ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۴ | جنوری ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۱

مشمولات

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

سالانہ زر تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی

فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۲۷۰۹

خیال کے مطابق جو خطاب اہم تر ہوتا ہے اُسے ہی منتقل کر کے "میثاق" میں شائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود بعض وجوہ سے خطاب بر وقت شائع بھی نہیں ہو پاتے۔ چنانچہ امیر محترم کے خطاب "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" کی باری اب جنوری ۸۵ء میں آئی ہے جبکہ یہ خطاب اواخر اگست ۸۴ء کو ارشاد کیا گیا تھا۔ اسی خطاب کا تتمہ وہ خطاب ہے جو اواخر ستمبر ۸۴ء میں "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" کے موضوع پر کیا گیا تھا۔ ہماری کوشش ہے کہ یہ خطاب اگلے ماہ کے شمارے میں شائع ہو جائے تاکہ اس موضوع پر امیر محترم کا نقطۂ نظر واضح طور پر قارئین کرام کے سامنے آ جائے۔

بید اللہ التوفیق وعلیہ التکلان

اعتذار "اس ماہ "الہدیٰ" کے دروس کے سلسلہ میں سورۂ تغابن کے درس کی دوسری نشست کی قسط شائع ہونی تھی۔ لیکن خوشنویس صاحب سے اس کا مسودہ گم ہو گیا۔ اب اُسے دوبارہ کیسٹ سے منتقل کرنا ہو گا لہٰذا ہمیں افسوس ہے کہ یہ قسط اس شمارہ میں شامل نہیں کی جا سکی۔ ●●

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

تذکرہ و تبصرہ

'میثاق' بابت ستمبر ۸۴ء میں "قرآن حکیم کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں کے بارے میں علماء کرام کے خدشات" کے موضوع پر راقم الحروف کے خطاب کی اشاعت کے بعد تبصروں، تنقیدوں اور مشوروں کا جو سلسلہ ذاتی خطوط اور دینی جرائد میں شائع شدہ مضامین کی صورت میں شروع ہوا تھا، وہ تاحال جاری ہے۔

گذشتہ شمارے میں ہم نے بعض خطوط میں جو اہم نکات اٹھائے گئے تھے اُنکے ضمن میں بھی اپنی گذارشات پیش کردی تھیں ـــــ اور خصوصاً معاصر 'الخیر' ملتان میں شائع شدہ دو اہم تحریروں کے مشترک نکات کے ضمن میں بھی مفصل وضاحت پیش کردی تھی ـــ خاص طور پر 'تقلید جامد' اور 'اجتہادِ مطلق' کے بین بین "نیم تقلید" کی جو اصطلاح راقم نے وضع کی تھی اُس کے ضمن میں کچھ راقم کے عجزِ بیان، کچھ اختصار اور کچھ بعض دوسرے اسباب سے جو مغالطے پیدا ہوگئے تھے اُن کے ازالے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

حُسنِ اتفاق سے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ گذشتہ ماہ بنفسِ نفیس پاکستان تشریف لے آئے اور انہوں نے 'میثاق' میں نہ صرف اپنا مکتوب اور اس پر راقم کا شکریہ ملاحظہ فرمالیا بلکہ متذکرہ بالا موضوع پر 'الخیر' کے مضامین بھی پڑھ لئے اور راقم کی وضاحت بھی ملاحظہ فرمالی ـــــ اس پر اُن کا یہ 'قولِ فیصل' راقم کے لئے بہت ہی حوصلہ افزائی کا 'موجب ہوا ہے' اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے:

"... ڈاکٹر صاحب نے اس نزاعی خطاب میں تفصیلی طور پر نہ سہی، اجمالی طور پر جس آرزو کا اظہار کیا ہے اُس سے بعض علماءِ کرام کو شکایت پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے 'میثاق' نومبر کے پرچے میں اس غلط فہمی کو

دُور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ **علمائے حق کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے** ۔ مجھے امید ہے کہ تعلید اور نیم تقلید جیسے جزوی مسائل کو دعوتِ قرآنی کے بنیادی مشن کے مقابلے میں اہمیت نہیں دی جائے گی ۔

پاکستان کے اندر اس وقت جزوی مسائل میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء جس طرح آپس میں گتھم گتھا ہیں اور مخالفِ شریعت عناصر اس کو ہوا دے کر علماءِ دین کا مذاق اڑ رہے ہیں اور اس حربِ عقائد سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں شرعی نظام قائم کرنے کا مطلب اس "لڑاکو" طبقے کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور دینا ہے ـــــ اس کا تقاضا ہے کہ **ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے** ـــــ موصوف کا مقصد یہی ہے کہ جزوی اور فروعی اختلافات کی شدّت اور ہنگامہ آرائی کم سے کم ہو جائے اور ملّت کی پوری طاقت و توجہ دینِ برحق کی اصولی دعوت پر مرکوز ہو جائے ۔ ۔ ۔ "

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد ماجد کے نام نامی سے معنون مدرسے کے مہتمم اور صدر مدرّس ہیں جو نئی دہلی میں واقع مشہور قبرستانِ "مہندیاں" میں واقع ہے جہاں نہ صرف شاہ ولی اللہؒ اور ان کے تمام جلیل القدر فرزند بلکہ اس عظیم خانوادے کی اور بھی متعدد عظیم ہستیاں محوِ استراحت ہیں[1] ۔ راقم کے نزدیک اسی تعلق اور نسبت کا پرتو کامل ہے جو مولانا قاسمی مدظلہٗ کی مندرجہ بالا سطروں میں جھلک رہا ہے آخر کیسے ممکن تھا کہ " الانصاف فی بیانِ سببِ الاختلاف " ایسی عظیم کتاب کے عظیم مصنّف کے ساتھ اس قدر قریبی تعلق بھی اپنے اثرات نہ پیدا کرتا !

---

[1] الحمد للہ کہ اپریل ۱۹۸۳ء میں راقم الحروف کو دہلی میں نہ صرف یہ کہ مدرسہ حسین بخش کی اُس تاریخی جامع مسجد میں خطابِ جمعہ کا موقع ملا جہاں کبھی سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ وعظ فرمایا کرتے تھے اور اب مولانا قاسمی مدظلہٗ خطابت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں بلکہ مدرسۂ رحیمیہ کی زیارت اور اس کے ساتھ خانوادۂ ولی اللّٰہیؒ کے قبرستان میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی !

بہرحال ہمیں قوی امید ہے کہ نہ صرف معاصرِ 'الخیر' کے مدیر گرامی مولانا محمد ازہر اور موقر مضمون نگار مولانا عبدالقیوم حقانی بلکہ وہ تمام علماء کرام جن کی نگاہوں سے ہماری یہ گذارشات گذری ہوں گی ہماری وضاحتوں سے پوری طرح مطمئن ہو گئے ہوں گے!

گذشتہ ماہ کی گذارشات کے اختتام پر عرض کیا گیا تھا کہ "البتہ ایک بات ایسی ہے کہ جس پر آئندہ کسی صحبت میں تفصیلی گفتگو ہوگی۔ اور وہ ہے "مولانا مودودی مرحوم اور تحریک جماعتِ اسلامی کے بارے میں میری رائے اور اُن کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت" — اس سلسلے میں ارادہ تو یہی تھا کہ اسی شمارے میں یہ فرض ادا ہو جائے لیکن ایک طرف تو یکم دسمبر ۸۲ء سے لاہور میں تنظیمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ایک چالیس روزہ تربیتی پروگرام جاری ہے جس میں راقم کی بھی شدید مصروفیت رہی، دوسری طرف یہ موضوع ایسا ہے کہ جس کے ضمن میں اختصار غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے، اور ضرورت ہے کہ بات مفصل اور پوری طرح کھل کر کی جائے تاکہ اس مسئلے میں راقم کے طرزِ فکر میں اگر کوئی غلطی ہو تو وہ بھی پوری وضاحت کے ساتھ ان علماء کرام کے سامنے آ جائے جنہیں راقم کے کام سے فی الجملہ دلچسپی اور ہمدردی ہے تاکہ وہ اس غلطی کے ازالے میں میری مدد کر سکیں — یہی وجہ ہے کہ اس معاملے میں مَیں از خود بھی تفصیل کے ساتھ لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ ۸۲ء میں مَیں نے "مولانا مودودی مرحوم اور مَیں" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ اُن ہی اسباب کی بنا جن کی تفصیل گذشتہ شمارے میں عرض کی جا چکی ہے وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ بہرحال اب ان شاء اللہ راقم اپنی پہلی فرصت میں نہ صرف اُس کی تکمیل کی کوشش کرے گا، بلکہ مولانا مرحوم کے 'فکر' اور زندگی کے مختلف ادوار میں اُن کے اختیار کردہ 'طریقِ کار' کے بارے میں اپنی رائے تفصیلاً پیش کرے گا۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ راقم کو اس ارادے کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے!

نومبر ۸۲ء کے 'میثاق' میں "مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، جمعیۃ علماء ہند اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح" کے عنوان سے میری ایک تحریر پیر کبیر والا ضلع ملتان

سے ایک عالمِ دین مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی کے دو خطوط اور اُن کا وہ ملخّص جو معاصر "الخیر" ملتان میں شائع ہوا تھا، راقم کے تفصیلی جواب کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا گیا تھا۔ اس پر ایک تو تفصیلی گرفت حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ نے فرمائی ہے جو اس پرچے میں شائع کی جا رہی ہے۔ اُسی کے ضمن میں ہماری گذارشات ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں پیش کی جائیں گی۔

البتہ اُسی سلسلہ میں کچھ اختصار اور کچھ رواروی میں نکلے ہوئے چند الفاظ سے ایک وسیع حلقے میں جو بدگمانی پیدا ہوئی ہے اُس کا ازالہ فوری طور پر ضروری ہے۔ وہ بدگمانی راقم کے ان الفاظ سے پیدا ہوئی ہے:-

(۲) "پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہند رحؒ طبقۂ علماء کی وہ آخری شخصیت تھے جنہوں نے جو کام بھی کیا، اپنے بل بوتے پر کیا ـــ جس کا اصل نقشۂ کار بھی ان ہی کے ذہن کی پیداوار تھا ـــ اور اس پر عملی جدوجہد کی قیادت و رہنمائی بھی خود ان ہی کے ہاتھ میں تھی ـــ ان کے بعد سے برِّصغیر میں قومی اور عوامی سطح پر علماءِ کرام کی مختلف تنظیموں کی حیثیت غالب تر اور سیکولر مزاج سیاسی تحریکوں کے ضمیموں کی رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحؒ جیسی عظیم شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت العلماءِ ہند کی حیثیت کانگریس کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی ـــ اسی طرح مولانا شبّیر احمد عثمانی رحؒ ایسی نابغہ شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت علماءِ اسلام کی حیثیت مسلم لیگ کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی ـــ اور یہی صورتِ حال آج تک جاری ہے کہ اس وقت بھی حلقۂ دیوبند کے سیاسی اور عوامی مزاج کے حامل علماءِ کرام اپنی تمام تر جلالتِ شان اور مرتبہ و مقام کے باوصف یا موجودہ فوجی آمریت کا ضمیمہ ہیں یا ایم آر ڈی کا ـــ اور یا پھر جماعتِ اسلامی کے مانند "نیمے دروں، نیمے بروں" بلکہ صحیح تر الفاظ میں "نہ اِدھر نہ اُدھر" کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں (اور کم و بیش یہی حال بریلوی مکتبۂ فکر اور اہلِ حدیث حضرات کی قیادت کا ہے۔)"

ان الفاظ پر مولانا شبّیر احمد عثمانی رحؒ کے عقیدت مند اور اُن کے سیاسی موقف کے

حامی حضرات کی جانب سے تو کوئی ردِّ عمل راقم کے علم میں نہیں آیا البتہ مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحؒ کے حلقۂ ارادت و عقیدت سے وابستہ اور اُن کی سیاسی حکمتِ عملی سے اتّفاق رکھنے والے حضرات کی جانب سے شدید ردِّ عمل ظاہر ہوا ہے چنانچہ اس ضمن میں متعدد حضرات نے مولانا سیّد حامد میاں مدظلہٗ کے نام شکایتی خطوط تحریر فرمائے ہیں کہ "آپ ڈاکٹر اسرار احمد کے سرپرست اور اُس کی قائم کردہ 'تنظیمِ اسلامی' کے مستشارین میں سے ہیں اور اس نے مولانا حسین احمد مدنی رحؒ اور جمعیۃ علماء ہند کو "کانگرس کا ضمیمہ" قرار دیا ہے ــــ جبکہ آپ صرف یہ کہ ذہناً اور قلباً "مدنی" ہیں بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحؒ کے خلیفۂ مجاز بھی ہیں!"[1] ــــ چنانچہ مولانا نے کمالِ شفقت کے ساتھ بعض خطوط بھی راقم کے حوالے کر دیئے اور یہ ہدایت بھی فرمادی کہ اس ضمن میں مناسب وضاحت راقم الحروف خود ہی کر دے!

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ:

۱ ــ راقم کے نزدیک مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحؒ اور مولانا شبّیر احمد عثمانی رحؒ دونوں ہی (بقول مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ) "حضرت شیخ الہند رحؒ کی جماعت" سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دونوں کا خلوص و اخلاص، تقوٰی و تدیّن اور 'للّٰہیت' و 'فی اللّٰہیت' ہر شک و شبہ سے بالا، اور دونوں کا علم و فضل کے اعتبار سے مقام و مرتبہ ہر معیار اور پیمانے سے نہایت اعلیٰ و ارفع ہے۔

۲ ــ جہاں تک سیاسی حکمتِ عملی کا تعلق ہے اُس کے اعتبار سے راقم کو مولانا شبّیر احمد عثمانی رحؒ کے موقف سے اتّفاق اور حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحؒ کے موقف سے اختلاف ہے۔ راقم کے نزدیک مولانا مدنی رحؒ نے اپنی خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" میں اپنے سیاسی موقف کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے کہ یہ تحریکِ شہیدینؒ کا تسلسل ہے تو یہ بات صدفی صد درست ہے، لیکن ایک پوری صدی گزر جانے کے باعث حالات میں مختلف اعتبارات سے جو تبدیلی آگئی تھی اُس کے پیشِ نظر اس میں تبدیلی کی ضرورت تھی، جس کے آثار حضرت شیخ الہند رحؒ کے خطبۂ صدارت، اجلاس جمعیۃ علماء ہند، نومبر ۱۹۲۰ء میں موجود

---

[1] یہ ترجمانی ہے، اقتباس نہیں، گویا روایت 'بالمعنیٰ' ہے 'باللفظ' نہیں!

ہیں ـــــ اور راقم کی رائے یہ ہے کہ اگر حضرت شیخ الہندؒ کو اللہ مزید زندگی عطا فرماتا تو اُن کی سیاسی حکمتِ عملی میں وہ تبدیلی لازماً آتی اور اس صورت میں برّصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی ملّی نشاۃ ثانیہ کے 'قائدِ اعظم' لازماً وہی ہوتے ـــــ لیکن 'ماشاءَ اللہ کانَ وما لم یشاءُ لم یکن'!

۳ - بایں ہمہ مولانا مدنیؒ کے 'خلوص و اخلاص'، اور 'علم و فضل' بلکہ 'مجاہدانہ کردار' کی عظمت کا جو نقش راقم کے دل پر قائم ہے سیاسی حکمتِ عملی کے ضمن میں اس اختلافِ رائے کا اُس پر ہرگز کوئی اثر نہیں ہے۔ اور اگرچہ سیاسی موقف کے ضمن میں 'اتفاق' اور خصوصاً حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن پر جو حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تحریر فرمائے اُن سے پورے ثلث صدی کے مسلسل استفادے کی بنا پر اُن کی ذات سے ایک خصوصی 'احسانمندی' کا تعلق راقم کو اضافی طور پر حاصل ہے ـــ تاہم جہاں تک میرے دل کا تعلق ہے اُس پر مولانا مدنیؒ کے 'عظمتِ کردار' کا نقش مقابلۃً بہت زیادہ گہرا ہے۔ گویا اگر میں یہ کہوں کہ میں 'ذہناً' 'عثمانی' لیکن 'قلباً' 'مدنی' ہوں تو یہ کیفیتِ واقعی کی غلط تعبیر نہ ہوگی۔ (اس ضمن میں مَیں اس وقت کچھ زیادہ عرض نہیں کرنا چاہتا اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ بعض ناقدین اِسے 'دقیق سخن سازی' سے تعبیر فرمائیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی مَیں 'میثاق' میں شائع شدہ اپنی بیس سال کی تحریروں کے متعلقہ اقتباسات پیش کر دوں گا)

۴ - راقم نے ان دونوں بزرگوں اور انکی 'جمعیتوں' کے ضمن میں "ضمیمہ" کا لفظ ان کی شخصیتوں، یا اُن کی نیتوں، یا اُن کے اپنے نقشہ ہائے کار کے اعتبار سے نہیں بلکہ برّصغیر کی سیاسی صورتِ حال کے واقعی اور معروضی مطالعے اور 'نتائج کار' کے اعتبار سے استعمال کیا ہے ـــــ یعنی اس واقعہ کے اظہار اور اس حقیقت کی تعبیر کے لئے کہ سیاسی میدان میں برّصغیر کے مسلمانوں پر علماء کرام کی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی ـــ اور بالخصوص جہادِ حرّیت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کے براہِ راست جانشین یعنی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور اُن کی زیرِ قیادت 'جمعیۃ علماء ہند' کا اثر و رسوخ دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ واقعاتی نتائج کے اعتبار سے اُن کی حیثیت کانگریس کے "ضمیمے" سے زیادہ نہ رہی ـــ واضح

رہے کہ اس پہلو سے اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی حکمت عملی بالفعل کامیاب رہی، لیکن چونکہ مسلم لیگ کی قیادت میں اُن کا مقام بھی ثانوی و ضمنی تھا لہٰذا راقم نے خود انہیں اور ان کی 'جمعیۃ علماءِ اسلام' کو بھی مسلم لیگ کا "ضمیمہ" ہی قرار دیا ہے ــــــ

بہرحال یہ معاملہ 'واقعات' اور 'نتائج' کے اعتبار سے ہے نہ کہ انکی 'ذوات' اور 'نیات' کے اعتبار سے!

اُمید ہے کہ ہماری اس وضاحت سے وہ بدگمانی رفع ہو جائے گی جو اُس حلقے میں پیدا ہو گئی ہے جس سے راقم کو نہایت گہرا قلبی تعلق ہے۔ واللہ علیٰ ما اقول شہید![1]

حال ہی میں ماہنامہ 'بینات' کراچی کے ادارتی صفحات میں ایک مفصل تبصرہ تحریر فرمانا شروع کیا ہے مدیرِ گرامی مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب نے اس کی تاحال پہلی قسط شائع ہوئی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون طویل ہو گا ــــ لہٰذا اس کے ضمن میں بہتر یہی ہے کہ مضمون پورا شائع ہو جائے تب ہی اپنی گذارشات پیش کی جائیں۔

سرِدست مولانا موصوف کی خدمت میں صرف اس قدر عرض ہے کہ وہ یہ ہرگز خیال نہ فرمائیں کہ ان کے بعض 'تیکھے' جملوں کے باوصف ہمیں اُن سے اسی تبصرے

---

[1] اس ضمن میں تفاصیل تو ان شاء اللہ بعد میں آ ہی جائیں گی۔ ایک واقعہ کا اظہار موقع کی مناسبت سے مفید رہے گا اور وہ یہ کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور نے جو ایک طویل تحریر "مولانا مدنیؒ کی شان میں بے ادبی اور گستاخیوں پر توبہ نامہ" کے طور پر تحریر کی تھی وہ سال بھر سے زیادہ عرصہ تک 'خدام الدین' کے دفتر میں پڑی رہی اور اسے شائع کرنے کی ادارہ خدام الدین کو ہمت نہ ہوئی یا اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر اسے مناسب نہ سمجھا گیا ــــ لیکن اسے شائع کیا پوری آب و تاب کے ساتھ راقم الحروف نے 'میثاق' میں جہاں سے بعد میں نقل کیا 'انوارِ مدینہ' نے!

پر کوئی ملال ہوا ہے یا ہوگا، ہمیں یقین ہے کہ وہ یہ کام لِلّٰہ وفی اللّٰہ اور خالصۃً ہماری خیر خواہی کے جذبے سے کر رہے ہیں اور ان شاء اللّٰہ جیسے انہوں نے راقم کی زبان کی ایک غلطی پکڑی ہے (جس پر راقم ان کا ممنون ہے) اُس طرح راقم کی سوچ میں بھی جس کجی کی نشان دہی وہ کریں گے اُس سے ہم حتی المقدور استفادہ کریں گے۔ اور کوئی جوابی وضاحت پیش کریں گے تو وہ بھی بغرضِ اصلاح ہی ہوگی ــــ!!

اطلاع متعلّقہ

حلقۂ مستشارین تنظیم اسلامی

(١) الحمد للّٰہ کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی مہتمم و شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ، مرکز حضرت شاہ ولی اللّٰہ دہلویؒ، خواجہ میر درد روڈ، نئی دہلی (بھارت) نے تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں باضابطہ شمولیت قبول فرمالی ہے!

(٢) مولانا سید وصی مظہر ندوی، مہتمم جامعہ اسلامیہ، ٹھنڈی سڑک، حیدرآباد (سندھ) کو اُن کے ایسی تنظیم کے ساتھ وابستگی اختیار کر لینے کی بنا پر جس کے رُوحِ رواں اور ناظم و رجم، کو اسلامی حد تسلیم نہیں کرتے بعد رنج و افسوس تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین کی رکنیت کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔

المعلن: (چودھری) غلام محمد، قیم تنظیم اسلامی، پاکستان

کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے ۸۲/۸/۳۱ء کے جمعہ کو مسجد دارالسلام لاہور میں مندرجہ بالا موضوع پر جو خطاب ارشاد کیا تھا وہ کیسٹ سے منتقل کر کے قدرے حک و اضافہ کے ساتھ پیش خدمت ہے۔
(جمیل الرحمٰن)

الحمد للہ - الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علیٰ افضلھم وخاتم النبیین محمد ن الامین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین - امابعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝
وقال تبارک وتعالیٰ فی سورۃ الشوریٰ :
شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ط -
وقال اللہ عزوجل فی سورۃ الصف :
ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ۝
وقال سبحانہ وتعالیٰ فی سورۃ الانفال :
وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ - امابعد :
فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم -

اَلْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ یُّقَاتِلُ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا۔ (اَوْکما قال صلی اللّٰه علیه وسلم)
رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ۔
اللّٰهم ربّنا الهمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا۔
اللّٰهم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔
اللّٰهم وفقنا ان نقول بالحق اینما کنا لانخاف فی اللّٰه لومة لائم۔

آمین یا ربّ العٰلمین ○

حضرات! گذشتہ جمعہ میں مَیں نے عرض کر دیا تھا کہ انشاء اللہ میں آئندہ جمعہ کو اس موضوع پر اظہار خیال کروں گا کہ "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" لہٰذا مجھے آج اسی موضوع پر کچھ عرض کرنا ہے۔ آپ شروع ہی سے محسوس کر رہے ہوں گے کہ میرا گلا خراب ہے۔ گذشتہ جمعہ سے لے کر آج تک شدید مصروفیت رہی۔ اس دوران پانچ دن میرے ایبٹ آباد، مانسہرہ، مظفر آباد اور راول کوٹ کے دعوتی دورے میں گزرے ہیں۔ کل رات ہی اس دورے سے واپسی ہوئی ہے۔ مَیں آج صبح گن رہا تھا تو گذشتہ جمعہ کے بعد سے اب تک میں نے گیارہ تقریریں کی ہیں۔ جن میں سے کوئی بھی شاید ڈیڑھ گھنٹے سے کم کی ہو۔ بہرحال دعا کیجئے کہ گلا ساتھ دے اور مَیں آج جس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس پر میں اپنے خیالات اور اپنے ما فی الضمیر کو اطمینان اور انشراحِ صدر کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو عیدالاضحیٰ کے بعد آنے والے جمعہ میں ——— آج کی تقریر کی دوسری کڑی پر اظہار خیال کرونگا جس کا موضوع ہو گا کہ : "کیا ایران کا انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟"

پس منظر

آج کے موضوع کا ایک پس منظر ہے ویسے تو بہت عرصے سے میرے بارے میں اخبارات میں چہ میگوئیاں جاری تھیں، ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ یہ شخص پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب لانا چاہتا ہے۔ جس زمانے

میں پردے وغیرہ کے معاملہ میں بحث چل رہی تھی تو بعض انگریزی اخبارات نے مجھے پاکستانی خمینی کا خطاب بھی دیا تھا۔ لیکن اصل میں اس وقت یہ موضوع میرے سامنے آیا ہے تو اسکی دو وجوہ ہیں، ایک یہ کہ میں اس مرتبہ جب شمالی امریکہ کے دعوتی دورے کے بعد پاکستان واپس آرہا تھا تو چار دن کے لئے میں نے انگلستان میں بھی قیام کیا۔ لندن میں ایک مسلم انسٹی ٹیوٹ قائم ہے، جس کے سربراہ ایک ہندوستانی مسلمان ہیں، اصلاً لکھنوی تھے اس کے بعد وہ پاکستانی ہوتے اور اب وہ انگلستانی ہیں۔ ان کا اسم گرامی ڈاکٹر کلیم صدیقی ہے۔ وہ ایرانی انقلاب کے اس درجہ حامی و مؤیّد اور اس کے اتنے قائل اور ہر اعتبار سے اتنے معترف ہیں کہ انہوں نے اس موضوع پر بہت سے مقالات اور مضامین شائع کئے اور متعدد سیمینار منعقد کئے ہیں۔ جن دنوں میں لندن میں تھا ان کے ادارے کے زیر اہتمام ایک سیمینار کا سلسلہ چل رہا تھا۔ چند دنوں بعد ایک سیمینار ہونے والا تھا جس کا موضوع تھا "پاکستان کا مستقبل"۔ یعنی کچھ لوگ پاکستان سے ہزاروں میل دور انگلستان میں بیٹھ کر پاکستان کے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ یہاں آئیں، منجدھار میں کودیں اور حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ لیکن انگلستان کی ٹھنڈی فضاؤں میں بیٹھ کر نظریات بگھارنا، ظاہر بات ہے کہ اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس اجلاس میں کیا کچھ کہا گیا ہے اس کا تو مجھے علم نہیں ہے چونکہ میری پاکستان کے لئے روانگی طے تھی۔ لیکن اس سے پہلے جب میں وہاں تھا تو وہاں جو سیمینار ہو رہا تھا وہ ایرانی انقلاب کے بارے میں تھا۔ اس میں شرکت کی دعوت عام نہیں تھی بلکہ دعوتی کارڈ جاری کئے گئے تھے۔ میں بھی بطور سامع اور مبصر شرکت کے لئے وہاں چلا گیا۔ منتظمین نے ایک تو میرے ساتھ زیادتی یہ کی کہ جیسے ہی میں وہاں لابی میں جاکر کھڑا ہوا۔ ابھی ہال میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ تین مندوبین جو شکل وصورت سے عالم دین معلوم ہوتے تھے، ان میں سے ایک صاحب کے متعلق مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا سابقہ تعلق جماعت اسلامی کے ساتھ تھا۔ اور یہ تینوں حضرات سندھی تھے۔ یہ حضرات میرے قریب آگئے جیسے ملاقات ہوتی ہے، پذیرائی ہوتی ہے اور آس پاس کھڑے ہو گئے اور فوراً ہی فوٹو لے لیا گیا اور دوسری زیادتی یہ کی کہ اگلے دن وہ فوٹو روزنامہ جنگ لندن کے پہلے صفحے پر بڑے نمایاں انداز میں شائع کردیا گیا جس میں گویا کہ مجھے بھی اس سیمینار کے مندوب شریک کی حیثیت سے پیش کیا گیا حالانکہ

وہاں نہ کسی مندوب کی حیثیت سے گیا تھا نہ وہاں میری شرکت ان معنوں میں تھی ہیں
ان ایک عام شریک ایک عام سامع اور ایک عام SPECTATOR کی حیثیت
گیا تھا۔ وہاں شرکا میں کچھ پاکستانی حضرات بھی تھے۔ روزنامہ مسلم (انگریزی) ا
لپنڈی کے مدیر تھے، ایک صاحب کوئٹہ سے تھے، تین حضرات سندھ سے تھے، اس سے زیادہ
واقف نہیں ہوں ــــ بہرحال وہاں جو بات بڑے شدومد کے ساتھ کہی گئی اور جن
یالات کا بڑے زور شور سے اظہار کیا گیا۔ وہ یہ تھے کہ کامل ترین اسلامی انقلاب،
لی ترین اسلامی انقلاب اور IDEAL ترین اسلامی انقلاب ــــ ایرانی انقلاب
ہے اور اسی کے نقشِ قدم کی پیروی ہونی چاہیئے اور تمام مسلم ممالک کے لوگوں
لو اسی نہج سے اپنے اپنے ممالک میں انقلاب برپا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جانا چاہیئے۔
یہ تمام تقاریر کا لُبِ لباب تھا۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ وہاں مجھے جس طریقے سے اخبار
میں پیش کیا گیا ہے تو اس سے لوگ اس مغالطے میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ گویا مجھے بھی
سیمینار میں پیش کردہ خیالات سے اتفاق ہے اور میں ان کا حامی ہوں لہذا میرے لئے
ضروری ہے کہ اس موضوع پہ مجھے اب اپنا موقف واضح طور پر بیان کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ
وہاں ایک بڑے اجتماع میں، میں نے خاص طور پر اسلامی انقلاب کے خصائص پر مفصل اظہار
خیال کیا۔

پیش منظر

پاکستان واپسی پر معلوم ہوا کہ یہاں لاہور
میں بھی ہوٹل فلیٹیز میں ایک بڑی کانفرنس
منعقد ہوئی جس میں ایرانی انقلاب کی تائید و توثیق کی گئی اور بین السطور تقاریر میں پاکستانی
مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا گیا اور فی الجملہ ان کی یہ رہنمائی کی گئی کہ ان کو بھی پاکستان میں ایرانی
طرز کے انقلاب کے لئے جدوجہد اور کوشش کرنی چاہیئے۔ اگرچہ یہ بات تاحال میرے لئے حیران
کن ہے کہ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ لاہور کے ایک معیاری ہوٹل میں اس عظیم الشان کانفرنس
کا انعقاد کس کی جانب سے کیا گیا تھا! اس پر تو کافی صرفہ ہوا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اخبارات
میں اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں بعض لوگوں نے شاید اس کا کنوینر کالعدم جماعت اسلامی
کو ٹھہرایا۔ لیکن سید اسعد گیلانی کی طرف سے اعلانِ برأت آ گیا کہ اس کانفرنس کے انعقاد
سے جماعت کا کوئی تعلق نہیں ــــ البتہ میری معلومات کے مطابق گیلانی صاحب اس

میں شریک تھے ۔ ـــــــ بہر حال یہ معاملہ ایک سوالیہ نشان ہے کہ اس طرح کی بڑی بڑی کانفرنسیں ہمارے ملک کے اعلیٰ ہوٹلوں میں منعقد ہوں تو عوام الناس کو معلوم تو ہونا چاہیئے کہ ان کا داعی کون ہے؟ کس کی طرف اُن ذمہ داریوں کو اصلاً لوٹنا چاہیئے جو ایسے سیمینار اور ایسے اجتماعات میں کی جاتی ہیں ۔ بہر حال اُس کانفرنس میں جو تقاریر ہوئیں میری معلومات کی حد تک ان کا لب و لباب اور خلاصہ یہی ہے کہ پاکستان میں بھی اسلامی انقلاب کے لیئے پاکستانیوں کو ایرانی انقلاب کے طرز اور منہجِ عمل کو اختیار کرنا چاہیئے ۔

بعض حضرات کا طرزِ فکر

یقیناً ہمارے یہاں بھی کافی تعداد میں لوگ ایسے ہیں جو مختلف اسلامی تحریکوں سے وابستہ تھے یا ہیں لیکن اپنے یہاں کی ناکامیوں سے دل برداشتہ ہو کر اور ایرانی بھائیوں کی کامیابی سے متاثر ہو کر وہ حضرات اب شاید اس طرز پر سوچ رہے ہیں کہ ہمیں بھی پاکستان میں ایرانی بھائیوں کے نقشِ قدم ہی کی پیروی کرنی ہوگی ۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں اسے اصلاً ایک فراری ذہنیت سمجھتا ہوں ۔ یہ ایک ESCAPIST TENDENCY ہے ۔ نہ اپنے حالات کو دیکھنا ، نہ اُس فرق پر نگاہ رکھنا جو ہمارے اور ایران کے حالات میں ہے ۔ اُسے آئیڈیل قرار دینا ان حضرات کے مقام سے مطابقت نہیں رکھتا جو اپنا ایک طریقِ کار رکھتے ہیں ۔ یہ اغلباً اس لیئے ہے کہ چونکہ ہم کچھ کر نہیں پائے لہٰذا جنہوں نے کچھ کر دکھایا ہے ان سے اس درجے مرعوب ہو گئے ہیں کہ یہ سوچنے لگے ہیں کہ اگر کوئی کام ہو سکتا ہے تو اُسی طرز پر ہو سکتا ہے ۔ ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

میرے خیال میں بعض لوگوں کی پاکستان میں اس وقت یہی ذہنی کیفیت ہے اور اسی وجہ سے اس قسم کی باتیں بڑے شدّ و مدّ سے ہمارے سننے میں آ رہی ہیں ۔

صحیح طرزِ عمل

ہمارے لئے صحیح طرزِ عمل یہ ہو گا کہ ہم دیکھیں کہ ہمیں OBJECTIVELY گہرا جائزہ لینا ہو گا کہ ہمارے ظروف و احوال کیا ہیں ! ایران کے حالات اور ہمارے حالات میں کتنا فرق ہے ! آیا ہم وہی طریقِ کار (METHODOLOGY) جوں کا توں اپنے یہاں استعمال کر سکتے ہیں کہ نہیں کر سکتے ! اس سے آگے بڑھ کر ضروری بات یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آیا

ایران کا انقلاب واقعتاً ایک آئیڈیل اسلامی انقلاب ہے!! ہمارے نزدیک توجو آئیڈیل اسلامی انقلاب ہے، وہ صرف اور صرف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ ہم کسی کو داد دے سکتے ہیں، ہم کسی کو شاباش دے سکتے ہیں، ہم کسی کی تحسین کر سکتے ہیں کہ انہوں نے بڑی ہمت، جرأت، اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم بڑی حد تک کسی سے یہ INSPIRATION بھی لے سکتے ہیں یہ قوتِ متحرکہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ کہ اگر انہوں نے یہ سب کچھ کر دکھایا تو ہم کیوں پیچھے رہیں! کیوں نہ ہم بھی ہمت کریں! بقول علامہ "آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی" — اس انداز کی بات ہو تو میرے نزدیک غلط نہیں ہے۔ لیکن ہمارے لئے کوئی انقلاب IDEAL نہیں ہے کوئی انقلاب نمونہ نہیں ہے سوائے انقلابِ محمدی کے (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) ہمارے لئے تو وہ معیارِ مطلق ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — لہٰذا ہم تو ہر انقلاب کو اس پر پرکھیں گے۔ اور اسے کسوٹی قرار دے کر ہم دیکھیں گے کہ منفی و مثبت عمل دخل کتنا ہے! کسی بھی انقلاب اور کسی بھی تبدیلی کو جانچنے اور ناپنے کے لئے اور اس کے PROS & CONS کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمارے پاس جو معیار اور پیمانہ ہے وہ سیرتِ محمدی ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

میں ان حالات کے پیش نظر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے اس مسئلہ پر جو سوچ بچار کیا ہے پھر مطالعہ اور چشم دید گواہوں سے جو معلومات مجھ تک پہنچی ہیں، تو وقت کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر میں کھل کر بات کروں۔ اس سے قبل انفرادی طور پر اور نجی گفتگو کی محفلوں میں اس مسئلہ پر میں اپنی رائے کا اظہار کرتا رہا ہوں۔ لیکن تفصیل و وضاحت اور دلائل کے ساتھ نہیں کیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس ذمہ داری کو علیٰ رؤس الاشہاد ادا کر دوں تاکہ میرا نقطۂ نظر پورے طور پر سامنے آجائے۔

نئی اصطلاحات

سب سے پہلے تو میں لفظ "انقلاب" کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں — پہلی بات یہ کہ یہ قرآنی اور دینی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ دورِ جدید کی اصطلاح ہے۔ نئی اصطلاح ہے اور نئی اصطلاحات کے استعمال میں اندیشے مضمر ہوتے ہیں چونکہ ہر نئی اصطلاح اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ نئے

تصورات لازماً رکھتی ہے ۔ اور جب ہم کسی نئی اصطلاح کا استعمال شروع کر دیتے ہیں تو وہ تصورات غیر شعوری طور پر اور غیر محسوس انداز سے از خود ہمارے اذہان و قلوب میں در آتے ہیں مثال کے طور پر ایک لفظ آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) ہے ۔ یہ لفظ ہمارے ہاں بطور اصطلاح بکثرت استعمال ہوتا ہے جیسے ' اسلامک آئیڈیالوجی' اور ' آئیڈیالوجی آف پاکستان' وغیرہ ۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے جو بنیادی فکر دیا ہے وہ بہت حد تک آئیڈیالوجی سے مشابہ ہے ۔ لیکن یہاں اس لفظ یعنی آئیڈیالوجی کے استعمال میں ایک قباحت یہ ہے کہ یہ لفظ آئیڈیا (IDEA) سے بنا ہے اور آئیڈیا دراصل انسانی ذہن کی پیداوار ہوتا ہے ۔ گویا آئیڈیالوجی وہ فلسفہ ہے جو انسانی ذہن اور اس کے غور و فکر کے نتیجے میں وجود میں آتے ۔ لہذا جب ہم اسلامی معتقدات کے لئے اسلامک آئیڈیالوجی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو مذکورہ بالا تصور بھی ساتھ چلا آتا ہے ۔ حالانکہ فی الحقیقت اسلام کا جو بنیادی فکر ہے وہ اللہ کا عطا کردہ ہے ۔

اس اعتبار سے مجھے پسند نہیں ہے کہ ہم جدید اصطلاحات کا استعمال کثرت سے کریں ۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے ۔ جدید اصطلاحات کو اگر سرے سے استعمال نہ کیا جائے تو ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوتا ، بات ذہنوں تک پہنچتی ہی نہیں ۔ اس لئے کہ ہر دور میں تعلیم یافتہ طبقہ ان اصطلاحات سے مانوس ہوتا ہے ، انکے معانی و مفاہیم کو سمجھتا ہے ۔ لہذا اس طبقے کے ذہنوں تک بات کو پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان جدید اصطلاحات کے حوالے سے اپنا موقف و مدعا سمجھائیں ۔۔۔ ورنہ پہلے تو دینی اصطلاحات کو عام (EDUCATE) کرنا ہوگا ۔ لوگوں کو بتانا ہوگا کہ اقامتِ دین سے کیا مراد ہے ! جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے ! قتال کا مفہوم و مقصود کیا ہے ! دعوت و تبلیغ کے معانی کیا ہیں اور ان کی اصل غایت کیا ہے ! وغیرہ۔ پھر جب معاشرے میں ان اصطلاحات کے ساتھ اتنی واقفیت پیدا ہو جائے ۔ کہ لوگ انکے حوالے سے بات کو سمجھ سکیں تو پھر یقیناً ابلاغ کا حق ادا ہو جائے گا ۔۔۔ لیکن ابتداءً ہم مجبور ہیں کہ جس دور میں جن اصطلاحات کے حوالے سے لوگ عام طور پر بات کو سمجھتے ہیں انہی اصطلاحات کے ذریعے سے بات ان تک پہنچائیں ۔ البتہ ان کو مستقل طور پر اوڑھنا بچھونا نہ بنا لیں ، اور انہیں مستقل اصطلاحات کا درجہ نہ دے دیا جائے ۔ پھر جو لوگ بات کو

سمجھتے چلے جائیں انہیں اُن اصطلاحاتِ دینی سے قریب تر لایا جائے جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور عملی شکل موجود نہیں ہے۔ —— چنانچہ میں اسی ضرورت کے تحت 'اسلامی انقلاب' کی اصطلاح استعمال بھی کر رہا ہوں اور ابتداءً اس اصطلاح کے استعمال کو درست خیال کرتا ہوں۔

انقلاب کے ضمن میں دینی اصطلاحات

اسلامی انقلاب اور اس کے ضمن میں قرآنی اصطلاحات کی تفاصیل پر تو ان شاء اللہ میں آئندہ کسی نشست میں اظہارِ خیال کروں گا۔ تاہم اس وقت ربطِ مضمون قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ میں انقلاب کے بارے میں دینی اصطلاحات کو اجمالاً بیان کر دوں۔

اس ضمن میں پہلی قرآنی اصطلاح ہے "تکبیرِ رب"۔ اس کے لئے میں نے آغاز میں سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی تھی۔ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ "اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم)، کھڑے ہو جاؤ۔ (کمر بستہ ہو جاؤ) لوگوں کو خبردار کرو اور اپنے ربّ کی تکبیر کرو"۔ ان آیات میں، جو بعثتِ نبوی کے بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئیں، یہ واضح کر دیا گیا کہ آپؐ کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز 'انذار' ہے۔ یعنی لوگوں کو خبردار کرنا، کہ مرنے کے بعد تمہیں اپنے ربّ کے حضورؐ حاضر ہونا ہوگا۔ ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہوگی اور پھر جزا یا سزا سے سابقہ پیش آکر رہے گا —— اور تیسری آیت کے ذریعے اس جدوجہد کے منتہائے مقصود کو بیان کر دیا گیا کہ "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" اپنے رب کی تکبیر کرو! یعنی وہ نظام قائم کرو جس میں اللہ کو فی الواقع 'اکبر' (سب سے بڑا) اور مقتدرِ اعلیٰ (SUPREME AUTHORITY) تسلیم کیا جائے۔ انفرادی معاملات میں بھی اسیؐ کی اطاعت کی جائے اور اجتماعی سطح پر بھی اُسی کی اطاعت پر مبنی نظام قائم ہو۔ یہ ہے 'تکبیر' کا حقیقی مفہوم ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم محض 'اکبر' کی تسبیح کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ 'تکبیر' کا حق ادا ہو گیا۔ اقبال نے اس بات کو بڑے پرشکوہ انداز میں بیان کیا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل   یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

دوسری اصطلاح ہے 'اقامتِ دین'، یعنی دین کو قائم کرنا۔ سورۃ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں فرمایا گیا کہ "ہم نے دین میں تمہارے لئے وہی بات معیّن کی ہے جس کی وصیت کی تھی ہم نے نوحؑ کو اور جس کی وحی کی ہم نے آپؐ کی جانب اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو" اور وہ بات کیا تھی جس کی وصیت کی گئی تمام انبیاءؑ کو اور وہی اب مسلمانوں کے لئے معین کی جا رہی ہے! اُسے آگے بیان فرمایا: اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ ط "کہ دین کو قائم کرو اور اُس کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ ـــــ دین کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس پورے نظام اجتماعی کو قائم کرنا جس کا نام 'دین الحق' ہے۔ جو عدل و قسط پر مبنی ایک نظام ہے جو انتہائی متوازن نظام ہے جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا گیا ہے۔ معلوم ہوا دینِ حق کو بالفعل قائم کرنے کے لئے قرآنی اصطلاح ہے 'اقامتِ دین'۔

اس سلسلے کی تیسری اصطلاح ہے 'اظہارُ دینِ الحق علی الدین کُلِّہٖ'۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے کہ هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۔ "وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کرے اُسے کُل کے کُل دین پر"۔ یعنی پورے نظامِ اجتماعی پر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ معاشیات میں تو ہم اسلام کی پیروی نہیں کر سکتے ہاں سماجی نظام ہم اسلام کے اصولوں کے تحت بنائیں گے۔ یا یہ کہ سیاست میں تو ہم اسلام کو اختیار نہیں کر سکتے البتہ اُس کا معاشرتی نظام ہم لے لیتے ہیں وغیرہ۔ اس قسم کی کوئی تقسیم اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں۔ بلکہ مطلوب یہ ہے کہ پورے کے پورے نظام پر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔

چوتھی اصطلاح سورہ انفال میں آئی ہے: وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدّوجہد مکّی دور سے گزر کر مدنی دور میں آچکی غزوہ

بدر ہو چکا ۔ تلوار نیام سے باہر آچکی، اب جہاد قتال کی شکل اختیار کر چکا تب یہ آیت نازل ہوئی کہ اے مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آگئی ہے تو اب یہ نیام میں واپس نہیں جائے گی، اب تمہاری جنگ جاری رہے گی یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو نہ ہو جائے اور دین کُل کا کل صرف اللہ ہی کے لئے نہ ہو جائے۔ پورا نظامِ زندگی اللہ کے دین کے تابع نہ ہو جائے ۔

یہ چار اصطلاحات ہیں قرآن مجید کی اور پانچویں اصطلاح ہے "اعلاء کلمۃ اللّٰہ"۔ یہ حدیث کی اصطلاح ہے ۔ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ۔ اور یہ اس دور کی بات ہے جبکہ قتال کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ۔ کہ حضورؐ ! کوئی شخص جنگ کرتا ہے اپنی بہادری اور شجاعت کے مظاہرے کے لئے ۔ کوئی شخص جنگ کرتا ہے اپنے دل میں مالِ غنیمت کی طلب لے کر ۔ کوئی شخص جنگ کرتا ہے اپنی قومی یا قبائلی عصبیت کے لئے مثلاً یہ کہ حضورؐ تو خالصتاً اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی سربلندی کے لئے جنگ فرما رہے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ہو جسے کسی خاص قبیلے سے دشمنی ہو جس کی وجہ سے وہ اس وقت حضورؐ کے ساتھ شامل ہو کر جنگ کر رہا ہے لیکن اس کی اصل نیت اس قبیلہ سے انتقام لینا ہے تو اس میں عصبیت اور اپنے ذاتی انتقام کا جذبہ شامل ہو گیا ۔ تو حضورؐ سے پوچھا گیا کہ ان میں سے کس کو ہم سمجھیں کہ وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے ۔ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی مجاہد فی سبیل اللہ نہیں ہے' مجاہد فی سبیل اللہ تو صرف جنگ کرتا ہے محض اس مقصد کے لئے کہ : لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۔ کہ" اللہ کی بات سب سے اونچی ہو جائے' اس کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہو اللہ کا حکم ہی سب سے اوپر اور اللہ کا فرمان سب سے بالاتر ہو جائے ۔ یہ ہے وہ مقصد کہ جس کے لئے اگر کوئی جنگ کرتا ہے تب اُسے مجاہد فی سبیل اللہ شمار کیا جائے گا ۔

یہ پانچ اصطلاحات (چار قرآن مجید کی اور ایک حدیث شریف کی) جو میں نے آپ حضرات کے سامنے بیان کی ہیں ۔ ان پانچوں سے مقصود کیا ہے ! انقلاب ۔ ایک ایسا نظام قائم کرنا جس میں اللہ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کیا گیا ہو اور پورا نظامِ زندگی اللہ کے دین کے تابع ہو جائے ۔ اس مفہوم کے ابلاغ کے لئے اگر وہ اسلامی

انقلاب" کی اصطلاح استعمال کی جاتے تو اس تمدنی ضرورت کے پیشِ نظر جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، میں اس کو غلط نہیں سمجھتا بلکہ درست اور مفید سمجھتا ہوں۔

لفظِ انقلاب کی بحث اب لفظِ انقلاب کو لیجئے! اس کے مقابل کوئی ایک لفظ تو اُردو زبان میں موجود نہیں ہے لیکن انگریزی زبان میں دو الفاظ الگ الگ ہیں جو اس مفہوم کے لئے مستعمل ہیں۔ ایک ہے 'REVOLUTION' اور دوسرا ہے 'COUP' [1] ——— ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کہیں کسی ہنگامی و فوری اقدام کے طور پہ فوج حکومت پر قبضہ کر لیتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ 'فوجی انقلاب' آگیا۔ مگر اس کے لئے انقلاب کا لفظ صحیح نہیں۔ وہاں کوئی انقلاب نہیں آیا، صرف ایک انتظام بدلا ہے۔ سول حکومت کے بجائے فوجی حکومت آگئی اس نے ملک کا انتظام سنبھال لیا ہے سول حکومت کے بجائے فوجی حکومت آگئی اسے انقلاب نہیں کہتے اسی لئے انگریزی میں آپ اس کے لئے REVOLUTION کا لفظ کبھی نہیں دیکھیں گے بلکہ اس کیلئے لفظ COUP استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ REVOLUTION کے معنی ہیں ملکی نظام میں کوئی بنیادی اور مکمل تبدیلی۔ ——— لہٰذا ہمیں ان دونوں الفاظ کے مدلولات (CONNOTATIONS) اور اپنی اپنی جگہ ان دونوں کا جداگانہ اصل مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے۔

لیکن اس بحث سے پہلے ایک بنیادی بات پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ دورِ جدید میں انسانی زندگی کے دو علٰحدہ علٰحدہ حصّے کر دیئے گئے ہیں۔ ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی۔ ویسے تو یہ الفاظ بہت قدیم ہیں اور کسی نہ کسی درجے میں ان کا استعمال ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن عہدِ حاضر میں اس نے ایک باقاعدہ فلسفے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جس کی بدیہیات میں سے ہے کہ مذہب ایک خالص ذاتی اور نجی (PRIVATE) معاملہ ہے جس کا اجتماعیت کے دائرے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اس فلسفے کا بنیادی مفروضہ (AXIOM) ہے بلکہ آج کے مہذّب معاشرے میں اس موضوع پر گفتگو کرنا پسند نہیں کیا جاتا کوئی کسی سے کیوں پوچھے کہ اس کا عقیدہ کیا ہے! یہ خالص انفرادی اور نجی معاملہ ہے۔

---

[1] اس کا تلفظ "کو" (KOO) ہے

ایک ہے اجتماعیت کا معاملہ ــــــــــــ معاشرت، معیشت، ریاست وحکومت فوجداری اور دیوانی قوانین اور تعزیرات و سزا سے متعلق مسائل۔ جدید فلسفے میں ان تمام امور کو اجتماعی زندگی سے متعلق قرار دیا جاتا ہے اور اس کے لئے جدید اصطلاح سیکولر (SECULAR) استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی یہ انسانی زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں کسی مذہب اور کسی عقیدے کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ کسی ملک کے رہنے والے خود یا اپنے نمائندوں کی کثرت رائے کے ذریعے جو قانون وضابطہ چاہیں بنائیں۔ وہ ملکی قانون (LAW OF THE LAND) کی حیثیت سے نافذالعمل ہوجائے گا۔ یہ گویا اس دور کا آئیڈیل ہے۔ جمہوریت کا جو بلند و بالا تصور ہے وہ یہی ہے۔

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سیکولرزم (SECULAR ISM) کا مطلب لا مذہبیت ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ سیکولرزم تو مذاہب کو تسلیم کرتا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ یہ لوگوں کی انفرادی زندگی کا دائرہ ہے۔ کوئی مسجد میں جائے، کوئی مندر میں جائے، کوئی گوردوارے میں جائے، کوئی گرجے میں جائے، کوئی سینی گاگ[ؒ] جائے یا کوئی آتش کدے میں جائے، کسی کو کوئی اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی اپنے مُردے کو دفن کرے، کوئی جلائے، کوئی گدھوں اور چیلوں کے حوالے کرے۔ کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ کوئی شادی کے لئے نکاح کا طریقہ اختیار کرے، کوئی پھیرے ڈلوالے، کسی کو اعتراض کی حاجت نہیں ہے۔ اپنے مذہبی تہواروں کو جو جس طرح چاہے، منائے، کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ تقسیم میراث کا جس مذہب میں جو دستور ہو اس کے مطابق متوفی کا ترکہ تقسیم کرے اُسے کامل اختیار ہے۔ یہ سارے معاملات ذاتی، نجی اور خالص انفرادی ہیں۔ کوئی کرے یا نہ کرے، نظامِ حکومت کو اس سے قطعی کوئی غرض نہیں۔ وہ ان سے بالکل لاتعلق رہے گا۔ البتہ وہ کسی بھی الہامی دین کو اجتماعیات کے دائرے میں مداخلت کی نہ اجازت دیتا ہے اور نہ اسے گوارا کرتا ہے۔ لہذا سیکولرزم میں لا مذہبیت نہیں ہے بلکہ لادینیت ہے۔ سیکولرزم کے نقطۂ نظر سے اجتماعی زندگی کے تین بڑے بڑے گوشے ہیں۔ ان کے تابع بہت سے معاملات آجاتے ہیں۔ وہ تین

ؒ یہودیوں کی عبادت گاہ

بڑے گوشے یہ ہیں۔ معاشرتی، معاشی اور سیاسی۔ ان کو موجودہ فلسفۂ عمرانیات کی رُو سے علیحدہ ہونا چاہئے۔ ان کا تعلق کسی دین، مذہب اور عقیدے سے نہیں ہے ان گوشوں میں ان کا عمل دخل قطعی گوارا نہیں ہے اور اسی کا نام سیکولرزم یعنی لادینیت

اس وضاحت کے بعد پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کام پہلے گوشے یعنی مذہبی میدان میں کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی عقیدے کی تبلیغ کر رہا ہے۔ کوئی مشرکانہ اوہام و رسوم اور مبتدعانہ افعال کی مذمت کر رہا ہے اور ان کی اصلاح کے لئے کوشاں ہے، کوئی عبادات کی تلقین کر رہا ہے کہ نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج کی ادائیگی کا اہتمام کرو، اس میں سستی اور بے عملی کیوں ہے، کوئی حسنِ اخلاق و معاملات کی صحت کے لئے نصیحت کر رہا ہے۔ اسی طریقے سے کوئی سماجی برائیوں کی اصلاحی کوششوں میں مصروف ہے کہ شادی بیاہ کی رسوم میں جو اسراف و تبذیر اور خلافِ دین چیزیں داخل کر لی گئی ہیں، ان کو ترک کرو، سالگرہ اور برسیاں منانے کا دین میں کوئی تصور نہیں ملتا۔ ان بدعات کو چھوڑو ——— ان تمام کاموں کو مذہبی دعوت و تبلیغ کا عمل کہا جائے گا۔ یہ مذہبی اور سماجی اصلاحی کوششیں ہیں اور ان کاموں کے لئے جماعتیں، جمعیتیں اور تحریکیں موجود ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ انقلاب کا تعلق اُن تین گوشوں سے ہے جو سیکولر میدان کے اندر واقع ہیں۔ معاشرے کی بنیادی ہیئت (STRUCTURE) میں کوئی تبدیلی لائی جائے تو یہ انقلابی عمل ہے، معیشت کے ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی لائی جائے تو یہ انقلاب ہے۔ سیاست کے ڈھانچے اور ریاست کی نوعیت میں کوئی بنیادی تبدیلی لائی جائے تو یہ انقلاب ہے۔ اب اسلام چونکہ ایک جامع دین ہے۔ اور اس میں عقیدہ، عبادات اور رسومات کے ساتھ ساتھ معاشرت معیشت اور سیاست بھی شامل ہیں گویا اسلام انسان کے انفرادی معاملات کے ساتھ ساتھ اجتماعی سطح کے معاملات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں ہے جن معنوں میں دنیا کے دوسرے مذاہب ہیں کہ وہاں عقیدہ (DOGMA)، عبادات (RITUALS) اور رسومات (SOCIAL CUSTOMS) ان تینوں کے مجموعے سے جدید فلسفے کا تصورِ مذہب مکمل ہو جاتا ہے اور جو سب کے

سب انفرادی اور نجی دائرے کے معاملات ہیں۔ اسی طرح معاشرت، اقتصادیات اور سیاسیات، ان تینوں کا مجموعہ یہ دراصل لادینیت کا میدان ہے اور جو خالصتہً انسانی اجتماعیات سے متعلق ہے۔ یہی جدید فکر اس وقت پورے کرۂ ارض پر مسلط اور غالب ہے، حتیٰ کہ مسلم ممالک بھی اصلاً اسی فکر و نظریے کی پوری گرفت میں ہیں۔

اسلام زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام گوشوں پر حاوی ہو کر اُنکی صلاح و فلاح چاہتا ہے۔ وہ ایمان بھی دینا چاہتا ہے جس کا تعلق عقیدے سے ہے۔ اس کا اپنا عبادات کا ایک نظام بھی ہے اور سماجی رسوم کے لئے بھی اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنا علیحدہ معاشرتی اور سماجی اور معاشی نظام بھی رکھتا ہے اور اپنا سیاسی نظریہ اور سیاسی نظام بھی رکھتا ہے۔ لہذا اسلام کا تعلق مذہبی اصلاحی کام سے بھی ہے اور انقلابی کام سے بھی ہے۔ غرض پوری انسانی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اسلام بحیثیت دین (یعنی نظامِ حیات) اُسے اپنے حیطۂ اختیار میں رکھتا ہے، اس کی گرفت سے انسانی زندگی کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ آزاد نہیں رہتا۔ یہی مفہوم و مقصود ہے اظہار دین الحق علی الدین کُلّہٖ کا۔ اللہ کے دین سے زندگی کا کوئی دائرہ باہر نہیں رہ سکتا۔

انقلاب کے نقطۂ نظر سے اگر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ دنیا کے دو انقلابات ایسے ہیں، جن پر لفظِ انقلاب کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اُن میں سے ایک انقلابِ فرانس ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی زندگی کا ایک اہم پہلو اور گوشہ یعنی سیاسی ڈھانچہ بدل گیا۔ بادشاہت ختم ہوئی اور جمہوریت کا دَور آگیا۔ چونکہ سیاسی ڈھانچے میں بڑی بنیادی تبدیلی واقع ہوئی لہذا اس کے لئے انقلاب کے لفظ کا استعمال درست ہے۔ اسی طریقے سے روس کا انقلاب بھی یقیناً انقلاب ہے۔ اس کے نتیجے میں بنیادی معاشی ڈھانچہ بدل گیا۔ انفرادی ملکیت کی پہلے تو نفیٔ مطلق تھی اس کے بعد معتدل ہوتے ہیں تو اس مقام پر آتے ہیں کہ انفرادی ملکیت صرف عام استعمال (ARTICLES OF USE) کی اشیاء کی حد تک تو ممکن ہے۔ مثلاً ایک مکان ہے جس میں کوئی شخص رہتا ہے تو وہ اُس کی ذاتی ملکیت ہو سکتی

ہے - وہ جو کپڑے پہنتا ہے وہ اُس کی ذاتی ملکیت ہو سکتے ہیں - ذاتی ضرورت کے لئے اُس کے پاس سائیکل یا موٹر سائیکل یا موٹر گاڑی ہے تو وہ اسکی ملکیت ہے - گھریلو استعمال کا فرنیچر اور برتن اُس کی ملکیت ہیں[1] - لیکن جو ذرائع پیداوار (MEANS OF PRODUCTION) ہیں، وہ کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتے - وہ اجتماعی اور قومی ملکیت ہیں - ان کا انتظام و انصرام اجتماعی سطح پر حکومت کرے گی - ان ذرائع سے جو پیداوار ہوگی اُسے معاشرے کی بہبود اور ملکی استحکام پر خرچ کرنے کی کوشش کی جائے گی — یہ بھی معیشت کا میدان ہے اور اس میں جب بڑی بنیادی تبدیلی عمل میں آئی تو یہ بھی انقلاب ہے -

لیکن میرے نزدیک تاریخِ انسانی میں کامل ترین بلکہ اکمل ترین انقلاب صرف ایک ہے اور وہ ہے انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام - اس لئے کہ ہم اس انقلاب میں دیکھتے ہیں کہ عقائد، اخلاق، عبادات، رسوم و رواجات، معاشرت، معیشت اور سیاست غرض سب کا انداز بدل گیا - یہ ایک ہمہ گیر تبدیلی اور مکمل انقلاب (TOTAL REVOLUTION) تھا اس قدر ہمہ گیر اور کامل انقلاب انسانی تاریخ میں کبھی نہیں آیا -

صنعتی انقلاب اور ثقافتی انقلاب

دو انقلابات اور ہیں جن کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں — وہ اصلاً انقلاب نہیں لیکن تبعاً انقلاب قرار دیئے جا سکتے ہیں ان میں سے پہلا وہ ہے جسے صنعتی انقلاب (INDUSTRIAL REVOLUTION) کہا جاتا ہے - اگرچہ فی الواقع وہ انقلاب نہیں تھا، وہ کوئی ڈھانچہ بدلنے کی کوشش نہیں تھی کوئی نئی آئیڈیالوجی اس کی پشت پر نہیں تھی — بلکہ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ مشین کی ایجاد نے پورے معاشرے کو اس طور سے متاثر کیا کہ پورے معاشرے کے اندر ایک زبردست تبدیلی رونما ہوگئی

---

[1] استعمال کی ان اشیاء پر قانونِ وراثت لاگو نہیں ہوتا - آدمی کے مرجانے کے بعد یہ سب چیزیں ریاست کی ملکیت ہونگی اور حکومت اپنی صوابدید سے ان اشیاء کا معاملہ طے کرے گی - (مرتب)

اسی کو صنعتی انقلاب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مشین کی ایجادات نئے مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ پہلے لوگ دیہاتوں میں رہتے تھے۔ شہروں کی تعداد کم تھی لیکن اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے شہروں کے حجم میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور مزید نئے شہر آباد ہونے سے نئے نئے مسائل سے سابقہ پیش آنے لگا — اس انقلاب سے قبل سرمایہ اور محنت کے درمیان کوئی بڑی اور قابلِ اعتناء الجھن نہیں تھی۔ لوگ بارٹر سسٹم کے تحت ایک دوسرے سے اشیاءِ ضرورت کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ مشین کی ایجاد سے بے شمار اقتصادی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ کارخانے کا مالک تو ایک شخص یا چند اشخاص ہوتے ہیں۔ ہزاروں افراد اُس میں کام کرتے ہیں۔ گویا پیداوار (PRODUCTION) میں ہزاروں افراد کی محنت شامل ہے۔ لیکن مالکان اُن کو معمولی سی اُجرت دے کر ٹرخا دیتے ہیں۔ اور اصل منافع سرمایہ دار یعنی کارخانے کا مالک، سمیٹ لیتا ہے۔ اس طرح سرمایہ اور محنت کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں وہ انقلاب آیا جسے بالشویک یا اشتراکی انقلاب کہا جاتا ہے — لہٰذا یہ صنعتی انقلاب خود تو انقلاب نہیں تھا لیکن انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

———— دوسرا انقلاب ثقافتی (CULTURAL) انقلاب ہے جو چین میں آیا۔ یہ بھی ایک نوع کا انقلاب ہے لیکن میں ان دونوں انقلابات (یعنی صنعتی انقلاب اور چین کا ثقافتی انقلاب) کو تبعاً انقلاب کا درجہ دیتا ہوں — مختصراً یہ کہ فی الواقع حقیقی اور کامل انقلاب تو وہی تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا اور ایسے مکمل انقلاب کی تاریخ انسانی میں کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کا تعلق ہے تو انہیں ہم جزوی انقلابات میں شمار کر سکتے ہیں۔

"کُو" (COUP) کا مفہوم

اس ضمن میں دوسرا لفظ جو مستعمل ہے وہ ہے "کُو" (COUP) ۔ اس لفظ کا اجمالی مفہوم آغازِ گفتگو میں بیان ہو چکا ہے — اسے واضح طور پر سمجھ لیجئے

یہ لفظ دراصل فرانسیسی لفظ ' COUP DE TAT ' سے بنا ہے اس کا تلفظ ہے ' KOODETAH ' ۔ معنی یہ ہیں کہ کسی ہنگامی، فوری اور مؤثر لیکن غیر آئینی اقدام

کے ذریعے حکومت پر قبضہ کر لینا — ضمنی طور پر یہ بات سمجھ لیجئے کہ آج جدید پولیٹیکل سائنس نے یہ تصور دیا ہے کہ ریاست (STATE) اور حکومت (GOVERNMENT) دو مختلف چیزیں ہیں - شہریوں کی وفاداری اصلاً ریاست کے ساتھ ہوتی ہے حکومت کے ساتھ نہیں ہوتی - اور آج کے دور میں عوام کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل سکتے ہیں — مثال کے طور پر امریکہ ایک ریاست ہے (گو وہ خود بہت سی ریاستوں (STATES) کا مجموعہ ہے) - وہاں مسٹر ریگن کی حکومت قائم ہے - لیکن امریکہ کے رائے دہندگان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسری پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دے کر ریگن کو اقتدار سے ہٹا دیں اور ریاست کا نظم و نسق کسی اور کے ہاتھ میں دے دیں - گویا ریاست یا نظامِ ریاست برقرار رہتا ہے، اسے چلانے والے ہاتھ بدلتے رہتے ہیں - تو ریاست اور حکومت کے اس بنیادی فرق کو ملحوظ رکھئے ! —

تو "کُو" (COUP) یہ ہوتا ہے کہ کوئی منظم ادارہ[1] کسی وقت موقع پا کر اقدام کر کے حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے - یہ صرف موقع کی بات ہوتی ہے - اس منظم ادارے نے نہ تو اس سے قبل پبلک کے سامنے کوئی اپنا پروگرام رکھا ہوتا ہے نہ انہوں نے میدان میں اُتر کر اس کام کے لئے کوئی محنت کی ہوتی ہے - اور نہ ہی اس کے لئے کوئی نئی پارٹی (FLOAT) (ترتیب) کی جاتی ہے — یعنی انقلاب کے جو بھی لوازم (PRE - REQUISTES) ہوتے ہیں وہ یہاں نہیں پائے جاتے — مختصراً یہ کہ کسی ملک میں فوج کسی موقع پر حکومت پر قابض ہو جائے تو اسے COUP (کُو) کہا جاتا ہے - لیکن اُردو میں چونکہ اس لفظ (یعنی COUP) کا کوئی مترادف موجود نہیں ہے لہٰذا ایسی صورتِ حال کے لئے "فوجی انقلاب" کی اصطلاح اختیار کی جاتی ہے - حالانکہ "انقلاب" کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا — انقلاب اور "کُو" (COUP) کا یہ فرق واضح رہنا چاہیئے کیونکہ آگے گفتگو انہی اصطلاحات کے حوالے سے ہوگی -

---

[1] یہ واضح رہے کہ کسی ملک میں فوج سے زیادہ منظم ادارہ اور کوئی نہیں ہو سکتا - البتہ ممکن ہے کہ فوج کے علاوہ کوئی دوسرا منظم ادارہ بھی کسی ملک میں موجود ہو -

موضوع زیرِ بحث کی اہمیت

ابھی تک تمام تر گفتگو تمہیدی نوعیت کی تھی کہ جو الفاظ ہم اس سلسلے میں استعمال کرتے ہیں ان کے اصل معانی و مفاہیم کیا ہیں - اب میں اصل موضوع کی طرف آ رہا ہوں۔

——— "اسلامی انقلاب" کی ترکیب ہمارے یہاں پہلے سے مستعمل تھی لیکن ایران کے حالیہ انقلاب کے حوالے سے یہ لفظ اب ایک اصطلاح کے طور پر پوری دُنیا میں معروف ہو گیا ہے - اور دُنیا نے ایرانی انقلاب کے معاملے کو اسلامی انقلاب ہی متصوّر کیا ہے اور اس کے حوالے سے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی انقلاب کیا ہوتا ہے ! اس کا نتیجہ جو نکلتا ہے وہ بہت قابلِ توجہ ہے کہ ایران میں جو کچھ بھی ہوا اُس میں اگ کوئی خوبی تھی تو وہ اسلام کے کھاتے میں درج ہوئی اور اگر کوئی خرابی یا نقص تھا ت اُس کا اندراج بھی اسلام ہی کے کھاتے میں ہوا اس لئے کہ پروپیگنڈا یہی ہے کہ ایرا کا انقلاب "خالص اسلامی انقلاب" ہے ——— اس پہلو سے یہ مسئلہ بہت اہم او نازک ہو جاتا ہے چنانچہ اس بات کا واضح ہونا بہت ضروری ہے کہ کیا فی الواقع ا کے انقلاب کو ایک "اسلامی انقلاب" قرار دیا جا سکتا ہے! یہ سمجھ لیجئے کہ یہ میرا یا ک اور شخص کا ذاتی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اُن تمام لوگوں کا مشترکہ مسئلہ ہے جن کا دین ساتھ کوئی عملی تعلق ہے - خاص طور پر وہ لوگ جو دین کے معاملے میں فعّال ہو غلبۂ دین کے لئے کچھ کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اُن کے ذہن اس مسئ بالکل واضح ہونے چاہئیں -

اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ کیا فی الواقع ایران کا انقلاب ایک اسلامی ان ہے ! ہمیں مثبت طور پر یہ سمجھنا ہوگا کہ اسلامی انقلاب کسے کہتے ہیں اور حضور صلی علیہ وسلم نے جو تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا تھا اس کے مدارج کون سے تھے ! اس طرح ہماری گفتگو کئی گوشوں میں منقسم ہو جاتی ہے - تاہم کے اجتماعِ جمعہ میں اعلان کے مطابق میں ایران کے انقلاب کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں -

ہمارے ایرانی بھائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ جو تبدیلی وہ ایران میں لاتے ہو ایک "خالص اسلامی انقلاب" ہے - اس جملے پر غور کیجئے - اسی کا منطقی نتیجہ یہ -

لوگ پاکستان میں انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ ایرانی انقلاب کے طریق کار اور اس کے انقلابی عمل کو اختیار کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے ہیں — اس دعوے کے دو حصے ہیں اور ہمیں اسے دو مراحل میں سمجھنا ہے اور اس کا تجزیہ کرنا ہے اولاً یہ کہ وہاں جو تبدیلی آئی ہے وہ واقعتہً "اسلامی" ہے یا نہیں! ثانیاً یہ کہ آیا وہاں جو تبدیلی آئی ہے اس پر فی الواقع لفظ انقلاب کا اطلاق ہوتا بھی ہے یا نہیں! سر دست میں صرف اس کے مؤخر الذکر حصے پر گفتگو کروں گا — باقی یہ کہ آیا یہ تبدیلی حقیقتہً "اسلامی" ہے یا نہیں اس پر گفتگو ان شاء اللہ آئندہ ہوگی۔

ایرانی انقلاب کی حقیقت

میرا تجزیہ جس کو میں ایک جملے میں بیان کرتا ہوں یہ ہے کہ ایران کی تبدیلی REVOLUTION (انقلاب) کی نوعیت کی نہیں ہے بلکہ اس کی اصل نوعیت UP (رکو) کی ہے"۔ میرا یہ دعویٰ اس بنیاد پر ہے کہ اس میں انقلاب کے ناگزیر لوازم (PRE REQUISITE) موجود نہیں ہیں — اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انقلاب کے دو ناگزیر لوازم ہیں — اس بات کو میں خوب کھول کر بیان کروں گا تاہم پایۂ ثبوت تک یہ بات اسوقت پہنچے گی جب میں اس کا تقابل انقلاب محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے کروں گا۔

انقلاب کا پہلا لازمہ یہ ہے کہ اس میں نیا نظریہ (NEW IDEOLOGY) سامنے آئے یا کسی قدیم آئیڈیالوجی کی عہد حاضر کے مطابق نئی تعبیر (RE-INTERPERTION) کی گئی ہو — اور پھر یہ کہ وہ فی الواقع انقلابی نظریہ (REVOLUTIONARY IDEOLOGY) ہو — یہاں اعتراض ہو سکتا تھا کہ اگر نئی آئیڈیالوجی کے بغیر انقلاب نہیں آسکتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔ اسی کے لئے میں نے یہ دوسری شکل بیان کی کہ اگر آئیڈیالوجی قدیم ہو تو لازم ہے کہ اس کی ایک نئی تعبیر سامنے لائی جائے۔ ورنہ اس کے بغیر انقلاب کے کیا معنی! نیا تفکر، نیا فلسفہ، نیا نقطۂ نظر نہیں تو انقلاب کیسا! ——— اسلامی انقلاب میں کیا ہوگا؟ یہاں آئیڈیالوجی وہ ہے جسے ہم 'ایمان' کہتے ہیں۔ وہ نظریات وعقائد جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہم تک پہنچے اُن کی تصدیق کا نام ایمان ہے۔ یہ تصدیق

باآ بہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم" اہر اسں بات کی تصدیق
حضور لے کر آئے) ۔ معاملہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقائق کائنات کے
یں جو تصورات دیئے تھے ہمارے ہاں ایمانیات اور عقائد کی شکل میں کتابوں میں
ں ہوگئے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسی تدوین کی بنیاد پر، جو آج سے چودہ سو سال
گئی تھی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے ؟ میرے نزدیک اس میں نئی تعبیر
ورت ہے ۔ یہ نئی تعبیر کس اعتبار سے ہوگی اسے ذرا تفصیل سے سمجھنا ہوگا ــــــ
ں آئیڈیالوجی یعنی ایمان کی نئی تعبیر کی ضرورت فی الواقع روحانیات یا اخلاقیات
ران میں نہیں ہے اس لئے کہ ان معاملات میں نئی تعبیر تو دراصل دین کی اساسات
فرات کے مترادف ہے ۔ نئی تعبیر کی ضرورت کا تعلق حقائق کائنات کی مادی
ے ہے ۔ اس لئے کہ انسان کا مادی علم اُس دور سے آج تک مسلسل ترقی کر رہا
مادی علوم کا دائرہ کہاں تک پھیل گیا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ کہاں
، زمین سے چند فٹ کی چھلانگ لگا سکتا تھا اور کہاں اب یہ صورت کہ وہ چاند
پنے قدموں سے پامال کر چکا ہے اور مریخ پر چھلانگ لگانے کی سوچ رہا ہے ــ مادی
، میں جو یہ تبدیلی آئی ہے اس نے ذہنوں میں بہت سے سوالات اور اشکالات کو جنم دیا
۔ اسی طرح بہت سے نئے مسائل پیدا ہو چکے ہیں جو اس وقت نہیں تھے ایک کی
، تو میں دے چکا ہوں کہ مشین کی ایجاد نے کتنے نئے اور گوناگوں مسائل پیدا کر دیئے
۔ مختصراً یہ کہ اب اسلام کی ایک ایسی تعبیر کرنی ہوگی جو اپنی اصل (جڑ) سے تو
رہے ۔ اور معاملہ وہی ہو کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ"۔
: اُسکی جڑ زمین میں قائم ہے اور شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں" سورۂ ابراہیم)
لیکن جب وہ پھیلے تو ان تمام مادی علوم کو اپنے دائرے میں لے لے ۔ یہ ہوگی
ی آئیڈیالوجی کی تعبیرِ نو ۔ اور یہ اس دور میں اسلامی انقلاب کا پہلا ناگزیر لازمہ ہے۔
میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آخر کیا وجہ تھی کہ علامہ اقبال
نے لیکچرز کا عنوان ' RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT
IN ISLAM ' رکھا تھا ! آپ نے کبھی غور کیا اس عنوان کے رکھنے کی وجہ کیا
۔ لوگ حیران ہونگے کہ یہ کیا عنوان ہوا کہ "اسلام میں الٰہیات کی تشکیلِ جدید" !

غالباً سیّد نذیر نیازی نے ان خطبات کے ترجمے کے لئے یہی عنوان تجویز کیا تھا ÷ اصل
میں بات تو وہی ہے۔ توحید تو وہی ہے اس کی شاخیں بڑھتی جاتی ہیں، ع "یہ سب
کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں ہیں"۔ جیسے جیسے انسان کے مادّی علوم کا دائرہ وسیع
سے وسیع تر ہو رہا ہے، نت نئے حالات و مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان سب کا احاطہ
کرتے ہوئے ہمیں اپنے بنیادی عقیدے یعنی توحید کی وہ تشریح کرنی ہوگی جو آج کے
جدید تعلیم یافتہ ذہن کو مطمئن کر سکے ـــــ اس کے بغیر اسلامی انقلاب کی جانب
پیش قدمی ممکن نہیں ـــــ اس لئے کہ نماز روزے کی تلقین ہو سکتی ہے، اتباعِ
سنّت کی ترغیب دی جا سکتی ہے، بدعات کا ردّ ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ ذاتی اصلاح کے
بے شمار کام ہو سکتے ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی معاشرے کے معاشی اور سیاسی ڈھانچے
میں کوئی تبدیلی اُس وقت تک نہیں لائی جا سکتی جب تک کہ اسلام کے بنیادی عقائد کی
تعبیرِ نو اور تشکیلِ جدید کا کام جدید دور کی علمی سطح پر نہ کیا جائے ـــــ یہ کام علّامہ اقبال نے
شروع کیا تھا۔ اس معاملے میں پیش رفت ہونی چاہیئے تھی لیکن علامہ کے بعد اِس
کوچے میں ہمیں صرف ایک شخصیت نظر آتی ہے جس نے اس سمت میں کچھ پیش قدمی
کی ـــ میرا اشارہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی جانب ہے جن کی کتاب "قرآن اور علم
جدید" کا تذکرہ میں کئی باران مجالس میں کر چکا ہوں ـــ اس کے علاوہ اس میدان
میں تاحال کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو سکا ـــــ اور ایران میں تو یہ کام بالکل نہیں ہوا
ـــــ مَیں نے سُنا تھا کہ ایران میں اس سطح پر ڈاکٹر علی شریعتی نے کچھ کام کیا ہے۔ مجھے
اشتیاق تھا کہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کروں۔ یہاں تو ان کی کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں
البتہ امریکہ میں ان کے کچھ کتابچے میری نظر سے گزرے ـ دیکھا تو مایوسی ہوئی۔ سطحی
باتیں ہیں۔ فکر کی گہرائی کا معاملہ مفقود نظر آیا ـ علامہ اقبال مرحوم کی کتاب جس کا میں
نے ابھی حوالہ دیا ہے، میرے نزدیک اس عظیم کام کے لئے ابتدائی قاعدے (PRIMER)
کی حیثیت رکھتی ہے ـ اگرچہ بہت دقیق کتاب ہے، پڑھتے ہوئے دانتوں پسینہ آ
جاتا ہے لیکن اس کام کے لئے اُسے ایک نقطۂ آغاز (STARTING POINT) ہی کہا جا سکتا
ہے۔ مقصود اس سے حاصل نہیں ہوتا ـــ پھر یہ کہ اس کی بعض باتوں اور نظریات سے ہمیں
اختلاف بھی ہے۔ تاہم اس کے باوجود وہ صحیح رُخ پہ ایک کوشش تھی ـــ لیکن

ایران میں یہ کام بالکل نہیں ہو پایا ۔۔۔ اور میرے نزدیک یہ چیز اسلامی انقلاب کی پہلی ناگزیر شرط ہے ۔

انقلاب کے لئے دوسرا ناگزیر لازمہ (PREREQUISITE) یہ ہے کہ انقلاب درحقیقت کسی ایسے منظم ادارے کے ہاتھوں نہیں آیا کرتا جو پہلے سے موجود ہو ۔ بلکہ انقلاب ہمیشہ کسی نئی انقلابی پارٹی کے ذریعے ، نئی درجہ بندی (CADRE) کے ساتھ اور ایسے لوگوں کے ہاتھ آتا ہے جو اس انقلابی پارٹی (REVOLUTI-ONARY PARTY) میں شریک ہوں اور ذہناً اس کی آئیڈیالوجی کو قبول کر چکے ہوں ۔۔۔۔۔ اب درجہ بندی اس اعتبار سے ہو گی کہ کس نے انقلاب کے لئے کتنا ایثار کیا ! ۔ ایسا نہیں ہو گا کہ جو سید زادہ ہے وہ آگے ہے اور جو شودر ہے وہ رتبے کے اعتبار سے کم تر ہے ۔ یا دولت مند کا رتبہ بلند ہے اور غریب پیچھے ہے ۔ بلکہ اب جو درجہ بندگی ہو گی اس میں یہ پہلو مقدم ہو گا کہ انقلاب کے لئے قربانیاں کس نے زیادہ دی ہیں ! کس نے ۔۔۔ اس کے لئے مشقت جھیلی ہے اور جان و مال کے نقصان کی پرواہ کئے بغیر ہمہ تن انقلاب کے لئے جدوجہد کی ہے ۔۔۔ انقلاب کی تکمیل اسی وقت ہو گی ۔ جب ایک نیا ڈھانچہ (STRUCTURE) نئی درجہ بندی (CADRES) کے ساتھ وجود میں آئے ۔۔۔ اگر کوئی پہلے سے موجود (PRE-EXISTING) ادارہ اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے تو یہ درحقیقت COUP (تختہ الٹنا) ہے ۔ اسے انقلاب کہنا درست نہ ہو گا ۔

اس نئی درجہ بندی کے معاملے کو ایک مثال سے سمجھئے ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے ۔ دربار خلافت لگا ہوا تھا بلکہ صحیح تر الفاظ میں مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا ۔ صحابہ کرامؓ تشریف لاتے تھے ۔ حضرت عمر فاروقؓ کا یہ دستور تھا کہ وہ کبار صحابہ کو ، خاص طور پر سابقون الاوّلون کو ، کہ جنہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی تھی اور دین کے لئے تن من دھن نچھاور کر دیا تھا ، اپنے قریب جگہ دیا کرتے تھے ۔۔۔ اسی دوران حضرت سہیل بن عمرؓو تشریف لاتے ہیں ۔۔۔ یہ کون ہیں ؟ قریش کے اونچے لوگوں میں سے ہیں ۔ فتح مکہ تک مشرکین میں سے تھے لیکن پھر ایمان لے آئے ۔ یہ وہی ہیں جو صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کی طرف سے سفیر اور بااختیار نمائندے کی

حیثیت سے آئے تھے اور صلح کی شرائط طے کرائی تھیں ۔ اگر ان کی ذہانت و فراست کا اندازہ کرنا ہو تو صلح حدیبیہ کی تفصیلات پڑھ لیجئے کہ صلح نامہ مرتب کرتے ہوئے انہوں نے کتنی باریک بینی سے کام لیا تھا ـــــ تو یہ سہیل بن عمرؓ تشریف لاتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے بالکل ساتھ بیٹھ جاتے ہیں ۔ اتنے میں ایک صحابیؓ آجاتے ہیں جو زمانی لحاظ سے ایمان لاتے ہیں حضرت سہیلؓ سے مقدم ہیں ۔ حضرت عمرؓ حضرت سہیلؓ سے کہتے ہیں کہ آپ ذرا ہٹ جائیے اور آنے والے صحابی کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں ۔ اتنے میں کوئی اور صحابی آجاتے ہیں ۔ ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ یہ سابقون الاولون میں سے ہیں ۔ حضرت عمرؓ انہیں بھی اپنے قریب جگہ دیتے ہیں اور جناب سہیلؓ کو مزید پیچھے کھسکنا پڑتا ہے ۔ یہ عمل کئی بار دہرایا جاتا ہے اور بالآخر حضرت سہیلؓ جوتیوں تک پہنچ جاتے ہیں ۔ اس پر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے ، احتجاجاً کہتے ہیں ۔

"کیا آپ کی مجلس میں ہمارا یہ مقام رہ گیا ہے کہ ہم جوتیوں تک پہنچا دیئے جائیں "۔ جواباً حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے اسلام میں پیچھے رہ کر اپنا مقام گنوا دیا ہے ۔ یہاں اُن کا مقام مقدم ہے جو اسلام میں پہلے داخل ہوئے تھے پھر سرحدوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ وہاں جاؤ جہاں جہاد و قتال ہو رہا ہے ۔ وہاں جا کر سرفروشی جانفشانی کا مظاہرہ کرو تو تمہارا بھی کوئی مقام معین ہو جائے گا ـــــ گویا اب وہ پُرانے اعزازات کام نہیں دیں گے ۔ یہاں تو اب معاملہ یہ ہے کہ اگر کسی غلام (مثلاً حضرتِ بلالؓ) نے بھی ایمان لانے میں سبقت کی ہے اور دین کیلئے قربانیاں دی ہیں تو اُس کا مقام و مرتبہ اُس قریشی سردار سے بہت بلند و ارفع ہے جس نے کہیں بعد میں جا کر (یعنی فتح مکہ کے نزدیک) اسلام قبول کیا ہے ۔ سورہ حدید میں فرمایا: لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا

تم میں سے کوئی شخص ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتا جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور (اللہ کی راہ میں) قتال ، یہ لوگ درجہ کے اعتبار سے ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے (فتح مکہ) کے بعد اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور قتال کیا ۔

یہ ہے ایک انقلابی جماعت کی شان کہ اس میں نئی درجہ بندی ہوتی ہے۔ نئے CADRES ہوتے ہیں۔ اور اسکی بنیاد صرف ایک ہوتی ہے کہ کون ہے جس نے اس انقلاب کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دی ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ

"اور مہاجرین و انصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔"

یہ دو چیزیں کسی بھی انقلاب کے ناگزیر لوازم (PRE REQUISITES) ہیں یہ اگر نہیں ہوں گے تو جو نتیجہ برپا ہوگا، اُسے آپ انقلاب نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ COUP کے قبیل کی ایک شئے ہوگی۔ اور یہ دونوں چیزیں ایرانی انقلاب میں موجود نہیں ہیں۔

ایرانی انقلاب اور پاکستان کی تحریک نظام مصطفےٰ: ایک تقابل

اب میں آپ کے سامنے اپنا ایک تجزیہ رکھ دیتا ہوں۔ یہاں ہمارے ہاں بھی ایک تحریک "تحریک نظامِ مصطفےٰ" کے نام سے چلی تھی۔ اور ایران میں بھی ایک تحریک چلی تھی۔ جو اس تبدیلی پر منتج ہوئی جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں ـــ عجیب بات یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان دونوں تحریکوں میں نہایت گہری مشابہت اور لبے انتہا مماثلت ہے بلکہ ان میں زمانی قرب بھی ہے۔ یعنی دونوں ایک ہی دور میں شروع ہوئی تھیں دونوں 'CONTEMPORARY MOVEMENTS' ہیں ـــ غور کیجئے دونوں جگہ ان تحریکوں کا اصل مقصود کیا تھا!! سادہ جواب ہوگا کہ وہ مقصود تھا ایک ناپسندیدہ حکمران سے نجات حاصل کرنا ـــ اب کسی کے نزدیک وہ ناپسندیدہ ہو سکتا ہے مذہبی اعتبار سے، کسی کے نزدیک آمرانہ رویّے اور جمہوریت کُشی کی وجہ سے ممکن ہے کچھ لوگ کسی مخصوص نظریّے کے باعث اور کچھ اُسے ذاتی کردار کی وجہ سے ناپسند کرتے ہوں۔ میں نے بہت ہی محتاط اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ اصل مقصود

تھا ایک ناپسندیدہ حکمران سے چھٹکارا حاصل کرنا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں تحریکوں میں یہ مقصد مشترک نظر آتا ہے۔ یہاں یہ تحریک بھٹو کے ردّ (Anti-Bhutto) میں تھی اور وہاں شاہ کے ردّ (Anti-Shah) میں تھی۔ ان دونوں میں بنیادی طور پر مذہب کا عمل دخل نہیں تھا ـــ یہی وجہ ہے کہ یہاں اس کا نام تھا "پاکستان متحدہ محاذ" ـــ وہاں کی تحریک کا ابتدا میں کیا نام تھا اس کا مجھے علم نہیں۔ بہرحال اس کا معاملہ ہمارے یہاں کی تحریک سے بہت مشابہ تھا۔

ثبوت اس دعوے کا یہ ہے کہ مختلف طرزِ فکر (SHADES OF OPINION) کے لوگ یہاں جمع تھے اور یہی صورت حال ایران میں بھی تھی۔ ایک ہی پلیٹ فارم پہ دائیں بازو والے (RIGHTIST) اور بائیں بازو والے (LEFTIST) جمع تھے۔ کیا یہ دونوں کسی مثبت کام خاص طور پہ دینی و مذہبی کام پر جمع ہو سکتے ہیں! دونوں کے نظریات جدا، قبلے جدا، نظام جدا، فکر جدا، فلسفہ جدا ـــ دونوں میں بُعد المشرقین ہے ـــ پھر دائیں بازو (RIGHTIST) میں بھی دو طرح کے لوگ تھے۔ سیکولر ذہن کے لوگ بھی شامل تھے اور مذہبی فکر رکھنے والے بھی ـــ پھر مذہبی فکر رکھنے والوں میں مزید تقسیم ہے۔ ہمارے یہاں ایک لبرل اسلام ہے یعنی مسلمان تو ہیں۔ لیکن نماز روزہ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے ـــ نہ ہی ستر و حجاب اور دیگر معاشرتی احکام اور حدود و قیود اس طبقے کے لوگوں کو گوارا ہیں ـــ دوسرا راسخ العقیدہ (ORTHODOX) اسلام ہے جس میں واقعتاً اسلام کی مقرر کردہ عبادات سے، اس کے ظواہر سے، اس کے شعائر سے، اس کے احکام و حدود و قیود اور اوامر و نواہی سے پورا شغف پایا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ اسلام کو بحیثیت دین، یعنی نظام زندگی نافذ العمل دیکھنا چاہتے ہیں ـــ اس طرح کُل چھ طرزِ عمل (SHADES) بن جاتے ہیں۔ اور یہ چھ کے چھ یہاں بھی جمع ہو گئے تھے اور وہاں بھی یہ سب جمع تھے ـــ وہاں تو خالص کیمونسٹ پارٹی بھی شریک تھی۔ ہمارے یہاں تو اس نام سے کوئی پارٹی نہیں ہے۔ گو اس کا فکر پھیلتا رہتا ہے اور درحقیقت جنہیں بایاں بازو (LEFTIST) کہا جاتا ہے وہ عموماً اسی نقطۂ نظر کے حامل لوگ ہیں۔ لیکن کیمونسٹ پارٹی کے نام سے کوئی پارٹی ہمارے یہاں موجود نہیں ہے لیکن تودہ پارٹی تو علی الاعلان کیمونسٹ پارٹی رہی ہے۔ اس نے اس

بات کو کبھی چھپا کر نہیں رکھا، وہ بھی وہاں کی تحریک میں شریک تھی۔ تو معلوم ہوا کہ شروع میں یہ دونوں تحریکیں خالص سیاسی تحریکیں تھیں اور ایک ناپسندیدہ حکمران سے نجات پانا ان تحریکوں کا اصل ہدف تھا۔ یہ بات سب کے ذہن میں تھی کہ جو نظام قائم کرنا ہوگا اس کے متعلق بعد میں طے کرلیں گے پہلے اس بڑی رکاوٹ (HUR-DLE) کو راستہ سے ہٹالیں۔

آپ کو ان تحریکوں میں یہ عجیب بات قدرِ مشترک کے طور پر نظر آئے گی کہ مسلمان ممالک میں اس قسم کی جو تحریکیں اٹھتی ہیں وہ جب اس مرحلے پر پہنچ جاتی ہیں کہ جہاں قربانیاں دینے کی ضرورت پیش آتی ہے تو ہمیشہ مذہب کے نام کا سہارا لیا جاتا ہے اور اسے بطور نعرہ استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا "بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر!"۔ اس لئے کہ لوگ جان پر کھیلنے کے لئے صرف اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام ہی پر تیار ہوتے ہیں۔ کسی اور نام پر کم سے کم مسلمان سینے پہ گولی کھانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک کے موقع پر میں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو گریبان کھول کھول کر سینے پر مردانہ وار گولیاں کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اس وقت میڈیکل کالج کا طالب علم تھا کالج کا جو دروازہ اس وقت گوالمنڈی کی طرف کھلتا تھا اسکی سلاخوں کے ساتھ کھڑے ہم دیکھ رہے تھے کہ جلوس بانسہ والا بازار سے آیا، ایک مقام پر پولیس نے پوزیشن لی اور فائرنگ شروع کی ـــ کچھ لوگ گرے لیکن پیچھے والوں نے پسپائی اختیار نہیں کی بلکہ وہ آگے آئے اور انہوں نے گریبان کھول کر نعرے لگائے "مارو گولی ناموس نبوت پر جان حاضر ہے"ـــ پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور بہت سے لوگ ڈھیر ہوگئے یہ واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ـــ اور اسی دن ہمیں اپریشن تھیٹر میں معلوم ہوا کہ ان میں دو سگے بھائی تھے، ایک پہلے پرسٹ میں اور دوسرا دوسرے برسٹ میں گرا۔ تو یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کا جوش و جذبہ فی الواقع دین و مذہب کے نام پر ہی اس شدت کو پہنچتا ہے کہ وہ ہر قسم کے ستم کے پہاڑ جھیلنے بلکہ ہدیۂ جان تک پیش کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کانپور کی مسجد اور مسجد شہید گنج لاہور کے لئے لوگوں نے خون دیا ہے، گولیاں کھائی ہیں۔ چاہے خود نماز کے پابند نہ ہوں۔ مسجد یک شب، کے واقعے پر اقبال نے کہا تھا ے

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا!

یہ ہے اصل حقیقت کہ یہاں بھی ۱۹۷۷ء میں انتخابی دھاندلیوں کے بعد ایک زور دار اور زبردست عوامی تحریک چلانے کے لئے رُخ بدلا گیا اور تحریک کا عنوان تبدیل کر دیا گیا — کہاں پاکستان قومی اتحاد (P.N.A.) اور کہاں "تحریک نظامِ مصطفےٰؐ" ! زمین آسمان کا فرق ہے - لیکن اس کے بغیر چارۂ کار نہیں تھا - عوام قید و بند کی سختیاں جھیلنے لاٹھیاں کھانے، حتیٰ کہ گولیاں کھانے کے لئے میدان میں کبھی اس جوش و جذبے سے نہ آتے اگر یہ قدم نہ اٹھایا جاتا — اسی طریقے سے یہاں ایران میں بھی ! ANTI) اینٹی شاہ تحریک کو" اسلامی انقلاب" کا نام دیا گیا - تاکہ عامۃ الناس قربانیاں دینے میں پس و پیش نہ کریں -

یہی وجہ ہے کہ یہاں تحریک کی لیڈر شپ کس کے سپرد کی گئی! ایک عالمِ دین کے! حالانکہ آپ خود سوچئے کہ کیا پیر پگارا صاحب مولانا مفتی محمود مرحوم و مغفور کو اپنا لیڈر مان سکتے تھے! کیا اصغر خان صاحب یا ولی خان صاحب مفتی صاحب کو اپنا لیڈر تسلیم کر سکتے تھے! مؤخر الذکر کی طرف تو بڑے توہین آمیز الفاظ پر مشتمل ایسے جملے بھی منسوب ہیں کہ" یہ ملّاٹے ہماری روٹیاں توڑنے والے کیا ان کو ہم سمجھ لیں گے کہ یہ ہمارے برابر کے لوگ ہیں اور ہمارے لیڈر ہیں" خوانین کو اپنے مقام اور مرتبہ کا ایک پندار ہے اور وہ مولویوں کے اس بلند مرتبے (STATUS) کو دل سے کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتے — پھر جو مذہبی لوگ تھے اُنکے بارے میں کیا آپ کا گمان ہے کہ مولانا نورانی میاں اور ان کے مکتبِ فکر کے لوگ مفتی محمود صاحب کو اپنا لیڈر تسلیم کر سکتے تھے! وہ تو ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے بھی روادار نہیں تھے - رہا چند دوسری نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتوں کا معاملہ! ان میں سے ہر ایک کے اپنے مستقل تصورات و معیارات تھے - وہ بھی دل سے مفتی صاحب مرحوم کو مستقل طور پر اپنا قائد اور رہنما ماننے کے لئے شاید ہی تیار ہوتے! — معلوم ہوا کہ یہ وقتی مصلحتوں کا معاملہ تھا - وقتی ضرورت کے تحت مفتی صاحب مرحوم کو متفقہ لیڈر کا درجہ دے لیا گیا ورنہ فی الواقع وہ ایک علامتی (SYMBOLIC) لیڈر شپ تھی جس کا حقیقت سے

کوئی واسطہ نہ تھا۔

اس کے بالکل برعکس ایران کا معاملہ تھا ہوا۔ وہاں ایک شخصیت علماء میں سے پہلے سے ایسی موجود تھی کہ جس نے شاہ کی حکومت، اس کی پالیسیوں اور اس کے ذاتی کردار پر نہایت جرأت کے ساتھ برملا تنقیدیں کی تھیں۔ جس کی وجہ سے عوام الناس میں یہ اعتماد پیدا ہوتا چلا گیا تھا کہ ایک شخص ایسا ہے کہ جو جرأت کے ساتھ شاہ سے ٹکر لے سکتا ہے۔ شاہ ایران اس شخصیت سے اتنا خائف تھا کہ ان پر ہاتھ ڈالنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے ان کو جلا وطن کر رکھا تھا۔ لیکن انکی شعلہ بیان تقاریر کیسٹوں کے ذریعے پورے ایران میں پھیل چکی تھیں جس کے اثرات اتنے ہمہ گیر ہوئے کہ باوجودیکہ وہ ملک سے باہر تھے لیکن تحریک کی مکمل رہنمائی انکے ہاتھ میں تھی اور باہر ہی سے انکی بروقت ہدایات کا ایک سلسلہ قائم تھا۔ مراد ہے جناب خمینی صاحب کی فعال اور متحرک (DYNAMIC) شخصیت ـــ پھر یہ قیادت اتنی ہر دلعزیز ہوئی کہ نہایت مستحکم طور پر پوری تحریک پر چھا گئی اسکی وضاحت میں آگے چل کر کرونگا کہ کن خاص اسباب کی بنا پر یہ قیادت اتنی مستحکم ہو گئی تھی ـــ بہرحال وہاں لیڈرشپ پوری تحریک پر چھا گئی اور اس نے حقیقی ـــ لیڈرشپ کی صورت اختیار کر لی جبکہ یہاں پاکستان میں صرف علامتی (TOKEN) لیڈرشپ تھی۔ یہی بنیادی فرق دونوں جگہ مختلف شکلوں میں منتج ہوا ـــ یہاں جب معاملہ آگے بڑھا اور بھٹو صاحب کی کرسی واقعتہً ڈولنے لگی تو آرمی نے موقع دیکھا اور وہ COUP کے ذریعہ برسرِ اقتدار آ گئی۔ نتیجتہً تحریک نظامِ مصطفیٰؐ کے قائدین کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ قائدِ فوج نے اقتدار سنبھالنے کے بعد قوم سے خطاب کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ نوّے دن کے اندر اندر نئے انتخاب کرا کے مرکزی اور صوبائی حکومتیں عوام کے نمائندوں کے حوالے کر دی جائیں گی اس طرح تحریک کا جو زور (MO- MENTUM) تھا وہ سرد پڑ گیا۔

ایران میں یہ ہوا کہ تحریک کامیاب ہوئی اور وہاں جو مستحکم مذہبی تنظیم (Religious Hierarchy) تھی، اس کی توضیح میں آگے بیان کروں گا ـــ اُس نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ـــ یہی وجہ ہے کہ یہ تبدیلی نہایت خونی انقلاب کی صورت میں دنیا کے سامنے

آئی — چونکہ وہ انقلاب ایک پارٹی کی قیادت میں نہیں آیا تھا بلکہ وہاں انقلاب لانے میں بہت سی پارٹیوں نے متحدہ طور پر حصہ لیا تھا - لہذا پھر آپس میں جو رسہ کشی ہوئی ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں — مجاہدینِ خلق کے ساتھ جو معاملہ ہوا ہے اور تحریک میں شامل دوسرے قائدین اور اراکین بلکہ خود اپنے قریب ترین ساتھیوں کے ساتھ مختلف نوعیت کے اختلافات کے باعث جو کچھ ہوا ہے اور جس طرح بیگانوں کے ساتھ یگانوں کو بھی سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں موت کی گھاٹ اتار دیا گیا ہے، وہ بہت ہی بدنما اور بدترین داغ ہے --- اور چونکہ یہ داغ اسلامی انقلاب کے حوالے سے اسلام کے صاف وشفاف اور پاکیزہ دامن پر آتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے برملا اعلانِ برأت کرنا ہوگا کہ اس کا کوئی تعلق ساتھ نہیں -

انقلابِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کیا ہوا تھا! جب انقلاب کامیاب ہوا اور نبی اکرمؐ کا فاتحانہ مگر نہایت عجز وانکسار کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخلہ ہوا تو سردارانِ قریش جو آپؐ کے خون کے پیاسے تھے، جنہوں نے ذاتِ اقدس اور آپؐ کے صحابہؓ کو جسمانی اور ذہنی ایذائیں پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اس وقت وہ سب خوف زدہ تھے۔ لرزہ براندام تھے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے! یہ لوگ حرم شریف میں اپنی قسمت کے منتظر تھے کہ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں" اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ " جاؤ تم سب آزاد ہو" — دربارِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے معافی اور امان پانے والے لوگوں میں وحشیؓ بھی شامل تھے (چونکہ ایمان لے آئے تھے اس لئے ان کا نام ادب سے لیا جائے گا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم انسانی عواطف وجذبات سے خالی تو نہیں تھے وحشی جان کے خوف سے چھپ گئے تھے چونکہ ان کے متعلق حکم تھا کہ جہاں بھی پائے جائیں قتل کر دیئے جائیں۔ جب وہ حضورؐ کی مجلس میں آئے تو حضورؐ نے رُخ پھیر لیا - وہ دوسری طرف آگئے، آپؐ نے پھر رُخ پھیر لیا۔ تیسری طرف آئے تو آپؐ نے بیعت قبول فرمالی۔ پھر صحابہ کرامؓ سے فرمایا "جب میں نے دو مرتبہ اعراض کیا تھا تو تم میں سے کسی کو خیال کیوں نہ آیا کہ اس کی گردن مار دیتے چونکہ حضورؐ مکہ میں داخلے سے قبل یہ حکم دے چکے تھے جس کا

میں نے ابھی ذکر کیا۔ بیعتِ اسلام سے پہلے پہلے اگر یہ کام ہو جاتا تو ہو جاتا۔ اب تو ان کو کلمہ کا تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ یہ کون شخص تھا؟ حضرت حمزہؓ کا قاتل اور ان کی لاش کا مثلہ کر کے ان کا جگر نکالنے والا شخص! لیکن جب وہ ایمان لے آتا ہے تو اسے بھی کلمے کا تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔ کسی ایک شخص سے بھی حضورؐ نے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ وحشی تک کو معافی مل گئی تو اوروں کا کیا پوچھنا۔ صرف وقتی طور پر دل میں ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کے باعث حضورؐ نے ان کی بیعت قبول کرنے میں تردد سے کام لیا۔ ان کی بیعت اسلام قبول فرمانے کے بعد بس اتنا فرمایا: کہ میرے سامنے آنے سے گریز کرنا چونکہ تم کو دیکھ کر مجھے حمزہؓ یاد آجائیں گے۔ اس سے زائد کچھ نہیں۔ وہ بھی وہیں رہے۔ ان کو مسلمانوں کے تمام حقوق بھی حاصل ہو گئے ـــــ البتہ وہ فرمانِ نبویؐ کی تعمیل میں حضورؐ کے سامنے آنے سے گریز کرتے رہے۔

ابوسفیانؓ بن حرب جو فتح مکہ سے قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مشرکین مکہ کے لشکروں کی قیادت کرتے رہے غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو جو چرکہ لگا اس وقت بھی لشکرِ کفار کے سپہ سالار یہی تھے۔ لیکن اتنے بڑے دشمن کے گھر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں داخلے سے قبل ہی دارالامن قرار دے دیا تھا اور تو اور ان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ جس کی شہ پر وحشی نے چھپ کر حضرت حمزہؓ پر اپنے مخصوص نیزے کا کاری وار کیا تھا جس نے اپنے باپ کے جوشِ انتقام میں حضرت حمزہؓ (اسداللہ واسد رسولہ) کے جگر کو چبانے کی کوشش کی تھی، اسے بھی نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رافت و رحمت میں پناہ مل گئی ـــــ ان کی بیعت قبول کر لی گئی۔ دونوں شوہر و بیوی صحابہؓ کے حلقہ میں شامل ہوئے اور مخلص مومن ثابت ہوئے رضی اللہ عنہ وعنہا دونوں نے خلافتِ فاروقی میں جہاد میں حصہ لیا۔ جنگ یرموک میں دونوں نے اسلام کے غلبے کے لئے شاندار کارنامے انجام دیئے۔

یہ شان ہوتی ہے اسلامی انقلاب کی۔ یہ اسوہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ـــ لیکن ایران کا معاملہ چونکہ انقلاب کی نوعیت کا نہیں تھا بلکہ Coup تھا۔ لہٰذا جو تنظیم مضبوط ترین تھی جس کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا تھا اسے دوسرے ان حلیفوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلنی پڑی جن سے اندیشہ تھا کہ وہ حاصل شدہ اقتدار کے لئے کسی وقت بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔ جن میں خود اپنی تنظیم کے لوگ بھی شامل تھے۔ چونکہ آپس میں چھینا جھپٹی کا امکان موجود تھا۔ اخبارات میں شائع شدہ خبروں اور دیگر ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کا ایک چوتھائی

حصّہ بھی صحیح تسلیم کیا جائے تو اندازہ لگائیے کہ سینکڑوں وہ لوگ بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے جو تحریک کے فعّال کارکن تھے.

لہٰذا میرے تجزیے کا پہلا حاصل یہ سمجھئے کہ یہ درحقیقت انقلاب ہے ہی نہیں۔ اسے ہم فی الواقع ایک مذہبی طبقے کے ہاتھوں حکومت کا تختہ الٹنا (COUP BY CLERGY) کہہ سکتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں یہ کام فوج نے کیا ہے (گویا یہاں COUP BY ARMY تھا) اور وہاں جو مضبوط مذہبی حلقہ تھا اس نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ـــــ غور کیجئے کہ عجیب مشابہت کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی چلا آ رہا ہے۔ ہمارے یہاں فوجی انقلاب کے نتیجے میں جس گروپ نے اس وقت اقتدار سنبھالا اس نے اسلام کے نفاذ کا بیڑا اٹھایا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اس ملک میں نظریۂ پاکستان کے عین مطابق اسلامی نظام قائم اور نافذ کر کے ہی عام شہریوں (CIVILIAN) کو اقتدار منتقل کریں گے۔ اربابِ اقتدار کی طرف سے اس کے اقدامات بھی ہو رہے ہیں۔ ان کی نوعیت کیا ہے اور وہ مؤثر کیوں نہیں ہو رہے! یہ علیحدہ بحث ہے۔ بہرحال ظاہر میں تو حدود آرڈی ننس کا نفاذ ہے، نظام زکوٰۃ کا نفاذ ہے، شریعت کورٹس کا قیام ہے، اور اب اقامت صلوٰۃ کے نظام کا اجراء ہے۔ وہاں بھی چونکہ شاہ کے خلاف تحریک اسلام ہی کے نام پر کامیابی سے ہمکنار ہوئی لہٰذا وہاں بھی شریعت کی تنفیذ شروع ہوئی۔ البتہ اس میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے ـــ وہاں چونکہ اقتدار آیا ہے شیعہ علماء کے طبقہ کے ہاتھ میں، جو پہلے سے نہایت منظم تھا اور اپنے مسلک کے مطابق دینی شعار کا پابند تھا۔ لہٰذا وہ فوراً حرکت میں آئے اور انہوں نے اپنی فقہ کے نفاذ کا عمل تیزی سے شروع کر دیا۔ ان کو یہ ضرورت پیش نہیں آئی کہ پہلے وہ اسلامک آئیڈیالوجی کونسل بنائے جو ہر قانون کے متعلق اپنی سفارشات مرتب کرتی۔ پھر انہیں برسرِ اقتدار گروپ کے سامنے پیش کیا جاتا اس طرح معاملات غیر ضروری تاخیر و تعویق کی نذر ہو جاتے جیسا کہ ہمارے یہاں ہو رہے ہیں۔ فقہ جعفری مدوّن شکل میں موجود تھی لہٰذا اس کا نفاذ فوراً شروع ہو گیا۔ کوئی دشواری آئی بھی تو انقلابِ ایرانی کے قائدین اجتہاد سے کام لے کر اسے حل کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں فقہ کی تنفیذ کا عمل تیز اور واضح ہے۔ ہمارے یہاں ہر معاملہ ڈانواں ڈول ہے۔ اس لئے کہ یہاں جن لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آیا ہے وہ علماء کے طبقے سے نہیں ہیں۔ نماز روزہ کی پابندی صدرِ مملکت صاحب کی حد تک تو معلوم و معروف ہے دیگر جرنیلوں کا کیا حال ہے! واللہ اعلم ـــــ پھر یہ کہ داڑھی جو شعائرِ اسلام

شامل ہے صدر صاحب کے چہرے پر بھی نہیں ہے شاید وہ اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پاتے۔ میں پردہ نہیں۔ اس کو وہ اپنے گھر تک ہی نافذ کر دیں یہ ان کے لئے مشکل ہے جبکہ ایران کے علماء کے طبقے میں یہ تمام پابندیاں اور یہ شعائر پہلے سے موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں فوجی حکومت کے ذریعے نفاذِ اسلام (ISLAMISATION) کی جو کوشش کی جارہی ہے۔ اس کا حال بھی قریباً ویسا ہی ہے جیسا تحریک نظامِ مصطفیٰ کا تھا کہ اس میں بھانت بھانت کے نظریات رکھنے والے افراد بھی شامل تھے اور پارٹیاں بھی۔ یہی حال قریباً اربابِ اقتدار میں سے اکثر کا ہے ــــ لیکن ایران میں مذہبی طبقے (COUP BY CLERGY) کے ذریعے جو نفاذِ اسلام کا کام ہوا ہے وہ زوردار ہے۔ بہرحال انہوں نے بڑی قوت اور اعتماد کے ساتھ ان کو نافذ کیا ہے اس اعتبار سے ان دونوں کے درمیان فرق ہے لیکن نوعیت ایک ہے۔ ہمارے یہاں فوجی حکومت نے اقتدار پر قبضہ کیا (یعنی COUP BY ARMY) اور وہاں علماء نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔

ایرانی طرز کا انقلاب پاکستان میں ممکن نہیں

اب میں آپ کے سامنے اس سلسلے کی آخری بحث رکھنا چاہتا ہوں ــــ وہ یہ ہے کہ ایران والی صورت حال پاکستان میں کبھی نہیں آسکتی۔ بالفاظِ دیگر یہ Coup by Clergy پاکستان میں ممکن نہیں ہے۔ یہاں آئے گا تو خالص محمدی انقلاب آئے گا صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ درمیان کی چیز یہاں ممکن نہیں ہے ــــ کیوں ممکن نہیں ہے؟ اس کی چند وجوہات ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور ذہن نشین کر لیں۔

پہلا فرق: ہمارے اور ان کے حالات میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ اصل میں مسلمانوں میں فرقہ وارانہ تقسیم صرف ایک ہی ہے اور وہ بڑی بنیادی تقسیم ہے۔ اور وہ ہے شیعہ سُنّی کی تقسیم! میں ان شاء اللہ اس بنیادی تقسیم کے فرق کو تفصیل کے ساتھ اگلے جمعہ کو بیان کروں گا۔ ــــ باقی کوئی بنیادی تقسیم ہمارے یہاں موجود نہیں ہے۔ لفظ 'فرقہ' کا اصل اطلاق شیعہ سُنّی پر ہی ہوتا ہے۔ رہا اہل سنّت کا معاملہ تو حنفی ہوں، مالکی ہوں، شافعی ہوں، حنبلی ہوں، اہلحدیث ہوں، سلفی یا ظاہری ہوں یہ سب کے سب اہل سنّت ہی کے مختلف مکاتبِ فقہ ہیں۔ ان میں مسالک کا اختلاف تو ہے لیکن کوئی اختلاف دین کی بنیادی نوعیت کی چیزوں کے بارے میں نہیں ہے۔ تفریق کر دینے والی، پھاڑ دینے والی اور بنیادی اختلافی چیز شیعیت و سنیت ہی ہے۔ البتہ شیعوں

میں بے شمار فرقے ہیں۔ ان میں اثنا عشری ہیں، شش امامی ہیں، زیدی ہیں، اسماعیلی ہیں، نصیری ہیں، دروزی ہیں، عزائی ہیں، اور نہ معلوم کتنے مزید فرقے ہیں۔ جن کے مابین بڑے بنیادی اختلافات ہیں۔ اب اہل سنت اور اہل تشیع کے اعتبار سے ہمارے یہاں پاکستان میں جو تقسیم ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے جو وہاں ایران میں ہے۔ وہاں اکثریت شیعوں کی ہے اور وہ بھی تقریباً صد فی صد اثنا عشری شیعہ۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر مسئلہ یہ ہے کہ وہاں جو تقسیم ہے وہ علاقائی ہے۔ جو اصل ملک ایران ہے، ایران کا قلب (یعنی MAIN LAND OF IRAN) وہاں صد فی صد شیعہ آباد ہیں۔ وہاں سنیوں کا وجود ہی نہیں ہے — سنی صرف سرحدی علاقوں میں ہیں اور منتشر ہیں۔ مثال کے طور پر جنوب مشرق میں بلوچ قبائل ہیں جو سنی ہیں۔ اسی طرح شمال مشرق میں بالکل مخالف سمت میں کرد قبائل اور کچھ افغان قبائل ہیں جو سنی ہیں۔ اس کے علاوہ اہواز کا صوبہ جو خلیج سے متصل علاقہ ہے، جہاں تیل کی دولت بھی کافی ہے، اس میں کچھ عرب سنی قبائل آباد ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ سعودی عرب کے جس علاقے میں تیل کی کافی نکاس ہے اس میں بھی شیعہ عرب قبائل آباد ہیں اور ان کی خاصی تعداد ہے۔ لیکن ایران میں صرف چار کونوں میں سنی آباد ہیں۔ وہاں ان کی کثرت ہے لیکن قطعی غیر مؤثر۔ اصل ملک ایران میں یعنی قلب ایران میں سرے سے سنیوں کا وجود ہی نہیں وہاں صد فی صد شیعہ آباد ہیں —— جبکہ ہمارے یہاں تو شیعہ سنی گڈ مڈ ہیں۔ آبادیاں ملی جلی ہیں۔ کچھ دور دراز کے کوہستانی علاقے جیسے چترال اور ہنزہ وغیرہ میں شیعہ خاص طور پر آغا خانی شیعوں کی کثرت ہے۔ یا بلتستان میں شیعہ اور سنیوں کے بین بین ایک فرقہ نوربخشی ہے۔ ان کو ملا کر وہاں شیعہ حضرات کی اکثریت ہو جاتی ہے۔ باقی تو عموماً یہی ہے کہ داہنے سنی آباد ہیں تو بائیں کچھ شیعہ بھی آباد ہیں۔ اور بڑے شہروں میں جہاں فلیٹ لائف ہے ان میں اوپر شیعہ تو نیچے سنی یا عکسی کیفیت ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں اس مذہبی اختلاف کی جو صورت بالفعل ہے وہ ایران کے مقابلے میں بہت مختلف ہے۔ وہاں کے انقلابی طریق کار —— (METHODOLOGY) کو جوں کا توں لا کر یہاں نافذ کرنے کے متعلق اگر کچھ لوگ سوچتے ہیں تو میرے خیال میں وہ جنت الحمقاء میں بستے ہیں انہیں یا تو حقائق کا علم نہیں یا وہ دانستہ حقائق سے صرف نظر کئے ہوئے ہیں۔

دوسرا فرق: دوسرا بنیادی فرق کیا ہے! یہ ایران میں بعض اسباب سے شیعہ علماء

کی تنظیم بہت ہی منظم ہے۔ وہاں ان کا ایک باعزت مقام ہے اور بہت محکم نظام ہے۔ جیسے عیسائیوں میں پوپ، اس کے بعد کارڈینل اور اس کے بعد بتدریج مختلف عہدے اور مرتبے ہیں۔ ضلع کمشنری اور صوبے میں بھی ان کے عہدیدار ہوتے ہیں اور یہ تقسیم تحصیل کے درجے تک آجاتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طریقے سے عیسائیت میں بہت ہی منظم درجہ بندی ہے اسی طرح اہلِ تشیع کے یہاں بھی نہایت منظم اور اعلیٰ نوعیت کی درجہ بندی ہے پھر یہ کہ مذہبی تعلیم کا نظام بھی اسی طرح بہت اعلیٰ اور معیاری ہے۔ جس طور پر عیسائیوں کے ہاں مذہبی تعلیم کا معیار بہت بلند ہے ـــــ ہندوستان سے زکوٰۃ اور عشر و خمس اکثر و بیشتر ایران جاتا تھا اور شاید اب بھی جاتا ہو۔ ان کے وسائل و ذرائع اتنے وسیع ہیں کہ ان کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کے بڑے بڑے اوقاف ہیں جو کافی منظم ہیں۔ تمام آمدنی ایک مرکزی جگہ اکٹھی ہوتی ہے۔ اور ان کی یافت سے ایک اعلیٰ نظم کے ساتھ تمام شیعہ مدارس اور دارالعلوموں کو حصہ رسد بہم پہنچایا جاتا ہے۔

تیسرا فرق: تیسری بات یہ ہے کہ ایران ہماری طرح کبھی بھی براہِ راست کسی بیرونی ملک کا سیاسی غلام نہیں رہا۔ ہم تو بدقسمتی سے دو سو برس بالواسطہ انگریز کے غلام رہے ـــــ اور نوے سال تو بالکلیہ طور پر یہ غلامی ہم پر مسلط رہی ہے۔ اس غلامی کے دوران انگریز نے ہمارے تمام دینی ادارے (INSTITUTIONS) تباہ و برباد اور منتشر کر کے رکھ دیئے ـــــ ہمارے ایرانی بھائی کبھی بھی ہماری طرح براہِ راست کسی کے غلام نہیں رہے۔ غلامی کا جو دور بھی وہاں رہا ہے وہ بالواسطہ (Indirect) غلامی کا دور تھا۔ ان کا اندرونی نظام قائم و محفوظ رہا۔ یعنی داخلی طور پر انہیں خود مختاری حاصل تھی لیکن بالاتر اقتدار انگریز کے ہاتھ میں تھا۔ ہمارے یہاں بھی تقریباً یہی صورتِ حال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک رہی یعنی ملک کی حقیقی حکومت تو کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھی لیکن داخلی طور پر ایک علامتی بادشاہ بھی موجود تھا اور شرعی عدالتیں بھی قائم تھیں جہاں عموماً رائج الوقت قانون یعنی فتاویٰ عالمگیری کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہماری براہِ راست غلامی کا دور رہا ہے کہ ملکی قانون (Law of the Land) پورا کا پورا انگریز کا نافذ ہوگیا۔ ہماری عدالتیں ختم ہوگئیں۔ قاضی برطرف ہوگئے تعزیراتِ ہند نئے سرے سے مدوّن ہو کر عدالتوں میں نافذ ہوگئیں۔ تمام اہم

عہدوں پہ انگریز تعینات ہو گئے۔ عدالتی اور سرکاری زبان انگریزی قرار دی گئی اور اس طرح ہماری تہذیبی اور معاشرتی اقدار میں بھی انگریزی تہذیب و تمدن کا نفوذ شروع ہو گیا۔ حتیٰ کہ آزادی کے بعد بھی اس تہذیب کا استیلاء نہ صرف برقرار ہے بلکہ روز افزوں ہے ـــــ اس کے برعکس ایران چونکہ براہِ راست انگریز کی غلامی سے محفوظ رہا لہٰذا وہاں کا داخلی نظام بھی برقرار رہا ـــ فارسی زبان اپنی جگہ رہی اور ان کے تمام مذہبی ادارے بھی انگریز کی بالادستی اور حکومت کی دست بُرد سے بالکل محفوظ رہے۔ لہٰذا اس معاملے میں وہ یقیناً ہم سے بہت آگے رہے بلکہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے ممکن ہو سکا کہ وہ حالیہ تحریک کی کامیابی کے بعد اپنا مذہبی نظام حکومتی سطح پر فوری طور پہ نافذ کرنے میں کامیاب ہو گئے ـــــ مختصراً یہ کہ ایک طرف شیعہ آبادی کی اکثریت کہ اصل ملک کے اعتبار سے ایران صد فیصد شیعہ ملک ہے سُنّی صرف سرحدی علاقوں میں آباد ہیں۔ دوسری طرف ان کے یہاں شیعہ علماء کے ایک منظّم و فعّال ادارہ کا عرصے سے موجود ہونا۔ پھر اس کی درجہ بندی، اس کی تعلیم کا بہت اعلیٰ اور عمدہ نظام پھر اس کے اپنے مستقل اور مستحکم مالی وسائل و ذرائع ـــــ یہ چند اسباب تھے جن کے باعث شیعہ علماء کا ادارہ اتنا منظم تھا کہ اس نے Take Over کر لیا۔

لہٰذا ایران میں تو ممکن تھا کہ مذہبی طبقہ برسرِ اقتدار آجاتا، ہمارے یہاں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات ہی سرے سے خارج از بحث ہے ـــــ ہمارے یہاں تو سُنّی اسلام کی پاکستان گیر پیمانے پہ کوئی ایک تنظیم موجود ہی نہیں ہے۔ اہلِ سنّت یہاں تین بڑے حصّوں میں منقسم ہیں۔ ایک حنفی مسلک ہے۔ ان میں دو قسمیں ہیں۔ ایک دیوبندی اور ایک بریلوی۔ ایک فقہ کے ماننے کے باوجود ان میں بُعدالمشرقین واقع ہو چکا ہے۔ تیسرے سلفی المسلک ہیں جو یہاں اہلِ حدیث کہلاتے ہیں۔ ان تینوں کے اپنے علیحدہ علیحدہ نظام ہیں۔ پھر انتشار اور پراگندگی کا حال یہ ہے کہ سب میں ذیلی تقسیمیں موجود ہیں۔ سیاسی اعتبار سے دیوبندیوں کے نہ معلوم کتنے گروپ ہیں۔ کتنی جمعیتیں ہیں۔ کون سی حقیقی جمعیت علماء اسلام ہے اور کون سی غیر حقیقی! پتہ ہی نہیں چلتا۔ آج جو گروپ زیادہ معروف ہیں ان کی صورت حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک حکومت کے ساتھ ہے، ایک ایم آر ڈی کے ساتھ اور تیسرا بین بین ہے۔ کچھ یہی حال اہلِ حدیث حضرات کی جمعیتوں کا ہے اور کم و بیش

ہی صورت حال بریلوی مکتبِ فکر کی جمعیتوں کی نظر آتی ہے۔ پس ہمارے ملک میں علماء کی
ئی تنظیم ایسی نہیں ہے جو ملک گیر ہو۔ نہ کوئی ایسی دینی شخصیت ہے کہ جو ہر مکتبہ فکر کے علماء
کے نزدیک مقتدر اور معتمد علیہ ہو۔ جس کو تمام علماء اپنا قائد تسلیم کر لیں۔ جیسا کہ ساٹھ ستر سال
قبل یہ مقام حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا کہ اس دور
میں صرف ایک ہی جمعیت العلماء ہند تھی اور اہلِ سنت کے تمام مکاتبِ فکر اور تمام فقہی مسالک
کے علماء اس کے پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ یہ معاملہ ہمارے یہاں بالکل نہیں ہے۔ بلکہ شدید
انتشار اور تشتت ہے۔

پھر ہمارے یہاں دینی تعلیم کا جو نظام ہے اس میں کوئی درجہ بندی (Gradation)
نہیں ہے۔ چند دیوبندی اور تھانوی مدارس نے اپنا اپنا وفاق المدارس قائم کر کے کچھ
درجہ بندی کی کوشش کی ہے باقی تو یہاں کھلی چھوٹ ہے۔ چار پانچ بچوں کو ناظرہ قرآن
پڑھانے کے لئے ایک حجرہ حاصل کر کے جو چاہے اس پر جامع تعلیم القرآن کا بورڈ لگا
سکتا ہے۔ جبکہ جامعہ کہتے ہیں یونیورسٹی کو۔ کوئی نہیں پوچھے گا کہ حضرت اسے "جامعہ"
کس اعتبار سے کہا جا رہا ہے! ہمارے ہاں معیاری دینی درس گاہیں بھی یقیناً ہیں لیکن بے شمار
ایسے دینی ادارے بھی موجود ہیں جہاں تعلیم کا کوئی معیار نہیں لیکن وہاں سے بھی دھڑا دھڑ
سندیں جاری ہوتی ہیں اور کوئی ایسا مرکزی نظام موجود نہیں ہے جو تحقیق کرے کہ سند جاری
کرنے والا ادارہ کس معیار کا ہے اور اس نے کس استحقاق پر یہ سندیں جاری کی ہیں۔ نتیجہ
یہ ہے کہ دینی مدارس کا معیارِ تعلیم بہت نیچے جا چکا ہے۔ اس ضمن میں ایک صاحب نے جو
نیوی میں اچھے عہدے پر ہیں، مجھ سے اپنا نہایت تلخ تجربہ بیان کیا۔ وہ صاحب پاکستان نیوی
میں دینی تعلیم کے لئے کچھ علماء کے تقرر کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تھے۔ مجھ سے بھی ملے۔
وہ خود بھی اچھے دینی ذوق کے حامل ہیں۔ انہوں نے بہت دکھ کے ساتھ بتایا کہ انٹرویو دینے
کے لئے بہت سے حضرات بڑی مرصع و مسجع سندوں کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ لیکن دوران
انٹرویو جب ان سے 'صحاح ستہ' کی تفصیل پوچھی گئی تو ان میں ایسے بھی تھے جو 'صحاح ستہ'
نام کی کسی شے سے واقف نہ تھے۔ اور جن کے لئے یہ ترکیب ناآشنا نہیں تھی وہ بھی جواب میں
صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے سوا حدیث کی تیسری کسی کتاب کا نام نہ لے سکے بلکہ ایک صاحب
نے تیسری کتاب کے طور پر نام لیا بھی تو موطا کا۔ ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

ـــــ حال ہی میں مجھے اپنے دعوتی و تبلیغی کام کے سلسلے میں آزاد کشمیر کے بعض اہم شہروں
میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ انگلستان میں امامت کے لئے مولویوں کی
بہت ڈیمانڈ ہے۔ اور انگلینڈ میں آباد پاکستانیوں میں سے ایک کثیر تعداد چونکہ ان لوگوں
پر مشتمل ہے جن کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے اس لئے فطری طور پر زیادہ تعداد میں مولوی حضرات
اسی علاقے سے بلائے جا رہے ہیں۔ مجھے آزاد کشمیر میں متعلقہ دفتر کے ایک ذمہ دار شخص نے
بتایا کہ بطور امام مسجد انگلینڈ جانے کے خواہش مند حضرات جب پاسپورٹ یا ویزا لینے
کے لئے آتے ہیں تو ان میں سے اکثر جلدی جلدی چند سورتیں رٹ رہے ہوتے ہیں تاکہ اگر
کوئی پوچھے کہ کتنی سورتیں حفظ ہیں تو ہم کچھ سورتوں کا نام بتا سکیں اور انہیں سنا سکیں ـــــ
تو اس معیار کے لوگ انگلستان جا کر امام بن رہے ہیں۔ نتیجہ کیا ہے کہ وہاں وہ ہنگامہ ہے کہ اللہ
حفظ و اماں میں رکھے۔ مسجدوں میں خوں ریزیاں ہوتی ہیں۔ مساجد میں پولیس بوٹوں
اور کتوں سمیت داخل ہوتی ہے۔ کئی مساجد انہی فسادات کے باعث بند کر دی گئی ہیں
اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا ہے کہ وہاں ان لوگوں نے مساجد سنبھالی ہیں جن کی کوئی
تعلیم نہیں۔ ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ آپ نے کیا پڑھا ہے! کہاں پڑھا ہے! اور اگر
کہیں پڑھا ہے تو وہ کس معیار کا مدرسہ یا دار العلوم ہے! کوئی لاء کالج یا ہماری یونیورسٹی
کی سند لے کر جاتا ہے تو اس کی توثیق ہو جاتی ہے چونکہ یہ معروف اور مستند ادارے ہیں۔
لیکن دینی تعلیم کی اتنی بے وقعتی ہے کہ اسناد کی توثیق کا اور تحقیق کا کوئی مرکزی نظام ہمارے
یہاں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

یہ وہ چند اہم اسباب ہیں جن کی بنیاد پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حالات جن کے نتیجے میں ایران
میں علماء نے حکومت پر قبضہ کیا وہ حالات یہاں بالکل نہیں ہیں ـــ چنانچہ اس طرح کا انقلاب
بلکہ صحیح تر الفاظ میں کوئی تبدیلی پاکستان میں لانا قطعی ناممکن ہے۔ البتہ جب بھی اللہ کو منظور
ہوگا تو یہاں انقلاب اسی نہج سے آئے گا جو ہمیں سیرت محمدی میں نظر آتا ہے۔ گویا یہاں
اگر آئے گا تو خالص محمدی انقلاب آئے گا۔ اس کے اصول و مبادی پر گفتگو ان شاء اللہ
آئندہ کسی موقع پر ہوگی۔

ابھی تو اس موضوع کی بھی دوسری نشست باقی ہے کہ دینی اور مذہبی اعتبار سے
سُنّی اور شیعہ اسلام میں اصل فرق و تفاوت اور اختلاف کی نوعیت کیا ہے! جو انقلاب

(بقیہ ص ۶۵ پر)

عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال

لا یؤمن احدکم

حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

اخلاق حسین قاسمی دہلوی
مہتمم جامعہ رحیمیہ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اپیل

اور ــــ علمائے دیوبند

ہندوستان میں دعوت قرآنی کی بنیاد حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ڈالی۔ اور ان کے صاحبزادگان نے اسے پروان چڑھایا۔

قرآن کریم نے اس دعوت کو جہاد کبیر قرار دیا ہے۔

وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا

قرآن کریم جس فطری اور وجدانی اسلوب میں اسلام کی دعوت دیتا ہے وہ بقول شاہ ولی اللہ انسان کی فطرتِ سلیم کو اپیل کرتی ہے اور عقل سلیم کی پیاس بجھاتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بعد شاہ صاحب کی جماعت نے اس دعوت کے سلسلہ کو جاری رکھا۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے دعوتِ قرآنی کو جاری رکھنے کے لیے باقاعدہ تنظیم بنائی، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی جادو بھری تحریر و تقریر سے دعوت بالقرآن کو رواج دیا۔

مولانا احمد سعید صاحب دہلوی اور مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے پیغام کی ترویج و اشاعت کو اپنی تبلیغی اور واعظانہ سرگرمیوں میں پوری اہمیت دی۔ کیونکہ اس جماعت کے شیخ مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند نے مالٹا کی اسارت سے واپس آکر اپنی جماعت کو براہ راست قرآن کریم سے وابستہ ہونے کی ہدایت فرمائی تھی اور امام شاہ ولی اللہ کے خصوصی مشن کو آگے بڑھانے کی طرف متوجہ کیا تھا۔

علماء دیوبند کے فیض یافتہ عالم

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے بھی اقامتِ دین کی خاص جدوجہد میں قرآن کریم

کو اہمیت دی۔

قرآن کریم کی دعوت ایک اصولی دعوت ہے اور اس دعوت کی اہمیت یہ ہے کہ امت کے تمام فرقے ہر قسم کے فقہی اور اعتقادی اختلافات کے باوجود اس مشن پر متحد ہو کر اور کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔

دعوت قرآن کی تحریک کو چلانے والے قائدین اور کارکنوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس اصولی دعوت کے اہم تقاضوں کو مدنظر رکھیں اور خاص طور پر اس تقاضے کو پورا کریں کہ اعتقادی اور فقہی جزوی اختلافات کی بحث کو اس تحریک کے دائرہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

شاہ ولی اللہ کے ان فقہی اختلافات میں جو توسع نظر آتا ہے اور جس توسع پر خاص کر حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے زور دیا ہے اس کا مقصد یہی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ سے پہلے حضرت مجدد صاحب رحؒ کی تحریک ترویج سنت اور تردید بدعات کے اندر بھی فقہی اختلافات میں یہی وسعت فکر و نظر ملتا ہے۔

حضرت مجدد صاحب ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

" باوجود التزام ایں مذہب مرابا امام شافعیؒ گو یا محبت ذاتی است و بزرگ مے دانم لہذا در بعض اعمال نافلہ تقلید مذہب او مے نمایم " (مکتوب ۵۵ دفتر دوم ص۱۱)

باوجود اس کے کہ میں حنفی مسلک کی پابندی کرتا ہوں مجھے امام شافعیؒ سے ذاتی محبت ہے اور میں انہیں بزرگ مانتا ہوں اور اسی لیے بعض عبادات میں ان کے مسلک کی پیروی کرتا ہوں۔

صاحب اتحاف نے لکھا ہے کہ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی اور حضرت مجدد صاحب کے درمیان اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ محدث صاحب کو فقہی مذہب میں بے حد تشدد تھا اور مجدد صاحب مطلق اتباع سنت اور بدعات کی تردید پر زور دیتے تھے (ص۱۶۲)

پاکستان اہل علم میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دین برحق کے غلبہ اور اقامت کے لیے قرآن کریم کی اصولی دعوت کا مشن اختیار کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو نہ عالم ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ فقیہ و متکلم اور شیخ طریقت ہونے کا ادعا ہے۔

خدا تعالیٰ نے موصوف کو اپنے مقدس کلام کا بڑا اچھا فہم عطا کیا ہے اور اس کلام عظیم کے اصولی پیغام کو جدید استدلالی اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر صاحب جدید تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور موصوف نے قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور وہ اس تحریک میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا چکے ہیں

ڈاکٹر صاحب کے سامنے اقامت دین کی تحریک کے تمام دور موجود ہیں اور جماعت اسلامی کی تحریک میں شامل رہ کر تمام اتار چڑھاؤ سے موصوف آگاہ ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دعوت قرآنی اور اقامت حق کی دعوت سے فقہی اختلافات کو دور رکھا ہے وہ اہل علم کو فقہی اور اجتہادی مسائل میں وسعت فکر و نظر کی دعوت ضرور دیتے ہیں۔ معتدل راستہ اختیار کرنے کی اپیل کرتے ہیں جو آج کے حالات کا شدید تقاضا ہے۔ لیکن عوام کو وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اتباع سنت کی نیت سے ان کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں (میثاق نومبر ۸۴ء)

لیکن ایک تقریر میں ڈاکٹر صاحب نے ضمناً اجتہادی اور فقہی بحث میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اپنے فقہی مسلک کے بارے میں اپنے لیے نیم مقلد کی تعبیر اختیار کی اور مستقبل کے لیے یہ آرزو کی کہ فقہی اختلافات میں اتحاد عمل کی کوئی سبیل نکل آئے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب سے سہو ہوا۔ موصوف جس احتیاط کے ساتھ کام کر رہے ہیں وہ احتیاط اس تقریر میں قائم نہ رہ سکی۔

موصوف کو اچھی طرح معلوم ہے اور ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے تحریک اقامت دین کے امیر و قائد کی حیثیت سے فقہی مسائل میں ادھر ادھر ہاتھ مار کر تحریک کو نقصان پہنچایا۔

وہ یقیناً صاحب علم آدمی تھے فقہی مسائل میں بھی اچھی بصیرت کے حامل تھے مگر ایک

اصولی اور بنیادی تحریک کے داعی کے لیے فقہی مسائل کے اختلافات میں پڑنا اور ہر مسئلہ میں اپنی منفرد راہ دکھانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس نزاعی خطاب میں تفصیلی طور پر نہ سہی اجمالی طور پر جس آرزو کا اظہار کیا ہے۔ اس سے بعض علمار کو شکایت پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے میثاق نومبر کے پرچہ میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علمار حق کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

مجھے امید ہے کہ تقلید اور نیم تقلید جیسے جزدی مسائل کو دعوت قرآنی کے بنیادی مشن کے مقابلہ میں اہمیت نہیں دی جائے گی۔

پاکستان کے اندر اس وقت جزوی مسائل میں مختلف مکاتب فکر کے علمار جس طرح آپس میں گتھم گتھا ہیں اور مخالف شریعت عناصر اس کو ہوا دے کر علماء دین کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اس حرب عقائد سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں شرعی نظام قائم کرنے کا مطلب اس لڑاکو طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور دینا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ موصوف کا مقصد یہی ہے کہ جزدی اور فروعی اختلافات کی شدت اور ہنگامہ آرائی کم سے کم ہو جائے —— اور ملت کی پوری طاقت و توجہ دین برحق کی اصولی دعوت پر مرکوز ہو جائے۔

البتہ اس بحث کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرے بڑے جھگڑے کو چھیڑ دیا ہے اور امامت اور امارت کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔

اور ساتھ ہی اس کا جوڑ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی امامت کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز سے لگا دیا ہے گویا ڈاکٹر صاحب نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔

اس بحث کو چھیڑتے ہوئے ڈاکٹر صاحب جذبات میں آ گئے اور موصوف کو اتنا خیال نہ رہا کہ جس ہستی (مولانا آزادؒ) کی امامت کے مسئلہ کو وہ سند کے طور پر علماء دیوبند کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس دانش مند ہستی نے امامت کی تجویز کو حالات کے پیش نظر کس طرح لپیٹ

کر رکھ دیا اور ساری زندگی مولانا مرحوم اسے زبان وقلم پر نہ لائے۔

امامت کی تجویز کی مخالفت گھر میں ہوئی ان رفقاء کی طرف سے ہوئی جو مولانا آزاد کی رفاقت میں کام کر رہے ہیں۔ مگر مولانا نے حالات کے تیور دیکھ کر ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر لی اور کبھی کوئی شکوہ وشکایت زبان پر نہیں لائے۔

مسلم جماعتوں کے تبصرہ میں ڈاکٹر صاحب نے غصہ سے کام لیا ہے تحمل سے کام نہیں لیا موصوف کے نزدیک حضرت شیخ الہند اپنے دور کے مجدد تھے، شیخ الہند نے اپنے بعد اپنے شاگردوں کی ایسی جماعت چھوڑی جو علم وفضل اور تقوی وجہاد میں نابغہ روزگار تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں شیخ الہند کے شاگردوں نے سیکولر جماعتوں کا ضمیمہ بن کر آزادیٔ ہند کی لڑائی میں حصہ لیا۔

حالانکہ تاریخ کا ایماندارانہ مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مشترک جدوجہد کا منصوبہ شیخ الہند اسارت مالٹا سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

ترکی قائدین نے شیخ کو یہ مشورہ دیا کہ ہندوستانی مسلمان تنہا جدوجہد کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نہیں نکال سکتے ــــ جیسا کہ اب تک وہ ناکام رہے ہیں۔

اسی تجویز کے مطابق شیخ الہندؒ کے مایہ ناز شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مفتی محمد کفایت اللہؒ، مولانا ابوالمحسن سجاد بہاریؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے آزادی کی جنگ میں قائدانہ طور پر حصہ لیا ــــ تابعانہ اور ضمیمہ بن کر حصہ لینا ان حضرات کی خودداری اور علم وفضل کی توہین تھا مکمل آزادی کی تجویز سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند نے منظور کی۔ آزادی کی تحریکات میں ہر قسم کی قربانیوں کا حصہ اپنی تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں کا زیادہ نکلتا ہے۔

مشترک جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے تشخص کی حفاظت کے محاذ پر جماعت شیخ الہند نے بھرپور جدوجہد جاری رکھی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے سن ۴۵ کے اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ لاہور کے خطبہ میں صاف صاف اعلان کیا کہ مشترک جدوجہد

سے حاصل ہونے والی آزادی اور جمہوری حکومت ہماری آخری منزل نہیں بلکہ اس آزادی سے آخری منزل (اسلامی نظامِ حیات کا قیام) ہمارے لیے آسان ہو جائے گی

اس خطبہ میں مولانا مدنی نے اسلامی نظام حیات کے بنیادی اصولوں کی مکمل وضاحت فرمائی۔

یہ دور جد وجہد آزادی کے شباب کا دور تھا اور شیخ الہند کی جماعت لگی لپٹی اور گول مول بات کہنے کے بجائے اپنا مدعیٰ صاف صاف پیش کر رہی تھی۔

جماعت شیخ الہند نے اسی دور میں مخالف اسلام تحریکوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انگریز حکومت کے کارندوں نے جماعت شیخ الہند کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ کی۔ سیاسی اتحاد کو مغربی تصور کے مطابق نیشنل ازم کے مترادف قرار دیا گیا۔ اور متحدہ قومیت کے لفظ سے فائدہ اٹھایا گیا ــــ لیکن بہت جلد دنیا نے دیکھا کہ آزادی کے بعد مصائب و مشکلات میں گھری ہوئی ملت اسلامیہ ہند کے ملی اور ثقافتی تحفظ کی جد و جہد میں جماعت شیخ الہند معروف جہاد ہے جبکہ بڑے بڑے بہادر قائدین اور اسلام پسند رہنمایان کرام ہجرت کے نام پر ہندوستان چھوڑ چکے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد اصل نصب العین کے لیے جد وجہد کرنے کا منصوبہ خطرہ میں پڑ گیا اور اقامت دین کے لیے براہ راست جد وجہد کے بجائے مسلمانوں کے وجود کی حفاظت کا اہم مسئلہ سامنے آ گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کے مشہور رہنما مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری ؒ نے تحریک آزادی کے دور میں حکومت الٰہیہ کے نام سے ایک منصوبہ تیار کیا تھا اور یہ الہلال اور البلاغ کے پیغام کی صدائے بازگشت تھی ۔ مولانا کی اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔

اس منصوبہ کے مطابق ہندوستان کے بعض حصوں ــــ بہار اڑیسہ وغیرہ میں امارتِ شرعیہ قائم کر دی گئی تھی ــــ جو آج تک قائم ہے۔

یہ امارتِ شرعیہ ایک نمونہ تھا اس اصل نصب العین کا جس کا اعلان مولانا حسین احمد

مدنی ؒ نے سن ۵۷ء کے خطبہ جمعیتہ علماء میں کیا تھا اور جماعت شیخ الہند کا حقیقی نصب العین تھا۔
آزادی کے بعد جماعت شیخ الہند کے یہی مرد مجاہد تھے جو بڑھاپے اور بیماری کی حالت میں
شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھر کر مسلمانوں کو تسلی دے رہے تھے اور ہندو فرقہ پرستی کا مقابلہ
کر رہے تھے۔

جبکہ پاکستان کے مذہبی قائدین پاکستان میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی قیمت پر ہندوستان
کے مسلمانوں کو گیتا کی حکومت کے تحت ذمّی بنا کر رکھنے کی تجویزیں پیش کر رہے تھے۔
مسلمانوں کی جان و مال پر قیامت ٹوٹ رہی تھی اور کاغذی حکومت الٰہیہ کے علم بردار
اس جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کی سعادت حاصل کر رہے تھے۔

اصل نصب العین کی طرف جماعت شیخ الہند ؒ نے آگ اور خون کی اس بارش میں بھی
اقدام کرنے سے غفلت اختیار نہیں کی۔ نعرہ بازی کی بجائے ٹھوس اقدام کیا اور دینی تعلیمی
تحریک کے نام سے ملک بھر میں اسلامی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کے ہزاروں مراکز
قائم کر دیئے —— اور مولانا محمد الیاس صاحب کی تحریک تبلیغ نے نہایت خاموشی کے ساتھ
کونہ کونہ پہنچ کر مسلمانوں کے اندر ایمانی حوصلہ پیدا کیا۔ اس جدوجہد میں جماعت شیخ الہند
کو دو طرفہ جہاد کرنا پڑا۔ ایک طرف ہندو فرقہ پرستی اور دوسری طرف دارا شکوہی ذہنیت
کے حامل اور انتہا پسند نیشنلسٹ مسلمان ——

مسلمانوں کے اس طبقہ نے جماعت شیخ الہند ؒ کے اکابر پر یہ الزام تراشی شروع کی
کہ ان ملاؤں نے مسٹر جناح کی دو قومی تھیوری کی حوصلہ افزائی کی ہے اور در پردہ پاکستان
کے قیام کی تحریک کو سہارا دیا ہے۔

مرحوم انیس الرحمان ہماری ایڈیٹر نئی زندگی اس تحریک کے قائد تھے —— اس
تحریک کو اندر سے کانگریس کے بعض سینئر مسلمان لیڈر ہوا دے رہے ہیں مگر مولانا
ابوالکلام آزاد کی بھاری بھرکم شخصیت کے مقابلے میں وہ کھل کر سامنے آنے کی جرأت
نہیں رکھتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ؒ کے کانگریس اور حکومت کے اندر رہنے سے مذہب پسند مسلم

قیادت کو جو ٹھوس فائدہ پہنچا وہ ناقابل بیان ہے۔
شروع ہی میں اگر یہ انتہا پسند نیشنلسٹ غالب آجاتے تو واقعی ہندوستان میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو زندہ رہنے میں بڑی مشکلات پیش آتیں۔ ایک طرف ہندو فرقہ پرستی کے حملے ہوتے اور دوسری طرف سے اندر کے منافقین اسلامی قدروں کو نقصان پہنچانے کی سازشیں کرتے رہتے۔

مولانا مدنیؒ نے آزادی کے بعد سرکاری خطاب اور اعزاز قبول کرنے سے انکار کردیا، مولانا کے بھائی اور بھتیجے سعودی عرب میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ان کے اصرار کے باوجود مولاناؒ نے مدینہ منورہ میں قیام کرنے پر ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ رہنا پسند فرمایا،

مولانا مدنیؒ تصوف و طریقت میں مولانا تھانویؒ کے مقابلہ میں بہت نرمی اختیار کرتے تھے مگر آزادی کے بعد مولانا کے رویہ میں سختی آگئی تھی اور مولانا شرعی داڑھی کے بغیر کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے — جبکہ اس ماحول میں مسلمان کی شکل و صورت میں چلنا پھرنا بڑی ہمت کا کام تھا اور لوگ شکل و صورت بدل بدل کر ہندوستان سے باہر جا رہے تھے — یہ انفرادی تشخص کی اہمیت اور حفاظت کے اظہار کی خاطر تھا۔

آزادی کے بعد سالہا سال تک مسلمانوں کی حفاظت اور دین حق کی تبلیغ و دعوت کا بھار بوجھ جماعت شیخ الہندؒ نے اٹھایا۔

اور آہستہ آہستہ ملک کی فضا کو اس قابل بنایا کہ دوسری مسلم جماعتیں بھی مسلمانوں کے اندر کام کرنے کے لائق ہو سکیں،

جماعت اسلامی ہند ان بدلے ہوئے حالات میں بھی مشترک تعاون اور سیاسی انتخابات میں حصہ لینے کو طاغوت پرستی کہتی رہی — جبکہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اسی انتخاب و الیکشن کے ذریعہ ہندو پارلیمنٹ میں جاکر مسلمانوں کی مشکلات اور ہندو فرقہ پرستی پر پوری جرأت حق کے ساتھ اظہار خیال کرتے رہے اور ہندوستان کے ضمیر کو جھنجھوڑتے رہے — اور یالآخر جماعت اسلامی کے اسلام پسند رہنماؤں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان

کے لیے سیکولر طرزِ حکومت اکثریت کے ہندو راشٹر سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان کی مسلم جماعتوں کے بارے میں جو تبصرہ کرنا چاہیں شوق سے کریں — لیکن شیخ الہندؒ جو موصوف کے نزدیک مجدد وقت تھے ان کی جماعت کے بارے میں تاریخ کا سنجیدہ مطالعہ فرماکر اظہارِ خیال فرمائیں تو بہتر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس تقریر میں تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کو بھی صرف افراد کی اصلاح تک محدود کہہ کر اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے لیکن کیا ایک صالح معاشرہ صالح افراد کے بغیر وجود میں آسکتا ہے؟ — یہ غلبۂ دین کی پہلی منزل ہے۔

اسی طرح علماء، مدارس کی تعلیمی سرگرمیوں کا معاملہ ہے، اس حلقہ کی جدوجہد ایک صالح معاشرہ کے لیے دین کے معلم، امام، قاضی اور داعی تیار کرنا ہے۔

پھر کیا یہ جدوجہد غلبۂ دین کی جدوجہد سے بے تعلق چیز ہے؟ ہاں، یہ امر ضروری ہے کہ اصحابِ تبلیغ ہوں یا اربابِ مدارس اپنے اپنے دائرہ کار کے بارے میں اس خوش فہمی کا شکار نہ ہوں کہ ان کے دائرہ کار میں حق کا انحصار ہے اور جو اللہ کے بندے اسلام کو بطور ایک مکمل نظامِ ہدایت کے پیش کرنے اور بطور دینِ کامل کے اس کے ایک ایک پہلو کو عصرِ حاضر کے استدلال کے مطابق نمایاں کرنے اور جدید جاہلیت کی گمراہیوں پر ضربِ کاری لگانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ان سے دور رہیں — بلکہ ان سے بدگمان ہوں —

اس روش سے نہ صرف اسلامی جدوجہد کو نقصان پہنچے گا بلکہ تبلیغ و مدارس کے حلقوں پر تخریب کاری کا الزام آئے گا۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ نے علماء کے بارے میں لکھا ہے

"اور علماء کی حیثیت زندگی کی اصل منجدھار سے ہٹی ہوئی ایک پتلی سی دھار کی ہوتی چلی گئی — تاآنکہ اب وہ اپنے محدود دائرۂ اثر کے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ جزیرے بھی دن بدن — نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا — کے مصداق روز بروز مختصر سے مختصر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔ (۶۶)

مجھے ادب سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ علماء کی اگر یہ حالت ہے

تو یہ طنز و تعریض کی بات نہیں بلکہ رنج وملال کی بات ہے اور اس کے محرکات میں ایک بڑا محرک مذہبی قیادت کا زوال ہے جس کی زد میں خود ڈاکٹر صاحب کی تحریک بھی ہے۔
اور یہ خوش فہمی مولانا مودودی صاحب کو بھی تھی کہ قوم کا ذہن ان کے ساتھ ہے۔
لیکن جب مرحوم اپنی قائدانہ جدوجہد اور دینی اور علمی کدوکاوش کا ثمرہ حاصل کرنے کی غرض سے عملی سیاست کے میدان میں کود ے تو عبرتناک شکست کے سوا انہیں کچھ حاصل نہ ہوا جو طبقہ ان پر لوٹ پوٹ ہوا کرتا تھا اس نے ووٹ دینے سے انکار کر دیا
اور ایک بے عمل معاشرہ پر دین کے غالب کرنے کا جو تجربہ کیا گیا تھا وہ ناکام ہوگیا۔ مرحوم جب تک کتابوں اور کاغذوں پر اللہ کے دین کو غالب کرتے رہے لوگ خوش ہوتے رہے اور حب ان کی زندگیوں پر دین کو غالب کرنے نکلے۔
اور اجتماعی وسائل اور مادی ذرائع پر خدا کے نیک بندوں کو بٹھانے کے لیے خیر امت اور امت مسلمہ سے ووٹ مانگے تو مرحوم نے کوفہ کے امام مسلم کی طرح اپنے آپ کو تنہا پایا۔ چند رفقاء باوفا کے علاوہ مجھے امید ہے کہ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے تقلید کے مسئلہ کی وضاحت کر کے علماء کرام کو مطمئن کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ اسی طرح موصوف امامت اور امارت کے مسئلہ کو دعوت دین کی تحریک کے لیے بنیادی مسئلہ نہیں بنائیں گے۔

ظاہر ہے کہ ہر اللہ کا بندہ خدا تعالیٰ کی توفیق سے باقاعدہ اس جدوجہد میں شامل ہوگا وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر رفاقت وتعاون کے عہد وپیمان میں کوئی تامل نہیں کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس احقر کو تنظیم اسلامی کے صلاح مستشارین میں شامل فرمایا ہے حالانکہ یہ احقر اس قابل نہیں ہے پھر پاک وہند کے درمیان ایک ایک دیوار حائل ہے، جس کو بڑی مشکل سے عبور کر کے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے، بہرحال ڈاکٹر صاحب جس انقلابی دعوت کو لے کر اٹھے ہیں اس کے بارے میں اسلام کے لیے بننے والے دیش میں یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ تحریک اگر ارباب اقتدار کے جبر وقہر سے محفوظ رہی تو انشاء اللہ کامیاب ہوگی اور ہمارا اس تحریک سے تعلق رضائے الٰہی کا سبب بنے گا۔ انشاء اللہ

مسئلہ رجم

چند اشکالات — اور اُن کے جوابات

—— مولانا سید حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور ——

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم ط

مسئلہ رجم کے بارے میں آجکل یہ سوال اُٹھتا ہے کہ رجم حدِ زنا ہے یا تعزیری کارروائی ہے۔ نیز یہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے یا نہیں۔ چونکہ بہت سے مسلمان اس بارے میں تفصیل جاننی چاہتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ثبوت کے لئے دلائل جمع کر دی جائیں۔ لوگوں کا عام خیال یہ سننے میں آیا ہے کہ رجم کی روایتیں بخاری مسلم وغیرہ میں آئی ہیں اور یہ کتابیں تیسری صدی میں لکھی گئی ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک آدمی اگر ایک بات کہے اور وہ دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے کہے تو آٹھویں دسویں آدمی تک پہنچتے پہنچتے وہ بات بدل جاتی ہے۔

ان دو اعتراضات کے ذریعہ چکڑالوی پرویزی جو در اصل افکار کے اعتبار سے معتزلہ ہیں، اسلام کے مسلمہ عقائد و احکام میں شکوک پیدا کرتے ہیں۔

اس لئے آجکل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علماء کو دلائل یعنی حدیثیں وہ پیش کرنی چاہئیں جو بخاری و مسلم وغیرہما رحمہم اللہ سے پہلے گذرے ہوئے محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں لہٰذا ہم اس مضمون میں وہی روایات پیش کریں گے۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حدیثوں کی روایت میں ہمیشہ سب سے زیادہ اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ محدث کی قوتِ حافظہ کتنی ہے۔ محدث اسی کو مانا جاتا تھا کہ جس کی روایتوں کو بار بار آزمایا جا چکا ہو کہ اس کی روایتوں میں ذرا بھی فرق نہیں آتا ورنہ اس سے حدیث نہیں لی جاتی تھی۔ عمر کا لحاظ بھی رکھا جاتا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ عمر کے آخری حصہ میں اس کا حافظہ متاثر ہو گیا ہو۔ جن محدثین کا حافظہ آخری عمر میں متاثر ہوا ہے ان کے

بارے میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ فلاں محدث کا حافظہ اس کی وفات سے اتنے سال پہلے متغیر ہو گیا تھا لہٰذا جن شاگردوں نے اس دور سے پہلے ان سے روایات سنی ہیں وہ معتبر ہیں جنہوں نے اس دور کے بعد سنی ہیں وہ معتبر نہیں ہیں - ہر آدمی کی ولادت، وفات علمی سفر، قوتِ حافظہ اس کی عادات کہ وہ حدیث کے بارے میں کتنی احتیاط کرتا تھا۔ سنتے ہی مان لیتا تھا یا اسکی تحقیق بھی کرتا تھا یہ سب معلومات تحریراً جمع کی گئی ہیں۔ خود با اعتماد ہونے کے لئے ثقہ کا لفظ لکھا جاتا ہے - اور اگر اسکی عادت تحقیق کی بھی تھی تو اسے ثبت بھی لکھتے ہیں اس طرح علم حدیث کے تمام راویوں کے حالات اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں - کتاب الجرح والتعدیل - التاریخ الکبیر - تہذیب الکمال، میزان الاعتدال - تاریخ یحیی ابن معین - لسان المیزان تہذیب التہذیب طبقات ابن سعد کتاب المجروحین - کتاب الضعفاء وغیرہ تو دستیاب ہیں ان میں تقریباً بیس ہزار لوگوں کے حالات ہیں - یہ کتابیں اسماء الرجال کی کتابیں کہلاتی ہیں: حدیث لینے کے بارے میں احتیاط کی حد انتہائی رہی ہے اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ جذبات میں کبھی غلط بات کہہ جاتا ہے تو ایسے شخص سے بھی روایت نہیں لیتے تھے۔

امام بخاری اور مسلم وغیرہ تک تین یا چار یا پانچ واسطوں سے حدیث پہونچی ہے - ان میں ہر شخص ان شرائط پر پورا اترتا ہے جو اوپر بیان کی گئیں ان کی روایتوں میں اور ان محدثین کی روایتوں میں جو کوفہ بغداد مدینہ منورہ شام اور مصر میں گذرے، باوجود ذرائع مواصلات نہ ہونے کے انتہائی یکسانیت ملتی ہے - بخارا سمرقند نیشاپور اور ترمذ کے محدثین کی کتابیں لے لیجئے جو دنیائے اسلام کے مشرق میں تھے اور امام طحاوی کی روایات لے لیجئے جو مصر میں دنیائے اسلام کے غربی حصہ میں گذرے ہیں ان میں جملے اور سطروں کی سطریں ملتی جلتی جائیں گی۔

اب آپ غور کریں کہ اگر ان شرائط پر پورے اترنے والے سمجھدار اور لائق ترین چار پانچ آدمی لائن میں لگا کر اپنی ایک بات آخری آدمی تک آپ پہنچانا چاہیں تو وہ بات بعینہٖ پہنچے گی یا بدل جائے گی — آپ سی - ایس، پی - اور پی، سی، ایس کرنے والوں میں بہترین حافظہ والے چن لیں پھر اس بات کا تجربہ کریں تو جو بات پہلے

آدمی نے کہی ہوگی بعینہ وہی بات آخری آدمی کہے گا یہ تو عام بات کا عام جواب ہے لیکن محدثین کی شرائط پر پورے اترنے والے لوگ لئے جائیں جو فی الوقت مل تو جائیں گے مگر لاکھوں میں ایک ملے گا جیسے یہ محدثین لاکھوں میں ایک تھے پھر ان میں سے ہر ایک ایسا ہو کہ وہ اس علم سے پوری دلچسپی رکھتا ہو اور ہر شخص کو یاد کرنے کا موقع بھی دیا جائے پھر وہ دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو بات پہنچائے یعنی ان کے حافظہ کا یہ حال ہو کہ ایک دفعہ ہی میں پوری بات ٹیپ کی طرح محفوظ ہو جاتی ہو اور مزید یاد کرنے کا موقع بھی دیا جائے پھر تیسرے چوتھے آدمی تک بات نہیں بدل سکتی۔ تجربہ کے طور پر ایسا امتحان ممکن بھی ہے اگرچہ محدثین کی جانچ اور ان کے امتحانات پھر بھی بہت زیادہ اور ساری عمر ہوتے رہے ہیں۔

ایسے تمام اصول کہ روایت کرنے والے کیسے ہوں اور روایت کے کیا کیا قاعدے ہیں۔ یہ بھی سب موجود ہیں۔ معرفۃ علوم الحدیث، المحدث الفاصل، کفایہ فی علم الروایہ، مقدمہ ابن صلاح، تدریب الراوی، شرح نخبۃ الفکر، الرفع والتکمیل۔ ممکن الحصول کتابیں ہیں۔ ان قواعد کے مطابق ہر روایت کا درجہ مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ اصول حدیث کی کتابیں کہلاتی ہیں۔

بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام نقل کئے گئے ہیں۔ مثلاً آپ جہاد میں جاتے ہوئے فلاں باغ سے گذرے وہاں باغ کے پھل کے وزن کا اندازہ لگایا اس قسم کی روایات جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرکات وسکنات سے تعلق رکھتی ہوں بہت ہیں، ان میں الفاظ بدلنے سے مطلب ایک ہی رہتا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قواعد واصول مقرر فرما دیئے ان میں الفاظ بدلیں گے تو بھی مفہوم ایک ہی رہے گا میراث کے قواعد کوئی بھی حساب دان احادیث سامنے رکھ کر یاد کرلے تو قاعدہ وہی رہے گا۔

لیکن محدثین نے اتنی احتیاط برتی ہے کہ ان میں بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے کلمات ہی باقی اور محفوظ رکھے ہیں۔ اس احتیاط کے ساتھ تین چار واسطوں سے امام بخاری ومسلم وغیرہ تک حدیثیں

پہونچی ہیں اور انہوں نے اپنی اپنی کتابیں اپنے اپنے معیار اور نقطہ نظر سے لکھی ہیں۔ سنین۔ تحریر حدیث صحابہ کرام کے زمانہ میں ہونے لگی تھی امام زہریؒ کے زمانہ میں جو صحابہ کرام کا زمانہ تھا یہ دستور عام ہو چکا تھا (الحفاظ للذہبی ص ۳۶۲ ج ۱ ومثلہ فی لسان المیزان) اس بارے میں ہم نے الگ باحوالہ مضمون لکھا ہے اس تحریر کے ساتھ وہ جمع نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمیں کوئی مسئلہ ثابت کرنے کے لئے ان ہی کتابوں پر انحصار کرنا پڑے ایسا ہرگز نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ وغیرہ، امام بخاری، مسلم وغیرہ سے بہت پہلے گذرے ہیں ان کی پیدائش حسب اختلاف مؤرخین ۸۰ھ میں امام بخاری کی پیدائش سے ایک سو چونتیس سال پہلے ہوئی ورنہ کم از کم ایک سو چودہ سال پہلے ہوئی جب وہ پیدا ہوئے تو امام اعظم کا مسلک (مسائل اجتہادیہ) تمام دنیا میں پھیل چکا تھا۔ جو دلیلیں یعنی حدیثیں امام اعظم کو پہونچیں انہوں نے ان سے مسائل سمجھنے کے اصول وضع کئے (اصول فقہ) اور مسائل استنباط کئے (یعنی نکالے)۔ وہ دنیا بھر کے علماء میں پہونچے اس طرح ہر حدیث اور مسئلہ دنیا بھر کے علماء کے بیشتر حصہ نے مانا اس پر عمل کیا اور فیصلے دیئے۔ ایسے مسائل کا انکار انکار حقیقت کے مترادف ہوگا۔ دنیائے اسلام کے چاروں امام اسی صد سالہ عرصہ میں گذرے ہیں جو امام بخاریؒ سے پہلے کا دور ہے۔

اس لئے مسئلہ رجم کے بارے میں مناسب ترین طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں ان ہی معروف ومسلم ائمہ اربعہ کی کتابوں میں جو روایات ہیں وہ اس مضمون میں لکھ دی جائیں تاکہ معلوم ہو کہ ہر مسئلہ پر پوری امت کا اتفاق چلا آرہا ہے تردد کی بھی گنجائش نہیں۔

ائمہ اربعہ میں سب سے پہلے امام جنکی علمیت وتقوی پر خود بخود امت مسلمہ کے سب سے بڑے حصہ نے اعتماد کیا اور ان کے مسلک وفتاوی پر چلنے لگے وہ امام اعظم ابوحنیفہ النعمان ہیں۔ رحمہ اللہ۔ امام اعظم تابعی بھی ہیں وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

رأى انس بن مالك غير مرة لما قدم عليهم	انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو متعدد بار دیکھا ہے

الکوفۃ (تذکرۃ الحفاظ)   جب وہ ان کے یہاں کوفہ آئے۔
ج ۱ ص ۱۶۸)
حافظ ابن حجر عسقلانی نے تحریر فرمایا ہے۔
رأی انساً —   حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے۔
تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۴۹

۲۔ دوسرے ایسے ہی جلیل القدر امام جن کے اصول و مسائل پر علماء امت کا دوسرا حصہ خود بخود بامر اللہ چلتا آیا ہے امام دار الھجرۃ (مدینہ منورہ) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہیں یہ مدینہ شریف ہی میں پیدا ہوئے وہیں وفات پائی - یہ عمر میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کم از کم تیرہ سال چھوٹے تھے اور تابعی نہ تھے۔

حنفی ائمہ میں امام ابویوسف رح امام اعظم کے شاگرد ہیں امام مالک رض سے انہوں نے نہیں پڑھا امام محمد رح نے امام اعظم امام ابویوسف اور امام مالک رح تینوں سے پڑھا ہے فقہ حنفی میں جہاں امام اعظم رح کا ذکر آتا ہے وہاں ان حضرات کا بھی ذکر آتا ہے۔

۳۔ دنیا میں ایسے تیسرے امام جنہیں ملت اسلامیہ نے اسی طرح قبول کیا اور انکی عظمت کا اعتراف کیا امام شافعی رح ہیں - یہ امام مالک اور امام محمد رح دونوں کے شاگرد ہیں - حافظ ذہبی فرماتے ہیں : ثم حفظ الموطا وعرضہ علی مالك مؤطا یاد کرکے امام مالک رح کو سنائی - وہ لکھتے ہیں : وکتب عن محمد بن الحسن وقر بختی : امام محمد بن الحسن سے انہوں نے بختی اونٹ کے وزن کے برابر کتابیں لکھیں (تذکرہ)۔

۴۔ دنیا میں ایسے چوتھے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے امام مالک رح کی روایات لیں اگرچہ وہ ان کے تقریباً ہمعصر تھے۔ لیکن امام شافعی رح کے شاگرد تھے اور امام ابویوسف کے بھی حافظ ذہبی نے امام ابویوسف کے حالات میں لکھا ہے - وعنہ محمد بن الحسن الفقیہ و احمد بن حنبل - ان سے امام محمد اور امام احمد بن حنبل نے پڑھا ہے (تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱ ص ۲۹۲) — امام ابویوسف سے امام لیث رح نے بھی روایت لی ہے لیث امام مالک رح کے معاصر تھے ان کی روایت عن یعقوب عن النعمان، امام طحاوی رح

نے اپنی جلیل القدر تصنیف شرح معانی الآثار باب القراءۃ خلف الامام میں دی ہے یعقوب (ابو یوسف) نعمان (ابو حنیفہ)

امام شافعیؒ کی عمر کا آخری حصہ مصر میں گذرا ہے وہ فرماتے ہیں کہ لیث لیس بدون مالکؒ لاان اصحابہ ضیعوہ یعنی لیث کا علمی مقام امام مالکؒ سے کم نہیں ہے سوائے اسکے کہ ان کے شاگردوں نے ان کے علوم محفوظ نہیں رکھے ضائع کر دیئے امام شافعیؒ جب مصر پہنچے ہیں تو لیثؒ وفات پا چکے تھے۔ ان کے شاگردوں سے انکی ملاقاتیں اور مذاکرات ہوئے۔

مسئلہ رجم ان مسائل میں سے ہے جو اسلام سے پہلے عیسائیوں میں اور ان سے پہلے یہودیوں میں انبیاء کرام پر نازل کردہ کتابوں میں موجود آرہے تھے اس لئے جب یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَا أُولٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ۔ پ۶ سورہ المائدہ آیت ۴۳	اور وہ تجھ کو کس طرح منصف بنائیں گے اور انکے پاس تو توراۃ ہے جس میں کہ اللہ کا حکم (موجود) ہے۔ پھر اسکے بعد (بھی) وہ (اس حکم سے) پھرتے ہیں۔ اور وہ ہرگز ماننے والے (ایمان لانے اور اس پر قائم رہنے والے) نہیں ہیں۔

اور ارشاد ہوا:

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا۔	ہم نے توراۃ نازل کی اس میں ہدایت اور نور ہے اس پر یہود کے فیصلے کرتے تھے (ان کے) پیغمبر جو کہ اللہ کے حکم بردار تھے۔

پ۶ سورۃ المائدہ آیت ۴۴

یعنی یہ مسئلہ آپ کے زمانہ کے یہودیوں کو معلوم تھا توراۃ میں موجود تھا۔ اور

رات مقدس کے احکام پر انبیاء کرام فیصلے کرتے آئے تھے اور ان کے بعد علماء بھی
الربانیون والاحبار - آیت ۴۴
نیز ارشاد ہوا کہ یہ احکام جیسے تورات میں اتارے گئے تھے ویسے انجیل میں بھی
باقی رکھے گئے تھے -

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ
آیت ۴۶

ان کے پیچھے انہی (موسیٰ علیہ السلام)
کے نقش قدم پر ہم نے عیسیٰ بن مریم
کو بھیجا تصدیق کرنے والا اپنے سامنے
توراۃ کی -

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا
أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَن لَّمْ
يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْفَاسِقُونَ -
پ ۶ سورہ المائدہ آیت ۴۷

اور چاہیئے کہ حکم (فیصلے) کریں انجیل
والے جو اللہ نے اس میں اتارا ہے
اس کے موافق اور جو کوئی اللہ کے
اتارے ہوئے (حکم) کے موافق
حکم (فیصلہ) نہ کریں تو وہی لوگ
نافرمان ہیں -

ان آیات کی تفسیر سمجھنے کے لئے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
نے ان آیات کا (تاریخی واقعہ) سبب نزول بحوالہ بغوی تحریر فرمایا ہے - کہ خیبر کے
ایک یہودی مرد و عورت نے جو معزز گھرانے کے تھے زنا کیا باوجودیکہ تورات میں اس
جرم کی سزا رجم (سنگسار کرنا) تھی مگر ان دونوں کی بڑائی مانع تھی کہ یہ سزا جاری
کی جائے - آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ شخص جو یثرب میں ہے (یعنی حضرت محمد صلی
اللہ علیہ وسلم) اس کی کتاب میں زانی کے لئے رجم کا حکم نہیں کوڑے مارنے کا ہے - تو
بنی قریظہ کے یہودیوں میں سے کچھ آدمی ان کے پاس بھیجو کیونکہ وہ ان کے ہمسایہ ہیں
اور ان سے صلح کا معاہدہ بھی کر چکے ہیں - وہ ان کا خیال معلوم کر لیں گے - چنانچہ
ایک جماعت اس کام کے لئے روانہ کی گئی، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم
کرے کہ زانی محصن کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں - اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیں تو ان پر
ایمان رکھ کر قبول کر لو - اور رجم کا حکم دیں تو مت مانو ان کے دریافت کرنے پر حضورؐ نے فرمایا

کہ تم میرے فیصلہ پر رضامند ہو گے؟ انہوں نے اقرار کر لیا خدا کی طرف سے جبرئیلؑ رجم کا حکم لے آتے وہ لوگ اپنے اقرار سے پھر گئے آخر حضورؐ نے فرمایا کہ فدک کا رہنے والا ابن صوریا تم میں کیسا شخص ہے؟ سب نے کہا آج روئے زمین پر شرائع موسویہ کا اس سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں۔ آپ نے اسکو بلوایا اور نہایت ہی شدید حلف دے کر پوچھا کہ تورات میں اس گناہ کی سزا کیا ہے باوجودیکہ دوسرے یہودؔ اس حکم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے جس کا پردہ حضرت عبداللہ بن سلام کے ذریعہ سے فاش ہو چکا تھا تاہم ابن صوریا نے جواُن کا مسلّم معتمد تھا کسی نہ کسی وجہ سے اس کا اقرار کر لیا کہ بے شک توراۃ میں اس جرم کی سزا رجم ہی ہے بعدہ اس نے سب حقیقت ظاہر کہ کس طرح یہود نے رجم اڑا کر زنا کی سزا یہ رکھدی کہ زانی کو کوڑے لگائے جائیں اور کالا منہ کر کے اور گدھے پر الٹا سوار کرا کر گشت کرایا جائے۔ الحاصل حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مرد و عورت پر رجم کی سزا جاری کی اور فرمایا اے اللہ آج میں پہلا شخص ہوں جسنے تیرے حکم کو دُنیا میں زندہ کیا اسکے بعد کہ وہ اُسے مردہ کر چکے تھے۔

ان آیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام میں وہی حکم باقی رکھا ہے جو انجیل میں تھا اور وہی حکم اس سے پہلے توراۃ میں تھا اور انجیل میں اجمالا اسکی تصدیق تھی۔ (جاری ہے)

بقیہ: کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟

کے نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ نیز یہ کہ ایران کی تبدیلی کو اسلامی انقلاب قرار دیا بھی جاسکتا ہے یا نہیں! اس موضوع پر ان شاء اللہ آئندہ گفتگو ہوگی۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم!!

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

محمد یونس جنجوعہ

بدعت کا لفظی معنیٰ نئی چیز، ایجاد اور انوکھے کے ہیں لیکن اسلامی اصطلاح میں یہ لفظ ایسے امور پر بولا جاتا ہے جو دین میں نئے نکالے گئے ہوں۔ امور دین میں ہر قسم کے اضافے کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی زندگی کے آخری ایام میں تکمیل و اتمام دین کی خوشخبری سنا کر یہ بات بالکل واضح کر دی گئی کہ امور دین میں اب کسی قسم کی کوئی خامی باقی نہیں رہی بلکہ دین تکمیل اور اتمام کے درجے کو پہنچ چکا ہے۔ مشاہدہ بھی یہی بات بتاتا ہے کہ درجہ کمال صرف ایک ہی ہوتا ہے جو کمی بیشی کا متحمل نہیں ہو سکتا جس طرح کمی درجہ کمال میں نقص پیدا کرتی ہے اسی طرح اضافہ بھی قصور پیدا کرتا ہے کیونکہ جس شے میں اضافے کو قبول کرنے کی گنجائش موجود ہو وہ کامل نہیں ہو سکتی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے پس وہ مردود ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پیش بندی نہ کی جاتی تو دین مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا اور اس میں تکمیلی شان بھی باقی نہ رہتی جو چاہتا حسن و خوبی کے نام پر اس میں اضافہ کرتا اور یہ اضافے اصل دین کا اسی طرح حلیہ بگاڑ دیتے جس طرح یہود و نصاریٰ نے اسلامی تعلیم کا ستیاناس کیا۔

دین کا پورا نظام عہد رسالت کے آخری ایام میں جاری و ساری ہو گیا اور پھر خلافت راشدہ کے دور میں بھی رائج رہا اگر دورِ صحابہ میں چند چیزیں دین میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام نے باہمی مشورے سے کسی کام کو منشاء رسالت سمجھا اور یہ بھی جانا کہ عہد رسالت میں اس کی ترویج میں کیا چیز حائل تھی چنانچہ اس کو رائج کیا۔

ایسے امور کو اول تو ہم اس لیے بدعت نہیں کہتے کہ صحابہ کرام مزاج شناسِ رسول تھے۔ یہ بات محال ہے کہ وہ کسی بدعت پر اجماع کرتے۔ دوم اس لیے کہ خود رسول پاکؐ نے صحابہ کرام کے طریق کار کو اپنی سنت اور امت کے لیے قابل تقلید قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو اختیار کرنا لازم ہے۔

مثال کے طور پر تراویح کا نظام نہ عہد رسالت میں رائج تھا اور نہ ہی عہد صدیقی میں۔ مگر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں نماز تراویح کا نظام قائم کر دیا جس پر تمام صحابہ کا اجماع ہوا اور کسی نے مخالفت نہ کی۔ اور امت نے اس کو سنت کے طور پر اپنایا۔ نظام تراویح کی ترویج کے ضمن میں صحابہ کرام کے سامنے یہ بات بالکل واضح تھی کہ اللہ تعالی کے ہاں رمضان شریف کی راتوں میں عبادت نہایت پسندیدہ ہے نیز یہ کہ نظام تراویح کے قیام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ عبادت اپنی عظمت کی وجہ سے فرضیت کے درجے میں آجائے گی اور یہ بات امت کے عام افراد پر بھاری ہو گی۔ دور رسالت کے اختتام پر سلسلہ وحی بند ہو جانے کے باعث رمضان کی راتوں کے قیام کا فرض ہونا ممکن نہ رہا تو امیر المومنین عمر فاروقؓ نے جملہ صحابہ کرام کے مشورے سے رسول پاکؐ کی پسندیدگی کے باعث اور حصول رضائے خداوندی کے لیے نظام تراویح کو رائج کر دیا۔ وگرنہ عہد صحابہ میں بدعت کی روک تھام کا پورا انتظام کیا گیا اور کسی ایسی بات کو دین میں داخل نہ ہونے دیا گیا جس کی نظیر عہد رسالت میں نہ ملتی ہو کیونکہ اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تعلیمات ان کے سامنے تھیں یہ وہی عمر فاروقؓ ہیں کہ جب لوگوں نے بیعت رضوان والے ببول کے درخت کا احترام کرنا اور زیارت کے لیے جانا شروع کر دیا تو انہوں نے اس درخت کو جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکا کہ اس طرح کوئی بدعت رواج نہ پائے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے بہتر بات خدا کی کتاب اور بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور بدترین کام وہ ہیں جن کو دین میں نیا نکالا گیا ہو۔ اور ہر بدعت یعنی دین میں نئی نکالی ہوئی چیز گمراہی ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

جو لوگ بدعت کی برائی میں لچک پیدا کرتے اور حسن ظن اور حسن نیت کی دلیل

پیش کرتے ہیں انکا خیال صحیح نہیں کیونکہ بدعت تو کہتے ہی اس کام کو ہیں جو دین کا کام سمجھ کر اور حصول رضائے الہی کے لیے اختیار کیا جائے لیکن اس کی مثال سنت میں نہ ملتی ہو کیونکہ دین میں نئی چیز کا اطلاق اس چیز پر تو ہو نہیں سکتا جس میں فی نفسہ برائی موجود ہو۔ بلکہ برائی کی تو دین میں سرے سے گنجائش ہی نہیں رکھی گئی۔ البتہ بزعم فکر انسانی دین میں اچھائی کے اضافے کا امکان موجود تھا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری صراحت کے ساتھ ختم کر دیا تاکہ دین اپنی اصلی صورت میں اور تکمیلی شان کے ساتھ قائم رہے۔

اسلامی ممالک میں عام طور پر اور برصغیر میں خاص طور پر جن بدعات کو اختیار کیا گیا ہے ان کے پیچھے بھی حبِ رسول اور حصولِ رضائے الہی کے جذبے کا دعویٰ کیا جاتا ہے لیکن اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ حبِ رسول اور رضاءِ الہی کی بہترین صورت تو صحابہ کرامؓ نے اختیار کر رکھی تھی اگر حبِ رسول اور حصول رضائے الہی کے کچھ تقاضے ان بدعات کو اپنا کر پورے کیے جا رہے ہیں جو صحابہ کے دور میں رائج نہ تھیں تو صحابہ کرام کے اسلام میں خامی تسلیم کرنا پڑتی ہے جو محال ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کے طرزِ عمل کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قابل اعتماد جانا ہے اور خدائے بزرگ و برتر نے اس طائفہ کی تعریف کی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حبِ رسول اور دینی استقامت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی سنت کو مضبوطی سے پکڑا اور عملاً اختیار کیا۔ انہوں نے پوری زندگی قرآن و سنت کے مطابق بسر کی البتہ حبِ رسول اور دینی استقامت کی نمائش کے لیے جلوس اور میلاد کی محافل منعقد نہ کیں۔ ذکرِ نبیؐ تو خود خدا نے بلند کر دیا۔ جو عہد رسالت، عہد صحابہ اور موجودہ دور میں بھی بلند ہی ہے اور بلند رہے گا لیکن اگر بلند بانگ نعروں، بے ہنگم اجتماعات، پر از تعصب مجالس اور نمائشی جلسوں سے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ کا تقاضا پورا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تقاضا نہ عہد رسالت میں پورا ہوا اور نہ عہد صحابہ میں۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ استقامت فی الدین کے تقاضے جس طرح جماعتِ صحابہ نے پورے کیے وہی جامع اور مکمل ہیں۔ آج بھی اگر حبِ رسول اور رضائے الہی کے جذبہ کے تحت بدعات کو رواج دینے والے لوگ اپنے دیگر امور میں تابع سنت نظر آئیں تو ان کے جذبے کو حسن ظن کے تحت لانے کا جواز پیش کیا جا سکتا ہے لیکن جب ان نمائشی محافل میں اکثریت بے عمل بلکہ بدعمل لوگوں کی ہوتی ہے جو نماز کی پابندی

وعدے کی پاسداری، اخلاق کی بلندی، کسب رزق حلال کی اہمیت سے بھی بے خبر ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو کسی نمائشی جلوس میں نعرے لگاتے دیکھ کر اللہ کا نبیؐ اور خود خدائے علیم و خبیر تو دھوکہ نہیں کھا سکتے البتہ بے شعور لوگوں میں وہ اپنے عاشق رسول ہونے کا رعب جما سکتے ہیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ دین میں شامل تمام امور کے تقاضے صحابہ کرامؓ نے بطریقِ احسن پورے کر دیئے اور امت کی راہنمائی کر دی اب دین میں کسی امر کا اضافہ خواہ وہ کتنی ہی حسن نیت اور حصولِ رضائے الٰہی کے لیے ہو قابل قبول نہیں۔ قرآن پاک کی سورہ حدید کے آخری رکوع میں مذکور ہے کہ نصاریٰ نے گناہوں سے بچنے اور حصولِ رضائے الٰہی کی خاطر ترک دنیا کی بدعت اختیار کی۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم نہ کی تھی چنانچہ وہ اس کو نباہ نہ سکے معلوم ہوا کہ گناہوں سے بچنے اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے وہ کوشش اور طرزِ عمل بھی بدعت ہے جو شارع نے دین میں شامل نہ کیا ہو۔ حالانکہ گناہوں سے بچنا اور حصول رضائے الٰہی امر محمود ہے مگر کوئی بات محمود نہیں ہو سکتی جب تک اس کا طریقہ تعلیمات نبوی کے مطابق نہ ہو۔ تین دن کے بھوکے کو روزے کا ثواب نہ ملے گا مگر سنت نبوی کے مطابق چند گھنٹے کا روزہ مقبول و مبرور اور کار ثواب ہو گا۔

حدیث پاک میں بار بار کتاب و سنت پر انحصار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت عرباضؓ بن ساریہ سے روایت ہے" آپؐ نے فرمایا .... پس تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے اور اختلاف کثیر دیکھے ایسی حالت میں تم پر لازم ہے کہ میرے اور میرے خلفائے راشدین کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑو اور اسی طریقہ پر بھروسہ کرو اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو اور بچو تم دین میں نئی باتیں پیدا کرنے سے اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (مشکوٰۃ)

حب رسول اور حصول رضائے الٰہی کا مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ اسوۂ حسنہ کو اپنایا جائے۔ اظہار دین کے پیغمبرانہ مشن کو پورا کرنے میں کوشش کی جائے۔ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کر کے ناقابلِ شکست قوت بنا دیا جائے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو تمام نمائشی اور اضافی امور بے معنی اور فریب محض ہیں کیونکہ اگر ہم حب رسول اور استقامت چاہتے ہیں تو صحابہ کرام کے طرز عمل سے اچھی مثال کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔

دینِ اسلام خالق کائنات کا مرتب کردہ دین ہے اور انسانوں کے لیے ہے جنہیں خود اس علیم و خبیر نے بنایا ہے لہذا اس دین کا کامل ہونا واضح ہے اگر غور کیا جائے تو اس کی ہر بات میں تکمیلی شان نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے دوسرے ادیان باطلہ کی کسی چیز کو اخذ نہیں کیا بلکہ دوسرے ادیان اور نظاموں نے دینِ اسلام سے بہت سی باتیں اخذ کیں لیکن یہ دینِ اسلام کے پیروکاروں کا زوال اور دین کی تکمیلی شان سے بے خبری ہے کہ ان کو دوسرے نظاموں میں حسن اور کشش نظر آنے لگی۔ برصغیر میں ہندو اور مسلمان سینکڑوں سال ساتھ ساتھ رہے۔ ہندو اپنے ایک تہوار پر اپنی عمارات پر روشنی کرتے تھے مسلمانوں نے بھی ایک تہوار ایجاد کر لیا اور اپنی عمارتوں پر چراغاں کے علاوہ آتش بازی کا مظاہرہ بھی کرنا شروع کیا وہ یہ بات بھول گئے کہ دین اسلام تو فضول خرچی سے روکتا اور ریاکاری (نمائش و نمود) سے روکتا ہے۔ عیسائیوں نے یوم ولادتِ مسیحؑ پر جشن کا اہتمام کیا مسلمانوں نے ان کی نقالی کی اور لغویات میں نصاریٰ کو پیچھے چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح عیسائیوں نے جذبہ فراریت کے تحت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو چھوڑ کر نمائش محبت رسول پر اکتفا کیا اسی طرح مسلمان بھی کتاب و سنت کے احکام کی پیروی چھوڑ کر ناقص مسلمان ہو گئے تو اس نقص کو چھپانے کے لیے وہ بھی نمائشی اظہار محبت کے ذریعے بدعملی کے باوجود بزعم خویش اتقیاء و اصفیاء بن رہے ہیں۔

دین اسلام کی تعلیم تو یہ تھی کہ رسول پاکؐ کے طریقوں کو اپنایا جائے اور آپؐ کے اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے مطابق طرزِ عمل اختیار کر کے صحت مند اسلامی معاشرہ استوار کیا جائے لیکن سہل انگاری، غفلت، سستی، کم ہمتی اور ضعفِ ایمان نے اصل سے توجہ ہٹا کر خود ساختہ رسوم کی پیروی پر آمادہ کر دیا۔ اور چند نمائشی طریقوں سے حصولِ مقصد کی باطل امید پیدا کر دی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جسے حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں "جس شخص نے میری امت کے بگڑنے کے وقت میری سنت کو اپنا راہنما بنایا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا" (مشکوٰۃ)

بدعات کے خوگر لوگوں پر جب بدعات کی مذمت واضح کی جائے تو وہ کہتے ہیں اگر نئی چیزیں مثلاً عینک، لاؤڈ سپیکر، ہوائی جہاز، جدید طرزِ تعمیر کو اختیار کرنا جائز ہے تو گیارہویں شریف، عرس اور تعزیے، محافل میلاد کیوں ناجائز ہوئیں جبکہ ان میں اتفاق

فی سبیل اللہ اور درود وسلام بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ دین میں نئی چیز بدعت ہوتی ہے مگر دنیا کی نئی چیزیں ایجادات کہلاتی ہیں جن سے فائدہ اٹھانا جائز ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ جب معروف سیاسی، سماجی، مذہبی اور قومی راہنماؤں کی سالگرہ منائی جاتی ہے تو نبی اکرمؐ کے میلاد منانے میں کیا حرج ہے تو یہاں بھی غلط فہمی واضح ہے کہ سیاسی اور قومی اہمیت کی شخصیات کے نام اور کارناموں کو زندہ رکھنے کیلئے ہم ان کی یاد میں ایام مناتے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان نامور ہستیوں کے معدوم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن آنحضرتؐ کی حیثیت ان لوگوں سے مختلف ہے کیونکہ آپؐ کے ذکر کی بلندی اور دوام کا خود کارنظام خالق کائنات نے دنیا میں جاری فرما دیا ہے لہٰذا اس بات کی حاجت ہی نہیں رہی کہ مصنوعی طریقوں سے آپؐ کے ذکر کو بلند کیا جائے بلکہ ایسا کرنے سے حسن نیت کے باوجود منفی نتائج برآمد ہونا لازمی ہے کیونکہ دیگر شخصیات کے ساتھ ہمارا جو تعلق ہے وہ محض دنیاوی ہے لیکن آنحضرتؐ کے ساتھ جو تعلق ہے وہ سراسر دینی ہے اور دینی تعلق کے تقاضے دنیاوی تعلق کے تقاضوں سے مختلف ہیں اس فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کمال محبت کے باوجود خلافت راشدہ میں کبھی ربیع الاول کے مہینے میں ذکر رسول کی خاطر اجتماعی محافل میلاد کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

بعض لوگ نفلی نوعیت کی عبادات کو مستقلاً اختیار کر لیتے ہیں اس حد تک تو یہ بات مستحسن ہے، لیکن جب اپنے نفلی معمولات کو پوری امت پر لازم قرار دینے کی کوشش کی جائے اور اختیار نہ کرنیوالوں کو مطعون کیا جائے تو یہ امر بدعت کہلاتا ہے کیونکہ یہ دین میں نئی بات ہے۔ پوری امت کے لیے عبادات اور وظائف کو لازم قرار دینا صرف پیغمبر خدا کا منصب ہے مذکورہ عمل اختیار کرنے والے یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار سے تجاوز کرکے پیغمبر کی حیثیت اپنا رہے ہیں جو شرک فی الرسالۃ کا ارتکاب ہے۔

خود رحمت للعالمین کا اسوہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے نفلی معمولات امت پر واضح تو فرمائے لیکن لازم نہ کیے بلکہ اختیاری رکھے تاکہ امت پر بوجھ نہ ہو تو آج کون شخص پوری امت کے لیے کوئی نیا عمل تجویز کرکے رائج کر سکتا ہے۔

آج کے دور میں بدعات کو ختم کرکے صحیح اسلامی طرز زندگی اپنانے کی ضرورت ہے۔ پس سنت کے احیاء میں جس قدر محنت ہو سکے کرنا چاہیئے یہی طریقہ حصول حب رسولؐ کے لیے مستند اور مجرب ہے۔ ●●●●

شامِ الہدیٰ ـــــ کراچی

ـــــ (دوسری نشست) ـــــ

مرتبہ: نعیم الطاف ـــــ بہ تعاون: شیخ جمیل الرحمٰن

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے پاکستان ٹیلی ویژن کے مقبول و مؤثر ترین پروگرام "الہدیٰ" کے تسلسل کو کراچی میں برقرار رکھنے کے لیے جب میرے بچپن کے ساتھی شیخ منصور فیروزالدین بویجہ مینجنگ ڈائریکٹر تاج محل ہوٹل کراچی نے ہوٹل کے وسیع و عریض اور عالی شان موتی محل ایڈیٹوریم کو ہر انگریزی ماہ کی ہر آخری سوموار کو بلا معاوضہ دینے پر رضامندی کا اظہار کیا تو ۲۹ نومبر ۸۴ء کو پہلی نشست کے انعقاد سے قریباً ایک ماہ قبل تنظیم اسلامی کراچی کے ذمہ دار رفقاء اڈیٹوریم کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لے گئے تو اس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے بعض رفقاء کو یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر اڈیٹوریم پورا پُر نہ ہو سکا اور اس کا کوئی حصہ بھی خالی رہا تو اس کا خوشگوار اثر مترتب نہیں ہوگا۔ اس اندیشہ کی وجوہ یہ تھیں کہ تاج محل ہوٹل کسی رہائشی آبادی میں واقع نہیں ہے۔ اور اس روٹ پر بس یا منی بس بھی بہت کم چلتی ہیں جب کہ بعض رفقاء نہایت پُرامید تھے کہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے اڈیٹوریم نہ صرف بھر جائے گا بلکہ ممکن ہے کہ اپنی وسعت کے باوصف ناکافی ثابت ہو ـــ الحمد للہ آخر الذکر رفقاء کی توقع پوری ہوئی اور نہ صرف اڈیٹوریم کی تمام نشستیں پُر ہو گئیں بلکہ قریباً دو سو حضرات کو اسٹیج اور نشستوں کے درمیان فرش پر بیٹھنا پڑا۔ اس پہلی نشست کی مفصل روداد گذشتہ ماہ کے "میثاق" میں شائع ہو چکی ہے۔

"شامِ الہدیٰ" کی دوسری نشست کا ۲۶ نومبر ۸۴ء بروز سوموار بوقت ۶½ بجے بعد نمازِ مغرب انعقاد ہوا۔ پہلی نشست کی غیر معمولی حاضری کے پیشِ نظر محدود تعداد

میں دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے۔ نیز اخبارات میں پبلسٹی بھی نصف کر دی گئی تھی جن حضرات کو دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے ان سے درخواست کی گئی تھی کہ عدم شرکت کی صورت میں فون پر اطلاع دے دیں اور شرکت کی صورت میں دعوت نامہ ساتھ لائیں۔ چونکہ ایسے حضرات کے لیے کرسیوں پر نشستیں محفوظ کرنے کا اہتمام پیشِ نظر تھا۔ ساڑھے چھ بجے سے قبل ہی آڈیٹوریم کی تمام نشستیں پُر ہو گئی تھیں۔ اور جو حضرات دعوت نامے ساتھ لے کر آئے تھے، ان کے لیے نشست کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ نشستوں کے پُر ہو جانے کے بعد آنے والے حضرات اسٹیج اور کرسیوں کے درمیان فرش پر بیٹھنے شروع ہو گئے جہاں قریباً ڈھائی سو افراد کے لیے سکڑ سکڑا کر بیٹھنے کی گنجائش تھی۔

ٹھیک ساڑھے چھ بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ چنانچہ لوگوں کو اسٹیج پر بٹھانا شروع کیا گیا جہاں تقریباً دو سو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ دس منٹ بعد اسٹیج پر بھی تِل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ بعد ازاں اسٹیج تک جانے والی نشستوں کے درمیان تین اطراف میں جو سیڑھیاں تھیں، نیز اسٹیج کے اور نشستوں کے درمیان دو طرف آمد و رفت کے دروازوں کے مابین جو گنجائش تھی، وہاں لوگوں نے بیٹھنا شروع کیا۔ چنانچہ قریباً سات بجے تک یہ جگہیں بھی پُر ہو گئیں۔ پھر نشستوں اور دیواروں کے درمیان جو جگہ تھی وہاں بہت سے لوگوں کو کھڑا ہونا پڑا۔ جن حضرات کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، ان میں سے جو حضرات پونے سات بجے تک تشریف لے آئے تھے، اُن کے لیے نشستوں کا انتظام کر دیا گیا تھا جن کو ہمارے رفقاء نے خود بیٹھ کر محفوظ کر رکھا تھا۔ لیکن ایسے حضرات جو سات بجے کے قریب یا اُس کے کچھ دیر بعد تشریف لائے، ہمیں افسوس ہے کہ ان کے لیے نشست کا انتظام کرنے سے ہم قاصر رہے۔ اکثر حضرات تو فرش پر بیٹھ گئے، جن میں بڑی معزز شخصیتیں شامل تھیں۔ جیسے ایڈمرل ایم۔ آئی ارشد صاحب، چیئرمین کراچی پورٹ ٹرسٹ۔ بعض حضرات کو کوئی جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ناچار واپس جانا پڑا۔ جن میں ملک کی نامور و محترم شخصیت جناب حکیم محمد سعید جیسی ہستی بھی شامل تھی۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی معزز شخصیتوں کو فرش پر بیٹھنا پڑا یا جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ناچار واپس جانا پڑا۔ اوپر گیلری میں خواتین

نشستیں اور درمیانی سیڑھیاں تک خالی جگہیں بھی پُر ہو گئی تھیں اور اکثر خواتین کو گیلری میں داخل ہونے کے راستوں کے باہر کے ننگے فرش پر بیٹھنا پڑا۔ الغرض پورے آڈیٹوریم میں "تِل دھرنے کی جگہ بھی نہیں تھی" کے محاورے کی عملی تفسیر کا نقشہ بنا ہُوا تھا۔ محتاط اندازہ یہ ہے کہ شرکاء کی تعداد کسی طرح بھی تین ہزار سے کم نہیں تھی۔ جس میں ہر شعبۂ زندگی (Walk of Life) سے تعلق رکھنے والے حضرات شریک تھے۔ اور کم و بیش ڈھائی سو افراد کو جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ناچار واپس جانا پڑا۔

جیسا کہ سابقہ روداد میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ٹی۔وی پر جب "الہدیٰ" بند کیا گیا تھا، تب تک مطالعۂ قرآن حکیم کا نصف حصہ مکمل ہُوا تھا جو سورۃ الحجرات پر ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تسلسل کو قائم کرنے کے لیے "شامِ الہدیٰ" کی پہلی نشست میں محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے سورہ حجرات ہی کا درس دیا تھا۔ یہ سورہ مبارکہ عملِ صالح کے ضمن میں قومی، ملی اور سیاسی زندگی سے متعلق قرآن حکیم کی جامع ترین سورہ کے مقام کی حامل ہے۔ سورۃ العصر میں جو اس منتخب نصاب کی اساس ہے، نجاتِ اُخروی کی جن چار ناگزیر شرائط کا بیان ہے یعنی (۱) ایمان۔ (۲) عملِ صالح (۳) تواصی بالحق اور (۴) تواصی بالصبر۔ تو سورہ حج کے آخری رکوع سے تواصی بالحق کے مباحث شروع ہوتے ہیں۔ اسی تواصی بالحق ہی کے لیے قرآن مجید میں متعدد اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے جہاد فی سبیل اللہ۔ شہادت علی الناس۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اظہار دین الحق، اقامتِ دین، تکبیرِ رب — اسی عمل کا ذروۂ سنام یا نقطۂ عروج ہے قتال فی سبیل اللہ۔

لہٰذا "شامِ الہدیٰ" کی دوسری نشست میں محترم ڈاکٹر صاحب نے سورہ حج کے آخری رکوع کے درس سے ان مباحث کا آغاز فرمایا۔ یہ رکوع چھ آیات پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی چار آیات میں پوری نوعِ انسانی کو یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کے الفاظ سے خطاب ہے جس میں قرآن کی اساسی دعوت یعنی دعوتِ ایمان کا خلاصہ "کوزے میں سمندر" کے مصداق آجاتا ہے اور آخری دو آیات میں خطاب یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے ہوتا ہے جس میں اُمّ "دعوتِ عمل"

خلاصہ آجاتا ہے جس کا مطالبہ قرآن حکیم ہر اس شخص سے کرتا ہے، جو ایمان
ہو یعنی دعوتِ ایمان کو قبول کرنے کا اعلان و اعتراف کرے ——
ٹے کے درس میں صرف پہلی چار آیات کا بیان ہی مکمل ہو سکا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب
ن نے فرمایا کہ بقیہ دو آیات کا درس ان شاء اللہ آئندہ نشست میں ہو گا۔
ٹے کے اس درس کے دوران شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے کرسی یا فرشی
نشست چھوڑی ہو۔

پہلی نشست میں سورہ حجرات کو ایک بڑے اسکرین پر سلائیڈ کے ذریعے
نے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ پچھلی نشستوں پر تشریف فرما
ت اور گیلری میں خواتین کو اسکرین پر سورہ مبارکہ کے پڑھنے میں شدید دقت پیش
تھی۔ اس کا ازالہ اس مرتبہ اس طرح کیا گیا کہ سورہ حج کے آخری رکوع کا متن
منتخب نصاب میں اس کے متعلق تحریر شدہ نکات پر مشتمل آٹھ صفحات کا
ٹ "بزمِ احباب الہدیٰ" کی جانب سے طبع کرا کے شرکاء میں تقسیم کر دیا گیا۔
کی بدولت ان کو یہ سہولت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ درس کے ساتھ ساتھ متن
پیشِ نظر رکھ سکتے تھے۔

درس کے اختتام پر ہوٹل کے Basement میں واقع مسجد میں
م ڈاکٹر صاحب کی اقتداء میں نمازِ عشاء باجماعت ادا کی گئی۔ موصوف نے
ام پر اعلان فرما دیا تھا کہ نماز کے بعد آڈیٹوریم ہی میں آج کے درس کے متعلق
ل و جواب کی نشست ہو گی۔ اس مقصد کے لیے سورہ حج کے متن کے ساتھ ہی
ل لکھنے اور اپنا نام و پتہ درج کرنے کے لیے فارم بھی بزم کی طرف سے شرکاء
تقسیم کر دیے گئے تھے۔

سوا گیارہ بجے شب کے قریب سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی جس میں قریباً
سو حضرات شریک رہے — جو متعدد سوالات فقہی نوعیت کے تھے، اُن کے
ب سے محترم ڈاکٹر صاحب نے معذوری کا اظہار فرمایا۔ درس سے متعلق بھی کافی
لات تھے جن میں سے سب کے موصوف نے شافی اور تسلی بخش جوابات دیے۔
نشست قریباً پون گھنٹے تک جاری رہی۔ اور دس بجے شب بحمد اللہ

اختتام پذیر ہوئی۔

حسب سابق اس درس اور سوالات و جوابات کے عام کیسٹ اور وڈیو کیسٹ بھی تیار کیے گئے جو نشر القرآن کیسٹ ۳۶ سی کے ماڈل ٹاؤن لاہور نمبر ۱۴۔ اور شائننگ ٹریڈرز رفیع منیشن بالمقابل آرام باغ شاہراہِ لیاقت کراچی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۴ء کی آخری سوموار ۳۱ تاریخ کو پڑ رہی تھی لیکن چونکہ قرآن اکیڈمی میں یکم دسمبر ۱۹۸۴ء سے ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ء تک چالیس روزہ ایک تربیتی پروگرام کا آغاز ہو رہا تھا جس میں محترم ڈاکٹر صاحب کو روزانہ درس قرآن اور تنظیم اسلامی کی دعوت پر مشتمل تالیفات پر لیکچرز دینے تھے لہٰذا اس دوران موصوف کا لاہور سے کراچی تشریف لانا مشکل تھا۔ چنانچہ نشست کے اختتام سے قبل ہی ڈاکٹر صاحب نے اعلان فرمایا کہ دسمبر کی آخری سوموار کی "شامِ الہدیٰ" کا انعقاد نہیں ہو سکے گا۔ اس کی تلافی کی صورت یہ ہو گی کہ ان شاء اللہ جنوری ۱۹۸۵ء کی آخری سوموار کو جو نشست منعقد ہو گی، وہ مسلسل تین دن تک جاری رہے گی۔ پہلی نشست میں سورہ حج کی بقیہ دو آیات کے درس کی تکمیل ہو گی اور دوسرے اور تیسرے دن یعنی دو نشستوں میں سورہ الصف کا درس مکمل ہو گا۔

تاج محل کی انتظامیہ سے اس کارِ خیر کے لیے مسلسل تین دن تک آڈیٹوریم استعمال کرنے کی منظوری حاصل کر لی گئی تھی جس کے لیے محترم ڈاکٹر صاحب نے ہوٹل کی انتظامیہ کے لیے ہدیہ تبریک و تشکر پیش کیا۔

لہٰذا ماہنامہ میثاق کے کراچی کے قارئین سے التماس ہے کہ وہ نوٹ فرمالیں کہ ان شاء اللہ العزیز "شامِ الہدیٰ" کی تین نشستیں ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ جنوری ۱۹۸۵ء، دوشنبہ (پیر)، سہ شنبہ (منگل) اور چہار شنبہ (بدھ) کو بعد نمازِ مغرب ساڑھے چھ بجے تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوں گی۔ نشست کی یقینی دستیابی کے لیے مناسب

ہوگا کہ نمازِ مغرب کی ادائیگی کا اہتمام ہوٹل کے
BASEMENT کی مسجد میں کیا جائے۔

قرآن حکیم کے علوم و معارف اور اس کے اعجازات سے واقفیت حاصل کرنے کا جو ذوق و شوق کراچی کے تعلیم یافتہ افراد میں پروان چڑھ رہا ہے اور محترم ڈاکٹر صاحب کے نہایت مدلل و پُر تاثیر اسلوبِ خطاب سے جن قلوب میں قرآن حکیم کے انقلابی فکر کی تفہیم کا جو شغف روز افزوں ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ موتی محل آڈیٹوریم بھی، جس سے وسیع شاید ہی پاکستان میں کوئی دوسرا آڈیٹوریم ہو ۔ ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ اور توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز آئندہ "شامِ الہدیٰ" کی نشستوں میں اس نشست میں شریک ہونے والے افراد کے مقابلے میں آئندہ تشریف لانے والے افراد کی تعداد کہیں زیادہ ہوگی۔ لہٰذا یہ انتظام بپیشِ نظر ہے کہ تاج محل ہوٹل کی انتظامیہ سے درخواست کی جائے کہ وہ ہوٹل کا دوسرا ہال جو "تاجی ہال" کے نام سے موسوم ہے اور جہاں آٹھ سو نشستوں کا انتظام بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ اس کارِ خیر کے لیے عنایت فرمادیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ ان شاء اللہ ہوٹل کی انتظامیہ اس درخواست کو ضرور منظور کرلے گی اور بزم کے ساتھ تعاون کرے گی۔ اس ہال میں ٹیلی ویژن یا بڑی اسکرین پر موتی محل کے پروگرام کو براہِ راست ریلے کرنے کا انتظام کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مدرس، خطیب، مقرر آنکھوں کے سامنے موجود ہو تو اثر پذیری میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید سے یہ انتظامات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تو "تاجی ہال" میں تشریف فرما حضرات نہ صرف درس سُن سکیں گے بلکہ اسکرین پر وہ محترم ڈاکٹر صاحب کو درس دیتے ہوئے دیکھ بھی سکیں گے اور جگہ نہ ملنے کے باعث کسی کو بھی ناچار واپس جانے کا ان شاء اللہ موقع نہیں آئے گا۔

بید اللہ التوفیق وعلیہ التکلان
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رفتارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا دورۂ ملتان و بہاولنگر

۶ نومبر ۱۹۸۴ء : امیرِ تنظیم آج عرصہ ۸ ماہ بعد ملتان تشریف لا رہے تھے ۔ جون میں ماہِ رمضان کی وجہ سے اور پھر فوراً بعد بیرونِ ملک دورے کی بنا پر ہم انہیں مدعو نہ کر سکے ۔ اکتوبر میں تاریخ تقریباً طے ہو چکی تھی لیکن ان کی علالت کی بنا پر یہ دورہ منسوخ کر دیا گیا ۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جب طبیعت سنبھلی تو انہوں نے خود ہی ۶ نومبر کی تاریخ ہمارے لئے متعین کر دی ۔ ۳½ بجے جب جہاز ائرپورٹ پر اترا تو ملتان کے امیرِ تنظیم جناب ترین صاحب اور راقم ان کے استقبال کے لئے موجود تھے مصافحہ اور معانقہ کے بعد ہم ۵ ۲ ۔ آفیسرز کالونی روانہ ہوئے ۔ جہاں بعد از نمازِ عشاء جلسہ ہونا تھا ۔ امیرِ تنظیم نے رفقاءِ تنظیم سے ملاقات کی اور عصر و مغرب کی نماز انہیں کے ساتھ ادا کی ۔ بعد نمازِ عشاء امیرِ تنظیم نے " جہاد بالقرآن " کے موضوع پر نہایت جامع خطاب کیا ۔ ان سے پہلے امیرِ ملتان نے تلاوت کی اور ترجمہ پیش کیا ۔ لگ بھگ ۶ صد افراد نے پورے انہماک کے ساتھ یہ خطاب سنا ۔

۷ نومبر ۱۹۸۴ء : ۹½ بجے سوال و جواب کی نشست شروع ہوئی جس میں انقلاب اور دوسرے موضوعات پر تحریری شکل میں سوالات پوچھے گئے جن کے نہایت مناسب اور مدلل جوابات دیئے گئے ۔ اس کے بعد چار اشخاص نے امیرِ تنظیم کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی ۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس عزمِ مصمم کو قائم رکھے اور دین کی خدمت کرنے کی توفیق بخشے ۔ (آمین)

بارہ بجے کھانے سے فارغ ہو کر دو کاروں پر مشتمل مختصر سا قافلہ بہاولنگر کی جانب روانہ ہوا ۔ عصر کی نماز راستے میں ادا کی ۔ اور مغرب تک بہاولنگر پہنچ گئے ۔ وہاں جناب نعیم صاحب اور یحییٰ چشتی صاحب نے ، جو رفقاء میں سے ہیں ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے ۔ ان دونوں صاحبان نے نہایت محنت اور جانفشانی سے جلسے کا انتظام کیا ہوا تھا ۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے (آمین) بہاولنگر کی رپورٹ جناب نعیم الدین احمد صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں ۔

ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی ، قیمِ تنظیمِ اسلامی ، ملتان

بہاولنگر اہلِ بہاولنگر کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بہاولنگر کا دورہ فرمائیں اور پھر ہماری کوششوں سے ۷ اکتوبر ۸۴ء کی تاریخ طے پائی مگر شاید یہ اللہ کو منظور نہ تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کی علالت کے باعث اس پروگرام کو ملتوی کرنا پڑا اور پھر پورے ایک ماہ بعد ۷ نومبر ۸۴ء کا پروگرام طے ہوا ۔ راقم اس ضمن میں ۴ اکتوبر ۸۴ء کو بہاولنگر چلا گیا اور جلسہ کے انتظامات کے سلسلے میں ضروری اقدامات کئے جس میں جگہ کا انتخاب ڈپٹی کمشنر سے جلسہ کی اجازت ، لوگوں کو پروگرام سے آگاہ کرنا شامل تھا ضلعی قانون کے مطابق ہمیں لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اعلان کرنے کی اجازت نہ مل سکی ۔ لہٰذا راقم نے اپنے تئیں ایک طریقہ اختیار کیا وہ یہ کہ ایک دوست کے ہاں سے بذریعہ ٹیلی فون شہر کے تمام شرفاء کو مطلع کر دیا (شہر زیادہ بڑا نہیں ہے اس لئے یہ کام چار یا پانچ گھنٹے میں انجام پا گیا) اس کے علاوہ وہاں مقیم

احباب اور اپنے چھوٹے بھائیوں کے ذمے لوگوں سے رابطہ کا کام سونپ کر واپس لاہور آگیا۔

امیر محترم کا پروگرام اس طرح سے تھا کہ مورخہ چھ نومبر ۸۲ء کو ملتان تشریف لے جائیں گے وہاں بعد نماز عشاء "جہاد بالقرآن" کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے اور سات تاریخ کو صبح آٹھ بجے سوالات کے جواب دیں گے۔ اور سات تاریخ کو ہی عصر تک جناب غلام حیدر ترین صاحب اور ملتان کے دیگر رفقاء کے ہمراہ ایک چھوٹے سے قافلے کی صورت بہاولنگر پہنچیں گے۔ لہٰذا راقم چھ نومبر ۸۲ء کی صبح بہاولنگر پہنچ گیا اور سب سے پہلے بہاولنگر کے رفیق جناب سخی چشتی صاحب سے ملاقات کی انہوں نے جائے جلسہ پر ضروری انتظامات کی ذمہ داری قبول فرمائی جو کہ شہر کی بڑی مسجد ریلوے جامع مسجد طے پایا۔ یہاں میں یہ ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہاں ہمارے پروگرام کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ حصہ ریلوے جامع مسجد کے خطیب جناب مولانا عبدالحفیظ صاحب کا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی آمد پر نہایت خوشی اور سرگرمی کا اظہار فرمایا بلکہ اپنے طور پر ضلع کے سرکاری افسران سے رابطہ کر کے انہیں جلسہ میں شرکت کی دعوت دی اور اس طرح سے انہوں نے جلسہ کی رونق میں بے حد اضافہ فرمایا۔ بہرحال میں ذاتی طور پر ان کا بے حد مشکور ہوں۔ علاوہ ازیں بہاولنگر کے ممتاز شہری اور علاقہ کے بڑے زمیندار جناب سید محمد زمان شاہ صاحب جن کے ساتھ دیرینہ تعلقات ہیں، نے ڈاکٹر صاحب کے دورۂ بہاولنگر کے سلسلے میں نہ صرف ہمارے ساتھ تعاون فرمایا بلکہ ہمہ وقت ہمارے ساتھ رہ کر ہماری عزت افزائی فرمائی۔

بہرحال انتظار کی گھڑیاں کس قدر کٹھن ہوتی ہیں اس کا اندازہ سات نومبر ۸۲ء کو عصر و مغرب کے درمیان اس وقت ہوا جب راقم اپنے کرم فرماؤں جناب محمد زمان شاہ صاحب، ڈاکٹر طفیل احمد صاحب (راقم کے چچا) جناب سخی چشتی صاحب اور دوسرے دوست احباب کے ساتھ امیر محترم کا نہایت شدت سے شہر کے باہر انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار مغرب سے پندرہ منٹ قبل امیر محترم کا دو کاروں پر مشتمل قافلہ بہاولنگر پہنچا۔ جناب محمد زمان شاہ صاحب نے اپنی عالی شان کوٹھی پر چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں معزز مہمانوں نے چائے نوش فرمائی اور مغرب کی اذان کے دوران ہی ریلوے جامع مسجد پہنچ گئے جہاں مولانا عبدالحفیظ صاحب بڑی بے تابی سے ڈاکٹر صاحب کے منتظر تھے۔

نماز مغرب کے بعد ٹھیک چھ بجے ڈاکٹر صاحب نے "ہماری دینی ذمہ داریاں" کے موضوع پر ڈھائی گھنٹہ کا نہایت ہی مدلل اور روح پرور خطاب فرمایا۔ جلسہ میں حاضری تقریباً ۱۲ سو کے لگ بھگ تھی جن میں کالج کے اساتذہ ضلع کے بڑے افسران اور معززین شہر نے شرکت فرمائی۔ علاقہ کے علماء حضرات بھی خاصی تعداد میں تشریف لائے تھے۔ بہرحال اس طرح سے یہ بہاولنگر کی تاریخ کا سب سے بڑا دینی جلسہ قرار پایا اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے فصیح و بلیغ بیان کے ذریعے اہل بہاولنگر کے دلوں پر گہرے نقوش چھوڑے۔

بعد ازاں امیر محترم مہمان رفقاء اور شہر کے دیگر معززین اور میرے دوستوں کے ہمراہ چھ سات کاروں اور اتنے ہی موٹر سائیکلوں کے قافلہ کی صورت میں راقم کے غریب خانہ پر تشریف فرما ہوئے۔ وہاں رات کا کھانا تناول فرمایا اور پھر محمد زمان شاہ صاحب کے ہمراہ ان کی کوٹھی تشریف لے گئے کیونکہ موصوف کا اصرار تھا کہ امیر محترم ان کے ہاں رہنے کی سعادت سے نوازیں۔ بہرحال صبح بعد نماز فجر سوال و جواب کی نشست بھی ریلوے جامع مسجد میں منعقد کی گئی جس میں نہایت اچھے سوالات پوچھے گئے جن کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص عالمانہ اور جچے تلے انداز میں دیا اور سائلین کو مطمئن فرمایا۔ ناشتہ پر جناب سخی چشتی صاحب نے مدعو کیا تھا اور ٹھیک دس بجے ڈاکٹر صاحب نے وکلاء کے اصرار پر بار کونسل میں "استحکام پاکستان" کے موضوع پر ایک تاریخی

خطاب کیا جس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وکلاء کے چند سوالات کا جواب بھی دیا اور پھر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ڈاکٹر صاحب ملتان کے رفقاء کے ہمراہ بہاولنگر سے ایک کامیاب دورہ کے بعد واپس تشریف لے گئے اور یوں اہل بہاولنگر کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ لیکن مزید خواہش کا پیش خیمہ بھی بنی کہ ڈاکٹر صاحب اس چھوٹے سے شہر کو ایک مرتبہ پھر پذیرائی بخشیں اور انہیں ایک عظیم سکالر کی میزبانی کا شرف حاصل ہو۔ خداوند تعالیٰ ہم سب کو اپنے نیک مقاصد میں کامیاب فرمائے آمین۔ میں اس سلسلے میں ان حضرات کا تہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ خدا انہیں اجرِ عظیم سے نوازے آمین۔

راقم: **نعیم الدین احمد** ، مینجر مکتبہ انجمن و تنظیم

امیرِ تنظیم کا دورۂ کوئٹہ

پروگرام کے مطابق امیرِ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مؤرخہ ۱۲ نومبر دوپہر ایک بجے بخیریت کوئٹہ پہنچے۔ رفقاءِ تنظیم اور کچھ عقیدت مند ہوائی اڈے پر استقبال کے لئے موجود تھے۔ راقم کی خوش قسمتی ہے کہ اس دفعہ ڈاکٹر صاحب کوئٹہ کے دورہ کے دوران راقم کے غریب خانہ پر رہائش پذیر رہے۔

ڈاکٹر صاحب کو کچھ عرصہ سے کمر میں درد تھا۔ کوئٹہ پہنچتے ہی کمر کی تکلیف نے شدت اختیار کر لی۔ علالت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات کا دائرہ محدود کرنا پڑا۔ اور کچھ عقیدت مندوں کی طرف سے دی گئی دعوتوں کو منسوخ کرنا پڑا۔

باوجود کمر کی تکلیف کے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سورۂ تغابن کا درس مکمل ہوا۔

دورۂ کوئٹہ کے دوران امیرِ محترم کی مصروفیات مندرجہ ذیل رہیں:

۱۲ نومبر: بعد نمازِ عصر تا مغرب: تنظیم اسلامی کوئٹہ کے دفتر میں رفقاءِ تنظیم اور مختلف لوگوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات ہوا۔
____ بعد نمازِ مغرب تا عشاء: پروگرام کے مطابق مسجد طوبیٰ میں سورۂ تغابن کی آیات ایک تا دس کا درس ہوا جو دو گھنٹے تک جاری رہا۔ جس میں امیرِ محترم نے قرآنی آیات کی روشنی میں مندرجہ ذیل مضامین پر روشنی ڈالی۔

۱۔ کائناتِ ارضی و سماوی کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے۔ اس کا مفہوم؟ ۲۔ ذات و صفاتِ باری تعالیٰ ۳۔ تخلیق بالحق سے آخرت پر استدلال ۴۔ نبوت اور شریعت میں استبعاد سے پیدا شدہ دو گمراہیاں ۵۔ اثباتِ بعث بعد الموت ۶۔ ایمان کی پرزور دعوت ۷۔ کامیابی و ناکامی اور ہار جیت کا اصل معیار

رفقاءِ تنظیم کی محنت اور اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کی بدولت کافی تعداد میں لوگوں نے درس میں شرکت کی۔

۱۳ نومبر: امیرِ محترم کے ساتھ بلوچستان کے ایک معروف عالمِ دین مولانا منیر الدین صاحب کی صبح ۸ بجے تا ۱۰ بجے
____ ایک نشست ہوئی جس میں خصوصی طور پر مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں زیرِ بحث رہیں۔ یہ نشست کافی معلوماتی اور دینی نقطۂ نظر سے اہم رہی۔

بعد نمازِ ظہر تا عصر: کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے کچھ علماء اور مختلف کالجوں کے اسلامیات کے اساتذہ سے امیرِ محترم کی تعارفی نشست ہوئی۔ یہ نشست کافی کامیاب رہی اور تجربہ کے لحاظ سے معلوماتی بھی۔

بعد نمازِ مغرب تا عشاء: پروگرام کے مطابق سورہ تغابن کی بقیہ آیات کا درس مکمل کیا گیا۔ جس میں حسب ذیل حکیمانہ، ایمان افروز اور جذبہ انگیز مضامین پر روشنی ڈالی گئی۔

۱۔ ثمراتِ ایمان: تسلیم و رضا، اطاعت و انقیاد، توکل علی اللہ

۲۔ اہل و عیال کی محبت میں مضمر خطرہ ۳۔ مال اور اولاد کی فتنہ انگیزی ۴۔ سمع و طاعت اور

۵۔ انفاق فی سبیل اللہ۔

نمازِ عشاء کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ جو رات دس بجے اختتام کو پہنچی۔

۱۴ نومبر: صبح ۸ بجے تا دس بجے مولانا منیر الدین صاحب سے امیرِ محترم کی ایک اور نشست ہوئی جس میں دینی نقطۂ نظر سے بہت سے اہم سوالات زیرِ بحث رہے۔ مولانا منیر الدین صاحب سے دو تفصیلی ملاقاتوں کے بعد امیرِ محترم کے تاثرات یہ ہیں کہ کوئٹہ میں قیام کے دوران ایک عالمِ حق سے دینی امور کے سلسلہ میں تبادلۂ خیالات اور ملاقات میرے لئے بہت اہمیت کی حامل رہی۔

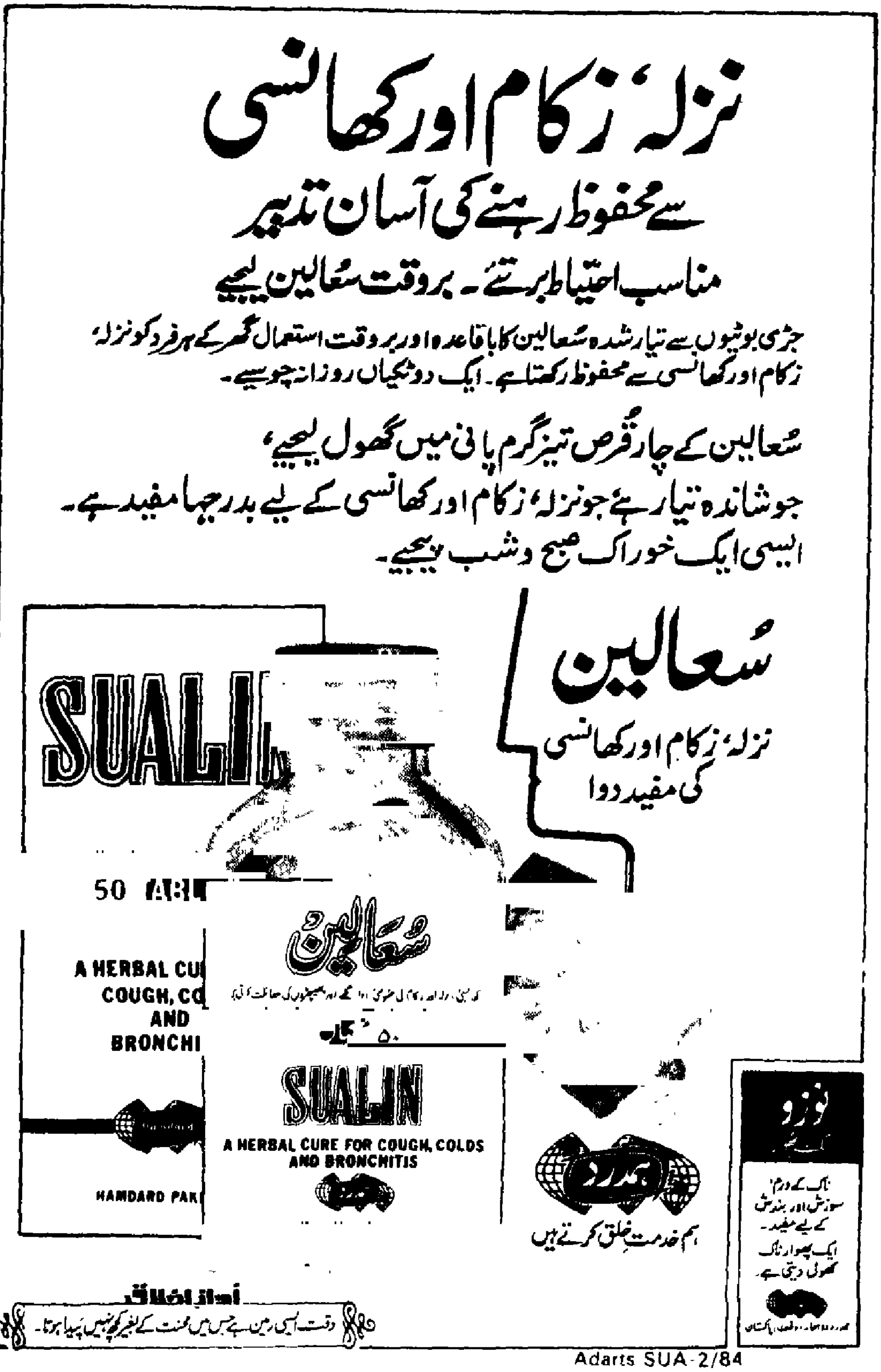
کوئٹہ سے لاہور روانگی سے پہلے امیرِ محترم نے رفقاءِ تنظیم اسلامی کو ضروری نصیحتیں فرمائیں۔ تنظیم اسلامی کے مقاصد کو سمجھتے ہوئے چند حضرات نے دینی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے عہد کیا اور امیرِ محترم کے ہاتھ پر بیعت کی۔

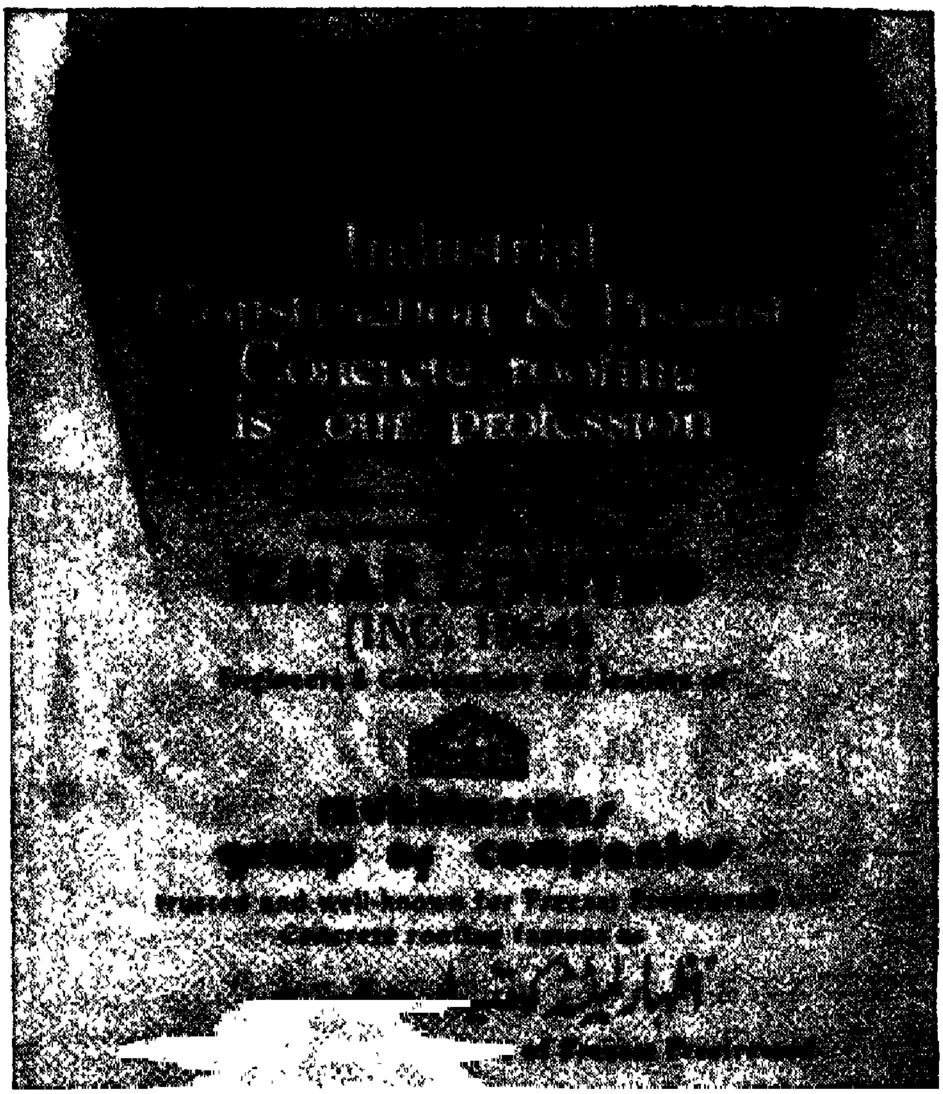
تقریباً ایک بجے آپ کوئٹہ سے لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس طرح امیرِ محترم کا یہ مختصر دورۂ کوئٹہ اختتام پذیر ہوا۔ امیرِ موصوف کے دورہ سے رفقاءِ تنظیم کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے ایک نیا جذبہ اور جوش ملا ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ امیرِ محترم کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے تاکہ اللہ کے دین کو پھیلانے اور اسے قائم کرنے کے سلسلہ میں مزید رہنمائی میسر آتی رہے۔

اشفاق احمد میر
قیم تنظیم اسلامی، کوئٹہ

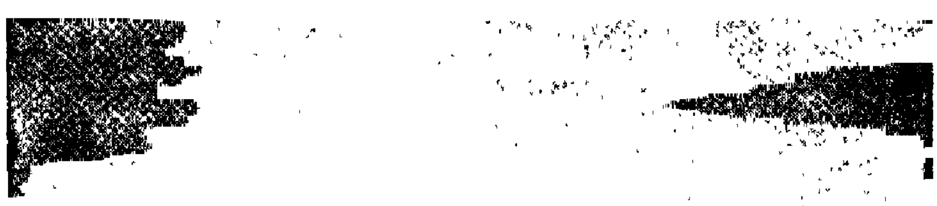

THE ORIGINAL
Coca-Cola
Have a Coke and


پاکستان کی کھلی فضاؤں میں
پاکستان کی
کھلی فضاؤں میں
اذانوں کی گونج
ہمارے نظریاتی حیات
کے آئینہ دار ہے
اور
مشینوں کے چلتے ہوئے پہیوں کا شور
ہماری صنعتی ترقی کا مظہر ہے
ملکی صنعت قوم کی خدمت ہے اور قومی خدمت ایک عبادت ہے
سروس اپنے شوز کی ایکسپورٹ سے زرمبادلہ کما کر دن رات
وطنِ عزیز
کی خدمت میں سرگرم عمل ہے
سروس شوز۔ دنیا کے گوشے گوشے میں مقبول


نزلہ، زکام اور کھانسی
سے محفوظ رہنے کی آسان تدبیر
مناسب احتیاط برتئے۔ بروقت سعالین لیجیے
جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ سعالین کا باقاعدہ اور بروقت استعمال گھر کے ہر فرد کو نزلہ، زکام اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک دو ٹکیاں روزانہ چوسیے۔
سعالین کے چار قرص تیز گرم پانی میں گھول لیجیے،
جوشاندہ تیار ہے جو نزلہ، زکام اور کھانسی کے لیے بدرجہا مفید ہے۔
ایسی ایک خوراک صبح و شب لیجیے۔
سعالین
نزلہ، زکام اور کھانسی کی مفید دوا
SUALIN
A HERBAL CURE FOR COUGH, COLDS AND BRONCHITIS
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
نوزو
ناک کے ورم، سوزش اور بندش کے لیے مفید۔ ایک پھوار ناک کھول دیتی ہے۔
وقت ایسی زمین ہے جس میں محنت کے بغیر کچھ نہیں پیدا ہوتا۔
Adarts SUA-2/84



Hollow Core Slab in Pakistan



وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۴ | فروری ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۲

مشمولات

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ
اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

ان شاء اللہ العزیز و بفضلہٖ تعالےٰ و بعونہٖ

تنظیمِ اسلامی پاکستان

کا

دسواں سالانہ اجتماع

۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء

قرآن اکیڈمی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوگا۔

رفقائے تنظیم اسلامی

شرکت کے لئے ابھی سے اہتمام شروع کر دیں

ان شاء اللہ، انہی ایام میں

شش روزہ محاضراتِ قرآنی کا اہتمام ہو رہا ہے

تفصیلات میثاق کے آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں

☆☆

المعلن: (چوہدری) غلام محمد، قیم تنظیم اسلامی

شیخ جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

بفضلہٖ تعالیٰ و بعونہٖ جمادی الاوّل ۱۴۰۵ھ مطابق فروری ۱۹۸۵ء کا میثاق پیشِ خدمت ہے ـــــ اِس شمارے میں امیرِ تنظیمِ اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ، کی ایک اہم اور مفصل تحریر بعنوان "دعوت رجوع الی القرآن، شیخ الہندؒ اور اُن کی جماعت اور مسئلۂ امامت و امارت" شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون میں، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، متعدد اہم اور نازک مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ اس تحریر کا محرک، دراصل، مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کے وہ فرمودات بنے جو گزشتہ میثاق میں 'ڈاکٹر اسرار احمد کی اپیل اور علماءِ دیوبندؒ' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ ساتھ ہی مولانا منظور نعمانی مدظلہٗ العالی کی تالیف 'مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف' کا پہلا باب بھی شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے جس سے درحقیقت، محترم ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے بعض حصّوں کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے ڈاکٹر صاحب کی تحریر چوں کہ طویل بھی ہے اور اس کی کتابت کے لیے ایک وقت درکار تھا۔ لیکن دوسری جانب اس کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اسے تازہ شمارے میں جگہ دی جاتی لہٰذا میثاق کی طباعت میں اس بار پھر کچھ تاخیر ہو گئی ہے، جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب 'کیا ایرانی انقلاب ایک اسلامی انقلاب ہے' اس شمارے میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ راقم کی علالت کے باعث یہ خطاب مکمل طور پر کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ ہو سکا تھا۔ جب کہ موضوع کا تقاضا تھا کہ یہ ایک ہی قسط میں مکمل مضمون کے طور پر قارئین کے مطالعہ میں آئے۔ مزید برآں

محترم خسروی صاحب (کراچی) کے مکتوب گرامی کو بھی، جو وسط نومبر میں ہمیں موصول ہوا، بوجوہ روکنا پڑا۔ مناسب خیال کیا گیا کہ اس مراسلے کو امیر محترم کے خطاب کے ساتھ ہی شائع کیا جائے۔ توقع ہے کہ محترم خسروی صاحب نے اپنے مفصل مکتوب میں اہل سنت کے بارے میں جو چند سوالات اٹھائے ہیں، ان کے جوابات انہیں محترم ڈاکٹر صاحب کے خطاب میں مل جائیں گے۔

محترم چوہدری غلام محمد صاحب، قیم تنظیم اسلامی، کی جانب سے تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے انعقاد سے متعلق اعلان اسی شمارے میں رفقاء تنظیم کی نظر سے گزرے گا۔ موسمی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سال اجتماع کے لیے اواخر مارچ کا تعین ہوا۔ یوں تو ہر ادارے، ہر انجمن اور ہر جمعیت، خواہ وہ دینی مقصد کے لیے قائم ہو یا کاروبار اغراض اس کے پیش نظر ہوں، کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ہر سال فرد احتسابی کے عمل سے گزریں۔ اور یہ جائزہ لیں کہ سال بھر میں اپنے مقاصد کے اعتبار سے پیش رفت ہوئی ہے یا جمود اور تعطل ہے یا انحطاط و تنزل ہے! ایک اصولی و انقلابی جماعت تنظیم کے لیے یہ جائزہ کس قدر ضروری ہے! میرا حسن ظن ہے کہ اس کی اہمیت سے ہر رفیق آگاہ ہوگا۔ سالانہ اجتماع کا ایک اضافی فائدہ یہ ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے رفقاء کو ایک جگہ جمع ہونے اور باہم دگر ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ جس سے بلا شبہ، باہمی اخوت میں اضافہ اور ذہنی ہم آہنگی کے حصول میں مدد ملتی ہے۔ توقع ہے کہ جملہ رفقاء اس سالانہ اجتماع میں شرکت کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام سالانہ محاضرات قرآنی، جو ہر سال مارچ میں منعقد ہوتے ہیں، اس سال ۲۳ مارچ تا ۲۸ مارچ ہوں گے (ان شاء اللہ)۔ گو تنظیم کا سالانہ اجتماع اور انجمن کے زیر اہتمام محاضرات قرآنی ایک ہی وقت میں ہوں گے، پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ سالانہ اجتماع کے اجلاس (SESSIONS) صبح کے اوقات میں اور محاضرات قرآنی کے سیشن شام کے اوقات میں ہوں گے۔ اس طرح بیرون لاہور سے آنے والے رفقاء تنظیم کو ان دونوں پروگراموں میں شرکت کا موقع مل سکے گا۔

حال ہی میں، یعنی ماہِ دسمبر ۸۴ء میں تنظیم اسلامی کے[1] زیرِ اہتمام ایک چالیس روزہ تربیتی پروگرام قرآن اکیڈمی میں منعقد ہوا تھا۔ یہ پروگرام بحمد اللہ بہت ہی مفید اور حوصلہ افزا رہا۔ اس کی اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ نے بحیثیت معلم و مربّی اس میں بھرپور حصہ لیا۔ دعوتی و تحریکی موضوعات پر امیرِ تنظیم نے متعدد لیکچر دیئے اور اہی موضوع پر بعض اہم تالیفات کا اجتماعی مطالعہ بھی کرایا۔ ڈاکٹر صاحب کا لیکچر روزانہ شام کو قبل عشاء ہوتا تھا۔ جس میں بلیک بورڈ کی مدد سے ڈاکٹر صاحب ہر وضاحت طلب مسئلے کی بہت اچھے انداز میں شرح فرماتے تھے۔ اس تربیتی پروگرام میں تجوید قرآن اور عربی زبان کی ابتدائی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا گیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امتحانات کا بھی ایک باقاعدہ پروگرام ترتیب دیا گیا تھا تاکہ اس بات کا اندازہ کیا جا سکے کہ شرکاء نے اس تعلیم اور تربیت سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔

اب ان شاء اللہ بیس بیس روز کے دو تربیتی پروگرام منعقد ہوں گے۔ ان میں سے پہلا پروگرام ۲ تا ۲۱ مارچ اور دوسرا ۳۰ مارچ تا ۱۷ اپریل منعقد ہوگا۔ گویا پہلا پروگرام سالانہ اجتماع سے متصلاً قبل اور دوسرا اس سے متصلاً بعد ہوگا۔ جن رفقاء کو اس سے قبل کسی تربیتی پروگرام میں شرکت کا موقع نہیں ملا ان کے لیے موقع ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں، اور بھرپور طور سے استفادہ کریں۔ اس تربیتی پروگرام کا اشتہار بھی اسی میثاق میں قارئین کی نظر سے گزرے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جن حضرات نے محض رضاءِ الٰہی کے حصول اور اپنے دینی فرائض کی انجام دہی کے لیے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی ہے، ان سب کی نصرت فرمائے اور ان کو خدمتِ دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔ اور دین کے لیے ان کی سعی و جہد کو شرفِ قبول عطا فرمائے (آمین یا رب العلمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ

---

[1] قبل ازیں ماہ جولائی ۸۴ء میں بھی تنظیم اسلامی کے تحت ایک بیس روزہ اقامتی تربیتی پروگرام منعقد ہو چکا ہے۔

اطلاع متعلقہ رفقائے تنظیم اسلامی بیرون پاکستان

تنظیم اسلامی کا بیرونی دفتر دعوت

کراچی سے لاہور منتقل ہو کر مرکزی دفتر ہی میں ضم ہو گیا ہے

لہٰذا آئندہ کل خط و کتابت ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور ہی کے پتے پر کی جائے

المعلن: (چوہدری) غلام محمد، قیم تنظیم اسلامی

تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام

چالیس روزہ تربیت گاہ کے بحسن وخوبی انعقاد کے بعد

ان شاء اللہ العزیز

۲ر تا ۲۱ر مارچ اور ۳۰ر مارچ تا ۱۷ر اپریل ۸۵ء

دو بیس روزہ تربیتی پروگرام

قرآن اکیڈمی ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن میں منعقد ہوں گے

رفقائے تنظیم اسلامی و دیگر طالبانِ حقیقت حسب سہولت شرکت کا اہتمام کریں

جو حضرات شرکت کے متمنی ہوں وہ ۲۵ر فروری ۸۵ تک مطلع فرمائیں

المعلن: چوہدری غلام محمد —— قیم تنظیم اسلامی

دعوتِ رجوع الی القرآن

"حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت"

اور

"مسئلہ امامت و امارت"

مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کے فرمودات پر چند گزارشات

از

اسرار احمد

مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ مہتمم و شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ، مرکز حضرت شاہ لی اللہ دہلویؒ، خواجہ میر درد روڈ، دہلی (بھارت) سے راقم الحروف کا تعارف کچھ تنا پرانا نہیں، زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو برس کا ہے۔

اُن سے اوّلین تعارف اُن کی بیش بہا تالیف 'محاسنِ موضح القرآن' اور اُس کے پاکستانی ناشر برادرم قاری سعید الرحمٰن علوی کی وساطت سے ہوا۔ اسی کی اساس پر راقم نے انہیں گزشتہ سال کے 'محاضراتِ قرآنی' میں شرکت کی دعوت ارسال کر ی۔ اُن کا کرم کہ انہوں نے بلا پس و پیش اور بغیر تکلف و تصنع دعوت قبول فرمالی ور تشریف لے آئے۔

اس طرح متعدد بالمشافہ ملاقاتوں کا موقع بھی ملا۔ اور محاضرات کی متعدد نشستوں یں اُن کی کئی تقاریر بھی سننے میں آئیں۔ اُن کے علم و فضل کا اندازہ تو ظاہر ہے کہ کوئی

ہ اعلیٰ پایہ کا عالم و فاضل ہی لگا سکتا ہے، مجھ ایسے عامی و اُمّی شخص کے دل نے
کے جذبہ و خلوص، سادگی و اخلاص اور بالخصوص طبیعت کے تواضع اور مزاج کے
ل سے بہت اثر قبول کیا - اس طرح گویا فوراً ہی "دل را بہ دل رہیست!" والا
بن گیا -

'محاضرات' کے ایک ہی ماہ بعد میرا بھارت جانا ہوگیا - اصل سفر تو حیدر آباد دکن
لیکن آتے جاتے دہلی میں بھی دو مرتبہ مختصر قیام رہا - اور دونوں ہی بار مولانا سے
ت ہوئی - مولانا کی محبت بھری دعوت پر ایک جمعہ میں جامع مسجد مدرسہ حسین بخش،
بڑ میں جمعہ سے قبل خطاب کا موقع ملا - (جہاں اب مولانا جمعہ پڑھاتے ہیں، اور بھائی
الرحمٰن صاحب سے معلوم ہوا کہ اسی مسجد میں ایک طویل عرصہ تک رئیس الواعظین سحبان
مولانا احمد سعید دہلویؒ وعظ فرماتے رہے ہیں) اور اُن ہی کی وساطت سے قبرستان
یان اور جامعہ رحیمیہ میں بھی حاضری کا موقع ملا -

راقم کو مولانا کی عمر کا صحیح اندازہ تو نہیں، البتہ گمان غالب ہے کہ لازماً ساٹھ
متجاوز ہوگی لیکن اُن کی جواں ہمتی' کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کے
سے اب تک اُن کے پاکستان کے دو مزید چکر لگ چکے ہیں جن سے بحمداللہ ربط
لق کے مزید استوار ہونے میں بہت مدد ملی ——————— جس کا ایک اہم
ر قارئین 'میثاق' کے علم میں گذشتہ شمارے سے آ چکا ہے، یعنی یہ کہ مولانا نے
ظیم اسلامی' کے 'حلقۂ مستشارین' میں شرکت قبول فرمائی - فجزاہ اللّٰہ عنّی و
ن جمیع رفقائی احسن الجزاء!

مولانا کی جو تحریر گذشتہ اشاعت میں "ڈاکٹر اسرار احمد کی اپیل اور علماء دیوبند"
عنوان سے شائع ہوئی ہے اُس کے ضمن میں :

اوّلاً ——— تو راقم کو مولانا کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے
لم کا اس درجہ اعزاز و اکرام فرمایا کہ اُسے بھی برّ صغیر کی "دعوتِ رجوع الی القرآن" کے اُس
سلسلۃ الذھب" میں منسلک کر دیا جس کا سرِ آغاز تو تھے امام
ہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کے جلیل القدر فرزند (رحمہم اللہ) ——— درمیانی

ڈی کی حیثیت حاصل ہے حضرت شیخ الہندؒ کو ۔ اور پھر اُن کی ذاتِ مجمع الصفات
ے جو متعدد لڑیاں شروع ہوئیں اُن میں سے ایک مشتمل ہے مولانا عبیداللہ سندھی
حوم و مغفور اور مولانا احمد علی لاہوریؒ پر، تو دوسری میں شامل ہیں مولانا
بو الکلام آزاد مرحوم اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ؎!

اس ضمن میں مولانا کے شکریے کے ساتھ راقم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ
گرچہ مولانا کی یہ 'سند' راقم کے لئے تا زیست متاعِ بے بہا کا درجہ رکھے گی تاہم راقم
اس سے قبل اس زعم میں مبتلا تھا نہ ان شاء اللہ مولانا کے اس اعزاز و اکرام سے
س مغالطے میں مبتلا ہو گا کہ راقم ان عظیم ہستیوں کا کسی بھی درجے میں ہم سر یا ہم پلّہ
ہے ۔ اللہ گواہ ہے کہ راقم کا معاملہ ان حضرات کے ساتھ وہی ہے جو اس شعر میں
یان ہوا کہ ؎ اُحِبُّ الصّالحین ولستُ منہم
لعل اللہ یرزقنی صلاحاً!

اس سلسلے میں راقم الحروف کے لئے مولانا نے جن جذبات و خیالات کا اظہار
رمایا ہے ۔ اُن میں سے صد فی صد درست بات تو صرف یہ ہے کہ :

"ڈاکٹر صاحب کو نہ عالم ہونے کا دعوٰے ہے اور نہ فقیہہ و متکلّم اور شیخِ
طریقت ہونے کا ادّعا"

مندرجہ ذیل باتیں بھی بحمداللہ بہت حد تک واقعیت پر مبنی ہیں : ۔

"ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دینِ برحق کے غلبہ اور اقامت کے لئے
قرآنِ کریم کی اصولی دعوت کا مشن اختیار کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ اس
تحریک میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا چکے ہیں ۔ ۔ ۔"

البتّہ یہ الفاظ ہمّت افزائی کے جذبہ کی بنا پر مبالغہ کی صورت اختیار کر گئے ہیں کہ :
"ڈاکٹر صاحب جدید تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور موصوف نے قرآنِ کریم کا گہرا

؎ مولانا مودودی مرحوم کے ضمن میں "علماءِ دیوبند کے فیض یافتہ عالم" کے جو الفاظ مولانا نے استعمال فرمائے ہیں، وہ بہت معنی خیز ہیں ! ۔ اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ کا ذکر اگر سہواً چھوٹ گیا ہے تب تو خیر ۔ لیکن اگر جان بوجھ کر ہے تو یہ بھی ایک اہم معاملہ ہے ! بہرحال ان دونوں باتوں کے ضمن میں ان شاء اللہ راقم آئندہ کچھ عرض کرے گا !

مطالعہ کیا ہے . . . . خدا تعالیٰ نے موصوف کو اپنے مقدس کلام کا بڑا اچھا فہم عطا فرمایا ہے اور اس کلام عظیم کے اصولی پیغام کو جدید استدلالی اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت سے نوازا ہے"

بہرحال راقم اس ہمت افزائی پر مولانا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اپنے کمالِ فضل و کرم سے اُسے فی الواقع ان الفاظ کا مصداق بنا دے۔ وما ذالک علیہ بعزیز!

مسالک فقہیہ کے ضمن میں راقم کی تقریر مطبوعہ 'میثاق' ستمبر ۸۲ء میں تقلید اور عدم تقلید یا اجتہادِ مطلق کے مابین 'نیم تقلید' کا جو تصور سامنے آیا تھا اُس پر ابتداءً مولانا بھی بہت برہم تھے، لیکن جب راقم نے ان کے سامنے اپنی وہ وضاحت پیش کی جو 'میثاق' کے دسمبر کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے (مولانا کی دہلی واپسی روانگی تک یہ پرچہ طبع نہ ہوا تھا لیکن راقم نے ان کی خدمت میں کچھ کتابت شدہ صفحات کی فوٹو سٹیٹ نقل اور کچھ اصل مسودہ پیش کر دیا تھا!) تو انہوں نے اطمینان کا اظہار فرمایا۔

مولانا کی برہمی کے آثار اُن کی زیرِ تبصرہ تحریر میں بھی موجود ہیں:

"ڈاکٹر صاحب نے دعوتِ قرآنی اور اقامتِ حق کی دعوت سے فقہی اختلافات کو دُور رکھا ہے۔ وہ اہلِ علم کو فقہی اور اجتہادی مسائل میں وسعتِ فکر و نظر کی دعوت ضرور دیتے ہیں اور معتدل راستہ اختیار کرنے کی اپیل کرتے ہیں جو آج کے حالات کا شدید تقاضا ہے۔ لیکن عوام کو وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اتباعِ سُنّت کی نیت سے اُن کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں۔

لیکن ایک تقریر میں ڈاکٹر صاحب نے ضمناً اجتہادی اور فقہی بحث میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اپنے فقہی مسلک کے بارے میں اپنے لئے 'نیم مقلد' کی تعبیر اختیار کی اور مستقبل کے لئے یہ آرزو ظاہر کی کہ فقہی اختلافات میں اتحادِ عمل کی کوئی سبیل نکل آئے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کو سہو ہوا —
موصوف جس احتیاط کے ساتھ کام کر رہے ہیں وہ
احتیاط اس تقریر میں قائم نہ رہ سکی !"
تاہم راقم کی توضیحات ملاحظہ فرمانے کے بعد مولانا نے جس فراخدلی کیساتھ
تسلیم فرمایا کہ :

"ڈاکٹر صاحب موصوف نے میثاق نومبر (مراد ہے دسمبر) کے پرچے
میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماءِ حق کو
مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا تقاضا ہے کہ
ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی
کی جائے !"

اُس سے جہاں اُن کے وسعتِ ظرف کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی
سامنے آتی ہے کہ ع "گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود !" کے مصداق ان کی نگاہ
جزوی اور فروعی مسائل میں الجھ کر رہ جانے کی بجائے دین و ملت کے اصل مسئلہ
پر مرکوز ہے ! فللّٰہ الحمد !

"فقہی اختلافات میں توسّع" کے ضمن میں مولانا نے شاہ ولی اللہ دہلوی اور
شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ اپنی جگہ پر راقم کے لئے خصوصی
دلچسپی کا باعث ہے حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کا حوالہ ہے کہ

"حضرت مجدد صاحبؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں : "باوجودِ التزامِ
ایں مذہب مرا با امام شافعیؒ گویا محبتِ ذاتی است و بزرگ مے دانم
لہٰذا در بعض اعمالِ نافلہ تقلید مذہبِ او می نمایم" (مکتوب ۵۵، دفتر دوم)
یعنی "باوجود اس کے کہ میں حنفی مسلک کی پابندی کرتا ہوں مجھے امام
شافعیؒ سے ذاتی محبت ہے اور میں انہیں بزرگ مانتا ہوں اور اسی لئے بعض
(نفلی) عبادات میں ان کے مسلک کی پیروی کرتا ہوں"

"صاحبِ اتحاف نے لکھا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت
مجدد صاحبؒ کے درمیان اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ محدث صاحب

کو فقہی مذہب میں بے حد تشدد تھا اور مجدد صاحب مطلق اتباعِ سنت اور بدعات کی تردید پر زور دیتے تھے (ص۱۶۲)"

مولانا قاسمی مدظلہ کی تحریر کا اہم ترین حصہ وہ ہے جو "حضرت شیخ الہند رح کی جماعت" اور "مسئلہ امامت و امارت" سے متعلق ہے۔ ان مسائل کے ضمن میں بھی مولانا کے انداز میں ایک محبت آمیز ربط بھی نمایاں ہے۔ اور فی الوقت راقم الحروف نے اسی مسئلے پر اظہار خیال کے لئے قلم اٹھایا ہے۔

اس ضمن میں مولانا کی ناراضگی کی اصل بنیاد تو وہی "ضمیمہ" والا لفظ ہے۔ جس کے بارے میں ضروری وضاحت گذشتہ شمارے میں پیش کی جاچکی ہے۔ بالمشافہ ملاقات میں مولانا کا انداز تحریر کے مقابلے میں کہیں زیادہ غضبناک تھا لیکن الحمدللہ کہ جب راقم نے اپنی وہ گذارشات زبانی پیش کیں جو گذشتہ ماہ کے "تذکرۃ و تبصرہ" میں درج ہو چکی ہیں تو مولانا نے اطمینان کا اظہار فرمایا اور یہ ہدایت فرمائی کہ اسے "میثاق" میں شائع کر دیا جائے ــــــ اس طرح ایک خاص لفظ کی حد تک تو معاملہ ختم ہو گیا البتہ اس تحریر میں شامل متعدد باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں راقم اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اگر وہ درست ہوں تو مولانا اور دوسرے اصحابِ علم و فضل ان کی تائید فرمائیں ورنہ میری اصلاح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے راقم مولانا کی تحریر کے اُس حصے کے "اوّل و آخر" کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے جو اس موضوع سے متعلق ہے۔ مولانا نے ابتداء ان الفاظ سے فرمائی ہے :-

> " البتہ اس بحث کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرے بڑے جھگڑے کو چھیڑ دیا ہے اور امامت و امارت کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے اور ساتھ ہی اس کا جوڑ مولانا ابوالکلام آزاد رح کی امارت کے بارے میں حضرت شیخ الہند رح کی تجویز سے لگا دیا ہے۔ گویا ڈاکٹر صاحب نے بھڑوں

کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے!"

اور اختتام ان الفاظ پر فرمایا:۔

"مجھے اُمید ہے کہ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے تقلید کے مسئلہ کی وضاحت کر کے علماء کرام کو مطمئن کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے اسی طرح موصوف امامت کے مسئلہ کو دین کی تحریک کے لئے بنیادی مسئلہ نہیں بنائیں گے!"

اس سلسلے میں راقم کی گذارش صرف یہ ہے کہ ان شاء اللہ العزیز ایسا ہی ہو گا۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک نہ یہ کوئی اساسی اور بنیادی مسئلہ ہے، نہ ہی برصغیر کے دونوں ملکوں یعنی پاکستان اور بھارت تو کیا، کسی چھوٹے سے چھوٹے مسلمان ملک کے علماء کرام کا کسی شخص واحد کی امامت و امارت پر متفق ہو جانے کا کوئی امکان حال چھوڑ مستقبل میں بھی دُور دُور تک موجود ہے! ــــ اور واقعہ یہ ہے کہ راقم نے اس مسئلہ کو ہرگز کسی ارادے یا منصوبے کے تحت نہیں چھیڑا بلکہ یہ "از خود" (اور چونکہ ہم "از خود" کچھ ہونے کے ہرگز قائل نہیں ہیں، بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے مشیّتِ ایزدی سے ہوتا ہے، لہٰذا) گویا "من جانب اللہ" چھڑ گیا۔

راقم کو اواخر ۱۹۷۴ء میں رمضانِ مبارک کے عشرہ اخیرہ کے وہ کیف آور لمحات اور ان کی سرور آمیز کیفیات اچھی طرح یاد ہیں جب راقم مسجد خضرا، سمن آباد میں اعتکاف میں تھا اور اسی دوران میں راقم کے قلم سے وہ تحریر نکلی جو "میثاق" بابت اکتوبر، نومبر ۷۴ء میں بڑے سائز کے ۴۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے[۱] جس میں راقم نے نہ صرف یہ کہ اُمتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے اور عروج و زوال کے ادوار کا تجزیہ کیا ہے بلکہ موجودہ "ہمہ گیر احیائی عمل" کا جائزہ بھی لیا ہے اور اُس کے مختلف "محاذوں" کی تفصیل بھی بیان کی ہے ــــ اسی کے ضمن میں راقم کے قلم سے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی بیعتِ امامت کی تجویز کے بارے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم سے سنا ہوا ایک واقعہ اور اُس موقع پر مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ ٹپک گیا ــــ جس پر صرف سَن کی غلطی کی آڑ لے کر ایک نہایت جارحانہ تردیدی خط لکھ دیا ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب[۲] ــــ جس پر میرے لئے مزید تحقیق و تفتیش لازم ہو گئی اور اس طرح

---

[۱] اور اب میری تالیف "[illegible]" [illegible]

الحمد للہ کہ برصغیر پاک و ہند میں "تاریخِ دعوت و عزیمت" کا ایک اہم لیکن گمشدہ باب روشنی میں آگیا ۔

اس تحقیق و تفتیش کے دوران جو انکشافات مجھ پر ہوئے اُن میں سے اہم ترین حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ المعروف بہ "شیخ الہند" کی عظمتِ شان اور جلالتِ قدر کے بارے میں تھا ۔ جن سے اس وقت تک میں اصلاً تو ان کے ترجمۂ قرآن کے حوالے ہی سے واقف تھا اور اس کی بنا پر میرے دل میں اُن کے لئے ایک گونہ محبت و عقیدت بھی موجود تھی مزید برآں اُن کی ذاتی عظمت، ان کے تقویٰ و تدین، اُن کے اخلاص و للہیت، ان کا علم و فضل، ان کے مجاہدانہ کردار، انکی عالی ہمتی اور جہادِ حریت اور تحریکِ استخلاصِ وطن میں ان کے مقام و مرتبہ کا تو کسی قدر اندازہ تھا لیکن اُن کی وسعتِ نظر، اُنکی عالی ظرفی، انکی معاملہ فہمی، ان کی انسان شناسی، ان کی وسعتِ قلب ــــ اور سب سے بڑھ کر اُن کی عاجزی و انکساری کا کوئی اندازہ راقم کو نہ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذاتی عظمت کے اس پہلو کے "یکبارگی" انکشاف سے راقم پر ایک مبہوتیت سی طاری ہو گئی ۔ چنانچہ اس موقع پر جو تحریر راقم کے قلم سے نکلی اُس میں ایک والہانہ آمد کی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے !

> وہ دن اور آج کا دن! ــــ راقم کی پختہ رائے ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے! اس لئے کہ اُن کی سی "جامعیتِ کبریٰ" کی حامل کوئی دوسری شخصیت اس پوری صدی میں کم از کم مجھے نظر نہیں آتی ۔

میری مذکورہ بالا تحریر اولاً "میثاق" بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور اس سے وہ بحث ختم ہو گئی تھی جو اس پوری تحقیق و تفتیش کا سبب بنی تھی، چنانچہ اس کے بعد پورے آٹھ سال اس مسئلے پر "میثاق" کے صفحات میں کوئی بات نہیں آئی ۔ لیکن ۸۴-۱۹۸۳ء میں میرے جو "طوفانی دورے" پاکستان کے طول و عرض میں ہوئے اور اُن کے دوران حلقۂ دیوبند کے علماء کرام کی ایک بڑی تعداد سے ملاقات اور

گفت و شنید کا موقع ملا تو یہ افسوسناک انکشاف ہوا کہ دیوبندی علماء کی نوجوان نسل کی عظیم اکثریت تو حضرت شیخ الہندؒ کے صرف نام سے واقف ہے، اُن کی عظمت سے بالکل واقف نہیں، بزرگ حضرات کی اکثریت بھی اپنے اکابر میں سے بعض دوسری عظیم شخصیتوں کو جو مقام دیتی ہے وہ حضرت شیخ الہندؒ کو نہیں دیتی —— اور خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بیعتِ امامت کی تجویز کی ناکامی اور اس کے اسباب تو دُور رہے اس واقعہ کا علم تک کسی کو نہیں ہے! —— تب خیال ہوا کہ اس تحریر کو دوبارہ شائع کر دیا جائے، چنانچہ اسے "قندِ مکرر" کے طور پر 'میثاق' کی جنوری ۸۹ء کی اشاعت میں شائع کر دیا گیا۔

اس پر کہروڑ پکا (ضلع ملتان) کے ایک عالم دین مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی نے دو خطوط تو راقم کو لکھے اور ایک مضمون معاصرِ 'الخیر'، ملتان میں شائع کرایا جس میں اس تحریر کی اشاعت —— اور تکرار کے پس پردہ جس محرک کا سراغ لگایا وہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:-

> "مگر ڈاکٹر اسرار احمد اس سے کچھ اور مفہوم اخذ کرنا چاہتے ہیں - ان کے مطابق شیخ الہندؒ کے ارادت مند، عقیدت کیش جانشینوں کو اپنے شیخ کی طرح وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دور میں ایک مثال قائم کرنی چاہیئے اور "سکہ بند حنفیت" زہد و تقویٰ کی اجارہ داری اور روایتی، مدرسی علم کا ادّعا آڑے نہیں آنا چاہیئے۔
>
> آج شیخ الہندؒ کے جانشین اتباعِ شیخ میں کس کو "امیر الپاکستان" تسلیم کرلیں - اس کی وضاحت امیر تنظیم اسلامی نے نہیں فرمائی مگر اُن کے پیچ پُراسرار اور دبے دبے لفظوں میں جس شخصیت کے بارے میں وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی اختیار کئے جانے کا مطالبہ چھلک رہا ہے - وہ چشم بد دور "حضرتِ اقدس ڈاکٹر صاحب" ہی کی ذاتِ گرامی قدر معلوم ہوتی ہے - مگر غالباً انہوں نے ازراہِ کسرِ نفسی اپنے نام کی صراحت نہیں فرمائی - باقی
>
> ہم یہی کہتے ہیں وہ اور کیا کہنے کو ہیں۔
>
> اور —— ہم سے تجھ میں ٹکرا جانے کی ہمت تو ٹکرا جا۔"

اس کے جواب میں جو کچھ میں نے انہیں تحریر کیا تھا اُس کے بعض ضروری حصے بھی فوری مراجعت کے لئے پیشِ خدمت ہیں :

"البتہ اس کے بین السطور میں آپ نے میری جس "نیت" یا "خواہش" کا سُراغ لگایا ہے، میں اسکی بالکلیہ نہ تردید کرتا ہوں نہ توثیق ــــ من وجہ اقرار ہے ــــ اور ــــ من وجہ انکار!

ایک شاعر کے قول "ہم اقراری مجرم ہیں" کے مصداق مجھے برملا اعتراف ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جس کے لئے میں نے اپنے پیشۂ طب کو بھی خیرباد کہا تھا وہ وہی ہے جس کی بیسویں صدی عیسوی میں پہلی بار نہایت زوردار دعوت دی تھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے ــــ اور جس کے لئے انہوں نے عملی جدّوجہد کا آغاز بھی "حزب اللہ" کے قیام کی صورت میں کر دیا تھا۔ لیکن جسے وہ بعض داخلی عوامل اور خارجی موانع کے باعث جلد ہی بددل ہو کر چھوڑ بیٹھے" (میثاق" نومبر ۱۹۸۲ء)

"..... بہرحال میرے نزدیک مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اس انتقالِ موقف سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اسی کو پُر کرنے کے لئے اٹھے تھے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ــــ چنانچہ یہ محض 'اتفاق' نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی پہلی تصنیف تھی "الجہاد فی الاسلام" جو گویا نہایت بسیط اور مدلل صدائے بازگشت تھی 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوتِ جہاد فی سبیل اللہ کی ــــ اور مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر اور مولانا مودودی مرحوم کے ماہنامے دونوں کا نام ایک ہی ہے یعنی "ترجمان القرآن"۔

مولانا مودودی مرحوم کے بعض نظریات سے شدید اختلاف کے باوجود میری رائے ہے کہ انہوں نے اصلاً اس دعوت کے تسلسل کو قائم رکھا جس کے داعئ اوّل مولانا آزاد تھے ــــ اور اس سلسلے میں یقیناً قابلِ لحاظ پیش رفت بھی کی ۔ لیکن افسوس کہ جس طرح ان کے پیش رَو اپنے رُخ کی تبدیلی کے بعد کلیتہً وقف ہو کر رہ گئے تھے ہندوستان کی قومی سیاست کے

اسی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی بھی آزادیٔ ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد "پاکستانی قومی سیاست" کی نذر ہو گئے ـــ اور اس طرح خالص اقامتِ دین وغلبۂ دین کی جدوجہد اور اسلام کی انقلابی دعوت کا تسلسل پھر ٹوٹ کر رہ گیا ـــ چنانچہ اسی کے احیاء کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا عزم مصمم کیا ہے ان سطور کے حقیر و عاجز راقم نے ـــ اور اس کام میں وہ اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے جملہ علمائے دین، بالخصوص حلقۂ دیوبند کے وابستگان کی اعانت اور سرپرستی کا ـــ چنانچہ یہ ہے میری اصل خواہش یا تمنا جسے آپ نے میری تحریر کے بین السطور پڑھا ہے اور اس حد تک میں "اقراری مجرم" ہوں ـــ لیکن اگر آپ اسے تعبیر کرتے ہیں "امام الپاکستان" بننے کی خواہش اور منصب کی تمنا سے تو یہ میرے نزدیک "جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے" کے مصداق خالصۃً آپ کے اپنے ذہن کی تخلیق و اختراع ہے جس سے میں اظہار برأت کرتا ہوں اور آپ سے بھی عرض کرتا ہوں کہ "اِجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ" کی قرآنی ہدایت کو پیش نظر رکھیں اور اس سوءِ ظن سے اجتناب فرمائیں۔

الحمد للہ کہ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی کے مختصر سے عرصہ میں کسی خطۂ زمین میں دعوتِ اسلامی کے آغاز سے اقامت وغلبۂ دین کی آخری منزل تک کے جملہ مراحل یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی تکمیل کا واقعہ تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار ہوا ہے ـ یعنی سید الاوّلین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے ـــ اور آپؐ ہی کے مقصدِ بعثت کی آخری تکمیل (بقول امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ "ازالۃ الخفا") کے طور پر یہ کام ایک بار پھر ہو گا ـــ اور عالمی سطح پر ہو گا ـ لیکن اس کے لئے آپؐ کے غلاموں کو کئی نسلوں تک مسلسل جدّوجہد کرنی ہو گی اور ایک ایک نسل کے دوران اس عمل کو ایک ایک درجہ آگے بڑھا دینا بھی اُمت کے لئے بہت بڑی کامیابی ہے اور

جو خوش قسمت افراد اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں ان کیلئے بہت بڑی سعادت ہوگی ۔ اور اس ضمن میں اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوصف جو خدمت انجام دی تھی مولانا آزاد نے ۔ اسی کے چراغ سے روشن ہوا جماعتِ اسلامی کا دیا ۔ اور اب اسکی بھی ناکامی کے بعد ان شاء اللہ اسی کی خاکستر سے نئی چنگاریاں روشن ہونگی اور میں اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود خواہشمند ہوں ؂

احب الصالحین ولست منھم لعل اللہ یرزقنی صلاحًا

کے مصداق اسی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کا ۔ لیکن ہرگز مبتلا نہیں ہوں اس خبط و حماقت میں کہ یہ عظیم کام میری امامت، میں سرانجام پائے گا اور میں نہ صرف یہ کہ مجددین کی فہرست میں جگہ پا جاؤں گا بلکہ بقول مولانا مودودی "مجدد کامل" کے مقام پر فائز ہو جاؤں گا!"

("میثاق"، نومبر ۸۴ ص ۶۲ و ۶۳)

البتہ جہاں تک حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ کا تعلق ہے تو اگرچہ میں مجموعی اعتبار سے بھی اُن سب کی عظمت اور جلالتِ شان کا تہہ دل سے قائل و معترف ہوں، اور اُن میں سے ایک ایک کے اپنے اپنے مقام پر علم و فضل، تقویٰ و تدین، خلوص و اخلاص، اور عظمتِ کردار کا نقش میرے دل پر قائم ہے ۔ بلکہ میں نے کہیں پہلے بھی یہ لکھا ہے اور اب پھر اعادہ کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک جس طرح امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیتِ کبریٰ کی مظہر ہیں اُن کی تصانیف و تالیفات، اُسی طرح حضرت شیخ الہندؒ کی "جامعیتِ کبریٰ" کے مظہرِ اتم ہیں ان کے تلامذہ بحیثیت مجموعی تاہم راقم اپنے اس واقعی احساس کے اظہار پر اپنے آپکو مجبور پاتا ہے کہ انفرادی طور پر اُن عظیم شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی اُن کی سی "جامعیت" کی حامل نظر نہیں آتی ۔ اس ضمن میں بھی راقم اپنی آج سے دس سال قبل کی تحریر کا اقتباس پیش کر رہا ہے، اس لئے کہ آج بھی اُس کی رائے یہی ہے :-

"اور اس پس منظر میں، ہمیں معاف فرمایا جائے اگر ہم اپنے آپ کو اپنے

اس احساس کے اظہار پر مجبور پاتیں، کہ اُن کے جانشینوں میں سے مختلف حضرات انکی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے وارث تو ضرور بنے لیکن کوئی بھی انکی جامعیت کا وارث نہ بن سکا۔ گویا ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے   وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

اور صورتِ حال بالکل اس شعر کے مصداق ہوگئی کہ ؎

"اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

خصوصاً وہ حضرات جو سیاست یا جہادِ حریت، یا تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں ان کے جانشین بنے انہوں نے تو اپنے گرد تقلیدِ جامد کا لبادہ اس قدر کس کر لپیٹا کہ دُنیا اِدھر سے اُدھر ہوگئی لیکن انہوں نے اپنے موقف میں ترمیم کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔"

(تحریر ۱۹۷۵ء، در میثاق جنوری ۸۴ ص ۶۱)

اس ضمن میں مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کی تحریر کے پیشِ نظر راقم اپنی اس رائے کے اظہار کی بھی ادب کے ساتھ اجازت چاہتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ یا حضرت کے شاگردوں کی اصطلاح تو درست ہے، لیکن "شیخ الہندؒ کی جماعت" یا "جماعتِ شیخ الہندؒ" کی اصطلاح جو مولانا نے اپنی اس تحریر میں گیارہ بار استعمال کی ہے، واقعہ کے خلاف ہے ـــــ اور راقم کا شدید احساس ہے کہ اصل میں یہی وہ کمی ہے جو اس حلقے میں رہی جس کے باعث ان نابغۂ روزگار ہستیوں سے جو برکاتِ عظیمہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے حق میں ظہور پذیر ہو سکتی تھیں وہ بتمام و کمال نہ ہو پائیں جس کے نتیجے میں اُن کی حیثیت قومی اور سیاسی سطح پر مآل کار اور نتائج واقعی کے اعتبار سے عظیم تر اور سیکولر مزاج سیاسی تحریکوں کے "ضمیموں" کی ہوگئی ـــــ چنانچہ اسی پس منظر میں اصل عظمت ابھر کر سامنے آتی ہے حضرتِ شیخ الہندؒ کی اس خواہش کی کہ کسی کو امام الہندؒ مان کر اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ اُن کی جامع و مجمع ذات کے اٹھتے ہی وہ انجمن منتشر ہو جائے جو انہوں نے عمر بھر کی کمر توڑ دینے والی مشقت سے سجائی تھی ـــــ اور اسی

سے سمجھ میں آتا ہے اس مسئلے میں حضرتؒ کے انہماک کی شدت کا سبب کہ بقول مولانا معید الرحمٰن علوی (سابق مدیر "خدام الدین" لاہور) :

کہ "شیخ الہندؒ نے شدید علالت کے دوران جمعیت علماءِ ہند کے دوسرے جلسہ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء بمقام دہلی کی صدارت بھی فرمائی تھی اور خطبہ صدارت بھی ارشاد فرمایا تھا۔ بقول مولانا محمد میاں "بیماری و نقاہت کے سبب تھوڑی دیر بھی اسٹیج پر بیٹھنا دشوار تھا" لیکن اس اجلاس کے اہم ترین ایجنڈا یعنی امیر الہند کے انتخاب کے سلسلے میں ان کے احساسات یہ تھے "میری چارپائی اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جائی جائے۔ اور یہ کام کر لیا جائے۔ پہلا شخص جو بیعت کرے گا وہ میں ہوں گا"

(میثاق، اکتوبر ۸۲ بحوالہ تاریخ امارت ص۵۲)

"ماشاء اللّٰہُ کان وما لم یشاء لم یکن" — اور "ان کلمة 'لو' تفتح عمل الشیطان" کے پیش نظر قلم اور زبان پر گرہ لگ جاتی ہے ورنہ دل کی گہرائیوں سے تو ہوک سی اٹھتی ہے کہ کاش! حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ اس مرحلہ پر یا حضرتؒ کی وفات کے فوراً بعد اگر مولانا آزاد مرحوم پر دل نہیں ٹھکتا تھا تو اپنے میں سے کسی اور کے ہاتھ پر "اطاعت فی المعروف" کی بیعت کر لیتے تو بعد میں صرف مزاج اور افتادِ طبع اور رائے اور خیال کے اختلاف نے جو گل کھلائے وہ نہ کھلتے اور یہ حضرات ایک بنیان مرصوص کی مانند "اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" پر باحسن وجوہ عمل پیرا ہو سکتے۔

کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی میں ان کی 'جماعت'، کونسی 'بیعت' پر قائم تھی جو عند الوفات یا بعد الوفات اس معاملے کی اس قدر اہمیت ہو گئی!؟؟ —— تو اس کا جواب مسکت تو یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ "کسی شئی کا عدمِ ثبوت اُس کے وجود کے عدم کو مستلزم نہیں ہے!" —— ویسے راقم کے نزدیک اس کی اصل وجہ وہی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کی تھی کہ مکہ میں پورے دس برس تک جو لوگ ایمان لائے اُن سے آپ نے کوئی بیعت نہیں لی لیکن مدینہ والوں سے آپ نے ایک چھوڑ دو دو بیعتیں لیں۔ اس کا سبب

جو بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتا ہے یہ ہے کہ مکہ میں آنحضورؐ بنفسِ نفیس موجود تھے اور جملہ اہلِ ایمان آپؐ کی اطاعت کرتے ہی تھے لہٰذا "قیامِ جماعت" یا "نظمِ سمع وطاعت" کے لئے کسی رسمی بیعت کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن مدینہ والوں کا معاملہ مختلف تھا وہاں کے لئے آنحضورؐ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر بارہ نقیب نامزد فرمائے تھے اور آپؐ کی عدم موجودگی میں وہاں کے مسلمانوں کو ان ہی کی اطاعت کرنی تھی - چنانچہ آپؐ نے ان سے اُن جامع الفاظ میں بیعت لی جو حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے متفق علیہ روایت میں منقول ہیں :

بَایعنا رسُولَ اللہ صَلی اللہُ علیہ وسلم عَلیَ السَّمع وَالطاعۃ فی العُسر وَ الیُسر والمنشط والمکرہ وعلیٰ اثرۃ علینا وعلیٰ اَن لانُنازع الامر اَھلہٗ وعلیٰ اَنْ نقولَ بالحق اینما کنا لانخاف فی اللہ لَومۃ لائم (بخاریؒ و مسلمؒ)

"(ترجمہ: ہم نے بیعت کی رسول اللہؐ سے سننے اور ماننے کی تنگی میں بھی اور کشادگی میں بھی اور طبیعت کی آمادگی کی کیفیت میں بھی اور ناگواری کے احساس کے باوصف بھی اور اس پر بھی کہ ہم پر خواہ کسی کو بھی ترجیح دی جائے، اور اس پر بھی کہ ہم اصحابِ امر سے جھگڑیں گے نہیں البتہ حق بات ضرور کہیں گے خواہ کہیں بھی ہوں، اللہ کے معاملے میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔"

بعینہٖ یہ معاملہ یہاں تھا کہ جب تک حضرت شیخ الہندؒ موجود تھے رسمی بیعت کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا - اگرچہ واقعات یہ ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کرنے کے ایک ہی سال بعد یعنی ۱۹۱۳ء میں بعض حضرات سے بیعت لی اور اس طرح "حزب اللہ" وجود میں آگئی ــــ لیکن ۱۹۱۵ء میں انہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو آمادہ کر لیا اور خود اپنے متوسلین سمیت ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی - اس کے بعد ایک اختلافِ رائے پیش آگیا، مولانا آزاد کی رائے

تھی کہ حضرتؒ ہندوستان ہی میں مقیم رہ کر تحریک چلائیں، لیکن بعض دوسرے اصحاب الرّائے نے مشورہ دیا کہ حجاز تشریف لے جائیں اور وہاں مرکز بنائیں، مولانا آزاد کا فرمانا ہے کہ "افسوس کہ حضرتؒ نے دوسری رائے کو اختیار فرمایا!"— بہرحال حجاز سے حضرتؒ کی گرفتاری عمل میں آگئی — اور وہاں سے واپسی اس وقت ہوئی جبکہ شمع حیاتِ دنیوی گُل ہوا چاہتی تھی۔— چنانچہ یہ ہے وہ مرحلہ جس پر حضرتؒ کی شدید خواہش تھی کہ مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت ہوجاتے لیکن افسوس کہ بوجوہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی!

مولانا قاسمی مدظلہٗ کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ صرف "جمعیتِ علماءِ ہند" ہی کو "حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت" قرار دیتے ہیں۔ راقم کے نزدیک یہ رائے دو اعتبارات سے محلِ نظر ہے:

اولاً یہ کہ 'جمعیت علماء ہند' — کو 'جماعت' قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے اسے زیادہ سے زیادہ 'علماء ہند کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم' قرار دیا جاسکتا ہے۔ سنن دارمیؒ کی مرفوع روایت میں یہ الفاظ مبارکہ موجود ہیں کہ "لاجماعۃ الا بالامارۃ" لہٰذا چونکہ جمعیت علماء ہند — 'جماعت' نہ تھی اسی لئے اُس میں 'صدارت' تھی 'امارت' نہ تھی![1]

ثانیاً — اگر "جماعتِ شیخ الہندؒ" کے الفاظ وسیع تر معنی میں لئے جائیں تو اس کے اہم ترین 'ارکان' میں سرفہرست نام آئیں گے مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے، پھر نام ہوں گے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے، اور پھر نام آئیں گے ایک جانب کثیر تعداد میں علماء کرام کے، جن میں سرفہرست ہونگے مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاریؒ اور دوسری جانب ایک بڑی تعداد میں غیر علماء کے جن میں سرفہرست ہوں گے۔ حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرھم بلکہ یہ فہرست نامکمل رہے گی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے نام نامی اور اسم گرامی کے بغیر، اس لئے کہ اُن سے بھی یہ قول منقول ہے کہ: "میں بھی حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت

---

[1] اس موضوع پر بعض دلچسپ حقائق مولانا نعمانی کی اس تحریر میں مذکور ہیں جو اس شمارہ میں شائع کی جارہی ہے۔

ہی کا آدمی ہوں ۔" جس کے راوی ہیں مولانا افتخار احمد فریدی مراد آبادی مدظلہ ۔
اگرچہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ حضرت شیخ الہند رح کے انتقال کے کچھ عرصے بعد جمعیت علماء ہند، کے پلیٹ فارم پر مولانا مدنی رح کی شخصیت اپنے جذبہ و جوش، محنت و مشقت، تواضع و ایثار اور مجاہدانہ سیرت و کردار کی بنا پر کلیتہً چھا گئی تھی ۔ چنانچہ بقیہ حضرات میں سے جو بھی اپنے مزاج اور افتاد، یا پالیسی اور حکمتِ عملی کے اعتبار سے ان سے ہم آہنگی اختیار نہ کر سکا وہ نہایت خاموشی اور حلم و وقار کے ساتھ ابتداءً غیر فعال اور رفتہ رفتہ غیر متعلق ہوتا چلا گیا اور اس طرح جہادِ حریت اور تحریک استخلاصِ وطن کے میدان میں حضرت شیخ الہند رح کے مسلمہ جانشین کی حیثیت حاصل ہو گئی مولانا مدنی رح اور ان کی زیرِ قیادت جمعیتِ علماءِ ہند کو ۔ لہ

مولانا آزاد مرحوم ۱۹۲۰ء کے بعد بھی اگرچہ جمعیت علماء ہند کے جلسوں میں شرکت فرماتے رہے لیکن اصلاً انہوں نے کچھ علماء کے رویّے سے بد دل ہو کر اور کچھ اس شعر کے مصداق کہ ؎

"کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے!
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے!"

لہ اس ضمن میں مولانا قاسمی مدظلہٗ نے مولانا آزاد کے حلم و وقار اور عالی ظرفی کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے وہ تو راقم کے نزدیک بہت قیمتی ہیں، یعنی :

"جس ہستی (مولانا آزاد) کی امامت کے مسئلے کو وہ (یعنی راقم الحروف) سند کے طور پر علماءِ دیوبند کے سامنے پیش کر رہے ہیں اُس دانش مند ہستی نے امامت کی تجویز کو حالات کے پیشِ نظر کس طرح لپیٹ کر رکھ دیا اور ساری زندگی مولانا مرحوم اسے زبان و قلم پر نہ لائے! امامت کی تجویز کی مخالفت گھر میں ہوئی ۔ ان رفقاء سے ہوئی جو مولانا آزاد کی رفاقت میں کام کر رہے تھے مگر مولانا نے حالات کے تیور دیکھ کر ہمیشہ کے لئے خاموشی اختیار کر لی اور کبھی شکوہ و شکایت زبان پر نہ لائے!"

تاہم یہ عرض کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہونا چاہیئے کہ کوئی اور بھی اس اہم واقعہ کا ذکر نہ کرے اور اسلامیانِ ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی تاریخ کے اس اہم باب کو ہمیشہ کے لئے پردۂ اخفاء ہی میں رہنے دیا جائے ۔

—— اپنی طبیعت کی جولانیوں کے لئے انڈین نیشنل کانگریس ہی کے پلیٹ فارم کو مستقلاً اختیار کر لیا۔ تاہم چونکہ سیاسی میدان میں کانگریس اور جمعیت کی حکمتِ عملی ایک ہی رہی لہٰذا ان دونوں بزرگوں کے مابین تا زیست کوئی تصادم تو درکنار کوئی اختلافِ رائے بھی سامنے نہیں آیا۔

"جماعتِ شیخ الہندؒ" کے ان متذکرہ بالا اساطین میں سے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے تفصیلی ذکر کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے بھی کہ وہ ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور ان کی واپسی کم و بیش رُبع صدی کے بعد ہوئی —— اور اس لئے بھی کہ وہ ایک متنازعہ شخصیت ہیں اور ان کی زندگی کے آخری دَور کے نظریات و خیالات کے بارے میں متضاد آراء ملتی ہیں۔ والبتہ قارئینِ میثاق کی دلچسپی کے اعتبار سے ان کے ایک قول کے نقل کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا جس کے سامع و راوی حاجی عبدالواحد صاحب بحمد اللہ تاحال بقیدِ حیات ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ وطن واپسی پر جب مولانا سندھی لاہور تشریف لائے اور انہوں نے اپنے شاگردِ رشید یعنی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے مشاغل کا مشاہدہ و مطالعہ کیا تو نہایت برہمی کے انداز میں فرمایا "میں نے اسے اس کام کے لئے تو تیار نہیں کیا تھا!!" —— بہرحال اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم حضرت شیخ الہندؒ ہی کی جماعت کے اہم فرد تھے اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کا سلسلہ بھی یقیناً حضرت شیخ الہندؒ ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے!

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا معاملہ البتہ نہایت اہم بھی ہے اور بہت پیچیدہ بھی —— لہٰذا قدرے طوالت طلب ہے!

سب کو معلوم ہے کہ مولانا نہ حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے تھے نہ ہی باضابطہ مستند عالمِ دین تھے، تقویٰ کا علم تو اللہ ہی کو ہو سکتا ہے، تدیّن کے اعتبار سے وہ کسی طرح علماءِ کرام کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے، اور خود اُن کا قول ہے کہ "ہم گلیم زُہد اور ردائے رندی کو بیک وقت اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں!" مزا

برآں وہ پختہ مقلد اور پکے حنفی بھی نہ تھے، بلکہ (حضرت مولانا عزیزگل مدظلہ سے ایک حالیہ ملاقات میں شنیدہ جملے کے مطابق) واقعۃً "آزاد" تھے!! وہ ذہنی فکر کے اعتبار سے انکا سب سے قریبی اور مضبوط ترین تعلق امام ابن تیمیہؒ سے تھا (بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کا امام ابن تیمیہؒ سے تعارف اصلاً اُن ہی کے ذریعے ہوا!)

دوسری طرف یہ بھی سب ہی جانتے ہیں کہ ذہانت اور فطانت کے اعتبار سے اُن کا مقام بہت بلند تھا اور وہ واقعۃً 'ابوالکلام' تھے، اسی طرح ادب و انشاء اور صحافت کے میدان کے بھی وہ عظیم شہسوار تھے، عربی اور فارسی پر تو انہیں عبور حاصل تھا ہی، متعدد یورپین زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے، اور بالکل نوجوانی کی عمر میں وہ اچانک اس طرح اُبھر کر سامنے آئے تھے کہ وقت کی بڑی بڑی ہستیاں اور عظیم شخصیتیں حیران ہو کر رہ گئی تھیں۔!

لیکن اُن کی اصل اہمیت اس اعتبار سے تھی کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کی ایک بہت بڑی تعداد کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور اُن کے سامنے نہ صرف یہ کہ 'اعلاءِ کلمۃ اللہ' یا 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' کا نصب العین رکھ دیا بلکہ اُس کے لئے صحیح طریق کار کی بھی نشاندہی فرمادی اور امام مالکؒ کا یہ قول یاد دلا کر کہ "لا یصلح اٰخرُ ھٰذہِ الامّۃِ الّا بما صلح بہٖ اوّلھا" واضح کر دیا کہ اس مقصد کے لئے پیشقدمی صرف اور صرف نبویؐ منہجِ عمل پر ممکن ہے! جس کے تین لازمی اجزاء ہیں: (۱) دعوت و تبلیغ اور تطہیرِ افکار و تعمیرِ سیرت — بذریعہ قرآن' (۲) بحوالۂ حدیثِ نبویؐ: "وانا اٰمرکم بخمسٍ: بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ" تنظیم اور شیرازہ بندی — بذریعہ بیعت، اور (۳) جذبہ و جوشِ جہاد اور ذوق و شوقِ شہادت!

اہم ترین بات یہ کہ ذہانت و فطانت کی بہتات کے ساتھ ساتھ مولانا میں ہمت و عزیمت کی فراوانی کا عالم یہ تھا کہ ۱۹۱۲ء میں چوبیس برس کی عمر میں 'الہلال' جاری کیا جس نے ایک سال کی مختصر مدت کے اندر اندر برصغیر کے طول و عرض میں تہلکہ مچا دیا — اور پھر اگلے ہی سال یعنی ۱۹۱۳ء میں 'بیعت' کی اساس پر بالفعل 'حزب اللہ' قائم فرمادی!

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت کا یہی پہلو ہے جس نے شیخ وقت اور استاذ العلماء حضرت شیخ الہند رحؒ کو اُن کا گرویدہ بنا دیا ـــــــ اور گرویدہ بھی اتنا کہ حضرت شیخ کے یہ الفاظ تو مشہور و معروف ہیں ہی کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے!" (ان الفاظ کی توثیق راقم الحروف نے ذاتی طور پر حضرت مولانا محمد یوسف بنّوری رحؒ سے بھی حاصل کر لی تھی!) ـــــ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ کی روایت کے مطابق ۱۹۱۵ء میں حادثۂ کانپور کے بعد حالات کو سنبھالنے کے لئے جب یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر دارالعلوم دیوبند آئے اور اُن کے ایماء پر مہتمم صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے داخلے پر پابندی لگا دی تو احتجاجاً حضرت شیخ الہند رحؒ نے بھی شرکت سے انکار فرما دیا ـــــ اور لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر کہ حضرت! آپ اس نوجوان کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟" حضرت شیخ الہند رحؒ نے جواباً یہ شعر پڑھا: "کامل اس طبقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!"

۱۹۱۵ء میں مولانا نے خود ـــــ (گویا اپنی "حزب اللہ" سمیت!) حضرت شیخ الہند رحؒ کے دستِ حق پرست پر "بیعت" کی، اس کے فوراً بعد حضرتؒ کی حجاز روانگی ہو گئی ـ جہاں سے اسیری اور پھر اسیری سے رہائی کے بعد ۸ رجون ۱۹۲۰ء کو واپسی ہوئی، اور ۳۰ رنومبر ۱۹۲۰ء کو انتقال ہو گیا ـ

حضرت شیخ الہند رحؒ کی حیاتِ دنیوی کے آخری پونے چھ ماہ جہاں اس اعتبار سے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے ایک نہایت درخشاں باب کی حیثیت رکھتے ہیں کہ پیری اور ضعیف العمری کی درماندگی و نقاہت اور عوارض و امراض کے غلبہ و شدت کے باوصف وعلی الرغم اُن کا جذبۂ جہاد اور جوشِ عمل پورے عروج پر تھا اور دینِ حق اور اُمتِ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے لئے اُن کی دردمندی پورے شباب پر تھی، وہاں اس اعتبار سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے (اور اس پہلو پر افسوس ہے کہ کم ہی توجہ دی گئی ہے!) کہ اسی کے دوران اُن کے عمر بھر کے غور و فکر، مطالعہ و مشاہدہ، اور تجربات کا خلاصہ و نچوڑ اور بالخصوص اسارتِ مالٹا کی تنہائیوں کے سوچ بچار اور غور و خوض کا حاصل و لُبّ لباب سامنے آتا ہے:

چنانچہ یہی ہیں وہ ایام جن کے دوران حضرتؒ کی زبانِ حقیقت ترجمان سے وہ حکیمانہ جملے ادا ہوتے کہ:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوتے - ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے - بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں - بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔" (ماخوذ از "وحدتِ امت" تالیف مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ)

غور کا مقام ہے کہ کیا یہ صدائے بازگشت نہیں ہے اُسی نعرۂ حق کی جو مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۵ء میں 'البلاغ' کے پہلے شمارے (مورخہ ۱۲ نومبر) میں ان الفاظ میں لگایا تھا:

"اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدینِ صادقین کا فقدان اور علماءِ سوء و مفسدین و دجالین کی کثرت — رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا —

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملے میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالکؒ کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیے کہ "لَا يُصْلِحُ اٰخِرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" یعنی امتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق

اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی وحقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں۔"

پھر انہی ایام میں حضرت رح نے سفر فرمایا علی گڑھ کا — جہاں سنگ بنیاد رکھا 'جامعہ ملیہ' کا — اور وہاں ارشاد فرمائے یہ تاریخی جملے :

"اے نونہالان وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں "دیوبند اور علی گڑھ" کا رشتہ جوڑا!"

(میثاق، جنوری ۸۴ء صفحہ ۶۲ بحوالہ "بیس بڑے مسلمان")

غور کرنا چاہیئے کہ یہ حضرت شیخ رح کا واقعی احساس تھا یا تصنع وتکلف پر مبنی دلجوئی اور مدارات کا معاملہ؟

پھر اسی سلسلۂ واقعات کا نقطۂ عروج ہے حضرت رح کے ایما پر جمعیت علماءِ ہند کے اجلاس میں مفتی کفایت اللہ دہلوی رح کی تجویز اور مولانا احمد سعید دہلوی رح کی تائید کے ساتھ پیش ہونے والا "امارت وامامت" اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر "بیعت" کا معاملہ!

غور طلب بات ہے کہ کیا امامتِ ہند کے لئے حضرت شیخ رح کی نگہ انتخاب کا مولانا آزاد کی ذات پر ٹک جانا محض رواداری کا معاملہ تھا؟ اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلم انڈیا کے مستقبل کے ضمن میں اُس مرحلے پر حضرت شیخ رح کی نگاہیں مولانا آزاد ہی کی قیادت ورہنمائی پر مرتکز ہوگئی تھیں؟ چشم تصور سے دیکھئے کہ کیا اُس مجمع میں بیعت کے وقت مولانا انور شاہ کاشمیری رح ایسے محدث وفقیہ، علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری رح ایسی جامع معقول ومنقول شخصیت اور خود تجویز امامت کے مجوز مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی رح ایسے فقیہہ ومفتی موجود نہ تھے جو مولانا آزاد کے مقابلے میں علم وفضل کے کوہ ہمالیہ کی حیثیت تو رکھتے ہی تھے عمر میں

بھی اُن سے بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس بڑے تھے - پھر کیا اسی اجتماع میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی شخصیت موجود نہ تھی جنہیں حضرت شیخؒ کا اس درجہ اعتماد حاصل تھا کہ اُن کے نمائندہ کی حیثیت سے اُن کی جانب سے خطبۂ صدارت انہوں نے ہی پڑھا تھا اور جنہیں حضرت شیخ الہندؒ کے مزاج اور طرزِ فکر سے اس درجہ ہم آہنگی حاصل تھی - کہ ترکِ موالات کے ضمن میں فتویٰ کی عبارت حضرت شیخ الہندؒ کو اُن ہی کی پسند آئی تھی! ـــــ پھر خواہ اس اجتماع سے غیر حاضر ہی سہی لیکن ہندوستان میں اُس وقت موجود نہ تھے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جو علم و فضل اور تقویٰ و تدین کا پہاڑ تو تھے ہی پورے ساڑھے چار سال حضرتِ شیخؒ کے شب و روز کے رفیق و خادم بھی رہے تھے! ـــــ (واضح رہے کہ عمر میں مولانا آزاد سے مولانا عثمانیؒ تین برس اور مولانا مدنیؒ نو دس برس بڑے تھے!) ـــــ پھر اگر ان سب کی موجودگی میں حضرتِ شیخؒ کی نگاہِ انتخاب مولانا آزاد مرحوم پر ٹِک گئی تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ

> اگر "حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت" کسی حقیقتِ واقعیہ کا نام ہے تو ۱۹۲۰ء میں اس کا عظیم ترین مظہر مولانا ابو الکلام آزاد کی ذات تھی! [1]

اور اگر یہ صحیح ہے کہ یہ ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء والے مولانا ابو الکلام آزاد ہی کی شخصیت کا معنوی تسلسل تھا جو ۳۲ ـــ ۱۹۳۳ء میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی صورت میں سامنے آیا اور یہ "الہلال" اور "البلاغ" ہی کے پیغام کی صدائے بازگشت تھی جو ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے ذریعے دوبارہ لوگوں کے کانوں تک پہنچی اور یہ

---

[1] اس ضمن میں راقم کو شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سے اس درجہ محبت و نعت اور ان کی جانب اتنی عنایت و التفات کی بنا پر حضرت شیخؒ کے بہت سے معتقدین و متوسلین کے احساسات و جذبات کی کیفیت اور خاص اس معاملے میں حضرتِ شیخؒ کے بارے میں اُن کی سوچ کا رُخ کیا ہوگا ـــ اس کا اندازہ حضرت یعقوبؑ کی حضرت یوسفؑ سے والہانہ محبت کی مثال سے لگایا جا سکتا ہے جس کے ضمن میں قرآن مجید میں آنجنابؑ کے فرزندوں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ "إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ" اور خود آنجنابؑ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ "لَوْلَا أَن تُفَنِّدُونِ" ـــ

'حزب اللہ' ہی کی بدلی ہوئی صورت تھی جو ۱۹۴۱ء میں 'جماعتِ اسلامی' کی شکل میں سامنے آئی تو کیا یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ

> مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم بھی حضرت شیخ الہندؒ ہی کی جماعت کے ایک فرد تھے اور ان کا ترتیب دیا ہوا قافلۂ غلبہ و اقامتِ دین بھی 'جماعت شیخ الہندؒ' ہی کی ایک شاخ تھا!

اور چونکہ راقم الحروف کو حق الیقین کے درجہ میں وثوق حاصل ہے کہ ابوالکلام آزاد مرحوم اور ابوالاعلیٰ مرحوم کی دعوت ——— اور 'حزب اللہ' اور 'جماعتِ اسلامی' کی تنظیمی ہیئتیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں' لہٰذا راقم کو نہایت پسند بھی آئے اور حد درجہ معنی خیز بھی نظر آئے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کے مولانا مودودی کے بارے میں وہ 'علماءِ دیوبند کے فیض یافتہ عالم' کے الفاظ!

جہاں تک مولانا آزاد مرحوم کی حیاتِ دنیوی کے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۵۸ء کے دور کا تعلق ہے مجھے اصلاً اس سے نہ دلچسپی ہے نہ بحث ——— اور اپنی بیس سالہ پبلک لائف کے دوران میں نے اس کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً بہت ہی کم کہا یا لکھا ہے۔ تاہم ریکارڈ درست رکھنے کے لئے عرض ہے کہ میرے نزدیک اس مسئلے کے تین گوشے ہیں: ایک ذاتی سیرت و کردار ——— اور اس کا بھی ایک گوشہ ہے بنیادی انسانی کیریکٹر کا اور دوسرا گوشہ ہے تقویٰ و تدین کا! ——— دوسرے نظریات و خیالات اور تیسرے سیاسی حکمتِ عملی'

جہاں تک سیاسی حکمتِ عملی کا تعلق ہے وہ مولانا آزاد کی بھی وہی تھی جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیرِ قیادت جمعیت علماءِ ہند کی رہی لہٰذا اس کے ضمن میں تو بات یکجا ہو گی۔

جہاں تک بنیادی انسانی اخلاقیات اور اساسی سیرت و کردار کا تعلق ہے پوری دنیا ان کے کیریکٹر کا لوہا مانتی ہے اور سوائے اس کے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاسی کشمکش اور رسہ کشی کی شدت کے دور میں بعض رکیک باتیں بھی انکے

بارے میں کہی گئیں جو ایک خاص دَور کی شدّتِ جذبات کا مظہر تھیں، اُن کی ذہانت و فطانت؛ فہم و بصیرت اور وُسعتِ فکر و نظر کے ساتھ ساتھ اُن کی پامردگی و بلند حوصلگی، جرأت و شجاعت، اور ثبات و استقامت، اور ان سب پر مستزاد اُن کی ذاتی شرافت و مروّت، عالی ظرفی، وضعداری اور وُسعتِ قلب کے بارے میں دو رائیں ممکن نہیں۔ اس معاملے میں مولانا قاسمی مدظلہٗ نے خاص مسئلہ امامت و امارت کے ضمن میں ان کی حسن وسعتِ ظرف کا ذکر کیا ہے اُس کا حوالہ پہلے آچکا ہے۔!

البتہ اُن کے تقویٰ و تدیّن اور بعض نظریات و خیالات کے بارے میں متضاد آراء موجود ہیں۔ تاہم راقم کے نزدیک اُنکی ذات کی حد تک تو کفِّ لسان اور "اذکروا موتاکم بالخیر" پر عمل اَولیٰ و انسب ہے ہی، اُن کے خیالات کے بارے میں بھی خود یہ رائے رکھنے کے باوجود کہ کچھ اپنی فلسفیانہ افتادِ طبع اور کچھ گاندھی جی کے قُرب کے باعث وہ اُن کے مرشد راجہ رام موہن رائے کے ایجاد کردہ "نظریۂ وحدتِ ادیان" سے کسی قدر متأثر ہو گئے تھے[*] راقم کا طرزِ عمل یہی ہے کہ کبھی اُس کا ذکر ہوتا بھی ہے تو نہایت اجمال و اختصار سے اور

راقم کے نزدیک اصل اہمیت اسلام کی اُس اُصولی و انقلابی دعوت کی ہے جس کے برِّصغیر پاک و ہند میں اس صدی کے داعیٔ اوّل کی حیثیت عطا فرمائی اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ !

---

[*] یہی معاملہ راقم کا مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ بھی ہے۔ کہ جہاں تک انکے شخصی محامد و محاسن یا کوتاہیوں اور تقصیروں کا معاملہ ہے وہ ان کی ذات سے متعلق تھا اور خصوصاً اُن کی وفات کے بعد اُن کے معائب، کے بارے میں گفتگو لاحاصل ہی نہیں، مضرت بخش بھی ہو سکتی ہے، البتہ جہاں تک اُنکے نظریات و خیالات کا تعلق ہے اُن میں سے جو چیزیں قابلِ گرفت نظر آئیں اُن پر تنقید و تبصرہ نہ صرف یہ کہ نامناسب نہیں بلکہ لازمی اور ضروری ہے۔ چنانچہ خود راقم

کو ان کے بعض نظریات سے شدید اختلاف ہے (جیسے اُن کا نظریۂ حکمتِ عملی اور تاریخ اسلام کے صدیِ اوّل کے دورِ فتن کے حالات و واقعات کے ضمن میں اُن کا تجزیہ اور بعض جلیل القدر صحابہ کرامؓ پر اُن کی نادوا تنقید والزام تراشی ــــ اسی طرح تصوّف سے اُن کا بُعد اور اُس کی کلّی نفی و تردید وغیرہ) اور ان پر راقم نے مختلف مواقع پر لکھا بھی ہے اور اپنی تقاریر میں تفصیلی کلام بھی کیا ہے۔ اسی طرح راقم الحروف کو اُن کی بعد از تقسیم ہند سیاسی حکمتِ عملی سے جو شدید اختلاف ہے وہ صرف قارئین ' میثاق ' کے حلقے ہی میں نہیں بلکہ اُس سے کہیں زیادہ وسیع حلقے میں معروف و مشہور ہے ، تاہم اُن کے ضمن میں بھی :

راقم کے نزدیک اصل اہمیت اُس اصولی دعوت و تحریک کی ہے جس کے وہ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۷ء داعی و قائد رہے اور جو اصلاً تسلسل ہے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ہی کی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء کی دعوت و تحریک کا ! اور جس کی امانت کا بارِ گراں اب راقم الحروف اپنے ضعیف و ناتواں شانوں پر محسوس کرتا ہے - اور اس اصولی دعوت و تحریک کی حد تک چونکہ مولانا آزاد کو سند حاصل تھی حضرت شیخ الہندؒ کی لہٰذا راقم اپنے آپ کو اِن دو واسطوں سے اصلاً منسلک سمجھتا ہے شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ !

جہاں تک مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیرِ قیادت جمعیتِ علماء ہند اور کانگریس میں شمولیت کی بنا پر مولانا آزاد مرحوم کی سیاسی حکمتِ عملی کا تعلق ہے مجھے اس میں ہرگز کوئی اشتباہ نہیں ہے کہ وہ اصلاً حضرت شیخ الہندؒ ہی کی اختیار کردہ تھی ۔ اور مجھے مولانا قاسمی مدظلہ کے ان الفاظ سے ہرگز کوئی اختلاف نہیں کہ "مشترکہ جدوجہد کا منصوبہ شیخ الہندؒ اسارتِ مالٹا سے اپنے ساتھ لائے تھے !" بلکہ مولانا

کی تحریر سے میرے علم میں یہ اضافہ ہوا ہے کہ "ترکی قائدین نے شیخ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان تنہا جدّوجہد کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نہیں نکال سکتے ۔ جیسا کہ وہ اب تک ناکام رہے ہیں" !![1] بلکہ ــــ اس ضمن میں میں مولانا مدنی رحؒ کے اُس موقف کو صد فی صد درست سمجھتا ہوں جو انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح 'نقشِ حیات' میں پیش فرمایا ہے کہ انگریز کی غلامی سے گلوخلاصی کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدّوجہد کا راستہ تیرھویں صدی کے مجدّد' مجاہدِ کبیر حضرت سیّد احمد بریلویؒ کا اختیار کردہ تھا[2] اور اس مسئلے میں جو شدید اور

---

[1] اِن ہی دنوں "بیس بڑے مسلمان" نامی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ بات بھی نظر سے گذری ــــ اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ بھی میرے علم میں اضافہ کا موجب بنی ہے کہ امیر حبیب اللہ خان والیٔ افغانستان نے بھی بعینہٖ یہی مشورہ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کو دیا تھا ۔ !!

[2] اس ضمن میں بھی راقم کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ضبطِ تحریر میں آجائے تو اچھا ہے ــــ اور وہ یہ کہ ۵۵ ـ ۱۹۵۶ء میں جب 'نقشِ حیات' شائع ہوئی تو مولانا مودودی مرحوم نے اس پر شدید تنقید 'ترجمان القرآن' میں شائع کی ۔ راقم اُس وقت جماعت اسلامی کا فعّال رکن ہی نہیں جماعتِ منٹگمری (حال ساہیوال) کا امیر بھی تھا ۔ لیکن اُس پر یہ اللہ کا بڑا فضل و احسان ہے کہ وہ اندھا بہرا مقلّد کبھی بھی نہیں رہا ۔ چنانچہ راقم نے (بعمر ۲۳، ۲۴ سال) جامعہ رشیدیہ حاضر ہو کر اصل کتاب حاصل کی اور اُس کا مطالعہ کیا اور جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ حضرت مدنیؒ کا موقف یہ ہے کہ ہم نے جو سیاسی لائحۂ عمل اختیار کیا تھا وہ ہمارے اپنے اجتہاد پر مبنی نہیں تھا بلکہ یہ تو حضرت سیّد صاحبؒ کا اختیار کردہ تھا جسے ہم نے جاری رکھا ہے تو میں نے جماعت اسلامی ساہیوال کے اجتماعِ ارکان میں برملا یہ الفاظ کہے کہ "اس معاملے میں مولانا مودودی سے علمی خیانت کا ارتکاب ہوا ہے اس لئے کہ دیانتداری کا تقاضا ہے کہ یا تو مولانا مدنیؒ کی اِس بات اور اس کے لئے جو حوالے انہوں نے پیش کئے ہیں انکو چیلنج کیا جائے ــــ ورنہ اب اگر تنقید کرنی ہے تو حضرت سیّد احمد بریلویؒ پر کریں ۔ یہ علمی بددیانتی ہے کہ تنقید میں اُن کا ذکر تک نہ کیا جائے اور ساری جرح مولانا مدنیؒ پر کی جائے !"

جارحانہ تنقیدیں مولانا مودودی مرحوم نے جمعیتِ علماء ہند اور عرفِ عام کے مطابق "نیشنلسٹ علماء" پر کیں انہیں میں انتہا پسندی کا مظہر سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ایک دفاعی حربے کے طور پر "متحدہ قومیت" کے تصوّر کو عارضی طور پر اختیار کر لینا ہرگز نہ کفر تھا نہ شرک، جیسا کہ مولانا مودودی نے اپنی انتہا پسندی کی بنا پر اور اپنی انشاپردازانہ مہارت کے ذریعے اُسے بنا دیا تھا!

اس موضوع پر بھی راقم کی ۷۴ء کی تحریر کا ایک اقتباس طوالت کے خوف کے علی الرغم ضروری محسوس ہوتا ہے — یورپی استعمار سے خلاصی حاصل کرنے کیلئے جو تحریکیں موجودہ صدی کے وسط میں مختلف مسلمان ممالک میں چلیں اُنکے تذکرہ میں راقم نے لکھا تھا (میثاق، اکتوبر، نومبر ۷۴ء، حال مشمولہ کتاب 'سرافگندیم')

"اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصولِ آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لئے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال (INVOKE) کیا گیا، انہیں بھی خالص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر کے ساتھ سوائے تباین و تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے۔ لیکن عالمِ واقعہ میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار موجود نہیں تھا۔ اس لئے کہ اسلام کیساتھ مسلمانوں کا ذہنی و قلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعّال تحریک کی اساس بنایا جاسکتا اور حصولِ استقلال کے لئے جس مؤثر مزاحمت (EFFECTIVE RESISTANCE) کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات (CONCRETE FOUNDATION) ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تُرک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہوگیا ہوتا تو شاید آج تُرکی کا نام و نشان بھی صفحۂ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں۔ اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لئے واحد موجود (THE ONLY AVAILABLE) بنیاد بن سکتا تھا اور ایک

وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے بشرطیکہ اسے نظامِ فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کر لیا جائے اور حصولِ آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدتِ ملّی کے شعور و احساس کو اجاگر کیا جائے۔"

"چنانچہ جمعیتِ علمائے ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خود نوشت سوانح 'نقشِ حیات' میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانانِ پنجاب کو 'سکھا شاہی' سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!"

(میثاق اکتوبر نومبر ۱۹۷۲ء)

البتہ راقم کے نزدیک جیسے جیسے حالات نے کروٹ لی اور صورتِ حال تبدیل ہوئی، قطع نظر اس کے کہ وہ ہندوؤں کی قدیم متعصب ذہنیت کا نتیجہ تھی ـــ یا مسلمانوں کی 'ہزار سالہ' غلامی سے پیدا شدہ انتقامی جذبہ کا شاخسانہ تھی، یا انگریزی سیاست اور اس کی شاطرانہ چال کی پیدا کردہ تھی، بہرحال اس پالیسی پر اُس نظرِ ثانی کی ضرورت تھی جس کی جانب اشارہ حضرت شیخ الہندؒ کے خطبۂ صدارت (۱۹۲۰ء) میں موجود ہے ـــ یعنی

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن محکموں اور ابوابِ معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی اکثریت اور ریزولیشنوں کی تائید سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے۔"

[illegible]

اس ضمن میں بھی راقم اب کچھ کہنے کی بجائے اپنی سنہ ۶۷ء کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتا ہے تاکہ اُسے کسی وقتی سخن سازی سے تعبیر نہ کیا جائے:

"بدقسمتی سے اس موقع پر مسلمانانِ ہند کے مذہبی طبقوں اور خصوصاً تحریک شہیدین ؒ اور جماعتِ مجاہدین ؒ کے معنوی و روحانی وارثوں نے حالات کے رُخ کو سمجھنے میں سخت غلطی کی اور وہ ہندوستان کی پوری مسلمان قوم کے سوادِ اعظم کے احساسات کا صحیح اندازہ کرنے میں بُری طرح ناکام رہے!! اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا اصل سبب کیا تھا؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا اصل سبب وہ حد سے بڑھی ہوئی انگریز دشمنی ہو جو ان کے لائے ہوئے زندقہ والحاد ——— اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں پر ان کے بے پناہ مظالم سے پیدا ہوئی تھی ——— اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا اصل سبب ان حضرات کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہو جس کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز سے نپٹ لینے کے بعد ابنائے وطن کے مقابلے میں اپنے ——— دین اور اپنے تہذیب وتمدّن اور فی الجملہ اپنے قومی تشخص کا تحفظ کچھ مشکل نہ ہوگا۔ بہرحال ہوا یہ کہ ان حضرات نے اپنے لئے یہ راہ متعین کی کہ پہلے ہندوؤں کے ساتھ مل کر غیر ملکی حکمرانوں سے گلوخلاصی کرائی جائے۔ ہندو مسلم معاملات اس کے بعد طے ہوتے رہیں گے۔ جبکہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لئے یہ لائحہ عمل طے کیا کہ وہ پہلے ہی سے تحفظات کے حصول کی جدّوجہد کریں گے۔ اور اس امر کی سعی کریں گے کہ وطن اس طور سے آزاد ہو کہ اُس میں اُنکے جملہ حقوق اور فی الجملہ انکے قومی تشخّص کے تحفظ کی مکمل ضمانت حاصل ہو جائے۔

اس طرح ہندُوستان کی مسلمان قوم کے سوادِ اعظم اور اسکے مذہبی طبقات کے مابین بُعد مزید بڑھ گیا ——— بلکہ آزادی کی جدوجہد میں یہ دونوں علیحدہ علیحدہ راہوں پر گامزن ہوگئے۔

۔۔۔ اس صورت حال کا سب سے اہم نتیجہ جس کی جانب بہت کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے، یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک قوم

کے بہترین افراد سے محروم ہوگئی۔ ابتک قوم کی پوری سیاسی و دینی قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں رہی تھی اور جس میں ایک سے ایک بڑھ کر مخلص و بے نفس، محنتی و سخت کوش، آزمودہ و تجربہ کار اور ہر اعتبار سے منجھا ہوا اور سرد و گرم چشیدہ سیاسی کارکن موجود تھا وہ قوم سے بے تعلق ہوکر رہ گیا ۔۔۔۔ (اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج خصوصاً پاکستان میں ہماری قومی زندگی جس شدید قحط الرجال سے دوچار ہے اُس کا اصل سبب یہی نہیں ہے!)"

(شائع شدہ 'میثاق' مئی ۱۹۶۷ مشمولہ 'اسلام اور پاکستان' ص۹۸)

چنانچہ راقم کے نزدیک اس صدی کے پانچویں دہے تک حالات کی تبدیلی کے پیش نظر 'حضرت شیخ الہند' کی جماعت' کے لئے صحیح تر طرز عمل وہ تھا جو حضرت شیخ ہی کے ایک دوسرے شاگرد و رفیق مولانا شبیر احمد عثمانی نے اختیار کیا اور جیسا کہ راقم اس سے قبل عرض کر چکا ہے، اب تو حسرت کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ پالیسی جمعیت علماء ہند نے مجموعی طور پر اختیار کر لی ہوتی تو برصغیر کی تاریخ کا رُخ ہی اور ہوتا ۔۔۔ اور آج ہم حیرانی و سرگشتگی کے 'صحرائے تیہہ' میں نہ گھوم رہے ہوتے!!

اگرچہ اس اختلاف رائے کی بنا پر حضرت مدنی اور اُنکے جلیل القدر رفقاء پر سب و شتم یا اُنکے خلوص و اخلاص پر شک و شبہ یا اُن کی شان میں گستاخی کو میں گناہ عظیم تصور کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے 'میثاق' میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی ---- مرحوم و مغفور کا وہ 'توبہ نامہ' بھی پوری آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا جو انہوں نے اپنی اُن گستاخیوں کے ضمن میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی تاکید پر تحریر کیا تھا جو تحریک پاکستان کے عروج کے دور میں حضرت مدنی کی شان میں اُن سے سرزد ہوئی تھیں۔ اور خود راقم نے جب ۱۹۷۰ء میں تھانوی حلقے کے ایک بزرگ عالم دین کی زبان سے مولانا مدنی اور اُن کے رفقاء کے بارے میں "کانگرسی مولوی" کی پھبتی سُنی تو جو جذباتی ردِّ عمل قلب کی گہرائیوں سے اُبھرا تھا اُسے شائع کر دیا تھا (میثاق، جون، جولائی ۱۹۷۰ء) میں بایں الفاظ:

ان حضرات پرؒ کانگریسی مولوی ؒ کی پھبتی سن کر خدا جانتا ہے کہ دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی اوّلین زد مولانا حسین احمد مدنی رحؒ ایسے اکابرِ ملت، مجاہدینِ حریت اور زعمائے دین پر پڑتی ہے جن کے سیاسی موقف سے چاہے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علم و فضل، تقویٰ و تدین، خلوص و بے نفسی، عزم و ہمت، جانفشانی و تدبر، قربانی و ایثار اور حلم و تواضع کی کوئی دوسری مثال مسلم ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

مولانا مدنی رحؒ کی زیارت کا شرف ہماری گناہ گار آنکھوں کو تو حاصل نہیں ہوا لیکن انکی "اس کرامت" کا مشاہدہ ہم نے بچشم سر کیا ہے کہ کتنے ہی مخلص اور متدین لوگوں کی آنکھوں سے ان کا نام سنتے ہی آنسوؤں کا دریا بہہ نکلتا ہے۔ اور حلقۂ دیوبند کے مدارس کی وہ زیرِ تعلیم نوجوان نسل جس نے مولانا کو نہ دیکھا نہ سنا، ان کی توہین پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے"

"اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے سنایا کہ: جن دنوں کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش زوروں پر تھی اور مولانا مدنیؒ اور ان کے رفقاء تنقید و استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے، ایک روز خبر آئی کہ کچھ لیگی نوجوانوں نے مولاناؒ کے ساتھ نہایت توہین و تذلیل کا معاملہ کیا ——

ان دنوں دارالاسلام سرنا، پٹھان کوٹ میں عام معمول یہ تھا کہ شام کے وقت ہم سب لوگ اکٹھے سیر کے لئے نہر پر جایا کرتے تھے (گویا یہ ان دنوں کی مرکزِ جماعتِ اسلامی کی شام کی نشست تھی! مدیر) وہاں مولانا مودودی سمیت کچھ لوگوں نے اس خبر پر خوش گپی کے انداز میں تبصرے کرنے شروع کئے۔ لیکن میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مولانا مودودی نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا — "میں اور کچھ تو نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنی رحؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!" — اس پر پوری مجلس پر خاموشی سی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مودودی نے کہا کہ "مولانا آخر جو لوگ

قوم کے احساسات و جذبات کا بالکل لحاظ نہ کریں ان کے ساتھ قوم کبھی گستاخی بھی کر گزرے تو کون سی بڑی بات ہے!" اس پر میں نے مزید تو کچھ نہ کہا لیکن اپنے فقرے کو دہرایا: "میں اور تو کچھ نہیں جانتا صرف یہ جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بڑی آفت آنے والی ہے!" -

"ذاتی تقویٰ و تدیّن کے علاوہ ---- اب تو ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ان حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ خود مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج سے تقریباً تین سال[1] قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ: "اب جو حالات پیش آ رہے ہیں ان کو دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے بارے میں اُن حضرات کی رائے زیادہ درست تھی جو یہ کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغ اسلام کو نہیں، فِرَقِ باطلہ اور الحاد و اباحیت کو حاصل ہوگا"! ---- لیکن بات یہاں تک نہ پہنچے تو بھی کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے کہ اس وقت صدّم ضدّا میں جو زیادتیاں ایک دوسرے پر ہو گئی تھیں۔ اب کم از کم ان کا اعادہ تو نہ ہو ----

ہم خود اپنا یہ ذاتی احساس بھی اس مقام پر بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے ---- کہ بقیہ تمام معاملات اور قیل و قال ایک طرف کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کے اعتبار سے تو کبھی کبھی شدّت کے ساتھ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ 'پاکستان کی اسکیم سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قوّت جو پہلے ہی تہائی ہے وہ تو تین حصّوں میں بٹ کر مزید کم ہو جائے گی اور ہندوؤں کی طاقت بالکل یکجا اور مجتمع رہے گی ----'! ان کا خیال کس قدر درست تھا!!

اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان سے مسلمانوں کے کسی تازہ قتلِ عام کی خبر آتی ہے دوسرے لاکھوں اور کروڑوں حسّاس مسلمانوں کی طرح راقم الحروف کے دل پر بھی چھریاں چل جاتی ہیں ---- اور

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۷۰ء کی ہے۔

نہ صرف یہ کہ یہاں کا ملکھ جین کاٹ کھانے کو دوڑنے لگتا ہے۔ بلکہ سیّدنا مسیحؑ کی تمثیل کے عین مطابق ہمیں کھانا ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا گوشت اور ہر مشروب ان کا خون نظر آنے لگتا ہے ——!!

ہمیں دوسروں سے تو کوئی گلہ نہیں لیکن حیرت ناک افسوس ہوتا ہے حلقۂ دیوبندی کے ان اکابر پر جو نہ صرف درس افتاء بلکہ تلقین وارشاد کی مسندوں پر رونق افروز ہوتے ہوئے بھی ایسے کٹھور دل واقع ہوئے ہیں کہ کچھ سیاسی یا روپہلی مصلحتوں کی بنا پر اب بھی ان خادمانِ دین و ملت پر "کانگریسی مولوی" ایسی تحقیر آمیز پھبتی کسنے سے باز نہیں رہتے۔"

(میثاق، جون جولائی ۱۹۶۰ء)

یہ اقتباسات ہماری آج سے لگ بھگ پندرہ برس قبل کی تحریروں کے ہیں اور ان کی طوالت کے باوجود ہم نے انہیں یہاں اس لئے نقل کر دیا ہے کہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ یہ کوئی وقتی 'سخن سازی' والا معاملہ ہے —— ان سے یہ بات بلا شائبۂ شک و شبہ ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا مدنیؒ اور اُنکے رفقاءِ گرامی کی سیاسی حکمتِ عملی سے اختلاف کے باوصف ہمارے دل میں اُن کے خلوص و اخلاص اور اُن کی سیرت و کردار کی عظمت کے بارے میں نہ صرف یہ کہ کوئی شک نہیں رہا بلکہ مثبت طور پر اُن کی علو ہمت اور مجاہدانہ کردار کی عظمت کا نقش قائم رہا ہے ——

بایں ہمہ راقم کو اعتراف ہے کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ نے مولانا آزاد مرحوم حضرت مدنیؒ اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی موجودہ بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کی جن خدمات جلیلہ کا ذکر فرمایا ہے اس سے راقم کے دل میں ان حضرات کی قدر و قیمت اور محبت و عقیدت میں مزید اضافہ ہوا ہے جس کے لیے راقم مولانا کا ممنون ہے!

تاہم جیسا کہ راقم پہلے عرض کر چکا ہے "جماعت شیخ الہندؒ" کے اس مختصر تذکرے یا صحیح تر الفاظ میں 'اشاریئے' میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا نام اگر سہواً رہ گیا ہے تب تو خیر ورنہ راقم اپنا احتجاج ثبت (REGISTER) کرانا ضروری سمجھتا

ہے ـــــ اس لئے کہ وہ بلا شبہ دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فرزند اور حضرت شیخ الہند رحؒ کے منظورِ نظر تلامذہ اور معتمد سا تھیوں میں سے تھے ۔

۱۹۰۸ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ دارالعلوم کے دورۂ حدیث کے امتحان میں اوّل آئے اور ۱۹۰۹ء ہی میں فتح پوری مسجد دہلی کے عربی مدرسے کی صدر مدرّسی کے عہدے پر فائز ہو گئے ـــ اُس زمانے میں دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کی زیرِ ہدایت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم ومغفور نے "جمعیت الانصار" قائم کی ہوئی تھی، مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ نے اُس میں بھر پور حصہ لیا اور اُس کے سالانہ جلسوں میں نہایت وقیع علمی مقالات پیش کیے ۔ ۱۹۱۱ء سے مولانا نے اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند ہی میں تدریس کی ذمہ داری سنبھال لی - اور اس کے ساتھ ہی گویا حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد رفیق کار کی حیثیت بھی اختیار کر لی - چنانچہ اکثر وبیشتر دوروں اور سفروں میں وہ ہی حضرت شیخ رحؒ کی رفاقت اور تقاریر کے ضمن میں نیابت ونمائندگی کی ذمہ داری ادا کرتے تھے - یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں "جمعیت علماء ہند" کی تأسیس ہوئی تو اسکی ورکنگ کمیٹی اور مجلسِ منتظمہ کے لئے علامہ عثمانی رحؒ بھی منتخب کئے گئے - جامعۂ ملّیہ کے افتتاح کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ سخت بیمار تھے - چنانچہ مولانا عثمانی رحؒ ہی نے اُن کے نمائندے کی حیثیت سے خطبۂ صدارت تحریر بھی کیا اور پڑھا بھی - پھر جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ "ترکِ موالات" کے ضمن میں جب حضرت شیخ الہند رحؒ نے یہ فرماتے ہوئے کہ "مجھ میں انگریزوں کی نفرت کا جذبہ شدت لئے ہوئے ہے، مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی - اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا" (سوانح قاسمی بحوالہ معاصر الجیر، بابت فروری ۵۸ء) اپنے تین شاگردوں یعنی: مفتی کفایت اللہ رحؒ، سید حسین احمد مدنی رحؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ کو فتوے لکھنے کا حکم دیا اور امتثالِ امر میں ان تینوں حضرات نے اپنے اپنے انداز میں فتوے تحریر کیا تو جس کی تحریر حضرت شیخ رحؒ کو سب سے زیادہ پسند آئی وہ علامہ عثمانی رحؒ ہی کی تھی ـــــ چنانچہ حضرت شیخ کے نمائندے کی حیثیت سے یہ "خطبہ" مولانا عثمانی رحؒ ہی نے جمعیت علماءِ ہند کے اجلاس ۱۹۲۰ء میں پڑھ کر سنایا ۔

ـــــ اور راقم کے نزدیک تو ان سب چیزوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہے یہ حقیقت کہ حضرت شیخ الہند رحؒ کے "ترجمۂ قرآن" کے حاشیہ پر "فوائدِ عثمانی رحؒ" کی اشاعت نے ابدالآباد تک کے لئے حضرت شیخ رحؒ کے نام نامی اور اسم گرامی کے ساتھ مولانا عثمانی رحؒ کے نام کو لازم و ملزوم کے درجے میں چسپاں کر دیا ہے۔

ان تفسیری فوائد کے بارے میں، جو بلاشبہ اپنی جگہ مکمل تفسیر کا درجہ رکھتے ہیں، خود حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحؒ کے خیالات ملاحظہ ہوں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے علامہ زمان، محققِ دوران حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی زید مجدہم کو دنیائے اسلام کا درخشندہ آفتاب بنایا ہے۔ مولانا نے موصوف کی بے مثل ذکاوت، بے مثل تقریر، بے مثل تحریر، عجیب غریب حافظہ، عجیب تبحر وغیرہ کمالاتِ علمیہ ایسے نہیں ہیں کہ کوئی شخص منصف مزاج اس میں تأمل کر سکے۔ قدرتِ قدیمہ نے مولانا شبیر احمد صاحب موصوف کی توجہ تکمیلِ فوائد اور ازالۂ مغلقات کی طرف منعطف فرما کر تمام عالم اسلامی اور بالخصوص اہل ہند کے لئے عدیم النظیر حجتِ بالغہ قائم کر دی ہے۔ یقیناً مولانا نے بہت سی ضخیم تفسیروں سے مستغنی کر کے سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے۔"

(قرآن حکیم تفسیر عثمانی ۔ مدینہ بجنور (بھارت))

اس پر مستزاد ہے علومِ حدیث و فقہ اور علم الکلام میں اُن کا مقام و مرتبہ، چنانچہ صحیح مسلم کی شرح "فتح الملہم" کے بارے میں بیہقیِ وقت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری کا فرمانا ہے کہ:

"یقیناً اپنے زمانہ کے علامہ مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی کہ اس زمانہ کے محدث و مفسر و متکلم ہیں اور احقر کے علم میں کوئی شخص اس کتاب (مسلم) کی خدمت ان سے زیادہ بہتر اور برتر نہ کر سکا۔ اس کی خدمت (شرح) کی طرف متوجہ ہو کر انہوں نے اہلِ علم کی گردنوں پر احسان کیا ہے۔"

اور بحیثیت "متکلمِ اسلام" مولانا عثمانی رحؒ کا درجہ کیا تھا اُس کے ضمن میں کفایت کرے گی مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کی یہ شہادت کہ:

"جن حضرات کو حضرت موصوف سے علمی استفادے کا موقعہ ملا ہوگا، انہیں اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ ذہانت و ذکاوت، فکر کی دقّت و متانت اور دماغ کے سلجھاؤ میں وہ آپ ہی اپنی نظیر تھے۔ اسی طرح اپنے مدعا کو بہترین اسلوب اور نہایت دلنشین انداز میں بیان کرنے اور دقیق سے دقیق علمی حقیقتوں کو آسان کرکے سمجھا دینے کا جو خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موصوف کو عطا فرمایا تھا، وہ ان کے لئے ان کے رب کا خاص عطیہ تھا۔

ایک مبصر ناقد نے مولانا کی بعض تقریریں سُنکر ایک زمانہ میں کہا تھا اور بالکل صحیح کہا تھا کہ جب مولانا غیبی حقیقتوں کو دلیلوں اور مثالوں سے سمجھانے اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیب اب شاید غیب نہیں رہے گا بلکہ شہود بن کر سامنے آجائے گا۔"

(الفرقان لکھنؤ بھارت، دسمبر ۴۹ء)

تو اس سب کے باوصف کیا صرف اس لئے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی رح مولانا سید حسین احمد مدنی رح کی سیاسی حکمتِ عملی سے کلیۃً اتفاق نہ کرسکے اور اگرچہ وہ ۱۹۴۶ء تک جمعیتِ علماءِ ہند کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے لیکن اسی اختلافِ رائے (اور ہوسکتا ہے کہ اس میں مزاج (افتاد طبع کے فرق یا بعض ذاتی نوع کی شکایتوں کو بھی دخل حاصل ہو!) کی بنا پر ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم دیوبند سے تعلق منقطع کرکے ڈابھیل چلے گئے —— اور بالآخر اپنے سیاسی موقف کی وضاحت اور اُس کے لئے بالفعل کام کرنے کے لئے ۱۹۴۵ء میں "جمعیت علماءِ اسلام" کا ایک جداگانہ پلیٹ فارم اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے —————— اُن کے نام نامی کو "جماعتِ شیخ الہند رح" سے خارج کر دینا قرینِ انصاف ہوگا؟

بہر حال راقم الحروف کا تو حضرت شیخ الہند رح کی شخصیت سے ابتدائی تعارف ہی تفسیری فوائد کی وساطت سے علامہ عثمانی رح ہی کے ذریعے سے ہوا تھا اور راقم اپنی گردن پر ایک احسان عظیم سمجھتا ہے شیخ الہند رح مولانا محمود حسن دیوبندی رح اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رح کا کہ علامہ اقبال مرحوم کے اشعار سے ایک

مبہم سے جذبہ ملّی اور "میلان الی القرآن" کے حصول ــــ اور ابتداءً مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف اور بعدازاں مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن"، اور مولانا اصلاحی کی "تدبّرِ قرآن" کے ذریعے معانیٔ قرآن کے ساتھ ابتدائی تعارف کے بعد جب راقم نے بھی آزادانہ طور پر علم وحکمتِ قرآنی کے بحرِ ذخار میں غوطہ زنی شروع کی تو اس پورے عرصے میں میرا "عروۃ وثقیٰ"، ترجمۂ شیخ الہندؒ اور حواشیٔ شیخ الاسلامؒ ہی رہے ہیں۔ جنہوں نے مجھے بفضلہ تعالیٰ نئی نکتہ طرازیوں اور دور دراز کی تاویلوں سے حفاظت میں رکھا ہے۔

اور اس اعتبار سے بھی میں اپنے آپ کو بواسطۂ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ منسلک اور متوسّل سمجھتا ہوں شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے!

اس موضوع پر اسقدر طولِ کلام سے راقم الحروف نے اس لئے کام لیا ہے کہ جیسا کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ نے بھی فرمایا ــــ اور راقم بھی عرض کر چکا ہے راقم کو یقین ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدّد تھے حضرت شیخ الہندؒ! اور انکی جامعیت کبریٰ کے مظہرِ اتم ہیں اُن کے تلامذہ بحیثیتِ مجموعی!! اور اگرچہ اُن میں سے کوئی بھی ان کی سی جامعیت کا مظہر تو نہ تھا تاہم اُن میں سے ہر ایک نے برصغیر پاک وہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور پاکستان اور ہندوستان کے موجودہ مُسلمان معاشرے میں مختلف عنوانات کے ذیل میں اور مختلف تحریکوں اور تنظیموں میں منقسم صورت میں جو بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف بلکہ متضاد نظر آتی ہیں درحقیقت اثرات پھیلے ہوئے ہیں حضرت شیخ الہندؒ ہی کی عظیم ذاتِ جامع الصّفات کے، بالکل اُس شان سے جو علامہ اقبال کے ان اشعار میں سامنے آتی ہے کہ:

اڑائی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے | چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری!
اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے | چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اور اب اصل ضرورت اِس امر کی ہے کہ اِس ظاہری افتراق وانتشار میں تالیف

واجتماع کی صورت پیدا کی جائے ـــــ اور ان بکھرے ہوئے اثرات کو از سرِ نو سمیٹ کر تعمیرِ نو کی سعی کی جائے!! اس شان کے ساتھ کہ ؎

دھرتی کے کونوں کھدروں میں پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو!
پھر مٹی سینچو اشکوں سے پھر اگلی رُت کی فکر کرو!!

اور اسی کے لئے کمر ہمت کسی ہے حضرت شیخ الہندؒ کے اس ادنیٰ عقیدتمند ـــــ اور اُن کے علم و فضل اور جذبہ وجوش عمل کے اس ادنیٰ خوشہ چین نے بقول ئے

؎ اخلاص عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

چنانچہ راقم خدا کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ راقم کے دل میں بلا تکلف و تصنع از خود محبّت وعقیدت پیدا ہو جاتی ہے ہر اُس شخص سے جس کا ادنیٰ سے ادنیٰ تعلق رہا ہو حضرت شیخ الہندؒ سے ـــــ یا جسے ادنیٰ سے ادنیٰ نسبت حاصل ہو اُن کی ذاتِ گرامی سے! اور راقم ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہے جملہ متوسّلان حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں کہ خدارا! وقت کی پکار کو کھلے اور متوجہ کانوں اور کشادہ و حاضر دلوں سے سُنیں، بمصداق الفاظِ قرآنی:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ
أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ

رہا مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کی تحریر کے آخری حصے میں وارد شدہ پند و نصائح کا معاملہ تو اُن کے ضمن میں گزارش ہے کہ راقم نے جب مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی صاحب کے نام خط میں یہ لکھا کہ:

"کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین جس خلیج کو ابتداء ہی میں پاٹ دینے کی کوشش کی تھی حضرت شیخ الہندؒ نے، وہ اس کے بعد روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور مسلمانانِ برصغیر کی ملّی اور قومی زندگی کا اصل دھارا علی گڑھ کے زیرِ اثر آتا چلا گیا ـــــ اور علماء کی حیثیت زندگی کی اصل

منجدھار سے ہٹی ہوئی ایک پتلی سی دھار کی صورت چلی گئی — تاآنکہ اب وہ اپنے محدود دائرۂ اثر کے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں - اور یہ جزیرے بھی دن بدن " نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا " کے مصداق روز بروز مختصر سے مختصر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں ؟"

" پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ علمائے کرام جمعہ و جماعت، درس و خطابت، افتاء و ارشاد ایسی اہم خدماتِ جلیلہ اور قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صداؤں اور دینی علوم کو زندہ رکھنے کے عظیم کارنامے —— اور دینِ حق اور شریعتِ حقہ کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے خلاف مساعیٔ عظیمہ کے باوصف غلبہ و اقامتِ دین کے مثبت مقصد کی جانب کوئی قابلِ لحاظ اور مؤثر اجتماعی تحریک نہیں چلا پا رہے ؟ —— علمائے دیوبند کے ایک حلقے سے تبلیغِ دین کے عنوان سے جو عظیم حرکت شروع ہوئی، اس میں شک نہیں کہ وسعت کے اعتبار سے اس کی کوئی نظیر حال میں تو کیا ماضی میں بھی نہیں ملتی — لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ بھی انفرادی اصلاح کے مرحلے سے آگے بڑھ کر کسی خطۂ ارضی پر دینِ حق کے واقعی قیام و نفاذ کے لئے کوئی راست اقدام کرنے کے بارے میں سوچنے پر بھی آمادہ نہیں !"

تو اس سے مقصود نہ کسی کی دلآزاری تھی، نہ توہین و تنقیص نہ طنز و تعریض، بلکہ صرف اور صرف صورتِ واقعہ کا کماحقہٗ، بیان و اظہار تھا - تاکہ سینوں میں درد اور دلوں میں سوز و گداز پیدا ہو - ورنہ واقعہ یہ ہے کہ راقم کے قلب کی گہرائیوں میں حد درجہ قدر و وقعت اور کمالِ محبت و عقیدت موجود ہے اُن علمائے کرام کے لئے بھی جو شب و روز قال اللہ تعالےٰ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مصروف و مشغول رہتے ہیں یا جمعہ و جماعت اور وعظ و خطابت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور اُن مربی اور مزکی حضرات کے لئے بھی جو لوگوں کے نفوس کے تزکیے، قلوب کی تنویر اور رُوح کے تجلیے میں منہمک رہتے ہیں —— رہی جماعتِ تبلیغی، تو یہ تو راقم عرض کر ہی چکا ہے کہ اسے بھی راقم حضرت شیخ الہندؒ ہی کی جماعت کی ایک شاخ سمجھتا ہے، مزید برآں راقم کے قلب و ذہن میں اس کے نقل و حرکت کی وسعت اور اس کے اصحابِ عزم و ہمت کے خلوص و اخلاص

کے احساس و شعور کی کوئی کمی نہیں ـــــــــــــــــــــ اور آخری بات یہ کہ
راقم اللہ کے فضل و کرم کے پورے احساس و ادراک اور اس پر اس کی حمد و شکر کے
ساتھ اپنا یہ مشاہدہ، عرض کر رہا ہے کہ متعدد گوشوں اور مختلف واسطوں سے
اطلاعات مل رہی ہیں کہ اب اس حلقے میں بھی جہاد و قتال کی باتیں ہو رہی ہیں اور
آخری منزلِ مقصود کے طور پر غلبہ و اقامتِ دین ہی کا ذکر ہو رہا ہے ـــ راقم کیلئے
یہ اطلاعات حد درجہ حوصلہ افزا اور امید بخش ہیں اور ان سے راقم کی اس توقع
کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے کہ ان شاء اللہ خدمتِ دین کے یہ قافلے جلد ایک
دوسرے سے متحد اور ایک ہی عظیم تر تنظیم و تشکیل میں ضم و مدغم ہو جائیں گے اور
پھر اللہ نے چاہا تو وہ دن دور نہیں رہے گا جب :

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ۔۔۔ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک ۔۔۔ بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود ۔۔۔ پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں ۔۔۔ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

یعنی: "وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ"

وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ

پس نوشت

راقم الحروف اپنی اس تحریر کو مکمل کر کے حیدر آباد سندھ اور کراچی کے آٹھ روزہ
دورے پر روانہ ہو گیا تھا۔ امید تھی کہ واپسی تک پرچہ کم از کم پریس میں جا چکا ہوگا
لیکن خوشنویس صاحب کی علالت کے باعث پرچے کی تکمیل میں تاخیر ہو گئی۔ اس اثناء
میں ایک مکتوب مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کا دہلی سے موصول ہوا جس میں انہوں
نے اپنی اُس تحریر کے بارے میں ہندوستان کے علماء کا ایک مجموعی تأثر اور بالخصوص مولانا

افتخار احمد فریدی مدظلہٗ کے خط کا اقتباس درج فرمایا ہے جس کے بارے میں تفصیلی گفتگو راقم نے اپنی مندرجہ بالا تحریر میں کی ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب سلام مسنون،

ماہ جنوری کا میثاق ملا، بندہ کا مضمون ہندوستان کے علماء کو پسند آیا، اسی کے ساتھ آپ کی وسیع النظری اور اخلاص کی لوگوں نے تعریف کی کہ آپ نے مجھ ناچیز کی تنقید اور اختلاف رائے کو گوارا فرمایا ——— مراد آباد کے مولانا افتخار فریدی صاحب کے پاس میثاق آتا ہے۔ موصوف نے لکھا ہے۔

"حق تعالیٰ ڈاکٹر صاحب سے قرآن حکیم کی خدمت لے رہے ہیں۔ اُن کے لئے آپ کی (مجھ ناچیز کی) رفاقت بہت مناسب ہے۔ میدان میں کام کرنے والوں کی اس طرح نگرانی کرنا تریاق کے حکم میں ہے"

اگر گنجائش ہو تو ۵ عدد پرچے ڈاک سے مجھے ارسال کر دیں تاکہ میں ہندوستان سے نکلنے والے جماعتی رسائل کو بغرضِ اشاعت ارسال کر دوں ——— چند کاپیاں اپنے مضمون کی فوٹو اسٹیٹ کرا کر بھیج رہا ہوں لیکن پورا پرچہ جو اثر کرے گا وہ صرف میرے مضمون سے نہیں ہوگا۔

تمام رفقاءِ کرام کی خدمت میں سلام مسنون۔

اخلاق حسین قاسمی
۲۲ جنوری ۸۵ء

راقم کو اُمید واثق ہے کہ مولانا موصوف اور حضراتِ علماء کرام میری ان گذارشات پر خوشدلی اور وسعتِ قلب کے ساتھ غور فرمائیں گے ——— اور اپنی آراء سے نوازیں۔

——— خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ،

مدیر "الفرقان" لکھنؤ، کی تالیف

مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت اور اب میرا موقف،

کا پہلا باب

تحریک خلافت اور اسکے اثرات

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ، کی یہ تحریر راقم الحروف کی نگاہ سے اس وقت بھی گذری تھی جب یہ اوّلاً (لگ بھگ پانچ سال قبل) "الفرقان" میں شائع ہوئی۔ بعدازاں جب یہ کتابی شکل میں شائع ہوئی تب بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس ماہ جب راقم اپنی تحریر "حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت" کا مسودہ کاتب صاحب کے حوالے کر کے کراچی گیا تو وہاں اتفاقاً پھر مولانا کی تالیف دیکھنے میں آئی اور محسوس ہوا کہ اس کا پہلا باب برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کے اُسی دور کے سیاسی و معاشرتی اور دینی و مذہبی پس منظر کو نکھار کر سامنے لاتا ہے جس کے بعض اعاظمِ رجال کا میری تحریر میں ذکر آیا ہے —— چنانچہ اس کی اشاعت ان شاء اللہ قارئین 'میثاق' کی دلچسپی کا موجب بھی ہوگی — اور خود میری تحریر میں اپنی کج مج بیانی کے باعث جو ابہام یا خلا رہ گیا ہے اسے بھی پُر کرے گی — اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یورپ کی پہلی جنگِ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء پر ختم ہوئی تھی، یاد ہے کہ اس کے خاتمہ تک ملک کی فضا ایسی تھی کہ عام آدمی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہاں انگریزوں کی حکومت نہیں رہے

گی، یا اس کے خلاف کوئی تحریک ہی اٹھ سکے گی ــــ پھر اس جنگ ہی کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا ہوئے جو ہندوستان میں "تحریکِ خلافت" برپا ہونے کا سبب بنے جس نے چند ہی مہینوں میں ہندوستان میں خاص کر ہندوستانی مسلمانوں میں وہ انقلاب برپا کر دیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ــــ خلافت کی تحریک اور آزادیٔ ہند کی تحریک دونوں ساتھ چل رہی تھیں، قیادت بھی دونوں کی مشترک تھی، مولانا محمد علی، شوکت علی جس طرح تحریکِ خلافت کے قائد و علمبردار تھے اسی طرح تحریکِ آزادی کے بھی، اور گاندھی جی جس طرح تحریکِ آزادیٔ ہند کے لیڈر تھے اسی طرح تحریکِ خلافت کے بھی، پروگرام بھی دونوں تحریکوں کا ایک ہی تھا، جس کا اہم نکتہ تھا، انگریزی سرکار اور اس سے تعلق رکھنے والے اداروں سے عدم تعاون اور تا امکان انگریزی مصنوعات کا بھی بائیکاٹ ــــ ہندو اور مسلمان دونوں پورے اشتراک بلکہ اتحاد کے ساتھ تحریک چلا رہے تھے لیکن مسلمانوں کے جذباتی مزاج، بے پناہ جوش و خروش اور مسئلہ خلافت کی خاص مذہبی نوعیت نے تحریک پر اسلامی رنگ غالب کر دیا تھا، ــــ اللہ اکبر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک نعرہ تھا، حد یہ تھی کہ بہت سے ہندو لیڈر جس طرح آزادیٔ ہند کے موضوع پر تقریر کرتے تھے اسی طرح خلافت کے مسئلہ پر بھی (جو مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ تھا) بالکل مسلمانوں کے انداز میں (بلکہ ایک حد تک مولویانہ انداز میں) تقریریں کرتے تھے، ہمارے ضلع مرادآباد میں میرے وطن سنبھل سے بالکل قریب ایک چھوٹا سا قصبہ سرسی ہے وہاں کے ماسٹر چیند و لال (جنہوں نے تحریک ہی کی وجہ سے اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا تھا) بڑے اچھے مقرر تھے، ان کی تقریروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "اَخْرِجُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ" بالکل صحیح الفاظ میں اور صحیح اعراب کے ساتھ اُن کی زبان سے بار بار سُننا اچھی طرح یاد ہے ــــ الغرض اس وقت ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جو تحریک مشترک طور پر چل رہی تھی اس پر اسلامی

رنگ ایسا غالب تھا جس کا وہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے جنھوں نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

جو دو تین سال "تحریکِ خلافت" کے خاص عروج و شباب کے تھے (تقریباً ۱۹۲۱-۲۲-۲۳ء) اُس زمانہ میں میرا قیام ایک طالب علم کی حیثیت سے ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو میں تھا میرے خاص استاذ و مربّی حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ (جن سے کچھ قرابت کا بھی تعلق تھا) مئو کی مشہور دینی درس گاہ "دارالعلوم" میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے) مجھے تعلیم و تربیت کے لئے ان کے سپرد کر دیا گیا تھا، اس وجہ سے اس زمانہ میں میرا قیام مئو میں تھا ـــ یوں تو ملک کے سب ہی حصّوں میں تحریکِ خلافت کا زور شور تھا لیکن مئو کا جو حال تھا وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے بڑے یا چھوٹے شہر کا رہا ہو ـ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگئی ہے ـــ چونکہ تحریک کے پروگرام میں سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا، اس لئے خلافت کمیٹی نے اپنی عدالتیں بھی قائم کی تھیں۔ یاد آتا ہے کہ مئو کے معتبر بزرگ شاہی جامع مسجد کے امام مولانا بشیر اللہ صاحب اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل مولانا محمد ضمیر صاحب اور مولانا عبد اللہ شائق مرحوم جو ایک بہت تیز اور ذی استعداد اہلحدیث عالم تھے) اس عدالت کے قاضی (جج) تھے ہر قسم کے مقدمات اور نزاعات مسلمانوں کے بھی اور غیر مسلموں کے بھی اسی عدالت میں آتے تھے اور ان کے فیصلے کئے جاتے تھے اور فریقین بلا چون و چرا ان فیصلوں کو مانتے تھے مسلمانوں میں بعض آوارہ مزاج لوگ تاڑی پیتے تھے (جو ایک طرح کی شراب ہے) خلافت کے رضاکار جو پولیس والی خدمات بھی انجام دیتے تھے ـــ ان کو پکڑ لاتے اور عدالت کے حکم سے ان کے کوڑے لگائے جاتے اور کوئی سرکشی اور سرتابی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا ـ مئو میں سرکاری تھانہ اور اس طرح کے دوسرے سرکاری ادارے اور محکمے موجود تھے لیکن اس عرصہ میں ان لوگوں کے لئے گویا کوئی کام نہیں تھا ـــ عوام کے اخلاق و کردار پر بھی غیر معمولی اثر پڑا تھا ـ جرائم اور لڑائی جھگڑے بڑی حد تک ختم ہو گئے تھے، کم از کم مئو

تو یہی حال تھا کہ وہ حقیقی معنی میں دار الامن بلکہ ایک طرح کا "دار الاسلام" بن گیا تھا۔
یہ فضا جیسا کہ عرض کیا گیا تقریباً دو تین سال قائم رہی، اس کے بعد جب سنہ ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے الغاءِ خلافت کا فیصلہ کر دیا تو تحریک کی بنیاد ہی ختم ہو گئی — اسی زمانے میں ملک میں بھی کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جن کے نتیجہ میں اس فضا کا خاتمہ ہو گیا، لیکن اس "تحریکِ خلافت" نے بعض بہت غیر معمولی اثرات چھوڑے، ان میں سے ایک یہ کہ عوام تک کے قلوب میں انگریزی حکومت کی مخالفت بلکہ دشمنی رچ بس گئی، اور اس کا خوف دلوں سے بالکل نکل گیا، اور ہم جیسے لوگ بھی "اپنی حکومت" اور کم از کم اس فضا کا خواب دیکھنے لگے جو تحریک خلافت میں قائم ہو گئی تھی اور راقم سطور نے مئو میں دیکھی تھی۔

دار العلوم دیوبند کی طالب علمی اور اس کے بعد جمعیۃ العلماء سے وابستگی

جیسا کہ اوپر عرض کیا، یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا اس کے بعد تعلیم کے آخری دور میں دو سال میرا قیام دار العلوم دیوبند رہا، اور واضح رہے کہ یہ اب سے قریباً ۶۰ سال پہلے کا دار العلوم دیوبند تھا، جب کہ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر ۳/۴ سال ہی گزرے تھے۔ تحریک خلافت نے جو جذبات پیدا کئے تھے یہاں کی فضا نے ان کی آبیاری کی اور ان کو اور مشتعل اور مستحکم کیا۔ "خلافت تحریک" ختم ہو چکی تھی، ان جذبات کو کسی درجہ میں غذا دینے والی مسلمانوں کی جماعت "جمعیۃ العلماء ہند" ہی میدان میں رہ گئی تھی اور "دار العلوم" میں تعلیم پائے ہوئے ہم جیسے لوگ اپنے اکابر کے تعلق سے اس کو اپنی جماعت سمجھتے اور اس سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے — راقم سطور کی بھی اسی سے وابستگی رہی۔

اُس وقت کی جمعیۃ العلماء

اس وقت وہ حقیقی معنی میں جمعیۃ العلماء تھی یعنی صرف علماء ہی اس کے ارکان اور عہدہ دار ہو سکتے تھے سیاسی پارٹیوں کی طرح کی عام ممبر سازی اور الیکشن کا طریقہ اس وقت تک نہیں اپنایا گیا

تھا،

اگرچہ ہماری جماعت دیوبند کے علاوہ دوسرے طبقوں اور حلقوں کے علمائے کرام، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، حضرات علماء اہلحدیث، علماء فرنگی محل، علماء بدایوں مولانا آزاد سبحانی، مولانا نثار احمد کانپوری، مولانا فاخر الٰہ آبادی (مولانا احمد رضا خاں صاحب[1] بریلوی کے خلفاء میں سے) مولانا مختار احمد میرٹھی۔ ان کے بھائی مولانا نذیر احمد خجندی مولانا عبدالعلیم میرٹھی (پاکستان کے مولانا نورانی میاں کے والد ماجد مرحوم) وغیرہ بھی اس وقت اچھی خاصی تعداد میں "جمعیۃ" میں شامل تھے اور وہ حضرات جمعیۃ کے ذمہ دارانہ عہدوں پر تھے لیکن ارکان اور کارکنوں میں غالب اکثریت جماعت دیوبند ہی کے علماء کی تھی ـــــ اسی دور کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ کسی موقع پر مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم نے (جو مسلکاً بدایونی حنفی تھے) مولانا ابوالکلام آزاد سے (جو سلفی المسلک تھے) بطور شکایت کے کہا کہ ہماری "جمعیۃ" کا نام تو "جمعیۃ العلمائے ہند" ہے لیکن واقعہ میں یہ جمعیۃ العلمائے دیوبند بنتی جارہی ہے۔ تو مولانا آزاد نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ میرے بھائی! ہندوستان میں جب بھی جمعیۃ العلماء بنے گی تو اس کی ہیئت ترکیبی یہی ہوگی، کیونکہ علماء تیار کرنے کا کام یہاں دیوبند ہی نے کیا ہے تو جب علماء کو جمع کیا جائے گا تو انھیں کی تعداد زیادہ ہوگی. اگر ہم نے، آپ نے یہ کام کیا ہوتا تو ہماری تعداد زیادہ ہوتی۔

آزادی کی جدوجہد میں کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل

ملک کی آزادی کی جدوجہد میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے ساتھ اشتراکِ عمل کا جو اصول تحریکِ خلافت کے دور میں اپنایا گیا تھا "جمعیۃ العلماء" بعد میں بھی اس پر برابر قائم رہی۔ اور آزادی حاصل کرنے کے لئے اس نے اس کو ضروری اور ناگزیر سمجھا لیکن

[1] مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، تحریک خلافت کے سخت مخالف تھے انھوں نے اس سلسلہ میں حسب عادت متعدد رسالے بھی لکھے تھے لیکن مولانا مختار احمد میرٹھی وغیرہ ان کے بعض خلفاء نے اس مسئلہ میں اُن سے گویا بغاوت کر دی تھی۔ نعمانی

آزادی کے بارے میں جمعیتہ کا خاص تصوّر

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ملک کی آزادی کے بارے میں "جمعیتہ العلماء" کا ایک خاص تصوّر تھا جو اس دور کے "جمعیتہ" کے اجلاسوں کے خطباتِ صدارت کے اوراق میں محفوظ ہے اور آج بھی دیکھا جا سکتا ہے (خاص کر حضرت مولانا محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار کے اجلاس مراد آباد کے خطبۂ صدارت میں اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے اجلاس کلکتہ کے خطبۂ صدارت، اور حضرت مولانا محمد انور شاہؒ کے اجلاس پشاور کے خطبۂ صدارت میں) اور جمعیتہ کے اجلاسوں کی تجاویز میں ــــ مجھے یاد ہے کہ اُس زمانہ کے جمعیتہ العلماء کے دستور میں **مقصد و نصب العین** کے تحت غالباً پہلی ہی دفعہ کے الفاظ یہ تھے **"شرعی نصب العین کے مطابق ہندوستان کی مکمل آزادی"**۔

بہر حال ملک کی آزادی کے بارے میں جمعیتہ العلماء کا ایک خاص تصوّر تھا، اور اسی تصوّر کی بنا پر اس کے اکابر و رہنما آزادی کی جدّوجہد کو اپنے لئے جہاد فی سبیل اللہ سمجھتے تھے اور اسی نیت سے اس کے راستہ میں قربانیاں دیتے تھے۔

شُدھی سنگٹھن کی تحریک کا دَور

تحریک خلافت کے اضمحلال اور پھر خاتمہ کے بعد کئی برس تک بعض ایسے اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، انگریزی حکومت کے خلاف جدّوجہد کا محاذ ٹھنڈا رہا تھا۔ اُس زمانہ میں آریہ سماجیوں کی اٹھائی ہوئی شُدھی سنگٹھن تحریک کے نتیجہ میں ہندو مسلم اتحاد بھی درہم برہم ہو گیا اور دین کی فکر رکھنے والے مسلمانوں کو دین کی حفاظت کے لئے اس تحریک کے جوابی اقدامات کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اس دَور میں جمعیتہ العلماء کی بھی مساعی زیادہ تر اسی شعبہ کی طرف مصروف رہیں۔ اسی زمانہ میں "جمعیتہ العلماء" نے اپنا اخبار "الجمعیتہ" نکالنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا مودودی اس کے اڈیٹر تھے اور وہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ یہ عاجز سب سے پہلے "الجمعیتہ" ہی کے ذریعہ ان کے نام

سے آشنا ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس زمانہ میں انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کا محاذ ٹھنڈا تھا، کانگریس کی طرف سے بھی کوئی تحریک جاری نہیں تھی۔

۱۹۳۰ء سے جنگ آزادی کا پھر آغاز

۱۹۳۰ء میں کانگریس نے انگریزی حکومت کے خلاف پھر آزادی کی جنگ شروع کی۔ جمعیۃ العلماء نے بھی اپنے امروہہ کے اجلاس میں اس جنگ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کا فیصلہ کیا اور وہ پھر کانگریس کے ساتھ جنگ کے میدان میں آ گئی۔

اس دور میں میرا حال اور مشاغل

عرض کیا جا چکا ہے کہ راقم سطور بھی جمعیۃ العلماء سے وابستہ تھا۔ میری یہ وابستگی اگرچہ ذہنی اور فکری لحاظ سے بہت عمیق اور راسخ تھی اور میں ملک کی آزادی کے سلسلہ میں اس کی جدوجہد اور قربانیوں کو پورے یقین و اطمینان کے ساتھ "فی سبیل اللہ" ہی جانتا اور سمجھتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کی اس سیاسی جدوجہد میں میرا عملی حصہ بس برائے نام ہی رہا۔ اس دور میں تعلیم و تدریس میرا خاص مشغلہ تھا، اس کے علاوہ آریہ سماجیوں کی برپا کی ہوئی "شدھی" کی تحریک نے (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) اس زمانہ میں آریہ سماج اور مسلمانوں کے درمیان مناظرہ، مباحثہ کا میدان گرم کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میدان میں اسلام کی وکالت و حمایت کی کچھ صلاحیت عطا فرمائی تھی اس لئے میں اس میں بھی حصہ لیتا تھا۔ قادیانی فتنہ اور قادیانی مبلغین کی سرگرمیاں بھی اس زمانہ میں عروج پر تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے اور ان کے فتنہ سے امت کی حفاظت کی خدمت کی توفیق بھی اس عاجز کو عطا فرمائی تھی۔

نیز قریباً اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نجد کی "وہابی حکومت" کے اس وقت کے فرمانروا سلطان عبدالعزیز بن سعود نے، شریف حسین کو (جس نے جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کی مدد سے سلطنت عثمانیہ ترکی اور خلیفۃ المسلمین سے بغاوت کر کے حجاز مقدس

پر اپنی حکومت قائم کرلی تھی) حرمین شریفین اور پورے علاقۂ حجاز سے بے دخل کر کے وہاں اپنا اقتدار قائم کرلیا اور اپنے مسلک کے مطابق حکومتی طاقت سے وہاں دینی اصلاحات نافذ کیں؛ اس سلسلہ میں انھوں نے وہ قبے بھی تڑوا ڈالے جو مکہ مکرمہ کے قبرستان "جنۃ المعلاۃ" اور مدینہ منورہ کی جنۃ البقیع میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے) بعض اہل بیت اور صحابۂ کرام کی قبور پر کسی زمانہ میں بنا لئے گئے تھے۔ اس واقعہ پر ہندوستان کے مختلف طبقوں کے قبوریین و مبتدعین اور شیعہ حضرات نے متحدہ محاذ بنا کر "وہابیوں" اور وہابیت کے خلاف زبان و قلم کی ایک طوفانی جنگ برپا کر دی اور یہاں حملوں کا خاص نشانہ شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کی دعوتِ توحید و سنت کی علمبردار جماعتِ دیوبند کے اکابر کو بنایا گیا اور تکفیر و تفریق اور فساد انگیزی کا وہ فتنہ جو مولانا احمد رضا خان بریلوی نے برپا کیا تھا اور جو تحریک خلافت میں بالکل دفن ہو گیا تھا پھر زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس میدان میں بھی یہاں مناظروں؛ مباحثوں کا بازار گرم ہو گیا۔ راقم سطور نے اللہ کی توفیق سے اس میدان میں بھی مسلک حق و اہل حق کی حمایت و وکالت میں حصہ لیا ـــ الغرض ایک طویل زمانہ تک تعلیم و تدریس کے ساتھ اسلام کی وکالت اور دین حق و اہل حق پر ہونے والے حملوں کی مدافعت بھی اس عاجز کا خاص مشغلہ رہا۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کو بھی قبول فرمائے اور اس سلسلہ کی تقصیرات معاف فرمادے۔

مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کا آغاز

غالباً سنہ ۱۹۳۲ء شروع ہو چکا تھا حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی نے ایک ادارہ لکھنؤ میں دارالمبلغین کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ "دارالعلوم دیوبند" جیسے بڑے دینی مدارس کے باصلاحیت فارغ التحصیل فضلا کو وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی دعوت و تبلیغ اور بیرونی حملوں اور اندرونی فتنوں

سے اس کی حفاظت و مدافعت اور اس کے لئے تحریر و تقریر اور مناظرہ مباحثہ کی تربیت دی جائے۔ مولانا مرحوم نے اس ادارہ کی خدمت کے لئے اس عاجز کو بھی طلب فرمایا اور اسی سلسلہ میں اس دور میں چند مہینے میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔ اسوقت مولانا کا ماہنامہ "النجم لکھنؤ" جاری تھا اس کے دفتر میں حیدرآباد سے ایک نیا رسالہ "ترجمان القرآن" آنا شروع ہوا، جس پر ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام ہوتا تھا۔ مولانا لکھنوی مرحوم کے صاحبزادے مولوی عبدالمومن فاروقی مرحوم نے جو خود نوجوان صاحب قلم تھے، اس کا ایک شمارہ دیکھنے کے لئے مجھے دیا، میں نے محسوس کیا کہ اس کے ایڈیٹر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالےٰ نے دینی مسائل و حقائق کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سمجھانے کی غیر معمولی صلاحیت اور قدرت عطا فرمائی ہے، اور اسلام کے بارہ میں مستشرقین کی کتابوں اور مغربی علوم و افکار کے پیدا کئے ہوئے شکوک و شبہات جڑسے اکھاڑ کے دلوں میں اطمینان و یقین پیدا کرنے میں ان کو خاص کمال حاصل ہے۔ اس کے بعد سے میں "ترجمان القرآن" کے ہر شمارہ کا منتظر رہنے لگا، جب وہ آتا تو مولوی عبدالمومن مرحوم مجھے پہنچاتے اور میں بڑے شوق اور اہتمام سے اس کا مطالعہ کرتا۔

بریلی سے الفرقان کا اجرا

لکھنؤ میں اپنے قیام ہی کے زمانہ میں، میں نے "الفرقان" جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور محرم ۱۳۵۳ھ (مارچ ۱۹۳۴ء) سے بریلی سے اس کا اجرا ہوا۔ اور اب "ترجمان القرآن" اس کے تبادلہ میں میرے پاس براہ راست آنے لگا، وہ مجھے اتنا عزیز تھا اور میں اس کا ایسا عاشق تھا کہ اس سے پہلے پورے ایک سال کے شمارے جو میں نے لکھنؤ میں دیکھے تھے اور اب میرے پاس نہیں تھے وہ بھی میں نے دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد سے بقیمت منگوالئے اور اس کا پورا فائل اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ترجمان القرآن کے مطالعہ سے میرے قلب میں مولانا مودودی کی وقعت

اور محبت میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے انکو اس دور میں متکلم اسلام لکھتا تھا اور نجی طور پر بھی اور الفرقان کے ذریعہ بھی "ترجمان القرآن" کے مطالعہ اور خریداری کی لوگوں کو ترغیب و دعوت دیتا تھا۔

ترجمان القرآن خالص علمی و دینی رسالہ

اس وقت "ترجمان القرآن" خالص دینی اور علمی رسالہ تھا جس میں ملک کی سیاسی تحریکات اور پولیٹیکل معاملات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا، برطانوی حکومت جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاغوتی حکومت" تھی اور ہندوستان پر اور عالم اسلام کے بہت بڑے حصہ پر براہ راست یا بالواسطہ مسلط تھی اس کے خلاف بھی کبھی کچھ نہیں لکھا جاتا تھا "حکومت الٰہیہ"، "اقامت دین"، "اسلامی نظام"، یا ان مقاصد کے لئے کسی جماعت کی تنظیم و تشکیل کا بھی کوئی ذکر اس کے صفحات میں نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس دور میں اس کے دائرہ بحث سے بالکل خارج تھیں

ترجمان القرآن میں سیاسی مضامین کا آغاز

"ترجمان القرآن" کے اجرا کے چوتھے سال ۱۹۳۶ء میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر ہندوستان میں پہلا جنرل الیکشن ہوا۔ اس دور میں جدا گانہ انتخاب کا طریقہ رائج تھا، مسلمان نمائندوں کو مسلمان ہی منتخب کرتے تھے اور ہندو نمائندوں کو صرف ہندو ۔ اس الیکشن کے نتیجہ میں ملک کے سات صوبوں میں کانگریس کو قطعی اکثریت حاصل ہوگئی، اور ان صوبوں میں بلا شرکت غیرے کانگریسی گورنمنٹیں قائم ہوگئیں۔ ان سات صوبوں میں غالب مسلم اکثریت کا ایک صوبہ سرحد بھی تھا۔ دوسرے صوبوں میں بعض دوسری مقامی سیاسی پارٹیوں کی مشترکہ گورنمنٹیں بن گئیں۔ یہ صوبائی گورنمنٹیں قانونی حیثیت سے زیر سایہ برطانیہ ہونے کے باوجود بڑی حد تک خود مختار تھیں۔

اس مرحلہ پر ہم جیسوں کے لئے دو حقیقتیں کھل کر بالکل سامنے آگئیں۔ ایک یہ کہ انگریزی اقتدار سے ملک کے بالکل آزاد ہو جانے کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے

۔۔۔ دوسرے یہ کہ انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت میں آزادی کی تحریک جس طرح چل رہی ہے اس کے نتیجے میں جو آزادی حاصل ہو گی اور جو جمہوری قومی حکومت قائم ہو گی وہ ہم مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق نہ ہو گی بلکہ خاص کر اقلیتی صوبوں میں ان کی تہذیب اور ان کے ملی تشخص کے لئے نئے نئے خطرات پیدا ہو جائیں گے ۔۔۔۔

۱۹۳۶ء کے الیکشن کے بعد ملکی سیاست پر مولانا مودودی کے مضامین

مولانا مودودی نے اس وقت ترجمان القرآن میں اس موضوع پر لکھنا شروع کیا، یہ واقعہ ہے کہ وہ قلم کے بادشاہ ہیں، ان کے یہ مضامین قوت استدلال کے لحاظ سے بہت ہی محکم اور بڑے موثر تھے۔ راقم سطور بھی ان سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا دوسرے بہت سے اخبارات و جرائد نے بھی ان کو اپنے صفحات میں شائع کیا یہاں تک کہ جمعیۃ العلماء کے اخبار "الجمعیۃ" میں بھی اس کی پہلی دو بایمن قسطیں شائع ہوئیں (حالانکہ ان کی زد اس وقت کے جمعیۃ کے سیاسی مسلک پر پڑتی تھی) "الفرقان" میں بھی یہ مضامین نقل ہوتے رہے اور راقم الحروف خود بھی ان کی تائید میں برابر لکھتا رہا۔

مولانا مودودی سے ذاتی ربط و تعلق

اسی زمانہ میں مولانا مودودی صاحب سے تعلقات بڑھے اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا اسی سلسلۂ مضامین میں ایک مرحلہ پر مولانا مودودی نے مسلمانوں کے سامنے احیاءِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کو اصل نصب العین بنا کر خالص دینی بنیاد پر اس طرح کی ایک جماعت کی تنظیم اور اصلاحی دعوتی کام کی اسکیم پیش کی جس طرح کسی دور میں مولانا آزاد مرحوم نے "الہلال" کے ذریعہ "حزب اللہ" کے نام سے ایک جماعت کی تنظیم شروع کی تھی ۔۔۔ مجھے یاد آتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں حوالہ کے ساتھ "الہلال" کے اقتباسات بھی نقل کئے تھے ۔۔۔ اس عاجز کو ان کی اس مثبت اسکیم سے بھی اس وقت پورا اتفاق تھا۔

پھر ایک مرحلہ آیا جب ہمارے درمیان خط و کتابت سے یہ طے ہوا کہ ترجمان القرآن اور الفرقان کے ذریعہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں مسلمانوں سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اور جو دعوت دی جا رہی ہے اس کو ایک تحریک بنا کر آگے بڑھانے کے لئے عملی جدوجہد کا کوئی لائحہ اور منصوبہ بنایا جائے ۔ مولانا مودودی نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ اب میں اس کا عزم کر چکا ہوں اور چونکہ اس کام کے لئے ریاستی علاقہ (حیدرآباد) بالکل مناسب نہیں ہے اس لئے میں پنجاب کے ایک مقام کو اپنی سکونت اور اس کام کے مرکز کے لئے تجویز کر چکا ہوں، اور وہاں منتقل ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہوں ۔ پھر ایک وقت انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ میں فلاں تاریخ کو دہلی پہنچ رہا ہوں، میرا قیام محلہ چوڑی والان "شمسی کاٹیج" میں ہوگا (یہ مولانا کا سسرالی مکان تھا) آپ اس تاریخ پر دہلی آجائیں تو آئندہ کام کے بارے میں تفصیلی باتیں ہوجائیں گی ۔‘

مودودی صاحب سے پہلی ملاقات

ابھی تک سارا تعلق غائبانہ تھا، ملاقات کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی، میں نے ان سے ملاقات اور مستقبل کے منصوبے اور کام کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے دہلی کا سفر کیا ۔ میں یہ بات سن چکا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کے ایمان افروز مضامین سے ان کے طرزِ زندگی کے بارے میں جو اندازہ کوئی لگا سکتا ہے ان کی زندگی اُس سے بہت مختلف ہے یعنی جس اسلامی زندگی کے وہ پرزور داعی ہیں خود اُن کی وہ زندگی نہیں ہے، جن صاحب نے مجھے یہ بات بتلائی تھی وہ مولانا کے ملنے والوں میں سے تھے اور ترجمان القرآن کے مضامین سے متاثر، اور ان کے قدردان تھے انھوں نے بتلایا تھا کہ مودودی صاحب حلق لحیہ رہتے ہیں ۔ مجھے یاد ہے کہ یہ سن کر مجھے حیرت و استعجاب کے ساتھ بڑا رنج و افسوس اور بڑی مایوسی ہوئی تھی[1] ۔ لیکن دہلی کی اس ملاقات سے چند ہی روز پہلے حیدرآباد ہی سے ایک بڑے قابلِ اعتماد ذریعہ سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب اُن کی زندگی کے

(حاشیہ صفحہ ۶۱ پہ)

طرز میں ہم جیسوں کے لئے خوشگوار تبدیلی شروع ہو گئی ہے (ایک محترم بزرگ نے لکھا تھا کہ آب مودودی صاحب کے چہرہ پر ایمان کی کیفیت اُگنا شروع ہو گئی ہے) مجھے اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی تھی، بہر حال میں مولانا سے ملنے کے لئے دلی پہنچا۔ چوڑی والان میں شمسی کالج پہنچ کر ملاقات کی — واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پہلی دفعہ مولانا کو دیکھ کر طبیعت کو ایک دھچکا سا لگا، کیونکہ اب بھی مولانا کی ہیئت اس سے بہت مختلف تھی جو ہونی چاہیئے تھی اور جس کی توقع پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت حلوق اللحیہ تو نہیں تھے لیکن اس لحاظ سے ان میں بس برائے نام ہی تبدیلی آئی تھی۔ مگر چونکہ مولانا کے مضامین سے میں بہت متاثر تھا اور ان کے ساتھ ایک خاص قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا اس لئے دل کو سمجھایا کہ عملی زندگی کی اصلاح کا ابھی آغاز ہوا ہے انشاءاللہ آئندہ یہ حالت نہیں رہے گی اور ان کی زندگی اور تحریر میں جو مطابقت ہونی چاہیئے وہ انشاءاللہ ہو جائے گی — آئندہ کام کے بارے میں اس ملاقات میں کسی قدر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

(حاشیہ صفحہ ۵۸)

لہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وصیت کے الفاظ ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر کر دیا جائے، اس کے حدود میں ان کو رہنے بسنے کی اجازت نہ دی جائے — خلافت کی تحریک جن بنیادوں پر برپا ہوئی تھی ان میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت بھی تھی۔ تحریک خلافت کے سلسلہ کی تقریروں میں یہ حدیث اس کثرت سے دہرائی جاتی تھی کہ عوام بلکہ بہت سے ہندو بھائیوں کی زبان پر بھی چڑھ گئی تھی۔

(حاشیہ صفحہ ۶۰)

لہ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ واقعہ ۱۳۵۶ھ کا ہے جب کہ ترجمان القرآن میں ۴/۵ برس سے مولانا کے وہ ایمان افروز مضامین شائع ہو رہے تھے جنھوں نے ہم جیسوں کو ان کا گرویدہ و عاشق بنا دیا تھا اور میرا تصور ان کے بارے میں وہی تھا جو دین کے کسی داعی کے بارے میں ہونا چاہیئے

۸

عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لا یؤمن احدکم

حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

الہدیٰ

(کیسٹ پر نشست)

ایمان اور اس کے ثمرات

سورۃ تغابن کی روشنی میں

(مباحث ایمان)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلی ویژن کے دروسِ قرآنی کا سلسلہ

(۲)

السلام علیکم — نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم — امابعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ   بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ز فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ز فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ غَنِيٌّ

حَمِيْدٌ ۝ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ط قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ

ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ط وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ

رَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ

لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ط وَمَنْ يُّؤْمِنْ م بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا

يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

فِيْهَآ اَبَدًا ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ

اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝ ـــ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ط

"کیا نہیں پہونچ چکی ہیں تمہیں خبریں ان کی جنہوں نے کفر کیا تھا پہلے! تو وہ چکھ چکے اپنے کئے کی سزا۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب موجود ہے ـــ یہ اس لئے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح اور روشن تعلیمات کے ساتھ آتے رہے۔ تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیدیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور پیٹھ موڑ لی تو اللہ نے بھی استغنا اختیار فرمایا۔ اور اللہ تو ہے ہی غنی اور اپنی ذات میں وہ خود محمود ہے۔ یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کافروں کو کہ انہیں اٹھایا نہ جائے گا۔ اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمادیجئے کیوں نہیں! اور مجھے میرے رب کی قسم ہے تمہیں لازماً اٹھایا جائے گا اور پھر تم کو جتلا دیا جائے گا جو کچھ تم کرتے تھے اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے ـــ جس دن وہ تمہیں جمع کرے گا، جمع ہونے کے دن۔ یہ ہے ہار اور جیت کے فیصلہ کا اصل دن۔ تو جو کوئی ایمان لائے گا اللہ پر اور نیک عمل کرے گا تو وہ تعالیٰ اس سے اس کی برائیوں کو دور کر دے گا اور اسے داخل کرے گا ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش تو یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہوگا وہ ہوں گے آگ والے۔ وہ اس میں رہیں گے ہمیش اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

یہ سورۂ تغابن کی آیات نمبر ۵ تا نمبر ۱۰ ہیں جو ابھی آپ نے سماعت فرمائیں اور جن کا رواں ترجمہ بھی سنا۔ آج ہمیں سب سے پہلے اپنی گذشتہ مجلس کا قرض ادا کرنا ہے۔ پچھلی مرتبہ ہم نے چار آیات کی تلاوت کی تھی لیکن چوتھی آیت کا بیان رہ گیا تھا۔ توحیدِ باری تعالیٰ اور اس کی صفاتِ کمال کے ضمن میں اس کی صفتِ علم کا بیان بھی ہے ـــ اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرما لیجئے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن دو صفات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ اس تعالیٰ کی صفتِ قدرت اور صفتِ علم ہے "ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" اور ھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ"ـــ سورۂ تغابن کی آیت نمبر چار اس اعتبار سے بڑی منفرد ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کو تین مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہمارے فہم کے لئے اس کے علم کے تین ابعاد ـــ (Dimentions) ہیں کہ جن کو نمایاں کیا گیا۔ فرمایا: یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

"وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے"۔ اب آپ غور کیجئے کہ بات مکمل ہو گئی۔۔۔
لیکن اسی پر مزید اضافہ فرمایا: وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ط "اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اس پر پھر بات مکمل ہے۔ لیکن مزید تاکید اور Emphasis کے لئے فرمایا وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ o "جو کچھ تمہارے سینوں میں مخفی ہے، تمہاری نیتیں، تمہارے عزائم، تمہارے ارادے اللہ تعالیٰ پر وہ بھی عیاں ہیں اللہ ان کا بھی جاننے والا ہے"۔ اس چوتھی آیت پر اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا بیان اس سورہ مبارکہ میں ختم ہوتا ہے۔ البتہ اسی سورۂ مبارکہ کے آخر میں پھر اس کا اعادہ ہوگا۔

لیکن اب آتا ہے ایمان بالرّسالت کا بیان۔۔۔ اس کے ضمن میں فرمایا کہ رسولوں کا معاملہ عام داعظین یا ناصحین یا مصلحین (Reformers) یا مبلّغین کا سا نہیں ہے کہ چاہے لوگ ان کی بات مانیں چاہے نہ مانیں کوئی اہم فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس رسول تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت بن کر آتے ہیں لہٰذا ان کا انکار، ان سے اعراض، ان کی تکذیب کے دو نتیجے نکل کر رہتے ہیں۔ دو سزائیں مل کر رہتی ہیں۔ ایک اس دنیا میں کہ قوموں کی قومیں ہلاک و برباد کر دی گئیں۔ قومِ نوحؑ، قومِ ہود، قومِ ثمود، قومِ لوط، قومِ شعیب اور آلِ فرعون۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں بار بار اسی اعتبار سے آیا ہے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول آئے واضح تعلیمات کے ساتھ: بِالْبَيِّنٰتِ۔ اس میں معجزات بھی شامل ہیں اور وہ تعلیمات بھی جو فطرتِ انسانی کے لئے جانی پہچانی ہیں۔ لیکن جب ان قوموں نے ان رسولوں کا، ان کی دعوت کا انکار کیا تو وہ نسیاً منسیا کر دی گئیں: كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا۔ وہ قومیں ایسے ہو گئیں جیسے کبھی دنیا میں تھیں ہی نہیں۔۔۔ یہ وہ سزا ہے جو اس دنیا میں ملتی ہے۔ لہٰذا فرمایا: فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ "اپنے کئے کا ایک مزا تو وہ چکھ چکے ہیں"۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ o اور ابھی ایک دوسری سزا باقی ہے اور وہ آخرت کی سزا ہے، وہ جہنم کی سزا ہے۔

رسالت کے ضمن جو دوسری نہایت اور اہم بات یہاں بیان ہوئی وہ یہ کہ رسولوں کے باب میں جو سب سے بڑی ٹھوکر لوگوں نے کھائی اور ان کو ماننے میں، ان پر ایمان لانے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ان کے سامنے آگئی وہ ان رسولوں کا بشر ہونا تھا۔ وہ انسان تھے، انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ وہ نبوت و رسالت پر فائز ہونے سے قبل دنیا میں کاروبار بھی کرتے تھے۔ جیسے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس برس کی عمر شریف تک کاروبار کیا ہے۔ جس پر

مشرکین مکہ اعتراض کرتے تھے جو سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط۔ تو رسولوں کی یہ بشریت ان پہ ایمان لانے میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی رہی ہے کہ یہ انسان ہیں ہم جیسے۔ ہماری طرح کے ہاتھ پاؤں رکھنے والے، ہماری طرح ہی کی ضروریات و حوائج ان کو بھی لاحق ہیں۔ یہ کیسے ہماری ہدایت پہ مامور ہو سکتے ہیں! یہ سب سے بڑی ٹھوکر تھی جو انسانوں نے کھائی: فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ط

اب آپ غور کیجئے۔ اسی برائی کا نبیوں اور رسولوں کے ضمن میں بعد میں ظہور ہوتا ہے ـــــ جنہوں نے انکار کیا تو ان کی بشریت کی بنیاد پہ انکار کیا کہ یہ بشر ہیں لہٰذا رسول کیسے ہو سکتے ہیں اور جنہوں نے مانا، انہوں نے پھر بالکل دوسرا رُخ اختیار کر لیا کہ جب یہ رسول ہیں تو یقیناً بشریت سے ماوراء ہوں گے۔ الوہیت میں شامل ہوں گے۔ یہی وہ گمراہی ہے کہ جس کا نتیجہ یہود کے ایک فرقہ کی طرف سے حضرت عُزیر علیہ السّلام کو اللہ کا بیٹا بنانے کی صورت میں نکلا۔ ان کو بشریت کی حدود سے نکال کر الوہیت کی صف میں شامل کر دیا گیا۔ اسی گمراہی نے عیسائیت میں اس طور پہ راہ پائی کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ کا صلبی بیٹا قرار دے دیا۔ جس کی قرآن حکیم میں مختلف اسالیب و دلائل سے اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی ہے۔

اس کے بعد اب بیان آتا ہے ایمان بالآخرۃ کا ـــــ اس کے ضمن میں یہاں جو اندازِ بیان ہے وہ بہت ہی زوردار ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت سے ہر وہ شخص لطف لے سکتا ہے جو عربی زبان سے تھوڑی سی بھی شُدبُد رکھتا ہو۔ فرمایا: زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ـــــ زعم کا لفظ ہم بھی اردو میں بولتے ہیں۔ بے بنیاد خیال کے معنوں میں۔ جیسے ہم کہتے ہیں، فلاں کو اپنے بارے میں بڑا زعم ہو گیا ہے۔ یعنی ہے کچھ بھی نہیں لیکن اپنے آپ کو سمجھتا بہت کچھ ہے۔" ان کافروں کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ط " کہ ہمیں اٹھایا نہ جائے گا"۔ قرآن مجید میں کفار کا یہ اعتراض و استبعاد مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے: ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ ط ـــــ جب ہم مر کر مٹی ہو کر مٹی میں مل جائیں گے تو پھر بعث بعد الموت کیسے ممکن ہے! یہ تو بالکل بعید بات ہے ـــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ اے نبی ان کا یہ مغالطہ دور کر دیجئے۔ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ "کہہ دیجئے، کیوں نہیں! اور مجھے میرے رب کی قسم ہے"۔ آگے جو زور ہے اس کا اندازہ کیجئے: لَتُبْعَثُنَّ "تم لازماً اٹھا

جاؤگے۔" ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۔ پھر تم (اس دنیا میں) جو کچھ کرتے رہے ہو وہ لازماً
تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔" وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ " اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان
ہے۔" تمہیں مشکل معلوم ہو رہا ہے لیکن جب تم نے اللہ کو مان لیا — میں نے عرض کیا تھا کہ
ایمان کی جڑ اور بنیاد تو ایمان باللہ ہے۔ اگر کوئی اللہ ہی کو نہیں مانتا تو آخرت کے بارے میں
اس سے گفتگو بیکار ہے — اور اگر اللہ کو وہ مانتا ہے اور عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ مانتا ہے۔
کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے تو اب اس اعتراض کی کوئی گنجائش اور بنیاد نہیں رہی کہ کیسے اٹھا لئے
جائیں گے! وہ جب ہر چیز پر قادر ہے تو یہ چیز اس سے بعید نہیں یہ اس پر بہت آسان ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ابتدائی دور کا ایک خطبہ ملتا ہے۔ اس میں وہی
انداز، اسلوب، فصاحت و بلاغت اور زور ہے جو اس آیتِ مبارکہ کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے وحی غیر متلو کے ذریعے یہ حکم "قُلْ" آں حضورؐ کو ابتدائی دور ہی میں مل چکا تھا — خطبہ اس
مؤثر ترین اسلوب سے شروع ہوتا ہے: اِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ اَهْلَهٗ ۔ "لوگو تم جانتے
ہو کہ قافلہ کا رائد (رہبر) اپنے قافلے والوں کو کبھی دھوکہ نہیں دیتا ۔ وَاللّٰهِ لَوْ كَذَبْتُ
النَّاسَ جَمِيْعًا مَا كَذَبْتُكُمْ ۔" خدا کی قسم! اگر (بفرض محال) میں تمام انسانوں سے
جھوٹ بول سکتا تب بھی تم سے کبھی جھوٹ نہ بولتا۔ وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا غَرَرْتُكُمْ
"اور اگر (بفرض محال) میں تمام انسانوں کو فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی دھوکہ نہ دیتا" —
اس پُرتاثیر تمہید کے بعد حضورؐ نے فرمایا: وَاللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ " اس اللہ کی قسم ہے
کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ اِنِّيْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَّاِلَى النَّاسِ كَافَّةً
" یقیناً میں اللہ کا رسول ہوں، فرستادہ ہوں، پیغامبر ہوں تمہاری طرف بالخصوص اور پوری
نوعِ انسانی کی طرف بالعموم" وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ۔ " خدا کی قسم تم سب پر موت
وارد ہو گی جیسے تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو" ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ : "پھر
یقیناً تمہیں اٹھایا جائے گا جیسے ہر صبح کو تم بیدار ہو جاتے ہو" یہ تشبیہ اور تمثیل، یہ بھی معراجِ فصا
و بلاغت ہے۔ حضورؐ خود اس کے مدعی ہیں۔ انا افصح العرب۔ "میں عرب کا فصیح ترین ا
ہوں — ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ "پھر تم سے لازماً حساب لیا جائے گا اس
جو تم کر رہے ہو۔ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا " پھر لاز
[illegible] وَاِنَّهَا الْجَنَّةُ اَبَدًا

لَنَا تُرَابًا ابَدًا ۔" اور وہ یا تو جنت ہے ہمیشہ ہمیش کے لئے یا آگ ہے دائمی ۔" تو گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کا یہ انداز تشریح و تفسیر ہے: قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ " کی جو یہاں فرمایا گیا۔

جیسا کہ میں نے گذشتہ نشست میں عرض کیا تھا، سات آیات میں ایمانیات ثلاثہ کا بیان آ گیا اس کی Narration ہو گئی۔ اب اگلی آیت میں دعوت ہے: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ـــ یہ ہیں اس کائنات کے اصل حقائق ـــ "پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر صلی اللہ علیہ وسلم ـ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ " اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا " یعنی یہ قرآن حکیم جو منبع اور سرچشمہ ہے ایمان و یقین کا ۔ نورِ ایمانی کے لئے یہی معدن و مخزن ہے ۔ یہیں ملے گا ایمان کا نور اور یقین کی روشنی ۔ جیسے سورۃ شوریٰ میں فرمایا: وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ "اور البتہ ہم نے اس قرآن کو نور بنا کر نازل کیا ہے۔ اس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت دیتے ہیں"۔ آگے فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ " جان لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

اب آپ دیکھئے کہ جب ایمانیات ثلاثہ کی Narration تھی تو سب سے زیادہ تفصیل توحید اور صفاتِ باری تعالیٰ کی آئی ۔ اس سے کم تر بحث نبوت و رسالت کی آئی ۔ اور صرف ایک آیت میں آخرت کا بیان تھا ۔ جب دعوت دی جا رہی ہے تو توحید اور رسالت پر ایمان کی دعوت تو ایک آیت میں جمع ہو گئی ۔ اب آگے آخرت پر ایمان کیلئے پوری دو آیات آ رہی ہیں ۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے عمل پر سب سے زیادہ جس ایمان کا اثر مترتب ہوتا ہے وہ ایمان بالآخرۃ ہے ۔ ان آیات میں اس کی تفصیل آ رہی ہے کہ جو شخص اللہ پر ایمان رکھے گا، ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو، اس کی کوتاہیوں کو، اس کی غلطیوں کو معاف فرما دے گا، ان سے درگزر فرمائے گا ۔ "وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ" ـــ اور اسے ان باغات میں داخل کرے گا ۔ جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی ۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے ۔ اور یہ اصل اور بڑی کامیابی ہے ـــ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

اس سے پہلے ارشاد ہوا تھا: لَیَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ـ "جس دن اللہ تعالیٰ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن" ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ط ـ تغابن کہتے ہیں۔ "ہار اور جیت کا فیصلہ"۔ اس دنیا میں بھی ہماری بھاگ دوڑ لگی ہوئی ہے، ہم ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں بھی جو دوڑ ہو رہی ہے اس میں بھی کوئی ہارتا ہے، کوئی جیتتا ہے۔ لیکن یہاں کی ہار نہ مستقل ہار ہے نہ جیت مستقل جیت ہے۔ ہار بھی عارضی ہے اور جیت بھی عارضی ہے۔ یہ ظاہری ہار اور جیت ہے۔ حقیقی ہار اور جیت نہیں ہے یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ط " وہ دن جس دن اللہ تمہیں جمع کریگا۔ جمع ہونے کے دن"۔ یعنی یوم القیامہ: لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ـ وہ ہے ہار اور جیت کے فیصلہ کا اصل دن: ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ط ـ جو اس دن نے جیتا وہ جیتا، جو اس دن ہارا وہ ہارا۔ وہ ہے ہار جو واقعی ہار ہے حقیقی ہار ہے مستقل ہار ہے ـ اور وہ ہے جیت جو واقعی جیت ہے۔ مستقل جیت ہے حقیقی جیت ہے

تو جیت کی بھی شرح ہو گئی کہ وہ جیت کیا ہے! جنت میں خلود ہے جہاں ہمیشہ ہمیش رہیں گے ـ اور ہار کیا ہے! وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ "اور جو لوگ کفر کی روش اختیار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ والے ہیں، وہ جہنمی ہیں"۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝ "وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے"۔ یہاں سورہ تغابن کا پہلا رکوع مکمل ہو گیا جس کی پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا بیان ہے اور آخری تین آیات میں ایمان کی نہایت زوردار دعوت ہے۔ اب اس ضمن میں کوئی سوال یا اشکال ہے تو میں اس کے لئے حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! کہا جاتا ہے کہ "Virtue has its own reward" اگر ایمان کا حصول ہو جائے تو reward کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اصل میں محاوروں اور مقولوں میں مبالغہ بھی ہوتا ہے۔ یقیناً نیکی کے اندر فی نفسہٖ ایک لذت ہے۔ اگر انسان کا مزاج درست ہو، اس کا ذائقہ بگڑا ہوا نہ ہو جیسے حالت بخار میں منہ کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے تو یقیناً نیکی کے عمل میں خود ایک لذت ہے۔ لیکن اس سے

دوسرا نتیجہ لازماً نہیں نکلتا کہ اس کی جزا نہ ہو، اس کا اجر نہ ہو۔ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ حقیقتیں ہیں لیکن انسانی کلام میں یہ عدم توازن ہو جاتا ہے کہ ایک چیز پر زور دینے کے لئے دوسری چیز کی نفی کر دی جاتی ہے۔ یقیناً نیکی اپنی جگہ پر خود ایک جزا بن جاتی ہے۔ اس لذت کی بنا پر جو انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اجر و ثواب آخرت میں بھی ملنے والا ہے!

سوال: ڈاکٹر صاحب! اس سورۂ مبارکہ میں کافروں کے لئے دو سزاؤں کا ذکر ہے۔ ان میں جو بنیادی سزا ہے آپ اس کی وضاحت کر دیں۔

جواب: کسی قدر تو میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا۔ آپ کی اس بات سے میرا یہ خیال ہے کہ مزید وضاحت ضروری ہو گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک کافر تو ہے عام کافر ـــــ یہاں جن کافروں کا ذکر ہو رہا ہے یہ وہ کافر ہیں جن تک رسولوں نے براہِ راست دعوت پہنچائی۔ رسولوں نے بنفسِ نفیس تبلیغ کی اور انہوں نے رسولوں کا انکار کیا۔ ان کی دعوت کو رد کر دیا ان کے بارے میں یہ اللہ تعالیٰ کا مستقل فیصلہ ہے، یہ سنّت اللہ ہے کہ جن لوگوں پر رسولوں کی دعوت کے ذریعہ سے اتمامِ حجّت ہو جاتا ہے اور پھر بھی وہ انکار اور اعراض پر اڑے رہتے ہیں تو پھر ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جاتی۔ انہیں اس دنیا میں عذابِ استیصال کے ذریعہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ معاملہ بہت سی اقوام کے ساتھ ہوا ہے۔ جیسے قومِ نوحؑ، قومِ صالحؑ، قومِ ھُودؑ، قومِ لوطؑ، قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون۔ پس ایسے منکرینِ حق کی دُنیوی سزا ہے، ان کو نیست و نابود کر دینا، نسیاً منسیّاً کر دینا، ان کی جڑ کاٹ دینا اور اسی کی متعدد مثالیں ہیں جو قرآن مجید میں آئی ہیں۔ لیکن ان قوموں کو رسولوں کی براہِ راست دعوت کے انکار و اعراض پر آخرت میں بھی دردناک سزا ملے گی جو دائمی ہو گی اور یہ بنیادی سزا ہو گی۔

حضرات! سورۂ تغابن کے پہلے رکوع میں، جیسا کہ میں نے عرض کیا ایمانیاتِ ثلاثہ کا بیان بھی ہمارے سامنے آیا۔ نہایت اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ ـــ اور ایمان کی نہایت زوردار دعوت بھی آئی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو بھی دعوتِ ایمان کے لئے کھول دے اور ہمارے قلوب و اذہان کو ایمان کے حقیقی نور سے منوّر فرما دے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مسئلہ رجم

(قسط ۲)

چند اشکالات — اور اُن کے جوابات

مولانا سید حامد میاں (مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور)

اب ہم بالترتیب ہر امام کی روایات نقل کرتے ہیں جن میں حدِ رجم آئی ہے۔ پہلے امام اعظم ابوحنیفہ پھر ان کے شاگرد امام ابو یوسف و محمد کی روایات پیش کی جاتی ہیں۔
امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بہت مختصر کتاب مسند امام اعظم میں کتاب الحدود میں ہے:

ابوحنیفۃ عن علقمۃ بن مرثد عن ابن بریدۃ عن ابیہ ان ماعز بن مالک اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان الاٰخِرَ قد زنی فاقم علیہ الحد فردہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم اتاہ الثانیۃ فقال لہ مثل ذلک ثم اتاہ الثالثۃ فقال لہ مثل ذالک ثم اتاہ الرابعۃ فقال ان الاٰخِرَ قد زنی فاقم علیہ الحد فسأل عنہ اصحابہ ھل تنکرون من عقلہ قالوا لا قال انطلقوا بہ

حضرت ماعز بن مالک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنے لئے "اَخِر" کا لفظ استعمال کیا جس کے یہ معنی بھی ہیں کہ نیکی میں پیچھے رہ جانے والے یا ذلیل یا تباہ حال، عرض کیا کہ اَخِر نے زنا کا ارتکاب کیا ہے آپ اس پر حد جاری فرما دیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لوٹا دیا پھر وہ دوبارہ آئے اور اسی طرح عرض کیا پھر تیسری دفعہ آئے اور آپ نے ایسا ہی جواب ارشاد فرمایا پھر وہ چوتھی دفعہ آئے عرض کیا کہ اَخِر

فارجموه قال فانطلق به فرجم
بالحجارة فلما ابطأ عليه
القتل انصرف الى مكان كثير
الحجار فقام فيه فاتاه
المسلمون فرجموه بالحجارة
حتى قتلوه فبلغ ذلك النبي
صلى الله عليه وسلم فقال
هلا خليتم سبيله فاختلف
الناس فيه فقال قائل هذا
ماعز اهلك نفسه وقال
قائل انا ارجو ان يكون توبة
فبلغ ذلك النبي صلى الله عليه
وسلم فقال لقد تاب توبة
لو تابها فئام من الناس
لقبل منهم فلما بلغ ذلك
قوما طمعوا فيه فسألوه ما
يصنع بجسده قال اصنعوا به
ما تصنعون بموتاكم من
الكفن والصلوة عليه والدفن
قال فانطلق به اصحابه فصلوا.

مسند ابی حنیفة رحمه الله
کتاب الحدود ص ۱۵۷، مطبع
اصح المطابع -

نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اس پر حد
قائم فرمائیے آپ نے ان کے ساتھیوں
سے دریافت کیا کہ کیا اس کی عقل تو
خراب نہیں ہے انہوں نے عرض کیا
کہ نہیں - فرمایا کہ اسے لے جاؤ
اور رجم کر دو ، بریدہ فرماتے ہیں کہ
پھر انہیں لیجایا گیا اور سنگسار کیا گیا
جب انہیں قتل ہونے میں دیر لگی تو
وہ پلٹے (لیکن) ایسی جگہ چلے گئے جہاں
بہت پتھر تھے وہاں وہ کھڑے ہو گئے
انکے پاس مسلمان پہنچے (آئے) انہیں سنگسار
کیا حتی کہ انہیں قتل کر دیا جناب رسول اللہ ﷺ
کو یہ اطلاع پہنچی (کہ وہ اس جگہ سے
جہاں رجم کیا جا رہا تھا پلٹ کھڑے
ہوئے تھے) تو ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں
نے انہیں کیوں نہ چھوڑ دیا (یعنی ان
پر لگائی جانے والی حد ان کے اقرار
پر موقوف تھی اور ان کا اس میدان
سے سزا دیئے جانے کے وقت پلٹنا
بمنزلہ انکار کے تھا اس لئے سزا موقوف
کر دینی چاہیئے تھی) لوگوں میں ان
کے بارے میں اختلاف ہوا - کسی نے
تو یہ کہا کہ اس ماعز نے تو اپنے آپکو
برباد کر لیا اور کسی نے کہا کہ مجھے یہ امید ہے کہ ان کا حد جاری کرانا ایک توبہ
ہے - جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپ نے ارشاد

فرمایا کہ انہوں نے ایسی توبہ کی ہے اگر لوگوں کے گروہ کرتے تو وہ قبول کرلی جاتی (ان کی نجات کے لئے کافی ہوتی) جب یہ ارشاد لوگوں نے سنا تو انہیں طمع کی حد تک ان کے بارے میں رغبت ہوئی۔ دریافت کیا کہ اب ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا جو تم اپنی میتوں کے ساتھ کرتے ہو کفن، نماز اور دفن۔
حضرت بریدہؓ نے فرمایا کہ انہیں ان کے ساتھی لے گئے اور نماز پڑھی۔

مسند ابی حنیفہ رحمہ اللہ
کتاب الحدود ص ۱۵۰ مطبوعہ اصح المطابع

مسند ابی حنیفہ میں یہ روایت پانچ طرح بیان کی گئی ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ اور بھی مختلف طریقوں سے یہ روایت موجود ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کثیر الحدیث تھے۔ ان کے پاس حدیث شریف کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ نصر بن حاجب فرماتے ہیں کہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس ایک مکان میں گیا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے فرمایا کہ یہ سب حدیثیں ہیں میں نے تھوڑی سی اتنی حدیثیں بیان کی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے کچھ حدیثیں سنائیے تو انہوں نے یہ حدیث املاء فرمائی۔

عن سلمة عن ابی الزعراء عن ابن مسعود قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اقتدوا بالذین من بعدی ابوبکر وعمر۔	حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا" ان دو کی پیروی کرو جو میرے بعد آنے والے ہیں اور وہ ابوبکر وعمر ہیں"۔

تنسیق النظام شرح مسند ابی حنیفۃ الامام ص ۱۸۰

للحافظ العلامہ المحدث الفقیہ محمد حسن السنبلی م ۱۳۰۵ھ

اس لئے امام اعظم نے اتنا فرماکر کہ یہ حدیث اور بھی مختلف طرق سے مروی ہے بقیہ احادیث کا حوالہ پر اکتفاء فرمایا ہے

اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ، نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اوپر حد جاری کرنے کی درخواست کی تھی اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اگر

اپنی فرمائش اور اقرار سے کسی کو سزا ہو رہی ہو تو انکار کرنے پر وہ سزا روک دی جائیگی کیونکہ سزا کا مدار صرف خود اسکے ہی اقرار و اعتراف پر ہے۔
امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے لیکر ہمارے زمانہ تک یہ مسائل اسی طرح کتابوں میں لکھے جاتے رہے ہیں اور ان پر عمل چلا آرہا ہے۔
فقہ حنفی کی معروف ترین کتاب ہدایہ کتاب الحدود ج ۲ ص ۰۶ ۵ پہلے حد کی تعریف بتلاتی ہے۔

والحد فی الشریعۃ ھو العقوبۃ	یعنی حد شریعت میں اس معین سزا کا
المقدرۃ حقا للہ تعالیٰ	نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنا حق قرار
(ص ۵۰۶)	دے کر مقرر کی ہو۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ زنا کی حد کس طرح ہو گی:-

فصل: فی کیفیۃ الحدود	فصل: اس بارے میں کہ حد کی کیفیت
واقامتہ واذا وجب الحد	کیا ہوگی اور اسے کس طرح جاری
وکان الزانی محصنا	کیا جائے گا۔
رجمہ بالحجارۃ حتی یموت	جب حد واجب ہو جائے اور زنا کا
لانہ علیہ السلام رجم	محصن (شادی شدہ ہو آزاد ہو غلام
ماعزا وقد احصن	نہ ہو مجنون نہ ہو وغیرہ) تو قاضی
وقال فی الحدیث المعروف	اسے پتھروں سے مارنے کا حکم دے گا
وزنا بعد احصان۔	حتی کہ وہ مر جائے۔ کیونکہ جناب رسول
وعلی ھذا اجماع الصحابۃ رض	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
ھدایہ ج ۲ ص ۵۰۹	ماعز کو سنگسار کیا تھا اور وہ (شادی

شدہ) محصن تھے۔ اور حدیث معروف میں آتا ہے کہ جان لینی اس صورت میں بھی ہوگی کہ احصان کے بعد زنا کرے اور اسی پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔
ہدایہ ہی میں ہے کہ اقرار چار دفعہ کرے گا تب معتبر ہوگا۔ اور امام۔ یعنی قاضی کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ اسے اپنے اقرار سے ہٹانے کی کوشش کرے اور اگر وہ رجوع کرے تو اس کے رجوع کو مانا جائے گا۔ ہدایہ ص ۵۰۸
اور اگر سزا گواہوں کی صداقت کی تحقیق کے بعد ان کے بیانات پر دی جارہی ہو

تو سنگسار کرنے میں بھی انہیں ہی پہل کرنی ہوگی - اگر وہ پہل کرنے سے انکار کر دیں گے - تو حد ساقط ہو جائے گی - اسی طرح اگر گواہ مر جائیں یا غائب ہو جائیں - تب بھی حد جاری نہ کی جائے گی -

ویغسل ویکفن ویصلی علیه - هدایه ص ۵۰۹

اور اسے غسل وکفن دیا جائے گا اور اس پر نماز پڑھی جائے گی -

وان لم یکن محصنا وکان حرا فحده مائة جلدة لقوله تعالى الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة الا انه انتسخ في حق المحصن فبقي في حق غيره معمولا به
الهدایه ج ۲ ص ۵۰۹

اور اگر وہ محصن (شادی شدہ رخصتی شدہ) نہ ہو اور آزاد ہو غلام نہ ہو تو اس کی حد سو کوڑے ہیں کیونکہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے زانی مرد و زن ہر ایک کے سو سو کوڑے لگاؤ سوائے اس کے کہ وہ محصن کے حق میں منسوخ ہو گیا ہے (آیت رجم کی وجہ سے اس کے لئے تو رجم کا حکم اترا آیا) لہذا اس کے علاوہ کنوارے کے لئے کوڑوں کا حکم باقی رہا - (جاری ہے)

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پانچ حکم

کیا ہم ان پر عمل کر رہے ہیں

غور فرمائیں

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
انا امرکم بخمس
بالجماعة والسمع
والطاعة والهجرة
والجهاد فی
سبیل الله

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا
میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم
دیتا ہوں التزام جماعت کا
اور سننے اور اطاعت کرنے کا
اور اللہ کی راہ میں ہجرت
اور جہاد (جد وجہد) کرنے کا

مشکوٰۃ ترمذی

حدیث نبوی

شامِ الہدیٰ - لاہور

شیخ جمیل الرحمٰن

کراچی کے وابستگانِ دعوت رجوع الی القرآن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی کہ انہوں نے ٹیلی ویژن کے محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے مقبول اور موثر ترین درس قرآن کے پروگرام " الہدیٰ " کے تسلسل کو برقرار رکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ پروگرام ٹی وی پر نصف تک پہنچا تھا کہ بند کردیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رفقائے کراچی کی نصرت فرمائی۔ کراچی کے مشہور معروف ہوٹل 'تاج محل' ہوٹل کی انتظامیہ نے اس کارِ خیر کے لیے اپنا 'موتی محل' آڈیٹوریم انگریزی مہینہ کی ہر آخری سوموار (پیر) کو بلامعاوضہ دینا منظور کرلیا۔ یہ آڈیٹوریم کراچی ہی کا نہیں اغلباً پورے پاکستان میں وسعت اور گنجائش، بناوٹ اور سہولت کے اعتبار سے مثالی آڈیٹوریم ہے جس میں بارہ سو چالیس نشستوں کا باقاعدہ انتظام ہے۔ مزید براں نشستوں اور اسٹیج کے درمیان خالی جگہ پر نیز اسٹیج پر چار پانچ سو افراد کے فرش پر بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اسی طریقہ سے مختلف کونوں، نشستوں کے درمیانی زینوں پر بھی کم و بیش اتنے ہی افراد کے بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی گنجائش موجود ہے۔

اللہ کے نام سے اس آڈیٹوریم میں ۲۹ اکتوبر ۸۴ء کی آخری سوموار کو بعد نماز مغرب " شامِ الہدیٰ " کی محفل کے انعقاد کا آغاز ہوا۔ محتاط اندازہ ہے کہ اس محفل میں کم و بیش پندرہ سولہ سو افراد نے شرکت فرمائی۔ دوسری نشست ۲۶ نومبر ۸۴ء مہینہ کی آخری سوموار کو بعد نماز مغرب منعقد ہوئی۔ اس محفل میں ریکارڈ حاضری تھی۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ پورے ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اور شرکاء کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی۔ دعوتِ قرآنی اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے پرتاثیر اسلوبِ خطاب اور محکم طرزِ استدلال کی یہ معجز نمائی ہے کہ کراچی جیسے معروف اور کاروباری شہر میں ہر شعبۂ زندگی کے افراد نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ان محافل میں حصہ لیا۔

کراچی کی " شامِ الہدیٰ " کی طرز پر لاہور میں اس مجلس کے انعقاد کا مرکزی انجمن خدام القرآن کے وابستگان میں بھی جذبہ اور عزم پیدا ہوا۔ چنانچہ انجمن کی مجلس منتظمہ نے اس سلسلہ میں اقدامات شروع کئے۔ پہلا مسئلہ تو کسی مناسب حال وسیع اور معیاری آڈیٹوریم کے

انتخاب کیا تھا۔ ذمہ داران انجمن نے "واپڈا" کے ارباب حل وعقد سے اس کار خیر میں تعاون حاصل کرنے کے لیے سلسلہ جنبانی کیا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید نے یہ مرحلہ بحسن وخوبی طے کرا دیا اور واپڈا کے منتظمین نے اس مقصد کے لئے انگریزی ماہ کے ہر پہلے جمعہ کو بعد نماز مغرب واپڈا اڈیٹوریم کو استعمال کرنے کی منظوری مرحمت کر دی۔ اِلّا آنکہ کسی ماہ اس تاریخ کو ان کا اپنا کوئی فنکشن ہو۔ اس تعاون کے لئے واپڈا کے منتظمین کی خدمت میں ہدیہ تبریک وتشکر پیش ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ۴ جنوری ۸۵ جمعۃ المبارک کو بعد نماز مغرب چھ بجے لاہور میں "شام الہدیٰ" کا واپڈا اڈیٹوریم میں آغاز ہوا۔ اس روز صبح سے لاہور کی فضا پر کہر چھائی ہوئی تھی، جس کے چھٹنے کے بعد شہر سردی کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ مزید براں وسط شہر میں ایک سیاسی مظاہرے کی وجہ سے کسی حد تک کشیدگی کی فضا تھی۔ اسی دن ساڑھے بارہ بجے کے قریب شادمان کی چورنگی پر دن دھاڑے پنجاب کی ایک ممتاز صنعتی اور سیاسی شخصیت اپنے تین باڈی گارڈوں کے ساتھ فائرنگ کے نتیجہ میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے جس کے باعث اس علاقہ کی حد تک فضا میں خوف وہراس کی کیفیت تھی۔ ان تمام موانع کے باوجود یہ اللہ تعالیٰ ہی کا لطف وکرم تھا کہ "شام الہدیٰ" کی محفل میں شرکاء کی تعداد کارکنان کی توقع سے کہیں زیادہ تھی اڈیٹوریم کی تمام فکسڈ نشستیں وقت سے قبل ہی پر ہو چکی تھیں۔ خالی جگہوں پر عارضی طور پر بہت سی کرسیاں لگا دی گئی تھیں وہ بھی بھر گئیں۔ چنانچہ بعد میں آنے والے اور انجمن کے کارکنان نے اسٹیج پر بیٹھنا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے وہاں بھی تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ الغرض اڈیٹوریم کا چپہ چپہ اور کونا کونا شرکاء سے پر تھا اور تمام WALK OF LIFE کے افراد اس میں شریک ہوئے تھے خواتین کی نشست کے لئے گیلری میں باپردہ انتظام تھا۔

چھ بجے بعد نماز مغرب اللہ تعالیٰ کے مبارک نام سے اس محفل کا آغاز ہوا۔ ٹی وی کا الہدیٰ کا ہفتہ وار پروگرام سورۃ حجرات کے درس کی تکمیل پر بند کیا گیا تھا۔ اس طرح محترم ڈاکٹر صاحب کا مرتب کردہ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب نصف تک پہنچا تھا۔ اس نصاب کا حقیقی مفاد یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بعض مقامات کے ذریعہ ایک مسلمان کے سامنے بالکل واضح طور پر یہ بات آجائے کہ قرآن حکیم کی انقلابی دعوت، انقلابی فکر اور پیغام کیا ہے! اسلام انفرادی سیرت وکردار کی تعمیر کے لئے کیا اساسات انسان کی رہنمائی کے لئے پیش کرتا ہے اور قرآن کی پیش کردہ عالمی اقدار اور بنیادیں کون سی ہیں، جن پر ایک صالح اور ایک فلاحی ورفاہی مملکت کا اجتماعی نظام ونافذ ہو سکتا ہے اعمال صالحہ کی بحث میں اس نصاب میں سورہ حجرات مکمل آخری درس کے طور پر شامل ہے

پر ہوتی ہے! اس ریاست کی حکومت کے لئے اساسی ہدایت کیا ہے! قانون سازی کے لئے حدود و قیود کیا ہیں! عالمی سطح پر امت مسلمہ کی ثقافتی و تہذیبی یکسانیت و ہم آہنگی کے لئے اصولی و جذباتی اساس کون سی ہے! کسی اسلامی ریاست کا مکمل شہری ہونے کی شرائط کیا ہیں! اسلامی معاشرے کی شیرازہ بندی اور اس کے استحکام کے اصول کیا ہیں! افواہوں کی روک تھام کے لئے قرآن مجید کی ہدایات کون سی ہیں! وہ انفرادی اور اجتماعی خرابیاں (EVILS) کون سی ہیں جن سے اسلامی معاشرے کو اجتناب و احتراز ضروری و لازمی ہے۔ مسلمانوں کے دو گروہوں میں اگر کوئی نزاع ہو جاتی ہے اور وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں تو ان میں صلح کرانے کے لئے امت کو کیا ہدایات دی گئی ہیں! اسلام کا آفاقی پیغام کیا ہے اور وہ پوری نوع انسانی میں باہمی اخوت اور ربط و تعلق کی کونسی آفاقی اساسات پیش کرتا ہے! اسلام اور ایمان کا فرق کیا ہے! ایمانِ حقیقی کے رکن رکین ہونے کی حیثیت کن امور کو حاصل ہے!

محترم ڈاکٹر صاحب ٹی وی پر پیش کئے جانے والے دروس سے ربط و تعلق اور اس کا تسلسل قائم کرنے کے لئے کراچی اور لاہور دونوں مقامات پر شام الہدیٰ کی افتتاحی نشست کے لیے سورہ حجرات کے درس کے اعادہ کا فیصلہ فرمایا تھا۔ کراچی میں تو پہلی ہی نشست میں الحمدللہ اس پوری سورہ مبارکہ کا درس مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن لاہور میں پہلی نشست کے دو گھنٹے میں اس سورہ مبارکہ کا درس بارہ آیات تک مکمل ہو سکا جبکہ یہ سورہ ۱۸ آیات پر مشتمل ہے چھ آیات کا درس باقی رہ گیا۔ ان آیات میں نہایت اہم مسائل اور ہدایات زیر بحث آتی ہیں ان کا اختصار سے حق ادا کرنا ممکن نہ تھا لہٰذا ڈاکٹر صاحب موصوف نے اعلان فرمایا کہ بقیہ آیات کا درس انشاء اللہ ''شام الہدیٰ'' کی دوسری نشست میں مکمل ہو گا جو یکم فروری ۸۵ء جمعۃ المبارک کو بعد نماز مغرب اسی واپڈا اڈیٹوریم میں منعقد ہو گی۔

درس کے خاتمہ پر دس منٹ کے وقفہ کے بعد سوال و جواب کے لئے دوبارہ نشست شروع ہوئی۔ درس سے متعلق سوالات کے علاوہ چند عمومی نوعیت کے بھی تحریری سوالات آئے تھے۔ فقہی نوعیت کے سوالات کے علاوہ جو سوالات مقررہ وقت کے اندر آ گئے تھے ان کے ڈاکٹر صاحب نے تفصیل کے ساتھ شافی اور تسلی بخش جوابات دیئے۔ سوال و جواب کی نشست تقریباً پون گھنٹے تک جاری رہی۔ جس کے خاتمہ کے بعد واپڈا ہی کی مسجد میں ڈاکٹر صاحب کی اقتدا میں نماز عشاء باجماعت ادا کی گئی۔

اس 'شام الہدیٰ' کے لئے انجمن کی طرف سے مناسب تشہیر کا اہتمام کیا گیا تھا اخبارات میں اشتہار کے علاوہ انفرادی طور پر بھی لاہور کی ممتاز علمی و سماجی شخصیات کو

دعوت نامے بھی ارسال کیئے گئے تھے۔ مزید براں درس سے قبل سورہ حجرات کا متن اور
اور سورہ مبارکہ کے متعلق جو اہم نکات ڈاکٹر صاحب موصوف نے منتخب نصاب میں تحریر
فرمائے ہیں ان پر مشتمل ایک پمفلٹ بھی تقسیم کیا گیا

شام الہدیٰ لاہور کی دوسری نشست یکم فروری ۸۵ء کو واپڈا آڈیٹوریم میں
منعقد ہوئی۔ جس کی رپورٹ ان شاءاللہ آئندہ شمارہ میں شامل کی جائیگی۔ اب
تیسری مجلس یکم مارچ جمعتہ المبارک کو بعد نماز مغرب منعقد ہوگی

ہم لاہور اور قریبی شہروں کے قارئین میثاق اور دعوت
رجوع الی القرآن کے جملہ وابستگان کو اس مجلس میں شرکت کی دعوت
دیتے ہیں اور ان سے اس تعاون کے بھی طالب ہیں کہ وہ اپنے حلقۂ
احباب و اثر میں اس مجلس میں شرکت کی دعوت و ترغیب دے کر تعاون
علی البر فرمائیں۔ انجمن کے وسائل اس امر کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ ہر مرتبہ
اخبارات میں نمایاں اشتہارات دیئے جائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

شام الہدیٰ کراچی

کراچی اور گردو نواح کے ماہنامہ میثاق کے قارئین سے التماس ہے کہ
وہ نوٹ فرمالیں کہ فروری میں "شام الہدیٰ" ان شاءاللہ العزیز
۱۸ فروری ۸۵ء بروز سوموار (پیر) بوقت ساڑھے سات بجے شب
تاج محل ہوٹل موتی محل آڈیٹوریم شارع فیصل میں
منعقد ہوگی۔ جس میں سورہ جمعہ کا مکمل درس ہوگا۔

افکار و آراء

پکی قبور کے متعلق ایک استفسار

مکرمی و محترمی جناب : ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ الرحمٰن۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کو ایک مسئلہ پر تکلیف دینے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اس اُمید پر کہ آپ اس مسئلہ کا قرآن و سُنت کی روشنی میں واضح اور مدلل حل پیش کریں گے۔ نیز شرعی لحاظ سے آپ پر واجب بھی ہے کہ آپ وہ علم لوگوں تک پہنچائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عنایت فرمایا ہے۔ مسئلہ ایک مستند حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اب میں اسے ترتیب وار پیش کرتا ہوں۔

۱۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

(الحشر: ۷)

"اور رسولؐ جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس بات سے منع کریں رُک جاؤ۔"

اس آیت کریمہ کے تحت جس بات کا نبی کریمؐ ہمیں حکم دیں ہمیں چاہیئے کہ اُس پر سختی سے عمل کریں اور جس بات سے روکیں بلا چون و چرا رک جائیں۔ یہ نہ دیکھیں کہ اس بات پر عمل کرنے یا نہ کرنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی تاویلیں نہ کریں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں سرِ تسلیم خم کر دیں۔

۲۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء: ۸۰)

"جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی"

اور ساتھ ہی ہمیں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔ کہ

۳۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

(الاحزاب: ۳۶)

"اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی وہ تو صریح گمراہی میں جا پڑا۔"

پھر اللہ تعالےٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی اور اس کے خلاف عمل کرنے والوں کے لئے فرماتا ہے -

۴ - فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (النور : ۶۳)

"رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیئے کہ وہ (خلاف ورزی کرکے) کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں، یا اُن پر دردناک عذاب آجائے"۔

ان آیات کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حکم ہے : جس پر عمل کرنا ہم پر واجب ہے - اگر حکم عُدولی کریں گے تو درج بالا آیات میں وارد شدہ تنبیہ سے ہمیں کیا نقصان پہنچ سکتا ہے ؟ اس کا اندازہ تو خوب لگایا جا سکتا ہے -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ :

عَنْ جَابِرٍ :- قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ -

(مسلم شریف - جلد ا صـ۳۱۲ - مشکوٰۃ شریف جلد ا - باب دفن المیت پہلی فصل حدیث نمبر ۵)

ترجمہ : حضرت جابرؓ سے روایت ہے : کہا : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا قبر کو پختہ بنانے سے، اور اس پر عمارت بنانے سے، اور اس پر بیٹھنے سے (روایت کیا اسکو مسلم ؒ نے)

مندرجہ بالا حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے ہیں کہ قبر کو پختہ نہ بناؤ اور اُس پر عمارت بھی نہ بناؤ - اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے : وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا - "اور جس بات سے منع کریں رک جاؤ"

اب یہاں سوچنے کا مقام اور لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر حضورؐ کے اس حکم کی خلاف ورزی اسقدر زیادہ ہو رہی ہے کہ کثیر تعداد میں قبروں پر گنبد اور عمارتیں بنی ہوئی ہیں - اور قبریں پختہ بھی ہیں - یعنی جن دو باتوں سے آپؐ نے منع فرمایا ہے وہی باتیں کثرت سے ہو رہی ہیں - اور کوئی عالم اس سے نہیں روکتا - اولیائے کرام کے مزارات پر گنبد موجود ہیں - اسکے علاوہ قبریں تو بہت پختہ ہیں -

کیا اس عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی حکم عدولی نہیں ہو رہی ہے؟
مجھے اس سوال کا مدلل جواب چاہیئے۔
میرا ایمان تو یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جب ایک بات سے روکا ہے —
تو بس رک جاؤ۔ اس میں کسی تاویل نکالنے کا جواز پیدا نہیں کرنا چاہیئے۔ محدثین، فقہاء کرام
علماء نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ تمام فتاویٰ کی بنیاد بھی رسول کریمؐ کا یہی ارشاد
ہے۔ مختصراً تفصیل لکھ دیتا ہوں۔ ویسے صحیح حدیث کے ہوتے ہوئے ان حوالوں کی ضرورت
نہیں ہے۔

۱ - امام نوویؒ شرح مسلم جلد ا = "قبر پر عمارت بنانا اگر وہ جگہ، عمارت بنانے والے کی ملک ہے تو مکروہ ہے اور اگر عام مقبرہ ہے تو حرام ہے۔"
۲ - حضرت امام ابوحنیفہؒ و امام محمدؒ = کتاب الآثار ، امام شافعیؒ وغیرہ
۳ - علامہ حلبی الحنفیؒ = حوالہ کبیری ص۵۹۹
۴ - حافظ ابن ہمام الحنفیؒ = فتح القدیر جلد ۴
۵ - علامہ ابن عابدین الحنفیؒ = شامی ج ا ص۱۰۱
۶ - ملا علی قاریؒ = مرقات ج ا ص۲۴۶ میں لکھتے ہیں۔

وهي ما انكره ائمة المسلمين كالبناء على القبور
وتجصيصها۔
ترجمہ: "وہ بدعت وہ ہے، جس کا ائمہ مسلمین نے انکار کیا ہو جیسے قبروں پر
عمارت بنانا اور انہیں پختہ کرنا۔"

۷ - فتاویٰ عالمگیریؒ مصری ج ا
المكروه التحريمي عند الامام (ابو المكارم ج ۳)
ويسنم القبر قدر الشبر ولا يربع ولا يجصص و
يكره ان يبنى على القبر

۸ - فتاویٰ رضویہ = "قبروں پر گنبد بنانا، انہیں پختہ کرنا حرام ہے۔ میرے والد اور والدہ کی قبریں ایک بالشت اونچی ہیں۔ اور ان پر کوئی عمارت نہیں۔"
اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی

وضاحت : میں اہلِ سُنّت مسلمان ہوں۔ لیکن رسولِ کریمؐ کے فرمان کو پڑھ کر حیرت میں گم ہو گیا ہوں۔ اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ یہ کیسے ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ رسولِ اکرمؐ کی قبرِ انور پر گنبد بنا ہُوا ہے تو اس کا جواب میری ناقص عقل میں یہ آتا ہے کہ وہ رسولِ اکرمؐ کی تخصیص میں سے ہے۔ نبیؐ جہاں فوت ہوتا ہے وہیں دفن ہوتا ہے۔ اور اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہؓ کے حجرہ مبارک پر پہلے ہی چھت موجود تھی۔ علاوہ ازیں اسلام دشمن عناصر کی شرارتوں اور ہتھکنڈوں سے محفوظ رکھنے کے لئے روضۂ انور کی حفاظت بہرحال ضروری سمجھی گئی۔ جیسا کہ نورالدین زنگی کے دور میں قبرِ انور کو نقصان پہنچانے کی ناپاک جسارت کی گئی تھی۔

نیز نبی کریمؐ کے گنبدِ خضرا کے مقابلے میں گنبد تعمیر کرانا بھی مناسب نہیں۔ شاید ادب کے بھی خلاف ہو۔ کچھ باتیں انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ جن پر اُمت کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

ان سب باتوں کے علاوہ سب سے مقدّم تو نبیؐ کا حکم ماننا ہے۔ کہ رُک جاؤ۔ بس رک جاؤ۔ حدیث میں نہی کا لفظ استعمال ہُوا ہے۔ اور اللہ کا حکم بھی یہی ہے۔ کہ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ رسولؐ اللہ کے حکم کے ہوتے ہوتے ہم گنبدِ خضرا کو بطورِ دلیل نہیں پیش کر سکتے۔ کیونکہ دونوں میں تضاد ہے۔ حضورؐ کا گنبدِ خضرا نبیؐ کی تخصیص ہے اور حضورؐ کا حکم ہمارے لئے حجّت ہے۔

البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ نبی کریمؐ کا کوئی فرمان اس حدیث کا ناسخ ہو۔ جیسے آیاتِ قرآنیہ میں ناسخ و منسوخ ہیں ویسے ہی احادیث میں بھی ہیں ۔۔۔ اگر کوئی ایسی صحیح اور اس حدیث سے بلند تر (ثقاہت اور صحیح ہونے میں) حدیث ہو تو پھر مذکورہ بالا حدیث منسوخ ہو سکتی ہے۔ اور عمارت بنانے والی حدیث (اگر کوئی ہو) تو اس پر عمل ہو سکتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسی ہی صحیح حدیث اس حدیث کو منسوخ نہیں کرتی تو پھر اسی حدیث پر عمل ہونا چاہیے۔ یا یہ ثابت ہو جائے کہ مسلم کی یہ حدیث ضعیف ہے۔

آپ سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔ یا اس حدیث کی ناسخ حدیث [illegible] گاہ فرمائیں مع حوالہ جات۔ مثلاً بخاری و مسلم یا صحاح ستّہ کی کسی کتاب یا مسند احمد وغیرہ میں کوئی ایسی واضح صحیح حدیث ہو جو مذکورہ حدیث

کو منسوخ کردے - یا یہ ثابت کردیں کہ مذکورہ حدیث ضعیف ہے -

ورنہ تو
وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ـــ (قرآن حکیم - سورۃ الحشر: ۷)

ـــ پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے - اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ :

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝

(الاحزاب: ۳۶)

" اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی - وہ تو کھلی گمراہی میں جا پڑا "

بوجہ عالم دین قرآن وسنت کے مطابق صحیح جواب دینا آپ پر واجب ہے - ورنہ قیامت کے دن آپ جوابدہ ہونگے - اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے آمین -

نیازمند ضیاء الحسن فاروقی (ایم اے)

آپ کی تحقیق بالکل حق ہے - اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ پکی قبریں بنانے اور ان پر مقبرے تعمیر کرنے کی شریعت میں ممانعت ہے اہل سنت کے تمام مکاتب فکر اس کے قائل ہیں - ہمارے معاشرے میں دین کے حقیقی علم کے فقدان کا یہ بھی ایک مظہر ہے ہماری اکثریت فرائض دینی تک سے غافل ہے - اس کے معاملے میں بہرحال کم تر برائی ہے - البتہ اس کے اثم ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے (ادارہ)

برائے توجہ !

قارئین میثاق سے گذارش ہے کہ خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں (شکریہ)

رفتارِ کار

چالیس روزہ تربیتی پروگرام

رحمت اللہ بٹر

یہ بات ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر انقلابی تحریک کے کارکنوں میں اپنے انقلابی فکر کے لئے جذبۂ عمل ابھارنے اور اس کے مطابق تربیت دینے کا معقول انتظام ہونا ضروری ہے تاکہ ایک طرف ان کو اس دعوت کی حقانیت پر مزید انشراحِ صدر حاصل ہو جس کو انہوں نے برضا و رغبت قبول کیا ہے۔ دوسری طرف ان میں وہ صلاحیت و استعداد اور سلیقہ نشو و نما پائے جو کسی دوسرے فرد کو اپنی دعوت سے متعارف کرانے کے لئے ضروری ہے۔

چونکہ تنظیم اسلامی کی دعوت خالصۃً کتاب اللہ اور سنتِ رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مبنی ہے لہٰذا تنظیم کے رفقاء و متوسلین کیلئے ان سے تمسک و اعتصام لابد و ناگزیر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ تنظیم اسلامی کے لئے فی الوقت یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دار العلوموں کی طرز پر دینی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکے اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے بڑی حد تک مرکزی انجمن کی طرف سے قرآن اکیڈمی میں دو سالہ دینی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ جس میں بحمد اللہ چالیس افراد مستقل طور پر حصہ لے رہے ہیں اور ان شرکاء میں اکثریت ان حضرات پر مشتمل ہے جو اعلیٰ سطح پر جدید تعلیم کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان شاء اللہ العزیز جب یہ حضرات دو سالہ کورس کامیابی سے مکمل کر لیں گے تو ان میں استعداد پیدا ہو جائے گی کہ وہ کتاب و سنت اور دیگر دینی علوم سے براہ راست استفادہ کر سکیں گے اور دورِ جدید کے باطل نظریات و افکار اور فلسفوں کا قرآن حکیم اور سنتِ رسول ؐ کی روشنی میں ابطال کی صلاحیت سے بڑی حد تک بہرہ مند ہوں گے اور مؤثر و حقیقی داعی الی اللہ کا فریضہ انجام دے کر عدل و قسط پر مبنی نظام حکومت کے قیام کی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کر سکیں گے۔

لیکن تنظیم اسلامی کے تمام رفقاء کے لئے عملاً ممکن نہیں ہے کہ وہ دو سال اس کام کے لئے وقف کر سکیں۔ پھر یہ کہ رفقاء میں سے ہر ایک کی ذہنی و تعلیمی استعداد بھی معیار مطلوب کے مطابق نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ امر ہے کہ ذرائع و وسائل بھی اتنے محدود ہیں کہ چالیس پچاس افراد سے زائد اشخاص کے لئے دو سالہ کورس کے مصارف کے متحمل نہیں ہو سکتے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید کے بھروسے پر بیس بیس دن پر مشتمل تعلیمی و تدریسی اور تربیتی کورس مرتب کیا گیا۔ اس سلسلہ کا پہلا کورس ۲۰ جولائی سے ۸ اگست ۸۴ء تک روبعمل آیا تھا اور دوسرا کورس چالیس روز کے لئے یکم دسمبر ۸۴ء سے شروع ہو کر ۸ جنوری ۸۵ء کو اختتام پذیر ہوا۔ اس تربیت گاہ کی نظامت کا بارِ گراں اس عاجز کے سپرد کیا گیا۔ اس چالیس روزہ تربیت گاہ کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی نے اپنی بیرونِ لاہور تمام مصروفیتوں کو ملتوی کر دیا اور اپنے تمام اوقات کو اس کام کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پروگرام اصلاً بیس بیس روز کے دو مراحل پر مشتمل تھا اور اوقات کار کو یوں ترتیب دیا گیا کہ غیر شرکاءِ تربیت گاہ بھی اس سے مستفید ہو سکیں چنانچہ تدریس عربی اور امیر محترم کے خطابات کے لئے بعد نماز مغرب تین گھنٹے کا وقت معین کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں شرکاء کی تعداد چالیس کے لگ بھگ رہی جو ہمہ وقتی قرآن اکیڈمی میں اقامت پذیر تھے دوسرے مرحلے میں اکثر حضرات لاہور سے بھی تشریف لاتے

تھے اور تعداد پچاس ساٹھ ہو جاتی تھی تعلیم کے اوقات صبح سوا سات بجے تا ایک بجے بعد دوپہر اور شام ساڑھے پانچ تا ۹ بجے شب رہے سب سے پہلے ایک گھنٹے تک قرآن مجید کی تلاوت کی تصحیح کے لئے علم تجوید کی تدریس جاری رہی ۔ محترم قاری محمد مشتاق صاحب نے جو یہ خدمت پچھلے سترہ سال سے سرانجام دے رہے ہیں، تجوید کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دی ۔ اس کلاس میں شرکاء تربیت گاہ کے علاوہ دیگر دس بارہ حضرات سردی کے اس موسم میں لاہور کے مختلف مقامات سے شریک ہوتے رہے ۔ قاری صاحب نے بڑی پابندی سے یہ خدمت سرانجام دی اور اختتام پر امتحان بھی لیا اور اس میں کامیاب حضرات کو سندات سے بھی نوازا ۔ تجوید کے بعد ایک گھنٹے تک تدریس حدیث کا پروگرام جاری رہا جس میں اس عاجز نے اس مجموعہ احادیث کو جو محترم جناب ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب نے منتخب کر کے مرتب کیا تھا ۔ شرکاء کو لکھوایا اور اس کی مختصر تشریح بھی کی ۔ شرکاء کو تلقین کی گئی کہ وہ ان احادیث کو ازبر کرنے کی کوشش کریں ۔ مزید براں چند ایام میں کچھ اذکار مسنونہ اور خاص کر نماز سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں پڑھائی گئیں ۔

اس کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا امیر تنظیم اسلامی کا منتخب نصاب جو قرآنی تعلیمات کے مباحث ایمانیات عمل صالح تواصی بالحق اور تواصی بالصبر پر مشتمل ہے سنانے کا اہتمام کیا گیا ۔ شرکاء پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ ان دروس کو سن کر اپنے الفاظ میں تحریر کریں تاکہ معلوم ہو کہ انہوں نے کس حد تک ان مباحث کو سمجھا اور ذہن میں رکھا ہے ۔ بحمد اللہ کہ یہ پروگرام بہت ہی مفید رہا چوہدری غلام محمد صاحب قیم تنظیم اسلامی جنہوں نے ان سب تحریروں کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان کی اغلاط کی بھی نشان دہی کی اور شرکاء کو مفید مشوروں سے بھی نوازا ۔ چوہدری صاحب موصوف کا فرمانا ہے کہ بیشتر حضرات نے ان دروس کو خوب محفوظ کر لیا ہے ۔ نماز مغرب کے بعد عربی کی ابتدائی تدریس کے لئے پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کی خدمات مستعار لی گئی تھیں ۔ انہوں نے بڑی محنت سے اس قلیل مدت میں عربی کا معلم نامی کتابچہ اور "طریقۃ جدیدہ فی تعلیم العربیہ" کا حصہ اول پڑھایا ۔ اس دوران مقیم حضرات کے علاوہ لاہور سے کوئی تیس کے قریب حضرات بھی شرکت کرتے رہے ۔ یہ تدریس ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہتی تھی جس کے اختتام پر چند منٹوں کے وقفے کے بعد اس تربیت گاہ کا سب سے اہم پروگرام شروع ہوتا رہا ۔ امیر محترم نے تسلسل اور ترتیب سے مندرجہ ذیل موضوعات پر مفصل خطابات کئے اور بلیک بورڈ کی مدد سے ضروری خاکے بھی سمجھائے ۔ ۱۔ حقیقت ایمان ۲۔ حقیقت نفاق ۳۔ حقیقت جہاد ۴۔ حقیقت شرک بعدہٗ دعوت رجوع الی القرآن اور برصغیر پاک و ہند میں مختلف دینی تحریکوں اور ان کی مساعی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا اور مختلف ادوار کو ترتیب کے ساتھ بیان کیا اور نیز امت مسلمہ کی تاریخ اور اس میں مسلمانوں پر جو زوال و عروج کے مراحل گذرے اور ادوار آئے ہیں ان کو بیان کیا اس کے لئے مندرجہ ذیل کتابچوں کا مطالعہ بھی کروایا گیا ۔

۱۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام ۲۔ حکمت قرآن کا خصوصی شمارہ جولائی و اگست ۸۴ء ۳۔ سرافگندیم نامی کتاب کا پہلا حصہ ۴۔ اسلام اور پاکستان ۵۔ سلسلہ اشاعت تنظیم اسلامی حصہ اول و دوم پر مشتمل قرارداد تنظیم اسلامی اور شرائط شمولیت ۔ یہ نشست رات نو بجے تک رہتی تھی اور نماز عشاء اس کے بعد ادا کی جاتی تھی ۔ قیام اللیل کا بھی اہتمام تھا جس میں کافی شرکاء نے حصہ لیا اور ایک بار پورا قرآن مجید نوافل میں سماعت کیا

ان اوقات کار کے ساتھ یہ تربیتی پروگرام دونوں مراحل میں بہت کامیاب رہا ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمام حضرات جنہوں نے اس میں شرکت کی انکو ان کی اس سعی جمیلہ کا صلہ عطا فرمائے اور ان کو دین کا حقیقی خادم بننے کی توفیق عطا فرمائے ۔

دَورہ کراچی اور حیدر آباد (نومبر ۸۴ء)

نومبر کی آخری سوموار کو "شام الہدیٰ" میں درس کے لئے امیر محترم کراچی تشریف لائے تھے۔ "شام الہدیٰ" کی رودادِ گزشتہ ماہ کے میثاق میں شائع ہو چکی ہے اسی دورے کے موقع پر ۲۷ نومبر ۸۴ کو امیر محترم پاکستان کونسل کے زیر اہتمام خالقدینا ہال میں منعقد ہونے والی محافل کی بعد نماز عشاء ڈیڑھ گھنٹے تک "صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم قرآن مجید کی روشنی میں" کے موضوع پر نہایت مؤثر اور فکر انگیز خطاب ارشاد فرمایا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ایثار و قربانی کے حالات پر نہایت دل گداز اسلوب بیان سے حاضرین میں سے شاید ہی کوئی آنکھ ہو جو نم نہ ہوئی ہو ــــ اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ کرامؓ کی دینِ حق کیلئے جان نثاری پر ان سے راضی ہونے کے متعلق قرآن حکیم میں جو بشارتیں دی ہیں وہ ان تمام لوگوں کے لئے بڑی امید افزا ہیں جوان قدوسیوں کے نقش قدم پر چلنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت و خوش بختی سمجھتے ہیں اور اسکے لیے کوشش و محنت کرتے ہیں۔ موصوف نے نہایت وضاحت سے فرمایا کہ جب تک جان نثاروں کی جماعت تیار نہ ہو اسلامی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ حضرت نوحؑ کی مثال قرآن مجید میں موجود ہے آں جنابؑ نے ساڑھے نو سو سال توحید کی دعوت و تبلیغ پر لگاتے لیکن معاشرہ بالکل مردہ ہو چکا تھا لہٰذا جمعیت فراہم نہ ہو سکی اور معدودے چند افراد کے علاوہ لوگوں نے دعوت ایمان قبول نہیں کی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بچا کر عذاب استیصال کے ذریعہ کافروں کو اپنی سنت کے مطابق نیست و نابود کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ دوسری مثال قرآن مجید نے حضرت موسیٰؑ کی بیان کی ہے۔ آں جنابؑ کے ساتھ ایک بڑی جمعیت تھی لیکن مصر میں آل فرعون کی قریباً تین صدیوں کی غلامی نے ان کو بزدل بنا دیا تھا لہٰذا جب حضرت موسیٰؑ ان کو معجزانہ طور پر مصر سے نکال لائے اور وہ صحرائے سینا میں داخل ہوگئے تو ارض فلسطین کے حصول کیلئے وہاں کے کافر حکمرانوں سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ و قتال کا حکم آیا تو قوم نے کورا جواب دے دیا اور کہا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ "اے موسیٰؑ تم جاؤ اور تمہارا رب جائے اور قتال کریں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔" نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی انقلاب کا عمل وہیں رک گیا۔ چالیس سال تک ان پر ارضِ فلسطین حرام کر دی گئی اور وہ اس عرصہ میں صحرا سینا میں بھٹکتے رہے۔ اسی دوران حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیٰ نبینا وعلیہما السلام کا انتقال ہو گیا۔ چالیس سال میں جو نئی نسل صحرا میں پروان چڑھی اس نے پھر جہاد و قتال کے ذریعہ ارض فلسطین کو فتح کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس کے مقابلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا یہ عالم تھا کہ بچے، بوڑھے اور جوان سب کے سب اللہ کی راہ میں گردن کٹانے کو اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ ان کی انہی جاں نثاریوں پر سورہ فتح میں اللہ تعالیٰ نے انؓ کو اپنے رسولؐ کا معین قرار دیا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ۔ اور ان صحابہ کرامؓ کی فدایانہ جدوجہد کا یہ نتیجہ نکلا ہجرت سے آں حضورؐ کی وفات تک کل دس سال کے مختصر عرصہ میں جزیرہ نما عرب میں اللہ کا دین بالفعل قائم و نافذ ہو گیا اور فتح مکہ کے موقع پر یہ ایمان افروز منظر چشم فلک نے دیکھا کہ نبی اکرمؐ کعبہ شریف میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بت اپنی چھڑی مبارک سے گراتے جاتے تھے اور آپؐ کی زبان مبارک پر سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت جاری تھی: جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت تک صحابہ کرامؓ کی جماعت نے اس وقت کی معلوم و مہذب دنیا کے نصف کے قریب زمین پر اللہ کے دین کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

امیر محترم نے اسی مختصر قیام کے دوران حکومت سندھ کے زیر اہتمام ادارہ شماریات میں بھی سیرت مطہرہ سے حضورؐ کی انقلابی سرگرمیوں کو اختصاراً لیکن نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا۔ قریباً سوا گھنٹے کے خطاب میں انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ

سلام کے جملہ مراحل (۱) دعوت و تبلیغ (۲) تنظیم (۳) تربیت (۴) صبر محض (۵) اقدام اور (۶) مسلح تصادم بیان
د گئے ۔ شرکاء متعلقہ دفتر کے قریباً دو سو افراد شریک تھے۔ امیر محترم کے خطاب کی یہ سحر انگیزی تھی کہ دوران خطاب
ال میں ہر شریک کی نگاہیں امیر محترم کی طرف مرتکز تھیں، گوش برآواز تھے اور آنکھیں نم تھیں۔ اسٹیج سیکرٹری صاحب
ے خطاب کے اختتام پر اپنے ان تاثرات کا اظہار فرمایا کہ "میں نے سیرت پر بے شمار تقاریر سنی ہیں لیکن اس پہلو سے کہ
ن اکرمؐ کی تمام جدوجہد انقلابی نوعیت کی تھی آج ہی نہایت مدلل اور موثر انداز میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ آج
اری آنکھیں کھلی ہیں اور دل مطمئن ہوئے ہیں کہ حضور پر نور خاتم النبیین و سید المرسلین تو تھے ہی۔ دنیا کے عظیم ترین انقلاب
ئدو رہنما بھی تھے اور آپؐ نے وہ صالح، ہمہ گیر انقلاب برپا کیا کہ جو جنتِ ارضی ثابت ہوا۔"

اس مختصر سے قیام میں امیر محترم ایک روز کے لئے حیدر آباد بھی تشریف لے گئے ۲۸ نومبر ۸۴ء کو بعد نماز
شاء حیدر آباد کی کثیر آبادی لطیف آباد میں امیر محترم نے "مسلمانوں کے دینی فرائض" کے موضوع پر نہایت مدلل موثر
لاب ارشاد فرمایا۔ ساتھ ہی تنظیم اسلامی کی دعوت سے بھی متعارف کرایا۔ ۲۹ نومبر کی صبح سوال و جواب کی نشست
ئی۔ بعدہ بفضلہ تعالیٰ بارہ حضرات نے عہد نامہ رفاقت پڑھ کر سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کی امیر محترم کے ہاتھ
ر بیعت کر کے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی ـــــ ان حضرات میں بحمد اللہ دو حضرات علماء کرام کے زمرے
ر حلقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ امر تمام وابستگان تنظیم کے لئے یقیناً باعث مسرت و انبساط ہوگا۔

حیدر آباد کے دورے سے فارغ ہو کر امیر محترم عازم لاہور ہوئے تاکہ ۳۰ نومبر ۸۴ء کے مسجد دار السلام
ے خطاب جمعہ کا ناغہ نہ ہو۔ ✿

شام الہدیٰ - لاہور

ہور اور گرد و نواح کے ماہنامہ "میثاق" کے قارئین سے التماس ہے کہ
وہ نوٹ فرما لیں کہ
یکم مارچ ۸۵ء بروز جمعہ بعد نماز مغرب ان شاء اللہ العزیز
"شام الہدیٰ" کا واپڈا آڈیٹوریم میں انعقاد ہوگا جس میں
سورۂ حج کے آخری رکوع کا درس ہوگا۔

... میں ڈاکٹر اسرار احمد کی

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری سے

اور مبینہ بیانات کے دستاویزات کے ضمن میں گذارشات

ماہنامہ میثاق لاہور

اشاعت خصوصی بموقع

دس سالہ اجتماع تنظیم اسلامی پاکستان

۲۳ تا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۴ | مارچ ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۳

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

اس شمارے کی قیمت -/۴ روپے

تنظیمِ اسلامی

کے نام سے، 'اقامتِ دین' کی جدوجہد کے لیے ایک نئے قافلے کی تشکیل

۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء

کو ہوئی تھی اور اواخر مارچ ۸۵ء میں منعقد ہونے والا سالانہ اجتماع اس کا

دس سالہ اجتماع

ہوگا جو اِن شاء اللہ العزیز اس کی تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوگا!

پاکستان کے طول و عرض میں

جن حضرات نے بھی تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے لیے مجھ سے بیعت کی ہے

وہ امکانی حد تک کوشش کریں کہ جمعہ ۲۲ مارچ کو قبل از دوپہر لاہور پہنچ جائیں

اور اس ضمن میں طبیعت کے کسی کسل، شیطان کی کسی چال اور علائق دنیوی کے کسی بندھن کو رکاوٹ نہ بننے دیں

> واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا ! — تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی!
> خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں — سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

اس ضمن میں جملہ رفقاء اور امراء کو چاہیئے کہ قیم تنظیم چوہدری غلام محمد صاحب کی ہدایات پر پوری توجہ سے عمل کریں

اسرار احمد عفی عنہ

(سامنے کے صفحہ کی عبارت کو بھی غور سے پڑھیں)

تنظیم کی بعض نہایت اہم ہدایات کیلئے صفحہ ۲۰! ضرور دیکھئے!

اگر آپ کسی اجتماعیت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں

تو

- اس کے اجتماعات میں شریک ہونے سے گریز کیجئے۔ مختلف مصروفیات کی آڑ لے کر شرکت سے بچنے کے بہانے تراشیئے۔
- اگر کسی اجتماع میں شرکت کرنی ہی پڑ جائے تو دیر سے پہنچنے کی کوشش کیجئے۔
- اگر آپ کو کسی وجہ سے درس اور اجتماع کی بروقت اطلاع نہ دی جا سکے تو ذمہ دار حضرات کو سخت سست کہئے، لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ٹھہرایئے۔
- اجتماعات کے اندر ذمہ دار افراد پر کھلے عام کڑی تنقید اور نکتہ چینی کیجئے، انتظامات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنا نہ بھولیے۔
- بھول کر بھی کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہ کیجئے، کسی قسم کا کوئی کام ہرگز نہ کیجئے۔ ہاں کام کرنے والوں پر تنقید ضرور کیجئے۔
- اگر آپ سے کسی مسئلہ پر رائے لی جائے تو ہمیشہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے سے گریز کیجئے اور بعد میں لوگوں سے یہ ضرور کہیئے کہ اس کام کو یوں ہونا چاہیئے تھا۔ یوں نہیں۔
- اوّل تو مالی اعانت کبھی نہ کیجئے اور اگر مجبوراً کرنی ہی پڑ جائے تو کم سے کم دیجئے۔ مگر سہولتیں اور آسانیاں زیادہ سے زیادہ حاصل کیجئے۔
- دوسرے کی ذات پر تنقید کا سنہری موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیجئے، ہمیشہ دوسروں پر کیچڑ اُچھالنے کی تاک میں لگے رہیئے۔
- ذاتی مفاد کو ہمیشہ اجتماعی مفاد پر ترجیح دیجئے۔

ان نہایت ہی سادہ اور زرّیں اصولوں پر عمل کر دیکھئے، انشاء اللہ آپ کم سے کم وقت میں کسی بھی منظم تحریک کے تار و پود نہایت آسانی سے بکھیر کر رکھ دیں گے۔ !

اور

اگر آپ کسی اجتماعیت کے ساتھ مخلص ہیں۔ اس کو روز بروز ترقی کرتے اور منظم ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں تو لِلّٰہ ان اصولوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیجئے۔

(بشکریہ "حبل اللہ" کراچی)

الرحمٰن

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ مطابق مارچ ۱۹۸۵ء کا 'میثاق' ہدیۂ قارئین ہے۔ یہ شمارہ اس لحاظ سے ایک خاص
ن گیا ہے کہ اس میں امیرِ تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ
کے چند اہم رشحاتِ قلم شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا یہ بھی ایک مظہر ہوتا ہے کہ وہ عزّ وجل بظاہر احوال
یف اور مصیبت کو بھی نافع اور مفید بنا دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف وسطِ ستمبر ۸۴ء میں کمر کے درد میں
لا ہوئے کہ قریباً صاحبِ فراش ہوگئے اور قریباً دو عشروں تک دروس و خطابات اور بیرونِ لاہور
دتی دوروں کا سلسلہ معطّل رہا۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے یہ خیر پیدا فرمایا کہ امیرِ محترم کے قلم پر عرصۂ دراز سے
لگی ہوئی تھی اور طبیعت تحریری کام پر آمادہ نہیں ہوتی تھی تو اس کے فضل و کرم سے یہ گرہ کھل گئی اور
ی کام کے لئے انشراحِ صدر حاصل ہوگیا ــــ چنانچہ اکتوبر ۸۴ء سے موصوف نے تحریری کام کا آغاز
نومبر کے 'میثاق' کے ذریعہ قارئین کرام کی نظر سے ہر ماہ گزر رہا ہوگا۔

زیرِ نظر شمارے میں امیرِ محترم کی چھ تحریریں شامل ہیں جن میں سے چار تازہ ترین ہیں اور دو قریباً
ل قبل کی تحریریں ہیں۔ پرانی تحریروں میں سے ایک تحریر تنظیم اسلامی کے قیام کے اعلان اور تاسیسی اجتماع
دوران دسمبر ۷۴ء کے 'میثاق' میں "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان کے تحت لکھی گئی تھی جس میں جماعت
ی کے متوسلین اور سابقین کی خدمت میں چند معروضات پیش کی گئی تھیں اسے قندِ مکرر کے طور پر
ں افادہ شامل کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایک طرف ان حضرات کے لئے لمحۂ فکریہ ہے جو طریقِ کار کے
اف کی وجہ سے ماضی میں جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے تو دوسری طرف موجودہ قارئین 'میثاق' بالخصوص
امِ تنظیم کے سامنے امیرِ محترم کا دس سال قبل کا اندازِ فکر آجائے گا۔ جو ان شاء اللہ متعدد پہلوؤں سے
بد ہوگا۔ ساتھ ہی ان حضرات کے لئے بھی غور و فکر کی راہیں کھل جائیں گی جو فی الوقت کالعدم جماعتِ
امی کے موجودہ طریقِ کار سے غیر مطمئن ہیں۔

دوسری پرانی تحریر اس "تذکرہ و تبصرہ" پر مشتمل ہے جو 'میثاق' نومبر ۷۴ء میں تحریک ختم نبوت کے
ہ میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے پر امیرِ محترم نے سپردِ قلم فرمایا تھا۔ اسی میں موصوف

ی وہ تقریر بھی شامل ہے جو قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کے دوران ماہ جون ۱۹۷۴ء کو انہوں نے مسجد خضرا سمن آباد لاہور میں خطاباتِ جمعہ کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی۔

قادیانیوں نے اب پھر کچھ عرصہ سے جدید نوع کی جارحیت کا انداز اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے متعلق امیرِ محترم کی ایک تازہ تحریر "قادیانی مسئلہ اور اس کا نیا اور پیچیدہ تر مرحلہ" کے موضوع پر "تذکرہ وتبصرہ (۲)" ہی کے عنوان کے تحت شاملِ اشاعت ہے۔ جس میں امیرِ محترم نے قادیانیوں کی موجودہ ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور ان کے غیر مسلم قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں ان کی طرف سے جو مگرمچھ کے آنسو، کے مصداق واویلا مچایا اور خود کو مظلوم بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے متأثر ہو کر چند "دانشور" قسم کے لوگ مسئلہ کی اصل حقیقت کے شعور و ادراک کے بغیر ان کی حمایت میں اخباری بیان دے رہے اور پمفلٹ وغیرہ شائع کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے مسئلہ کی صحیح و حقیقی صورت پیش کی ہے تاکہ اگر یہ دانشور کسی مغالطہ اور غلط فہمی کی بنیاد پر قادیانیوں کی بے جا حمایت کر رہے ہیں تو وہ دور ہو جائے ــــــ

تازہ ترین تحریروں میں سے پہلی تحریر "تذکرہ وتبصرہ" کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔ قارئینِ کرام کو یاد ہوگا کہ 'میثاق'، کے ستمبر ۸۴ء کے شمارے میں امیرِ محترم کا ایک خطاب بعنوان "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات کے بارے میں علماء کے خدشات" شائع ہوا تھا۔ جس پر متعدد مخلصین نے اپنے خیر خواہانہ مشورے، تبصرے، تنقیدیں اور آراء و تأثرات براہِ راست ادارہ کو ارسال فرمائے تھے جو اکتوبر و نومبر کے میثاق کے شماروں میں شائع کر دیئے گئے تھے۔ نیز معاصر ماہنامہ 'الخیر' ملتان میں دو تنقیدی مضامین شائع ہوئے تھے۔ جن کے ضمن میں امیرِ محترم کی گذارشات ماہِ دسمبر ۸۴ء میں شائع کر دی گئی تھیں ــــــ لیکن امیرِ محترم کے ستمبر ۸۴ء والے خطاب کے سلسلہ میں ذاتی خطوط کے ذریعہ نقد و نظر، تبصروں اور مشوروں کا سلسلہ جاری تھا اس لئے اس موضوع پر "تذکرہ وتبصرہ" ہی کے عنوان سے امیرِ محترم کی دوسری تحریر جنوری ۸۵ء میں شائع ہوئی ــــــ اسی شمارے میں مولانا سید اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کا ایک مضمون "ڈاکٹر اسرار احمد کی اپیل اور علماءِ دیوبند" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس کی روشنی میں امیرِ محترم کی "شیخ الہندؒ کی جماعت" کے عنوان پر ایک مفصل تحریر فروری ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے ــــ اسی دوران معاصرِ عزیز ماہنامہ 'بینات' کراچی کے ادارتی صفحات میں اس کے مدیرِ محترم مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہٗ کی ادارتی کالموں میں تنقید ایک محاکمہ کے اسلوب سے شائع ہونا شروع ہوئی۔ اس ضمن میں امیرِ محترم نے مناسب سمجھا کہ اس پر اپنی گذارشات مضمون کی تکمیل کے بعد

پیش فرمائیں ــــ اب چونکہ 'بینات' کے فروری کے شمارے میں یہ نقد و نظر مکمل ہوگیا ہے لہٰذا زیرِ نظر شمارے میں "تذکرہ و تبصرہ" ہی کے عنوان سے امیرِ محترم نے جہاں اپنے گذشتہ ماہ کے مضمون کے بعض گوشوں اور پہلوؤں کی مزید توضیح و تشریح کی ہے وہاں مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ کے تبصرے اور تنقید پر اپنی معروضات پیش کی ہیں ۔ 'میثاق' کے جو قارئین کرام مولانا موصوف کے اعتراضات محاکمہ و محاجّہ کے دلائل کو پوری طرح سمجھنے کے خواہشمند ہوں ان کی خدمت میں ہم یہ مشورہ پیش کریں گے کہ معاصر ماہنامہ 'بیّنات' کراچی ۵ سے جنوری اور فروری ۸۵ء کے دونوں شمارے طلب فرما کر مولانا موصوف کے اس مضمون کا ضرور بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں ۔ اس طرح امیرِ محترم کی گذارشات اور وضاحتوں کی تفہیم میں بڑی مدد ملے گی ــــ اس ضمن میں ہم مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ کے الطافِ خسروانہ کے پیشِ نظر موصوف سے یہ استدعا کریں گے کہ وہ معاصر 'بیّنات' کے شمارے میں اس امر کا تذکرہ فرما دیں کہ "جو حضرات 'بیّنات' کے جنوری و فروری ۸۵ء کے ادارتی کالموں میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے متعلق شائع شدہ تبصرہ و تنقید پر ڈاکٹر صاحب کی معروضات کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہوں وہ ماہنامہ 'میثاق' لاہور ۱۴ کا مارچ ۸۵ء کا شمارہ ضرور ملاحظہ فرمائیں ــــ ان شاء اللہ افہام و تفہیم کے لئے اس طرح ایک نہایت صحت مند اور مفید روایت قائم ہو جائے گی ــــ

تازہ ترین تحریروں میں ایک تحریر امیرِ محترم کے اس مکتوب پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے برِّ صغیر پاک و ہند کے متعدد اصحابِ علم و فضل کو ۲۳ تا ۲۸ مارچ منعقد ہونے والے محاضراتِ قرآنی میں شرکت اور فرائض دینی کے اس جامع تصوّر پر اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے جو امیرِ محترم نے قرآن حکیم اور سیرتِ مطہرہ کے معروضی مطالعہ سے اخذ کیا ہے اور جس کی تبلیغ و دعوت کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے ۔ یہ مکتوب متعدد اصحابِ علم و فضل کی خدمت میں نام بنام بھی ارسال کیا جا چکا ہے ۔ اس مکتوب کے بعد تیسری تحریر "فرائض دینی کا جامع تصوّر" کے نکات پر مشتمل ہے ۔ جن پر علماءِ کرام کی رہنمائی مطلوب ہے ۔

امیرِ محترم کی ان تحریروں کے علاوہ ایک اہم مضمون "امیر کی اطاعت" کے عنوان سے شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے ۔ یہ مضمون "جماعت المسلمین" کراچی ۲۸ کے شکریہ کے ساتھ اس کے ایک کتابچے سے نقل کیا گیا ہے ۔ اس مضمون کے ذریعے کتاب و سنّت سے اسلامی ریاست اور اسلامی نظمِ جماعت میں "امیر کی اطاعت" کا جو مقام ہے وہ نہایت واضح اور مبرہن ہو کر سامنے آ جاتا ہے ــــ چونکہ "تنظیم اسلامی" کی تاسیس اسلام کے ٹھیٹھ اور خالص اصول ہیئت اجتماعی "بیعت" پر ہوئی ہے لہٰذا اس میں

امیرِ تنظیم یا اس کے مقرر کردہ اصحابِ امر اور نائبین کی اطاعت فی المعروف کی بڑی اہمیت ہے بلکہ اس کے بغیر اُس جماعت وتنظیم کے تقاضے پورے ہی نہیں ہوتے جو خالص اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کے لئے قائم ہوئی ہو۔ ایسی تنظیمی ہیئت میں امیر کی اطاعت فی المعروف وجوب کا مقام رکھتی ہے۔ یہ بات ان شاء اللہ اس مضمون کے مطالعہ سے رفقاءِ تنظیم کے سامنے روزِ روشن کی طرح آجائے گی۔ مزید برآں تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع سے قبل اس کا مطالعہ رفقاءِ تنظیم کے لئے ان شاء اللہ نہایت مفید ثابت ہوگا جو ۲۳ مارچ سے ۲۸ مارچ تک قرآن اکیڈمی میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس اجتماع میں رفقاء کے علاوہ ایسے حضرات بھی بطور مبصر شرکت کرسکتے ہیں جو تنظیم اسلامی سے تھوڑے بہت متعارف ہوں اور اس کی دعوت وطریقِ کار اور خصائص ومبادی کو قریب سے دیکھنے کے خواہش مند ہوں۔ ایسے حضرات اجتماع میں شرکت کے لئے مقامی تنظیموں کے امراء سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں یا اپنی تشریف آوری کی براہِ راست اطلاع محترم قیّم تنظیم اسلامی (پاکستان) لاہور کو بذریعہ خط دے سکتے ہیں۔

امیرِ محترم کی تحریرات اور "امیر کی اطاعت" کے مضمون کی وجہ سے اس شمارے میں امیرِ محترم کا خطاب بعنوان "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" "الھدیٰ" اور "زہدِ رحیم" کی اقساط نیز چند دوسرے مضامین شاملِ اشاعت نہیں ہوسکے۔ ان شاء اللہ یہ آئندہ شمارے میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ مزید براں، ماہنامہ حکمت قرآن کے قارئین مطلع رہیں کہ مارچ اور اپریل ۸۴ء کا مشترکہ شمارہ ان شاء اللہ اوائل اپریل میں شائع ہوگا۔

وَمَا تَوْفِيقِيٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ط

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اِس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!!

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

"یعنی وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ"

تذکرہ و تبصرہ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

جماعتِ شیخ الہندؒ سے میرا قلبی تعلق

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ سے میرے روابط

اور مدیرِ بیّنات، کراچی کے فرمودات کے ضمن میں کچھ گذارشات!

گذشتہ ماہ کے طویل 'تذکرہ و تبصرہ' کے آخری حصّے کی تحریر کے وقت راقم الحروف پر ایک عجیب 'سُکر' کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ چنانچہ حسب ذیل الفاظ بھی اسی کیفیت میں سپردِ قلم ہوگئے تھے[1]

"چنانچہ راقم خدا کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ راقم کے دل میں بلا تکلّف و تصنّع از خود محبت و عقیدت پیدا ہوجاتی ہے ہر اُس شخص سے جس کا ادنیٰ سے ادنیٰ تعلق رہا ہو حضرت شیخ الہندؒ سے ــــ یا جسے ادنیٰ سے ادنیٰ نسبت حاصل ہو ان کی ذاتِ گرامی سے اور راقم ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہے جملہ متوسلانِ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں کہ خدارا! وقت کی پکار کو کھلے اور متوجّہ کانوں اور 'کشادہ' و 'حاضر' دلوں سے سُنیں بمصداق الفاظِ قرآنی اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰى لِمَنۡ كَانَ لَهٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَى السَّمۡعَ وَهُوَ شَهِيۡدٌ !!!"

بعد میں محسوس ہوا کہ یہ فی الحقیقت "مستی" کی کیفیت میں نکلی ہوئی نہایت ہی "سچی بات" ہے![2] چنانچہ بعد میں ماضی کے جھروکوں میں مزید جھانکا ـــــ اور اپنے ذہن و شعور کی تحتانی

---

[1] اسی کیفیت میں علامہ اقبال مرحوم کے اُن اشعار کی جانب بھی ذہن اچانک منتقل ہوگیا تھا جو گذشتہ ماہ بھی شاملِ اشاعت تھے اور اس ماہ پھر نمایاں طور پر شائع کئے جا رہے ہیں۔ ورنہ راقم کے قارئین اور سامعین کے علم میں ہے کہ علامہ کے یہ اشعار اس سے قبل کبھی بھی راقم کی تحریر یا تقریر میں نہیں آئے۔ بعد میں کئی دن یہ اشعار راقم کے ذہن پر سوار رہے اور تنہائی میں بے اختیار زبان پر جاری ہوتے رہے اور دل کی گہرائیوں سے علامہ کے لئے دعائیں نکلتی رہیں! (اشعار سامنے کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

"فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا! نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں"

سلجھن میں مزید کھود کرید کی تو اندازہ ہوا کہ اگرچہ راقم ابتدائً ایک مبہم سے جذبۂ ملی اور بعد میں جدید تہذیبی و عمرانی نظریات اور سائنس و ٹیکنالوجی کے پیدا شدہ مسائل و معاملات کے ضمن میں 'فکرِ قرآنی' کے سلسلے میں شدید زیرِ بارِ احسان اور مرہونِ منت ہے علامہ اقبال مرحوم و مغفور کا ـــــــ اور 'تدبرِ قرآن' کے سائنٹفک طریق کے ضمن میں خوشہ چین ہے علامہ حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کا ـــــــ تاہم راقم کا قلبی جھکاؤ اور لگاؤ رہا ہے ان ہی شخصیتوں کی جانب جن کا کوئی نہ کوئی تعلق ہے حضرت شیخ الہندؒ سے!

حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ جامع الصفات سے علم و عمل کے جو چشمے جاری ہوئے ان کا ایک اجمالی ذکر گزشتہ صحبت میں ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ذرا سے تأمل سے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:-

حضرت شیخ الہندؒ کے نام نامی سے سب سے زیادہ نمایاں طور پر "معنون" سلسلہ تو وہ ہے جو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ذات سے چلا ـــــــ جبکہ راقم کے نزدیک حضرتؒ کی حیاتِ مستعار کے آخری دور کی کیفیات کے اعتبار سے سب سے زیادہ 'مستند' سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم، دوسری کڑی تھے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم اور تیسری کڑی ہے 'بزعمِ خویش' ان سطور کا حقیر و عاجز راقم!

مزید برآں ایک سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور، جن پر آخری عمر میں 'انقلابیت' کچھ زیادہ ہی طاری ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کے عزیز و شاگرد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ ان کے راستے سے ذرا ہٹ کر پوری طرح ضم اور مدغم ہو گئے متذکرہ بالا 'سلسلۂ اولیٰ' ہی میں ـــــــ جبکہ ایک سلسلہ وہ ہے جو اس کے بالکل برعکس اس 'سلسلۂ اولیٰ' سے قومی اور ملی سیاست کے ضمن میں اختلاف رائے کی بنا پر منقطع ہو کر جا ملا مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک ـــــــ یعنی تحریکِ پاکستان کے ساتھ جسے حلقۂ دیوبند ہی کی ایک دوسری عظیم شخصیت یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حمایت و تائید حاصل تھی۔ اس سلسلے کی اولین کڑی تھے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت اور ان کے جانشین کی حیثیت حاصل ہوئی مفتی محمد شفیعؒ کو۔

انگریزی مثل "Last but not the Least" کے مصداق ذکر میں آخری اور پانچواں لیکن خالص علمی اعتبار سے اولین اور اہم ترین سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا

سید انور شاہ کاشمیریؒ ـــــ اور دوسری اہم ترین کڑی تھے مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ۔

ان "سلاسلِ خمسہ" کی اوّلین شخصیتوں کی زیارت کی سعادت تو راقم کو بُعدِ زمانی و مکانی کے باعث حاصل نہیں ہو سکی لیکن دوسری اور تیسری کڑیوں کی حیثیت رکھنے والے حضرات میں سے اکثر سے نیازمندی اور حصولِ فیضِ صحبت کے مواقع میسر آئے۔ اور بعض دوسرے علماءِ کرام کے علمی تبحّر اور خلوص و اخلاص کے پوری طرح قائل و معترف ہونے کے باوجود قلبی میلان صرف ان ہی حضرات کی جانب رہا۔

لاہور میں راقم کی نیازمندی اور گاہ بگاہ حاضری کا سلسلہ اگرچہ بعض دوسرے حضرات کے یہاں بھی ہے لیکن سب سے زیادہ ربط و تعلق مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مجاز اور جامعہ مدنیہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث مولانا سید حامد میاں مدظلہ، سے ہے، جو تنظیمِ اسلامی کے حلقہء مستشارین میں بھی شامل ہیں۔

دہلی کے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ، بھی جو حال ہی میں تنظیم کے حلقہء مستشارین میں شامل ہوئے ہیں، جمیعت علماء ہند ہی کے پرانے متوسّلین میں سے ہیں اگرچہ فی الوقت ان کا کسی قدر اختلاف مولانا اسعد مدنی خلف الرشید مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ہے!

حضرتِ لاہوریؒ کی تو صرف ایک بار زیارت کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہوا تھا۔ لیکن لاہور میں دوسرے نمبر پر راقم کی حاضری کا معاملہ ان کے جانشین مولانا عبید اللہ انور مدظلہ ہی کی خدمت میں ہوتا رہا۔ چنانچہ کئی سال وہ قرآن کانفرنسوں میں بھی تشریف لاتے رہے اور ہمارے بعض دوسرے اجتماعات میں بھی شرکت فرماتے رہے۔ ایک تقریر جواب "شہیدِ مظلومؓ" کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں طبع ہوتی ہے، راقم نے اُن ہی کی مسجد میں اُن ہی کی زیرِ صدارت کی۔ اور ۱۹۷۵ء میں جس "قرآنی تربیت گاہ" کے اختتام پر راقم نے "تنظیمِ اسلامی" کے قیام کا اعلان کیا اس کی افتتاحی تقریب کے مہمان خصوصی بھی وہی تھے اور انہوں نے نہایت شاندار بلکہ "شرمسار کن" الفاظ میں راقم الحروف کو خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ اگرچہ اِدھر کچھ عرصہ سے وہ بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر راقم اور اس کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے اجتماعات سے پہلو تہی فرمانے لگے ہیں اور راقم یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے اب بھی ان کی سرپرستی حاصل ہے۔

مولانا سندھی مرحوم کے شاگردوں، شارحوں اور راویوں میں سے پروفیسر محمد سرور مرحوم سے راقم کو بھی اُنس تھا ـــــ اور وہ بھی راقم سے بہت دلچسپی رکھتے تھے ـــــ حتّٰی کہ

عمر کے آخری دور میں اگرچہ تقدیر انہیں کھینچ کر اسلام آباد ایک سرکاری ادارے میں لے گئی لیکن خود ان کی شدید خواہش "قرآن اکیڈمی" ہی میں ڈیرہ لگا لینے کی تھی ـــــ (ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے کا موقع بھی راقم کو حاصل ہوا) دوسری طرف مولانا سندھیؒ کے دو معتقدین "دیوانوں" یعنی شیخ بشیر احمد لدھیانوی مرحوم اور محمد مقبول عالم مرحوم سے بھی راقم کا گہرا ربط ضبط رہا ـــ چنانچہ ان کے مضامین بھی 'میثاق' میں شائع ہوتے رہے اور ان کے حوالے سے مولانا سندھیؒ کے فکر کا تعارف بھی ایک مضمون میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے کرایا[1]۔

ادھر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زیارت تو راقم کو نصیب نہ ہوئی لیکن راقم کے لئے یہ خیال بہت غنیمت ہے کہ راقم کا ایک غائبانہ اور معنوی تعلق ان سے اس طرح بنتا ہے کہ جب وہ تحریکِ پاکستان کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کے طول و عرض میں دورے کر رہے تھے اس وقت راقم الحروف بھی تحریکِ پاکستان کے ایک ننھے کارکن کی حیثیت سے (بطور جنرل سیکرٹری حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن) ضلع حصار کے قصبات ہانسی، سرسہ وغیرہ کے ہائی اسکولوں کے طلبہ کو آمادۂ عمل کرنے کے لئے سفر کیا کرتا تھا۔ باقی مولاناؒ کا جو معنوی فیضِ صحبت راقم کو ان کے "حواشی ترجمۂ قرآن" کے ذریعے حاصل رہا ہے اس کا تفصیلی ذکر گذشتہ اشاعت میں آ ہی چکا ہے۔

البتہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں حاضری کے راقم کو ۶۵-۱۹۶۴ء میں وافر مواقع ملے۔

---

[1] مولانا سندھی مرحوم اور حضرت لاہوریؒ کے ساتھ راقم کے ایک اور تعلق کا راز بھی آج فاش ہو جائے تو بہتر ہے۔ اور وہ یہ کہ حاجی عبدالواحد صاحب 'ایم۔اے'، جو ایک سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہ کر مولانا سندھیؒ سے کسبِ فیض کرتے رہے ـــ بعد ازاں حضرت لاہوریؒ سے بیعت ارشاد میں منسلک ہوئے، (مزید برآں ایک طویل سفر میں مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ اور مولانا علی میاں مدظلہ کے ہمرکاب رہے جس کا مقصد "وحید اعلاءِ کلمۃ اللہ کی تحریک کے لئے کسی "داعی" کی تلاش تھا ـــ بعد ازاں کچھ عرصہ ندوۃ العلماء میں مقیم رہ کر عربی کی تحصیل کرتے رہے)، پہلے شخص ہیں جنہوں نے راقم الحروف سے اس وقت 'بیعتِ جہاد' کی جبکہ خود راقم کو ابھی اس کا خیال بھی نہیں تھا۔ اور انہوں نے زبردستی راقم کا ہاتھ کھینچ کر بیعت کی تھی!

خصوصاً ان چھ ماہ کے دوران جبکہ راقم کی رہائش بھی کورنگی میں "دارالعلوم" کے نہایت قریب تھی اور رمضان المبارک میں اعتکاف بھی راقم نے دارالعلوم ہی کی مسجد میں کیا تھا، جس کے دوران حضرت مفتی صاحبؒ کے خویش کلاں مولانا نور احمد صاحب سے بہت قرب رہا تھا!

حضرت مفتی صاحبؒ کے صاحبزادوں میں سے مولانا رفیع عثمانی اور مولانا تقی عثمانی سے بھی ان دنوں کافی ملاقاتیں رہیں۔ مولانا تقی عثمانی صاحب سے بعد میں بھی متعدد بار ملنا ہوا۔ ایک ملاقات میں انہوں نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی بعض تحریروں کی 'میثاق' میں اشاعت پر احتجاج کیا۔ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک رسالہ دکھایا جو انہوں نے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے تفسیری حواشی پر تنقید و اصلاح کے ضمن میں "التقصیر فی التفسیر" کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا۔ ایک بار میری درخواست پر انہوں نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام 'قرآن کانفرنس' منعقدہ کراچی کے ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی[1]

حضرت شیخ الہند سے معنوی تعلق ہی کا یہ فیض بھی ہے کہ دیوبند میں قائم 'شیخ الہندؒ اکیڈمی' کے ڈائریکٹر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ کی بھی خصوصی شفقت و عنایت گذشتہ

---

[1] تاہم چند دن ہوئے تنظیم اسلامی کے ایک نوجوان رفیق نے ان کے والد ماجد کے استفتاء پر مولانا تقی عثمانی صاحب کے دستخط سے جاری شدہ تحریر دکھائی جس میں کہا گیا ہے کہ چونکہ راقم الحروف باضابطہ عالم دین نہیں ہے لہٰذا نہ میری تنظیم میں شمولیت درست ہے نہ میرے درس میں شرکت! (اس کے بارے میں راقم اپنی گذارشات آگے عرض کرے گا) ساتھ یہ بھی درج تھا کہ انہوں نے (یعنی مولانا تقی عثمانی صاحب نے) نہ میری تقریریں سنی ہیں نہ تحریریں پڑھی ہیں —— اس پر کسی قدر تعجب ہوا کہ اگر وہ 'میثاق' نہیں دیکھتے تھے تو چشتی صاحب کی تحریریں ان کے علم میں کیسے آئیں؟ —— اور کم از کم میری وہ تقریر تو انہوں نے ازابتداء تا انتہاء سنی تھی جو میں نے 'قرآن کانفرنس' کے متذکرہ بالا اجلاس میں ان ہی کے زیر صدارت "مقام صحابہؓ" کے موضوع پر کی تھی۔ اور جو اختصار کے باوصف خاصی طویل تھی۔ اس کی اس کے سوا اور کیا تاویل کی جائے کہ کچھ عرصہ گذر جانے کے باعث یہ واقعات مولانا کے حافظے سے محو ہو گئے۔! —— واللہ اعلم!

دو تین سالوں کے دوران راقم الحروف کو حاصل ہو گئی ہے!

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے راقم الحروف کی نسبت کا ذکر تحصیلِ حاصل ہے! اور خواہ اسے "یہ دعویٰ بہت بڑا ہے، پھر ایسا دعویٰ نہ کیجئے گا!" (حالیؔ) کا مصداقِ کامل ہی قرار دیا جائے راقم کا موقف یہی ہے کہ اُس کی دعوت و تحریک 'الہلال' اور 'البلاغ' ——— اور 'ترجمان القرآن' اور 'الجہاد فی الاسلام' ہی کی صدائے بازگشت ہے اور اس کی قائم کردہ 'تنظیمِ اسلامی' ——— 'حزب اللہ' اور 'جماعتِ اسلامی' ہی کے سلسلے کی کڑی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی ذات سے شروع ہونے والے 'سلسلۂ خاصہ' کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کا ذکر راقم کو ذرا تفصیل سے کرنا ہے، اس لئے کہ اس کے موجودہ 'آرگن' ماہنامہ 'بیّنات' کے دو حالیہ شماروں کے ادارتی صفحات راقم کے تذکرے میں صرف ہوئے ہیں۔

اس سے قبل راقم 'اکابرِ دیوبند' رحمہم اللہ کے ساتھ اپنے ایک اور تعلق کے اظہار کی اجازت چاہتا ہے ——— اور وہ ہے 'زمینی نسبت'، یعنی یہ کہ راقم کے آباد و اجداد کا تعلق بھی یوپی کے مشہور دوآبہ کی اسی سرزمین سے ہے جس میں سہارنپور، دیوبند، کاندھلہ، گنگوہ، نانوتہ، بڈھانہ، جھنجھانہ، کیرانہ، تھانہ بھون اور پھلت ایسے قصبات واقع ہوئے ہیں، جنہوں نے مسلم انڈیا کے ابتدائی دور میں تو شیخ عبدالقدوس گنگوہی ایسی عظیم شخصیت پیدا کی تھی ——— پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا خاندان عطا کیا۔ (یہ حضرات اصلاً قصبہ پھلت کے تھے) بعدازاں مجاہدِ کبیر سید احمد بریلویؒ کو کثیر ترین تعداد میں جہاد و قتال کے ساتھی (Comrades - At - Arms) مہیا کئے۔ اور پھر جملہ اکابرینِ دیوبند کا تحفہ مسلمانانِ ہند کو دیا۔

ان قصبات میں 'شیوخ' کی ایک برادری آباد ہے جن میں سے کچھ تو اپنے ناموں کے ساتھ 'قریشی' کا عمومی لاحقہ لگاتے ہیں اور کچھ تعیّن کے ساتھ صدیقی، فاروقی یا عثمانی لکھتے ہیں ——— ان کے رشتے ناطے آپس میں بھی بہت ہیں اور ہندی نومسلم خاندانوں کے ساتھ بھی، اس طرح ان میں باہر سے آنے والے قدیم الاسلام اور مقامی آبادی میں سے ایمان لانے والے حدیث العہد مسلمان باہم گڈمڈ ہیں۔ راقم کا ددھیال اسی علاقے کے قصبہ حسین پور سے تعلق رکھتا ہے اور ننھیال قصبہ بَنَت سے! میری والدہ صاحبہ تو تعیّن کے ساتھ صدیقی ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ شیخ حبان المصری الیمنی الصدیقی تھے جن کی سترھویں پشت میں شیخ محمد طاہر ہندوستان آئے تھے۔ (اس خاندان کے بعض حضرات جیسے مولانا محمد حسین فقیر اور ان کے صاحبزادگان مولانا محمد ابراہیمؒ اور مولانا محمد اسحٰقؒ

قبرستان مہندیاں دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے ابناء و احفاد کے قریب محوِ استراحت ہیں!) میرے پڑدادا حافظ نور اللہ صاحب حسین پور میں دیکی حویلی والے' مشہور تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد وہ انگریزی حکومت کے زیرِ عتاب آئے اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ مجبوراً انہوں نے نقلِ مکانی کی اور دریائے جمنا عبور کر کے مشرقی پنجاب کے ضلع حصار آگئے اور سرکاری ملازمت شروع کر دی۔ میرے دادا حاجی محمد یحییٰ بھی وہیں سرکاری ملازمت میں رہے۔ والدِ مرحوم شیخ مختار احمد کے ساتھ ہم سب لوگ ۱۹۴۷ء کے قتلِ عام اور جبری تبادلہ آبادی کے ضمن میں واقعتہً آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان آئے (حصار سے سلیمانکی ہیڈ ورکس کا ایک سو ستّر میل کا فاصلہ ہم لوگوں نے ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس دنوں میں طے کیا ـــــ اور راستے میں جو مصیبتیں اٹھائیں ان کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہے!) ـــــ الغرض ع "کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی!" کے مصداق یہ بھی میری اکابرینِ دیوبند کے ساتھ ایک نسبت کی اساس ہے!

مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے تذکرے سے قبل چند الفاظ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بارے میں بھی ضروری ہیں۔ مبادا کوئی غلط فہمی راہ پالے ـــــ مولانا تھانویؒ کو بھی اگرچہ حضرت شیخ الہندؒ سے ایک نسبت تلمذ حاصل تاہم ان کا شمار حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ یا متوسّلین میں درست نہیں بلکہ وہ ہر اعتبار سے ایک متوازی شخصیت ہیں اور ان کی عظمت خالص ذاتی ہے۔ چنانچہ عمر کے اعتبار سے بھی وہ حضرت شیخ الہندؒ سے صرف بارہ سال چھوٹے ـــــ اور ان کے اکثر تلامذہ سے پندرہ پندرہ بیس بیس سال بڑے تھے۔ پھر ان کا مزاج بھی خالص علمی و اصلاحی تھا ـــــ چنانچہ ان کی اصل توجہات یا تصنیف و تالیف پر مرتکز رہیں یا تزکیہ و سلوک پر، سیاسیات پہ وہ نگاہ رکھتے تھے اور آزادانہ رائے کے حامل بھی تھے لیکن اس سے انہیں کوئی عملی دلچسپی نہ تھی ـــــ چنانچہ جہادِ حُرّیت اور تحریکِ استخلاصِ وطن میں بھی ان کا کوئی قابلِ ذکر حصّہ نہیں ہے ـــــ لیکن دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ موجودہ پورے حلقۂ دیوبند پر اُن ہی کے علم اور تصوّف کی چھاپ سب سے بڑھ کر ہے اور پاکستان میں اکثر و بیشتر عظیم الشان

دینی درسگاہیں ان ہی کے خلفاء اور متوسّلین نے قائم کی ہیں! ـــــــ الغرض ان کی ذات سے جو 'خیرِ کثیر' برِصغیر پاک و ہند میں پھیلا وہ اظہر من الشمس ہے تاہم راقم کے نزدیک ان کا شمار "حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت" میں نہیں ہے' یہی وجہ ہے کہ گذشتہ شمارہ میں ان کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔

بیسویں وقت مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگرد رشید مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ کا مزاج بھی بالکل غیر سیاسی اور خالص علمی بلکہ تعلیمی و تدریسی تھا! اہلِ علم کے حلقے میں تو وہ یقیناً بہت پہلے نمایاں اور معروف ہوگئے ہوں گے ـــــ لیکن عوامی سطح پر ان کی شہرت ۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوّت سے پہلے زیادہ تر صرف کراچی اور اس کے گرد و نواح تک محدود تھی ـــــ البتہ ۷۴ء کی تحریک کے دوران وہ دفعتاً ملک گیر شہرت کے حامل ہوگئے ـــــ راقم کو ان سے جو ذہنی و قلبی تعلق رہا اس کی اجمالی داستان الحمد للہ کہ ان کی وفات پر سپردِ قلم ہوگئی تھی اور 'میثاق' کی نومبر ۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہوگئی تھی جو ذیل میں نقل کیجا رہی ہے! (اگر راقم آج یہ باتیں لکھتا تو شاید بعض حضرات اسے 'سخن سازی' قرار دیتے!)

مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَم

آہ مولانا محمّد یوسف بنوریؒ

"اس دارِ فانی میں جو بھی آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن کوچ کرنا ہی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کے انتقال سے ایک دم ایک مہیب خلا پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے اور ایک بار تو دنیا واقعۃً اندھیری ہوجاتی ہے ـــــ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی وفاتِ حسرت آیات یقیناً اسی زمرے میں ہے! اور اس سے پورے عالمِ اسلام اور بالخصوص پاکستان کے دینی و علمی حلقے میں جو خلا پیدا ہوا ہے' اس کے پُر ہونے کی کوئی صورت بظاہر احوال تو دُور دُور تک نظر نہیں آتی۔

راقم الحروف میں لگ بھگ چھ ماہ اور پھر ۶۲ء تا ۶۵ء تقریباً چار سال کراچی میں مقیم رہا' اور اس دوران میں اکثر جمعے جامع مسجد نیو ٹاؤن ہی میں ادا ہوئے اور

اس طرح مولانا کے اقتدار کی سعادت بھی نصیب ہوتی رہی اور مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن کے تعمیر و ترقی کے مراحل بھی " وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ " کے مانند نگاہوں سے گزرتے رہے، جس سے مولانا کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوتا چلا گیا۔ محبِ مکرم ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی (کیماڑی، کراچی)[1] ان دنوں مولانا سے باقاعدہ دورۂ حدیث میں شامل ہو کر استفادہ کر رہے تھے اور ساتھ ہی کچھ علاج معالجے کی خدمت بھی بجا لاتے تھے۔ اس دوران میں ان کے ساتھ مولانا سے چند بار ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا، لیکن زیادہ تر رسمی اور سرسری انداز میں[2]

اکتوبر، نومبر ۶۷ء کے دوران رمضانِ مبارک کا پورا مہینہ راقم کو مدینہ منورہ میں بسر کرنے کی سعادت ملی تھی۔ آخری عشرے میں مولانا بنوری بھی تشریف لے آئے تھے اور مسجد نبوی میں معتکف تھے۔ لہٰذا وہاں چند تفصیلی ملاقاتوں کا موقع میسر آیا۔ راقم نے اپنا کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" مولانا کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ پیش کیا کہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ اور کوئی غلطی ہو تو متنبہ فرما دیں تاکہ اصلاح کر لی جائے ____ مولانا نے اسے بالاستیعاب دیکھا اور ایک مقام پر عبارت میں اصلاح فرمائی ____ (جو اگلے ایڈیشن میں کر دی گئی ہے)[3]

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۷۱ء کی ہے۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے جو انداز اختیار کیا اس کے باعث اب راقم کا کوئی ربط و ضبط ان سے نہیں ہے!

[2] تاہم ان سرسری ملاقاتوں میں بھی مولاناؒ سے جو قربِ ذہنی و قلبی پیدا ہو گیا تھا اس کا مظہر ہے کہ جب راقم نے ۶۶ء میں 'میثاق' کی ادارت سنبھالی تو مولاناؒ کی ایک تحریر مئی ۶۶ء کے شمارے میں شائع کی ____ اور "حرمتِ صحابہؓ" کے عنوان سے ایک طویل مضمون اپریل و مئی ۶۸ء کے مشترک شمارے میں شائع کیا ____! حضرت مولاناؒ کی یہ دونوں تحریریں نہایت اہم ہیں۔ اور ان شاء اللہ 'میثاق' کی قریبی اشاعتوں میں دوبارہ شائع کی جائیں گی۔

[3] راقم کی اصل عبارت یوں تھی:-

" لیکن پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا بھلا عرصہ صرف کر دیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم و فنون حاصل کئے ہوں۔ مادری ہی نہیں غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں، اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو ان کی یہ تلاوت نہ صرف یہ کہ بے کار اور لاحاصل ہو گی (باقی اگلے صفحہ پر)

عید الفطر کے روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ راقم مولانا کی خدمت میں غالباً بخاری حضرات کی رباط میں حاضر ہوا۔ راقم کی اس درخواست پر کہ اسے کچھ علیحدگی میں عرض کرنا ہے، مولانا نے فوراً تخلیہ کا اہتمام فرمایا۔ تب راقم نے عرض کیا کہ "مجھے تشویش لاحق ہے کہ مسجدِ نبویؐ میں تو دل بھی لگتا ہے اور انشراحِ صدر و انبساط کی کیفیت بھی نصیب ہوتی ہے لیکن مسجدِ حرام میں قطعاً دل نہیں لگتا!" یہ سنتے ہی مولانا پر رقّت طاری ہو گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے فرمایا "ڈاکٹر صاحب! آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی دینی و روحانی الجھن کا ذکر کیا ہے ورنہ ہمارے پاس جو بھی آتا ہے دُنیوی معاملات کا ہی کا رونا روتے آتا ہے!" ـــــ راقم مولانا کے اس شدّتِ احساس سے حد درجہ متأثر ہوا اور یہ واقعہ راقم اور مولانا کے مابین ایک قریبی قلبی تعلق کی تمہید بن گیا۔

۷۵ء کے دوران راقم ہر ماہ کراچی جاتا رہا اور گاہے گاہے مولانا کی زیارت سے مشرف بھی ہوتا رہا۔ اسی زمانے میں ایک بار مولانا نے اپنے دورۂ حدیث کے طلبہ سے خطاب کا موقع بھی عنایت فرمایا اور اگرچہ راقم مولانا کی موجودگی اور ان کے رعبِ علمی کے باعث کچھ کھل کر بات نہ کر سکا اور اس نے اعتراف بھی کیا کہ: میری حالت اس وقت وہی ہے جس کا نقشہ قرآن مجید کے ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ: "وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنطَلِقُ لِسَانِي!" تاہم راقم نے جس طرح بھی بن پڑا "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" کے موضوع پر گفتگو کی جس کی مولانا نے کھلے دل کے ساتھ تصویب فرمائی۔ انہی دنوں مولانا نے یہ محبت آمیز پیشکش بھی فرمائی کہ "جب بھی کراچی آنا ہو، مدرسے ہی میں قیام کیا کرو، تمہارے لئے ایک بالکل علیحدہ کمرہ مخصوص کر دیا جائے گا!" ـــــ راقم کے لئے مولانا کی اس مشفقانہ پیشکش سے فائدہ اٹھانا تو بوجوہ ممکن نہ ہو سکا تاہم دل پر ان کی ان شفقتوں کا بجد

(تسلسل) بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں!"

جسے مولاناؒ نے بدل کر یوں کر دیا:

"......... اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں اور اس اعراض عن القرآن کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے۔"

اس طرح الحمدللہ کہ میری مراد بھی اور زیادہ واضح ہو گئی اور محض لفظی بے احتیاطی کے باعث منکرینِ حدیث سے جو مشابہت پیدا ہو رہی تھی اس کا بھی ازالہ ہو گیا۔!

اثر ہوا اور قلب میں مولانا کی عظمت اور عقیدت کے ساتھ ساتھ محبت بھی جاگزیں ہو گئی ۔

وسطِ دسمبر ۱۹۷۳ء میں پہلی سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تو راقم نے مولانا کو اس میں شرکت کی دعوت دی جسے انہوں نے کمال شفقت سے قبول فرما لیا۔ چنانچہ حسبِ وعدہ تشریف لائے اور دو دن راقم کے غریب خانے ہی پر رونق افروز رہے۔ اس دوران ان کی سادگی اور بے تکلفی کا جو تجربہ ہوا اس سے بھی دل بہت متأثر ہوا ــــ اور ان کا یہ طرزِ عمل تو بہت ہی 'غیر معمولی' نظر آیا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ آمد و رفت کا کرایہ وصول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ جب انجمن خدام القرآن کی کچھ مطبوعات ان کی خدمت میں پیش کی گئیں تو ان کی قیمت بھی باصرار ادا فرمائی[4]

۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو راقم نے مولانا کو اس کے 'حلقہ مستشارین' میں شرکت کی دعوت دی تو فرمایا "ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے بیحد عزیز ہیں، آپ کو پوری آزادی ہے کہ جب چاہیں آئیں اور جو مشورہ چاہیں طلب کریں، میں کبھی دریغ نہ کروں گا لیکن کوئی باضابطہ ذمہ داری قبول کرنے سے میں اپنی صحت کی کیفیت اور مصروفیت کی شدت کے باعث معذور ہوں!" ــــ اس کے بعد ایک اور بات بھی ارشاد فرمائی جو راقم دسمبر ۷۶ء کے 'میثاق' میں نقل کر چکا ہے اور اس وقت اس کے اعادے کی نہ ضرورت ہے، نہ افادیت![6]

---

[4] راقم الحروف کو ۲۶ر دسمبر ۷۳ء کی اس شام کی کیفیات ابھی تک اچھی طرح یاد ہیں۔ جب مولاناؒ نے 'مقامِ رسالتؐ' پر اپنی عالمانہ اور جذبہ انگیز تقریر فرمائی تھی۔ جناح ہال نہ صرف یہ کہ خود پوری طرح کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ اس کی تمام گیلریاں بھی انسانوں سے پٹ چکی تھیں۔ راقم نے مولاناؒ کی تقریر کے بعد عرض کیا تھا کہ ــــ

"میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر آج پوری طرح سمجھ میں آیا ہے کہ ؎

"بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!"

اہالیانِ لاہور میں سے اکثر کے لئے مولاناؒ سے یہ پہلے تعارف کا موقع تھا ــــ اور اکثر و بیشتر لوگوں کے چہروں پر ایک خوش گوار حیرانی کا تأثر نمایاں تھا!

[5] ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت اور اس کی نہایت شاندار کامیابی کے ضمن میں ایک طویل اداریہ راقم نے اکتوبر نومبر ۷۴ء کے 'میثاق' میں شائع کیا تھا جس میں اس کی کامیابی کا ایک اہم سبب حضرت مولاناؒ کی قیادت و سیادت کو قرار دیا تھا۔ راقم کا احساس ہے کہ یہ پورا اداریہ موجودہ حالات کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہے چنانچہ اسے بھی ان شاء اللہ من و عن 'میثاق' کی کسی قریبی اشاعت میں دوبارہ شائع کر دیا جائے گا!

[6] حضرت مولاناؒ کی بقیہ بات یہ تھی "........ ویسے یہ بات بھی ہے کہ آپ مولانا فراہیؒ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد افسوس ہے کہ مولانا سے صرف چند سرسری ملاقاتیں ہی ہو سکیں۔ جن میں سے ایک میں مولانا نے دسمبر ۷۶ء کے متذکرہ بالا مضمون کا ذکر تحسین آمیز انداز میں کیا اور اپنی دو تازہ عربی تالیفات بھی عنایت فرمائیں، جن میں سے ایک میں بعض وہی موضوعات زیر بحث آئے تھے جن پر راقم نے اپنی مذکورہ تحریر میں اظہار رائے کیا تھا ـــــ غالباً اسی موقع پر راقم نے مولانا سے دریافت کیا کہ کیا یہ درست ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بارے میں فرمایا تھا کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا!" تو مولانا نے اس کی توثیق فرمائی اور مزید ارشاد فرمایا کہ: اس سے ایک طرف تو حضرت شیخ الہندؒ کے تواضع و انکسار کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف چھوٹوں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کا!

راقم الحروف کے لئے یہ بات تازندگی رنج و غم کا باعث رہے گی کہ ماہنامہ "بیّنات" کا جو غالباً آخری شمارہ مولانا کے اداریے کے ساتھ شائع ہوا ہے اس میں مولانا نے راقم کی ایک تحریر کے بعض مقامات پر گرفت فرمائی اور راقم سوچتا ہی رہ گیا کہ حاضرِ خدمت ہو کر بالمشافہ وضاحت پیش کرے یا تفصیلی خط لکھے کہ خبر آگئی کہ مولانا نے راولپنڈی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥ ـــــ ویسے جن حضرات سے بھی مولانا کی اس گرفت کے بارے میں بات ہوئی وہ گواہی دیں گے کہ راقم کو اس سے ہرگز کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ جہاں تک 'گرفت' کا تعلق ہے اس کے بارے میں تو راقم کو یقین تھا کہ اس کی بنیاد غلط فہمی پر ہے اور جیسے ہی راقم وضاحت پیش کرے گا، مولانا یقیناً تسلیم فرما لیں گے، اور جہاں تک محبت و شفقت کا تعلق ہے تو وہ مولانا کی اس تحریر سے بھی ٹپک رہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے لئے مولانا کے قلم سے "آں محترم" کے الفاظ دیکھ کر تو اپنے آپ میں ایک شرمندگی کا سا احساس بھی ہوا ـــــ البتہ حسرت ہے تو صرف اس کی کہ کاش مولانا سے ملاقات ہو جاتی اور

(تسلسل) اور مولانا اصلاحی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ہم ان کے معلّم اوّل امام ابن تیمیہؒ کو علم کا بحر ذخار ماننے کے باوجود اہمیت نہیں دیتے تو ان لوگوں کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔!" ـــــ راقم نے اس وقت اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت مولانا اصلاحی صاحب کے ساتھ راقم کا ربط و تعلق کم ہوتے ہوتے معدوم کے درجے میں آچکا تھا! چنانچہ دسمبر ۷۶ء کے 'میثاق' میں راقم نے مولانا سے اپنے تعلقات کے انقطاع کا اعلان بھی کر دیا تھا ـــــ!!

راقم خود ان ہی کو گواہ بناتا کہ :

○ راقم کو نہ مفسّر بننے کا کوئی شوق ہے[۷] !

○ نہ ہی وہ جہنّم سے نجات پا جانے کو ادنیٰ درجہ کی کامیابی متصوّر کرتا ہے !

○ نہ اس کا کسی بھی درجہ میں کوئی تعلق 'خارجیت' سے ہے اس لئے کہ وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو ہرگز کافر نہیں سمجھتا ــــ اور اس دنیا میں کسی کے ایمان کے فیصلے کا دار و مدار عمل پر نہیں صرف 'قول' پر سمجھتا ہے![۸]

ہوسکتا ہے کہ بعض حضرات 'غلط فہمی' کے لفظ سے مغالطے کا شکار ہو جائیں، اس میں ہرگز کوئی دخل مولانا کے سوءِ فہم کو حاصل نہیں۔ یہ تو ثابت ہی ہے کہ مولانا نے راقم کی متعلقہ تحریر ـ 'انجمن خدام القرآن' کے طبع کردہ کتابچے "راہِ نجات: سورۂ والعصر کی روشنی میں" میں نہیں پڑھی بلکہ "ادارہ اشاعت علومِ اسلامیہ، چہلیک، ملتان" کے ماہانہ سلسلۂ مطبوعات کے شمارہ نمبر ۴۴ میں "انسان کا اصل سرمایہ" کے عنوان سے مطبوعہ رسالے میں پڑھی جس میں نہ صرف یہ کہ اس کا اوّل و آخر غائب ہے بلکہ راقم کا نام بھی "ڈاکٹر اسرار محمد خاں" درج کیا گیا ہے۔ ثانیاً اندازہ ہوتا ہے کہ کسی نے اس تحریر کے بعض مقامات نشان زد کرکے مولانا کے سامنے رکھ دیئے اور مولانا نے اس پر رائے رقم فرما دی، واللہ اعلم !!

---

[۷] چنانچہ واقعہ ہے کہ راقم نے بیسیوں مرتبہ اس فرمائش کے جواب میں کہ آپ بھی تفسیر لکھیں یہی عرض کیا کہ نہ تو راقم اس کا اہل ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے اس لئے کہ بحمد اللہ اردو زبان میں درجن بھر کے لگ بھگ عمدہ تفاسیر موجود ہیں۔ میں تو اس کوشش میں ہوں کہ ان کے پڑھنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں! ــــ بلکہ ایک مرتبہ تو ایک کرم فرما مُصر ہوئے کہ اچھا صرف قرآن مجید کا ترجمہ کر دو، میں اسے فوراً شائع کر دوں گا ــــ اور اس خدمت کے عوض انہوں نے ایک خطیر رقم کا لالچ بھی دیا ــــ اور میری حوصلہ افزائی کے لئے یہ بھی کہا کہ اس میں محنت کچھ درکار نہیں، دو چار ترجمے سامنے رکھ کر ترجمہ کر دیں، صرف آپکا نام درکار ہے، ان شاء اللہ بہت نسخے فروخت ہوں گے ــــ جس پر راقم نے دل میں لاحول پڑھی اور ان سے مناسب الفاظ میں معذرت کر دی۔

[۸] اس مسئلے پر راقم ان شاء اللہ آئندہ تفصیلی گفتگو کرے گا۔

بہرحال راقم الحروف کے نزدیک مولانا کے ساتھ کم وبیش سات سالہ تعلقات کی انتہائی خوشگوار یادوں کے آخر میں اگر ایک ذرا سی تلخ یاد بھی شامل ہوگئی تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ اس تلخی میں بھی محبت وشفقت کی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مولانا کو ہماری دعاؤں کی ہرگز کوئی حاجت نہیں لیکن ان کے لئے دعا خود ہمارے لئے یقیناً اجر وثواب کا ذریعہ ہے ــــ

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَاَدْخِلْہُ فِیْ اَعْلٰی عِلِّیِّیْنَ ـ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ!"

یہ ایک امرِ مُسلّم ہے کہ اللہ والوں کا اصل ترکہ ــــ اور عظیم ترین صدقۂ جاریہ صالح اولاد ہوتی ہے، راقم کا حضرت مولانا بنوریؒ کے صاحبزادے مولانا محمد بنوری سے مولاناؒ کی وفات کے بعد بہت ہی کم ملنا ہوا لیکن چونکہ انہوں نے مولاناؒ کی مجھ پر شفقت وعنایت کا مشاہدہ کیا ہوا ہے لہٰذا وہ میرا بہت لحاظ کرتے ہیں! ــــ پھر داماد بھی بیٹوں ہی کے حکم میں ہوتے ہیں، چنانچہ مولاناؒ کے خویشِ کلاں مولانا محمد طاسین مدظلہٗ کی راقم پر عنایتوں اور شفقتوں کا حال تو سب کے علم میں ہے ہی ــــ شاید بعض حضرات کے علم میں یہ نہ ہو کہ وہ 'تنظیمِ اسلامی' کے حلقۂ مستشارین میں بھی باضابطہ شامل ہیں!

مولانا بنوریؒ کا دوسرا عظیم صدقۂ جاریہ "جامعۃ العلوم الاسلامیہ" ہے جس کی ایک ایک اینٹ پر مولانا کے عزمِ مصمّم اور محنت ومشقّت کے نقوش اسی شان کے ساتھ ثبت ہیں جو نعیمؔ صدیقی صاحب کے ان اشعار میں سامنے آتی ہے ؎

ہیں بالاکوٹ کی مٹی کے ذرّے! ہماری آرزوؤں کے مزارات!
ہیں ہر ذرّے کی پیشانی پر منقوش ہمارے عـزم کے خونیں نشانات

اس جامعہ کا ماہانہ مجلّہ 'بیّنات' بھی مولاناؒ ہی کا صدقۂ جاریہ ہے، جس کے "بصائر وعبر" کے صفحات سالہا سال تک ان ہی کے رشحاتِ قلم سے مزیّن ہوتے رہے ــــ اور جس کی ادارت ان کی وفات کے بعد مولانا محمد یوسف لدھیانوی کے سپرد ہوئی جو مولاناؒ کو اپنا "شیخ اور مربّی" بھی قرار دیتے ہیں اور ان کے ساتھ ہم نامی کی اضافی نسبت بھی رکھتے ہیں۔

مولانا لدھیانوی کے قلم پر راقم الحروف کا تذکرہ پہلی بار آج سے پورے اٹھارہ برس قبل راقم کی تالیف 'تحریکِ جماعتِ اسلامی' پر تبصرے کے ضمن میں آیا تھا جو فروری ۱۹۶۷ء کے

بینات" میں شائع ہوا تھا اور جس کے کل چار میں سے تین صفحات مولانا نے جنوری ۸۵ء کے "بصائر و عبر" میں بطور اقتباس شائع کئے ہیں۔ ــــــ ان میں راقم کے بارے میں یہ الفاظ تو شامل ہیں کہ "ہماری رائے میں (جو اگر غلط ہو تو حق تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں) مصنف نے جماعت کی "بنائے فساد" کی تشخیص صحیح فرمائی ہے......" اور "......جس کی شکایت بڑے درد مند دل سے آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کرنا پڑی ہے" ــــــ لیکن نہ معلوم کیوں ان جملوں کے نقل سے مولانا نے احتراز فرمایا ہے کہ "تاہم ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا تو ایک ایک جملہ ان کے اخلاص اور خیر خواہی کی شہادت دیتا ہے!" ــــــ اور "ہم مصنف سلمہ کے قلم کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے پیچیدہ مسائل و مراحل میں بھی متانت، رزانت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا!"

تاہم یہ تو غیر اہم بات ہے۔ راقم کے نزدیک اس تبصرے میں شامل اہم ترامور یہ ہیں کہ:

(۱) ۱۹۴۱ء تک مولانا لدھیانوی مولانا مودودی مرحوم کی نیک نیتی کی کرامت کے قائل تھے اور

(۲) مولانا مودودی سے مولانا لدھیانوی کو اصل شکایت یہ تھی کہ انہوں نے "اپنے نظریات اور افکار کے گرد "انا اعلم" کا حصار کھینچ لیا!" ــــــ مولانا کی مکمل عبارت یوں ہے:

"اس لئے ہمیں اس پر قطعاً تعجب نہیں، کہ مولانا کی تحریک میں غلطیاں کیوں پیدا ہوتی گئیں۔ بلکہ حیرت اور تعجب اس بات پر ہے کہ اتنی کم غلطیاں ہی کیوں پیدا ہوئیں، اور وہ اپنے خود رو مطالعہ کے نتیجے میں، اہل حق سے نسبتاً قریب کیسے رہ گئے۔ دوسرے لوگ نہ معلوم اس کی کیا توجیہہ کریں، لیکن مجھے تو یہ مولانا کی نیک نیتی کی کرامت معلوم ہوتی ہے۔

اور عجلت پسندانہ بے اصولی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا، جبکہ مولانا نے اپنے نظریات و افکار کے گرد "انا اعلم" کا حصار کھینچ لیا، ان کی کسی غلطی پر جب کبھی تنبیہہ کی جاتی تو انہوں نے اس کی پرواہ کئے بغیر کہ یہ تنبیہہ کتنے بڑے فاضل، فقیہہ اور خداترس کی جانب سے کی گئی ہے۔ اسے "لائق توجہ نہیں" کہہ کر دل و دماغ کے تمام راستے بند کر لئے، ورنہ جب وہ غیر تربیت یافتہ ذہن کے باوصف اسلامی تحریک کی سربراہی کر رہے تھے، اگر اس دوران بھی وہ اہل صلاح و تقویٰ، اور اصحاب علم و فضل کی ہدایات پر کان دھرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جماعت بالآخر اس سطح پر آجاتی جس کی شکایت بڑے درد مند دل سے آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کرنا پڑی ہے۔"

(ماہنامہ "بینات" ـ شوال ۱۴۰۶ھ)

ہمیں مولانا لدھیانوی کی ان آراء سے کامل اتفاق ہے ـــــ بلکہ ہم انہیں اس وسعتِ قلب پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ـــــ لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو یہ عرض کرنے پر بھی مجبور پاتے ہیں کہ کاش! مولانا اسی وسعتِ قلب کا مظاہرہ اس خاکسار کے حق میں بھی کر سکتے جسے "انا اعلم" تو کجا "عالم" ہونے کا بھی دعویٰ نہیں، اور جو علماءِ کرام کی خدمت میں حاضری اور ان سے استفادے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے ـــــ بہرحال اس موضوع پر کسی قدر گفتگو آگے ہوگی!

مولانا لدھیانوی کے قلم پر راقم کا دوسری بار ذکر آج سے تین سال قبل خواتین کے مسئلے پر راقم کے ایک اخباری انٹرویو پر مغرب زدہ خواتین کے احتجاجی جلوس پر تبصرے کے ضمن میں آیا تھا ـــــ اور اس میں الحمدللہ کہ ملک بھر کے تمام دینی جرائد کے ساتھ ساتھ مولانا لدھیانوی نے بھی راقم کے موقف کی پوری تائید و تحسین فرمائی تھی اور ایک نہایت عمدہ تحریر "اسلام میں عورت کے مقام اور مرتبہ" کے موضوع پر سپردِ قلم کی تھی۔ (مولانا تقی عثمانی صاحب کا اداریہ بھی اسی موضوع پر بہت زوردار تھا اور انہوں نے بھی راقم کی قرآنی حقائق کی تعبیر کی توثیق و تحسین فراخدلانہ انداز میں فرمائی تھی)۔

اس کے بعد نہ معلوم کیوں مولانا لدھیانوی کے قلم نے راقم کے خلاف مخالفانہ انداز اختیار فرمالیا۔ یہ معاملہ اگر اس طرح ہوتا کہ مولانا نے راقم کی علمی و فکری لغزشوں پر پے بہ پے ٹوکا ہوتا، اور اس کی اختیار کردہ دینی تعبیرات کی غلطیوں پر تنبیہہ کی ہوتی جس پر راقم نے مسلسل ضد اور ہٹ دھرمی کی روش اختیار کی ہوتی اور اس کے نتیجے میں مولانا کے طرزِ عمل میں وہ تبدیلی رونما ہوتی تو ہمیں شکایت کا کوئی حق نہ ہوتا ـــــ لیکن صورتِ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ آج تک مولانا نے راقم کی کسی علمی یا فکری غلطی کی نشاندہی نہیں فرمائی (صرف ایک بار مجلس احرار اسلام اور ۵۳ء کی ختم نبوت کی تحریک کے بارے میں راقم کے بعض غیر محتاط الفاظ پر گرفت فرمائی تھی جس کی پوری وضاحت راقم نے تحریراً بھی کر دی تھی اور حاضرِ خدمت ہوکر بالمشافہ بھی کر دی تھی جس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار فرما دیا تھا!) لیکن جنوری اور فروری ۸۵ء کے شماروں میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" کے پیشِ نظر راقم کو جو مشورہ دیا

اس کا حاصل یہ بنتا ہے کہ راقم اپنی جملہ سرگرمیوں اور دینی خدمات کی بساط لپیٹ کر رکھ دیے
ہم مولانا کے اس مشورہ کو بھی ان کے خلوص و اخلاص ہی پر محمول کر کے سکوت اختیار کرتے
اگر انہوں نے بعض صریح زیادتیاں اپنی اس تحریر میں نہ کی ہوتیں ۔

ان میں سب سے بڑی زیادتی تو یہ ہے کہ مولانا نے راقم کے کتابچے "راہِ نجات: سورۃ والعصر کی روشنی میں" پر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا تنقیدی (تنبیہی) تبصرہ تو پورے کا پورا نقل کر دیا ہے لیکن اس پر جو وضاحت راقم نے 'میثاق' میں شائع کی تھی (جو اوپر درج کی جا چکی ہے) اس کا تذکرہ تک نہیں کیا! ——— اس ضمن میں یہ بات تو ہرگز قرینِ قیاس نہیں ہے کہ اُس وقت بھی راقم کی وضاحت مولانا لدھیانوی ایسے بیدار و ہوشیار اور محنتی شخص کی نظر سے نہ گذری ہو ——— البتہ یہ عین ممکن ہے، اور ہم یہی حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ کہ اِس وقت وہ ان کی یادداشت میں محفوظ نہ رہی ہو اگرچہ یہ بات بھی ان کے منصب کے شایانِ شان نہیں، گویا معاملہ وہی ہے کہ

ان کنت لا تعلم فھٰذا مصیبۃٌ
وان کنت تعلم فالمصیبۃُ اعظمُ

بہرحال اب جبکہ حضرت مولانا بنوری کا رقم کردہ وہ شذرہ 'بیّنات' ایسے وقیع مجلے میں دوبارہ شائع ہو گیا ہے تو اپنی سابقہ وضاحت پر مستزاد عرض ہے کہ:

۱ - اس معاملہ کا تعلق اصلاً تو اس حقیقت سے ہے کہ فقہ و قانون اور قضاء و افتاء کی زبان اور دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت اور اخلاقی تلقین کے لئے ترغیب و ترہیب کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور اصلاً اسی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ مخالفین نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بعض عبارتوں پر طوفان کھڑے کر دیئے جس کا تلخ ترین تجربہ پورے حلقۂ دیوبند کو ہے ——— بلکہ اگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو خود قرآن حکیم اور فرمودات نبی کریمؐ پر 'تضاد' کا الزام عائد ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن اخلاقی و روحانی سطح پر عفو و درگذر کی تلقین کرتا ہے لیکن قانونی و دنیوی نظام کی مصلحتوں کے پیشِ نظر قصاص کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر تلقین کرتا ہے کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اللہ کی راہ میں دے دو ——— !

(یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ) اور دوسری طرف وراثت کا تفصیلی قانون بھی بیان کرتا ہے اور زکوٰۃ کی تعیین بھی کرتا ہے جس کے نصاب اور مقادیر کا معاملہ سنّتِ رسولؐ نے معیّن فرما دیا ہے! (معلوم ہے کہ اسی اخلاقی اور قانونی تعلیمات میں فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ اشتراکی اس آیۂ مبارکہ کو اپنی تائید کے لئے استعمال کرتے ہیں!)

۲۔ ثانیاً اس کا تعلق 'ایمان' کی تعریف سے ہے جس میں امّت کی دو عظیم ترین ہستیاں بظاہر متضاد موقف رکھتی ہیں۔ چنانچہ فقیہہ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا مشہور موقف یہ ہے کہ "الایمانُ قولٌ لَا یَزِیۡدُ وَلَا یَنۡقُصُ!" جبکہ محدّثِ اعظم امام بخاریؒ کا قول ہے کہ "الایمان قولٌ وَعملٌ ویزید وینقص!" ـــــــ ان بظاہر متضاد اقوال کے مابین تطبیق کی حسین ترین صورت یہ ہے کہ پہلی تعبیر اس فقہی اور قانونی ایمان کی ہے جو اس دنیا میں معتبر ہے اور جس کی بنا پر کسی شخص کے مسلم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے جبکہ دوسری تعبیر اس حقیقی ایمان کی ہے جو آخرت میں معتبر ہوگا ـــــــ اور دونوں ہی تعبیریں اپنی اپنی جگہ صد فی صد درست ہیں! ـــــــ چنانچہ اس حقیقت کو پیشِ نظر نہ رکھنے کے باعث خطرناک ٹھوکریں کھائیں ایک جانب خوارج، معتزلہ اور اہلِ تفلیح نے اور دوسری جانب 'مُرجئہ' نے!

اور یہی حقیقت ہے جس سے وہ ظاہری تضاد رفع ہوتا ہے جو ایمان کے مسئلے میں قرآنِ حکیم کی بعض آیات میں سامنے آتا ہے مثلاً سورۂ نساء (آیت نمبر ۹۴) میں ارشاد ہوتا ہے کہ "جب تم جہاد کے لئے نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو شخص تم پر سلام (سلامتی یا اسلام) پیش کرے اس سے یہ مت کہا کرو کہ تم مومن نہیں ہو!" اور سورۂ حجرات (آیت نمبر ۱۴) میں بعض بدوؤں کے دعوئے ایمان کو رد کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے "تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں یا ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے)" یہاں ظاہر ہے کہ پہلی آیت میں لفظ 'مومن' قانونی اور شرعی و فقہی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس کے لئے دوسری آیت میں 'اسلام' کی اصطلاح اختیار فرمائی گئی ہے اور "ایمان" کا لفظ حقیقت اور قلبی ایمان کے لئے مختص کر دیا گیا ہے (یہی وجہ ہے کہ اسی آیت میں مزید وضاحت فرمائی گئی ان الفاظ میں کہ "ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا!") اسی بات کو آنحضورؐ نے حدیثِ معاذ ابن جبلؓ میں اس طرح واضح فرمایا کہ کلمۂ شہادت، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے ذکر کے بعد فرمایا کہ "فَاِذَا فَعَلُوۡا ذَالِکَ فَقَدۡ

أَمْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ!"
یعنی جب وہ یہ تین شرطیں پوری کر دیں تو ان کی جانیں اور مال محفوظ ہو جائیں گے (یعنی ان کا اسلام قبول کر لیا جائے گا) باقی رہا نیتوں کا معاملہ تو اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے (یعنی یہ معاملہ دنیا میں زیرِ بحث نہیں آئے گا اور اس کی بنیاد پر کوئی قانونی فیصلے یا اقدامات نہیں ہوں گے)

اس بنیادی حقیقت کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے تو اگرچہ بہت سی احادیث میں 'ایمان' اور 'اسلام' کو جداگانہ حقیقتوں کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے تاہم انسان بہت سی احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں بھی تضاد کے سوءِ ظن میں مبتلا ہو سکتا ہے، مثلاً ایک جانب 'ترہیب' اور تنبیہ و تہدید کے انداز میں فرمایا جاتا ہے کہ "خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں!" پوچھا گیا کون! تو ارشاد فرمایا "جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی چین میں نہ ہو!" —— اور دوسری جانب 'ترغیب' اور دلدہی اور حوصلہ افزائی کے انداز میں فرمایا جاتا ہے کہ "اگر تمہیں کوئی اچھا کام کر کے خوشی ہو اور برا کام کر کے افسوس ہو تو تم مومن ہو!"

بہر حال جیسے کہ پہلے نقل ہو چکا ہے راقم کا موقف یہ ہے کہ:

> میں اس دنیا میں کسی کے دعویٔ اسلام و ایمان کی قبولیت کا دار و مدار صرف اس کے قول کو قرار دیتا ہوں۔ عمل کی بنیاد پر کسی کے دعویٔ اسلام و ایمان کو رد کر دینا درست نہیں سمجھتا، چنانچہ میرے نزدیک گناہِ کبیرہ کے مرتکب کی بھی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ تکفیر کی صرف ایک صورت درست ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اسلام کی کسی بنیادی بات (جیسے مثلاً ختمِ نبوت) کا انکار کر دے یا اس کی ایسی تعبیر کرے جو انکار کو مستلزم ہو! —— رہا آخرت کا معاملہ تو وہ اللہ کے حوالے ہے وہ 'عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ' ہے۔ چنانچہ اپنے علم کامل کی اساس پر فیصلہ کرے گا۔ البتہ اصولاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں صرف وہی ایمان معتبر ہو گا جو کسی نہ کسی درجے میں "تصدیق بالقلب" یعنی دلی یقین کے ساتھ ہو اور اس مرتبہ پر اعمال صالحہ بھی ایمان کے ذیل ہی میں آ جاتے ہیں!!

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، راقم کو یقین ہے کہ اگر وہ یہ وضاحتیں مولانا بنوریؒ کی خدمت میں پیش کر تا تو وہ یقیناً قبول فرما لیتے —— بلکہ راقم اپنا یہ کتابچہ بھی ان کی خدمت میں پیش

کر دیتا کہ اس میں جہاں جہاں کسی لفظی بے احتیاطی کے باعث کوئی مخالف مفہوم متبادر ہوتا ہو تو اصلاح فرما دیجئے! ـــــ اور راقم کو یقین ہے کہ مولانا کی اصلاح سے میرا مفہوم زیادہ نکھرتا! (جس کی مثال "قرآن مجید کے حقوق" نامی کتابچے کے ضمن میں پہلے گذر چکی ہے) ـــــ بہرحال اب بھی اگر مولانا لدھیانوی اس کتابچے کے بالاستیعاب مطالعہ کی تکلیف گوارا فرما کر ایسے مقامات کی نشاندھی فرمائیں تو وہ ان شاء اللہ راقم کو کسی ضد میں مبتلا نہ پائیں گے۔

سورۃ العصر کے بارے میں راقم نے جو یہ لکھا کہ "یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں بلکہ صرف آخری درجے میں پاس ہونے کی شرح کا بیان ہو رہا ہے" تو اس میں صرف اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب کی جانب اشارہ ہے کہ اس میں اصل زور ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" پر جس سے نجات کا ذکر ایک استثناء کے طور پر ہے، بمقابلہ سورۃ التّین کے کہ اس میں اصل زور ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" پر اور ثانیاً آخر میں ذکر صرف نجات کا نہیں بلکہ مثبت طور پر "فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ" کی نوید جانفزا ہے۔ گویا سورۃ العصر پر رنگ غالب ہے "انذار" کا اور سورۃ التین پر رنگ غالب ہے "تبشیر" کا (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو 'راہِ نجات' کے نسخۂ کلاں کے صفحات ۸ تا ۱۰) ـــــ اسی طرح ہر شخص جانتا ہے کہ کسی شے کا اپنی جگہ حقیر یا وقیع ہونا اور ہے اور کسی دوسری چیز کے مقابلے میں کم تر یا برتر ہونا اور! ـــــ چنانچہ لاکھ اپنی جگہ بہت ہے لیکن کروڑ کے مقابلے میں بہت کم! ـــــ اسی طرح محض جہنّم سے چھٹکارا پا جانا بھی اگرچہ اپنی جگہ بہت بڑی کامیابی ہے لیکن جنّت کے اعلیٰ مقامات کے مقابلے میں تو خود اس کے ادنیٰ درجات بھی کم تر ہوں گے (جس کی نسبت و تناسب کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے حضورؐ کے ان الفاظِ مبارکہ سے کہ: ایک کم تر درجہ کا جنّتی اپنے سے اوپر والے درجہ کے جنّتی کو اس طرح دیکھے گا جیسے تم زمین پر بیٹھ کر آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہو۔ (او کما قال صلّی اللہ علیہ وسلّم) کجا محض جہنّم سے چھٹکارا پا جانا!! ـــــ یہ تقریر چونکہ راقم نے ایچی سن کالج کے طلبہ کے سامنے کی تھی لہٰذا اس میں ان کے ذہن کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ایک طالب علم کے نزدیک محض تھرڈ ڈویژن میں پاس ہو جانا بھی کتنی بڑی کامیابی ہے یہ اس سے پوچھئے جو فیل ہو گیا ہو!

رہی یہ بات کہ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ـــــ کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسلام کی کوئی

بات باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آئی ہو !" تو یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو خود راقم نے "نجات کی راہ" کے نسخۂ کلاں کے صفحات ۲۸ تا ۳۱ تک لکھی ہے جس کے دو مختصر حصّے درج ذیل ہیں :

"واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم صلاح و فلاح کے جس راستے کی جانب رہنمائی کرتا ہے یہ چار چیزیں (یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر) اس کے لئے بمنزلہ اساس کے ہیں۔ ...... پھر جس طرح ایمان کے ابتدائی مراحل سے لے کر صدّیقیت کے مقام تک بے شمار مدارج ہیں (اسی طرح) عمل صالح موٹے موٹے اعمال سے شروع ہو کر ایک گھنے اور پاٹ دار درخت کی طرح انسانی زندگی کے جملہ اطراف حتّٰی کہ اس کے بعید ترین گوشوں Remote Corners تک پر محیط ہو جاتا ہے۔"

" لیکن اگر کسی انسان کی شخصیت کو کوئی اخلاقی یا رُوحانی بیماری گھُن کی طرح کھا چکی ہو تو لازم ہے کہ ایمان کا تخم جب اس کی کشتِ قلب میں جم کر پھوٹے تو اس سے عملِ صالح اور تواصی بالحق کی متناسب اور متوازن شاخیں نمودار ہوں۔"

مولانا لدھیانوی کی دوسری زیادتی ان کا استہزائیہ انداز ہے۔ جو کسی اخبار کے فکاہی کالموں یا ادبی جرائد کے مزاج سے تو مناسبت رکھ سکتا ہے، دینی جرائد اور ان کے بھی ادارتی صفحات کے شایانِ شان ہرگز نہیں ع۔ ایں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را" چنانچہ انہوں نے اپنی طویل تحریر کا اختتام توان الفاظ سے کیا ہے کہ "آخر میں یہ گذارش کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محض خیر خواہی کے جذبہ سے لکھا ہے، ڈاکٹر صاحب کی شان کے خلاف کوئی بات نکل گئی تو اس پر پیشگی (؟) معذرت کا طالب ہوں" —— لیکن خود اس جملے میں "شان" کے لفظ کی استہزائی شان سے قطع نظر پوری تحریر میں جابجا طعن و طنز کا انداز موجود ہے —— مثلاً :

۱۔ " انہوں نے "تنظیم اسلامی" کے نام سے اپنے مدّاحوں کی ایک جماعت بنا رکھی ہے۔"

۲۔ " موصوف کو شکایت ہے کہ علماءِ کرام نہ صرف یہ کہ ان کے مبارک سلسلہ سے تعاون نہیں کرتے ہیں بلکہ ......"

۳۔ جبکہ ٹیلیویژن پر ان کے "الہدیٰ" کا غلغلہ بلند ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں پڑھے لکھے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کو سعادت سمجھ رہے ہیں"۔

۴۔ ڈاکٹر صاحب تو اپنی فتوحات پر نازاں ہیں اور........"

۵۔ "اس جہاد کے لئے انہوں نے 'تنظیم اسلامی' تشکیل دیکر 'سفرِ قیادت' کا آغاز کردیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ چشم بد دور انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح 'سلسلۂ بیعت' بھی جاری فرمادیا ہے (جسے 'سلسلۂ عالیہ احمدیہ' کے مقابلے میں 'سلسلۂ عالیہ اسراریہ' کہنا موزوں ہوگا" (اس پر حاشیہ میں ایک وضاحتی نوٹ ہے: "تشبیہہ نفسِ بیعت میں ہے گو نوعیت کا اختلاف ہو")

اس ضمن میں راقم نہایت ادب کے ساتھ مندرجہ ذیل گذارشات کی اجازت چاہتا ہے:

۱۔ یہ اندازِ نگارش خواہ اپنی جگہ ادبیت کا شاہکار قرار پائے دینی جرائد خصوصاً "بینات" اور اس کے بھی 'ادارتی صفحات' کے شایانِ شان نہیں ہے!

۲۔ سورۂ حجرات کی آیت ۱۱ میں انہی امور سے منع فرمایا گیا ہے ___ یعنی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

اے ایمان والو! نہ مذاق اڑائیں تم میں سے کچھ لوگ دوسرے لوگوں کا، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ بعض عورتیں دوسری عورتوں کا، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ ___ اور نہ عیب چینی کرو ایک دوسرے کی، اور نہ بُرے نام رکھو ایک دوسرے کے۔ ایمان کے بعد بُرا نام بھی بہت بُرا ہے۔ اور جو لوگ باز نہ آئیں تو (اللہ کے نزدیک) وہی ظالم ہیں۔

۳۔ زبان اور قلم راقم کے پاس بھی ہیں، اور خواہ یہ مولانا لدھیانوی کی زبان و قلم کے

مقابلے میں نہایت حقیر اور بے بضاعت ہوں تاہم کسی نہ کسی درجہ میں ترکی بہ ترکی جواب دیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اس سے نفس کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے ـــــ پھر ماہانہ جرائد بھی راقم کے پاس ایک چھوڑ دو دو ہیں، اور خواہ ڈائجسٹوں کے مقابلے میں ان کا حلقۂ اشاعت بہت محدود ہو، دینی جرائد کے اعتبار سے ہرگز کم نہیں ہے ـــــ لیکن ایک خاص سبب سے راقم یہ صورت اختیار نہیں کرسکتا ـــــ گویا بقول شاعر ؎

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کہ نہیں آتی !"

۴۔ اور وہ 'خاص سبب' یہ ہے کہ راقم کی حیثیت اس وقت 'سائل' کی ہے۔ اس نے جس دینی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے وہ آیۂ مبارکہ " وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ " (العنکبوت : ۶) کے مطابق سراسر اپنے ہی 'بھلے' اور اپنے ہی 'فائدے' کے لئے اٹھایا ہے، اس میں جب وہ تعاون کا طلب گار ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بھی " مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج !! " کے مصداق ایک طرح کا 'سوال' ہی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ راقم ابھی تو صرف حلقۂ دیوبند، خصوصاً متوسلین شیخ الہندؒ ہی کے در پر سوالی بن کر حاضر ہوا ہے کہ بزرگ اس کی سرپرستی فرمائیں اور جوان اس کا ساتھ دیں۔ ـــــ راقم کا ارادہ ہے کہ وقت آنے پر، اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے واثق امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ دن ضرور آئے گا جب وہ آگے بڑھ کر دوسرے مسلکوں کے علمائے کرام کی خدمت میں بھی سوالی بن کر حاضر ہوگا ـــــ اس لئے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے زمانے میں جمعیت علماء ہند، جملہ مسالک کے علماء کا مشترک پلیٹ فارم تھی اور جس طرح آنحضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر " نَسِیۡئ " کا رواج منسوخ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ " اِسۡتَدَارَ الزَّمَانُ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ " راقم کے نزدیک قدرتِ خداوندی سے یہ ہرگز بعید نہیں کہ برصغیر پاک وہند میں بھی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کی فضا پھر لوٹ آئے ـــــ اس ضمن میں مولانا لدھیانوی نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کا ایک سبق آموز واقعہ سنایا تھا کہ مولانا محمد علی جالندھریؒ جب بریلوی مکتبِ فکر کے علماء کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے مولانا سید ابوالحسنات قادریؒ کے ہاں تشریف

انہوں نے سخت غیظ و غضب کے عالم میں گفتگو تک سے انکار کردیا تو مولانا جالندھریؒ نے اٹھتے اٹھتے یہ جملہ کہا: "حضرت ہم اپنے کسی کام کے لئے حاضر نہیں ہوئے تھے، آپ ہی کے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ناموس کی حفاظت کے ضمن میں تعاون درکار تھا!" تو مولانا قادریؒ کا رنگ ایک دم تبدیل ہوگیا اور انہوں نے پوری توجہ سے بات سنی اور تحریک میں شمولیت اختیار کرلی۔

تو راقم بھی بحمد اللہ اپنی کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لئے کھڑا ہوا ہے اور اس کے ضمن میں وہ اگر سرپرستی اور تعاون کا سوال کر رہا ہے تو اس کی حیثیت بھی ایک 'سائل' کی ہے۔ لہٰذا مولانا لدھیانوی ایسے حضرات کو اگر ابھی کچھ شکوک و شبہات ہیں تو بیشک سوالی کو خالی ہاتھ لوٹا دیں لیکن کم از کم "قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ" ــــ "وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ" اور "فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا" کی قرآنی ہدایات کو تو پیشِ نظر رکھیں!

اس گلہ اور شکوہ سے قطع نظر ــــ مولانا لدھیانوی نے "قرآن حکیم کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات" پر تبصرہ کے ضمن میں راقم کی تشخیص کو "سطحی" قرار دیتے ہوئے جو اصل تشخیص خود کی ہے وہ مختصر الفاظ میں تو یہ ہے کہ:

"ان تحریکات کے قائد و بانی علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے، جو کسی دینی تحریک کے قائد و بانی کے لئے ناگزیر ہے۔"

اور مزید شرح ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ:

"پس جو شخص کہ علمی رسوخ میں لائق اعتماد نہ ہو، جس کا عملی معیار مستند نہ ہو، جس نے اہل قلوب اور اربابِ باطن کی صحبت میں رہ کر اپنے اخلاق کا تزکیہ اور اپنی باطنی کیفیات کی تصحیح نہ کی ہو۔ اس کے بارے میں کیسے باور کرلیا جائے کہ وہ کسی دینی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے نیابتِ نبوت کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرسکے گا، اور وہ کسی افراط و تفریط خود رائی و کجروی کا شکار نہیں ہوگا ــــ ایک ایسا شخص جس نے علوم نبوت کو کسی ماہر سے نہیں سیکھا، جس نے کسی مردِ کامل کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ باطن نہیں کرایا، جس نے لائق اعتماد مشائخ سے

حکمتِ دین کا درس نہیں لیا' جس نے کتاب و سنّت کے اسرار و حقائق کو کسی جاننے والے سے نہیں سمجھا' جس نے اپنے علم و عمل' عقائد و نظریات اور سیرت و اخلاق کو اسوۂ نبویؐ میں ڈھالنے کی محنت و ریاضت نہیں کی' اور جس کا فہمِ دین جنگل کی خود رَو گھاس ہے' وہ دینی قیادت کا منصب سنبھالتا ہے ...."

بنا بریں ان کی 'تجویز' یہ ہے کہ :

" میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ ان سے عرض کیا جائے کہ آپ ایک نئی جماعت بنا کر اور بیعت کی نئی طرح ڈال کر امّت کو کسی نئی آزمائش میں مبتلا نہ کریں۔ یہ امّت نئی نئی اصطلاحات اور دین کے نام پر وجود میں آنے والی نئی نئی تنظیموں کے چرکوں سے پہلے ہی چُور چُور ہے۔ خدارا اس پر رحم کیا جائے اس کو کسی نئی تنظیم نئی بیعت اور نئی اصطلاحات کی آزمائش سے معاف رکھا جائے۔"

گویا ان کا راقم کو مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ راقم اس پورے کام کی بساط لپیٹ کر رکھ دے جس کے لئے اس نے عمرِ عزیز کے پورے بیس سال تو اس کیفیت کے ساتھ کھپائے ہیں کہ ؎

والپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا　　　تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی

خیریّتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں　　　سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اس سے پہلے بھی کم و بیش پندرہ سال اسی کیفیت میں گذرے تھے کہ 'دعوت و تحریکِ اسلامی' ہی اس کی زندگی میں اہم ترین اور مقدم ترین شئے تھی!!

راقم خدا کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ اسے مولانا لدھیانوی کے خلوص و اخلاص پر ہرگز کوئی شُبہ نہیں ہے۔ اسی طرح اسے مولانا تقی عثمانی صاحب کے متذکرۃ الصدر فتوٰی کے بھی مبنی بر اخلاص ہونے میں کوئی شک نہیں' ـــــ اور راقم کے علم میں ہے کہ دوسرے بہت سے مخلص علماء کرام کو بھی راقم سے اسی بنا پر اندیشے اور خدشے لاحق ہیں (چنانچہ کراچی کے مولانا عبدالبرّ سکھر گاہی صاحب بھی راقم کے پاس ان ہی دلائل پر مشتمل طویل خط کے ساتھ تشریف لائے تھے!) ـــــ یہی وجہ ہے کہ راقم اس مسئلہ پر کھل کر بات کرنی چاہتا ہے!

اس دلیل کا لبِّ لباب یہ ہے کہ خدمتِ دین کا بیڑا اٹھانے والوں کو دو شرطوں پر پورا اترنا چاہئے : ایک یہ کہ وہ باضابطہ اور مستند عالمِ دین ہوں' اور دوسرے یہ کہ متقی اور مزکّٰی ہوں! ـــــ ان میں سے دوسری چیز تو کسی ناپ تول میں آنے والی نہیں ہے اور اس

کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا، لہٰذا آخری تجزیے میں شرطِ واحد یہ رہ جاتی ہے کہ علمِ دین کا حصول مروّجہ معیارات کے مطابق کیا ہو ـــــ اور مسلّمۃ المقام علماء سے سندِ فراغت حاصل کی ہو!

اس پر سب سے پہلی گذارش تو راقم کی یہ ہے کہ کسی ایک ہی ایسے بڑے فتنے کا نام بتا دیا جائے جس کا آغاز کرنے والے مستند عالمِ دین اور مسلّم حیثیت کے مالک علماء کرام کے فیض یافتہ نہ ہوں۔ چنانچہ کیا مسلم انڈیا کی تاریخ کے سب سے بڑے فتنے یعنی 'دینِ الٰہی' کے مصنّف ابوالفضل اور فیضی مسلّم عالمِ دین نہ تھے؟ اسی طرح عہدِ حاضر کے عظیم فتنوں کے بانیوں میں سے کیا سرسید احمد خان مرحوم وقت کے اعلیٰ ترین معیارات کے مطابق عالمِ دین ـــــ اور بہترین علماء کے فیض یافتہ نہ تھے؟ کیا حکیم نورالدین بھیروی نے وقت کے چوٹی کے علماء سے کسبِ علم نہیں کیا تھا (اور واضح رہے کہ غلام احمد قادیانی کی گمراہی میں اصل دخل اسی شخص کو حاصل تھا!) کیا مولوی عبداللہ چکڑالوی اور علّامہ اسلم جیراج پوری علماء میں سے نہ تھے؟ (غلام احمد پرویز کا ذکر چھوڑ دیجئے کہ وہ ان ہی اصحابِ ثلٰثہ یعنی سرسید، علّامہ جیراجپوری اور مولوی چکڑالوی کا خوشہ چین ہے، خود کچھ نہیں!) مزید قریب آکر دیکھئے! کیا مولانا امین احسن اصلاحی مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے سند یافتہ فارغ التحصیل اور پھر علّامہ فراہیؒ ایسے محققِ قرآن اور محدّث مبارکپوریؒ ایسے عالم و شارحِ حدیثِ نبویؐ کے فیض یافتہ نہیں ہیں؟ ـــــ اس سے بھی زیادہ قریب کی مثال درکار ہو تو کیا ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی باضابطہ سند یافتہ "فاضلِ علومِ دینیہ" اور خود حضرت مولانا بنوریؒ کے فیض یافتہ نہیں ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا دارومدار 'علم' پر نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے۔ ایک انسان کی اپنی نیت و ارادہ اور دوسرے اللہ کی توفیق و تیسیر!! ـــــ اگر انسان کے اپنے دل میں کجی اور نیّت میں فتور ہو اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی سنّت کے مطابق کہ " فَلَمَّا زَاغُوٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ " اس سے توفیقِ خیر سلب فرمالے تو ایسا انسان جتنا بڑا عالم و فاضل ہوگا اتنا ہی بڑا فتنہ اٹھائے گا ـــــ بلکہ بڑے بڑے فتنے تو بڑے علماء و فضلاء ہی اٹھا سکتے ہیں غریب عامی و اُمّی انسان فتنہ اٹھانا چاہے گا بھی تو کوئی بڑا فتنہ کیسے اٹھائے گا۔
یہی بات علماء کرام مولانا رومؒ کے اسی شعر کے حوالے سے بیان کیا کرتے ہیں کہ ؎

علم را بر دل زنی یارے بود   علم را بر تن زنی مارے بود!!

دریہی بات آنحضورؐ کے اس قول میں وارد ہوئی ہے کہ "ایک زمانہ آئے گا کہ مسلمانوں کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی، آسمان تلے کی بدترین مخلوق (نام نہاد) علماء ہوں گے، فتنے ان ہی کے اندر سے اٹھیں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے!" (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

اس ضمن میں ۵۱-۱۹۵۰ء کا ایک واقعہ یاد آیا۔ راقم اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن اور میڈیکل کا طالب علم تھا۔ برادرم خرم جاہ مراد نے جو اس وقت جماعت اسلامی کے صف دوم کے رہنماؤں میں بہت نمایاں ہیں راقم سے ایک 'آٹوگراف' کی فرمائش کی تو راقم نے یہ الفاظ لکھے:

"کبھی کبھی میرا دل ان لوگوں کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے جو کبھی تحریکِ اسلامی کی اولین صفوں میں تھے لیکن اب اسی نسبت سے دور جا چکے ہیں——— میں خود 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' کے بعد 'رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ' کا سہارا لیا کرتا ہوں——— اور اسی کا مشورہ اپنے عزیزترین دوستوں کو دیا کرتا ہوں۔"

یہ آج سے ثلث صدی قبل کی بات ہے ——— راقم کو یقین ہے کہ یہ انہی مبارک دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ راقم نے چوبیس برس کی عمر میں مولانا مودودی مرحوم ایسی عظیم شخصیت سے صرف اختلاف ہی نہیں کیا، ماچھی گوٹھ کے عظیم اجتماع میں ان کے رُو در رُو اپنی دانست کے مطابق 'احقاقِ حق' اور 'ابطالِ باطل' کی سعی کی۔ اور وہ کتاب تالیف کی جس پر خراجِ تحسین خود مولانا لدھیانوی نے ادا فرمایا تھا اور جس پر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا تھا:

"میں نے آپ کی کتاب آتے ہی پڑھ ڈالی ——— میرے لئے سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس شخص کے ذہن وفکر پر کوئی دوسرے اثرات نہیں تھے جس کا تمام دینی شعور جماعتِ اسلامی ہی کی گود میں پلا بڑھا اور تمام تربیت اسی کے سانچے میں ہوئی اس کا ذہن اس قابل ہوا کیسے کہ جماعت کی پالیسی سے اتنی جلدی بے اطمینانی محسوس کرنے لگے! میرے خیال میں شاید اس کی دوسری مثال جماعت میں موجود نہیں ہے......"

(طبع شدہ 'میثاق' و شمولہ کتاب 'سرافگندیم' صفحہ ۱۳۲)

پھر یقیناً یہ بھی ان ہی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ ابتداء میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے حد درجہ متأثر بلکہ مرعوب ہونے کے باوجود، اور ان کے ساتھ طویل ترین اور قریب ترین تعلقات کے باوصف راقم نے اوّلاً تصوّف کے ضمن میں ان کی رائے سے اختلاف کیا، اور ان کی برہمی کے باوجود عین اس دور میں جبکہ 'میثاق' ان کے "زیرِ سرپرستی" شائع ہوتا تھا تصوّف کی حمایت میں مضامین شائع کئے ____ اور بالآخر رجم کے مسئلے پر ان کے ساتھ آخری تعلق کا تسمہ بھی توڑ ڈالا۔ (اس 'وصل و فصل' کی پوری داستان راقم 'میثاق' دسمبر ۶۷ء میں شائع کر چکا ہے)

الغرض، مولانا لدھیانوی اور جملہ علمائے حقانی کے کرنے کا 'اصل کام' یہ ہے کہ خود انہیں اللہ تعالیٰ نے جو خیرِ کثیر عطا فرمایا ہے اس پر اس کا شکر بجا لائیں اور راقم کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اسے شیطان اور نفس کے فتنوں سے اپنی حفاظت میں رکھے ____ اور اگر اپنے وقت اور صلاحیت کا ایک حصہ اس کام کے لئے بھی وقف کر دیں کہ مجھ پر، میری سرگرمیوں پر، اور میری تحریروں پر نظر رکھیں اور جہاں کجی نظر آئے تعیّن کے ساتھ متنبّہ فرما دیں تو اسے تو راقم ان کا اپنے اوپر ذاتی احسان سمجھے گا! (چنانچہ یہی فلسفہ ہے تنظیم اسلامی کے 'حلقۂ مستشارین' کا جس میں شمولیت کی دعوت راقم نے حضرت مولانا بنوریؒ کو دی تھی لیکن انہوں نے کچھ اپنی مصروفیات اور کچھ مولانا اصلاحی سے راقم کے قرب کے باعث قبول نہ کی تھی!)

اس ضمن میں ایک واقعہ اور یاد آیا۔ چند سال قبل کی بات ہے کہ مشفق مکرّم سردار اجمل خان لغاری (رحیم آباد، ضلع رحیم یار خاں) کی موجودگی میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی مدظلہ، نے راقم کے بارے میں کچھ تنقیدی کلمات ارشاد فرمائے جس پر لغاری صاحب نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ کی اس سے کبھی ملاقات ہوئی؟ یا کیا آپ نے کبھی اس کی تقریر سنی؟ یا کیا آپ نے کبھی اس کی کوئی تحریر پڑھی؟ ____ اور جب تینوں سوالوں کا جواب نفی میں ملا تو انہوں نے بااصرار عرض کیا کہ میرے ساتھ ابھی لاہور چلئے، میں اس سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں! جس پر حضرت مفتی صاحب نے حامی بھر لی ____ چنانچہ یہ حضرات لاہور تشریف لے آئے، اور گلبرگ میں لغاری صاحب کے بھانجے کے مکان پر مقیم ہوئے ____ لغاری صاحب نے فون پر راقم کو حکم دیا کہ فوراً آؤ چنانچہ راقم حاضر ہو گیا! ____ گفتگو کا آغاز ہوا تو بلکہ مفتی صاحب نے فرمایا: "ہم کسی ایسے شخص کو درسِ قرآن کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں

جس نے نہ باقاعدہ علم حاصل کیا نہ علمائے حقانی اور اہل اللہ کی صحبت اٹھائی؟" ـــ اس پر راقم نے قدرے توقف کے بعد عرض کیا "حضرت! اوّل تو یہ آپ کی اجازت پر منحصر نہیں ـــ دوسرے فرض کیجئے میں آپ کے حکم کی تعمیل میں درس بند کر دوں تو غلام احمد پرویز تو نہیں کرے گا! تو بتائیے کہ اس سے دین کا نفع ہوگا یا نقصان؟" ـــ الحمد للہ کہ راقم کی اس دلیل کو مفتی صاحب نے کھلے دل سے قبول فرما لیا اور صرف اس قدر اضافہ فرمایا کہ "لیکن یہ لازم ہے کہ علماء کے ساتھ ربط ضبط رکھا جائے!" جس پر میں نے عرض کیا کہ "میں نہ صرف یہ کہ اس کے لئے انتہائی دلی آمادگی اور رغبت کے ساتھ تیار ہوں بلکہ پہلے سے اس پر عمل پیرا ہوں"۔[۱]

امید ہے کہ مولانا لدھیانوی اور ان کی طرز پر سوچنے والے علماء کرام معاملہ زیر بحث کے اس پہلو پر بھی سنجیدگی سے غور فرمائیں گے!

جہاں تک 'تقلید' یا 'عدم تقلید' یا 'نیم تقلید' کی بحث کا تعلق ہے اس پر اصل مقدمہ تو مولانا عبد القیوم حقانی (اکوڑہ خٹک) اور مولانا محمد ازہر (مدیر 'الخیر' ملتان) نے قائم فرمایا تھا ـــ اور راقم اپنی امکانی حد تک اس کے ضمن میں اپنی وضاحت پیش کر چکا ہے، راقم مولانا لدھیانوی کا ممنون اور شکر گزار ہے انہوں نے میری ابتدائی تحریر ـــ اور بعد کی وضاحت دونوں کو پیشِ نظر رکھ کر میری وضاحت کو قبول فرماتے ہوئے یہ جملے تحریر فرمائے ہیں:

۱۔ "امید ہے کہ موصوف کی یہ توضیحات ان کے ناقدین کے لئے بڑی حد تک اطمینان اور تسلی کا موجب ہوں گی"۔[۲] (بیّنات' فروری ۸۵ء صفحہ ۷)

---

[۱] چنانچہ راقم اپنے اسی طرزِ عمل کے لئے استشہاداً پیش کرتا ہے 'قرآن کانفرنسوں' اور محاضراتِ قرآنی میں علماء کرام کی شرکت اور شمولیت کو ـــ اور خود ان کی خدمت میں حاضری کو ـــ جس پر مولانا لدھیانوی نے یہ معارضہ کر دیا کہ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ تم 'مستند' ہوگئے؟ اس پر اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ بقول "خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے!"

[۲] یاد ہوگا کہ بالکل اسی کے لگ بھگ الفاظ مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ نے تحریر فرمائے تھے کہ "ڈاکٹر صاحب نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماءِ حق کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے" اور "اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی مؤقف کی حوصلہ افزائی کی جائے!"

۲۔ "ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بھی بالکل بجا ہے کہ: "جنسِ اجتہاد یا نفسِ اجتہاد کے بقاء و تسلسل کا معاملہ میرے نزدیک ان مسائل میں سے ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں بالکل نئی صورتِ معاملہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں' ——— !"

البتہ اس معاملے میں جس حزم و احتیاط کی ضرورت ہے اس کے ضمن میں نہایت عمدہ باتیں مولانا نے ارشاد فرمائی ہیں جو اپنی جگہ سب صد فی صد درست ہیں لیکن راقم سے ہرگز متعلق نہیں اس لئے کہ وہ اپنے بارے میں اہلیتِ اجتہاد کا مدّعی ہی نہیں ہے!

اس ضمن میں مسالک اربعہ میں سے کسی کو 'اختیار' کرنے پر 'اجتہاد' کے لفظ کا اطلاق زیادتی ہے۔ اور مولانا لدھیانوی نے تو نہیں، البتہ مولانا محمد ازہر صاحب نے ستم بالائے ستم کا معاملہ اس طرح کیا ہے کہ اسی کو مبنیٰ اور مدار بنا کر ایک مکمل مضمون سپردِ قلم کر دیا ہے جو الخیر کے فروری کے شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں اجتہاد کی جملہ شرائط کو بالوضاحت بیان فرمایا ہے (ساتھ ہی راقم کو ایک ذاتی خط بھی تحریر فرمایا ہے جس کے لئے راقم ان کا ممنون ہے ——— راقم کا سوال ان سے صرف یہ ہے کہ آیا ائمہ اربعہ بھی ان کے معیارِ اجتہاد پر پورے اترتے تھے یا نہیں؟ اور اگر پورے اترتے ہیں تو ان کے فیصلے گویا اجتہاد کی جملہ شرائط کی چھلنیوں میں سے چھن کر آئے ہیں اور انہوں نے اجتہاد کے تمام کڑے امتحانات پاس کر لئے ہیں ——— اب ان میں سے کسی کے اختیار کرنے کے لئے ازسرِنو ان تمام شرائط کا پورا کرنا اور ان تمام امتحانات میں سے گذرنا کس دلیل سے لازم ٹھہرتا ہے؟

ایک دوسری زیادتی اس بحث کے ضمن میں مولانا لدھیانوی نے یہ کی ہے کہ راقم کو بالجزم 'اہلحدیث' قرار دے دیا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ راقم اگر سکہ بند 'حنفی' نہیں تو معروف اور متداول معنوں میں 'اہلحدیث' بھی ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ سکہ بند اہلحدیث راقم کو اہلحدیث تسلیم نہیں کرتے (ابھی حال ہی میں فاتحہ خلفِ امام ہی کے مسئلے میں راقم کے موقف پر نہایت جارحانہ تنقید اپنے ہفت روزہ پرچے کی کئی اشاعتوں میں مولانا عبدالقادر روپڑی صاحب نے کی ہے!) گویا راقم کا معاملہ وہی ہے کہ ؎

"زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا — اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں"

اس ضمن میں غالباً مولانا لدھیانوی کی توجہ 'میثاق' دسمبر ۸۴ء کے شمارے میں شائع شدہ مولانا سید حامد میاں مدظلہ کے ان الفاظ پر نہیں ہوئی کہ:

"ہاں البتہ اگر کوئی غیر مقلد ہو اور وہ ان ائمہ کو مقتدا مان کر بلا خواہش نفس مسئلہ کو راجح سمجھتے ہوئے ایسا کرنے لگے (یعنی راقم کے الفاظ میں 'نیم مقلد' بن جائے) تو شاید اس کے لئے مطلقاً غیر مقلد بنے رہنے سے بہتر ہو گا....."

مزارعت کے ضمن میں میری رائے پر جو اشکال مولانا لدھیانوی کو ہوا ہے وہ اسی پر تھوڑا سا مزید غور فرما لیتے تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ راقم سکہ بند اہلحدیث نہیں ہے! ـــــ اس مسئلے میں مزید زیادتی مولانا لدھیانوی نے یہ کی ہے کہ راقم کی رائے کو مولانا طاسین مدظلہ کے مقالے سے تأثر کا نتیجہ قرار دیا ہے ـــــ حالانکہ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ راقم مولانا کے مقالے کا حد درجہ مدّاح ہے' یہی وجہ ہے کہ اس نے اسے 'حکمتِ قرآن' کی پندرہ اشاعتوں میں قسط وار شائع کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ راقم کی رائے اس سے بہت پہلے کی ہے ـــــ اور مولانا کے مقالے سے اسے صرف مزید تقویت حاصل ہوئی ہے ـــــ پھر معلوم کیوں مولانا لدھیانوی نے اس کے ضمن میں صرف فقہ حنفی کے "مفتیٰ بہ" قول کا ذکر کیا اور امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ میں نے اپنی رائے کے لئے باضابطہ ان کا حوالہ دیا تھا! ـــــ یہاں یہ تذکرہ بھی ہو جائے تو نامناسب نہ ہو گا کہ مزارعت کے باب میں میری سب سے زیادہ زور و شور کے ساتھ مخالفت اہلحدیث حضرات ہی کی جانب سے ہوئی۔ چنانچہ حافظ احسان الٰہی ظہیر صاحب نے اس پر میرے خلاف ایک غیظ و غضب سے مملو تقریر اجتماعِ جمعہ میں کی۔ اسی طرح مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ' اور ان کے صاحبزادے برادرم صہیب حسن سلمہ' نے بھی اظہار ناپسندیدگی کیا لیکن میں نے ان سب حضرات کو مولانا طاسین صاحب کے مکمل مقالے کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں پیش کر کے عرض کیا کہ اس پر علمی تنقید فرمائیے میں شائع کر دوں گا جس کا آج تک کسی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا!!

مولانا لدھیانوی کو ایک اور بہت بڑا مغالطہ یہ لاحق ہوا ہے کہ شاید میرے "جہاد بالقرآن" کا ہدف صرف 'فرقہ واریت' ہے ـــــ اور مغالطہ در مغالطہ یہ کہ فرقہ واریت سے میری مراد مسالکِ فقہیہ ہیں! راقم پہلی بات کے ضمن میں وضاحت اور دوسری سے کامل اعلانِ براءت کرتا ہے۔ راقم کے نزدیک مسلمانوں میں حقیقی فرقے تو دو

ہی ہیں : ایک سُنّی اور دوسرے شیعہ ' اور ان کے مابین اختلاف صرف فقہ کا نہیں بلکہ بنیادی عقائد اور اصولوں کا ہے ۔ دوسری جانب صورت واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں (اور اسی طرح ہندوستان میں) اصل محاذ آرائی اور ' فرقہ واریت ' دیوبندیوں اور بریلویوں کے مابین ہے جو ایک ہی فقہ کی پیروی کرتے ہیں ! راقم مولانا لدھیانوی سے اس بات پر شدید احتجاج کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے اسے اتنا کودن سمجھا کہ یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ " اس ' فرقہ واریت ' سے ان کی مراد ائمۂ مجتہدین کا فقہی اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والے مذاہب یا مسالک ہیں ! " مولانا اگر ذرا غور فرمائیں تو اس ضمن میں میری تقریر یا جو اقتباس انہوں نے ' بیّنات ' بابت فروری ۸۵ء کے صفحہ ۳ پر دیا ہے اسی میں اس کی کامل تردید موجود ہے !

رہا جہاد بالقرآن کے ' اہداف ' کا معاملہ تو مولانا نے راقم کی جس تقریر پر اظہار رائے کے لئے دو اقساط پر مشتمل مفصّل تحریر سپردِ قلم کی ہے اسی میں راقم نے پانچ ' محاذ ' گنوائے ہیں : (۱) جاہلیتِ قدیمہ ـــــ جس میں مشرکانہ اوہام ' بدعات ' اور شفاعتِ باطلہ کے تصورات شامل ہیں (۲) جاہلیتِ جدیدہ یعنی الحاد اور مادہ پرستی ـــــ اور فحاشی و اباحیت (۳) بے یقینی اور تذبذب (۴) فرقہ واریت اور (۵) نفس پرستی اور شیطان کی وسوسہ اندازی ـــــ راقم کے نزدیک ان پانچوں محاذوں پر جہاد قرآن کی سیفِ قاطع سے ہوگا ' بقول علّامہ اقبال مرحوم

؎ خوشتر آں باشد مسلمانش کنی ــ کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی !

لیکن چونکہ قرآن کے نام پر اٹھنے والے بہت سے گروہ " ضَلُّوا وَاَضَلُّوا " کا مصداق بن گئے لہٰذا راقم نے پانچ احتیاطوں کا ذکر بھی کیا یعنی :

(۱) اسلاف کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت و احترام کا رشتہ کسی صورت ٹوٹنے نہ پائے

(۲) تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین معتدل راہ اختیار کی جائے (یہ ہے وہ مسئلہ جس پر ' الخیر ' میں بحث چھڑی تھی اور راقم نے وہ وضاحتیں کی تھیں جنہیں مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مولانا لدھیانوی نے تو تسلی بخش قرار دیا ہے ' لیکن مولانا محمد زاہد مطمئن نہیں ہوئے ۔)

(۳) تمسک بالقرآن کے ضمن میں : (۱) آیاتِ احکام کی وہی تعبیر صحیح قرار دی جائے جو سنّتِ رسول ' سنّتِ خلفاءِ راشدینؓ ' اجماعِ صحابہؓ اور سلف صالحین خصوصاً ائمۂ اربعہ

کے اجتہادات کے دائرے کے اندر اندر ہو ---- (ii) البتہ تاریخی اور سائنسی مباحث میں جدید انکشافات کو مدِنظر رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے !

(۴) علماءِ حقانی کے ساتھ ربط و ضبط ---- اور ان کی خدمت میں طالب علمانہ حاضری اور

(۵) علماءِ حق کا اعتماد حاصل کرنے کی پوری کوشش !!

مولانا لدھیانوی اگر تنقید کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان جملہ نکات کو پیشِ نظر رکھ کر تنقید فرمائیں۔ راقم اور اس کے ساتھی ان شاء اللہ العزیز حتی الامکان استفادہ کریں گے۔

آخر میں ایک غیر اہم سی بات جسے مولانا لدھیانوی کی تعبیر نے بہت اہم بنا دیا ہے ---- اور وہ یہ کہ راقم کا اپنے آپ کو اور اپنے بعض رفقاء کو "اُمّی نبی کا اُمّی اُمتی" لکھنا نہ کسی مبالغہ آمیز انکسار پر مبنی تھا نہ کسی ارادی 'مدحِ خود' پر ---- بلکہ صرف اس اعتراف کے طور پر تھا کہ راقم باضابطہ فارغ التحصیل عالمِ دین نہیں ہے۔ اور راقم اس اعتراف کو "عصمتِ بی بی است از بے چادری" کے مصداق اپنے حق میں حفاظت کا ایک ذریعہ اور گویا ایک ڈھال سمجھتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو 'میثاق' ستمبر ۸۴ء صفحہ ۵۸) ---- لیکن اس کے بارے میں مولانا لدھیانوی کا یہ خیال ہے کہ اس میں "آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حق میں سوءِ ادب کا پہلو نکلتا ہے" ---- تو اگرچہ راقم مولانا کی اس رائے سے متفق نہیں ہے تاہم اس کے امکان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے راقم عہد کرتا ہے کہ آئندہ یہ الفاظ کبھی استعمال نہ کرے گا ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اعوذ بک مِن الشّکّ والشرک۔ واعوذ بک من النفاق والریاء۔ واعوذ بک من همزات الشیاطین واعوذ بک ربّ اَن یحضرون۔ واعوذ بک مِن شر نفسی ومن سیّات اعمالی۔ واعوذ بک من خزی الدنیا وعذاب الآخرة ---- اَللّٰهُمَّ اهدنی و رفقائی کلّهم فی جمعیة خدّام القرآن والتنظیم الاسلامی اَللّٰهُمَّ اغفرلنا وارحمنا ووفّقنا لما تحبّ وترضی۔ اَللّٰهُمَّ وفّقنا ان نجاهد فی سبیلک باموالنا وانفسنا۔ اَللّٰهُمَّ ارزقنا شهادةً فی سبیلک آمین۔

یا ارحم الرّاحمین!!

تذکرہ وتبصرہ (۲)

اسرار احمد

قادیانی مسئلہ

اور اس کا نیا اور پیچیدہ تر مرحلہ!

کچھ عرصہ سے مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں کہ قادیانیوں نے فرضی ناموں سے نہایت درد بھری مظلومانہ فریاد پر مشتمل خطوط کی مہم پورے زور شور سے جاری کی ہوئی ہے جس کے ذریعے سادہ دل اور معاملے کی اصل نوعیت سے بے خبر مسلمانوں کے جذباتِ ایمانی اور جذبۂ رحم سے اپیل کرتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ دیکھئے! کیسا ظلم ہے کہ ہمیں کلمہ پڑھنے سے روکا جارہا ہے اور ہماری "مسجدوں" سے کلمۂ طیبہ اور آیاتِ قرآنیہ کو جبرًا مٹایا جارہا ہے ــــــ اس ضمن میں چند بار مجھ سے اجتماعاتِ جمعہ میں بھی استفسار کیا گیا جس پر میں نے معاملے کی اصل نوعیت کی مختصر وضاحت کردی ــــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اس قسم کی مصنوعی اور جذباتی اپیل سے حنیف را[مے] صاحب ایسے دانشور سیاستدان اور جناب اعتزاز احسن ایسے منجھے ہوئے قانون دان بھی متاثر ہوجائیں گے ــــــ میں خود پچھلے دنوں مسلسل سفر میں رہا جس کی وجہ سے اخبارات کے ساتھ رابطہ نہ رہا، واپسی پر جناب حنیف [رامے] کا مکمل بیان اور اس کا مولانا اللہ وسایا صاحب کی جانب سے مفصل جواب نظر سے گذرا تو اندازہ ہوا کہ "قادیانی مسئلہ"، جو ہمارے جسدِ ملی میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے ایک نئے اور پیچیدہ تر مرحلے میں داخل ہو [گیا ہے]۔

اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جس نے اس مسئلے کی پیچیدگی میں ایک نہایت خ[طرناک] پہلو (DIMENSION) کا اضافہ کردیا ہے ــــــ اور وہ یہ کہ مولانا محمد اسلم کی گمشدگی اور پھر حا[دثہ] ساہیوال سے قادیانیوں کے جن جارحانہ عزائم کا ظہور شروع ہوا تھا - انہوں نے کلمۂ طیبہ کے بیج سینوں [پر لگا] کر باہر نکلنے اور گرفتاریاں دینے کی صورت میں ایک "مستقل مظاہرے" کی شکل اختیار کرلی ہے ــــــ تاحال غنیمت ہے کہ معاملہ قادیانی نوجوانوں اور ملک کی انتظامی مشینری کے مابین ہے، لیکن اگر خدانخواستہ معا[ملہ] آگے بڑھا اور قادیانی جارحیت کے جواب میں عوامی ردِّعمل شروع ہوگیا تو صورت بہت خوفناک ہوجا[ئے گی]!

جہاں تک حنیف رامے اور انکی طرز پر سوچنے والے حضرات کا معاملہ ہے میں ان سے صرف یہ [عرض] کرتا ہوں کہ براہ کرم اس سوال پر غور فرمائیں کہ وہ کیا سبب تھا جس کے باعث محمد رسول اللہ صلی اللہ [علیہ] وآلہٖ وسلّم وفداہُ آباءُنا واُمّہاتُنا ایسی شفیق و ودود اور رؤف و رحیم ہستی نے ایک نام نہاد "مس[جد]" یعنی منافقین کی تعمیر کردہ "مسجدِ ضرار" کو مسمار کرنے کا حکم دے دیا تھا؟ ــــــ اسی طرح وہ کیا سبب

ی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے اپنے عہد خلافت میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کی سی وضع قطع اختیا
نے سے روک دیا تھا؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا صرف ایک جواب ممکن ہے اور وہ یہ کہ چونکہ اسلام عُرفِ عام کے مطابق صرف
'مذہب' نہیں ہے بلکہ 'دین' یعنی مکمل نظام زندگی ہے — لہٰذا اُس کا دائرہ کار صرف بندے اور رب
مابین ایک نجی تعلق کی حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اوّلاً ایک معاشرے اور قومیت کی صورت اختیار کرتا
اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنی حکومت اور ریاست قائم کرنی چاہتا ہے — بنا بریں اس کے نظام
انفرادی آزادی اور اجتماعی مصلحتوں کے مابین ایک حسین توازن موجود ہے اور بعض معاملات میں
یت اور ریاست کے تحفظ کے لئے ایسے اقدامات لازمی ہوتے ہیں جو بظاہر انفرادی آزادی پر قدغن نظر آتے
— چنانچہ ان ہی کے ذیل میں آتے ہیں آنحضورؐ اور حضرت عمرؓ کے متذکرہ بالا اقدامات بھی —
اسی کے ذیل میں آتا ہے موجودہ حکومت کا یہ فیصلہ بھی کہ قادیانی کوئی ایسی نشانی یا علامت 'تقریبًا
ری نقوش کے ذریعے استعمال میں نہیں لاسکتے جس سے عوام کو ان کے مسلمان ہونے کا دھوکا لگے —
ر یہ لازمی منطقی نتیجہ ہے آنجہانی غلام احمد قادیانی کے دعوئ نبوت کا جس کی بنا پر اُن کے ماننے والے
دل کے نزدیک وہ سب لوگ کافر قرار پائے جنہوں نے اُن کو نہیں مانا اور پوری اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا
صلوٰۃ والسلام کے نزدیک ان لوگوں کے کفر اور ارتداد میں ہرگز کوئی شک و شبہ نہیں ہے جنہوں نے کسی
ی حیثیت سے انہیں مان لیا — اب جناب غلام احمد قادیانی اور اُن کی ذریتِ صلبی و معنوی
'پختہ زُنّاری'' کا عالم تو یہ ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں اور ان کے حق میں لچر سے لچر
بان اور گھٹیا سے گھٹیا مذہبی گالیاں استعمال کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے — حتیٰ کہ
ن نئی اُمت' کا ایک مشہور و معروف فرد اپنے محسن و مربّی اور بانی ریاست و سربراہ مملکت قائد اعظم محمد علی
اح تک کی نماز جنازہ پڑھنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیتا ہے کہ "مجھے خواہ ایک مسلمان ملک کا غیر مسلم
یر قرار دید یا جائے خواہ ایک غیر مسلم حکومت کا مسلمان وزیر!" — لیکن ہمارے دانشوروں اور
یاستدانوں کی "رقتِ قلب" اور "وسعتِ قلبی" کا عالم یہ ہے کہ قادیانیوں کو 'غیر مسلم اقلیت' قرار دے کر
ن کے جان و مال اور عزت و آبرو کو پورا تحفظ دینے — اور انہیں عقیدہ و عبادات کے ضمن میں پوری آزادی
ینے کے بعد — صرف اُنکی جارحانہ پیشقدمی کی روک تھام کے لئے کچھ ناگزیر اقدامات کئے جاتے ہیں تو اُن
ا 'جذبۂ رحم' اور 'داعیۂ حمایتِ مظلوم' جوش میں آجاتا ہے ؎

"دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ !!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ !"

جناب رامے اور اُن کے ہم خیال حضرات کے لئے طے کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو

غیر مسلم سمجھتے ہیں یا مسلمان؟ —— اگر خدانخواستہ بات دوسری ہے تو انہیں ہیر پھیر کا راستہ چھوڑ کر —— اور خواہ مخواہ کی جذباتی دلیلوں اور اپیلوں کا سہارا لینے کی بجائے خم ٹھونک کر میدان میں آنا چاہئے اور اپنا مؤقف صاف صاف بیان کرنا چاہیئے —— اور اگر بات پہلی ہے اور اُن کا دل اس پر ٹھکا ہے کہ قادیانی غیر مسلم ہیں تو پھر انہیں اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اس کے منطقی نتیجے کو کھلے دل سے قبول کر لینا چاہیئے کہ قادیانیوں کو "تشبّہ بالمسلمین" سے روکا جائے تاکہ وہ سادہ لوح اور ناواقف مسلما کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر مرتد نہ کر سکیں ۔

اس موقع پر میں قادیانی حضرات کی خدمت میں بھی یہ گذارش ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے حق میں ۱۹۷۴ء کا فیصلہ نرم ترین اور مناسب ترین ہے جسے آپ لوگوں کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے ۔ اس لئے کہ اس کے ذریعے آپ لوگوں کو ایک مسلّم اقلیت (RECOGNISED MINORITY) کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔ جس سے آپ کو وہ جملہ مذہبی، سماجی اور اقتصادی حقوق حاصل ہو گئے ہیں جو دوسری تمام اقلیتوں کو حاصل ہیں ۔ اب خود آپ کی اپنی مصلحت کے اعتبار سے آپ کے لئے بہترین لائحہ عمل یہ ہے کہ ممالک (بشمول پاکستان) کی حد تک اس مرتبۂ اقلیت (MINORITY STATUS) پر قناعت کریں اور اپنی دعوت و تبلیغ کے جملہ حوصلے اور ارمان غیر مسلم ممالک میں نکال لیں —— پاکستان میں اگرچہ تاحال دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی تبلیغی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں ہے تاہم اس وقت عالمی سطح پر احیائے اسلام کی جو تحریک برسرِکار ہے اس کے پیشِ نظر وہ دِن زیا دور نہیں ہے جب مسلمان ممالک میں پورا پورا شرعی نظام قائم ہو گا اور اس کے نتیجے میں غیر مسلموں کی تبلیغی سرگرمیوں پر مکمل پابندی بھی عائد ہو کر رہے گی اور ارتداد کی سزا بھی نافذ ہو کر رہے گی (جس کی مثالیں ایران اور سوڈان میں سامنے آ بھی چکی ہیں!) —— پھر آپ لوگوں کے معا ایک اضافی پیچیدگی یہ ہے کہ کوئی عیسائی اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتا اور جب وہ تبلیغ کرتا ہے مسلمانوں کو صاف صاف اسلام ترک کر کے عیسائیت اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے جبکہ آپ اپنے آپکو مسلمان سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو بزعم خویش "کفر" سے تائب ہو کر اپنے خود ساختہ "اسلام" میں داخلے کی دعوت دیتے ہیں ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک پاکستان میں کو گرجا مسمار کیا گیا نہ صلیب توڑی گئی، حتیٰ کہ یہودیوں کی عبادت گاہ بھی کراچی میں ثابت و سالم کھڑی ہے لیکن آپ کی عبادت گاہوں کے خلاف اقدام ہو رہا ہے —— !! بنابریں مصلحت اس میں ہے کہ آپ اپنی عبادت گاہوں کے لئے تعمیر کا ڈیزائن بھی کوئی نیا اختیار کر لیں اور ان کے لئے نام بھی نیا تجویز کر لیں (جیسے مثلاً آپ کی علامہ اقبال روڈ لاہور پر واقع عبادت گاہ کا

دارالذکر" ہے!) اور ان کے باہر کلمۂ طیبہ اور آیاتِ قرآنیہ لکھنے سے بھی احتراز کریں ——
ں کے بعد آپ آزاد ہیں، اندر آپ جو چاہیں لکھیں، جو چاہیں پڑھیں اور جس طرح چاہیں
ادت کریں۔ —— بصورتِ دیگر اگر آپ لوگوں نے اپنی "جارحانہ دعوت و تبلیغ" کا
سلسلہ جاری رکھا بلکہ اس میں "قوت کے مظاہرے" کا عنصر مزید شامل کر لیا تو یاد رکھئے کہ جس
ح ۱۹۷۴ء کی ربوہ ریلوے اسٹیشن کی "جارحیت" آپ لوگوں کو بہت مہنگی پڑی تھی اسی طرح
ے پاکستان کے مسلمان حکومت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ "قتلِ مرتد" کی
اب وسنت سے ثابت اور اجماعِ امت پر مبنی سزا کو فی الفور نافذ کیا جائے ——
فتنۂ ارتداد کے آگے مؤثر بند باندھا جا سکے!

اس سلسلے میں اگر قادیانی حضرات کا خیال یہ ہو کہ اُن کے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے اور
ر اُن کے لئے "اسلامی علامات" اختیار کرنے پر پابندی لگنے کے فیصلے کسی نے وقتی مصلحت کی خاطر
ادیئے ہیں اور کسی آئندہ حکومت کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ انہیں تبدیل کرا سکے تو وہ بہت بڑی
لط فہمی میں مبتلا ہیں —— اس لئے کہ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخ ساز فیصلہ تو ایک ایسی
مت کے دَور میں ہوا تھا جس سے زیادہ سیکولر مزاج حکومت کا پاکستان کے لئے تصور تک نہیں
جا سکتا —— اور اب جو اسی فیصلہ کے مطابق اگلا منطقی قدم اٹھایا گیا ہے تو یہ بھی کسی فردِ
مد کے مذہبی مزاج کا نتیجہ نہیں ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ اقدام بہت پہلے ہو جاتا —— بلکہ
دونوں اقدام ملکی سطح پر مسلسل عوامی دباؤ اور پورے عالمِ اسلام میں حالات کے "احیاءِ اسلام"
رخ پر پیش قدمی کا نتیجہ ہیں —— جو اگرچہ نہایت سُست رفتار بھی ہے، اور ہماری کوتاہیوں
ر نااہلیوں کے باعث وقتی اور فوری ردِّ عمل اور اس کے نتیجے میں عارضی پسپائی کا شکار
ں —— بایں ہمہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اب وہ دن بہت زیادہ دور نہیں ہیں
ب خالص اور ٹھیٹھ دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کو عالمی غلبہ حاصل ہوگا اور کوئی "مثیلِ
مسیح" نہیں بلکہ اصل اور حقیقی مسیح عیسیٰ ابن مریم علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام دنیا میں
بارہ تشریف لائیں گے اور ایک جانب موجودہ نام نہاد عیسائیت کو ختم کر دیں گے —— اور دوسری
نب یہودیوں اور ان کے معاونین کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے! —— لہٰذا قادیانیوں کیلئے
ع راہِ ہدایت تو یہ ہے کہ وہ جھوٹے مدعیِ نبوت سے کامل انقطاع اور اظہارِ براءت کر کے "
ہیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!" کے مصداق دوبارہ اصل اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ
سلام میں شامل ہو جائیں۔ —— بصورتِ دیگر کم از کم "عافیت" کی راہ یہ ہے کہ مسلمان
لک میں غیر مسلم اقلیت کی حیثیت کو دل سے قبول کر کے اپنی دعوت و تبلیغ کا رُخ غیر مسلم
لک کی جانب موڑ دیں۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارینہ را!

۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوّت

اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے پر تبصرہ

از ڈاکٹر اسرار احمد

(ماخوذ از میثاق، نومبر ۷۴ء)

اگرچہ جس وقت 'میثاق' کا یہ شمارہ طبع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، اس وقت تک قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا فیصلہ خاصہ پرانا ہو چکا ہوگا، تاہم جی نہیں مانتا کہ 'میثاق' کے صفحات اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم پر اُس قسم کی جناب میں ہدیۂ تشکّر و امتنان پیش کرنے کی سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں جو اس فیصلے کی صورت میں پوری ملّتِ اسلامیہ پر ہوا ہے ——— اس لئے کہ اگرچہ عالمِ اسباب میں اس تاریخی فیصلہ کے بہت سے عوامل ہیں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ایک خالص خدائی تدبیر کے نتیجے میں ہوا جس نے جملہ اسباب و عوامل کو جمع کر کے اس طرح ایک ہی رُخ میں پھیر دیا کہ اس فیصلے سے فرار کی کوئی راہ کسی کے لئے کھلی ہی نہ رہی اور بالکل معجزانہ طور پر وہ کٹھن مرحلہ طے ہو گیا جس کے طے ہونے کا کوئی امکان آج سے چھ ماہ قبل کسی بڑے سے بڑے سیاسی پنڈت کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔

لہٰذا ——— اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کے مطابق کہ "مَنْ لَّا یَشْکُرُ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ"[1] پوری ملّتِ اسلامی کی جانب سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں وہ عوام بھی جنہوں نے دینی غیرت اور حمیّت کا بھرپور ثبوت بھی دیا اور صبر و تحمّل اور نظم و ضبط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور علمائے کرام اور دینی و سیاسی جماعتوں کے رہنما اور کارکن بھی جنہوں نے نہایت منظّم طریقے پر عوام کے جذبات کی ترجمانی کا فرض سرانجام دیا اور اس سلسلے میں سخت محنت اور مشقّت بھی برداشت کی اور ہر طرح کے خطرات بھی مول لئے یہاں تک کہ

---

[1] "جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا" (الحدیث)

قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ خصوصاً مولانا محمد یوسف بنوری جنہوں نے علالت و پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کے باوجود ایسی شدید مشقت برداشت کی جس کا تحمل صحت مند اور تنومند نوجوانوں کے لئے بھی مشکل ہو، پھر مبارک باد اور شکریہ کے مستحق ہیں ممبرانِ اسمبلی اور ارکانِ پارلیمنٹ بھی جنہوں نے عوام کے جذبات کا بھی پورا لحاظ کیا اور خود بھی دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کی اور حکومتِ وقت بھی جس نے نہ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنایا، نہ نوشتۂ دیوار کو پڑھنے سے انکار کیا۔ خصوصاً مسٹر بھٹو جو سیاسی تدبّر اور فہم و فراست کے اس کڑے امتحان سے کامیابی کے پھریرے اڑاتے ہوئے نکلے ——— لیکن ہمارے شکر و سپاس کا اصل حقدار اور ہمارے تشکرو امتنان کا سزاوارِ حقیقی ہے اللہ رب العٰلمین جو " فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیدُ " بھی ہے اور " غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ " بھی اور جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں تمام اسباب وعلل اور جملہ وسائل و عوامل ، فَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۔

جیسا کہ قارئین ' میثاق ' کو معلوم ہے ، راقم الحروف ۲۴ مئی سے ۳۰ جون تک تقریباً مسلسل لاہور سے باہر رہا۔ پہلے کچھ بجالی صحت اور کچھ بعض معاملات و مسائل پر گوشہ تنہائی میں غور و فکر کے پیش نظر ایک سفر ایبٹ آباد اور وادی کاغان کا ہوا ، پھر ایک طویل دورہ کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے شہروں کا رہا ، اسی دوران میں جب ' حادثہ ربوہ ' کی خبر پڑھی تو فوراً جو خیال دل میں پیدا ہوا یہ تھا کہ غالباً تقدیر الٰہی میں فتنہ قادیانیت کی جس قدر مہلت طے تھی وہ پوری ہو چکی اور یہ رسّی جتنی دراز ہونی مقدر تھی وہ ہو چکی۔ آج سے اس کے زوال کا آغاز ہو گیا ، گویا ایک انگریزی محاورے کے مطابق " THIS IS THE BEGINNING OF THEIR END! " تبھی تو ان کی عقل ماری گئی اور ایسے ہوشیار اور کائیاں و شاطر گروہ کے ہاتھوں اتنی بڑی حماقت کا ارتکاب ہو گیا۔ چنانچہ اثنائے سفر میں نجی گفتگوؤں میں بھی راقم اپنے اس تاثر کا اظہار کرتا رہا اور جب ۲۸ جون کو سکھر کی نئی تعمیر شدہ لیکن قدیم بادشاہی طرز کی عظیم جامع مسجد میں اجتماع جمعہ سے خطاب کا موقع ملا تو وہاں بھی راقم نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ ایک خالص خدائی تدبیر ہے اور اس بار یہ مسئلہ انشاء اللہ العزیز ضرور تسلی بخش طریقے پر طے ہو جائے گا اور پھر جب تقریباً ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد راقم نے ۵ جولائی کو جامع مسجد خضراء سمن آباد میں پہلا جمعہ پڑھایا تو اس موقع پر بھی ایک مفصل تقریر میں پھر اسی توقع کا اظہار کیا۔ یہ تقریر جو اتفاقاً ٹیپ کر لی گئی تھی ، رفقاء و احباب نے اپنے حسن نظر کے باعث بہت پسند کی اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے سخت محنت جھیل کر اسے صفحۂ قرطاس پر بھی منتقل کر لیا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اسے ' میثاق ' میں شائع کر دیا جائے لیکن اس وقت سنسر کی پابندی کے باعث ان کی

خواہش پوری نہ کی جا سکی۔ ذیل میں اس کا ابتدائی حصّہ درج کیا جا رہا ہے تاکہ ایک قوان کی خواہش پوری ہو جائے اور ان کی محنت سپھل ہو اور دوسرے یہ نہ کہا جا سکے کہ ہمارے یہ خیالات واقعہ کے پیش آ چکنے کے بعد کی خیال آرائیوں کے قبیل سے ہیں۔

(تقریر کا بقیہ حصّہ جو "عقیدۂ ختمِ نبوّت اور قرآنِ حکیم" کے موضوع پر اظہارِ خیال پر مشتمل ہے انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا!) :-

" حمد و ثنا اور تلاوتِ آیات کے بعد عرض کیا گیا :-

حضرات! ۲۹ مئی کے بعد آج دو جولائی کو ملاقات ہو رہی ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ادھر تو جمعہ کے ان اجتماعات میں میرے خطابات کا سلسلہ عارضی طور پر لاہور سے باہر جانے کے سبب سے معطل ہوا اور ادھر ملک میں ایک نہایت ہیجان انگیز واقعہ پیش آ گیا۔ یعنی حادثۂ ربوہ — اور اس کے بعد پوری شدّت کے ساتھ اس مسئلے نے سر اٹھا لیا جو اگرچہ موجود تو تقریباً ایک صدی سے ہے لیکن جس کا شدّت کے ساتھ احساس آج سے تقریباً اکیس سال قبل ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۵۳ء کے حادثے کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ بالکل دب گیا تھا اور بجز اس کے کہ بعض افراد جیسے جناب شورش کاشمیری اور ہمارے بزرگ حکیم عبدالرحیم اشرف اس کی فتنہ سامانی کی طرف توجّہ دلاتے رہتے تھے یا بعض غیر اہم قسم کے ادارے وقتاً فوقتاً کچھ کتابچے اور پمفلٹ اس کے بارے میں شائع کرتے رہتے تھے، کوئی عوامی تحریک اس مسئلے کے بارے میں موجود نہ تھی۔ اب ربوہ کے اس حادثے نے اس کو ازسرِنو زندہ کر دیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس کی حقیقی فتنہ انگیزی، اس کی سازشی فطرت اور اس کی مکّاری کا صحیح احساس اجاگر ہوا اور ایوانِ حکومت سے لے کر خواص و عوام سب کی توجّہ ادھر مبذول ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا تو وہ کسی سیاسی پارٹی کی کوشش اور محنت سے نہیں اٹھا بلکہ میں نے جہاں تک حالات کا تجزیہ کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ خالص ایک خدائی تدبیر ہے کہ اس طائفے کی عقل ماری گئی اور اس نے خود ہی اپنے ایک انتہائی غلط اقدام سے اس مسئلے کو زندہ کر دیا!

یہ فتنہ اپنے سازشی کردار اور خاموشی لیکن انتہائی مہارت اور مشّاقی کے ساتھ جسدِ ملّت میں سرطان کے پھوڑے کی طرح جڑیں جمانے کے اعتبار سے پوری ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ میں منفرد مقام رکھتا ہے اور عام طور پر اس کی ہلاکت انگیزی کا لوگوں کو اندازہ نہ تھا بلکہ تعلیم یافتہ حضرات میں سے بھی اکثر لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے یا اس کے بارے میں گوناگوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا ہے تو اگرچہ قادیانیوں نے تو اس کا کریڈٹ بھٹو صاحب کو دینے کی کوشش کی

ہے تاہم اسے بھی ان کی سابقہ مکاریوں کا ایک تتمہ یا ضمیمہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ اس مسئلہ کے ابھرنے اور اٹھنے میں نہ حکومت کا کوئی عمل دخل ہے نہ کسی اپوزیشن پارٹی کا ہاتھ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ علماء کی کسی تنظیم یا جماعت کا بھی اس میں کوئی دخل نہیں ہے! اور حقیقت یہ ہے کہ اس بار اس کے کریڈٹ کا کوئی شخص اور کوئی سیاسی پارٹی دعویٰ نہیں کرسکتی۔ بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس مرتبہ یہ مسئلہ ایک خالص خدائی تدبیر کے تحت اٹھا ہے اور اس کا کریڈٹ اگر کسی کو پہنچتا ہے تو وہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔

میرے اس یقین کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ اس مرتبہ قادیانیوں کی طرف سے ربوہ سٹیشن پر جو اقدام ہؤا وہ ان کے اپنے اساسی فلسفے، بنیادی طریق کار اور اپنے سابق طرزِ عمل سے بالکل مختلف ہے ان کا رویہ اور طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ حکومتِ وقت کو سلام کرو اور اس کی کاسہ لیسی، مدح سرائی اور اس کی ثنا خوانی کرکے اس سے مراعات حاصل کرو اور ان مراعات کے تحت غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاؤ۔ امتِ مسلمہ سے براہ راست تصادم سے ہمیشہ کنی کتراتا ان کا وطیرہ رہا ہے۔ یہی ان کا ابتدا سے فلسفہ ہے، یہی ان کا طریق کار رہا ہے۔ انہوں نے نہ کبھی سیاسی میدان میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی موقع پر جارحیت کا کوئی انداز اختیار کیا۔ اس لئے کہ سیاست کا مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جمعیتیں اور جماعتیں یا فرقے اور گروہ کسی ملک میں بھی جارح ہو کر نہیں جی سکتے۔ مظلوم و مجروح ہو کر رہتے ہیں تو پھر بھی ان کے زندہ رہنے کا امکان رہتا ہے۔ جارحیت کی صورت میں تو سوائے خاتمے کے اور کوئی صورت ہی نہیں۔ یہی فلسفہ تھا جس کے سہارے یہ آج تک پنپتے رہے ہیں۔ اسی فلسفے پر وہ انگریزی دور میں پوری طرح کاربند رہے۔ حکومت برطانیہ کی قصیدہ گوئی، اس کی خوشامد، اس کو رحمتِ خداوندی قرار دے کر اس کو بقا و ترقی کی دعائیں دے کر، اس کے مقاصد و مفادات میں ممد و معاون ہو کر، اس کے زیر سایہ اور زیر عاطفت رہ کر اور اس سے مراعات حاصل کرکے جسدِ ملت میں یہ سرطان کے مانند اپنی جڑیں پھیلاتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں کہ خواہ کوئی بھی حکومت ہو اور کوئی بھی شخص یا جماعت برسرِ اقتدار ہو خود کو اس کا وفادار ثابت کریں اور خوشامد کے ذریعے مراعات پر مراعات حاصل کرتے چلے جائیں۔ یہ پہلا مرتبہ ہؤا ہے کہ نہ صرف ان کی طرف سے جارحیت کا ارتکاب ہؤا بلکہ انہوں نے اس جارحیت کو وقت کی حکمران سیاسی پارٹی سے منسوب کرنے کی

حماقت کرکے حکومت وقت کو اپنے مدِ مقابل لا کھڑا کیا۔ گویا ان کی حماقت کے نتیجے میں حکومت اور عوام دونوں ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور حکومت اور عوام بلکہ حکمران جماعت اور اپوزیشن کے مابین کسی قسم کی سیاسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ لہٰذا ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ایک طرف تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا دوسری طرف خود بخود حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ حکومت اور عوام سیاسی پارٹیوں کی باہمی کشاکش کی نوبت آتے بغیر یہ امید ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ انشاء اللہ اس مسئلہ کا ایسا حل ضرور نکل آئے گا جو ملت کے لئے قابل قبول ہو، اس سے پہلے کبھی ایسی صورت حال رونما نہیں ہوئی کہ اس مسئلے کے حل کی طرف کوئی ادنیٰ سا اقدام بھی ہوا ہو لیکن اس مرتبہ تائید ایزدی سے ایسے حالات خود بخود پیدا ہو گئے ہیں کہ انشاء اللہ العزیز اس بار یہ مسئلہ کھٹائی میں نہیں پڑ سکے گا۔ اس لئے کہ بحمد اللہ اس حد تو معاملہ آ گیا ہے کہ ایک طرف ایک اعلیٰ سطحی تحقیقاتی عدالت کا تقرر ہوا ہے جس کے TERMS OF REFERENCE کافی وسیع کر دیئے گئے ہیں، تمام معاملات اس عدالت کے سامنے لائے جا رہے ہیں۔ اگر یہ عمل جاری رہا تو اس گروہ کا گھناؤنا کردار اس تحقیقی عدالت کے سامنے آ جائے گا اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اس گروہ کا مقام دائرہ ملت کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ دوسری طرف اس ملک کے اعلیٰ ترین با اختیار ادارے یعنی ملک کی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں بھی اس مسئلے پر باقاعدہ غور و فکر شروع ہو گیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اس مسئلہ کے صحیح حل کے لئے نہایت مناسب ہیں اس وقت اس بات سے بالکل قطع نظر کر لیجئے کہ اس مسئلہ کے حل سے کس کا کیا مفاد وابستہ ہے۔ حکمران پارٹی کیا چاہتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں کیا چاہتی ہیں؟ ان سب سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہ بات عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا مقام ہے کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے قانونی اور دستوری طور پر جو صحیح اقدامات کئے جا سکتے ہیں وہ کر لئے گئے ہیں اور یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ انشاء اللہ ضرور حل ہو جائے گا۔

البتہ اس موقع پر تین احتیاطوں کی سخت ضرورت ہے:

ایک احتیاط تو عوام کو کرنی چاہیئے کہ معاملہ کسی صورت میں بھی ہنگامہ، ایجی ٹیشن اور دنگہ فساد کی شکل اختیار نہ کرنے پائے اس لئے کہ یہ قادیانیوں کے جال میں پھنسنے کے مترادف ہوگا۔ بعض معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں بھی قادیانیوں نے پاکستان سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ کسی طرح ہنگامہ کی صورت پیدا ہو اور حکومت اور عوام کے مابین شدید نوعیت کا تصادم پیدا ہو جائے اور جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے اور

مارشل لاء لگ گیا تو وہ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا اور ان کے قدم جم گئے۔ اب بھی ان کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جا رہی ہے۔ اب تک جہاں بھی فساد اور لوٹ مار کا معاملہ ہوا یا فائرنگ تک نوبت پہنچی وہاں ابتداء ان ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس کو ایک ہنگامہ خیز اور دھماکہ خیز صورت بنا دیا جائے اور حالات کا رُخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ ملک میں Law & Order کا گمبھیر مسئلہ اٹھ کھڑا ہو تاکہ حکومت اور عوام میں خوفناک تصادم ہو جائے۔ نتیجۃً موجودہ دستوری اور آئینی نظام درہم برہم ہو جائے اور اختیارات فوج کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں۔ فوج کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا دینی مسئلہ کی تائید یا مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ خالص انتظامی معاملہ سمجھ کر Law & Order قائم کرنے کے لئے ہر قسم کی بدامنی اور ہنگامے کو فرو کر دینا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہے لہذا قادیانیوں کو اسی میں اپنی عافیت نظر آتی ہے کہ ملک میں بڑے پیمانہ پر لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا کر دیا جائے اور عوام اور حکومت میں کسی طرح شدید تصادم کرا دیا جائے۔ آپ نے بھی سنا ہوگا کہ ربوہ میں کسی جگہ نمایاں طور پر یہ عبارت لکھی گئی تھی کہ "خدا اپنی فوجوں کے ساتھ آ رہا ہے" گویا انہوں نے اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کر لیا تھا کہ کسی طرح ملک میں سول ایڈمنسٹریشن فیل ہو جائے اور فوج حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں سنبھال لے تاکہ ایک طرف دستور معطل ہو جائے اور دوسری طرف وہ اپنے سازشی طور طریقوں سے فوج کو متاثر کرکے فائدہ اٹھا سکیں لہذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوام ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل اور صبر سے کام لیں اور کسی وقت بھی کوئی ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دیں جس سے Law & Order کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ اگر اس موقع پر قادیانیوں کی اشتعال انگیزی کے جواب میں ہماری جانب سے بھی اسی قسم کا معاملہ ہو گیا تو درحقیقت یہ قادیانیوں کی تدبیر کی کامیابی ہوگی اور گویا ہم خود ان کے جال میں پھنس جائیں گے۔

دوسری احتیاط تمام سیاسی اور دینی پارٹیوں کو یہ کرنی چاہیئے کہ اس مسئلہ کے اٹھانے اور اس کے حل کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے بھرپور اجتناب کیا جائے۔ کسی سیاسی پارٹی کی جانب سے اس مسئلے سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی پورے معاملہ کو خراب کر سکتی

ہے لہٰذا اس سے دامن بچانا از حد ضروری ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر کسی پارٹی کی جانب سے اس رجحان کا اظہار کہ یہ معاملہ اس کی کوششوں سے اٹھا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھنا چاہیئے انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

تیسری احتیاط یہ ہونی چاہیئے کہ کسی موقع پر بھی اس معاملہ کو حکومت اور حزبِ اختلاف کے مابین طاقت آزمائی کا رنگ نہ دیا جائے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ اس مسئلے سے بعض گروہوں اور سیاسی پارٹیوں نے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کو حکومت VERSUS حزبِ اختلاف کا مسئلہ بنا دیا جس کے نتیجے میں مسئلہ حل ہونے کے بجائے لاینحل بن گیا۔ اس موقع پر یہ صورت حال پیدا نہیں ہونی چاہیئے اس سلسلے میں یہ بات نہایت امید افزا اور اطمینان بخش ہے اور گویا ایک نہایت نیک شگون کا درجہ رکھتی ہے کہ اس بار متحدہ مجلس عمل کی قیادت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری مدظلہٗ کو سونپی گئی ہے جو ایک خالص غیر سیاسی شخصیت ہیں اور چاہے ملک کے ہر شہری کی طرح ان کے بھی کچھ مخصوص سیاسی نظریات ہوں بہر حال وہ عملی سیاست کے میدان سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے صرف علمی اور تدریسی مشاغل میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ مولانا کی قیادت میں یہ تحریک سیاست کی نذر ہونے سے بچ جائے گی اور معاملہ حکومت بمقابلہ احزاب اختلاف کا نہیں بنے گا بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر مسئلے کے حل کا کریڈٹ حکمران پارٹی لینا چاہتی ہو تو وہ بے شک لے لے۔ ہمیں ساری دلچسپی اس سے ہونی چاہیئے کہ اس مرتبہ کسی طرح یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے مطالبے کے مطابق حل ہو جائے۔ میں اسی بات کو سکھر کے ایک اجتماع میں بھی بیان کر چکا ہوں، مختلف ذرائع سے اپنی یہ گزارشات علماء کرام اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں تک بھی پہنچا چکا ہوں اور آج پھر اس کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ خود قادیانیوں کی حماقت سے اٹھا ہے، پورے زور شور سے اٹھا ہے۔ اس مسئلہ کے اٹھانے میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اللہ نے ہمیں موقع عطا فرمایا ہے کہ ہم اس صورت حال سے صحیح فائدہ اٹھائیں۔ اگر ہم نے کفرانِ نعمت کیا تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسئلہ کتنے طویل عرصے کے لئے دوبارہ سرد خانے میں چلا جائے۔ اس مسئلہ کو نئے سرے سے اٹھانا آسان نہیں ہوگا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد سے یہ مسئلہ جس طرح دب گیا تھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ لہٰذا اس موقع پر ہمیں پورے دینی اور سیاسی فہم کا ثبوت دینا چاہیئے اور ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے پُرامن ذرائع

سے اپنا مطالبہ جاری رکھنا چاہیئے، دلائل سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہنگامہ آرائی سے دامن بچانا چاہیئے۔ اس کو حکومت اور حزب اختلاف کے مابین نزاعی مسئلہ بنانے سے پہلو تہی کرنی چاہیئے اور اس کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے ہر سیاسی پارٹی بالخصوص اپوزیشن کو بچنا چاہیئے۔ ہم کو یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت کی سطح پر اس فتنہ پر تشویش کا اظہار ہوا ہے اور بڑی اعلیٰ سطح پر یہ احساس اجاگر ہوا ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی واقعتاً ضرورت ہے۔ یہ صورت حال بڑی اطمینان بخش ہے لہٰذا ہمیں موقع دینا چاہیئے کہ یہ ایوان نمائندگان پُرامن فضا میں اس مسئلہ کو اس صحیح حل تک پہنچا سکے جو پوری امت مسلمہ کے لئے قابل قبول ہو۔

جہاں تک اس مطالبہ کا تعلق ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول اس سے زیادہ نرم کوئی اور مطالبہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کسی کمیونٹی (COMMUNITY) کو باقاعدہ اقلیت (MINORITY) تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے بہت سے قانونی حقوق اور تحفظات دے دیئے جائیں: یہ گویا ایک اعتبار سے اس کی قانونی حیثیت کا اقرار (RECOGNITION) اور بین الاقوامی سطح پر اس کے حقوق کا اعتراف ہے۔ اگر کوئی ملک کسی کمیونٹی کو اپنے ہاں اقلیت (MINORITY COMMUNITY) کی حیثیت سے تسلیم کرلے تو گویا یونائیٹڈ نیشنز کے تمام ادارے اس کے پشت پناہ ہو گئے۔ یو این او اس کی کسٹوڈین بن گئی۔ بین الاقوامی عدالت اس کے معاملات میں مداخلت کی مجاز ہو گئی۔ بحیثیت اقلیت ان کے حقوق آپ کو باقاعدہ طے کرنے ہوں گے اور ان کو اپنی کتاب دستور میں مندرج کرنا ہوگا۔ ان حقوق کی ادائیگی کی آپ کو ضمانت دینا ہوگی اور آپ کے ملک کی عدالت عالیہ ان حقوق کی نگہداشت کرے گی۔ قادیانیوں کے لئے اس سے زیادہ فیاضانہ سلوک کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ختم نبوت کا عقیدہ امت مسلمہ کا ایک ایسا اجماعی عقیدہ ہے کہ اس میں کسی اعتبار سے رخنہ ڈالنا یا دراڑ پیدا کرنا ہمیشہ سے ارتداد کی ایک پختہ اور متفق علیہ بنیاد رہی ہے۔ دوسری طرف قتل مرتد اور خصوصاً منظم مرتدین کے ساتھ قتال کے مسئلے پر بھی ہمیشہ سے امت کا اجماع ہے۔ یہ تو اس دور کی "برکات" ہیں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم کہ:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ　　گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر　　انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

کہ جس نے جو چاہا کہہ دیا اور جو جی میں آیا دعویٰ کر دیا اور اسے کوئی فکر نہیں کہ میرا حشر کیا ہوگا اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا! مرزا صاحب کے تمام دعاوی برٹش راج میں ہوئے۔ یہ دعوے برطانوی سامراج کے اپنے مفاد میں تھے۔ پھر مسلمانوں میں انتشار فکر و نظر اس کو عین مطلوب تھا لہٰذا وہ کیوں ان کا نوٹس لیتا۔ اس نے تو ان کی سرپرستی کی اور خوب سرپرستی کی اس کی سرپرستی اور نگہداشت میں یہ پودا نہیں، جھاڑ جھنکار نشو و نما پاتا رہا۔ اگر کہیں خلافت راشدہ کا دور ہوتا یا کوئی بھی اسلامی حکومت برقرار ہوتی تو آنے والا کا بھاؤ معلوم ہوتا۔ ایسا دعویٰ کرنے والے کا مقام دار و رسن ہوتا یا پھر اس دعویٰ کو ماننے والوں کے ساتھ باقاعدہ قتال ہوتا۔ ان کی جان اور ان کا مال مسلمانوں کے لئے مباح قرار پاتا اور ان کے ساتھ معاملہ وہی کیا جاتا جو محارب کفار اور مشرکین کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کا سینہ بڑا کشادہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا مسئلہ بہت ہی نازک مسئلہ سمجھا گیا ہے۔ عام طور پہ جو یہ بات مشہور ہے کہ تکفیر ایک آسان سا معاملہ ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا معاملہ بہت کم ہوا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں کفر کا فتویٰ مختلف عقائد اور مختلف اعمال پر لگتا رہا ہے۔ متعین افراد یا گروہوں کی باقاعدہ تکفیر شاذ ہی کبھی ہوئی ہے۔ آپ کو گنتی کی مثالیں ہی ملیں گی کہ کسی اسلامی حکومت نے متعین طور پر کسی متعین شخص یا جماعت کی تکفیر کر کے اس کو جسد ملت سے کاٹ پھینکا ہو۔ ارتداد یا تکفیر کا معاملہ انہی افراد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ جن کے قول اور عقیدہ کی کوئی تاویل اور توجیہہ ممکن ہی نہ رہی ہو اور صریح ارتداد یا کفر کا ایسا ثبوت فراہم ہو گیا ہو جس کی تردید ممکن نہ ہو پھر ایسے افراد کے ساتھ بھی انتہائی سزا یعنی قتل سے قبل پوری طرح افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں عیسائیت کی تاریخ آپ کو بتائے گی کہ کتنی معمولی، چھوٹی اور بالکل فروعی باتوں پر کیسی کیسی بہیمانہ اور وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں اور کس طرح بے دریغ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ہمارا اجتماعی مزاج اس کے بالکل برعکس رہا ہے لیکن قادیانیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ رخنہ پیدا کیا ہے کہ اگر اس سے صرف نظر کیا گیا تو ملت کی شیرازہ بندی ممکن ہی نہیں رہے گی۔ دعویٰ نبوت درحقیقت وہ رخنہ اور فتنہ ہے کہ جس سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے جس پر اسلام کا قصر کھڑا ہے۔ نبوت سے کم تر درجہ کے بہت سے فتنے ہمارے ہاں اٹھتے رہے اور امت نے انہیں برداشت کیا ہے لیکن نبوت کا دروازہ وہ دروازہ ہے کہ اگر اس کو ایک ہی بار کھول

دیا گیا تو منطقی طور پر اُمّت میں تفریق کا ایک مسلسل عمل شروع ہو جائے گا جس کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی دعویٰ نبوت کرے تو لازماً اس کے دو نتائج مترتب ہوں گے۔ اس کو ماننے والا مومن اور اس کا انکار کرنے والا کافر قرار پائے گا۔ نبی ایک میزان اور فرقان بن کر آتا ہے وہ کفر و ایمان کا معیار بن کر آتا ہے جو اس کو نہ ماننا چاہے وہ دیگر تمام باتوں کو مانتا ہو یہاں تک کہ وہ خدا کو مانتا ہو اور خالص توحید کے ساتھ مانتا ہو وہ آخرت کو مانتا ہو اور ان تمام تفاصیل کے ساتھ مانتا ہو جن کی خبر انبیاء و رسل دیتے چلے آئے ہیں۔ وہ حضرت آدمؑ سے لے کر اس نبی سے پہلے آنے والے تمام نبیوں اور رسولوں کو مانتا ہو، تمام صحیفوں اور کتابوں کو مانتا ہو، ملائکہ کو مانتا ہو، زاہد ہو، عابد ہو، بڑا ہی متقی ہو لیکن مجرد اس بات سے کہ اس نے ایک نبی کا انکار کر دیا، اس پر کفر کا ٹھپہ لگ جائے گا اور وہ مومن نہیں بلکہ کافر قرار پائے گا۔ گویا نبوت کا لازمی اور منطقی نتیجہ تفریق ہے۔ غور کیجئے کہ یہود اور نصاریٰ کے مابین آخر کیا چیز وجہ الاختلاف ہے؟ عیسائی اب بھی جس کتاب کو لئے پھرتے ہیں، اس میں انجیل (NEW TESTAMENT) کے ساتھ ساتھ عہد نامہ عتیق OLD TESTAMENT کے نام سے بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہونے والے تمام صحیفے شامل ہیں گویا عیسائی تورات، زبور اور تمام صحیفوں کو بھی مانتے ہیں اور حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام تک تمام نبیوں اور رسولوں کو بھی مانتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دو علیحدہ علیحدہ امتیں ہیں۔ یہ فرق کیوں واقع ہوا؟ صرف اس لئے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کی نبوت کا انکار کیا اور عیسائیوں نے اس کو مانا تو بنی اسرائیل میں تفریق ہو گئی۔ اب یہ دو بالکل جدا امتیں ہو گئیں۔ یہود کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کو نبی اور رسول ماننے والے دائرہ ایمان سے خارج ہو کر کافر ہو گئے اور عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کے انکار کی وجہ سے یہود کافر قرار پائے۔ مزید غور کیجئے کہ ہمارے اور عیسائیوں کے مابین فرق کیا ہے؟ یہاں میری مراد ان لوگوں سے ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا نبی اور رسول مانتے ہوں اور جو حقیقتاً حضرت مسیحؑ کے متبع ہوں۔ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں لیکن یہ متبعین حضرت مسیحؑ، ہمارے نبی سید المرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے لہٰذا ہمارے نزدیک وہ کافر اور ان کے نزدیک ہم کافر۔ گویا یہ وہ منطقی نتیجہ ہے جس تک خود قادیانیوں نے اس مسئلے کو پہنچا دیا ہے جب وہ ایک نئی نبوت پر ایمان کے مدعی ہیں تو ان کے نزدیک اس نبوت کا انکار کرنے والے کافر اور ہمارے نزدیک

اس نبوت کو ماننے والے کافر۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ نئی نبوت کا کھڑاگ مول لیا گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ نبوت کی بنیاد پر جو تنظیم قائم ہوتی ہے اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ جس کسی نے کسی کو نبی مان لیا اس نے گویا ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اس نبی کی کامل فرمانبرداری میں دے دیا اور خود کو بالکلیہ SURRENDER کر دیا۔ اور اب اس نبی کے مقابلے میں اُس کا فکر، اُس کی عقل اور اس کی رائے سب معطل ہو جائیں گے کوئی شخص جب ظلی طور پر، بروزی طور پر یا کسی اور اعتبار سے خود کو ایک مرتبہ نبی منوالے تو اب وہ ماننے والے کے لئے امام معصوم بھی ہو گیا، واجب الاطاعت بھی ہو گیا، اس کی رائے سے اختلاف اور اس کے حکم سے انحراف کفر ہو جائے گا حتیٰ کہ اس کے خلاف دل میں کدورت کے جذبات رکھنا بھی کفر ہو جائے گا۔ پس ایسے شخص کے گرد جو تنظیم بنے گی اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ایسی تنظیم کے علاوہ جو دوسری تنظیمیں ہوں گی ان کے صدر سے، امیر سے، سربراہ سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، آپ ان کے خلاف سوءِ ظن میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ان کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پیش بھی کر سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں چونکہ یہاں معاملہ ایمان و کفر کا نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس جہاں کسی کو نبی مان لیا گیا ہو وہاں ان تمام امکانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس برّصغیر میں قادیانیوں کی تنظیم سے بہتر اور مضبوط کوئی تنظیم نہیں ہے اور اس کا سبب یہی "نبوّت" کا تصوّر ہے۔ یہ فائدہ نبوّت کے دعویٰ کے بغیر حاصل ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر انہوں نے نبوّت کے لازمی اور منطقی نتیجہ کو خود ہی لوگوں کے سامنے واضح کر کے پیش کر دیا۔ عامۃ المسلمین سے ان کی مساجد علیحدہ، نمازیں علیحدہ، یہاں تک کہ وہ ہمارے جنازے میں شرکت نہیں کریں گے[1]۔ حد یہ ہے کہ وہ ہمارے بچّوں کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوں گے۔ یہ بات باقاعدہ سوال و جواب کی صورت میں ان کے لٹریچر میں موجود ہے مرزا بشیر الدین محمود سے پوچھا گیا کہ بچے تو معصوم ہوتے ہیں لہٰذا اگر غیر احمدی بچوں کے جنازہ کی نماز میں

---

[1] مشہور ہے کہ چودھری سر ظفر اللہ خاں صاحب نے جو لیاقت علی خاں مرحوم کی کابینہ میں اس وقت وزیر امور خارجہ تھے، اپنے محسن اور مربی اور بانیٔ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کے نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔

ثرکت کر لی جائے تو کیا ہرج ہے؟ جواب دیا گیا کہ کیا آپ عیسائیوں کے بچوں کے نماز جنازہ
ں شرکت کر سکتے ہیں؟ اسی طرح انہوں نے کسی غیر احمدی لڑکے سے احمدی لڑکی کا نکاح
اجائز اور غیر احمدی کی لڑکی سے احمدی کا نکاح جائز قرار دیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اہل کتاب
ی لڑکیوں سے نکاح جائز لیکن ان کو لڑکی دینا ناجائز ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس معاملہ
ہ منطقی انتہا تک تو قادیانی خود پہنچا چکے اس کے جملہ مضمرات کو کھول کر وہ خود واضح
ریں اور اس کے بعد اس کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیئے یعنی یہ کہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا
جائے تو یہ اس پر واویلا کریں۔ اس میں آخر کیا معقولیت ہے؟ خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ
عتقادی طور پر وہ اپنے آپ کو خود ہی ایک علیحدہ امت قرار دے چکے ہیں لیکن وہ اس کے
ضمرات کو اس لئے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اس طرح ان کے توسیع پسند عزائم
یں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ امت مسلمہ میں شامل رہ کر وہ جس طرح ہر قسم کے مادی فوائد
ے متمتع ہو رہے ہیں اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔ غیر مسلم اقلیت ہونے کے باعث وہ حکومت
کے تمام کلیدی مناصب سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ نیز حکومت کے دفاتر اور محکمہ جات کی ملازمتوں
میں تناسب تعداد کے لحاظ سے ان کا کوٹا مقرر ہو جائے گا۔ تبلیغ اسلام کے نام سے جو زرِ مبادلہ کثیر
مقدار میں وہ ہر سال حاصل کرتے ہیں اس پر قدغن لگ جائے گی۔ مسلمانوں میں شامل رہنے کے سبب
سے فوج، سفارت خانوں اور دیگر محکموں کے اعلیٰ عہدوں تک ان کی جو پہنچ اور دسترس حاصل
ہے اس پر پابندی عاید ہو جائے گی۔ یہ نقصانات وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے وہ چاہتے
ہیں کہ آکاش بیل کی طرح شجر ملت سے چمٹے رہیں تاکہ اسی سے غذا حاصل کرتے رہیں اور اسی کی بربادی
کے باعث ہوں۔ اسی لئے وہ واویلا مچا رہے ہیں اور خود کو مسلمان ثابت کرنے کے لئے اپنے
روایتی دجل و فریب سے کام لے رہے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے خود اپنے اختیار کردہ مؤقف کے
اعتبار سے اپنے علاوہ بقیہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر بحیثیت ایک جداگانہ امت اپنا تشخص
تین چوتھائی صدی قبل ہی کر لیا تھا۔ ان حالات کی بنا پر ہر معقول اور انصاف پسند شخص اس نتیجہ
پر بہ ادنیٰ تامل پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیوں کو ایک جداگانہ غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ اور
جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ انتہائی نرم، معقول اور خود ان کے حق میں مفید فیصلہ ہے۔ اور
اس طرح ان کو بین الاقوامی سطح پر MINORITY COMMUNITY کا مقام حاصل ہو
جاتا ہے۔ اگر یہاں فی الواقع دینی نظام نافذ ہوتا تو ان پر جو کچھ بیتتی اور ان کو نئی نبوت کے اجرا

اور اس کو ماننے کے جو تاریخ بھی پڑھتے ہیں ان کے لئے کہیں زیادہ سخت ہوتے ہیں قرار دینے کا دور ہے اور ملک میں ابھی تک بالعموم انگریزی دور کا نظام معمولی حک و اضافہ کے ساتھ نافذ ہے اسی لئے ان کے ساتھ انتہائی نرم سلوک کا مطالبہ ہے ورنہ ان کے ساتھ معاملہ وہ ہوتا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ہوا اور خلافت راشدہ کے بعد بھی اسلامی سلطنت میں ارتداد کی جو سزائیں دی جاتی رہیں ان کا ان سزاؤں سے واسطہ پڑتا۔ یہ تو اکبر الہ آبادی مرحوم کے بقول اس دور کی برکت ہے کہ " انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!" — کتنے ہی لغو اور مضحکہ خیز دعاوی کئے گئے۔ حتیٰ کہ نبوت کے قلعے میں بھی رخنہ ڈال دیا گیا اور نئی نبوت کے ٹھاٹھ بالفعل جما دیئے گئے۔ اپنے علاوہ عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو کافر دے دیا، ان کے بچوں کی بھی تکفیر کر ڈالی لیکن نہ صرف یہ کہ ان کا کچھ نہ بگڑ سکا بلکہ وہ مسلمانوں میں شامل رہ کر تمام حقوق سے استفادہ کرتے رہے اور اپنے خاص سازشی کردار اور "انجمن امداد باہمی" کے طرز پر کام کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق سے کہیں بڑھ کر سہولتیں اور مراعات حاصل کیں بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ نرم ترین اور انتہائی وسعت قلبی کا سلوک ہے جو امت مسلمہ ان کے ساتھ روا رکھنا چاہتی ہے یعنی یہ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے جائیں اور ان کو ہمیشہ کے لئے جسد ملت اسلامی سے علیحدہ کر دیا جائے۔

(بقیہ از ص۱۷)

بڑی خدمت کے ارادے سے جمع ہو رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق ہم آپ ہی کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کے لیے اٹھ رہے ہیں۔ اس شیرازہ بندی سے مقصود ہرگز آپ کی مخالفت نہیں ہے اگرچہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ " الدین النصیحۃ " کی رو سے آپ کی جن باتوں کو ہم غلط سمجھتے ہیں ان پر لامحالہ ہمیں تنقید کرنی ہوگی تاہم اس سے مقصود سوائے اصلاح کے اور کچھ نہ ہوگا — آپ کی ذات سے ہمیں نہ عناد ہے نہ بغض، بلکہ ہم پروردگار سے آپ کی ہدایت اور مغفرت کی دعا ہی کرتے رہیں گے کہ " رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ "

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!

تنظیمِ اسلامی کی تاسیس کے موقع پر

جماعتِ اسلامی کے متوسّلین اور سابقین

کی خدمت میں چند گزارشات

ماخوذ از 'میثاق'، دسمبر ۱۹۷۴ء

"تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک باضابطہ قافلہ تو ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو تشکیل پایا تھا (گویا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء کو اس کی زندگی کے دس سال پورے ہو جائیں گے) لیکن اس کے لیے ذاتی فیصلے کا اعلان راقم الحروف نے ۲۱ جولائی ۱۹۷۴ء کو ایک اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر (جس کا افتتاح حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہٗ نے فرمایا تھا) اپنی ایک طویل تقریر میں کر دیا تھا ـــــ راقم کی یہ تقریر "میثاق" کے ستمبر اور پھر اکتوبر دونوں مہینوں کے مشترک شماروں میں شائع ہو گئی تھی۔ (اور اب "سرافگندیم" کے عنوان سے کتابی صورت میں طبع شدہ موجود ہے!) ـــــ مؤخر الذکر اشاعت کی تیاری کے فوراً بعد راقم کو سفرِ حج پر روانہ ہو جانا تھا لیکن پی آئی اے کی حج کی پروازوں میں تاخیر کی بنا پر "میثاق" بابت دسمبر ۱۹۷۴ء کا "تذکرہ و تبصرہ" بھی راقم ہی نے تحریر کیا جو ایک نئی تشکیل کے پیشِ نظر ماضی بعید و قریب کے "بزرگوں" اور "دوستوں"

کی خدمت میں کچھ معروضات پر مشتمل تھا ــــ "تنظیمِ اسلامی" کے دس سالہ اجتماع کے موقع پر ان معروضات کی "بارِ دگر" اشاعت سینہ کے داغوں کو تازہ رکھنے کے علاوہ ع "میری تمام سرگزشت، کھوئے ہوؤں کی جستجو!" کے مصداق بسابقہ بزرگوں اور دوستوں کو ع "ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!" کے مصداق بارِ دگر" پکارنا" بھی ہے !

ــــــــــ خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

پی آئی اے کی حج کی پروازوں کے پروگرام میں قدرے تاخیر کے طفیل ہمیں 'میثاق' کے قارئین سے اس اشاعت کے ذریعے بھی ہمکلام ہونے کا موقع مل گیا۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ" برآور ہرچہ اندر سینہ داری!" کے مصداق ہم اپنا ذہن پچھلی اشاعت میں پوری طرح کھول کر سامنے رکھ چکے ہیں اور ہمارے پاس اس میں اضافے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ گویا سطورِ ذیل کو گزشتہ شمارے کے 'تذکرہ و تبصرہ' ہی کا 'پس نوشت' (POST SCRIPT) سمجھنا چاہیئے۔

ــــــــــ

بعض لوگوں کو ہمارے بارے میں یہ خواہ مخواہ کا سوءِ ظن لاحق ہو گیا ہے کہ ہمیں جماعتِ اسلامی یا مولانا مودودی کی ذات سے کوئی عداوت یا دشمنی ہے، حالانکہ خدا گواہ ہے کہ ہمیں نہ جماعتِ اسلامی سے کوئی عداوت ہے نہ مولانا مودودی سے کوئی ذاتی رنجش یا دشمنی۔

جماعتِ اسلامی سے ہمارا اختلاف صرف طریق کار اور پالیسی کا ہے اور 'طریق کار' کے بارے میں ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ یہ ایک خالص اجتہادی 'مسئلہ' ہے جس میں اختلاف کی وسیع گنجائش موجود ہے اور اگرچہ ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے قبل از تقسیم ہند اور بعد از تقسیم طریق کار میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک جماعت کی بعد از تقسیم پالیسی بھی نہ کفر ہے نہ شرک! ہمارے نزدیک تو، جیسا کہ ہم گزشتہ اشاعت میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، اسلام کے احیاء اور ملت کی تجدید کا عمل نہایت وسیع الاطراف ہے اور اس میں قومی تحریکوں کا بھی ایک مقام ہے اور علماء کی مساعی کا بھی، علامہ اقبال مرحوم کی شخصیت بھی ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بھی، تبلیغی جماعت

کا بھی ایک اہم حصّہ ہے اور جماعت اسلامی کا بھی! چنانچہ ہم نے جب ۱۹۶۶ء میں اپنی تالیف "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" شائع کی تو اس کے دیباچے میں بھی واضح طور پر عرض کر دیا تھا کہ:

"میرے نزدیک نہ مختلف مسلمان ملکوں کو جغرافیائی و وطنی وحدت مان کر ان کے بقاء و استحکام کی سعی و جہد کفر ہے اور نہ ہی مسلمان قوم کو ایک وحدتِ ملی مان کر اس کی فلاح و بہبود کی کوشش دائرہ اسلام سے خارج۔ لیکن تمام مقاصد میں سب سے اعلیٰ مقصد اور تمام کوششوں میں سب سے برتر کوشش اعلائے کلمۃ اللہ کا مقصد اور شہادتِ حق علی الناس کی کوشش ہے۔ یہ بات جس طرح آج سے پہلے صحیح تھی اُسی طرح آج بھی حق ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ کی غرضِ تاسیس ہی یہ ہے کہ " كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ[۱] اور وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا[۲] اور آج جبکہ یہ اُمّت بحیثیت مجموعی اپنے اصل فرضِ منصبی کو نہ صرف یہ کہ ادا نہیں کر رہی بلکہ عملاً اس کے بالکل برعکس کوششوں میں مصروف ہے۔ اس اُمّت میں سے صحیح راہ پر وہی ہیں جو کم از کم وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[۳] کے مصداق بن جائیں۔

---

۱ سورہ آل عمران۔ رکوع ۱۲: "تم ہو بہتر سب اُمّتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں۔ حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔"

۲ سورہ بقرہ۔ رکوع ۱۷: "اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو اُمّت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔"

۳ سورہ آل عمران۔ رکوع ۱۱: "اور چاہیئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو" (ترجمہ شیخ الہند رح)

میرے نزدیک اگر آج سے پچیس سال قبل مسلمانانِ ہند تقریباً مجتمع ہو کر اپنے قومی و ملّی تشخص کے تحفظ اور غیر مسلم اقوام کے معاشی و تہذیبی تسلط سے بچاؤ کی فکر کر رہے تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان کی جدوجہد میں مصروف تھے تو وہ کفر تھا اور نہ ہی آج اگر جماعت اسلامی نظریہ پاکستان کی سب سے بڑی علمبردار بن کر تحریک مسلم لیگ کی وراثت حاصل کرنے کی سعی کر رہی ہے تو یہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گئی ہے — لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جب قومی و ملّی بہبود کے لیے کام کرنے والے نہ پہلے کم تھے نہ آج مفقود ہیں وہاں اُس جگہ کو پُر کرنے والا کوئی نہیں رہا جو جماعتِ اسلامی نے اپنے انتقالِ موقف سے خالی کی ہے۔"

البتہ اپنے اس موقف پر ہم پورے وثوق کے ساتھ قائم ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے اساسی نظریات اور اس کے موجودہ طریق کار میں بُعدالمشرقین پایا جاتا ہے۔ اور یہی وہ واحد نکتہ ہے جس کی وضاحت کے لیے ہم نے وہ طویل بیان تحریر کیا تھا جو اب متذکرہ بالا تالیف کے نام سے شائع شدہ موجود ہے!

ہمارے اس بیان یا ہماری اس تالیف کا جس شخص نے بھی مطالعہ کیا ہے عام اس سے کہ وہ جماعت کے اندر کا آدمی ہو یا باہر کا، وہ یہ مانے بغیر نہ رہ سکا کہ واقعتہً جماعت اسلامی کے قبل از تقسیم موقف اور بعد از تقسیم طریق کار میں تضاد و تباین کے سوا کوئی نسبت موجود نہیں۔ اس کے بعد ایک عظیم اکثریت تو ان لوگوں کی ہے جنہوں نے تسلیم کیا کہ اگر جماعت اپنے طریق کار میں تبدیلی نہ کرتی تو آج "تجدید و احیاء دین" کی سعی و جہد کے بہت سے مراحل طے ہو چکے ہوتے اور "ہنوز روز اوّل" کی صورت ہرگز نہ ہوتی۔ البتہ ایک اقل القلیل تعداد ایسے لوگوں کی بھی نکلی جنہوں نے کہا کہ جماعت کا موجودہ طریق کار صحیح ہے پہلا غلط تھا![1]

---

[1] مثلاً ۱۹۷۲ء میں حج کے موقع پر جب جماعت اسلامی ہند کے ایک اہم رکن اور بمبئی کی جماعت کے امیر سے ملاقات ہوئی اور ان سے اس موضوع پر مفصل گفتگو ہوئی تو آخر میں وہ پھٹ کر بولے کہ "ہمارے نزدیک جو کچھ مودودی صاحب اب کر رہے ہیں وہ درست ہے اور ان کا تقسیم ہند کے قبل کا موقف غلط تھا!" تو راقم نے بحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ مسئلہ زیر بحث

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دوسرے دلائل و شواہد سے قطع نظر خود مولانا مودودی نے ستمبر ۴۹ء ہی میں اس فرق کو تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ اُس ماہ کے "ترجمان" میں "رسائل و مسائل" کے تحت مولانا نے فرمایا تھا کہ "واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے" اور کہ "ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں!" اس میں اگر صرف اس بات کا اضافہ کر لیا جائے کہ اپنی اس تحریر میں مولانا نے جس طریق کار کو صرف "دوسرا راستہ" قرار دے کر چھوڑ دیا تھا تقسیم سے قبل اسی کو "واحد طریق کار" کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اور پورے چھ برس اس پر حالات کی سخت نامساعدت کے علی الرغم استقامت بھی اختیار کیے رکھی تھی تو ہمارے موقف کی مکمل ترجمانی ہو جاتی ہے۔

ہمارے اس موقف کا ایک دوسرا 'داخلی شاہد' وہ واقعہ ہے جو ہمیں حال ہی میں جماعت اسلامی پاکستان کے ایک اہم رکن کی زبانی معلوم ہُوا — یعنی یہ کہ بھارت کی جماعت اسلامی بھی باقاعدہ و باضابطہ دو حصّوں میں منقسم ہو چکی ہے جن میں سے ایک کا نام ہے "آل انڈیا جماعت اسلامی" اور دوسری کا نام ہے "جماعت اسلامی ہند!" اگرچہ اس کی تفاصیل ابھی تک ہمارے علم میں نہیں آئی ہیں کہ یہ تقسیم کس بنا پر ہوئی لیکن چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہاں بھی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں شدید اختلاف موجود تھا لہٰذا اندازہ یہی ہے کہ یہ درحقیقت اسی کا شاخسانہ ہے۔

پاکستان میں بھی بعینہٖ یہی صورت پیش آتی۔ اگر مولانا مودودی کی بھاری شخصیت میدان میں موجود نہ ہوتی۔ چنانچہ ۵۶-۵۷ء میں جماعتِ اسلامی کی مرکزی شوریٰ میں پالیسی

(حاشیہ : پچھلے صفحے سے پیوستہ)

کے نصف حِصّے پر ہمارا اتفاق رائے ہو گیا ہے، بقیہ نصف حِصّے پر بحث پھر کریں گے!"
— اسی طرح ۵۸ء میں جب مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ راقم کو "سمجھانا" چاہا تو

اپنی گفتگو کا آغاز اس جملے سے کیا کہ "جہاں تک مولانا مودودی کے قبل از تقسیم ہند کے نظریات کا تعلق ہے مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے!" اس پر میں نے عرض کیا کہ "میرے اور آپ کے مابین گفتگو کی کوئی مثبت اساس ہی موجود نہیں اس لیے کہ میری ساری دلچسپی مودودی صاحب کے ان ہی نظریات سے ہے!"

اور طریق کار کے مسئلے پر باقاعدہ دو گروپ وجود میں آگئے تھے اور بہترین صورت یہی تھی کہ دونوں گروپ خوشدلی کے ساتھ علیحدہ ہو کر اپنے اپنے طریق کار پر عمل پیرا ہو جاتے۔ لیکن مولانا مودودی نے اپنی شخصیت کا پورا وزن ایک پلڑے میں ڈال دیا۔ نتیجۃً دوسرے گروپ کے لوگ ع

"کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!"

کے مصداق مایوس اور بددل ہو کر علیحدہ ہوتے چلے گئے اور ان کی شکستہ خاطری نے انہیں فوری طور پر مجتمع ہو کر کسی مثبت تعمیری کام میں لگ جانے کے قابل بھی نہ چھوڑا

یہاں یہ بات بھی واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ پالیسی کے بارے میں اختلافی نقطۂ کے حامل صرف وہی نہیں تھے جو اس وقت جماعت سے علیحدہ ہو گئے بلکہ اور بھی بہت سے لوگ تھے جو اس ہنگامی صورتِ حال کے باعث جو اس وقت پیدا ہو گئی تھی کشمکش میں مبتلا ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے تو مختلف مراحل پر علیحدگی اختیار کر لی اور بعض جماعت کے اندر تو رہے لیکن پالیسی اور طریق کار کے بارے میں ذہنی اُلجھاؤ کے باعث عملاً عضوِ معطل بن کر رہ گئے! اور اس طرح خلوص و اخلاص کا بہت سرمایہ اور قوتوں اور صلاحیتوں کا ایک بڑا اثاثہ اس شعر کے مصداق بے کار ہو کر رہ گیا کہ ؎

تری رہبری کا یہ فیض ہے قدم اہلِ شوق کے رک گئے
نہ کوئی جوازِ سفر ملا نہ کوئی دلیلِ قیام ہے!!

۶۷ء میں 'تنظیم اسلامی' کے قیام کی سعی درحقیقت اسی غرض سے کی گئی خلوص و اخلاص کے اس سرمائے اور قوتوں اور صلاحیتوں کے اس اثاثے کو کسی مثبت تعمیری جدوجہد میں لگایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے داعیوں میں سے تین حضرات وہ جو ۵۷ء میں جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے اور جماعت کے اندر انہیں جو مقام حاصل وہ اس سے ظاہر ہے کہ تینوں مولانا مودودی کی اسارت و نظر بندی کے مختلف مواقع جماعت اسلامی پاکستان کی امارت کے منصب پر فائز رہے تھے، یعنی مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحب — اور تین وہ تھے جو بعد میں مختلف مراحل پر علیحدہ ہوئے یعنی مولانا عبدالحق جامعی، سردار محمد اجمل خان لغاری

کٹر محمد نذیر مسلم ـــــ اور سات میں کا ساتواں ، تھا ان سطور کا راقم جو اگرچہ علیحدہ تو ۵۷ء
میں ہو گیا تھا ، لیکن ظاہر ہے کہ علم اور تجربے دونوں کے اعتبار سے وہ نہ ۴۸ء میں
ی شمار قطار میں تھا اور نہ ۵۷ء میں !

لیکن افسوس کہ یہ کوشش بھی کچھ خارجی مخالفت اور زیادہ تر اندرونی سہو تاثر کا
کار ہو گئی اور اپنے پیچھے مایوسی اور دل شکستگی کے گہرے سائے چھوڑ گئی ۔ چنانچہ
لانا امین احسن اصلاحی نے یہ طے کر لیا کہ باقی تمام مہلتِ عمر اور کُل قوت و صلاحیت
سیر تدبر قرآن کی تحریر و تسوید کے لیے وقف کر دیں گے ۔ مولانا عبد الغفار حسن نے مستقل
یرہ حجاز مقدس میں لگا لیا کہ ایک خالص دینی اور علمی شغل پر مستزاد سعادتِ مجاورت
مین شریفین تو میسر ہے ، وقس علیٰ ہذا ۔

نتیجۃً اب پورے سات برس بعد " سات میں کے ساتویں " کو ہمت کرنی پڑی ہے
، وہ کھڑا ہو اور اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرے جو تقسیم ہند کے موقع پر جماعت اسلامی
کے انتقال موقف کے باعث پیدا ہوا تھا اور تا حال پُر نہیں کیا جا سکا ۔

اس موقع پر اولین گزارش تو ہمیں ان حضرات سے کرنی ہے جو ۵۷ء میں تنظیم اسلامی
، قیام کی سعی میں بحیثیت داعی شریک تھے اور وہ یہ کہ یہ درحقیقت آپ ہی کا کام ہے ،
سے راقم الحروف لے کر کھڑا ہوا ہے وہ اپنے بارے میں ہرگز کسی کبر یا عجب میں مبتلا نہیں
ر اب بھی وہ اپنے آپ کو " سات میں کا ساتواں " اور آپ حضرات کو اپنا بڑا اور بزرگ ہی
سمجھتا ہے ۔ سامنے وہ اس لیے آ گیا کہ اس کے سوا اب اُسے کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آیا ۔
س کا یہ مقام تو ہرگز نہیں کہ وہ آپ حضرات سے کہے کہ " آؤ اور میرا ساتھ دو ! " خصوصاً
س حقیقت کے پیشِ نظر کہ اس کے بعض خیالات سے آپ حضرات متفق بھی نہیں ہیں !
بتہ دو باتوں کا متمنی وہ ضرور ہے ۔ ایک یہ کہ آپ حضرات اس کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ
س کام میں اس کی رہنمائی بھی فرمائے اور تائید بھی اور دوسرے یہ کہ اسے کم از کم اپنے مخلصانہ
شوروں سے ضرور نوازتے رہیں ـــــ وہ آپ کے مشوروں کا تو محتاج ہے ہی تنقید کا بھی
یر مقدم کرے گا ! اس سے بڑھ کر اگر آپ " دامے ، درمے ، سخنے " اس کی مدد بھی فرمائیں
، یہ آپ کا صدرجہ ایثار ہو گا جس کا اجر آپ اپنے رب سے پائیں گے ، رہا وہ تو اس کا
ال تو " رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ " کا کامل مصداق ہے ۔

اور وہ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے تہی دست و محتاج سمجھتا ہے۔!

یہاں قارئین "میثاق" کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ راقم نے چند ہی دن قبل مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی دو درخواستیں پیش کیں تو انہوں نے کمال شفقت سے ان دونوں کو قبول فرما لیا اور فرمایا کہ "تم نے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس کی ہمت نہ تھی لیکن اب جبکہ تم نے بوجھ اٹھا ہی لیا ہے تو میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم اس میں ناکام ہو بلکہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس میں تمہیں کامیاب کرے۔ ہمیں اپنے دوسرے بزرگوں سے بھی اسی کی توقع ہے اور ان شاء اللہ العزیز ہمیں اس معاملے میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔!

ثانیاً ان تمام حضرات سے جو مختلف اوقات میں پالیسی اور طریق کار کے اختلاف کے باعث جماعت سے علیحدہ ہوئے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ مایوسی اور دل شکستگی سے دامن چھڑائیں اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو مجتمع (POOL UP) کر کے اسی طرز پر سعی و جہد میں لگ جائیں جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں۔

اس ضمن میں راقم اپنی ان ہی گزارشات کے دہرانے کو کافی سمجھتا ہے جو ۶۶ء میں 'تنظیم اسلامی' کے قیام کے فیصلے کے بعد 'میثاق' کی ستمبر اکتوبر ۶۶ء کی اشاعت کے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں پیش کی گئی تھیں:۔

"اجتماع رحیم یار خان کے دوران بہت سے پرانے رفقاء سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا تو راقم الحروف کے اس خیال کو مزید تقویت حاصل ہوئی کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے ایسے حضرات کو چھوڑ کر جو اپنی کسی ذاتی مجبوری کی بنا پر علیحدہ ہوئے یا کسی دینی و اخلاقی کمزوری کے سبب سے علیحدہ کر دیے گئے، پالیسی اور طریق کار سے اختلاف کی بنا پر جتنے لوگ جماعت سے علیحدہ ہوئے چاہے وہ حال ہی میں علیحدہ ہوئے ہوں، چاہے آج سے دس سال قبل اور چاہے اس سے بھی پہلے، ان سب کا طرزِ فکر تقریباً یکساں اور سوچنے کا انداز بہت حد تک مشابہ ہے۔ ان کے نقطۂ نظر میں تھوڑا بہت فرق اگر ہے بھی تو صرف اس اعتبار سے کہ کسی کے نزدیک اختلاف کا کوئی ایک پہلو اہم تر ہے اور کسی کے نزدیک کوئی

دوسرا، یا آخری تجزیے میں کسی کے خیال میں اصل غلطی کوئی سی ہے اور کسی کے خیال میں غلطی کا اصل سبب کوئی دوسرا ہے ___ پھر کچھ اسی بنا پر اور کچھ ذاتی رجحانات اور ذوق کے فرق کی بنا پر کسی کے صبر کا پیمانہ کسی مرحلے پر لبریز ہوا اور کسی نے کسی دوسرے مرحلے پر طے کیا۔ کہ اب مزید ساتھ چلنا ممکن نہیں۔ چنانچہ مختلف اوقات میں علیحدگی کے وقت علیحدگی کے جو اسباب بیان ہوئے وہ بھی لازماً ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف تھے ___ بایں ہمہ تھوڑے سے تبادلہ خیال اور باہمی گفتگو سے یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فی الواقع سب کا طرزِ فکر اور نقطۂ نظر تقریباً یکساں ہے اور مختلف کڑیوں کے جوڑنے سے جو مکمل نقشہ بنتا ہے وہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے ___ !!

بدقسمتی سے ماضی میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگوں کے مابین نقطۂ نظر کے اس باریک فرق پر جو مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر پیدا ہوا تھا کچھ تو رفقاء خود بھی زیادہ زور دیتے رہے اور کچھ باہر کے لوگوں نے اسے زیادہ ہی شہرت دے دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تِل کا پہاڑ بن گیا ؎

کچھ تو ہوتے بھی ہیں الفت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ دیوانہ بنا دیتے ہیں

چنانچہ کبھی یہ کہا گیا کہ جماعت سے علیحدہ ہونے والوں میں سے کوئی دو افراد بھی باہم متفق نہیں ہیں ___ کبھی یہ پھبتی چُست کی گئی کہ ان میں سے ہر شخص لیڈر ہے!" اور کبھی اپنے معتقدین کو یہ دلاسا دیا گیا کہ "آپ مطمئن رہیں، خوارج کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔" اور ان باتوں کا واقعتہً کچھ ایسا نفسیاتی اثر پڑا کہ خود علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے بعض اس بات سے مایوس ہوتے چلے گئے کہ وہ دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لیے جمع ہو سکتے ہیں!

اوّل تو جو لوگ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے وہ سیاست بازی کے کسی کھیل کے لیے جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ جماعت میں ان کی شمولیت

ایک خالص دینی مقصد کے تحت اور اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے تھی لہٰذا جب ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان کے لیے جماعت میں شامل رہنا ممکن نہ رہا تو یہ حادثہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے عمر عزیز کے دس دس، پندرہ پندرہ بلکہ سترہ سترہ سال اس کی نذر کیے تھے کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، ان پر صدمے کی کیفیت کا طاری ہونا بالکل فطری تھا۔ پھر جماعت کے مخصوص تنظیمی ڈھانچے کی بنا پر ان میں سے ہر ایک نے ہر مرحلے پر اپنا لائحۂ عمل خالصتاً اپنی ذاتی صوابدید پر طے کیا۔ چنانچہ کوئی کسی مرحلے پر کارواں سے ٹوٹا اور کوئی کسی مرحلے پر بدگماں ہُوا اور مختلف لوگ مختلف اوقات میں جماعت سے الگ ہوئے — بنا بریں ان کا فوری طور پر کسی نئے نظم میں منسلک ہونا خارج از امکان تھا۔ بعد میں جوں جوں وقت گزرا ، روابط قائم ہوئے اور افہام و تفہیم کے مواقع نہ رہے تو نقطۂ نظر کا وہ باریک سا فرق جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اہمیت اختیار کرتا چلا گیا ہر شخص کی سوچ اپنے ہی زاویے پر آگے بڑھتی گئی اور بعض اوقات بالکل متضاد باتیں بھی سُنائی دینے لگیں — چنانچہ شماتتِ ہمسایہ کے لیے بنیاد فراہم ہوگئی — اور وہ سب کچھ کہا گیا جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔!

اس داستان کو دہرانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بعض رفقاء کے ذہنوں پر جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کے باہمی اختلافات کے چرچے کا خاصا اثر ہے اور اس امر کی واقعی ضرورت ہے کہ ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے ذریعے ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسے ہی روابط استوار ہوتے ہیں باہم افہام و تفہیم کا موقع ملتا ہے۔ اور ما بہ الاختلاف مسائل کے ساتھ ساتھ ان وسیع تر اور اہم تر امور پر نظر کی جاتی ہے جن میں کامل اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور جن کی بنا پر سب لوگ دس دس، پندرہ پندرہ اور بعض حالات میں سترہ سترہ سال ایک ہی اجتماعیت میں فعال کارکنوں کی حیثیت سے شریک رہے تھے تو اختلاف، نسبتاً منسیاً ہو جاتا ہے اور وہ کیفیت

پیدا ہو جاتی ہے کہ ـــ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جتنی بڑی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص کو انفرادی طور پر جوابدہی کرنی ہے، (وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا) اتنی ہی بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں انسان منفرد نہیں پیدا کیا گیا بلکہ ایک اجتماعیت کے جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اجتماعیت اس کی فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے ـــ خصوصاً اس دور میں جبکہ "اجتماعیت" اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اور باطل پوری طرح منظم اور مجتمع ہے۔ حق اور اہلِ حق کے لیے اجتماعیت سے گریز کسی طرح بھی مناسب نہیں ـــ بنا بریں ہم اپنے تمام رفقاء اور بزرگوں کی خدمت میں یہ گزارش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ وقت کے فرض کو پہچانیں اور اس کی آواز پر لبیک کہیں اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو مجتمع کر کے حق کے اظہار اور اس کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اس کے لئے اگر اپنے ذاتی رجحانات اور انفرادی ذوق بلکہ ذاتی خیالات و نظریات تک میں کسر و انکسار کا کسی قدر ایثار کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کریں ـــ اللہ تعالیٰ اس پر انہیں یقیناً اجر دے گا۔ ویسے ہم علیٰ وجہ البصیرت یہ جانتے ہیں کہ اس کی ضرورت بھی محض ابتداء ہی میں ہو گی ـــ اور جیسا کہ عرض کیا گیا روابط کے از سرِ نو استوار ہوتے ہی اختلاف کا سارا افسوں ٹوٹ کر رہ جائے گا !۔"

آخر میں جماعت اسلامی کے احباب کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ وہ ہمیں اپنا دشمن، نہ سمجھیں اور مولانا مودودی کی خدمت میں بھی التماس ہے کہ وہ ہمارے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں بلکہ "اختلاف" کو اس کی حقیقی اور واقعی نوعیت تک محدود رکھیں[1]۔ اس ضمن میں بھی ہم اب کچھ مزید کہنے کی بجائے "میثاق" کے محولہ بالا شمارے

---

[1] راقم کو بہت دُکھ ہوا یہ معلوم کر کے کہ جماعت کے حلقوں میں یہ خبر.. (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہی سے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں :

"اس موقع پر بالکل ذاتی حیثیت میں ایک گزارش راقم الحروف جماعت اسلامی کے بزرگوں خصوصاً مولانا مودودی کی خدمت میں کرنا چاہتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران راقم الحروف کے بعض اقدامات اور ان کی بعض تقریروں سے یقیناً آپ کو شدید تکلیف پہنچی ہوگی لیکن خدا شاہد ہے کہ دل کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی ان میں سے کسی اقدام یا تحریر سے آپ کی دل آزاری ہرگز مقصود نہ تھی۔ راقم الحروف کے دل میں اظہار دین حق اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ ہی کی تحریروں سے پیدا ہوا — اسی جذبے سے سرشار ہو کر طالب علمی کے قیمتی اوقات اور عمر عزیز کے بہترین لمحات آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر جدوجہد کی نذر کیے — پھر جب محسوس ہوا کہ آپ غلط رُخ پر چل نکلے ہیں تو ایک بیان کی صورت میں اپنے خیالات کو قلمبند کیا اور آپ سے درخواست کی کہ: "اپنی تو کوئی ایسی خدمت نہیں ہے جس کا واسطہ دے سکوں۔ آپ ہی کی شفقتیں اور عنایتیں ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس بیان کو ضرور پڑھ لیں" — ماچھی گوٹھ کے بھرے اجتماع میں سٹیج پر اعلان کیا کہ : " اگرچہ مجھے اپنے موقف کی صحت کا یقین ہے اور رابہر جماعت

حاشیہ : پچھلے صفحے سے پیوستہ

گشت کر رہی ہے کہ راقم دراصل حکومت پاکستان کے سرکاری حج وفد کے ساتھ حج کے لیے جا رہا ہے۔ پہلے جب ایک صاحب نے اس کا ذکر کیا تو راقم نے اسے مذاق سمجھا اور قطعاً اہمیت نہ دی۔ لیکن گزشتہ اتوار کو درسِ قرآن کے بعد مسجد شہداء میں دو حضرات نے فرمایا کہ یہ بات علماءِ کرام کی ایک مجلس میں کہی گئی جہاں مولانا مودودی بھی موجود تھے تو باور ہی کرنا پڑا کہ کسی کو واقعتہً کوئی مغالطہ لگا ہے۔ لیکن ساتھ ہی سخت صدمہ ہوا کہ اگر ہمارے علماءِ کرام بھی اس درجہ غیر محتاط ہیں تو دوسروں سے کیا توقع کی جائے ع

" چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی "

کی طویل تقریر میں مجھے کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ تاہم مَیں جماعت میں شامل رہوں گا۔ اس لیے کہ اس کے بغیر مَیں اپنے وجود کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا!" لیکن پھر جب کچھ آپ کی عنایتوں میں مزید اضافہ ہُوا اور آپ نے اہلِ اختلاف پر ضعفِ ارادہ بسیط اور ضعفِ ارادہ مرکب کی پھبتیاں چُست کرنی شروع کیں اور کچھ یہ محسوس ہُوا کہ جماعت میں ایک عضوِ معطّل کی حیثیت سے رہنا آخر چہ سُود؟ تو یہ کہتے ہوئے ایک بھاری دل کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی کہ: "مَیں جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان ومتفق مجھ سے حقیقی محبّت کا تعلّق رکھتے ہیں۔ جب مَیں سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے مَیں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا — !" علیحدہ ہونے کے بعد بھی کم وبیش پانچ سال تک شدید اختلاف کے باوجود آپ کے ساتھ وہی قلبی تعلّق قائم رہا جو ایک احسان مند کا اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس قلبی کیفیّت کا اظہار بھی کیا تھا — افسوس کہ اس کے فوراً بعد آپ کے دو اقدامات یعنی ایک غلافِ کعبہ کے سوانگ اور دوسرے سہروردی مرحوم سے ربط وتعلق کی بدولت دل کی یہ کیفیت برقرار نہ رہ سکی اور ذہنی دُوری کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلبی بُعد بھی قائم ہو گیا جس میں رنج کے ساتھ غصّے کی بھی آمیزش تھی۔ اب خلافت وملوکیت لکھ کر عمر کے آخری حصّے میں جو کمائی آپ نے کی ہے اس کی وجہ سے غصّے کی جگہ حسرت نے لے لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے دل کانپنے لگتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے کہ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ!

بایں ہمہ اب جبکہ ہم، آپ کے کچھ قدیم ساتھی، رفیق اور نیاز مندِ دین کی چھوٹی

(بقیہ صـ۵۸)

اِن شاءاللہ اِس سال قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں

۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء روزانہ بعد نمازِ مغرب

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیرِ اہتمام سالانہ

محاضراتِ قرآنی

کا موضوع :

' قرآن کا تصوّرِ فرائضِ دینی '

ہو گا، جس میں ان شاءاللہ العزیز جملہ مکاتبِ فکر کے جیّد علماءِ کرام حصّہ لیں گے۔

ذیلی عنوانات

عبادتِ ربّ، شہادت علی النّاس، اقامتِ دین

جہاد فی سبیل اللہ، التزامِ جماعت، بیعتِ سمع و طاعت

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے !

"تنظیمِ اسلامی" کے دسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر منعقد ہونے والے محاضراتِ قرآنی کا موضوع:

فرائضِ دینی کا جامع تصوّر

اور اس پر ——— اصحابِ علم و فضل کو

دعوتِ تنقید و ہدایت!

——— از ———

ڈاکٹر اسرار احمد، امیر تنظیمِ اسلامی

عریضہ بنام علمائے کرام

محترم و مکرم جناب ———

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ——— مزاج گرامی!

جناب کے علم میں ہے کہ راقم الحروف اللہ کی کتابِ حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اس کے دینِ متین کا ایک حقیر خادم ہے۔ اُس نے ایک انجمن "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے نام سے ۱۹۷۲ء میں قائم کی تھی جس کا وہ تاحیات صدر ہے۔ اور ایک دینی جماعت "تنظیمِ اسلامی" کے نام سے ۱۹۷۵ء میں قائم کی تھی جس کا وہ امیر ہے!

انجمن کے جملہ وابستگان اور تنظیم کے تمام شرکار، ظاہر ہے کہ راقم ہی کے دروسِ قرآن، اور تحریروں اور تقریروں سے متأثر ہو کر راقم کے معاون و مددگار بنے ہیں ——— لیکن، الحمد للہ، کہ راقم کا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اپنے رفقاء و

معاونین کو صرف اپنے ہی فہم و فکر کے حصار میں محصور نہ رکھوں، بلکہ وسیع تر حلقے سے ذہنی و فکری استفادے کی تلقین بھی کروں اور اس کے مواقع بھی پیدا کروں ـــــ چنانچہ انجمن کے زیرِ اہتمام جو سالانہ "قرآن کانفرنسوں" اور "محاضراتِ قرآنی" کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا ہے اور اُن میں جملہ مکاتبِ فکر کے علمائے کرام اور اصحابِ علم و فضل حصہ لیتے رہے ہیں تو اس سے دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیشِ نظر رہا ہے کہ وابستگانِ انجمن اور رفقائے تنظیم کا ذہنی افق وسیع ہو اور وہ جس راہ پر چلیں "علیٰ وجہ البصیرت" چلیں!

آئندہ ماہ، **۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء** ایسا ہی موقع آ رہا ہے۔ چنانچہ ان ایام میں، ان شاء اللہ العزیز **"قرآن اکیڈمی"** **۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور** میں صبح کے اوقات میں تنظیمِ اسلامی پاکستان کے رفقاء کے خصوصی اجتماعات ہوں گے اور **روزانہ بعد نماز مغرب** انجمن کے زیرِ اہتمام **"محاضراتِ قرآنی"** کے عنوان سے عمومی جلاس ہوں گے۔

اس موقع پر "محاضراتِ قرآنی" کے ضمن میں راقم نے طے کیا ہے کہ اصحابِ علم و فضل کو اپنے دینی فکر، بالخصوص **"تصوّرِ فرائضِ دینی"** پر تنقید کی دعوت دے تاکہ اگر انہیں اُس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اُس کی نشاندہی فرمائیں، بصورتِ دیگر تائید و تصویب سے نوازیں ـــــ اِس مقصد کے لئے راقم نے اپنی دینی سوچ، خصوصاً اپنے تصوّرِ فرائضِ دینی کا ایک "خلاصہ" مرتب کیا ہے جو جناب کی خدمت میں اس عریضے کے ساتھ ارسال ہے!

جناب سے درخواست ہے کہ اس کا بغور مطالعہ فرما کر ـــــ جناب پسند فرمائیں تو اس پر بحیثیتِ مجموعی خطاب فرمائیں، اور مناسب خیال فرمائیں تو اس کے کسی ایک جزو کو اپنے خطاب کے لئے منتخب فرمالیں ـــــ مزید گذارش ہے کہ اگر جناب اپنے خیالات تحریراً پیش فرما سکیں تو راقم اور اس کے رفقاء کے مستقل استفادے کی صورت بن جائے گی، اور تقریر کی صورت میں بھی اگر

اسکا غلاصہ جناب خود مرتب فرماویں گے تب بھی افادیت زیادہ ہوگی — تاہم آپ کی شمولیت ہمارے لیے ہر حال میں مفید ہوگی۔

جیسے کہ جناب منسلکہ اوراق میں ملاحظہ فرمالیں گے راقم کا تصوّرِ فرائضِ دینی چھ ۶ عنوانات کے ذیل میں مندرج ہے: تین ۳ اساسی فرائض، اور تین ۳ ان کے لوازم، — اِدھر محاضرات بھی ان شاءاللہ چھ ۶ یوم جاری رہیں گے۔ بنا بریں مناسب تقسیم یہ رہے گی کہ روزانہ ایک ایک عنوان زیرِ بحث آئے، چنانچہ اگر جناب ان میں سے کسی ایک عنوان پر اظہارِ خیال فرمانا چاہیں تو اگر دنوں کی ترتیب کے لحاظ سے پروگرام بنالیں تو انسب ہوگا، اگر بحیثیت مجموعی پورے تصوّرِ فرائض پر گفتگو کرنی مقصود ہو تو وہ کسی بھی دِن کی جا سکے گی۔ بہرحال اس ضمن میں کوئی چیز بھی 'شرط' کے درجے میں نہیں ہے!

اِسی طرح 'ان شاءاللہ العزیز' سِوائے ایک وقت کی پابندی کے اور کوئی پابندی کسی مقرّر پر نہیں ہوگی اور آزادانہ اظہارِ خیال کا پورا موقع ہوگا — اس ضمن میں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ ان اجتماعات میں راقم خود بھی سراپا گوش رہے گا اور امکانی حد تک 'استفادے' کی کوشش کریگا اور صورت ہرگز کسی بحث مباحثے کی نہیں بنے گی۔

آخر میں بادب مؤدّبانہ گذارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لئے ضرور وقت نکالیں۔ اس لئے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی، خصوصاً جبکہ اُس کا محرّک و داعی خود اس کے لئے مستدعی ہو ایک اہم دینی فریضہ ہے! — بصورتِ دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی جناب ہی نے توجّہ نہ فرمائی، فقط والسلام مع الاکرام۔

رہنمائی کا طالب، خاکسار اسرار احمد عفی عنہٗ

لاہور - ۱۲ ار فروری ۸۵ء

میرے تصورِ فرائضِ دینی کا خلاصہ

★ **تمہید:-** انسانی شخصیت کے دو رُخ ہیں: ایک علم دوسرے عمل
اسلام میں علمِ صحیح کا مظہرِ اتم 'ایمان' ہے۔
جبکہ عملِ صحیح کی اساس 'تصورِ فرائض' پر قائم ہے۔
'ایمان' انسان کو علمِ حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا صحیح محرّکِ عمل بھی دیتا ہے، اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے، چنانچہ ایمان کی ماہیت، اس کی تفاصیل، اس کے درجات، اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے لوازم و ثمرات اہم ترین موضوعات ہیں لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ 'تصورِ فرائضِ دینی' پر ہے!

★ **راقم کے نزدیک ایک مسلمان کے 'اساسی دینی فرائض' تین ہیں:**

(۱) ایک یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

★ اس کے لئے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام، اطاعتِ خدا و رسول، تقویٰ اور عبادت۔

★ یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن، ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جزوی یا جزوقتی —— الاّ یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یا جذبات کی رَو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے، تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں لازماً مقبول ہوگی (النساء: ۱۷) —— اس کے برعکس اگر جان بوجھ کر کوئی ایک 'معصیت' بھی مستقل طور پر اختیار کر لی گئی اور اس پر توبہ کی بروقت توفیق نہ ملی تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے بلکہ جہنم میں داخلے، حتّٰی کہ 'خلود فی النار' تک

کا اندیشہ ہے (البقرہ : ۸۱) اِلّا یہ کہ حقیقی اور واقعی 'اِضطرار' ہو !!

(۲) دوسرے یہ کہ دُوسروں کو حتیٰ المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے !

☆ اس کے لئے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں جیسے انذار، تبشیر، تذکیر، وعظ، نصیحت، وصیّت، تعلیم، تبیین، تلقین،

☆ لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں : تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی النّاس ۔

☆ یہ خود انسان کی اپنی شرافت و مروّت کا تقاضا بھی ہے اور اَبنائے نوع کی ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا بھی، لیکن سب سے بڑھ کر یہ سیّد المرسلین محمدؐ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ختمِ نبوّت کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسُولؐ کی جانب سے اتمامِ حجّت یعنی "شہادت علی النّاس" کی ذمّہ داری بحیثیتِ مجموعی اُمّتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے کندھوں پر ہے !

(۳) تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس کے دینِ حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لئے تن، من، دھن سے کوشاں ہو۔

★ اس کیلئے قرآن حکیم کی چار اساسی اصطلاحات ہیں : تکبیرِ ربّ، اِقامتِ دین، اظہارِ دینِ الحق علی الدّین کلّہ، اور 'لیکون الدین کلّہ للہ'

★ حدیث نبویؐ میں ایک پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے : لِتکونَ کلمۃُ اللہِ ھِیَ العُلیا ــــ اور

★ تین عام فہم تعبیرات ہیں : قیامِ حکومتِ الٰہیہ، نفاذِ نظامِ اسلامی اور اِسلامی انقلاب !

مذکرہ بالا تین فرائض کی باہمی نسبت اور انکے ایمان اور ارکان اسلام کے ساتھ ربط و تعلق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہوجاتا ہے جس کی ــ (i) ایک زیرِ زمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دارو مدار اسی پر ہے ۔ (ii) اسی بنیاد کا ایک حصہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں "کرسی" اور انگریزی میں کہتے ہیں ــ (iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں، دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں، ظاہر ہے کہ اوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے (iv) ان ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے (v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے (vi) اس کے اوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اُس کا بھی معاملہ یہی ہے ـــــــ!

اس مثال میں : (ا) زیرِ زمین بنیاد ـــ ایمان کا "تصدیق بالقلب" والا حصہ یعنی یقینِ قلبی ہے! (ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصہ ـــــــ "اقرار باللسان" ـــــ یعنی کلمۂ شہادت ہے! (ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ۔ (د) پہلی چھت اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے (ھ) دوسری چھت ـــ تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس سے عبارت ہے ـــــ اور (و) تیسری اور آخری چھت تکبیرِ ربّ، اقامتِ دین، اظہارِ دین، اعلاءِ کلمۃ اللہ یا قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی مظہر ہے! واللہ اعلم!!

★ اِن تین اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے تین لوازم لابدّ منہ ہیں :

(۱) دوام "جہاد فی سبیل اللہ" جس کا ظہور :

★ فریضۂ اوّل کے ضمن میں (i) نفسِ امّارہ (ii) شیطانِ لعین اور اس کی ذریتِ صلبی و معنوی اور (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے غلط رجحانات اور دباؤ ـــــــ کے خلاف جدّ و جہد اور زور لگانے

کی صورت میں ہوتا ہے اور حدیثِ نبویؐ کی رُو سے یہی 'افضل الجہاد' ہے۔

★ فریضۂ ثانی کے ضمن میں دعوت و تبلیغ کے لئے جان و مال کھپانے کی صورت میں ہوتا ہے، اور

★ فریضۂ ثالث کے ضمن میں سر دھڑ کی بازی لگانے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کی قوتوں سے 'بالفعل' اور 'بالید' پنجہ آزمائی کی صورت میں ہوتا ہے جس کے لئے تن، من، دھن لگا دینے کا عزم، حتیٰ کہ جان دیدینے کی 'آرزو' کا ہونا لازمی ہے!

گویا جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس اور آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے!

واضح رہے کہ اِسی کا 'منفی پہلو' ہجرت ہے'

چنانچہ اسکی بھی پہلی منزل "اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ" ہے اور آخری یہ کہ اقامتِ دین کی جدّوجہد میں وقت آنے پر گھر بار، مال و منال اور اہل و عیال کو چھوڑ کر نکل جایا جائے!

جہاد کی پہلی دو منزلوں کے لئے اصل آلہ و ہتھیار قرآن مجید ہے یعنی 'جہاد بالقرآن' چنانچہ 'مجاہدہ مع النفس' کا موثر ترین ذریعہ ہے قرآن کے ساتھ قیام اللیل یا تہجد!

اور دعوت و تبلیغ کا پورا عمل بھی قرآن حکیم ہی کی اساس پر اور اسی کے ذریعے ہونا چاہیئے!! -

تیسری اور آخری منزل پر عہدِ حاضر میں 'جہاد بالید' کی موزوں ترین صورت فواحش و منکرات کے خلاف پُرامن

مظاہرے ہیں، لیکن اس میں نوبت فقہاء کرام کی طے کردہ شرائط کے تحت، قتال یعنی 'جہاد بالسیف' تک بھی آ سکتی ہے۔

(۲) لزومِ اجتماعیت، جس کا تقاضا:

★ فریضۂ اوّل کے ضمن میں صرف صحبتِ صالح (بلغوائے: "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ") سے بھی پورا ہو سکتا ہے!

★ اسی طرح فریضۂ ثانی کے ضمن میں درسگاہوں، اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں سے پورا ہو سکتا ہے!

★ لیکن فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'سمع وطاعت فی المعروف' کے ٹھیٹھ اسلامی اور عسکری اصول پر مبنی جماعت کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا (اور یہی مراد ہے آنحضورؐ کے ان الفاظ مبارکہ سے کہ: "اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ"

(احمدؒ والترمذیؒ عن الحارث الاشعریؓ)

(۳) 'بیعت' ——— جو: ———

★ پہلے دو فرائض کے ضمن میں 'بیعتِ سلوک وارشاد' کی صورت میں کفایت کرتی ہے۔ لیکن

★ فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف' کی صورت لازمی ولابدی ہے! چنانچہ اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے مسلمؒ کی روایت (عن عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما) سے جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوتے ہیں کہ "مَنْ مَّاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِهٖ بَیْعَةٌ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً" ——— !" ——— واضح رہے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں: (i) اگر کم سے کم شرائط ومعیارات پر پورا اترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اس کے سربراہ سے

بیعت سمع وطاعت ہوگی ——— اور (۱) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعتِ سمع وطاعت ہوگی ——— اور تیسری کوئی صورت ممکن نہیں !

★ **چنانچہ: (۱) 'انجمن خدام القرآن' کا مقصد ہے 'جہاد بالقرآن'،** یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں اس کے قیام کے وقت اس کے جو 'اغراض ومقاصد' معین ہوئے وہ یہ تھے: (۱) عربی زبان کی تعلیم و ترویج (۲) قرآن مجید کے مطالعہ کی عام ترغیب و تشویق (۳) علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت، (۴) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت جو تعلیم و تعلّمِ قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں ——— اور (۵) ایک ایسی 'قرآن اکیڈمی' کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے، اور

(۲) 'تنظیمِ اسلامی' ہے 'جملہ دینی فرائض' کی انجام دہی کے لئے 'بیعتِ ہجرت وجہاد فی سبیل اللہ وسمع وطاعت فی المعروف' پر مبنی خالص دینی جماعت !!

میں نے اپنا مافی الضمیر کھول کر بیان کر دیا ہے اب علمائے کرام اور اصحابِ دانش کا فرض ہے کہ رہنمائی فرمائیں ! خاکسار اسرار احمد

—————(نوٹ)—————

مندرجہ بالا خط مع 'خلاصۂ تصورِ فرائضِ دینی'، حسب ذیل حضرات کو ارسال کیا گیا ہے:

مولانا سید حامد میاں صاحب لاہور	مولانا عبید اللہ انور صاحب لاہور
مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب ؍	حافظ عبد القادر روپڑی صاحب ؍
مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب ؍	مولانا محمد حنیف ندوی صاحب ؍
مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی صاحب ؍	مولانا محمد متین ہاشمی صاحب ؍
مولانا سعید الرحمن علوی صاحب ؍	علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب ؍

مفتی غلام سرور صاحب لاہور
نعیم صدیقی صاحب ؍؍
مولانا اسعد گیلانی صاحب ؍؍
جسٹس ملک غلام علی صاحب ۔
مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب کراچی
مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب ؍؍
مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی ؍؍
مولانا مولانا عبدالوکیل صاحب خطیب ؍؍
مولانا منتخب الحق قادری صاحب ؍؍
مولانا مفتی ولی حسن صاحب
مولانا وصی مظہر ندوی صاحب حیدرآباد
مولانا احمد سعید کاظمی صاحب ملتان
مفتی زین العابدین صاحب فیصل آباد
مفتی سیاح الدین کاکاخیل صاحب ؍؍
مولانا اسحٰق چیمہ صاحب ؍؍
علامہ عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجرات
مولانا محی الدین لکھوی صاحب اوکاڑہ
مولانا خان محمد صاحب میانوالی
مولانا سمیع الحق صاحب اکوڑہ خٹک
مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب ؍؍
مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب لکھنو
مولانا تقی امینی صاحب علی گڑھ
مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلی
مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب ناگپور
جناب شمس پیرزادہ صاحب بمبئی
مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی صاحب ملتان

علامہ محمود احمد رضوی صاحب لاہور
علامہ طاہر القادری صاحب ؍؍
پروفیسر حافظ احمد یار صاحب ؍؍
حافظ عبدالرحمٰن صاحب مدنی ؍؍
جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کراچی
مولانا محمد اسحٰق صاحب روپڑی ؍؍
مولانا محمد طاسین صاحب ؍؍
ڈاکٹر غلام محمد صاحب ؍؍
مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی ؍؍
مولانا سلیم اللہ خان صاحب ؍؍
شاہ بدیع الدین پیر آف جھنڈا سندھ
مولانا محمد ازہر صاحب ملتان
حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب فیصل آباد
مولانا عبدالغفار حسن صاحب ؍؍
ڈاکٹر محمد نذیر مسلم صاحب رحیم یار خان
مولانا محمد طاہر صاحب پنج پیر
مولانا گوہر الرحمٰن صاحب مردان
جسٹس پیر کرم شاہ صاحب سرگودھا
مولانا محمد عبداللہ صاحب اسلام آباد
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب ضلع بنوں
مولانا محمد منظور نعمانی صاحب لکھنو
مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی
مولانا وحید الدین خاں صاحب دہلی
قاری قطب الدین صاحب حیدرآباد
قاری عبدالحلیم صاحب ؍؍
قاری تقی الدین صاحب ؍؍

****

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیر کی اطاعت

بشکریہ "جماعت المسلمین"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ	اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو امراء ہوں ان کی اطاعت کرو۔

(النساء : ۵۹)

اس آیۂ مبارکہ سے اولوالامر یعنی امراء کی اطاعت فرض ہوئی۔ اس آیت میں امراء کے ساتھ حکومت کی کوئی شرط اللہ تعالیٰ نے نہیں لگائی۔ لہٰذا ہر امیر کی اطاعت فرض ہے۔ اپنی طرف سے حکومت کی شرط کتاب اللہ پر زیادتی ہے اور یہ کفر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ یُّطِعِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ یَّعْصِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ۔	جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء۲۔ صـ۱۲۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر امیر کی اطاعت فرض ہے۔ امیر کی اطاعت کے لئے حدیث میں کوئی شرط نہیں ہے۔ اپنی طرف سے حکومت کی شرط لگانا شریعت سازی ہے اور یہ شرک ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ کَرِہَ مِنْ اَمِیْرِہٖ شَیْئًا فَلْیَصْبِرْ فَاِنَّہٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ	جس شخص کو امیر کی کوئی بات ناگوار گذرے تو صبر کرے۔ کیونکہ جو شخص

السُّلْطَانِ شِبْرًا مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً — سلطان سے ایک بالشت بھی علیحدہ ہوا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی

(صحیح بخاری کتاب الفتن باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم سترون بعدی امورًا تنکرونہا جزء ۹ صہ ۹۵ وصحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الامر بلزوم الجماعۃ جزء ۲ صہ ۱۲۷۔)

سلطان کے معنی دلیل، حجت، اختیار اور قوت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ ۝ (ھود: ۹۶) — اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا (بنی اسرائیل۔۳۳) — اور جو شخص ظلم کے ساتھ قتل کردیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے (کہ وہ بدلہ لے لے)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ (الرحمٰن۔۳۳) — اے جنات اور انسانوں کی جماعت اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ (لیکن) تم نہیں نکل سکتے بغیر قوت کے۔

حدیث مذکور کے پہلے جزء میں امیر کا لفظ ہے اور دوسرے جزء میں سلطان کا لفظ ہے۔ جو امیر ہی کے لئے استعمال ہوا۔ کیونکہ امیر کو اپنے عہدۂ امارت کی وجہ سے ایک قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے اور کیونکہ اس کا حکم ماموریں پر حجت ہو جاتا ہے اسی لئے اسے سلطان کہا گیا ہے ـــ بادشاہ کو بھی اسی لئے سلطان کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں قوت ہوتی ہے اور اس کا فرمان رعایا پر حجت ہوتا ہے۔

الغرض ہر امیر کی اطاعت فرض ہے اور اس کی اطاعت سے ایک بالشت بھی علیحدہ ہونا ناجائز ہے۔ امیر ہی کی وجہ سے جماعت میں تنظیم اور تنظیم میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر امیر کی اطاعت نہ کی جائے تو تنظیم کی قوت جاتی رہے گی۔ امیر ہی جماعت کی قوت کا مرکز ہے اور اس مرکزیت ہی

کی وجہ سے وہ خود ایک قوت اور سلطان ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

مَنْ رَاٰی مِنْ اَمِیْرِهٖ شَیْئًا یَکْرَهُهٗ فَلْیَصْبِرْ عَلَیْهِ فَاِنَّهٗ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ اِلَّا مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً (صحیح بخاری کتاب الفتن جزء ۹ صفحہ ۵۹ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الامر بلزوم الجماعۃ جزء ۲ صفحہ ۱۳۶)	جو شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اس پر صبر کرے اس لئے کہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا (اور اسی حالت میں) مرگیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

نوٹ: جاہلیت سے مراد اسلام سے پہلے کا زمانہ یعنی کفر کا زمانہ ہے۔

اس حدیث کے پہلے جزء میں امیر کا لفظ ہے اور دوسرے جزء میں جماعت کا لفظ ہے گویا امیر کو چھوڑنا جماعت کو چھوڑنا ہے۔

حضرت عبادہ ابن الصامت فرماتے ہیں:۔

دَعَانَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَبَایَعْنَاهُ فَقَالَ فِیْمَا اَخَذَ عَلَیْنَا اَنْ بَایَعَنَا عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِیْ مَنْشَطِنَا وَمَکْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَیُسْرِنَا وَاَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَاَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ فِیْهِ بُرْهَانٌ (صحیح بخاری کتاب الفتن جزء ۹ صفحہ ۵۹ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ صفحہ ۱۳۲)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا پھر ہم سے بیعت لی۔ آپ نے ہم سے جن باتوں پر بیعت لی وہ یہ تھیں کہ: امیر کا حکم سننا اور اطاعت کرنا، خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی، تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی اور ترجیح کی صورت میں بھی اور (اس بات پر بھی بیعت لی) کہ امیر سے (اس کے) امر کے معاملہ میں جھگڑا نہ کرنا سوائے اس صورت کے کہ تم (اس کو) صریح کفر (کرتے) دیکھو جس (کو کفر ثابت کرنے) کے لئے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل و برہان ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْ وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَاَنَّ رَأْسَهٗ زَبِيْبَةٌ
(صحیح بخاری کتاب الاحکام باب السمع و الطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ جزء ۹ ص۷۸)

(امیر کا حکم) سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر کسی حبشی غلام ہی کو کیوں نہ (امیر) مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش (کے برابر) ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ اَوْ كَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ۔
(صحیح بخاری کتاب الاحکام جزء ۹ ص۷۸
صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ ص۱۳۱)

مسلم آدمی پر (امیر کا حکم) سننا اور اطاعت کرنا لازمی ہے خواہ اُسے وہ (حکم) پسند ہو یا ناپسند ہو (اس شرط کے ساتھ کہ) اسے گناہ کا حکم نہ دیا جائے

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ امیر کی اطاعت فرض ہے۔ صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امیر گناہ کا حکم نہ دے امیر کی اطاعت کے لئے حکومت کی شرط کسی حدیث میں نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتَ
(صحیح بخاری کتاب الاحکام باب کیف یبایع الامام الناس جزء ۹ ص۹۶ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب البیعۃ علی السمع و الطاعۃ فیما استطاع جزء ۲ ص۱۴۲)

ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (حکم) سننے اور اطاعت کرنے پر بیعت کیا کرتے تھے تو آپ ہم سے فرماتے تھے کہ: "جہاں تک تم سے ہو سکے!"

حضرت جریرؓ فرماتے ہیں:۔

بَايَعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ فَلَقَّنَنِيْ فِيْمَا اسْتَطَعْتُ (صحیح بخاری کتاب الاحکام جزء ۹ ص۹۶)

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (حکم) سننے اور اطاعت کرنے پر بیعت کی تو آپؐ نے مجھے سکھایا (کہ اس طرح کہو) جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا (سنوں گا

اور اطاعت کروں گا۔

مندرجہ بالا احادیث سے امیر کی اطاعت کی اہمیت آشکارا ہے۔ امیر کی اطاعت کرنے پر بیعت لی جاتی تھی۔

حضرت ابوذر فرماتے ہیں :-

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ اِنِّیْ اَرَاکَ ضَعِیْفًا وَاِنِّیْ اُحِبُّ لَکَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَا تَاَمَّرَنَّ عَلَی اثْنَیْنِ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوذر، میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور (آدمی) ہو اور جو چیز میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں وہی تمہارے لئے پسند کرتا ہوں۔ تم ہرگز دو آدمیوں پر بھی امیر نہ بننا۔

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب کراہۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ جزء ۲ صفحہ ۱۲۲)۔

دو آدمیوں پر امیر بننے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں :-

(۱) خلیفہ دو آدمیوں پر کسی کو امیر بنا دے۔ مثلاً امیرِ وفد۔

(۲) خلیفہ کی عدم موجودگی میں دو آدمی خود کسی کو امیر بنا لیں مثلاً امیرِ جماعت یا امیرِ سفر۔

ان دو صورتوں میں سے کسی ایک کو خاص کر لینا بے دلیل ہے۔ دوسری صورت میں دو آدمیوں کے امیر کے پاس نہ کوئی حکومت ہوگی اور نہ فوج لیکن اس حالت میں بھی اس کی اطاعت فرض ہوگی۔ اگر فرض نہ ہو تو پھر وہ کونسی ذمہ داری ہے جس سے ڈرایا جا رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

عَلَیْکَ السَّمْعُ وَالطَّاعَۃُ فِیْ عُسْرِکَ وَیُسْرِکَ وَمَنْشَطِکَ وَمَکْرَہِکَ وَاَثَرَۃٍ عَلَیْکَ

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ صفحہ ۱۲۰)

تم پر (امیر کا حکم) سننا اور (اس کی) اطاعت کرنا لازم ہے : تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی، تمہاری خوشی میں بھی اور تمہاری ناخوشی میں بھی اور (غیر مستحق کو) تم پر ترجیح دیئے جانے

کی صورت میں بھی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

إِنْ أُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقُودُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا (صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ صہ ۱۳۱)

اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری رہنمائی کرے تو اس کی (بات کو) سنو اور اطاعت کرو۔

غلام کو امیر بنائے جانے کی دو صورتیں ہیں :۔

(۱) کوئی خلیفہ کسی غلام کو امیر بنا دے مثلاً مقامی امیر یا امیر لشکر وغیرہ۔

(۲) مشورہ سے لوگ خود کسی کو اپنا امیر بنا دیں مثلاً خلیفہ یا امیر جماعت۔

ہر دو صورتوں میں اس غلام کی اطاعت ضروری ہوگی ۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں :۔

إِنَّ خَلِيلِي أَوْصَانِي أَنْ أَسْمَعَ وَأُطِيعَ وَإِنْ كَانَ عَبْدًا مُجَدَّعَ الْأَطْرَافِ (صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ صہ ۱۳۰)

میرے خلیل (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے وصیت کی کہ میں (امیر کا حکم) سنوں اور اطاعت کروں اگرچہ وہ ہاتھ پیر کٹا ہوا غلام ہی کیوں نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ ثُمَّ مَاتَ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً (صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الامر بلزوم الجماعۃ عند ظہور الفتن جزء ۲ صہ ۱۲۵)

جو شخص (امیر کی) اطاعت سے باہر ہو گیا اور جماعت چھوڑ دی پھر (اسی حالت میں) مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا حُجَّةَ لَهُ وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ

جس شخص نے (امیر کی) اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو وہ قیامت کے دن اللہ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت

مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الامر بلزوم الجماعۃ جزء ۲ صفحہ ۱۳۶)

نہیں ہوگی اور جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس کی گردن میں (امیر کی) بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

ثَلَاثٌ لَا يُغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُؤْمِنٍ إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَالطَّاعَةُ لِذَوِي الْأَمْرِ وَلُزُوْمُ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (رواہ الحاکم عن جبیر بن مطعم وسندہ صحیح۔ المستدرک جزء اول ص ۸۸)

تین باتیں ایسی ہیں کہ ان کے معاملہ میں مؤمن کا قلب خیانت نہیں کرتا :

(۱) عمل کو اللہ کے لئے خالص کرنا ۔

(۲) ذوالامر یعنی امیر کی اطاعت کرنا۔

(۳) جماعت المسلمین سے چمٹے رہنا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ حَتّٰى يُرَاجِعَهُ (رواہ الحاکم عن عبد اللہ بن عمرو وسندہ صحیح ــــ المستدرک جزء اول ص ۷۷)

جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا اس نے اسلام کی رسّی کو اپنی گردن سے اتار دیا یہاں تک کہ وہ (دوبارہ جماعت کی طرف) لوٹے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

أَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اَللّٰهُ أَمَرَنِيْ بِهَا : اَلسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْجِهَادِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجَمَاعَةِ فَإِنَّهُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ إِلَّا أَنْ يُّرَاجِعَ۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الامثال عن الحارث الاشعری وصححہ۔ جزء ۲ ص ۲۹۶)

میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن (کی تبلیغ) کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے :۔

(۱) (امیر کا حکم) سننا

(۲) اطاعت کرنا

(۳) جہاد کرنا

(۴) ہجرت کرنا ــــ اور

(۵) جماعت (سے چمٹے رہنا) کیونکہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا اس نے اسلام کی رسّی کو اپنی گردن سے علیحدہ کر دیا۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ (جماعت کی طرف) واپس لوٹے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ اَبْعَدُ (رواہ الترمذی فی ابواب الفتن وصححہ جزء ۲ صـ۳۹)

جماعت کو لازم پکڑو، علیحدگی سے بچو کیونکہ شیطان ایک آدمی کے ساتھ رہتا ہے، دو سے دور ہو جاتا ہے۔

یہ حدیث ہر زمانہ کے لئے عام ہے۔ کوئی زمانہ اس کے لئے مخصوص نہیں۔ کیا جس زمانہ میں جماعت کے پاس حکومت نہ ہو جماعت سے علیحدگی اختیار کر کے شیطان کو اپنا ساتھی بنانا جائز ہے۔ ہرگز نہیں، لہٰذا جماعت سے علیحدگی بھی ہرگز جائز نہیں۔ جماعت سے چمٹے رہنا ضروری ہے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جماعت کے امیر سے بھی چمٹا رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ وَاسْتَذَلَّ الْإِمَارَةَ لَقِيَ اللهَ وَلَا حُجَّةَ لَهٗ عِنْدَ اللهِ (رواہ الحاکم وسندہ صحیح۔ المستدرک جزء اول صـ۱۱۹)

جو شخص جماعت چھوڑ دے، امارت کی تذلیل کرے وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ کے نزدیک اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی (یعنی اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی جو عند اللہ مقبول ہو)

مندرجہ بالا تمام احادیث میں ـــــــ

(۱) امیر کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے کسی حدیث میں بھی امیر کے ساتھ حکومت کی شرط نہیں لگائی گئی۔

(۲) جماعت سے چمٹے رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جماعت سے چمٹے رہنا بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ امیر جماعت سے چمٹا رہے اور امیر جماعت سے چمٹے رہنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کی اطاعت کرتا رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ فَالْإِمَامُ الَّذِيْ عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ

خبردار تم میں سے ہر شخص حکمران ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعیت کے متعلق بازپرس ہوگی۔ امام جو لوگوں پر حکمران ہوتا ہے

رَعِيَّتِهٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ اَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ۔

(صحیح بخاری کتاب الاحکام باب قول اللہ تعالیٰ واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم جزء ۹ ص۷۸)

اس سے اس کی رعیت کے متعلق بازپرس ہوگی مرد اپنے اہلِ بیت پر حکمران ہے ۔ اس سے اس کے اہلِ بیت کے متعلق بازپرس ہوگی عورت اپنے شوہر کے اہلِ بیت اور اس کی اولاد پر حکمران ہے اور اس سے ان کے متعلق بازپرس ہوگی ، اور غلام اپنے آقا کے مال پر حکمران ہے اور اس سے اس مال کے متعلق بازپرس ہوگی (الغرض خبردار رہو جاؤ) تم میں سے ہر ایک حکمران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق بازپرس ہوگی ۔

اس حدیث میں لفظ رَاعٍ استعمال ہوا ہے ۔ اس کے معنی درج ذیل ہیں :۔

۱) اسم فاعل وکل من ولی امر قوم، وفی الاصطلاح ھو المتحقق فی معرفۃ الامور السیاسیۃ المتعلقۃ بالمدنیۃ المتمکن علی تدبیر النظام الموجب لصلاح العالم (محیط المحیط قاموس مطول للغۃ العربیۃ ص۳۴۱)

ترجمہ (یہ لفظ رعایۃ سے) اسم فاعل (ہے، اس سے مراد) ہر وہ شخص ہے جو کسی قوم کے امر کا والی ہو اور اصطلاح میں (اس سے مراد وہ شخص ہے جو) مدنیت کے متعلق امورِ سیاست واجب اور قائم کرنے والا (ہو یا) جو صلاحِ عالم کے لئے انتظامی تدابیر پر قدرت رکھنے والا ہو۔

۱) کل من ولی امر قوم کالاسقف والبطریرک وغیرھما (المنجد فی اللغۃ والادب والعلوم ص۲۶۸)

ترجمہ ہر وہ شخص جو کسی قوم کے امر کا والی ہو جیسے اُسقف (بادشاہ یا عالم) اور بطریرک (سردار یا رئیس)

۲) والی، امیر (منتہی الادب فی لغات العرب)

الغرض مندرجہ بالا تصریحات کے لحاظ سے "رَاعٍ" کا صحیح ترجمہ "حکمران" ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

ثَلَاثَةٌ لَا تَسْأَلُ عَنْهُمْ: رَجُلٌ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ وَعَصَى إِمَامَهُ وَمَاتَ عَاصِيًا وَأَمَةٌ أَوْ عَبْدٌ أَبَقَ فَمَاتَ وَامْرَأَةٌ غَابَ زَوْجُهَا قَدْ كَفَاهَا مُؤْنَةَ الدُّنْيَا فَتَبَرَّجَتْ بَعْدَهُ فَلَا تَسْأَلْ عَنْهُمْ (مسند امام احمد و مستدرک حاکم وسندہ صحیح المستدرک جزء اوّل ص۱۱۹ و حجاب المرأۃ المسلمۃ للالبانی ص۵۲)

تین آدمی ایسے ہیں کہ ان کے متعلق نہ پوچھو (کہ ان کا حشر کیا ہوگا): ایک تو وہ شخص جو جماعت چھوڑ دے، اپنے امام کی نافرمانی کرے اور نافرمانی کی حالت میں مرجائے، دوسرا وہ غلام یا لونڈی جو بھاگ جائے اور (اسی حالت میں) مرجائے۔ تیسری وہ عورت جس کا شوہر اس کے پاس موجود نہ ہو اور وہ اس کی دنیا کی ضروریات پوری کر گیا ہو، پھر وہ اس کے جانے کے بعد اپنا بناؤ سنگار ظاہر کرے (الغرض) ان (تینوں) کے متعلق (کچھ) نہ پوچھو (کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شر کے ایک زمانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

دُعَاةٌ عَلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا

(اس زمانہ میں) دوزخ کے دروازے پر ایسے بلانے والے ہوں گے کہ جو شخص ان کی بات کو مان لے گا وہ اسے دوزخ میں جھونک دیں گے۔

حضرت حذیفہؓ نے پوچھا:

فَمَا تَأْمُرُنِيْ إِنْ أَدْرَكَنِيْ ذٰلِكَ ـ

اگر میں وہ زمانہ پاؤں تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں (میں کیا کروں)!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَإِمَامَهُمْ

تم جماعت المسلمین اور ان کے امام سے چمٹے رہنا۔

(صحیح بخاری کتاب الفتن باب کیف الامر اذالم تکن جماعۃ جزء ۹ ص۶۵ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب لزوم الجماعۃ عند ظهور الفتن جز ۲ ص۱۳۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس شر کے زمانے میں اسلامی حکومت نہیں ہوگی کیونکہ اسلامی حکومت کی موجودگی میں گمراہ کرنے والے داعی کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

مزید برآں اسلامی حکومت کا زمانہ تو خیر کا زمانہ ہوتا ہے نہ کہ شر کا ۔
جماعت المسلمین سے چمٹے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ جماعت میں شامل رہے ۔
امام جماعت سے چمٹے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ امام کی اطاعت کرے، اس کی اطاعت
، ہاتھ نہ کھینچے ۔ امام سے چمٹنے کے معنی اطاعت ہی ہو سکتے ہیں اور اس کے سوا دوسرے
ی نہیں ہو سکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ إِمَامُ جَمَاعَةٍ فَإِنَّ مَوْتَهُ مَوْتَةٌ جَاهِلِيَّةٌ ۔ (رواه الحاكم وسنده صحيح المستدرك جزء اوّل ص۱۱۷)	جو شخص اس حالت میں مر جائے کہ اس پر امام جماعت نہ ہو تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مسلم کو اس حالت میں مرنا چاہیئے کہ وہ کسی امام کا ماتحت
۔ مندرجہ بالا تمام احادیث میں امام کی اطاعت کے لئے حکومت کی کوئی شرط نہیں ہے
ذا امام جیسا بھی ہو اس کی اطاعت کرنی ہوگی ۔
"امیر کی اطاعت" اور "امام جماعت....." کی ذیل میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں
ن کے مضمون سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امیر اور امام میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں
ظ ایک دوسرے کے بجائے استعمال ہوتے رہتے ہیں ۔

امیر کے معنی

"امیر" صفت مشبہہ ہے ۔ اس کا مصدر امارت ہے جس کے معنی ہیں : امر والا ہونا"
صفت مشبہہ میں مصدری معنی کا ثبوت اور لزوم سمجھا جاتا ہے ۔ لہٰذا امیر کے
عنی میں "امر والا" ہونے کی صفت ثابت ہے اور اپنے موصوف کے ساتھ لازم یعنی
ٹی ہوئی ہے ۔ یہ صفت یعنی "امر والا" ہونا امیر سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتی ۔ ایسا نہیں ہو
سکتا کہ کسی شخص کو امیر کہا جائے اور وہ "حکم والا" نہ ہو ۔ امیر ہر حال میں حکم والا ہوگا ۔ اس کا
کم ہر حال میں اور ہر وقت مانا جائے گا ۔ اگر کسی شخص میں "حکم والا" ہونے کی صفت ہر حال
یں نہ پائی جائے تو اسے آمر تو کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی صرف اس وقت تک جب تک وہ حکم

دینے کا فعل کر رہا ہو لیکن اسے امیر نہیں کہہ سکتے۔

امام کے معنی

امام کے معنی ہیں : مَنْ يُؤْتَمُّ بِهِ اَيْ يُقْتَدٰى بِهٖ مِنْ رَئِيْسٍ اَوْ غَيْرِهٖ (محیط المحیط ص۲۱) یعنی وہ شخص جس کی پیروی کی جائے خواہ وہ رئیس ہو یا کوئی اور۔ پیروی احکام میں بھی ہوتی ہے اور اقوال میں بھی۔ احکام کی پیروی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَهٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبَارَكٌ	یہ (بڑی) بابرکت کتاب ہے جو ہم نے
فَاتَّبِعُوْهُ (الانعام : ۱۵۵)	نازل کی ہے۔ للہذا اس کی پیروی کرتے رہو

افعال کی پیروی تو عموماً کی ہی جاتی ہے اور اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

اِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فِيْ سَفَرٍ	جب تین آدمی سفر کے لئے نکلیں تو
فَلْيُؤَمِّرُوْا اَحَدَهُمْ	انہیں چاہیئے کہ اپنے میں سے ایک کو
(رواہ ابوداؤد فی کتاب الجہاد رواتہ ثقات	امیر بنالیں ۔

وسندہ صحیح وحسنہ الالبانی فی تعلیقاتہ علی المشکوٰۃ ص۱۱۴۲)

اس حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں:۔

(۱) سفر میں بھی بغیر امیر کے نہ رہے ۔

(۲) امیرِ سفر کے پاس نہ حکومت ہوتی ہے اور نہ اسے کوئی خلیفہ مقرر کرتا ہے بلکہ حدیث کی رُو سے مسافر خود کسی کو اپنا امیر مقرر کر لیتے ہیں

(۳) امیر بنانے کا مقصد سوائے اطاعت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ـــــ اور

(۴) ایسے امیر کی اطاعت بھی ضروری ہے جس کے پاس کوئی حکومت نہ ہو

نتیجہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سفر کی قلیل مدت میں بھی مسافروں کا بغیر امیر رہنا پسند نہیں فرماتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ شہر میں مسلم آبادی کا دائمی طور پر بغیر امیر کے پسند فرمائیں گے۔ اگر سفر کی قلیل سی مدت میں امیر کا ہونا ضروری ہے تو حضر کی طویل مدت امیر کا ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے اور کیونکہ امیرِ سفر کی بغیر حکومت کے اطاعت ضروری۔ امیرِ جماعت کی بھی بغیر حکومت کے اطاعت ضروری ہے ۔ نہ آیت میں اور نہ کسی حدیث میں امیر کی اطاعت کے لئے حکومت کی شرط لگائی گئی ہے اور نہ لگائی جاسکتی ہے۔ حکومت کا

لگانا خودساختہ ہے لہٰذا کالعدم ہے۔

شوہر اور ماں باپ کی اطاعت بھی فرض ہے لیکن ان کی اطاعت کے لئے بھی حکومت کی شرط نہیں تو آخر امیرِ جماعت کے لئے حکومت کی شرط لگانا کس حد تک صحیح ہے۔ یقیناً یہ شرط لغو ہے۔

امیرِ سفر کی اطاعت سے صرف چند مسافروں کا مفاد وابستہ ہوتا ہے، شوہر کی اطاعت سے بیوی کا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ ماں باپ کی اطاعت سے صرف اولاد کا مفاد وابستہ ہوتا ہے پھر بھی یہ اطاعتیں تو فرض ہوں اور امیرِ جماعت کی اطاعت فرض نہ ہو جس سے پوری جماعت اور اللہ تعالیٰ کے دین کا مفاد وابستہ ہو۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے۔

الغرض منقول و معقول دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امیر کی اطاعت فرض ہے۔

اعتراضات اور ان کے جوابات

اعتراض ۱ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خلیفہ کو امیر یا امام کہا گیا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی امیر یا امام کا لفظ آئے گا اس سے خلیفہ ہی مراد ہوگا۔

جواب یہ تو صحیح ہے کہ خلیفہ کو بھی امیر یا امام کہا جاتا ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جہاں کہیں امیر یا امام کا لفظ آئے گا اس سے مراد خلیفہ ہی ہوگا۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے اس مفروضہ کا کوئی ثبوت نہیں۔ ہر خلیفہ امیر یا امام ہوتا ہے لیکن ہر امیر یا امام خلیفہ نہیں ہوتا۔

اعتراض ۲ امیرِ جماعت کی اطاعت اگر فرض ہے تو وہ شرعی سزائیں کیوں نہیں نافذ کرتا۔

جواب اس اعتراض کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کی طاقت کے مطابق مکلف بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا — کسی شخص کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ (سورہ بقرہ: ۲۸۶)

لہٰذا امیرِ جماعت اپنی طاقت کے مطابق کام کرے گا۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ امیرِ جماعت خلافت کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا ہے لہٰذا اس جدوجہد کے زمانہ میں اس سے خلیفہ کے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا بالکل لغو ہے۔ اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ تیسری جماعت میں پڑھنے والا ابھی طالب علم ہے لہذا ابھی اسے

میں پڑھنے والا بھی طالب علم ہے۔ تیسری جماعت میں پڑھنے والا کوشش کر رہا ہے کہ وہ بھی بی اے کا طالب علم بن جائے لیکن ابھی بنا نہیں تو کیا اس تیسری جماعت کے طالب علم سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بی اے کے امتحان کے پرچے حل کرے۔ ہرگز نہیں۔ دونوں میں محض طالب علم ہونے کی یکسانیت اس بات کی متقاضی نہیں کہ تیسری جماعت کا طالب علم بی اے کے پرچے حل کرے۔ بالکل اسی طرح امیرِ جماعت بھی امیر ہوتا ہے اور خلیفہ بھی امیر ہوتا ہے تو کیا امیرِ جماعت سے اس حال میں کہ وہ خلیفہ بننے کی کوشش کر رہا ہے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ خلیفہ کے فرائض سرانجام دے۔ ہرگز نہیں محض امارت کی یکسانیت اس بات کی متقاضی نہیں ہو سکتی کہ ہر امیر سے خلیفہ کے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے۔

امیرِ جماعت اسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکی زندگی میں غالب نہیں تھے۔ آپؐ کے ہاتھ میں نہ اقتدار تھا اور نہ حکومت۔ البتہ آپؐ کی حکومت مسلمین کے قلوب و ابدان پر تھی۔ جو کچھ آپؐ فرماتے تھے مسلمین اس کی اطاعت کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے مقاصد یہ تھے:۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی تبلیغ اور اس عقیدہ کو قلوب میں راسخ کرنا،

(۲) مسلمین کی اصلاح و تربیت،

(۳) مسلمین کو نظم و ضبط اور صبر و استقامت کی تلقین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے عقیدہ کو عملی جامہ پہنانے یعنی اس عقیدہ کی بنیاد پر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کی منظم تحریک تھی۔

ہر تنظیم میں بعض قواعد و ضوابط پر سختی سے عمل کرایا جاتا ہے۔ تنظیم کی قوت اور قواعد و ضوابط پر عمل سربراہِ تحریک کی اطاعت پر منحصر ہے۔ اگر سربراہ کی اطاعت نہ ہوگی تو تنظیم بھی نہ ہوگی اور اگر تنظیم نہ ہوگی تو تحریک ختم ہو جائے گی۔ مکی زندگی میں بھی مسلمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کرتے تھے اور حکومتِ الٰہیہ کی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ زندگی بھی مسلمین کے لئے نمونہ اور مشعلِ راہ ہے۔ اسی زندگی کی اتباع کر کے مسلمین منزلِ مقصود کو پہنچ سکتے ہیں۔ حکومتِ الٰہیہ کے لئے جو تحریک چلائی جائے یا چلائی جا رہی ہے

ں کے لئے اسوۂ حسنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہے۔ جس طرح مکی زندگی
ں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جاتی تھی اسی طرح حکومتِ الٰہیہ کو قائم کرنے کی
تحریک میں امیرِ تحریک کی اطاعت لازمی ہوگی۔ اگر امیر کی اطاعت نہ کی جائے تو امیر کی حیثیت
یے مٹی کے بت سے زیادہ نہیں ہوگی، مرکزیت ختم ہو جائے گی اور تحریک مردہ ہو جائے
ں۔ الغرض امیرِ جماعت کی اطاعت بہت ضروری ہے اس لئے کہ اس کے بغیر حکومتِ الٰہیہ
ا قیام ناممکن ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت سے
کی جاتی تھی لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہمارے لئے نمونہ نہیں
ن سکتی تا وقتیکہ ہمارا قائد بھی نبی نہ ہو۔

جواب نبوت ختم ہو گئی، نبی اب کوئی نہیں بن سکتا لہٰذا تنظیم کا کام اب کسی غیر نبی ہی سے
لیا جا سکتا ہے اور وہ اس تنظیمی کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کو
پنا نمونہ بنائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے اسی لئے تو آپؐ کی مکی زندگی ہمارے
لئے نمونہ ہے۔ اگر آپ نبی نہ ہوتے تو آپؐ کی مکی زندگی ہمارے لئے نمونہ نہ ہوتی۔ ہم نبوت
میں بے شک آپؐ کے شریک نہیں ہو سکتے لیکن آپؐ کے اقوال و افعال میں عموماً ہم آپؐ
کے شریک ہیں یعنی ہم وہی کرتے ہیں جو آپؐ نے فرمایا اور جو آپؐ نے کیا۔ خلافت کی تحریک میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جاتی ہے اسی بنیاد پر خلافت کی ہر تحریک میں امیرِ جماعت
کی اطاعت لازمی طور پر کی جائے گی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
اطاعت بہ حیثیت نبی کے کی جاتی تھی لہٰذا وہ اطاعت اور اس اطاعت کی بنیاد پر آپؐ کی تنظیم
ہمارے لئے نمونہ نہیں تو پھر بتائیے کہ کیا خلافت کی تحریک میں کسی غیر نبی کی زندگی کو نمونہ
بنائیں۔ اگر نہیں تو پھر نمونہ کہاں سے لائیں۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تحریکِ خلافت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی زندگی میں ہمارے لئے کوئی نمونہ نہیں تو کیا آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے کامل
نمونہ نہیں! کیا اسلام ناقص ہے کہ اس سلسلہ میں وہ ہماری رہنمائی نہیں کرتا۔
الغرض مندرجہ بالا اعتراض ایک شیطانی وسوسہ ہے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اعلائے کلمۃ الحق فرض ہے

اس امر پر تو سب متفق ہیں کہ اعلائے کلمۃ الحق فرض ہے اور اس کے لئے خلافت کا قیام ضروری ہے۔ اگر اعلائے کلمۃ الحق فرض ہے تو کیا اس کے لئے حتّی الامکان جد وجہد فرض نہیں ہوگی۔ ضرور ہوگی۔ اس کے لئے ضرور ایک تحریک چلانی ہوگی۔ ایک مضبوط جماعت بنانی ہوگی۔ اور تحریک منظم اور جماعت مضبوط اسی صورت میں ہوسکتی ہے جبکہ امیرِ جماعت کی اطاعت فرض ہو۔ اگر امیرِ جماعت اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جہاد کا حکم دے اور جماعت حکم ماننے سے یہ کہہ کر انکار کر دے کہ امیرِ جماعت کی اطاعت نفل ہے تو کیا جماعت اعلائے کلمۃ الحق کے فریضہ کو ادا کر سکے گی، ہرگز نہیں۔ اگر جماعت اعلائے کلمۃ الحق کو فرض سمجھتی ہے تو وہ یہ سوچے کہ پھر اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہوگا۔ کیا اس کے سوا اور بھی کوئی ذریعہ ہوسکتا ہے کہ جماعت اپنے امیر کے حکم جہاد کو فرض سمجھے۔ اور فوراً جہاد کے لئے تیار ہو جائے۔ امیر کے تمام احکام اعلائے کلمۃ الحق ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ لہٰذا اس کے ہر حکم کی اطاعت کرنی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ (النور ۔ ۵۵)	جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا۔ جس طرح ان لوگوں کو خلافت دی تھی جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اور ان کے لئے ان کے دین کو جس کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے مستحکم کر دیگا۔ اور ان کے خوف و ہراس (کو ختم کرنے) کے بعد (اس کے) بدلے میں امن عطا فرمائے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صالح مؤمنین سے تین وعدے فرمائے ہیں :۔

۱۔ ان کو حکومت و خلافت عطا فرمائے گا۔

۲۔ دینِ اسلام کو مستحکم کر دے گا۔
۳۔ خوف کی زندگی کے بدلے میں امن و امان کی زندگی دے گا۔

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان وعدوں کے پورا ہونے سے پہلے

۱۔ ان کے پاس کوئی حکومت نہ ہوگی۔
۲۔ دینِ اسلام مستحکم نہیں ہوگا۔
۳۔ ان کے دن خوف و ہراس میں گزرتے ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان صالح مؤمنین کو حکومت، استحکامِ دین اور امن و امان کیسے عطا ہوگا؟ کیا اس کے لئے انہیں کچھ کرنا ہوگا یا بغیر کچھ کئے تحفۃً انہیں یہ چیزیں مل جائیں گی؟ کیا خلافت کے عطا ہونے سے پہلے مؤمنین کی کوئی جماعت ہوگی یا نہیں؟ اگر جماعت ہوگی تو کیا اس کا امیر ہوگا یا نہیں؟ اگر امیر ہوگا تو اس کی اطاعت لازمی ہوگی یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ حصولِ خلافت کے لئے ان صالح مؤمنین کو جماعت بھی منظم کرنی ہوگی۔ امیرِ جماعت کی اطاعت بھی کرنی ہوگی اور پھر جدوجہد بھی کرنی ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ (الحج : ۷۸) — اللہ کے راستہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔

افکار و آراء

اس عنوان کے تحت شائع شدہ آراء سے ادارے کا بالکلیہ متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اہلِ تشیّع اور اسلام —— نیز دیگر مسائل

جناب خُسروی صاحب کراچی کا ایک مکتوب مرقومہ ۱۵ اکتوبر ۸۴ء

اس مکتوب کی تاخیر سے اشاعت پر ادارہ کو نہایت افسوس ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ اس کو "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" والے امیر محترم کے خطاب کے ساتھ شائع کیا جائے چونکہ اس میں صاحبِ مکتوب کے اہلِ تشیّع کے متعلق خیالات پر امیر محترم کی رائے ان کے اور قارئین کرام کے سامنے آجاتی۔ لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس کی اشاعت میں تعویق و تاخیر ہوتی چلی آرہی ہے۔ لہٰذا اس مکتوب کو اس اشاعت میں شامل کیا جارہا ہے۔ سابقہ مکتوب شائع شدہ نومبر ۸۴ء میں محترم خُسروی صاحب نے مولانا مودودی مرحوم و مغفور اور جماعتِ اسلامی کے متعلق جو استفسار کیا تھا (صفحہ) تو اس کا جواب موصوف کو اس شمارے میں شامل شدہ "تذکرہ و تبصرہ" میں مل جائے گا۔ (ادارہ)

مخدومی، وعلیکم السلام الیٰ یوم القیام۔ گرامی نامے ممنونِ کرم ہوئے۔

ان دونوں مکتوبات کے بعض نکات پر اظہارِ خیال کا ارادہ کر رہا تھا کہ محترم ۱۴۰۵ھ کا "میثاق" موصول ہوا جس میں مطبوعہ خطاب کے بعض پہلوؤں پر توجہ نے سبقت کی۔ چنانچہ پہلے اسی کے متعلق کمترینہ ذیل معروضات پیش کر رہا ہوں:

سب سے پہلے تو یہ کہ میلادِ نبوی اور پاکستان کی سالگرہ ہی کو "عید" کہنے پر کیا تعجب ہے! یہ لفظ شرعی اصطلاح محلِ نظر سہی، مگر لغوی معنی سے تو جواز نکلتا ہے۔ اس سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اب "شہید" کہلانے کے لئے بھی اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جان دینے کی شرط نہیں رہی۔ "شہدلئے اردو" آپ نے بھی سنا اور پڑھا ہوگا۔ جن کی قبریں یہاں لیاقت آباد میں قومی شاہراہ پر بناکر زبردستی اس وسیع و عریض قطعۂ اراضی پر قبضہ کرلیا گیا جو ہمدرد فاؤنڈیشن کو اقامتی ہسپتال اور طبیہ کالج اور دواسازی کے محل بنانے کے لئے

الاٹ ہوا تھا اور جس کا سنگِ بنیاد بھی مرحوم ایوب خاں نے نصب کر دیا تھا۔ جو نہ معلوم کہاں غائب کر دیا گیا۔ یہ لوگ تو پھر بھی مسلمان تھے 'یوم مئی' پر سُرخوں کی تقلید میں جو تقریب سرکاری و دَرباری سرپرستی میں منائی جاتی ہے (جس پر دفاتر کی چھٹی قومی تعطیلات میں شامل ہے)، اس کے سلسلہ میں اخبارات و جرائد کی خصوصی اشاعتوں اور ضمیموں میں اور مزدوروں کے سرمایہ دار لیڈروں کے جلسوں میں آپ نے "شہدائے شکاگو" بھی پڑھا اور سنا ہوگا (ریڈیو اور ٹی وی کے "دانش وروں" سے بھی)۔ اسی طرح فرانس اور روس کے انقلابات میں جو مارے گئے وہ بھی "شہدائے آزادی" کہے اور لکھے جاتے ہیں۔

صفحہ ۴۳ کی پہلی سطر کے حوالہ سے یہ پوچھنا ہے کہ آپ کے نزدیک "کفر" کی تعریف کیا ہے! اگر اسلام صرف خدا کو خالق و قادر ماننے ہی کا نام ہے تو اس سے منکر تو کفارِ عرب بھی نہیں تھے اگر حضورؐ کو آخری نبی اور قرآن کو آخری کتاب ماننا بھی شرطِ اسلام ہے تو پھر جو شخص زبانی تو حضورؐ کو خاتم الانبیاء کہے مگر عقیدۃً حضورؐ کے بعد بھی ایک نہ دو پورے بارہ افراد کو حضورؐ ہی کی طرح معصوم اور مفروض الاطاعۃ مانے جن میں سے ہر ایک پر وحی بھی نازل ہوتی تھی اور الگ الگ صحیفہ بھی نازل ہوا تھا اور جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر سکتے ہیں، جس کا اختیار حضورؐ کو بھی نہیں تھا' اسے آپ کیا کہیں گے۔ اور پھر جو تمام جامعین و حافظین و ناشرین قرآن کو منافق و مرتد سمجھے اور اس بین الدفتین کتاب کو ان ہی لوگوں کی من گھڑت ہونے اور اصل قرآن کے ہنوز مستور ہونے پر یقین رکھے' اسے آپ کیا سمجھیں گے؟ ایسا شخص تو دراصل "اہلِ کتاب" نہیں ہے کیونکہ وہ کتابِ مشہود کو مانتا نہیں اور اس کی معتقد علیہ کتاب مستور' اس کے پاس ہے نہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے پاس، جعلی ہی سہی، کتابیں موجود تو ہیں۔

یہ تو صورت ان کے ایمان کی ہے۔ اب اسلام کو دیکھئے تو کلمۂ شہادت' اذان، وضو' نماز' روزہ اور دیگر تمام شعائرِ اسلام میں سے کس بات میں ان کا جمہور اہلِ اسلام سے اشتراک ہے؟ وجہ یہ کہ ہم میں اور ان میں قدرِ مشترک نہ کتاب ہے نہ سنّت۔ کتاب کے متعلق تو عرض کر چکا ہوں اور سنّت کا حال یہ کہ ان کی روایات کا سلسلہ حضرت باقر و جعفر یا ان کے اخلاف و احفاد (علیہم الرحمۃ) سے اوپر پہنچتا ہی نہیں اور پھر یہ کہ راویوں کے بیشتر سلاسل میں راویٔ اوّل زرارہ جیسا شخص ہے جسے خود ان کے علمائے رجال نے کذّاب کہا ہے۔ ان کی امہات کتب کی رو سے جو ان کا ہم عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں لہٰذا منطقی نتیجہ یہ کہ یا تو وہ مسلمان نہیں یا ہم نہیں۔ یہ تو ہمارے علماء کا جہل یا تقیہ کہ رفض کو محض ایک مکتبِ فکر ہی کہے جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے جب عالمِ کشف میں حضورؐ سے ان کے متعلق استفسار کیا تھا اور اس کا جو جواب ملا تھا کیا وہ آپ کے علم میں نہیں؟ چلئے آپ مکاشفات کو شرعاً معتبر نہ سمجھیں مگر مرقومہ بالا واقعاتی اور دستاویزی شہادتوں کو کیسے نظرانداز

کر سکیں گے! یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ آپ ان اساسی اختلافات کو نہیں جانتے اور نہ یہ ماننے کو جی چاہتا ہے کہ آپ منافقانہ ان کو دائرہ اسلام ہی کی ایک قوس کہتے ہیں، کیونکہ نفاق اہل سنّت کا شیوہ نہیں۔ تو پھر یہ کہنا کہ "سنی شیعہ اختلاف سب کے نزدیک کفر اور اسلام کا اختلاف تو ہے نہیں[1]" چہ معنی دارد! مقابلتاً قادیانی ان سے بہتر ہیں کہ نہ وہ کوئی دوسرا قرآن مانتے ہیں نہ صحابہؓ کو منافق و مرتد کہتے ہیں، نہ نماز و روزہ الگ ہے، نہ احادیث کا مجموعہ جدا ہے، نہ فقہ مختلف ہے۔ اختلاف صرف عقیدۂ ختم نبوّت پہ ہے (جس کی بناء پر ہی ان کا غیر مسلم ہونا عقلاً و شرعاً ثابت ہے)۔ لیکن ان کے ہاں تو ختم نبوّت سے عقیدۃً انکار بھی ہے (جس کا تقیۃً اعلان نہیں کرتے) اور اس کے سوا اور بھی سارے اختلافات ایمانی و اسلامی۔ تو کیا یہ قادیانیوں سے زیادہ تکفیر کے مستحق نہیں ہیں!

مرکزی اور صوبائی سول اور دفاعی محکموں میں ہی نہیں تمام نیم سرکاری خود مختار اداروں میں بھی تمام با اختیار مناصب پر ۵۰ نہیں تو ۴۰ فیصد تو یقیناً یہی قابض ہیں۔ اگر صرف چھ مہینے کے لئے کسی معتبر و مستعد شخص کو صرف اس کام پہ مامور کر دیں کہ اخبارات و رسائل میں اور ریڈیو اور ٹی وی پر کسی بھی سلسلہ میں جو نام درج اور نشر ہوتے ہیں وہ نوٹ کرتا رہے تو آپ کو ناموں سے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ انتظامیہ کے (سرکاری و نیم سرکاری اداروں) میں ان کا تناسب کیا ہے! اور کن کن اونچی کرسیوں پر یہ لوگ براجمان ہیں۔ دفاعی محکموں سے یہ معلومات مجوزہ بالا ذرائع سے حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ لہٰذا اس کے لئے کوئی اور تدبیر کرنی پڑے گی جو آپ کے وسیع حلقۂ رفقاء کی وجہ سے مشکل نہیں ہوگی۔

ان کے مقابلہ میں حکومت کی بے بسی کا اندازہ آپ کو زکوٰۃ و عشر کے معاملہ میں انکے اسلام آباد میں مظاہرہ سے بھی ہو جانا چاہئے کہ اور سال گزشتہ یہاں نئی کراچی کے فساد کے سلسلہ میں (باوجود دفعہ ۱۴۴) تقریباً ۲۶ گھنٹے ان کے ہزاروں آدمیوں کے بندر روڈ کو بلاک رکھنے سے بھی، نیز اس محرم پر یہاں جو کچھ ہوا اور ہنوز ہو رہا ہے، اس سے بھی حالیہ واقعات کے اسباب پر تحقیقات کے لئے ہائی کورٹ کے ایک جج کی سربراہی میں کمیٹی بنائی گئی ہے، اگر اس نے کوئی رپورٹ جناب صدر کو پیش کی بھی تو شاید ہی منظرِ عام پر آئے ـــــ جیسے نئی کراچی کے فساد کے سلسلہ میں جو رپورٹ تیار ہوئی تھی وہ دبا دی گئی، کیونکہ اس میں دونوں فریقوں کی ہی زیادتیوں کا ذکر تھا۔ ان مسلسل مشاہدات کے بعد بھی آپ جناب صدر سے یہ توقع کیوں رکھتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں آپ جیسوں کی مانیں گے جو کسی

---

[1] جملہ کا انداز خود بول رہا ہے کہ اس میں عوام الناس کی اکثریت کی رائے کی طرف اشارہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی دور میں بھی اہل تشیع کی اجتماعی و قانونی طور پر اس طرح تا حال تکفیر نہیں ہوئی ہے جیسے قادیانیوں کے معاملہ میں ہوئی ہے۔ (مرتب)

طرح، کسی قسم کی طاقت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے ! کارِ کلیمی ہو یا کارِ فرعونی، بغیر عصا کے ہر ایک بے بنیاد ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ فقہ جعفری واقعی نافذ ہو ہی جائے تو مغرب زدہ تراوڈ بھی "مومن" ہو جائے کیونکہ اس فقہ میں تو علاوہ متعہ کے محرمات کے معاملہ میں "لفِ حریر" جیسی عیاشانہ رخصتیں بھی شامل ہیں اور بعض معمولی سی شرائط کے ساتھ "صحبت ہم جنس" بھی۔ حکومت کی مجبوری کی وجہ علاوہ مذکورہ بالا داخلی کے خارجی دباؤ بھی ہے کہ دو دشمن تو دائیں بائیں پہلے ہی شمشیر بکف گھات میں ہیں۔ ایک اور پڑوسی کو بھی دشمن بنا لینا مزید خطرناک ہے اور پڑوسی بھی وہ ملک جہاں، حسن بن صباح کے فدائیوں کے مجوزہ، مذہبی جنونی برسراقتدار ہیں۔ اگر کسی طرح آپ تہران سے خمینی کی اب تک کی تقاریر کے کتابی صورت میں مطبوعہ مجموعے منگوا سکیں تو دیکھیے گا کہ ہر موقعہ اور تقریب پر جو تقریریں ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہوئی ہیں ان میں مسلمانانِ عالم اور عالم عرب کے لئے جو کچھ کہا ہے وہ کہا ہی ہے لیکن بالخصوص پاکستان کے متعلق کن عزائم کا اظہار ہوتا رہا ہے اور کیا کیا دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ نئی کراچی کے فسادات میں تو کھلم کھلا ایرانی قونصلر ملوث تھا جس پر حکومت نے احتجاج کر کے اسے نکلوایا لیکن سفارت خانے سے جو بڑی بڑی رقومات مستقلاً اور مسلسل ان کے اداروں کو ملتی ہیں اور جو ان کے علماء زیارات کے بہانے وہاں جا کر لاتے ہیں ان کا حساب کون لگا سکتا ہے ! نئی کراچی میں اور اس کے بعد جو اسلحہ جات برآمد ہوئے وہ آخر کہاں سے آتے ہیں اور کس کے خلاف استعمال کے لئے !

نا معلوم آپ کو یہ شکایت کیوں ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے پہلے ایتاءِ زکوٰۃ کے لئے کیوں مجبور کیا گیا ؛ صلوٰۃ سے سرکاری خزانہ میں کیا آجاتا ؟ اور اب تو زکوٰۃ کی طرح صلوٰۃ کے لئے کوئی قانونی جبر نہیں ہے، لہٰذا نتیجہ معلوم ! اور یہ شکوہ بھی غلط کہ زکوٰۃ صرف بنکوں میں جمع کردہ رقوم پر کیوں ہے! مالِ تجارت پہ کیوں نہیں ؟ سرمایہ دار تاجروں اور صنعتکاروں کا جو دباؤ ہمیشہ سے انتظامیہ اور مقننہ پہ رہا ہے اور رہے گا اس سے تجاہلِ عارفانہ کیوں ؛ بنکوں کے ذریعے سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے اس سے بھی تو آخر یہ لوگ مستثنیٰ ہی ہیں۔ ان لوگوں میں سے کوئی صرف سات آٹھ فیصد سالانہ منافع کے لئے سیونگ اکاؤنٹس میں رقم جمع کیوں کرے جبکہ اس سے دس گنا نفع تو سال بھر میں وہی رقم صنعت یا تجارت میں لگا کر آسانی سے حاصل کر سکتا ہے ؛ لہٰذا ان اصحابِ دُول کی رقومات ہمیشہ کرنٹ اکاؤنٹس میں رہتی ہیں، جن سے زکوٰۃ قانوناً کٹتی ہی نہیں چاہے کسی کھاتے میں لاکھوں روپیہ بھی ہوں۔ اس کے برعکس عام آدمی اگر پیٹ کاٹ کر کسی آڑے وقت کے لئے تین ہزار روپیہ سیونگس اکاؤنٹس میں تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرا دے تو ۷۵ روپیہ زکوٰۃ کٹ جاتی ہے۔ ایک اور عجوبہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ سودی یا نام نہاد بلا سودی بچت کھاتوں میں تو تین ہزار روپیہ پر کٹوتی ہوتی ہے لیکن نام نہاد بلا سودی میعادی کھاتے (ٹرم ڈیپازٹس) میں اگر ایک ہزار بھی ہوں تو ۲۵ روپے وضع ہو جاتے ہیں۔ گویا کہ :—

(۱) کرنٹ اکاؤنٹس میں تو اگر کروڑوں ہوں تب بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔

(۲) سودی یا نام نہاد بلاسودی بچت کھاتے میں تین ہزار (یا ہر سال جو بھی نصاب مقرر ہو اس) پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے اور

(۳) نام نہاد بلاسودی میعادی کھاتے میں اگر ایک ہزار بھی ہوں (جس سے کم رقم سے یہ کھاتہ کھولا ہی نہیں جاسکتا) تو اس پر بھی زکوٰۃ دینی پڑتی ہے۔ یہ ایک ہزار پر زکوٰۃ کی کٹوتی صرف نام نہاد بلاسودی کھاتے سے نہیں، ہوتی بلکہ اگر کسی کی صرف ایک ہزار کی رقم آئی سی پی کے شراکتی کھاتے (میوچل فنڈز) کے ذریعہ بھی تجارت میں لگی ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ کٹ جاتی ہے۔ گویا کہ یہ فرض کر لیا گیا کہ جس کے ایک ہزار آئی سی پی کے شراکتی کھاتے یا بنک کے میعادی کھاتے میں ہیں اس کے پاس لازمی طور پر دو ہزار اور بھی ہوں گے۔ لہٰذا صاحبِ نصاب ہے

چنانچہ اکتوبر میں آئی سی پی نے جو سالانہ منافع برائے سال مختتمہ ۳۰، ۶، ۸۴ تقسیم کیا اس میں سے بلالحاظ مقدار اصل رقم، زکوٰۃ کاٹ لی۔ زکوٰۃ کے معاملے میں "شُد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیر ہا" والی بات بھی ہے۔ کیونکہ یا تو محکمۂ زکوٰۃ سے واضح ہدایات جاری نہیں ہوئیں یا بنکنگ کونسل نے پانچوں شکوں کو تسریحاً نہیں بتایا۔ چنانچہ سودی اور نام نہاد بلاسودی کھاتوں سے تو زکوٰۃ سب ہی بنک وضع کر رہے ہیں لیکن میعادی کھاتوں سے زکوٰۃ کی وصولی میں اختلافِ عملی ہے۔ کچھ بنک تو منافع میں سے وصول کر لیتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے کہ جب بعد انقضائے میعاد اصل رقم واپس کی جائے گی اس میں سے اکٹھی تمام سالوں کی مجموعی زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے گی، جیسا کہ مختلف نوعیت کے میعادی سیونگ سرٹیفکیٹس پر اصل رقم بعد اختتام میعاد واپس کرتے ہوئے وصول کی جاتی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ ہر سال منافع میں سے زکوٰۃ کاٹنی درست ہے یا میعاد پوری ہونے پر تمام سالوں کی اکٹھی وصول کرنا؟ سوال یہ ہے کہ بنکوں کے طریقۂ کار میں یہ اختلاف اور دوعملی کیوں ہے اور کس کی وجہ سے ہے؟ ایک یہ اس سے بھی بڑا لطیفہ یہ ہوا کہ اس سال زکوٰۃ یکم جون ۱۹۸۴ء : یکم رمضان ۱۴۰۴ھ کو واجب الوصول ہوئی اور منافع ۳۰ جون ۸۴ء کو بنکوں کی طرف سے واجب الادا ہوا۔ یعنی کہ منافع سے جو کھاتہ داروں کو آمدنی ہوئی وہ اگلے زکوٰتی سال ۱۴۰۵ھ میں جس کی زکوٰۃ یکم رمضان ۱۴۰۵ھ کو واجب الادا ہوگی اس میں محسوب ہونی چاہیے۔ لیکن منافعہ کی یہ آمدنی جو اس سال ہوئی وہ سابقہ سال کی بچت محسوب کر کے اس پر بھی زکوٰۃ کاٹ لی یعنی یکم رمضان ۱۴۰۴ھ کو کھاتہ میں وہ منافعہ کی رقم تھی ہی نہیں مگر سمجھا یہ گیا کہ کیونکہ اصل رقم تھی لہٰذا آئندہ ملنے والا منافعہ بھی اس میں شامل تھا۔ ایسے "اسلامی لطیفے" پاکستان ہی میں نفاذِ اسلام سے وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔ اور ہاں اس میں بھی یہی ہوا کہ کچھ بنکوں نے اس منافعہ پر بھی زکوٰۃ کاٹی اور کچھ نے نہیں کاٹی اور جائز مؤقف اختیار کیا کہ کیونکہ یہ رقم وضع زکوٰۃ کے بعد کھاتہ

میں آئی ہے۔ لہٰذا اس پر کٹوتی نہیں ہوگی بلکہ صرف اسی رقم پر جو اس تاریخ کو کھاتہ میں تھی۔

اس اندھے کی لاٹھی گھمانے میں اور بھی عجیب عجیب طرفگیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی نے بغرض حفاظت اپنی رقم آپ کو امانت دی ہے اور آپ نے اسے اپنے بنک کے بچت کھاتے میں جمع کر دیا تو اس پر بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ پچھلے سال کا ایک واقعہ مجھے ایک بنک کے افسر ہی نے سنایا کہ اس بنک کے پٹھان چوکیدار کے دوست نے اپنی پرانی ٹیکسی ستر ہزار میں بیچ دی اور نئی خریدنے کے لئے بات چیت کسی کمپنی یا کسی پرائیویٹ مالک سے شروع کر دی۔ دریں اثنا اس نے وہ پوری رقم اپنے دوست چوکیدار کو بطور امانت محفوظ رکھنے کو دے دی اور اس غریب نے اپنی بنک میں جہاں ملازم تھا اپنے سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کر دی۔ دوسرے دن یکم رمضان کو جو زکوٰۃ وصول کی گئی تو اس کے کھاتہ میں ان ستر ہزار سے ایک ہزار سات سو پچاس روپیہ کاٹ لئے۔ دو چار دن بعد جب اس ٹیکسی والے نے نئی ٹیکسی کے لئے سودا طے کر کے ادائیگی کے لئے اپنے چوکیدار دوست سے رقم واپس مانگی اور اس نے روپیہ نکالنے کے لئے چیک پیش کیا تو یہ پتہ لگا۔ نتیجہ یہ کہ چوکیدار کا بنک سے اور اس ٹیکسی والے کا چوکیدار سے بہت جھگڑا ہوا اور آخرکار غریب چوکیدار کو وہ رقم بھگتنی پڑی۔ اس سے بڑا گھپلا یہ کہ اگر کوئی مقروض ادائے قرض کے لئے تھوڑی تھوڑی رقومات بنک میں جمع کراتا رہا ہے کہ مطلوبہ رقم اکٹھی ہونے پر نکال کر قرض اتار دونگا۔ تو وہ رقم وضع زکوٰۃ کی وجہ سے ہر سال کم ہوتی جائے گی۔ اور تو اور کسی بنک سے بھی رقم قرض لی ہوئی اور اسی بنک کے بچت کھاتے میں سرکاری اعلان کردہ نصاب کے برابر یا زیادہ رقم پڑی ہوئی ہے تو بلا لحاظ اس مقروضہ رقم سے جو اسے اسی بنک کو ادا کرنی ہے اس کھاتے میں سے زکوٰۃ کٹ جائے گی۔

حالانکہ شرعًا قرض کی واجب الادا رقم سے زائد اگر رقم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ادائے قرض اور ادائے زکوٰۃ کے دو فرائض میں سے ترجیح اوّل الذکر فرض کو ہے۔ یہی صورت تعمیر مکانات کے لئے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے لئے ہوئے قرض کی بھی ہے۔ اگر کسی پر اس سلسلہ میں ایک لاکھ قرض ہے اور بنک میں صرف نصاب کے مطابق رقم ہے تو اس واجب الادا قرض کی رقم کو نظر انداز کر کے کھاتے میں سے کٹوتی کر دی جائے گی۔ یہ تو سرکاری اداروں سے قرض لی ہوئی رقومات کی صورت ہے جس کا دفتری ثبوت بھی ہوتا ہے۔ اگر نجی طور پر کسی سے بغیر دستاویز یا دستاویز پر قرض لیا ہوا ہے تو اسے بھی وضع زکوٰۃ کے لئے کوئی نہیں مانتا۔ یعنی بات یہ ہوئی کہ سرکاری خزانہ میں تو رقم آنی چاہئے، تم پر کسی کا قرض ہے تو مکان بیچو اور نہ ہو تو بیوی بچوں کو رہن رکھ کر ادا کرو، ہمیں کیا غرض۔ اس سلسلہ میں جتنا کچھ عرض کیا ہے وہ سنی سنائی باتیں نہیں بلکہ سب میرا ذاتی تجربہ ہے۔ لیکن یہ بلائے زکوٰۃ تو عوام کالانعام پر ہی نازل ہوئی ہے۔ سرمایہ دار تاجر و صنعت کار، جن کے ایک ہاتھ میں انتظامیہ کی لگام اور دوسرے میں قانون ساز اداروں کی نکیل ہمیشہ سے رہی ہے ان کے لئے کھلی چھوٹ ہے کہ ان کے اموالِ تجارت پر زکوٰۃ

ہے، نہ کرنٹ اکاؤنٹس میں جمع شدہ "اموالِ ظاہرہ" پر چاہے لاکھوں کروڑوں روپیہ ہوں۔

یہ تو حال ہے قانونِ زکوٰۃ کے نفاذ کا۔ اب جو قانونِ عُشر آیا ہے اس کا بھی حال سن لیجئے کہ اس "رشوتستان" میں اس سے فائدہ نہ عوام مستحقین کو ہوگا نہ حکومت کو۔ چھوٹے موٹے کاشتکاروں پر تو یہ عائد ہی نہیں ہوتا۔ اور بڑے بڑے وڈیروں، زمینداروں اور مربع داروں کے اقتدار سے باہر مقامی محصلینِ عُشر ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنے میں جان و آبرو کا ہر وقت خطرہ ہے۔ پھر علاوہ "زور" کے "زر" بھی تو انہیں کے پاس ہے۔ عُشر کا تخمینہ لگانے والے "بزور" یا "بزر" چاہیں تو گیہوں کو باجرا لکھ دیں، چاہیں تو دس من پیداوار کو پانچ من درج کر دیں اور چاہیں تو لہلہاتی فصل والی زمین کو بنجر اور کلّر لکھ دیں۔ اوپر والوں میں سے چیک کرنے کو کون آتا ہے۔ اور کس کس اندراج کو چیک کرتا پھرے گا! اور اگر آیا بھی تو وہ بھی کون سا فرشتہ ہوگا! ہاں یہ ہے کہ اس کا پیٹ بڑا ہوگا تو ان لوگوں کو بڑے سے بڑا پیٹ بھرنے کی بھی استطاعت ہے اور انہیں بھی فائدہ ہی ہے کہ بجائے ایک ہزار عُشر ادا کرنے کے دہنِ سگ پانچ سو سے ہی دوختہ ہو جاتا ہے تو نقصان کیا ہے؟

غرض یہ کہ اسلام کے نام پر جن مصنوعات کی نمائش لگائی جا رہی ہے وہ اسی اسلام کی ہیں جس کے مبلغ ہونے کا خطاب طارق عزیز کو عطا ہوا ہے۔ اس اسلام کے تو ارکانِ خمسہ رقص و موسیقی و اداکاری و آزادیٔ نسوانیت اور تشہیرِ جرم و جنس ہی ہو سکتے ہیں تو پھر آرٹ اور کلچر کے ان مظاہر، یعنی فلموں اور ٹی وی کے اداکاروں اور صداکاروں کی پرورش اور حوصلہ افزائی تو اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ جن کی ادائیگی نہ ہو تو دنیا پر کیسے ثابت کیا جائیگا کہ جس مقصد کے لئے یہ خطۂ زمین خدا نے دے دیا تھا وہ ہم پورا کر رہے ہیں!۔

اور شریعت کورٹس کے دائرۂ اختیار سے عائلی قوانین کا جائزہ الگ رکھنے کی وجہ کیوں ناقابلِ فہم ہے؟ یہ قانون جب ایک مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے نافذ کیا تھا تو پیشہ کی ہم آہنگی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ دوسرا بھی اسے محترم سمجھتا رہے۔ "إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا" کا اصول بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ اور اصل بات یہ کہ آزادیٔ نسواں اور مساواتِ مرد و زن کے معاملہ میں حقیقی دباؤ معدودے چند لولیانِ اطلس پوش کا نہیں ہے جبکہ صرف سٹیج کی کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور مشرقی و مغربی ہمسایوں کے ہاتھوں میں ہے جو ہر بہانہ یہاں مسلسل فکری اور نتیجۃً عملی انتشار چاہتے ہیں اور جن کے تنخواہ دار گرگے یہاں نام نہاد ترقی پسند ادیبوں اور ابلاغِ عامہ کے سرکاری اور درباری اداروں اور آرٹ اور کلچر کے مراکز میں مقتدرینِ اعلیٰ ہیں اور سالانہ لاکھوں روپیہ خزانۂ عامرہ سے ان پر خرچ ہوتے ہیں۔

جناب صدر نے جو فلموں سے آمدنی کو رزقِ حلال کہا ہے؟ اس میں کیا حرج ہے! اسلامی اقدار و شعائر کے گوسفندوں کو حلال کر کے منڈی میں فروخت کرنے سے جو رزق حاصل ہو وہ حلال نہیں تو کیا حرام ہوگا! یا شاید پھر طنزاً فلم والوں کو "حلال خور" کہا ہو، یہ تو دی جانیں کہ کیا منشاء تھا۔ جناب صدر کی اسلام آوری کے بیانات سے جو بابرہ شریف جیسی فلمی عشوہ فروشوں کو غلط فہمی ہوگئی تھی اس کا ازالہ کر کے انہوں نے علماء کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش اپنی طرف سے تو کر دی۔ اب یہ محترم حضرات جنّت الحمقاء میں ہی رہنے پر مصر ہوں تو اس میں صدر صاحب پر تو الزام آتا نہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ ہر طرف سے یلغار کرتا ہوا اسلام آ رہا ہے ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے

ابھی تو بس اونٹ کی گردن ہی جھونپڑی میں داخل ہوئی ہے۔ جب پورا اونٹ گھس آئے گا تب کیا معلوم سما بھی سکے گا یا جھونپڑی تو رہے گی نہیں بس اونٹ ہی بلبلاتا نظر آئے گا۔ وہ جو ایک بزرگ کا مشہور شعر ہے (جو بطور ٹوٹکے کے عسرِ ولادت کی صورت میں لکھ کر حاملہ کے پیٹ پہ باندھ دیا جاتا ہے)، وہ اس وقت یاد آ رہا ہے کہ ؎

مرا جاں شُد، بخرم را نیز جاں شُد   زنِ دہقان زاید یا نہ زاید

یعنی شترِ اسلام داخل ہو جائے چاہے جھونپڑی رہے یا نہ رہے۔ اس اسلام پر شتر بیت کا اطلاق یوں ہوتا ہے کہ ابھی تک کوئی کل سیدھی نظر نہیں آئی

سندھ میں جو کچھ لاوا پک رہا ہے اس کے حال کا تصور ہی بڑا ہولناک ہے۔ جی ایم سیّد کو نظر بند رکھنا لاحاصل ہے کیونکہ اسکی پوری اُمّت بالائی اور زیریں سندھ کے ہر علاقہ میں فعّال ہے اور ہر جگہ معاشی معاشرتی، نجی، سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں میں با اثر ہے۔ شیخ ایاز، حمیدہ کھوڑو، شمشیر الحیدری اور غلام مصطفیٰ تو گنتی کے چند نمایاں کھلاڑی ہیں، ورنہ تو نہ جانیں کتنے کہاں کہاں بنیاد کھود رہے ہیں اور مسلح و غیر مسلح تخریب کاری کے لئے کیا کیا اسلحہ اور مالی امداد اپنے مشرقی اور مغربی سرپرستوں سے کیسے کیسے حاصل کر رہے ہیں؛ غلام مصطفیٰ شاہ کا جو انگریزی جریدہ شائع ہوتا ہے اس میں اسلام اور اقبال اور قائدِ اعظم اور دیگر بانیانِ پاکستان کے لئے جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ بھارت کے جرائد بھی نہیں لکھتے۔ نظریۂ پاکستان کی جیسی دھجیاں بکھیری جاتی ہیں اور اسلامی افکار کے جس طرح پرخچے اڑا دئے جاتے ہیں وہ آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے، بشرطیکہ کوئی اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن کیونکہ صوبائی انتظامیہ میں اکثریت انہیں لوگوں کی ہے، جن میں سابق حکومت کے شکست خوردہ اور آمادۂ انتقام افراد بھی شامل ہوگئے ہیں، لہٰذا اوپر رپورٹیں "سب ٹھیک ہے" ہی کی بھیج سکتے ہیں اور جناب صدر کے دوروں میں بھی اپنے ہی لوگوں سے زندہ باد کے نعرے لگوا کر امن و امان کے تاثر

کو مستحکم کرتے رہتے ہیں ۔ یہ معاہدہ اتو انتخابات ہی میں پھوٹے گا اور اگر اس دقت سختی کی گئی ، جس کے نتیجے میں انہیں میں سے دو چار ہزار بھی مشرقی سرحد پار کر کے بظاہر پناہ لینے کے لئے نکل گئے تو پھر ان کے سرپرست کو وہی بہانہ مل جائے گا جو سنہ ۷۱ء میں مل گیا تھا ، جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش بن گیا ۔ اگر اسی طرح سندھو دیش بھی بنا تو دو ڈھائی کروڑ پناہ گیر تو خیر مارے ہی جائیں گے ، لیکن یہ " بڑے بھائی " جو یہاں مرکزی حکومت کے سرکاری و نیم سرکاری محکموں ، نیز صنعتی و تجارتی شعبوں میں اس صوبہ کو اپنی کالونی سمجھ کر راج کر رہے ہیں ، ان کا حال اور بھی بُرا ہوگا کیونکہ سندھیوں کو پنجابیوں سے ویسی ہی نفرت ہے جیسے ہندوستان کے عوام کو بدیسی حکمرانوں سے تھی اور وجوہات بھی وہی ہیں ۔ یہ آج کی بات نہیں بلکہ سندھی میں ایک پرانی ضرب المثل ہے کہ اگر سانپ اور پنجابی ساتھ نظر آجائیں تو پہلے پنجابی کو مارو پھر سانپ کو ۔ رہے ہم پناہ گیر جن کا سب سے بڑا مرکز کراچی اور پھر حیدرآباد ہے تو سرکاری ملازمتوں میں اوّل تو کوٹہ سسٹم نے راستہ بند کر دیا ہے ، جس کے خلاف احتجاجات پر جناب صدر نے اعلان کر دیا کہ یہ پرنالہ تو وہیں گرتا رہے گا جہاں مدّت سے گر رہا ہے ۔ پھر یہ کہ سرکاری آسامیوں کے اشتہارات میں کھلم کھلا مہاجروں کے دونوں شہروں کے باشندوں کو اہل ہونے سے خارج کر دیا جاتا ہے ۔ تیسری بات یہ کہ اگر بظاہر یہ استثناء نہ بھی ہو تو صوبائی محکموں میں تو ۹۹ ٪ وہی تقرر کا اختیار رکھتے ہیں جو سندھو دیش کے حامی ہیں اور مرکزی یا مرکز کے تحت محکموں میں پنجاب کے لوگ ہیں جو اپنے ہم صوبہ لوگوں کے علاوہ کسی اور کو دیکھنا پسند نہیں کرتے ۔ پھر بھی انتخابات میں اگر سندھ سے جناب صدر کوئی توقع رکھ سکتے ہیں تو ہم پناہ گیروں سے ہی کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر غلبہ پنجاب کا رہا تو پھر بھی سندھیوں کے مقابلہ میں شاید ہم پر توجہ کر سکیں ۔ ورنہ اگر سندھو دیش کے حامیوں کو ہی انتخابات میں کامیابی ہوئی تو وہی حال ہوگا جو بھٹو کے اقتدار کے آخری دن ہوتے ہوتے رہ گیا ۔ اس لئے ہمیں بھی عافیت اسی میں نظر آتی ہے بقول آپ کے " اھون البلیتین " ہی رہے گا ۔ مگر اب مشکل یہ ہوگئی ہے کہ بیرونی اور اندرونی سیاسی دباؤ اور بین الاقوامی ، خصوصاً دونوں طرف کی سرحدوں کے حالات کے پیش نظر انتخابات سانپ کے مونہہ کی چھچھوندر ہوگئے ہیں ۔ اسلام دِسلام کی بات تو بعد کو سوچئے ، پہلے اس خطہ کی خیر منائیے ۔ جہاں سچ مچ کے اسلام کے کبھی نہ کبھی نافذ ہونے کی امید تو ہے ، چاہے اگلی صدی میں ہی پوری ہو ۔ اب یہ ملک سنہ ۶۵ء والا نہیں ہے ۔ جب جہاں تک اس کی حفاظت کے لئے سربکف نکل آئے تھے ۔ سنہ ۶۵ء سے سنہ ۷۰ء تک صرف ۵ برس میں افکار و احوال میں جو تبدیلی آئی اس کا ثبوت تو آپ نے دیکھ ہی لیا ۔ اب سنہ ۷۰ء سے سنہ ۸۴ء تو چودہ برس ہو چکے جو عرصہ بھی طویل تر ہے اور وقت کی رفتار بھی تیز تر رہی ہے اور سمت میں بھی زیادہ کجی آگئی ہے تو اب اندازہ کیجئے کہ نتیجہ کیا رہے گا ۔ معاذ اللہ منہا ۔

لاھور اور گرد و نواح کے قارئین "میثاق" سے التماس ہے کہ
وہ نوٹ فرما لیں کہ ان شاء اللہ العزیز

شامِ الہدیٰ - لاہور

کی تیسری نشست بتاریخ ۸ مارچ ۸۵ء بروز جمعۃ المبارک
بوقت سات بجے بعد نماز مغرب

بمقام: واپڈا آڈیٹوریم - واپڈا ہاؤس

منعقد ہوگی جس میں سورہ حج کے آخری رکوع کا درس ہوگا -
مزید براں چوتھی نشست کا اسی مقام پر انعقاد ان شاء اللہ العزیز
۵ اپریل ۸۵ء بروز جمعہ بعد نماز مغرب ہوگا جس میں سورہ صف
مکمل زیر درس رہے گی -

کراچی اور گرد و نواح کے قارئین "میثاق" سے التماس ہے کہ
وہ نوٹ فرما لیں کہ ان شاء اللہ العزیز

شامِ الہدیٰ - کراچی

کی آئندہ نشست ۱۸ مارچ ۸۵ بروز سوموار (پیر)
بوقت پونے آٹھ بجے (۷-۴۵) بعد نماز مغرب

بمقام: تاج محل ہوٹل، موتی محل آڈیٹوریم - شارع فیصل

منعقد ہوگی جس میں سورۃ المنٰفقون مکمل کا درس ہوگا -


فریش ویل
سویٹس
پاکستانی تہذیب
کا آئینہ دار
صدیوں پرانی
روایات کی حامل
ہماری مٹھائیاں اور
حلوہ جات یقیناً ہمارے
ذائقہ اور لذت کی غمازی
کرتی ہیں۔ احمد نے اس قدیم
پیشے کو جدید دور کے تقاضوں
سے ہمکنار کیا اور اپنی
مصنوعات کو بالکل
منفرد انداز میں
پیش کیا۔
دنیا کے ہر بڑا اعظم میں احمد
کی مٹھائیاں اور حلوہ جات
پاکستانی تہذیب اور روایات
کی شناخت ہیں۔
حلوہ جوزی
Freshwel
جدید ترین نائٹروجن پیکنگ پلانٹ پر
سیلوفین پیکنگ کے ساتھ پیک کئے جاتے ہیں
تاکہ تازگی اور خستگی ہمہ وقت برقرار رہے
ٹین کے لیڈ بیز کھولنے کو آسانی سے کھل جاتے ہیں۔
سوہن حلوہ
کراچی حلوہ
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
رس گلے
زعفرانی جامن
سوہن ڈیلائیٹ
تلے ہوئے مصالحہ دار بادام
مٹھائیوں میں روایتی اور صنعتی معیار کے خالق
AHMED
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی ۱۱۲، سائٹ، کراچی۔ فون: ۲۹۴۲۹۱-۹۵
MASS

ہدایات برائے شرکاءِ سالانہ اجتماع تنظیمِ اسلامی

منجانب چودھری غلام محمد (قیمِ تنظیمِ اسلامی)

(۱) سالانہ اجتماع میں تمام رفقاءِ تنظیم کی شرکت لازمی ہے۔ اگر کوئی عذر ہو تو پیشگی معذرت ضروری ہوگی۔

(۲) خواتین کے لئے خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ تنظیم سے منسلک یا تنظیم کے کام سے دلچسپی رکھنے والی تمام خواتین اجتماع میں شرکت کی امکانی کوشش کریں۔ —— اجتماع میں شرکت کرنے والی خواتین ہمیں اپنی آمد سے پیشگی مطلع فرما دیں۔

(۳) سالانہ اجتماع کی پہلی نشست ان شاء اللہ ۲۴ر کی صبح کو ہوگی۔ تاہم تمام رفقاء حسبِ ہدایتِ امیر تنظیم ۲۲ر مارچ کو قبل از دوپہر پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ ۲۲ر کو امیر تنظیم کے خطبۂ جمعہ میں بھی شرکت ہو جائے اور شام کو مسجد شہداء کے درسِ قرآن میں شرکت ہو سکیں اور پھر ۲۳ر کی صبح انجمن کے سالانہ اجلاس اور پھر شام کو محاضراتِ قرآنی کی پہلی نشست میں بھی شرکت کر سکیں۔ بہرکیف ۲۳ر کی شام تک ہر رفیق لازماً قرآن اکیڈمی پہنچ جائے۔

(۴) بیرونِ لاہور سے تشریف لانے والے رفقاء نوٹ فرمالیں کہ جمعہ ۲۲ر مارچ کی صبح سے تنظیم کی جانب سے لاہور ریلوے سٹیشن کے باہر بائیں جانب رفقاء کی سہولت کے لئے ایک کیمپ لگا دیا جائے گا۔ جو حضرات بھی بذریعہ ٹرین تشریف لائیں وہ سٹیشن سے باہر کیمپ میں موجود رفقاء سے خود رابطہ کریں۔ بسوں، منی بسوں اور فلائنگ کوچز سے آنے والے حضرات کے لئے بھی وہ جگہ دور نہیں ہے۔ وہاں تک وہ خود پہنچ جائیں تو ان شاء اللہ قرآن اکیڈمی تک ٹرانسپورٹ کا انتظام ہو جائے گا۔ کیمپ جمعہ کی شام تک قائم رہے گا۔ ہفتہ کو آنے والے حضرات قرآن اکیڈمی خود پہنچیں۔

(۵) اجتماع کے دوران تمام رفقاء کا قرآن اکیڈمی میں رہائش پذیر ہونا لازمی ہے۔ معذرت کی صورت میں پیشگی تحریری درخواست ضروری ہوگی۔

(۶) موسم کے مطابق ضروریات کا مختصر سامان ہمراہ ہونا چاہیئے۔

(۷) اگر کوئی رفیق کوئی تجویز پیش کرنا چاہیں یا کسی مسئلہ پر اظہارِ خیال کرنا چاہیں تو ۱۵ر مارچ تک تحریری شکل میں دفتر کو ارسال کر دیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نظم کی پابندی کے ساتھ دین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

اس شمارے میں، انقلابِ ایران،
التزامِ جماعت اور لزومِ بیعت
پر ڈاکٹر اسرار احمد کے اہم خطابات

وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی
٣٦ کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۴	اپریل ۱۹۸۵ء مطابق رجب المرجب ۱۴۰۵ھ	شمارہ ۴

مشمولات

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زر تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ط

ہماری بھرپور کوشش ہے کہ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۵ء کا شمارہ مارچ کے آخری عشرے میں کتابت و طباعت کے جملہ مراحل سے گذر کر تنظیم اسلامی کے دسویں سالانہ اجتماع اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے ساتویں سالانہ محاضراتِ قرآنی کے دوران منصۂ شہود پر آجائے۔ السعی منا والا تمام من اللہ

مرکزی انجمن خدام القرآن کے امسال کے محاضرات اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کہ اس میں ملک کے بعض جیّد علماءِ کرام محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ کے پیش کردہ فرائضِ دینی کے اُس جامع تصوّر پر اظہارِ خیال فرمائیں گے جو محترم ڈاکٹر صاحب نے کتاب و سنّت اور سیرتِ مطہرہ کے معروضی مطالعے سے اخذ کیا ہے اور جس کی دعوت و تبلیغ کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ واضح رہے کہ فرائضِ دینی کے جامع تصوّر کا خلاصہ مارچ کے میثاق میں شائع کیا جا چکا ہے۔ — جو علماءِ کرام مقالے پیش فرمائیں گے وہ تو ان شاءَ اللہ ایک ترتیب کے ساتھ شائع ہونگے ہی، اللہ کی نصرت شاملِ حال رہی تو تقاریر کو بھی کیسٹوں سے نقل کر کے شاملِ اشاعت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ نیز تائیدی مقالوں کے ساتھ ساتھ تنقیدی مضامین کو بھی شائع کیا جائیگا۔

زیرِ نظر شمارے میں امیرِ تنظیم اسلامی کے تین اہم خطاب شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک "شذرات" کے زیرِ عنوان ہے جو دراصل محترم ڈاکٹر صاحب کے ایک حالیہ خطابِ جمعہ سے ماخوذ ہے جس میں موصوف نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ فرمایا ہے۔ دوسرے خطاب کا عنوان ہے "کیا ایرانی انقلاب ایک اسلامی انقلاب ہے ؟" ہمیں افسوس ہے کہ صفحات کی تنگی کے باعث اسے مکمل شائع نہیں کیا جا رہا۔ ان شاءاللہ آئندہ شمارے میں یہ مضمون تکمیل کو پہنچ جائیگا۔ تیسرا خطاب "اسلامی انقلاب کے لئے التزام جماعت اور لزوم بیعت" اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ درحقیقت محترم ڈاکٹر صاحب کے خطاب "جہاد بالقرآن" کا تتمہ و تکملہ ہے۔ مناسب ہوگا کہ قارئین اس کے ساتھ ہی میثاق کے اگست ستمبر ۸۴ء کے دو شماروں میں "جہاد بالقرآن" کا ایک بار پھر مطالعہ کر لیں۔ تاکہ بات پورے طور پر سامنے آسکے۔

شذرات

★ محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ نے یکم مارچ ۸۵ء کے خطابِ جمعہ میں، مسجد دارالسلام میں 'حالاتِ حاضرہ' پر جو اظہارِ خیال فرمایا تھا اس کا صرف ملخص قارئینِ کرام کے استفادہ کے لئے پیش ہے۔ (جمیل الرحمٰن)

حمد وثنا، صلوٰۃ و درود اور ادعیہ مسنونہ و ماثورہ کے بعد فرمایا:

حضرات! بہت طویل عرصہ سے ہمارے ان اجتماعات میں بہت اہم اور بنیادی دینی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ہے۔ خاص طور پر اسلامی انقلاب اور اس کا طریق کار، سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے اس کا استنباط، پھر یہ کہ اس دور میں کس کس پہلو سے اس میں اجتہاد کی ضرورت ہے! یہ موضوعات بڑی تفصیل سے زیر بحث رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اس پورے عرصہ میں ملک کے سیاسی حالات وواقعات کے بارے میں اپنی اصل تقریروں کے بعد کسی سوال کے جواب میں کوئی مختصر سی بات کہی ہو تو کہی ہو ورنہ ان میں سے کسی چیز کو اپنی کسی تقریر کا موضوع نہیں بنایا۔ لیکن اس سلسلہ میں آج میں چاہتا ہوں کہ کچھ چیزیں زیر بحث لاؤں۔

ملک میں سیاسی و انتخابی عمل کیوں ضروری ہے! آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے جمعہ میں میں نے اصل تقریر کے بعد اجمالاً یہ عرض کیا تھا کہ ہم نہ الیکشن کا بائیکاٹ کرنے والوں میں ہیں نہ ان میں حصہ لینے والوں میں ہیں۔ میں نے اور تنظیم اسلامی نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ہم الیکشن کا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ البتہ ہم نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ہمارے حلقۂ انتخاب میں اگر کوئی امیدوار نیک اور سیرت و کردار کے لحاظ سے دیندار ہوگا تو اس کے حق میں ووٹ دیا جا سکے گا۔ اگر وہ کسی جماعت کے ٹکٹ پر کھڑا ہو تو اضافی شرط یہ ہوگی کہ اس جماعت کے منشور میں کوئی شق خلافِ اسلام نہ ہو۔ چونکہ ہماری رائے میں اس ملک میں صحیح اسلامی نظام الیکشن کے ذریعہ قائم و نافذ ہونا ممکن العمل نہیں ہے یہاں جب بھی اسلامی نظام قائم و نافذ ہوگا وہ ان شاء اللہ انقلابی نہج کی جدوجہد کے نتیجہ میں ہوگا — یہ انقلابی نہج سیرتِ مطہرہ کے تفصیلی اور مرحلہ وار جدوجہد سے متعلق قریباً آٹھ دس مسلسل تقاریر کے

بین السطور تو قع ہے کہ آپ نے سمجھ لیا ہوگا۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ مجھے کافی عرصہ سے ملک کے مستقبل کے بارے میں حالات کے تشدید پریشان کن پہلوؤں کے پیش نظر جو تشویش لاحق تھی اس میں کچھ عرصہ سے قدرے تخفیف ہوئی ہے اور کچھ امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ میں آج اسی پر قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں ــــ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ میں اپنی تقاریر میں شدت سے یہ بات کہتا رہا ہوں کہ اس ملک میں سیاسی اور انتخابی عمل جلد از جلد جاری ہونا اس ملک کی بقا اور استحکام کے لئے نہایت ضروری ہے۔ صدر صاحب سے نجی ملاقاتوں میں بھی ان سے کہہ چکا ہوں اور شوریٰ کے پہلے اجلاس میں بھی میں نے یہ بات بڑے شدومد کے ساتھ کہی تھی۔ میں نے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ موجودہ مارشل حکومت اگر اس بارے میں کھلے اجلاس میں اپنا موقف زیر گفتگو لانا نہیں چاہتی تو جیسے طرح خارجہ پالیسی پر بند اجلاس میں گفتگو ہو چکی ہے۔ جس میں باہر کے کسی شخص حتیٰ کہ پریس کے نمائندوں کو بھی شرکت کی اجازت نہیں تھی اسی طرح بند اجلاس میں اس مسئلہ پر گفتگو کر لی جائے۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح میری یہ تجویز کسی نے تسلیم نہیں کی ــ بعدہٗ بہت سے اسباب کے پیش نظر میں جلد ہی شوریٰ سے استعفیٰ دیکر علیحدہ ہو گیا پھر میں نے دسمبر ۸۲ء میں صدر صاحب کو ایک خط لکھا کہ میں اس بات سے تو مایوس ہو چکا ہوں کہ موجودہ حکومت واقعی اور حقیقی اسلام کے نفاذ کے لئے مؤثر ہو سکتی ہے لہٰذا اس کیلئے ضروری ہے کہ اس ملک میں جلد از جلد انتخاب کرائے تاکہ یہاں کے لوگوں میں محرومی کا احساس ختم ہو جو روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور جو ملک کے مستقبل کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تمام باتیں میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر حضرات کے علم میں ہوں گی ــ ان میں سے اکثر باتیں اخبارات میں اور میثاق میں شائع ہو چکی ہیں ــ البتہ ایک بات کا اعادہ ضروری ہے۔ مختلف اوقات میں بہت سے مخلصین مجھ سے یہ سوال کرتے رہے ہیں کہ ایک طرف تم کہتے ہو کہ اسلام انتخابی عمل سے نہیں آسکتا، صرف انقلابی عمل سے آسکتا ہے۔ دوسری طرف تم الیکشن کے عمل کو جاری کرنے پر پیہم انتہائی زور دیتے رہے ہو تو ان میں تضاد ہے ــ میں اس کی متعدد بار وضاحت کر چکا ہوں آج پھر کیے دیتا ہوں۔

اصل میں ظاہری طور پر یہ تضاد اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ ہم دو چیزوں کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ اللہ کے لئے ان دونوں کو بالکل علیحدہ علیحدہ اپنے سامنے رکھیے۔ دونوں کے تقاضے جدا ہیں۔ ان کو آپس میں خلط مبحث نہ کیجیے۔ ان دونوں کو میں ایک مثال سے

سمجھا تا رہا ہوں کہ ایک ہے کسی انسان کا زندہ رہنا۔ اور ایک ہے کسی انسان کا مسلمان بنا۔ ان دونوں چیزوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ ہر انسان کو خواہ وہ کسی دین و مذہب سے تعلق رکھتا ہو زندہ رہنے کے لئے ضرورت ہے ہوا کی۔ پانی کی اور غذا کی۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی آپ بند کر دیں گے تو انسان مر جائیگا۔ ہوا بند ہو جائے۔ تو چند منٹوں میں مر جائیگا۔ پانی بند ہو تو شاید ایک ہفتہ گزر جائے۔ غذا روک دیں تو ممکن ہے پندرہ بیس دن زندہ رہ جائے۔ الغرض زندگی کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے انسان کے لئے یہ تینوں چیزیں لازم ہیں۔ البتہ ایک انسان کے مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دل میں ایمان ہو۔ خواہ کسی درجہ میں ہو۔ اللہ پر یقین ہو، آخرت پر یقین ہو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین ہو، قرآن مجید کے کلام ربانی ہونے پر یقین ہو۔ یہ چیزیں ہونگیں تو وہ اپنی عملی زندگی میں مسلمان بن سکے گا۔ لہٰذا یہ دونوں چیزیں بالکل جُدا ہیں لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ان دونوں کو بعض نیم سیاسی نیم مذہبی جماعتوں نے ہمارے یہاں گڈمڈ کر دیا ہے۔ لوگ بھی اپنی نیک نیتی اور سادہ لوحی کے باعث اسے علیحدہ علیحدہ سمجھ نہیں پا رہے۔ ورنہ یہ دونوں چیزیں ایک نہیں ہیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ پس جس طرح ایک انسان کے زندہ رہنے کے لوازم کچھ اور ہیں۔ اور ایک انسان کے مسلمان بننے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اسی طریقہ سے پاکستان کے بقاء کے لئے لازم ہے کہ ملک کے تمام رہنے والوں کو اطمینان ہو کہ ہمارے حقوق محفوظ ہیں۔ مختلف علاقوں اور طبقوں کے لوگوں کو بھی اطمینان ہو کہ ملکی معاملات میں ہماری رائے کا بھی ایک مؤثر درجہ اور حصہ ہے۔ ان کو چلانے والوں میں ہمارے نمائندے بھی ہماری رائے اور پسند کے مطابق شریک ہیں۔ الغرض کسی کو بھی احساس محرومی نہ ہو۔ کوئی بھی یہ نہ سمجھے کہ ایک مخصوص علاقے یا طبقے کے لوگ بطور حکمران ہم پر مسلط ہیں اور ہمارا مقام و مرتبہ صرف محکوم کا رہ گیا ہے۔ اس احساس محرومی کو ختم کرنے کا اصل ذریعہ سیاسی اور انتخابی عمل ہے۔ غیر جانبدارانہ منصفانہ آزادانہ اور صاف ستھرا مسلسل سیاسی و انتخابی عمل۔ اس کو میں ہوا کے مشابہ سمجھتا ہوں۔ اگر ہوا کی آمد و رفت نہ رہے، اگر سانس کی آمد و شد نہ رہے تو یہ سب سے زیادہ مہلک و خطرناک ہے آپ جانتے ہیں کہ انسان کا ہر سانس اس کیلئے باعث تقویت بھی ہے اور باعث تنقیہ بھی اس لئے کہ اس طرح جسم کو توانائی بھی حاصل ہوتی ہے اور خون کی صفائی بھی ہوتی ہے۔ تو جس طرح انسان کی زندگی کا یہ معاملہ ہے، اسی طرح سیاسی دور کے آزاد ملک میں جیسا کہ ہمارا ملک پاکستان ہے سیاسی و انتخابی

عمل طویل عرصہ کے لئے رُک جائے۔ معطل ہو جائے تو اس کا نتیجہ ملک کے حق میں نہایت ہولناک نکلے گا۔ سیاسی و انتخابی عمل غیر پسندیدہ عناصر کو ایوانِ حکومت سے بے دخل کرنے اور پسندیدہ لوگوں کو منتخب کرنے کے مسلسل مواقع فراہم کرتا ہے۔ جو 'ہوا' کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسی لئے میں شدومد اور تکرار کے ساتھ حسبِ موقع یہ کہتا رہا ہوں کہ اس ملک میں سیاسی و انتخابی عمل شروع ہونا اور جاری رہنا لازمی اور ضروری ہے۔ ورنہ مختلف علاقے کے لوگوں کے احساسِ محرومی کو وہ لوگ جو نظریہ پاکستان سے متفق نہیں ہیں، وہ مختلف طریقوں سے لوگوں کو غیر مطمئن کریں گے اور کر رہے ہیں۔ جو اس ملک کی بقا، اس کی سالمیت، اس کی یکجہتی کے لئے انتہائی مضر ہے۔ اسی لئے میں نے صدر صاحب کی جانب سے انتخاب کے انعقاد کے اعلان کا خیر مقدم کیا تھا اور امید کی کرن بھی اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ سیاسی و انتخابی عمل کا آغاز ہو گیا ہے۔ پھر یہ کہ میری محدود معلومات اور اخبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ بہت بڑی حد تک انتخابات غیر جانب دارانہ اور منصفانہ ہوئے ہیں۔ مارشل لا حکومت نگران تو رہی ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی غیر جانب دار رہی ہے۔ اگر کہیں کچھ قابلِ اعتراض حرکتیں ہوئی ہیں تو وہ شاذ بھی ہیں اور ان کی ذمہ داری محدود طور پر صرف حلقے کے منتظمینِ انتخاب کے سر جاتی ہے۔ یہ حرکتیں تو کسی نہ کسی درجہ میں بعض ان ملکوں میں بھی ہوتی ہیں جو جمہوریت کی چیمپین کہلاتی ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی دُنیا نے تسلیم کیا ہے کہ انتخابات غیر جانب دارانہ ہوئے ہیں۔

اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے لئے انتخابی عمل مفید نہیں ہے!

البتہ جہاں تک پاکستان کا صحیح معنی میں اسلامی ریاست بننے اور اس میں صحیح طور پر اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کا تعلق ہے۔ صرف چند تعزیرات اور صرف چند قوانین نہیں۔ بلکہ اس کا سیاسی، اقتصادی، معاشی، سماجی، معاشرتی اور عائلی نظام پورا کا پورا اور بھرپور طریقے پر یہاں قائم و نافذ ہو جائے تو اس کا طریقہ الیکشن کا نہیں ہے۔ اس راستہ سے کوئی مثبت پیش قدمی ممکن نہیں ہے۔ بلکہ میں پھر وہی بات عرض کروں گا جس کا مختلف مواقع پر اظہار کر چکا ہوں کہ اس طریقہ سے منفی نتائج نکلتے ہیں۔ انتخابی عمل کے ذریعہ تحزّب اور حریفانہ جذبات، کدورتیں، عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جب مقابلہ ہو گا تو مختلف گروہوں اور طبقوں میں ان چیزوں کا جڑ پکڑنا ایک لازمی بات ہے۔ یہ چیزیں کسی ایسی جماعت کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہیں، خالصتاً اسلام کے لئے کام کرنا چاہتی ہو۔ خواہ وہ اپنے دل میں اور کام میں کتنی ہی

مخلص ہو لیکن ظاہر بات ہے کہ الیکشن میں آئے گی تو مقابلہ میں آتے گی اور مقابلہ میں بھی مسلمان ہیں - انہی کی دوسری جماعتیں ہیں جن میں سے اکثر اسلام ہی کے نام پر انتخابات میں حصہ لے رہی ہوں گیں - لہٰذا مسلمانوں ہی کی مختلف جماعتوں، گروہوں یا پارٹیوں کا باہمی یہ انتخابی کش کش اور کشمکش کا معاملہ رکاوٹ بن جائے گا اس جماعت کے لئے جو خالصۃً اسلامی نظام کے لئے کام کرنا چاہتی ہو - وہ جب کسی کی مدمقابل اور حریف بن کر میدان میں آتے گی اور ووٹوں کے حصول کے لئے کوشش کرے گی تو اس کی داعیانہ حیثیت شدید مجروح ہوگی اور وہ کبھی بھی اکثریت میں منتخب ہو کر ایوانِ حکومت میں نہیں پہنچ سکے گی - لہٰذا ایسی جماعت کا خود حریف بن کر الیکشن کے میدان میں اترنا یا کسی جماعت یا کسی آزاد اُمیدوار کی بلاواسطہ یا بالواسطہ حمایت کرنا - اس کے لئے کنویسنگ کرنا، کسی کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنا ایسی سنگین چٹان ثابت ہوگا جو ہٹائے نہ ہٹے گی - لہٰذا اس ملک کو اسلامی ریاست بنانے اور اسلامی نظام کو مستحکم بنیادوں پر قائم اور نافذ کرنے کا عمل کسی طور پر بھی انتخابی سیاست کے ذریعے ممکن نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کا راستہ انقلابی راستہ ہے - جس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ میں متعدد بار گفتگو کر چکا ہوں - ان کا حوالہ تنظیمِ اسلامی کی بعض مطبوعات میں بھی مل جائے گا -

ترجیحات کا تعیّن ضروری ہے

موجودہ الیکشن کے نتائج الم نشرح ہو کر سب کے سامنے موجود ہیں - یہ نتائج ان حضرات کے لئے لمحہ فکریہ ہیں جو خلوص سے پاکستان میں اسلامی نظام کے لئے اجتماعی طور پر کوشاں ہیں لیکن انہوں نے اس کے لئے انقلابی طریق کار کو چھوڑ کر انتخابی سیاست کی راہ اختیار کر رکھی ہے حالانکہ جس جماعت سے وہ وابستہ ہیں اُسی نے انقلابی طریق کار سے تقسیم ملک سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کو متعارف کرایا تھا - میں سمجھتا ہوں کہ پھر یہ موقع آگیا ہے کہ وہ لوگ اپنے موجودہ طریق کار پر نظر ثانی کریں - میں پوری دل سوزی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جو لوگ واقعتاً اسلام کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں ان کو اپنی ترجیحات کا از سرِ نو متعیّن کر لینا چاہیے - میرے نزدیک ہر انسان، ہر گروہ، ہر جماعت کو واضح اور شعوری طور پر طے کرنا چاہیے کہ اس کی اوّلین ترجیح (First-Privilege) کیا ہے! جس طرح ایک فرد کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ ایک کامیاب انسان بننا چاہتا ہے تو وہ شعوری طور پر فیصلہ کرے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے! اسی طرح ایک جماعت کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ شعوری طور پر طے کرے کہ اس کا اصل ہدف

گیا ہے؟ اس کے بغیر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ افراد بھی اور جماعتیں بھی بہت سے گوشوں میں کوششیں کرتی اور ہاتھ پاؤں مارتی ہیں اور کسی ایک سمت میں بھی پیش قدمی کر نہیں پاتیں۔ معنی خیز اور نتیجہ خیز کام خواہ انفرادی سطح پر ہو خواہ اجتماعی سطح پر، اس لئے لازم ہے کہ پہلے وہ اپنا مقصود و مطلوب اور ہدف متعین کرے۔ اس کے ساتھ دوسرا کام جتنا ہو جائے فبہا۔ نہ ہو تو نہ سہی۔ لہذا ترجیحات کا تعین ہو جانا چاہیئے۔

پس میں پھر ان دینی جماعتوں سے درخواست کروں گا جو انتخابی سیاست کے میدان میں اُتر آئی ہیں کہ وہ بڑے ٹھنڈے دل سے سوچیں، غور کریں کہ اگر ان کا اوّلین ہدف اور اوّلین ترجیح ہے احیاءِ اسلام — تو اس کام کے لئے انتخابی سیاست کا طریقہ مؤثر نہیں ہے۔ اس میں قوتیں اور توانائیاں ضائع ہوتی ہیں۔ اس الیکشن میں کم قوتیں نہیں لگی ہیں، کم توانائیاں صرف نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن حاصل کیا ہوا! اور یہ نتائج پے بہ پے سامنے آ رہے ہیں۔ اس اعتبار سے اُن قوتوں کے لئے نظرِ ثانی کا ایک موقع ہے کہ جن کا ہدفِ اوّلین احیاءِ دین ہے — البتہ جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں قومی سطح پر کام کرنا ہے تو یہ کوئی غلط کام نہیں ہے۔ میں اُسے گناہ نہیں سمجھتا۔ اس پہلو سے جو لوگ طے کرلیں کہ اس ملک میں قومی سطح پر سماجی اصلاح کرنا، سیاسی شعور پیدا کرنا جمہوریت لانا، معاشی عدل قائم کرنا ہمارا پہلا ہدف اور اوّلین ترجیح ہے تو ٹھیک ہے۔ وہ سیاسی اور انتخابی طرز پر کام کریں یہ لوگ میری رائے میں ثانوی طور پر اسلام کی بھی کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔ لیکن جن کی اوّلین ترجیح دین ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ ان کے لئے انتخابی سیاست کی راہ ہرگز مفید نہیں ہے۔ ایسے حضرات کو اپنے طریق کار پہ نظرِ ثانی کرنا چاہیئے۔ پروفیسر غفور احمد صاحب نے جو رکالعدم) جماعتِ اسلامی کے نائب امیر ہیں اپنے کارکنوں کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے جو کل کے اخبار میں آئی ہے، کہا ہے "ہمیں کام تو زور شور سے کرنا چاہیئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ آخر نتائج کیا ہیں! ان کے اسباب کیا ہیں! ہمارے طریق کار میں کہاں غلطی ہے! جس کا نتیجہ ہمارے سامنے بار بار اس صورت میں آرہا ہے۔

امید کی کرن کونسی ہے!

میں نے پچھلی مرتبہ بھی عرض کیا تھا اور آج اس کا اعادہ کیا ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں مجھے امید کی کچھ کرن نظر آئی ہے اور میری تشویش میں کچھ تخفیف ہوئی ہے۔ میں اب اس کی کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں — اس کا اصل میں پس منظر یہ ہے کہ جن لوگوں کی بھی اپنے ملک کی قومی اور سیاسی

حالات پر گہری نگاہ ہے، وہ یہ بات جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں عوامی سطح پر سیاسی شعور اور جس سطح کی مضبوط سیاسی تنظیم ہونی چاہیئے یہ دونوں چیزیں تا حال موجود نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جب انتخابات ہوتے ہیں تو اکثر و بیشتر وہی چہرے اور وہی خاندان ابھر کر ایوانِ حکومت میں پہنچتے ہیں جو شروع سے چلے آرہے ہیں۔ فرق اگر واقع ہوتا ہے تو اتنا کہ باپ کی جگہ بیٹا، بھائی یا بھتیجا آجاتا ہے۔ یہی صورتِ حال موجودہ انتخابات میں بھی نظر آتی ہے لیکن پہلے سے کچھ کم۔ بہرحال خوش آئند بات یہ ہے کہ جو لوگ اب آئے ہیں وہ الیکشن لڑ کر آئے ہیں۔ اب ان کا معاملہ وہ نہیں ہے جو سابقہ شوریٰ کا تھا جو پوری کی پوری صدر صاحب کے نامزد کردہ افراد پر مشتمل تھی۔ میں نے پچھلی مرتبہ عرض کیا تھا کہ یہ شوریٰ بھی محض انگوٹھا چھاپ ثابت نہیں ہوئی تھی کہ صدر صاحب کی مرضی کے مطابق ہر معاملہ میں تائیدی ٹھپا لگا دے۔ بلکہ اس نے قرارداد پاس کی تھی کہ الیکشن جماعتی ہونے چاہئیں اور یہ بات صدر صاحب کو بالکل پسند نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شوریٰ کی قرارداد کے علی الرغم غیر جماعتی الیکشن منعقد ہوئے۔ بہرحال جو لوگ بھی منتخب ہوئے ہیں وہ الیکشن لڑ کر آئے ہیں لہٰذا ان کا طرزِ عمل نامزد شوریٰ سے بالکل مختلف ہوگا۔ اب اختیارات لینے اور دینے یا نہ دینے کے مابین ایوانِ حکومت کے اندر ایک صحیح طرز کی کشمکش شروع ہوگی۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اقتدار وہ بڑی بلا ہے کہ جس کے قبضہ میں آجائے وہ اُسے چھوڑنے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کوئی فرد ہو خواہ کوئی طبقہ۔ اس کے لئے بڑی کشاکش ہوتی ہے اور اگر درجہ بدرجہ آئینی طور طریقوں سے یہ کام ہو تو یہ ملک و قوم کے لئے مبارک و مفید عمل ہوتا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ "جو سہج پکے سو میٹھا ہو"۔ لہٰذا توقع ہے کہ اس وقت جو لوگ الیکشن لڑ کر کامیاب ہوئے ہیں وہ یقیناً اب ایوان میں بیٹھ کر جو مطالبے اور تقاضے کریں گے تو جلد ہی ان شاء اللہ جمہوریت کی طرف مثبت بنیاد پر پیش رفت کا آغاز ہو جائے گا۔

ایک قابلِ داد طرزِ عمل

اس کے ساتھ ہی میں ایم آر ڈی کو داد دیتا ہوں۔ بہت سے حضرات کو شاید یہ بات پسند نہ آئے۔ لیکن میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اس عرصہ میں ایم آر ڈی نے ایک مثبت کردار ادا کیا ہے۔ غور کیجئے کہ وہ اپنے اس موقف پر ڈٹی رہی ہے یا نہیں کہ ہم ۱۹۷۳ء کے دستور کی بحالی کے بغیر الیکشن میں حصہ لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ بھی میرے نزدیک سیاسی اعتبار سے ایک صحت مند روایت قائم ہوئی ہے کہ کچھ با اثر لوگ تو ایسے موجود ہیں جو اصولوں پر

ڈٹے رہے ہیں - یہ دوسری بات ہے کہ اس پارٹی کے بعض لوگوں نے اپنے طور پر الیکشن لڑا ہے - لیکن ساتھ ہی دیکھئے کہ ایم آر ڈی نے ایسے لوگوں کو اپنی پارٹی سے خارج کر دیا ہے - کم وبیش یہی موقف اور طرزِ عمل جمعیتِ علماء پاکستان (مولانا نورانی میاں گروپ) کا رہا ہے - جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری طرف ایک خالص سیاسی اور ایک نیم دینی اور نیم سیاسی جماعت نے انفرادی طور پر اپنے امیدوار کھڑے کئے اور حالانکہ یہ "غیر جماعتی" انتخابات تھے لیکن ان دونوں جماعتوں' بالخصوص آخر الذکر جماعت نے اپنے ہم خیال امیدواروں کو کامیاب کرانے کے لئے اپنی پوری توانائیاں اپنے پورے وسائل اور اثر ورسوخ کو استعمال کیا ہے جبکہ اسی آخر الذکر جماعت نے "غیر جماعتی" طور پر انتخابات میں حصہ لینے کیلئے چند شرائط پیش کی تھیں اور اخبارات کی اطلاع کے مطابق ان میں سے اکثر کو صدر صاحب نے منظور بھی کر لیا تھا - جبکہ میری معلومات کے مطابق کسی ایک شرط پر بھی عمل نہیں ہوا -

اُصول پسندی کے خوشگوار نتائج نکلنے کی توقع

ایم آر ڈی اور دوسرے عناصر کی اصول پسندی کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلنے کی توقع ہے کہ بحالی جمہوریت کے لئے ایوان سے باہر ایک زور یہ عناصر لگائیں گے اور ایک زور ایوان حکومت میں اندر سے ان حضرات کا لگے گا جو الیکشن کے ذریعے وہاں پہنچے ہیں - جن کی اکثریت کے متعلق مجھے یہ خوش اعتمادی ہے کہ وہ ربڑ اسٹیمپ نہیں بنیں گے اس طور پر بتدریج اور پُرامن طریقے پر بحالی جمہوریت کی طرف صحیح نہج پر پیش رفت ہونے کی صورت نکلے گی اور فوج سے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل ہونے کا عمل آگے بڑھے گا۔ پیر پگاڑا صاحب پہلے فرما چکے ہیں کہ موجودہ انتخاب ایک نوع کی ریہرسل ہیں اور حال ہی میں انہوں نے کہا ہے کہ اصل انتخاب تو دو تین سال بعد ہونگے - اور وہ جماعتی بنیاد پر ہوں گے - اگر یہ ہو جائے تو یہ بہت خوش آئند بات ہو گی کہ الیکشن اس نہج پر ہو کہ ملک کے تمام عناصر اُس میں بھرپور طریقہ سے حصہ لیں اور اس طرح عوام کے حقیقی نمائندوں پر مشتمل ایک قیادت ابھر کر آجائے - نیز سندھ میں الیکشن کے مواقع پر جو صورتِ حال سامنے آئی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں جو عناصر مکمل علاقائی خود مختاری کا ہی نہیں تخریب کاری کا بھی رجحان رکھتے ہیں وہ فی الوقت اتنے مؤثر نہیں تھے کہ وہ اس الیکشن کا راستہ روک سکتے - اگرچہ مجھے اندازہ ہے کہ سندھ کے نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت ذہناً نظریۂ پاکستان کو تج چکی ہے - بلکہ اس سے بھی آگے والی نہایت

تشویش ناک صورت یہ ہے کہ ایسا رجحان رکھنے والے نوجوانوں کی خاصی تعداد اسلام سے بھی ذہناً بہت دور جا چکی ہے۔ بہر حال اگر صحیح طور پر ملک میں سیاسی و جمہوری عمل جاری رہے تو اس کا خوش گوار نتیجہ یہ نکلے گا کہ جن صوبوں میں احساس محرومی سرطان کی طرح جڑیں پکڑ رہا ہے اس کا کچھ نہ کچھ مداوا ہونے کی سبیل نکل آئے گی۔ ویسے میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ پاکستان کی بقا اور اس کے حقیقی استحکام کا اصل دارو مدار صحیح و حقیقی اسلامی نظام کے قیام و نفاذ پر ہے۔ یہ کام پورے خلوص کے ساتھ نہیں ہوگا تو اس قسم کے خطرناک اور تشویش ناک مسائل مسلسل سر اٹھاتے رہیں گے۔

محترم صدر مملکت کی خدمت میں چند گذارشات

اب میں چند باتیں صدر صاحب کی خدمت میں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے بعض اوقات میری زبان سے صدر صاحب کے بارے میں کچھ تنقیدی اور تلخ باتیں بھی سنی ہونگیں۔ وہ بھی درحقیقت اپنی اصل کے اعتبار سے خیر خواہانہ مشورے تھے۔ آج میں اس امید پر چند ضروری مشورے پھر ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ سامعین میں چند حضرات ایسے ضرور ہونگے جن کے ذریعہ میری گذارشات ان کی خدمت میں پہنچ جائیں گی۔

مُبارک باد

پہلی بات تو مبارکباد سے متعلق ہے۔ انتخابات کے بارے میں انہوں نے جس بات کا عزم ظاہر کیا تھا۔ اُسے پورا کر دکھایا۔ انتخابات غیر جانب دارانہ ہوئے ہیں۔ اس بات کو دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر معتمدین خاص اس الیکشن میں ہار گئے ورنہ اگر حکومت کی سطح پر غیر جانب داری نہ برتی جاتی تو یہ بات ممکن نہیں تھی۔ لہٰذا اس کے لئے یقیناً صدر صاحب قابل مبارک باد ہیں۔

عائلی قوانین

دوسری بات یہ کہ انہوں نے اسلامائزیشن کا جو عمل شروع کیا تھا تو اب انہیں جو وقت مل رہا ہے اس میں انہیں ثابت کرنا چاہیئے کہ وہ اس کے ضمن میں پورے مخلص ہیں لہٰذا اُسے وہ پوری دیانت کے ساتھ، سنجیدگی، محنت اور عزم کے ساتھ آگے بڑھانے کی پوری کوشش کریں۔ اس کام کے اعتبار سے میرے نزدیک اسلامائزیشن کے ضمن میں انہوں نے اپنے ماتھے پر جو سب سے بڑا داغ لیا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ آج عائلی قوانین کو جو صدر ایوب صاحب نے بحیثیت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ایک مارشل لا آرڈیننس کے ذریعے نافذ کئے تھے

ہے۔ اور ہمارے ملک کے تمام دینی مکاتبِ فکر کے علماء کے نزدیک ان قوانین کی بیشتر دفعات خلافِ اسلام ہیں۔ ان قوانین کو موجودہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدرِ مملکت نے تاحال تحفظ دیا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ان پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے شرعی کورٹ بھی مجاز نہیں ہے۔ وہ شریعت کورٹ جس کے جج صاحبان کو خود انہوں نے اپنی صواب دید کے مطابق ملک کے جیّد علماء اور اعلیٰ ماہرینِ آئین و قوانین میں سے انتخاب کر کے تقرر کیا ہے لیکن اس کورٹ کے ہاتھ باندھ دیئے گئے ہیں کہ وہ فلاں فلاں قوانین پر غور و فیصلہ کی مجاز نہیں ہوگی۔ ان میں عائلی قوانین بھی شامل ہیں جبکہ ہر وہ شخص جو دین کے نظام پر تھوڑی بہت بھی نگاہ رکھتا ہے وہ اس بات سے واقف ہوگا کہ عائلی و معاشرتی قوانین یعنی نکاح، طلاق، وراثت، ستر و حجاب، مرد و عورت کے فرائض و حقوق وغیرہ کو قرآن حکیم میں سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور طویل طویل سورتوں میں ان کو تفصیل سے زیرِ بحث لایا گیا ہے اور ان کے تمام پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے جو زندگی کے اس پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی پہلی اینٹ خاندان کا ادارہ ہے۔ میں پہلے کئی بار وضاحت سے بیان کر چکا ہوں کہ اجتماعی زندگی کی کئی منزلیں ہیں۔ جن میں سے پہلی منزل خاندان کا ادارہ ہے۔ اگر یہ پہلی اینٹ صحیح ہوگی تو پوری تعمیر صحیح ہوگی۔ یہ کج ہوگی تو نتیجہ اس شعر کے مصداق نکلے گا:

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج	تا ثریا می رود دیوار کج

میں نے صدر صاحب سے ایک ملاقات میں بھی عرض کیا تھا کہ "میں دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے"۔ میں کون! میں تو عالم ہونے تک کا مدّعی نہیں مفتی ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ "آپ شریعت کورٹ کے ہاتھ کھول دیجئے۔ ہر نقطۂ نظر کے لوگ آئیں شریعت کے حوالوں سے دلائل پیش کریں۔ پھر شریعت کورٹ اس فیصلہ کی مجاز ہو کہ شریعت کا اصل منشاء کیا ہے"۔

معاشی ڈھانچہ کی تبدیلی کی ضرورت

تیسری گذارش یہ ہے کہ اگر واقعتاً اس ملک میں صدر صاحب پائیدار جمہوریت قائم و نافذ کرنا چاہتے ہیں تو یہاں کا جو معاشی ڈھانچہ ہے اس کے بارے میں بنیادی طور پر غور و فکر کریں۔ جہاں تک نقد کے سود کا معاملہ ہے بہرحال اس میں اب تک جو کچھ ہوا ہے ہم اور اکثر علماء کرام اُس سے مطمئن نہیں ہیں۔ صرف لیبل بدلا گیا ہے اصل روح کے اعتبار سے نظام سودی ہی ہے۔ لیکن کم از کم یہ تو ہوا

ہے کہ غور و فکر کیا گیا ۔ کمیشن بنے ۔ جو لوگ اس معاملہ کے ماہرین ہیں انہوں نے کچھ عرق ریزی اور کوشش کی ہے کہ اگر سود کی لعنت بالکلیہ ختم نہ ہو تو کم از کم اس کو کمزور اور نرم کر دیا جائے اور سرمایہ داری کے سودی نظام میں اسلام کی کچھ پیوند کاری ہی ہو جائے ۔ لیکن اس ملک میں جمہوریت کے اعتبار سے جو اہم ترین مسئلہ ہے وہ زمینداری کا مسئلہ ہے ۔ چونکہ ہمارا ملک بنیادی طور پر زرعی ملک ہے اور اس کی کثیر آبادی کاشتکاروں پر مشتمل ہے ۔ اس کے بارے میں غور و فکر کے لئے بھی آمادگی نہیں۔ میں نے جو تھوڑا سا وقت شوریٰ میں گزارا تھا تو ایوان میں عرض کیا تھا کہ ایک لینڈ کمیشن مقرر کیا جائے ۔ اس میں علماء کو بھی شامل کیا جائے ۔ اس میں جدید بندوبست اراضی کے جو ماہرین ہیں وہ بھی شامل ہوں ۔ پھر یہ کمیشن بتائے کہ موجودہ زمینداری اور مزارعت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے ! ہمیں انگریز کی وراثت کے طور پر جو زمین کا نظام ملا تھا ۔ اس میں دو مرتبہ اصلاحات کی گئی ہیں لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ اس لئے کہ یہ انہی لوگوں کے ہاتھوں ہوئی تھیں جو خود بڑے زمیندار تھے ۔ وہ لوگ پہلے ہی سے ایسے تحفظات کر لیتے تھے کہ اصلاحات بے نتیجہ نکلیں ۔ موجودہ نظام زمینداری پر اسلام کی روشنی میں بڑے سوچ بچار کی ضرورت ہے ۔ آخر کوئی تو سبب ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ نے مزارعت کی ہر صورت کو حرام قرار دیا ہے چونکہ حضورؐ کی ایک حدیث موجود ہے جس میں مزارعت کو ربا قرار دیا گیا ہے ۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی ایک استثناء کے علاوہ اُسے حرام ٹھہرایا ہے میں نے عرض کیا تھا کہ اگرچہ فقہ حنفی میں صاحبینؒ کی رائے پر فتویٰ ہے کہ مزارعت چند شرائط کے ساتھ جائز ہے ۔ لیکن موجودہ مزارعت میں شاذ ہی ان شرائط کا لحاظ رکھا جاتا ہو ۔ مزید یہ کہ جس بزرگ ہستی امام ابو حنیفہؒ کے نام سے یہ فقہ معنون ہے ۔ یعنی فقہ حنفی تو میں پورے جزم کے ساتھ جانتا ہوں کہ امام اعظم رحمۃ اللہ کی مطلق رائے ہے کہ مزارعت کی ہر شکل بالکل حرام ہے۔

خراجی زمین کا معاملہ پھر ایک اور اہم مسئلہ ہے جس پر اس کمیشن کو سوچنا ہو گا ۔ وہ یہ کہ فقہ حنفی ہی کی رو سے ہمارے بعض علماء کی نہایت ہی قابل غور اور فکر انگیز رائے یہ ہے کہ پاکستان کی اکثر و بیشتر قابلِ کاشت اراضی ' خراجی زمینیں ہیں عشری نہیں ہیں ۔ ' خراجی زمین ' کا مطلب یہ ہے کہ جس ملک کو مسلمانوں نے فوجی قوت سے فتح کیا ہو وہاں کی زمینیں انفرادی ملکیت میں نہیں رہتیں بلکہ وہ حکومت کی اجتماعی ملکیت ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے ہو جاتی ہیں ۔ اگر کسی وقت

کوئی دوسری قوم ملک پر قابض ہو جائے لیکن جب مسلمان اُسے دوبارہ حاصل کر لیں یا وہ ملک آزاد ہو جائے تو پھر بھی زمین کی حیثیت "خراجی" رہے گی - گو یا جو زمینیں ایک مرتبہ خراجی ہو گئیں وہ ہمیشہ خراجی رہیں گی - اس زمین کے مزارع ریاست کے مزارع ہوں گے اور یہ مزارعت موروثی چل سکتی ہے - کوئی زمیندار مالک بن کر ان پر قابض نہیں رہ سکتا - اب یہ مسئلہ بھی انتہائی غور اور حل طلب ہے - اس پر غور وفکر ہونا اور اسلام کی منشا کے مطابق ہمارے یہاں کے کاشتکاری کے موجودہ نظام کو استوار کرنا لازم و لابد ہے - جس کے بغیر یہاں نہ صحیح طور پر جمہوریت آسکتی ہے اور نہ ہی اسلامی نظام قائم و نافذ ہو سکتا ہے اور اس کی برکات سے ہمارا ملک فیض یاب ہو سکتا ہے -

خطرہ ہماری سرحدوں پر منڈلا رہا ہے

اگر ہمارے ملک میں موجودہ سرمایہ داری اور زمینداری کے استحصالی نظامِ معیشت کو اسلام کے عدل وقسط پر مبنی معاشی نظام کے مطابق استوار نہ کیا گیا تو آپ کو معلوم رہنا چاہیئے کہ ایک نہایت ہولناک خطرہ درّہ خیبر تک پہنچا ہوا ہے - بار بار ہمارے دروازہ پر آ کر دستک بھی دے گیا ہے - بلکہ اس نے کبھی کبھی Door crashing بھی کی ہے - لیکن اس کے باوجود ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے تو یہ ہماری بہت بڑی تاریخی غلطی ہوگی - اس اعتبار سے یہاں صحیح اسلام لانے اور صحیح جمہوریت قائم کرنے کے لئے ہمارے لئے ضروری بلکہ لازم ہے کہ ہمارے یہاں کا جو معاشی ڈھانچہ ہے اس کے بارے میں اسلام کی روشنی میں غور وفکر ہو - اسی طور پر ہم ان تمام باطل نظریات و افکار اور طاغوتی نظام ہائے حیات سے نبرد آزما ہو سکیں گے جو سرطان کی طرح نوعِ انسانی میں جڑیں پکڑ رہے ہیں -

دستوری ترامیم

جناب صدر سے ایک چوتھی بات یہ عرض کرنی ہے جس کے متعلق مختلف گوشوں سے صدائیں بلند ہو رہی ہیں جس سے میری اس بات کی تائید ہو رہی ہے کہ جو لوگ الیکشن لڑ کر آتے ہیں وہ محض ربڑ اسٹامپ نہیں بن سکیں گے - آپ نے اخبارات میں دیکھ لیا ہوگا کہ بہت سی نگاہیں بدل گئی ہیں - اور ان کا لہجہ بدل گیا ہے - خواجہ صفدر صاحب کی طرف سے بھی بات آ گئی ہے کہ دستور سے متعلق ترامیم کا معاملہ منتخب شدہ اسمبلی پر چھوڑ دینا چاہیئے -

لہذا صدر صاحب کو اس معاملہ میں کسی نئی بحث و مباحثہ اور ذہنی انتشار کے سدباب کے لئے یہ مسئلہ واقعتاً منتخب شدہ اسمبلی پر چھوڑ دینا چاہیئے - جو ترامیم بھی ان کے پیش نظر ہیں ان کو وہ کسی آرڈیننس کے ذریعہ نافذ کرنے کے بجائے انہیں اسمبلی میں پیش کرائیں اور معاملہ اس پر چھوڑ دیں [1]

مارشل لاء کا خاتمہ

جناب صدر سے آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ انہیں جلد سے جلد مارشل لاء ختم کر دینا چاہیئے تاکہ واقعتاً ایک سویلین حکومت ہمارے ملک میں قائم ہو جائے اور کسی درجہ میں بھی کوئی ایسی صورت نہیں ہونی چاہیئے کہ ترکی کے دستور کو سامنے رکھ کر نیم فوجی اقتدار برقرار رکھا جائے - میں آج جب مسجد کی طرف آ رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ تقریباً پونے آٹھ سال جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے جس طرح اپنی ذہانت و فطانت اور متانت و صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے - اب انہیں ذرا سویلین صدر کی حیثیت سے بھی اپنے ان اوصاف کا مظاہرہ کرنا چاہیئے - اپنی وردی اتاریں - ساری فوج کو بیرکوں میں واپس بھیجیں - تمام فوجی عدالتیں ختم کریں اور کُل کا کُل سول نظام ہو اور وہ ایک سول صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیں - اور میری رائے ہے کہ جو بھی معقول توازن صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات کے مابین وہ تجویز کریں گے - اُسے موجودہ اسمبلی بھی خوش دلی کے ساتھ قبول کرے گی اور عوام بھی قبول کریں گے - اس لئے کہ ۷۳ء کے متفقہ دستور میں بعد میں صرف پارٹی کی اکثریت کے بل پر دستوری ترامیم کے ذریعے جو عدم توازن پیدا کیا گیا تھا اور جملہ اختیارات کا جس طرح وزیر اعظم کی ذات میں ارتکاز ہو گیا تھا اس کو دور کرنا صحیح اور درست ہے لیکن دستوری طور پر فوج کی مداخلت کا راستہ کھلا رکھنا کہ وہ ایک مستقل تلوار کی طرح اسمبلی کے سر پر لٹکی رہے کسی طرح بھی نہ عوام کے لئے قابل قبول ہو گا اور میری رائے ہے کہ جو اسمبلی اب منتخب ہو کر آئی ہے نہ اس کی اکثریت اس کو قبول کرے گی -

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر یکم مارچ ۸۵ء کو کی تھی - ۲ مارچ کو آرڈیننس کے ذریعے دستوری ترامیم کے نفاذ کا صدر صاحب کی طرف سے اعلان ہو گیا - اس کے بعد سے روزانہ ہی ان ترمیمات میں بھی ترمیم کا سلسلہ جاری ہے لہذا اس مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب کے اظہار خیال کے اسی حصہ پر اکتفا کیا جاتا ہے (ج-س)

اِسلامی انقلاب کے لئے التزامِ جماعت اور لزومِ بیعت

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ نے محاضراتِ قرآنی منعقدہ ۲۵ مارچ ۸۴ء زیرِ صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی دامت فیوضہ کی پہلی نشست میں 'جہاد بالقرآن' کے موضوع پر تقریر فرمائی تھی۔ بعدہٗ محاضرات کی تیسری نشست میں مندرجہ بالا موضوع پر جو ایک اعتبار سے 'جہاد بالقرآن' ہی کا تتمہ و تکملہ ہے خطاب ارشاد فرمایا تھا۔ 'جہاد بالقرآن' والا خطاب میثاق اگست و ستمبر ۸۴ء میں شائع ہو چکا ہے اور اب وہ دو مزید خطابات کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ یہ مضمون بھی جلد کتابی شکل میں شائع ہو جائے گا۔ اسے 'تنظیمِ اسلامی' کے دس سالہ اجتماع کے انعقاد کے پیشِ نظر میثاق میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (ج۔ر)

اَلحمدُ للّٰہِ وکفیٰ والصّلوٰۃُ والسّلامُ علیٰ عبادہِ الّذین اصطفیٰ خصوصًا علیٰ افضلھم خاتمِ النبیین محمدٍ الامین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔ امّا بعد۔ قالَ اللہُ تعالیٰ وسبحانہٗ فی القرآنِ المجیدِ فی سُورۃِ التوبۃِ:

اعوذُ باللّٰہِ من الشّیطٰنِ الرّجیمِ ۔ بسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیمِ

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ۝ اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ السَّآئِحُوۡنَ الرّٰکِعُوۡنَ السّٰجِدُوۡنَ الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّاہُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَالۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰہِ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝

صدق اللّٰہُ العظیم!

محترم صدرِ مجلس، علمائے کرام، معزز حضرات اور محترم خواتین

میں نے پرسوں 'جہاد بالقرآن' کے موضوع پر اظہارِ خیال کے آخر میں عرض کردیا تھا کہ مجھے آج بھی آپ حضرات کی سمع خراشی کرنی ہے۔ اگرچہ میں نے کل عرض کر دیا تھا کہ آج کی نشست میں پہلی تقریر صدرِ اجلاس محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ کی ہوگی، جس کا عنوان ہے "مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ــــ سیرت و شخصیت ــــ علمی کارنامے ــــ اور شیخ الہندؒ کا ان سے خصوصی تعلقِ خاطر"۔ لیکن چونکہ میری آج کی گفتگو مولانا موصوف کی تقریر سے کسی حد تک متعلق ہے۔ لہٰذا میں صرف اس تبدیلی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس کے فوراً بعد صدرِ مکرم کا خطاب ہوگا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک لطیف حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بندۂ مومن کی شخصیت کے تین رُخ ہیں۔ جیسے ہمارا تصورِ مکان ہے (THREE DIMENSIONAL CONCEPT OF SPACE) ویسے ہی بندۂ مومن کی شخصیت کے بھی تین ابعاد (DIMENSIONS) ہیں۔ تین جوانب و اطراف ہیں۔ جن میں سے دو کا تعلق ظاہر سے ہے اور اس پہلو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک تصویر کے دو رُخ ہیں۔ تیسرے کا تعلق باطن سے ہے۔ مطالعۂ قرآن حکیم کا میں نے جو منتخب نصاب مرتب کیا ہے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کی دعوت اور تنظیم اسلامی کی تحریک کی جڑ اور بنیاد ہے، اس کے تیسرے حصے میں ایمانیات کے مباحث میں قرآن حکیم کے دو مقامات سے میں نے ان دو ظاہری رُخوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دونوں مقامات ایک دوسرے کے لئے توضیحی یعنی (COMPLIMENTARY) معیّت کے ہیں۔ دونوں مل کر ایک حقیقت کی تکمیل کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک طرف سورۃ نور میں حقیقتِ ایمان کو ایک نہایت بلیغ اور نہایت فصیح تمثیل کے ذریعہ سے بیان کیا گیا۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط پھر جن لوگوں کے قلوب اس نور سے منور ہو جاتے ہیں، ان کی شخصیت کی جھلک ان الفاظِ مبارکہ میں دکھا دی گئی : فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ لا یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ

لے یہ تقریر ماہنامہ 'حکمتِ قرآن' کے اگست ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوچکی ہے۔ (مرتب)

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ صلے يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ اب یہ نقشہ ہے کہ ان کی طبیعت کا میلان کیا ہے؟ اور ان کے دل کو سکون میسر آتا ہے تو کہاں آتا ہے! ان گھروں میں جو اللہ کے ذکر کے لئے مخصوص ہیں۔ جیسا کہ حضورؐ کی ایک حدیث میں آتا ہے: وَرَجُلٌ قَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ۔ "وہ شخص جس کا دلی تعلق مسجدوں سے ہے" وہ صبح و شام اس میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں، تسبیح کرتے ہیں، اگرچہ وہ دنیاوی کاروبار میں بھی منہمک رہتے ہیں، معاش کی ذمہ داریاں بھی ادا کر رہے ہیں، لیکن رِجَالٌ "وہ جواں مرد کہ ان کو کوئی کاروبارِ دنیوی، کوئی لین دین، کوئی خرید و فروخت، کوئی مصروفیت اللہ کے ذکر، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے باز نہیں رکھتی۔ وہ خوف رکھتے ہیں اس دن سے یعنی قیامت کا جس میں اُلٹے جائیں گے دل اور آنکھیں" — اب یہ ایک نقشہ ہے۔ ایک رُخ ہے۔ اطاعت، عبادت، ذکر، ان چیزوں کو جمع کر لیجئے تو بندۂ مومن کی سیرت اور شخصیت کا ایک رُخ بن گیا۔

سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں مومنینِ صادقین کی جو عظیم دعائیں آئی ہیں۔ ان دعاؤں کے بعد، ان دعاؤں کی قبولیت کے طور پر جو الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں۔ وہ میرے موضوع سے متعلق ہیں اور ان ہی میں ایک بندۂ مومن کی سیرت و شخصیت کا دوسرا رُخ سامنے آتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ج بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ج فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ج ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ "جواب میں ان کے رب نے فرمایا: میں تو تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت، تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ تو جن لوگوں نے میری خاطر ہجرت کی، جو اپنے گھروں سے نکالے گئے، جو میری راہ میں ستائے گئے اور میرے لئے لڑے، قتل بھی کیا اور مقتول بھی ہوئے میں لازماً ان کی سب خطائیں معاف کر دوں گا اور لازماً ان کو ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی

ہونگیں۔ یہ اجر ہے ان کا اللہ کے پاس اور بہترین جزا تو اللہ ہی کے پاس ہے"۔ یہ دوسرا رُخ ہے۔ ہجرت، مصائب، صبر و مصابرت، جہاد اور قتال ــ سورہ آل عمران کی آخری آیت میں امر کے صیغے میں صبر و مصابرت اور باطل کے مقابلے میں پامردی دکھانے، حق کا بول بالا کرنے کے لئے کمربستہ رہنے کا ذکر فرمایا گیا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ــ یہ دوسرے رُخ کی تکمیل ہے۔

اصل میں یہ دونوں رُخ جمع ہوں تو وہ بات بنتی ہے جس کی رپورٹ دی تھی ایران کے سپہ سالار رستم کے ان جاسوسوں نے جن کو اس تحقیق کے لئے بھیجا گیا تھا کہ بے سروساماں اور لوٹ مار کی خوگر اس عرب قوم کی کایا پلٹ اور قلب ماہیت کے اسباب کیا ہیں! آخر ان مٹھی بھر مسلمانوں کی فوج میں یہ عزم و حوصلہ کیسے پیدا ہوا کہ وہ ایران جیسی وقت کی ایک عظیم ترین قوت سے ٹکرا رہے ہیں اور اسے پاش پاش کر رہے ہیں! اس رپورٹ کا یہ جملہ نہایت جامع اور حالات کی حقیقی تصویر کے طور پر تاریخ میں نقل ہوا ہے کہ یہ بڑے عجیب و غریب قسم کے لوگ ہیں: "هُم رهبانٌ بِاللَّيلِ وَفُرسانٌ بِالنَّهار"۔ یہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شاہسوار ہیں ن کی راتیں اپنے اللہ کے حضور میں قیام و سجود، الحاح و گریہ اور دعا و مناجات میں بسر ہوتی ہیں، ان کی داڑھیاں اور ان کی سجدہ گاہیں خشیت الٰہی کے آنسوؤں سے تر ہوتی ہیں۔ اور دن کو یہی لوگ برق کی طرح میدانِ جنگ میں کوندتے ہیں، لپکتے، جھپٹتے ہیں. ر اس راہ میں گردن کٹا دینے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔ جبکہ دنیا جنگ کے ن طور طریقوں سے آج تک واقف چلی آ رہی ہے وہ تو یہ ہیں کہ فوجیوں کی راتیں شراب کباب اور شباب سے کھیلنے میں بسر ہوتی ہیں۔ جس بستی یا اس کے آس پاس کسی فوج کا پڑاؤ ہو جائے کیا وہاں کی کسی جوان خاتون کی عصمت و عفت محفوظ رہ سکتی ہے! لیکن یہ وہ وبہ، انوکھے اور نرالے اللہ کے سپاہی تھے کہ ان کی زندگی، ان کی شخصیت کے یہ دو رخ اتنے ظاہر و نمایاں تھے کہ جو غیر مسلم ایرانی جاسوسوں کو بھی نظر آ گئے ــ تیسرا رُخ ہے طن کا۔ وہ ہے اخلاص فی النّیّۃ، وہ ہے اخلاص فی العبادہ، وہ ہے مقامِ شکر، وہ ہے مقامِ توکل اور مقامِ رضا، جو میرے نزدیک ان سب مقاماتِ عالیہ سے بلند ترین مام ہے۔ اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ علامہ اقبال کا یہ شعر حرفِ آخر ہے۔

ہ دہ کہہ گئے ہیں ؎

بدروں کشید زپیچ و تاب کہ ہست دلبود مرا ۔ چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا

انسان کو دنیا میں پیچ و تاب کی جو کیفیات لاحق رہتی ہیں، اُن سے نکال لینے والا حقیقت مقامِ رضا ہے ـــ ان باطنی لطائف سے متعلق ہمارے صوفیاء نے بڑی معرکۃ الآرا شیں کی ہیں۔

بہر حال ایک بندۂ مومن کی شخصیت کے یہ تین رُخ ہیں ۔ ان میں سے ہر رُخ پر آج نشست میں گفتگو ہونے والی ہے ۔ ظاہری دو رُخ تو میری آج کی گفتگو میں زیرِ بحث آ رہے ں تصوّف کے موضوع پر اسی نشست میں ان شاء اللہ العزیز دو مقالے پیش ہوں گے یک مقالہ مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی جو قرآن اکیڈمی میں معلم ہیں پیش فرمائیں گے ن کے مقالہ کا عنوان "حقیقتِ تصوّف" ہے ۔ دوسرا مقالہ مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب ظلہٗ کا ہے ۔ وہ اس سمندر کے شناور ہیں ۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملیفۂ مجاز ہیں۔ وہ جب گفتگو کریں گے تو وہ صرف 'قال' پر نہیں بلکہ 'حال' پر مبنی ہوگی ؛ ان شاء اللہ العزیز ۔ ان کے مقالہ کا انوکھا موضوع یہ ہے کہ "حضرتِ عمر ضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اور تصوّف"۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ و زیادہ دلچسپی دین کے ظاہری احکام سے تھی ۔ چند لوگوں نے حضرت عمرؓ کی شخصیت و اپنے بہت سے غلط مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے ۔ چنانچہ تصوّف دشمنی کے لئے بھی اُسے (EXPLOIT) کیا گیا ہے اور حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ کے قولِ حق سے ج اُرِیْدَ بِہِ الْبَاطِل کا کام لیا جا رہا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی قیمتی بات ہوگی کہ تصوّف کے بارے میں حضرتِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی سیرت کا یہ پہلو بھی ہمارے سامنے آ جائے ـــ اسی سے متعلق ایک موضوع ہے "فلسفۂ مذہب و اخلاق" اس پر قرآن اکیڈمی کے ڈائریکٹر برادرم ڈاکٹر ابصار احمد صاحب ایک مقالہ پیش کریں گے[1] یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں مقالے تصویر کے باطنی رُخ سے متعلق

---

[1] جن مقالات کا ذکر اس تقریر میں آیا ہے، ان کی اشاعت "ماہنامہ حکمتِ قرآن" لاہور میں شروع ہو چکی ہے۔ (مرتب)

ہیں ۔ البتہ تصویر کے ظاہری دو رخوں کے متعلق مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے اور جس کے متعلق محترم صدرِ مجلس نے بھی کچھ ارشاد کرنا ہے یعنی دعوتِ رجوع اِلی القرآن اور جہاد ۔ جس کا غلغلہ اس صدی میں سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بلند کیا۔ میری مراد 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ابوالکلام آزاد سے ہے ۔ اس دور میں یہ دو اہم چیزیں نمایاں ہو کر سامنے آئیں جن کی طرف اس صدی میں نہایت جوش و خروش سے متوجہ کرنے والے مولانا آزاد مرحوم تھے ۔ ایک قرآن اور دوسرا جہاد ـــــ ان ہی کے بارے میں مجھے آج مزید کچھ باتیں عرض کرنی ہیں ۔

میں نے اپنی پہلی تقریر میں عرض کیا تھا[1] کہ میرے نزدیک جہاد اور انقلابی عمل دونوں مترادف الفاظ ہیں ۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جہاد فی سبیل اللہ قرآن کی اصطلاح ہے ۔ بڑی اہم مقدس و محترم اصطلاح ہے جبکہ انقلابی عمل اس دور کی اصطلاح ہے ـــــ اس جہاد یا انقلابی عمل کے چند مراحل میں نے پرسوں بیان کئے تھے ۔ آج ان کو قدرے تفصیل سے بیان کرنا اس وقت میرے پیشِ نظر ہے ـــــ وہ تین تین مراحل کے دو Sets ہیں ۔ تین مراحل تمہیدی ہیں اور تین مراحل تکمیلی ـــــ تمہیدی مراحل سے کیا مراد ہے! یہ کہ جب ایک شخص کسی انقلابی دعوت کو لے کر اٹھتا ہے تو اس کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اس انقلابی فکر کو قبول کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کرے ۔ اس جماعت کے لئے تین چیزیں لازمی ہیں ۔ دعوت و تبلیغ ، تنظیم اور تربیت ۔ اس لئے کہ جماعت جب تک پختہ نہ ہو ، منظم نہ ہو ، انقلاب نہیں آسکتا ۔ جزوی کام ہوسکتے ہیں ۔ درس و تدریس کا کام ، تعلیم و تعلّم کا کام ، تصنیف و تالیف کا کام ، اصلاح و تزکیۂ نفس کا کام یہ سب ہو سکتے ہیں ۔ لیکن انقلاب برپا کرنے کے لئے ، دین کے غلبہ کے لئے یہ لازم ہے کہ ان تین مراحل کے ذریعہ سے ایک جماعت ، ایک تنظیم وجود میں آجائے ـــــ تین مراحل جو تکمیلی ہیں وہ درحقیقت اس جماعت کے مخالف و باطل نظریات اور قوتوں کے ساتھ تصادم کے تین مرحلے ہیں ۔ صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) ـ اقدام ۔ (ACTIVE RESISTANCE) ـ اور جنگ ، قتال ، مسلح تصادم : (ARMED CONFLICT) ـ اس موقع پر اس نکتہ پر غور فرمالیجئے کہ جہاں تک تین تکمیلی مراحل کا تعلق ہے وہ تمام انقلابی تحریکوں میں یکساں ہیں

---

[1] یہ تقریر 'جہاد بالقرآن' کے عنوان سے اگست اور ستمبر ۸۴ء کے میثاق میں شائع ہو چکی ہے (مرتب)

اصل فرق جو ایک انقلاب کو دوسرے انقلاب سے ممیز کرتا ہے، وہ پہلے دو مراحل ہیں۔ تمہیدی مراحل میں بھی ایک مرحلہ مشترک ہے۔ فرق ہے دعوت اور تربیت کے اصولوں کا ــــ

دعوت کا فرق کیا ہے؟ ایک اشتراکی دعوت ہے اس کا رُخ ہے مادّی۔ سدفی صد مادّی اور الحاد و زندقہ کی طرف جس میں اخلاق اور روحانیت کا سرے سے کوئی گزر نہیں ــــ ایک انقلابِ محمدؐی ہے جس کا رُخ ہے توحید کی طرف، آخرت کی طرف، اخلاق کی طرف، روحانیت کی طرف ــــ معلوم ہوا کہ یہاں سے راستے بالکل جُدا بلکہ قطعی مخالف سمتوں کی طرف ہو گئے ــــ پھر تربیت کا معاملہ بھی ہے۔ مادّی انقلاب کے لئے مادّی تربیت کافی ہے۔ جب وہ نہ اللہ کو مانیں نہ آخرت کو تو ان کے تزکیۂ نفس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خواہ مخواہ ان کا اور اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس انقلاب کے جو (DIMENSIONS) ہیں یہ چیزیں اس کے بالکل خلاف ہیں۔

اس مادّی انقلاب کے ثمرات روحانی انقلاب کے ثمرات کے بالکل برعکس ہیں۔ لیکن انقلابِ محمدؐی، انقلابِ اسلامی کے لئے یہ شرطِ لازم ہے۔ یہ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ ــــ تیسری چیز تنظیم وہاں بھی درکار ہے، یہاں بھی درکار ہے۔ نظم نہیں ہوگا، Dis-organisation نہیں ہوگا تو جماعت کی شکل نہیں ہے بلکہ بھیڑ ہجوم ہے۔ اس فرق کو نمایاں کیا ہے علامہ اقبال نے اس شعر میں ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں   عیدِ محکوماں ہجومِ بے یقیں !!

تنظیم اور ہجوم میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی تنظیم کے لئے تو اقبال نے یہ بھی کہا ہے ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

میری قوم منتشر ہے اس کو تنظیم اور نظم میں کس دینا ہی میری شاعری کا مقصود ہے، ورنہ میں کہاں اور شاعری کہاں! ــــ بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تنظیم، صبرِ محض، اقدام اور مسلح تصادم، یہ ہر انقلابی عمل میں مشترک مراحل ہوتے ہیں ــــ ہم جب سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری نگاہیں عموماً آخری دو تکمیلی مراحل پر جمی رہتی ہیں ــــ

اس مطالعہ میں دعوت، تربیت و تنظیم کے تمہیدی اور ابتدائی مراحل پر ہمارے یہاں بڑی حد تک غور و فکر کا فقدان ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے بہت خوبصورتی سے اس طرف توجہ دلائی ہے ؂

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

وہ غارِ حرا کے مراقبے۔ پھر وہ قیام اللیل: قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ پھر دعوت و تبلیغ۔ پھر دعوت پر لبیک کرنے والوں کی تنظیم۔ ساتھ ہی ان کا تزکیہ اور تعلیم و تربیت۔ پھر نظم اور Discipline کی سخت ترین مشق۔ بارہ سال تک حکم تھا کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ چاہے تمہیں دہکتے انگاروں پر کباب بنایا جا رہا ہو ــــ اس سے زیادہ کسی نظم کی پابندی کا آپ تصور نہیں کر سکتے ــــ یہ ہیں وہ مراحل جن سے گزر کر وہ جماعت بنی جو صحابۂ کرام کی جماعت ہے۔ جس کو قرآن مجید نے کہا ہے ــــ۔ کسی جماعت کا پختہ ہونا اصل میں یہ ہوتی ہے کلیدِ کامیابی ــ یہ خام رہ گئی تو ناکام ہو جائے گی۔ اس سیرت کی پختگی اور اس تربیت کے بغیر اگلے مراحل میں قدم رکھیں گے تو معلوم ہوگا جیسے ریت کا ایک گولہ ہے جسے اگر شیشہ پر بھی مار دیا جائے تو شیشہ قائم رہے گا ریت بکھر جائے گی۔ اسی بات کی تفہیم کے لئے میں نے پچھلی تقریر میں آپ کو اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر سنایا تھا ؂

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پہ بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

پھر اقبال نے اس مضمون کو کمال تک پہنچایا ہے ؂

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اور اسی کو فارسی میں علامہ نے مزید بلندی اور رفعت پر پہنچا دیا ؂

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ جو دو ابتدائی مراحل ہیں دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و

تربیت، تو ان کے لیے جو تلوار ہے وہ قرآن مجید ہے۔ "جہاد بالقرآن" کے عنوان سے میں پرسوں اس پر تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ انقلابِ محمدیؐ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہمیں نظر آتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا مرکز و محور بھی قرآن اور تزکیہ و تربیت کا مرکز و محور بھی قرآن ـــــ ان دونوں کو جمع کیجئے تو وہ جہاد بالقرآن ہے۔

آج میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنے اور پھر اس کی جدوجہد کے لیے ہمیں کتاب و سنّت سے کیا رہنمائی حاصل ہوتی ہے! ـــــ میں نے پرسوں عرض کیا تھا آج اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اولوالعزم من الرسل کے بارے میں قریباً اجماع ہے کہ وہ پانچ ہیں جن کا ذکر سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں آیا ہے۔ ان میں اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ زمانی ترتیب سے درمیان میں حضرتِ ابراہیم، حضرتِ موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ـــــ ان میں ایک عجیب نقشہ سامنے آتا ہے۔ حضرت نوحؑ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے، کوئی جمعیت وجود میں نہیں آئی تو اگلا قدم اٹھانے کا سوال ہی نہیں۔ معاشرہ اگر مرچکا ہے اور وہ اس دعوت کو جھٹلا چکا ہے ـــــ تو اس کی کوئی ذمہ داری آنحضورؐ پر نہیں۔ ان کے ثبات اور استقامت کے لیے بس یہی کافی ہے کہ وہی دعوت آخری سانس تک دیتے رہے۔ جیسا کہ نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا تھا: فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ۔ اب اگر معاشرہ ساتھ دے گا تو بات آگے چلے گی، اعوان و انصار ملیں گے تو اگلا قدم اٹھے گا۔ نہیں ملے تو کوئی پرواہ نہیں۔ اس میں حضرتِ نوحؑ کے لیے ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔ ناکامی معاشرے کی ہے، قوم کی ہے۔ اس کے بالکل برعکس معاملہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ کُل بیس برس میں دعوت و تبلیغ بھی ہوگئی۔ تنظیم بھی ہوگئی۔ تزکیہ و تربیت بھی ہوگئی۔ صبرِ محض کا مرحلہ بھی گزر گیا۔ اقدام بھی ہوگیا۔ مسلّح تصادم بھی ہوگیا اور لکھو کھا مربع میل رقبہ کے ملک پر اللہ کا دین بالفعل قائم ہوگیا ـــــ دیکھئے کس قدر نمایاں فرق ہے ـــــ میرا خیال ہے کہ اسی فرق کو واضح کرنے کے لیے قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کی مدّت دعوت ساڑھے نو سو برس بیان کی گئی ہے ورنہ کسی اور رسول کی مدّت دعوت کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔

اسی سے اوّل، و آخر کا فرق نہایت نمایاں ہوگیا ہے۔ واللہُ اعلم ——— ان پانچ اولوالعزم من الرسل کے وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا معاملہ آتا ہے کہ جمعیت بہت بڑی تھی لیکن بودی۔ کچے لوگ، تھڑدلے لوگ۔ جب نقدِ جاں ہتھیلی پر رکھ کر میدان قتال میں آنے کا وقت آیا تو کورا جواب دے دیا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ "موسیٰ تم جاؤ اور تمہارا رب جائے اور کافروں سے قتال کرے ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔" نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ارضِ مقدّر جو انہیں دی جاچکی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی بزدلی کی پاداش میں چالیس برس تک وہ ان پر حرام کردی۔ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ——— انہی چالیس سالوں کے دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السّلام کا انتقال ہوگیا۔ یہ دونوں حضرات والا قدر اپنی جسمانی آنکھوں سے اس حیاتِ دنیوی میں اپنی اس جد وجہد کو اس مقام پر پہنچتا نہ دیکھ سکے کہ اللہ کا دین بالفعل کسی خطۂ ارضی میں قائم اور نافذ ہو جائے۔

اب ہمارے لئے یہ مسئلہ انتہائی غور طلب ہے کہ وہ جمعیت کس بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ تنظیم کی بنیاد کیا ہے۔؟ اس ضمن میں آپ سے عرض کروں گا کہ سورۂ فتح کی آخری دو آیات پیشِ نظر رکھئے۔ ان میں جو آخری سے ماقبل کی آیت ہے اس میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا امتیازی ہدف متعیّن ہوا: هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ○ ——— لیکن سوچئے کہ وہ کون سی جمعیت اور قوت تھی جن کے ساتھ مل کر آنحضورؐ نے اپنے اس امتیازی منصبِ رسالت کو ادا فرمایا اور جزیرہ نمائے عرب پر بیس سال کی مدت میں اللہ کا دین بالفعل قائم و نافذ فرمادیا ——— ! اگر بالفرض حضرت نوحؑ کی طرح جناب محمد بھی اکیلے رہ جاتے صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ یا آں حضورؐ کے ساتھ بھی وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ والا معاملہ ہوتا یا بالفرض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جمعیت بھی حضرت موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل کی طرح 'بودی' بزدل اور تھڑدلی ہوتی اور قتال سے انکار کردیتی تو کیا اس عالمِ اسباب وعلل میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اکیلے اپنے امتیازی فرضِ منصبی اظہارِ دین

حق کو ادا فرما سکتے تھے ۔ سورہ فتح کی آخری آیت آتی ہے جس میں اس مبارک جمعیت کے اوصاف بیان فرمائے گئے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی، آغاز ہوتا ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ـــ میں آج اس آیت کی طرف آپ حضرات کی خاص طور پر توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ـــ میں نے تصویر کے جو دو رخ آپ کے سامنے رکھے، وہ دونوں یہاں جمع ہیں ۔ ایک طرف ان کی یہ کیفیت : اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ـــ ان کی جمعیت کا پہلا وصف، بمقابلۂ کفار، بمقابلۂ باطل ـــ اور کس شان کے ساتھ! ـــ کہ بیٹے کی تلوار باپ کے خلاف نیام سے باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہے ۔ غزوۂ بدر میں عتبہ ابن ربیعہ اس کے ایک بیٹے اور ایک بھائی نے جب مبارزت طلب کی تھی تو مسلمانوں کے لشکر کی طرف سے پہلے تین انصاری مقابلہ کے لئے نکلے تھے ۔ اس پر عتبہ نے کہا کہ یہ ہماری توہین ہے ۔ ہمارے مدمقابل ہمارے برابر کے ہونے چاہئیں ۔ تو کون نکلے تھے؟ عتبہ کے بیٹے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ـــ رحمتِ عالم نے گوارا نہ کیا یہ بات دوسری ہے ۔ حضورؐ نے انہیں روک دیا ۔ پھر حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نکلے ۔ یہی معاملہ حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ کے ساتھ ہوا ۔ وہ غزوۂ بدر تک ایمان نہیں لائے تھے اور کفار کے لشکر کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے ۔ بعد میں جب وہ ایمان لے آئے تو انہوںؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اباجان! بدر میں ایک موقع پر آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے، لیکن میں نے آپ کو چھوڑ دیا ۔ میں نے آپ کا لحاظ کیا حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، بیٹے تمہاری جنگ چونکہ باطل کے لئے تھی لہٰذا تمہارے لئے تو یہ خونی رشتہ بامعنی تھا ۔ خدا کی قسم اگر تم میری زد میں آ گئے ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا ۔ غزوۂ بدر کے مشرک قیدیوں کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ قیدیوں میں جو جس صحابی کا رشتہ دار ہو اس کو وہ صحابیؓ اپنے ہاتھ سے قتل کرے ۔ یہاں بھی رحمۃ للعٰلمین نے فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ کیا بعد میں وحی نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی ـــ یہ ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کی تصویر ـــ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا رخ دیکھنا ہو تو اس مواخات میں دیکھئے

جو مدینۃ النبیؐ میں مہاجرین و انصار کے مابین ہوئی تھی ۔ ایک انصاری صحابیؓ نے یہاں تک پیش کش کی تھی کہ ان کی دو بیویوں میں سے جو مہاجر بھائی کو پسند ہو، میں اس کو طلاق دے دوں گا ۔ وہ اس سے نکاح کر لیں ۔ جنگِ یرموک میں زخمیوں کی جانب سے ایک مسلمان سپاہی نے آواز سنی کوئی زخمی پکار رہا تھا العطش ! العطش، پانی پانی ـــ وہ پانی کا پیالہ لے کر دوڑ کر اس زخمی کے پاس پہنچے تو دوسری طرف پانی پانی کی پکار آئی ۔ ان زخمی نے کہا پہلے میرے اس بھائی کو پانی پلاؤ ـــ وہ وہاں پہنچے تو تیسری طرف سے یہی صدا آئی ۔ انہوں نے بھی اصرار کیا کہ پہلے اس کو پانی پلاؤ ۔ وہاں پہنچے تو چوتھی طرف سے یہی پکار آئی ۔ ان تیسرے صاحب کے اصرار پر چوتھے کے پاس پہنچے تو وہ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر چکے تھے ۔ یکے بعد دیگرے یہ تینوں کے پاس پہنچے تو یہ تینوں بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے ۔ یہ تھی قربانی ۔ یہ تھا ایثار ۔ یہ تھا رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا نقشہ ـــ اور یہ کامل عکاسی ہے : فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا کی ۔

اور جو دوسرا نقشہ ہے : فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ ..... اِلٰی آخر الآیہ وہ آگے آ رہا ہے : تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ز سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ـــ "تم جب انہیں دیکھو گے رکوع و سجود میں مشغول پاؤ گے ۔ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر ظاہر ہوں گے ۔ وہ اللہ کے فضل اور اس تعالیٰ کی خوشنودی کی طلب میں مصروف ملیں گے ۔ ان کی یہی صفت تورات میں بیان ہوئی ہے اور انجیل میں بھی" ـــ ان دو آیات کو ذہن میں رکھئے اور اب آگے آئیے تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ اس رشتہ یعنی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ کو آپس میں جوڑنے والی شے کون سی ہے ؟ قرآن مجید نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ بہت اہم ہے اور وہ ہے نصرت ۔ سورۂ صف جو میرے نزدیک جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے ۔ یہ اس موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام ہے ۔ Climax ہے ۔ اس کا اس پر اختتام ہوتا ہے : يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ

كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ " اے لوگو جو ایمان لائے ہوئے ہو، اللہ کے مددگار بنو، جیسے کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا: کون ہے اللہ کی طرف (بلانے میں) میرا مددگار"۔ یہاں نوٹ کیجئے کہ نصرت کی دو نسبتیں آئی ہیں۔ دین اللہ کا ہے اس کے غلبے کے لئے تن من دھن لگاؤ گے تو یہ نصرت ہے اللہ کی ـــ ہمایوں کو ہندوستان سے شیر شاہ سوری نے نکال باہر کیا تھا تو ایران کے بادشاہ طہماسپ کی فوجوں نے ہندوستان کی حکومت دوبارہ حاصل کرنے کیلئے ہمایوں کی مدد کی۔ اس سے بڑا محسن ہمایوں کا کون ہوگا! تو اللہ کو دیس نکالا دیا ہوا ہے
ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ اللہ کی تشریعی حکومت کا تختہ الٹا ہوا ہے' اب اس حکومت کو دوبارہ قائم کرنا ہے تو جو اس کام کے لئے خود کو وقف کر دیں' لگا دیں' کھپا دیں' ان سے بڑھ کر اللہ کا مددگار اور کون ہوگا! ـــ یہ نصرت اللہ کی ہے۔ لیکن عملاً یہ فرضِ منصبی ہوتا ہے رسول کا۔ لہٰذا جو یہ کام کرتے ہیں وہ رسول کی نصرت کرتے ہیں۔ نصرت کی یہ دو نسبتیں ہیں، ان کو اچھی طرح جان لیجئے۔ ان ہی دو نسبتوں کا بیان ہوا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کے لئے مطالبہ آیا: كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ ـــ " اللہ کے مددگار بنو"۔ آگے رسول کی طرف سے دعوت آئی: مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ـــ "کون ہے میرا مددگار اللہ کے راستہ میں"۔ اسی بات کی تفہیم کے لئے سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ کو دیکھئے فرمایا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ
یہاں بھی نصرت کی دو نسبتیں بیان ہوئیں: وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اللہ دیکھ لینا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو اس سے غیب میں ہونے کے باوجود اس (تعالیٰ) کی اور اس (تعالیٰ) کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ لوہے کی طاقت کو ہاتھوں میں لے کر میدان میں آتے ہیں"۔ رسول کی نصرت چونکہ اللہ کی نصرت یعنی اس کے دین کے غلبے کے لئے جان و مال لگانا ہے۔ لہٰذا رسول کی نصرت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور فوز و فلاح کی بشارت ہے جس کا ذکر سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے آخر میں بایں الفاظ مبارکہ وارد ہوا ـــ : فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَ

نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ہ
"جو لوگ اس پر (اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) ایمان لائیں اور ان کی توقیر و عزت کریں اور ان کی حمایت و نصرت کریں اور اس روشنی (یعنی قرآن مجید) کی پیروی اختیار کریں جو ان کے ساتھ نازل کی گئی ہے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"
آیت کے آخر میں حصر کا اسلوب ہے۔ معلوم ہوا کہ فوز و فلاح منحصر ہے ان چار کاموں پر۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، ان کا احترام، دعوت و تبلیغ، شہادت علی الناس اور اظہار دینِ الحق علی الدین کلّہٖ کی جدوجہد میں ان کی نصرت اور قرآن حکیم کا اتباع ــــ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دین کے غلبے کے لئے نصرت اصلاً اللہ کی نصرت ہے لہٰذا سورۂ محمد میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بشارت دیتا ہے کہ اگر تم اللہ کی اس کے دین کے غلبے کے لئے مدد کرو گے تو وہ اہلِ ایمان کی مدد کرے گا اور باطل و طاغوتی قوتوں کے مقابلہ میں ان کے قدم مضبوطی سے جما دے گا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ہ ــــ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ میں پہلا نقطۂ ماسکہ، پہلی جوڑنے والی چیز نصرتِ رسول ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ۔ لہٰذا یہ لفظ نصرت بہت اہم ہے۔ اس کو نوٹ فرما لیجئے!

اس تعلق کو قائم کرنے کے لئے قرآن مجید نے جو دوسرا عنوان قائم کیا ہے، وہ ہے مبایعت۔ میں نے دانستہ لفظ بیعت استعمال نہیں کیا اسے ذرا رو کا ہے اس سے آپ لوگوں کو الرجی ہے۔ مبایعت ذرا ثقیل تو ہو گیا لیکن نیا لفظ ہے تو شاید آپ اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہو جائیں ــــ یہ لفظ مبایعت بابِ مفاعلہ میں بیع سے بنا ہے۔ دو اشخاص کہہ لیں، دو فریق کہہ لیں، دو شخصیتیں کہہ لیں۔ ان کے مابین جو معاہدہ طے پا جائے۔ بیع و شراء تو یہ مبایعہ یا مبایعت ہے۔ قرآنِ حکیم میں سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۱ میں بیع و شراء دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اسی آیت کی تلاوت سے میں نے آج کی گفتگو کا آغاز کیا تھا ــــ قرآن مجید نے دین کی اس حقیقت کو متعدد مقامات پر "تجارت" کے لفظ سے واضح کیا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مفہوم و تصور (CONCEPT) بڑا واضح ہے۔ ہر معمولی شخص

بھی جانتا ہے کہ تجارت کسے کہتے ہیں ! تجارت کے لئے سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ پونجی لگتی ہے خواہ کم ہو یا زیادہ ۔ ساتھ ہی محنت لگتی ہے ۔ ان دونوں کے اشتراک کا نام تجارت ہے ۔ اس تجارت سے پیشِ نظر منفعت ہے ۔ چنانچہ سورۂ صف کی یہ آیت ذہن میں لائیے ! یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ" اے اہلِ ایمان میں تمہاری رہنمائی کر دوں، تمہیں بتاؤں ایک تجارت، ایک سوداگری جو تم کو دردناک عذاب سے بچالے چھٹکارا دلادے ۔! ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور محنت کرو، کشمکش کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے" یہاں لفظِ تجارت بہت جامع ہے ـــــ اسی تجارت کی نہایت مہتم بالشان اسلوب سے شرح ہے جو سورہ توبہ کی اس آیتِ مبارکہ میں آئی ہے : اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ اللہ نے اہلِ ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں جنّت کے عوض"۔ اس سودے کا ظہور کس طور پر ہو رہا ہے؟ اسے آگے بیان کیا گیا ہے ۔ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ۔" وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں"۔ آگے بڑا لطیف نکتہ آ رہا ہے ؛ غور کیجئے گا ۔ چونکہ یہ سودا نقد نہیں ہے بلکہ ادھار ہے ۔ جان و مال تو یہاں دینا ہوگا، جنّت وہاں آخرت میں ملے گی ۔ ادھار سودا کرکے آدمی کے دل میں وسوسے آتے ہیں کہ قیمت ملے کہ نہ ملے۔ اس لئے اس آیت میں آگے کس قدر تاکید آ رہی ہے۔ فرمایا : وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ۔ کسی وسوسے کو قریب پھٹکنے نہ دو ۔ یہ تو اللہ کا وعدہ ہے اس کے ذمّہ حق کے ساتھ۔ تین مرتبہ اس کی توثیق ہوئی ہے ۔ تین مرتبہ کے وعدے کے بعد بھی کوئی شک باقی رہ سکتا ہے ! تورات میں یہ وعدہ آچکا، انجیل میں یہ وعدہ آچکا، قرآن میں یہ وعدہ آچکا اور سوچو تو سہی کہ اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کا وفا کرنے والا کون ہے! لہٰذا فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ؕ" پس خوشیاں مناؤ اس

اس بیع پر جو تم نے کی ہے"۔ یہاں "بَایَعْتُمْ" باب مفاعلہ ہے۔ دو فریقوں کے مابین خرید و فروخت ۔ لین دین ـــــ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ٥ "اور یہی اصل اور بڑی کامیابی ہے۔"

اب ایک اہم بات پر غور کیجئے ۔ یہاں بیع تو اصلاً ہے اللہ اور بندے کے درمیان ۔لیکن اللہ نہ کبھی زمین پر اترا اور نہ کبھی اترے گا کہ وہ یہ خریداری' یہ بیع وشرا خود کرے ۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسؐ کے نمائندے کی حیثیت سے سامنے ہیں ۔ بیع کس سے ہے ! اللہ سے ۔ اور بیعت کس سے ہے ! محمد رسول اللہ سے ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ اس حقیقت کو کس قدر خوبصورتی سے اس آیت میں واضح کیا ہے جو میں ابھی آپ کو سنانے والا ہوں ۔ اس آیت کو اس اعتبار سے مزید اہم سمجھئے کہ یہ اسی سورہ فتح میں ہے جس میں فرمایا گیا تھا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ یہ (LINK) کیا ہے ! نقطۂ ماسکہ کیا ہے ! وہ رشتہ کیا ہے جس نے ان کو آپس میں جوڑ دیا ہے ! ـــــ آپ کو معلوم ہے' اسی سورۂ فتح میں بیعتِ رضوان مذکور ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ـــــ اس سے قبل آیت نمبر ۱۰ میں اس بیعت کی حقیقت کو ایسے حسین و عجیب اسلوب سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر انسان واقعتاً غور کرے تو عظمت کے احساس سے سر خود بخود جھکتا ہے ۔ فرمایا :

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ط يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ج

"اے نبیؐ! جو لوگ آپؐ سے بیعت کر رہے ہیں حقیقت میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں ۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔"

چونکہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت ہوتی ہے ۔ البتہ خواتین سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی بیعت لی ہے اس میں کبھی مصافحہ نہیں ہوا : لَا اُصَافِحُ النِّسَاءَ ۔ بعض خواتین نے ہاتھ بڑھائے بھی تھے ـــــ ہمارے ملک کی جو خاتونِ اوّل ہیں' اخباری اطلاعات کے مطابق انہوں نے یہی (PLEA) لی تھی جب خواتین کی محفلِ میلاد میں کسی بچّی نے اعتراض کر دیا تھا کہ ہمارے ملک کی

خاتونِ اوّل نے ایک غیر محرم مرد سے ہاتھ ملایا ! تو انہوں نے یہی عذر پیش کیا تھا کہ اس نے ہاتھ بڑھا دیا تھا، میں کیا کرتی ! میں اسے شرمندہ کیسے کرتی!۔۔۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امّت کے تمام مردوں اور عورتوں کے لئے بمنزلہ باپ ہیں اور خواتین کے ہاتھ بڑھ چکے ہیں اور وہ کہہ رہی ہیں اَلَا تُصَافِحُنَا " کیا آپ ہم سے مصافحہ نہیں فرمائیں گے ؟ آپؐ نے ہم سے بیعت تو لی نہیں !" اس لئے کہ بیعت کا جو معروف طریقہ ہے ہاتھ میں ہاتھ دے کر قول و قرار کرنا اس کے مطابق تو عمل ہوا نہیں۔ حضورؐ کا جواب تھا : لَا اُصَافِحُ النِّسَآءَ ۔۔۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین سے بیعت لینے کے لئے حضورؐ کا طریقہ یہ تھا کہ یا تو کپڑا ہوتا تھا۔ ایک سرا حضورؐ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا اس خاتون کے ہاتھ میں۔ یا ایک طشت میں پانی ڈال کر ایک طرف نبی اکرمؐ نے اپنا دست مبارک ڈبو دیا اور دوسری طرف خاتون نے ۔۔۔ ہاتھ مس تو نہیں ہو رہا ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ معاملہ ضرور ہے۔ اب یہ تو اہلِ تصوّف جانیں کہ کونسا روحانی اور برقی عمل ۔۔۔ ہو رہا ہے۔ ہم کو تو ظاہر نظر آتا ہے۔ ظاہر کی پیروی کرنے کو ہم اتباعِ رسول کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں۔ اس میں یقیناً کوئی باطنی و روحانی چاشنی بھی ہے وہ نَافِلَةً لَّكَ کے درجے میں ہے۔ بہرحال اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے ضرور۔ ورنہ اس تکلّف کی ضرورت کیا ہے ! فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ ۔ ہمارے لئے زیادہ سلامتی اور عافیت اسی میں ہے کہ ظاہر پر عمل کیا جائے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

یہ باتیں میں آج کی گفتگو میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ آج چند لوگوں نے مجھ سے عجیب و غریب باتیں کہی ہیں کہ ہم ایک دینی جماعت کے رکن ہیں۔ اس کا ایک 'دستور' ہے۔ اس کا ایک 'امیر' ہے۔ چونکہ ہم دستور کو تسلیم کر کے جماعت میں شامل ہوئے ہیں لہٰذا بیعت ہوگئی۔ اب کیا ضروری ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہی بیعت کی جائے ۔۔۔ میں نے ان سے کہا کہ یہی بات آج کا صوفی کہتا ہے کہ نماز کا مقصد کیا ہے ! اللہ سے لَو لگانا ۔۔۔ میں نے اللہ سے لَو لگا لی!

ہوئی ہے ! مجھے نماز کی کیا ضرورت ہے! ـــــ دین کے ظاہر کے لئے جب آپ اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں اور بالکل صحیح دیتے ہیں کہ صَلّوا کَمَا رَاَیتمونی اُصلّی ـــــ اور اس میں ذرا سے فرق پر آپ کے یہاں ہنگامے ہیں۔ من دیگرم تو دیگری والا معاملہ ہے ۔ اور اس بیعت کے معاملہ میں ظاہر کو اس طرح اٹھا کر پھینک دیں ، اس کی کوئی قدر و قیمت نہ رہے ـــــ یہ درحقیقت ہمارے تضادات ہیں ـــــ بہرحال میں نے برسبیلِ تذکرہ یہ باتیں کہی ہیں ۔

گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ ایک بندۂ مومن کی اصلاً بیع ہوتی ہے اللہ کے ساتھ لیکن اس عالمِ واقعہ میں بیعت اللہ کے رسولؐ کے ہاتھ پر ہوتی ہے پھر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نائبین کے ہاتھ پر ہوتی ہے ـــــ پھر جو بھی انؐ کے نقش قدم پر چلیں گے ان کے ہاتھ پر ہوگی ۔ یہ بیعت کی بنیاد ہے جو ان کو جوڑتی ہے ۔ ایک قوّت بناتی ہے ۔ ان کو متحد کرتی ہے اور ایک جمعیت کی شکل دیتی ہے اور جمعیت بھی کیسی ! اس بیعت کے بعد لامحالہ وہ ڈسپلن وجود میں آئے گا جس کی اس عالمِ واقعہ میں صرف ایک ہی مثال ہے جس کو (ARMY DISCIPLINE) کہتے ہیں ۔ فوج کا نظم و ضبط ـــــ بلا چون و چرا حکم کی بجا آوری ـــــ سمع و طاعت ۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ سمع و طاعت کیوں کہا گیا! بادی النظر میں یہاں 'سمع' کا لفظ زائد ہے ، بیکار ہے ۔ آخر اطاعت ہوگی تو کوئی حکم سن کر ہی تو ہوگی ۔ پھر کس لئے یہ 'سمع و طاعت' ۔ ! اور قرآن مجید کی یہ اصطلاح ہے : وَاسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا ـــــ اور اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا اور وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ط ـــــ غور کیجئے کہ سمع و طاعت کا جوڑا کیوں آیا ۔! ایک اطاعت وہ ہوتی ہے جو حکم کی غایت اور اس کے مقصد کو سمجھنے کے بعد واجب ہوتی ہے اور ایک اطاعت وہ ہے جو مجرّد سننے پر واجب ہوتی ہے ۔ یہ فوج کی اطاعت ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ فوج میں اگر ماتحت اپنے بالاتر سے پوچھنے لگے کہ " جناب اس حکم کی غایت کیا ہے ؟ پہلے مجھے سمجھایئے " اگر معاملہ یہ ہو تو ظاہر بات ہے کہ فوج کا ڈسپلن تو ختم ہوا ۔ اس کو انگریزی کی مشہور نظم چارج آف لائٹ بریگیڈ میں دو جملوں میں بڑی خوبصورتی

سے ادا کیا گیا ہے ۔

THEIR'S NOT TO REASON WHY
THEIR'S BUT TO DO & DIE

فرق صرف یہ ہے کہ رسول کی اطاعت مطلق ہے ۔ اس لئے کہ رسول ہی تو درحقیقت اللہ کا نمائندہ ہے ۔ اس کے ساتھ کوئی شرط نہیں ہے بلکہ اس کے لئے تو فرمانِ ربانی یہ ہے : وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ البتہ رسول کے بعد کسی کی اطاعت مطلق نہیں ہے، مقید ہے لِلْكِتٰبِ وَالسُّنَّةِ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کا جو دائرہ ہے اس کے اندر اندر ہے ۔ اس کے باہر ہے تو لا سمع ولا طاعۃ ہے ۔ معروف میں اطاعت لازم ہے ۔ واجب ہے ۔ فرض ہے ۔ پھر یہ کہ جہاں تک اطاعت کی کیفیت کا تعلق ہے تو وہی سمع و طاعت درکار ہے ۔ ثابت کر دیجئے کہ یہ حکم کسی نص کے خلاف ہے تو بات دوسری ہے ۔ ثابت نہ کر سکیں تو ماننا پڑے گا ۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اچھا لگے یا نہ لگے ، انشراح صدر ہو یا نہ ہو ۔

میں اپنی اس بات کی دلیل کے طور پر آپ کو چند احادیث سنانا چاہتا ہوں ۔ ان میں سے پہلی حدیث متفق علیہ ہے ۔ کاش وہ لوگ جن میں دین کے ظاہر کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو تسلیم کرتے ہیں کہ سنّتِ رسولؐ واجب الاطاعت ہے ۔ میں یہاں حنفی ، اہلِ حدیث اور بریلوی کے چکر میں نہیں پڑتا ۔ اتباع اور اطاعتِ رسولؐ کی فرضیت سے ان میں سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے ۔ جو اختلافات ہیں ، ان کی نوعیت یہ ہے کہ آیا یہ سنّت ثابتہ ہے یا نہیں ۔ جو روایت آ رہی ہے وہ کس نوع اور کس درجے کی ہے ۔ سند کے اعتبار سے اس کا مقام کیا ہے ! ضعیف ہے یا قوی ہے ! مرسل ہے کہ مرفوع ہے ۔ شاذ ہے کہ مشہور ہے ۔ اس سے زیادہ مضبوط کوئی اور روایت ہے ۔ یہ بحثیں ہیں اور ہوں گی ۔ اصولاً کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ پھر آج یہاں جو حضرات تشریف لائے ہیں ان میں سے کون نہیں جانتا ہے کہ جو روایت متفق علیہ ہو ۔ جس کی صحت پہ ائمہ حدیث میں سے چوٹی کے دو محدثین امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کا اتفاق ہو ، احادیث میں اس

سے بلند کسی حدیث کے پختہ ہونے کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ یقینی ہونے کے اعتبا سے ایسی حدیث تقریباً قرآن کے ہم وزن مانی جاتی ہے ـــ اب میں آپ کو جو حدیث سنانے والا ہوں اسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔ یہ متفق علیہ روایت ہے ـــ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ کو توجہ اور غور سے سماعت فرمائیے۔ خاص طور پر ان الفاظ پر جو کہ جوڑوں کی صورت میں آئے ہیں۔

عن عبادة بن الصامت قال بایعنا رسولُ اللهِ صلی اللهُ علیہ وسلم علی السَّمعِ والطاعۃ فِی العُسرِ والیسرِ و المنشطِ والمکرہِ وعلیٰ اَثَرۃٍ علینا وعلیٰ اَن لا نُنَازِعَ الامرَ اَھلَہٗ وعلیٰ اَنْ نقولَ بالحقِّ اَینما کُنّا لا نخاف فی اللہ لومۃَ لائم

حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ "ہم نے بیعت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے"۔ کس بات کی بیعت کی ! "عَلیَ السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ"۔ اس پر کہ سنیں گے اور اطاعت کریں گے ـــ کن کن حالات میں ! "فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ" چاہے تنگی ہو یا آسانی، مشکل ہو یا آسان ـــ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ" منشط نشاط سے بنا ہے۔ اگر کسی حکم کا آپ کی طبیعت سے موافقت ہے۔ آپ کی رائے بھی اس کے حق میں ہے تو آپ خوش دلی، انشراحِ صدر اور نشاطِ طبع کے ساتھ اس حکم پر عمل کرتے ہیں۔ یہ منشط ہے ـــ مکرہ بنا ہے اکراہ سے۔ اگر آپ کی ذاتی رائے کچھ اور ہے، آپ کا ذاتی میلان و رجحان کچھ اور ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ اسے مان رہے ہیں۔ تو یہ ہے اکراہ کے ساتھ، ناگواری کے ساتھ، اپنی طبیعت پر جبر کے ساتھ ماننا۔ تو حکم ہر حال میں ماننا ہے۔ چاہے طبیعت میں انشراح و انبساط ہو چاہے طبیعت کو مجبور کر کے ماننا پڑے۔ یہاں تک تو جوڑے کی شکل میں بیعت کے لوازم کا ذکر ہوا۔ اب آگے علیحدہ علیحدہ امور آرہے ہیں جن میں سے ہر ایک اہم ہے۔ "وَعَلیٰ اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا" اور اس پر بیعت کی کہ چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے۔ ہم اس کی بھی اطاعت کریں گے ـــ جماعتی

زندگی کا جو سب سے بڑا فتنہ ہوتا ہے اس کا یہاں سدِّ باب کر دیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پر بیعت ہو رہی ہے، وہ ہر آن تو موجود نہیں رہ سکتا۔ کسی مہم پر وہ کسی کو اپنا نائب بنا کر بھیجے گا۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:
مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ ــــ
بالکل معقول، مربوط اور منطقی بات ہے۔ "جس نے میری اطاعت کی، پس اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔ دوسری امارتوں کا جو نصب ہو گا مثلاً امیر جیش ہے۔ حضورؐ کہیں کوئی لشکر بھیج رہے ہیں تو اس کا کسی کو امیر یا سپہ سالار مقرر فرما رہے ہیں ـــ یا حضورؐ مدینہ سے باہر کسی مہم پر بنفس نفیس لشکر لے کر تشریف لے جا رہے ہیں تو مدینہ میں کسی کو اپنا نائب مقرر فرمایا ہے۔ تو ایسے مواقع پر فطری طور پر کسی کے دل میں یہ بات آسکتی ہے کہ میں زیادہ حقدار ہوں۔ میں زیادہ باصلاحیت ہوں میری (STANDING) زیادہ ہے۔ میں بہت پرانا ہوں۔ مجھ پر دوسروں کو ترجیح کیوں دے دی گئی۔! آپ کو معلوم ہے کہ موتہ کی طرف جو لشکر بھیجا گیا تھا، اس کا امیر حضرت زیدؓ بن حارثہ کو مقرر کیا گیا تھا تو اس پر چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اس معاملہ کو آپؐ نے اپنی عمر شریف کے آخری دور میں ایک لشکر کا امیر حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو بنا کر منطقی انتہا تک پہنچا دیا۔ جس میں حضرتِ ابو بکرؓ اور حضرتِ عمرؓ جیسے جلیل القدر آپؐ کے صحابہ بھی شامل تھے۔ یہ بھی دوسرے تمام صحابہ کرامؓ کی طرح مامور تھے اور حضرتِ اسامہؓ امیر۔ یہ اس لئے کہ معلوم ہو جائے کہ میری تربیت کس حد تک مؤثر ہو چکی ہے ـــ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا۔ شعوری طور پر یہ بات جانتے ہوئے بیعت کر دکہ ہم ہر حال میں اطاعت کریں گے۔ خواہ ہم محسوس کریں کہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جا رہی ہے تاکہ اس فتنے کی ابتدا ہی میں جڑ کٹ جائے اور اس مرحلہ پر آکر کوئی انتشار برپا نہ ہو ـــ "وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ" اور اس پر بیعت کی کہ جو لوگ اصحابِ امر ہوں گے ہم ان سے کبھی جھگڑا نہیں کریں گے۔ اس میں ایک استثناء ہے جس کا ایک

دوسری روایت میں اس مقام پر ان الفاظ میں ذکر ہے۔ وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ۔ الا یہ کہ تم کھلا کھلا کفر دیکھو جس کے لئے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح و روشن دلیل ہو۔ اس حال میں سمع و طاعت نہیں ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ ــــ یہی بات عام ہدایت و رہنمائی کے لئے اس حدیث میں وارد ہوئی ہے کہ: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ ــــ حضرت عبادہؓ ابن الصامت آگے آخری بات یا فرماتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی اور عہد کیا اس بات پر: "وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ" "ہم حق کہتے رہیں گے جہاں بھی ہوں اور ہم ہرگز نہیں ڈریں گے کسی ملامت گر کی ملامت سے۔" یعنی معاذ اللہ غلامانہ ذہنیت پیدا کرنا اس بیعت کا مقصد نہیں ہے۔ معاذ اللہ مقلدانہ مزاج بنانا اسلام کا ہرگز منشا نہیں ہے ــــ اپنی سوچ کو آزاد رکھو، غور کرتے رہو، اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ دین کے لئے کام کرنا سب کا مشترکہ مقصد ہے۔ کسی ایک کا مقصد نہیں ہے۔ جو مرحلہ بھی درپیش ہو، اس موقع پر اس کے تقاضوں کے فہم کے لئے تمہارا ذہن کام کرے۔ اس کے موافقت یا مخالفت، اس کے حق اور اختلاف کے بارے میں تم بھی سوچو۔ اپنی رائے کا برملا اظہار کرو۔ البتہ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ جب اجتماعی مشورے کے بعد امیر کا فیصلہ سامنے آجائے تو مانو ــــ اس کے حکم کی تعمیل کرو۔

اندازہ کیجئے یہ ہے ڈسپلن۔ اس ڈسپلن کے بغیر انقلاب نہیں آسکتا۔ اس ڈسپلن کی اہمیت کو غزوہ احد سے سمجھئے۔ آپ نے غور کیا کہ اس غزوہ میں فتح ہو چکی تھی۔ قرآن کہتا ہے: وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ "اور اللہ نے نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا۔ اس نے پورا کر دیا۔ جب تم انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے" ــــ پھر یہ فتح شکست میں کیوں بدلی! اسی آیت میں اجمالاً اس کا ذکر ہے۔ اس کی تفصیل احادیث اور سیر کی مستند کتابوں میں ملتی ہے۔ احد کے میدان میں پہاڑ کے ساتھ ایک درّہ تھا۔ اس امکان کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن جبیرؓ کی سربراہی میں پچاس صحابہؓ کا ایک دستہ تعینات کر دیا تھا کہ مبادا دشمن کی فوج کا کوئی دستہ پہاڑ کے پیچھے سے آکر اس سے

درّے کے راستے مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دے۔ اس دستہ کو نبی اکرمؐ نے اتنی شدید تاکید کی تھی کہ اگر تم دیکھو کہ ہمیں شکست ہو گئی ہے اور ہماری لاشیں پرندے نوچ رہے ہیں تب بھی اس جگہ کو نہ چھوڑنا ـــــ مسلمانوں کو جب اللہ کی نصرت سے فتح ہوئی اور دشمن منتشر ہونے لگا تو اس دستے میں اختلاف ہوا کہ حضورؐ کا منشا تو یہ تھا کہ شکست کی صورت میں ہمیں یہ جگہ نہیں چھوڑنی لیکن اب جبکہ مسلمانوں کو فتح ہو رہی ہے تو ہمیں بھی دشمن کو قتل کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں چلنا چاہیے۔ دستہ کے امیر حضرت عبداللہ ابن جبیرؓ ان کو روکتے رہے کہ جب تک، نبی اکرمؐ کا حکم نہ آئے ہمیں اسی جگہ ٹھہرنا چاہیے۔ لیکن ان پچاس میں سے زیادہ سے زیادہ پینتیس حضرات تھے جنہوں نے دستہ کے امیر کی بات نہیں مانی اور میدانِ جنگ میں جا شامل ہوئے۔ خالدؓ بن ولید جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور عرب کے مانے ہوئے جرنیل تھے۔ انہوں نے جب اس درّے کو خالی دیکھا اُحد پہاڑ کے پیچھے سے ایک لمبا چکّر کاٹ کر اپنے دستے کے ساتھ اس درّے کی جانب سے عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ جو پندرہ صحابیؓ رک گئے تھے وہ اس یلغار کو نہ روک سکے اور سب کے سب شہید ہو گئے۔ دشمن کی فوج نے جب یہ دیکھا کہ پیچھے سے خالد بن ولید کے دستے نے حملہ کر دیا تو ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور انہوں نے پلٹ کر مقابلہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کی یہ فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے آیت کے اگلے حصہ میں:

حَتّٰۤی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ "مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور حکم کے بارے میں اختلاف کیا"

دیکھیے وہی لفظ آ گیا: لَا تُنَازِعُ الْاَمْرَ ـــ "تم نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کی جیسے ہی اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی جو تم کو محبوب تھی" [۱]

---

[۱] اکثر مفسرین نے یہاں مَا تُحِبُّوْنَ سے مراد مالِ غنیمت کی محبت لی ہے۔ جبکہ بعض نے اس سے مراد فتح لی ہے۔ یہ حضرات سورہ صف کی آیت وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ۔ سے اپنی رائے کے لئے استدلال کرتے ہیں۔ یہ رائے انسب معلوم ہوتی ہے۔ (مرتب)

دیکھا آپ نے پینتیس ۳۵ افراد کی طرف سے ڈسپلن توڑنے کی سزا ستّر صحابہ کرام کی شہادت کی شکل میں ملی جن میں حضرت حمزہ بھی تھے اور حضرت مصعب ابن عمیر بھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ پھر یہ کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہوئے ــــ یہ سب اس لئے ہوا کہ ہم تمہیں آزمانا اور سبق دینا چاہتے تھے اور تمہارے دلوں کو پاک کرنا چاہتے تھے وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ تمہاری تنظیم کا یہ جھول رفع ہو جانا چاہیئے اور تمہیں ڈسپلن کا پابند اور خوگر بننا چاہیئے۔ ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔ ابھی تو عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ تمہیں اللہ کے دین کا جھنڈا چہار دانگِ عالم میں بلند کرنا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط تم عالمی اسلامی صالح انقلاب کے ہراول ہو ــــ تمہاری جانب سے کامل سمع و طاعت کا مظاہرہ ہونا چاہیئے۔ اگر ابھی یہ ڈھیل ہے تو آگے کیسے چلو گے! ــــ یہ ہے بیعتِ سمع و طاعت۔

میں اس موقع پر ایک ضمنی بات کہہ کر آگے بڑھوں گا ــــ ایک دوسری بیعت بھی ہے، میں اسے حق مانتا ہوں اور وہ ہے بیعتِ ارشاد۔ لیکن وہ بیعتِ سمع و طاعت نہیں ہے۔ اس بیعتِ ارشاد کے لئے قرآن و سنّت میں بنیاد ہے۔ قرآن مجید میں سورہ ممتحنہ میں بیعت النسآء کا پوری تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ (الی آخر الآیۃ) یہ بیعتِ نسآء ہے۔ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ مل جاتے ہیں کہ لیلۃ العقبہ میں اسی کی بیعت حضورؐ نے انصارِ مدینہ سے لی تھی۔ اس میں بالکل یہی الفاظ ہیں۔

عَن ابی ادریس عائذ اللہ بن عبد اللہ ان عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ وکان شھد بدرا وھو احد النقباء لیلۃ العقبۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال وحولہ عصابۃ من اصحابہ بایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئًا و

لا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادکم ولا تأتوا ببھتان
تفترونہ بین ایدیکم وارجلکم ولا تعصوا فی معروف
فمن وفیٰ منکم فاجرہ علی اللہ ومن اصاب من ذٰلک شیئًا
فعوقب فی الدنیا فھو کفارۃ لہ ومن اصاب من ذٰلک شیئًا
ثم سترہ اللہ فھو الی اللہ ان شاء عفا عنہ وان شاء عاقبہ
فبایعناہ علی ذٰلک۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الایمان)

—— لیلۃ العقبہ میں حضورؐ نے یہ بیعت لی ہے۔ یہ بیعتِ ارشاد ہے۔ نیکیوں کے کے لئے، بھلائیوں کے لئے، برائیوں سے بچنے کے لئے، تزکیہ نفس کے لئے۔

اب میں تاریخی اعتبار سے ایک اجمالی سا نقشہ آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں —— دیکھئے نبیِ اکرمؐ نے بیعتیں لیں۔ بیعت عقبۂ اولیٰ، بیعت عقبۂ ثانیہ، اور بیعتِ شجرہ، اسی کا دوسرا نام بیعتِ رضوان ہے۔ ان بیعتوں کا ذکر تو سیرت کی تمام کتابوں میں مل جاتا ہے۔ بیعتِ رضوان کا بیان تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ ایک بیعت کا ذکر امام بخاریؒ نے کیا ہے۔ اس شعر میں جو صحابہ کرامؓ غزوۂ احزاب میں پڑھ رہے تھے۔ جب وہ خندق کھود رہے تھے تو ان کی زبانوں پہ یہ شعر جاری تھا ؎

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدَا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

"ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جہاد کے لئے بیعت کی ہے۔ جب تک ہم زندہ رہیں۔"

اس بات کو خاص طور پہ نوٹ کیجئے کہ بیعتِ رضوان ابھی نہیں ہوئی۔ سورہ فتح ابھی نازل نہیں ہوئی —— یہ بیعتِ جہاد جس کا اس شعر میں ذکر ہے کب ہوئی۔ ! اب یہ تحقیق کی بات ہے کہ بالفعل بھی ایسا کوئی واقعہ ہوا تھا۔ ! یا یہ کہ اس کو تعبیر کیا گیا اس امر سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم نے بیعتِ جہاد کی ہے۔ یہ کسی محقق کے کرنے کا کام ہے کہ یہ بیعتِ جہاد کب اور کہاں لی گئی ! یا جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ ایمان لانے کی تعبیر ہے: نحن الذین

بایعوا محمدا علی الجہاد ما بقینا ابدًا ۔ میں اپنی رائے پیش کر رہا ہوں، میرا گمان ہے کہ عقبۂ اولیٰ کی بیعت وہ تھی جو میں نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت کے حوالے سے ابھی آپ کو سنائی ہے ۔ جو بیعتِ ارشاد اور تزکیہ کے لئے جڑ اور بنیاد ہے ۔ اور عقبۂ ثانیہ میں نبی اکرمؐ نے انصارؓ سے جو بیعت لی وہ چونکہ حضورؐ کی حفاظت کے لئے تھی اس لئے اس میں یقیناً جہاد کے لئے بیعت کے بھی الفاظ ہوں گے ۔ تحقیق پر انشاء اللہ کوئی روایت مل جائے گی ۔ اور میرے اس خیال کی تصویب ہو جائیگی۔

یہاں ایک نکتہ اور عرض کر دوں ــ اگر آپ غور کریں گے تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نوع کی بیعت لینے کی ضرورت نہیں تھی ۔ اس لئے کہ حضورؐ تو اللہ کے رسول ہیں ۔ رسول سے تعلق تو ایمان کا ہے ۔ ایمان لائے اور ہمہ تن مطیع ہو گئے جیسا کہ سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ نے غزوہ بدر سے پہلے مجلس مشاورت میں کہا تھا کہ حضورؐ ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں : اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ ۔ ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں ۔ ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے ۔ اب ہمارے پاس کون سا اختیار رہ گیا ہے ! ــــ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ط رسول مان لیا تو بات ختم ۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور اہلِ علم کی تصویب یا تصحیح کے لئے یہ بات پیش ہے کہ درحقیقت یہ ساری بیعتیں حضورؐ نے صرف اسوہ اور سنّت چھوڑنے کے لئے لی تھیں ۔ ورنہ مجھے یقین ہے جتنا اس بات کا یقین ہے کہ اس وقت آپ حضرات یہاں تشریف رکھتے ہیں اور میں آپ سے خطاب کر رہا ہوں ۔ اتنا ہی مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ چودہ سو صحابہ کرامؓ جو مدینہ سے چل کر حدیبیہ تک پہنچے تھے ۔ اس موقع پر نبی اکرمؐ جنگ کا فیصلہ فرماتے تو ان میں سے کوئی ایک نہیں تھا جو پیٹھ دکھا دیتا ــ ان کے دلوں میں تو آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ حضرت عمر کے طرزِ عمل سے بھی سامنے آ رہی ہے اور حضرت علی کے طرزِ عمل سے بھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما ــ تمام صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل سے سامنے آ رہا ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احرام کھول دو اور جو ھدی کے جانور لائے ہو ان کی قربانی دے دو، انہیں یہیں ذبح کر دو ۔ لیکن ایک بھی نہیں اٹھا ۔ ان کے دلوں کی کیفیت عجیب تھی ۔ ان کی تلواریں نیاموں سے باہر آنے کے لئے بیتاب تھیں ۔ وہ

سوچ رہے تھے شاید جلد ہی وحی الٰہی آجائے اور حضورؐ جنگ کا فیصلہ فرمائیں ——
پھر بیعت کی ضرورت کیا تھی۔ وہاں بیعت ہونی چاہیئے تھی سمع وطاعت کی بیعت۔
حضورؐ کو ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنا ہے۔ انہیں روکنا ہے۔ لیکن درحقیقت بیعت
شجرہ اسوہ اور سنّت تھی بعد میں آنے والوں کے لئے —— اگر ہم یہ مانتے ہیں
کہ دین ہمہ اوست۔ دین تو نام ہی اتباعِ رسولؐ کا ہے۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ تو ہم بعد
کے زمانے کے لئے وہ بنیاد کہاں سے لاتے۔ اگر وہ بات سنّت وسیرتِ رسول
علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام سے ثابت نہ ہوتی!

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد خلافتِ راشدہ کا نظام قائم ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دین و دنیا ایک وحدت ہیں جیسے دَورِ نبوّی و رسالت میں ویسے ہی دورِ خلافتِ راشدہ میں۔ جو امام دنیا کا ہے، وہ ہی امام دین کا ہے۔ وہی مسجد نبویؐ کی نمازوں کا امام بھی ہے اور خطیب بھی۔ لہٰذا ایک ہی بیعت ہے، حضرات ابوبکرؓ کی، عمرؓ کی، عثمانؓ کی، علیؓ کی رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین ——

یہ بیعت سیاسی بھی ہے، حکومت کی بھی ہے اور یہ بیعت دینی بھی ہے ——

البتہ اس دور میں لوگوں کو ایک مغالطہ ہوگیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی اصلاح کے لئے کچھ عرض کر دوں۔ اکثر لوگ بیلٹ کو بیعت کا مترادف اور قائم مقام سمجھ رہے ہیں۔ یہ مغالطہ ہی نہیں حماقت ہے۔ اس دور کا جو بیلٹ ہے، وہ مشورے کے قائم مقام ہے۔ مشورے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے چھ صحابہؓ کا امیر کے انتخاب کے لئے جو بورڈ قائم کیا تھا، اس نے کتنی دیر تک مشورہ کیا ہے اور پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو اختیار سپرد کیا ہے کہ وہ حضرات عثمانؓ و علیؓ میں سے ایک کو خلیفہ اور امیر المؤمنین نامزد کر دیں۔ پھر فیصلہ سے قبل حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے مدینہ میں بہت سے مردوں عورتوں حتیٰ کہ نوعمروں سے مشورہ لیا ہے۔ یہ تمام تفاصیل سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت عثمانؓ کا نام پیش کیا ہے۔ پھر بیعت عام ہوئی ہے۔ حضرت علیؓ کو جب خلافت کی پیش کش کی گئی ہے تو آپؓ نے مدینہ میں مقیم اکابر صحابہؓ کو مسجد نبوی میں جمع کیا ہے اور پھر مشورہ کے بعد بیعت لی ہے —— لہٰذا بیلٹ اور بیعت کو بالکل علیحدہ

کر دیجئے۔ یہ قطعی طور پہ ایک دوسرے سے جدا عمل ہیں ــــــ اس دور میں مشورے کا جو بھی نظام بنے۔ یہ اصحابِ علم و دانش کا کام ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کو سامنے رکھ کر مشورے کا کوئی نظام بنائیں اور جب ضرورت ہوگی انشاء اللہ بن جائے گا اور جب تک وہ وقت نہیں آتا بحثیں ہی ہوتی رہیں گی۔ حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ ذہنی انتشار ہی بڑھتا رہے گا۔ بہر حال بیعت اور بیلیٹ بالکل جدا ہیں۔ بیلیٹ مشورے کا معاملہ ہے۔ مشورے کے بعد وہ مسئلہ طے ہوگا جس کے لئے بیلیٹ کرایا جائے گا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد نری خلافت رہ گئی۔ خلافت تو ہے لیکن اس میں سے دینی عنصر نکل گیا۔ اب محض حکمرانی ہے۔ لہٰذا آپ کو معلوم ہے کہ دو بیعتیں شروع ہو گئیں۔ اس دینی عنصر نے بیعت ارشاد کی شکل اختیار کرلی۔ سیاسی اور حکومتی سطح پہ بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفاء سے بیعت ہو رہی ہے۔ ان دو بیعتوں کا نظام چلتا رہا۔ تا آنکہ مغربی امپریلزم کے سیلاب نے ہمارے سیاسی اور حکمرانی کے نظام کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ریت کے گھروندوں کے مانند ہماری حکومتیں بیٹھ گئیں۔ لہٰذا بیعتِ حکومت ختم ہوگئی۔ اب ایک ہی بیعت رہ گئی اور وہ بیعتِ ارشاد ہے۔ اس کو تو ختم کرنے والا کوئی نہیں تھا ــــ اس میں جو مختلف سلاسل وجود میں آ گئے تھے وہ تا حال چل رہے ہیں ــــ جیسے فقہ کے چار مسالک مشہور و معروف ہیں اور چل رہے ہیں ــــ البتہ اب جو احیائی تحریکیں اٹھیں ــــ یہ ہے اہم اور غور طلب بات ــــ وہ سب بیعت کی بنیاد پر اٹھیں۔ ایک استثنا ہے جس کا میں بعد میں ذکر کروں گا۔ ــــ سوڈان میں انگریزی حکومت سے ٹکراؤ کے لئے مہدی سوڈانی کی جو تحریک اٹھی وہ بیعت کی بنیاد پہ اٹھی۔ طرابلس (موجودہ لیبیا) میں سنوسی کی تحریک اطالویوں کے خلاف بیعت کی بنیاد پر اٹھی۔ نجد سے جو تحریک اٹھی اگرچہ وہ براہِ راست مغربی سامراج کے غلام نہیں ہوئے تھے لیکن شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تجدیدِ دین واحیائے اسلام کے لئے جو تحریک اٹھی تھی وہ بھی بیعت کی بنیاد پہ ــــ پھر میرے نزدیک ان تمام تحریکوں میں سب سے عظیم تحریک، دورِ صحابہ سے مماثلت میں قریب ترین تحریک وہ تحریک تھی جسے ہم تحریکِ شہیدین کے نام سے جانتے ہیں ــــ اس کی بنیاد بھی بیعت پہ ــــ اس تحریک میں کم از کم مجھے دَورِ نبوّت کا نقشہ نظر آتا ہے۔ جیسے حضورؐ نے

بہت سی بیعتیں لی ہیں جن کا ذکر احادیث میں ملے گا۔ یہاں تک کہ سننِ نسائی میں حضرت جریرؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضورؐ سے ہر مسلمان کی خیر خواہی کے لئے بیعت کی: عن جریرؓ قال بایعت رسولؐ اللہ علی النصح لکلِّ مسلم۔ بیعت عقبہ اولیٰ، بیعتِ عقبہ ثانیہ، بیعتِ رضوان کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک روایت جو متفق علیہ ہے۔ مزید سن لیجئے - قال کنا اذا بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ یقول لنا فیما استطعتم "جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ ہم سے فرماتے کہ جس چیز کی تم طاقت رکھو"۔ معلوم ہوا کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف امور کے لئے صحابہ کرامؓ سے بیعتیں لی ہیں۔ یہی نقشہ آپ کو تحریکِ شہیدین میں ملے گا۔ بیعتِ ارشاد بھی ہے، بیعتِ جہاد بھی ہے۔ بیعتِ اتباعِ شریعت بھی ہے اور آخری بیعت وہ تھی جو اس آخری وقت لی گئی جب انتہائی نامساعد حالات تھے۔ نہ راشن ہے، نہ اور ساز و سامان ہے گویا کہ مشہدِ بالاکوٹ کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس وقت سید صاحبؒ نے آخری بیعت لی تھی کہ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ ہر شخص اپنے ساتھی بھائی کو اپنے اوپر ترجیح دے گا اور مقدم رکھے گا: یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ ط۔ اس بیعت سے معذرت کی شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس عذر کی بنیاد پر کہ "میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے قویٰ کمزور پڑ گئے ہیں۔ میں اس بیعت کا حق ادا نہیں کر سکتا"۔

ذہن میں رکھئے کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کون ہیں۔ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا پوتا۔ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کا بھتیجا۔ شاہ عبدالغنیؒ کا لختِ جگر۔ علم کا پہاڑ۔ "عبقات" کا مصنّف، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس دور کے جو فارغ التحصیل علماء ہیں ان کے نوّے فیصد حضرات اس کتاب کو سمجھنا تو درکنار، صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ منصبِ امامت جیسی کتاب کا مصنّف۔ تقویۃ الایمان جیسی کتاب کا مصنّف۔ کس کے ہاتھ پر بیعت کی جوانؒ کے مقابلہ میں علم میں ان کا پاسنگ نہیں۔ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جلالتِ شان کے باوجود علم میں شاہ اسمٰعیلؒ کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ عمر میں چھوٹے، چھ سال کا فرق۔ شاہ اسمٰعیلؒ چھ سال

بڑے ہیں سیّد صاحب سے ــــ میں نے ابھی حال ہی میں کراچی میں تحریکِ شہیدین پر ایک تقریر کی ہے۔ لہٰذا چند کتابوں سے مراجعت کی تو پہلی مرتبہ میرے علم میں آیا کہ سیّد صاحبؒ شاگرد بھی ہیں شاہ اسمٰعیلؒ کے ــــ بعض کتابیں انہوں نے شاہ صاحبؒ سے پڑھی ہیں۔ وہ نسبت بھی ہے لیکن یہ کہ اس اللہ کے بندے نے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے بعد جو نباہ کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ یہ ہمارے ماضی قریب کی تاریخ ہے۔ قریباً ڈیڑھ سو صدی قبل کی بات ہے ــــ سیّد صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاریخ کا (LONGEST MARCH) کیا ہے۔ ماؤزے تنگ کا مارچ اس کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے!۔ وہ جو ہجرت کی ہے اور رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہ کو چھوڑا ہے اور ندی کو پار کیا ہے تو دو نفل شکرانے کے ادا کئے ہیں کہ اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے اپنے دین کے لئے ہجرت کی توفیق عطا فرمائی اور پھر کہاں سے کہاں!۔ رائے بریلی سے گوالیار۔ گوالیار سے ٹونک' وہاں سے جیسلمیر وہ عمرکوٹ جہاں اکبر پیدا ہوا تھا۔ پھر وہاں سے حیدرآباد ــــ پھر پیر جی گوٹھ پیر پگاڑا صاحب کی بستی۔ وہاں سے شکارپور۔ پھر درّہ بولان کراس کر کے کوئٹہ پھر قندھار ہوتے ہوئے کابل اور وہاں سے پشاور ــــ

یہ باتیں اس وقت میرے موضوع سے متعلق نہیں ہیں۔ تحریک شہیدین کی بات چلی تو یہ باتیں بھی زیرِ گفتگو آگئیں۔ اس وقت مجھے جو عرض کرنا تھا وہ یہ کہ یہ عظیم الشان تحریک بیعت کی بنیاد پر اٹھی ــــ اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ یہ نہ سمجھئے کہ بالاکوٹ کے مقام پر ان قائدینؒ اور ان کے نیک ساتھیوں کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم ہوگئی اور اس کے کچھ اثرات نہیں رہے۔ معاذ اللہ ــــ اس کے بعد بھی اس تحریک کے بنگال میں، بہار میں، یوپی میں، جنوبی ہند میں باقیات الصالحات پھیلے ہیں اور انہوں نے وہاں دعوت و تبلیغ کا کام کیا ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے۔ بالاکوٹ میں دنیوی اور ظاہری نقطۂ نظر سے تحریک ناکام ہوئی ہے تو یہ نہ سمجھئے کہ اس کے اثرات بھی ختم ہوگئے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کا قیام، اس کے علمائے حق، یہ اسی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ اسی دیوبند کی ایک عظیم ترین شخصیت ہیں شیخ الہند مولانا محمود حسن

دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ ــــ یہاں تک اس بیعت کا تار نہیں ٹوٹا چل رہا ہے۔
مولانا عبید اللہ سندھیؒ آخر شیخ الہند کے ساتھ کسی عہد میں بندھے ہوئے تھے کہ ادھر حکم ہوا ادھر یہ اپنا گھر بار چھوڑ کر افغانستان نکل گئے ــ اگر اسی مسئلہ پر ہمارے یہاں باقاعدہ تحقیق ہو تو مجھے یقین ہے کہ بہت سی اہم باتیں جن پہ ماضی کا پردہ پڑا ہے، منظر عام پہ آجائیں۔ میں نے جب مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق یہ روایت "میثاق" کے اکتوبر ۷۵ء میں شائع کی تھی کہ جمعیت العلماء ہند کے ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں حضرت شیخ الہندؒ کے ایماء پر مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ مولانا آزاد مرحوم کو امام الہند مان کر تمام علماء ان کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کریں۔ لیکن مولانا معین الدین اجمیری مرحوم کے ایک اصولی اعتراض کی وجہ سے اس پر عمل نہیں ہوا (یہ مضمون میں نے علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں طبع کرالیا ہے اور آج حاضرین میں ہدیۃً تقسیم ہوجائے گا)[۱] اس پہ کراچی سے ڈاکٹر احمد کمال صاحب کا خط آیا جس میں اس بات کو خلافِ واقعہ بتایا گیا تھا ۔ لامحالہ مجھے پھر معاملہ کی تحقیق کرنی پڑی جس کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ میں نے جس روایت کا حوالہ دیا تھا وہ بالکل صحیح تھی ۔ اس میں صرف سن کے تعین میں تسامح ہوگیا تھا ۔ یعنی یہ اجلاس ۲۲ء میں نہیں ۲۱ء میں منعقد ہوا تھا ۔ بہر حال یہ تمام بحث پمفلٹ کے مطالعہ سے آپ کے سامنے آجائے گی ۔ اس تحقیق کے دوران اور بھی عجیب عجیب انکشاف ہوئے ۔ مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ خیر آبادی مکتب فکر کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آخری شخصیت لیکن میرے نزدیک اس مکتبہ فکر کی آخری شخصیت مولانا اجمیریؒ کے شاگردِ رشید مولانا منتخب الحق صاحب ہیں جو بفضلہٖ تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں ۔ ان کے بعد شاید منطق و فلسفہ قدیم کا یہ مکتبِ فکر ختم ہو جائے۔
مولانا اجمیریؒ کے متعلق مولانا منتخب الحق صاحب مدظلہٗ نے مجھے بتایا کہ مولاناؒ اپنی لائبریری کی الماریوں کی چابیاں کتابوں کی صفائی کے لئے اکثر کسی نہ کسی شاگرد کو دے دیا کرتے تھے ۔ لیکن ایک الماری ایسی تھی کہ جس کی چابی وہ اپنے شاگردوں

---

[۱] یہ پمفلٹ ۵۰ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر مکتبہ سے ہدیۃً طلب کیا جاسکتا ہے ۔ (مرتب)

میں کبھی کسی کو نہیں دیتے تھے۔ مولانا منتخب الحق صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ ایسی چوک ہوئی کہ انہوں نے اس کی چابی مجھے دے دی کہ ذرا اس الماری کی کتابیں وغیرہ صاف کر لو۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ اس میں ان لوگوں کے نام اور پتے درج تھے جو مولانا مرحوم کے ہاتھ پر انگریز کے خلاف بیعت جہاد کئے ہوئے تھے۔ اس دور میں یہ چیز کہاں ہے۔! نہ معلوم ہندوستان میں کتنے علماء ہوں گے جنہوں نے اسی طرز پر بیعتِ جہاد لی ہوگی۔ لیکن یہ کہ کوئی مرحلہ آئے تو بات سامنے آئے۔ مناسب جمعیت فراہم ہو تو اس کا آگے ظہور ہو۔

میں اب جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی وہ کوشش جو حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی زندگی کا چراغ گل ہونے سے چند یوم قبل کی تھی کہ یہ تار نہ ٹوٹنے نہ پائے۔ یہ کوشش ۱۹۲۰ء کے جمعیت العلماء ہند کے اجلاس میں جو دہلی کی جامع مسجد میں منعقد ہوا تھا کی گئی تھی دیے سے دیا جلتا رہے۔ چراغ سے چراغ روشن ہوتا رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی کوشش یہ تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ وہ امام الہند مانے جائیں اور پھر جہاد کیا جائے۔ میں نے مولانا معین الدین اجمیریؒ کا ذکر پہلے کر دیا۔ میرے دل میں ان کا بڑا احترام ہے۔ علمی وجاہت کے اعتبار سے بھی اور اس لئے بھی کہ وہ خود اپنی جگہ بیعتِ جہاد لے رہے تھے۔ لیکن مسئلہ درپیش تھا کہ تمام علمائے ہند کی طرف سے بیعت کی جائے۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ اس لئے کہ اس وقت جمعیت علمائے ہند کا پلیٹ فارم صرف علمائے دیوبند کا نہیں تھا۔ وہ تو مشترک پلیٹ فارم تھا۔ اس میں اس وقت فرنگی محل کے علماء بھی تھے، اس میں بدایون کے علماء بھی تھے اس میں بریلی مکتبِ فکر کے علماء بھی تھے۔ مجھے تو یہ واقعہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور نے سنایا تھا۔ اور انہوں نے یہ واقعہ مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم کے برادرِ بزرگ مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم سے سنا تھا جو اس اجتماع میں بنفسِ نفیس موجود تھے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور کے نام کا ذکر آ گیا ہے۔ بہت سے احباب نے مجھے یاد دلایا تھا کہ ان محاضرات میں ان کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوا حالانکہ

ہماری تمام قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کی ایک نشست کی وہ رونق ہوا کرتے تھے، بلا استثنا ــــ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور بہت کچھ حاصل کیا ہے ــــ بہرحال وہ اللہ کے حضور حاضر ہو چکے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ جذبات میں آکر وہ کبھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کر جاتے تھے، اس کو علیحدہ رکھ کر میں نے ان سے زیادہ سچا آدمی اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا کسی شے کا خوف ان کو نہیں تھا۔ اور سچ کہنے سے کوئی باک نہیں تھا۔ کبھی انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ میری اس بات سے کون ناراض ہوگا اور کس کی تیوری پر بل چڑھ جائیں گے۔ جو بات کہی ہے سچ سمجھ کر کہی ہے ــــ ہوسکتا ہے کہ آدمی مغالطہ میں ہو یہ دوسری بات ہے ــــ لیکن ہمیشہ بات وہی کہی ہے جو ان کے نزدیک حق ہو ــــ ان کے انتقال پر ہمارے یہاں جو کچھ ہوا ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے ــــ ایکٹر مر جائیں تو اخبارات کے صفحے کے صفحے میں کالے نہیں کہہ رہا رنگین ہو جاتے ہیں اور خصوصی ایڈیشنوں کی مسابقت شروع ہو جاتی ہے لیکن وہ درویش ایسے گیا ہے کہ جیسے پتہ نہیں۔ میرا خیال یہ تھا کہ ان کے جنازے پر لاہور ٹوٹ پڑے گا لیکن جب وہاں جا کر جو حال دیکھا ہے سو دیکھا ہے۔ چند لوگ نمازِ جنازہ کے لئے۔ پانچ صفیں بھی مشکل سے بنی تھیں۔ وہ بھی طاق تعداد بنانے کی خاطر ــــ

بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ وہ جو کوشش تھی اور بات یہ آگئی تھی کہ اس وقت جمعیت علمائے ہند کا پلیٹ فارم مشترک تھا۔ اہلِ حدیث حضرات سن لیں کہ اس وقت کوئی جمعیتِ اہلِ حدیث نہیں تھی۔ اہلِ حدیث علماء بھی اسی میں شامل تھے۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم و مغفور اس اجلاس میں شریک تھے ــــ

جب مولانا آزاد مرحوم کو امام الہند بنانے اور ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کرنے کی تحریک پیش ہوئی تو مولانا معین الدین اجمیری مرحوم کھڑے ہوگئے۔ اور انہوں نے ایک بات کہی ــــ انہوں نے تجویز کی مخالفت نہیں کی۔ اسے مخالفت نہیں کہا جاسکتا ــــ مولانا اجمیری مرحوم نے کہا کہ اتنا بڑا فیصلہ اچانک مجمع عام میں نہیں ہونا چاہیئے اس سے پہلے اس تجویز پر مجلس شوریٰ یا جو بھی ان کا نظام تھا،

اس میں اس پر غور ہونا چاہیے ـــــ بات اتنی وزنی تھی کہ اس کو رد کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ـــ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جو پہلے اصل تجویز کی تائید کر چکے تھے انہوں نے بھی مولانا اجمیری مرحوم کی بات کی تائید کی اور اس وقت اصل تجویز مجلسِ شوریٰ کے سپرد کر دی گئی ـ چند اور باتیں بھی ہیں جو آپ کو اس پمفلٹ سے معلوم ہو جائیں گی ـ اسے گھر جا کر پڑھیئے گا ـــــ اس اجلاس کے دس روز بعد حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال ہو گیا ـ بہرحال اس تجویز کے پیچھے جو اصل قوت تھی جو اس تار کو جوڑے رکھنا چاہتی تھی اور جو ہندوستان گیر پیمانے پر بیعتِ جہاد کی تجدید و تحریک کی آرزو مند تھی وہ دنیا سے رخصت ہو گئی اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ ـــــ مولانا سعید الرحمٰن صاحب علوی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک مضمون کے ذریعہ حضرت شیخ الہندؒ کے یہ الفاظ ہم تک پہنچا دیئے کہ یہاں تک ان کا حال تھا کہ وہ فرماتے ہیں کہ " میں بیعت کئے بغیر مرنا نہیں چاہتا ـ میری چارپائی اسٹیج پر لے جاؤ " اس لئے کہ اٹھنے کی تو پوزیشن ہی نہیں تھی ـ اس اجلاس کا ان کا خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھ کر سنایا تھا ـ انہیں ایام میں جب حضرت شیخ الہندؒ علی گڑھ یونیورسٹی گئے تھے تو پالکی میں لٹا کر انہیں وہاں پہنچایا گیا تھا ـ اور چارپائی پر لیٹے لیٹے انہوں نے نہایت دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ علی گڑھ کے طلبہ کو ان کا دینی فرض یاد دلایا تھا ـــــ لیکن یہ ان کے اندر جو جذبہ تھا وہ ان سے یہ کام کرا رہا تھا ـ جسم تو بالکل گھل چکا تھا ـ ٹی بی آخری اسٹیج کو پہنچ چکی تھی جبھی تو انگریز نے انہیں مالٹا سے رہا کیا تھا اور ہندوستان بھیجا تھا ـ ورنہ رہائی کا کیا سوال تھا ـ

جب حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال ہو گیا تو وہ تجویز ٹھپ ہو گئی ـ وہ دن اور آج کا دن وہ تار ٹوٹا ہوا ہے ـــــ دو تار بیک وقت ٹوٹے ہیں ـ توجہ کیجئے گا ـــ ایک تار خلافت ٹوٹا ـــ آج ساٹھ برس سے زیادہ ہو گئے کہ کوئی صرف نام کا ادارہ بھی پورے عالم اسلام میں موجود نہیں ہے ـــ کہیں کوئی علامتی خلافت کا ادارہ بھی موجود نہیں ـــــ دوسرا تار بیعتِ جہاد کا ٹوٹا ـ میں پورے ادب و احترام لیکن نہایت دکھ اور رنج کے ساتھ عرض کرتا ہوں

کہ مجھے ایک طرف تو ان حضرات کے طرزِ عمل پر نہایت افسوس ہوتا ہے جو مدعی ہیں متبعِ سنّت ہونے کے اور ظاہر حدیث پر عمل کرنے کے ________
کیسی کیسی حدیثیں ہیں کہ جنہیں یہ حضرات گھول کر پی گئے۔ وہ انہیں نہ صحیح بخاری میں نظر آئیں نہ صحیح مسلم میں ـــــ رفع یدین کی احادیث، وہ بھی قولی نہیں عملی صحابہ کرام کی رپورٹ ہے، حضورؐ کا اپنا کوئی قول نہیں ـــــ اس پر معرکے ہیں۔ اس پر من دیگرم تو دیگری والا معاملہ ہے ـــــ یہ حدیثیں کہاں گئیں! ذرا سنئے تو سہی حضورؐ کا کا فرمان، قولی حدیث۔ رواہ مسلم عن عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما: قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: " حضرت عبدؓ اللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے"۔ مَنْ خَلَعَ یَدًا مِّنْ طَاعَۃٍ لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا حُجَّۃَ لَہٗ وَمَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً ۔ " جس نے ہاتھ کھینچ لیا امیر کی اطاعت سے تو وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے لئے کوئی عذر اور حجت نہیں ہوگی اور جو شخص مرا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا حلقہ نہ تھا بیعت کا قلادہ نہ تھا وہ جاہلیت کی موت مرا"۔ ایک اور حدیث بھی سن لیجئے اگرچہ وہ ایک دوسرے طریق سے میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں

عن جنادۃ بن ابی امیۃ قال وصلنا علی عبادۃ بن الصامت وھو مریض۔ قلنا اصلحک اللہ حدث بحدیث ینفعک اللہ بہ سمعتہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال دعانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعنا فقال فیما اخذ علینا ان بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا و مکرھنا وعسرنا ویسرنا واثرۃ علینا وان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان

میں کہتا ہوں کہ ہمارے صوفیوں کے لئے پھر بھی گنجائش ہے، ان کے لئے پھر بھی سہارا ہے کہ ہم نے بیعت کی ہوئی ہے اور بیعت لے بھی رہے ہیں بیعت ارشاد کے سلاسل تو جاری ہیں۔ لیکن یہ حضرات اس کے بھی قائل نہیں۔ وہ کہاں

کھڑے ہیں! یہ حدیثیں انہیں پکار رہی ہیں ـــــ دوسری طرف میں اسی اد واحترام لیکن رنج وافسوس کے ساتھ ان علمائے کرام سے عرض کرتا ہوں جو خ کو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے سلسلہ تلمذ سے وابستہ کہتے ہیں کہ یہ حضرا کس حال میں ہیں! حضرت شیخ الہندؒ کا یہ حال کہ بسترِ مرگ پر فرما رہے ہیں کہ میر چارپائی اسٹیج پر لے جاؤ، میں بیعت کئے بغیر مرنا نہیں چاہتا اور بیعت سمع وطاعت اور ہجرت وجہاد کس کے ہاتھ پر کرنے کے لئے آمادہ ہیں جو ان سے عمر کے لحاظ سے پینتیس یا چالیس سال چھوٹا ہے اور جو تقویٰ، طہارت اور علم وفضل کے اعتبار سے ان پاسنگ بھی نہیں ہے۔ ان کا ظرف اتنا وسیع ہے کہ برملا اعتراف فرمایا کرتے تھے کہ ا نوجوان یعنی ابوالکلام آزاد نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اسی لئے خود ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس امر کی کوشش فرماتے ہیں کہ جمعیت العلماء ہند ابوالکلام آزاد مرحوم کے ہاتھ پر من حیث الجماعت ان کو امام الہند تسلیم کرکے ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کرلے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ گزشتہ ڈیڑھ دو صدی قبل جو تحریکیں اٹھیں، وہ بیعت کی بنیاد پر اٹھیں۔ اس میں ایک استثناء ہے۔ اس کا ذکر یہاں مناسب ہوگا۔ مولا آزاد مرحوم نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لئے ایک جماعت کی ضرورت پر جو مدلّل مقالے لکھے تھے اس کے نتیجے میں اس وقت "حزب اللہ" کے نام سے ایک جماعت مولانا آزاد مرحوم نے قائم کی تھی لیکن وہ محدود رہی اور کوئی تحریک برپا نہ ہوسکی۔ ۱۹۲۰ء میں ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی شیخ الہندؒ کی تجویز روبعمل نہ آسکی جس کے اسباب میں بیان کرچکا ہوں۔ مولانا آزاد تو اس ناکامی سے بددل ہوکر اس کام سے دستبردار ہوگئے اور ان کی مساعی کا تمام تر میدان استخلاصِ وطن کی جولان گاہ بن گیا ـــــ آزاد مرحوم ہی کی فکر سے متاثر ہوکر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ومغفور کی دعوت پر ۱۹۴۱ء میں تجدید واحیائے دین کے لئے 'جماعتِ اسلامی' کا قیام عمل میں آیا[1]۔ اور یہ دستوری وآئینی طرز کی جماعت تھی۔ اس نے ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے بیعت کے مسنون طریقہ کو اختیار نہیں کیا ـــــ لیکن اسی دور میں مصر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے

---

[1] اگرچہ مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تحریک کا رشتہ اشارۃً وکنایۃً بھی مولانا آزاد مرحوم کی فکر سے نہیں جوڑا۔

شیخ حسن البنا شہیدؒ نے الاخوان المسلمون قائم کی تو اس کی بنیاد بیعت پر ہی رکھی۔ تنظیم اسلامی کی مجلسِ مشاورت نے اپنے رفیق ڈاکٹر تقی الدین صاحب کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ الاخوان المسلمون کے تنظیمی ڈھانچہ کے متعلق تحقیق کریں۔ چنانچہ انہوں نے اخوان سے متعلق بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ کراچی میں ان حضرات سے ملاقاتیں کیں جن کا قریبی تعلق اخوان سے رہا ہے تو معلوم ہوا کہ اس تنظیم کے تین درجے تھے جس میں سب سے اونچا درجہ وہ تھا جس سے وابستگی بیعت کی بنیاد پر ہوتی تھی ۔

اب میں کھل کر چند صاف صاف باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اچھی طرح جان لیجئے کہ اس دور میں جس سے ہم آج کل گزر رہے ہیں۔ یہ بیعت سمع و طاعت صرف دو طرح کی ہو سکتی ہے ۔ تیسرا کوئی امکان نہیں ہے۔ ایک یہ کہ اگر اسلامی نظامِ حکومت کہیں قائم ہے تو اس کے سربراہ سے بیعت ہو گی ۔ دوسرے یہ کہ اگر ایسا ہے تو جو جماعت جہاد یعنی انقلابی عمل کے ذریعہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے اٹھے گی اس کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہو گی ـــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں : لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ ـــ اور حضورؐ فرماتے ہیں : لَا جَمَاعَۃَ اِلَّا بِالْاِمَارَۃِ ـــــ اگر اسلامی نظام قائم ہے تو اس کا جو سربراہ ہے وہ صدر نہیں ہوا کرتا۔ وہ امیر المومنین ہے ۔ اس کے ہاتھ پر بیعت ہے ۔ اور اگر نہیں ہے تو اس کو قائم کرو ۔ یہ دو ہی شکلیں ہیں ۔ اسلامی نظام قائم کرنے کی جد وجہد کے لئے جماعت درکار ہے۔ اس جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہو گی۔ تیسری کوئی شکل ہے ہی نہیں ـــ کیسے ایک بندۂ مومن مر سکتا ہے بغیر بیعت کے ۔ یا اسلامی حکومت ہے ۔ اسلامی نظام ہے تو اس کے سربراہ کے ہاتھ پر بیعت ہے۔ ملک گیر پیمانے پر بیعت لینے کا نظام قائم ہو گا جیسا کہ خلافتِ راشدہ میں اور خلافت بنی امیّہ و بنی عباس میں قائم تھا ـــــ اگر نہیں ہے تو اس کو قائم کرنے والی جماعت کے ہاتھ پر بیعت ہے ـــ تیسری کوئی شکل ممکن نہیں لہٰذا ہر بندہ مومن پر لازم ہے ، واجب ہے ، فرض ہے کہ بیعت کا قلادہ اس کی گردن میں پڑا ہو ۔ اگر یہ نہیں ہے تو نبی اکرم کا فتویٰ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں آ چکا ہے جو مسلم شریف کی روایت ہے جس کے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ آتے ہیں : وَمَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ

مِثْنَۃٌ جاھلیّۃٌ

مناسب ہوگا کہ میں اس اشکال کا ذکر بھی کردوں جو لوگوں کو لاحق ہوتا ہے کہ آخر اس دور میں مسلمانوں کے خلاف قتال کیسے ہوگا! چونکہ عام طور پر مسلم اکثریت کے ممالک کے حکمران مسلمان ہی ہیں۔ بالکل عملی مسئلہ ہے اور یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو کتاب وسنّت کی روشنی میں رفع ہونا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اعتبارات سے مسلمانوں کا مسلمانوں سے قتال کا معاملہ یعنی مسلمان حکومت کے خلاف بغاوت کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ چاہے ملک میں اسلامی نظام رائج نہ ہو۔ کفّار کے مقابلہ میں قتال کا معاملہ دوسرا ہے۔ دو عوامل — ایسے ہیں کہ مسلمانوں کا کسی مسلمان حکومت کے خلاف بغاوت اور مسلمانوں کا آپس میں قتال خارج از بحث ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ اگرچہ مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب یہاں تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے گذشتہ محاضرات میں جو مقالہ پیش کیا تھا جو ''میثاق'' کے جنوری ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے مستند حوالہ جات سے بتایا تھا کہ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ کسی فاجر و فاسق مسلمان حکومت کے خلاف خروج اور بغاوت حرام مطلق نہیں ہے۔ البتہ اس کے لئے نہایت کڑی شرائط ہیں۔ یہ پوری ہوجائیں تو خروج کیا جاسکتا ہے لیکن مسئلہ علمی ہے۔ دقیق ہے۔ باریک ہے۔ اہلِ علم اس پر غور کرکے کوئی حتمی رائے قائم کریں۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس جدید دور کے حالات کو سمجھئے۔ ممکن اس لئے نہیں ہے کہ عوام اور حکومت کے درمیان طاقت کا بہت بڑا فصل ہے۔ کوئی نسبت بنتی نہیں۔ آخر قرآن مجید نے بھی کوئی نہ کوئی نسبت تو قائم کی ہے ——

—— آخر بدر میں بھی ایک اور تین تھے۔ احد میں ایک اور چار تھے۔ لیکن جب 'موتہ' میں ایک اور تینتیس[۳۳] کی نسبت ہوگئی تو جو نتیجہ نکلا وہ آپ کو معلوم ہے۔ زید بن حارثہ شہید، جعفر طیار ابن ابی طالب شہید، عبد اللہ ابن رواحہ شہید۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس نرغے سے بقیہ لشکر کو نکال کر لے آئے۔ یہ بھی بڑی کامیابی ہے۔ اب جو معاملہ ہے وہ ایک اور تینتیس کیا، ایک اور تینتیس سو سے بھی زیادہ ہے۔ چونکہ عوام بالکل نہتے اور حکومت کے پاس فوج کی جو طاقت ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ دوسری اہم بات کیا ہے! اصل میں تمدن میں جو

ارتقا ہوا ہے۔ بعض لوگ اسے بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ دور وہ نہیں ہے جس میں عمرانی اور تمدنی مسائل ابھی (DEVELOP) نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت کیا تھا؟ حکومت بدلنے کا ارادہ کرنا بھی بغاوت تھا۔ اور آج حکومت کو بدلنا، اس کو بدلنے کی کوشش کرنا عوام کا مسلّمہ حق ہے۔ زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا۔ اس لئے کہ اس وقت تک ابھی ریاست اور حکومت ——— کے درمیان فرق و امتیاز نہیں تھا۔ اُس دور میں تصوّر یہ تھا کہ ریاست اور حکومت ایک ہے۔ لہٰذا حکومت کے خلاف اقدام گویا کہ ریاست کے خلاف اقدام شمار ہو جاتا تھا۔ آج تو مشرق و مغرب کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ ریاست اور شے ہے حکومت اور شے ہے۔ ہم کسی حکومت کے وفادار نہیں ہیں۔ ہماری وفاداری ریاست کے ساتھ ہے اور حکومت کو بدلنا جمہور کا حق ہے۔ لہٰذا زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تبدیلی صرف بغاوت ہی کے ذریعہ آسکتی ہے، وہ لوگ تمدن میں جو فرق واقع ہو چکے ہیں، ان کو نظرانداز کرتے ہیں۔ ایک اور اہم بات۔ وہ یہ کہ اس دور میں دنیا میں ایک تصوّر (CONCEPT) مضبوط بنیادوں پر استوار ہوا ہے جس کی کامیابی کے مظاہر آپ کو ہر چہار طرف نظر آرہے ہیں۔ وہ تصوّر یہ ہے کہ عوام کو کسی بھی مطالبہ کے لئے پُرامن مظاہرہ کا حق ہے۔ عوام اپنے سیاسی حقوق کے لئے مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ وہ اگر حکومت کے کسی اقدام یا فیصلے کو غلط سمجھتے ہیں تو اس کے خلاف مظاہرہ کر سکتے ہیں لیکن نظم و ضبط میں رہیں ——— اور مظاہرہ کریں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ سورۂ توبہ میں آیت ۱۱۱ کے بعد جو آیت نمبر ۱۱۲ ہے وہ بڑی عظیم آیت ہے۔ اس میں ایک طرف تو وہ ظاہری اور باطنی اوصاف بیان ہو گئے جو ایک بندۂ مومن کی سیرت میں درکار ہیں۔ بڑی دلکش اور عجیب ہے یہ آیت ——— اس میں تین تین اوصاف کے تین سیٹ ہیں۔ ایک طرف وہ چھ اوصاف بیان ہوئے جو ایک بندۂ مومن کی زندگی میں انفرادی سطح پر مطلوب ہیں۔ دوسری طرف ایک مسلم معاشرے کا فرد ہونے کے اعتبار سے ایک بندۂ مومن پر جو اجتماعی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے اس کے لئے جو اوصاف چاہئیں وہ بیان ہو گئے۔ وہ بھی تین ہی بیان ہوئے۔ فرمایا:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ ۔

"(یہ مومنین جنہوں نے جنت کے عوض اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے) اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے ہیں۔ عبادت گزار ہیں، اس کا شکر ادا کرنے والے، اس کی ثنا کرنے والے ہیں۔ اس کے (دین) کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے ہیں اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے ہیں۔"

چھ اوصاف تو یہ ہو گئے۔ آگے جو تین اوصاف آرہے ہیں وہ بڑے غور اور توجہ کے متقاضی ہیں

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ

"نیکی کا حکم دینے والے ہیں۔ بدی سے روکنے والے ہیں اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ جو بندۂ مومن اللہ سے بیع و شراء کا معاملہ کرتا ہے، وہ ان اوصاف کا حامل ہوتا ہے ـــــ ان آخری اوصاف میں کلید ہے اس سارے مسئلہ کی ـــــ ایک مسلمان حکومت میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے جو انقلابی جماعت میدان میں آئے گی وہ اس بنیاد پر آئے گی کہ صرف امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تحفظِ حدود اللہ کا فریضہ انجام دے۔ فلاں شے منکر ہے۔ ہم اسے نہیں ہونے دیں گے۔ اگر ہمارے پاس عوامی تائید کی طاقت ہے تو ہم چیلنج کریں گے کہ یہ اسلام کے خلاف کام ہے ہم اسے نہیں ہونے دیں گے اور اسی میں مسئلہ کا حل موجود ہے۔ وہ چیزیں جو سب کے نزدیک منکر ہیں۔ جو بریلوی ہیں، وہ بھی مانتے ہیں کہ بے حیائی، نیم عریانی، تبرّج جاہلیہ، مرد و عورت کے سارے مخلوط طور طریقے منکر ہیں۔ جو دیوبندی ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ تمام کام منکر ہیں، اہلِ حدیث ہیں ان کو بھی ان کے منکر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہی وہ چیز ہے کہ جو تمام فقہی اختلافات کے باوجود لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے گی ـــــ میں پرسوں آپ کو وہ حدیث سنا چکا جو مسلم شریف کی روایت ہے اور اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ وہ کہتے ہیں کہ

حضورؐ نے فرمایا: ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہ قبلی الا کان لہ فی امتہ حواریون واصحاب یأخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ" مجھ سے پہلے اللہ نے جس نبی کو اس کی اپنی امّت میں مبعوث فرمایا تو اس نبی کی امّت میں اس کے ایسے حواری اور اصحاب ہوتے تھے جو اپنے نبی کی سنّت کو تھامے رکھتے تھے اور اس کے حکم کی اطاعت کرتے تھے" ثم انہا تخلف من بعدھم خلوف " ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آجاتے تھے جو نالائق ہوتے تھے" یقولون مالا یفعلون و یفعلون مالا یؤمرون " جو کہتے تھے، اس پر عمل نہیں کرتے تھے اور ایسے کام کرتے تھے جن کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا " اب حدیث کا اگلا حصہ غور سے سماعت فرمائیے۔ حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں: فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن ولیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل ۔
تو ایسے لوگوں سے جو شخص ہاتھ یعنی قوت و طاقت سے جہاد کرے تو وہ مومن ہے۔ اور جو شخص زبان سے جہاد کرے تو وہ مومن ہے اور جو شخص دل سے جہاد کرے یعنی دل میں کڑھے، اس کی نیندیں حرام ہو جائیں۔ وہ اپنی بے بسی پر مضطرب اور بیکل رہے تو وہ بھی مومن ہے اور اگر ان تینوں حالتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔" وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ ــــ اس حدیث میں "ھُمْ" کی ضمیر مفعولی انتہائی قابلِ غور ہے۔ نبی اکرمؐ ان ناخلف جانشینوں کے خلاف جہاد کی تاکید فرما رہے ہیں جو مسندِ اقتدار پر بیٹھ کر منکرات کو فروغ دے رہے ہوں۔ جن کے عمل، جن کے طور طریقے، جن کا وطیرہ منکرات پر مشتمل ہو۔ جو ذرائع ابلاغ کو منکرات کی تشہیر و اشاعت کے لئے استعمال کر رہے ہوں۔ ان کی سرپرستی کر رہے ہوں اور ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کرنے کا باعث بن رہے ہوں کہ اس میں معروفات سسک رہے ہوں اور منکرات فروغ پا رہے ہوں۔ معاشرہ جن کی بدولت سنڈاس بن گیا ہو ــــ ان حالات میں اگر مسلمان منکرات کے خلاف ہاتھ سے یا زبان سے یا دل سے جہاد نہ کرے تو الصادق والمصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے ایمان کی نفی فرمائی ہے۔ منکرات کے خلاف ایک بندۂ مومن کا صحیح طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے

اسے ایک اور حدیث سے بھی سمجھ لیجئے جس کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:

من رأى منكم منكراً فليغيره بيده وان لم يستطع فبلسانه

وان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان

"جو کوئی تم میں سے برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ یعنی طاقت سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے برا کہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا جانے۔ اس پر دلی کرب محسوس کرے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

اس حدیث کے آخری ٹکڑے میں دوسری روایت میں وہی الفاظ آئے ہیں جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ: "وَلیس وراءَ ذٰلک من الایمان حبّۃُ خردلٍ" — یہ ہے ہمارے دین میں منکرات کے خلاف جہاد کی اہمیت۔ اگر صورتِ حال یہ ہو کہ ایک مسلمان نہ ہاتھ سے، قوت سے بُرائی کو بدلنے کی اجتماعی جدوجہد کا اپنے اندر داعیہ رکھتا ہو۔ نہ بُرائی کو بُرا کہنے کی ہمت پاتا ہو اور نہ ہی برائی کے خلاف اپنے دل میں کرب اور اضطراب اور نفرت و کراہیت کے جذبات رکھتا ہو تو ایسے شخص کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیئے۔ فضائل کے بیان کی بھی اہمیت ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ اس کے ذریعہ کچھ لوگ انفرادی طور پر نکوکار بن جائیں گے لیکن معاشرہ بحیثیت مجموعی ہرگز تبدیل نہیں ہوگا جب تک منکرات کے خلاف جماعتی سطح پر منظم جدوجہد اور جہاد نہ ہو۔

اگر جمعیت فراہم ہو جائے۔ تعداد بھی معتدبہ ہو۔ پھر وہ منظم ہو۔ تربیت یافتہ ہو تو اس دور میں منکرات کے استیصال اور معروفات کی ترویج کے لئے جہاد کی اور موجودہ دور کی اصطلاح کی رو سے انقلابی عمل کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ اسلامی نظام قائم ہوگا اور نہ کوئی صالح تبدیلی رونما ہوگی — خالصتہً رضائے الٰہی کے حصول کیلئے ایسے با اصول اور جذبۂ قربانی سے سرشار لوگوں کی طاقت فراہم ہو جائے تو کسی منکر کو چیلنج کیجیے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ منظم قوت ہونی ضروری ہے۔ ہمیں حکومت ہرگز درکار نہیں۔ نہ حکومت کا کوئی منصب ہم کو چاہیئے۔ ہم صرف آخرت کے طالب ہیں: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا

نَسَادًا ــــ انتخابات کی طرف ہم کبھی جائیں گے بھی نہیں ۔ ہم ان مناصب پر تھوکتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں ان کی پرکاہ کے برابر بھی کوئی حیثیت نہیں ـــ لیکن ہم اس پر عمل کرنے کی کوشش میں جان کی بازی لگانا اپنے لئے سعادت سمجھیں گے : وَالْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ ۔ ہمارا کام اور ہماری ذمّہ داری یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں اور حدود اللہ کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے خود کو پیش کریں ۔ اس آیت میں وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ فرما کر گویا اسلام کے پورے نظامِ حیات کو بالفعل قائم کرنے کی ذمّہ داری بھی عائد کر دی گئی ہے ۔ اس فریضہ کو انجام دینے کی جدوجہد کرنے والوں کے لئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ ان مؤمنین صادقین کے لئے آخرت میں فوز و فلاح کی بشارت ہے ـــــ

اس سارے مسئلہ کی کلید سورۂ توبہ کی اس آیت میں موجود ہے اگر سیاسی حقوق کیلئے مظاہرہ ہو سکتا ہے تو دین نے جن کاموں کو منکرات قرار دیا ہے۔ ان کو چیلنج کیوں نہیں کیا جا سکتا ! ہماری دینی قوتیں جو منتشر ہیں وہ اسی انتخابی سیاست کی وجہ سے منتشر ہیں ۔ ہر ایک اپنی بھیڑوں کو سنبھالنے کی فکر میں ہے تاکہ جب الیکشن کا مرحلہ آئے تو ہمارے ووٹوں کی تعداد سب سے زیادہ رہے ۔ اسی لئے فقہی اختلافات کو زیادہ ہوا دی جاتی ہے اور باقاعدہ فرقہ واریت پیدا کر کے امّت کی وحدت کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اپنی اپنی بھیڑوں کے گلّے علیحدہ علیحدہ رہیں (IDENTIFIED) رہیں ۔ ممیز رہیں ۔ کہیں گڈمڈ نہ ہو جائیں لیکن انقلابی عمل کے مطابق کام ہو گا تو یہ ساری تقسیمیں ختم ہو جائیں گی ۔ اس لئے کہ ان منکرات کے بارے میں کسی کے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

میں آج سوچ رہا تھا کہ کاش کبھی وہ وقت آئے کہ ہم ایک الٹی میٹم دیں کہ ہم ملک میں کسی عورت کی تصویر چھپنے نہیں دیں گے ۔ کیا یہ دین کے اعتبار سے جائز ہے جو ہو رہا ہے کہ عورت کو ایک اشتہاری جنس بنا رکھا ہے ۔! اخبارات کو دیکھ لیجئے ۔ اشتہارات کو دیکھ لیجئے ، مختلف مصنوعات کو دیکھ لیجئے ــ پھر کسی اور مسئلہ کو لیجئے ، منکرات کی ترویج کی کوئی حد ہی نہیں ہے لیکن اس کے لئے شرط ہے اجتماعی منظّم قوّت : وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ۔ اس کے لئے وہ جمعیت درکار ہے ۔ جو ایک کمانڈ پر حرکت (MOVE) کرے ۔ وہ اتنی منظّم ہو کہ اگر وہ سڑکوں پر مظاہرہ

کے لئے آئے تو پوری ذمہ داری لے سکے۔ اس کا جلوس نکلے تو اس میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ گڑبڑ کرنے والوں کے ہاتھ روکنے کا پورا انتظام ہو۔ یہ نہیں کہ جلوس تو ہم نے نکالا ہے لیکن کچھ اور لوگ آگئے ہیں۔ انہوں نے گڑبڑ کی ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ آپ کی تنظیم نہیں۔ آپ کی جماعت نہیں۔ آپ لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں۔ آپ کا اندرونی نظم و ضبط اس قدر مستحکم ہو کہ یہ گارنٹی دی جا سکے کہ اگر ہم جلوس نکالیں گے تو جو کچھ ہو گا اس کے ہم ذمہ دار ہوں گے۔ اس کام کے لئے ہجوم درکار نہیں ہے۔ یہ بڑا مبارک اور احسن کام ہے۔ اس میں کامیابی بھی اجر و ثواب کا باعث ہے اور رہی ناکامی تو اللہ کے دین کی راہ میں جان دینے سے بڑی کسی سعادت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ـــــ

بہرحال اس جہاد یا انقلابی عمل کے لئے جو جماعت درکار ہے۔ اس کے اوصاف امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما کی اس حدیث کے حوالے سے سمجھئے جس کے راوی ہیں حضرت حارث بن اشعری رضی اللہ عنہ۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا: ـــــ

آمرکم بخمس بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجہاد فی سبیل اللہ

میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، التزام جماعت کا، سمع و طاعت کا، اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔

ایک دوسری روایت میں امرکم بخمس کے بعد الفاظ آئے ہیں: اللہ امرنی بھن " اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔

یہ ہے میری پرسوں کی گذارشات کا تکملہ اور تتمہ ـــــ دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت۔ یہ ہے جہاد بالقرآن۔ اگلے سارے مراحل ایک منظم جماعت کے ساتھ حق کے قیام کے لئے عملاً جدوجہد، کشمکش۔ باطل سے تصادم۔ اپنے اقتدار کے لئے نہیں۔ حصولِ حکومت کے لئے نہیں۔ صرف اللہ کے دین کے لئے ؛ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ط ـــــ یہ ہے اس دور کی اصل ضرورت۔ بدقسمتی سے ۱۹۲۰ء میں اس کے لئے جو آخری کوشش ہوئی تھی، وہ ناکام ہوئی۔ اس کے بعد سے یہ تار ابھی تک

ٹوٹا ہوا تھا۔ اس دوران میں صرف ایک بیعت ہوئی ہے لیکن وہ جزوی تھی۔ صرف فتنۂ قادیانیت کے استیصال کے لیے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو امیرِ شریعت کا درجہ دے کر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئی ہے اور اس بیعت کرنے والوں میں کون کون شامل تھے! یہیں وقت حضرت مولانا انور شاہ کشمیری بھی ان میں شامل تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ — شاہ بخاریؒ کا اپنا خلوص و اخلاص اور قربانی و ایثار اپنی جگہ لیکن جہاں تک علم کا تعلق ہے تو شاہ بخاریؒ کو شاہ کشمیریؒ سے پاسنگ کی نسبت بھی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی شاہ کشمیریؒ، شاہ بخاریؒ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں —

بہرحال میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے مخالفانہ رنگ کے باوجود اس تعؑ نے مجھے تنظیم اسلامی بیعت کے مسنون طریقے پر قائم کرنے کی ہمت دی۔ ایک انجمن ہے اس کے متعلق گفتگو پرسوں والی تقریر میں ہو چکی ہے لیکن میں نے جب انجمن قائم کی تھی تو اسی وقت اس کے دیباچہ میں لکھ دیا تھا کہ یہ میری آخری منزل نہیں ہے۔ یہ پہلا قدم ہے۔ میرا اصل ہدف ایک 'جماعت' قائم کرنا ہے اور اس کی تشکیل کے ۱۹۶۷ء میں نے بیعت کا تصوّر اسی وقت دے دیا تھا ۱۹۶۷ء کی میری تحریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے لیکن تنظیم اسلامی میں بیعت کا نظام اختیار کرنے کے بعد کچھ عرصہ یہ بات زبان پر لاتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ طاری رہی — اور جب یہ بات میں نے انشراحِ صدر کے ساتھ ببانگِ دہل کہی تو نہ جانے کہاں کہاں سے صدائیں اٹھیں ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کوئی رسالے میں لکھ رہا ہے اور حکومت کو اشارے کر رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بغاوت ہے۔ کچھ علماء بھی اس میدان میں آ گئے اور بیعت کے خلاف اخباری بیانات جاری ہو گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان علماء سے رجوع کرنے کی ہمت اور توفیق اس تعؑ نے مجھے عطا فرمائی۔ اور مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ کو اللہ تعالیٰ نے کلمۂ حق کہنے کی جرأت عطا فرمائی۔ کیوں؟ خلیفہ مجاز کس کے ہیں اس بطلِ حریت اور پیکرِ تقویٰ و طہارت

کے جن کا نام ہے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ـــ مولانا حامد میاں نے برملا کہا کہ یہ بیعت جہاد ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس میں افضل مفضول کے ہاتھ پر بیعت کر سکتا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے مثالیں بھی دیں۔

بہرحال میں نے کوشش کی ہے کہ اس دعوت اور تحریک کا ایک خاکہ آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔ آگے ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے ـــ میں نے اپنے طور پر تحقیق و تفتیش کی تھی کہ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی تحریک کی تھی۔ میں اپنی تحقیق کے حاصل کو تحریر کر چکا ہوں۔ مولانا آزاد مرحوم کے متعلق میرا آج تک جو موقف رہا ہے۔ اسے میں چند لفظوں میں بیان کر رہا ہوں۔ میری ساری دلچسپی صرف اس ابوالکلام آزاد سے رہی ہے، اب بھی ہے اور ان شاء اللہ کبھی ختم نہیں ہوگی جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک نظر آتا ہے۔ رہا بعد کا ابوالکلام تو صحیح صورتِ حال بھی معلوم نہیں۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ علماء کی مخالفت کے نتیجے میں مولانا بددل ہو گئے۔ چونکہ اس زمانے میں علماءِ کرام کا کنٹرول بہت شدید تھا اور کسی کے لئے بات کرنی ممکن نہیں تھی اگر اس کے پیچھے علماء کی تائید نہ ہو۔ آج یہ بات نہیں ہے ـــ بہرحال میرے خیال میں انہیں بددل نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ حق کیا ہے، کوئی ساتھ دے یا نہ دے۔ آدمی کو حق کے راستہ پر ہی ڈٹا رہنا چاہیئے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کا یہ پہلو بھی میرے لئے قابلِ احترام ہے اور میں نے بارہا یہ بیان بھی کیا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے ساتھ ان کا رویہ خیرخواہانہ رہا ہے وہ اس کے مؤید رہے ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اختلافِ رائے کا ایک علیحدہ معاملہ تھا پاکستان بننے کے بعد وہ ختم ہو گیا۔ اب جبکہ پاکستان وجود میں آگیا تو یہ اسلام کا قلعہ ہے۔ اگر خدانخواستہ اس کو گزند پہنچا تو اسلام کو گزند پہنچے گا۔ ان کی سیرت کا یہ روشن پہلو ہے۔ میں یہ باتیں تفصیل کے ساتھ 'میثاق' میں لکھ چکا ہوں ـــ توقع ہے کہ آج کی مجلس کے صدر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت پر سیر حاصل روشنی ڈالیں گے۔

اقول قولی ھـٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ـــ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین!

کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ نے ۳۱ اگست ۸۴ء کو "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" کے موضوع پر تقریر فرمائی تھی جو 'میثاق' جنوری ۸۵ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے ـــ اس سلسلۂ کلام کا دوسرا موضوع تھا "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" اس پر امیر موصوف نے ۲۸ ستمبر ۸۴ء کو تقریر فرمائی تھی۔ چونکہ تقریباً ایک ماہ کا وقفہ پڑ گیا تھا لہٰذا اس تقریر میں انہوں نے ابتداءً سلسلۂ کلام کا ربط قائم کرنے کے لئے سابقہ تقریر کا خلاصہ بھی پیش فرمایا تھا لیکن چونکہ یہ تقریر 'میثاق' کے جنوری ۸۵ء کے شمارے ہی میں شائع ہو چکی ہے لہٰذا اس خلاصہ میں سے چند اہم نکات کے سوا بقیہ حصہ اس تقریر میں شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔

جمیل الرحمٰن

الحمد للہ۔ الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہِ الذین اصطفٰی۔ خصوصاً علیٰ افضلھم وخاتم النبیین محمدٍ الامین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ اما بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۙ

وقال تبارک وتعالیٰ فی سورۃ الشورٰی:

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ؕ

وقال اللہ عزوجل فی سورۃ الصف

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ

وقال سبحانہ وتعالیٰ فی سورۃ الانفال:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ اما بعد
فقال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم
اَلْمُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ يُّقَاتِلُ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ـ
(اوکما قال صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم)
رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ـ
اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا الهمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا۔ اَللّٰهُمَّ ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ اَللّٰهُمَّ وفقنا ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللّٰہ لومۃ لائم
آمین یا رب العٰلمین!

میں نے گذشتہ تقریر میں Revolution اور Coup کے درمیان جو فرق ہے اسے وضاحت سے بیان کیا تھا۔ اس پس منظر میں میری پختہ رائے ہے کہ ایران کا انقلاب حقیقت میں انقلاب نہیں بلکہ اپنی Methodology کے اعتبار سے Coup ہے۔ میں نے تفصیل سے گذشتہ تقریر میں بیان کیا ہے اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ پاکستان کی اینٹی بھٹو تحریک اور ایران میں اینٹی شاہ تحریک یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت مشابہ بھی تھیں اور متوازی بھی چو برپا ہوئیں۔

خارجی عامل میں اس میں اس موقع پر اس بات کا اضافہ کر رہا ہوں کہ بین الاقوامی سطح پر ان دونوں تحریکوں کو امریکہ کی شہ اور اس کی پشت پناہی حاصل تھی اور دونوں میں امریکہ کا پیسہ بے دریغ استعمال ہوا تھا ـــــ بعد میں خود امریکہ نے اس پر کفِ افسوس ملا ہے۔ اس وقت چونکہ امریکہ میں ڈیموکریٹس کی حکومت تھی اور "جمہوریت" ان کے نزدیک مذہب کی حیثیت رکھتی ہے۔ حرّیت ان کا Creed ہے۔ اس کے باعث انہوں نے اس وقت ان تحریکوں کو تقویت پہنچائی ـــ بھٹو صاحب بھی یہ کہتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں کہ میری پیٹھ میں چھرا امریکہ نے گھونپا ہے اور شاہ بھی یہی فریاد کرتا ہوا دنیا سے گیا ہے کہ میری حکومت کا تختہ اصل میں امریکہ نے الٹا ہے ـــ لہٰذا خارجی اعتبار سے بھی اس میں یہ مشترک عامل موجود رہا ہے۔

داخلی محرکات

داخلی اعتبار سے اصل میں یہ تحریکیں کیا تھیں! یہ ناپسندیدہ حکمرانوں کے خلاف ایک ردِّ عمل تھا — یہ ناپسندیدگی مختلف طبقات کو مختلف اعتبارات سے تھی۔ چند سرمایہ داروں کو اس وجہ سے تھی کہ ان کی پالیسیوں سے ان کو نقصان پہنچا ہے۔ کارخانہ داروں کو اس اعتبار سے تھی کہ ان کے مفادات کو بھی ان کی پالیسیوں سے زک پہنچی ہے۔ زمینداروں کو بھی صحیح یا غلط یہ اندیشہ تھا کہ کہیں ہمارے مفادات پر آنچ نہ آجائے۔ مذہبی لوگوں کو اس لحاظ سے تھی کہ بعض مذہبی معاملات میں دخل دیا گیا ہے اور اس طرح معاشرتی سطح پر اباحیت اور بے پردگی کا رواج ہو رہا ہے۔ جمہوریت پسند لوگوں کی ناپسندیدگی اس بنا پر تھی کہ جمہوریت قائم نہیں ہے بلکہ آمریت ہے۔ الغرض یہ مختلف اسباب تھے جن کی بنا پر چند Shades of Opinions تھے جو یہاں بھٹو صاحب کے خلاف جمع ہوئے اور وہی چند نقطہ ہائے نظر و آراء تھیں جو ایران میں شاہ کے خلاف مجتمع ہوئیں۔ گذشتہ تقریر میں ان کو تفصیل سے بیان کر چکا ہوں — ان تمام نقطہ ہائے نظر میں بُعد المشرقین تھا اور ہے۔ لیکن ان سب میں پاکستان میں بھٹو صاحب اور ایران میں شاہ سے شدید ناپسندیدگی کا عنصر قدرِ مشترک کے طور پر شامل تھا۔ لہٰذا ابتداءً دونوں جگہوں پر حکمرانِ وقت کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے سیاسی تحریکیں شروع ہوئیں۔ لیکن جیسا کہ میں پچھلی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ جب ایسی تحریکیں قربانیاں دینے کے مرحلہ میں داخل ہوتی ہیں اور جب Confrontation کا وقت آتا ہے اور لوگوں کو جانیں دینے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے تو دین و مذہب کا نام لئے بغیر مسلم ممالک میں کوئی اور چارۂ کار نہیں ہوتا — یہی وجہ ہے کہ یہاں "پاکستان قومی اتحاد" نے "نظامِ مصطفیٰ" کی تحریک کی شکل اختیار کی۔ حالانکہ اصلاً اس قومی اتحاد میں "اسلام" کا نام تک شامل نہیں تھا۔ وہ تو ایک خالص سیاسی و قومی تحریک تھی۔ اسی مقصد کے لئے نہ صرف مختلف بلکہ بالکل متضاد نظریات کی حامل سیاسی پارٹیوں کا "اتحاد" عمل میں آیا تھا جس کا اصل مقصد پیپلز پارٹی بلکہ اصلاً بھٹو صاحب کو اقتدار سے بے دخل کرنا تھا۔ وہاں ایران میں بھی اصلاً تحریک شاہ کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی غرض سے برپا ہوئی تھی۔ اس کا پہلے کیا نام تھا! اس کے متعلق مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن جب وہاں بھی تحریک باقاعدہ تصادم کے مرحلہ میں داخل ہوئی تو اس میں دین و مذہب کا نعرہ شامل ہوا۔

مشترک عوامل

چنانچہ ان دونوں تحریکوں میں چار چیزیں مشترک تھیں۔ پہلی خارجی مداخلہ دوسری چیز اصل تحریک ناپسندیدہ حکمرانوں کے خلاف تھی جس میں چھ Shades of opinions شامل تھے۔ تیسری چیز ان تحریکوں کا دین و مذہب کی طرف آنا تھا۔ چوتھی چیز مشترک یہ تھی کہ جب اسلام کا نام لینا ہے اور اس کی اپیل پر عوام الناس کو قربانیاں دینے پر آمادہ کرنا ہے تو ظاہر بات ہے کہ کسی مذہبی شخصیت کی قیادت بھی ضروری ہے۔ لہٰذا مفتی محمود مرحوم و مغفور یہاں پر اس کے قائد بنے لیکن یہاں ان کی قیادت ایک علامتی (Symbolic) قیادت تھی حقیقی قیادت نہیں تھی۔ مفتی صاحب مرحوم کو نہ پیر پگارا صاحب اپنا حقیقی لیڈر مان سکتے تھے، نہ اصغر خان صاحب نہ ولی خان صاحب، نہ جماعت اسلامی اور نہ مولانا نورانی میاں — لیکن ایران میں یہ قیادت ایک ایسی شخصیت کے ہاتھ میں آ گئی جو فی الواقع اپنی ذاتی حیثیت میں بھی اور ایران کے اندر علماء کا جو نظام ہے اس کے اندر اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے بھی وہ اس پوزیشن میں تھی کہ جب اس کے ہاتھ میں تحریک کی قیادت آئی ہے تو وہ صرف ایک علامتی قیادت نہیں تھی بلکہ وہ ایک حقیقی و واقعی قیادت (Real Leadership) بن گئی تھی۔

مختلف نتائج کے اسباب

یہاں سے وہ فرق شروع ہو گیا کہ جس کے نتائج مختلف نکلے جب ہمارے یہاں تحریک کامیابی سے ہمکنار ہونے کے قریب ہوئی اور بھٹو صاحب کے اقتدار کی کرسی جس کی مضبوطی پر ان کو بڑا غرّہ تھا ڈانواں ڈول ہونے لگی تو آرمی نے coup کیا اور اقتدار پر قبضہ کر لیا اور سارے کے سارے نو ستارے ٹاپتے رہ گئے اور اب آٹھویں سال شروع ہوئے بھی قریباً تین ماہ گزر چکے ہیں۔ جبکہ اس coup کے فوراً بعد کہا یہ گیا تھا کہ نوّے دن بعد الیکشن کرا کے اقتدار ملک کے منتخب نمائندوں کو سونپ دیا جائے گا۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ نو ستارے کب تک منتظر رہیں گے۔ وہی مثل بڑی حد تک صادق آتی ہے کہ دبلیاں لڑتی رہیں اور بندر ان کے بیچ میں سے پوری روٹی اڑا لے گیا! وہاں ایران میں یہ معاملہ ہوا کہ شاہ کے ساتھ ساتھ آرمی سے بھی وہاں پر اب کی نفرت تھی۔ لہٰذا فوج کے لئے اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ وہ اقتدار پر قابض ہو سکے۔ وہاں دوسرا جو منظّم ادارہ تھا وہ علماء کا تھا۔ جسے میں گذشتہ تقریر میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ علماء کا یہ ادارہ اور نظام

انتہائی منظم اور Well graded and well define تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا چنانچہ یہ Coup by Clergy تھا ـــــ ہمارے یہاں یہ صورت حال نہ پہلے موجود تھی اور نہ اب موجود ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک جن لوگوں کی نگاہ اس فرق پر نہیں ہے تو وہ حضرات اس قسم کی بچگانہ اور سطحی باتیں کہہ رہے ہیں جو مسلم انسٹیٹیوٹ لندن کے روحِ رواں ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب نے اس سیمینار میں اپنے افتتاحیہ خطبہ میں کہی ہیں جو "پاکستان کا مستقبل" کے موضوع پر اگست کے اواخر میں منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ازراہِ کرم اپنے اس خطبہ کی اردو اور انگریزی کی ایک کاپی مجھے بھی بھیج دی ہے ـــــ امریکہ کے دورے سے واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ اسی قسم کی باتیں اس کانفرنس میں بھی کہی گئی ہیں جو میری غیر حاضری کے دوران لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی کہ "پاکستان کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ امام خمینی صاحب کی قیادت کو قبول کریں، انہی کو اپنا امام تسلیم کریں، اپنے یہاں کے تمام دینی کام بند کریں اور اسی رُخ اور ان ہی کی قیادت میں پاکستان میں اسی نہج کا اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں جس نہج کا ایران میں برپا ہوا ہے"ـــــ ان حضرات کی نگاہ نہ اس فرق پر ہے جو میں نے گذشتہ تقریر میں بیان کیا تھا اور نہ ان مسائل پر ہے جو شیعہ اور سنیوں میں بنیادی طور پر مابہ الاختلاف والامتیاز ہیں۔ ان کا ذکر میں ان شاء اللہ آگے چل کر کروں گا۔

مرعوب ذہنیت کا تجزیہ

اس موقع پر میں اپنا ایک تجزیہ اور تأثر بھی بیان کردوں وہ یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک والے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی نہایت پرزور دعوت دی تھی لیکن چند موانع کے باعث انہوں نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا اور قریباً ۱۹۲۰ء سے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ان کی تمام تر مساعی کا ہدف استخلاصِ وطن ہو گیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۲ء سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور نے اپنے ماہنامے ترجمان القرآن کے ذریعے اس دعوت کی تجدید کی اور 'اسلامی انقلاب' کا تصوّر اور فکر مدلّل طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ جس کے نتیجہ میں ۱۹۴۱ء میں انقلابی طرز کی جدوجہد کے لئے جماعتِ اسلامی قائم ہوئی اور اس نے غیر منقسم ہندوستان میں پورے جوش و جذبے کے ساتھ جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا ـــــ میرا موقف یہ ہے اور جس سے اختلاف ممکن ہے ـــــ کہ قیامِ پاکستان کے بعد مولانا مودودی ہی کی قیادت میں جماعتِ اسلامی نے پاکستان میں جو

رخ اور منہج اختیار کیا وہ بجائے انقلابی کے انتخابی سیاست کا ہوگیا تھا۔ سیاسی انتخابی عمل کے ذریعہ اس نے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی کہ پاکستان میں اسلام کا غلبہ ہو جائے۔ —— اور میرا جماعت کے ساتھ یہی بنیادی اختلاف واقع ہوا اور آج نہیں بلکہ ۱۹۵۶ء کے اواخر میں مَیں اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ جماعتِ اسلامی انقلابی منہج کے بجائے سیاسی وانتخابی راہ پر پوری طرح گامزن ہو چکی ہے۔ چنانچہ میں نے جماعت کا رکن رہتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کے لئے اپنی استعداد کے مطابق دلائل کے ساتھ اپنا ایک تحریری بیان بھی جماعت کی قائم کردہ جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا تھا اور اسی کو فروری ۱۹۵۷ء کے جماعت کے سالانہ اجتماع منعقدہ ماچھی گوٹھ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی[1] —— میرے نزدیک اسی انتقال وانحرافِ طریق کار کے باعث جماعت ایک دلدل میں پھنس چکی ہے کہ سینتیس[2] سالوں کی جدوجہد کے باوجود نہ اس کے ہاتھ کچھ آیا ہے اور نہ آنے کی کوئی توقع ہے بلکہ منزل دور سے دور تک ہوتی نظر آرہی ہے۔ اصل میں یہی وہ شکست خوردہ ذہنیت ہے کہ جماعتِ اسلامی کے چند اہم حضرات ایران کے انقلاب سے بہت مرعوب ہوگئے ہیں اور نفسیاتی طور پر صورت یہی ہوئی ہے کہ ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا   ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اسی مرعوبیت کا ایک نمایاں مظہر یہاں لاہور میں جناب سید اسعد گیلانی صاحب کی شخصیت ہے جو فی الوقت جماعتِ اسلامی کی صفِ اوّل کے اکابر میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے متعلق بھی میں آپ کو بتا دوں کہ وہ جماعتِ اسلامی کے ایک دانش ور ہیں۔ کراچی میں ان کا جماعت سے تعلق رہا تھا پھر لندن جاکر بھی پہلے ان کا وہاں کی جماعتِ اسلامی کے حلقہ کے ساتھ سرگرم اور فعال نوعیت کا تعلق رہا ہے۔ بہرحال اب ان کا جماعت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ فی الوقت جماعت کے ناقدین میں شامل ہیں۔

اس طرزِ فکر کا پس منظر

ان باتوں کا بھی ایک پس منظر ہے۔ وہ یہ کہ جماعت کے ابتدائی لٹریچر نے کارکنوں کے قلوب واذہان میں اسلامی

---

[1] یہ بیان "تحریکِ جماعتِ اسلامی —— ایک تحقیقی مطالعہ" کے عنوان سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ (مرتّب)

انقلاب کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اس کی جب تسکین نہ ہو پائی اور اپنے کئے کچھ نہ ہو سکا تو اب جیسا تیسا بھی اسلام کے نام پر کہیں کوئی "انقلاب" آگیا ہے اس سے ایسے حضرات شدید قسم کی مرعوبیت اپنے ذہنوں میں محسوس کر رہے ہیں اور اس کے آرزومند ہی نہیں بلکہ داعی ہیں کہ پاکستان میں ایران کی طرز پر انقلاب لانے کی جدوجہد کی جائے۔ ایسے حضرات نے گہرائی اور گیرائی میں جاکر شاید ہی غور و فکر اور تجزیہ کیا ہو کہ ایرانی انقلاب کی اصل نوعیت کیا ہے۔ اور آیا وہ ہمارے لئے قابلِ تقلید ہے یا نہیں! پھر یہ کہ ہمارے حالات میں اور ایران کے حالات میں کیا فرق و تفاوت ہے جس کی بنا پر اس طرز کا انقلاب پاکستان میں برپا کرنا ممکن ہی نہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں بھی ایرانی طرز کا انقلاب آسکتا ہے، ان کے متعلق میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ میرے نزدیک یہ حضرات اجتماعیات اور پولیٹیکل سائنس کے مبادیات تک سے ناواقف ہیں۔ اس موضوع پر میں گذشتہ تقریر میں تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں۔ مزید یہ کہ ان سب سے بڑھ کر قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے نام سے ایران میں جو تبدیلی آئی ہے وہ عین اسلام کے مطابق ہے بھی یا نہیں اور آیا وہ محض شیعی نوعیت کی تبدیلی تو نہیں ہے؟

اہلِ سنّت اور اہلِ تشیع کے اساسی، بنیادی اور اصولی اختلافات

اب آئیے اصل موضوع کی طرف ـــــ وہ یہ کہ "کیا ایرانی انقلاب 'اسلامی انقلاب' ہے؟" اس بارے میں بنیادی بات یہ جان لیجئے کہ اگرچہ "لفظ اسلام" مشترک ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے شیعہ اسلام اور سنّی اسلام میں بہت بڑا فرق ہے۔ بڑا اساسی و اصولی فرق ہے۔ یہ کسی طور پر بھی ایک اسلام قرار نہیں پا سکتے۔ یہ دو اسلام ہیں۔ بلکہ میرے نزدیک اسلام میں درحقیقت فرقے ہی صرف دو ہیں۔ اہلِ سنّت اور اہلِ تشیع۔ اہلِ سنّت میں جن کو فرقے سمجھ لیا گیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اس میں ہماری کوتاہ نظری اور بعض یگانوں کے تشتت کا بڑا دخل ہے۔ دراصل ہمارے یہاں فرقے نہیں بلکہ مختلف مکاتبِ فقہ و مسلک ہیں جن میں بعض فروعی مسائل کے استنباط میں تعبیر، رائے اور استدلال میں اختلاف واقع ہوا ہے جو بالکل فطری امر ہے۔ اصل الاصول ہمارے تمام مسالک کے نزدیک متفق علیہ ہے۔

پہلا اختلاف

لیکن اہلِ سنّت اور اہلِ تشیع کے مابین اصل الاصول ہی میں نہایت اساسی اور بنیادی اختلافات ہیں ـــــ تین امور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو اہلِ سنّت

اور اہلِ تشیع کے مابین مابہ الاختلاف اور مابہ النزاع ہیں۔ ان میں سے ایک معاملہ فقہ کا ہے۔ ان کے یہاں مشہور و معروف دو فقہیں ہیں۔ فقہ جعفری اور فقہ زیدی ۔ چونکہ اہلِ تشیع میں اثنا عشری شیعوں کی عظیم اکثریت ہے۔ زیدی شیعہ یمن کے علاوہ شاید ہی کہیں قابلِ لحاظ تعداد میں موجود ہوں۔ لہٰذا ان کے یہاں فقہ جعفری ہی متداول ہے۔ ہم اہلِ سنّت کے یہاں چار فقہیں رائج ہیں اور ان میں اہلِ حدیث مسلک شامل کرلیا جائے تو پانچ فقہیں بن جائیں گی: فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی اور پانچویں جسے اہلِ حدیث حضرات مسلک سلفی کہتے ہیں۔ میرے محدود مطالعہ کے رو سے فقہ جعفری میں دو بہت بڑے نقائص ہیں۔ پہلا یہ کہ اس میں متعہ جیسا گھناؤنا مسئلہ شامل ہے اور دوسرا یہ کہ ان کی فقہ جن روایات پر قائم ہے ان کا سلسلہ حضرت محمد باقر اور ان کے صاحبزادے حضرت جعفر صادق رحمہم اللہ سے آگے شاید ہی چلتا ہو۔ تاہم میری ذاتی رائے میں اکثر و بیشتر مسائل میں فقہ جعفری اور ہماری اہلِ سنّت میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے ۔ عقائد کی بات بالکل مختلف ہے۔ اس میں بڑے بنیادی اور اصولی اختلافات ہیں جو اہلِ سنّت کے اسلام کو شیعی اسلام سے بالکل جدا جدا کر دیتے ہیں۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

بایں ہمہ اگر کسی ایسے ملک میں جہاں کی اکثریت اہلِ سنّت پر مشتمل ہو اور وہاں شیعہ بھائی بھی موجود ہوں، اگر وہاں بھی جب بھی اسلامی نظام کی تنفیذ کا مرحلہ آئے گا تو میرے نزدیک فقہی اختلاف اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ یہ تو اصل میں سیاسی نوعیت کی تحریکیں ہیں جو ابھرتی رہی ہیں اور ان اختلافات کو ہوا دیتی ہیں اسی کو کچھ لوگوں نے بہانہ اور دلیل بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام کی ترویج و تنفیذ کے خلاف کہ کس کا اسلام! جہاں تک شخصی قانون اور فقہ کا تعلق ہے، میری رائے میں اگر اہلِ سنّت کے جملہ فقہوں کے ساتھ فقہ جعفری بھی شامل کرلی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ آخر اسلام خالص غیر مسلموں کو بھی ان کے شخصی معاملات میں آزادی دیتا ہے۔

دوسرا اختلاف البتہ جو دوسرا اختلاف ہے۔ ویسے اصولی اعتبار سے تو اس کی اہمیت زیادہ نہیں ہے لیکن جذباتی اعتبار سے شدید ترین تلخی (Bitterness) کی بنیاد وہی ہے۔ یہ اختلاف تاریخ کے بارے میں اہلِ تشیع کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی خلافتیں غاصبانہ خلافتیں تھیں، اصل میں خلافت کے حق دار حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ اگر اختلاف صرف فضیلت تک محدود

رہنا تو گوارا تھا۔ جیسے زیدی شیعہ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ امت میں افضل ترین ہیں حضرت علیؓ اور انہی کا حق تھا کہ پہلی خلافت انہیں ملتی لیکن وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت کو غاصبانہ نہیں کہتے۔ وہ انہیں بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ امت نے ایک فیصلہ کیا جس کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا ٹھیک ہے افضل کے ہوتے ہوئے بھی مفضول کی خلافت قائم ہو سکتی اور تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اگر زیدی شیعوں کے نقطہ نظر تک معاملہ رہے تو اس میں تلخی نہیں ہے۔

ایک اتفاق: یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ ۳۱ اگست کو میں نے "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" کے موضوع پر تقریر کی اور اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ آئندہ میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا کہ "کیا ایرانی انقلاب، اسلامی انقلاب ہے؟" ان موضوعات پر اظہارِ خیال کی ضرورت میں نے کیوں محسوس کی تھی اس کا پس منظر اور پیش منظر میں اپنی پہلی تقریر میں بیان کر چکا ہوں۔ لیکن آج جو موضوع زیرِ گفتگو ہے اس میں اور پچھلی تقریر میں قریباً ایک ماہ کا وقفہ پڑ گیا۔ اس میں میرے کسی ارادے کو دخل نہیں تھا۔ مشیتِ الٰہی یہی تھی۔ ستمبر کے پہلے جمعہ کو عید الاضحیٰ واقع ہو گئی۔ دوسرے جمعہ کو میں نے 'انقلاب' کے موضوع پر عمومی نوعیت کے چند امور بیان کئے۔ اسی جمعہ کی شب کو میری کمر میں شدید درد اٹھا جس نے مجھے صاحب فراش کر دیا۔ میری یادداشت کے مطابق شاید یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور میں موجود ہوتے ہوئے میں مسلسل دو جمعوں کو مسجد دارالسلام میں حاضر نہ ہو سکا۔ اس کا سبب محض علالت رہا ہے۔ —— آج اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کا موقع ملا ہے جس کا اعلان میں قریباً ایک ماہ قبل ہی کر چکا تھا یعنی ایرانی انقلاب اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے 'اسلامی انقلاب' ہے یا نہیں! اب یہ مشیتِ الٰہی ہے کہ اس موضوع پر اظہارِ خیال کا جب موقع ملا تو ماہ محرم الحرام شروع ہو چکا ہے۔ حالانکہ میرے حاشیہ خیال میں بھی اس موضوع کا محرّم سے کوئی تعلق نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

ایک وضاحت: بہرحال جب بھی محرّم شروع ہوتا ہے تو اتحاد کے لئے زعماء اور اکابر کی جانب سے بڑے بڑے بیانات آیا کرتے ہیں اور حکومت کی طرف سے نصیحتیں ہوتی ہیں اور اہل سنّت و اہل تشیع کے علماء کی کمیٹیاں بنا کرتی ہیں اور اکثر وہی حضرات جو ایک دوسرے کی انتہائی کاٹ کرتے ہیں، جمع ہو کر اتحاد اور اخوت کی اپیلیں شائع کرتے ہیں، لہٰذا میں

وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میری آج کی تقریر خالصتۂ واقعتی اور حقیقی مسائل سے متعلق ہے میرے پیشِ نظر کسی نوع کی وقتی اور ہنگامی کشیدگی یا تلخی پیدا کرنا ہرگز نہیں ہے۔

مستقل تلخی کا حقیقی سبب

اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ محض فضیلتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قائل ہو لیکن شیخین اور ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے احترام و توقیر کا بھی مقر ہو تو محض یہ بات تلخی کا سبب نہیں بن سکتی اور نہ ہی فقہ جعفری اس کا باعث ہے بلکہ اصل بنائے تلخی یہ چیز ہے کہ اہلِ تشیع کی جانب سے چار اہلبیت اور بعض اصحابِ رسول[1] کو چھوڑ کر تمام کبار صحابہ کرام و عظام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی نیت، اخلاص و خلوص اور شخصیت پر جو تبرا بھیجا جاتا ہے، جو ان پر چھینٹے اڑائے جاتے ہیں، جن کی شان میں جو نہایت رکیک الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اوّلین تین خلفاء راشدین کی خلافت کو جو درحقیقت دورِ رسالت کا مکمل ترین نمونہ اور تتمہ تھی اور جو علیٰ منہاج النبوۃ خلافتِ راشدہ تھی اسے غاصبانہ خلافت قرار دیا جاتا ہے۔ چار صحابہؓ کو چھوڑ کر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو منافق، غاصب، سازشی، حتٰی کہ مرتد قرار دیا جاتا ہے، یہ مستقل طرزِ عمل مسلمانوں کو کسی طور پر بھی گوارا نہیں ہے۔ یہ چیز ان کی حمیّت و غیرت دینی کو للکارنے والی ہے۔ یہ صحابہؓ کون ہیں! ان میں شامل ہیں عشرہ مبشرہ بھی، انصارِ مدینۃ النبی بھی شامل ہیں اور اصحابِ بدر بھی، ان میں اصحابِ بیعتِ رضوان (اصحابِ شجرہ) بھی شامل ہیں اور فتح مکہ سے قبل اور بعد مشرف بہ اسلام ہونے والے مخلص اور صادق القول اصحابِ رسول بھی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم ــــ جن کے متعلق قرآنِ حکیم میں تین مقامات پر فیصلہ ربّانی یہ ہے کہ: رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (المائدہ - المجادلہ - البیّنہ) اور جن کی مدح میں فرمایا گیا: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝[2]

---

[1] اہلِ تشیع کی روایات کے مطابق حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضراتِ حسنین نیز حضرت مقداد بن اسود، حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سوا معاذ اللہ ثم معاذ اللہ تمام اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ ھٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (مرتب)

(حاشیہ [2] اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ب اصولی بات: اس موقع پر یہ اصولی بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ اگر معاملہ ِ افضلیت کا زیدی موقف کے مطابق رہتا تو یہ کسی حد تک گوارا کیا جاسکتا تھا۔ حضرت ُسے قبل کے خلفاء راشدین کی بالترتیب افضلیت کو تسلیم کرنے پر کسی کو مجبور نہیں نہیں کیا جاسکتا ن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوا۔ اب اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفاء شدین المہدیین، عشرۂ مبشرہ، اصحاب بدر اور اصحاب بیعتِ رضوان رضی اللہ عنہم پر تنقید تا ہے، ان کی تنقیص کرتا ہے، ان پر زبانِ طعن دراز کرتا ہے، ان کا ادب و احترام ملحوظ ں رکھتا بلکہ ان تمام امورِ معاصی سے بھی آگے بڑھ کر (نعوذ باللہ) ان کو غاصب، منافق مرتد قرار دیتا ہے تو یہ انتہائی ضلالت اور گمراہی ہے۔ یہ وہ حد ہے کہ جہاں پہنچ کر اسلام ایمان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ چونکہ معاملہ صرف نقطہ نظر و فکر تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس الص علمی و فکری طور پر تجزیہ کیا جائے تو اس کی زد سیدِ وُلدِ آدم، سرورِ عالم، محبوبِ الٰہی النبیین والمرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس پر بھی پڑتی ہے ۔ کسی تربیت و بت یافتہ اور شاگرد میں کوئی نقص یا کوئی تقصیر رہ جائے تو مربیؔ، معلمّ اور استاد اس سے ل بری قرار نہیں دیا جاسکتا۔ وہ بھی کسی نہ کسی درجہ میں ذمہ دار قرار پاجاتا ہے۔ اس ن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے سمجھئے جو امام ترمذیؒ اپنی جامع میں لائے ہیں:

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

۱ یہ سورۂ توبہ کی آیت ہے جو سفر تبوک سے واپسی پر نازل ہوئی تھی اور جو فتح مکہ کے بعد وقوع پذیر ہوا تھا۔ آیت میں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ، کی تعیین میں مفسرین سلف کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے وہ مہاجرین و انصار مراد ہیں جنہوں نے ہجرت سے قبل اسلام قبول کیا۔ بعض کے نزدیک، غزوۂ بدر تک کے مومنین صادقین، بعض نے صلح حدیبیہ اور بعض نے فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کرنے والے مومنین صادقین تک وسعت دی ہے۔ اور وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ کو فتح مکہ اور اس کے بعد حیات نبیؐ تک اور بعض نے تاقیامِ قیامت مومنین صادقین تک اسے وسیع خیال کیا ہے۔ (مرتب)

۲ سورۂ فتح بالاتفاق صلح حدیبیہ کے بعد مراجعتِ مدینۃ النبی کے دوران نازل ہوئی تھی۔ جس میں فرمایا گیا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ ۔ الفاظ کا عموم تمام اصحابِ رسولؐ کا احاطہ کرتا ہے۔ اگر اسے خاص کیا جائے تو اس میں وہ تمام صحابہؓ کرام آجاتے ہیں جو اس سفر میں حضورؐ کے معین تھے یعنی ساتھ تھے۔ اہل تشیع کا باطل عقیدہ اس آیت کریمہ کے ابطال و انکار کا باعث بنتا ہے۔ (مرتب)

عن عبد الله بن مغفلؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الله الله فی اصحابی لا تتخذوهم غرضاً من بعدی فمن احبهم فبحبی احبهم ومن ابغضهم فببغضی ابغضهم ومن آذاهم فقد آذانی ومن آذی الله فیوشک ان یؤخذ

"حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ ان کو میرے بعد نشانہ نہ بناؤ پس جس شخص نے ان کو محبوب جانا تو میری محبت کی وجہ سے محبوب جانا اور جس شخص نے ان کے ساتھ بغض رکھا تو میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان کے ساتھ بغض رکھا اور جس شخص نے انکو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی اور جسنے اللہ کو تکلیف دی تو عنقریب وہ (اس جرم میں) پکڑا جائے گا۔"

اس حدیث کو سامنے رکھئے اور پھر اہل تشیع کا یہ طرزِ عمل دیکھئے کہ معدودے چند کے علاوہ تمام صحابہ کرامؓ کو منافق اور مرتد قرار دینے کے ساتھ ہی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شان میں بھی گستاخی کی جاتی ہے جن کا مقام و مرتبہ یہ ہے کہ واقعہ افک کے سلسلہ میں ان کی برأت اللہ تعالیٰ نے فرمائی اور ان کی پاک دامنی پر مہرِ تصدیق ثبت فرمائی جو ہمیشہ ہمیش کے لئے سورۂ نور میں محفوظ رہے گی۔ جنؓ کا لعابِ دہن اس جہانِ فانی سے الرفیق الاعلیٰ کی طرف مراجعت کے وقت حضورؐ پُر نور کے دہن مبارک میں پہنچا تھا۔ روایت میں آتا ہے کہ انتقال سے کچھ وقت قبل اندازہ ہوا کہ حضورؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے دانتوں سے مسواک نرم کر کے حضورؐ کو دی جس سے آپؐ نے مسواک فرمائی۔۔۔ پھر یہ کہ جب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانِ مبارک جانِ آفرین کے سپرد کی تو آپؐ کا سر مبارک حضرت صدیقہؓ کے زانو پر رکھا تھا۔۔۔ پھر یہ کہ حضرت صدیقہؓ نبی اکرمؐ کی محبوب ترین زوجہ محترمہ تھیں۔۔۔ مزید یہ کہ حضرت صدیقہؓ کا حجرہ حضورؐ کی آخری استراحت و آرام گاہ بنا۔

انصاف پسند نظر: ہر نوع کے تعصب اور ہر قسم کی عصبیت سے بالاتر ہو کر انصاف پسند نظر سے دیکھئے کہ کون مسلمان حضرت ابوبکرؓ[1]، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور بہ استثناء

---

[1] حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس پائے کے صحابی ہیں کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے انؓ کو "ثانی اثنین" فرمایا ہے۔ اور اکثر مفسرین کا قول ہے کہ سورۃ الیل میں الاتقیٰ اور وَلَسَوْفَ

چند تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شان میں یہ گستاخیاں برداشت کر سکے گا؟ کس مسلمان کی غیرت و حمیت جوش میں نہیں آئے گی اور اس کا خون نہیں کھولے گا جب اسے معلوم ہوگا کہ یہ اثنا عشری اہل تشیع حضرات شیخین رضی کو غاصب، منافق، مرتد قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا ہی نہیں حکم کے خلاف کام کیا ہے اور سازش کی ہے۔ حضرت عثمان ذوالنورین رضی کی شان میں جو کچھ کہا گیا اور کہا جاتا ہے اسے تو میں زبان پر بھی نہیں لا سکتا۔ پھر معدودے چند صحابہ کو چھوڑ کر سب صحابہ کرام و عظام کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ منافق و مرتد ہو گئے تھے، یا شیخین رضی کی سازش میں شریک تھے یا اتنے بزدل تھے کہ ان کے خوف و رعب کی وجہ سے حق بات کہنے کی ہمت و جرأت ان میں سے مفقود ہو چکی تھی[1] — تو درحقیقت یہ چیزیں اصل تلخی اور غم و غصہ کی بنیاد بنتی ہیں — چلئے یہ کہہ لیجئے کہ اگر صرف یہ رائے رکھی جائے تو اسے تاریخ کے غلط مطالعہ اور اس کو مسخ کرنے اور حضرت علی اور حضراتِ حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عقیدت و محبت میں حد درجہ غلو کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن معاملہ صرف رائے کا نہیں بلکہ کھلم کھلا، سرِ بازار اور اپنی مجالس میں نہایت غلیظ اور رکیک الفاظ میں ہر سال ان باتوں کا ذکر کرنا اور اسے تبرّا کہنا۔ جبکہ تبرّا کے معنی صرف اعلان برأت کے ہیں، گالیاں بکنے اور دشنام طرازی کے ہرگز نہیں ہیں اگر کوئی گروہ شیخین اور ذوالنورین رضی اللہ عنہم کی فضیلت و عظمت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے ان رضی سے صرف اعلانِ برأت کرتا ہے تو اسے بھی کسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس تبرّا کو گالیاں دینے

(مسلسل) یرضیٰ سے حضرت صدیقِ اکبر رضی ہی مراد ہیں۔ نیز ان مفسرین نے اس پوری سورۃ مبارکہ کو سورۃ صدیق رضی قرار دیا ہے۔ (مرتب)

[1] صاحبِ مشکوٰۃ شریف بحوالہ رزین حضرت عمر بن الخطاب رضی سے ایک طویل حدیث روایت کرتے ہیں جس کے آخر میں آنجناب رضی کہتے ہیں: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم — نبی اکرم صلعم تو بلا استثنا تمام صحابہ کرام رضی کو راہِ ہدایت کے نجوم قرار دیتے ہیں اور اہل تشیع معدودے چند کو چھوڑ کر سب کو مرتد تک قرار دیتے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مزید یہ کہ صحابہ رضی کی منقبت میں یہ قول بھی ملتا ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول"

رکیک حملے کرنے، توہین کرنے، دشنام طرازی کے ہم معنی و مترادف سمجھ لیا جائے اور ان کی سیرت پر، ان کی عظمت پر، ان کی شخصیتوں پر چھینٹیں اڑائے جائیں تو اسے کوئی سُنّی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا، ان کا یہی طرزِ عمل فسادات کا باعث بنتا ہے ـــــ اس ضمن میں ہر سطح پر اس امر کی کوشش ہونی چاہیئے کہ اہلِ تشیع اپنے اس طرزِ عمل سے باز آجائیں۔ ویسے بھی اس قسم کی غلیظ اور رکیک زبان استعمال کرنا شرفاء کا شیوہ نہیں کجا یہ کام مذہب کے نام پر کیا جائے اور اسے نیکی سمجھا جائے۔

تیسرا اور بنیادی سبب میرے نزدیک جو اصل اور بنیادی نزاع ہے جس کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ یہ دو مستقل فرقے ہی نہیں دو اسلام ہیں۔ وہ درحقیقت اجتماعی اور سیاسی نظام کے بارے میں ایک اساسی اختلاف ہے۔ سُنّی اسلام کی بنیاد ہے خلافت کے اصول پر اور یہ خلافت درحقیقت Popular Viceregency ہے۔ کوئی خلیفہ اللہ کی طرف سے مامور نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت مسلمانوں کے چناؤ سے ان کے باہمی مشورہ سے اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے اصول پر اس کا نصب ہوتا ہے، اس طریق پر اُسے اس منصب پر فائز کیا جاتا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ جو روحِ عصر ہے، یہ جو اس دَور کا اندازِ فکر ہے جس کو ہم "جمہوریت" سے تعبیر کرتے ہیں تو خلافت کا تصوّر اس سے بہت قریب ہے ـــ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ یہ لوگوں کا معاملہ ہے کہ وہ طے کریں گے کہ کس کو وہ اپنا خلیفہ اور سربراہ بنائیں لہٰذا یہ عوامی حاکمیت (Popular Sovereignty) نہیں ہے بلکہ Popular Caliphate (عوامی خلافت) ہے۔ یہ عوامی نیابت ہے ـــــ عوامی حاکمیتِ کلّی کے تصوّر والی جو جمہوریت ہے، وہ تو اللہ کی حاکمیت کے بجائے عوامی حاکمیت کے اصول پر مبنی ہوتی ہے جو شرک ہے، کفر ہے۔ لیکن خلافتِ عامّہ کا حق مسلمانوں کو حاصل ہے۔ حاکمیتِ مطلقہ حاصل نہیں ہے البتہ خلافت حاصل ہے۔ یہ خلافت کسی فرد کے لئے مختص نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے ہے وہ اپنے میں سے جس کو چاہیں خلیفہ بنالیں۔ یہ ہے اصل میں اہلِ سنّت کا تصوّرِ خلافت ـــــ یہ تصوّر بہت ہی مختلف ہے بلکہ بالکل متضاد ہے اس تصوّر سے جس کی بنیاد پر شیعیت قائم ہے۔ وہ ہے امامتِ معصومہ کا تصوّر۔ میں اس وقت تنقید کے لئے کوئی بات نہیں کہہ رہا بلکہ خالص علمی و فکری اعتبار سے بتارہا ہوں کہ اصل فرق کیا ہے! اہلِ تشیع

کے نزدیک یہ عقیدہ ان کے دین میں اسی طرح رکنِ ایمان ہے جیسے اہلِ سنّت کے یہاں عقیدۂ توحید و رسالت و قیامت و آخرت ـــــ لہٰذا یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ یہ دونوں چیزیں یعنی تصوّرِ خلافتِ عامّہ اور تصوّرِ امامتِ معصومہ محالِ تطبیق (Irreconcilable) ہیں۔ ان کو باہم جوڑا جا ہی نہیں سکتا۔ ان کے مابین کسی طور پر بھی مطابقت و مصالحت ممکن نہیں۔ ان کے درمیان بُعد المشرقین ہے۔

نسلی امامت | اس پر مستزاد یہ کہ یہ امامتِ معصومہ بھی ایک ہی نسل میں چلے گی۔ یوں کہنے کو تو یہ نسل شمار ہوتی ہے نبی اکرمؐ کی۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ لیکن حقیقت میں وہ نسل ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی۔ اس لئے کہ اصلاً نسل بیٹے سے چلتی ہے۔ بیٹی سے تو نہیں چلتی ـــــ لہٰذا اصل میں وہ نسل حضرت علیؓ کی ہے کہ امامتِ معصومہ کا مدار انہی کی نسل میں ہوگا۔ چنانچہ اہلِ تشیع کا بنیادی عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ بلا فصل امام، خلیفہ اور امیر المؤمنین ہیں اور آپؓ کے بعد آپؓ کی فاطمی اولاد میں سے مزید گیارہ حضرات ائمۂ معصومین ہیں ـــــ پس اس طرح اس عقیدہ میں نسلیت آگئی۔

معصوم امامت: پھر یہ کہ امام مامور من اللہ ہے۔ وہ معصوم ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے وہی خلیفۂ برحق اور مطاعِ مطلق ہے الغرض وہ امام بھی ہے، مامور من اللہ بھی، معصوم عن الخطا بھی ہے اور وہی امام الزماں ہے تا قیامِ قیامت۔ جبکہ اسلام کے نزدیک معصومیت صرف خاصۂ نبوّت ہے۔

قرآن کا ظاہر و باطن: پھر یہ کہ اگرچہ اس پر وحی نازل نہیں ہوتی لیکن وحی الٰہی کی صحیح تعبیر و تشریح صرف وہ کر سکتا ہے۔ وہ الفاظِ قرآنی نہیں بدلے گا بلکہ جو تشریح امام معصوم کر دے گا، وہی صحیح سمجھی جائے گی۔ خواہ آپ کو یہ نظر آ رہا ہو کہ وہ قرآن کی نص یا منشاء کے خلاف بات کہہ رہا ہے۔ چاہے آپ یہ سمجھتے ہوں کہ ظاہرِ قرآن کی نفی ہو رہی ہے لیکن اہلِ تشیع کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ تم ظاہر دیکھتے ہو، امام معصوم اس کے باطن کو دیکھتا ہے اور اس کے اعتبار سے وہ جو تعبیر کرتا ہے، وہی اس کی حقیقی تعبیر سمجھی جائے گی اور نافذ العمل ہوگی[1]

---

[1] نقلِ کفر کفر نہ باشد کے مصداق حضرت جعفر صادقؒ سے بعض آیات کی جو تشریح و تفسیر منسوب کی جاتی ہے ان میں سے چند نمونے اہلِ تشیع کی معتبر ترین کتاب "اصولِ کافی" سے پیش ہیں۔ کلیجے پر پتھر رکھ کر

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

حرام و حلال کا مطلق حق | اہل تشیع اپنے ائمہ معصوم کا حق ہی نہیں بلکہ ان کا یہ منصب قرار دیتے ہیں کہ وہ جس چیز اور جس عمل کو چاہیں حرام یا حلال قرار دے سکتے ہیں۔ گویا وہ علی الاطلاق شارع و مقنن ہیں۔ ان کے اس عقیدے کی بنیاد قرآن کے ظاہر و باطن کے فرق کے عقیدے

(تسلسل) پڑھئے سورۂ نساء کی آیت ۱۳۷ : اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ۔ اصول کافی کی روایت کے مطابق امام جعفر صادقؒ نے اس کی شرح یہ کی ہے کہ "یہ آیت فلاں، فلاں، فلاں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (یہ بات ذہن نشین رہے کہ شیعی روایات میں جہاں فلاں کا لفظ ایک مرتبہ آتا ہے اس سے مراد ابوبکرؓ جہاں دو مرتبہ آتے ہیں وہاں ابوبکرؓ و عمرؓ اور جہاں تین مرتبہ آتے ہیں وہاں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ ہوتے ہیں) یہ تینوں شروع میں رسول اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور جب ان کے سامنے حضرت علی کی ولایت و امامت کا مسئلہ پیش کیا گیا اور آپؐ نے فرمایا: "من كنت مولاه فهٰذا علی مولاه" تو یہ تینوں اس سے منکر ہو کر کافر ہو گئے۔ پھر حضورؐ کے فرمانے سے انہوں نے امیر المؤمنین (حضرت علی) کی بیعت کر لی اور اس طرح پھر ایمان لے آئے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو پھر یہ (امیر المؤمنین علی) کی بیعت سے انکار کر کے کافر ہو گئے۔ پھر یہ کفر میں اور آگے بڑھ گئے جب انہوں نے ان لوگوں سے بھی بیعتِ خلافت لے لی جو امیر المؤمنین سے بیعت کر چکے تھے تو اب یہ سب اس حال میں ہو گئے کہ ان میں ایمان ذرا سا بھی نہیں رہا۔ (یعنی قطعی کافر ہو گئے)"۔ سورۂ حجرات کی آیت ۷ ہے : وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ "اصول کافی" کے بقول حضرت جعفر صادقؒ نے اس آیت کی تفسیر و تشریح یوں بیان کی ہے "حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ" میں ایمان کا مطلب امیر المؤمنین علیہ السلام اور آگے "كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ" میں کفر کا مطلب ہے خلیفہ اوّل (ابوبکر) اور فسق کا مطلب ہے خلیفہ ثانی (عمر) اور عصیان کا مطلب ہے خلیفہ ثالث (عثمان)"۔ استغفر اللہ والعیاذ باللہ)۔ اسی "اصول کافی" میں سورۂ تغابن کی آیت ۸ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ کے متعلق حضرت باقرؒ کی یہ شرح منقول ہے کہ "خدا کی قسم اس نور سے مراد (ہمارے) ائمہ ہیں"۔۔۔۔۔ سورۂ مائدہ

پر مبنی ہے۔ یہ اس کا منطقی و لازمی نتیجہ ہے کہ شیعہ حضرات اس بات کو جزوِ ایمان تسلیم کریں۔ چنانچہ وہ اس کو بلا قید و شرط تسلیم کرتے ہیں۔

کتمان و تقیہ: ایک طرف تو اہلِ تشیع ائمہ کو مامور من اللہ اور معصوم تسلیم کرتے ہیں لیکن دوسری طرف تاریخ سے خواہ وہ سُنیوں کی مرتب کردہ ہو یا شیعوں کی جب انہیں یہ نظر آتا ہے کہ یہ بات معروف و مسلّم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر حضرت حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ تک کسی نے بھی عملاً عام مسلمانوں کے کسی بڑے اجتماع میں اپنی امامت اور اپنے حقِ ولایت و خلافت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ حضرت علی رضؓ نے تینوں خلفاء راشدین، حضرات ابوبکر، عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہاتھ پر بہ رضا و رغبت بیعت کی۔ انؓ کے ساتھ ہر نوع کا تعاون فرماتے رہے، حضرت عمرؓ کے عقد میں اپنی صاحبزادی حضرت امّ کلثوم کو جو حضرت فاطمہ زہراؓ کی لختِ جگر تھیں، دیا تھا۔ حضرتِ حسنؓ نے رضا کارانہ طور پر خلافت سے دست برداری اختیار

(رسل) کی آیت ۶۷ کے ابتدائی حصہ: يَا أَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۖ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۚ کی یہ تشریح و تفسیر "اصول کافی" میں حضرت باقرؒ سے منسوب کی گئی ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ حکم ملا کہ آپؐ اپنے بعد کے لئے حضرت علیؓ کی امامت و خلافت کا اعلانِ عام کر دیں تو آپؐ کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اس اعلان سے بہت سے مسلمان مرتد اور میرے خلاف ہو جائیں گے اور تہمت لگائیں گے کہ میں یہ کام علی کی قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ اللہ کی طرف سے ایسا حکم نہیں آیا۔ لہٰذا آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے اس حکم پر نظرِ ثانی فرمانے کی درخواست کی تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔" گویا حضرتِ باقرؒ کے نزدیک اس کی شرح یہ ہے کہ جب تک حضرت علیؓ کی امامت و خلافت کا اعلان نہیں ہوگا العیاذ باللہ فریضۂ رسالت ادا نہیں ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

ہمیں وثوقِ کامل ہے کہ یہ تمام روایات موضوع ہیں اور ان کا ہرگز کوئی تعلق ان حضرات گرامیؒ سے نہیں ہے جن کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ان تمام امور کی جناب خمینی نے اپنی کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" میں توثیق، تائید و تصویب کی ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جو ایرانی انقلاب میں کلید کا مقام رکھتی ہے۔ (مرتب)

کی اور حضرت امیر معاویہؓ سے بیعتِ خلافت کر لی۔ حضرت حسینؓ اور حضرت علیؓ کے تمام خانوادہ نے بھی امیر معاویہؓ سے بیعتِ سمع و طاعت کر لی تو اہل تشیع کی وہ تمام باتیں ریت کی بنیاد ثابت ہو جاتی ہیں جن پر حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل اور انؓ کی فاطمی اولاد میں ائمہ معصومین کے تسلسل کے عقیدے کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کو جو ان کے عقیدے کا تضاد ثابت کرتی ہے باطل قرار دینے کے لئے یہودی سبائی ذہنیت نے جو دراصل شیعیت کی بانی مبانی ہے شیعہ مذہب کے لئے کتمان اور تقیہ کے اصول وضع کئے کتمان کا مطلب ہے اصل عقیدہ اور مذہب و مسلک کو چھپانا اور دوسروں پر ظاہر نہ کرنا ——— اور تقیہ کا مطلب ہوتا ہے اپنے عقیدے، اپنے مذہب، اپنے مسلک اور اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کہنا اور کوئی عمل کرنا اور اس طرح دوسروں کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کرنا ——— یہ دونوں امور ان کے مذہب کے مطابق اعلیٰ درجے کی نیکی اور اجر و ثواب کے مستوجب کام ہیں[1]

تحریفِ قرآن کا عقیدہ : یوں تو ہمارے شیعہ بھائی اور ان کے علماء مجتہدین یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم قرآن مجید میں تحریف کے قائل نہیں ہیں[2]۔ لیکن ان کے سلف کے علماء برملا یہ لکھتے

---

[1] "اصول کافی" میں کتمان اور تقیہ کو شیعی مذہب کے لحاظ سے جس نیکی کا مقام دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق متعدد روایات اپنے مختلف ائمہؒ سے منسوب کی گئی ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے: (i) امام جعفر صادقؒ نے (اپنے خاص مرید سے) فرمایا کہ "اے سلیمان! تم اس دین پر ہو کہ جو اس کو چھپائے گا اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت عطا ہو گی اور جو اس کو ظاہر اور شائع کرے گا اس کو اللہ ذلیل و رسوا کرے گا۔ (ii) حضرت باقرؒ سے یہ روایت منسوب ہے کہ "مجھے اپنے اصحاب میں وہ شخص زیادہ محبوب ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو، (ہمارے) دین کو زیادہ سمجھتا ہو اور ہماری باتوں کو زیادہ چھپانے والا اور راز میں رکھنے والا ہو" ——— (iii) ابو عمیر عجمی روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؒ نے مجھ سے فرمایا "اے عمیر! دین کے دس حصوں میں سے نو حصے تقیہ میں ہیں اور جو تقیہ نہیں کرتا وہ بے دین ہے"۔ (iv) ایک روایت حضرت باقرؒ سے ان الفاظ میں منسوب کی گئی "تقیہ میرا دین اور میرے آباء و اجداد کا دین ہے اور جو شخص تقیہ نہیں کرتا اس میں ایمان ہی نہیں ہے" جناب خمینی صاحب اپنی تصانیف اور تالیفات میں ان تمام امور کی بھرپور اور زوردار تائید کی ہے۔ (مرتب)

[2] یہ بات خالصتہً تقیہ پر مبنی ہو سکتی ہے۔ (مرتب)

اور کہتے آئے ہیں، موجودہ دور میں بھی یہ رائے رکھنے والے شیعہ علماء موجود ہیں کہ قرآن مجید کا اصل نسخہ جو حضرت علیؓ نے مرتب کیا تھا ائمہ معصومین کے پاس خفیہ طور پر منتقل ہوتا چلا آیا ہے اور وہ اب امام مہدی کے پاس ہے جو ۲۶۰ھ سے غائب لیکن کسی پہاڑ کی کھوہ میں زندہ موجود ہیں اور وہ قربِ قیامت اپنی پناہ گاہ سے قرآن مجید کا نسخہ لے کر آئیں گے اور دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔[ل]

ل؎ "اصولِ کافی" میں حضرت جعفر صادقؒ اور حضرت باقرؒ سے منسوب تحریفِ قرآن کے متعلق جو روایات منسوب کی گئی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۱۵ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا.... الخ کے متعلق "اصول کافی" میں روایت ہے کہ امام جعفر صادقؒ نے قسم کھا کر فرمایا کہ یہ پوری آیت اس طرح نازل ہوئی تھی۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ كَلِمَاتٍ فِي مُحَمَّدٍ وَعَلِيٍّ وَفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ وَالْأَئِمَّةِ مِن ذُرِّيَّتِهِم فَنَسِيَ ...... (هٰكذا والله انزلت على محمد صلى الله عليه وآله وسلم)

"اور ہم نے پہلے ہی آدم سے کچھ باتوں کا عہد لیا تھا محمدؐ اور علیؓ اور فاطمہ اور حسن اور حسین اور ان کی نسل سے پیدا ہونے والے اماموں کے بارے میں۔ پھر وہ اسے بھول گئے" (پھر امام جعفر صادق نے فرمایا) "خدا کی قسم یہ آیت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اسی طرح نازل ہوئی تھی۔

(۲) سورہ بقرہ کی آیت ۲۳ " إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ کے مطابق "اصول کافی" میں حضرت باقرؒ سے روایت کیا گیا ہے "جبرئیل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت اس طرح لے کر نازل ہوئے تھے کہ اس میں "عَلىٰ عَبْدِنَا کے بعد اور فَأْتُوا" سے پہلے "فِي عَلِيٍّ" کا لفظ تھا۔

(۳) سورۂ احزاب کی آیت ۷۱ کے آخری ٹکڑے: وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ کے متعلق اسی "اصولِ کافی" میں حضرت جعفر صادقؒ سے یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ یہ آیت اس طرح نازل ہوئی تھی: وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فِي وِلَايَةِ عَلِيٍّ وَالْأَئِمَّةِ مِن بَعْدِهِ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا۔ یعنی خط کشیدہ الفاظ قرآن میں سے حذف کر دیئے گئے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

صلِ گفتگو امامتِ معصومہ کے تصوّر، اس کے لوازم، اس کے عقائد کا ایک بہت ہی ہلکا سا خاکہ میں نے پیش کیا ہے جس سے دو اور دو چار کی طرح یہ بات ثابت د جاتی ہے کہ اہلِ سنّت کا خلافت کا تصوّر، نظریہ، عقیدہ کہ جس میں انبیاء علیہم السلام کے سوا ی کے لئے بھی خواہ وہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہی کیوں نہ ہوں معصومیت کا مور شرک فی المعصومیتِ الرّسالت ہو جائے گا۔ اور اہلِ تشیع کا امامت معصومہ کا تصوّر، نظریہ، یدہ کہ جا ـــ ان دونوں کے مابین ہر اعتبار سے تضاد و تصادم ہے اور بُعد المشرقین ہے۔ ، میں مطابقت ناممکن ہے، محالِ مطلق ہے۔ چنانچہ کوئی سیاسی ہیئت حاکمانہ اور انتظامیہ ں متضاد عقائد کو اپنے اندر کسی طریقہ سے ملا نہیں سکتی جذب نہیں کر سکتی۔ لہٰذا نظام یا تو نی مکتبِ فکر پر قائم ہوگا۔ یا امامی تصوّر پر ـــ میں شیعہ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ امامی کہہ رہا ہوں۔ بجہ اس تصوّرِ امامت کی بھی بہت سی شاخیں ہوگئی ہیں۔

تہ کی مجمل تاریخ اور مختلف شاخیں امامتِ معصومہ کے جتنے بھی قائلین ہیں ان میں سے چھ ائمہ تو سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ پہلے امام ضرتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ دوسرے حضرتِ حسن، تیسرے حضرتِ حسین رضی اللہ تعالیٰ ہما۔ چوتھے حضرت علی بن حسین جو زین العابدین کے نام سے مشہور ہیں۔ پھر پانچویں ان کے بیٹے ضرت محمد باقر اور چھٹے ان کے بیٹے حضرت جعفر صادق رحمہم اللہ۔ اس کے بعد ایک تقسیم لئی ـــ ایک تقسیم اوپر بھی ہوگئی تھی لیکن ان کو امامیہ کہنا درست نہیں۔ حضرت زین العابدین ۃ اللہ علیہ کے ایک بیٹے تو حضرت محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ تھے اور دوسرے بیٹے حضرتِ زید ۃ اللہ علیہ تھے۔ ان آخر الذکر کو ماننے والے زیدیہ ہیں جو فی الوقت قابلِ لحاظ تعداد میں

تسلسل

(۱۷) تیرھویں صدی مشہور شیعی عالم و مجتہد علامہ نوری طبرسی کا مقام و مرتبہ اور ان کی عظمت و تقدیس کا اہل تشیع میں جو درجہ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کو نجف اشرف میں مرتضوی کی عمارت میں دفن کیا گیا جو شیعہ حضرات کے نزدیک روئے زمین کا مقدس ترین مقام ہے۔ انہوں نے فصل الخطاب، نامی اپنی کتاب میں جو قرآن میں تحریف، حک و اضافہ اور تغیر و تبدل کو ثابت کرنے کے لئے تصنیف کی گئی تھی ایک پوری سورہ "سورۃ الولایۃ" اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی ہے کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اور یہ سورہ جو قرآن میں شامل تھی لیکن اسے ساقط کر دیا گیا ہے ـــ ان طبرسی صاحب کی جنابِ خمینی صاحب نے بڑی مدح کی ہے (مرتب)

یمن میں آباد ہیں۔ گویا ایک تقسیم تو حضرت علیؓ بن حسینؓ یعنی حضرت زین العابدینؒ کے بعد سے شروع ہو گئی تھی۔ جو اسماعیلی کہلاتے ہیں۔ یہ اصل تقسیم جو شروع ہوئی ہے وہ حضرت محمد باقرؒ کے دو بیٹوں کے مابین ہوئی ہے۔

اسماعیلی: حضرت محمد باقرؒ کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؒ تھے، جن سے تاحال اسماعیلی چل رہے ہیں۔ یعنی جو حضرت اسماعیل کو امام وقت اور پھر انہی کی نسل میں امامت تسلیم کرتے ہیں۔ ان اسماعیلیوں کا امام معصوم ہر زمانہ اور ہر دور میں "حاضر" رہتا ہے۔ پھر ان اسماعیلیوں کی بھی آگے چل کر تقسیم ہو گئی۔ ان میں سے ایک شاخ تو وہ ہے جو اصل اسماعیلی ہیں اور دنیا کے مختلف علاقوں کے علاوہ پاکستان میں بھی موجود ہیں۔ یہ اب آغا خانی بھی کہلاتے ہیں۔ پرنس آغا عبدالکریم صاحب ان کے امام حاضر ہیں وہ ان کے نزدیک معصوم عن الخطاء ہیں، وہ مامور من اللہ ہیں۔ قرآن کا حقیقی مفہوم صرف وہی جانتے ہیں اور وہی بیان کر سکتے ہیں۔ یہ ہے اسماعیلیت اور اصل امامیت یہی ہے۔ چونکہ یہ "امام حاضر" کو مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں اور ان کو ان تمام صفات سے متصف قرار دیتے ہیں جو امامتِ معصومہ کے لوازم ہیں۔ ان کے امام حاضر کو تحلیل وتحریم اور اصولِ دین کے تغیر و تبدل کے تمام اختیارات حاصل ہیں۔ چنانچہ نماز، روزہ زکوٰۃ ان کے یہاں فرض عبادات سے اب خارج ہیں۔

داؤدی یا بوہری: جب کہ انہی اسماعیلیوں کی دوسری شاخ وہ ہے کہ جن کے نزدیک ایک مرحلہ پر ان کے امام بھی غائب ہو چکے ہیں اور تاحال روپوش ہیں، ان کا ظہور ہوگا۔ اب ان تمام کے نائب داعی کہلاتے ہیں۔ بمبئی (بھارت) سے جو برہان الدین صاحب یہاں تشریف لایا کرتے ہیں اور ان کی پاکستان آمد پہ ہمارے اخبارات میں بڑے نمایاں طور پہ ان کی یہاں تشریف لانے کی خبریں چھپا کرتی ہیں۔ یہ داؤدی یا بوہری شیعہ کہلاتے ہیں انہیں عام طور پہ "خوجے" بھی کہا جاتا ہے۔ کراچی میں ان کی "آدم مسجد" کے نام سے ایک شاندار مسجد بھی ہے جبکہ آغا خانی شیعوں کے ہاں سرے سے مسجد کا تصور ہی نہیں ہے۔ ان کے یہاں جماعت خانے ہوتے ہیں۔ ان داؤدی یا بوہریوں کے یہاں بھی امامت غائب ہو چکی ہے لیکن اثنا عشری شیعوں کی امامت کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ حضرت اسماعیلؒ سے ان کی شاخ علیحدہ ہو چکی تھی اور غالباً ان کے اٹھائیسویں امام غائب ہیں اور وہ بھی ان کے ظہور کے منتظر ہیں۔

اثنا عشری: حضرت محمد باقرؒ کے چھوٹے بیٹے تھے۔ حضرت جعفر صادقؒ جن سے اثنا عشری شیعوں کا سلسلہ چلا ہے ـــ حضرت جعفر صادقؒ کے بیٹے تھے حضرت موسیٰ کاظم۔ ان کو امام تسلیم کرنے والے موسوی شیعہ کہلاتے ہیں۔ ایران میں انہی اثنا عشری شیعوں کی عظیم ترین اکثریت ہے۔ پاکستانی شیعوں میں بھی یہی اکثریت میں ہیں۔ اس موسوی سلسلہ کو ماننے والوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت موسیٰ کاظمؒ کے بعد پانچ امام اور رہے ہیں جن میں سے چار کے متعلق اہل سنّت بھی مانتے ہیں کہ تاریخی طور پر یہ شخصیتیں گزری ہیں۔ یہ چار حضرات ہیں علی رضا بن موسیٰ کاظمؒ ان کے بیٹے محمد تقی، ان کے بیٹے محمد نقی اور ان کے بیٹے حسن عسکری رحمہم اللہ۔ تاریخی طور پر ان چاروں پر شیعہ سنّی دونوں کا اتفاق ہے۔ پانچویں کے متعلق اختلاف ہے۔ سُنّی مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت حسن عسکریؒ کے یہاں اولاد ہوئی ہی نہیں تھی۔ وہ ۲۶۰ھ میں لاولد فوت ہو گئے تھے[1] ہمارے اثنا عشری بھائی یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسن عسکری کے ایک صاحبزادے تھے۔ ہمارے بارہویں امام ہیں۔ ان کا نام محمد بن حسن عسکری اور لقب امام ہے۔ یہ اپنے والد کے انتقال کے وقت قریباً پانچ سال کے تھے۔ چونکہ خطرہ تھا کہ بنو عباس کی حکومت ان کو کہیں شہید نہ کرا دے لہٰذا وہ اپنے ہی شہر سُرَّ مَنْ رَّأی کے ایک غار میں اپنے والد کی وفات سے دس دن پہلے روپوش ہو گئے اور وہ اس وقت سے غار میں معجزانہ طور پر چھپے ہوئے ہیں۔ ۲۶۰ سن ہجری سے لے کر اب ۱۴۰۵ ہجری شروع ہو گئی ہے۔ گویا گیارہ سو پینتالیس برس ان کو چھپے ہوئے ہو گئے ہیں۔ شیعی روایات یہ بھی ہیں کہ وہ تمام چیزیں جو حضرت علیؓ سے منتقل ہو کر ہر امام کے پاس رہتی تھیں اور آخر میں امام حسن عسکری کے پاس تھیں جیسے حضرت علیؓ کا جمع کیا ہوا اصلی اور کامل قرآن۔ اس کے علاوہ تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے اصل نسخے اور بے شمار وہ چیزیں جو کسی نہ کسی طور پر انبیاء علیہم السّلام سے منسوب ہیں۔ ان امام مہدی غائب کے پاس موجود ہیں۔

پس یہ ہیں اہل تشیع کی چار مشہور شاخیں۔ زیدیہ[1]، اثنا عشری[2]، اسماعیلیہ[3] اور

---

[1] "اصول کافی" ہی میں یہ روایات بھی موجود ہیں کہ حسن عسکریؒ کے حقیقی بھائی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ حسن عسکری لاولد فوت ہوئے اور حکومت کے ذمہ داروں کو بھی تحقیق و تفتیش سے یہی ثابت ہوا چنانچہ ان کا ترکہ شرعی قانون کے مطابق ان کے بھائی اور دوسرے موجود وارثوں میں تقسیم کر دیا گیا (مرتب)

داؤدی بوہرے[1]، جو امامت کے نظریہ اور عقیدہ کے تحت چل رہی ہیں اور جو خلافت کے نظریہ اور عقیدہ کے حامل ہیں وہ ہیں اہل سنّت والجماعت ـــ جن میں پانچ مسالک ہیں جن کا تعلق عقائد سے نہیں ہے بلکہ معاملات سے، فقہ سے، قانون سے تعبیر سے، افضل و مفضول اور راجح و مرجوح سے ہے۔ یہ ہیں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور سلفی۔ یہ فقہی مکاتب ہیں۔ فرق نہیں ہیں۔ اصلاً فرقے دو ہی ہیں۔ اہل سنت والجماعت اور اہل تشیع۔

غیبت کا عقیدہ اب آئیے غیبت کے مسئلے کی طرف۔ چونکہ اثنا عشری اہل تشیع کی عظیم اکثریت ہے۔ ایران میں تو یہی حضرات غالب اکثریت میں ہیں اور پاکستان میں بھی شیعوں میں انہی کی اکثریت ہے۔ لہٰذا اب گفتگو انہی کے عقیدہ کے نقطۂ نظر سے ہوگی۔

غیبتِ صغریٰ: شیعی روایات کے مطابق اثنا عشری شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اس روپوشی کے بعد چند سال تک ان کے خاص محرم راز ان کے پاس جاتے رہے اور ان سے ہدایات لاتے رہے۔ اس روپوشی کو وہ غیبتِ صغریٰ کہتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس کے بعد ان سے رابطہ کا کوئی تعلق باہر والوں کا باقی نہیں رہا۔ میں نے جو گیارہ سو پنتالیس سال بیان کئے تھے تو اگر یہ مان لیا جائے کہ ان میں سے ابتدائی دس سال وہ ہیں جن میں رابطہ قائم رہا۔ تو گویا اس غیبت پر گیارہ سو پینتیس سال گزر چکے ہیں۔

غیبتِ کبریٰ: اس طویل غیبت کے عرصہ کو اثنا عشری شیعہ غیبتِ کبریٰ قرار دیتے ہیں جو تا حال جاری ہے۔ اس طویل عرصہ میں امام غائب (امام مہدی) سے کسی کا کوئی رابطہ قائم نہیں رہا۔ لیکن اثنا عشری شیعہ حضرات کے عقائد میں یہ بات جزوِ ایمان کی حیثیت رکھتی ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے تا قیامِ قیامت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارہ امام خلافت و امامت کے لئے نامزد ہیں اور ان کی نامزدگی خود حضورؐ نے فرما دی تھی۔ لہٰذا امام غائب ہی کا دورِ امامت جاری ہے ـــ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے خلاف اعیاذ باللہ حضرت علیؓ کی خلافت سے قبل اہلِ تشیع کے عقیدے کے مطابق غاصبانہ طور پر خلفاءِ ثلاثہ حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم متمکن رہے جس پر نہ صرف صحابہ کرامؓ نے احتجاج کیا اور نہ خود حضرت علیؓ نے اپنے "حق" کے لئے کوئی کوشش کی۔ بلکہ انہوں نے خلفاءِ ثلاثہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ مستند روایات کے مطابق

---

[1] تضادِ فکری ملاحظہ فرمائیے۔ ایک طرف یہ عقیدہ اور یہ دعویٰ کہ حضرت علی کو اللہ اور اس کے رسول نے

آنجناب اس پر بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے۔ آپ کا پورا دورِ خلافت باہمی جنگ و جدال کی نذر ہوا جس میں طرفین کے چوراسی ہزار کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلوار دل سے کھیت رہے۔ آپ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت ہوئی لیکن نبی اکرمؐ کی پیشین گوئی کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امّت کی خیر خواہی اور وحدت و اتحاد کے عظیم ترین مقصد و مصلحت کی خاطر از خود خلافت سے دست برداری کا فیصلہ فرمایا اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی۔ چنانچہ پوری اسلامی مملکت میں کامل امن امان قائم ہو گیا اور پیغامِ ربانی کی تبلیغ اور طاغوتی نظام ہائے حکومت پر اظہارِ دین الحق کی توسیع کے عمل کی تجدید ہو گئی ــــ گویا حقیقی معنوں میں پورے عالمِ اسلام پر اعیاذ باللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نامزدگی کے باوجود ان بارہ مامور من اللہ ائمہ معصومین کی ایک دن بھی خلافت و حکومت بالفعل قائم نہیں ہوئی۔

غیبتِ کبریٰ کے عقیدے کی اصل غرض و غایت! 'اصولِ کافی' میں حضرت جعفر صادق رحؒ سے منسوب کر کے متعدد روایات نقل کی گئی ہیں جن کا مفاد یہ ہے کہ "یہ دنیا امامِ معصوم کے بغیر ایک لمحہ بھی قائم نہیں رہ سکتی" یعنی اگر امام نہ رہے تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔ پھر انہی حضرت جعفر صادقؒ سے یہ روایات بھی منسوب ہیں کہ "امامت ایک عہد ہے اللہ عزّ وجل کی طرف سے متعین اشخاص کے لئے (لہٰذا کسی) امام کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے اللہ کے نامزد امام کے سوا کسی دوسرے کی طرف امامت منتقل کر دے"؛ نیز بعض دوسری روایات کا حاصل یہ ہے کہ امام کا بیٹا ہی امام ہو سکتا ہے۔ کوئی قریب ترین عزیز بھی نہیں ہو سکتا ــــ یہ اصول تو خود شیعوں کی تاریخ کے مطابق بھی ٹوٹ گیا ہے چونکہ ان کے بقول حضرت حسن رضؓ کے بعد امام حضرت حسین رضؓ

(مسلسل) خلیفہ بلا فصل اور امام ماموُر فرمایا تھا اور دوسری طرف حضرت علیؓ کا یہ طرزِ عمل؛ یہ تضاد معمولی عقل کا شخص بھی معلوم و محسوس کر سکتا ہے۔ اسی تضاد کو دور کرنے کے لئے "تقیہ" کا باطل عقیدہ گھڑنا پڑا۔ لیکن یہ نہیں سوچا کہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ اسد اللہ کو محض اپنی جان بچانے کے لئے تقیہ جیسے مکروہ عمل کی پناہ لینی پڑی۔ العیاذ باللہ! اہلِ سنّت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اسد اللہ ہرگز کسی باطل طاقت کے سامنے جھکنے والے نہیں تھے۔ اور اللہ و رسول کی کسی طور پر بھی العیاذ باللہ معصیت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا اہلِ تشیع کا سارا تانا بانا باطل ہے (مرتب)

تھے جو حضرت حسن رضؓ کے بھائی تھے نہ کہ بیٹے ۔ شاید اسی لئے ایک اور روایت وضع کی گئی کہ یہ سلسلہ حضرت حسین رضؓ سے چلے گا ۔ پھر یہ کہ حضرت حسن رضؓ کی نصب خلافت کے لئے باقاعدہ بیعت ہوئی تھی ۔ ان کو حضرت علی نے وفات کے وقت نامزد نہیں فرمایا تھا ۔ لوگوں نے جب آنجناب رضؓ سے پوچھا کہ " کیا ہم آپ کے بعد حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں تو آپ نے جواب میں فرمایا " میں اس سے نہ تم کو روکتا ہوں اور نہ اس کا حکم دیتا ہوں ـــ یہ بات تواریخ میں موجود ہے خواہ وہ سنّیوں کی لکھی ہوئی ہوں یا شیعوں کی ـــ پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ " مامور من اللہ امام " نے از خود خلافت سے دست برداری اختیار کر کے حضرت معاویہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی ۔ طاعت کرلی[ا] ۔ اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ جس میں سنّیوں کے علاوہ شیعہ مؤرخین بھی شامل ہیں کہ حضرت حسن عسکریؒ لاولد فوت ہوئے تھے لہٰذا سابقہ روایات کی رو سے مسئلہ پیدا ہونا ایسی صورت میں " امامت معصومہ " کے عقیدے کی بقا اور اس کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں ! چنانچہ سنّی محققین کی رائے یہ ہے کہ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہ دعویٰ کیا گیا اور اس کو شہرت دی گئی کہ حسن عسکری رح کے یہاں ایک صاحب زادے محمد تھے جن کا لقب امام مہدی ہے روپوش ہو گئے اور تا حال روپوش ہیں ۔ یہی امام آخر الزماں ہیں اور چونکہ اگرچہ غائب ہیں لیکن زندہ موجود ہیں اس لئے یہ دنیا بھی قائم ہے ۔ یہ عقیدہ وضع نہ ہوتا تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا کہ امام معصوم کے بغیر کاروبار کیسے چل رہا ہے ! اس استبعاد کو دور کرنے کے لئے " غیبت کبریٰ " کے افسانہ طرازی کی ضرورت ہوئی ۔ واللہ اعلم !

(جاری ہے) ۔

[ا] آنجناب رضؓ کا قیامت تک کے لیے امت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر احسان ہے کہ آپ رضؓ نے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق مسلمانوں کے دو متحارب گروہوں میں خالصتاً للہ فی للہ خلافت سے دست برداری اختیار کر کے صلح کرادی اور پوری اسلامی دنیا میں امن و امان قائم قائم ہو گیا ۔ حضرت حسن رضؓ کا یہ عمل چونکہ سبائی یہودی سازش کے خلاف تھا لہٰذا ان کو امام معصوم سمجھنے والوں نے خود انکی حیات میں انکو عار المؤمنین اور مذل المؤمنین جیسے تحقیر و توہین آمیز خطابات سے نوازا تھا (مرتب)

ضروری وضاحت منجانب مرتب

محترم ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر میں جو فٹ نوٹ مرتب کی جانب سے شامل ہیں ان میں سے متعدد امور مولانا محمد منظور نعمانی دامت فیوضہم کی تازہ ترین تالیف " ایرانی انقلاب ۔ امام خمینی اور شیعیت " سے ماخوذ ہیں ۔ جو قارئین اس مسئلہ سے کماحقہ واقفیت کے خواہش مند ہوں ان کو اس کتاب کے مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے ۔



بہار' رنگارنگ پھولوں' شاداب چہروں اور بیدار آنکھوں کا موسم
پھر بھی کچھ چہرے بے آب اور کچھ آنکھیں بے رونق کیوں؟

موسم بہار میں چہار سو نئی کونپلیں اور تازہ پھول کھل اٹھتے ہیں اور روئے زمین پر زندگی انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے۔

اس موسم بیدار میں صحت بخش خون چہروں پر حسن بن کر جھلک اٹھتا ہے اور آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن اگر خون میں فاسد مادے سرایت کر جائیں تو پھوڑے پھنسیوں' مہاسوں اور کئی دوسری جلدی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس سے چہرے بے آب اور آنکھیں بے شباب نظر آتی ہیں۔

بہار کے موسم میں صافی کا باقاعدہ استعمال فاسد مادوں کو خارج کر کے خون کو صاف اور صحت بخش رکھتا ہے اور یہی صاف خون چہروں پر حسن بن کر جھلک اٹھتا ہے۔

جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ
صافی
سے خون صاف' چہرہ شاداب

ہم خدمت خلق کرتے ہیں

Adarts HSF 1/84

نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:

کیا ہم آپ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اِسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے



فریش ویل سویٹس
پاکستانی تہذیب
کا آئینہ دار
صدیوں پرانی روایات کی حامل ہماری مٹھائیاں اور حلوہ جات یقیناً ہمارے ذائقے اور لذت کی غمازی کرتی ہیں۔ احمد نے اس قدیم پیشے کو جدید دور کے تقاضوں سے ہمکنار کیا اور اپنی مصنوعات کو بالکل منفرد انداز میں پیش کیا۔
دنیا کے ہر براعظم میں احمد کی مٹھائیاں اور حلوہ جات پاکستانی تہذیب اور روایات کی شناخت ہیں۔
حلوہ جوزی
Freshwel
جدید ترین نائٹروجن پیکنگ پلانٹ پر سیلوفین پیکنگ کے ساتھ پیک کئے جاتے ہیں تاکہ تازگی اور خستگی ہمہ وقت برقرار رہے
ٹین کے لیڈ بغیر ٹین کٹر آسانی سے کھل جاتے ہیں۔
سوہن حلوہ
کراچی حلوہ
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
رس گلے
زعفرانی جامن
سوہن ڈیلائیٹ
تلے ہوئے مصالحہ دار بادام
مٹھائیوں میں روایتی اور صنعتی معیار کے خالق
AHMED
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی-۱۱۲، سائیٹ، کراچی۔ فون: ۹۵-۲۹۴۲۹۱

MASS

مکتوب گرامی مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

مہتمم و شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ - دہلی / بھارت

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

قرآنی محاضرات میں شرکت کا دعوت نامہ ملا -

یادفرمائی کا شکریہ !

اس موقع پر یہ سعادت میرے حصہ میں آتی نظر نہیں آتی ، اوّل تو تین ماہ کے بعد پھر ویزا کا ملنا مشکل ہے - نومبر ۸۴ میں آپ سے ملاقات ہو چکی ہے ، سال بھر میں ایک دفعہ ہی ویزا ملتا ہے — سفارش کا چکر میرے بس کا نہیں ،

دوسرے آخر سال ہے کتابیں پوری کرانی ہیں ، ایک مہینہ کی غیر حاضری پہلے ہی ہو چکی ہے - انشاء اللہ اگلے اجلاس میں ملاقات ہوگی -

---

تازہ میثاق بھی نظر سے گذرا اور آنجناب کا تبصرہ بھی پڑھا ، واقعی اس مضمون میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کا اسم گرامی رہ گیا ، مولانا عثمانیؒ جماعت شیخ الہند میں اپنے علم وفضل اور اپنے استاذ کی نظر میں قابل اعتماد ہونے کے ناطے بڑی وقیع شخصیت کے مالک تھے تفسیر قرآن حکیم پر مولانا کا کام بڑا اہم ہے اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ کے ساتھ مولانا عثمانیؒ کے تفسیری حواشی اس خاص تعلق ونسبت کی دلیل ہیں -

میں نے محاسن موضح قرآن میں مولانا عثمانیؒ کی قرآنی خدمات کا مفصل تذکرہ کیا ہے.

لیکن دعوت قرآنی کا جہاں تک تعلق ہے جس کا مفہوم میرے نزدیک قرآن کریم کے ذریعہ اسلام کی اصولی دعوت پیش کرنا ہے اور اس کے لئے اپنے آپکو تقریر، وعظ اور تحریر ہر سطح پہ سرگرم عمل رکھنا ہے —

اس میدان میں مولانا عثمانی مرحوم مولانا آزاد ، مولانا احمد علی صاحب لاہوری مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا احمد سعید صاحب دہلوی رحمہم اللہ کے زمرہ میں شامل نہیں ہوتے -

تفسیر قرآن حکیم لکھنے کے معاملہ میں مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کو اس

حلقہ میں تقدم کا شرف حاصل ہے۔ اور بعد کی اردو تفسیروں کیلئے حضرت تھانوی ؒ کی بیان القرآن ایک اہم مأخذ رہی ہے، پھر مولانا مفتی محمد شفیع ؒ کی معارف القرآن بھی حضرت شیخ الہند ؒ کے حلقہ کی بیش قیمت قرآنی خدمت کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن دعوتِ قرآنی کی جس تحریک کا اس مضمون میں ذکر کیا گیا ہے اس کا مفہوم الگ ہے۔

آپ نے علماء دیوبند کے ایک حلقہ کے اس طعنہ کا ذکر کیا کہ یہ کانگریسی مولوی ہیں — دراصل یہ طعنہ یہ حضرات اپنے تقاعد کو چھپانے کے لئے دیتے رہتے ہیں۔

حضرت تھانوی ؒ کی یہ بات مشہور ہے کہ کسی موقعہ پر خانقاہ کے اندر مولانا حسین احمد صاحب مدنی ؒ کے کانگریسی ہونے پر بعض طعن کیا گیا تو حضرت تھانوی ؒ نے اسے ناپسند فرمایا اور کہا ”مولانا مدنی قائم ہیں اور ہم قاعد ہیں“۔

اسی طرح مولانا مدنی ؒ اس اختلافی دور میں لوگوں کو مولانا تھانوی ؒ کے پاس بیعتِ طریقت کے لئے بھیجا کرتے تھے،

دراصل دونوں طرف حاشیہ نشین مفاد پرستوں کا ایک حلقہ تھا جو اس اجتہادی اختلاف کی آڑ میں ان بزرگوں کے درمیان چپقلش پیدا کرنے میں سرگرم رہتا تھا، اور اس میں اس کا مفاد تھا،

ان بزرگوں کے درمیان جو اخلاص قائم تھا وہ دونوں حلقوں کی نوجوان نسل کے لئے مشعل راہ ہے۔

مولانا عثمانی ؒ اور مولانا مدنی ؒ کی سیاسی کشمکش کے دور میں ایک دفعہ پنجاب کے احراری لیڈر کے ایک صاحبزادے کی طرف سے مولانا عثمانی ؒ کی شان میں ایک بیہودہ قلمی پوسٹر چسپاں کیا گیا — یہ بے ہودگی مولانا مدنی ؒ کے علم میں آئی، مولانا حسب معمول دارالحدیث میں سبق پڑھانے کے لئے تشریف لائے اور چوکی پر بیٹھتے ہی فرمایا:

> ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی شان میں گستاخی کی گئی ہے، میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ سلسلہ اگر بند نہ کیا گیا تو میں ان لوگوں کے لئے تہجد کی نماز کے بعد بددعا کروں گا۔

یہ فرما کر سبق پڑھائے بغیر تشریف لے گئے — طلبہ میں کہرام مچ گیا، لڑکے

رونے لگے، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معافی مانگی،

مولانا عبید اللہ انور کا بیان ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جب مولانا عثمانیؒ کراچی کے لئے روانہ ہوئے تو اسکی اطلاع مولانا احمد علیؒ صاحب لاہوری کو دی، مولانا لاہوریؒ لاہور کے اسٹیشن پر پہنچے، مولانا عثمانیؒ سے ملاقات ہوئی مولانا نہایت سکوت کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے رہے - مولانا احمد علیؒ نے سکوت توڑتے ہوئے فرمایا — "حضرت خدا کی مشیت اسی طرح تھی - اگر آپ ادھر تشریف نہ لاتے تو خدا جانے ہم کس بدایونی کے حوالہ کر دیئے جاتے" مولانا نے سر اٹھایا — اور فرمایا "مولانا صاحب میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے یہ راستہ کسی ذاتی عناد کے سبب اختیار نہیں کیا، میں نے استخارہ کر کے مولانا تھانوی کے مسلک کو راجح پایا اس لئے اسے اختیار کیا"

ہندوستان میں تو خیر — ماضی کی وہ تلخیاں ختم ہو گئیں، دارالعلوم کے قضیہ نے چند دنوں کے لئے تازہ کر دی تھیں - مگر جہاں پوری ملت دفاعی محاذ پر سرگرم ہے وہاں اس کا کیا موقعہ رہ گیا ہے کہ لیگی اور کانگریسی کی تقسیم موجود رہے،

البتہ پاکستان میں علماء دیوبند کے ان دونوں حلقوں میں جو تناتنی اور غیریت کارفرما ہے وہ انتہائی افسوسناک اور شرمناک ہے -

میرے ایک رفیق درس دہلوی فاضل کراچی میں دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں، یہ مولانا مدنیؒ سے خاص عقیدت رکھتے تھے، ان کے ساتھ مخالف طبقہ نے وہ سلوک کیا کہ یہ پاگل ہو گئے — ایک طرف ترکِ وطن کی پریشانیاں، دوسری طرف اس مذہبی فرقہ پرستی کی کاری ضرب — ایک قیمتی جان بے کار ہو گئی -

بہرحال اس بحث کی برکت سے پاکستان کی نوجوان دیوبندی نسل کے سامنے ان بزرگوں کے اخلاص کی داستانیں آگئیں میں جماعت شیخ الہند کی اصطلاح اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ دونوں دیوبندی حلقے ماضی کی تنگ نظری سے نکل کر پاکستان کے ماحول میں دینی خدمت کے تقاضوں کے لئے متحد ہو جائیں اور دینِ برحق کے قیام کی تحریکوں کے ساتھ تعاون کریں -

ملت کے سنجیدہ اور دانش مند طبقہ میں تب ہی ہماری بات بنے گی - والسلام

اخلاق حسین قاسمی (۱۲، فروری ۸۵ء)


THE ORIGINAL
Have a Coke and
paragon

افکار و آراء

[اس عنوان کے تحت شائع شدہ آراء سے ادارے کا بالکلیہ متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

دیوبندی حلقہ کی تنگ نظری!

مکرمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! السلام علیکم

اس ماہ کے میثاق میں جو تسلسل مسئلہ امامت کا چل رہا ہے، اس کے ضمن میں قدم قدم پر ہمارے مخلص و محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، علمائے دیوبند کی عظمت و جلالتِ شان کے گیت گا رہے ہیں، اور عظمت و تقدس کے جتنے القاب و آداب ہو سکتے ہیں وہ سارے کے سارے بزرگانِ دیوبند کی شان میں موقع و بے موقع صرف کر رہے ہیں، محض اس جذبے کے تحت کہ دیوبند کی برادری ان القاب و آداب کے ساتھ علمائے دیوبند کے مناقب و اوصاف کو پڑھ کر ہمارے مستحق ترین فرد، جناب اسرار احمد صاحب کی امارت پر متفق ہو جائے گی، مگر یہ ان کا خیال خام ہے، وہ برادری اپنے سے باہر کسی کی عظمت و امامت کی قائل ہی نہیں، اور کسی کو مانتی ہی نہیں۔ اور اگر مانتی بھی ہے تو بس اس قدر کہ یہ باعظمت بزرگ ہمارے طبقۂ علماء کے حلقہ بگوشوں اور خدام میں سے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جس میں سرِفہرست علامہ سید سلیمان ندوی ہیں، یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہمیں تو سرِدست صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ معاصر علماء کو چھوڑ کر اس مرتبہ میثاق میں عہد قدیم کے اساطین و اسلاف پر بھی ہاتھ صاف کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی سے شیخ الہند کو بایں معنی مماثلت دی گئی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے تو کتب ہائے جلیلہ و صحائف نادرہ یادگار چھوڑی ہیں اور ہمارے شیخ الہند نے زندہ افراد، اور متحرک اجسام یادگار چھوڑے ہیں، جو علوم و فنون کے جبال ہیں۔ جیسے انور شاہ کاشمیری، شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد، مفتی کفایت اللہ وغیرہ وغیرہ۔ بھلا بتائیے ان جبالِ علوم کو کیا نسبت ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی کارناموں سے! اور ان جبالِ علوم نے کونسی نادر تصنیفات و تالیفات یادگار چھوڑی ہیں اور کس علم و کس فن میں اپنی یکتائی کا ثبوت دیا ہے۔ وہی عام کتابیں ہیں جو عام علماء لکھتے ہی رہتے ہیں اور مکھی پر مکھی بٹھاتے رہتے ہیں نقل اقوال کے سوا ان کو کچھ آتا ہی نہیں ہے، کسی بھی مسئلے میں اجتہاد و ندرتِ فکر کا ثبوت دیا ہی نہیں، اور اگر دیا بھی ہے تو ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے امت میں اختلاف و انتشار پھیلا ہے۔ برخلاف اس کے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے تلامذہ ایسے جلیل القدر افراد ہیں جنہوں نے علوم و فنون کی دنیا میں اپنے اجتہادِ فکر اور ندرتِ افکار سے چمن کے چمن کھلائے ہیں۔ مثلاً صرف علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ ہی کو لے لیں۔ اوّل الذکر حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کے شاگرد ہیں اور انہوں نے فلاسفۂ یونان کا

وہ سارے کے سارے دلائل اپنے استدلالاتِ قویہ سے باطل کر دیئے ہیں، جن پر حکمائے یونان کو ناز تھا اور جن کی بنا پر ایران کا دعویٰ تھا کہ ہم نے مذہب کی بنیادیں گرادی ہیں ـــــ ہر چند کہ یہ دورِ علوم کے انحطاط کا دور ہے اور سارے مکاتبِ فکر کے علماء، علومِ حکمیہ سے بیگانہ ہو کر علومِ حدیث وعلومِ قرآن کی تحصیل کر رہے ہیں، جس کی بنا پر ہمارے مذہب کی اساسِ فکر سے باخبر نہیں۔ اور علومِ حکمیہ جو صرف آلہ تھے، علومِ احادیث وعلومِ قرآنیہ کے سمجھنے کے لئے، مقصود بالذات ہرگز نہ تھے، انہیں ترک کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ جدید علوم سے آراستہ اور فکر وخیال کی بلندیوں سے پیراستہ ملحد وبے دین افراد کی تسکینِ خاطر کا سامان اپنے پاس نہیں رکھتے۔

آپ اس میدان میں اترے ہیں تو اپنی ہمت سے کام لیجئے، آپ میں صلاحیتیں موجود ہیں۔ عَلَمِ امارت ہاتھ میں لیجئے اور میدان میں نکل پڑیئے۔ مولانا ابوالکلام نے یہی کیا تھا اور اپنے معاصر علماء میں سے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لائے تھے۔ اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ نے بھی یہی کیا کہ اپنی تحریک کو اپنے دست وبازو کی قوت سے چلاتے رہے۔ تحریکیں چلتی بھی ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ ان کی رفتارِ ترقی میں کمی بھی آجاتی ہے۔ مگر یہ وقتی وعارضی ہوتی ہے۔ ابوالکلام اور ابوالاعلیٰ کی تحریکیں باقی رہیں گی اور اس اساس پر کام کرنے والے پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہمت کیجئے اور میدان میں آجایئے!

آپ خود انصاف کیجئے کہ آپ نے ایک جملہ مولانا معین الدین کے سلسلے میں لکھ دیا تھا کہ مولانا ابوالکلام کو مسئلہ امارت میں شکست ہوگئی، اس ایک جملے پر سارے کے سارے علماء دیوبند آپ کے پیچھے پڑ گئے اور طرح طرح کی تاویلات کرتے رہے کہ شیخ الہند اس زد سے نکل جائیں اور مذہبی نہ سہی سیاسی امارت ہی ان کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اعترافِ خطا کوئی ایک بھی نہ کر سکا اور مولانا مسندِ امامت سے محروم ہو کر سیدھے ہندؤوں کی آغوش میں چلے گئے اور اپنی مذہبی تحریکات کو بھی بھول گئے جن کا آغاز خود انہوں نے کیا تھا۔

آپ کا مخلص

محمد شہاب الدین کریمی کراچی

مرعوب ذہن کے شاخسانے

"میثاق" بابتہ جنوری ۸۵ء کے صفحہ ۱ پر پیش منظر میں جو آپ نے ہوٹل فلیٹیز کے اجتماع میں سید اسعد گیلانی صاحب کی موجودگی کا بیان کیا ہے وہ وجہ حیرت نہیں۔ موصوف جماعتِ اسلامی کے ترجمانوں کے مقتدرین میں شامل ہیں اور ایران کے متعلق ان کے افکار اور نظریات ان کے "سفرنامہ ایران" کے ہر لفظ، خصوصاً ۸۴ صفحات کے پیش لفظ سے ٹپکتے ہیں جن میں ایرانی انقلاب کو محمدی انقلاب کا ہو بہو مثنیٰ ثابت کرنے

پر زورِ قلم صرف کیا گیا ہے۔ لاہور سے ہی ایک معتبر صاحب سے جو ماضی قریب تک جماعت ہی کے ایک موقر دینی جریدہ کے مدیر رہے ہیں معلوم ہوا کہ یہ سفرنامہ سفارت خانۂ ایران نے خرید لیا ہے تاکہ اس کی اشاعت مختلف زبانوں میں کرا کے دنیا بھر میں پھیلایا جا سکے اور موصوف کا ۲۷ صفحات کا کتابچہ "انقلاب ایران" جس کی قیمت ۶ روپے اس "سفرنامۂ ایران" کے صفحہ ۲۷۲ پر درج ہے وہ بھی اسی مقصد کے لئے خرید لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی تو کاپی ملتی ہی نہیں ہے میں نے اس کے پبلشر کو لکھا تو جواب آیا کہ ابھی تک شائع ہی نہیں ہوا حالانکہ جب تک کوئی کتاب شائع نہ ہو اشتہار میں اس کی ضخامت اور قیمت کا اظہار ناممکن ہے۔ اگر "انقلاب ایران" کا کوئی نسخہ یا عکسی نقل آپ کسی قیمت پر دلوا سکیں تو ممنون ہوں گا۔

اور سب سے بڑا کارنامہ تو گیلانی صاحب کا "امام خمینی۔ دعوت تحریک اور افکار" ہے جو خمینی صاحب کی "ولایت فقیہہ المعروف بہ حکومت اسلامیہ" کا (بقول ان کے) آزاد ترجمہ ہے۔ اس کے دیباچہ میں گیلانی صاحب نے خمینوی انقلاب کی جو پر زور قصیدہ خوانی کی ہے اس کی تائید و توثیق محمد نصر اللہ خان خازن مجددی صاحب نے اپنے "حرفِ اول" میں فرمائی ہے (ابلہ گفت و دیوانہ باور کرد)۔ گیلانی صاحب تو جو کچھ فرمائیں وہ تو ان کے "مرشد" کے افکار کی توسیع ہے لیکن تعجب تو یہ ہے کہ خازن صاحب جو خود کو "مجددی" کہتے ہیں وہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے رسالہ "ردّ شیعیت" کو بھی نظر انداز کر گئے۔ چشتیوں پر تفضیلیت کا الزام بھی ہے لیکن نقشبندی و مجددی حضرات تو رفض کی مخالفت میں بڑے متشدد ہیں اور اس جرم میں ان کے بزرگوں نے مصائب بھی برداشت کئے ہیں، حتیٰ کہ حضرت مجددؒ نے قید بھی جھیلی اور حضرت جانِ جاناںؒ شہید بھی کر دیئے گئے۔ اور ایک یہ "مجددی" ہیں کہ موجودہ خمینوی حکومت کو علیٰ منہاجِ خلافت ثابت کرنے پر علم و نکر و قلم کا سارا زور صرف فرما رہے ہیں" فاعتبروا۔ مجددی سلسلہ حضرت صدیق اکبرؓ سے ہی جاری ہوا اور یہ "مجددی" انہیں کو گالیاں دینے والوں کی مدح سرائی میں رطب اللسان ہیں۔

اگر آپ خمینی صاحب کی "اصل" "ولایتِ فقیہہ" یا "حکومتِ اسلامی" اور گیلانی صاحب نے جو اس کا "آزاد ترجمہ" مرقومہ بالا نام سے فرمایا بیک وقت مطالعہ کریں تو حیران رہ جائیں کہ علمی دنیا میں ایسی مترجمانہ بددیانتی بھی ممکن ہے۔ "آزاد ترجمہ" کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ مصنف کے نظریات کو چھپانے کے لئے اس کی عبارتوں کے ترجمہ میں تحریف کی جائے یا چھوڑ دی جائیں مگر موصوف نے یہی کرشمہ دکھایا ہے۔ خمینی صاحب نے جہاں جہاں صحابہؓ اور امہات المومنین پر سب و شتم کیا ہے اس کا ترجمہ آپ کو گیلانی صاحب کے قلم سے نہیں ملے گا۔ بلکہ ان حضرات کے ناموں کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" پائیں گے جو خمینی صاحب نے نہ لکھا اور نہ لکھ سکتے تھے۔ یہ بات عجیب ہے کہ اپنے افکار و نظریات کے اظہار میں خمینی صاحب تو

تقیہ کرتے نہیں (جو ان کے دین کا ۹۰٪ ہے) مگر گیلانی صاحب خواہ مخواہ ان کی پردہ پوشی فرماتے ہیں۔ خمینی صاحب نے "کشف اسرار" اور "توضیح المسائل" وغیرہ، نیز اب تک تمام تقاریر، خطبات اور بیانات میں جو دنیا بھر میں نشر ہوتی ہیں اور کتابی صورت میں بھی شائع ہوئیں کھلم کھلا اپنے سبائی عقائد کا اظہار کیا ہے، مگر گیلانی صاحب ان کے انہیں عقائد و گفتار و کردار کو خالص اور اصل اسلام ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ کیا یہ سب مفت کر رہے ہیں! یہ سوچنے کی بات ہے۔ والسلام

نیازکیش

خسروی، کراچی۔

غیرت و حمیتِ دینی

مکرمی! علامہ اقبال ایک نہایت ہی غیرت مند انسان تھے۔ انگریز "لارڈ ولنگڈن" کے زمانے میں علامہ اقبالؒ کو اپنا گورنر بنا کر جنوبی افریقہ بھیجنا چاہتے تھے۔ من جملہ شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ تمام سرکاری تقریبات میں "بیگم اقبال" ان کے ہمراہ ہوں گی۔ علامہ اقبال نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ بے شک میں ایک گنہگار مسلمان ہوں اور اعمال کے اعتبار سے مجھ سے بہت سی کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔ تاہم میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ محض ایک سرکاری عہدے کی خاطر اپنی بیوی کو بے پردہ کر دوں (از مولانا مودودی، ماہنامہ بتول اپریل ۷۲)

ایک مرتبہ علامہ مرحوم کسی مغربی ملک میں بصورت وفد گئے۔ تمام ارکانِ وفد اپنی بیویوں سمیت جا رہے تھے علامہ اقبال نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ ان کی بیگم پردے کی پابند ہیں اور ایسے وفدوں میں پردے کا ذکر تک نہیں آتا۔ (حکیم محمد حسین صاحب عرشی امرتسری)

ایک مرتبہ سر محمد شفیع کے ہاں علامہ صاحب "مع فیملی" مدعو تھے۔ لیکن علامہ صاحب تنہا گئے۔ سر شفیع نے پوچھا۔ بیگم صاحبہ کو کیوں نہیں لائے؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ پردے کی پابند ہیں۔ سر شفیع نے کہا — یہاں زنانے میں قیام فرما سکتی ہیں۔ علامہ صاحب نے جواب دیا۔ بے پردہ گھروں کے "زنانے" بھی ایسے ہوتے ہیں (پیرزادہ بہاء الحق قاسمی امرتسری۔ کتاب پردۂ نسواں صفحہ ۲۵)

سر راس مسعود علامہ اقبالؒ کے بہت ہی گہرے دوست تھے۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جب سر راس مسعود کے افغانستان کے دورہ پہ جانے کا وقت آیا تو بیگم مسعود نے اصرار کیا کہ انہیں بھی افغانستان وفد کے ہمراہ لے جایا جائے۔ سر راس مسعود نے علامہ صاحب سے مشورہ کیا تو آپ نے تحریراً جواب دیا

کہ حکومت افغانستان اپنے تہذیبی و تعلیمی نظام کی تربیت کے لئے ہندوستان کے علماء کا جو وفد بلا رہی ہے اس کے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کے جانے کا افغانستان کے حکمرانوں پر جو اثر مرتب ہوگا وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ اس جواب کے بعد سر راس مسعود اپنی بیگم صاحبہ کو سفر میں ہمراہ نہیں لے گئے۔ (روزگارِ فقیر حصہ اوّل ص۱۶۷-۱۹۶۰ء، سید مظہر علی ادیب صحافی کالونی اقبال ٹاؤن لاہور)

O

خاتونِ خانہ کا کردار !!

مکرمی! ۱۱ دسمبر کو باغ جناح میں خواتین کے ایک کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے صدر ضیاء نے کہا ہے " خاتون خانہ جب تک اپنے صحیح فرائض سرانجام نہیں دے، معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا " (امروز ۱۲ر دسمبر)

کہنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے، تاہم صدر صاحب نے اس ایک جملے میں معاشرتِ انسانی کی ایک عظیم حقیقت کو سمو دیا ہے۔ جدید دور میں " خاتون خانہ " کو سوسائٹی کا ایک فعّال رکن تصوّر نہیں کیا جاتا، بلکہ اسے ایک عضو معطّل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ " خاتون خانہ " ہی قوم کی اصل معمار ہے۔ آئندہ نسلوں کی کردار ساز ہے۔ کل کے رہنماؤں کی ماں ہے۔ دنیا کے اچھے یا برے مستقبل کی ذمہ دار ہے۔ دنیا کے عظیم انسانوں نے بڑے واشگاف لفظوں میں اپنی تمام تر عظمت کو اپنی ماؤں کی طرف سے دی گئی تربیت سے منسوب کیا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں (اپنی والدہ سے مخاطب ہوتے ہوئے)

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا　　گھر میرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

انگریزی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے (ترجمہ) وہ ہاتھ جو بچّے کو پالنے کو ہلاتا ہے، دراصل وہی ہاتھ دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ نپولین نے ایک بار کہا تھا۔ تم مجھے ایک اچھی ماں دے دو اور میں تمہیں ایک اچھی قوم دے دوں گا۔ ظاہر ہے ایک " اچھی ماں صرف ایک خانہ دار ماں ہی ہو سکتی ہے۔ گھر سے باہر جا کر دفتر میں ملازمت کرنے والی یا بیرون خانہ مصروفیات میں اپنا زیادہ وقت گزارنے والی عورت ایک اچھی ماں نہیں بن سکتی۔　　سید مظہر علی ادیب لاہور

اس شمارے کا اہم مضمون

ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کی دینی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ ڈائرکٹر حضرت شیخ الہند اکیڈمی دیوبند

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن —— لاہور

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۴ | مئی ۱۹۸۵ء مطابق شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۵

مشمولات

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی دفتر کا فون نمبر
۲۱۶۵۸۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

بفضلہ تعالیٰ میثاق ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۵ء قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔ ہماری بھرپور کوشش تھی کہ گزشتہ ماہ کا شمارہ تنظیم اسلامی کے دس سالہ اجتماع اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے ساتویں محاضراتِ قرآنی منعقدہ ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء کے دوران پریس سے آجاتے۔ لیکن لاہور میں بجلی کے لوڈ شیڈنگ کا جو سلسلہ قریباً دو ماہ سے جاری ہے اس سے شہر کا تمام کاروبار متاثر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں بے تدبیری کا یہ عالم ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ لوڈ شیڈنگ کے اوقات کسی ضابطے کے تحت مسلسل تین چار گھنٹے یا اس سے زائد ہوں بلکہ دن میں بھی اور رات میں بھی وقفہ وقفہ کے بعد بغیر کسی پیشگی اطلاع کے سلسلہ جاری رہتا ہے مثلاً دن میں دو تین بار قریباً گھنٹہ گھنٹہ کے لئے بجلی چلی جاتی ہے اور بجلی سے چلنے والے کارخانے، پریس، فیکٹریاں معطل ہو جاتی ہیں۔ مشینیں بند ہو جاتی ہیں اور کارکن بیکار۔ چنانچہ شمارہ پریس سے ۳ اپریل کو مل سکا۔ حکمتِ قرآن کا مارچ و اپریل ۸۵ء کا مشترکہ شمارہ جو ۱۸ مارچ کو پریس چلا گیا تھا تاحال نہیں آسکا ہے۔ اب 'میثاق' کا مئی کا شمارہ ۲۰ اپریل تک پریس بھیجنے کا انتظام پیش نظر ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ طباعت اور جلد بندی کے مراحل طے کرنے میں کتنا وقت لگے گا! — السعی منا والاتمام من اللہ —

مئی ۸۵ء کے زیر نظر شمارے میں قارئین کو مطالعہ کے لئے نہایت بیش قیمت مضامین ملیں گے۔ اس میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کا وہ خطاب جمعہ شامل ہے جو موصوف نے ۲۹ مارچ کو ارشاد فرمایا تھا، مزید براں حضرت مولانا سعید اکبر آبادی دامت فیوضہم کے وہ ارشاداتِ گرامی بھی شامل ہیں جو موصوف نے

محاضراتِ قرآنی کے لئے بحالتِ علالت ریکارڈ کرائے تھے - ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب موصوف کے خطاب "کیا ایرانی انقلاب، اسلامی انقلاب ہے؟" کی دوسری اور آخری قسط شاملِ اشاعت ہے ——————— اور یہ تمام مضامین بالاستیعاب مطالعہ کے متقاضی ہیں - "میثاق" کی ضخامت ۹۶ صفحات مقرر ہے لیکن مارچ کے شمارے میں ۲۴ اور اپریل کے شمارے میں آٹھ صفحات کے اضافے کے باوجود چند مستقل مضامین کی اقساط کو روکنا پڑا جس سے جہاں قارئین کرام کو وجہ شکایت ہوئی، وہاں ہمارے لئے بھی دلی دکھ کا باعث ہوا - ہماری خواہش ہے کہ مستقل طور پر کم از کم ۱۶ صفحات کا اضافہ کر دیا جائے لیکن اس صورت میں سالانہ زرِ تعاون اور پرچے کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہو جائے گا - اس ضمن میں قارئین کی آراء ہمارے لئے رہنما ثابت ہونگیں -

---

قارئین کرام سے ایک مخلصانہ درخواست یہ ہے کہ وہ "میثاق" کے حلقہ کی توسیع کے لئے تعاون فرمائیں - اسی طرح دعوت کا حلقہ بھی وسیع ہوگا اور "میثاق" کو مالی حیثیت سے بھی کچھ سہارا ملے گا - ہمارے مستقل قارئین بالخصوص تنظیمِ اسلامی کے رفقاء اگر اپنے حلقہ تعارف و اثر میں کوشش کریں تو ہر ماہ کم از کم ایک نیا سالانہ خریدار آسانی سے بنایا جا سکتا ہے - یہ تعاون انشاء اللہ تعاون علی البر شمار ہوگا - توقع ہے کہ اس درخواست پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا اور اسی ماہ سے اس کوشش کا آغاز کر دیا جائے گا -

---

یوں تو تنظیمِ اسلامی کے دس سالہ اجتماع اور انجمن کے ساتویں محاضراتِ قرآنی کا باقاعدہ آغاز ۲۳ رمارچ ۸۵ سے ہوا تھا - لیکن قرآن اکیڈمی میں انکی تیاری کے کام کے ضمن میں ۱۸ رمارچ ہی سے چہل پہل شروع ہو گئی تھی اور تنظیمِ اسلامی کے لاہور کے رفقاء بڑی مسرت اور انہماک کے ساتھ مختلف انتظامات میں مصروف ہو گئے تھے چونکہ محتاط اندازہ یہ تھا کہ پاکستان کے طول و عرض سے قریباً پانچ سو رفقاء تشریف لائیں گے جن کا قیام آٹھ روز تک قرآن اکیڈمی میں رہے گا -

لاہور کے رفقاء نے بہتر سے بہتر انتظامات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جس کیلئے وہ قابلِ تحسین ومبارکباد ہیں۔ ان کی یہ ساری محنت لوجہ اللہ تھی ان شاء اللہ وہ آخرت میں ماجور ہوں گے۔

مختلف مزاج، مختلف علاقائی زبان بولنے والوں اور مختلف علاقوں سے آئے ہوئے رفقاء میں بفضلہ تعالےٰ اتنی ذہنی ہم آہنگی تھی کہ آٹھ روز تک قرآن اکیڈمی کی چھوٹی سی دُنیا اتنے بڑے اجتماع کے باوجود متانت ووقار کا مظہر بنی رہی۔ اور کسی قسم کی مغائرت کا شائبہ تک پیدا نہ ہوا۔ سنٹر کار کی مصروفیات صبح ساڑھے چار بجے سے شروع ہو کر رات کو قریبًا گیارہ بجے تک جاری رہتی تھیں۔ درمیان میں بمشکل ڈھائی بجے سے چار بجے تک کا درمیانی وقت آرام کے لئے ملتا تھا۔ جن رفقاء کے سپرد مختلف کام تھے خاص طور پر جن کے ذمہ دوپہر کا کھانا اور چار بجے چائے کا اہتمام کرنا تھا ان کو آرام کا یہ وقت بھی میسر نہیں آسکتا تھا۔ یہ تمام ایثار وقربانی، یہ جذبۂ یہ لگن صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لئے تھی۔ اللہ کی رحمت سے اُمید واثق ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کو اپنی نگاہ ترحم سے نوازے گا۔ بمصداق ارشادِ ربانی: اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی[1]۔

جیسا کہ قارئینِ میثاق کو علم ہے کہ امسال کے محاضراتِ قرآنی کا موضوع: "قرآن کا تصورِ دینی" تھا۔ اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ نے قرآنِ حکیم اور سنّت وسیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعہ سے فرائضِ دینی کا جو جامع تصوّر اخذ کیا تھا اس کا خلاصہ مارچ ۸۵ء کے "میثاق" کے شمارے میں اس مکتوب کے ساتھ شائع کر دیا تھا اور قریبًا ملک کے اسّی اہلِ علم وفضل کو محاضرات میں تشریف لاکر اپنے اس تصوّرِ دینی پر تنقید و رہنمائی کی دعوت دی تھی۔ جن حضرات نے لاہور اور بیرون سے تشریف لاکر اس موضوع پر تائیدی اور تنقیدی واختلافی اظہارِ خیال فرمایا ان میں سے اکثر نے اپنی تقاریر میں بھی اور نجی تبادلۂ خیال میں بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس اقدام کو نہایت مستحسن ومفید اور اس

اجتماع کو اپنی نوع کا پہلا اجتماع قرار دیا کہ کسی جماعت و تنظیم نے اپنے پلیٹ فارم پر ——— اپنے ہم خیال شرکاء کے سامنے اپنے فکر و نظریہ اور طریق کار پر، تنقیدی و اختلافی اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا۔ پھر ان حضرات نے سامعین کے نظم و ضبط اور سکون و تحمل کے ساتھ ان تنقیدی و اختلافی آرا کو کھلے کانوں اور کھلے دل کے ساتھ سننے پر بھی خراجِ تحسین پیش کیا۔ اور امیرِ تنظیم کو داد دی کہ انہوں نے اپنے رفقاء کی اس طرح ذہنی تربیت کی ہے کہ انہوں نے اپنے امیر کے تصوّرات پر تنقیدوں کو خوش دلی اور خندہ پیشانی سے سنا۔ ہم اس تمام صورتِ حال پر صمیمِ قلب سے بارگاہِ ربّ العزّت میں ہدیۂ تشکر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ یہ اسی حق سبحانہٗ کی تائید و نصرت تھی ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط اور تربیت کیا!

اللہ تعالیٰ امیرِ محترم کو اپنی رحمتوں سے نوازے کہ انہوں نے بھی اپنے اوپر ان تنقیدوں کو خاموشی اور پوری توجہ سے سنا جو ان کے تصوّرِ دینی اور وضاحتوں میں سے وہ معانی و مفاہیم اخذ کر کے کی گئیں تھیں جو ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھے اس پر بھی موصوف نے قطعی خاموشی اختیار کئے رکھی جیسا کہ انہوں نے پیشگی اعلان کر دیا تھا کہ میں محض سامع رہوں گا۔ اپنی صفائی اور غلط فہمی کو بھی دور کرنے کے لئے بھی موصوف نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہ اللہ ہی کا فضل و کرم تھا کہ ایسی تنقیدوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ دوسرے مقررین کی طرف سے آپ سے آپ ہو گیا۔

بہرحال امرِ واقعہ یہ ہے کہ امیرِ محترم کے اس اقدام سے جہاں ایک تابندہ نظیر قائم ہوئی ہے۔ وہاں افہام و تفہیم کے لئے ایک مستحسن راہ کھل گئی ہے۔ جب امیرِ محترم نے ان محاضرات میں اپنے تصوّرِ فرائضِ دینی پر علماء کرام کو تنقید و رہنمائی کی کھلی دعوت دی تو ہمارے بعض ممتاز رفقاء نے امیرِ محترم کے سامنے اپنی اس تشویش کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے کہ ذہنی پراگندگی پیدا ہو، تنظیم کے رفقاء کے موقف میں تزلزل آ جائے جو تحریک کے لئے غیر مفید ہو سکتا ہے۔ امیرِ محترم کا پختہ موقف یہ تھا کہ جب ہم دین کا کام کرنے چلے ہیں اور ہمارا نصب العین

صرف رضائے الٰہی ہے تو ہم علماء حقانی کی رہنمائی اور ان کی تائید کے سخت محتاج ہیں ۔ ہمیں آخرت کی بھلائی اور بہتری کے لئے بھی اہل علم وفضل کی آراء سے مستفید ہونا ضروری ہے ۔ موصوف نے فرمایا تھا کہ میرا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ قرآن وسنت کے دلائل سے جو حق بات سامنے آئے اُسے قبول کرنا ہمارے دین کا عین تقاضا ہے ۔ اگر ہم پر ہماری کوئی غلطی کتاب وسنت کے دلائل سے واضح ہوجائے تو اس سے رجوع کرنا عین تقاضائے ایمان ہے ۔ ایسا کرنے سے بلاشبہ جگ ہنسائی ہوگی لیکن یہ اُس رسوائی کے مقابلے میں پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی جو صرف انانیت اور بات کی پچ اور دنیا میں سبکی کے خوف سے غلط بات پر اڑے رہنے سے آخرت میں ہوسکتی ہے ۔ چنانچہ جو بات بھی مجھے حق نظر آئے گی اُسے قبول کرنے میں مجھے قطعی تامل نہیں ہوگا ۔ میں اختلاف اور تنقید سے نہیں ڈرتا مجھے آخرت کا خوف ہے اور میں جو کچھ حقیر سی خدمت کر رہا ہوں وہ مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّیْ کے جذبہ سے کر رہا ہوں ــــ امیرِ محترم کے اسی جذبہ کے مشاہدے کا ایک موقع اس راقم کو اس طرح میسر آیا کہ جب چند حضرات کی مختصر سی مجلس میں ایک مرتبہ ہمارے ہی ایک محترم رفیق امیرِ محترم کے ایک موقف کے خلاف اظہارِ خیال کر رہے تھے ۔ دونوں طرف سے دلائل دیئے جا رہے تھے کہ ان رفیق نے اپنے موقف کی دلیل میں ایک حدیث پیش کی ۔ امیرِ محترم نے فوراً گفتگو بند کردی اور فرمایا کہ اب جب کہ حدیث سامنے آگئی ہے جو بظاہر احوال میرے دلائل کے خلاف جاتی ہے تو میں جب تک اس حدیث پر اچھی طرح غور وفکر نہ کرلوں اور دوسری احادیث سے جو میرے موقف کے حق میں ہیں ان سے ملا کر ان میں مجھے کوئی تطبیق نظر نہ آجائے تو اس وقت تک میں اس مسئلہ پر گفتگو جاری رکھنا صحیح نہیں سمجھتا ۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ڈاکٹر صاحب کو یہ مزاج عطا فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک اصل حقیقت اور اصل کام دین کی خدمت ، قرآن کی خدمت اور اللہ کے کلمہ کو سربلند کرنے کی جدوجہد ہے جس کے لئے ان کو ہر وقت اللہ کی توفیق ورہنمائی اور علماء حقانی کی تائید وتوثیق

اور دعاؤں کی شدید حاجت ہے۔ ان محاضراتِ قرآنی کے ذریعہ جو روشن نظیر و مثال قائم ہوئی ہے وہ ان شاء اللہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں سنگ میل ثابت ہوگی۔ اور ان شاء اللہ العزیز اسلام کی نشأۃ ثانیہ، اقامتِ دین، اعلاء کلمۃ اللہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک کو اکابر علماء حقّانی کی تائید، ان کی پُرخلوص دعائیں اور ان کے حلقوں کا تعاون و اشتراک حاصل ہوگا۔ اور پاکستان میں جس کے قیام کی واحد وجہ جواز اسلامی نظام کا قیام و نفاذ ہے، یہ تحریک پوری قوت کے ساتھ پُرامن طریق پر اور علیٰ منہاج النبوۃ آگے بڑھے گی، پھلے پھولے گی اور برگ و بار لائے گی۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

اس موقع پر ان سطور کا عاجز راقم ایک بات بطور گلہ و شکوہ عرض کرنا چاہتا ہے۔ چند علماء کرام نے تو محترم ڈاکٹر صاحب کی دعوتِ شرکت پر کامل خاموشی اختیار کی نہ اثباتاً نہ نفیاً کوئی جواب دیا اس عاجز کی رائے میں یہ شانِ استغناء ان کے اعلیٰ مقام سے مناسبت نہیں رکھتی۔ البتہ چند حضرات کرام نے کسی نجی مصروفیت ——— کی وجہ سے شرکت سے معذوری فرمائی۔ ان بزرگوں کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش ہے۔ تین حضرات نے اس مفہوم پر مشتمل جواب عنایت فرمایا کہ "وہ ڈاکٹر صاحب سے اس قدر بیزار ہیں کہ ان کی دعوت پر غور کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں"۔ انہی میں سے ایک بزرگ نے جو ما شاء اللہ خود عالم دین اور ایک مشہور شہر کی ایک مشہور جامع مسجد کے خطیب ہیں اس قسم کی تحریر رقم فرمائی کہ "ہم تو مقلدِ محض ہیں ہمارے بزرگوں سے بات کرو ہم ان کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتے"۔ اس میں جو تعریض و طنز ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ان سے اور ایسے تمام حضرات والا قدر سے عاجزانہ گذارش ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک سوالی اور سائل بن کر ان حضرات کی خدمت میں مکتوب ارسال کیا تھا اور ان سے تنقید و ہدایت کی استدعا کی تھی۔ قرآن حکیم کی تعلیمات تو یہ ہیں کہ: وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ط۔ اور۔ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى o وَهُوَ يَخْشٰى o فَاَنْتَ

عَنْہُ تَکَلُّفًا ۰ لہٰذا ان حضرات گرامی کا یہ طرزِ عمل کسی طرح بھی ان جیسے صاحبان علم وفضل کے شایانِ شان نہیں ہے - ان سے عاجزانہ التجا اور استدعا ہے کہ وہ اپنے موقف پر نظرِ ثانی فرمائیں ان شاء اللہ اس سے خیر ہی وجود میں آئے گا - بِیَدِ اللّٰہِ الْخَیْر وھو علیٰ کُلِّ شَیءٍ قَدِیْرٌ -

---

اس موقع پر ایک مزید ضروری بات بھی یہ عاجز عرض کرنا چاہتا ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ جو دعوت دے رہے ہیں ہماری بے بضاعتی اور کوتاہ قلمی سے بعض مخلصین کو مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے، ان کی امارت کو تسلیم کر کے اور تنظیم اسلامی میں شامل ہو کر ہی تجدید و احیاءِ دین، دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے - ہرگز ہرگز نہ یہ دعویٰ ہے نہ دعوت - ہم علیٰ وجہ البصیرت اس سے اعلان برأت کرتے ہیں - ڈاکٹر صاحب موصوف بھی اپنی متعدد تقاریر و تحاریر میں اس کی تردید اور اپنے اس موقف کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جہاں تک انہوں نے قرآن حکیم، سنتِ رسول اور سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا معروضی مطالعہ کیا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تجدید و احیاءِ دین، اقامت و اظہارِ دین الحق، اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے لزوم جماعت ضروری ہے - نیز تشکیلِ جماعت یا تنظیم کے لئے بیعت کا طریقہ انہوں نے اپنے فہم کے مطابق اقرب الی الکتاب والسنۃ اور اسلاف کے طریق کار کے مطابق سمجھ کر اختیار کیا ہے - وہ اسے مسنون و ماثور سمجھتے ہیں - اس پر ان کو شرح صدر حاصل ہے اس عاجز کی رائے میں کسی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل کا مسئلہ خالص اجتہادی ہے اگر چند اصحاب علم و فضل دستوری و آئینی اور جمہوری طرز کی جماعت و تنظیم کے تشکیل و قیام کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق سمجھتے ہیں تو یہ بھی اجتہادی ہو گا - اس کو کبھی بھی ڈاکٹر صاحب نے غلط، یا ناجائز قرار نہیں دیا - اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بیعت کے طریقے کو مسنون قرار دیتے ہیں - لہٰذا اس کے خلاف کوئی طریق کار لازماً غیر مسنون ہو گا - اس عاجز کی رائے میں ایسا سمجھنا درست نہیں ہو گا - ہمارے یہاں جو فقہی

مسالک ہیں تو ان میں سے بعض تعبدی امور ایسے ہیں کہ جن کو بعض ائمہ و محدثین رحمہم اللہ مسنون قرار دیتے ہیں اور بعض محض انہیں مباح یا مستحب کے درجے میں رکھتے ہیں اور بعض یہ رائے بھی نہیں رکھتے۔ اس کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن توقع ہے کہ یہ اجمال ہی اس عاجز کے منشا کی تفہیم کے لیے کفایت کرے گا۔

اصلی مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت پاکستان میں دین انتہائی غریب ہو چکا ہے۔ بقول مولانا حالی ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

دین کے بارے میں تشکیک و ریب نے ہماری تعلیم یافتہ اکثریت کے اذہان پر پنجے گاڑھ رکھے ہیں۔ عوام الناس کی اکثریت دین سے غافل محض ہے اور اس نے مشرکانہ اوہام اور مبتدعانہ افعال ہی کو دین سمجھ رکھا ہے۔ تجدد اور اباحیت پسند طبقہ شعائر دین کا استہزا کرنے ان کو مسخ کرنے اور ان کا حلیہ بگاڑنے میں لگا ہوا ہے۔ منکرات کو خوب فروغ ہو رہا ہے۔ بے حجابی بڑھ رہی ہے۔ مرد و زن کے مخلوط طور طریقے رواج پا رہے ہیں اور انکو کہیں ثقافت کا نام دیا جا رہا ہے اور کہیں ان کو قومی ضرورت قرار دیا جا رہا ہے۔ کہیں سرکاری سطح پر حدود اللہ اور شریعت کا مثلہ کیا جا رہا ہے اس کی مثالیں اظہر من الشمس ہیں۔ ان حالات میں کیا دین کا حقیقی درد رکھنے والے دین کے بہی خواہ اور دین پسند عناصر اور محاسبہ اخروی کا خوف رکھنے والے افراد اور جماعتوں کا یہ دینی فریضہ نہیں ہے کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں اور تنظیموں میں رہتے ہوئے اپنے اپنے طریق کار کے مطابق خدمتِ دین کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ گیر احیائے دین کی تحریک برپا کرنے کے عظیم کام میں تعاون اور اشتراکِ عمل کی کوئی سبیل نکالیں اور اجتماعی طور پر اصلاح معاشرہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کیلئے بنیان مرصوص بن جائیں۔ ایسی کوشش کرنے والے دردمند و حساس دلوں کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں بشارت دی گئی ہے: بدأ الاسلام غریبًا وسیعود کما بدأ غریبًا فطوبیٰ

للغیر بلاہے۔ اور قرآنِ حکیم میں امر کے صیغہ میں فرمایا گیا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔

اہلِ علم وفضل کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلانا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ یقیناً یہ حضرات والا قدران باتوں سے بخوبی واقف ہوں گے لیکن عامۃ المسلمین بالخصوص "میثاق" کے قارئین کی رہنمائی کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند مرفوع احادیث مبارکہ اور امیر المؤمنین حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے خلیفہ راشد کا ایک خطبہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ امتی رسولؐ ہونے کی حیثیت سے امر بالمعروف خاص طور پر نہی عن المنکر کے فریضہ کا ہمارے دین میں جو مقام و مرتبہ ہے وہ ہمارے رسولِ پاک خاتم النبیین وسید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات عالیہ اور افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد گرامی کے حوالوں سے ہمارے سامنے آجائے۔ پہلی حدیث ہے:

"عن ابن مسعودؓ قال قالَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما من نبیٍ بعثہ اللّٰہُ فی اِمتہٖ قبلیْ اِلّاکان لہٗ فی امتہٖ حواریّونَ وَاصحابٌ یأخُذونَ بسُنّتہٖ وَیقتدُونَ بامرِہٖ ثُمَّ انّھا تخلفُ من بعدِھِم خلوفٌ یقولون ما لایفعلون ویفعلون ما لایُؤمَرُوْنَ فمن جاھَدَھم بیدِہٖ فھُوَ مُؤمنٌ ومن جاھدھم بلسانہ فھو مُؤمِنٌ ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن ولیس وراء ذالک من الایمانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ" (رواہ مسلم)

"حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی امت میں مبعوث فرمایا تو اس کے اپنی امت میں ایسے حواری اور ساتھی ہوا کرتے تھے، جو اس کے طریقہ پر چلتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے پھر ان حوارین کے بعد ایسے نالائق جانشین

جاتے تھے کہ جو اپنی کہی ہوئی باتوں پر عمل نہیں کرتے تھے اور ایسے کام کیا کرتے تھے جن کے کرنے کا ان کو حکم نہیں ہوتا تھا۔ سو ایسے لوگوں سے جو ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ مومن ہے اور جو ان سے زبان سے جہاد کرے تو وہ بھی مومن ہے اور جو ان سے دل سے جہاد کرے (دل میں ان کے افعال قبیحہ سے نفرت رکھے) تو وہ بھی مومن ہے اور اس کے ورے (اس آخری درجۂ ایمان کے بعد) ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

دوسری حدیث ہے:

"عن حذیفة ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال والذی نفسی بیدہ لتأمرنّ بالمعروف ولتنهونّ عن المنکر او لیوشکنّ اللّٰہ اَن یبعث علیکم عذابًا من عندہ ثم لتدعُنّہ، ولا یُستجاب لکم

(رواہ الترمذی)

"حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروگے۔ (تمہاری لازمی ذمہ داری ہے) ورنہ بہت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تم پر عذاب مسلط کردے۔ اور پھر (تم عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لئے) اللہ سے دعائیں مانگو اور تمہاری دعائیں قبول نہ کی جائیں۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خطبہ ہے:

عن ابی بکر الصدیق قال یاایها الناس انکم تقرأون هذه الاٰیة، یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ۔ فانی سمعت رسول

اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقولُ اِنَّ النَّاسَ اذا رَأو منکرًا فلم یغیّروہُ یوشِکُ اَن یَعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابِہٖ رواہ ابنُ ماجۃ والترمذی وصححہٗ - وفی روایۃ ابی داؤد اِذا رَأَوُا الظَّالِمَ فلَمْ یَأخُذُوْا علیٰ یدیہِ اَوْشک اَنْ یَعُمَّھُمُ اللّٰہُ بعقابٍ - وفی اُخریٰ لہٗ ما من قومٍ یُعْمَلُ فِیْھِمْ بِالْمَعَاصِی ثُمَّ یَقْدِرُوْنَ عَلیٰ اَنْ یُّغَیِّرُوْا ثُمَّ لَا یُغَیِّرُوْنَ اِلَّا یُوْشِکُ اَنْ یَعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابٍ ہ

"حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے ارشاد فرمایا۔ اے لوگو! تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے پہلو تہی کرنے کے لئے بطور دلیل یہ آیت پڑھتے ہو اور اس کو اس کے عموم پر رکھتے ہو جو کہ صحیح نہیں ہے "اے ایمان والو تم پر اپنی جان کا فکر لازم ہے ۔جب تم راہ پر ہوئے تو جو گمراہ ہوا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا"

"حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ جب بُرائی دیکھیں اور اس کو نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے عذاب کی لپیٹ میں لے لے"۔ (اس کو امام ابن ماجہؒ اور امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے - ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں " لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو اپنے عذاب کی لپیٹ میں لے لے" اور ابوداؤد کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "جس قوم میں بھی معاصی کا ارتکاب کیا جاتا ہو اور اس قوم کے بعض لوگ ان معاصی کو روکنے کی قدرت رکھتے ہوں اور پھر اس کے باوجود وہ معاصی کو نہ روکتے ہوں تو لامحالہ قریب ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے عذاب کی لپیٹ میں لے لے"

اس ضمن میں قرآن مجید فرقان حمید کا یہ اٹل قانون اور ضابطہ بھی ہر دردمند اور حساس دل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ "اور بچتے رہو اس فساد و فتنہ سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص ظالموں ہی پر اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے"۔ اس آیت پر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے یہ حاشیہ تحریر فرمایا: "یعنی فرض کیجئے کہ ایک قوم کے اکثر افراد نے ظلم وعصیان کا وطیرہ اختیار کیا کچھ لوگ جو اس سے علیحدہ رہے انہوں نے مداہنت برتی، نہ نصیحت کی نہ اظہار نفرت کیا تو یہ فتنہ ہے جس کی لپیٹ میں وہ ظالم اور یہ خاموش مداہن سب آجائیں گے۔ جب عذاب آئیگا تو حسب مراتب سب اس میں شامل ہوں گے کوئی نہیں بچے گا۔ اس تفسیر کے مطابق آیت سے مقصود یہ ہوگا کہ خدا اور رسول کی حکم برداری کے لئے خود تیار رہو اور نافرمانوں کو نصیحت و فہمائش کرو۔ نہ مانیں تو بیزاری کا اظہار کرو"۔ امر واقعہ یہ ہے کہ فتنہ و فساد ایک متعدی مرض ہے۔ جس معاشرے میں یہ جڑ پکڑ لے اس میں اس کے اثرات اور اسکی لپیٹ سے انفرادی نیکوکار بھی نہیں بچ سکتے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ جماعتی طور پر اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے کی جد و جہد کی جائے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

الحمد للہ تنظیم اسلامی کا دس سالہ اجتماع ۲۴ مارچ کو باقاعدہ شروع ہو کر ۲۸ مارچ کو ایک بجے دوپہر کو اختتام پذیر ہوا۔ اس اجتماع میں بعد نماز فجر روزانہ درس حدیث ہوا۔ محترم قیم تنظیم اسلامی (پاکستان) کی جانب سے کارگزاری کی سالانہ رپورٹ اور جناب محاسب صاحب کی طرف سے مرکزی بیت المال کی سالانہ رپورٹ پیش ہوئی۔ چند مقامی تنظیموں کے امراء نے اپنے اپنے علاقوں میں کام کی رفتار دعوت کی توسیع نیز موانعات کے متعلق رپورٹیں پیش کیں۔

چار یوم تک تنظیم اسلامی کے قیام و تاسیس کے ارتقائی منازل نیز امیر محترم کے چند خطابات کی تلخیص تنظیم اسلامی کی مطبوعہ روداد میں سے پیش کی گئی - چار روز تک ہمارے رفیق محترم ڈاکٹر تقی الدین احمد نے تنظیم کے رفقا کیلئے کتاب و سنت کے ضروری علم کے حصول کی کوشش اور تزکیہ نفس کی اہمیت و ضرورت پر نہایت مفید و مؤثر خطابات ارشاد فرمائے - جن کا مفاد یہ تھا کہ ان چیزوں کے بغیر اعلائے کلمۃ اللہ کے عظیم کام کو لے کر اٹھنے والی جماعت و تنظیم کا حال ایسا ہوگا جیسے تلوار کے بغیر نیام یا کارتوس کے بغیر بندوق اور پستول کا ہوتا ہے — پانچ روز تک عموماً گیارہ بجے سے ایک بجے تک امیر محترم نے محاضرات میں اٹھائے ہوئے اشکالات و اعتراضات پر تبصرہ فرمایا — تنظیم کے پیش نظر جو عظیم کام ہے قرآن و حدیث سے اسکی اہمیت کو مبرهن و واضح فرمایا — سوالات کے جوابات عنایت فرمائے۔ مزید برآں رفقاء کے دلوں میں اپنے مؤثر انداز سے اس کی اہمیت ایک ولولۂ اور جذبۂ تازہ، ایک جوشِ نو، ایک والہانہ لگن کو مہمیز فرمایا — اجتماع کے آخری روز دو سال کے لئے کل پاکستان بنیاد پر مرکزی مجلس مشاورت کا بذریعہ بیلٹ انتخاب عمل میں آیا جس کے نتیجہ میں حسب ذیل حضرات منتخب ہوئے -

(۱) ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب (۲) میاں محمد نعیم صاحب (۳) قمر سعید قریشی صاحب (۴) چودھری غلام محمد صاحب (۵) رحمت اللہ بٹر صاحب (۶) عبدالرزاق صاحب (۷) ان سطور کا عاجز راقم -

مقامی تنظیمیں جن میں رفقاء کی تعداد چھبیس ۲۶ سے پچاس تک ہے ایک ایک رفیق کو منتخب کر کے مرکز کو اطلاع دیں گی - اس طرح مرکزی مجلس مشاورت کی تکمیل ہو جائے گی اور اس کی مدتِ تشکیل دو سال ہوگی -

اس اجتماع میں پاکستان میں مقیم رفقا میں سے ۳۲۹ رفقاء نے شرکت کی - ۴۲ حضرات بطور مبصر شریک ہوئے - ان مبصرین میں سے اجتماع کے بعد ۱۳ حضرات نے عہد رفاقت لے کر امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس طرح وہ تنظیم میں بحیثیت رفیق شامل ہوگئے : اللّٰھم ثبت اقدامنا و اقدامھم علی دینک -

بیرونِ پاکستان سے بھی ہمارے بعض رفقاء شریک اجتماع ہوئے ہمارے ایک رفیق

اسکندریہ (مصر) سے صرف اس اجتماع اور محاضراتِ قرآنی میں شرکت کے لئے
لاہور تشریف لائے اور دس روز تک یہاں مقیم رہے - ایک رفیق سعودی عرب
سے ہفتہ عشرہ کے لئے اس طرح پروگرام بنا کر تشریف لائے کہ چار دن اجتماع اور
محاضرات میں شریک ہو سکیں اور بقیہ چند دن وہ اپنے نجی کاموں میں صرف کر سکیں
حیدرآباد دکن (بھارت) سے بھی تین حضرات تشریف لائے جو امیر محترم سے بیعت
ہیں ہماری ایک فنی کوتاہی کے باعث ان حضرات میں سے دو کو آٹھ روز
تک پاکستان کا ویزا بروقت نہ ملنے کے سبب سے دہلی میں رکنا پڑا - یہ حضرات جناب
قاری قطب الدین صاحب چشتی اور جناب قاری عبدالعلیم صاحب مدظلہ آخری
دن لاہور پہنچے اور محاضرات کی آخری نشست میں اوّل الذکر نے اپنا مقالہ پیش کیا
آخر الذکر جناب قاری عبدالعلیم صاحب نے تقریر فرمائی - قاری صاحب مدظلہ آل
انڈیا مجلسِ قرأت کے اعزازی معتمدِ عمومی ہیں - موصوف نے ۲۹ مارچ کو مسجد دارالسلام
باغ جناح میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا اور صلوٰۃ جمعہ کی امامت فرمائی - مزید
براں موصوف کے اعزاز میں لاہور کے مشہور آئی سرجن ڈاکٹر محمد یقین صاحب نے
۳۰ مارچ کو فلیٹیز ہوٹل میں عشائیہ کا اہتمام فرمایا - ۵ اپریل کو بھی مسجد دارالسلام
میں قاری صاحب موصوف ہی نے خطبۂ جمعہ دیا اور صلوٰۃ جمعہ پڑھائی - اللہ تعالیٰ
نے قاری صاحب کو عربی زبان و لہجہ پر بڑی قدرت عطا فرمائی ہے - ان کے
خطباتِ جمعہ کا انداز یہ تھا کہ گویا کوئی شعلہ بیان عرب خطیب خطبہ دے رہا ہے
جس کے سحر سے تمام شرکا مسحور ہو گئے ہیں - قاری صاحب مدظلہ اپنے مؤثر خطبات
کی وجہ سے مسجد دارالسلام کے مستقل نمازیوں کے دلوں پر اپنی شخصیت کے
گہرے نقوش ثبت فرما گئے ہیں - ان کی متواضع اور دل آویز شخصیت نے قرآن
اکیڈمی کے تمام کارکنان کے دل موہ لئے تھے - اللہ تعالیٰ ان کو صحت کے ساتھ
تا دیر سلامت رکھے اور ان سے اپنے دین کی مزید خدمت لے اور ہم کو ان کی
صحبت سے فیض یاب ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے -

امیرِ محترم کا پختہ ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ العزیز موصوف گذشتہ سال کی طرح

امسال بھی رمضان المبارک میں تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کے حصّہ کا ہر شب کو تراویح میں ترجمہ اور اہم مقامات کی مختصر تشریح بیان فرمائیں گے۔ سال گذشتہ جامع القرآن میں جگہ کی تنگی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ بفضلہ تعالےٰ جامع القرآن کے ہال کے اوپر چھت پڑ گئی ہے اور دوسرے ہال کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ اس طرح امسال گذشتہ سال کے مقابلے میں دوگنا افراد شریک ہو سکیں گے۔ اس دورۂ ترجمۂ قرآن حکیم میں شرکت کے لئے جو حضرات باہر سے تشریف لانے کے خواہش مند ہوں۔ ان سے التماس ہے کہ وہ اس امر کی اطلاع ۱۵ رمئی تک جناب بھائی قمر سعید قریشی صاحب ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن کو ارسال فرما دیں۔

بحمداللہ کراچی اور لاہور میں 'شام الہدیٰ' کے پروگرام جاری ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ان پروگراموں کو اتنا قبول عام عطا فرمایا ہے کہ دونوں مقامات پر جگہ کی قلت اور تنگی منتظمین کے لئے مسئلہ بن گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے توقع ہے کہ وہ کوئی ایسی صورتِ حال پیدا فرمائے گا جس سے اس مشکل کا کوئی بہتر حل نکل سکے۔ ماہ مئی میں انشاءاللہ ۱۹ رتاریخ کو بروز اتوار 'شام الہدیٰ' کی آئندہ نشست کا انعقاد حسبِ سابق تاج محل ہوٹل میں بعد نماز مغرب ہوگا۔ اس میں امیر محترم کا 'استقبال رمضان المبارک اور عظمتِ صوم' کے موضوع پر خطاب کرنے کا ارادہ ہے۔ لاہور میں اگر کوئی وقتی دشواری مانع نہ ہوئی تو اگلی نشست اللہ نے چاہا تو ۳۰ رمئی کو واپڈا آڈیٹوریم میں بعد نماز مغرب منعقد ہوگی۔ لاہور اور کراچی کے قارئینِ میثاق سے درخواست ہے کہ وہ متذکرہ بالا تاریخیں نوٹ فرما لیں

بحمداللہ امیرِ محترم کی صحت بہتر ہے۔ لاہور اور بیرونِ لاہور دعوتی دوروں کا سلسلہ جاری ہے۔ اہم مضامین کی کثرت و طوالت کے باعث 'رفتارِ کار' کے عنوان کے تحت ان دعوتی دوروں کے کوائف کے لئے صفحات دستیاب نہیں ہوتے۔ اس لئے فروری ۸۵ء سے اس کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہے لیکن بفضلہ تعالیٰ سبحانہٗ اسلام آباد کے کمیونٹی سنٹر میں انگریزی ماہ کی ہر پہلی پیر کو درس و خطاب کا۔

بقیہ صـ ۸۸ پر

تذکرہ و تبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد کا خطابِ جمعہ

مسجد دارالسلام لاہور ۲۹ مارچ ۸۵ء

- پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی یاد میں جلسہ
- سالانہ محاضراتِ قرآنی کی شاندار کامیابی پر اللہ کا شکر
- نصرتِ خداوندی کے حصول کا یقینی طریقہ: نصرتِ خدا و رسول

یعنی غلبہ و اقامتِ دین کی جدّ و جہد

مولانا سیّد مظفر حسین ندوی (مظفر آباد) کی تقریر کے حوالے سے!

مرتبہ: شیخ جمیل الرحمٰن

الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصًا علٰی افضلھم خاتم النبیین محمد ن الامین وعلٰی آلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالٰی فی سورۃ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ (آیت ۷)

وقال تبارک وتعالٰی فی سورۃ آل عمران

(۲) اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ (آیت ۱۶۰)

(۳) وقال عزّ وجلّ فی سورۃ الاعراف
فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آیت ۱۵۷)

(۴) وقال جلّ وعلا فی سورۃ التوبہ
اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ (آیت ۴۰)

(۵) وقال عزّ اسمُہٗ فی سورۃ الحدید
لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ط اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (آیت ۲۵)

(۶) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ ج فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ (آیت ۱۴) صدق اللہ العظیم !!!
رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ــــ

حضرات! آپ میں سے اکثر کو اس کا اندازہ ہے کہ ۲۲ مارچ سے کل ۲۸ مارچ تک پورا ہفتہ میرا اور میرے ساتھی یعنی تنظیم اسلامی کے رفقاء اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے جو فعال وابستگان ہیں، ان کا وقت شدید مصروفیت اور مشقت میں گزرا ہے۔ ۲۲ مارچ کے جمعہ کی تقریر، خطبہ اور نماز ہوئی پھر اسی شام کو مغرب کے بعد ہم نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ وہ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ جلسہ کے صدر جناب چیف جسٹس (ریٹائرڈ) شیخ انوار الحق صاحب تھے۔ موصوف اپنی ایک دوسری مصروفیت کی وجہ سے دورانِ جلسہ اجازت لے کر چلے گئے تھے۔ بعدہ جلسہ جناب علامہ شبیر احمد بخاری سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی صدارت میں جاری رہا۔ مقررین نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کی اور سامعین نے بھی ہمیں مایوس نہیں کیا۔ بلکہ واقعتاً ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر اس اجلاس میں شرکاء کی تعداد تھی ۔۔۔ پھر ہفتہ کی صبح کو ہماری مرکزی انجمن خدام القرآن کا ایک فنکشن تھا۔ وہ بھی صبح نو بجے سے شروع ہو کر ایک بجے دوپہر کو ختم ہوا۔ پھر اسی شام سے محاضراتِ قرآنی کا قرآن اکیڈمی میں سلسلہ شروع ہو گیا جو جمعرات ۲۸ مارچ کی شب تک چلتا رہا اور ہر اجلاس عموماً رات کو ۱۰ بجے تک جاری رہتا تھا۔ پھر اتوار کی صبح سے تنظیم اسلامی کے دس سالہ اجتماع کا آغاز ہوا جو کل ۲۸ تاریخ کو ظہر کے وقت اختتام پذیر ہوا۔ اس طرح روزانہ صبح آٹھ بجے سے لے کر ایک بجے تک اور شام کو عصر سے لے کر رات کو دس بجے تک ہماری شدید ترین مصروفیت رہی ہے۔

محاضراتِ قرآنی کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے اور میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعہ میں اللہ سبحانہٗ کا شکر ادا کر سکوں۔ ان محاضرات کو جو گوناگوں کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ ہماری ہر توقع سے بڑھ کر ہے۔ ہم نے قریباً اسّی اہلِ علم وفضل حضرات کو ان محاضرات میں شرکت کی دعوت دی تھی کہ وہ ان محاضرات کے موضوع 'قرآن کا تصوّرِ فرائضِ دینی' پر اظہارِ خیال فرمائیں [1] ۔۔۔ میں نے قرآنِ حکیم، سنّت وسیرتِ محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے معروضی مطالعہ سے فرائضِ دینی کا جو جامع تصوّر اخذ کیا ہے جس کے پیشِ نظر عملی جدوجہد کے لئے میں قریباً بیس سال سے ہمہ تن لگا ہوا ہوں، اس کا خلاصہ بھی ان حضرات کی خدمت میں ارسال کر دیا تھا اور ان سے استدعا کی تھی کہ علماءِ کرام اور اصحابِ دانش تشریف لائیں اور رہنمائی فرمائیں کہ اس تصوّرِ دینی میں کیا صواب ہے اور کیا خطا یا تقصیر ہے!

---

[1] علماءِ کرام اور اصحابِ دانش کو محترم ڈاکٹر صاحب کی جانب سے جو مکتوب اور موصوف کا اخذ کردہ تصوّرِ دینی کا خلاصہ ارسال کیا گیا تھا وہ 'میثاق' کے مارچ ۸۵ء کے شمارے میں شائع کیا جا چکا ہے۔ (مرتب)

ان مدعوین میں سے پچیس تیس کے مابین حضرات تشریف لائے۔ ان میں ہمارے ملک کے چوٹی کے علماء بھی شامل ہیں۔ حضرت مولانا سیّد عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہ گجرات والے جو ایک خاص مکتبِ فکر اور مسلک کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں[1]۔ حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی[2] شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نہ صرف یہ کہ ملک گیر شہرت کے حامل ہیں بلکہ وہ ضیاء صاحب کی نامزد کردہ مجلسِ شوریٰ کے بھی رکن رہے ہیں اور اس اعتبار سے بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل مدظلہ جو اسلامی نظریاتی کونسل کے قریباً مستقل رکن رہے ہیں اور بہت معروف شخصیت ہیں۔ ان کا زیادہ تر اتفاق، تعاون اور اشتراکِ عمل جماعتِ اسلامی کے ساتھ رہا ہے[3]۔ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہ، بریلوی مکتبِ فکر کی ایک نمایاں شخصیت ہیں[4]۔ وہ بھی مجلس شوریٰ کے کافی عرصہ رکن رہے ہیں۔ ویسے تو موصوف ملک کی سطح پر معروف ہیں لیکن لاہور کی تو بہرحال وہ ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب مدظلہ، اصلاً اہلِ حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والی ایک معروف شخصیت ہیں۔ انہوں نے جماعتِ اسلامی میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے اور ۱۹۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک کے سلسلہ میں جب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور اسیر رہے تھے تو کچھ عرصہ مولانا موصوف جماعتِ اسلامی کے امیر بھی رہے ہیں۔ پھر وہ اسی زمانہ یعنی ۱۹۵۷ء میں علیحدہ ہوئے تھے جس زمانہ میں چند دوسرے حضرات اور میں خود علیحدہ ہوا تھا۔ پھر مولانا نے طویل عرصہ تک تدریسِ حدیث کی ذمہ داری جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ میں ادا کی ہے۔ مزید یہ کہ وہ بھی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے ہیں اور شوریٰ کے بھی[5]۔ پھر مولانا عبدالقادر صاحب روپڑی[6] مدظلہ، اہلِ حدیث

---

[1] شاہ صاحب قبلہ نے پورے خاکہ تصویب و توثیق فرمائی۔ (مرتب)

[2] مولانا موصوف مدظلہ نے جماعت سازی میں اندیشوں کا اظہار فرمایا۔ (مرتب)

[3] مفتی صاحب قبلہ نے بیعت کے مسئلہ کے سوا پورے خاکہ سے اتفاق فرمایا۔ بیعت کے مسئلہ پر گفتگو کسی آئندہ موقع کے لئے ملتوی فرما دی۔ (مرتب)

[4] مفتی صاحب موصوف نے قرآن کے تصورِ فرائضِ دینی کے جزو اوّل و دوم سے اور جماعت کے التزام سے کامل اتفاق فرمایا لیکن بیعت اور جہاد بالسیف کو چند اہم شرائط سے مشروط قرار دیا۔ (مرتب)

[5] مولانا موصوف مدظلہ نے ہر نوع کی دینی جماعت بنانے سے بھرپور اختلاف کیا۔ (مرتب)

[6] مولانا موصوف مدظلہ نے بھی مفتی سیاح الدین کاکاخیل مدظلہ کے مطابق موقف اختیار کیا۔ (مرتب)

علماء میں چوٹی کی شخصیتوں میں سے ہیں ـــــــ یہ سب شریک ہوئے ۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ شرات کرنے والے جن حضرات کے نام میں نے آپ کو بتائے ہیں یہ اپنے اپنے حلقوں کی چوٹی کی شخصیتیں ہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ حضرات کرام اپنے اپنے حلقہ کی چوٹی کی شخصیتوں میں سے ضرور ہیں ۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ۔ ان کے علاوہ بھی اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے پاکستان کے بہت سے علماء نے شرکت فرمائی ۔

ہندوستان سے مولانا وحید الدین خاں صاحب[1] مدظلہٗ دہلی سے تشریف لائے ۔ بہت معروف شخصیت ہیں ۔ آپ نے شاید نام سنا ہو ۔ ان کو سیرت پہ لکھی ہوئی ایک کتاب پہ پچھلے سال ایک بڑا انعام ملا تھا ۔ ہمارے صدر ضیاء الحق ہر سال سیرت پہ جو فنکشن منعقد کرتے ہیں اس میں کتابوں پہ انعام ملتے ہیں تو یہ عالمی سطح پہ مقابلہ ہوتا ہے ۔ اس میں انہیں انعام ملا تھا ۔ طویل عرصہ سے ان کی زیر ادارت دہلی سے ماہنامہ "الرسالہ" نکلتا ہے جو دینی اور علمی حلقوں میں بہت معروف ہے ـــــ حیدر آباد دکن سے دو علمی شخصیتیں تشریف لائیں ۔ ان میں سے ایک صاحب تو آل انڈیا سطح پہ ایک منصب کے حامل ہیں ۔ قرّاء حضرات کی ایک آل انڈیا تنظیم ہے ۔ اس کے وہ اعزازی معتمد اعلیٰ (سیکرٹری جنرل) ہیں ۔ وہ ہیں حضرت مولانا قاری عبدالعلیم صاحب مدظلہٗ ۔ وہ اس جمعہ میں بھی تشریف لائے ہوئے ہیں ۔ میں اپنی تقریر کے بعد ان سے مختصر خطاب نیز خطبۂ جمعہ ارشاد فرمانے اور صلوٰۃ جمعہ کی امامت کرنے کی درخواست کروں گا ۔ دوسرے صاحب مولانا قاری قطب الدین علی چشتی مدظلہٗ ہیں جو حیدر آباد دکن کی ایک معروف علمی و دینی شخصیت ہیں ۔ یہ دونوں حضرات کل ہی لاہور پہونچے ہیں[2] حیدر آباد دکن سے تو یہ تقریباً پونے دو ہزار میل کا سفر طے کر کے ۱۹ مارچ ہی کو دہلی پہنچ گئے تھے لیکن پاکستان کا ویزا ملنے میں ان حضرات کو بڑی دشواریوں ، دقتوں اور پریشانیوں سے سابقہ پیش آیا ۔ بہرحال یہ حضرات کل ۲۸ مارچ کو لاہور پہنچ گئے اور کل ان حضرات نے محاضرات کو اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرمایا ۔

ان محاضرات میں جن پچیس تیس علماء اور اہل علم و فضل حضرات نے اظہار خیال فرمایا ان میں سے چند حضرات کے نام میں نے پیش کئے ہیں ۔ میرے لئے بڑا مشکل مسئلہ ہے کہ ان میں سے اور دوسرے

---

[1] مولانا موصوف مدظلہٗ نے مولانا عبدالغفار حسن کے موقف کی تائید کی ۔ (مرتب)

[2] ان دونوں حضرات نے بھی ڈاکٹر صاحب کے موقف کی مکمل تائید فرمائی ۔ (مرتب)

حضرات میں سے کس کو صفِ اوّل کی شخصیتیں کہا جائے اور کن کو صفِ دوم کی شخصیتیں قرار دیا جائے ۔ بہرحال میں اپنی معلومات اور ان حضرات کی اکثریت کو معروف ہونے کے اعتبار سے صفِ اوّل کی شخصیات قرار دے رہا ہوں ـــــ ان حضرات کی تشریف آوری اور اشتراک و تعاون کے اعتبار سے میرے نزدیک بہت بڑی کامیابی ہے ۔ برصغیر پاک و ہند کا کوئی نمایاں مکتبِ فکر ایسا نہیں ہے جس کے چوٹی کے علماء میں سے کوئی نہ کوئی شریک نہ ہوا ہو ۔ پھر یہ کہ ان محاضرات میں جو سنجیدہ و باوقار فضا برقرار رہی وہ نہایت ہی خوش آئند، لائقِ تحسین اور قابلِ داد ہے ۔ بعض مقررین نے بعض اعتبارات سے میری چند آراء سے کھل کر شدید اختلاف کیا ان پر شدید تنقیدیں کیں ۔ اب میری انجمن اور میری تنظیم کا جلسہ ہے ۔ میری ہی صدارت میں محاضرات کی تمام نشستیں منعقد ہو رہی ہیں ۔ شرکاء کی عظیم ترین اکثریت بھی میرے فکر سے اتفاق رکھنے والے اور میرے کاموں میں دامے درمے سخنے تعاون کرنے والوں پر مشتمل رہی ہے ۔ لیکن سب نے ان اختلافات اور تنقیدوں کو بڑے صبر، سکون اور تحمّل سے سنا ـــ اسی لئے تو میں نے ان محاضرات کا موضوع " قرآن کا تصوّرِ فرائضِ دینی" رکھا تھا تاکہ دوسرے اہلِ علم و فضل کے تائیدی اور اختلافی آراء اور ان کے دلائل ہم سب کے سامنے آجائیں اور اگر واقعی ہم پر ہماری کوئی غلطی واضح ہو جائے تو اس کی اصلاح کی جا سکے ۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ بعض حضرات کی طرف سے اختلافی آراء آئیں گی اور تنقیدیں ہوں گی ۔ اس موقع پر یہ انتقالِ ذہنی ہے کہ مجھے فوراً یاد آیا کہ قرآن مجید میں سورۂ ہود کی آیت ۱۱۸ کے آخر میں فرمایا: وَ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ٥ اور اگلی آیت کے درمیان میں فرمایا: وَلِـذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ط لوگ اختلاف تو کرتے ہی رہیں گے ـــ اور اسی لئے تو اللہ نے ان کو پیدا فرمایا ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس حکمت پر تخلیق فرمائی ہے کہ اس میں اختلاف ہے ۔ شکلوں کا اختلاف ہے ۔ رنگوں کا اختلاف ہے ۔ زبانوں کا اختلاف ہے ۔ مزاج کا اختلاف ہے، اندازِ فکر کا اختلاف ہے ۔ آراء کا اختلاف ہے ۔ تعبیر و استنباط کا اختلاف ہے ۔ ؏ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است ۔ والا معاملہ ہے ۔ صحابہ کرامؓ میں بھی اختلاف تھا ۔ کسی کا مزاج کچھ ہے، کسی کا دوسرا مزاج ہے ۔ کوئی بالکل درویش منش ہے، کوئی کاروباری صلاحیت بہت رکھتا ہے ۔ کوئی مردِ میدان بہت زیادہ ہے، بڑا شجاع، دلیر اور بہادر ہے ۔ کوئی اعلیٰ پائے کا خطیب ہے ۔ کسی کو ہم کہتے ہیں کہ وہ فقہائے صحابہؓ میں سے ہیں ۔ ان کو دین و شریعت کا خصوصی فہم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے ۔ نہ قانون و قضا میں دور رس نگاہ رکھتے ہیں کسی کو قراءتِ قرآنِ مجید سے بہت زیادہ شغف ہے ۔

کسی پر زہد کا انتہائی غلبہ ہے ـــــــــــ - - - کوئی تدبر، فراست میں بڑھا ہوا ہے، انتظامی صلاحیتیں ان میں بے انتہا ہیں۔ تو ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کا معاملہ تھا۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ۔ اللہ نے بنایا ہی ایسا ہے۔ یہ گوناگونی، یہ بوقلمونی، یہ رنگا رنگی نہ ہو تو یہاں تو بڑی یکسانیت پیدا ہو جائے جس سے طبیعت اکتا جائے۔ پھر یہ کہ اختلاف رائے سے اصلاح کی راہیں کھلتی ہیں۔ اخلاص و خلوص موجود ہو، ہٹ دھرمی اور ضد و انانیت نہ ہو تو اختلاف رحمت ثابت ہوتا ہے۔ معاملہ وہی ہے جو اس مصرعے میں سامنے آتا ہے ؎

اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے محاضرات میں یہ موضوع رکھا ہی اس لئے تھا کہ ہمارے اہل علم و فضل کی آراء سامنے آ جائیں تاکہ ان کی روشنی میں ہم اپنے فکر، اپنی دعوت، اپنے کام اور اپنی جدوجہد کے ہدف پر غور و فکر کر سکیں اور جو صحیح بات بھی دلائل کے ساتھ سامنے آئے اسے قبول کر کے اصلاح کر سکیں۔ لہٰذا اختلافات سامنے آئے اور کھل کر سامنے آئے لیکن قابلِ شکر بات یہ ہے کہ کوئی تلخی نہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے تاکیداً یہ کہہ دیا تھا کہ بالکل سامع بن کر بیٹھیں اور اختلافات و تنقیدات کو کھلے کانوں اور کھلے دماغوں سے سنیں۔ البتہ استفہام کے لئے کوئی سوال کرنا ہو تو اسے تحریری طور پر کر لیں۔ کوئی جرح، کوئی تنقید اور ان کو اپنی بات پڑھانے کی کوشش، اپنی بات منوانے کی سعی، ان باتوں سے میں نے سختی سے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا تھا۔ سامعین میں صرف ہماری انجمن اور تنظیم کے رفقاء ہی نہیں تھے۔ دوسرے حضرات بھی تھے۔ بہرحال کسی نے اس نوع کے سوالات بھیجے بھی تو میں نے ان کو روک لیا۔ استفہامی نوعیت کے سوالوں میں سے بھی وقت کی کمی کی وجہ سے چند ہی سوالات متعلقہ مقرر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

جو اہل علم و فضل حضرات ان محاضرات میں تشریف لائے ان میں سے متعدد حضرات نے علی رؤس الاشہاد اس بات کا اعتراف کیا کہ برصغیر پاک و ہند کی جہاں تک معلوم تاریخ ہے اس میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس نوع کی ایک مجلس ترتیب دی گئی اور اہل علم و فضل کو دعوت دی گئی کہ آئیے مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہماری غلطیاں بتائیے۔ ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہم پر دین کے جو فرائض اور تقاضے عاید ہوتے ہیں ہم ان کو جاننا چاہتے ہیں۔ اور ان کو ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہوئے ہیں۔ ہمیں کوئی شوقِ مجلس آرائی اور انجمن آرائی اور کوئی شوقِ سیاست و قیادت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے ہمیں اپنی حفظ و امان میں رکھے

اور ان سے بچائے ـــــ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ نہایت خوشگوار ماحول میں یہ چھ دن کے مسلسل محاضرات ہوئے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی طور پر بھی مناظرے کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ـــ میں نے تو پہلے ہی طے کر کے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گفتگو میں محض سامع بنا رہوں گا اور کسی اختلاف اور کسی رائے پر بھی اظہارِ خیال نہیں کروں گا۔ استفہامی سوال کے لئے میں نے اپنا حق رکھا تھا لیکن میں نے اس کو بھی استعمال نہیں کیا۔ البتہ صرف دو ضمنی مختصر سوالات کئے۔ اس سے زیادہ میں نے اس گفتگو میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

البتہ بعض علماء کے متعلق پوری مجلس نے یہ محسوس کیا کہ وہ تیاری کر کے نہیں آئے تھے.

ـــــــــــــــــــــــــ انہوں نے ایسے نکات پر جن پر کسی کو سرے سے اختلاف ہو ہی نہیں سکتا ایک وعظ کہہ دیا۔ اپنی جگہ در حقیقت وہ مواعظ بھی نہایت قیمتی تھے لیکن جس مقصد کے لئے یہ محاضرات منعقد کئے گئے تھے اس کے اعتبار سے وہ غیر متعلق تھے اور جو اصل نکتہ تھا جس میں اختلافِ رائے کی گنجائش تھی اور جس کے متعلق رہنمائی مطلوب تھی یعنی لزومِ جماعت اس کے تقاضے، ان کی انجام دہی کے لئے بیعتِ ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ و سمع و طاعت فی المعروف پر مبنی خالص دینی جماعت کا قیام ' ـــــ تو اس پر اظہارِ خیال سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔ نہ ان کی تصویب و توثیق کے متعلق کچھ فرمایا گیا اور نہ ہی اس سے اختلاف کرتے ہوئے کتاب و سنّت سے دلائل پیش کئے گئے۔ بایں ہمہ ان مواعظِ حسنہ کو بھی جملہ شرکاء نے صبر و سکون سے سنا۔ میرے لئے یہ بات نہایت ہی اطمینان بخش ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس پر جتنا ہی اللہ کا شکر کروں شکر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں فللہ الحمد والمنۃ

میری اپنی سوچ اور اپنے فکر کے اعتبار سے ان محاضرات کی اہم ترین بات یہ ہے کہ میں نے محسوس نہیں کیا کہ کسی صاحب کی طرف سے کوئی بڑی بنیادی اختلافی بات محکم دلائل کے ساتھ آئی ہو ـــــ اختلاف کی نوعیت عموماً یہ رہی ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک جماعت یا تنظیم کے قیام سے بہت سے اندیشے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ بعض ضروری احتیاطیں ہونی چاہئیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض حضرات نے میری بعض ان تعبیرات سے شدید اختلاف کیا جن کے متعلق میں گذشتہ جمعہ کی اپنی تقریر میں پیشگی اعتراف کر چکا تھا کہ روا روی میں کچھ الفاظ ایسے استعمال ہو گئے ہیں کہ جن سے بعض حضرات کو مغالطہ ہوا ہے۔ مثلاً میں نے اس خط میں جو اہلِ علم و فضل کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ یہ لکھا تھا کہ

"آخر میں جناب سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لئے ضرور وقت نکالیں۔ اس لئے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی، خصوصاً جبکہ اس کا محرک اور داعی خود اس کے لئے مستدعی ہو، ایک اہم دینی فریضہ ہے! ــــ بصورت دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی جناب ہی نے توجہ نہیں فرمائی۔"

میرے خط کی اس عبارت کے حصے میں جو الفاظ آئے ہیں کہ "آپ پر ایک حجت قائم ہو جائیگی" انکا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ میں اس طرح ان پر اپنی بیعت کرکے تنظیم اسلامی میں شامل ہونے کی دعوت دے کر "حجت" قائم کر رہا ہوں۔ حاشا وکلا میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں اسے اپنی کوتاہ قلمی اور اپنی تقصیر سمجھتا ہوں کہ ان الفاظ سے بعض حضرات نے یہ مفہوم اخذ کیا ــــ میرا اس عبارت سے مقصود یہ تھا کہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ علماء کرام آسانی سے میری دعوت قبول نہیں کریں گے تو میں نے ایک انتباہ کے طور پر لکھا تھا کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور تشریف لائیں۔ اس مفہوم و معنی میں میں نے لفظ حجت استعمال کیا تھا کہ دیکھئے کہ میں نے تو آپ سے ہدایت و رہنمائی چاہی ہے۔ آپنے نہیں دی تو اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ جوابدہ ہوں گے۔ ایک تو وہ ہے جسے آپ ہدایت دینا چاہتے ہیں لیکن وہ سرتابی کرتا ہے ــــ اب دیکھئے وہی انتقال ذہنی والا معاملہ ہے میرا ذہن سورۂ عبس کی ان آیات کی طرف منتقل ہوا: وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ○ وَهُوَ يَخْشٰى ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ○ جو شخص چاہتا ہے کہ مجھے بتاؤ، میری جو غلطی ہے اس کی نشاندہی کرو ــــ اب اس کے باوجود کوئی استغناء کا انداز اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے جواز اور عذر پیش کرنے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی شرعی عذر کی بنا پر لاہور کا سفر کرنا یا تشریف لانا ممکن نہ ہو۔ توقع ہے کہ جن حضرات کو عبارت کے اس حصہ سے مغالطہ لاحق ہوا ہے ان کی غلط فہمی ان شاء اللہ اس وضاحت سے رفع ہو جائے گی۔ چند دوسری تعبیرات کی میں وضاحت آگے کروں گا ــــ تین حضرات کے مجھے خطوط آئے ہیں کہ ہم تو تم سے اتنے بیزار ہیں کہ آنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے ایک مزاج ہے، افتاد ہے۔ باقی بعض اکابر علماء جو تشریف نہیں لا سکے۔ ان کے نہایت عمدہ اور حوصلہ افزا خطوط آئے ہیں۔ ان میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا

وہ میرے لئے سرمایۂ زیست رہیں گے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ جو اس وقت برصغیر کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں۔ میں بلاخوفِ تردید اپنے تجربہ اور علم کے اعتبار سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا موصوف اپنی عمر، اپنے وسیع تجربے اور اپنے علم و فضل کی بنیاد پر واقعتاً اس دور میں چوٹی کے عالم ہیں۔ وہ شخص جو کلکتہ کی قدیم اور معیاری درس گاہ مدرسہ عالیہ کا طویل عرصہ تک پرنسپل رہا ہو۔ وہ شخص جو علی گڑھ یونیورسٹی کا طویل عرصہ تک شعبۂ دینیات کا صدر رہا ہو۔ وہ شخص جو بے شمار نہایت اعلیٰ اور تحقیقی کتابوں کا مصنف ہے۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کی بعض کتابیں پڑھی تھیں جن میں "حقیقت وحی" سے میں نے بہت استفادہ کیا تھا۔ آج تک میری لائبریری میں شاید وہ نسخہ موجود ہو جس کے بعض ابواب کو میں نے انڈر لائن کر کے پڑھا تھا جس طرح میں میڈیکل کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ میری یہ عادت تھی کہ ضروری حصوں کو سرخ نیلی اور دوسری رنگوں کی پنسلوں سے انڈر لائن کیا کرتا تھا تاکہ حسب ضرورت ان میں ربط قائم کر سکوں اور جب کبھی موقع آئے تو صرف ایک نگاہ دوڑا کر رنگوں کے اختلاف سے مضمون کے نکات کو باہم جوڑ کر نتیجہ نکال سکوں ــــ اسی انداز سے میں نے مولانا موصوف کی کتاب "حقیقتِ وحی" کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ وہ شخص اس وقت اتنے اعلیٰ پائے کا مصنف تھا۔ ابھی سیرتِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ان کی بڑی محققانہ اور ضخیم کتاب آئی ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نہایت عرق ریزی اور تحقیق سے سرکاری خطوط جمع کئے ہیں۔ سیرت عائشہ صدیقہ پر ان کی محققانہ تصنیف موجود ہے۔ پھر یہ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے نام سے دارالعلوم دیوبند میں ایک اکیڈمی قائم ہوئی ہے۔ اس کے وہ ڈائریکٹر ہیں ــــ وہ محاضرات میں بنفس نفیس تشریف لانا چاہتے تھے، وہ اس کے بڑے خواہش مند تھے کہ خود آ کر میرے موقف کی کلی تائید فرمائیں۔ فی الوقت وہ کراچی میں مقیم ہیں۔ کافی علیل ہیں۔ ان کے معالجوں نے سفر کی ان کو بالکل اجازت نہیں دی تو ہمارے ایک رفیق ان کا پیغام ٹیپ کرا کے لے آئے تھے جس میں انہوں نے ہر پہلو سے تائید کی ہے، کسی پہلو سے تنقید نہیں کی۔ یہ ٹیپ محاضرات کے پہلے اجلاس میں سنایا گیا ــــ لہٰذا بتائیے کہ مولانا مدظلہٗ کی یہ تائید میرے لئے سرمایۂ زیست ہے یا نہیں؟

اسی طرح حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ (جو برصغیر پاک و ہند میں علی میاں کے نام سے مشہور و معروف ہیں)۔ وہ صرف برصغیر ہی کے نہیں بلکہ عالمی شہرت کے عالم اور مفکر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ عالم عرب میں وہ جتنے محبوب و مقبول ہیں اس کا کسی کو اندازہ ہو ہی نہیں ہو سکتا۔ عرب مولا

کی عربی زبان کی تحریر و تقریر سے چٹخارے لیتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر اتنی اعلیٰ عربی میں ہوتی ہے کہ عرب جو اہل زبان ہیں اس کا لوہا مانتے ہیں۔ ان کے ہاں گنتی کے لوگ ہوں گے جو علی میاں مدظلہٗ کے پائے کی عربی لکھ اور بول سکتے ہوں۔ ان کا خط بھی بڑا حوصلہ افزا آیا ہے۔ ایسے جملے بھی ہیں جن کو میں یہاں نقل بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح حضرت مولانا گوہر الرحمٰن مدظلہٗ نے اپنے مکتوب گرامی میں اس عاجز کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ اور جہاد بالقرآن کی تحسین و تائید فرمائی ہے۔ نیز قومی اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے عدم شرکت پر معذرت کی ہے۔

یہ سب کچھ عرض کرنے کی غایت یہ ہے کہ مجھے توقع ہے کہ یہ محاضرات ان شاء اللہ ہماری دعوت کے لئے سنگ میل ثابت ہوں گے۔ اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر جس چھوٹی سی دینی خدمت کا میں نے آغاز کیا تھا۔ اس پر بہرحال بیس سال بیت گئے ہیں۔ اب تھوڑا وقت باقی ہے لیکن انسان کی یہ کمزوری ہے کہ اس نے جو کام شروع کیا ہو وہ چاہتا ہے کہ اسے پھلتا اور پھولتا دیکھے پھل لاتا ہوا دیکھے۔ اگرچہ سورۂ صف میں ایک عجیب نکتہ آیا ہے۔ فرمایا گیا ہے:
وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ ایک چیز تمہیں بڑی محبوب ہے کہ فتح ہو، کامیابی ہو، نتائج نکلیں اور تمہیں اپنے لگائے ہوئے پودے درخت بنتے اور برگ و بار لاتے نظر آئیں۔ یہ تمہیں پسند ہے۔ اللہ کو تو اس سے غرض ہی نہیں۔ اللہ کو یہ کرنا ہو تو آنِ واحد میں کر دے۔ اللہ تو تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے کہ تم اس کے دین کے غلبہ کے لئے اپنا تن من دھن لگاتے ہو یا نہیں! اللہ کی نگاہ میں تو وقعت آخرت کی کامیابی کی ہے۔ اس کامیابی کی ہے ہی نہیں۔ یہ تو اونچ نیچ ہے جو ہوتی ہی رہتی ہے: تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ ـــــ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا۔ میں ایک نوع کی تعریض ہے کہ تمہاری نگاہ میں اس کی بڑی اہمیت ہوگی۔ ہماری نگاہ میں تو اسے پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون ہے "شمع سودائی دل سوزیِ پروانہ ہے" جو ہمارے دین کے لئے اپنا سب کچھ لگا دے وہ کامیاب ہے۔ چاہے ایک قدم ہی چل پایا ہو کہ موت نے آلیا ہو گویا پہلے ہی قدم پر شہادت قدم چوم لے۔

اس پہلو سے یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہمارا کام بڑھے، پھیلے، پھلے پھولے، نتائج نکلیں۔ میں نے بہرحال اپنی جوانی اور کسی شخص کی عمر کا جو بھی بہترین حصہ ہوتا ہے وہ اس کام میں لگایا ہے۔ اس لئے فطری خواہش ہے کہ یہ کام پائیدار

بنیادوں پر آگے بڑھے ۔ دعوتِ قرآنی بھی آگے بڑھے اور اقامتِ دین کی جدوجہد بھی صحیح صحیح رُخ پر علیٰ منہاج النبوّۃ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نقوش پائے مبارک کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھے ۔ باقی رہا یہ کہ کون کہاں تک پہنچے گا اور کس منزل تک یہ جدوجہد پہنچے گی یہ کسی کو معلوم نہیں جب قرآن میں خود حضور سے فرمایا گیا کہ اے نبی! آپ کہہ دیجئے: اِنْ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ " مجھے کچھ پتہ نہیں میرا کیا بنے گا اور تمہارا کیا بنے گا!" اور ــــ وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ " مجھے کچھ پتہ نہیں جس عذاب کی تمہیں دھمکی دی جا رہی ہے وہ آیا سر پہ آن کھڑا ہے یا ابھی کچھ مہلت ہے"۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے ــــ تو ہمیں کیا پتہ! ؏ گیے بر پشت پائے خود نہ بینم ۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ وہ کبھی خود اپنے پیر کی پشت پر رکھی ہوئی چیز کو نہیں دیکھ پاتا، جیسے ہم کہتے ہیں کہ ناک تلے کی شے نظر نہیں آتی ۔ دعویٰ وہ یہ کرتا پھرتا ہے کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں وہ دیکھ رہا ہوں اور یہ مستقبل ہے ۔ البتہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرائن و موجود شواہد سے انسان پیش آنے والے واقعات و حالات کا صحیح اندازہ لگا لیتا ہے جیسے علّامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے ؏ گاہ میری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود ــــ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ مستقبل کی کوئی جھلک دکھاتا ہے اور جیسے علّامہ نے کہا ہے ؎

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی ۔۔۔ دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!

اور یہ کہ ؎

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

یہ دونوں کیفیات ہوتی ہیں ۔ بہرحال میرے لئے یہ بات بہت ہی موجبِ اطمینان ہے کہ جو کام میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسی کی تائید و نصرت کے بھروسہ پر شروع کیا تھا اس سمت میں رفتہ رفتہ ہمارے قدم آگے بڑھ رہے ہیں ۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ والمنہ

میں نے آج کے لئے جو موضوع اپنے سامنے رکھا تھا اس پر گفتگو کا موقع ہی نہیں آیا اور کافی وقت محاضراتِ قرآنی کے متعلق تاثرات کے بیان میں صرف ہو گیا ــــ ان ہی محاضرات میں ایک بزرگ، مظفر آباد آزاد کشمیر سے تشریف لائے تھے جن کا نامِ نامی ہے مولانا سیّد مظفر حسین ندوی ــــ مجھے ان کے متعلق یہ اندازہ تو تھا کہ بہت خاموش طبع، بہت شریف النفس اور بہت نیک انسان ہیں ۔ اس مرتبہ جب وہ ہمارے ساتھ پانچ چھ دن رہے تو اندازہ ہوا کہ صاحبِ دل شخصیت بھی ہیں ــــ ان کو دو اطراف سے فیض بھی پہنچا ہے اور اسی اعتبار سے ان کو دو اطراف سے ذہنی مناسبت بھی ہے ۔ وہ

جب ندوہ (لکھنؤ) میں زیرِ تعلیم تھے تو مولانا سید ابو الحسن علی میاں مدظلہٗ اور مولانا مسعود عالم ندوی رحمۃ اللہ علیہ دونوں ان کے استاذ تھے۔ مولانا علی میاں ندوی حنفی المسلک ہیں اور مولانا مسعود عالم ندوی سلفی المسلک یعنی اہلِ حدیث تھے۔ مولانا علی میاں بھی اگرچہ جماعت اسلامی کے ابتدائی دور میں اس میں شریک ہوئے تھے لیکن بہت جلد چند اختلافات اور کچھ چیزوں سے مایوس و بددل ہو کر علیحدہ ہو گئے تھے۔ یہ ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد ان کا زیادہ وقت تبلیغی جماعت کے ساتھ گزرا ہے۔ جبکہ مولانا مسعود عالم ندویؒ جب جماعت میں آئے تو تادمِ واپسیں جماعت ہی میں رہے۔ عالمِ عرب میں مولانا مودودی مرحوم کو متعارف کرانے والے یہی ہیں۔ مولانا مودودی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے اور ان کو عرب میں پھیلانے کا ابتدائی کام مولانا مسعود عالم ندوی ہی نے سرانجام دیا ہے۔ وہ بھی ندوہ کے صاحبِ قلم تھے اور اپنے عربی مضامین کے باعث جو وہاں عربی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے ایک معروف عربی انشاپرداز کی حیثیت سے کافی معروف و مشہور تھے ــــ یہ مولانا سید مظفر حسین ندوی مدظلہٗ ان دونوں کے شاگرد ہیں۔ لہٰذا دونوں کے مزاج ایک حسین توازن کے ساتھ ان میں جمع ہیں۔ ان کو میں مجمع البحرین اگر کہوں تو بالکل درست ہو گا۔ ایک طرف ان میں حنفیت بھی ہے دوسری طرف اس میں سختی و تشدد کے بجائے توسع ہے۔ بڑی وسعتِ قلبی ہے۔ پھر یہ کہ ان کا ایک انقلابی مزاج بھی ہے جو ابتدائی دور میں جماعتِ اسلامی کا تھا اور تبلیغی جماعت کا تقویٰ، تدین، دھیما پن بھی ان کی طبیعت کا ایک جزو ہے۔ مزید یہ کہ ۱۹۴۷ء میں جو جہادِ کشمیر میں ہوا تھا تو جہاں تک میرا گمان ہے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کا آغاز کیا تھا۔ اس کی تحریک کرنے والے وہی ہیں۔ انہوں نے ہی لوگوں کو اس مقصد کے لئے جمع اور آمادہ کیا تھا۔ بہرحال اس جہاد کی نمایاں ترین شخصیت وہ رہے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ البتہ میں اس کی تحقیق کروں گا کہ اس کی تحریک کرنے والے وہی ہیں یا کوئی اور!

سید مظفر حسین صاحب نے محاضرات میں جو تقریر کی اس کے آخر میں انہوں نے محاضرات کے موضوع کے بارے میں تو ایک جملہ کہا کہ مجھے پوری چیز سے اتفاق ہے۔ یہ جملہ ہی بہت قیمتی ہے۔ البتہ انہوں نے اپنی تقریر میں جو اہم بات فرمائی وہ میں ان ہی کے حوالے سے آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں ــــ دیکھئے ایک تو وہ نقطۂ نظر ہے جو بحیثیت ایک مخلص پاکستانی ہم میں سے ہر ایک کا ہونا چاہئے۔ اور ایک وہ نقطۂ نظر ہے جو ہمارا مومن و مسلم کی حیثیت سے ہونا چاہئے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے ہمارے عمل میں مضبوطی اور پختگی آئے گی ــــ انہوں نے یہ بات بایں الفاظ نہیں کہی ہے لیکن اس کا جو مفہوم میں نے سمجھا ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں ــــ ہمارا

خالص مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر بھی اگر ہو کہ یہ پاکستان ہمارا ملک ہے۔ ہمارا وطن ہے۔ اسے مشرق و مغرب سے خطرات لاحق ہیں۔ ہمارے دشمنوں کے بڑے مضبوط حلقے (LOBBIES) ہمارے ملک کے اندر موجود ہیں۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد یہاں ہنگامے ہوتے رہے ہیں۔ کبھی لسانی فسادات ہو گئے۔ جیسے کہ بھٹو کے دور میں سندھ میں ہو گئے اور اس موقع پر اندیشہ لاحق ہوا تھا کہ پتہ نہیں کہ اب یہ کشتی اس گرداب سے نکل سکے گی یا نہیں؟ کبھی کبھی سُنّی شیعہ فسادات ایک ہولناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ فی الوقت قادیانیوں کا جارحانہ انداز امن و امان کے نقض کا موجب بن سکتا ہے۔

اب ذہنوں میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کی بقا کے لئے، اس کے استحکام کے لئے کوئی سہل نسخہ بھی ہے یا نہیں! ٹھیک ہے طویل نسخے موجود ہیں: اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ۔ تیاری جاری رکھو جتنی بھی امکان میں ہے۔ اتحاد پیدا کرو۔ جو بھی اپنے RANKS کے اندر اختلافات ہیں انہیں دور کرو۔ یکجہتی پیدا کرو۔ علاقائی سطح پر انصاف کا معاملہ ہو۔ لوگوں کو ان کے جائز حقوق دیئے جائیں تاکہ انہیں اطمینان ہو۔ وہ احساسِ محرومی میں مبتلا نہ ہوں۔ پھر یہ کہ اگر خارج میں ہمارے کچھ دشمن ہیں تو خارجہ پالیسی کے تحت کچھ دوست بھی تلاش کئے جائیں۔ ان میں سے کسی چیز سے بھی اختلاف نہیں ہے لیکن یہ وہ امور ہیں کہ خالص مادہ پرستانہ اور لادینی نقطۂ نظر رکھنے والے ذہن کا آدمی بھی ان کے متعلق سوچے گا۔ دشمنوں کے مقابلہ میں دوستوں کی تلاش، ان سے معاہدے، اگر معاہدے نہ ہوں تو کوئی اطمینان ہو۔ یہ باتیں تو ہر شخص سوچے گا۔ اسلحہ جمع کرنے کے متعلق ہر ملک سوچے گا کہ کتنا ہم خود بنا سکتے ہیں اور کتنا دوسروں سے لے سکتے ہیں اور وہ کہاں سے مل سکتا ہے۔ کہاں سے نہیں مل سکتا۔ یہ سوچیں تو ہر محبِ وطن کی ہوں گی۔ خواہ وہ مومن و مسلم ہو یا کافر ہو ——

لیکن سیّد صاحب موصوف نے دو آیات کے حوالے سے اس کا آسان ترین نسخہ بتایا ہے جس کے مؤثر ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے جو تیر بہدف SHURE SHOT ہے۔ اس نسخہ کا پہلا جزو تو سورۂ محمّد کی آیت نمبر ۷ میں ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ۔ "اے اہلِ ایمان اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔ تو یہ اس نسخہ کا پہلا جزو ہے تم اللہ کی مدد کرو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اب حدیث میں اس انداز کی بہت سی باتیں آئی ہیں۔ فرمایا گیا کہ اگر تم اپنے تمام تفکرات کو ایک فکر میں مدغم کر دو —— مجھے اس مدغم کے لفظ سے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کے دور میں جب ایران کا نادر شاہ علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا تو علاقہ کے ذمہ دار پرچے پر پرچے بھیج رہے تھے کہ بادشاہ سلامت کچھ

کیجئے۔ دشمن منزل بمنزل دارالحکومت کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ لیکن شاہ صاحب کی جو رنگ رنگیلی محفلیں ہوا کرتی تھیں، شراب نوشی ہوتی رہتی تھی۔ لہٰذا شاہ کی طبع پر ان پرچوں کا پڑھنا بھی گراں گزرتا تھا تو جو رقعہ آتا تھا اسے وہ بغیر پڑھے شراب کے جام میں پھاڑ کر ڈال دیتے تھے کہ ؏

این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

یہ انداز مطلوب ہے کہ دنیا کے تمام تفکرات کو غرق کردو ایک فکر میں اور وہ فکرِ آخرت ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ ارشادِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالہ سے ذہن نشین کر لیجئے۔ فرمایا الصادق والمصدوق ؐ نے : مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ اٰخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ ۔ "تو اللہ ذمہ لیتا ہے اس شخص کے تمام دنیا کے تفکرات کو دور کرنے کا" ___ بتائیے کہ اس سے زیادہ آسان نسخہ کوئی ہے۔ بس اس کے لئے تھوڑے سے ایمانِ حقیقی کی ضرورت ہے ___ اگر وہ تھوڑا سا واقعی یقین کہیں سے میسر آجائے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

یہ یقین ہے اصل مسئلہ ۔ اسی طریقہ سے ایک طویل حدیث کے درمیان میں آتا ہے : مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ " جو شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے، اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے ۔ اب آپ بتائیے کہ جو ایک انسان اپنے ایک بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے، اللہ کی نگاہ میں اس کی اتنی قدر ہے کہ اس کی ضرورت خود وہؐ پوری فرماتا ہے تو اگر اللہ کے دین کی ضرورت کوئی پوری کر رہا ہو تو اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ کیا ہوگا! یہ ہے انداز اس آیت کریمہ کا : يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ○ اے اہل ایمان اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔" پھر تمہارے قدموں میں کوئی لغزش نہیں ہوگی، تم ثابت قدم رہو گے تو یہ ہے اس نسخہ کا جزوِ اوّل ___

دوسرا جزو کیا ہے؟ اسے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۶۰ سے سمجھئے۔ فرمایا : اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ " اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکے گا" یہ بڑی یقین دہانی والی بات ہے۔ جس کا پشت پناہ اللہ بن گیا ہو، جس کا مددگار اللہ ہو تو اب کیا کوئی اللہ پر غالب آسکتا ہے ؟ لیکن یہاں ایک دھمکی بھی ہے : وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ

يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ۔ ہوش میں آؤ" اگر اللہ ہی تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون ہے وہ جو تمہاری مدد کر سکے اس کے بعد"۔ امریکہ بچا لے گا! میزائل بچا لیں گے! اسلحہ بچا لے گا! اگر اللہ نے چھوڑ دیا تو کوئی بچانے والا نہیں۔ نہ کثرت تعداد بچاتی ہے۔ نہ کوئی اور مادّی شے بچاتی ہے۔ جنگ حنین میں بارہ ہزار مسلمان تھے، لیکن ابتداء میں شکست ہوئی: وَيَوۡمَ حُنَيۡنٍ اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ ۔ حنین میں جنگ کے دن تمہیں اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا۔ نتیجہ دیکھ لیا ___ اس بات کو جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کفار کے ساتھ خالص مادّی سطح پر معاملہ کرتا ہے۔ اگر ان کی آپس کی جنگ ہے تو ان کا معاملہ تو حساب کتاب سے ہوگا۔ اسباب و وسائل کی کمی بیشی فیصلہ کن ہوگی۔ مسلمان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس کے ساتھ معاملہ کے اللہ تعالیٰ کے معیارات بالکل جدا ہیں۔ یہ معیار معلوم کرنا ہے تو حضرت طالوت کا جالوت جیسے باجبروت اور عسکری لحاظ سے نہایت مضبوط لشکر سے مقابلہ کا انجام دیکھو۔ جہاں ان مومنین کا یہ قول قرآن مجید نے نقل کیا ہے جن کو یقین تھا کہ مرنے کے بعد اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے: كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ○ "بارہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" یہ معیار معلوم کرنا ہے تو معرکہ بدر دیکھو جسے اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان قرار دیا ہے۔ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والا دن جس روز اللہ تعالیٰ کی مدد سے تین سو تیرہ بے سروسامان مومنین صادقین ایک ہزار کفار کے لشکر پر غالب آئے جو ہر طرح کے ہتھیاروں اور کیل کانٹوں سے لیس اور مسلح تھے۔

ہم مومنین صادقین اور کفار کے معاملہ کے تناسب کو دنیوی معیارات سے گڈمڈ کرتے ہیں اور اصل صورت حال یہ ہے کہ عام طور پر ہم اپنے معاملات کو ان معیارات پر سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں جو اللہ کے پیمانے اور معیارات کفار کے لئے ہیں۔ مسلمان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ان سے تو مستقل وعدہ ہے کہ: وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ "تم ہی غالب و سربلند رہو گے۔ لیکن یہ وعدہ مشروط ہے اس سے کہ: اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۔ "بشرطیکہ تم مومن ہو"۔ یعنی سربلندی اور غلبہ کے لئے مومن صادق ہونا لازمی شرط ہے ___ وہ بھی فرداً فرداً نہیں بلکہ جماعتی اور منظم طور پر۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

تو سیّد مظفر حسین ندوی مدظلہٗ نے یہ نسخہ تجویز فرمایا کہ اگر ہم بحیثیت قوم ملت اللہ کے دین کے حامی اور مددگار بن جائیں اور اسے اپنے ملک میں مخلصانہ جذبہ کے ساتھ صحیح خطوط پر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ انفرادی طور پر خود بھی حقیقی مومن بن جائیں اور اجتماعی نظام کو بھی کتاب و سنّت کی تعلیمات کے مطابق استوار کر کے قائم و نافذ کر دیں تو ان شاء اللہ ہمارے ساتھ معاملہ وہ ہوگا جس کی بشارت ان آیات میں دی گئی ہے: اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ـــــ اور اِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ـــــ اصل میں یہ باتیں تو بالکل سامنے کی ہیں۔ دو اور دو چار کی نوعیت کی ہیں۔ متعدد بار یہ مضمون اس انداز میں بیان بھی ہوا ہوگا۔ لیکن انہوں نے جس پُر تاثیر انداز سے بیان کیا اس کی شان ہی نرالی تھی ـــ مجھے اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ واقعہ ہے کوئی کہانی نہیں ہے کہ امیرِ افغانستان کی والدہ شدید بیمار تھیں۔ مقامی اطبّاء و حکماء بالکل مایوس ہو چکے تو علاج کے لئے حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی سے بلایا گیا۔ حکیم صاحب نے دیکھا بھالا اور پھر نسخہ لکھوانا شروع کیا تو امیر کابل نے کہا کہ یہ ساری دوائیاں تو ہم استعمال کرا چکے ہیں۔ اس پر حکیم اجمل خاں صاحب نے جواب دیا کہ "بدستِ اجمل خان نخوردہ!" یہ دوائیاں اب اجمل خاں کے ہاتھ سے کھلاؤ ـــــ تو دوائیوں کا معاملہ اپنی جگہ ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس کے ہاتھ سے اور کس کی تجویز اور کس کے نسخے سے وہ دوائی کھلائی جا رہی ہے ـ اس میں بڑا فرق ہے ـــــ تو میں نے محسوس کیا کہ سیّد صاحب مدظلہٗ نے جس طرح دل اور جذبے میں ڈوب کر یہ بات کہی ہے اور جس یقین کے ساتھ کہی ہے یہ قال نہیں حال معلوم ہوتا تھا۔ اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا اور اسی وقت میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ ان کی بات انہی کے حوالے سے جمعہ کے اجتماع میں اپنے الفاظ میں آپ حضرات کو منتقل کروں گا۔

اب اس مضمون کو تھوڑا سا اور آگے بڑھائیے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نصرت کا خاص طور پر قرآن مجید میں دو جگہ ذکر آیا ہے۔ ایک جگہ مثبت انداز میں اور ایک جگہ منفی اسلوب سے ـــــ مثبت والے انداز کی جو آیت ہے وہ تو ہمارے ایک کتابچے کی اساس و بنیاد ہے۔ وہ سورۃ اعراف کی آیت نمبر ۱۵۷ کے آخری جزو پر مشتمل ہے جس میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں اللہ تعالیٰ نے چار الفاظ کے حوالہ سے معیّن فرمائی ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا تھا کہ جب میرے الرسول النبی الامّی مبعوث ہوں گے تو میری ایک رحمتِ خاص ہے وہ میں نے محفوظ (RESERVE) کی ہوئی ہے۔ وہ ان لوگوں

کے لئے مخصوص ہے جو ہمارے اس الرسول النبی الامیّ کے ساتھ یہ معاملہ کریں گے ۔ وہ اُس رحمت کے حق دار ہوں گے ۔ وہ کیا معاملہ ہے ! اسے ان الفاظ مبارکہ میں بیان کیا : فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ پس جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے اور ان کی تعظیم و توقیر، عزت و احترام کریں گے اور ان کی نصرت و مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو ان کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو کامل فلاح ان ہی کے لئے ہے" یہاں النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ سے مراد قرآن مجید ہے ۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے بہرحال اس موضوع کو جو حضرات تفصیل سے سمجھنا چاہیں ان کو میں اس موضوع پر اس کتابچہ کے مطالعہ کرنے کی دعوت دوں گا[1] تو یہاں مثبت انداز میں فرمایا کہ اگر تم فلاح و کامیابی چاہتے ہو تو اس کی چار شرائط ہیں ۔ حضورؐ پر ایمان، حضورؐ کی تعظیم، حضورؐ کی نصرت اور قرآنِ حکیم کا اتباع ۔۔۔۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نصرت و مدد سے کیا مراد ہے ! کیا حضورؐ کو اپنی کسی ذاتی ضرورت کے لئے مدد درکار تھی ! کیا آپؐ کو اپنے کسی گھریلو مشکل کے حل کے لئے مدد درکار تھی ۔ کیا آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں اپنی مالی مدد کے لئے دستِ سوال دراز کیا ! ۔۔۔ میرے لئے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے اس واقعہ پر جب بھی اس کا تصوّر آ جاتا ہے کہ جو معاملہ حضورؐ نے حضرتِ ابوبکرؓ کے ساتھ کیا ۔ ان سے زیادہ جگری اور کون ہوگا جن کے متعلق فرمایا : لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ خَلِیْلًا ۔ حضورؐ تو یہاں ایک بابِ ہمہ اور بے ہمہ شخص کا نقشہ پیش فرما رہے ہیں ۔ اس دنیا میں خلیل میرا کوئی نہیں ۔۔۔ فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی کو اس دنیا میں خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا" میرا خلیل صرف اللہ ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ حضورؐ کے اندر محبّت اور شفقت اتنی بے پایاں تھی کہ ہر صحابی محسوس کرتا تھا کہ حضورؐ میرے خلیل ہیں ۔ یہ تو ظرف اور حسنِ سلوک کا معاملہ ہے کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ شاید آپؐ کی نظرِ عنایت و التفات مجھ ہی پر ہے ۔ حضرتِ ابوذر غفّاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو حدیث ہی ان الفاظ سے روایت کرتے ہیں : اوصانی خلیلی " میرے دوستؐ، میرے خلیلؐ نے مجھے یہ وصیّت کی تھی " ۔۔۔ تو جس واقعہ کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مکّہ میں مشرکین

---

[1] "نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" کے نام سے یہ کتابچہ مطبوعہ شکل میں موجود ہے ۔ (مرتب)

نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بنی ہاشم کے علاوہ قریش کے تمام خاندان کے چند نوجوان رات کو چھپ کر حملہ کریں گے اور یکبارگی حضورؐ کو شہید کر دیں گے تاکہ بنی ہاشم کسی ایک خاندان کو مورد الزام نہ ٹھہرا سکیں ۔ حضورؐ کو اس سازش کا علم ہوگیا تھا لیکن اللہ کے اذن کے بغیر نبی اپنا شہر چھوڑ نہیں سکتا۔ لہٰذا حضورؐ بھی ہجرت کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں اور ابوبکرؓ بھی منتظر ہیں ۔ حالات روز بروز مخدوش ہوتے جارہے تھے ۔ حضرت ابوبکرؓ کو تشویش لاحق تھی کہ کہیں مشرکین مکہ یہ آخری اقدام کر نہ بیٹھیں ۔ لہٰذا وہ کافی بے چین تھے اور حضورؐ سے بار بار پوچھتے تھے کہ اجازت آئی یا نہیں آئی اور حضورؐ جواب میں فرماتے کہ ابھی اجازت نہیں آئی ـــــ ایک دن دوپہر کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لائے اس طرح دوپہر کے بعد کسی کے گھر جانا عرب کے تمدن اور روایات کے اعتبار سے ایک غیر معمولی بات تھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ حضورؐ دوپہر کے غیر معمولی وقت ہمارے گھر تشریف لائے اور آتے ہی والد صاحب سے فرمایا کہ خاص بات ہے تخلیہ کرادو ۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ کی اہلیہ عائشہؓ کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں ـــ اس وقت تک حضرت عائشہؓ آپؐ کے نکاح میں آچکی تھیں ـــ حضورؐ نے فرمایا ہجرت کی اجازت آگئی ہے ۔ اب حضرت ابوبکرؓ کی خوشی کی جو کیفیت ہوگی اس کا آپ حضرات اندازہ کیجئے کہ انہوں نے حضورؐ کو بتائے بغیر دو اونٹنیاں خوب کھلا پلا کر تیار کی ہوئی تھیں ۔ اونٹ کا یہ معاملہ ہے کہ اگر اسے خوب کھلایا پلایا جائے تو اس کے اندر قوت جمع (ENERGY STORE) ہو جایا کرتی ہے ۔ دور دراز کا سفر ہے ۔ پھر تعاقب کا بھی اندیشہ ہے لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے دو تیز رفتار اونٹنیاں خوب فربہ کر رکھی تھیں ۔ لہٰذا بڑے مسرت کے انداز سے عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ میں نے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں ـــ اب ہے وہ مرحلہ حضورؐ تھوڑی دیر توقف فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ " ٹھیک ہے ایک اونٹنی میں استعمال کروں گا اور میں اس کی قیمت ادا کروں گا " ـــ یہ سن کر رو پڑے حضرت ابوبکرؓ اور عرض کیا " حضورؐ کیا یہ جان اور مال کسی اور کے لئے ہیں ! " ـــ یہ تو ان کے الفاظ ہیں ۔ میں ان کی تعبیر یوں کیا کرتا ہوں کہ حضورؐ مجھ سے بھی اتنی مغائرت ! ـــ تو یہ تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ـــ کس کام کے لئے آپؐ کو مدد درکار تھی ۔ وہ مدد تھی اللہ کی مدد ۔ اللہ کے دین کی مدد ۔ اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کی مدد ۔ اللہ کی کبریائی کے نظام کو برپا اور قائم کرنے کے کام میں مدد ـــ حضورؐ کو کوئی ذاتی مدد، کوئی خاندانی مدد، کسی اور مسئلہ میں استمداد اعاذ اللہ ثم معاذ اللہ ـــ سیرت مطہرہ میں تو حضورؐ

کی بے نفسی کا یہ عالم سامنے آتا ہے کہ جب آپ سواری پر تشریف فرما ہوتے تھے اور آپ کا کوڑا زمین پر گر جاتا تھا تو سواری کو بٹھانا، اس سے اترنا اور کوڑا خود اٹھانا آپ کو اس سے کہیں زیادہ پسند تھا کہ کسی سے فرمائیں کہ ذرا مجھے کوڑا اٹھا دینا ـــــ تو حضورؐ کو جو نصرت مطلوب تھی، وہ اللہ کے دین کے غلبہ اور اس کی کبریائی کے نفاذ کے لئے مطلوب تھی۔ اسی نصرت کا مثبت انداز میں یہاں ذکر آیا ہے: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؀

اب اسی کو منفی طور پر سورۂ توبہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ حسن اتفاق ہوا ہے کہ یہ معاملہ بھی اسی ہجرت کا ہے جس کا ایک پہلو میں نے آپ حضرات کو ابھی سنایا۔ میرے ذہن میں یہ بات پہلے اس طرح نہیں تھی ـــــ سورۂ توبہ میں فرمایا: اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ـــ غزوہ تبوک کے موقع پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ جو تم سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو اگر تمہاری ہمتیں پست ہوئی جا رہی ہیں اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ۔ اگر تم زمین میں دھنسے جا رہے ہو۔ تمہارے پاؤں من من بھر کے ہو گئے ہیں، تمہیں حضورؐ کے ساتھ قیصرِ روم کے خلاف جہاد و قتال کے لئے نکلنا بہت شاق اور گراں گزر رہا ہے تو ذرا یاد کرو اللہ محتاج نہیں ہے۔ اگر تم اس مرحلہ پر ہمارے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو اللہ نے ہر مرحلہ پر اپنے رسول کی مدد کی ہے۔ جب یہ صرف دو تھے اور غار میں تھے تو کون تھا ان کو دشمنوں سے بچانے والا! ـــ جب کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے لئے اور اپنی جان کے لئے نہیں بلکہ حضورؐ کی جان کی وجہ سے اس قدر پریشان ہوئے کہ سرگوشی سے عرض کیا کہ حضورؐ ان دشمنوں نے جو غار کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں اگر قدموں کی طرف جھک کر غار میں جھانک بھی لیا تو ہم دیکھ لئے جائیں گے ـــ لیکن یہ کہ غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا تھا۔ اور نیچے کبوتری کا گھونسلا تھا جس میں انڈے موجود تھے۔ جو علامت تھے اس بات کی کہ کوئی فرد غار کے اندر داخل نہیں ہوا۔ ہوتا تو جالا ٹوٹ جاتا۔ گھونسلہ اور انڈے بکھر جاتے ـــ ذرا قدرت الٰہی کا اندازہ کیجئے کہ بچا تا ہے تو مکڑی کے جالے اور کبوتری کے گھونسلے اور انڈوں سے۔ ماہر ترین کھوجی غار تک تعاقب کرنے والے مشرکین کے اس دستہ کو لے آیا ہے جس کا سردار ابوجہل ہے جس کی ذہانت اور زیرکی کی وجہ سے مشرکین قریش اسے ابوالحکم کہتے تھے۔ کھوجی اصرار کر رہا ہے کہ میرا علم اور میرا تجربہ بتاتا ہے کہ محمد (صلی اللہ

علیہ وسلم) اور ابوبکر (رضی اللہ عنہ) دونوں اس غار تک آئے ہیں اور یہاں سے آگے نہیں گئے۔ لہٰذا یہیں نہ ہوں غار میں ہیں ــــ اب غور کیجئے کہ کیا بات تھی! وہ کیوں رکے رہے۔ وہ ذرا جھک کر دیکھ لیتے! کس قدر باریک پردہ ہے! لیکن اصل بات تو اس طرح نصرتِ الٰہی کا ظہور تھا۔ انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ یُصَرِّفُ کَیْفَ یَشَآءُ۔ وہ جس طرف چاہے ان کو پھیر دے۔ لہٰذا ابوجہل غار کے دہانے پر کھڑا ہے اور پکار رہا ہے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر اندر ہو تو نکل آؤ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں قتل نہیں کروں گا بلکہ زندہ مکہ لے جاؤں گا ــــ اس وقت حضرت ابوبکرؓ گھبرائے اور حضور نے تسلی میں یہ بات فرمائی: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ "کیوں گھبراتے ہو اے ابوبکر! اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ پس اللہ نے مدد فرمائی تو اس طرح فرمائی ــــ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے مدعیان بھی مدد کرتے ہیں کہ نہیں۔ یہی ان کا امتحان ہے۔ زندگی کا فلسفہ یہی ہے کہ یہ امتحان کے لئے ہے ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

تمہارے ایمان کا امتحان ہے۔ تمہارے شوقِ عبادت کا امتحان ہے۔ تمہارے جذبۂ انفاق کا امتحان ہے۔ تمہارے طرزِ عمل کا امتحان ہے۔ تمہارے جوشِ جہاد کا امتحان ہے۔ تمہارے ذوقِ شہادت کا امتحان ہے۔ امتحان کے سوا اور کچھ یہاں مطلوب نہیں: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ "موت و حیات کے اس سلسلہ کی غایت ہی جانچنا اور پرکھنا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ــــ اس نصرت کو سمجھنے کے لئے سورۂ اعراف اور سورہ توبہ کی یہ آیات ذہن نشین کرلیں۔ اب دو آیات کا مفہوم مجھے اور بیان کرنا ہے جس کے بعد میری آج کی گفتگو مکمل ہو جائے گی۔

اب دیکھئے کہ نصرت اصلاً درکار ہے دین کی۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں نے آج شروع دعاؤں میں وہ دعا بھی شامل کی جو خطبہ میں ہم ہمیشہ مانگتے ہیں کہ: اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ "اے اللہ مدد فرما ہر اس بندے کی جو مدد کرے تیرے نبی محمدؐ کے دین کی اور ہم کو ان ہی میں سے بنا دے، انہی میں شامل فرما دے"۔ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَھُمْ "اور ہر اس شخص کو رسوا کر دے، اپنی توفیق اس سے سلب کر لے، اس کی مدد سے دستکش ہو جا جو تیرے نبی محمدؐ کے دین سے دستکش ہو رہا ہو اور اے اللہ ہمیں ان کے ساتھ شامل نہ کیجئیو"۔ میں اس کی تعبیر یوں کیا کرتا

کہ اے اللہ ہم کبھی دھوکہ سے بھی ایسے لوگوں کے پھندے میں نہ پھنس جائیں۔ معاشرے میں ایسے لوگ ہر دور میں موجود رہتے ہیں جو گندم نما جَو فروش کے زمرے میں آتے ہیں۔ دکھاتے گندم ہیں اور بیچتے جَو ہیں۔ بظاہر دین کی خدمت ہے اصل میں دنیا مطلوب ہے۔ کوئی چودھراہٹ مقصود ہے شہرت درکار ہے۔ کسی اور پہلو سے کوئی منفعت پیشِ نظر ہے تو ایسے گندم نما جَو فروش موجود ہوتے ہیں۔ پس ہم کسی کی گندم نمائی سے دھوکہ کھا کر اس کے ساتھی نہ بن جائیں۔ یہ ہے دعا۔ اس میں آپ نے دیکھا کہ نصرت و مدد کس کی درکار ہے! دین کی ــــ لیکن اس دین کی نسبتیں دو ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ بات جو میں دو مزید آیات کے حوالے سے سمجھانا چاہتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ دین کس کا ہے! اللہ کا۔ نبی کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے۔ دین کی ایک نسبت ہماری طرف بھی ہے: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ "تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے"۔ میرا دین، تمہارا دین، اس کا دین، یہ سب نسبتیں مجازی ہیں۔ دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی مجازی نسبت ہے۔ دین کی اصل نسبت کس کی طرف ہے! اللہ کی طرف 'دین اللہ'۔ اس لئے کہ دین اس کو کہتے ہیں کہ کسی ہستی یا ادارہ کو مطاعِ مطلق مان کر اس کی اطاعت کے مطابق پوری زندگی کا نقشہ بنایا جائے ــــ یہ نقشہ قبول کرنے والے کا دین ہوگا ــــ اگر کسی بادشاہ کی حاکمیت کو مطلق العنان تسلیم کر لیا گیا اور اس کی ABSOLUTE SOVEIRGNITY مان لی گئی۔ اسے قانون سازی کا مختارِ کل تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جو چاہے قانون بنائے جس چیز کو چاہے حلال قرار دیدے جس کو چاہے حرام ٹھہرا دے تو اس نظریہ کے تحت جو نظام بنے گا اور رائج ہوگا وہ دین الملک کہلائے گا۔ یہ لفظ سورۂ یوسف میں آیا ہے: مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ۔ اس کو آپ قیاس کر لیجئے جمہور کی حاکمیت کے اصول پر۔ جمہور کے قانون سازی کے اختیارِ مطلق کے اصول پر ــــ اس اصول پر جو نظام بنے گا وہ کہلائے گا دین الجمہور ــــ اور اللہ کو حاکمِ مطلق مان کر جیسے ہم نے تبرکاً قراردادِ مقاصد میں مانا ہوا ہے۔ تبرکاً ہی ہے ورنہ اندر خانہ آج تک تو مانا نہیں۔ آج کی تاریخ تک تو مانا نہیں۔ جھوٹ کہتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ مانا ہوا ہے۔ فلاں چیز مستثنیٰ، فلاں چیز مستثنیٰ تو کیا مانا! خاک مانا! جس چیز میں بیگمات ناراض ہوں، وہ مستثنیٰ۔ جس میں امریکہ ناراض ہو وہ مستثنیٰ۔ جس میں کارخانہ دار ناراض ہو وہ مستثنیٰ۔ جس میں زمیندار ناراض ہو وہ مستثنیٰ۔ تو کیا مانا! اللہ کو حقیقتاً حاکمِ مطلق مان لینا ہی تو ایک بات ہے۔ یہی تو توحید ہے ــــ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے! ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

لیکن یہ بڑی بھاری بات ہے۔ قولِ ثقیل ہے۔ ایک اللہ کا بندہ بن جانا انفرادی اعتبار سے بہت مشکل ہے اور اجتماعی اعتبار سے صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اصول پہ پورے نظامِ زندگی کو استوار کر دینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام تو وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرانجام دیا تھا۔ کوشش ہم کر سکتے ہیں کوشش کرنے ہی میں ہمارے لئے کامیابی ہے کر لینا آسان کام نہیں ہے ۔ بہرحال عرض یہ کر رہا تھا کہ اللہ کو حاکمِ مطلق مان کر جو نظام بنے گا وہ کہلائے گا دین اللہ ـــــ یہ اصطلاح سورۃ النصر میں استعمال ہوئی ہے : اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝

تو دین اصلاً اللہ کا ہے اس کے غلبہ اور اس کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرنا کس کی مدد ہوئی ! اللہ کی مدد ! اس کو غالب اور سربلند کرنے کے لئے اللہ نے اپنا رسول بھیجا صلی اللہ علیہ وسلم هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ " وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول کو الھدیٰ اور دین الحق دے کر تاکہ وہ غالب کرے اسے کُل کے کُل دین پہ چاہے یہ بات مشرکوں کو کتنی ناگوار گزرے"۔ تو دین غالب کرنے کا فرضِ منصبی کس کا ! رسول کا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگر تم اس دین کی سربلندی اور غلبہ کے لئے تن من دھن لگا رہے ہو، رسولؐ کے دست و بازو بن رہے ہو تو کس کی مدد ہوئی! رسولؐ کی مدد۔ تو یہ تین چیزیں ہو گئیں۔ دین کی مدد، دین کی نصرت ایک طرف اللہ کی مدد و نصرت ہے اور دوسری طرف رسولؐ کی مدد و نصرت ہے۔ اس کے لئے دو آیات نوٹ کر لیں۔

ایک آیت تو سورۂ حدید کی ہے۔ یہ آیت کریمہ قرآن مجید کی جامع ترین آیات میں سے ایک ہے۔ میں اس وقت اس کا ترجمہ سنا سکتا اور مختصر تشریح کر سکتا ہوں۔ چونکہ اس سے زائد کے لئے وقت نہیں ہے۔ فرمایا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ "ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو روشن تعلیمات اور واضح نشانیوں کے ساتھ"۔ بیّنات کا دونوں پر اطلاق ہوگا۔ جو تعلیمات وہ لے کر آئے وہ بھی روشن اور فطرتِ انسانی کی جانی پہچانی اور وہ جو معجزے لائے وہ بھی بیّن، واضح اور روشن۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ " اور ان کے ساتھ ہم نے کتاب بھی نازل کی، میزان بھی اتاری: میزان سے مراد سب کے نزدیک شریعت ہے وہ نظامِ عدل جو اللہ نے دیا۔ معاشی میدان میں یوں عدل و انصاف ہوگا۔ سیاسی میدان میں یوں عدل و انصاف ہوگا۔ شوہر اور بیوی کے حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔ آجر اور مستاجر کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔

بائع اور مشتری کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔ فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔ زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو میں توازن ہوگا۔ شریعت کی میزان میں ہر ایک کا حق تُلے گا اور ایک کا حق دوسرے کا فرض ہے ۔ والدین کے جو حقوق ہیں اولاد پر وہ اولاد کے والدین کے بارے میں فرائض ہیں۔ شوہر کے بیوی پر جو حقوق ہیں وہ بیوی کے شوہر کے متعلق فرائض ہیں ۔ بات تو ایک ہی ہے۔ پس پوری اجتماعی زندگی میں حقوق و فرائض کا ایک توازن ہے ___

اب غور کیجئے کہ سب کچھ کیوں کیا گیا کہ اللہ نے رسول بھیجے، تعلیمات اتاریں، بیّنات اتاریں۔ کتاب نازل فرمائی، میزان اتاری۔ کس لئے! کاہے کے لئے! یہ کوئی اللہ کی HOBBY ہے۔ کوئی مشغلہ ہے کوئی تفریح ہے۔ یا کوئی کارِعبث ہے! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ___ ہم نے یہی سمجھا ہے کہ بے مقصد کام ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ ۔ اس دین کو، اس قرآن کو، اس شریعت کو ایک طرف رکھے رہیئے ؎ چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب ___ اسے بند رکھنے ہی میں عافیت ہے۔ یہ پٹارہ کھل گیا تو ہماری خیر نہیں۔ ہمارے مفادات کی خیر نہیں۔ ہماری چودھراہٹوں کی خیر نہیں، ہماری پیشوائیوں کی خیر نہیں۔ علامہ اقبال نے بڑے سادہ الفاظ میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے

جانتا ہوں میں یہ امّت حاملِ قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

نئے تقاضے ابھر رہے ہیں، نئے نظریات جنم لے رہے ہیں اور محسوس ہو رہا ہے کہ شاید جو حرف قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ تھی اب تک اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار کچھ تقاضے ہیں جو سامنے آرہے ہیں۔ لیکن ہمارا وطیرہ یہ ہے کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے
اور : ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے ! یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
اور : ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے ہیں صفات ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات
ہیں کتاب اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم ! امّت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

ان گتھیوں کو سلجھاؤ گویا اسی سمجھنے سمجھانے پر دنیا و آخرت کی فلاح اور نجات کا دار و مدار ہے۔ پھر یہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اب تو نور و بشر کی گرما گرم بحث ہی نہیں جدال ہو رہا ہے

اسی میں لڑتے اور لڑاتے رہو۔ حضورؐ کا سایہ تھا یا نہیں تھا۔ اسی جھگڑے میں الجھاتے رہو۔ انہی مسائل پر مناظرے ہوں۔ پھر بڑے بڑے میلے ٹھیلے ہیں۔ عرس ہیں کبھی فلاں بزرگ کا عرس ہے کبھی فلاں کا۔ اخبارات میں روزانہ ہی کسی نہ کسی کے عرس کے بڑے بڑے اشتہار چھپتے رہتے ہیں۔ مزاروں کی تصاویر بڑی عقیدت سے خریدی اور گھروں میں آویزاں کی جا رہی ہیں۔ یہ ہیں وہ چیزیں جو بطور کھلونا دے دی گئی ہیں ع کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں ___

یہ باتیں دکھی دل کی پکار بن کر نوکِ زبان پر آگئیں۔ سلسلۂ کلام یہ ہے کہ غور طلب بات یہ ہے کہ الکتاب (قرآن مجید) کس لئے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا اور المیزان (شریعت اسلامی) کس لئے اللہ تعالیٰ نے اتاری تھی۔ اس کو نہایت وضاحت و صراحت کے ساتھ آگے بیان فرمایا گیا: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ تاکہ لوگ عدل و انصاف پر کاربند ہوں۔ قائم ہوں۔ یہ ترازو نصب کیا جائے۔ یہ دھرم کنڈا صرف دکھاوے کے لئے نہ ہو بلکہ اس میں ہر چیز فی الواقع تلے اور حقدار کو اس کا پورا حق ملے۔ لیکن یہ ترازو نصب کون ہونے دے گا! جو اپنے حق سے زیادہ لے رہا ہے وہ پسند کرے گا کہ میزانِ عدل سے تول کر لے؟ جو محروم ہیں وہ تو چاہیں گے کہ بھائی ترازو سے تولو۔ یہ کیا کہ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر لے جا رہے ہو اور ہمیں ایک مٹھی پر ٹرخا رہے ہو۔ وہ تو چاہیں گے۔ چاہے ہمت نہ ہو، جرأت نہ ہو، کھڑے نہ ہو سکیں لیکن جو اپنے حق سے زائد لے رہے ہیں وہ کبھی چاہیں گے کہ عدل و قسط کی میزان قائم ہو، نصب ہو۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو چاہے دلیل سے قائل بھی ہو جائیں بالفعل مانیں گے کبھی نہیں۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں باتوں سے کبھی ماننے والے نہیں۔ اسی لئے فرمایا: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ "ہم نے لوہا بھی اتارا ہے کہ نہیں"۔ پنجابی میں کہتے ہیں کہ نہیں 'چار کتاباں عرشوں آیاں پانچواں آیا ڈنڈا'۔ اسی کو اقبال نے یوں کہہ دیا ع عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد ___ لوگ میری باتوں سے گھبراتے ہیں کہ یہ کیا باتیں کرتا ہے! لیکن میں قرآن حکیم کی انقلابی دعوت پیش کرتا ہوں ___ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ۔ "اور ہم نے لوہا اتارا ہے" کیوں اتارا ہے؟ اس لئے کہ اس میں جنگ کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لئے اس میں کچھ دوسری منفعتیں بھی ہیں چمٹا، پھکنی، توا، پرات اور بھی روزمرہ کے استعمال کی ہزاروں چیزیں بھی اس لوہے سے بنتی ہیں لیکن حقیقت میں اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس سے اسلحہ بنایا جائے۔ چنانچہ فرمایا: فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ___ اور یہ اس لئے اتارا گیا ہے کہ اس اسلحہ کی طاقت کو وہ لوگ جو میرے دین کے

ماننے والے ہیں جو میرے نازل کردہ نظام عدل و قسط پر ایمان رکھتے ہیں، ہاتھ میں لیں اور ان لوگوں کی سرکوبی کریں جو میرے دین سے سرتابی کریں ۔ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ "تاکہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر غیب میں رہتے ہوئے بھی اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں"۔ اللہ کی مدد کیا ہے! اس کے نازل کردہ دین کی سربلندی اور اس کا نفاذ ۔ رسول کی مدد کیا ہے! اس کے لائے ہوئے دین کی سربلندی اور اس کا نفاذ ۔ آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ بے شک اللہ تعالیٰ بذاتہ قوت والا اور زبردست ہے۔ غالب ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ تمہاری مدد ہوگی تو اس کا دین قائم و نافذ ہوگا سربلند ہوگا۔ اس کی تکوینی حکومت اس کائنات کے ذرّے ذرّے پر مستولی ہے۔ اس دنیا میں اس کا تشریعی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری بغرض امتحان ان لوگوں کے سپرد کی گئی ہے جو اس پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے کے مدّعی ہیں ۔ وہ دیکھنا اور جانچنا چاہتا ہے کہ یہ مدعیانِ ایمان اللہ کے دین کی تنفیذ کے لئے اپنے تن من دھن کی قربانی کے لئے بھی تیار ہیں یا نہیں ۔ اس کے لئے یہ ضرور ہے کہ اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے ہمیں سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جو تدریج ملتی ہے اسے ملحوظ رکھا جائے۔ بصورت دیگر فساد رونما ہو جائے گا۔ فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ بارہ برس تک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مار کھانے کی مشق کرائی ہے اور خود ماریں کھائی ہیں۔ صحابہؓ نے نہایت بہیمانہ مظالم کو برداشت کیا ہے اور دشمنوں میں سے کسی کا بال تک بیکا نہیں کیا ۔ نہ یہ کیا کہ ہاتھ میں ہتھوڑا پکڑ کر خانہ کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے ان کو توڑنا شروع کر دیتے ۔ پورے نظم و ضبط کے ساتھ اپنے ہاتھ بندھے رکھے ۔ یہ تمام باتیں سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں جملہ مراحلِ انقلابِ اسلامی کے بیان میں آٹھ دس تقریروں کے ذریعے آپ کے سامنے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں [1]

اسی نصرت کے تذکرہ کی آیت پر سورہ صف ختم ہوتی ہے۔ وہاں بھی دو نصرتوں کا بیان ہے۔ ایک اللہ کی نصرت دوسری رسول کی نصرت ۔ فرمایا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ "اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بنو"۔ یہاں زوردار دعوت کا اسلوب ہے۔ آگے فرمایا۔ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ جیسے کہ یاد کرو چھ سو برس قبل عیسٰی ابن مریمؑ نے صدا لگائی تھی ۔ حضورؐ پر وحی کا آغاز سنہ ۶۱۰ عیسوی میں ہوا ہے۔ چنانچہ

---

[1] ان تقاریر کی اشاعت کا قسط وار سلسلہ ان شاء اللہ جون ۸۵ کے شمارے سے ہوگا (مرتب)

حضرت عیسیٰؑ اور حضورؐ میں چھ صدیوں کا فصل ہے ـــــ تو فرمایا کہ جیسے آج ہمارا آخری رسول تمہیں پکار رہا ہے کہ مدد کرو اللہ کی اور مدد کرو میری۔ اسی طرح چھ سو برس قبل آواز لگی تھی اور حضرت عیسیٰؑ ابن مریم نے اپنے حواریین کو پکارا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف، میں نے تو دعوت الی اللہ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تو اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لئے آگے بڑھ رہا ہوں۔ اب کون ہے جو میرا مددگار اور ساتھی بنے۔ میرے اعوان و انصار میں شامل ہو۔ یہ ندا تھی حضرت مسیح علیہ السلام کی کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط۔ اللہ کے کام میں، اللہ کے دین کے لئے کون معین و معاون بنتا ہے۔ دیکھئے دو نسبتیں آگئیں مَنْ اَنْصَارِیْ کون ہے میرا مددگار۔ اور 'اِلَی اللّٰہِ' اللہ کی طرف یعنی اللہ کے دین کے لئے ـــــ اس کے بعد تاریخ کی ایک جھلک دکھائی گئی۔ تمہیں یاد ہے کہ حضرت عیسیٰ کی دعوت قبول کرنے والے کتنے کم تھے۔ بارہ تو وہ تھے جن کو حواری کہا جاتا ہے اور جو ہر وقت آنجنابؑ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ان میں سے ایک غداری کر گیا تھا۔ دوسرا پیٹر تھا جس نے جب بہت ہی وفاداری اور عقیدت مندی کا اظہار کیا تھا تو حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا کہ "پیٹر! صبح مرغ کی بانگ سے پہلے پہلے تم دو یا تین مرتبہ میرا انکار کرو گے"۔ تو جب حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرنے کے لئے رومی فوج کے دستے نے ایک حواری کی غداری اور مخبری کی وجہ سے آپ کی پناہ گاہ پہونچ کر پکڑ دھکڑ شروع کی تو پیٹر جزع فزع کرنے لگا۔ اس نے آنجنابؑ سے بے تعلقی کا اظہار کیا۔ آپؑ کے حواری ہونے سے انکار کیا۔ یہ تمام باتیں موجودہ اناجیل میں مذکور ہیں۔ اب رہ گئے دس حواری تو حضرت مسیح کے رفع آسمانی (اور عیسائیوں کے بقول مصلوب ہونے) کے بعد ان سے اب جو دعوت شروع ہوئی تو اس نے جڑ پکڑنی شروع کی ان حواریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان کی دعوت پر ایمان لانے والوں کو زندہ آگ میں جلایا گیا۔ لیکن حق کا چراغ روشن سے روشن تر ہوتا گیا۔ چنانچہ فرمایا: کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ "جیسے کہ عیسیٰ نے پکارا حواریوں کو کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف تو حواریوں نے لبیک کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کی روش اختیار کی" فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ۔ "پس ہم نے ان اہل ایمان کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی"۔ فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ ۵ پھر وہی اہل ایمان غالب ہوئے" ـــــ وہی بات آگئی: اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ

— اور إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ —

سورہ صف کی اس آخری آیت میں اہل ایمان کے لئے اللہ کے دین کی نصرت کی پُرزور دعوت آگئی۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ پھر ہمارا رسول ہے جو تمہیں اللہ کے دین کی نصرت کے لئے پکار رہا ہے۔ آؤ اللہ کے دین توحید کے قیام و نفاذ کے لئے اس کے دست و بازو بنو — مجھے بے ساختہ اقبال کا یہ شعر یاد آگیا ؎

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تاریخ تو اپنے آپ کو دہراتی رہے گی۔ آج ہم میں سے ہر شخص کی سعادت اسی میں ہے کہ اس پکار کو کھلے کانوں سے سنے اور کھلے دل سے قبول کرے۔

یہ ہے وہ تیر بہدف (SHURE SHOT) اور مجرّب نسخہ۔ تم اللہ کے دین کی مدد میں لگو۔ اللہ تمہارے دنیا کے تمام معاملات کا ذمہ خود لے گا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ — اور
إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ط
بَارَكَ اللّٰهُ لِي وَلَكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ وَنَفَعَنِي وَإِيَّاكُمْ بِالْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ٥

ڈاکٹر اسرار احمد اور انکی دینی خدمت

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ کی نگاہ میں

مولانا سعید احمد اکبر آبادی دامت فیوضہم برصغیر پاک ہند کی نہایت مشہور و معروف دینی اور علمی شخصیت ہیں۔ موصوف کا تعارف محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے خطاب جمعہ میں بھی موجود ہے جو اسی شمارے میں شامل ہے۔ ۱۹ مارچ ۸۵ء کو راقم الحروف مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ مولانا کا محاضرات میں شرکت کا پختہ ارادہ تھا لیکن علالت مانع رہی۔ راقم کی درخواست پر موصوف نے اپنے ارشادات ریکارڈ کرا دیئے نیز از راہ کرم سوالات کے جوابات بھی عنایت فرمائے۔ یہ دونوں چیزیں قریباً لفظ بلفظ کیسٹ سے منتقل کر کے پیش خدمت ہیں۔ —— جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر صاحب کا کتابچہ یعنی میرے تصور فرائض دینی کا خلاصہ مجھے دیا گیا اسے میں نے بڑی توجہ سے پڑھا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تمام تحریریں جو میثاق میں نکلتی رہی ہیں یا جو انہوں نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں وہ بھی میری نظر سے گزری ہیں۔ ان سب کو پڑھنے کے بعد میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی شخص ایک تحریک شروع کرتا ہے تو اس کا نقطۂ آغاز یہ ہوتا ہے کہ جو کام کرنے میں جا رہا ہوں اس وقت تک کسی نے نہیں کیا اور اس رویے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس بات کے کہ وہ اپنے پیش رو اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی تعریف و تحسین کرے اور ان کی ستائش

کرے اور ان کی روشنی میں وہ یہ بتلائے کہ اس نے اپنے لئے یہ راہ عمل متعین کی ہے، اس کی بجائے وہ تنقید کرتا ہے اور اپنے نتیجے ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جو کام اب تک امت میں نہیں ہوا تھا وہ کرتے جا رہا ہے - یہ ایک عام روش ہے ان حضرات کی جو کہ تحریک اسلامی کے بانی ہیں اور اس کی ایک نہیں کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں - لیکن ڈاکٹر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے جب کہ وہ ایک ڈاکٹر تھے اور ان کا CAREER میڈیکل پریکٹیشنز کا تھا اور اس میں وہ بہت کامیاب تھے لیکن جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں اپنے آپ کو دین کی اور اسلام کی خدمت کے لئے اپنے خاص نظریئے کے ماتحت جو انہوں نے مطالعہ قرآن سے اخذ کیا ہے، وقف کر دینا ہے تو انہوں نے باقاعدہ علوم اسلامیہ کی تحصیل کی اور بڑے غور و فکر اور دقت نظر سے اپنا لائحہ عمل طے کیا - پھر تاریخ اسلام میں جو تحریکیں پیدا ہوئی ہیں ان کا انہوں نے بنظر غور مطالعہ کیا اور اس کے بعد پھر جب انہوں نے کام شروع کیا تو نہایت ہی عاجزی اور انکساری کے ساتھ کیا۔ اس میں کوئی تعلّی نہیں ہے اس میں کوئی انانیت نہیں ہے اس میں اپنی بالا خانی نہیں ہے - تو یہ ایک خاص چیز ہے جس نے مجھے ڈاکٹر صاحب کے متعلق بہت ہی متاثر کیا - ڈاکٹر صاحب جو کچھ بھی فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں وہ کھلے دل سے لکھتے ہیں اور لوگوں کو پھر دعوت دیتے ہیں کہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں جو لوگ ان کے معترضین ہوتے ہیں ان کا وہ بڑی خوش دلی کے ساتھ بغیر کسی بیزاری کے اور ناگواری کے جواب دیتے ہیں اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سلسلے میں میں یہ عرض کروں کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی جو خط و کتابت ہوئی ہے اس میں ڈاکٹر صاحب کی زبان سے ایک تقریر میں یہ لفظ نکل گیا تھا کہ میں نیم مقلّد ہوں - مولانا اخلاق حسین صاحب کو ناگوار گزرا اور انہوں نے اس پر اعتراض کیا - لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب نیم مقلّد نہ کہتے بلکہ یہ کہتے کہ میرا تقلید کے معاملے میں وہی رویّہ ہے جو کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اور جو کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا تھا تو بات نہ بگڑتی وہ محض نیم مقلّد کے معنیٰ کچھ سے کچھ سمجھے تو چونکہ

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے آپ کو حنفی لکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے لکھا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ میرا مسلک جو ہے وہ تلفیق بین المذاہب ہے ۔ یعنی میں ہوں حنفی لیکن اگر میں کہیں دیکھتا ہوں کہ امام شافعیؒ کا مذہب قابل ترجیح ہے تو میں اس کو اختیار کر لیتا ہوں ۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں اس کی ایک نہیں دسیوں مثالیں ملیں گی۔ تو صرف ایک تعبیر کی وجہ سے بات کچھ سے کچھ ہو گئی ورنہ ڈاکٹر صاحب اگر یہ کہہ دیتے تو میرے نزدیک بالکل درست تھا بہرحال یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب میں بڑی عاجزی اور انکساری ہے ۔ خلوص اور للّٰہیت ہے اپنے بزرگوں کا احترام ہے وہ یہ بتلاتے ہیں کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ ہمارے بزرگ برابر کرتے رہے لیکن زمانے کے حالات کے زیر اثر بعض ایسی چیزیں پیش آئیں کہ وہ اپنے راستے سے ہٹ کر ایک دوسری طرف لگ گئے تو یہ ایک الگ چیز تھی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ چیزیں جاری نہیں رہ سکیں۔ اب ڈاکٹر صاحب نے ع "من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را" کے مصداق ———— اسی کام کو آگے بڑھانا شروع کیا ہے اور اس کے لئے مستقل ایک تنظیم انہوں نے قائم کی ہے ۔ تنظیم کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ ایک بڑی اہم بات ہے کہ اس میں انہوں نے تنظیم کے مقاصد میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بہت اہم درجہ دیا ہے ۔ میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان دونوں کے درمیان عام وخاص کی نسبت ہے ۔ یعنی جہاں کہیں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پایا جائے گا وہاں تبلیغ ضرور ہو گی ۔ لیکن جہاں تبلیغ ہو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہونا ضروری نہیں ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہمارے مبلغین ہیں کتنے ہمارے عمائدین تبلیغ کے تبلیغ کرتے ہیں لیکن ان کے سامنے منکرات منہیات ہوتے رہتے ہیں اس کے لئے وہ کچھ بھی نہیں کرتے اور کچھ نہیں کہتے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کا بھی قرآن نے حکم دیا ہے اور حدیث شریف میں تو سب سے زیادہ زور نہی عن المنکر پر ملتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے قرآن نے اس امت کو خیر امم کہا ہے : كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ

لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اور اسی طرح فرمایا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو نسبت ہمارے رسول کو ہمارے ساتھ ہے۔ وہی نسبت ہم کو دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ ہے یعنی جو حضورؐ کا فریضہ تھا۔ جس طرح سے کہ آپؐ نے دینِ حق ہم تک پہنچایا اور ہم کو ایک قوم بنایا اب ہمارا فرض ہے کہ اُسی کو لے کر ہم آگے چلیں اور اُسے دوسروں تک ہم پہنچا دیں۔ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ بہت ہی اہم چیز ہے جسے قرآن کریم میں بہت اہم کام قرار دیا گیا ہے۔ محض تبلیغ اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے مستقل ایک تنظیم چاہیئے اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری پوری تاریخ اسلام میں قرونِ اولیٰ کے اندر تو اس کا کچھ نشان ملتا ہے کہ وہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے کچھ ادارے تھے لیکن اس کے بعد کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تبلیغ بھی ہوتی رہی درس قرآن بھی ہوتا رہا درس حدیث بھی ہوتا رہا علماء بھی پیدا ہوتے رہے لیکن سماج برابر بگڑتا رہا اسلامی سماج میں جو خرابیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں وہ برابر پھیلتی رہیں اور یہاں تک کہ اس بگاڑ کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں اس کی بڑی وجہ اصل میں یہی ہے کہ ہم نے امر بالمعروف بالخصوص نہی عن المنکر جیسی چیز کو چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک اساسی اور بنیادی حیثیت سے اپنے پروگرام میں شامل کرنے کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہ چیز ہے جو اصل میں خود قرآن کا مطلوب اور مقصود ہے ۔۔۔ اللہ تعالےٰ یہ جانتا ہے کہ یہ کام تمام مسلمان تو نہیں کر سکتے ہیں حالانکہ ہے تو سبھی کا فریضہ۔ اس بنا پر اس کو فرض کفایہ بنایا ہے فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے فرمایا کہ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔۔۔ یعنی تم سب تو نہیں کر سکتے اپنی اپنی جگہ پر تو ہر ایک کو کرنا ہے۔ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ۔۔۔ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اپنی رعیت

کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔ باپ اپنی اولاد کے اوپر ہے استاد اپنے شاگردوں کے اوپر ہے یوں تو اپنی انفرادی زندگی میں ہر مسلمان راعی ہے ہی لیکن قرآن مجید وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ بھی کہتا ہے اُس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسا ORGANIZATION ہونا چاہیئے مستقل طور پر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو اپنے آپ کو وقف کردے اس کے لئے اور اس کا کام کیا ہوگا! امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ تو گویا یہ جو خود قرآن کے نزدیک بڑی اہم اور بنیادی چیز ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کو اپنی تنظیم میں شامل کرکے ایک اتنا بڑا اہم اقدام کیا ہے جو کہ میرے خیال میں اب تک بہت کم لوگوں کے لئے قابل توجہ رہا ہے اور اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس میں اعانت کرے قدمے دامے درمے جس طرح سے بھی ہو اور مجھے توقع ہے کہ یقیناً انشاء اللہ تعالیٰ یہ ادارہ بہت ہی اہم اور مفید اور اسلام اور دین کے لئے بہت ہی زیادہ نفع بخش ثابت ہوگا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سوال وجواب

سوال: مولانا میں سب سے پہلے تو آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرمایا۔ ہماری خواہش تو یہ تھی کہ آپ بذات خود بنفس نفیس محاضرات میں شرکت فرماتے لیکن آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ممکن نہیں رہا مگر ہمارے لئے یہ بہت بڑی سعادت ہے کہ آپ کے خیالات اس طرح سے ٹیپ ہوگئے ہیں۔ چند چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں میں آپ کی رہنمائی کا طالب ہوں ایک چیز تو اشارۃً آپ کی اس گفتگو میں آگئی ہے کہ امت کے برپا کرنے کے مقاصد میں اہم ترین مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے گویا پوری اُمت کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے اور امت بحیثیت امت جب اس کام سے غافل ہوجائے تو خود ہی قرآن رہنمائی فرماتا ہے کہ: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ تو اس سے یہ

معلوم ہو رہی ہے کہ ایک گروہ تو ایسا ہونا قرآن کے نزدیک ضروری ہے لازم ہے کہ جو اسی فریضے یعنی دعوت الی الخیر کو انجام دے۔ اس دعوت الی الخیر میں جملہ ایمانیات کی دعوت، اعمال صالحہ کی دعوت، تواصی بالحق کی دعوت، تواصی بالصبر کی دعوت سب شامل ہو ہی جاتی ہیں پھر اس جماعت کا اہم کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اللہ تعالے نے اس آیت میں حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ "یہی لوگ ہیں کہ جو کامیاب ہونگے" میں نے جہاں تک سمجھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہونگے اور آخرت میں تو ان شاء اللہ کامیابی اور اللہ کی رحمت ان کے شامل حال ہوگی اور اللہ کی رحمت کے سائے میں وہ انشاء اللہ جگہ پائیں گے۔ لیکن ہمارے ہاں بعض حضرات جماعت سازی کو صحیح نہیں سمجھتے اور اس کی وجہ بھی ہے کہ کچھ تلخ تجربات ایسے ہیں کہ جو جماعتیں کسی اچھے کام کے لئے بنتی ہیں وہ آگے جا کر کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ جو امت میں تفرقے کا باعث ہوتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ امکان موجود رہتا ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ جب ہم کوئی کام اور خاص طور پر دین کا کام کرنے کے لئے اٹھیں گے تو کوئی نہ کوئی ہیئتِ اجتماعیہ ہمیں بنانی پڑے گی۔ اب سڑک پر حادثات ہوتے ہیں تو لوگ حادثات کی وجہ سے سڑک پر چلنا تو نہیں چھوڑ دیتے۔ انسان کی نیت اگر اللہ کی رضا کا حصول ہے اور وہ یہ کام خلوص کے ساتھ کر رہا ہے تو بہر حال جو لوگ اخلاص کے ساتھ کام کریں گے وہ تو انشاء اللہ، اللہ کے ہاں ماجور ہوں گے۔
اب ایک امکان اور اندیشے کی وجہ سے ایسی جماعتوں کے متعلق تشویش میں مبتلا ہو جانا کیا آپ کے نزدیک صحیح ہوگا؟

جواب: میرے نزدیک تو لوگ جماعت کے بنانے سے غالباً اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عام طور پر تجربہ یہ رہا ہے کہ جو جماعت بنتی ہے وہ آگے جا کر کے تحزّب کے اندر مبتلا ہو جاتی ہے تحزّب کے معنی یہ ہیں کہ ہم چوں ما دیگرے نیست۔ لیکن یہ ضروری ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ کا صاف مطلب یہ ہے کہ جماعت تو ہونی چاہیئے یقیناً ہونی چاہیئے لیکن اب جو جماعت

ہے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کیا اس سے تحزّب کا خطرہ ہے! کیا وہ اپنے اندر کوئی ایسی انانیت پیدا کرے گی کہ وہ یہ کہے گی کہ راہِ حق پر بس ہم ہی ہیں دوسرے اس پر نہیں ہیں تو مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب قبلہ جس طرح تنظیم اسلامی کا کام لے کر چل رہے ہیں اور جو خود انکی اپنی فطرت ہے جو خود ان کی افتادِ طبع ہے جو خود ان کا مزاج اور ان کی طبیعت ہے وہ ہم کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ انشاء اللہ تعالےٰ یہ جماعت تحزّب سے الگ تھلگ رہے گی اور اپنا کام برابر اسی طرح پر کرتی رہے گی۔ پھر میرے خیال میں جماعت تو ہونا ضروری ہے یہ یقینی بات ہے کہ بغیر ORGANIZATION کے کام نہیں ہوتا - ORGANIZATION تو ضروری ہے لازمی ہے لیکن ORGANIZATION سے جو لوگ عام طور پر کچھ مشتبہ ہوتے ہیں وہ اس وجہ سے ہوتے ہیں اور اگر اس کا ان کو اطمینان ہو جائے کہ نہیں یہ جماعت مخلصوں کی جماعت ہے۔ یہ جماعت مؤمنینِ قانتین کی جماعت ہے۔ یہ جماعت ان لوگوں کی ہے جن کے اندر کسی قسم کا کوئی تحزّب نہیں ہے اور جس کو کہ قرآن نے خود CONDEMN کیا ہے اور فرمایا ہے: كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ - یہ بات واضح ہے کہ جو شخص خود قرآن کی تعلیمات کو اس طرح پر عام کر رہا ہو۔ وہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا ہے کہ تحزّب سے بچنا بہت ضروری ہے اور اب تک جو کچھ بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے۔ اس سے ہرگز بھی یہ بُو پیدا نہیں ہوتی کہ کہیں جا کر کے ان کی تنظیم تحزّب کا شکار ہو جاتے گی۔

سوال : اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الحمدللہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے یہ توفیق عطاء فرمائی ہے۔ کہ انہوں نے جب تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا تو بہت واضح طور پر اس بات کا اعلان کر دیا کہ ہرگز ہرگز ہماری جماعت الجماعۃ کے حکم میں نہیں ہے۔ الجماعۃ تو یہ پوری امت ہے اور ہماری جماعت میں شامل ہونا اسلام میں شامل ہونا نہیں ہے بلکہ اسلام کے عائد کردہ فرائض کو اجتماعی طور پر ادا کرنے کیلئے ہم جمع ہو رہے ہیں اسی طرح اگر کسی کو مجھ پر میری جماعت اور تنظیم پر اعتماد نہ رہے تو اس کا علیحدہ ہو جانا ہرگز ہرگز اسلام سے باہر نکلنا نہیں ہے۔ تو

یہ وضاحتیں ڈاکٹر صاحب نے ایک بار نہیں کئی بار کی ہیں اور ہماری مطبوعات میں موجود ہیں اسی طرح تنظیم کے رفقاء کو ان کی ہدایت ہے کہ جو جس مسلک پر ہے اس پر وہ شرح صدر کے ساتھ عمل کرے تو ان وضاحتوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے ۔؟

جواب : یہی وہ چیزیں ہیں جو کہ اس بات کی ضمانت ہیں کہ یہ جماعت ان شاء اللہ تعالےٰ اس سے (مراد ہے تحزّب)، بالکل محفوظ رہے گی ۔

سوال : مولانا ایک اور مسئلہ ہے جس میں رہنمائی مطلوب ہے کہ عام طور پر ہمارے ہاں یا تو ادارے اور انجمنیں ہیں، جو ASSOCIATIONS کی طرز پر محدود کام کر رہے ہیں۔ کوئی تعلیمی کام کر رہا ہے اور کوئی تحقیقی کام کر رہا ہے لیکن اگر کوئی انقلابی کام پیش نظر ہو جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سرفہرست ہو تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لئے تو جماعت بنے گی تو اس کی جماعتی ہیئت کے لئے ایک طریقہ تو وہ ہے جو ہم نے مغرب سے اخذ کیا ہے یعنی اس کے کچھ ممبرز ہوں پھر وہ ووٹوں سے اپنا کوئی سربراہ یا صدر منتخب کریں ہم جب تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اس طرز کی کوئی دینی تنظیم سلف میں نظر نہیں آتی بلکہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے کسی بندے میں کوئی داعیہ پیدا کرتا ہے وہ اٹھتا ہے اور لوگوں کو بلاتا ہے کہ میں اس کام کے لئے اٹھا ہوں جیسے کہ سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہوئے انہوں نے دعوتِ جہاد دی ۔ جن لوگوں نے بیعت کی وہ ان کی جماعت میں شامل ہو گئے تو ہمیں سلف سے یہی ملتا ہے کہ اس طرز پر وہ جماعت قائم ہوئی ہے جو خالص اسلام کے لئے بن رہی ہو ۔ انتخابی اور صدارتی طرز کی تنظیم ہمیں سلف میں نظر نہیں آتی ۔ کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ ایسی تنظیم جو اعلاءِ کلمۃ اللہ یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے بنے وہ بیعت کی بنیاد پر بنے ؟

جواب : جی ہاں، جماعت کے جو معنیٰ ہیں یعنی جو جماعت ہم بنائیں گے یقیناً اس کا ایک امیرِ جماعت ہو گا اور امیرِ جماعت پر اعتماد کر کے آپ کو اپنا کام کرنا ہو گا تو ویسے اعتماد کی شکل کیا ہے ! اعتماد کی شکل یہی ہے کہ بیعت کی جائے اور

میرے خیال میں تو ہر امیر کو اس بات کا حق حاصل ہے ۔ امر کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو اس معاملے میں رہنمائی کر رہا ہے وہ سب کے لئے قابل قبول ہے تو اس بنا پر تو میرے نزدیک اس میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ یہ تو لازمی ہو جاتا ہے ۔

سوال : مولانا جزاک اللہ ۔ آپ نے یہ مسئلہ صاف کر دیا اب ایک مسئلہ یہ ہے کہ بعض ہمارے اہل علم اس بات پر اشکال پیدا کرتے ہیں کہ بیعت صرف خلافت کے لئے ہو سکتی ہے یا پھر جو بیعت رائج ہے وہ صرف بیعت ارشاد ہے ۔ وہ لی جا سکتی ہے ۔ بیعتِ سمع و طاعت لینے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے جبکہ ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ ہم نے قرآن کا اور اسلام کا اور سیرت مطہرہؐ کا اور پوری تاریخ کا جو مطالعہ کیا ہے اور معروضی مطالعہ کیا ہے تو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک بیعت تو وہ ہے کہ جب اسلامی نظام قائم ہو تو خلیفہ اپنی ذات میں کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر شریعت کے مطابق عدالتیں قائم ہیں شریعت کا نفاذ ہے اسی کے مطابق انفرادی و اجتماعی معاملات چل رہے ہیں تو اس وقت تو صحیح ہے کہ سربراہ کی بیعت ہوگی اور اس کے درمیان میں کوئی شخص بھی اپنی بیعتِ سمع و طاعت لینے کے لئے کھڑا ہوگا تو وہ خروج کی تعریف میں آ جائے گا الا یہ کہ وہ شرائط جو فقہاءؒ نے عائد کی ہیں وہ پوری ہو رہی ہوں جو بہت مشکل ہے لیکن جب خلافت کا ادارہ بالکل درہم برہم ہو جائے اور کسی ملک میں بھی اسلامی نظام اور اسلامی حکومت اور شریعت کا نفاذ معمولی شکل میں بھی نظر نہ آئے تو اس وقت اس ملک کے اندر پُرامن طریقے سے اگر اسلامی نظام کو قائم کرنے کے لئے کوئی شخص بیعتِ سمع وطاعت لیتا ہے تو آیا اس پر اُن احادیث کا اطلاق ہوتا ہے ؟ میرے ناقص مطالعے کے مطابق تو ان کا اطلاق صرف اس وقت ہوتا ہے جب خلافت کا ادارہ اور اسلامی نظام کا ادارہ بالفعل قوتِ نافذہ کے ساتھ اس ملک میں نافذ و رائج ہو اس سلسلے میں کچھ رہنمائی فرمائیں ۔

جواب : بات یہ ہے کہ بیعت کے تو معنی یہ ہیں کہ ہم نے ایک شخص کو امیر بنا لیا ہے وہ ہمارا سربراہ ہے اس معاملے میں اور اس کے لئے جو کچھ

وہ ہم سے کہے گا قرآن و سنت کی روشنی میں تو ہم اُس کی بات مانیں گے دیکھیے یہ تو ایسا ہے کہ خلیفہ سے بیعت ہو رہی ہے لیکن جناب عالی قرآن مجید نے[1] کہا کہ لَا طَاعَۃَ اِلَّا فِی مَعْرُوْفٍ ۔ کیسی ہی آپ نے بیعت کر لی ہو۔ لیکن اگر وہ کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جو کہ معروف کے خلاف ہے تو مت کرو۔ صاف طور پر بالکل کھلی بات ہے۔ اچھا ویسے مجھے معلوم ہے کہ ایک مرتبہ پنجاب میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت بنایا گیا تھا اور کسی اور نے نہیں بلکہ خود میرے استاد محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی حالانکہ ہم لوگوں کو تعجب بھی ہوا کہ شاہ صاحب عطاء اللہ شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں لیکن شاہ صاحب نے ان کو مانا۔ گویا کوئی بھی تنظیمی کام اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ہے۔ طاعت کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ہے۔ فوج بھی جو ہوتی ہے اس کا ایک کمانڈر انچیف ہوتا ہے اس کے ماتحت ہوتی ہے اور وہ واجب الاطاعت ہوتا ہے۔ تو بیعت ایک اصطلاحی لفظ ہے بیعت کے معنیٰ بالکل یہ نہیں ہیں کہ ہر بات مانی جائے گی۔ بلکہ مجھے اس کا افسوس ہوتا ہے کہ تصوف میں جا کر بیعت کے معنیٰ بالکل بگڑ گئے یعنی ایک وقت وہ تھا جب بیعت کا مفہوم یہ تھا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور آپ ہمارے مرشد ہیں ہمارے رہنما ہیں لیکن اس میں آگے بڑھ کر اتنا غلو کیا گیا کہ مرشد کے حکم کے برخلاف اگر اسلام کا کوئی حکم ہے تو لوگوں نے اس کی پرواہ نہیں کی (اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ) حالانکہ یہ چیز بالکل غلط ہے۔ وہ تو حضرت عمرؓ تک نے فرمایا کہ دیکھو تم نے اگر میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے لیکن اگر میں غلطی کروں تو فوراً تم مجھے مطلع کر دینا اور ایسے دسیوں بیسیوں واقعات ہیں وہ تو جب حضورؐ نے فرما دیا کہ خواہ کتنا ہی بڑا تمہارا کوئی امام ہو اگر معروف کے خلاف وہ تم کو کوئی حکم دے رہا ہے تو اس کی اطاعت تمہارے اوپر ضروری نہیں ہے بالکل لا طاعۃ اس کی اطاعت کرنی ہی نہیں ہے

---

[1] راقم کا خیال ہے کہ یہاں مولانا حدیث شریف فرمانا چاہتے تھے لیکن لغزش زبان کے باعث قرآن مجید کا لفظ ادا ہو گیا (ج۔ ر)

ایک طرف اسلام جو بیعت کرنے والے ہیں ان کو آزادی دیتا ہے کہ تم خود اس کو دیکھتے رہو امیر کو اور دوسری طرف یہ کہ قرآن اور سنت کے تعلیمات کے دائرے کے اندر رہ کر جو امر بالمعروف کر رہا ہے یا نہی عن المنکر کر رہا ہے اسکی اطاعت تمہارے اوپر ضروری ہوگی یہ دونوں چیزیں اگر ہوں تو اس کے اندر کوئی حرج نہیں ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی تنظیم اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی جب تک کہ ایک شخص کے اوپر آپ مکمل اعتماد نہ کریں اور اس کو امیر نہ بنائیں اور امیر بنانے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو لہذا اس سے لوگوں کا بھڑکنا صرف اسلئے ہے کہ ہماری تاریخ اسلام میں اس بیعت کو بہت غلط معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے اگر صحیح معنیٰ میں استعمال کیا جائے تو بغیر اس کے کوئی تنظیم چل ہی نہیں سکتی یہ تو ضروری ہے۔

س : مولانا ایک بات اور ہے کہ عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ دین کا کام کرنے اور درس قرآن دینے کا حق صرف اس شخص کو حاصل ہے جو کسی دارالعلوم سے باقاعدہ سند یافتہ ہو اور کسی بزرگ ہستی کا فیض یافتہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب پر عام طور پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے۔ جبکہ ایک شخص خود محنت کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کو فہم دیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس کو بھی ذہانت ملتی ہے وہ اللہ کی ودیعت کردہ ہوتی ہے انسان کی اپنی خود تو پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ اب اگر وہ اپنی ذہانت و فطانت کو اللہ کے دین کے لئے صرف کرتا ہے محنت کرتا ہے مطالعہ کرتا ہے لوگوں کی خدمت میں جاتا ہے غور و فکر اور افہام و تفہیم سے ایک رائے بناتا ہے اور اس کا جو اپنا اندرونی جذبہ ہے۔ وہ اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ میرا دین مجھ سے یہ مطالبہ کرتا ہے اور پھر وہ دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیتا ہے لوگوں کو اس طرف دعوت دیتا ہے۔ اس پر یہ اشکال اور یہ اعتراض کہ وہ کسی دارالعلوم کا سند یافتہ اور فارغ التحصیل نہیں ہے اور کسی سے اس نے فیض حاصل نہیں کیا یعنی اپنا تزکیہ نہیں کرایا اسے درس قرآن دینے اور بیعت لینے کا حق نہیں ہے تو آیا دین

کے کام کے لئے کیا یہ شرائط قرآن و سنت سے عائد ہوتی ہیں یا یہ لوگوں نے بطور احتیاط خود عائد کی ہوئی ہیں۔ آپ اس میں کیا رہنمائی فرمائیں گے۔؟

جواب: سوال یہ ہے کہ جب تک یہ مدارس قائم نہیں ہوتے تھے اس وقت تک جو حضرات درس قرآن کا کام کرتے تھے درس حدیث کا کام کرتے تھے وہ کس طرح پر کرتے تھے! ان کو کونسی اتھارٹی حاصل تھی!! بات یہ ہے کہ وہ تو ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے مقصود تو نہیں ہے اور اگر آپ یہ قید لگا دیں کہ وہ کسی مدرسے کا فارغ ہوگا۔ کسی دارالعلوم کا سند یافتہ ہوگا جہاں اس نے باقاعدہ استادوں سے تعلیم پائی ہوگی صرف اُسی کو حق حاصل ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک نہیں کئی ایک بڑے بڑے نامی گرامی جو علماء تھے جنہوں نے بڑھ کر کام کئے ہیں وہ بھی سب نکل جائیں گے اور خارج ہو جائیں گے۔ وہ تو صرف یہ ہے کہ آپ کو دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ بھی وہ لکھ رہا ہے جو کچھ بھی وہ کہہ رہا ہے اس پر آپ اعتراض کیجئے۔ لیکن یہ کہ خود وہ ذاتی طور پر کسی مدرسے سے فارغ التحصیل نہیں ہے تو یہ تو کوئی چیز نہیں ہے یہ تو کوئی معیار نہیں ہے بہت سارے خدا کے بندے ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد سے چند سبق پڑھے اور جا کر بیٹھ گئے خود ابوالکلام آزاد کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کونسے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے! مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ کونسے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے! تو ایک نہیں کتنی ہی آپ کو مثالیں ملیں گی کہ انہوں نے ابتدائی کچھ کتابیں پڑھیں اور اُس کے ذریعے پھر کچھ مطالعہ کیا اور یہ کیا اور وہ کیا اور پھر جہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہے تو ڈاکٹر صاحب نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ وہ برابر شروع سے اُس میں لگے ہی رہے۔ برابر لگے رہے پڑھتے رہے لوگوں سے فیض حاصل کیا اُن سے پوچھا غور کرتے رہے اور پھر جہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کا تعلق ہے وہ عالمانہ تحریریں ہیں اور بتلاتی ہیں کہ ان کی استعداد علمی جو ہے وہ پختہ ہے اور اُس کی روشنی میں وہ قرآن مجید کی جو تشریح کرتے ہیں اور جو تقریریں کرتے ہیں وہ میں سمجھتا ہوں کہ بعض اچھے اچھے علماء ہمارے اس طرح سے نہیں کر سکتے ہیں۔

لہذا یہ تو بہت ہی ناقص قسم کا اعتراض ہے ۔ یہ تو محض اعتراض برائے اعتراض والا معاملہ ہے ۔

سوال : مولانا جزاک اللہ ۔ آپ نے اس مسئلہ میں بڑی مفید رہنمائی عطا فرمائی ہے ۔ مولانا آپ نے شروع میں مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کی خط و کتابت کا حوالہ دیا تھا جو 'میثاق' میں شائع ہوئی ہے ۔ تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی جو وضاحت فرمائی ہے وہ بھی آپ کی نظر سے گزری ہو گی (اس موقع پر مولانا نے فرمایا ۔ جی ہاں اوہ میں نے پوری پڑھی ہے) تو الحمد للہ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب بھی اس سے مطمئن ہو گئے پھر یہ کہ مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ جو ماہنامہ بینات کراچی کے مدیر اعلیٰ ہیں انہوں نے بھی الحمد للہ اس پر اظہارِ اطمینان کیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج آپ نے جو رہنمائی فرمائی ہے ۔ اس کے متعلق میں ان شاء اللہ ڈاکٹر صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ غور فرمائیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے جو مسلک اختیار کیا تھا وہ ڈاکٹر صاحب جیسے شخص کے لئے بہت محفوظ اور مامون نظر آتا ہے ۔ اس ضمن میں کیا آپ ڈاکٹر صاحب کے لئے کوئی مزید رہنمائی عطا فرمائیں گے ؟

جواب : اگر کوئی تعلّی نہ ہو تو میں خود یہ عرض کر سکتا ہوں کہ خود میرا مسلک بھی یہی ہے ۔ چنانچہ میں نے جو مضامین لکھے ہیں ۔ ان میں کئی جگہ امام شافعیؒ کے مسلک کو ترجیح دی ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک پر ۔ تو تلفیق بین المذاہب خاص طور پر موجودہ زمانہ میں بہت ضروری ہے ۔ اس کے بغیر تو ہم چل ہی نہیں سکتے ۔ اس دور میں کسی خاص ایک امام کا دامن پکڑ کر چلتے رہیں اور اِدھر اُدھر نہ دیکھیں ۔ دوسرے آئمہ فقہاء کی اجتہادی آراء سے استفادہ نہ کریں تو یہ بالکل ناممکن ہے اگر آپ کو دنیا کے موجودہ مسائل حل کرنے ہیں تو لازمی طور پر آپ کو تلفیق بین المذاہب پر عمل کرنا ہو گا ۔

جزاک اللہ ۔ مولانا میں آپ کا انتہائی ممنون ہوں اور یہ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آپ کا جذبۂ تعاون

علی البر والتقویٰ ہے کہ اس علالت اور ضعف کے باوجود آپ نے ہمیں وقت عنایت فرمایا اور اپنے ارشاداتِ عالیہ نیز اس عاجز کے سوالات کے مفصل جوابات ریکارڈ کرائے۔ آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمارے لئے اور ڈاکٹر صاحب کے لئے دُعا فرماتے رہیئے۔ خاص طور پر ڈاکٹر صاحب آپ جیسے بزرگوں کی دُعاؤں کے بہت محتاج ہیں چونکہ جب کوئی شخص دینی خدمت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ دعوت دیتا ہے تو شیطان اس پر جو جال ڈالتا ہے وہ عجب کا تکبر کا اور انانیت کا ڈالتا ہے۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالےٰ ان مہلکات سے ڈاکٹر صاحب کو محفوظ رکھے۔

راقم کی اس درخواست پر مولانا مدظلّہ نے فرمایا:

ڈاکٹر صاحب کے لئے اور آپ لوگوں کے لئے میں کیا ہوں۔ میں توقیق رکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں کے لئے سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے فرشتے دعا کرتے ہیں۔ بہرحال میری دعائیں اور نیک تمنائیں آپ حضرات کے ساتھ ہیں۔

کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد
کا خطاب (۲۸ ستمبر ۱۹۸۴ء)

(گذشتہ سے پیوستہ)

بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ

ائمہ معصوم کے متعلق اہلِ تشیع کے مزید عقائد

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ شیعوں کے عقیدے کے مطابق حکومت کا حق صرف اور صرف ائمہ معصومین کے لیے ہے اور یہ ائمہ انبیاء علیہم السلام کی طرح قطعی معصوم ہوتے ہیں جیسے کہ "اصولِ کافی" میں آٹھویں امام محمد تقی علی بن موسیٰ رضا رح کے ایک طویل خطبہ میں ان سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ "امام ہر طرح کے گناہوں اور عیوب سے مبرّا ہوتا ہے۔" اور یہ کہ "امام معصوم ہوتا ہے۔ اللہ کی خاص تائید و توفیق اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ اللہ اس کو سیدھا رکھتا ہے۔ وہ غلطی، بھول چوک اور لغزش سے محفوظ و مامون ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معصومیت کی اس نعمت کے ساتھ اس کو مخصوص کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کے بندوں پر حجت ہو اور اس کی مخلوق پر شاہد ہو۔" معاملہ یہیں تک نہیں رہتا بلکہ اثنا عشری شیعوں کے بہت بڑے عالم و مجتہد علامہ باقر مجلسی کہتے ہیں کہ "امامت کا درجہ نبوت سے بالاتر ہے۔" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ایران کا موجودہ "انقلاب" اور جنابِ خمینی کی شخصیت

مَیں نے اب تک شیعہ مکتبِ فکر اور ان کے عقائد کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے وہ زیادہ تر شیعہ متقدمین مجتہد حضرات کے حوالے سے عرض کیا ہے۔

اب ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ جنابِ خمینی صاحب کے معتقدات و تصوّرات کیا ہیں ؟ یہ سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ ایران کی تبدیلی کو" اسلامی انقلاب " قرار دینے کے لیے چھ سات سالوں سے پوری دنیا میں زبردست پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ جنابِ خمینی کا image قائم کرنے والے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے کی کوئی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ دنیا کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ " ایران کا انقلاب " فی الواقع " اسلامی انقلاب " ہے۔ چونکہ ایران کی موجودہ تبدیلی میں بلاشبہ جناب خمینی کو اہم ترین قائد و رہنما کا مقام و مرتبہ حاصل ہے اس لیے ہمیں معروضی طور پر سمجھنا ہوگا کہ موصوف کیا معتدل مزاج کے حامل شیعہ ہیں یا غالی شیعہ ہیں ۔

جہاں تک پروپیگنڈے کا تعلق ہے تو بڑے زور شور سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام میں شیعہ سُنّی کی کوئی تفریق و تقسیم نہیں سب مسلمان ہیں۔ اور نعرے لگائے جا رہے ہیں کہ " ثورۃ اسلامیۃ لا شیعیۃ ولا سنیۃ " لہٰذا ضروری ہے کہ جنابِ خمینی کے معتقدات کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ ممدّ و معاون موصوف کی اپنی تصانیف ہی ہو سکتی ہیں جن میں موصوف کی کتاب " الحکومۃ الاسلامیۃ " کو کلید کا مقام حاصل ہے اور موجودہ ایرانی انقلاب میں اس کتاب نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس کتاب کے مختلف ابواب ہیں۔ ان میں سے ایک باب کا عنوان : " الولایۃ التکوینیہ " ہے جس میں ان کے حقیقی عقائد کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ مَیں چند باتیں نوٹ کر کے لایا ہوں۔ انہیں گوشِ ہوش سے سُنیے اور اندازہ لگائیے کہ ایران کا موجودہ انقلاب کس حد تک اسلامی ہے۔ !

ائمہ کی تکوینی حکومت اس ذیلی عنوان کے تحت جنابِ خمینی رقمطراز ہیں :

فان للامام مقاما محمودا و درجة سامية وخلافة تكوينية تخضع لولايتها جميع ذرّات الكون ص ۵۲

" امام کو وہ مقامِ محمود اور وہ بلند درجہ اور ایسی تکوینی حکومت حاصل ہوتی ہے ، کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کے حکم و اقتدار کے سامنے سرنگوں و تابع فرمان ہوتا ہے ۔"

ائمہ کا مقام و مرتبہ سب سے بلند و ارفع ہے۔ اسی باب میں تحریر فرماتے ہیں :

وان من ضروریات مذهبنا

" اور ہمارے مذہب (شیعہ اثنا عشریہ)

ان لنا مقاما لا یبلغه ملک مقرب ولا نبی مرسل ص۵۲ — کے ضروری اور بنیادی عقائد میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ ہمارے ائمہ معصومین کو وہ مقام اور مرتبہ حاصل ہے جس تک کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

ائمہ سہو و غفلت سے محفوظ و منزہ ہیں

دنیا مانتی ہے کہ سہو و نسیان اور غفلت کا امکان بشریت کے لوازم میں سے ہے۔ انبیاءؑ بھی اس سے محفوظ نہیں لہذا قرآنِ مجید میں انؑ کے سہو و نسیان کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ نبی اور رسول کو اللہ تعالیٰ اس پر مطلع فرما دیتا ہے۔ لیکن جناب خمینی علی الاطلاق ائمہ معصومین کو اس سے منزہ قرار دیتے ہیں جو خالصۃً اللہ کی صفت ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

لا نتصور فیهم السهو و الغفلة — الحکومۃ الاسلامیہ ص۹۱ — "ان کے بارے میں سہو و غفلت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

ائمہ تخلیقِ عالم سے پہلے انوار و تجلیات تھے

کتاب و سنت کی تعلیمات سے جو شخص تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے، وہ اس بات کو جانتا اور سمجھتا ہے کہ عالمِ بشریت میں بلند، اعلیٰ و ارفع مقام صرف انبیاء و مرسلین کا ہے اور انؑ سب کے سردار ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ کسی امتی کا مقام بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بھی یہ مرتبہ نہیں ہو سکتا لیکن جناب خمینی صاحب شیعی روایات کے حوالے سے اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

وبموجب ما لدینا من الروایات والاحادیث فان الرسول الاعظمؐ والائمةؑ کانوا قبل هذا العالم انوارا فجعلهم الله بعرشه محدقین وجعل لهم من المنزلة

"اور جو روایات و احادیث یعنی (شیعی روایات و احادیث) ہمارے سامنے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اعظمؐ اور ائمہؑ اس عالم کے وجود میں آنے سے پہلے انوار و تجلیات تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے عرش کے گرد حلقہ بنا کر کھڑا کر دیا اور

والمنزلۃ مالا یعلمہ الا اللہ
ص ۵۲

ان کو وہ مرتبہ اور مقام عطا فرمایا جس کو بس اللہ ہی جانتا ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

ائمہ کی تعلیمات دائمی طور پر واجب الاتباع ہیں

جناب خمینی صاحب نے اسی اپنی کتاب "الحکومۃ الاسلامیہ" میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ ائمہ کی تعلیمات قرآنی تعلیمات کے مانند ہیں اور ان کے احکام کی تنفیذ اور اتباع تمام انسانوں پر قیامت تک واجب ہے

ان تعالیم الائمۃ کتعالیم القرآن لا تخص جیلا خاصا وانما ھی تعالیم للجمیع فی کل عصر ومصر والی یوم القیامۃ یجب تنفیذھا واتباعھا۔
ص ۱۱۳

"ہمارے ائمہ معصومین کی تعلیمات قرآنی تعلیمات ہی کے مثل ہیں وہ کسی خاص طبقے کے اور خاص دور کے لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ وہ ہر زمانے اور ہر علاقے کے تمام انسانوں کے لیے ہیں اور تا قیام قیامت ان کی تنفیذ اور ان کا اتباع واجب ہے۔"

میں یہ چند مثالیں نوٹ کر کے لایا تھا — ہمارے یہاں اس مفہوم کی ایک کہاوت ہے کہ دیگ کا ایک چاول پوری دیگ کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا ان چند مثالوں سے جناب خمینی صاحب کے معتقدات، نظریات اور تصورات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید اور سنتِ رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کے مطابق دائمی طور پر مطاع مطلق صرف اللہ ہے — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے ہے اور یہ بھی دائمی ہے۔ اتباع مطلق بھی صرف اور صرف آپؐ کا ہوگا۔ دوسروں کی اطاعت اور اتباع اللہ کی اطاعت اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کے تحت ہوگی نہ کہ آزاد — قرآن مجید نے اس بات کو متعدد مقامات پر متعدد اسالیب سے واضح طور پر بیان کیا ہے۔ سب کا احاطہ تو ممکن نہیں چند وضاحتیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں — پہلے اطاعت و اتباع رسول کے متعلق چند باتیں سن لیجیے —

نبی اکرمؐ کی اطاعت اور آپؐ کا اتباع

سب سے پہلے تو صرف اطاعت و اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جان لیجئے کہ اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مقام و مرتبہ ہے اسے ہر ا شخص بخوبی جانتا ہے جس کا دین کی تعلیمات سے تھوڑا سا بھی تعلق ہو۔ پھر بھی چند آیات اور ایک حدیث سنا کر آگے چلوں گا۔ سورہ نساء میں فرمایا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔ (سورہ نساء)— اور وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۚ (سورۃ الحشر)— اور قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (سورہ آل عمران) — پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ" —— میرے محدود مطالعہ کے مطابق اہلِ تشیع کی مذہبی کتابوں میں رسول کی اطاعت اور اتباع کا ذکر اگر کہیں آیا ہے تو سرسری طور پر آیا ہے۔ زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرکے ان روایات کا حوالہ ملتا ہے جن میں امامتِ معصومہ کا کسی طور ذکر و حوالہ ہو— اہلِ سنت کے قابلِ اعتماد محدثینِ عظام اور فقہائے کرام رحمہم اللہ نے جرح و تعدیل کے بعد ان کو موضوع قرار دیا ہے— ایسی روایات کو حضرت باقر اور حضرت جعفر رحمہما اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے اس کو بھی ہمارے اہلِ علم نے باطل ٹھہرایا ہے۔

اطاعت کے مزید نصوص قرآنیہ

پھر قرآن مجید میں اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ کا حکم اتنی بار آیا ہے کہ مجھے اس کے دہرانے کی حاجت نہیں۔ پھر اطاعتِ رسول کے متعلق قاعدہ کلیہ بیان فرمایا گیا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ اسی قاعدہ کلیہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ فرما کر خاص کیا گیا: وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہاں "الرسول" ہے اور اس سے قطعی طور پر حضورؐ کی ذاتِ گرامی مراد ہے۔ سورہ نساء کی آیت نمبر ... پر تدبر کیا جائے تو اسلام میں اطاعت کا مکمل ضابطہ موجود ہے۔ فرمایا: يَآ اَيُّهَا الَّ

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ —" اے اہلِ ایمان اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور اپنے میں سے صاحبِ امر کی ہے" یہاں "مِنْكُمْ" خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ تمام مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ اور رسول کے ساتھ اطاعت کا لفظ استعمال فرما کر یہ بات بطور نص واضح فرمائی گئی ہے کہ ان کی تو اطاعت مطلق فرض ہے البتہ جو تم میں سے اولوالامر ہوں ان کی اطاعت مطلق نہیں ہوگی بلکہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے دائرے کے اندر ہوگی ان کا حکم واجب الاطاعت ہوگا۔ ساتھ ہی یہاں "مِنْكُمْ" فرما کر اولوالامر کے دائرے کو اتنی وسعت عطا فرما دی کہ پوری امت اس کے احاطہ میں آگئی۔ پھر "أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" کے قرآن کے اصول کے تحت اس کو اتنا وسیع فرما دیا کہ مسلمانوں کا کوئی شخص بھی مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ خلافت و حکومت کا سربراہ، امیر، امام اور خلیفہ بن سکتا ہے۔ کسی نسل میں اس کی قید "تاقیامِ قیامت" اس لفظ "مِنْكُمْ" نے ختم کر دی ہے۔ یہ ہے اسلام کا عمومی خلافت کا تصور۔ اور یہ تصور اسلام کے بنیادی "معتقدات" میں شامل ہے جبکہ اہلِ تشیع اسے صرف حضرت علی رضؓ کی فاطمی رضؓ نسل میں بطور عقیدہ مختص اور منحصر سمجھتے ہیں اور اس کو بھی صرف بارہ اماموں میں دائر سمجھتے ہیں پھر ان کے عقیدے کے مطابق یہ بارہ کے بارہ امام مامور من اللہ ہیں[1]— بارھویں امام ان کے نزدیک غائب لیکن تا حال زندہ ہیں اور انہی کا دورِ امامت جاری و ساری ہے[2]۔

---

[1] کتنا مضحکہ خیز عقیدہ ہے کہ "مامور من اللہ" ہونے کے باوجود ان میں سے حضرت علی رضؓ فقط ساڑھے چار سال خلیفہ رہے۔ وہ بھی تین خلفاء راشدین کے بعد۔ اور آنجنابؓ کی خلافت وقت کی تمام مملکتِ اسلامیہ پر ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں رہی۔ مزید یہ کہ آپؓ نے بے چون و چرا اور بلا اعتراض پوری دلی آمادگی کے ساتھ اپنے تینوں پیش رو خلفاء راشدین کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت کر لی۔ پھر حضرت حسن رضؓ نے رضاکارانہ طور پر خلافت سے دستبرداری اختیار فرما کر امت پر احسانِ عظیم فرمایا جس کے نتیجہ میں پوری اسلامی مملکت ایک وحدت بن گئی۔ (مرتب)

[2] نبی اکرمؐ نے ایک موقع پر صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ... (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سُنی اور شیعہ معتقدات کا فرق و تفاوت

چنانچہ سنی اسلام اور شیعی اسلام میں عقائد کا فرق اتنا واضح اور اتنا متضاد اور متصادم ہے کہ ان میں باہم سے کوئی مصالحت محال مطلق اور قطعی ناممکن ہے۔ کوئی دور از کار تاویل بھی ان دونوں میں کوئی مطابقت پیدا نہیں کر سکتی ایک طرف خلافتِ عامہ کا تصور و عقیدہ ہے۔ دوسری طرف امامتِ معصومہ کا تصور و عقیدہ ہے اور وہ بھی ایک مخصوص نسل میں۔ پھر یہ امامتِ معصومہ بھی بارہ ائمہ تک محدود ہے۔ جن میں سے بارہویں امام غائب ہیں لیکن قریباً تیرہ سو سال سے زندہ کسی غار میں پوشیدہ ہیں۔ اور ان کے ظہور تک انہی کا عہدِ امامت جاری و ساری ہے حکومت کا حق صرف ان کے لیے مخصوص ہے۔ اثنا عشری شیعوں کے عقائد کے مطابق ان کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قبل تینوں خلفاء راشدین رض معاذ اللہ غاصب تھے اور آنحضرت ؐ کے بعد تاحال دنیا میں جتنی بھی حکومتیں قائم رہی ہیں یا اب ہیں وہ سب غاصبانہ حکومتیں ہیں۔ اس عقیدے کے جو منفی نتائج تاریخ اسلام میں نکلے ہیں۔ ان پر آگے کچھ عرض کروں گا۔

ان عقائد کا اسلامی انقلاب سے ربط و تعلق

ظاہر بات ہے کہ کسی نمایاں تبدیلی یا مکمل اسلامی انقلاب میں بنیادی اہمیت انہی تصورات اور معتقدات کی ہے کہ سیاسی ہیئتِ حاکمہ کس اصول پر قائم ہوگی۔ یہی تو اس میں فیصلہ کن عامل ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے سنی اور شیعہ مکاتبِ فکر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان میں جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے بعد المشرقین ہے۔ ان میں CO-EXISTANCE اور مطابقت ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لیے میں اس فرق کو بنیادی و اساسی فرق کہتا ہوں اور اسی لیے میں نے ابتداء ہی میں ان کو دو اسلام سے تعبیر

(حاشیہ پچھلے صفحہ سے پیوستہ) تم میں سے جو آج زمین پر زندہ ہیں وہ سو سال سے زیادہ زندگی نہیں پائیں گے۔ اس کے بعد بارہ سو سال تک مسلسل زندہ رہنا کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔! اسی لیے اکثر اہلِ سنت ان روایات کو بھی موضوع قرار دیتے ہیں جو حضرت خضر کی مسلسل حیات کے متعلق پائی جاتی ہیں (مرتب)

ہے۔ سُنّی اسلام خالصتاً کتاب وسنت پر مبنی ہے۔ جبکہ شیعہ اسلام محض توہمات
تخیلات پر مبنی ہے۔ جس کی کوئی معمولی سی بنیاد نہ قرآن مجید میں ہے اور نہ احادیث
ثابتہ میں — لہٰذا اسلام کے نام سے اگر کوئی انقلاب آئے گا یا ظہور پذیر ہوگا
وہ یا سُنّی انقلاب ہوگا یا شیعہ انقلاب۔ اس کو مقید ومشروط (CLASSIFIED)
بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ محض ظاہری رواداری کے تحت یہ کہا جائے کہ سُنّی وشیعہ
اسلام ایک ہے تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ انقلاب یا مؤثر تبدیلی کے اعتبار سے اسلام ایک
ہیں دو ہوں گے۔ یا خلافت کے اصول پر انقلاب آئے گا اور اس کے مطابق نظام قائم
گا اور یہ سُنّی اسلامی انقلاب ہوگا۔ یا وہ امامتِ معصومہ کی بنیاد پر آئے گا تو وہ شیعہ
مذہبی انقلاب ہوگا۔

موجودہ ایرانی انقلاب، اصل شیعیت کے مطابق بھی نہیں ہے

ایک اہم ترین بات اور پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ ایران کا موجودہ انقلاب جو معیاری اور ٹکسالی (CLASSICAL) شیعی معتقدات اور شیعہ ذہن ہے اس کے مطابق بھی نہیں ہے۔
اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جو اثنا عشری شیعہ ہیں جن کے بارہویں امام غائب ہیں یا
داؤدی بوہری شیعہ جن کے بھی آخری امام غائب ہیں دونوں کو جمع کر لیجئے — رہے
اس فرقہ کے لوگ جن کا امام حاضر اور موجود ہے، ان کی تو ہم بات ہی نہیں کرتے۔ اس
لیے کہ ان کے عقائد کے مطابق ان کا امام حاضر ہے، وہی ان کا حاکم ہے، وہی ان
کا مطاع بھی ہے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے وہی ان کا معبود ہے۔ اس کی تصویر
سامنے رکھ کر اسماعیلی سجدہ کرتے ہیں[1] لہٰذا ان کا معاملہ تو علیحدہ کر دیجئے۔ وہ ہماری
موجودہ گفتگو سے خارج ہیں۔ باقی جن لوگوں کے نزدیک ان کے امام غائب ہیں تو ان

---

[1] حال ہی میں حیدرآباد سندھ سے میثاق کے ایک قاری نے اسماعیلی فرقہ کی ایک درسی کتاب گجراتی اور اردو کی فوٹو سٹیٹ نقول ارسال کی ہیں۔ اس فرقہ کے عقائد کو سمجھنے کے لیے ان اسباق سے چند باتیں پیش ہیں (۱) ہمارا حقیقی کلمہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدً رسول اللہ واشھد ان امیر المؤمنین علی اللہ ہے۔ اس (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ی ایک خاص نفسیات سبائی فتنہ انگیز فکر کے تحت اسی وقت سے بنتی اور پختہ
(DEVELOP) ہوتی چلی آرہی ہے جو آپ کو پوری اسلامی تاریخ میں نظر آئے
گی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قبل خلفائے راشدینِ ثلاثہ کا جو بھی حکومت کا
نظام قائم ہوا اور آنجناب رضؓ کے بعد جو بھی دَور چلا۔ خواہ بنو امیہؒ کا ہو، وہ بنو عباس کا
ہو، وہ ترکانِ سلجوق ہوں، وہ ترکان عثمان ہوں۔ وہ مصر کی فاطمی خلافت ہو —
ہندوستان میں خاندانِ غلاماں سے لے کر مغل دورِ حکومت ہو۔ کہیں بھی اور کوئی
بھی حکومت ہو۔ امام غائب کے عقیدہ کو تسلیم کرنے والے تمام اہلِ تشیع کے نزدیک
وہ غاصبانہ حکومتیں تھیں اور موجودہ دور میں بھی جو مسلمانوں کی حکومتیں ہیں، وہ
بھی غاصبانہ ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک حکومت کا حق صرف ائمہ معصوم کو ہے۔ آخری امام
روپوش ہیں لہٰذا حضرت علی رضؓ کی خلافت کو مستثنیٰ کر کے ماقبل اور مابعد کی تاحال ہر
نوع کی حکومتیں غاصبانہ تھیں اور ہیں چاہے وہ سُنیوں کی ہوں چاہے وہ شیعوں
کی ہوں۔ اس لیے کہ امام معصوم کے سوا حکومت کرنے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے

(حاشیہ: گذشتہ صفحہ سے پیوستہ) کتاب میں آخری حصّہ کا ترجمہ یہ لکھا گیا ہے کہ "علی اللہ ہیں یا (علی اللہ میں سے ہیں)" (ii) 'یا علی مدد' ہمارا سلام ہے۔ (iii) ہمارا امام حاضر بولتا ہوا قرآن ہے اس لیے اس کے فرمانوں پر عمل کرنے والے فلاح پاتے ہیں (iv) امام کا ہاتھ خدا کے ہاتھ کے برابر ہے امام کا چہرہ خدا کے چہرے کے برابر ہے۔ عقیدت سے امام کا دیدار کرنے والا خدا کا دیدار کر رہا ہے (v) امام حاضر عقلِ کل ہے۔ اسی وجہ سے جو ہو چکا۔ جو ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے یہ سب امام حاضر پر روشن ہوتا ہے (vi) رات کو سوتے وقت اور صبح اٹھتے وقت "مولا علی" سے مدد مانگنی چاہیئے۔ امام حاضر کو ہم "مولیٰ علی" کہتے ہیں (vii) نبی محمد گرو برہما کے اوتار ہیں۔ ست گرو برہما اور محمد ایک ہی ہیں۔ ان کو پیدا کرنے والا داتا وشنو ہے (ix) امام حاضر جو ہیں وہ مرتضیٰ علی کے اوتار ہیں" — کلیجہ پر پتھر رکھ کر ان خرافات کو نقل کیا گیا ہے۔ تاکہ سُنی مسلمانوں کو اس فرقے کی ضلالت بلکہ کفر کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ یہ درسی کتاب "اسماعیلیہ ایسوسی ایشن بمبئی (انڈیا) کی جانب سے شائع کی گئی ہے اور غالباً تمام اسماعیلی اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ (مرتب)

اور آخری امام غائب ہیں۔

اس نفسیات کے منطقی نتائج

لہٰذا پوری اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ میں ہمارے شیعہ بھائیوں کا اکثر و بیشتر لیفٹسٹ[1] اور ففتھ کالمسٹ کا کردار نظر آئے گا۔ اس لیے کہ ان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ کسی کی حکومت کو دل سے قبول نہ کریں۔ چونکہ حکومت کا حق صرف امام کا ہے تم کون ہو! مجھے بے ساختہ اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا یہ شعر یاد آگیا۔ ؎

رضائے حق پر راضی رہ یہ حرفِ آرزو کیسا! خدا مالک، خدا خالق، خدا کا حکم تو کیسا!

اہلِ تشیع کے نزدیک ائمہ مامور من اللہ ہیں اور امام کا حق ہے کہ وہ حکومت کرے۔ تم بیچ میں کیسے آگئے۔ حکومت کرنے والے تم کون ہو! — لہٰذا وہ ہر حکومت کو غاصبانہ حکومت سمجھتے ہیں خواہ وہ کسی کی ہو۔ ایسی حکومت کے ساتھ ان کا دلی تعاون ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہوگا تو تقیہ کے تحت ہوگا۔ حالات کی مجبوری کے تحت ہوگا۔ ظاہر میں یہ حضرات تعاون کا طرزِ عمل اختیار کرلیں لیکن دلی ہمدردی اور دلی تعاون کا معاملہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے لیے اہلِ تشیع اپنے ایمان اور عقیدے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

اس نفسیات کے مہلک اثرات

لہٰذا ان کا جو طرزِ عمل رہا ہے اس کو چند الفاظ میں جمع کرکے سمجھ لیجئے۔— ایک بے اطمینانی، ایک جذبۂ عدم وفاداری اور ایک حالتِ منتظرہ — وہ انتظار میں ہیں کہ امام حاضر ہوں تو گاڑی آگے بڑھے۔ جب تک امام غائب ظاہر و حاضر نہیں ہوتے تو پورا معاملہ ایک معطل (STAND STILL) اور غیر متحرک حالت میں ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی جو نظامِ حکومت چلتا رہا ہے یا اب چل رہا ہے۔ وہ غلط ہے اس لیے کہ حکومت کا اصل حق دار تو امام معصوم ہے۔ یہ بہت اہم اور بنیادی بات میں نے آپ کو بتائی ہے۔ یہ بڑا نفسیاتی الجھاؤ ہے۔ جس سے اہلِ تشیع دورِ اوّل سے دوچار چلے آرہے

---

[1] غالباً یہی وجہ ہے کہ برِ صغیر پاک و ہند میں مسلمان کہلانے والے جو نامی کمیونسٹ اور سوشلسٹ گزرے ہیں یا اس نظریہ کے فی الوقت قائلین موجود ہیں ان میں اکثریت شیعہ مکتبِ فکر کے حضرات کی ہے۔ (مرتب)

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری پوری تاریخ میں اس نقطۂ نظر کے حامل اور اس الجھن میں گرفتار لوگوں کا طرزِ عمل قطعی طور پر منفی (NEGATIVE) رہا ہے جب تک امام غائب ظاہر ہو کر حکومت نہ سنبھال لیں ان کے نزدیک ہر قسم کی حکومت غلط ہے اور فاسد ہے۔ غاصبانہ ہے۔ لہٰذا نفسیاتی طور پر تمام اہلِ تشیع بے اطمینانی، عدمِ وفاداری اور حالتِ منتظرہ کی کیفیات میں صدیوں سے دوچار چلے آرہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کے ایک منفی طرزِ عمل کے ہماری پوری تاریخ میں بے شمار شواہد موجود ہیں۔ یہ محض اتفاقات نہیں ہیں کہ بنو اُمیہ کی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں ابو مسلم خراسانی پیش پیش رہا ہے۔ بنو عباس کے دور میں کئی بار اس گروہ کی طرف سے سازشیں اور بغاوتیں ہوئی ہیں اور بالآخر جب تاتاریوں نے حملہ کیا ہے اور بغداد کو تہس نہس کیا ہے تو عباسی حکومت میں وزارتِ عظمیٰ پر علقمی کے نام سے اس گروہ کی شخصیت موجود تھی جس نے تاتاریوں کے ساتھ ساز باز کی تھی اور ان کو بغداد پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ اور ان کی پوری پوری مدد کی تھی۔ آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو ہلاکو خاں قتل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس علقمی نے اس سے کہا تھا کہ حضور آپ اس کے ناپاک خون سے اپنی تلوار کیوں خون آلود کریں! پھر اسی کی تجویز پر مستعصم باللہ کو گائے کی کھال میں سی کر اس کے جسم کو گھوڑوں سے روندا گیا تھا۔ اسی بہیمانہ سلوک کے متعلق شیخ سعدی نے کہا تھا ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں　　بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیںؑ

پھر ہم نے برِ صغیر پاک و ہند کے اندر جو چرکے کھائے ہیں انہیں یاد کیجئے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن　　ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

یہ دونوں کس مذہبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر انگریزوں کے لئے جاسوسی کرنے، ان کو دہلی کے اندرونی حالات کی خبریں دینے، ان کی مدد کرنے میں سب سے اہم کردار بہادر شاہ ظفر کی اہلیہ زینت محل اور اس کے خانزادے نے ادا کیا تھا۔ سب بھی اسی مکتبِ فکر سے متعلق تھے۔

اس کا سبب

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ نسل پرست (Racialism) عنصر کسی بھی نظام کو چاہے وہ نظامِ شریعت کا نظام ہو ذہناً قلباً صحیح سمجھ ہی نہیں سکتا۔ چونکہ اُس کے عقیدے کے مطابق یہ حق صرف اور صرف ائمہ معصومین کا ہے اور آخری امام غائب ہیں لہٰذا ان کے ظہور تک ہر نوع

حکومتیں غاصبانہ حکومتیں ہیں۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ اصل میں کلاسکل شیعیت کے اعتبار سے تو ایران کا موجودہ نظام بھی غلط ہے۔ اصل تشیع کے اعتبار سے جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو "حقیقی اسلامی حکومت" ان کی امامت میں قائم ہو گی۔ اس سے پہلے اسلامی حکومت قائم ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

جناب خمینی صاحب کا کارنامہ

لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ خمینی صاحب کا یہ کارنامہ ہے۔ اس کو ماننا پڑے گا اور اس کا کریڈٹ ان کو دینا پڑے گا کہ انہوں نے نہایت ذہانت سے شیعہ مکتبِ فکر کے اس تعطل کو ختم کر دیا۔ اور انہوں نے نائب امام کا نیا تصور پیش کیا۔ امام تو فی الوقت موجود نہیں ہیں غائب ہیں، لیکن ان کے ظہور تک کوئی شخصیت نائب امام کی حیثیت سے کاروبارِ حکومت چلا سکتی ہے۔ چونکہ ظاہر بات ہے کہ نائب امام کو حقوق وہی حاصل ہو جائیں گے جو امام کو حاصل ہیں۔ نیابت کے تو معنی ہی یہ ہیں ـــ اور انہوں نے دوسرا تصور یہ دیا کہ جب تک امامِ منتظر ظاہر نہیں ہو جاتے اُس وقت تک ولایتِ فقیہ کا فلسفہ و نظریہ (CONCEPT) ہے کہ علماء مجتہدین کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ یہ دراصل THEOCRACY کا نظام ہے یعنی علماء کے طبقہ کی حکومت۔ اور وہ مذہبی طبقہ نائبِ امام کی سرکردگی میں کاروبارِ حکومت چلائے گا اور نائبِ امام کی بالکلیہ اطاعت ہو گی۔ چاہے اُسے امام معصوم نہ مانا جائے لیکن اس کا ایک عکس اس کے اندر ہو گا اور FINAL AUTHORITY اور آخری فیصلہ کا حق اس کے ہاتھ میں ہو گا۔ باقی نائبین فقہاء و مجتہدین اس کے مشیر اور کارندے ہوں گے جو شیعی قانون کے ماہرین میں سے ہیں۔

ایران کا موجودہ نظام

لہٰذا ایران کا اس وقت کا نظام نہ سُنّی اسلام کے مطابق ہے اور نہ اصل شیعی اسلام کے مطابق ہے بلکہ اسے آپ جناب خمینی صاحب کا بڑا دُور رس و مؤثر اجتہاد کہہ سکتے ہیں۔ ایک نیا نظریہ ہے، جو انہوں نے اپنی کتابوں "ولایت الفقیہ" اور "الحکومت الاسلامیہ" میں پیش کیا ہے۔ ان کے نظریئے کے اعتبار سے یہ بڑی معرکۃ الآرا اور بنیادی کتابیں ہیں۔ ایران کی موجودہ تبدیلی میں ان کتابوں نے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ آخر الذکر کتاب کے کچھ حوالے میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ان کے نزدیک ان کے ائمہ کا مقام و مرتبہ کیا ہے! لیکن بہرحال اس

وقت ان کا موقف یہ ہے کہ امام آخرالزمان کے ظہور تک نائبِ امام کو علماء و فقہاء سے اشتراک و تعاون سے حکومت کرنے کا حق ہے نہ کہ کسی بادشاہ یا کسی جمہوری ادارہ کو۔ لہٰذا اصل میں یہ ایک مخصوص مذہبی طرز کا نظام (THEOCRATIC SYSTEM) ہے، جو اس وقت ایران میں چل رہا ہے۔

جناب خمینی کا اجتہاد اور نظریہ خود ان کے الفاظ میں

جناب خمینی صاحب کا نظریہ و اجتہاد خود ان کے الفاظ سے سُنیے جس کے تحت وہ اس وقت ایران میں نائب امام کی حیثیت سے مختارِ کُل ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں؛

واذا نهض بامر تشكيل الحكومة فقيه عالم عادل فانه يلي من امور المجتمع ما كان يليه النبیؐ منهم، ووجب على الناس ان يسمعوا له ويطيعوا ويملك هذا الحاكم من امر الادارة والرعاية والسياسة للناس ما كان يملكه الرسولؐ وامير المؤمنينؑ۔

"اور جب کوئی فقیہ (مجتہد) جو صاحبِ علم ہو عادل ہو حکومت کی تنظیم و تشکیل کے لیے اُٹھ کھڑا ہو تو اس کو معاشرے کے معاملات میں وہ سارے اختیارات حاصل ہوں گے جو نبیؐ کو حاصل تھے اور سب لوگوں پر اس کی سمع و طاعت واجب ہوگی اور یہ صاحبِ حکومت فقیہ مجتہد حکومتی نظام اور عوامی و سماجی مسائل کی نگہداشت اور امت کی سیاست کے معاملات میں اسی طرح مالک و مختار ہوگا جس طرح نبیؐ اور امیر المومنینؑ مالک و مختار تھے"۔

الحکومۃ الاسلامیہ ص۴۹

ولایت فقیہ کے نظریہ کی مزید توجیہہ

جناب خمینی صاحب کو شیعہ علماء و فقہاء اور مجتہدین کو اپنے اعوان و انصار کی حیثیت سے ساتھ لے کر چلنا تھا۔ لہٰذا انہوں نے جو موقف اختیار کیا وہ ان کے الفاظ میں سُنیے:۔

ان الفقهاء هم اوصياء الرسولؐ من بعد الائمة وفى حال غيابهم وقد كلفوا بالقيام بجميع

"فقہاء (یعنی مجتہدین) ائمہ معصومین کے بعد اور ان کی غیبت کے زمانے میں رسولؐ خدا کے وصی ہیں اور وہ مکلف ہیں ان سب امور و معاملات کا

ما کلف الائمۃ علیہم السلام بالقیام بہ (الحکومۃ الاسلامیہ ص۵۸)

انجام دہی کے جن کی انجام دہی کے مکلف ائمہ علیہم السلام تھے۔"

ہمارا موقف

جناب خمینی صاحب کے اجتہادات کے صحیح و غلط اور حسن و قبیح پر ہمیں قطعاً بحث نہیں ہے۔ ہمارا موقف اس معاملہ میں یہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے ایرانی بھائی اپنے ملک کو جس طرح چاہیں چلائیں انہیں اختیار ہے۔ اگر عوام اس کو قبول کرتے ہیں تو چلئے اس کو ایک عوامی سند بھی حاصل ہو گئی ہے۔ باقی رہا وہ تشدد اور قتل و غارت کے معاملات تو اس کے متعلق ہمیں حقیقی صورت حال کا علم نہیں ہے۔ اس لیے اس کی بابت نہ اثباتاً کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے نہ نفیاً۔ یہ تو کوئی عدالت ہو جس کے سامنے فریقین پیش ہوں اور شواہد سامنے آئیں تو کوئی فیصلہ ہو۔ اس لیے میں اس بارے میں صرف نظر کرتا ہوں[1]۔ بہر حال ہمارے ایرانی بھائیوں کو حق ہے کہ وہ اپنے لیے جو نظام پسند کریں اُسے اختیار کر سکتے ہیں خواہ وہ تھیاکریسی کا ہو۔ وہ خمینی صاحب کو نائب امام ہی نہیں امام مطلق مان لیں۔ وہ ولایت الفقیہ کے تصور کو اپنا مذہبی تصور تسلیم کر لیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن بہر حال اس پوری صورت حال میں لفظ اسلام کے اشتراک کی وجہ سے مغالطہ پیدا کرنا اس کا حق کسی کو نہیں ہے۔ اگر یہ مغالطہ پیدا کیا جائے گا تو ہمارا فرض ہوگا کہ اس مغالطہ کو رفع کریں اور جو اصل حقیقت ہے اُسے کھول کر سامنے رکھ دیں[2]۔

---

[1] اخبارات کی اطلاعات سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ خمینی صاحب کی کامیابی کے بعد مخالفین کو ہزاروں کی تعداد میں موت سے ہم کنار کیا گیا بلکہ مخالفین کے علاوہ اپنی صفوں کے ایسے عناصر کو بھی قتل کیا گیا یا وہ وہاں سے جان بچا کر نکل گئے جن سے کامل Theocracy کے نظام سے اختلاف کا اندیشہ تھا۔ اس صورتِ حال کو "اسلامی انقلاب" سے منسوب کرنا سراسر ناانصافی ہی نہیں بلکہ اسلام کی بدنامی کا باعث ہے۔ اس لحاظ سے بھی ایران کے حالات کو "اسلامی انقلاب" کہنا قطعی غلط ہے (مرتب)

[2] تعجب تو ان سُنی سیاستدانوں اور دانشوروں کے طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو شیعہ سُنی کے بنیادی اور اساسی عقائد سے ناواقف نہیں ہو سکتے پھر بھی ایران کے واقعات و حالات اور تبدیلی کو "خالص اسلامی انقلاب" قرار دیتے ہیں اور اُسے آئیڈیل ٹھہرا کر پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے مسلمانوں کو جناب خمینی کی قیادت و امامت قبول کر کے اپنے اپنے ملکوں میں ایرانی طرز کا انقلاب برپا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ (مرتب)

میرا تجزیہ

ایران میں تقریباً آٹھ سال قبل حالات نے جو رُخ اختیار کیا تھا، اور اس کے نتیجہ میں وہاں جو بڑی نمایاں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں ان کے متعلق میرا تجزیہ یہ ہے کہ اوّلاً ایران کی یہ تبدیلی انقلاب کے معیارات (CRITERIA) پر پورا نہیں اُترتی۔ یہ حقیقت کے اعتبار سے انقلاب (REVOLUTION) نہیں ہے بلکہ (COUP D'ETAT) ہے۔ اور یہ COUP فوج کے بجائے ایک مذہبی طبقے کے ذریعے ظہور پذیر ہوا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے صحیح اصطلاح COUP BY CLERGY ہے۔ ثانیاً یہ کہ جو سیاسی فکر اس کی بنیاد ہے اس کا سُنّی اسلام سے تو سرے سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں وہ تو بُعد المشرقین کا معاملہ ہے لیکن جو اصل شیعیت ہے اس سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ایرانی شیعہ بھائیوں میں سے ایک ایسی بڑی شخصیت جنابِ خمینی کی اُبھری ہے کہ اُس نے تعطّل توڑ کر نائبِ امام اور ولایت الفقیہ کا ایک ایسا فلسفہ اور نظریہ پیش کر دیا ہے کہ جس کی وجہ سے ان کی گاڑی آگے چل سکتی ہے۔ بہر حال یہ ہے ایرانی انقلاب کے متعلق میری رائے — اسے [illegible] معنوں میں انقلاب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے اور اسے "اسلامی" اور آگے بڑھ کر "خالص اسلامی انقلاب" قرار دینا سخت نادانی ہی نہیں بہت بڑی ناانصافی ہے اور ظلم ہے۔ ایسا پروپیگنڈہ کرنے والوں کے متعلق میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ حقیقی اسلامی انقلاب کے اصول و مبادی، خدوخال اور مراحل سے نابلدِ محض ہوں گے بس اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ ایسے مریض اور مرعوب ذہنیت کی کامل عکاسی قرار دینے میں کسی کو کوئی تامّل نہیں ہو سکتا۔

حقیقی اسلامی انقلاب؟

اب مجھے قرآن و سنت اور سیرتِ مطہرہ کے معروضی حوالہ سے حقیقی اسلامی انقلاب کے اصول، مبادی، منہج عمل اور مختلف مراحل کو تفصیل سے بیان کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اختصار اس کے لیے ہرگز کفایت نہیں کرے گا لہٰذا اللہ کو منظور ہوا تو آئندہ جمعہ سے سلسلہ وار اس موضوع پر گفتگو ہوگی جو اندازاً آٹھ جمعوں میں جا کر مکمل ہوگی؎ فی الحال مجھے انقلاب

؎ الحمد للہ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے قریباً آٹھ خطابات ریکارڈ ہو چکے ہیں۔ ان کو منتقل [illegible]

کے حوالے سے پاکستان کے حالات کے متعلق چند گزارشات پیش کرنی ہیں۔

پاکستان کے متعلق کچھ باتیں

پاکستان کے بارے میں پہلی حقیقت جسے سمجھ لینا چاہیئے۔ وہ یہ ہے کہ اگر اس پاکستان کو باقی رہنا ہے تو اسلامی انقلاب اس کے لیے مقدر ہے، ناگزیر ہے وہ آئے گا تو یہ بچے گا اگر نہیں آئے گا تو یہ نہیں بچے گا۔ یہ نہیں ہوا کرتا کہ کوئی خطۂ ارضی ختم اور نابود ہو جائے۔ مشرقی پاکستان موجود نہیں ہے لیکن اس کی جگہ بنگلہ دیش کے نام سے ایک ملک موجود ہے۔ مغربی پاکستان — جسے اب ہم کُل پاکستان، سمجھتے اور کہتے ہیں — نہ رہے بلکہ اس کی جگہ چند ریاستیں مختلف ناموں سے وجود میں آ جائیں جسے BULKINISATION کہا جا سکتا ہے۔ زمین تو رہتی ہے اس کی نوعیت بدل جاتی ہے یا اس کی حدود میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ تو پاکستان کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اسلام یہاں غالب نہیں آتا تو یہ ملک نہیں رہے گا۔ اگر رہے گا تو کسی کا طفیلی بن کر رہے گا۔

بھارت کی حکمتِ عملی

وہ طفیلی بھارت کا ہو جیسے اندرا گاندھی[1] کی ساری کوشش یہی ہے۔ وہ پاکستان کو ہرگز ختم کرنا نہیں چاہتی۔ یہ بات اس کی مصلحت کے خلاف ہے کہ پاکستان بالکل ختم ہو جائے۔ روس کے ساتھ اس کا معاملہ یہ ہے کہ "نہ طاقتِ وصل دارم نہ طاقتِ جدائی" وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرے گی کہ اس کی سرحدیں روس سے مل جائیں اور افغانستان میں روسی عمل دخل بلکہ اس کے قابو اور قبضہ میں چلے جانے اور پاکستان کے درمیان میں سے ختم ہو جانے اور بھارت میں ضم ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ بھارت کی سرحدیں روس کے مقبوضات سے ملحق ہو جائیں۔ یہ اندرا گاندھی کو کسی طور گوارا نہیں ہو گا اس لیے کہ روس کے سفید ریچھ کا EMBRACE۔ اس کا قرب کسی کو بھی گوارا نہیں ہو گا چونکہ یہ بڑا ہلاکت خیز (FATAL EMBRACE) ہو گا جو بھی اس کے قریب آئے گا اُس کا اس کے پنجے سے بچنا ممکن نہ ہو گا۔ وہ ختم ہو جائے گا۔ پھر بھارت میں جو اونچ نیچ اور ثروت و غربت کا فرق و تفاوت ہے۔ وہ روس کے فلسفہ

---

[1] خیال رہے کہ یہ تقریر ۲۸ ستمبر ۸۴ء یعنی اندرا گاندھی کی ہلاکت سے قبل کی ہے۔ ویسے بھارت کی موجودہ حکومت کی بھی اندرا گاندھی ہی کی حکمتِ عملی پر کاربند نظر آتی ہے۔ (مرتب)

کے اعتبار سے بڑی آسان چراگاہ ہے۔ اِس لیے وہ اس کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتی کہ دو میان
میں سے پاکستان ختم ہو جائے۔ صرف اس کی خواہش یہ ہے کہ پاکستان ہمارا طفیلی،
ہمارا دبیل اور ہماری مرضی کے مطابق داخلی، خارجی، دفاعی حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہونے والا
ملک رہے۔ اس پر "نوائے وقت" کے بہت صحیح اداریے آچکے ہیں۔ معاصرِ عزیز نے
حالات کا درست تجزیہ کیا ہے۔

بقاء اور استحکام کا واحد راستہ، اسلام کا قیام

اچھا آپ یا بھارت کے دبیلی بن کر بچ جائیں یا
امریکہ کے طفیلی ہو کر بچ جائیں[1]۔ اس سے فرق کو
نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ طفیلی ہو کر تو آپ بچ سکتے
ہیں۔ لیکن ایک آزاد، حقیقتاً آزاد، باوقار اور باعزت ملک کی حیثیت سے باقی رہنے کا صرف
ایک راستہ ہے کہ یہاں صحیح صحیح طور پر اسلامی نظام اپنی تمام تفاصیل اور جزئیات کے سا
قائم و نافذ ہو۔ اگر نہیں ہوگا تو پاکستان نہیں رہے گا[2]۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد
بچائے کہ ٹکڑے ہو کر ملک تقسیم ہو جائے اور صورتِ حال علامہ اقبال کے اس شعر کے مصدا
ہو جائے ؎

اُڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

پاکستان کا نام صرف تاریخ کے اندر رہ جائے کہ اس نام سے چالیس پینتالیس سال ایک

---

[1] امریکہ پر بھروسہ بھی گویا تنکوں کے سہارے کے مانند ہے چونکہ امریکہ کی دوستیاں اپنے مفادات
مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ پھر اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ امریکہ کی ڈیموکریٹ پا
بہرصورت پاکستان کے مقابلہ میں بھارت کی دوستی اور خوشنودی کو اولیت دیتی ہے۔ امریکہ
بھی اس پارٹی کی حکومت بنے گی تو پانسہ بالکل بدل سکتا ہے۔ (مرتب)

[2] حسنِ اتفاق سے ۲۹ مارچ ۸۵ء کے خطاب جمعہ میں مولانا سید مظفر حسین ندوی مدظلہ کی
قرآنی میں کی گئی ایک تقریر کے حوالے سے حالات کے رُخ کو بدلنے کا ایک قرآنی آسان نسخہ بیا
وہ یہ ہے: یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُ
اَقْدَامَكُمْ (مرتب)

واسطے اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

ہمارے لیے لمحۂ فکریہ

میں آپ سے کئی بار عرض کر چکا ہوں اب پھر عرض کر دیتا ہوں کہ حالات جس رُخ پر جا رہے ہیں تو نظر یہ آ رہا ہے کہ ہماری شامتِ اعمال ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ لیکن میرے دل میں اُمید کی ایک کرن رہتی ہے۔ وہ کبھی کبھی ٹمٹمانے لگتی ہے۔ کبھی کبھی دیا بجھنے کو آ جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ پھر سے اُسے روشن فرما دیتا ہے۔ یہ میرا وہ مشاہدہ ہے جسے میں نے کئی بار بیان کیا ہے کہ میرے نزدیک پاکستان کا قیام اللہ تعالیٰ کی جو تکوینی تدابیر ہیں۔ درحقیقت انہی تدابیر کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے۔ یہ قائم ہوا ہے تو مشیتِ الٰہی (DIVINE WILL) سے ہوا ہے۔ یہ ہماری کوششوں سے نہیں ہوا۔ یہ جیسا کچھ بھی اب تک قائم اور باقی رہا ہے تو اللہ کے فیصلے اور اس کی نصرت سے رہا ہے، ہمارے ہاتھوں سے نہیں رہا۔ صدر ایوب صاحب نے اپنے دورِ حکومت میں بھارت کو مشترکہ دفاع (JOINT DEFENCE) کی تجویز پیش کر دی تھی۔ گویا آزاد پاکستان پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دیا تھا۔ وہ تو پنڈت نہرو کی اللہ تعالیٰ نے مت ماری اور اس نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا ورنہ پاکستان کا ایک آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت سے اس پیش کش کی منظوری کی صورت میں اسی روز خاتمہ ہو جاتا ـــــ چونکہ JOINT DEFENCE کے منطقی تقاضے یہ ہیں کہ بجٹ بھی مشترکہ ہو۔ اس لیے کہ بجٹ کا بڑا حصّہ ملک کے دفاع سے متعلق ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ خارجہ پالیسی بھی ایک ہو۔ چونکہ دفاعی حکمتِ عملی سے اس کا چولی دامن والا تعلق ہے۔ گویا پاکستان کو بھارت کی ایک طفیلی ریاست بنانے کی ہماری طرف سے اُس وقت ہی پیش کش کر دی گئی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور خود پنڈت نہرو نے اس کو مسترد کر دیا ـــ پھر جن لوگوں کو تحریکِ پاکستان کی کشاکش کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ قائدِ اعظم نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا جس کی رُو سے ایک مرکز کے تحت ملک کے تین زون (ZONES) دس سال کے لیے تشکیل دینے کی تجویز تھی گویا دس سال کے لیے آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبہ سے قائدِ اعظم خود دستبردار ہو گئے تھے۔ تو اس موقع پر بھی پنڈت نہرو ہی کی مت ماری جاتی تھی۔ پاکستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے وجود میں نہ آیا ہوتا۔ پنڈت جی نے ایک صحافی کے جواب میں کہہ دیا تھا کہ دس سال کے بعد مرکز کب کسی زون کو خود مختار و آزاد ہونے دے گا۔ پھر ۶۵ء کی جنگ

میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس طرح سرخرو فرمایا، وہ بھی اس بات کے شواہد میں سے ہے۔ پھر سنہء کی جنگ کے نتیجہ میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ہمارا حوصلہ اتنا پست ہو گیا تھا کہ بظاہر احوال مغربی پاکستان کا بچنا محال نظر آتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس طرح مدد فرمائی کہ امریکہ کے صدر رچرڈ نکسن نے روس کے ذریعہ بھارت پر دباؤ ڈالا کہ وہ فوراً مغربی پاکستان میں جنگ بند کر دے ورنہ امریکہ مداخلت کرے گا۔ اس طرح وہ خطرہ ٹل گیا، جو ہماری شامتِ اعمال کی وجہ سے درپیش تھا۔۔۔ یہ چند اشارات ہیں جن کی بنا پر میرے دل میں یہ کرن پھوٹتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو تکوینی تدبیر ہے کہ عالمی سطح پر اسلام کا جو غلبہ ہو کر رہنا ہے تو شاید اس کا تعلق پاکستان کے خطۂ ارضی کے ساتھ ہو۔ شاید ہم وہ خوش نصیب قوم ہوں کہ اس کا آغاز ہمارے ہاتھوں ہونا ہو۔ ان ہی شواہد کے پیشِ نظر میں اس اُمید کو پالتا ہوں اور جب بگڑتے ہوئے حالات کے مشاہدے سے یہ اُمید مرنے لگتی ہے تو اُسے پھر زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُمید و بیم کی یہ دونوں کیفیات رہتی ہیں۔ اپنے کرتوتوں کو دیکھیے۔ دینی، اخلاقی، ملی اعتبار سے معاشرے کے بگاڑ کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں آزاد قوم و ملک کی حیثیت سے رہنے کا قطعاً حق ختم کر چکے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی رحمت پر نگاہ ہوتی ہے تو اس سے اُمید ہوتی ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ ہمیں مزید مہلت دے اور ہم متنبہ ہو کر اصلاح کے لیے کمر کس لیں۔ اللہ کی طرف رجوع کریں اور وہ ہمیں اپنے سایۂ رحمت میں لے لے۔ لہٰذا ایک بات تو یہ جان لیجئے کہ پاکستان کا مستقبل وابستہ ہے حقیقی اسلام کے ساتھ۔۔۔ اس معاملہ میں کوتاہی جاری رہے گی اور محض خالی خولی نعروں، بیانوں اور کچھ ظاہری ٹیپ ٹاپ تک معاملہ رہے گا تو قرآن کا یہ اٹل قانون سامنے رکھیے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

اسلام کے قیام و نفاذ کا صحیح منہج

دوسری بات جس کو بھی میں نے کئی بار اپنے پورے اذعان و ایقان کے ساتھ بیان کیا ہے۔۔۔ اُسے اجمالاً عرض کر دیتا ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ اِس وقت تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے۔۔۔ وہ یہ کہ پاکستان میں اسلام نہ انتخابی عمل کے ذریعے سے آسکتا ہے نہ جنرل محمد ضیاء الحق کے عمل کے ذریعے سے آسکتا ہے۔ یہ د

عمل بالکل ناکام (Failures) ثابت ہوئے ہیں۔ تیس سال کا تجربہ ثابت کر چکا ہے کہ انتخابات کے ذریعہ سے یہاں اسلام کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس کے ذریعہ یہاں منفی (Negative) کام ہوا ہے۔ مثبت (Positive) کام نہیں ہوا ہے۔ فرقہ واریت کو ہوا ملی ہے اور اس میں تلخی بڑھی ہے اس لیے کہ اسلام کے نام پر ووٹ مانگنے والی جب پانچ جماعتیں سامنے آئیں گی تو لامحالہ ہر ایک کو اپنا اسلام علیحدہ کرنا پڑے گا، یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس طرح فرقہ واریت کی فضا مزید مسموم ہوئی ہے اور وحدتِ امت مزید شکستہ ہوئی ہے۔ اسلام کی طرف مثبت پیش قدمی ایک انچ بھی نہیں ہوئی — اور ان سات سال کی تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کو بدنام تو ہم کر رہے ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے اسلام کا دھیلے کا کام نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں طریقے خارج از بحث ہیں۔ میں اپنی یہ رائے قریباً دو سال پہلے ایک خط کے ذریعہ سے صدر صاحب کی خدمت میں بھی پیش کر چکا ہوں۔

صرف انقلابی عمل ہی سے یہاں اسلام آ سکتا ہے

کامل یقین اور وثوق سے میں یہ بات کہتا رہا ہوں کہ یہاں اسلام اگر آئے گا تو صرف انقلابی عمل کے ذریعہ سے آئے گا۔ کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ تو پہلی بات یہ جان لیجئے کہ پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ یہاں اسلام اگر آئے گا تو انقلابی طرز کی جدوجہد کے نتیجہ میں آئے گا وہ کبھی اس طرح کی کوششوں سے نہیں آئے گا جس طرح کی کوششوں پر ہم اب تک عمل پیرا رہے ہیں۔

انقلابی نہج کیا ہے؟

یہ دو باتیں تو متعدد بار بیان ہوئی ہیں۔ آج میں ایک تیسری بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اسلامی انقلاب اگر یہاں آئے گا تو خالص محمدیؐ انقلاب آئے گا۔ علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔ خالص سنی انقلاب آئے گا اور یہ انقلاب صد فی صد اس نقشِ قدم پر ہو گا جو ہمارے پاس سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی شکل میں موجود ہے۔ کوئی اور طریقہ، کوئی اور راستہ، کوئی اور Via Media، کوئی پگڈنڈی، کوئی Short cut کوئی درمیانی راستہ، کوئی نیم دلانہ (Half Hearted) کوششیں یہاں اسلام نہیں لا سکتیں۔ یہاں انقلاب آئے گا تو علیٰ منہاج النبوۃ آئے گا۔ اس کے سوا کوئی اور دوسرا

طریقہ یہاں ممکن نہیں ہے۔ مجھے یہاں امام مالک ابن انس رحمہ اللہ امام دارالہجرۃ۔ امام مدینہ منوّرہ کا ایک قول یاد آگیا۔ حدیث کا مستند ترین پہلا مجموعہ مؤطا امام مالکؒ انہی کا مرتب کردہ ہے۔ ان کے اس قول کو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۱۹۱۲ء میں جب "الہلال" جاری کیا تھا۔ آج سے بہتر سال پہلے کی بات ہے تو اس میں وہ قول نقل کیا تھا۔ اس میں ہے ہمارے لیے صدفی صد اور درست رہنمائی۔ وہ قول یہ ہے : لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا۔ "اس اُمت کے آخری حصّہ کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر صرف اُسی طریقہ پر جس طریقہ پر پہلے حصّہ کی اصلاح ہوئی"۔ وہ پہلا حصّہ کون سا ہے اسے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشاد مبارک سے سمجھیے :-

خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ

وہ انقلاب جو برپا کیا تھا خاتم النبیین سیّد المرسلین حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اور جس نہج سے برپا کیا تھا۔ جس انداز سے برپا کیا تھا۔ اس میں جو Methodology استعمال فرمائی تھی۔ اس میں جو مدارج و مراحل درپیش آئے تھے۔ اس کے جو لوازم پورے فرمائے تھے۔ اس میں جو تدریج ملحوظ رکھی تھی۔ ان تمام امور کو خالص معروضی طور پر (objectively) سمجھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی تو جان لیجئے کہ صحیح اسلامی نظام کا دنیا میں آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ تو ایک ہی راستہ ہے : بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا۔

آخری دور کا آغاز ہو چکا ہے

اس پر پہلے بھی گفتگو میں ہو چکی ہیں کہ وہ آخری دور شروع ہو چکا ہے۔ حالات بتا رہے ہیں۔ نبی اکرمؐ کی پیشین گوئیاں پوری ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ "اسرائیل" کا قیام اس کی بہت بڑی مثال ہے۔ پھر اس کا سب سے بڑا ہوائی اڈا Ludda قائم ہے جس کا ذکر حدیث میں "لد" کے نام سے آیا ہے۔ جہاں دجّالِ اکبر حضرت مسیح علیہ السّلام کے ہاتھوں آنجناب کے نزول کے بعد قتل ہوگا۔ قربِ قیامت کی جو علامات احادیث میں بیان ہوئی ہیں ان کے لیے گویا اسٹیج تیار ہو رہا ہے۔ جیسے کسی ڈرامہ کسی خاص سین کے لیے پہلے سے اسٹیج سیٹ ہوتا ہے۔ تو اس طریقہ سے حالات پورے ہو رہے ہیں جن کی خبر دی تھی الصادق والمصدوق صلّی اللہ علیہ وسلّم نے۔

بیس سال ہوں۔ تیس ہوں پچاس ہوں ان سے بھی زیادہ ہوں اللہ تعالیٰ کی تقویم میں سو پچاس سال کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لیکن بہر حال رُخ وہ نظر آ رہا ہے جس کی خبریں حضورؐ نے دی تھیں۔ اسی طرح بہت سے اشارات اور شواہد سے یہ اُمید ہوتی ہے کہ شاید اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا اسی نہج پر اصلاحِ اُمت کا عمل بھی آگے بڑھے جس نہج پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انقلاب برپا کیا تھا۔ کیا عجب کہ وہ خوش نصیب خطّہ یہ خطّۂ ارضی ہو۔ علّامہ اقبال نے جو کہا تھا ؎

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے   میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہم یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے بہر حال ایک ارشادِ نبویؐ میں مشرق کا ذکر تو آیا ہے۔ میں اِسے کسی فلسفے سے نہیں جوڑ رہا۔ ایک اُمید کا اظہار ہے کہ شاید پاکستان کو یہ سعادت نصیب ہو جائے کہ اُس نہج پر اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ دین کی تجدید کے کام کا مؤثر طریق کا آغاز یہاں سے ہو جائے کہ جس نہج پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس برس کی جاں گسل جدّوجہد کے نتیجہ میں جزیرہ نما عرب میں بنفسِ نفیس تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اور جس کے استحکام اور توسیع کا کام علیٰ منہاج النبوّۃ خلفائے راشدین مہدیین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سرانجام دیا تھا۔ ان شاء اللہ اب اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور تجدید دین کا کام عالمی سطح پر ہوگا۔ البتہ یہ کام شروع کسی ایک ملک سے ہوگا۔ اللہ کرے کہ وہ ملک پاکستان ہو۔ بہر حال وہ جب ہوگا تو ان شاء اللہ وہ خالص انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کے انداز، اسلوب اور نہج پر ہوگا۔

ان تمہیدی باتوں کے بعد اب ہمیں سمجھنا ہوگا کہ خالص محمدیؐ طریقِ انقلاب کیا ہے! اس پر ان شاء اللہ تعالیٰ اگلے جمعہ سے گفتگو کا آغاز ہوگا۔

اقول قولی ھذا و استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

●●●●●●●

THE ORIGINAL



مراد آباد (بھارت) سے ایک مکتوب!

حضرت محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دام مجدھم   السلام علیکم

مزاج گرامی! مارچ کے اجتماع کا دعوت نامہ ملا جزاکم اللہ۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب سعودی عرب سے واپسی پر شروع اپریل میں پاکستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خدا کرے دعوت قرآن کے پروگرام میں کراچی اور لاہور بھی کوئی پروگرام ہو جائے۔ بندہ نے توان سے عرض کیا ہے۔ (مولانا علی میاں مدظلہ نے اپنے ایک حالیہ مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں جب بھی پاکستان تشریف لائیں گے تو انشاءاللہ قرآن اکیڈمی کو اپنے خطابات کے لیے ضرور وقت دیں گے ——— ادارہ)

سید قطب شہید کی تالیف، قرآنی خصوصیات، سعید گوالوی کے بدست ارسال کی تھی جو دفتر مرکزی انجمن خدام القرآن میں دے آئے تھے، خدا کرے آپ کے ملاحظہ میں آگئی ہو۔

امارت کی انتخابی کارروائی کی تفصیل جمعیۃ العلماء ہند کی جن رپورٹوں میں آئی ہے اس کی ایک جلد مولانا سید حامد میاں کے ذریعہ آپ کو مل ہوگی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے سلسلہ میں میثاق میں جو تحریر آپ کی شائع ہوئی ہے ماشاءاللہ خوب ہے جزاکم اللہ اس سلسلہ میں ایک بات مزید معلومات کے لیے عرض کرتا ہوں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز سے قبل جس میں اسارت مالٹا سے دوچار ہوئے اپنے خواص سے بیعت جہاد لی تھی۔ اس میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے بھی بیعت کی تھی۔ اور اپنے شیخ مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

ماشاءاللہ مولانا عزیر گل صاحب سے ملاقات کر لی۔ یہ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے خواص میں سے ہیں۔ حضرتؒ کی جانکنی کے وقت شاید مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ بھی موجود تھے۔ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا بھی حضرت شیخ الہندؒ کے پاس دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری صاحبؒ کی کوٹھی پر موجود ہونا تو یقین سے معلوم ہوتا ہے۔

ایک بات یہ بھی عرض کروں کہ حضرت نانوتویؒ کے والد صاحبؒ کو آخری عمر میں اسہال کا مرض ہو گیا تھا دیوبند مسجد انار والی حجرہ قاسمی میں قیام تھا۔ چوکی اور کونڈا وہاں رہتا تھا۔ اس کی صفائی استاد شاگرد کرتے تھے۔ ایک روز کونڈا رکھنے سے رہ گیا تھا تو دست زمین پر پھیل گیا۔ شاگرد فکرمند ہوئے کہ اب کیسے اٹھائیں؟ حضرت نانوتویؒ اس وقت باہر سے تشریف لاتے اور حجرہ کے باہر ہی اس فکر و مشورہ میں شریک ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی باہر سے ساتھ آتے تھے جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو حضرت نانوتویؒ حجرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ جگہ بالکل صاف ہے۔ یہ صفائی حضرت شیخ الہندؒ نے کر لی تھی بس وہیں حضرتؒ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ "اے اللہ! اس لڑکے کے بارے میں قیامت کے روز میری لاج رکھ لیجیے

گا" حضرت شیخ الہندؒ کو حضرت نانوتویؒ کی جانشینی کا شرف اسی وقت مل گیا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ مسجد نبوی میں درس دیتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے وقت حضرت مدنیؒ کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو پیش کیا کہ میں اس تحریک میں حضرت کے ساتھ شریک ہوں۔ جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو حضرت مدنیؒ کے خاندان کی مدینہ پاک میں کئی اموات ہو چکی تھیں۔ والد، بھائی، والدہ، اہلیہ، بچیاں لیکن حضرت مدنیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ہی ہندوستان تشریف لے آئے اور آخر تک ساتھ رہے۔ وفات سے ایک روز قبل حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ میں نے مولانا آزاد سے وعدہ کر لیا تھا۔ ان کے مدرسہ دارالارشاد کے لیے ایک مدرس کا لیکن کوئی آمادہ نہیں ہے تم ہی چلے جاؤ چنانچہ حضرت مدنیؒ روانہ ہو گئے۔ راستہ ہی میں تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات ہو گئی بس یہی واقعہ جانشینی کا ذریعہ بنا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بھی برابر کے شریک تھے۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد والا خطبہ مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے ہی لکھا اور پڑھا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ پورا مغرب ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کو اپنے مفادات کے لیے کتنا عزیز رکھتا ہے اور پورا مغرب انگریزی داں طبقہ کو اپنا سب سے زیادہ حامی خیال کرتا ہے۔

ماشاء اللہ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے وہ مدرسہ رحیمیہ سنبھال لیا ہے جس نے ملت ہندیہ کی بقا و سلامتی کا حضرت مجدد صاحبؒ والے پروگرام کو چلانے والے شاہ ولی اللہ صاحب پیدا کیے تھے۔ خدائے پاک ان سب کا آپ کو وارث و جانشین بنائے۔ آپ کی صحت کا فکر رہتا ہے۔ دعا کرتا رہتا ہوں۔ اب آپ کام کرنے والے بنائیں خود کرنے کے بجائے دوسروں سے کام لیں اور ان کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دیں والسلام

خادم افتخار فریدی (مراد آباد ——— بھارت!)

بقیہ: عرضِ احوال

سلسلہ کسی انقطاع کے بغیر جاری ہے۔ اسی طرح مختلف دوسرے شہروں کے دعوتی دوروں کا تسلسل بھی ہر ہفتہ تین چار دن کے لئے قائم ہے۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ، قرآن حکیم کے جس مسلسل درس کا سلسلہ قریبًا آٹھ ماہ سے معطل تھا۔ جو سورہ احقاف تک مکمل ہوا تھا۔ اس کا بھی بفضلہ تعالیٰ ۱۵ اپریل سے مسجد شہدا میں اجرا ہو گیا ہے۔ سورہ محمد زیر درس ہے۔ ان شاءاللہ یہ درس ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب اسی مسجد میں جاری رہے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ۰

احقر: [illegible] عفی عنہ

۵ر۱۰ر۸۵

حُسنِ انتخاب

علماء کب اُٹھیں گے؟

جب اسلامی معاشرہ کافرانہ لبادے میں دفن ہو جائیگا

محترم ایس ایم جمیل صاحب ریٹائرڈ اڈیٹر جنرل حکومت پاکستان صدر مؤسس انجمن اشاعت قرآن عظیم پاکستان (کراچی) ۴ر اپریل کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ملاقات کے لیے اکیڈمی تشریف لاتے تھے۔ موصوف تو دعوتی دورے پر اسلام آباد اور پشاور تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا سید صاحب ازراہ کرم و تلطف اس عاجز کے کمرے میں قدم رنجیدہ ہوتے نصف گھنٹے تک مختلف موضوعات پر موصوف نے راقم کی راہنمائی فرمائی۔ نیز ایک چہار ورقہ عنایت فرماگئے جس کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوا کہ اس شمارے میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں اس کے مضمون کی ان سے بڑی مناسبت ہے لہٰذا قارئین میثاق کی خدمت میں پیش ہے

جمیل الرحمٰن !

(۱) حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق امت کے علمآ بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ علمآ انبیاء کے وارث ہیں۔ دونوں ارشادات کے بموجب علمآ اسلامی معاشرے کے خصوصی رہبر اور سردار ہیں۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کی امت کو اللہ تعالٰے نے "خیر امت" سے تعبیر فرمایا ہے اور پوری امت کو خطاب فرماتے ہوئے اللہ تعالٰے نے امت پر ذمہ داری ڈالی ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی۔

دوسرے مقامات پر اللہ تعالٰے کے ارشاد کے بموجب دعوت الی اللہ اور دیگر ادیان پر اسلام کو برتر ظاہر کرنے کی بھی حضورؐ پر اور حضورؐ کی امت پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اُمت کے ہر فرد پر لازم ہے کہ علم دین سیکھے اور دین کی حفاظت اور برتری میں اپنی جان اور مال کو وقف کردے اور اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ پر بکا ہوا سمجھے یہ ذمہ داری امت کے ہر فرد پر ہے۔ البتہ جو لوگ علم والے ہیں ان پر یہ ذمہ داری بدرجۂ اولٰی عائد ہوتی ہے اور جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

(۳) علمائے حق نے ہر پریشان کن اور نازک وقت پر ذاتی آرام و راحت کو چھوڑ کر دین اور معاشرۂ اسلامی کی حفاظت کے لیے سربکف ہو کر پیش قدمی کی ہے انھوں نے سلطنت مغلیہ کے اضمحلال اور

انہدام اور سلطنت برطانیہ کے موقع پر لیے یار و مددگار رہتے ہوئے اور بغیر اسباب ظاہرہ کے اسلام کی مدافعت میں ایسی مضطربانہ اور والہانہ کوششیں کیں کہ برصغیر کے مسلمان، عیسائی مشنریوں کے اثر سے محفوظ رہے اور ہزاروں میں سے ایک مسلمان بھی انگریزوں کے صد سالہ دور حکومت میں عیسائی نہیں ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مکمل شکست و ریخت کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمانوں میں دین اور اسلامی معاشرے کے سلسلہ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اور پورے برصغیر میں عزم و حوصلہ اور خود اعتمادی کی لہر دوڑ گئی تا آنکہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا۔

افسوس کہ گزشتہ تیس چالیس سالہ دور میں بہت غلطیاں اور لاپرواہیاں ہوئیں اور اسلام کے نام پر بنائے ہوئے اس ملک میں غیر اسلامی خیالات اور رجحانات کے مراکز اور انجمنیں بن گئیں اور اس ملک میں نفاذ اسلام ایک حقیقت کے بجائے چیلنج اور سوال بن گیا۔ ہر مسلمان اور عام مسلمان سے زیادہ ہر عالم دین پر لازم ہے کہ سب اختلافات و کشاکشوں اور ذاتی مفادات و مصلحتوں کو چھوڑ کر اس بنیادی، تباہ کن خطرے کو دور کرنے کی مہم پر آمادہ ہو جائیں۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(۵) اسلام نہایت کم مادی وسائل کے عالم میں ابھرا اور زاہدانہ زندگی، تقوٰی، جہاد اور بلند اخلاق کی بنیادوں پر بجلی کی طرح پھیلا اور ہر جگہ ایسا محبوب بنا کہ وہاں کے غیر مسلم لوگ مسلمان ہو کر اسلام کے جانباز سپاہی بنے۔ اب ہم کو دوبارہ احکام قرآنیہ اور سنت نبویہ پر کاربند ہوتے ہوئے "حب الدنیا وکراھیۃ الموت" کی بجائے تقوٰی، توکل اور تبتل کی طرف آنا چاہیے اور زاہدانہ جفاکشی اور ذکر کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔

(۶) آج کل علماء کی توجہات مدرسہ کی حدود میں اور مساجد کے امام بنانے میں صرف ہو رہی ہیں عوام اور ان کے منتخب خواص سے رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

(۷) اب اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ایک سنہری موقع دیا ہے کہ عوام بالعموم اور علماء بالخصوص اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس کرتے ہوئے بیدار ہو جائیں۔ استغفار اور ذکر کے ساتھ اپنی اور معاشرے کی اصلاح میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ دین کے لیے کام کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد اور کامیابی یقینی ہے۔

(۸) اسلام پھیلا ہے اور اسلام محکم ہوا ہے مسلمانوں کے خصوصاً علماء کے تقوٰی، توکل، اور مجاہدانہ زندگی سے راتوں کے ذکر اور دعاؤں سے بقولہ تعالیٰ:

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ۔ (سورۃ الزمر - ۹)

یہ بات قابل غور ہے کہ ابتدائی طور پر جب مسلمان بالعموم مجاہدانہ زندگی گزارتے تھے علماء اور غیر علماء میں طبقاتی حیثیت سے تفریق نہیں تھی۔ البتہ بعض لوگ علم اور تقوٰی میں دوسروں سے زیادہ ممتاز ہوا کرتے تھے اور عوام ان کی صحبتوں اور مذاکرات سے مستفید ہوتے تھے۔ آخرت کی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا جذبہ علماء کی سرکردگی میں عوام، خواص، علماء اور حکام سب کو حاصل ہو۔ یہی استحکام اور ترقیات کی بنیادیں تھیں۔ اس زمانہ میں مروجہ مدارس نہ تھے مگر کتاب و سنت کا علم و عمل پہنچانے والے ہر جگہ موجود اور سرگرم عمل تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام پورے معاشرے میں جاری تھا اور اس کا دھاکہ اور مسلمانوں سے بے لاگ انصاف اور حق کے لیے جانبازی کا دھاکہ اطراف عالم پر تھا اور یہ خصوصیات زندگی ہر معرکہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سے نصرت اور کامیابی لانے والی تھیں۔ ہر شخص تکمیل احکام اور تقوٰی میں پیش قدمی اور سبقت لے جانے کا خواہاں تھا۔ بقولہٖ تعالیٰ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا ؕ

تقوٰی کی دوڑ اور مسلسل کوشش اسلامی معاشرے کی فضا میں لازم و ملزوم تھی اور تقوٰی کا نصاب قرآن شریف اور احادیث میں واضح طور پر مکرراً اور تاکیداً ارشاد فرما دیا گیا تھا تاکہ اس سے کوئی شخص لاپرواہ نہ رہے اور جاننے والے اور نہ جاننے والوں کا ایسا ارتباط تھا کہ تقوٰی اور اتباعِ سنت نبویؐ کے سلسلہ میں پورے معاشرے میں ہم آہنگی، یک رنگی کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ ضرورت ہے کہ یہ باہمی رابطہ دوبارہ پورے طور پر قائم اور مستحکم ہو اور جاننے والے، نہ جاننے والوں میں علم و عمل کی پیاس پیدا کریں۔ جیسا کہ سابقہ ادوار میں ہوتا آیا ہے۔

(۹) آج کل بعض جگہ ذکر آ رہا ہے کہ مدارس دینیہ کے نصاب میں انگریزی زبان، جغرافیہ، ریاضی اور سائنسی علوم کو شامل کیا جانا ضروری ہے۔ مناسب طور پر نصاب میں ان چیزوں کا اضافہ کر دینے میں حرج نہیں ہے مگر بنیادی ضرورت اس کی ہے کہ ان مدارس میں کتاب اللہ، سنت نبویؐ اور صحابہؓ کی عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لایا جائے۔ تقوٰی، توکل اور تبتل اور مسلسل مجاہدانہ زندگی، دنیا اور آخرت دونوں کے لیے کامیابی اور عزت کی بنیادیں ہیں۔ فلسفہ اور منطق اور انگریزی زبان وغیرہ بالکل بعد کی چیزیں ہیں۔ اور انگریزی زبان کے ساتھ انگریزی طرز معاشرت اور نظریاتی زندگی کی اہمیت طالبعلموں کے ذہنوں میں آ گئی تو یقینی طور پر اسلامی علم و عمل کے لیے سم قاتل ہے۔

(۱۰) سیاسی غلامی سے زیادہ ذہنی اور قلبی غلامی تباہ کن ہے جس میں پاکستانی قوم خصوصاً نوجوان نسل گرفتار ہے اور دن بہ دن غیروں کی ذہنی غلامی، دنیا کی محبت، اتباعِ ھوٰی (خواہشاتِ نفس کی غلامی)، آرام و راحت اور عیش پرستی کی جانب نہایت تیزی سے پیش قدمی کر رہی ہے اور اس دلدل میں دن بدن پہلے سے زیادہ پھنستی چلی جا رہی ہے مسلمان قوم اور مسلم معاشرے کی اصلاح کی اور اس کا رخ بدلنے کی ہنگامی کوششوں کی ضرورت ہے اور اس کی زیادہ تر ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔ اس ذمہ داری سے کما حقہٗ سبکدوشی

کے لیے متذکرہ بالا اسلامی بنیادوں کو از سر نو زندہ کرنا پڑے گا ان پر کاربند ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر اصلاح معاشرہ کا اور مسلمانوں کو تباہی سے بچانے کا مقصد حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اگر اس وقت اس جانب ہنگامی بنیادوں پر توجہ نہ دی گئی تو اسلامی معاشرے کو کفر اور لادینیت کی دلدل میں دفن ہونے سے بچانے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور پاکستانی قوم اور پاکستانی معاشرہ بھی بہت سے دوسرے اسلامی علاقوں کے معاشروں کی طرح ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔

ائمہ مساجد کی ذمہ داریاں

(۱) نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو اللہ تعالےٰ نے "خیر امت" کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ (آل عمران) دنیا کی بہترین امت اس واسطے کہ کار نبوت اس امت سے لیا جائیگا۔

(۲) اس امت کا ہر فرد اس امر پر مامور ہے کہ "امر بالمعروف" "نہی عن المنکر" اور "دعوت الی اللہ" کا کام کرے اور اس کام کے لیے امکان بھر تیاری کرے اور اپنے آپ کو اللہ کے ہاں بکا ہوا سمجھے۔

(۳) یہ فریضہ خاص طور پر ان افراد پر عائد ہوتا ہے جو علم دین کی دولت سے بہرہ ور ہیں اور اگر مساجد کے امام بھی ہوں تو اس علاقے کے لیے راہ دکھلانے کی ذمہ داری ان پر مزید طور پر آتی ہے۔

(۴) اسی نظام کے تحت جب اسلام پھیلا تو ہر جگہ کے لیے امام بھیجے گئے۔ انھوں نے ہر جگہ اپنی ذمہ داری ایسی ادا کی کہ ہر جگہ دین کے علم وعمل کا نور چمکا۔ دور دور علاقوں میں بھی ہر جگہ مساجد، دینی علوم اور تقوی کا مرکز بن گئیں اور عوام میں علم وعمل کی تلاش اور پیاس پیدا ہوئی۔

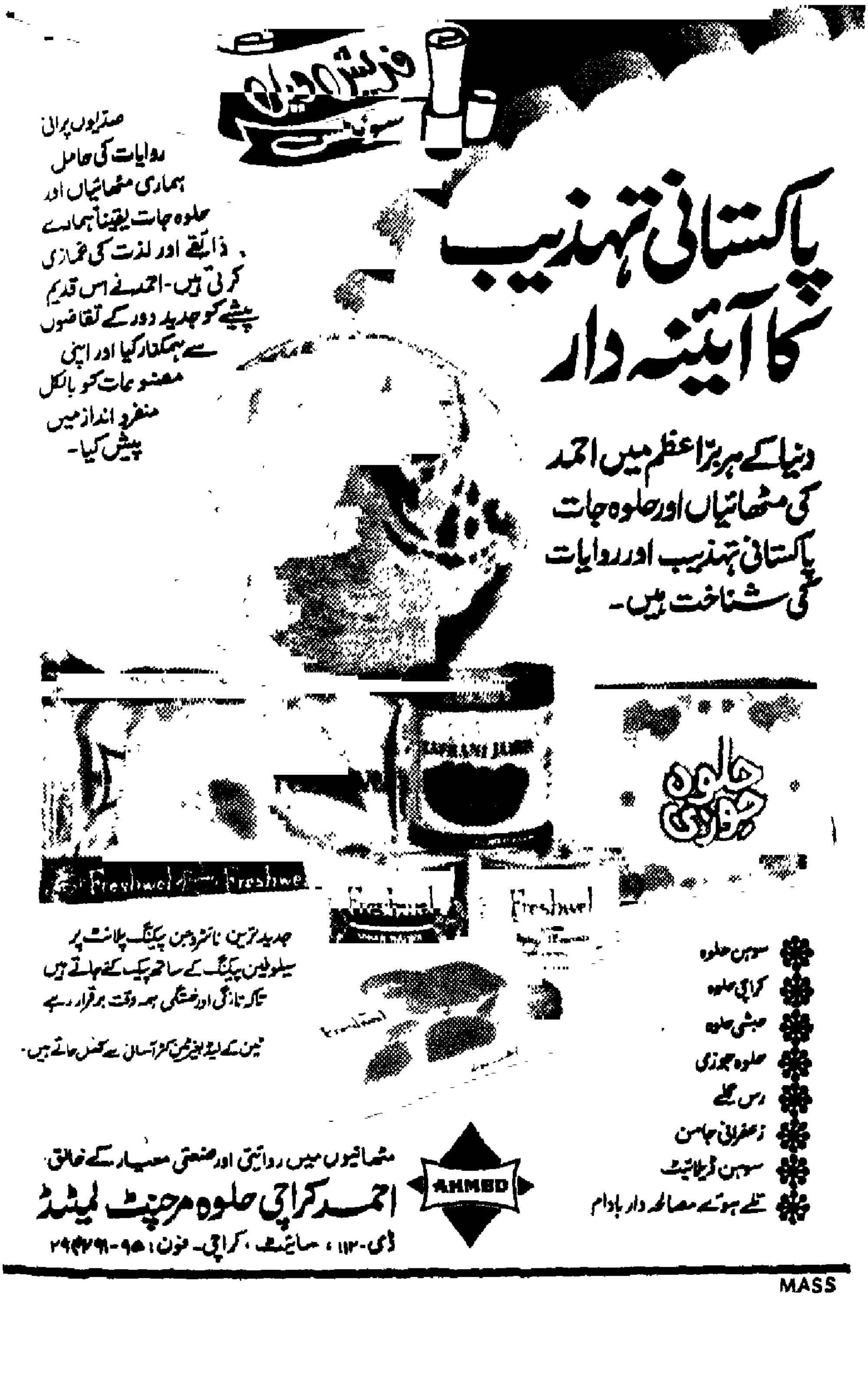
(۵) پاکستان بھی اسلام کے نام پر بنا تھا مساجد اور علمی کتابیں پہلے سے موجود تھیں اور ان میں حیرت انگیز طور پر سوگنا ترقی ہوئی۔ مگر مادیت کی طرف توجہات کی وجہ سے مقاصد کی طرف سے لاپرواہیاں برتی گئیں اور معاشرے میں خرابیاں اور دینی نقصانات رونما ہوئے۔

(۶) اب وقت آگیا ہے کہ مساجد کے امام اپنی پوری ذمہ داریاں ادا کریں اور سابقہ غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کریں ورنہ لادینیت کی مسلسل لہریں اور بیرونی دشمنان دین کی کوششیں تباہی کے خطرات کو دوچند کیے ہوتے ہیں۔ صرف پوری کوشش سے سابقہ لاپرواہیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ تمام اختلافات کو مٹا کر والہانہ طور پر قرآن وسنت کی روشنی کو قائم کرنا اور بڑھانا ہے۔

(۷) اللہ تعالےٰ کا مستقل حکم ہے کہ ہر مرد مومن اللہ کے ہاتھ جان ومال کے ساتھ بکا ہوا ہے اگر اس کا عملی ثبوت ہم سب نے اور خصوصاً اہل علم نے نہ دیا تو نہایت پریشان کن تباہی کو دور نہیں سمجھنا چاہیے۔ پورے ماحول کا تقاضا ہے کہ ہر اہل علم وبصیرت کو اس تعمیری کام میں بلا تاخیر سرگرم عمل ہو جانا چاہیے تاکہ اسلامی معاشرہ بھی بنے اور استحکام پاکستان کا مقصد بھی حاصل ہو۔

مولانا محمد زکریا
سربراہ پاکستان سنی اتحاد


ملک کا مایۂ ناز مشروب، دیس دیس مرغوب
تو گرمی اور تپش کی شدت سے جب جسم نڈھال اور جان بے حال ہو جائے تو پیاس بجھنے کا نام نہ لے۔
مشرق کے حکما نے صدیوں کی جستجو اور تجربوں کے بعد ایسی جڑی بوٹیاں دریافت کیں جن میں انسان کے جسمانی نظام کو ٹھنڈک اور تازگی پہنچانے والے موثر اجزا شامل ہیں۔
روح افزا اسی مسلسل تحقیق کا حاصل ہے۔ یہ قدرتی جڑی بوٹیوں، پھولوں اور پھلوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے کوئی دوسرا مشروب اس کا ثانی نہیں۔
روح افزا ایک خوش ذائقہ، خوش رنگ اور پُر تاثیر مشروب ہے جو جسم و جاں کو فرحت پہنچا کر فوری پیاس بجھاتا ہے اور تر و تازگی لاتا ہے۔
بے شک۔ بے مثال
روح افزا
مشروبِ مشرق
ہمدرد
آفیشل مشروب
ورلڈ اوپن اسکواش چیمپئن شپ
Aderts HRA-1/85


فریش ویل
سوئٹس
صدیوں پرانی
روایات کی حامل
ہماری مٹھائیاں اور
حلوہ جات یقیناً ہمارے
ذائقے اور لذت کی غمازی
کرتی ہیں۔ احمد نے اس قدیم
پیشے کو جدید دور کے تقاضوں
سے ہمکنار کیا اور اپنی
مصنوعات کو بالکل
منفرد انداز میں
پیش کیا۔
پاکستانی تہذیب
کا آئینہ دار
دنیا کے ہر براعظم میں احمد
کی مٹھائیاں اور حلوہ جات
پاکستانی تہذیب اور روایات
کی شناخت ہیں۔
حلوہ جوزی
Freshwel
جدید ترین نائٹروجن پیکنگ پلانٹ پر
سیلوفین پیکنگ کے ساتھ پیک کیے جاتے ہیں
تاکہ تازگی اور خستگی ہمہ وقت برقرار رہے
سوہن حلوہ
کراچی حلوہ
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
رس گلے
زعفرانی جامن
تلے ہوئے مصالحہ دار بادام
مٹھائیوں میں روایتی اور صنعتی معیار کے خالق
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
AHMED
MASS

بسم الله الرحمن الرحيم

اس شمارے میں

...سرار احمد کے دو اہم...

...ن حکیم کا علمی و برہانی تعلیم — (۲) اسلامی انقلاب...

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۴	جون ۱۹۸۵ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ	شمارہ ۶

مشمولات

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی دفتر کا فون نمبر
۲۱۶۵۸۶

عام طور پر ہمارے یہاں

توحید علمی و نظری — یعنی — توحید فی العقیدہ

پر تو بہت زور دیا جاتا ہے، لیکن

توحیدِ عملی

پر کما حقہٗ توجہ نہیں دیجاتی

ڈاکٹر اسرار احمد

پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ زمر تا سورہ شوریٰ پر تدبّر کے دوران

توحیدِ عملی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں

یعنی: اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین کی فرضیت

کو خوب منکشف بھی فرمایا اور بیان کی توفیق بھی مرحمت فرمائی، اور

شیخ جمیل الرحمٰن کی محنت نے ان خطابات کو کتابی صورت دیدی

سائز ۱۸ × ۲۲/۸ ○ صفحات ۱۹۲ ○ عمدہ سفید کاغذ ○ دیدہ زیب کور

هدیہ: ۱۵ روپے، علاوہ محصول ڈاک

مکتبہ تنظیم اسلامی: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور ۱۴

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز "ماہنامہ میثاق" کا موجودہ شمارہ بابت رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق جون ۱۹۸۵ء رمضان کے پہلے عشرے کے اختتام تک قارئین کرام کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مبارک مہینہ کے پہلے عشرے کو رحمت، دوسرے کو مغفرت اور تیسرے کو "عتق" من النار" قرار دیا ہے جو لوگ ایمان اور احتساب کے ساتھ اس ماہ کے روزے رکھیں اور اسی کیفیت کے ساتھ قیام اللیل کا اہتمام کریں ان کو مغفرت کی بشارت دی ہے۔ ایک حدیث میں جو حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا کہ "روزہ اور قرآن دونوں میدانِ حشر میں بندے کی سفارش کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو دن میں کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا پس آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا: میں نے اس کو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا، پس خداوند آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندے کے حق میں قبول کی جائے گی (اور اس کے لیے مغفرت اور جنت کا فیصلہ فرمادیا جائیگا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ رمضان خاص اللہ کا مہینہ ہے۔ یعنی یہ وہ ماہ مبارک ہے جس میں اللہ کی رحمت گھٹائیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح موجزن اور جوش میں ہوتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو پوری شرائط و آداب کے ساتھ اس ماہ میں صیام و قیام اللیل کا اہتمام کر کے اللہ کی رحمت کے مستوجب قرار پائیں اور سال کے بقیہ گیارہ مہینوں میں تقویٰ کی روش اختیار کر کے اس ماہ کی برکات سے متمتع ہوں چونکہ روزوں کی فرضیت کی غایت قرآن حکیم نے تقویٰ قرار دی ہے: لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانانِ عالم کو اس ماہ کی برکات سے متمتع فرمائے۔

رمضان المبارک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ایک رات میں لوح محفوظ سے سمائے دنیا تک قرآن مجید کا دفعۃً واحدہ نزول ہوا بحوالۂ آیاتِ قرآنیہ: شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ

اور إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ فِي لَيۡلَةِ ٱلۡقَدۡرِ ۔ اسی کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید سے امسال اوائل شعبان ہی سے مرکزی انجمن کے چند فعال اور صاحبِ دل ارکان نے "رمضان المبارک میں مسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق" نامی کتابچے کو بڑے وسیع پیمانے پر ملک بھر میں عمومی طور پر اور بالخصوص لاہور کے عوام و خواص میں پھیلانے کی مہم کی تیاری شروع کر دی تھی، چنانچہ تادمِ تحریر قریباً ساٹھ ہزار کی تعداد میں اس پمفلٹ کو طبع کرانے کے لیے فنڈز جمع ہو گئے ہیں، طباعت کا مرحلہ بھی قریباً مکمل ہو گیا ہے۔ اس کتابچے کا سرنامہ بھی بدل دیا گیا ہے اور اس پر محترم ڈاکٹر صاحب اور مرکزی انجمن کا نام بھی حذف کر دیا گیا ہے تاکہ یہ وسوسہ اندازی نہ ہو کہ یہ کام ایک شخصیت اور ایک ادارے کی شہرت کے لیے کیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی توجہات اس امر کی طرف مبذول اور منعطف ہوں کہ "نوعِ انسانی پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان اور اس کی رحمت کا مظہرِ اتم قرآن ہے اور ہر مسلمان پر اس کے ضمن میں کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ جن کو ادا کرنے کے لیے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وہ کیا ہیں؟" یہ کتابچہ لوگوں تک ہدیتہً بھی پہنچایا جائے گا اور قیمتاً بھی۔ اس کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کے مقصد کے پیشِ نظر اس کی لاگت سے بھی کم محض ایک روپیہ قیمت مقرر کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں پیشِ نظر یہ ہے کہ ہمارے رفقاء پورے رمضان میں مختلف مساجد اور مجالس میں اس کتابچے کو سبقاً سبقاً پڑھانے کی بھی کوشش کریں گے مزید برآں بے شمار تعداد میں لاہور کے لیے سحر و افطار کے کیلنڈر مختلف تجارتی فرموں کی طرف سے طبع کرائے گئے ہیں جن کا مرکزی پیغام یہ ہے کہ "قرآن مجید ایک مسلمان سے کیا چاہتا ہے! اس کا پہلا مطالبہ ہے کہ اسے مانا جائے ۔ دوسرا مطالبہ ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ تیسرا مطالبہ ہے کہ اُسے سمجھا جائے ۔ چوتھا مطالبہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اور پانچواں مطالبہ ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے"۔ مرکزی انجمن اور تنظیم اسلامی کے متعدد کارکن اور رفقاء نے اس رمضان المبارک میں اس کام کو ایک مہتم بالشان طریق پر انجام دینے کا عزم کیا ہوا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مہم کو کامیاب سے کامیاب تر بنائے اور اس میں دامے، درمے قدمے حصہ لینے والوں کو اجرِ عظیم سے نوازے اور اس مہم کے ذریعہ اس کی کتاب عزیز فرقانِ حمید یعنی قرآن مجید کی طرف ہمارے معاشرے کی توجہات منعطف ہو جائیں ۔ اگر قرآن حکیم ہمارے اذہان و قلوب میں اتر گیا تو بقول علامہ اقبال عالم یہ ہوگا:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود   جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

قارئینِ میثاق کو یاد ہوگا کہ گذشتہ رمضان المبارک میں صلوٰۃ التراویح کے ہر فرویحہ میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے چار رکعتوں میں سنائے جانے والے قرآن مجید کا رواں ترجمہ اور اہم نکات کی تشریح کی تھی۔ اس طرح یہ پروگرام روزانہ قریباً رات کے دو ڈھائی بجے تک جاری رہتا تھا۔ خالص نصرتِ الٰہی سے ۲۸ راتوں میں یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔ الحمد للہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ حضرات نے شدید گرمی کے موسم میں اس پروگرام میں پوری دلچسپی لی اور رفتہ رفتہ شرکاء کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوا کہ قرآن اکیڈمی کی جامع القرآن میں جگہ ملنی مشکل ہو گئی۔ بفضلہ تعالیٰ امسال جامع القرآن کی دوسری منزل تیار ہو گئی ہے اور اس طرح جگہ کے اعتبار سے قریباً دوگنا اصحاب کی شرکت کی گنجائش نکل آئی ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا مصمم ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ العزیز وہ امسال بھی اسی پروگرام کا اعادہ فرمائیں گے۔ توقع ہے کہ اللہ نے چاہا تو نقشِ ثانی، نقشِ اول سے کہیں بہتر ہوگا۔ قارئین کرام جب ان سطور کا مطالعہ کر رہے ہوں گے تو اس وقت تک ان شاء اللہ ایک تہائی قرآن حکیم کا ترجمہ اور تشریح مکمل ہو چکی ہو گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتابِ عزیز کی دعوت، پیغام اور تعلیمات کو عام کرنے کی اہل علم وفضل کو زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے اور ڈاکٹر صاحب کی ان مساعی کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔

امسال بفضلہ تعالیٰ دعونہٖ رمضان المبارک کی آمد سے قبل قرآن اکیڈمی میں ایک اور بہار آئی یعنی ہمارے ملک کے دو بزرگ علماء کرام کا قران السعدین ہوا۔ پنجاب کے مشہور صوفی منش اہل حدیث عالم دین مولانا معین الدین لکھوی مدظلہ ۱۱ر سے ۱۳ر مئی ۸۵ء تک قرآن اکیڈمی میں مقیم رہے۔ مولانا ماضی میں جماعتِ اسلامی کے رکن رہے ہیں اور ۵۱ء تا ۵۳ء پنجاب پراونشل اسمبلی میں جماعت اسلامی کے واحد رکن رہے ہیں۔ موصوف موجودہ امیرِ جمعیت اہل حدیث پاکستان نیز قومی اسمبلی کے رکن مولانا معین الدین لکھوی دامت برکاتہم کے بڑے بھائی ہیں۔ مولانا محی الدین نے ہفتہ کو عصر و مغرب کے مابین اور اتوار کی صبح بعد نمازِ فجر اپنے مواعظِ حسنہ سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ مولانا محترم نے اتوار کو تنظیم اسلامی حلقہ خواتین کے اجتماع میں عصر سے مغرب تک اسلام میں عورت کے مقام پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں مرد بھی شریک تھے۔ اس کے علاوہ مولانا موصوف کی محترم ڈاکٹر صاحب، رحمت اللہ بٹر صاحب اور راقم الحروف سے تبادلۂ خیال کی کئی نشستیں ہوئیں۔ الحمد للہ مولانا مکرم نے تنظیم اسلامی کے پورے لائحۂ عمل اس کے اصول و مبادی اور اس کے طریقِ کار سے کامل اتفاق کا اظہار فرمایا اور اپنے پورے تعاون کی پیشکش فرمائی۔ جزاک اللہ خیراً واحسن الجزاء۔

دوسرے بزرگ عالم دین، مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے فارغ التحصیل، سابق مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (بھارت)، اور سابق رکن مجلس دعوت و تحقیق و نگران شعبۂ تخصص جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوریؒ ٹاؤن کراچی نیز متعدد اہم علمی و دینی کتب کے مؤلف و مصنف جناب مولانا محمد اسحٰق صدیقی لکھنوی مدظلہ ۱۰ رمئی سے ۱۸ رمئی ۸۵ء تک قرآن اکیڈمی میں مقیم رہے۔ مولانا موصوف نے ہفتہ ۱۱ رمئی سے جمعرات ۱۶ رمئی تک بعد نماز مغرب مندرجہ موضوعات پر اپنے مواعظ حسنہ سے شرکاء کو مستفیض فرمایا۔

(۱)۔ اعتصام و اقدام۔ (۲) ایمان و امان (۳) ایمان و عرفان۔ (۴) ایمان کے تقاضے۔ (۵) صراطِ مستقیم اور استقامت (۶) وراثت کتاب اللہ۔ مزید برآں چار یوم تک مولانا نے نماز فجر کے بعد بھی اختصار کے ساتھ اپنے مواعظ سے شرکاء کو مستفید فرمایا۔

مولانا مدظلہ نے بھی تنظیم اسلامی کے لائحہ عمل سے اتفاق فرمایا اور محترم ڈاکٹر صاحب کے لیے اس کام کی کامیابی کے لیے دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اظہار فرمایا۔

ان دونوں بزرگ علماء کرام کا یہ تعاون علی الخیر ان شاء اللہ تنظیم اسلامی کی دعوت کی توسیع میں انتہائی مفید ثابت ہوگا۔ ان حضرات نے پیرانہ سالی اور گرمی کے موسم میں خالصتاً للہ جو تعاون فرمایا ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس پر اپنی خاص رحمت اور اجر عظیم سے بہرہ مند فرمائے۔

الحمدللہ والمنۃ گذشتہ سال عیدالاضحیٰ کے فوراً بعد قرآن اکیڈمی میں جو دو سالہ تدریسی کورس شروع ہوا تھا۔ اس کا پہلا تعلیمی سال شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ کے دوسرے عشرے میں مکمل ہو گیا۔ آخری عشرے میں اس کورس میں شرکاء کا باقاعدہ امتحان لیا گیا اور وہ امتحان سے فارغ بھی ہو گئے۔ رمضان المبارک میں تعطیل رہے گی۔ شوال المکرم کے فوراً بعد ان شاء اللہ دوسرے اور آخری سال کی تعلیم کا آغاز ہو جائے گا۔ قرآن اکیڈمی میں ۱۹۸۳ء میں 'قرآن اکیڈمی فیلوشپ سکیم'، اور ۱۹۸۴ء میں دو سالہ تدریسی کورس کا مکمل جائزہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے قلم سے حکمتِ قرآن کے مئی کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ واضح رہے کہ حکمتِ قرآن کا وہ شمارہ جس میں دو سالہ تدریسی کورس کا جائزہ شائع ہوا تھا قریباً، میثاق کے تمام خریداروں کو ارسال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اکیڈمی کے اصل مقصد کی طرف جو ابتدائی پیش رفت ہوئی ہے وہ بتدریج جاری رہے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک ایسی کھیپ علمی میدان میں آ جائے جو موجودہ خدا ناآشنا اور ملحدانہ باطل نظریات کا قرآن مجید اور سنتِ رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے محکم دلائل کی روشنی میں اعلیٰ علمی سطح پر ابطال کر سکے اور قرآنِ حکیم کی بینات

کے ذریعے احقاق حق کر سکے۔ اسلام کے بطور دین (نظام حیات) غلبہ کے لیے پہلے تمام باطل فلسفوں اور نظریات و افکار پر قرآن مجید کا علمی غلبہ از حد ضروری ہے۔

اسے حسنِ اتفاق کہہ لیں جبکہ ہمارے نزدیک یہ خالص مشیتِ الٰہی کا مظہر ہے کہ اس شمارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کا وہ خطاب جمعہ بھی شامل ہے جو موصوف نے ۵ / اپریل ۸۵ کو ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطاب میں جہاں قرآن حکیم کی دعوت اور اس کا پیغام، نہایت فکر انگیز اور مدلل طور پر سامنے آتا ہے وہاں قرآنِ حکیم کے علمی غلبہ کی اہمیت اسلام کے عملی غلبہ کے ناگزیر لازمے (Pre-requisite) کے طور پر سامنے آتی ہے۔ توقع ہے کہ ان شاء اللہ قارئین کرام کے لیے اس خطاب کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔

میٹرک اور ایف اے کے امتحان سے فارغ ہونے والے طلبہ کا نتیجہ نکلنے اور مزید تعلیم کے لیے کالجوں میں داخلہ کے حاصل کرنے کے انتظار میں قریباً ساڑھے تین ماہ کا وقت فارغ ہوتا ہے۔ اس فارغ وقت کو مفید بنانے کے لیے امسال یکم جولائی تا ۲۹ / اگست قرآن اکیڈمی میں ایک دو ماہی کورس کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ان ساٹھ دنوں میں ان طلبہ کے لیے دین کی بنیادی تعلیم کا نصاب مرتب کیا گیا ہے یہ نصاب اس شمارے میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔ توقع ہے کہ لاہور اور قریب کے شہروں کے میثاق کے وہ قارئین کرام جن کے بچوں نے امسال میٹرک کا یا ایف اے کا امتحان دیا ہے۔ اپنے بچوں کے اس فارغ وقت کو اس اہم مصروفیت میں لگا دیں گے۔ دوسرے شہروں کے بچوں کا بھی ان شاء اللہ خیر مقدم کیا جائے گا۔

الحمدللہ محترم ڈاکٹر صاحب کا لاہور اور بیرونِ لاہور دعوتی دوروں کا پروگرام حسب سابق جاری ہے۔ کراچی اور لاہور میں "شام الہدیٰ" کا انعقاد بھی بحسن و خوبی ہو رہا ہے۔ کوشش ہو رہی ہے کہ اسلام آباد / راولپنڈی میں بھی "شام الہدیٰ" کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

احقر
جمیل الرحمن
عفی عنہ

الہدیٰ

بائیسویں نشست

ایمان اور اس کے ثمرات

سورۃ تغابن کی روشنی میں

(مباحث ایمان)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلی ویژن کے دروس قرآنی کا سلسلہ

سلسلے کے لیے فروری ۸۳ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں

———(۴)———

السلام علیکم - نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد،

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ
یَھْدِ قَلْبَہٗ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ
فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ
اِلَّا ھُوَ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا
اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا
وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝
اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ؕ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝
صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۝

"نہیں نازل ہوتی کوئی مصیبت مگر اللہ کی اجازت سے، اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے) رسول کی، پھر اگر تم نے رُوگردانی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اللہ وہ ہستی ہے جس کے سوائے کوئی معبود نہیں ہے۔ پس اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اہل ایمان کو۔ اے اہلِ ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے تمہارے دشمن ہیں پس ان سے بچ کر رہو۔ اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔ بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے حق میں فتنہ ہیں، آزمائش ہیں اور اصل اجر تو اللہ ہی کے پاس ہے۔"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

ابھی آپ نے سورہ تغابن کے دوسرے رکوع کی ابتدائی پانچ آیات سماعت فرمائیں، اور ان کا ترجمہ بھی سُنا۔ یہ اس سورہ مبارکہ کی آیات ۱۱ تا ۱۵ ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں ان آیات میں نہایت جامعیت کے ساتھ ان مضمرات کو کھولا گیا ہے جو ایمان میں مخفی ہیں یا یوں کہیئے کہ ان آیات میں ان ثمرات و نتائج کو بیان کیا گیا ہے جو ایمان کی بدولت انسان کی شخصیت میں پیدا ہونے چاہئیں۔ جیسے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ایک ٹنڈ منڈ درخت ہوتا ہے جس میں نہ پتے ہوتے ہیں نہ پھل، اور ایک مثمر درخت ہوتا ہے، جس میں برگ و بار ہیں، جس میں پھل لگے ہوئے ہوتے ہیں، تو معاذ اللہ ایمان اس ٹنڈ منڈ درخت کے مانند نہیں ہے بلکہ یہ ایک بار آور اور مثمر درخت ہے۔ اس ایمان کی بات دوسری ہے جو صرف زبان کی نوک پر ہے، اور ابھی دلوں میں داخل نہ ہوا ہو لیکن جب دل میں راسخ ہو جاتا ہے۔ جب انسان کا باطن اس کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو اس کے اثرات، اس کے ثمرات، اس کے نتائج انسانی شخصیت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ اگر کوئی انسان سلیم الفطرت ہے۔ اس کے قلب کی زمین صالح ہے تو جب اس میں ایمان کا بیج جمتا ہے اور پھر پھوٹتا ہے تو رفتہ رفتہ اور تدریجاً وہ ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرتا ہے، جس میں خوبصورت پتے بھی لگتے ہیں، حسنات کے، نیکیوں کے، اعمالِ صالحہ کے، اخلاقِ حسنہ کے اس میں پھل بھی لگتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انسان کی پوری شخصیت میں ایک تغیر پیدا ہوتا ہے جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ہے

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شُد، جہاں دیگر شود

علامہ نے تو یہ قرآن مجید کے بارے میں کہا ہے۔ لیکن قرآن منبع ایمان ہے۔ لہٰذا یہی بات ایمان کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ جب ایمان انسان کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اب اس کے باطن میں ایک انقلاب آ جاتا ہے، اس کی سوچ بدل جاتی ہے، اس کا نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے، اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے، اس کی اقدار تبدیل ہو جاتی ہیں، اس کا جو بھی
ہے وہ پورا تبدیل ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی روش، اس کا رویہ یہ بھی کُل کا کُل بدل کر رہ جاتا ہے

ع جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود !

اب ان پانچ آیات میں نہایت معجز نما اسلوب و انداز میں اللہ تعالیٰ نے ان بنیادی تبدیلیوں کی نشاندہی کی ہے جو ایمان کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر میں، اس کے زاویۂ نگاہ میں، اس کے اندازِ فکر میں اور اس کی روش اور رویہ میں ہویدا، نمایاں اور ظاہر ہو جانی چاہئیں، ان آیات میں ہمارے لئے ایک کسوٹی مہیا ہو جاتی ہے کہ ہم خود اس پر اپنے ایمان کو پرکھ سکیں۔ اگر یہ اثرات و ثمرات ہماری شخصیتوں میں ظاہر ہوتے ہیں تو ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ یہ ایمانِ حقیقی کا نور ہمارے دلوں میں موجود ہے، اور اگر یہ ظاہر نہیں ہو رہے تو یہ گویا ایک تنبیہہ ہے ایک
ہے کہ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم اس ایمانِ حقیقی کی روشنی سے محروم تو نہیں ہیں۔ اب ان باتوں کو سمجھنے کے لئے جو ان آیاتِ مبارکہ میں بیان ہوئی ہیں ایک اصولی بات جان لیجئے کہ ہر شخص کی پہلی حیثیت تو ایک فرد ہونے کے اعتبار سے یوں ہے کہ کچھ حالات اور واقعات اس پر وارد ہوتے ہیں اور کچھ اعمال اس سے صادر ہوتے ہیں، ہماری ذاتی شخصیت کے یہ دو رُخ ہیں، کچھ حالات، واقعات، حادثات، کیفیات ہم پر وارد ہوتے ہیں، کبھی کوئی خوشی کی بات ہے، کبھی کوئی تکلیف دہ بات ہے جس سے ہم دوچار ہوتے رہتے ہیں، اس میں بھی جو چیز تکلیف دہ ہے جسے ہم مصیبت سے تعبیر کرتے ہیں، اس سے ہم زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں، لہٰذا سب سے پہلے تو یہ بیان کیا گیا کہ ایک بندۂ مومن کا نقطۂ نظر مصائب کے بارے میں کیا ہونا چاہیئے۔ اگر وہ اللہ پر یقین رکھتا ہے، ارشاد فرمایا، مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ، کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی" اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ، مگر اللہ کے اذن سے ہوتی ہے" جب اللہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے، اس کائنات پر وہ حکمران ہے۔ اس کے اذن کے بغیر ایک پتّا تک نہیں ہلتا تو جو کچھ بھی حالات و واقعات

پیش آ رہے ہیں، ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ کے علم میں ہیں اور اللہ کے اذن سے ہیں۔ اب جو چیز اللہ کے اذن سے ہوا اگر مجھے اللہ پر یقین ہے، اللہ پر ایمان ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس پر شکوہ اور شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ بقول شاعرؔ ہر چہ ساقی ما ریخت عین الطاف است۔ میرے ساقی نے میرے پیمانے میں جو بھی ڈال دیا ہے یہ اس کا کرم ہے، اس کا فضل ہے۔ میرے رب کو اگر میرے لئے یہی پسند ہے تو میں بھی اس پر راضی ہوں۔ یہ ہے وہ ثمرہ جو ایمان کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر میں پیدا ہونا چاہیئے۔ اس کو کہتے ہیں تسلیم و رضا۔ جس کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں۔

برون کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا!

جب انسان اس مقام رضا پر آجاتا ہے تو اس کے احساسات و جذبات یہ ہو جاتے ہیں کہ میرے رب نے میرے لئے جو کچھ پسند کیا ہے، مجھے بھی وہی پسند ہے۔ تسلیم و رضا کی کیفیت اس کے قلب میں پیدا ہو جاتی ہے اور سینکڑوں ان الجھنوں سے اُسے نجات حاصل ہو جاتی ہے کہ کیوں ہوا! یہ کیسے ہوا! یہ اس نے کر دیا! یہ تکلیف مجھے اس کی وجہ سے پہنچی! اس کی سوچ اور اس کا عمل احساس محرومی (FRUSTRATION) اور تخالف (CONFLICT) میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ اسی ادھیڑ بُن میں الجھا رہتا ہے کہ ایسا کیوں ہو گیا! ایسا کیوں نہیں ہوا۔ انسان کو ان تمام چکروں سے نجات دلانے والی چیز ہے تسلیم و رضا۔ لہٰذا پہلا نتیجہ تو یہ برآمد ہوا اور اس کے لئے فرمایا وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ، جو کچھ بھی اس کائنات میں ظہور پذیر ہونے والا ہوتا ہے، اللہ کے علم ازلی میں وہ پہلے سے موجود ہے۔

اب آیئے ان اعمال کی طرف جو ہم سے صادر ہوتے ہیں، ہمارے ہاتھ پاؤں، ہمارے اعضاء و جوارح ہم ان سے حرکت کرتے ہیں، بھاگ دوڑ کرتے ہیں، اس دنیا میں ہماری سعی و جہد اور ہماری تمام سرگرمیاں ہمارے ان اعمال پر مبنی ہیں جو ہمارے وجود سے صادر ہوتے ہیں۔ ان کے ضمن میں ایمان کا جو نتیجہ نکلنا چاہیئے اس میں مقدم ترین شے اطاعت ہے۔ آپ کے اعضاء و جوارح سے کوئی عمل اللہ کے حکم کے خلاف صادر نہ ہو۔ اگر اللہ پر ایمان لائے ہیں، اللہ کو مانا ہے تو آپ کوئی کام اور کوئی حرکت ایسی نہ کریں، جس سے اللہ کا کوئی حکم ٹوٹتا ہو۔ آپ کی زبان سے کوئی لفظ ایسا نہ نکلے جو اللہ کو ناپسند ہو —— پھر معاملہ صرف اللہ کا نہیں ہے، ارشاد فرمایا: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول کی (صلی اللہ علیہ وسلم) تم نے مانا ہے اللہ

اور تم نے مانا ہے اس کے رسول کو (صلی اللہ علیہ وسلم) ایمان کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ تمہارے اعضا و جوارح سے جو اعمال و افعال صادر ہوں، وہ سب کے سب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ یہ ایمان کا لازمی دوسرا نتیجہ ہے۔ اس پر تنبیہ فرما دی کہ اگر یہ نہیں کرتے، فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ "پس اگر یہ پیٹھ موڑ لیں، روگردانی کریں، اطاعت کی روش اختیار نہ کریں" تو اے نبیؐ ان کو سنا دیجئے کہ، فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔ "ہمارے رسول پر تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے"

ہمارے وجود سے صادر ہونے والے اعمال و افعال کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ اس کو بھی یہاں واضح فرما دیا گیا۔ ایمان کے نتیجے میں ہمارا سارا بھروسہ، ہمارا سارا تکیہ، ہمارا سارا توکل اللہ کی ذات پر ہونا چاہیئے۔ اگرچہ اس دنیا میں ہم اسباب سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ مادی وسائل و ذرائع ہمیں استعمال کرنے ہوں گے۔ بلکہ قرآن مجید میں تاکیدی حکم ہوا ہے۔ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ "اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری تیاری کرو۔ جو ساز و سامان فراہم کر سکتے ہو، فراہم کرو، لیکن تمہارا توکل، تمہارا اعتماد، تمہارا بھروسہ، تمہارا تکیہ ان اسباب و وسائل پر نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی ذات پر ہو۔ ہوگا وہ جو اللہ چاہے گا۔ اپنی سی محنت کرو، کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دو، لیکن اگر تم نے بھروسہ اپنی محنت، اپنی تیاری پر کیا، اپنے ساز و سامان پر کیا، مادی وسائل و اسباب پر کیا تو معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات سے تمہاری نگاہیں ہٹ گئیں —— ایمان کے نتیجے میں محنت اپنی جگہ ہے، کوشش اپنی جگہ ہے۔ اسباب و وسائل کا استعمال لازمی ہے۔ لیکن توکل صرف اور صرف اللہ کی ذات پر ہوگا۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ "اللہ ہی ہے وہ ذات جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی ولی نہیں، کوئی نصیر نہیں، کوئی دستگیر نہیں، کوئی پشت پناہ اور مددگار نہیں، کوئی حامی نہیں لہٰذا اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے"

اب ذرا ایک فرد سے آگے آیئے۔ انسان اس دنیا میں بہت سے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے اس کے والدین ہیں، اس کے بھائی ہیں، بہنیں ہیں، اس کی بیوی ہے، اس کے بچے ہیں، اس کے رشتہ دار ہیں، اس کے اعزہ و اقارب ہیں۔ ان سب کو ایک لفظ میں جمع کر لیجئے۔ وہ ہے علائقِ دنیوی —— اس کے بہت سے دائرے ہوں گے۔ سب سے پہلا دائرہ ہے، والدین، بیوی اولاد، بھائی بہن۔ انسان کی دنیوی زندگی کے تعلقات کا یہ سب سے پہلا اور مقدم دائرہ ہے۔ اس کے بعد رشتہ داروں کا دائرہ ہے، یہاں تک کہ پوری نوعِ انسانی تک یہ سلسلہ منتج ہو جائے

گا، اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اس تمدن و تہذیب کی گاڑی کو چلانے کے لئے کچھ فطری محبتیں انسان کے قلب میں ڈال دی ہیں۔ والدین کی محبت ہے، بیوی کی محبت ہے، اولاد کی محبت ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان محبتوں میں سب سے زیادہ قوی محبت ہے بیویوں کی محبت اور اولاد کی محبت اس محبت کی طرف اگلی آیت میں اشارہ فرمایا کہ یہی محبت کسی وقت انسان کے لئے دشمنی کا روپ دھار لیتی ہے اس میں POTENTIAL DANGER مضمر ہے۔ بالقوۃ فطرۃً موجود ہے۔ اگر آخرت نہ ہوتی تب تو کوئی پرواہ کی بات نہ ہوتی۔ پھر تو بیویوں کی تمام فرمائشیں پوری کرے چاہے حلال سے کرے چاہے حرام سے کرے، اولاد کو اچھے سے اچھا کھلائے اور پہنائے، چاہے جائز ذرائع سے آمدنی ہو چاہے ناجائز ذرائع سے آمدنی ہو، جب یہ حقیقت تمہارے سامنے آ گئی کہ یہ زندگی عارضی زندگی ہے، بہت مختصر زندگی ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ وہی اصل و حقیقی کامیابی اور جیت کی زندگی ہے: ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ۔ اس سے متعلق پچھلی نشست میں ہم قدرے وضاحت سے گفتگو کر چکے ہیں، تو اب اگر تم نے اپنی بیویوں اور اولاد کی محبت سے مغلوب اور مجبور ہو کر اللہ کی حرام کردہ چیزوں پر منہ مارا۔ ناجائز آمدنیوں کے راستوں کا رُخ کیا، ان کو عیش کرانے کے لئے، ان کی فرمائشیں پورا کرنے کے لئے، ان کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے تم نے اگر حلال و حرام کی تمیز کو مٹا دیا۔ جائز و ناجائز کا خیال نہ رکھا تو جان لو کہ یہ محبت نہیں دشمنی ہے لہٰذا ارشاد ہوتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ "اے اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں۔ پس ان سے بچ کر رہو، چوکس رہو، چوکنا رہو، ہوشیار رہو، خبردار رہو، مبادا غفلت میں یہ محبت تمہاری عاقبت کی بربادی کا ذریعہ بن جائے۔" چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بڑا ہی نادان ہے وہ شخص جس نے دوسروں کی دنیا بنانے کے لئے اپنی عاقبت تباہ و برباد کرا دی" (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)۔

اسی آیت مبارکہ کے آخری ٹکڑے میں جہاں فصاحت و بلاغت کا کمال ہے وہاں ایک صحیح رویہ اختیار کرنے کے لئے نہایت پُرزور دعوت اور استدلال ہے۔ وہ یہ کہ جہاں زور دیا گیا کہ تمہاری بیویاں اور اولاد میں تمہارے دشمن ہیں POTENTIAL ENEMIES ہیں وہاں دوسری طرف اس کو متوازن اور BALANCE کیا گیا کہ یہ جو گھر گرہستی کی زندگی ہے یہ اکھاڑہ نہ بن جاتے یہ میدان جنگ کا سماں پیش نہ کرے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا: وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا۔

یہ نہیں کہ ہر وقت ہی لڑائی ہے، گھر میں فساد کا ہر لحظہ نقشہ جما ہوا ہے، ہر دم خشونت ہے، درشتگی ہے، سختی ہے۔ اور محبت و شفقت اور نرمی کا بالکل ظہور ہی نہ ہو، نہیں۔ خود اپنے آپ کو تو محفوظ رکھو، خود چوکس اور چوکنا رہو، کہیں غفلت میں ان کی محبت تم سے کوئی غلط کام نہ کرا لے۔ لیکن ان کی خطاؤں سے چشم پوشی بھی کیا کرو، درگزر بھی کیا کرو، ان کو معاف بھی کر دیا کرو، بخش بھی دیا کرو اس لئے کہ! فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ "اللہ بھی معاف فرمانے اور رحم فرمانے والا ہے" تم اس کی مغفرت اور رحمت کے طالب ہو تو اپنے اندر بھی ان صفات کا مظاہرہ کرو۔

آج کے سبق کی آخری آیت میں اولاد کے ساتھ مال کو جمع کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ اولاد کو دونوں جگہ لایا گیا۔ بیویوں سے محبت ہوتی ہے اور اولاد سے بھی محبت ہوتی ہے لیکن مال پر بھروسہ ہوتا ہے اور اولاد پر بھی بھروسہ ہوتا ہے۔ انسان اس سے اپنی بڑی توقعات وابستہ کئے ہوتا ہے۔ اپنے بڑھاپے کے لئے بہت سی امیدیں اس سے وابستہ کئے ہوتا ہے۔ یہاں فرمایا کہ تمہارے یہ مال اور تمہاری یہ اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں، کسوٹی ہیں جن پر تم کو پرکھا جا رہا ہے کہ آیا تم ان کی محبت میں مبتلا ہو کر، ان کی محبت سے مغلوب ہو کر اللہ کو بھول جاتے ہو اور اپنی عاقبت کو برباد کر لیتے ہو۔ جیسے سورۃ منافقون میں فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ۔ "اے اہل ایمان! تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں"۔ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ "اور جو یہ کرے گا تو وہ بڑے خسارے پانے والوں میں سے ہو جائے گا"۔ یہاں فرمایا: اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ۔ امیدیں وابستہ کرنی ہیں تو اللہ سے کرو، امیدوں کو پورا کرنے والا، امیدوں کو بر لانے والا، تمہاری محنت کی صحیح اجرت ادا کرنے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے ——— دنیا میں جو تم اپنے آپ کو کر رہے ہو، اپنے آپ کو فروخت کر رہے ہو، اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں کھپا رہے ہو، اگر اپنی قوتوں اور اپنے اوقات کو اللہ کے ہاتھ بیچو، اس کے احکام کو بجا لاؤ، اس کے نواہی سے خود کو بچاؤ تو وہ تمہیں بہترین قیمت اور اجرت دینے والا ہے۔ عمدہ، اعلیٰ اجر اسی کے پاس ہے۔ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ۔

یہ ہیں وہ پانچ آیات، جن میں گویا کہ ایمان کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں جو تغیرات پیدا ہو جانے چاہئیں، انہیں نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب ذرا ذہن میں

لا جیئے گا یہ بات کہ سورۃ آل عمران میں ایمان کی بحث آئی اور ایمان کا نتیجہ عمل کی شکل میں بھی آیا۔ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا ۔ سورہ نور میں ایمان کی تمثیل اور تشبیہ آئی اور اس کے نتائج بھی آگئے۔ یاد الٰہی ہے، نماز کا مقام ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی ہے رقتِ قلب ہے، اس دن کے تصور سے لرزاں و ترساں رہنا ہے جس دن دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پلٹ جائیں گی۔ سورۂ تغابن کے پہلے رکوع میں ایمان کا بیان آگیا اور ایمان کے تین ابعاد کا (THREE DIMENSIONS) ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا جامعیت کے ساتھ ذکر آگیا۔ اس کے بعد ایمان کے ثمرات کا بیان ہوگیا اور بتا دیا گیا کہ ایمان کے نتیجہ میں ایک بندۂ مومن کی باطنی کیفیات کیا ہو جانی چاہئیں، اس کے نقطۂ نظر میں کیا انقلاب آجانا چاہیئے، ان پانچ آیات کے ذریعے امور بھی جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آگئے۔

اب اس ضمن میں کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب اس سورت میں اولاد کو فتنہ کہا گیا ہے۔ دوسری سورتوں میں نعمت کہا گیا ہے۔ اس تضاد کی وضاحت فرمائیں؟

جواب: یہ بہت عمدہ سوال ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ عطا فرمایا جاتا ہے اس کا ایک رُخ یہ ہے کہ وہ نعمت ہے لیکن اسی کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس کو اس نعمت کا حساب دینا ہوگا۔ اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس اعتبار سے اگر آپ دیکھیں گے کہ جس کے پاس مال کم ہے اسے حساب بھی کم دینا ہوگا۔ جس کے پاس مال زیادہ ہے اسے حساب بھی زیادہ دینا ہوگا۔ گویا تمام دنیوی نعمتیں ہمارے محاسبۂ اخروی کی بنیاد بن جائیں گی، جن پر ہم جانچے اور پرکھے جا رہے ہیں۔ فتنہ عربی زبان میں کسوٹی کو کہتے ہیں، جس پر سونے کو رگڑ کر ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ یہ خالص سونا ہے یا اس میں کوئی کھوٹ بھی ہے۔ تو یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ آزما رہا ہے، پرکھ رہا ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کی ہر نعمت فتنہ ہو جاتی ہے۔ مال اور اولاد خاص طور پر وہ چیزیں ہیں، جن کی محبت سے مغلوب ہو کر انسان حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز اٹھا دیتا ہے۔ لہٰذا ان کا بالخصوص یہاں ذکر کر دیا گیا جن کے ذریعہ سے انسان کی جانچ، پرکھ اور آزمائش ہو رہی ہے۔

(بقیہ ص ۴۴ پر)

غلبۂ دین کا مرحلۂ اوّل

علمی اور برہانی غلبہ

ڈاکٹر اسرار احمد

(خطاب جمعہ ۵ ، اپریل ۸۵ء)

الحمد للّٰہ وکفٰی والصلٰوۃ والسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصًا علٰی افضلہم خاتم النبیّین محمد ن الامین وعلٰی آلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد فقد قال اللّٰہ تبارک وتعالٰی فی سورۃ محمد علٰی صاحبہا الصّلٰوۃ والسّلام ۔

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ (آیت ۷)

وقال تبارک وتعالٰی فی سورۃ اٰل عمران

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ (آیت ۱۶۰)

وَقال عزّ اسمُہ فی سورۃ الحدید

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ط اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (آیت ۲۵)

وقال اللّٰہ تعالٰی فی سورۃ التوبۃ وسورۃ الفتح وسورۃ الصف،

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ـــــ

حضرات! آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے جمعہ میں قریباً نصف وقت تو تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع اور اس کے ساتھ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام محاضراتِ قرآنی کے انعقاد کے تذکرے اور ان کی کیفیات و ثمرات اور نتائج کے بیان میں صرف ہوا تھا بقیہ نصف وقت میں میں نے مظفر آباد آزاد کشمیر سے انجمن کے محاضرات میں شرکت کے لیے تشریف لانے والے ایک عالمِ دین، مولانا سید مظفر حسین ندوی کے حوالہ سے یہ بات عرض کی تھی اس وقت ہمارے ملک کے جو اندرونی اور بیرونی حالات ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں. بیرونی خطرات کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ دن بدن بڑھ رہے ہیں. روس کا رویہ سخت سے سخت تر ہوتا نظر آ رہا ہے. اس پر چہ میگوئیاں واشنگٹن تک میں ہو رہی ہیں. اس کا مادی سطح پر جو ظاہری علاج ہے جسے لوگ سوچ سکتے ہیں وہ ہمارے بھی اربابِ بست و کشاد سوچ رہے ہیں یہ کہ امریکہ سے زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کی جائے. اس کی کیا قیمت ہمیں اپنے بین الاقوامی تعلقات میں دینی پڑے گی! یہ علاحدہ مسئلہ ہے میں اس پر دانستہ گفتگو کرنا نہیں چاہتا اس لیے کہ یہ بڑے نازک اور حساس موضوعات ہیں.

ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ نسخہ

بہرحال یہ مسائل اور ان پر سوچ بچار تو خالص مادی سطح کی ہیں. ان پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے کوئی اتفاق کرے یا اختلاف کرے اس کے لیے میدان کھلا ہے. ہمارے یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہماری موجودہ پالیسی غلط ہے بلکہ ہمیں روس کے ساتھ اور افغانستان کی جو بھی حکومت فی الوقت موجود ہے اس کے ساتھ مذاکرات کرنے چاہئیں، لیکن نہ صرف ہماری حکومت کا بلکہ اکثر مسلمان حکومتوں کا یہ موقف ہے کہ ہم روس کی مدد سے برسرِ اقتدار آنے والی حکومت کو تسلیم نہیں کر سکتے اور براہِ راست گفت و شنید کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس حکومت کو تسلیم کر لیا. بہرحال یہ تو وہ بات ہے کہ جس کے حق میں اور خلاف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن جو بات مولانا مظفر حسین ندوی مدظلہ نے فرمائی تھی وہ مجھے بہت پسند آئی تھی. بات سامنے کی ہوتی ہے لیکن وہی بات کسی وقت برمحل کہی جائے، موقع کی مناسبت سے کہی جائے تو اس کے اندر ایک تاثیر ہوتی ہے. میں نے چونکہ خود اس کی تاثیر کو محسوس کیا تھا لہٰذا میں نے چاہا تھا کہ اس تاثیر میں آپ حضرات کو بھی شریک کروں چنانچہ گذشتہ جمعہ کو میں ان کے حوالہ سے یہ کام کر چکا ہوں بطور اعادہ عرض ہے کہ انہوں نے ہمارے مسائل کے لیے جو سادہ نسخہ تجویز فرمایا ہے وہ قرآن مجید کی دو آیات سے ماخوذ ہے، ایک سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آیت نمبر ۷ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ○ " اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا، انہیں ثبات عطا فرمائے گا" یہ بالکل دو اور دو چار کی طرح کی بات ہے کہ تم اللہ کی مدد چاہتے ہو تو اس کی مدد کرو ۔ اس کے ساتھ سورہ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۶۰ جمع کر لیجئے: اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ج "اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکے گا" — لیکن وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ "اور اگر تمہاری ناہنجاری کی وجہ سے، تمہاری بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ ہی تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون ہے وہ جو تمہاری مدد کر سکے گا اس کے بعد!" — یہ ہے وہ نسخہ جو ان دو آیات کے حوالہ سے مولانا موصوف نے بیان کیا تھا۔ یہ نسخہ سادہ بھی ہے اور مجرّب بھی — بشرطیکہ یقین ہو اور اللہ کی مدد کی جائے جیسے کہ اس کی مدد کا حق ہے۔ اس کی مدد سے کیا مراد ہے؟ اسے میں تفصیل سے پچھلے جمعہ کو بیان کر چکا ہوں[1] کہ وہ ہے اس کے دین کی مدد، اس کے دین کو غالب کرنے کی جدّوجہد — ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے پہلے ہمیں اپنی انفرادی زندگیوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و احکامات کے مطابق سنوارنا اور صحیح کرنا ہو گا — ہم خود صحیح معنوں میں بندۂ مسلم و مومن بن جائیں اور اپنے ماحول کو، اپنے معاشرے کو، اپنے ملک کے نظام کو اللہ کے دین کے مطابق اور اس کے تابع کرنے کی جدوجہد کریں گے، اس کے لیے تن من دھن لگائیں گے تو یہ اللہ کی مدد شمار ہو گی، اور اس صورت میں ہم اللہ کی مدد کے مستحق بن جائیں گے — یہ ہے تیر بہدف نسخہ۔ تمام دنیوی سہارے چاہے وہ امریکہ ہو، کوئی اور ہو وہ ضمنی طور پر مفید ہو سکتے ہیں حقیقی اور کلّی طور پر نہیں ہو سکتے۔ پھر امریکہ کی ماضی قریب کی ایک تاریخ ہے اس نے ویٹ نام میں ایک مرتبہ دھوکہ کھا لیا ہے۔ لہٰذا آئندہ وہ کبھی دھوکہ نہیں کھائے گا۔ وہ کسی کے لیے لڑے گا نہیں۔ لڑنے مرنے کے لیے آپ تیار ہوں تو وہ اسلحے کچھ مدد کر دے تو کر دے وہ بھی سکا سکا کر جیسا کہ وہ افغانستان کے مجاہدین کے ساتھ کر رہا ہے۔ کھل کر مدد کرے معاملات کو حتمی طور پر طے کرانے کی پوزیشن میں لے آئے وہ اس کی پالیسی نہیں ہے۔ اور کچھ پتہ نہیں کہ امریکہ کی حقیقی پالیسی ہے کیا! ہو سکتا ہے کہ جیسے گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد یالٹا میں بیٹھ کر سپر پاورز کے مابین سودے بازی ہو گئی تھی ایسے ہی پھر یہ سپر پاورز بیٹھ کر کچھ لین دین کر لیں اور افغانستان کو ایک سودے کی حیثیت سے استعمال کر لیں۔ سپر پاورز پر اعتماد کرنا ہماری بہت بڑی نادانی ہے۔ ہمیں تو جو حقیقی مقتدرِ اعلیٰ (Supreme Power) ہے یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ — اس کی مدد

---

[1] یہ خطاب مکمل طور پر میثاق کے مئی ۸۵ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے (مرتب)

درکار ہے۔ اگر ہمیں کوئی سہارا لینا ہے تو اس کا لینا ہے، ہمیں انتہائی قابلِ اعتماد مددگار درکار ہے تو وہ صرف اور صرف اسی کی ہو سکتی ہے: نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ۔

تم اللہ کی مدد کرو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

میں نے عرض کیا کہ اس نسخہ میں اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے دین کے غلبہ اور سربلندی کی جدوجہد ہے۔ گذشتہ جمعہ کو یہ بات میں سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ کے حوالہ سے جس کی میں نے آج بھی آغاز میں تلاوت کی ہے اور سورہ صف کی آخری آیت کی روشنی میں قدرے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ تم اللہ کے دین کو غالب کرنے کی سعی و جہد میں اپنا تن، من دھن لگا دو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر بن جائے گا۔ اسی ضمن میں پچھلی مرتبہ میں دو حدیثیں بھی آپ کو سنا چکا ہوں کہ تم اللہ کے کام میں لگ جاؤ، اللہ تمہارے کام میں لگ جائے گا۔ یہ انفرادی طور پر بھی درست ہے اور اجتماعی سطح پر بھی درست ہے کہ جو شخص آخرت کے ایک مسئلہ میں اپنے تمام تفکرات کو مدغم کر دے تو اس کے دنیا کے سارے مسائل کا سارا ذمہ اللہ لے لیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پورا کرنے میں لگ جائے اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔ جب اللہ کی غیرت کا معاملہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جائے تو وہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے تو جو لوگ اللہ کے دین کے غلبہ کے کام میں لگ جائیں تو ان کے ساتھ اللہ کا معاملہ کیا ہو گا! یہی بات سورہ صف کی آخری آیت اور سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں بیان ہوئی ہے جس کو میں گذشتہ جمعہ کو بیان کر چکا ہوں۔

بعثتِ رسل اور انزالِ کتاب و میزان

آج میں پچھلی گفتگو ہی کو مزید آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ پچھلی مرتبہ میں سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ کی وضاحت کر چکا ہوں۔ آج اسی کی مزید توضیح و تشریح پیش نظر ہے۔ اس آیت مبارکہ کی میں نے آج بھی آغاز میں تلاوت کی ہے کہ: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ "بلاشبہ اور بالتحقیق ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بیّنات کے ساتھ"۔ بیّنات جمع ہے بیّنہ کی۔ بیّن کا لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے، ہم کہتے ہیں کہ یہ بڑی بیّن بات ہے کیوں سمجھ میں نہیں آ رہی ــــ بیّن کہتے ہیں ایسی چیز کو جو بالکل روشن ہو از خود واضح ہو۔ اسے اپنے ثبوت کے لیے کسی اور خارجی شہادت اور دلیل کی احتیاج نہ ہو۔ اس کے لیے فارسی کا مشہور محاورہ ہے بڑا خوبصورت اور مسکت ہے کہ "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

سُورج طلوع ہو جائے تو وہ اپنے وجود پر خود ہی دلیل ہے، آپ کسی اور دلیل سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے تو کوئی شک تو شاید پیدا کر دیں، یقین پیدا کرنا مشکل ہو گا۔

بیّنات سے مُراد

یہاں بیّنات سے مُراد کیا ہے! اس ضمن میں ایک بات تو قطعی ہے کہ اس سے مراد ہیں معجزات ۔ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسُولوں کو معجزات عطا فرماتا رہا ہے۔ یہ اس نوع کا معاملہ ہے جیسے آپ کو دنیا کا یہ رواج معلوم ہے کہ کسی دوسرے ملک کا سفیر جب ہمارے یہاں آتا ہے تو وہ اپنے سفیر مقرر ہونے کی اپنے ملک کی حکومت کی طرف سے جاری کردہ اسناد پیش کرتا ہے۔ اللہ کے رسُول چونکہ اللہ کے سفیر ہوتے تھے، اللہ کے ایلچی ہوتے تھے، اللہ کے پیغامبر ہوتے تھے، انسانوں کے مابین اللہ کی نمائندگی اس زمین پر کرنا ان کا فرضِ منصبی ہوا کرتا تھا، لہٰذا وہ جب رسالت کے منصب پر فائز ہوتے تھے تو اسناد لے کر آتے تھے، ان کی اسناد ان کے معجزات ہوا کرتے تھے، وہ چند ایسی چیزیں دکھاتے تھے کہ جن کے بارے میں قطعی طور پر یقین ہو جاتا تھا کہ یہ کسی انسان کی قدرت کی بات نہیں ہے۔ یقیناً کوئی بالاتر طاقت ہے جس کے حکم سے یہ خرقِ عادت واقعہ ظاہر ہوا، جس کی قدرت سے انسانوں کو عاجز کرنے والا یہ معاملہ ظہور پذیر ہوا، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور یدِ بیضاء۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام، آنجناب کی پھونک میں تاثیر تھی۔ پھر آنجناب کے اور بے شمار معجزات ہیں، یہاں تک کہ خلقِ حیات بھی ہے کہ مٹی سے پرندے کا پُتلا بنایا اور پھونک ماری اور اڑتا ہوا پرندہ ہو گیا۔ احیاءِ موتیٰ بھی ہے قرآن کی گواہی ہے کہ آپ نے اللہ کے حکم سے مردے کو بھی جلایا۔ پھر جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی۔ ایک چٹان میں سے گابھن اونٹنی برآمد ہو گئی۔ تو یہ وہ معجزات ہیں جنہیں کسی بھی قانونِ طبعیہ کے تحت EXPLAIN نہیں کیا جا سکتا، ان کی کوئی بھی سائنٹیفک توضیح ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ معجزات درحقیقت ثبوت ہوتے تھے کہ ان کو پیش کرنے والی نیک سیرت و نیک کردار شخصیتیں کسی بالاتر اقتدار اور بالاتر مقتدر اور کسی قاہر و قادر ہستی کے نمائندے بن کر آئے ہیں۔ لہٰذا معجزات کو قرآنِ مجید میں بیّنات سے تعبیر کیا گیا ہے یہ بات تو قطعی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اعلیٰ ترین بنیادی تعلیمات، براہین، استدلالات اور حکمت جو فطرتِ انسانی کی بالکل جانی پہچانی باتیں ہیں، جو حقائق انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ ہیں۔ جن کو بدیہیاتِ فطرت کہا جاتا ہے۔ وہ مل کر البیّنہ بن جاتی ہیں کہ اگر انسان کی فطرت مسخ نہ ہو گئی ہو۔ اس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہ پڑ گئی ہو تو اس کا دل، اس کی عقل، اس کا شعور، اس کا ذہن پکار اٹھتا ہے یہ چیزیں کسی انسان کی

ذہن کی اختراع نہیں ہوسکتیں۔ ان کا منبع وہ ہستی ہی ہو سکتی ہے جو بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہو اور جو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہو۔ آسمانی الہامی کتابوں میں منطقی استدلال آپ کو بہت کم ملے گا، ملے گا تو ثانوی بلکہ ثالثی درجے میں جاکر کہیں ملے گا۔ رسولوں کی جو اصل تعلیمات ہیں وہ فطرتِ انسانی کی ایسی جانی پہچانی باتیں ہیں کہ کوئی بھی سنے خواہ وہ دہقان ہو، کاشت کار ہو، مزدور ہو، وہ ان پڑھ ہو، وہ عرب کا بدو ہو۔ وہ کوئی عالم فاضل ہو، مفکر اور فلسفی ہو تو اس کا دل گواہی دے کہ یہ حق ہے۔ اس کو بھی 'بیّنات' کہا جائے گا۔

انزال کتاب اور میزان

فرمایا: لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ "اور نازل فرمائی ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ کتاب اور میزان بھی۔" کتاب کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ تورات، انجیل، زبور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابیں ہیں۔ اور الکتاب، مکمل کتاب، آخری کتاب، تا قیام قیامت لفظاً محفوظ رہنے والی کتاب قرآن مجید ہے۔ اس کتاب کے علاوہ میزان ایک دوسری شے ہے۔ سب جانتے ہیں کہ میزان ایک آلہ ہے جس سے وزن کرتے ہیں۔ مفعال کے وزن پر 'وزن' سے 'موزان' بننا چاہیے۔ 'و' بدل گیا 'ی' سے اور میزان بن گیا۔ یہ لفظ اسی معنی میں اردو میں بھی مستعمل ہے۔ میزانِ عدل بھی ہوتی ہے اور میزان وہ بھی ہے جسے دھرم کنڈا بولتے ہیں، ترازو کہتے ہیں۔ الغرض ہر تولنے والی چیز میزان ہے۔ مفہوم یہ ہوا کہ میزان کسی شے کے تولنے اور وزن کرکے تعین کا آلہ ہے۔ یہ المیزان درحقیقت وہ شریعت کا نظام ہے، جس میں سب کے حقوق اور فرائض کو تول دیا گیا ہے۔ کس کی کیا ذمہ داری ہے اور اُسے کیا کرنا ہے اور اس کے کیا حقوق ہیں۔ فرائض وحقوق کا سارا معاملہ ہے۔ اس میں عدم توازن نہیں ہونا چاہیے: أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ "میزان میں زیادتی نہ کرو، حد سے تجاوز نہ کرو اور عدل و انصاف کے ساتھ میزان قائم رکھو اور وزن کو گھٹاؤ نہیں" اگر فرائض وحقوق کی اس میزان میں کچھ ذرا اِدھر اُدھر ہوگیا، مزدور کو اس کا جائز حق نہ ملا اور سرمایہ دار اپنے حق سے سو گنے سے بھی زیادہ لے گیا ع 'انتہائی سادگی سے کھا گیا مزدور مات' والا معاملہ اگر ہو گیا تو ایک وقت آئے گا کہ مزدور سرمایہ داری کے نظام کا تختہ الٹ دے گا۔ تصادم ہوگا اور بڑا خونیں تصادم ہوگا۔ جہاں بھی اس نوع کا انقلاب آیا ہے وہاں بڑا خون ریز انقلاب آیا ہے۔ اگر عورتوں کو ان کے وہ جائز حقوق نہیں دیے گئے جو شریعت ان کو دیتی ہے تو وہی عورتیں پھر سینہ تان کر مقابلے میں

کھڑی ہونگیں اور شریعت کے حدود و قیود سے تجاوز کر جائیں گی ۔۔۔ اصول یہ ہے کہ ہر ظلم کا ایک
رِ عمل ہوتا ہے۔ ظلم کے ردِ عمل کے بارے میں یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ اس ضمن میں قرآنِ حکیم بڑا نرم
ویہ اختیار کرتا ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ: "اللہ تعالیٰ کو یہ بالکل
ند نہیں ہے کہ بُری بات بلند آواز سے کہی جائے سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو" اس کے بارے
یں اللہ تعالیٰ نرمی اختیار فرمائے گا، دکھی دل سے جو صدا نکلی ہو اگر اس میں کچھ تلخی بھی ہو، اس میں اگر
داب اور حدود و قیود کا پاس نہ رکھا جا سکے تو بھی اللہ تعالیٰ اس کے معاملہ میں نرمی برتے گا جس کے
ساتھ ظلم ہوا ہو۔ تو اس سے اندازہ کر لیجیے کہ جہاں بھی ظلم ہو گا وہاں جلد یا بدیر اس کا ردِ عمل ہو گا۔

الصراط المستقیم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ زمین پر نقشہ کھینچ کر ایک بڑی پیاری اور پُر حکمت بات سمجھائی۔ آپؐ نے ایک سیدھا خط کھینچا پھر اس کو کاٹنے والے آڑے ترچھے خطوط کھینچے، ایک دائیں سے آیا اور اس کو کاٹتا ہوا بائیں کو چلا گیا، ایک بائیں سے آیا اس کو کاٹتا ہوا دائیں کو چلا گیا، یہ جو حضورؐ نے نقشہ کشی فرمائی تو عجیب طریقے سے آپؐ نے تمدن کا جو نظام چلتا ہے اور جس طریقے سے افراط و تفریط کے دھکوں سے نوعِ انسانی کو دوچار ہونا پڑتا ہے، اس کی نہایت قابلِ فہم اور بہترین تصویر کشی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ۔۔۔ سیدھا خط تو وہ صراطِ مستقیم ہے جو صرف اللہ دے سکتا ہے کسی اور کے بس میں ہے ہی نہیں، وہ ہدایت، وہ صراطُ السوی، وہ سَواءُ السبیل تو ظاہر بات ہے کہ وہی ہستی دے سکتی ہے کہ جو بالکل غیر جانب دار ہو۔ سرمایہ دار نظام بنائے گا تو مزدور کو پیسے گا، اس کے حقوق کو پامال کرے گا اپنے مفادات کا تحفظ کرے گا، مزدور نظام بنائے گا تو سرمایہ دار پر ظلم کرے گا اپنے حقوق کا زیادہ سے زیادہ پاس رکھے گا۔ آپ کی پارلیمنٹ میں زمیندار اکثریت میں ہوں گے جیسے کہ عموماً ہوتے ہیں تو وہ جو نظام بنائیں گے ظاہر بات ہے کہ وہ کسانوں کو ان کے جائز حقوق دینے سے رہے، آپ ان سے یہ توقع نہ رکھیں وہ تو اپنے مفادات کا تحفظ کریں گے۔ اور اگر کہیں کسان برگشتہ ہو گئے اور REVOLT میں کھڑے ہو گئے تو وہ جو زیادتیاں کریں گے۔ ان کا اندازہ بہت سے ممالک کے حالات و واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اگر عورتوں کے ہاتھ میں اختیار آ گیا تو وہ تو وہ نظام بنائیں گی جو کسی زمانہ میں قلوپطرہ نے بنایا تھا۔ پس دنیا میں افراط و تفریط کا یہ معاملہ ہوتا رہے گا۔ مبنی بر عدل و قسط و انصاف نظام تو صرف وہ ہستی بنا سکتی ہے جو قطعاً غیر جانب دار ہو۔ وہ ہستی کون

ہو سکتی ہے۔ اسوائے اللہ کے ایسی کوئی دوسری ہستی ہے ہی نہیں۔ لہٰذا صراط مستقیم دینے والا صرف ایک ہے اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اسی لیے ہم اُسی سے نماز کی ہر رکعت میں مانگتے ہیں:
اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ٥

میدانِ حشر کا الصراط

اب اس صراط المستقیم کو یوں سمجھئے کہ یہ اس دنیا میں تو وہ راہِ ہدایت ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے میں انسان کی عافیت ہے۔ اس کے بعد میدانِ حشر میں یہی 'پل صراط' ہو جائے گا یعنی الصراط۔ پھر یہی ہو گا جو جنت یا جہنم میں پہونچا دیگا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے تو جیسے وہ پل صراط ہے تو حقیقت میں اس دنیا میں بھی یہ صراطِ مستقیم بہت باریک ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں متضاد تقاضوں اور متصادم مفادات کے مابین جب آپ توازن قائم کریں گے تو وہ توازن بہت باریک ہو گا ؎

لو سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت یہ کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری میں

ذرا سا عدم توازن اِسے درہم برہم کر دے گا اس لیے کہ ہر قدم پر متضاد و متصادم تقاضے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جیومیٹری میں خط کی کیا تعریف ہے! آپ لائن کسے کہتے ہیں! خط وہ ہے جس کی صرف ایک DIMENSION ہے، صرف طول LENGHT ہے، عرض BREDTH کوئی نہیں۔ اگرچہ ممکن نہیں۔ آپ باریک ترین پنسل سے بھی خط کھینچیں گے تو آخر اس کی کچھ نہ کچھ چوڑائی ہو گی۔ لیکن نظری طور پر خط اسی کو کہتے ہیں جس کا عرض کوئی نہ ہو۔ ایسے ہی نقطہ اُسے کہتے ہیں جس کی سرے سے کوئی DIMENSION ہے ہی نہیں۔ اُسے خالص نظری شے مانا جاتا ہے حالانکہ آپ باریک سے باریک پنسل سے بھی جب نقطہ لگائیں گے تو وہ ہو گا تب ہی تو نظر آئے گا نہ ہو گا تو نظر کہاں سے آجائے گا! لیکن نقطہ کو نظری شے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح خط کی صرف ایک DIMENSION مانی جاتی ہے اور وہ طول ہے اس کا عرض کوئی نہیں۔ بعینہٖ یہ معاملہ صراطِ مستقیم کا ہے اور اس دنیا کا یہی صراطِ مستقیم حشر کے میدان میں الصراط بنے گا جسکو سمجھانے کے لیے ہمارے واعظین کہا کرتے ہیں کہ "پل صراط" بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔

غلط راستوں کی بھول بھلیاں

اب ہوتا کیا ہے! یہ کہ جو غلط راستے ہیں، دائیں بائیں سے آتے ہیں، اور یہ ہمیشہ آئیں گے

الصراط کی طرف۔ اس لیے کہ فطرتِ انسانی مجبور کرتی ہے کہ کہاں جا رہے ہو! فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ تم کدھر جا رہے ہو لوٹو ـــ وہ لوٹتے ہیں وہ الصراط تک آئیں گے لیکن چونکہ آنکھیں کھلی ہوئی نہیں ہیں کہ جان لیں کہ ہم الصراط پر آگئے بلکہ ع "شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برگ"، کے مصداق وہ اپنے اُسی زورِ حرکت میں (MOMENTUM) اس صراطِ مستقیم کو عبور کر جاتے ہیں، جو دائیں سے چلے وہ بائیں کو نکل گئے اور جو بائیں سے چلے وہ دائیں کو نکل گئے۔ سب کاٹیں گے اسی صراطِ مستقیم کو، لامحالہ آئیں گے اسی کی طرف۔ پھر ایک مقام تک پہونچ کر انہیں ہوش آئے گا کہ ہم یہ کیا حماقت کر بیٹھے ہیں، ہم تو ایک غلط انتہا تک آ گئے، پھر وہ صراطِ مستقیم کی طرف مراجعت کریں گے۔ وہ مقناطیس ان کو اپنی طرف کھینچے گا ـــــــ اس میں کشش ہے۔ اس لیے کہ وہ فطرت کا راستہ ہے۔ اُس سے بہت دور جا نہیں سکتے۔ دائیں بائیں جائیں گے پھر لوٹیں گے لیکن اُس صراطِ مستقیم پر رُک نہیں سکتے ہیں۔ پھر اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔ اسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نقشہ سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو سمجھایا کہ صراطِ مستقیم تو بالکل سیدھا راستہ ہے، دائیں بائیں نکل جانے والے راستے درحقیقت ترغیباتِ دنیا ہیں خواہشاتِ نفس ہیں اور شیطانی اغوا ہے ان کے باعث انسان افراط و تفریط کی پگڈنڈیوں میں بھٹکتا اور ٹھوکریں کھاتا ہے۔ یہ ہیں وہ غلط راستے جو دنیا میں تمدنی ارتقا کی بدولت بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اب ان حالات میں وہ میزان نصب کرنی ہے جو صحیح صحیح تول کر بتا دے کہ کس کے فرائض کیا ہیں اور حقوق کیا ہیں! تو یہاں تک تین چیزوں کا بیان ہوا جو اللہ نے نازل فرمائیں: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ۔

ارسالِ رُسل اور انزالِ کتاب و میزان کی غایت

اس سے آگے ہے وہ کانٹے کی بات: لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ "تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔" یہاں حرفِ جار لام، لامِ غایت ہے۔ آیتِ کریمہ کے اس حصہ میں بیّنات کے ساتھ رسولوں کی بعثت اور ان کے ساتھ انزالِ کتاب و میزان کی غرض و غایت کو انتہائی بلاغت و فصاحت سے بیان فرمایا گیا ہے کہ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ـــ اس سلسلۃ الذھب کا اصل مقصد ایک ایسے اجتماعی نظام کا قیام و نفاذ ہے جس کے ذریعہ سے لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔ اللہ کی نازل کردہ میزان نصب ہو تاکہ اس میں انسان کے حقوق و فرائض کو تولا جائے۔ میزان کے نصب کرنے کا فائدہ تو تب ہی ظاہر ہوگا جبکہ اس سے تولنے کا کام لیا جائے۔ اگر اس میزان سے تولنے کا کام نہ لیا جائے بلکہ اس کے برخلاف کسی کو خوب ہاتھ کھول کر دیا جائے کسی کو مٹھی بھر دیدیا جائے کسی کو خالی ہاتھ ٹرخا دیا جائے۔

س "میزان" کا کیا فائدہ ہے؟ اس کا حقیقی فائدہ تو تب ہی حاصل ہوگا جب اسے نصب بھی کیا جائے، جس کو جو کچھ ملے، اس میزان ہی سے تُل کر ملے۔

المیزان ـــــ نظامِ عدل وقسط

اب ظاہر بات ہے کہ اس میزان کو نصب کرنے میں کون رکاوٹ ڈالے گا؟ رکاوٹ وہ لوگ ڈالیں گے جو اپنے حق سے زائد لے رہے ہیں یہ بالکل فطری بات ہے۔ لیکن جب عدل ہوگا تو جنہوں نے اپنے حق سے زائد لیا ہے، ان سے وصول کیا جائے گا اور جو محروم ہیں انہیں دیا جائے گا: فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ۝ اور اگر وہ اپنی مرضی سے نہیں دیں گے تو زبردستی لیا جائے گا۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ زکوٰۃ کے لیے فرمایا گیا کہ جبر سے لی جائے گی۔ خلافتِ صدیقی میں انکار کیا گیا تو انکار کرنے والوں کو مرتد قرار دیا گیا اور ان کے ساتھ قتال کیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح فرمان ہے: تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآءِهِمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَآئِهِمْ۔

انزالِ حدید ـــــ اس کی غایت

پس یہ ہے میزان۔ اس کو نصب کرنے میں جو لوگ اڑے آئیں، ٹھیک ہے کہ پہلے انہیں دلیل سے سمجھاؤ، برہان سے سمجھاؤ، ان کو قائل کرو۔ ان میں کچھ شریف لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جو تسلیم کرلیں، کچھ لوگ ایسے ہو سکتے ہیں کہ جن کی سوئی ہوئی انسانیت جاگ جائے۔ لہٰذا دلیل سے، برہان سے، اپیل سے، افہام سے، تفہیم سے، دعوت سے، تبلیغ سے اتمام حجت کر دو۔ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں پہلے بات سمجھائی تو ہوتی! اتم تو فوراً ہی ڈنڈا لے کر سر پر مسلط ہو گئے، تم نے پہلے ہمیں سمجھایا تو ہوتا۔ ہمارے مغالطوں کو دور کرنے کی کوشش تو کی ہوتی۔ ہماری آنکھوں کے پردے کچھ ہٹائے تو ہوتے۔ لہٰذا پہلے سے ایسے تمام عذرات کو رفع کرنے کی بھرپور کوشش ہو، اتمام حجت ہو جائے، پھر بھی اگر وہ اڑے رہیں اور لاتوں کے بھوت اگر باتوں سے نہ مانیں تو پھر طاقت استعمال کرو۔ چنانچہ آگے فرمایا وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے جس سے اسلحہ بنتا ہے، جس میں جنگ کی صلاحیت ہے اور بڑی شدید صلاحیت ہے: بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ۔ اور اس لوہے میں لوگوں کے لیے دوسرے منافع بھی ہیں، جن کے متعلق میں عرض کیا کرتا ہوں کہ تمدن کے فائدے کی بے شمار چیزیں اس لوہے سے بنتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس لوہے کے نزول کا جو اصل مقصد ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ بھی اس میزانِ خداوندی کو نصب کرنے کے لیے سر سے کفن باندھ لیں اور اس کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے آمادہ ہو جائیں وہ اس لوہے کی طاقت کو استعمال کریں اور

ان لوگوں کی سرکوبی کریں جو اس راہ میں رکاوٹ بنیں۔

ایمان کی کسوٹی

اسی آیت میں آگے ارشاد ہوتا ہے: وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ "اور اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہے جو مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی اللہ سے غیب میں رہتے ہوئے" ——— یہی اصل میں اس نے اپنے بندوں کی وفاداری کا ایک معیار معین فرمایا ہے کہ جو اس کے دین پر ایمان لائے ہوں جو اس کے رسولوں کو مانتے ہوں، جو اس کی کتابوں پر یقین رکھتے ہوں، وہ اس کی نازل کردہ میزان کو نصب کرنے کے لیے اپنا تن من دھن لگا دیں تو وہ ہیں اس کے وفادار بندے ——— اور یہ ہیں وہ لوگ جن سے کہا گیا: كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ "اللہ کے مددگار بنو" ——— سورہ حدید کی زیر گفتگو آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر: اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ "بے شک اللہ قوی ہے زورآور ہے زبردست اور غالب ہے" یعنی اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کی راہ میں اور اللہ کی نازل کردہ میزان نصب کرنے کی تعلیم و ترغیب اس لیے نہیں دی جا رہی کہ معاذ اللہ وہ تمہاری مدد کا محتاج ہے۔ اس القوی العزیز کو تمہاری مدد کی کیا حاجت! البتہ تمہاری وفاداری کا امتحان مقصود ہے تاکہ جو بندے اس میں کامیاب ہوں ان کو وہ فوز و فلاح سے ہم کنار فرمائے۔ یہ ہے سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ کا حاصل ——— اور میں آپ سے یہ عرض کر دوں کہ یہ آیت مبارکہ واقعتاً قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں سے ہے۔

جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی امتیازی شان

اب ذرا اس سے آگے چلئے۔ اس آیت مبارکہ کا اسلوب عمومی انداز (Generalization) کا ہے۔ ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر اس میں رسولوں کی بعثت کا مقصد، ان کو معجزات دیئے جانے کا مقصد، کتاب و میزان اور حدید یعنی لوہے کے نزول کا مقصد بیان ہوا ہے۔ یہی مفہوم یہی مضمون معین طور پر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے امتیازی مقصد کے ذکر کے طور پر قرآن حکیم میں تین جگہ آتا ہے۔ وہاں الفاظ میں حضورؐ کی یہ امتیازی شان نہایت نکھر کر اور واضح ہو کر آئی ہے، یہ مضمون خوب ابھر کر آیا ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ ——— اب یہاں رسول واحد ہے۔ وہاں کیا تھا لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا ——— وہاں رُسُل جمع کا صیغہ تھا۔ یہاں رسول واحد کے صیغہ میں آیا۔ ترجمہ ہوا "وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول کو (صلی اللہ علیہ وسلم)" بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ ———

الھدیٰ اور دین الحق کے ساتھ" — وہاں کیا تھا! تین لفظ بِالْبَیِّنٰتِ اور : وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ ۔ نوٹ کرنے کی بات ہے یہ بڑا اہم نکتہ ہے کہ یہاں آکر دو چیزیں رہ گئی ہیں۔ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ ۔ اس کی وجہ کیا ہے! یہاں بینات اور کتاب، جمع ہو گئی ہیں " الھدیٰ" میں" اس لیے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل معجزہ قرآن مجید ہی ہے۔ ویسے حضورؐ کے حسی معجزات بھی ہیں اور خرقِ عادت اور کرامات کے واقعات تو بہت زیادہ ہیں لیکن آپؐ کا محسوس و مشہور اور تا قیامِ قیامت موجود رہنے والا معجزہ قرآن مجید ہے، جس میں چیلنج کیا گیا ہے جس میں تحدی ہے اور یہ اُس دور کے خطباء، ادباء، شعراء کے لیے نہیں تھی بلکہ قیامت تک کے لیے ہے، وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا " اور اگر تم شک میں ہو اس کلام کے بارے میں جو اتارا ہے ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اِس جیسی اور بلا لو ان کو جو تمہارے مددگار ہوں اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو، پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز نہ کر سکو گے"، فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۔ (البقرہ) سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا کہ اے نبی فرما دیجئے کہ تم اس کتاب کا مقابلہ نہیں کر سکو گے چاہے انس و جن مجتمع ہو کر کوشش کریں کہ اس جیسا قرآن لائیں ہرگز نہیں لا سکیں گے چاہے ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں"۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ اس سے بھی نیچے اتریں، اسے کہتے ہیں بر سبیل تنزل — "تم کہتے ہو کہ معاذ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن گھڑ لیا ہے تو چلو پورے قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ"؛ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ ۔" کیا یہ کہتے ہیں کہ اے نبی تم بنا لائے ہو اس قرآن کو؟ ان سے کہہ دو کہ تم بھی ایسی دس سورتیں ہی بنا کر لے آؤ"۔ یہ سورہ ہود میں فرمایا گیا کہ ایک سو چودہ نہیں دس سورتیں تو اس جیسی تصنیف کر کے دکھا دو — اتمام حجت کے طور پر معاملہ اور نیچے اترا بر سبیل تنزل — یہ سورہ یونس میں ہے ۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ — بنی اسرائیل، ہود اور یونس یہ مکی سورتیں ہیں، مدنی دور میں پھر اس چیلنج کا، اس تحدی کا اعادہ کیا گیا، وہ آیت میں آپ کو سنا چکا ہوں — تو یہ ہے وجہ کہ یہاں بینات اور کتاب کو' الھدیٰ' میں جمع کر دیا گیا اور تمام مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہاں الھدیٰ سے مراد قرآن مجید ہے۔ لہٰذا یہاں البینہ اور الکتاب کو' الھدیٰ' کا نام دے دیا گیا — اور حضورؐ کے ساتھ دوسری چیز کیا بھیجی گئی : دین الحق — اس لیے

کہ وہ میزان اب ایک مکمل نظام کی شکل میں آگئی۔ میں اس مسئلہ پر کئی مرتبہ تقاریر میں بھی عرض کر چکا ہوں اور میرا جو ایک کتابچہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت" کے نام سے موجود ہے۔ اس میں میں نے اس بات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ چونکہ انسانی تمدن کئی ارتقائی مراحل سے گزرا ہے۔ کبھی محض قبائلی نظام تھا۔ پھر اس سے آگے چل کر شہری ریاستیں (CITY STATES.) قائم ہوئیں۔ پھر بڑی سلطنتیں (EMPIRES) قائم ہوئیں۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ عمرانیات میں ریاست (STATE) کا تصور کچھ ہے اور حکومت (GOVERNMENT) کا تصور کچھ اور ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس ارتقاء کی مناسبت سے احکام بھی ارتقائی منازل سے گزرتے رہے۔ ابھی تمدن کی بے شمار پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوئی تھیں لہٰذا فرائض و حقوق کے توازن کے لیے موٹے موٹے احکام کافی تھے۔ معاملہ ذرا آگے بڑھا تو اُسی مناسبت سے تفصیلی احکام دے دیئے گئے۔ لیکن جس دور میں تمدنِ انسانی اپنے عروج کو پہونچنے والا تھا اور ایک مکمل اجتماعی نظام کا تصور سامنے آنے والا تھا تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو 'دین الحق' دے کر بھیجا گیا۔ یہ دینِ حق ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ زندگی کے جملہ انفرادی و اجتماعی گوشوں پر محیط نظام کو کامل کر دیا گیا جناب محمد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ یہ گویا میزان کی تکمیلی شکل ہے۔

اسی لیے قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کی اس امتیازی شان کو ایک شوشہ کی تبدیلی کے بغیر تین مقامات، سورہ توبہ، سورہ فتح اور سورہ صف میں بایں الفاظ فرمایا گیا: هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ "وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسُول کو الھدیٰ اور دینِ الحق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اس کو کُل کے کل دین (نظام اطاعت) پر"۔ اس آیت مبارکہ پر متعدد بار گفتگو ہوئی ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس پر میرا ایک مضمون بھی کتابی شکل میں موجود ہے لہٰذا میں اس کی مزید تشریح کی طرف نہیں جاؤں گا۔ جن کو دلچسپی پیدا ہوئی ہو ان سے عرض ہے کہ میرے اس کتابچہ کا مطالعہ فرمائیں ــ یہاں جس نکتہ کو مجھے واضح کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ظاہر بات ہے کہ نظامِ حیات کی حیثیت سے دینِ حق کو غالب کرنے کے مراحل تو وہی ہوں گے جو کسی انقلابی نظریہ اور فلسفہ کے مطابق اجتماعی نظام کو یکسر بدلنے کے ہوتے ہیں، جن کے تکمیلی مراحل میں آخری مرحلہ ہے مسلح تصادم۔ تکمیلی مراحل میں اقدام سے لے کر جہاد و قتال سب ہی شامل ہیں۔ سورہ صف کا مرکزی مضمون ہی جہاد و قتال ہے۔ اس سورہ مبارکہ کی چوتھی آیت ہے اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ "بے شک اللہ کو تو اپنے وہ بندے محبوب ہیں جو جنگ کرتے

اس کی راہ میں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں" ــ سورہ حدید کی آیت میں جو "وَاَنْزَلْنَا
الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ" کے الفاظ مبارکہ آئے تھے یہ آیت گویا کہ ان الفاظ کی شرح ہے۔ تو
قتال سے سورہ صف شروع ہوئی ہے لیکن آگے چل کر جہاد کی اہمیت بیان فرمائی ہے تُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ۔ کسی دعوت کے آغاز ہی میں
قتال شروع نہیں ہو جاتا۔ یہ تو جہاد کی بلند ترین چوٹی ہے۔ البتہ جہاد بالکل آغاز ہی سے شروع
ہو جاتا ہے۔ مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا وہ قتال نہیں تھا جہاد تھا۔ جدوجہد،
کشمکش، دعوت، تبلیغ، اس کے نتیجہ میں تنظیم، پھر تربیت و تزکیہ نیز تعلیم اور صبر محض کی تلقین
ــ یہ تمام کام بارہ برس تک مسلسل ہوتے رہے، یہ تمام کام جہاد کے ذیل میں آئیں گے۔ اگرچہ قتال
کا مرحلہ مدینہ میں جاکر شروع ہوا ہے۔ پس جہاد و قتال بر حق و باطل کے مابین کشمکش و کشاکش کے مراحل
ہیں اس کو میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، اس ضمن میں اس وقت اس بات کو نوٹ کر لیجئے کہ اسی
کشمکش، اسی جہاد، اسی سعی و جہد کو سورہ صف کی آخری آیت میں نصرت سے تعبیر کیا گیا: یٰٓاَیُّھَا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی
اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔ یہ ہے وہ نصرتِ الٰہی جہاں سے ہماری آج کی گفتگو
شروع ہوئی تھی۔

الھدیٰ اور دین الحق کے معانی و مفاہیم

اب میں تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اظہار دین الحق کا ایک مفہوم جو بہت سے علماء کرام
اور مفسرین عظام نے بیان کیا ہے وہ ہے دینِ حق کا علمی غلبہ ــ استدلالی غلبہ۔ دنیا کے بقیہ جتنے بھی نظام
ہائے حیات ہیں ان کا کوئی نہ کوئی فلسفہ اور نظریہ ہے۔ کوئی نہ کوئی اصول و مبادی ہیں، جن پر کوئی نظام
قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا ان سب پر اسلام کے دین حق ہونے کی علمی، فکری اور استدلالی طور پر فوقیت ثابت
کرنا، یہ ہے اظہار دین الحق علی الدین کلہ کا مفہوم و مقصود بہت سے علماء کرام اور مفسرین عظام کے نزدیک
ــ ایک اعتبار سے بات صحیح ہے کہ جب تک دنیا کے دوسرے نظریات، اصول و مبادی اور فلسفوں
پر اسلامی نظام کے فلسفہ اور اصول و مبادی کا غلبہ نہ ہو، بالفعل دینِ حق کے غلبہ کا بھی امکان نہیں ہے۔
یوں سمجھئے کہ یہ تو اس کی بنیادی شرط (PREREQUISITE) ہے۔ اس کے بغیر دینِ حق کا غلبہ نہیں ہو
سکتا ــ لیکن اس ضمن میں، میں اپنے حقیر مطالعہ اور غور و فکر کے نتیجہ میں قائم کردہ اپنی ذاتی رائے پیش کر رہا
ہوں کہ اصل میں اس کا تعلق "الھدیٰ" سے ہے۔ درحقیقت الھدیٰ یعنی قرآن حکیم علمی اور استدلالی غلبہ

کی اساس و بنیاد ہے علمی، فکری اور استدلالی غلبہ، الحدید یعنی اسلحہ کی قوت اور قتال کے ذریعہ سے نہیں ہوتا۔ سورہ حدید میں جو الحدید اور سورہ صف میں جو قتال کے الفاظ آئے ہیں، وہ علمی غلبہ کے لیے نہیں ہیں۔ وہ تو عبارت ہیں اسلام کو ایک دین، ایک نظام حیات کی حیثیت سے غالب کرنے سے ۔۔۔ اس کو نظر انداز کر دینا درست نہیں ہے۔ ہمارے یہاں یہ کچھ نظر انداز ہوا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے! یہ کہ تمام تفاسیر کب لکھی گئیں! جبکہ مسلمانوں کی حکومت قائم تھی۔ جبکہ اسلامی قانون نافذ تھا۔ چاہے وہ دور بنو امیہ کا ہو چاہے وہ دور بنو عباس کا ہو۔ بلکہ تفاسیر، تدوینِ حدیث، تدوینِ فقہ، مغازی اور دیگر علوم کی ترتیب و تدوین کا اکثر و بیشتر کام دور بنو عباس میں ہوا ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دورِ بنو امیہ میں ان کاموں کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ وہ ادوار ہیں کہ ان میں اگرچہ تشکیل حکومت کی سطح پر گڑبڑ ہو گئی تھی اور عوامی و شورائی خلافت کے بجائے موروثی "خلافت" چل رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے نامزد "خلفاء" کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اگرچہ ان میں چند متقی و متدین لوگ بھی تھے لیکن اکثر و بیشتر کا کردار دنیادارانہ تھا جیسے دنیا میں دوسرے بادشاہ تھے۔ ویسے ہی یہ "خلفاء" بھی تھے۔ بعض پہلوؤں سے بہتر ہوں گے لیکن اکثر بیت کے محلوں میں وہی کچھ ہوتا تھا جو دنیا میں دوسرے بادشاہوں کے محلات میں ہوتا ہے۔ تو اوپر کی سطح پر گڑبڑ ہو گئی تھی۔ لیکن بہرحال ایسے بھی باہمت لوگ اٹھتے رہے جنہوں نے اس اوپر کی سطح کی گڑبڑ کو بھی چیلنج کیا اور اس کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی کوششوں میں اپنی جانیں دیدیں، اپنی گردنیں کٹوا دیں۔۔۔ معاملہ ذرا ایک قدم نیچے آ رہا تھا کہ حضرت حسین ابنِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما میدان میں آ گئے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما میدان میں آ گئے تھے۔ ان کو کوئی غلط نہیں کہہ سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ وہ ابھی اقدام نہ کرتے بلکہ پہلے تنقید کرتے، اصلاح کی کوشش کرتے۔ رائے عامہ کو ہموار کرتے۔ پھر اقدام کرتے۔۔۔ یہ دوسری بات ہے لیکن یہ بات کہ ان حضرات والا قدر کا اقدام خلاف اسلام قرار دیا جا سکتا ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔۔۔ اس کا کوئی تصور ہم نہیں کر سکتے۔ یہ معاملہ بالکل علاحدہ ہے۔ لیکن بالفعل قانونِ شریعت کا نفاذ ہے، حدود اللہ کی تنفیذ ہو رہی ہے۔ فقہاء ہیں، مفتیانِ کرام ہیں۔ قاضی حضرات ہیں شرعی عدالتیں ہیں۔ شریعت کے مطابق کام چل رہا ہے۔۔۔ اس اعتبار سے اب جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ اکثر و بیشتر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور جو چیز کسی وجہ سے حاصل نہیں ہوتی تھا ہیں اس پر جم جاتی ہیں۔ یہ اصل سبب ہے کہ متقدمین کی اکثر تفاسیر میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس آیتِ مبارکہ کے ان الفاظ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کی تشریح میں صرف علمی غلبہ کا ذکر کر کے رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز حاصل ہے اس کا ذکر کرنا اور اس پر زور دینا غیر ضروری ہے۔ اس کو منطق میں کہتے ہیں تحصیل حاصل

ر چیز آپ کو حاصل ہے اس کو حاصل کرنے کی آپ کوشش کر رہے ہیں یہ فضول کام ہے، یہ انسان طری کمزوریوں میں سے ہے کہ جو چیز ہمیشہ آپ کے سامنے ہوگی اس طرف دھیان نہیں جائے گا۔ پ کا تجربہ ہوگا کہ اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں ہوتی۔ لیکن کوئی نئی چیز ہوگی تو وہ فوراً آپ کی توجہ پنی طرف مبذول کرے گی۔ پس جو چیز دوام کے ساتھ سامنے رہتی ہو، اس کی طرف سے ذہول ہو ہے، اور جو نئی چیز سامنے آتی ہے اس کی طرف توجہ کا ارتکاز ہوتا ہے۔ اس باعث ہمارے ندین نے اظہار دین الحق کی تشریح وتفسیر میں اس سے علمی، نظری، فکری غلبہ مراد لیا ہے۔ بات اپنی جگہ ل صحیح ہے۔ علمی غلبہ کے بغیر نظام کے غلبہ کا امکان ہی نہیں ہے لہذا یہ تو شرطِ لازم ہے۔ دلیل و برہان ے میدان میں اگر آپ باطل کو شکست نہیں دیں گے تو میدانِ جنگ میں بھی آپ اس کو شکست نہیں دے یں گے۔ وہ پہلی شرط ہے۔ لہذا علمی و فکری غلبہ کا معاملہ بھی اپنی جگہ نہایت اہم ہے بلکہ نظام کے غلبہ ے لوازم میں سے ہے۔

قرآن کے مخاطبینِ اوّل

میں اپنی اس رائے کے حق میں کہ علمی و فکری غلبہ کا تعلق دین الحق سے نہیں بلکہ الھدٰی یعنی قرآن مجید سے ہے مزید کچھ باتیں عرض کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آغازِ وحی کے وقت عرب میں تین گروہ آباد تھے، جو قرآنِ حکیم اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوّلین مخاطب تھے۔ پہلا گروہ تھا مشرکین عرب کا۔ عام طور پر انہیں بنو اسمٰعیل کہہ دیا جاتا ہے لیکن وہ سب کے سب بنو اسمٰعیل نہیں تھے۔ ان میں دوسرے قبائل بھی تھے، جیسے مدینہ کے انصار کے اوس وخزرج کے قبائل یمنی تھے، وہ بنو اسمٰعیل میں سے نہیں تھے۔ مکہ میں قریش کا قبیلہ بنو اسمٰعیل میں سے تھا۔ حاصل یہ کہ عرب کے جملہ قبائل کو بنو اسمٰعیل میں شامل سمجھ لیجئے اگرچہ ماہرانہ رائے کے بموجب عرب کے اصل قدیم باشندے ان کو بھی نہیں مانا جاتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل وطن عرب نہیں تھا، وہ تو عراق کے رہنے والے تھے۔ ان کا مولد شہر اُر سلطنت کلدانیہ کا صدر مقام تھا۔ پھر آنجنابؑ کی زندگی کا اکثر وبیشتر حصہ ہجرت کے بعد فلسطین میں گزرا ہے۔ حجاز میں تو آپؑ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو آباد کیا تھا: رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ لہذا ان کو عربِ مستعربہ کہا جاتا ہے۔ یہ عرب بن گئے تھے، اصل عرب نہیں تھے۔ اہلِ یمن کے قبائل مدینہ کے اوس وخزرج کے قبائل اور عرب کے مختلف علاقوں میں بسنے والے اکثر قبائل اصل اور قدیم عرب ہیں، انہیں عرب عاربہ کہا جاتا ہے۔ بہرحال ایک گروہ تو ان عربوں کا تھا

ہ وہ عرب عاربہ ہوں یا عرب مستعربہ ۔ یہ تو اکثر و بیشتر مشرکین تھے ۔ دوسرا گروہ یہود کا تھا۔ مدینہ
ہ کا بڑا مضبوط گڑھ تھا۔ وہاں تین قبیلے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ آباد تھے۔ یہ تینوں کافی خوش
ل قبیلے تھے، اور ان کی اہل یثرب پر (ہجرت کے بعد جو مدینۃ النبی کہلایا اور اب مدینہ منورہ کہا جاتا
ہے) معاشی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ذرا شمال میں خیبر خالص یہودیوں کی بستی تھی، اس میں کئی مضبوط
ڑھیاں (چھوٹے قلعے) بنے ہوئے تھے۔ پھر نجران کے علاقہ میں نصاریٰ کثیر تعداد میں آباد تھے۔ یمن میں
انی طویل عرصہ تک عیسائیوں کی حکومت رہی ہے وہ اس لیے کہ یمن کے بالکل مقابل سمندر پار حبشہ کا ملک
تھا۔ جہاں عیسائی حکومت اس وقت بھی موجود تھی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے۔
البتہ اس وقت یمن سلطنت کسریٰ یعنی ایران کے ایک مقبوضہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

مشرکین عرب پر علمی غلبہ

لہٰذا یہ تین گروہ، یہ تین طبقات تھے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت کا آغاز فرمایا۔ اب آپ دیکھئے کہ کیسے قرآن نے سب سے پہلا تو علمی، فکری یا فنی غلبہ اس دعویٰ کے ساتھ حاصل کیا کہ آؤ اس قرآن کا مقابلہ کرو۔ یہ پہلا غلبہ ہے۔ اس دعویٰ اور اس چیلنج کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا۔ جھوٹ موٹ کو بھی کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ کھڑا ہو جاتا کہ دیکھو میں مقابلے کا قرآن لے آیا ہوں ۔۔۔ اس شرافت کی ان مشرکین مکہ کو داد دینی چاہیئے۔ ان کے اندر یہ شرافت موجود تھی۔ مثلاً حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا اس دور کا مشہور واقعہ ہے جبکہ وہ ایمان نہیں لائے تھے، اس وقت جب قیصر روم کے پاس نبی اکرمؐ کا دعوتِ اسلام کا نامہ مبارک پہنچا ہے تو اس نے پتہ کیا کہ فی الوقت عرب سے کوئی قافلہ آیا ہوا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ ابوسفیان ایک قافلہ لے کر غزہ آئے ہوئے ہیں جو قبیلہ کے سردار بھی ہیں، چنانچہ ان کو غزہ سے یروشلم (بیت المقدس) بلوایا گیا چونکہ ان دنوں قیصر روم یروشلم آیا ہوا تھا اور وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا معاملہ ہے! یہ کون صاحب ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور دعوتی خط بھیجا ہے، ہرقل قیصر روم ہونے کیساتھ ساتھ کتب سماوی تورات، زبور، انجیل کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے نامہ مبارک ہی سے پہچان لیا تھا کہ جن نبی آخر الزمان کی پیشین گوئیاں ان کتابوں میں موجود ہیں ان کا ظہور ہو گیا ہے اور ہو نہ ہو یہی وہ نبی ہیں۔ لیکن چاہتا یہ تھا کہ صرف میں ہی ایمان نہ لاؤں، میرے جو اعیان و عمائدینِ مملکت ہیں، جو میرے سپہ سالار ہیں، میرے دربار میں جو بڑے بڑے رہبان و احبار ہیں، جن کے ستون پر میری حکومت قائم ہے، وہ سب بھی ایمان لے آئیں تاکہ ہمارا نظام برقرار رہے۔ اگر میں اکیلا ایمان لے آیا تو مجھے تو یہ لوگ تخت سے اٹھا پھینکیں گے، پس حکومت

اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ اس نے اسی خیال سے ابوسفیان کو بھرے دربار میں بلایا تاکہ سوال وجواب کے ذریعہ سے حقیقت حال تمام درباریوں پر منکشف ہو جائے۔ اب وہ ابوسفیان کو اپنے سوالات کے ذریعہ سے بے بس کرتا چلا جا رہا ہے تاکہ واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضورؐ سچے نبی اور رسول ہیں۔ پوچھتا ہے کہ انہوں نے دعویٰ نبوت سے پہلے کبھی جھوٹ بولا؟ ابوسفیان کا جواب تھا نہیں۔ پھر پوچھتا ہے کہ کیا ان کے خاندان میں کبھی حکومت رہی ہے؟ وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اگر کوئی خاندانی بادشاہ ہو تو وہ چھنی ہوئی حکومت حاصل کرنے کے لیے بھی کوئی ہتھکنڈہ کر سکتا ہے۔ ابوسفیان نے جواب دیا نہیں کبھی حکومت نہیں رہی۔ اس نے پوچھا کہ کیا ان کی طرف سے کوئی وعدہ خلافی ہوئی ہے ابوسفیان کا جواب تھا نہیں۔ ایک ایک کر کے ہرقل نے سوال کیے جن سے ثابت ہوتا چلا جا رہا ہے کہ حضورؐ سچے ہیں۔ ہرقل ابوسفیان کے جوابات کی توثیق بھی کرتا چلا جا رہا تھا کہ نبی ایسے ہی کردار کے ہوتے ہیں جیسا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں بتا رہے ہو۔ جو بات میں اس واقعہ سے آپ کو بتانا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لانے کے بعد اس واقعہ کی روایت کرتے ہوئے صاف کہتے ہیں کہ بارہا میرا جی چاہا کہ میں جھوٹ بول دوں، چونکہ گویا وہ خود CORNER ہوتے چلے جا رہے ہیں، خود شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں، خود ان پر حجت قائم ہو رہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کئی بار مجھے خیال آیا کہ میں جھوٹ بولوں۔ لیکن چونکہ اکیلے تو نہیں تھے۔ اور ساتھی بھی موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ میرے ساتھی کیا کہیں گے کہ اتنا بڑا سردار ہو کر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی تحسین آپ کس کو دیں گے! معلوم ہوا کہ یہ بات نہیں ہے کہ ان کے یہاں کوئی اخلاقی معیار سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ ایسی بات ہرگز نہیں تھی۔ ان کے اپنے معیارات تھے۔ ابوسفیانؓ کہتے ہیں کہ مجھے جھوٹ بولنے سے یہ چیز روکتی رہی کہ یہ میرے ساتھی کیا سوچیں گے کہ قریش کا اتنا بڑا سردار ہو کر جھوٹ بول رہا ہے۔ لہٰذا میں جھوٹ نہیں بول سکا۔

میں بیان کر رہا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی اعتبار سے جو پہلا غلبہ حاصل ہوا وہ یہ کہ کوئی جھوٹ موٹ کو بھی قرآن کے مقابلہ میں کوئی ایک سورت بھی بنا کر پیش نہیں کر سکا کہ یہ ہے تمہارے چیلنج کا جواب۔ کوئی شخص ڈھٹائی پر اتر آئے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایک لطیفہ ہے کہ کسی دربار میں بحث ہو رہی تھی کہ زمین کا مرکز کہاں ہے؟ اتفاق سے وہاں ایک دیہاتی بھی موجود تھا۔ اس نے اپنا لٹھ اٹھایا اور زمین پر مار کر یہ ہے زمین کا مرکز۔ نہیں مانتے تو ناپ لو۔ یہ بھی تو ایک طریقہ ہے۔ تو کوئی شخص کہہ سکتا تھا کہ میں نے یہ سورت بنائی ہے۔ وہ قرآن کے مساوی ہے بلکہ اس سے بھی بہتر ہے۔ اب چند ماہرین

ا بنفیں، جج صاحبان کا کوئی بورڈ بیٹھے، پھر ان پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ کہاں کے ماہرین فن آ گئے۔ یسے دیوانی مقدمہ ہمارے یہاں چلتا ہے کہ عمریں ختم ہو جاتی ہیں مقدمہ ختم نہیں ہوتا۔ ایسے ہی وہاں بھی ی کھڑے ہو کر دیوانی مقدمہ شروع کر سکتا تھا اور دعویٰ کر سکتا تھا کہ میں نے قرآن کے مقابلہ میں جو کچھ یش کیا ہے وہ قرآن سے بہتر ہے۔ لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایک شخص مقابلہ نہیں کر سکا۔ لوں نے جادو کہا، سحر کہا: اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ لیکن جھوٹ موٹ کے لیے صرف تین آیات شتمل سورۃ الکوثر کے مقابلہ کی بھی ایک سورت بنانے کا کوئی دعویٰ دار بن کر کھڑا نہیں ہوا۔ اور ہم سب انتے ہیں کہ سورۃ الکوثر ہر اعتبار سے قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ ہے ـــ یہ پہلا علمی غلبہ ہے۔ وقرآن مجید کو مشرکین پر حاصل ہوا۔[۵]

نظریہ توحید کا غلبہ

اس کے بعد آپ دیکھئے کہ مشرکین کے پاس شرک کے لیے جو بھی بنیادیں تھیں، دلائل تھے، ں سب کی قرآن مجید نے خاص طور پر مکی سورتوں میں دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ خالص فطری طرزِ استدلال ے تمام مشرکانہ عقائد کا تار پود ادھیڑ کر رکھ دیا۔ مکہ میں دانشوروں اور خطبا و شعراء کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن ئی بھی قرآن حکیم کے دلائل و براہین کا مقابلہ نہ کر سکا۔ علمی و فکری سطح پر سب ہی لاجواب اور مبہوت ہو رہ گئے۔ سب ہی کو سپر ڈالنی پڑی۔ سب ہی اعجازِ قرآنی کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ یہ قرآن مجید کا دوسرا لمی غلبہ تھا مشرکین پر ـــ

مسئلہ معاد پر ایمان لانے کیلئے علمی غلبہ

پھر معاد یعنی بعث بعد الموت کے انکار کے لیے ان کو جو شکوک و شبہات تھے اور وہ جو اعتراضات ار دکیا کرتے تھے کہ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ جب ہماری ہڈیاں گل سڑ جائیں گی اور مٹی ہو کر ٹی میں مل جائیں گی، ہم کیسے دوبارہ زندہ کیے جائیں گے؟ کیسے ہمیں پھر گوشت پوست کے ساتھ اٹھایا

---

۵ اس موقع پر راقم کو یاد آیا کہ کافی زمانہ گزرا ایک معتبر رسالہ میں پڑھا تھا کہ ایک مصری عیسائی جو عربی ادب، عربی صرف و نحو، عربی لغت کا بہت بڑا ماہر تھا اخبارات میں اپنا بیان شائع کرایا کہ اس نے قرآن کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے ایک سورت بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ عاجز رہا۔ اس نے جو عبارت بھی بنائی وہ قرآن ہی کی آیات کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر سے بنا سکا۔ بالآخر اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ ایمان لے آیا۔ اس دور میں بھی بے شمار واقعات ایسے ہیں کہ قرآن مجید کی معجز نمائی سے متاثر ہو کر کئی غیر مسلم ایمان لے آئے۔ (مرتب)

جائے گا۔ یہ بڑے دور کی کوڑی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے ان تمام شکوک وشبہات اور اعتراضات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ دلائل سے ثابت کر دیا کہ بعث بعد الموت، حشر ونشر حساب وکتاب اور جزا وسزاء اُخروی کو ماننا پڑے گا۔ یہ بات فطرت کے اندر ودیعت شدہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم کا یہ تیسرا علمی غلبہ تھا جو اُسے مشرکین پر حاصل ہوا۔

نبوت ورسالت کو تسلیم کرانے کا علمی غلبہ

نبوت ورسالت پر اعتراضات کچھ انہوں نے خود سوچ سمجھ کر کیے اور کچھ مکی دور ہی میں یثرب (مدینہ) سے علماءِ یہود نے کچھ نارِ ہلانا شروع کر دیا تھا کہ ان سے یہ پوچھو، وہ پوچھو۔ زچ کرنے کے لیے وہ سوالات قریش کو سکھاتے تھے۔ ان سب کے مُنہ توڑ جواب قرآن مجید نے ان کو دے دیئے۔ یہ قرآن کا چوتھا علمی غلبہ تھا مشرکین عرب پر۔

الغرض مکی دور ہی میں مشرکینِ عرب پر علمی وفکری اعتبار سے مکمل غلبہ ہے جو جناب محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید، فرقانِ حمید هدًى للناس کے دلائل وبراھین کے ذریعہ سے حاصل ہوا۔

یہود پر علمی غلبہ

ہجرت کے بعد جناب محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے۔ اب یہاں پہلی بار براہِ راست یہود سے سابقہ پیش آ رہا ہے۔ اب تک تو یہود پس پردہ رہ کر مشرکینِ مکہ کے ذریعہ سے اعتراضات کیا کرتے تھے۔ اب صُورت یہ ہے کہ مدینہ میں ان کے تین مضبوط قبیلے آباد ہیں۔ ہر قبیلہ میں بڑے بڑے یہودی علماء، فقہاء، دانشور اور دنیا کا گرم وسرد دیکھے ہوئے فضلاء موجود ہیں۔ ہجرت کے بعد جو پہلی سورت یعنی سورۂ بقرہ نازل ہوئی ہے۔ مختلف اوقات میں جو خطباتِ الٰہیہ اور آیاتِ الٰہیہ نازل ہوئی ہیں انہیں اس سورہ مبارکہ کی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ چند استثناءات اس میں ہیں۔ لیکن تقریباً ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے پہلے تک جتنا قرآن نازل ہوا ہے۔ وہ سورہ بقرہ کی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ میں نے تقریباً اس لیے کہا ہے کہ بعض آیات اس میں ہجرت سے پہلے کی بھی شامل ہیں۔ جیسے اس سورہ مبارکہ کی آخری دو آیات، جن کے متعلق صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہ تحفۂ معراج النبی ہے۔ یہ آیات حضورؐ کو سدرۃ المنتہٰی پر عطا ہوئی تھیں۔ سود کی حرمت والی آیات سن نو ہجری میں نازل ہوئی تھیں۔ اسی طرح غزوۂ بدر سے متصلاً قبل سورہ محمد نازل ہوئی تھی جس کا دوسرا نام سورۂ قتال بھی ہے۔ سورہ بقرہ میں دس رکوع وہ ہیں کہ جن میں ان یہود کے ساتھ مناظرہ کہہ لیں، مجادلہ کہہ

ں، ردوقدح کہہ لیں، بحث وتمحیص کہہ لیں — ان کے اعتراضات کے جوابات کہہ لیں، ان کے اندر اعتقادی برائیاں تھیں، ان پر تنقید کہہ لیں۔ ان کے اندر جو اخلاقی برائیاں تھیں اور عملی اعتبار سے ہیں جو گراوٹ، ریاکاری اور خرابی آچکی تھی، ان پر تبصرہ کہہ لیں۔ ان سب باتوں کو ملا کر گویا پہلے دس رکوعوں یہود پر فردِ قرارداد جرم کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ بات آگے بھی چلتی ہے سورۂ نساء میں ان پر تنقید ہے پھر سورہ مائدہ میں یہ بات تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اس طریقہ سے یہود پر پورا علمی غلبہ قرآن مجید نے حاصل کیا۔ ان کے پاس کوئی دلیل رہنے نہیں دی، دلیل کے میدان میں وہ قرآن سے پوری طرح شکست کھا گئے — قرآن حکیم نے ان کو چیلنج کیا: هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ "اگر تم سچے ہو تو لاؤ کوئی دلیل"۔ کبھی ان سے کہا: فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ "لاؤ اپنی کتاب تورات اور پڑھو ہمارے سامنے اگر تم سچے ہو"۔ تم کہتے ہو کہ ہمیں آگ چھو ہی نہیں سکتی اگر چھوئے گی تو محض گنتی کے چند دن: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ط تمہارا یہ قول تورات یا انجیل میں اگر درج ہے تو دکھاؤ تاکہ ہمیں بھی علم ہو کہ تم کو آگ سے چھٹکارے کی ضمانت مل گئی ہے تم کہتے ہو کہ: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط "ہم تو اللہ کے بیٹوں کے مانند ہیں اور اس کے بڑے چہیتے اور لاڈلے ہیں"۔ اس کے لیے ان سے برہان بھی مانگی اور ساتھ ہی ایک تاریخی تبصرہ بھی کیا: فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ۔ تم پر اس دنیا ہی میں تمہارے گناہوں کی پاداش میں تمہاری پیٹھوں پر عذاب کے جو کوڑے پڑتے رہے ہیں۔ بخوکدنصر کے ہاتھوں تمہاری جو پٹائی اور رسوائی کرائی گئی ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنے لاڈلوں کے ساتھ یہ سلوک کرتا رہا ہے! تم کہاں کے لاڈلے اور چہیتے ہو: بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ط "تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے ہم نے دوسرے انسان پیدا کیے ہیں"۔ اللہ کا تمہارے ساتھ کوئی رشتہ یا کوئی خصوصی تعلق نہیں ہے۔ اللہ کا قانون بے لاگ ہے اس کے عدل میں کوئی جانب داری نہیں ہے۔ اس کا معاملہ انسان کے ساتھ ایمان اور عمل کی بنیاد پر ہے۔ اگر وہ ہے تو ٹھیک ہے، وہ اگر نہیں ہے تو اللہ کی طرف سے کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاس یہ ضمانت ہے تو هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ اور فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ط۔ قرآن کا تو یہ چیلنج والا انداز ہے۔ جس کا جواب علماء یہود میں کوئی نہیں دے سکا۔ سب کے سب منہ دیکھتے رہ گئے۔ پس اس طور پر قرآن مجید نے یہود پر علمی غلبہ حاصل کیا۔

نصاریٰ پر علمی غلبہ

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ تیسرا گروہ نصاریٰ کا تھا۔ سورہ آلِ عمران کی قریباً تینتیس ۳۳ آیات میں پھر یہ مضمون آگے چلتا ہے۔ سورہ نساء، سورہ مائدہ اور سورہ مریم میں بھی نصاریٰ کے باطل عقائد پر تعریض کی گئی ہے۔ ان کے عقائد کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔ ان کی تردید میں دلائل دیئے گئے۔ براہین کے ساتھ ان پر فتح حاصل کی گئی ــــ اس ضمن میں نصاریٰ سے بھی آخری بات کہی گئی جیسے مشرکین عرب کے لیے قرآن کی طرف سے چیلنج کیا گیا کہ آؤ اس قرآن کا مقابلہ کر لو۔ بالکل اسی کے ہم وزن وراسی کے مساوی وہ آخری بات ہے جس کا نام مباہلہ ہے۔ قرآن مجید میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رمایا گیا۔ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝

ــے نبی اگر یہ نصاریٰ دلیل و برہان اور افہام سے بھی قائل نہیں ہوتے اور آپؐ سے اس بات کے ارے میں حجت بازی پر اڑا رہے جس کے متعلق آپؐ کے پاس سچا اور حقیقی علم آچکا ہے تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ بلائیں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان پھر (کھلے میدان میں) ہم سب التجا کریں اور لعنت (طلب) کریں اللہ کی ان پر کہ جو جھوٹے ہیں۔"

عوتِ مباہلہ اس شخص کو قبول کرنے میں تو تامل ہو ہی نہیں سکتا جو جانتا ہے اور جسے انشراحِ صدر ہے ہ میری بات صحیح ہے۔ لیکن اُس شخص کے لیے بہت بڑی آزمائش بن جاتی ہے جو دل سے تو قائل ہوتا ہے کہ دوسرے فریق کی بات صحیح ہے لیکن اس کی انانیت، اس کی عصبیت، اس کا تعصب، اس ت کا زبان سے اقرار کرنے میں مانع ہوتا ہے ــ بحث و تمحیص میں یہ اکثر ہوتا ہے، میرے اور آپ ے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ کسی موقع پر ہم پھنس جاتے ہیں کہ ہاں بات اس کی درست ہے لیکن مان کیسے ں! ماننے کا مطلب تو یہ ہے کہ شکست تسلیم کر لی گئی۔ لہٰذا یہ جھوٹی عزتِ نفس حق بات کو قبول کرنے ں مانع ہوتی ہے اور اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی جھوٹی انانیت آڑے جاتی ہے۔ کیسے مان لیں! جیسے یہود کے بارے میں قرآن کہتا ہے: يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ "یہود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قرآن کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں"۔ لیکن پہچاننے اور ماننے میں بہت فرق ہے۔ اپنی بالادستی، اپنی سیادت، اپنی قیادت، اپنی مسندیں چھوڑنی مان نہیں ہیں ــ چنانچہ جب نجران کے نصاریٰ کے وفد کو دعوتِ مباہلہ دی گئی ــ جس وفد میں ان کے

ذ یعنی بہت بڑے عالم بھی شامل تھے تو سب کے سب ششش و پنج میں پڑ گئے۔ انہوں نے مشورے
یے مہلت مانگی۔ ان کی اس مجلس مشاورت میں ان کے ہوش مند اور تجربہ کار لوگوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ
وسلم سے اتنے دنوں ہماری گفتگو رہی ہے۔ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق فیصلہ کن
الہی ہیں۔ تم یقیناً دلوں میں قائل ہو چکے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی مُرسل ہیں۔ لہٰذا ایک نبی سے
اور ملاعنہ کرنے کا نتیجہ ہمارے حق میں ہلاکت خیز نکل سکتا ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ ہم صلح کر کے
ستیوں کو واپس چلے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ مباہلہ و ملاعنہ نہیں کر سکے اور صلح
کے چلے گئے۔[1] چنانچہ نصاریٰ پر بھی قرآن حکیم نے علمی و فکری غلبہ حاصل کر لیا۔

عرب میں موجودہ اوّلین مخاطبین پر علمی غلبہ الھدیٰ کے ذریعے

حاصل گفتگو یہ ہوا کہ جس طرح کا علمی و فکری غلبہ اس قرآن کے اعجاز کی صورت میں مشرکین
ب پر ہوا۔ بعینہٖ اُسی معیار کا اور اُسی نوعیت کا علمی و فکری غلبہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
رآن کے دلائل و براہین کے ذریعہ سے مدینہ کے یہود اور نجران کے نصاریٰ پر حاصل ہوا۔ یہ تمام
ے وہ ہیں جو قرآن مجید، فرقانِ حمید نے عطا فرمائے۔ اس غلبہ کے لیے قرآن حکیم میں تمام دلائل
براہین موجود ہیں۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اس کام کی نوعیت کیا ہے! اور اس کے لیے آلہ اور
یہ کون سا ہے؟ یہ درحقیقت علمی کام ہوا ہے اور اس کا آلہ و ذریعہ قرآن مجید ہے جو الھدیٰ ہے۔ اس الھدیٰ کے
یعے علمی غلبہ، دلیل و برہان کے میدان میں غلبہ دورِ نبوت و رسالت میں ان تینوں گروہوں پر حاصل ہو
ا جو فی الواقع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوت کے اوّلین مخاطب تھے۔

دین حق کا غلبہ

لیکن حضورؐ صرف الھدیٰ لے کر تشریف نہیں لائے تھے بلکہ دین الحق بھی ساتھ لائے تھے۔ اور
پ کی بعثت کی امتیازی شان اور منتہائے مقصود یہ تھا کہ جہاں آپؐ الھدیٰ کے ذریعہ سے علمی و فکری
طح پر، دلیل و برہان کے میدان میں بنی نوعِ انسان پر توحید اور عبادتِ ربّ کا احقاق اور شرک
ر طاغوت کی بندگی کا ابطال فرما دیں وہاں دین الحق کو جہاد و قتال کے ذریعہ سے اس دنیا میں بالفعل
بنس دین یعنی تمام نظام حیات و اطاعت پر غالب فرما دیں۔ آپؐ کی بعثت کے مقاصد اور

---

[1] حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ مباہلہ کرتے تو وادی ان پر آگ بن کر برستی اور اللہ تعالیٰ نجران کا بالکل استیصال فرما دیتا۔ ایک سال کے اندر اندر نجران کے تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے (مرتب)

زائفِ منصبی میں یہ دونوں غلبے بالفعل شامل ہیں۔ چونکہ آپؐ آخری نبی و رسول ہیں لہٰذا تاقیامِ قیامت آپؐ کا دورِ رسالت ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ لہٰذا حضورؐ کو بنفسِ نفیس یہ دونوں غلبے مکمل فرمانے تھے ۔ اسی لیے یہ الفاظِ مبارکہ پورے قرآن مجید میں کسی اور رسول علیہ السلام کے لیے نہیں آئے جو حضورؐ کی بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں ایک شوشے کی تبدیلی کے بغیر قرآن مجید میں تین سورتوں میں وارد ہوئے هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۔

پہلا غلبہ یعنی علمی و فکری سطح پر غلبہ شرطِ لازم ہے ۔ پہلے وہ حاصل کرنا ہوگا تب دوسرا غلبہ حاصل ہوگا[1] ۔ اس لیے کہ جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ ۔ جو اذہان و قلوب کو فتح کرلے گا وہی پھر اس زمین پر اپنا نظام قائم کرسکے گا ۔ اسی علمی و فکری غلبہ کے لیے جہاد بالقرآن کی اصطلاح ہے[2] سورہ فرقان کی اس آیت مبارکہ کے حوالے سے : فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ○ ۔ اے نبی ! آپؐ ان کافروں کی باتوں میں نہ آجایئے گا ۔ ان کا کہنا نہ مان بیٹھئے گا ، یہ تو ہر طرح آپؐ کو ورغلائیں گے ۔ بلکہ آپؐ تو اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر ان کے ساتھ جہاد کیجئے ۔ بہت بڑا جہاد ۔ یہ جہاد ہے علمی و فکری غلبہ کا جہاد ۔ اس غلبہ کے لیے جو لوگ اُس وقت موجود تھے جن سے براہِ راست تصادم و مقابلہ تھا ان سے مقابلہ کے لیے قرآن مجید نے تمام براہین و دلائل اسی وقت دے دیئے اسکے بعد حضورؐ نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین الحق کو بنفسِ نفیس قائم و غالب فرما دیا ۔ لیکن اب یہ غلبہ آگے چلنا ہے ۔ یہ غلبہ اس وقت تک مکمل نہیں ہے جب تک پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا بالفعل قیام و نفاذ نہ ہو جائے ۔ وہ ہو کر رہے گا ۔ کب ہوگا ؟ یہ ہم نہیں جانتے ۔ البتہ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس جدوجہد میں اپنی زندگیاں لگا دیں ۔ باقی رہا یہ کب ہوگا ! کسی کو معلوم نہیں ۔ اور نہ ہی ہمیں

---

[1] اس عاجز کی یہ حقیر رائے ہے کہ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ جن تین سورتوں میں وارد ہوئی ہے وہ مدنی دور کی ہیں ، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ عرب اور اہلِ کتاب پر علمی و فکری سطح پر الہدیٰ کے ذریعہ سے غلبہ حاصل فرما چکے تھے ۔ دلائل و براہین کے میدان میں تمام مخالفین شکست کھا چکے تھے ۔ (مرتب)

[2] ان شاء اللہ العزیز جلد ہی "جہاد بالقرآن" کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب موصوف کے تین خطابات کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آجائیں گے (مرتب)

...سے بحث ہونی چاہیئے۔ یہ تو حسابی ذہن کا کام ہے جو یہ سوچ کر کوئی کام کرتا ہے کہ کامیابی کے کتنے ...کانات ہیں کتنے نہیں ہیں۔ ایک وہ ذہن ہوتا ہے کہ جو کام کرتا ہے اس لیے کہ یہ میرا فرض ہے۔ ...ے تو ہر حال میں یہ کام کرنا ہی کرنا ہے، کامیابی ہو یا نہ ہو اس سے اُسے کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ دو مختلف ...ظر ہائے نظر ہیں۔ ایک حساب کتاب سے چلنے والا ذہن (CALCULATIVE MIND) ...بلاتا ہے اور دوسرا احساس فرض کے تحت چلنے والا ذہن ہوتا ہے۔ اسی کا نقطۂ عروج ہیں وہ الفاظ ...حضورؐ کی زبانِ مبارک پر آئے تھے کہ "چچا جان! اب یا تو یہ کام پورا ہوگا یا اسی میں مَیں اپنی جان دے دوں ...گا"۔ قریش کی جب آخری سفارت ابوطالب کے پاس آخری دھمکی کی صورت میں آئی تھی اور ان کے ...بھی پائے صبر و ثبات میں لغزش آگئی تھی اور انہوں نے حضورؐ سے کہا تھا کہ "بھتیجے۔ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ...ڈالو جو میں برداشت نہ کر سکوں"۔ اب اس سے زیادہ اپیل اور کیا ہوگی کہ اپنے موقف میں کچھ نرمی پیدا ...کرو۔ تمہارے رویہ اور موقف میں مفاہمت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ لہٰذا مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو۔ کچھ سوچو میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ یہ سُن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ دنیوی اعتبار سے یہ واحد سہارا تھا اور محسوس ہو رہا ہے کہ اب یہ بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ آنکھوں میں آنسو تو آئے ہیں لیکن اندر جو عزیمت ہے کوہ ہمالیہ سے زیادہ عظیم عزیمت۔ اس کا اظہار ہوا ہے ان الفاظِ مبارکہ سے کہ

"چچا جان! اب یا تو یہ کام پورا ہوگا یا اسی میں مَیں اپنی جان دے دوں گا۔ میرے لیے
کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔"

پس یہ غلبہ جو بالفعل ہونا ہے اس کے بھی دو رُخ ہیں۔ خلافت راشدہ کے دوران صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر نکلے۔ ظاہر بات ہے کہ اس وقت دعوت و تبلیغ کا وہ حق ادا کرنا جیسا کہ بارہ تیرہ برس مکہ والوں پر ادا کیا گیا، اس کا تو موقع نہیں تھا۔ اب تو یہ تھا کہ بالجبر کسی کو مسلمان بنانا نہیں، لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ لیکن باطل اور طاغوتی نظام کو راستہ میں حائل رہنے دینا نہیں، اسلیئے کہ غلط نظام اصل میں راہِ ہدایت میں رکاوٹ بن جاتا ہے، اور حائل ہو جاتا ہے بندے اور رب کے مابین۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

چنانچہ کوئی غلط معاشرتی نظام، کوئی غلط معاشی نظام، کوئی غلط سیاسی نظام لوگوں کو درحقیقت اس طرح اپنے اندر جکڑ بند کر لیتا ہے کہ ان میں سوچ کی، فکر کی اور عمل کی آزادی نہیں رہتی۔ ان حالات میں وہ

کیسے اللہ کی طرف متوجہ ہوں! لہٰذا باطل اور غلط نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا ہے ۔ بڑے عجیب الفاظ ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے استعمال فرمائے ہیں : فَكُّ كُلِّ نِظَامٍ ۔ ہر باطل نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا دراصل بندۂ مومن کا فرض ہے ۔ اس لیے کہ نظامِ باطل رکاوٹ اور آڑ بن جاتا ہے ۔ یہ حجاب بن جاتا ہے اللہ اور بندے کے درمیان — لیکن کسی شخص کو بھی زبردستی مسلمان بننے پر مجبور نہیں کیا گیا اور نہ کیا جائے گا ۔

اسلام کو دو چیلنجوں سے سابقہ — پہلا چیلنج

اس موضوع پر اپنی گفتگو ختم کرنے سے قبل میں چند اہم باتوں کی طرف آپ حضرات کی مزید توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔ دیکھئے ۔ اسلام کی وسعت کے ساتھ ساتھ جو دو بڑے بڑے علمی چیلنج اسلام کو پیش آئے ہیں ۔ ان میں سے سب سے بڑا چیلنج وہ تھا کہ قرآن مجید میں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں جو تشریعی احکام ملے تھے وہ اصولی اور مختصر تھے تفصیلی احکامات بہت کم تھے — لیکن جب ایک وسیع و عریض اسلامی مملکت وجود میں آگئی تو زندگی کے مختلف گوشوں کے پیچیدہ مسائل کے بارے میں شریعت کا منشا معلوم کرنے کے لیے سوالات پیدا ہونے شروع ہوئے — جیسے کہ مدینہ میں جب ایک اسلامی ریاست بالفعل وجود میں آگئی تھی ، پوچھا جانے لگا تھا : يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ” اے نبی ، یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں “ لیکن ’خمر‘ شراب ایک لفظ ہے ۔ اب اس کے متعلق سو طرح کے سوال ہوں گے ۔ شراب کسے کہتے ہیں ! کیا ہر مسکر اور نشہ آور شئے شراب کی طرح حرام ہے یا یہ کہ صرف کسی خاص چیز اور خاص طریقہ سے بنایا ہوا نشہ آور مشروب شراب ہے ! اس نوع کے بے شمار سوالات اٹھیں گے ! جوا کسے کہتے ہیں ! آج آپ کے ملک کی عدالت میں گھڑ دوڑ پر لگائی ہوئی شرط پر بحث ہو رہی ہے کہ یہ ’شرط‘ جوا ہے یا نہیں ہے ! اب آپ اس پر قیاس کیجئے کہ ایک مسئلہ اور موضوع پر کتنے بے شمار سوالات پیدا ہو سکتے ہیں ۔ پھر جب ایک مکمل نظامِ حکومت وجود میں آئے گا تو ان سوالات کا دائرہ کتنا وسیع ہو جائے گا ! لہٰذا اس کے لیے تفصیلی قوانین کی شدید ضرورت پیش آئے گی — یہ وہ علمی چیلنج تھا جس کو بحیثیت مجموعی حل کیا ہمارے فقہائے کرام اور محدثین عظام نے رحمہم اللہ — اور ہر امام فقہ اور ہر امام حدیث نے اس عظیم کام میں اپنا اپنا رول ادا کیا ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب کے کارہائے

نمایاں ہیں سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی حضرات کا معاملہ اکثر وبیشتر انفرادی ہے ۔ جبکہ امام صاحبؒ نے اس معاملہ کو انفرادی نہیں رکھا ۔ بلکہ باقاعدہ ایک حلقہ قائم کیا ۔ جس میں مسائل پر مباحث ہو رہے ہیں ۔ دلائل دیئے جا رہے ہیں ۔ دلائل کو توڑا جا رہا ہے ، کاٹا جا رہا ہے ۔ دوسرے امکانات کو سامنے لایا جا رہا ہے ۔ قریباً ہر مسئلہ جرح وتعدیل کے عمل سے گزر کر طے پا رہا ہے ۔ تو امام صاحب علیہ الرحمہ نے ایک ادارہ (INSTITUTION) کے ذریعہ سے ایک اسلامی مملکت کے لیے تفصیلی قانونی نظام مدون کیا ہے ۔ فقہ حنفی کسی ایک فرد کی فقہ نہیں ہے ۔ اس میں امام صاحبؒ کی آراء ہیں ۔ اس میں امام محمد شیبانیؒ کی آراء ہیں ۔ اس میں قاضی ابو یوسفؒ کی آراء ہیں ۔ اس میں امام زفرؒ کی آراء ہیں ۔ اور بے شمار اہل الرائے کی آراء ہیں ، رحمہم اللہ اجمعین ۔ یہ چیلنج جو اگرچہ مخالفین کی طرف سے نہیں بلکہ وقت کے تقاضوں کی طرف سے بہت بڑا علمی چیلنج تھا جسکا ہمارے فقہاء و محدثین کرامؒ نے بالعموم اور امام اعظم امام ابوحنیفہؒ نے مواجہہ (FACE) کیا اور اس میں الحمد للہ کامیاب بھی ہوئے اور ایسا قانون مرتب کر دیا کہ بڑی بڑی مملکتیں قریباً ہزار برس تک کامیابی سے چلتی رہیں ۔ اس لیے کہ مغربی امپیریلزم کی تاریخ ڈھائی تین سو سال پرانی ہے ۔ اس وقت تک بلکہ اس کے ابتدائی زمانہ میں بھی وہی نظام چل رہا تھا ۔ ایک وقت کا یہ علمی چیلنج تھا جس کو ہمارے فقہاء و محدثین نے کما حقہ پورا کیا ۔

دوسرا خطرناک چیلنج

وقت کی رفتار کے ساتھ دوسرا علمی چیلنج بھی آیا ۔ یہ تھا اصل میں کافی خطرناک چیلنج ۔ جہاں تک مجوسیت ، عیسائیت ، یہودیت اور ہندومت کا تعلق تھا تو ان سب کی حیثیت مشرکانہ مذاہب کی تھی ، لہٰذا توحید کے احقاق اور شرک کے ابطال کے لیے قرآن حکیم میں جتنے دلائل و براہین دیئے گئے تھے وہ سب کے سب ان کی تردید کے لیے کفایت کر گئے ۔ لیکن جو دوسرا چیلنج بعد میں آیا وہ فلسفہ ، منطق اور عقلیات (RATIONALISM) کا چیلنج تھا ۔ یونان کی عقلیت کے ساتھ جہاں فلسفہ تھا اور منطق تھی ، وہاں سائنس بھی تھی ۔ آج کے دور میں جو بھی فلسفے ، جو بھی منطق اور جو سائنسی ترقی ہوئی ہے آپ ان کا سراغ لگائیں گے تو معلوم ہوگا کہ یونان ہی اس کا نقطۂ آغاز ہے ۔ ٹھیک ہے کہ ایران اور ہندوستان کا بھی اس میں قابلِ لحاظ حصہ ہے ۔ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں نے بھی اس میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے ۔ لیکن ان سب کی اصل آپ کو یونان ہی میں نظر آئے گی ۔

پھر دنیا میں اصل فلسفہ و منطق آج بھی دو ہی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یوں کہنے کو تو بیسیوں اصطلاحات آپ کو نظر آئیں گی لیکن حقیقت میں (۱) IDEALISM (تخیّل پسندی) جس کی بنیاد افلاطون نے رکھی، (۲) REALISM (واقعیّت پسندی) جس کی اساس ارسطو نے رکھی — دنیا میں جو بھی مزید فلسفے ہیں، وہ انہی دو میں سے کسی ایک کی فروع ہیں — ان میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ لیکن فی الواقع سب کی اصل ان دو میں سے کوئی ایک ہی فلسفہ و منطق ہے — جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ مسلمانوں میں فرقے تو دو ہی ہیں اہلِ سنّت والجماعت اور اہلِ تشیّع۔ پہلے کا بنیادی عقیدہ ہے خلافتِ عمومی اور دوسرے کا ہے امامتِ معصومہ۔ اور ان دونوں عقیدوں میں بُعد المشرقین ہے[۱] اصولی اعتبار سے یہ متصادم و متضاد نظریات ہیں — لہٰذا ان پر فرقہ کا اطلاق درست ہے۔ اس لیے کہ فرقہ بنا ہے 'فرق' سے جس کے معنی ہیں پھاڑ دینا، کامل علیحدگی ہو جانا — باقی اہلِ سنت والجماعت میں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور اہلِ حدیث فرقے ہیں! معاذ اللہ ان کے لیے لفظ 'فرقہ' کی اصطلاح سراسر ظلم ہے، یہ تو مکاتبِ فقہ ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کو مسالک کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو کچھ دنیادار دانشین اور نام نہاد مولویوں نے اپنی دوکانیں چمکانے کے لیے بعض مسائل کو ایک دوسرے کے خلاف اس طرح استعمال کیا ہے کہ بدقسمتی سے وحدتِ امت[۲] پارہ پارہ ہو گئی ہے اور 'من دیگرم تو دیگری' کا معاملہ عملاً نظر آنے لگا ہے۔ ورنہ ہر مسلک کے دلائل کتاب و سنت میں موجود ہیں۔ اور انہی سے ماخوذ ہیں۔

چنانچہ فلسفہ اور منطق کے راستے سے دینِ اسلام کو دوسرے چیلنج سے سابقہ پیش آیا — اس چیلنج کا مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ کامل شکست دی ہمارے عظیم اکابرِ اُمّت نے — اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ اس علمی چیلنج کے جواب کے لیے بھی مواد قرآن حکیم میں موجود تھا۔ لیکن وہ فلسفہ و منطق کی اصطلاحات و الفاظ میں نہیں تھا۔ اگر ان الفاظ اور اصطلاحات میں وہ مواد دیا جاتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[۱] اس موضوع پر تفصیل کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کا خطاب "کیا ایرانی انقلاب "اسلامی انقلاب" ہے؟" شائع شدہ "میثاق" (اپریل و مئی ۱۹۸۵ء) ملاحظہ فرمایئے (مرتب)

[۲] حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی اختلافات کی اصل نوعیت کے بیان میں "وحدتِ امت" ہی کے نام سے ایک کتاب ہے جو دوسرے میں تولنے کی قدر و قیمت کی حامل تقاریر شامل ہیں، جو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے بھی حال ہی میں شائع کی ہے (مرتب)

طالبین اُسے کیسے سمجھتے! ان کے لیے تو وہ گورکھ دھندا اور معمہ ثابت ہوتا۔ وہ ابتداء سے کیا سمجھتے جن کو اوّلاً اسلامی انقلاب کے لیے متحرک و فعال بنانا تھا جن کے ذریعہ سے اسلام کا عملی غلبہ ہونا تھا۔ لہٰذا قرآن میں سارے کا سارا مواد موجود تھا اور دنیا میں قیامت تک مادہ پرستانہ، ملحدانہ، زندقہ اور دہریت کے حامل جتنے بھی نظریاتِ منطق اور فلسفے وجود میں آسکتے ہیں ان سب کا توڑ قرآن مجید میں موجود ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے تا قیامِ قیامت ھُدًی لِّلنَّاس ہے۔ لیکن ہر دور کے لیے اس مواد کو کھود کر نکالنا ہوگا۔ اس معدن سے نہایت عرق ریزی اور محنت و عزم کے ساتھ ہیرے اور جواہر نکالنے پڑیں گے۔ اسی کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ آئے ہیں: لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ۔ "اس قرآن کے عجائبات یعنی نئے نئے علوم و معارف کے خزانے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔" ہیروں کی یہ کان کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں: وَلَا یَشْبَعُ مِنْہُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ۔ "اس قرآن سے کبھی اہل علم سیری حاصل نہ کرسکیں گے نہ اس کی کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کی تاثیر اور لطف و لذت میں کوئی کمی آئے گی۔"

پس فلسفہ و منطق کے راستے سے جو پہلا علمی چیلنج آیا تھا۔ اس کا مقابلہ کیا گیا اور ہمارے یہاں بڑے بڑے متکلمین پیدا ہوئے۔ لیکن ان میں دو شخصیتیں بہت نمایاں ہیں۔ ان میں ایک امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان رجالِ دین نے ایسی عالمانہ کتابیں لکھیں کہ یونان کے فلسفے اور منطق کا تمام تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ ان کے بخیے اُدھیڑ کر ڈال دیئے۔ 'اَلرَّدُّ عَلَی الْمَنْطِقِیِّیْنَ' یہ امام ابن تیمیہؒ کی شاہکار تصنیف ہے۔ اسی طریقے سے "تہافۃ الفلاسفۃ" اور "المنقذ من الضلال" امام غزالیؒ کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔ یہ تینوں تصانیف اپنے مضامین کے اعتبار سے انتہائی جامع، بہت نمایاں اور شاہکار ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں کہ جنہوں نے یونان کے فلسفہ و منطق کے تانے بانے اور صغریٰ کبریٰ (Premises) کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں کہ جن سے مسلح ہو کر یونانی فلسفہ ایمان اور اسلام پر حملہ آور ہوا تھا۔ ان بزرگوں نے دلیل و برہان کے ساتھ اس فلسفہ کی مکمل تردید کر دی۔ منطق کو کاٹا ہے منطق سے: اِنَّ الْحَدِیْدَ بِالْحَدِیْدِ یُفْلَحُ۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، اُسے لکڑی سے تو کاٹا نہیں جاسکتا لہٰذا منطق کا ردّ منطق ہی سے ممکن ہے۔ اور میں عرض کر چکا ہوں کہ بنیادی طور پر قرآن حکیم نے منطق کو اپنی اساس نہیں بنایا اگرچہ منطق بھی اس کے اندر ہے لیکن مضمر ہے، چھپی ہوئی ہے۔ قرآن کی منطق قرآن میں غوطہ زن ہو کر نکالنی ہوگی جس کے لیے علامہ اقبال نے کہا

ہے ۔ علامہ قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ۔ قرآن بحرِ ذخار ہے ۔ اس کی گہرائیاں ناپیدا کنار ہیں ، انتہاہ ہیں ۔ اس کے اندر غوطہ زنی کرو ۔ جتنی گہرائیوں میں جاؤ گے اتنے ہی قیمتی موتی دستیاب ہوں گے آپ معدن کو کھود کر ہیرے وجواہر نکالتے ہیں اور غواص سمندر کی تہہ سے موتی اور دُرِ شہوار نکالتے ہیں ۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور اشعار ہیں۔

یغوص البحر من طلب اللآلی

ومَن طلبَ العلا سهر اللیالی

ومن طلبَ العلا مِن غیر کدٍ

اضاعَ العمر فی طلبِ المحال

"جو شخص موتیوں کا طلب گار ہوتا ہے ، وہ سمندر میں غوطہ زنی کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اونچا مقام حاصل کرے اُسے راتوں کو جاگ کر محنت کرنی پڑتی ہے"[1] اس بات کو ان سے پوچھئے جنہیں کسی اعلیٰ ڈگری کا امتحان دینا ہو اور پوزیشن بھی حاصل کرنی پیشِ نظر ہو ان کو کیسی کیسی مشقّت راتوں کو جاگ جاگ کر کرنی پڑتی ہے ۔ یہ وہ بات ہے جو حضرت علیؓ نے دوسرے شعر میں فرمائی ہے" اور جن لوگوں نے چاہا کہ بلندی بھی حاصل کرلیں اور محنت بھی نہ کریں ، انہوں نے ایک طلبِ محال میں اپنی عمر ضائع کرلی اس کے سوا اور کچھ نہیں"۔

ہمارے لیے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں ۔ کیا اس معاملہ میں دو رائیں ممکن ہیں کہ ہماری امت کی عظیم ترین اکثریت بالخصوص جدید تعلیم یافتہ افراد کے اذہان وقلوب مغرب سے آئے ہوئے مادہ پرستانہ ، ملحدانہ اور خدا ناآشنا فلسفوں اور نظریات کی پوری گرفت میں ہیں ، ان پر ان افکار کا مکمل غلبہ اور استیلاء ہے ۔ اس سے نجات اگر مل سکتی ہے تو صرف اس طرح کہ قرآن حکیم کے حِکَم اس کے معارف ، اس کے فطری طرزِ استدلال کے ذریعہ سے قرآن کے علمی غلبہ کے لیے تن من دھن لگا دیا جائے ۔ یہی علمی غلبہ ان شاء اللہ صحیح اسلامی نظام یعنی دین الحق کے قیام ونفاذ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا آج پوری دنیا میں کہیں بھی ہمیں بتمام وکمال اسلام بطور نظام حیات قائم ونافذ نظر نہیں آتا

---

[1] تجلیِ ربانی کے حصول کے لیے راتوں کو جاگ کر محنت کرنے کے متعلق بوعلی سینا کا بڑا پیارا قول ہے : فَجَاهِدْ فِیْ خَلَوَاتِكَ فلعل شُعْشَۃً تلمعُ لَكَ : رات کی تنہائیوں میں مجاہدہ کرو ۔ اللہ سے لو لگاؤ شاید کہ معرفتِ ربانی کی کرن تمہارے لیے بھی جگمگا اٹھے ۔ (مرتب)

اگر اللہ نے چاہا تو اس کے امکانات روشن سے روشن تر ہوتے جائیں گے۔ علامہ اقبال نے دو اشعار میں ہمارے موجودہ انحطاط، زوال، نکبت و مسکنت کی تشخیص بھی کی ہے اور اس کا علاج بھی تجویز کر دیا ہے۔ علامہ کہتے ہیں ؂

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی	شکوہ سنج گردش دوراں شدی
اے چوں شبنم برزمیں افتندۂ	در بغل داری کتاب زندۂ

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انہی دو کاموں کے لیے اس عاجز نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ دعوتِ رجوع الی القرآن کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن کے فورم سے جو بھی حقیر سی خدمت بن آ رہی ہے اس سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ قرآن کے علمی غلبہ کے لیے انجمن ہی کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے تاکہ چند اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین و فطین نوجوانوں کو جو اپنی زندگی کا مقصد "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" بنالیں قرآن حکیم کے ان مبادی و اصول سے روشناس کرا دیا جائے جن کی بدولت موجودہ دور کے ملحدانہ و مادہ پرستانہ نظریات وافکار کا اعلیٰ علمی سطح پر رد کرنے کی ان میں صلاحیت پروان چڑھ سکے۔ اظہار دین الحق کی جد و جہد کے لیے تنظیم اسلامی کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بدولت ترتیب پا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ان حقیر سی مساعی کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور یہ کام ایک عالمی اسلامی انقلاب کے لیے ممد و معاون ثابت ہو۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ۔

بقیہ : الہدیٰ

حضرات! سورہ تغابن کی ان پانچ آیات کے ذریعے ہمارے سامنے وہ بنیادی تغیرات آگئے جو ایمان کے نتیجے میں ہمارے نقطۂ نظر میں، ہمارے زاویۂ نگاہ میں، ہمارے رویے میں ہمارے VALUE STRUCTURE میں پیدا ہو جانے چاہئیں۔ اب ہمیں اس کسوٹی پر اپنے ایمان کو پرکھنا ہے۔ اگر یہ کیفیات ہمارے اندر موجود ہیں تو ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے ——— یہ علامت ہے اس بات کی کہ ایمان کی روشنی ہمارے قلب میں موجود ہے۔ اگر نہیں ہے تو ہمیں تشویش ہونی چاہیئے کہ ہم ایمان حقیقی سے محروم ہیں اور اس کی تحصیل باقی تمام چیزوں پر مقدم ہو جانی چاہیئے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

اسلامی انقلاب

مراحل۔ مدارج۔ اور لوازم

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے ۲۸ ستمبر ۸۴ء کے جمعہ میں "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" کے موضوع پر خطاب ارشاد فرمانے کے بعد ۵ اکتوبر ۸۴ء کے جمعہ سے مندرجہ بالا موضوع پر آٹھ جمعوں میں تسلسل کے ساتھ آٹھ تقاریر فرمائی تھیں۔ پہلی تقریر کیسٹ سے منتقل کر کے معمولی حک و اضافہ کے بعد پیش خدمت ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہ جملہ خطابات "میثاق" میں مسلسل پیش کئے جاتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو !!!

جمیل الرحمٰن

الحمد للہ۔ الحمد للہ وکفٰی وَالصّلوٰۃ والسّلام علٰی عبادہِ الذین
اصطفٰی خصوصًا علٰی افضلھم وخاتم النبیّٖن محمدؐ الامین
وعلٰی آلہ وصحبہ اجمعین ـــــ امابعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ٥ بسم اللہِ الرّحمٰن الرحیم
یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ہ قُمْ فَاَنْذِرْ ہ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ہ

وَقال تبارک وتعالٰی فی سورۃ الشورٰی :

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَ
مَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ

وَقَالَ اللهُ عزوجل فی سورۃ الصف

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ٥

وَقَالَ سبحانہٗ وَتعالٰی فی سورۃ الانفال

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ

امّا بعد : فقال رَسُوْلُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم

اَلمجاھد فی سبیل اللہ من یقتلُ لتکون کلمۃ اللہ ھی العُلیا۔

عن عبادۃ بن الصامت قال بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرۃٍ علینا وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنّا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم ۔ (متفق علیہ)

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۔

اَللّٰھم رب‍نا الھمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا

اَللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ ۔

اَللّٰھم وفقنا ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم

آمین یارَبَّ العٰلَمین

حضرات! آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ۳۱ اگست ۸۴ء کے جمعہ میں اس موضوع پر مفصل تقریر کی تھی کہ "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" اس تقریر میں میں نے لفظ انقلاب کی تشریح بھی کی تھی۔ اور دنیا کے واحد مکمل ترین اسلامی انقلاب کے نہایت اختصار کے ساتھ اصول و مبادی اور خصائص بیان کئے تھے۔ بعدہٗ ۱۵ ستمبر اور ۲۸ ستمبر ۸۴ء کو میں نے اس موضوع پر مفصل اظہار خیال کیا تھا کہ "کیا ایرانی انقلاب، اسلامی انقلاب ہے؟" اور ان تقاریر میں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ایران کی حالیہ تبدیلیاں اور واقعات نہ تو "انقلاب" کے معیار و اصول (Criterion) پر پورا اترتے ہیں اور نہ اس حقیقی اسلام کے مطابق ہیں جس کو ہم

نتے ہیں اور جس پہ ہمارا ایمان ہے ۔ ان تمام باتوں کے متعلق میں دلائل کے ساتھ اپنی رائے ر اپنا تجزیہ بیان کر چکا ہوں[1] ۔ اب مجھے خالص اسلامی انقلاب کے اصول و مبادی، مدارج راحل اور لوازم پر اپنی گفتگو کا مفصل آغاز کرنا ہے ۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ سلسلہ چھ سات معوں میں مکمل ہوگا ۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی مرتبہ اپنی گفتگو کے اختتام پر میں نے چار باتیں عرض کی تھیں ۔ ں آج صرف ان کا اعادہ کروں گا چونکہ آج سے جس موضوع پر گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے اس ے ان باتوں کا ایک گہرا ربط و تعلق ہے ۔ ان چاروں باتوں میں سے ہر بات ایک مستقل موضوع ا حامل ہے اور ہر موضوع ایک مفصل تقریر کا متقاضی ہے اور میں نے ان موضوعات پر مختلف ہوں پر مفصل تقاریر کی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس ترتیب سے یہ بات جمعہ کے سلسلۂ تقاریر ں شاید بیان نہیں ہو پائی ہے ۔ بہر حال اس وقت میری رائے میں ان باتوں کا خلاصہ ہی کفایت رے گا ۔

پہلی بات یہ کہ پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے ۔ ہمارے ں اسلام کے سوا اس ملک کی بقا اور استحکام کے لئے کوئی اور بنیاد سرے سے موجود نہیں ہے ـــــ اب یہ بات ایک مکمل تقریر کا موضوع ہے کہ تحریک پاکستان کا پس منظر کیا تھا ! یہ ے بنا کیوں تھا ! اس کے محرکات اور عوامل کیا تھے ! اس کی اساسات کیا ہیں ! ـــــ پھر یہ مختلف ممالک کے استحکام اور بقا کے لئے کون کون سے عوامل سہارا دیتے ہیں اور اس کی نوعیت کا باعث بنتے ہیں ! ان میں سے ایک ایک عامل کا جائزہ لے کر یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے ـــــ اور یہ بات میں بلا خوف تردید کہہ رہا ہوں ـــــ کہ دنیا کے عام ممالک کو اپنے استحکام ر بقا کے لئے جو سہارے دستیاب ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ہمارے پاس موجود ہیں ہے ۔ ہمارے پاس جو واحد سہارا ہے وہ ہمارا دین ہے ۔ ہمارے بارے میں یہ بات کل صحیح ہے کہ ع کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو ۔ ہم کافر ہو ہی نہیں سکتے ہمیں تو لامحالہ سلمان ہونا پڑے گا ۔

دوسری بات بھی جو اپنی جگہ ایک مکمل تقریر کا موضوع ہے ـــــ یہ کہ پاکستان میں اسلام

---

[1] محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ تقاریر 'میثاق' کے جنوری، اپریل اور مئی ۸۵ء کے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں : (مرتب)

نہ انتخابی طریق سے آسکتا ہے اور نہ اس ضیائی طریق سے آسکتا ہے جو سوا سات سال سے ہمارے ملک میں چل رہا ہے۔ اس کے لئے واحد راستہ انقلاب کا راستہ ہے ـــــ اب اس کے لئے بھی دلائل و شواہد چاہئیں۔ انتخابات میں بھی اسلامی نظام کے قیام کے لئے لوگوں نے حصّہ لیا ہے۔ اور آئندہ جب کبھی بھی انتخابات ہوں گے لوگ حصّہ لیں گے اور نیک نیّتی سے لیں گے کہ اس طریق سے اسلام کی سربلندی کے لئے کام کریں۔ انتخابات میں حصّہ لینے والوں میں یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی اصل غرض حصولِ اقتدار ہوگی لیکن یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جو نہایت خلوص کے ساتھ اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسی انتخابی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن مجھے اس سے شدید اختلاف ہے جس کے لئے میرے پاس قوی اور مستحکم دلائل ہیں۔ جن کو وقتاً فوقتاً میں بیان بھی کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اس وقت یہ میری گفتگو کا موضوع نہیں ہے۔ بہرحال اس بات کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام اگر آسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف انقلابی عمل کے ذریعے سے ہی آسکتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر بات ہے کہ جب پاکستان کی غالب آبادی سُنّی آبادی ہے تو یہاں جو بھی انقلاب آئے گا اور اس کے نتیجہ میں یہاں جو بھی نظام قائم ہوگا وہ سُنّی تصوّرِ خلافتِ عامّہ پر مبنی ہوگا نہ کہ شیعی تصوّرِ امامتِ معصومہ پر ـــــ یہ دونوں تصوّرات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان کو باہم دگر کسی طور پر بھی ملایا نہیں جاسکتا ـــــ ان امور پر میں سابقہ تقریر میں قدرے تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ وہ انقلاب اگر آئے گا تو خالصتہً اس نہج پر آئے گا کہ جس نہج پر محمد صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے انقلاب برپا کیا تھا۔ اس کے لئے پچھلی مرتبہ میں نے امام مالک رحمہ اللّٰہ کا یہ قول بھی آپ کو سنایا تھا کہ: لا یصلح اٰخر ھٰذہ الامّۃ الّا بما صلح بہٖ اوّلھا۔ "اس امّت کے آخری حصّہ کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر صرف اس طریق پر کہ جس پر پہلے حصّہ کی اصلاح ہوئی تھی" ـــــ اس قول کے متعلق میرا اپنا جو تأثر ہے اسے ویسے تو ایک اذعانی و وجدانی بات کہا جائے گا لیکن مجھے اس پر اتنا ہی یقین ہے جتنا اس پر ہے کہ کل سورج طلوع ہوگا ـــــ پھر یہ کہ اس کارگاہِ عالم کی زندگی کا آخری دور شروع ہو چکا ہے۔ حالات اس رُخ پر جا رہے ہیں کہ جن کی خبر دی تھی نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے ـــــ اس بارے میں بھی میں گذشتہ تقریر میں اشارات اور قرائن پیش کر چکا ہوں۔

چوتھی بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ آخری دور میں اسلام کے عالمی غلبہ کی جو خبر الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، اس کا بھی عمل یقیناً شروع ہوگا۔ کہاں سے شروع ہوگا اور کس خطۂ ارضی کو یہ سعادت نصیب ہوگی! یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے —— آپ کو معلوم ہے کہ مکہ سے مایوس ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طور پر طائف کا انتخاب فرمایا تھا۔ لیکن طائف میں جو کچھ حضورؐ کے ساتھ ہوا، وہ آپ حضرات کو معلوم ہے۔ یوم طائف کو نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ کا سخت ترین دن قرار دیا تھا۔ وہاں سے آپؐ کو ناکام واپس آنا پڑا —— اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا مدینہ منورہ کا۔ حضورؐ کے قدم مبارک وہاں پہنچے بھی نہیں اور وہاں انقلاب آگیا۔ تمہیداً چھ افراد حج کے موقع پر ایمان لائے۔ اگلے سال ان میں سے پانچ اور سات دوسرے افراد یعنی کل بارہ افراد حاضرِ خدمت ہوگئے۔ انہوںؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسے کتبِ سیرتِ مطہرہ میں بیعت عقبۂ اولیٰ کہا جاتا ہے —— اور درخواست کی کہ ہمیں اپنا کوئی جان نثار شاگرد دیجئے جو ہمیں قرآن پڑھائے۔ اور یثرب میں جو مدینہ منورہ کا پہلا نام ہے دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے۔ لہٰذا حضورؐ نے حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ جاؤ —— انؓ کی ایک سال کی تعلیمِ قرآن اور دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں اگلے سال بہتّر مرد اور تین خواتین کل پچھتّر افراد آگئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت ہوگئی اور یہ بیعت ہجرت کی تمہید بن گئی۔ اسے بیعتِ عقبۂ ثانیہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان پچھتّر انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا ہے کہ حضورؐ آپ ہمارے یہاں تشریف لائیے۔ اگر قریش یثرب پر حملہ آور ہوں گے تو ہم آپؐ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ بعدہٗ جب حضورؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں استقبال کی تیاریاں تھیں۔ کئی دن سے روزانہ لوگ شہر سے باہر آکر آپؐ کی تشریف آوری کے منتظر رہتے تھے۔ یہاں مکہ میں قریش خون کے پیاسے ہیں جہاں تیرہ برس حضورؐ نے بنفسِ نفیس دعوت دی —— وہاں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تین دن رات غارِ ثور میں روپوش رہنا پڑا ہے۔ پھر یہ کہ تعاقب ہو رہا ہے۔ سراقہ ابنِ مالک جو بعد میں دولتِ ایمان سے بہرہ مند ہوگئے دو مرتبہ قریب پہنچ گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر حفاظت فرمائی ہے —— مکہ کا حال تو یہ ہے اور اہلِ مدینہ سراپا انتظار آپؐ کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں اور حضورؐ کا وہاں داخلہ ہو رہا ہے ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت

سے۔ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ تو یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت میں ہوتا ہے کہ وہ کس جگہ کو سعادت عطا فرمائے۔ کون سے مقام کو چن لے۔ یہ اسی کا انتخاب ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور عالمی سطح پر دینِ حق کے غلبہ کا آغاز کس ملک سے ہوگا! لیکن یہ بات میں پورے یقین و وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ آخری دور کے بارے میں جن واقعات وحالات کی خبریں احادیثِ صحیحہ میں دی گئی ہیں، وہ دور آچکا ہے۔ اس کا آغاز ہوگیا ہے۔ کسی نہ کسی خطۂ ارضی کو یہ سعادت حاصل ہو کر رہے گی کہ اسے اللہ تعالیٰ منتخب فرمالے صحیح اسلامی انقلاب کے لئے ـــــ اور یہ انقلاب بالکل اسی نہج پر آئے گا جس نہج پر برپا فرمایا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول امام مالکؒ لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا۔ تو یہ 'آخر' والی بات شروع ہو چکی ہے۔ ان شاء اللہ کہیں نہ کہیں اُسی نہج پر انقلاب آئیگا جو عالمی سطح پر غلبۂ دین کی تمہید بنے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ پاکستان کا یہ خطۂ ارضی جو حقیقت کے اعتبار سے مملکتِ خداداد ہے۔ یہ ہمارے قوتِ بازو اور ہماری جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ اس سعادت کے لئے قبول فرمالے۔ میں پچھلی مرتبہ عرض کرچکا ہوں کہ بظاہر احوال مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے سامنے آتے ہیں پھر امید بندھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے۔ اس کی شانِ والا تبار یہ ہے کہ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ۔ اُسے ہر شے پر قدرت حاصل ہے۔ وہ شر سے خیر برآمد کرتا ہے جس کا کہیں سان گمان تک نہیں ہوتا ـــــ لہٰذا ہمیں اس تبارک و تعالیٰ کے فضل اور قدرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم معروضی طور پر یعنی Objectively غور کریں۔ اور سمجھیں کہ انقلاب کا "محمدی طریق" ہے کیا؟ علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔

اب میں اپنی اصل گفتگو کا آغاز کر رہا ہوں اور اس کو میں تین مرحلوں میں آپ کے سامنے رکھوں گا ـــ ایک بات تو بالکل آغاز ہی میں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے واقعات وحالات کے حوالوں اور References کے بغیر اصولی طور پر یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ انقلاب کسی بھی نوع کا ہو اس کے لئے چھ مراحل طے کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ اس نتیجہ تک مجھے پہونچانے والا ذریعہ سیرت النبیؐ ہی ہے اور میں اس بات تک سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعے سے پہنچ پایا ہوں۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ سیرتِ مطہرہ کے دوران جو حالات و واقعات پیش آئے ان سے استقراء کے ذریعہ سے، انہیں خاص سے عام کرکے انہیں generalize کرکے جو اصول و مبادی مستنبط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں پہلے میں آپ کے سامنے یہ بات رکھوں گا کہ انقلابی عمل کے مراحل، مدارج اور لوازم کیا کیا ہیں؟ پھر دوسری بات میں یہ بتاؤں گا کہ اس مستنبط خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے ہمیں سیرتِ مبارکہؐ سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ کیا ہے؟؟ اور تیسری بات جو عملی اعتبار سے میرے لئے اور آپ حضرات کے لئے بہت ضروری ہے، یہ ہوگی کہ ہمارے حالات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ سعید کے حالات میں بہرحال چودہ سو برس سے کچھ زیادہ ہی مدت کا فصل ہے۔ حالات میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا ہے۔ انسان کے تمدنی و عمرانی تصورات میں بہت کچھ ارتقاء ہوا ہے۔ پھر ایک نمایاں ترین فرق یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا انقلابی عمل ایک خالص مشرکانہ و کافرانہ ماحول میں پایۂ تکمیل کو پہونچا تھا جبکہ ہمیں اسلامی انقلاب کے لئے جو کام کرنا ہے، وہ مسلمانوں میں کرنا ہے، کافروں میں نہیں کرنا۔ لہٰذا ان حالات کی بنا پر ہمیں غور کرنا ہوگا کہ جو طریقِ کار ہمیں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ملتا ہے آیا بعینہٖ وہی ہوگا یا اس طریقِ کار میں ہمیں درپیش حالات کے فرق و تفاوت کی وجہ سے کہیں کہیں کچھ اجتہاد کرنا ہوگا! یہ ہے تیسری اہم ترین بات اس لئے کہ کوئی سلیم العقل شخص بھی بہرحال اس کی نفی نہیں کرسکتا کہ ایک معاملہ ہے خالص مشرکوں اور کافروں میں کام شروع کرنے کا اور ایک معاملہ ہوگا ان لوگوں میں کام کرنے کا جو بہرحال اعتقاداً اور قانوناً مسلمان ہیں۔ وہ مدعی ہیں کہ ہم توحید کو بھی مانتے ہیں، رسالت کو بھی ختم نبوت و تکمیل رسالت کے عقیدہ کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ الغرض خود کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہونے کے مقر ہیں۔ چاہے ان کی عظیم اکثریت بے عمل ہو۔ سیرت و کردار کے اعتبار سے ان کی عظیم اکثریت اور غیر مسلموں کے مابین کوئی فرق نہ رہ جائے۔ لیکن یہ بڑا عظیم فرق ہے کہ بہرحال وہ مسلمان ہیں[۱]۔ لہٰذا ان حالات میں منہج انقلاب میں کیا فرق و تفاوت ہونا چاہئیے! تیسری بات پر تفصیلی گفتگو کے ضمن میں یہ امر بھی حسبِ موقع زیرِ بحث آئیگا۔
اب آئیے ابتدائی بات کی طرف۔ میں نے عرض کیا تھا کہ انقلاب کسی بھی نوع کا ہو، اس

---

[۱] راقم کو اس موقع پر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کے لئے چھ مراحل سے گزرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ اعلام و ابلاغ کے لئے ان چھ مراحل کو تین تین مرحلوں کے دو دو حصوں میں تقسیم کر لیجئے۔ اب اس تقسیم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے چونکہ میری گفتگو میں ان کا بار بار حوالہ آئے گا ــــ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنی پہلی تقریر[1] میں عرض کیا تھا کہ موجودہ دور میں انسانی زندگی کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک انفرادی اور دوسرے اجتماعی ــــ مذہب کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے اور اجتماعیت کے لئے بنیاد ہے سیکولرازم (Secularism) یعنی لادینیت ــــ میں نے لامذہبیت نہ پہلے کہا اور نہ اب کہہ رہا ہوں۔ اس لئے کہ سیکولرازم مذہب کو تسلیم کرتا ہے لیکن اسے صرف انفرادی زندگی میں دائرہ قرار دیتا ہے۔ اس انفرادی مذہبی زندگی کے بھی تین حصے ہیں۔ عقیدہ[1] (Dogma)۔ عبادات[2] (Rituals) اور چند سماجی رسوم (Social Customs) ــــ ادھر اجتماعی زندگی کے بھی تین حصے ہیں۔ معاشرتی نظام[1]۔ معاشی نظام[2] اور سیاسی نظام[3]۔ گویا تین گوشے انفرادی زندگی کے اور تین گوشے اجتماعی زندگی کے۔ ملا کر کل 'چھ' گوشے ہو گئے۔

اسی طریقہ سے انقلابی عمل کے مراحل کو بھی اپنے ذہنوں میں ۳+۳ = ۶ کے ہندسہ کے حوالہ سے مستحضر کر لیجئے ــــ پہلا مرحلہ ہے کہ کوئی انقلابی نظریہ، کوئی انقلابی فکر، کوئی انقلابی فلسفہ ہو اور اس کی نشر و اشاعت ہو۔ ظاہر بات ہے کہ انقلاب آتا ہے کسی انقلابی نظریہ کی بنیاد پر۔ اس کا نقطۂ آغاز (Starting Point) یہ ہے کہ اس نظریہ کی نشر و اشاعت کی جائے، اسے پھیلایا جائے، اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور لوگوں کو اس نظریہ کی افادیت کا دلائل سے قائل بنایا جائے۔ اس میں نوٹ کرنے کی اہم بات یہ ہے کہ وہ انقلابی نظریہ اُن تین گوشوں میں سے کسی ایک سے لازماً متعلق ہونا چاہیئے جو اجتماعی زندگی کے ہیں، انقلاب جب ہی

(تسلسل) مولانا کانگریس میں شامل تھے اور لکھنؤ میں اس کے ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے کہ کسی نے تحریری سوال بھیجا "مولانا اسلام کے نقطۂ نظر سے آپ کی گاندھی جی کے متعلق کیا رائے ہے؟" مولانا نے کسی مداہنت و مصلحت کے بغیر دو ٹوک جواب دیا کہ "میں گاندھی جی کو سیاسی اعتبار سے ملک کا عظیم ترین لیڈر تسلیم کرتا ہوں لیکن اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کے مقابلہ میں ایک فاسق و فاجر کلمہ گو کو بھی افضل سمجھتا ہوں"۔ مولانا مرحوم کی یہ حق گوئی بہرحال رنگ لائی اور انہیں طرح طرح سے تنگ کیا گیا اور وہ کانگریس کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

[1] مراد ہے ۳۱/۸/۸۴ والی تقریر "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" (شائع شدہ 'میثاق' بابت جنوری ۱۹۸۵ء) (مرتب)

آئے گا ـــــ اگر مذہبی اصلاح کا کام ہو رہا ہے، عقائد کی تصحیح ہو رہی ہے، عبادات کی ادائیگی کی ترغیب و تشویق ہو رہی ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کی ترویج ہو رہی ہے تو یہ ہیں مذہبی کام، یا بالفاظ دیگر روحانیت اور اخلاقی اصلاح کے کام ـــــ لیکن انقلابی عمل کا آغاز تو کسی ایسے نظریہ کی بنیاد پر ہوگا جس کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی، معاشی زندگی اور سیاسی زندگی سے ہو۔ اس لئے کہ انقلاب کا درحقیقت محل، مقام اور میدان اجتماعی زندگی کا دائرہ ہے۔ لہٰذا یہ بات یہاں نوٹ کرلیں کہ کوئی ایسا نظریہ، کوئی ایسا فلسفہ، کوئی ایسا فکر جو انسان کی اجتماعی زندگی کے کسی گوشے کے بارے میں ایک "انقلابی نظریہ" کو سامنے رکھتا ہو اور وہاں جو نظام قائم ہے اس کی جڑوں پر وہ تیشہ بن کر گرتا ہو تو انقلابی عمل کا آغاز ہوگا۔

دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اس انقلابی نظریہ کو ذہناً قبول کرلیں کہ ہاں یہ صحیح ہے، حق ہے، تو اب ان کو منظم کیا جائے۔ ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے اور یہ بات جان لیجئے کہ اس جماعت کے لئے دو چیزیں لازمی ہونگیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے Cadres، اس کی درجہ بندی بالکل نئی ہونی چاہیئے۔ پرانے نظام کے تحت لوگوں کی جو درجہ بندی ہے اگر وہی درجہ بندی اس جماعت کے اندر ہوگئی تو پھر وہ انقلابی جماعت نہیں ہوگی۔ یہاں تو بالکل نئی درجہ بندی ہوگی کہ کون کس قدر گہری وابستگی (Commitment) اس انقلابی نظریہ سے رکھتا ہے! کس نے اس انقلابی نظریہ کے تقاضوں کو خود اپنے آپ پر لازم کیا ہے! اور کون اس انقلابی نظریہ کے لئے کتنی قربانی دے چکا ہے اور کتنی مزید دینے کو تیار ہے! جس نے جتنی پیش قدمی کی ہے اتنا ہی وہ آگے چلا جائے گا چاہے سابقہ نظام میں وہ شودروں اور اچھوتوں میں شمار ہوتا ہو۔ وہ سب سے گھٹیا لوگوں میں شمار ہوتا ہو۔ اس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ لیکن اگر اس نے اس انقلابی نظریہ کو خلوص و اخلاص اور گہرائی کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی مکمل ذہنی اور عملی وابستگی (Commitment) ہے۔ اس کے لئے وہ قربانیاں دے رہا ہے تو وہ پیدائشی سیدوں سے توقیر، تکریم اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے کہیں آگے نکل جائے گا۔ اگر یہ بات نہیں ہوگی تو وہ جماعت انقلابی جماعت نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ تمام اقدار برقرار ہیں جو سابقہ نظام کے اندر تھیں۔ لہٰذا پہلی چیز تو یہ ہوئی کہ نئے Cadres (درجہ بندی) کے ساتھ نئی پارٹی اور دوسری چیز یہ کہ اس پارٹی کا اگر نظم (Discipline) فوج والا نہ ہو تو یہ پارٹی انقلاب نہیں لاسکتی۔ کوئی ڈھیلی ڈھالی ایسوسی ایشن، کوئی انجمن ٹائپ کی شے، کوئی چار آنے کی ممبری والی جماعت ـــــ کوئی ایسی ہیئت

اجتماعیہ انقلاب نہیں لاسکتی۔ ہر اجتماعی کام کی نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے اسی نوع کی انجمن یا ادارہ یا جماعت کی ضرورت ہے۔ کوئی اصلاحی کام کرنا ہے کوئی انجمن بنا لیجئے۔ کوئی تعلیمی کام کرنا ہے تو کوئی ادارہ قائم کر دیجئے۔ مذہبی دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہے تو کوئی جمعیت بنا لیجئے۔ انتخابی سیاست کا کام کرنا ہے تو ممبری کی کوئی فیس مقرر کر کے بڑے پیمانے پر اپنے ہمخیال افراد کی ممبر سازی کر لیجئے اور ایک سیاسی جماعت بنا لیجئے۔ لیکن اگر انقلاب لانا ہے تو اس کے لئے ایسی " پارٹی" درکار ہوگی جس کے ایک تو Cadres بالکل نئے ہوں اور دوسرے یہ کہ وہ اس طرح مربوط اور منظم ہو کہ اس کا ڈسپلن فوج والا ڈسپلن ہو کر جو حکم ملے مانا جائے ۔ یہ نہیں ہوگا تو انقلاب نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ ایک جمے ہوئے نظام کو اکھاڑ پھینکنا ہے۔ ایک مضبوط طاقت کے ساتھ ٹکراؤ کا مرحلہ آنا ہے۔ اس میں ڈھیلی ڈھالی انجمن ٹائپ ایسوسی ایشن کام نہیں دے سکتی۔

انقلابی عمل میں تیسرا مرحلہ ہوتا ہے Training کا تربیت کا ۔ میں دانستہ طور پر اسلامی اصطلاحات استعمال کرنے سے گریز کر رہا ہوں تاکہ آپ مجرد فلسفۂ انقلاب کو سمجھ لیں، اس کے لئے میں نے ٹریننگ کی وضاحت کے لئے تربیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چونکہ درحقیقت تربیت قرآن و حدیث کی اصطلاح نہیں ہے۔ قرآنی اصطلاح میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ ـــ تربیت ہر انقلابی عمل کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر انقلابی کارکنوں کی تربیت نہ ہو تو وہ خام ہیں، کچے ہیں۔ تربیت ہوگی تو وہ پختہ ہوں گے۔ میں نے مختلف مواقع پر دو شعر سنائے ہیں۔ ایک شعر علامہ اقبال کے مرشدِ معنوی اکبر الٰہ آبادی کا۔ یہ کہ ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

کچے اور خام لوگوں کو جمع کر لیں گے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ٹُس ہو کر رہ جائیں گے۔ اگلے مرحلہ میں جا کر جواب دے جائیں گے۔ وہ خالی کارتوس ثابت ہوں گے۔ یہاں ضرورت ہے کہ ہر کارکن پختہ ہو۔ اس بات کو ڈاکٹر اقبال نے خوب کہا ہے۔ ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ یہ دوسرا شعر بھی میں بار ہا سنا چکا ہوں۔ وہ کہتے ہیں ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

یہی وجہ ہے کہ ہر انقلابی پارٹی کے Training Camps ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ وہ تربیت ہوگی انقلاب کے نظریہ اور فکر کی مناسبت سے۔ اگر انقلاب خالص مادّی اقدار والا انقلاب ہے تو ان کارکنوں کی روحانی تربیت کرنا بیکار ہے۔ لیکن اگر پیشِ نظر وہ انقلاب ہے اور اس نظام کا قیام ہے جس کے اہم ترین ابعاد (Dimensions) اخلاقی اور روحانی ہیں تو اگر یہ چیزیں انقلابی کارکنوں میں نہیں ہوں گی تو انقلاب کے کامیاب ہونے کے نتیجہ میں کہاں سے آجائیں گی! — لہٰذا ایسے انقلاب کے کارکنوں کے لئے اخلاقی و روحانی تربیت بھی لازمی ہوگی بلکہ اس کو اقدمیت و اوّلیت کا درجہ حاصل ہوگا

پس یہ ابتدائی تین مرحلے ہیں۔ ان تینوں کا حاصل کیا ہے! تربیت یافتہ کارکنوں پر مشتمل ایک انقلابی جماعت وجود میں آجائے اور ایک طاقت اور ایک قوت بن جائے !!

اگلے جو تین مرحلے ہیں ان کے لئے جامع عنوان ہے "تصادم" — لفظ ناپسندیدہ ہے۔ اچھا نہیں لگتا۔ امن پسند لوگ اس سے گھبرائیں گے لیکن یہ جان لیجئے کہ انقلاب تصادم کے بغیر نہیں آتا۔

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں !

مذہبی اصلاح کا کام کرنا ہو، کسی تصادم کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف عام نوعیت کی روحانی تربیت گاہیں کھولنی ہوں اور خانقاہی نظام بنانا ہو، کسی تصادم کی ضرورت نہیں ہے۔ خانقاہ میں کوئی مربی، کوئی شیخ بیٹھے ہیں، جو وہاں خود چل کر آئے گا اسے وہ اپنے تربیتی پروگرام میں شامل کرلیں گے۔ بات ختم ہوگئی۔ تصادم کوئی نہیں — لیکن اگر نظام بدلنا مقصود و مطلوب ہو اور پھر تصادم سے گریز ہو تو یہ کیسے ممکن ہے! یہ تو بالکل ایسی بات ہے جیسے دو محالات اور دو متضاد چیزوں کو جمع کرنے کی خواہش ہو — یہ خواہش اپنی جگہ کتنی ہی اچھی ہو لیکن یہ محالِ مطلق ہے، تصادم تو ہوگا یہ انقلاب کے لوازم میں سے ہے —

یہاں ایک اور بات ذہن نشین کر لیجئے کہ واقعات و حالات کے تفصیلی تجزیہ کے نتیجہ سے یہ طے کرنا کہ کس کی زیادتی ہے! کون ظالم ہے اور کون مظلوم! یہ بالکل علیحدہ بات ہے لیکن یہ بدیہی امر ہے کہ تصادم کا آغاز اصل میں انقلابی جماعت کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک نظام قائم و نافذ ہے۔ جیسا بھی ہے وہ چل رہا ہے۔ اگر ظالمانہ، استبدادی اور

استحصالی ہے تو جو مظلوم طبقات ہیں وہ اس نظام کو برداشت اور تسلیم (Resignation) کیے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں ایک جماعت ابھرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ نظام غلط ہے ہم اس کو بدل کر رہیں گے۔ تو درحقیقت تصادم کا آغاز اس جماعت نے کیا۔ اس نے اس نظام کو غلط قرار دے کر اس کو بدلنے کا جو عزم کا اظہار کیا جو وہاں ایک طویل عرصہ سے چلا آرہا ہے۔ جس کے ساتھ لوگوں کی اقدار وابستہ ہیں جس کے ساتھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہیں۔ جو ان کے یہاں قابل احترام روایات کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے وہ انقلابی جماعت کہتی ہے کہ یہ غلط نظام ہے۔ گویا کہ تصادم کا آغاز اصلاً انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اب اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے اسے تین مدارج (Phases) کے حوالوں سے سمجھ لیجئے:

پہلا درجہ ہے Passive Resistance یعنی صبر محض کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انقلابی جماعت اس نظام کو غلط و فاسد قرار دیتی ہے تو لوگ اس جماعت کو چھیڑیں گے نہیں، پہلے وہ کیا کریں گے! انقلابی فکر اور نظریہ کو چٹکیوں میں اڑائیں گے۔ استہزاء اور تمسخر کریں گے۔ فقرے چست کریں گے۔ مذاق اڑائیں گے۔ کہیں گے کہ دماغ خراب ہو گیا ہے دیوانے اور مجنون ہیں۔ لیکن اگر اس انقلابی جماعت کا قائد اور اس کے معدودے چند ساتھی اس وار کو جھیل گئے اور نظریہ کی نشر و اشاعت کا عمل جاری ہے، آگے بڑھ رہا ہے اور لوگ اس کو قبول کر کے جماعت میں شامل ہو رہے ہیں تو مخالفین کو محسوس ہو گا کہ یہ ہوا کا کوئی معمولی جھونکا نہیں ہے اس میں تو ایک زبردست آندھی اور طوفان کے آثار پوشیدہ ہیں جو ہمارے تمام مفادات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائیں گے۔ لہٰذا اب تشدد (Persecution) شروع ہو گا۔ ان کو تعذیب کرو، ان پر تشدد کرو۔ ان کو مارو پیٹو۔ عقوبت اور ایذا رسانی کی کوئی کسر نہ چھوڑو۔ یہ معاملہ پیش آنا لازمی ہے۔ لیکن اس دور کے لئے اس انقلابی جماعت کا پہلا مرحلہ یہ ہو گا کہ ماریں کھاؤ لیکن نہ اپنے موقف سے ہٹو اور نہ ہی اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ چونکہ اگر اس جماعت نے بھی Retaliate کیا یعنی بدلہ میں اس نے بھی ہاتھ اٹھایا اور وہ جماعت بھی Violent ہو گئی، اس نے بھی جواب میں متشددانہ رویہ اختیار کر لیا تو جو جما جمایا نظام ہے اسے اس جماعت کو کچلنے اور نیست و نابود کرنے کا قانونی و اخلاقی جواز مل جائے گا۔ یہ جواز ان کو نہ دیا جائے۔ بے جواز ماریں اور پیٹیں، ایذا رسانی کرتے رہیں یہ بات اور ہے لیکن ان کو یہ الزام لگانے کا موقع ہرگز نہیں ملنا چاہیے

کہ یہ جماعت خود بھی متشدد ہے اور عوام الناس کو بھی تشدد اور بدامنی کے لئے ابھار رہی ہے۔
اس عدم تشدد کی پالیسی پر کاربند رہنے سے وہ لوگ ایذا رسانی اور مارنے سے باز نہیں آئیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلے گا کہ اس معاشرہ کی Silent Majority (خاموش اکثریت) اس جماعت کے حق میں ہموار ہوتی چلی جائے گی۔ قدرتی طور پر ان کے ذہنوں میں یہ سوال ہیجان پیدا کر دے گا کہ آخر یہ لوگ کیوں پیٹے جا رہے ہیں! ان کو ایذائیں کیوں دی جا رہی ہیں! آخر ان کا جرم کیا ہے! کیا انہوں نے چوری کی ہے یا ڈاکہ ڈالا ہے! کسی غیر اخلاقی حرکت کا ارتکاب کیا ہے؟ ـــــ یہ اکثریت ہمیشہ خاموش (Silent) ہوتی ہے لیکن اندھی اور بہری تو نہیں ہوتی! وہ دیکھتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! اور اس کے قلوب و اذہان میں اس انقلابی جماعت کے لئے ہمدردی کے جذبات اور احساسات غیر محسوس طریق پر پروان چڑھتے رہتے ہیں ــــ اور یہ چیز بھی درحقیقت اس انقلابی نظریہ او فکر کے پھیلنے میں ایک اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے لئے بڑا پیارا مصرع ہے کہ ع "جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ" ـــ اندر اندر دل تو مفتوح ہو رہے ہیں۔ چاہے زبانیں خاموش ہیں، لوگوں میں جرأت نہیں کہ وہ سامنے آجائیں۔ لیکن وہ انقلابی نظریہ اور فکر لوگوں کے ذہن و قلب میں ہمدردی بلکہ نظریہ کی حقانیت کے لئے گھر کرتا چلا جاتا ہے۔
اس کے بعد جب طاقت اتنی فراہم ہو جائے کہ وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کرنے کہ اب ہم کھلم کھلا اور برملا اس غلط نظام کو چیلنج کر سکتے ہیں اور اس نظام کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو اس مرحلہ پر۔ یہ صبر محض (Passive Resistance) اپنے اگلے مرحلے یعنی اقدام ـــــ (Active Resistance) میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب حکمت عملی تبدیل ہو گی کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ ان کے تشدد کا جواب بھرپور طریقہ پر دو یا اس نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دو ــــ آگے چل کر ان تمام باتوں کی تشریح ہو جائے گی ــــ اس کے نتیجہ میں چھٹا اور آخری مرحلہ شروع ہو گا اور وہ ہے مسلح تصادم ـــ جب تک وہ انقلابی جماعت اقدام نہیں کر رہی تھی یعنی ماریں کھا رہی تھی اور ہاتھ نہیں اٹھا رہی تھی۔ تب تک اور بات تھی۔ اگر اس جماعت نے بھی ہاتھ اٹھا لیا تو وہ نظام اس پر پوری طاقت اور قوت کے ساتھ حملہ آور ہو گا اور یہ ہے وہ آخری مرحلہ Final Phase جسکے اندر جسمانی ٹکراؤ (Physical Collision) [illegible]

یہ اصطلاح مسلح تصادم یعنی Armed Conflict ــــ اسے آپ اپنے ذہن میں رکھ لیں۔
ظاہر بات ہے کہ جب یہ چھٹا مرحلہ شروع ہو جائے تو فریقین کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ اب تو تاریخ بتائے گی۔ حالات فیصلہ کریں گے اور دو میں سے ایک نتیجہ بہر حال نکلنا ہے اور وہ ہے تخت یا تختہ۔ تیسرا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر پہلے پانچ مراحل صحیح طور پر طے ہوئے ہیں۔ مستحکم ہوتے ہوئے اور Consolidate کرتے ہوئے وہ انقلابی عمل آگے بڑھا ہے۔ صحیح تربیت ہوئی ہے، صحیح تنظیم ہوئی ہے اور خاص طور پر یہ بات کہ پہلے پانچوں مراحل کو طے کرنے کا صحیح حق ادا کیا گیا ہے تو انقلابی جماعت کامیاب ہو جائے گی۔ انقلاب وقوع پذیر ہو جائے گا اور اس انقلابی نظریہ کے مطابق نظام یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ ورنہ اسے کچل کر رکھ دیا جائے گا تخت یا تختہ یہ دو انجام ہیں، تیسرا کوئی نہیں۔

یہ چھ مراحل (Phases) ہیں۔ ان کے متعلق پھر عرض کرتا ہوں کہ ان کو تین تین کے دو حصوں میں تقسیم کر لیجئے۔ پہلے تین مراحل کا حاصل ہے:

کسی انقلابی نظریہ، فکر، فلسفہ کو قبول کرنے والوں کا ایک تربیت یافتہ اور منظم جماعت کی شکل میں وجود میں آجانا ـــ

دوسرے حصّہ کے بھی تین مراحل ہیں اور وہ ہیں:

صبر محض (Passive Resistance)۔ اقدام (Active Resistance)
اور مسلح تصادم (Armed Conflict) اور اس کا نتیجہ تخت یا تختہ۔

اب اگر انقلاب کامیاب ہو جائے تو ایک ساتواں مرحلہ (Seventh Phase) اور شروع ہوگا۔ ان چھ مراحل سے تو کسی ایک ملک میں انقلاب کی تکمیل ہوتی ہے۔ ساتواں مرحلہ ہوتا ہے اس انقلاب کی توسیع۔ اس لئے کہ ایک نظریاتی انقلاب کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ جغرافیائی اور قومی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ ایک فکر، ایک فلسفہ، ایک نظریہ کی بنیاد پر آتا ہے اور نظریہ وہ شے ہے کہ اس کے لئے نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہے نہ ویزا کی حاجت ہے۔ نظریہ کے لئے سرحدیں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ نظریہ تو امریکہ جیسے دور دراز ملک سے چلتا ہے اور پاکستان پہونچتا ہے۔ نظریہ کے بڑے مضبوط پر ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ اڑتا ہوا سرحدوں کے تمام موانعات (Barriers) کو عبور کرتا ہے۔ اگر اس نظریہ میں جان ہے تو وہ دوسرے ممالک میں اپنی جڑیں قائم کرے گا جس کے نتیجہ میں انقلاب کی توسیع

ہوگی اور وہ پھیلے گا۔ جیسے انقلابِ فرانس۔ فرانس تک محدود نہیں رہا۔ بالشویک ریوولیوشن یعنی اشتراکی انقلاب صرف روس تک محدود نہیں رہا۔ انقلاب کا یہ خاصہ ہے کہ پہلے کسی ایک ملک کسی ایک علاقے (Home Ground) میں آتا ہے۔ وہاں اس کے ثمرات کا ظہور ہوتا ہے پھر اس کی بین الاقوامی سطح پر توسیع کا عمل شروع ہوتا ہے۔

انقلاب کے ان سات مراحل (۳+۳+۱) کے متعلق سمجھ لیجئے کہ میں نے ان کو اخذ کیا ہے سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے۔ اس کے سوا میرا ماخذ اور کوئی نہیں ہے۔ میں یہ بات بار بار عرض کر چکا ہوں کہ کامل اور ہمہ گیر انقلاب کا منہاج اور نقشہ صرف مل ہی سکتا ہے سیرتِ محمدی سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں کامل انقلاب (Total Revolution) صرف اور صرف حضرت محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا ہے۔ باقی دنیا کے جو انقلابات مشہور ہیں وہ جزوی انقلاب تھے۔ فرانس کے انقلاب سے صرف سیاسی ڈھانچہ بدلا۔ معاشی نہیں بدلا۔ معاشرتی نہیں بدلا۔ روحانی و اخلاقی نہیں بدلا۔ عقائد نہیں بدلے۔ روسی انقلاب سے صرف معاشی ڈھانچہ بدلا۔ سیاسی ڈھانچہ میں ایک جزوی تبدیلی یہ آئی کہ صرف ایک پارٹی ہی کے نمائندوں پر مشتمل حکومت کا نظام قائم ہوگا ___ انسانی زندگی کے چھ کے چھ گوشوں اور حصوں یعنی عقائد، عبادات، سماجی رسوم، معاشرتی سسٹم، معاشی و اقتصادی سسٹم اور سیاسی سسٹم کو بدلا ہے تاریخ انسانی میں تو صرف ایک مرتبہ بدلا اور یہ بدلا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ پس جسے کامل، ہمہ گیر، گمبھیر اور Total Revolution کہا جائے تو وہ ہے ہی ایک، صرف ایک اور وہ ہے صرف رسولِ آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا برپا کیا ہوا انقلاب ___ حضورؐ کے لائے ہوئے انقلاب کے متعلق میں یہ کہا کرتا ہوں کہ ہمیں ڈھونڈے سے بھی اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی جو یکسر تبدیل ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهٗ کی جدوجہد، سعی و کوشش، محنت، مشقت اور ایثار و قربانی کے نتیجہ میں لاکھوں مربع میل زمین کے ایک ملک کے رہنے والوں کی زندگیوں میں ایک ایسا انقلابِ عظیم برپا ہوگیا کہ ان کی سوچ بدل گئی، ان کا فکر بدل گیا، ان کے عقاید بدل گئے، ان کی اقدار بدل گئیں، ان کے عزائم بدل گئے، ان کے مقاصد بدل گئے، ان کی آرزوئیں بدل گئیں، ان کی تمنائیں بدل گئیں، ان کے دن بدل گئے، ان کی راتیں بدل گئیں، ان کی صبحیں بدل گئیں، ان کی شامیں بدل گئیں، ان کی زمین بدل گئی، ان کا آسمان بدلا

گیا۔ یہاں تک کہ اگر پہلے انہیں زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہوگئی۔ جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے۔ جو اُمّیِ محض تھے وہ متعدد علوم و فنون کے موجد بن گئے۔ جو بے شمار مظالم اخلاق میں مبتلا اور ان کے خوگر تھے وہ مکارم اخلاق کے معلّم و داعی بن گئے۔ جو زانی اور نفس پرست تھے، وہ عصمت و عفت کے محافظ بن گئے۔ جو بے قید حصول معاش کے عادی اور اسراف و تبذیر کے خوگر تھے وہ مال و دولت کے امین بن گئے[1]۔ یہ تھی گھمبیرتا، ہمہ گیری اور برکت اس انقلاب کی جو برپا فرمایا حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

پھر صرف یہی بات قابلِ ذکر نہیں ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی میں انقلابی عمل کی تکمیل دنیا میں صرف ایک بار ہی ہوئی ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ اہم قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انقلابی عمل کے تمام کے تمام سات مراحل آپ کو ایک فردِ واحد کی زندگی میں نظر آجائیں! یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کی کوئی نظیر ہی نہیں سوائے خاتم النبیین سیّد المرسلین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایک فردِ واحد ۶۱۰ء عیسوی میں ایک انقلابی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور ۶۳۰ء یعنی کل بیس برس میں عرب میں انقلاب تکمیل پا جاتا ہے۔ باقی دو سال اس انقلاب کی توسیع کے عمل میں گزرے ہیں ــــ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد مختلف سربراہان مملکت کو دعوتی خطوط ارسال کئے گئے تھے۔ اور سفارتیں بھیجی گئی تھیں۔ ۸ھ میں مکّہ فتح ہوگیا۔ اس کے بعد کے دو سال کے عرصہ میں جنگ موتہ ہوئی جس میں سلطنت روما جیسی وقت کی سپرطاقت کے ساتھ مسلّح تصادم ہوا۔ اس کے بعد ۹ھ میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں سفرِ تبوک ہوا۔ اس موقع پر تیس ہزار جان نثار حضوؐر کے جلو میں تھے۔ قیصر روم ایک لاکھ سے بھی متجاوز کیل کانٹے سے لیس افواج کے ساتھ فلسطین اور شام کے سرحدی علاقوں میں موجود تھا۔ لیکن یہ بھی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے کہ اس کو نبی اکرمؐ کے مقابلہ میں آنے کی ہمّت نہیں ہوئی ــــ اس کی صرف یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ ہرقل قیصر روم دل میں حضوؐر کی نبوّت و رسالت کا قائل ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ کسی دل سے ٹکراؤ کا مطلب تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لئے وہ دو بدو مقابلہ سے پہلو تہی کر گیا۔ ایمان اس لئے نہیں لایا کہ اس طرح اسے اپنی گدّی سے محروم ہونا پڑتا ــــ پھر یہ کہ حضوؐر نے وفات سے چند دن قبل حضرت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے محترم ڈاکٹر صاحب کی معرکۃ الآراء تصنیف "نبی اکرمؐ کا مقصدِ بعثت اور انقلابِ محمدیؐ کا اساسی منہاج" (مرتّب)

اسامہ ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی سربراہی میں شام کی ایک مہم کے لیے لشکر ترتیب فرمایا۔ وہ لشکر ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ مرض نے شدت اختیار کی اور ربیع الاوّل سنہ ۱۱ھ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلرَّفِیقُ الْاَعْلٰی کی طرف مراجعت فرمائی۔

اب آپ اندازہ کیجیے کہ اکیس بائیس برس کے لگ بھگ مختصر ترین عرصہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی انقلاب کی از ابتداء تا انتہا بنفسِ نفیس تکمیل فرما دی، جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہ پہلے موجود تھی نہ تاقیام قیامت ملے گی۔ ہم جو تیئس برس کہتے ہیں وہ قمری سال ہیں۔ میں نے جو بات عرض کی ہے وہ شمسی تقویم کے اعتبار سے کی ہے ۔۔۔ دنیا کے جو دوسرے دو انقلابات مشہور ہیں یعنی فرانس اور روس کے انقلابات۔ تو ایک طرف یہ انقلابات جزوی تھے اور دوسری طرف قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان انقلابات کا فکر دینے والے اور تھے اور انقلاب برپا کرنے والے اور ۔۔۔ پھر انقلابی فکر پیش ہونے اور اس کے نتیجہ میں عملاً انقلاب بپا ہونے میں اچھا خاصا زمانی فصل ہے۔ انقلابِ فرانس اس فکر کے نتیجہ میں رونما ہوا جو والٹیر اور روسو جیسے بیشمار مصنفوں کی کتابوں کے ذریعہ کافی عرصہ تک پھیلتا رہا ۔۔۔ اسی طرح انقلابِ روس کی اساس کارل مارکس کی کتاب "داس کیپٹال" پر قائم ہوئی لیکن خود مارکس کی زندگی میں ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان تک پیدا نہ ہو سکا۔ مارکس جرمنی کا رہنے والا تھا لیکن انقلاب روس میں آیا اور اس کی موت کے قریباً پچاس سال بعد لینن جیسی فعّال شخصیّت کے ہاتھوں آیا اور وہ بھی اس لئے کہ روس کے داخلی معاملات اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ وہ بالشویک انقلاب کے لئے سازگار ہو گئے تھے میں اس بات کا پھر اعادہ کر رہا ہوں کہ اکیس بائیس برس کے لگ بھگ اس مختصر سے عرصہ میں ایک عالم گیر انقلاب کی تکمیل جس میں انقلاب کے جملہ مراحل کی تکمیل دنیا کی تاریخ میں صرف ایک بار ہوئی اور وہ حضرتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے ہوئی ہے۔

میں پھر اس بات کا اعادہ کر رہا ہوں کہ انقلاب کے میں نے جو مراحل بیان کئے ہیں تو اس کے استنباط کا میرا ذریعہ (Source) صرف اور صرف سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ میں بار بار اس کا اعادہ اس لئے کر رہا ہوں کہ چند لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے جب میں دوسروں کا حوالہ دیتا ہوں کہ شاید یہ بات میں نے ان سے سمجھی ہے۔ مجھے دنیا کے دوسرے انقلابوں میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں تو صرف توثیق (Confirmation

کے طور پر ۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ دنیا نے وہ چیزیں لی ہیں تو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ سے لی ہیں ۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست!! یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

نبی اکرمؐ کے سعید و مبارک دور کے بعد دنیا نے جو کچھ سیکھا ہے وہ حضورؐ سے ہی سیکھا ہے ۔ یا انسان ٹھوکریں کھا کھا کر چار و ناچار اسی منزل کی طرف پیشقدمی کر رہا ہے کہ جس منزل پر پہونچایا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۔۔۔ لہٰذا میں پھر ایک بار عرض کر رہا ہوں کہ انقلابی عمل کے مراحل کے استنباط کے لئے میرا ماخذ صرف اور صرف سیرت النبی ہے ۔ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ۔

میری آج کی گفتگو کا پہلا مرحلہ تو مکمل ہوا ۔ اب سیرت النبیؐ کا جائزہ لینا شروع کیجئے کہ کس ترتیب سے یہ چھ قدم وہاں اٹھائے گئے ۔ پہلا قدم ہوتا ہے ایک انقلابی نظریہ، فکر اور فلسفہ سے متعلق ۔ انقلابِ محمدی اور دوسرے انقلابات کے مابین اس اعتبار سے فرق کیا ہے ۔؟ یہ کہ دنیا کے دونوں مشہور و معروف انقلابات کے لئے نظریہ، فکر اور فلسفہ انسانی ذہنوں کی پیداوار تھا ۔ جبکہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ نظریہ، فکر اور فلسفہ وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ۔ پہلا عظیم ترین فرق تو یہ نوٹ کیجئے ۔ پھر یہ بات ذہن نشین کیجئے کہ یہ نظریہ ہے 'توحید' ۔ کامل ترین اور خالص ترین توحید ۔ اور جس کی بنیاد ہے قرآنِ حکیم ۔ اس قرآن کے ذریعہ سے یہ انقلابی نظریہ لوگوں کے سامنے آنا شروع ہوا ۔ اس حقیقت کو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں بیان کیا مولانا حالیؔ نے ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور ؎ وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

اور نہایت پُرشکوہ الفاظ میں بیان کیا علامہ اقبالؔ نے ؎

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزیں ۔ قوم و آئین و حکومت آفریں
در آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست اُو زندہ و پائندہ و گویاست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

انقلابی نظریہ توحید۔ قرآن اس کی بنیاد — دعوت قرآن کی۔ تبلیغ قرآن کی۔ انذار قرآن سے۔ تبشیر قرآن سے۔ تذکیر قرآن سے۔ حتّٰی کہ تزکیہ یعنی تربیت بھی قرآن سے۔ اس پر آگے ان شاء اللہ ذریعے تفصیلی گفتگو ہوگی۔ حاصلِ کلام یہ کہ:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مرکز و محور اور منبع و سرچشمہ ہے قرآن مجید' فرقانِ حمید!!

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے — یہ بہت اہم نکتہ ہے جسے لوگ سمجھ نہیں پاتے — وہ یہ کہ حضوؐر کی دعوت کو جہاں تک 'نظریہ' کہا جائے گا تو اس انقلابی نظریہ کے تین حصّے شمار کئے جائیں گے: توحیدؔ۔ رسالتؔ اور معادؔ یا آخرت — ان میں سے جہاں تک نظام کا تعلق ہے وہ درحقیقت نظریہ توحید پر ایمان لانے سے ہے۔ آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تربیت اور صحیح تعمیر کی بنیاد بنتا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اصل میں اسی تربیتی مراحل کی چیزیں ہیں۔ اشخاص کی سیرت و کردار کو اس خاص سانچہ میں ڈھالنا کہ جس سانچہ کے ڈھلے ہوئے کارکنوں کے ذریعہ سے اسلامی انقلاب آسکے۔ اس تربیت کا پروگرام ان چیزوں پر مشتمل ہے۔ دل میں چھپے ہوئے امراض اور روگوں کا مداوا اور علاج بھی قرآن اور اس تربیتی پروگرام ہی سے ہوتا ہے جس کے لئے دینی اصطلاح تزکیہ ہے۔ الغرض ایمان بالآخرت انسان کے جذبۂ عمل کو متحرک (Motivate) کرنے کا نہایت مؤثر عامل ہے — رسالت پر ایمان کا تعلق قانون سے ہے۔ حضوؐر کو دل و جان سے رسول تسلیم کرنے اور آپؐ کی دی ہوئی تمام خبروں کی تصدیق کا نام ہی دراصل ایمان ہے۔ ان کے بغیر ہم نہ توحید کو صحیح معنوں میں جان سکتے ہیں' نہ آخرت کو مان سکتے ہیں۔ اور نہ ہی اعمالِ صالحہ اور افعالِ سیئہ کو صحیح طور پر پہچان سکتے ہیں۔ یہی مطلب' مفہوم اور مقصود ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ

"تم میں سے کوئی شخص مؤمن ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لیکر آیا ہوں۔"

میں نے ابھی عرض کیا کہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انقلابی نظریہ، دعوت لے کر تشریف لائے وہ درحقیقت توحید ہے۔ لہٰذا اس انقلابی فکر اور فلسفہ کے متضمنات (corollaries)، اس کے مضمرات، اس کے مقتضیات، اس کے بدیہی نتائج و عواقب کو سمجھنا ضروری ہے جس کے بغیر توحیدِ کامل اور توحید خالص کے انقلابی پہلو کا صحیح ادراک و شعور مشکل ہے۔ اس پہلو سے تین چیزیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

سب سے پہلی چیز ہے حاکمیتِ انسانی کی کُلّی نفی۔ یہ سب سے بڑا، سب سے عظیم انقلابی نظریہ ہے۔ اس تک انسان کا اپنا ذہن رسائی کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا علم صرف وحی الٰہی کے ذریعے سے حاصل ہونا ہی ممکن ہے۔ اس بات کو پہلے بھی مشرکین نے مانا ہے اور آج بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کی تکوینی حاکمیت صرف اللہ ہی کی ہے۔ لیکن یہ بات کہ دنیا میں تشریعی حاکمیت مطلقہ بھی صرف اللہ کے لئے ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ اور اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ اور تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ۔ اور لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

تو اس نظریہ کو نہایت شدّ و مد اور محکم دلائل و براہین کے ساتھ قرآن مجید ہی نے پیش کیا ہے۔

اب یہی موضوع ایک مفصّل گفتگو کا متقاضی ہے۔ لیکن میں اشارات ہی پر اکتفا کروں گا۔ اب آپ غور کیجئے کہ فرانس کے انقلاب نے کیا کیا تھا۔ صرف ایک ہی چیز میں تبدیلی کی تھی وہ یہ کہ حاکمیت کسی خاندان یا فرد کی نہیں ہے بلکہ عوام کی ہے۔ گویا

ان امور کی تفہیم کے لئے محترم ڈاکٹر صاحب کی دو کتابوں، ایک "نبی اکرمؐ کا مقصدِ بعثت" اور دوسری "نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" کا مطالعہ ان شاء اللہ بہت مفید رہے گا۔

لمیت ایک خاندان یا فرد کے ہاتھ سے لے کر جمہور کو دے دی گئی۔ صرف یہی تبدیلی
رونما ہوئی اور تو کوئی نہیں۔ اس انقلاب کا لبِ لباب یہی ہے کہ:

"حاکمیت (Sovereignty) کسی مخصوص فرد یا کسی شاہی خاندان
کے ساتھ متعلق نہیں ہے۔ بلکہ فی الحقیقت حاکمیت کا تعلق عوام کے ساتھ ہے۔

یہی نظریہ ہے جمہوریت کا۔ سارا جھگڑا اسی کا ہے۔ سارا فساد اسی کا ہے کہ حاکمیت کس کی!
ختیار کس کا!! قانون بنانے اور دینے کا مجاز کون!!! یہ ہے اصل میں سارے بس کی گانٹھ۔ اور
انقلاب کہ حاکمیت کو افراد اور خاندانوں سے نکال کر عوام میں لے آنا تو اس کے لئے کتنا خون
بنا پڑا ہے۔ فرانس کا انقلاب بڑا ہی خونیں انقلاب تھا۔ شیر کے منہ سے نوالہ نکالنا کوئی آسان
کام ہے! جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں Divine
بھی Rights of Kings کا سکہ جاری تھا۔ بادشاہوں کو تو خدائی اختیار حاصل ہیں انہیں
کون چیلنج کر سکتا ہے! دنیا میں عام طور پر بادشاہوں کے لئے یہی تصور دیا گیا جیسے ہندوستان
میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان تھے اور مصر میں فرعون تھا۔ راع یعنی سورج کو مصری
بھی اپنا سب سے بڑا دیوتا مانتے تھے۔ تو ان خاندانوں کا تعلق نام نہاد دیوتاؤں اور دیویوں سے
جوڑا گیا۔ ان کو چھیڑا نہیں جا سکتا۔ حکومت کرنا ان کا حق ہے۔ اور ان کی بے چون و چرا اطاعت
کرنا اور ان کو خراج ادا کرتے چلے جانا عوام کا فرض ہے۔ یہ فلسفے مذہبی سطح پر چلائے گئے
نام نہاد مذہب نے ہمیشہ اس تصور کو تحفظ دیا ہے۔ چونکہ پنڈتوں، پوپ، پجاریوں، پروہتوں
پادریوں اور Priests کے مفادات اسی مشرکانہ تصور سے وابستہ رہتے تھے اور رہتے
ہیں۔ دیوی دیوتا کے نام سے جو بڑے مناور اور ہیکل تعمیر کئے جاتے تھے اور کئے جاتے
ہیں اور حضرت عیسٰی علیہ السلام اور مریم صدیقہ کے نام پر جو بڑے بڑے کلیسا گرجے اور چرچ
بنائے جاتے تھے اور بنائے جاتے ہیں ان پر عوام الناس جو چڑھاوے چڑھاتے تھے اور
چڑھاتے ہیں وہ کہاں جاتے تھے اور جاتے ہیں! کیا ان بتوں اور مجسموں کے پیٹوں میں!! وہ
سب ان لوگوں کے پیٹ میں جاتے تھے اور جاتے ہیں جن کے القاب پ سے شروع
ہوتے ہیں اور جو میں نے ابھی آپ کو گنوائے ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک پ (پیر) کا اور
اضافہ کر لیں جو ہمارے یہاں رائج ہے جن کی اکثریت نے اسے پیشہ بنا رکھا ہے اور اس نے

حاکمیت کے بجائے شفاعت باطلہ کا تصور جہلا کے ذہنوں بٹھا کر اولیاء اللہ کے مقابر کو آستانوں کا درجہ دے رکھا ہے اور اس طرح آمدنی کا ذریعہ پیدا کر رکھا ہے۔ بقول شاعر ؎

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج

بہرحال سارا جھگڑا حاکمیت کا ہے۔ حاکم و مختارِ مطلق کون ہے! اب آپ سوچئے کہ انسانی سطح پر حاکمیت کی تبدیلی ایک فرد یا ایک خاندان کی حاکمیت کے بجائے عوام کی حاکمیت لانے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تو یہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو برپا فرمایا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ جسے یوں تعبیر کیا علامہ اقبال نے کہ ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

یہ عظیم ترین انقلابی نظریہ ہے: اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ ــــ اس کے سوا کوئی حاکم مطلق نہیں ہے۔ نہ کوئی فرد، نہ کوئی خاندان نہ کوئی قوم۔ نہ پوری نوعِ انسانی۔ انسان کے لئے حاکمیت کی نفیٔ مطلق ہے۔ انسان کے لئے تو خلافت ہے۔ اور وہ بھی عوامی خلافت ہے ــــــــــــ خلیفہ بھی آسمان سے مقرر نہیں ہوتا۔ میں اہلِ سنّت اور اہلِ تشیّع کا اساسی و بنیادی فرق و اختلاف گذشتہ تقریر میں وضاحت سے بیان کر چکا ہوں [1]۔ اہلِ تشیّع کے نزدیک امامت صرف ایک خاندان کا حق ہے اور ان کے نزدیک امام مامور من اللہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مطاعِ مطلق بھی ہوتا ہے اور معصوم عن الخطاء بھی۔ ہمارا تصور و عقیدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ مامور من اللہ اور معصومیت خاصّۂ نبوّت و رسالت ہیں۔ جناب محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نبوت ختم ہوئی اور رسالت کی تکمیل ہوگئی۔ لہٰذا معصومیت بھی ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم ہوگئی۔ کوئی خلیفہ یا امام مامور من اللہ نہیں ہے۔ کوئی معصوم نہیں ہے اور نہ تا قیام قیامت ہو سکتا ہے ــــ ہمارے عقیدہ کے مطابق خلافت ہے مسلمانوں کی۔ خلافتِ عامّہ ــــ عوام الناس اپنی رائے سے جس کو چاہیں خلیفہ چن لیں گویا کہ وہ اپنے حقِ خلافت کو تفویض (Delegate) کر رہے ہیں ایک شخص کو کہ وہ ان کا سربراہ ہے۔ لہٰذا نوٹ کیجئے گا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے لئے اصطلاح استعمال کی تھی خلیفۃ رسول اللہ اور عام طور پر زبان زد ہوئی اصطلاح خلیفۃ المسلمین ــــ خلافتِ راشدہ درحقیقت تمتہ اور ضمیمہ تھی دورِ نبوت کی ــــ

---

[1] یہ مفصل تقریر دو اقساط میں 'میثاق' کے اپریل اور مئی ۸۵ء کے شماروں میں شائع ہو چکی ہے

وہ مشن جو حضورؐ کو دیا گیا تھا۔ هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ . لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۔ اس کی توسیع اور عالمی سطح پر اس کی تکمیل کے لئے در اصل یہ خلافت کا نظام قائم کیا گیا تھا کہ ایک ملک میں اللہ کے دین کو بنفسِ نفیس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے غالب اور قائم فرما دیا اور پھر پورے کرۂ ارض پر اسے غالب کرنے کا کام حوالے فرما دیا امت کے ـــ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ مشن دے کر حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔ لہذا یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ اسی لیے صدیق اکبرؓ پہلے خلیفہ راشد نے اپنے لئے خلیفۃ رسول اللہ کا کا لفظ اختیار کیا۔ لیکن آئندہ مستقل طور پر اسلامی خلافت کا سربراہ خلیفۃ المسلمین یا امیر المؤمنین کہلائے گا۔ یعنی اصل میں تمام مسلمان ہیں خلافت کے اہل اور حامل۔ وہ جب اپنی رائے سے کسی کو خلافت کی ذمہ داری تفویض کریں گے تو وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہوگا ـــــــــــــــــ

ـــ یہ ہے سب سے پہلا انقلابی تصور جس کا تعلق ہے سیاسی ڈھانچے سے۔

اسی توحید کے نظریہ کا بدیہی نتیجہ ہے جسے اس دور میں پوری طرح کھول کر بیان کرنے اور واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ انسان کی ملکیتِ مطلقہ کی نفی کامل ہے۔ جیسے کوئی حاکم مطلق نہیں ویسے ہی کوئی مالکِ مطلق نہیں۔ حاکمِ حقیقی بھی اللہ ہے اور مالکِ حقیقی بھی اللہ ہے ـــ قرآن مجید میں جس طور پر مختلف اسالیب سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کا اثبات فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ملکیتِ مطلقہ کا بھی مختلف اسالیب سے اثبات کیا گیا ہے۔ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ اور لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ اللہ کی اسی ملکیت مطلقہ کے اظہار کے لئے قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے۔ یہاں لِلّٰهِ اور لَهٗ میں حرفِ جار لام کے متعلق تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ لام تملیک بھی ہے اور لام استحقاق بھی ـــ پھر سورہ آلِ عمران میں: وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط اور سورہ منافقون میں: وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فرما کر مسئلہ کو بالکل واضح اور منقح کر دیا کہ جس طرح حاکمِ حقیقی صرف اللہ ہے اسی طرح کائنات کی ہر شے کا مالکِ حقیقی بھی صرف اللہ ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کو بڑے دل نشین اسلوب سے ادا کیا ہے ؎

این امانت چند روزہ نزد ماست　　　در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست

اسی مفہوم کو علامہ اقبال یوں ادا کرتے ہیں ؎

بندۂ مومن امیں، حق مالک است　　　غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است

حاصلِ کلام یہ ہوا کہ جیسے حاکمیت کے باب میں حاکمیت کے بجائے خلافت ہے۔ ویسے ملکیت کے ضمن میں ملکیت کے بجائے امانت ہے جو کچھ انسان کے پاس ہے یا جو کچھ وہ جائز طریقہ سے حاصل کر رہا ہے۔ اس حصول پر بھی قدغنیں ہوں گی۔ ناجائز طریقہ سے حاصل کرے گا تو ضبط کر لیا جائے گا اور تادیب کا سزاوار ٹھہرے گا۔ لیکن انسان جائز طریقہ سے جو جو کچھ حاصل کرے گا تو وہ اس کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اس میں تصرّف بھی صرف جائز طریقہ سے کیا جا سکے گا۔ ناجائز طریقہ سے تصرّف ہوگا تو تصرّف کا اختیار بھی ساقط ہو جائیگا۔

—— یہ بھی بہت بڑا انقلابی نظریہ ہے۔ ایک وہ تصوّر ہے کہ ذاتی ملکیت کا حق بڑا مقدّس ہے۔ میری شے ہے۔ میں جس طرح چاہوں استعمال کروں۔ میرا اختیار مطلق ہے۔ میں جو چاہوں کروں۔ ملکیت کا مطلب تو یہی ہے۔ میری بکری ہے۔ میں جب چاہوں ذبح کر دوں۔ تم کون پوچھنے والے! میرا پیسہ ہے، میں جس طرح چاہوں اسے invest کروں۔ میں نے شراب خانہ کھولا ہے میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا جو آکر پینا چاہے پیئے۔ نہ پینا چاہے نہ پیئے۔ میں نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ میں بھی آزاد ہوں، وہ بھی آزاد ہے۔ میں نے قمار خانہ، قحبہ خانہ، نائٹ کلب اور اسی قبیل کے کاموں میں اپنا سرمایہ لگایا ہے۔ کوئی ان میں دلچسپی لے یا نہ لے۔ میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ یہ تصور اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام میں امانت کا تصوّر ہے جس کی امانت ہے اس نے جس حد تک اور جن پابندیوں کے ساتھ تصرّف کا حق دیا ہے، اس حد تک تصرّف کر سکتے ہو۔ اس سے تجاوز کرو گے تو مجرم شمار ہو گے۔ غور کیجئے کہ معاشی سطح پر یہ کتنا عظیم انقلاب ہے۔ مجھے علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آرہے ہیں ؎

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف ... منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب ... پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اس عقیدہ توحید کا جو تیسرا انقلابی پہلو ہے اس پر گفتگو سے قبل چند اہم باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ اس توحید کا ایک اعتقادی پہلو ہے۔ کسی کی عبادت اور پرستش نہ ہو سوائے اللہ کے : لَا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِیَّاہُ ۔ کسی کو رکوع و سجدہ نہ کیا جائے سوائے اللہ کے۔ کسی سے دعا نہ کی جائے سوائے اللہ کے : لَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ۝ اس کا کوئی نِد، اس کی کوئی ضِدّ، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کا کوئی کفو، اس کا کوئی ہم سر نہیں : فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا —— اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَکُنْ

لہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ اس کے سوا کوئی حاجت روا، دستگیر اور پشت پناہ نہیں ہے۔ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ۝ نذر و نیاز، قربانی الغرض کوئی بھی تعبدی عمل اس کے سوا کسی اور کے لئے نہیں ہے: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ یہ تمام امور یقیناً عقیدہ توحید کے مظاہر اور اس کے لوازم ہیں ـــــ ان میں ذرا سی اونچ نیچ اور کمی بیشی ہوئی تو توحید ختم ہوئی اور شرک لازم ہو گیا۔ پھر تو معاملہ وہ ہو جائے گا جس کی طرف سورہ یوسف کی اس آیت مبارکہ میں توجہ دلائی گئی ہے: وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ ۝ ـــــ میں اس وقت عقیدہ توحید کے انقلابی پہلوؤں کو بیان کر رہا ہوں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ معاذ اللہ توحید صرف یہ ہے۔ توحید کا پوری انسانی زندگی پر محیط ہونا ایمان کا لازمی تقاضا ہے ـــ توحید کی چھاپ تو پوری زندگی پر ہونی لابدمنہ ہے ـــ لیکن اس وقت کی اور اس دور کی شدید ضرورت ہے کہ عقیدہ توحید نے اجتماعی زندگی کے ان تین گوشوں یعنی معاشرتی، معاشی اور سیاسی گوشوں میں جو عظیم انقلاب برپا کیا ہے اسے نہایت وسیع پیمانے پر محکم دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسی کے ذریعہ سے موجودہ باطل اور مادہ پرستانہ تمام نظریات اور نظام ہائے زندگی کا ابطال اور اسلام کی حقانیت کا احقاق ہو سکے گا۔ سیاسیات کے شعبہ میں توحید کا انقلابی تصور یہ ہے کہ ہر نوع کی حاکمیت انسانی کا خاتمہ۔ حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کی ہے۔ سیاسی سطح پر انسان کے لئے اسلام نے خلافت کا اصول دیا ہے۔ معاشیات اور اقتصادی شعبہ میں توحید کا انقلابی تصور یہ ہے کہ انسان کی ملکیت مطلقہ کا خاتمہ۔ ملکیتِ مطلقہ صرف اللہ کی ہے۔ اس سطح پر ہمارا دین امانت کا تصور دیتا ہے ـــــ ان دونوں امور پر میں گفتگو کر چکا ہوں وہ بھی اختصار کے ساتھ۔ چونکہ وقت کی محدودیت کی وجہ سے تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ اور تیسرے شعبہ یعنی معاشرتی سطح پر عقیدۂ توحید کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ اب اس کے متعلق مجھے اختصار سے کچھ روشنی ڈالنی ہے۔

انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ جہاں ایک طبقہ خدائی اختیار (Divine Right) کا مدعی رہا ہے اور جہاں انسان ملکیت مطلقہ کی ضلالت میں مبتلا رہا ہے وہاں وہ اس گمراہی میں بھی ٹھوکریں کھاتا رہا ہے کہ انسانوں میں ذات پات اور اونچ نیچ کی تقسیم ہے۔ جبکہ توحید کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں۔ کوئی اونچ

نہیں ، کوئی نیچ نہیں، کوئی اعلیٰ نہیں، کوئی ادنیٰ نہیں۔ یہ برہمن اور شودر کی تقسیم، یہ رنگ و نسل پر افتخار انسان کے اپنے ذہن کے تراشے ہوئے فلسفے ہیں ـــــ یہ انسان کے تنگ ذہن اور قلب کے تراشیدہ اصنام ہیں۔ معاشرتی سطح پر توحید کا انقلابی تصور یہ ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً " اے نوعِ انسانی بندگی اختیار کرو اس مالک اور پروردگار کی جس نے ایک جان سے تمہیں پیدا کیا۔ پھر اس ایک جان سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر اس جوڑے سے دنیا میں کثیر تعداد میں مرد و عورت کو پھیلا دیا۔" یعنی پوری نوعِ انسانی ایک ہی جوڑے کی اولاد ہے ـــــ بدقسمتی سے توحید کے ماننے والوں میں بھی مرورِ زمانہ اور دوسروں کی دیکھا دیکھی اونچ نیچ کی تقسیم آگئی ہے۔ سیّد زادہ وہ چاہے واقعی سیّد زادہ ہو یا بنا ہوا سیّد ہو۔ وہ چاہے زانی اور شرابی ہو۔ اس کے گھٹنے کو احترام کے ساتھ ہاتھ لگایا جائے گا۔ یہی صورتِ حال، یہی تقسیم وڈیروں، زمینداروں اور ان کے مزارعین اور پیروں اور ان کے مریدوں کے مابین دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ سب کہاں سے آیا؟ ایک طرف نسل کی نفی اور دوسری طرف نسل پرستی کا یہ عالم! ـــــ اگر کامل سماجی مساوات نہیں ہے تو کسی درجہ میں بھی وہ معاشرہ اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟!

یہ ساری تقسیمیں غلط ہی نہیں موجبِ فساد ہیں۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں اس لئے کہ سب کا خالق ایک اللہ ہے اور سب ایک انسانی جوڑے آدم اور حوّا کی اولاد ہیں۔ تو کون اونچا اور کون نیچا! کون اعلیٰ اور کون ادنیٰ! نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حجّۃ الوداع میں اعلانِ عام فرما دیا:

لیس لعربی علی عجمی فضل ولا لعجمی علی عربی فضل ولا لاسود علی ابیض فضل ولا لابیض علی اسود فضل الا بالتقوٰی

"نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو گورے پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے۔ بنائے فضیلت صرف تقوٰی ہے۔"

فضیلت اگر کوئی ہے تو وہ خدا ترسی اور اعلیٰ سیرت و کردار کی بنا پر ہے اور وہ معاملہ آخرت میں ہوگا۔ تمام انسان اس دنیا میں کامل سماجی مساوات رکھتے ہیں۔

غور کیجئے کہ اس سماجی و معاشرتی مساوات کا تعلق بھی توحید ہی سے ہے چونکہ تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ سب برابر ہو گئے۔ کوئی چھوٹا اللہ کسی کا پیدا کرنے والا ہوتا اور کوئی بڑا اللہ کسی اور کا پیدا کرنے والا ہوتا تو اونچ نیچ ہو جاتی۔ یا جیسے ہندوؤں میں تصور ہے کہ برہمن تو ایشور کے سر سے پیدا ہوا ہے اور شودر اس کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک ایشور ہی میں یہ تقسیم کر دی۔ توحید یہ ہے کہ ایک ہی اللہ سب کا پیدا کرنے والا ہے اور سب انسان ایک ہی انسانی جوڑے کی اولاد ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

(سورہ الحجرات آیت نمبر ۱۳)

"لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے (جدا جدا) خاندان، قبیلے (اور قومیں) بنائیں تو باہم شناخت اور تعارف کے لئے (نہ کہ فخر و تکبر کے لئے) بے شک تم میں سے عزت دار تو اللہ کے نزدیک وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ (سب کچھ) جاننے والا اور باخبر ہے"۔

اس وقت تک گفتگو کا نتیجہ اور حاصل یہ ہوا کہ اسلام کا انقلابی نظریہ ہے توحید ـــ اس کی دعوت پر مشتمل ہے قرآن مجید۔ لہٰذا دعوت، تبلیغ، تذکیر، تبشیر، انذار اور تربیت و تزکیہ یہ سب کام ہوں گے بذریعہ قرآن ـــ ان تمام کاموں کے لئے انذارِ آخرت نہایت اہم ہے۔ لیکن یہ انذارِ آخرت دراصل انسان کی انفرادی اعلیٰ سیرت کی تعمیر کے لئے بنیادی پتھر ہے ہے جس پر ایک بندۂ مومن کا کردار اور سیرت آگے بڑھے گی۔ آخرت پر یقین، محاسبہ پر یقین، جزا و سزا پر یقین۔ اس کے بغیر اس سیرت کی تعمیر محال ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے ـــ اس تعمیرِ سیرت کے پروگرام کی تقویت کے لئے ذرائع کے طور پر نماز ہے، روزہ ہے، حج اور زکوٰۃ ہے۔ دوامِ ذکرِ الٰہی ہے وغیرہ وغیرہ ـــ یہ تمام چیزیں درحقیقت انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے ہیں ـــ انقلاب کے اعتبار سے جیسا کہ میں قدرے تفصیل سے عرض کر چکا ہوں انقلابی نظریہ عقیدۂ توحید

کی یہ تین Colloraies یعنی تین لوازم اور نتائج ہیں۔ نمبر ایک: معاشرتی و سماجی کامل مساوات۔ دوسرے: معاشی سطح پر ملکیتِ مطلقہ کے تصور کا خاتمہ اور اس کے بجائے امانت کا تصور اور تیسرے: سیاسی سطح پر جو اہم ترین ہے۔ حاکمیتِ مطلقہ نہ کسی ایک فرد کی ہے، نہ کسی مخصوص خاندان کی ہے، نہ قوم کی ہے، نہ عوام کی ہے اور نہ پوری نوعِ انسانی کی ہے۔

It belongs to Allah and Allah alone.

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری

پس اسلامی انقلاب کے لئے اصل میں ان چیزوں کو Emphasize کرنا ہوگا۔ ان کی اہمیت کو واضح، نمایاں اور اجاگر کرنا ہوگا۔ ان کو نظرانداز کر کے زور ہو جائے نماز اور روزے وغیرہ پر تو درحقیقت انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہوگا۔ کچھ مذہبی اور اخلاقی اصلاح کا کام ہو جائے گا۔ کچھ لوگ اچھے مسلمان بن جائیں گے۔ یہ اور ایسے دوسرے کچھ اچھے کام ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن انقلابی عمل کا آغاز ہی نہیں ہوگا۔

اب اگلی بات لیجئے وہ ہے تنظیم ـــــ منظم کرو، مربوط کرو ـــ اس کے لئے قرآن مجید کی تین اصطلاحات خاص طور پر اپنے ذہن میں رکھئے۔ پہلی بات ہے: بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ـــ جب تک یہ کیفیت نہ ہو تنظیم وجود میں نہیں آسکتی۔ اس کے لئے بنیاد کیا ہے! سمع وطاعت، سنو اور اطاعت کرو: وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا (Listen and obey) ـ یہ دوسری بات ہوئی۔ اب اس میں تیسرا عنصر شامل کریں تو وہ ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ جو لوگ ہمسفر ہیں، ساتھی ہیں، ان کے لئے نہایت مہربان، نہایت نرم، نہایت ہمدرد و دمساز۔ لیکن کفار جو مقابل ہیں ان کے لئے نہایت سخت محسوس ہو جائے کہ ان کے اندر کسی قسم کی لچک کا امکان نہیں Uncompromising

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

تنظیمی اعتبار سے جب تک ایک ایسی مضبوط جماعت موجود نہ ہو انقلاب کا عمل شروع نہیں ہو سکے گا ـــــ ایسی جماعت کے وجود میں آنے کی اساسات کیا ہیں! اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ میں ہمیں دو چیزیں نظر آتی ہیں ـــ اصل بنیاد تو یہ ہے حضورؐ نے دعوٰی کیا کہ میں نبی ہوں رسول ہوں: اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ جس نے مان لیا اور جو ایمان لے آیا گویا وہ ہمہ تن، ہمہ وجود مطیع ہو گیا۔ یہ اتنی منطقی بات ہے کہ جب

تسلیم کر لیا کہ حضورؐ اللہ کے رسول ہیں اور " وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ تو اس کے بعد کسی مسلمان کا کچھ کہنے اور حضورؐ کے فرمان اور رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے دینے کا حق باقی کب رہ گیا ـــ! البتہ انتظامی امور کے متعلق صحابہ کرامؓ بڑے ادب و احترام کے ساتھ دریافت کر لیا کرتے تھے کہ آپؐ نے یہ جو تدبیر فرمائی ہے تو یہ آپؐ کا ذاتی اجتہاد ہے یا بذریعہ وحی اللہ کے حکم سے فرمائی ہے! اگر حضورؐ نے فرمایا کہ یہ فعل وحی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ذاتی اجتہاد پر مبنی ہے ـ تب اپنی رائے دینے کی جرأت کرتے تھے کہ حضورؐ پھر اپنے تجربے اور فہم کی بنیاد پر ہم عرض کریں گے کہ فلاں معاملے کی تدبیر اس طرح کی جائے تو مناسب ہوگا ـــ اس کی متعدد مثالیں سیرتِ مطہرہ میں موجود ہیں ـــ مثلاً غزوۂ بدر کے لئے حضورؐ نے مسلمانوں کے کیمپ کے لئے جو مقام معیّن فرمایا تھا تو صحابہؓ نے بڑی لجاجت سے عرض تھا کہ حضورؐ اگر وحی کی بنیاد پر یہ انتخاب ہے تو سرِ تسلیم خم ہے ـــ لیکن اگر یہ اجتہاد کا معاملہ ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جگہ جنگ کی حکمتِ عملی (War Strategy) کے اعتبار سے یہ جگہ مناسب نہیں ہے بلکہ فلاں جگہ مناسب ہے ـ تو حضورؐ نے وہاں کیمپ لگوا دیا۔ ـــ یہی معاملہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا تھا۔ اس موقع پر تین اطراف سے مدینہ منورہ کی چھوٹی سی بستی پر کفّار نے یورش کی تھی۔ جنوب سے قریش آ گئے، شمال سے یہودی آ گئے۔ اور مشرق سے بنو غطفان کے قبائل آ گئے۔ حضورؐ کو بڑا دکھ تھا کہ میری وجہ سے آج مدینہ کی بستی گھیراؤ میں آ رہی ہے۔ انہوں نے مجھے اور میرے صحابہؓ کو اپنے یہاں پناہ دی اور میرا ساتھ دیا جس کی وجہ سے ان پر یہ قیامت ٹوٹ پڑنے والی ہے۔ تو انصارؓ پر نرمی کے خیال سے حضورؐ نے یہ تجویز پیش فرمائی کہ اگر آپ لوگ چاہیں تو بنو غطفان کے ساتھ ہم یہ معاملہ کر لیں کہ مدینہ کی پیداوار کا کوئی حصہ ان کو بطور خراج دینے کی پیش کش کریں اور وہ اگر واپس چلے جائیں تو ہم پھر ان دو دشمنوں سے نمٹ لیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے انصارؓ کے حوصلہ کی پختگی (Morale) کا جائزہ لینے کے لئے یہ بات بطور تجویز پیش فرمائی ہو۔ واللہ اعلم! تو انصارؓ نے عرض کیا حضورؐ! اگر یہ تجویز وحی کی بنیاد پہ ہے تو سرِ تسلیم خم ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ قبائل ہم سے کبھی جاہلیت میں بھی خراج نہ لے سکے۔ آج ہم اسلام میں آ کر ان کو خراج دیں! ایسا نہیں ہو سکتا ـــ حضورؐ نے شاباش دی ـــ تو یہ بات جان لیجئے کہ نبی کے ساتھ تعلق یہ ہوتا ہے کہ جہاں حکم آ جائے اور ساتھ

ساتھ یہ صراحت ہو کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو اس کے بعد سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں ۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں مشورہ کی گنجائش ہو تو مشورہ دو : وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔" اے نبی آپ ان سے مشورہ کرتے رہا کریں"۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۔" لیکن جب آپ فیصلہ کر لیں تو پھر اللہ پر توکل کریں"۔ وہاں گنتی کی بنیاد پر کبھی فیصلے نہیں ہوئے کئی بار ایسا ہوا ہے کہ حضورؐ نے اپنی ذاتی رائے کے مقابلے میں صحابہ کرامؓ کی رائے قبول فرمالی ۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ رسول اور امتی کا تعلق ہی وہ ہے کہ اس سے زیادہ مضبوط اور Disciplined جماعت کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ۔

لیکن اب میں جو بات عرض کرنے والا ہوں اس پر اپنی توجہ کو مرتکز فرمائیے ، بہت اہم نکتہ ہے ۔ اگر یہ کام صرف حضورؐ کے دستِ مبارک سے ہونا ہوتا تو تنظیم کے لئے کسی دوسرے بنیاد اور اساس کو واضح کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔ لیکن اگر یہ ایک جاری و ساری عمل ہے اسے آگے بھی چلنا ہے ۔ جیسے اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ ہے کہ اگر تعالیٰ ہمیں یہ ارادہ عطا فرمادے کہ ہمیں خالص اسی نہج پر انقلاب برپا کرنا ہے جس پر حضورؐ نے برپا فرمایا تھا ۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد نبی تو کوئی نہیں تو پھر کس بنیاد پر لوگ جڑ کر ایک تنظیم بنیں گے ! یہ تعلق کس اساس پر قائم ہوگا ! وہ کوئی جمہوری تنظیم ہوگی ! دستوری تنظیم ہوگی ! گنتی کی اساس پر فیصلے ہوا کریں گے !! کیا ہوگا ! اس کے لئے حضورؐ نے رہنمائی ہمیشہ ہمیش کے لئے چھوڑی ہے اس طریق کار کو اختیار فرما کر جسے ہم لفظ بیعت کے نام سے جانتے ہیں ـــــ اللہ کا کوئی بندہ کھڑا ہو ـــــ وہ نبی نہیں ہوگا ، وہ رسول نہیں ہوگا ۔ لیکن وہ اللہ کی توفیق سے کھڑا ہو اور پکارے کہ میں اسلامی انقلاب کی طرف پیشقدمی کرنا چاہتا ہوں ۔ کون ہے جو میرا ساتھ دے ! : مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ـــــ لوگ اسے ٹھوک بجا کر دیکھیں ۔ جائزہ لیں ۔ اس کی سیرت و کردار کو پرکھیں ۔ اس کی پوری تاریخ کو دیکھیں ۔ اپنی حد تک اطمینان کی کوشش کریں کہ یہ شخص بہروپیا تو نہیں ۔ واقعتہً کوئی کام کرنا چاہتا ہے ۔ اور اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو متضاد اور متناقض ہو اس کام سے جس کا بیڑا اٹھا کر یہ کھڑا ہوا ہے ۔ فی الجملہ اس کے فکر اور اس کے خلوص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ۔ لہٰذا اس صورت میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں ـــــ یہ ہے بیعتِ سمع و طاعت ۔ جس کے لئے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیلی ہدایات چھوڑی ہیں ۔ حضورؐ نے کئی بیعتیں لی تھیں ۔ دو کا تو میں نے آج ذکر کیا ہے

بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ ـــــ ایک بیعت وہ ہے جس کی ابدالآباد تک تلاوت ہوتی رہے گی۔ وہ ہے بیعتِ رضوان : لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ـــــ آپ حضرات مجھے بتائیے کہ وہ چودہ سو اصحابِ رسولؐ جو مدینہ منورہ سے چل کر حدیبیہ تک گئے تھے، اگر حضورؐ جنگ کا فیصلہ فرماتے تو کیا ان میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹ جاتا؟ ـــــ پھر بیعت حضورؐ نے کیوں لی! اس مسئلہ پر میں نے بہت غور کیا ہے اور میری پختہ رائے یہ بنی ہے کہ اصل میں یہ بعد والوں کے لئے سنّت اور اسوہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا ہے۔

پس یہ بنیاد ہے تنظیم کی۔ اور اس تنظیم میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ہر قسم کے نسلی اور قبائلی امتیازات کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ اب یہ نہیں ہے کہ کوئی قرشی ہے تو اس کا اونچا مقام ہے اور اگر کوئی حبشی ہے تو اس کا نیچا مقام ہے۔ یہ تقسیم ہے تو یہ جاہلیت کی تقسیم ہے۔ یہ اسلام کی تقسیم نہیں ہے ـــ وہاں کیا تبدیلی ہوئی ہے۔ اس کا ایک واقعہ میں آپ کو سنا دوں ـــ سہیل ابن عمرؓ کون تھے؟ ذرا نوٹ کیجئے۔ یہ وہ صاحب ہیں کہ جو حدیبیہ میں قریش کے نمائندے کی حیثیت سے صلح کی شرائط طے کرنے آئے تھے ـــــ تو ان کا قریش میں کتنا اونچا مقام ہوگا کہ وہ صلح کی شرائط کی Negotiation (گفت و شنید) کے لئے قریش کی طرف سے بااختیار نمائندہ بن کر آئے تھے۔ ذہانت کتنی ہے! اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جب نبی اکرمؐ نے صلحنامہ تحریر کرانا شروع کیا کہ "یہ معاہدہ ہے محمد رسول اللہ اور قریش کے مابین" تو انہوں نے فوراً اعتراض کر دیا کہ "نہیں یہاں محمد رسول اللہ کے الفاظ نہیں آئیں گے"۔ اس لئے کہ اگر حضورؐ کو "رسول اللہ" مان لیں تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ نیچے تو دستخط دونوں فریقوں کے ہونے تھے۔ سہیل ابن عمر نے کہا کہ "یہ لکھا جائے گا کہ یہ معاہدہ ہے محمد ابن عبداللہ اور قریش کے مابین" ـــــ حضورؐ مسکرائے کہ کوئی مانے نہ مانے آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن آپؐ نے اس اعتراض کو تسلیم فرما لیا۔ یہ ہیں سہیل ابن عمر۔ فتح مکّہ کے بعد وہ بھی ایمان لے آئے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کا ایک واقعہ ہے کہ قریش کے یہ چوٹی کے فرد سہیل ابنِ عمرؓ فاروقِ اعظمؓ کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آنجنابؓ نے ان کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ ان کے بعد چند اور اصحابؓ آ گئے جو سابقون الاولون میں سے تھے یا اصحابِ بدر و احد میں سے تھے یا بیعتِ رضوان یعنی اصحابِ شجرہ میں سے تھے

تو آپؐ نے حضرت سہیلؓ کو کچھ پیچھے جانے کے لئے فرمایا اور ان حضراتؓ کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ پھر چند اور اصحاب آگئے، ان کو اور پیچھے ہٹایا اور اُن کو قریب بٹھایا۔ لوگ آتے رہے اور حضرت عمرؓ ان سہیلؓ کو پیچھے ہٹاتے رہے۔ ہوتے ہوتے سہیلؓ جوتیوں تک پہنچ گئے تب ان کی قرشیت کی جو حمیت تھی وہ ذرا جاگی۔ انہوں نے شکوہ کیا کہ کیا آپؐ کی مجلس میں ہمارا مقام یہ جوتیوں والا رہ گیا ہے! حضرت عمرؓ نے زبان سے کوئی جواب نہیں دیا۔ اشارہ کر دیا۔ " وہ سرحدوں پہ کفار سے جنگیں ہو رہی ہیں ـــــ تم نے وہ تمام مواقع کھو دیئے جو اسلام میں آگے آنے کے مواقع تھے۔ اب بھی موقع ہے۔ وہاں سرحدوں پہ جاؤ اور اسلام کے لئے قربانیاں دو، سرفروشیاں کرو تب تو شاید تمہیں یہ مقام حاصل ہو جائے۔ لیکن نسل اور قبائلی بنیاد پر جو مقامات تھے، وہ ختم ہو چکے" ـــــ یہ اگر نہ ہو تو وہ انقلابی جماعت نہیں ہے ـــ

یہی وجہ ہے کہ بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا بن گئے! عمر فاروقؓ انہیں ہمیشہ "سیدنا بلال" ہمارے آقا بلال کہا کرتے تھے ـــ عمرؓ! ـــ اور وہ حضورؐ کے سوا کسی اور کو "سیدنا" کہہ دیں! انؓ کا مزاج، انؓ کا مقام، انؓ کی اپنی شخصیت کا ایک رنگ! ـــ ہر شخص کی اپنی افتادِ طبع ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ کی اپنی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا۔ لیکن وہ عمرؓ، بلالؓ کا نام نہیں لیتے تھے "سیدنا" کے بغیر۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لئے یہ کہا کرتے تھے کہ "ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا" ابوبکرؓ خود بھی ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار (بلالؓ) کو آزاد کیا تھا ـــ اب یہ فرق و تفاوت رونما ہوا ہے۔ کہاں وہ حبشی! وہ آزاد کردہ غلام! عرب کے اس معاشرے میں غلام آزاد ہو کر بھی نیم غلام تو رہتا ہی تھا۔ اسے مولا کہا جاتا تھا اور اسے آزاد مسلمان کی طرح معاشرے میں برابر کا مقام پھر بھی حاصل نہیں ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ جس کو ختم کرنے کے لئے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عملی سبق دیا تھا کہ جنگ موتہ میں کس کو لشکر کی کمان سپرد فرمائی! زیدؓ بن حارثہ کو ـــ کون ہیں یہ زیدؓ ابن حارثہ! آزاد کردہ غلام ـــ اور ان کی کمان کے تحت کون کون ہے جعفر طیارؓ حضرت علیؓ کے بھائی ـــ اور کون ہیں خالدؓ ابن ولید۔ عبداللہؓ ابن رواحہ اور کیسے کیسے جلیل القدر اصحابِ رسولؐ ـــــ پھر عین مرضِ وفات میں جو لشکر شام کی سرحد کی طرف بھیجنے کے لئے تیار فرمایا تھا۔ اس کی کمان کسے سونپی تھی! انہی زیدؓ کے بیٹے اسا

ـ جن کی عمر بھی اس وقت تیئس چوبیس کی ہوگی اور اکابر صحابہ کرامؓ جیسے حضرت ابوبکرؓ
رت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان کے زیر کمان تھے ـــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں
ا! اس لئے کہ پچھلے نسلی اور قبائلی افتخار کے اگر بت ابھی ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہوں
وہ سب پاش پاش ہو جائیں۔ یہ بالکل نیا نظام ہے جو قائم ہوا۔ یہ تھے اس انقلابی
ٹی کے لئے نئے Cadres اور نئی درجہ بندی۔

پھر اس انقلابی جماعت میں سمع و طاعت کا معاملہ کس نوعیت کا تھا! اس کے لئے دو
ات میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ آج کی گفتگو یہیں پر ختم ہو جائے گی ـــ پورے مکی دور میں
ام صحابہ کرامؓ کے لئے حکم یہ رہا کہ چاہے تمہیں کتنا ہی ماریں، کتنی ہی ایذائیں دیں، حتیٰ کہ تمہیں
ل کر دیں، تم ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے ـــ
ر تاریخ میں اس کی شہادت موجود نہیں ہے کہ کسی نے حضورؐ کے اس حکم کی خلاف ورزی
ا ہو ـــ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں ایسا کوئی حکم نازل نہیں ہوا
ھا۔ جو بدنصیب لوگ سنت کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں، ان کے لئے خاص طور پر نوٹ
رنے کی بات ہے کہ مکی دور میں صحابہ کرامؓ کس حکم پر اس شدت اور سختی سے عمل پیرا
ھے! وہ حکم تھا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ـــ قرآن حکیم میں تو کہیں جا کر سنہ
۶ھ میں سورہ نساء میں یہ الفاظ آئے ہیں: اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا
یْدِیَکُمْ ـ" اے نبیؐ! آپؐ نے ان لوگوں کا حال دیکھا جن کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ
ندھے رکھو"۔ لیکن پورے مکی قرآن میں یہ حکم موجود نہیں ہے ـــ دراصل یہ حکم اللہ کا نہیں
تھا بلکہ محمد رسول اللہ کا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم ـــ اللہ نے تو سورہ نساء کے اندر اس کی توثیق
فرمائی ہے۔ سورہ نساء کی اس آیت سے ہمارے سامنے اس بات کی وضاحت ہو گئی ہے کہ اے
سلمانو! ایک دور وہ تھا کہ جب حکم یہ تھا کہ ہاتھ بندھے رکھو، اس وقت تو تم کہا کرتے تھے کہ
ہمیں جنگ کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اور آج جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے تو گھبرا رہے ہو۔ یہ
بات ہے سورۂ نساء کی آیت ۷۷ کی جس میں وہ الفاظ آئے: کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ـ ورنہ
پوری مکی سورتوں میں کہیں یہ الفاظ نہیں ہیں ـــ دراصل وہ حکم تھا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا۔ یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم حضورؐ کو وحی خفی کے ذریعے سے دیا۔ وحی جلی میں تو
یہ حکم بہر حال موجود نہیں ہے ـــ ایک تو کسی جماعت کا اس درجہ منظم ہونے اور اپنے رہنما

ئد اور لیڈر کے حکم کی پابندی کی ایسی مثال پوری انسانی تاریخ میں آپ کو نہیں ملے گی۔

دوسری اس کے برعکس مثال ہے۔ ایک موقع پر نظم کی عدم پابندی اور حکم عدولی ہوئی۔ وہاں سپلن توڑا گیا۔ پھر اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا دی گئی ہے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا اس ڈسپلن کا کیا مقام ہے جو مطلوب ہے ـــــ غزوۂ احد میں کیا ہوا تھا! اللہ کا وعدہ ماکہ مدد ہوگی اور واقعتہً نصرتِ الٰہی آئی۔ پہلے ہی مقابلے کے اندر کفار کے قدم اکھڑ گئے اور سلمانوں نے انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ لیکن اب وہ پچاس تیر انداز جو ضورؐ کی طرف سے جبل احد کے ایک درّے پر معیّن کئے گئے تھے اور جنہیں حضورؐ نے حکم دیا ماکہ" چاہے ہم سب کے سب شہید ہو جائیں۔ کوئی نہ بچے اور تم دیکھو کہ ہمارے جسموں سے ہمارے گوشت کو نوچ نوچ کر پرندے کھا رہے ہیں تب بھی یہاں سے ہٹنا نہیں" ـــــ کم کی گیرائی کی کوئی انتہا ہے! پچاس تیر انداز تھے جن کے کمانڈر حضرت جبیر ابن مطعم رضی اللہ تعالیٰ نہ تھے۔ ہوا کیا؟ اس واقعہ کو بیان کرتے وقت میں کہا کرتا ہوں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ لیہم اجمعین کی عظمت کو سامنے رکھ کر صورتِ واقعہ کو سمجھئے۔ اصل میں اس موقع پر درّے پر معیّن ان محابہ کرامؓ کی اکثریت سے اجتہادی غلطی ہوئی ـــــ انہوں نے یہ سمجھا کہ حضورؐ کا حکم شکست کی صورت سے متعلق تھا ـــ اب تو برعکس صورت سامنے ہے۔ فتح ہو گئی ہے۔ کفار میدانِ جنگ سے فرار ہو رہے یں۔ لہٰذا اب یہ جگہ چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمیں بھی میدان میں چلنا چاہیئے ـــ لیکن ان کے مانڈر حضرت جبیرؓ ان کو روکتے رہے کہ حضورؐ کے حکم کو سامنے رکھو۔ ہمیں کسی حال میں بھی حضورؐ کے حکم کے فیر یہاں سے نہیں ہٹنا۔ لیکن پچاسؐ میں سے پینتیس۳۵ نے حکم عدولی کی ـــ حضورؐ کے حکم کی جو نافرمانی ہوئی ں کے متعلق تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاویل ہو گئی کہ حضورؐ نے شکست کی صورت میں اس درّے کو چھوڑنے سے منع فرمایا تھا۔ فتح کی حالت کے لئے تو نہیں فرمایا تھا ـــ لیکن اس دستہ کا جو کمانڈر ہے فیصلہ کا فتیار تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ فوج میں جو دستہ کا کمانڈر ہوتا ہے اس کی بات کو ماننا ڈسپلن کا عین قاضا ہے بلکہ فرض ہے۔ دستہ کے سپاہیوں کو کسی حکم کی تاویل کرنے کا قطعی حق نہیں ہے۔ یہ حق صرف س کمانڈر کا ہے۔ اس دستہ کے کمانڈر حضرت جبیرؓ تو اپنے دستہ کو روک رہے تھے۔ لہٰذا ان پینتیس۳۵ نے اپنے کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی کی اور درہ چھوڑ کر میدان میں جا اترے ـــــ خالد ابن ولید جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور جنگ کی حکمتِ عملی کے ماہرین میں جن کا شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے جب اس درّے کو خالی دیکھا تو گھوڑ سواروں کے ایک دستہ کے ساتھ جبل احد کے

ب کا چکر لگا کر درّے کے دوسرے سرے سے حملہ کر دیا۔ پندرہ صحابہؓ جو وہاں رک گئے تھے۔ جن
ضرت جبیرؓ بھی شامل تھے سب کے سب شہید ہوگئے۔ خالد ابن ولید نے مسلمانوں پر پشت
ف سے حملہ کر دیا۔ فرار ہونے والے کفّار نے بھی پلٹ کر ایک زوردار حملہ کیا۔ نتیجہ کے طور پہ ان
ں صحابہؓ کی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی وجہ سے فتح شکست سے بدل گئی ـــــ پینتیس مسلمانوں
م عدولی کی سزا ستّر صحابہ کرامؓ کی شہادت کی صورت میں سامنے آئی۔ حمزہؓ اسد اللہ واسد
ولہ ہزار افراد کے مقابلہ کا ایک فرد، مصعب ابن عمیرؓ جیسی جان نثار شخصیت جن کی تبلیغ و دعوت سے
لہ نے یہ شرف قبولیت عطا فرمایا کہ یثرب دار الہجرت اور مدینۃ النبیؐ بن گیا۔ پھر ان کے علاوہ دوسرے
ن نثار انصار و مہاجرین نے جامِ شہادت نوش کیا۔ کل ستّر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے ـــــ اور
ور خود حضورؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ خود کی کڑیاں رخسارِ مبارک میں گڑ گئیں
پؐ پر غشی طاری ہوتی ہے ـــــ مسلمانوں میں سراسیمگی پھیلی ہے۔ حضورؐ کی شہادت کی خبر اڑی
ے۔ بہت سے صحابہ دل گرفتہ اور مایوس ہو کر بیٹھ رہے ہیں، بھگدڑ بھی مچی ہے ـــــ وہ
جب حضورؐ کی ذرا طبیعت سنبھلی اور آپؐ صحابہ کرامؓ کو لے کر جبلِ اُحُد پر چڑھ گئے ـــــ
ر لوگوں نے آپؐ کو زندہ سلامت دیکھ لیا تو پراگندہ جمعیت دامنِ کوہ میں جمع ہوئی ـــــ
رحال شکست تو ہوگئی ـــ اتنا بڑا چرکہ لگ گیا ـــ بعد میں سورہ آلِ عمران میں اس صورتحال
اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبصرہ نازل ہوگیا : وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ ـــ اے
سلمانو! اللہ کا وعدہ جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔ اللہ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ
بِاِذْنِهٖ ۚ جب تم اس کی اجازت سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے ـــ
للہ کا وعدہ غلط نہیں تھا۔ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ ـــ لیکن جب تم ڈھیلے پڑے۔ تمہارا نظم ٹوٹا۔ تم نے جب وہ چیز
یکھی جو تمہیں محبوب ہے اور اس کے بعد تم نے حکم کی خلاف ورزی کی تب ہم نے یہ سزا دی۔
ـــــ یہاں 'تُحِبُّوْنَ' سے بعض مفسّرین نے مالِ غنیمت کے بجائے سورہ صف کی
آیت کے ان لفظ سے استشہاد کرتے ہوئے : وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ
فَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ سے وہ فتح مراد لی ہے جو بالکل ابتدا ہی میں مسلمانوں کو حاصل ہوتی نظر
آرہی تھی۔ مجھے بھی یہی رائے اپیل کرتی ہے ـــــ البتّہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی
انقلاب کے لئے کیسی تنظیم مطلوب ہے! اور اس میں امیر کی اطاعت کی کیا اہمیّت ہے۔

چاہے وہ پچاس افراد کے دستہ ہی پر امیر کیوں نہ بنا دیا گیا ہو!

بہرحال آج ہم نے ابتدائی تین مراحل میں سے دو مراحل کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ ابھی ہم یہ سارا معاملہ سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے ابتداء میں جو عنوانات مقرر کئے تھے یوں سمجھئے کہ ہم اس وقت تک ان میں سے دوسرے مرحلہ کے درمیان میں ہیں۔ میں نے پہلے سیرتِ مطہرہ اور دینی اصطلاحات سے علیحدہ کر کے مجرّد انقلابی عمل کے چھ مراحل بیان کئے تھے۔ بلکہ اس میں بین الاقوامی مرحلہ کو شامل کیجئے تو سات مراحل بیان ہوئے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ العزیز میں آئندہ اس خاکہ میں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے واقعات کا رنگ بھر کر اسے پیش کروں تاکہ بات پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجائے اور ذہنوں میں بیٹھتی چلی جائے اس کے بعد اس مسئلہ پر ہمیں غور کرنا ہوگا کہ آیا بعینہٖ اور جوں کا توں ہمیں یہی نقشہ اختیار کرنا ہے یا اس میں حالات کی دو تبدیلیوں کی وجہ سے ایک یہ کہ چودہ سو برس میں انسان کے تمدنی و عمرانی شعور میں جو ارتقا ہوا ہے اسے سامنے رکھنا ہے اور دوسرے یہ کہ ایک خالص کافرانہ ماحول میں کام کرنا ہوتا ہے اور ایک مسلمان کے معاشرے میں کام کرنا ہے تو ان کی وجہ سے ہمارے دور میں انقلابی عمل میں کیا کیا فرق و تفاوت وقوع پذیر ہوگا ان کو سامنے رکھ کر ان شاء اللہ آئندہ جمعہ سے گفتگو ہوگی۔

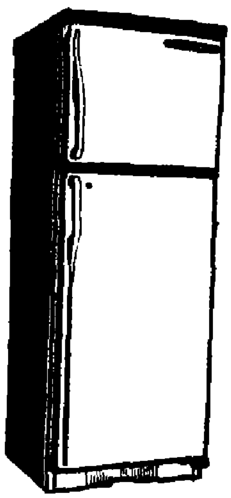
بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ
بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سانیو

SANYO

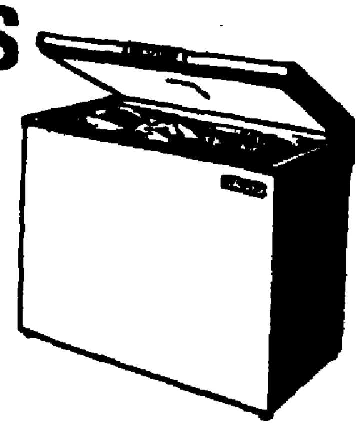
AIRCONDITIONERS REFRIGERATORS & FREEZERS



NO-FROST REFRIGERATORS

with exclusive features

- Two door with built-in lock.
- Spacious freezer compartment with drainage system, a new feature
- Indicator pilot light on front door.
- In 4 pleasing colours (Green, Gold, Almond and White).
- One Year free service and 5 Years Guarantee on Compressor.

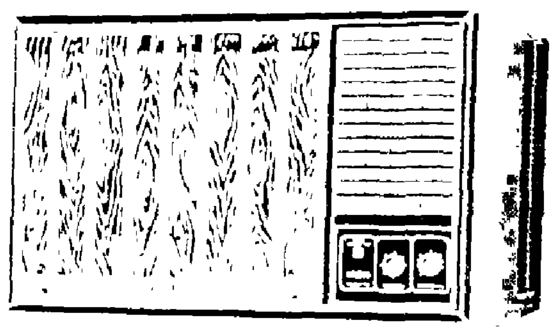


CHEST/UPRIGHT FREEZERS

AIR-CONDITIONERS

new in utility with higher efficiency

Capacity: 1½ Ton, 18000 BTU/h
Noiseless Operation.
Trouble Free Service. Auto Deflector (Swing System).
Brown Teak Wood finish Grill.



Available at all
SANYO
Authorised Dealers

MANUFACTURED/ASSEMBLED IN PAKISTAN

SPECIAL ATTENTION: Please ensure that you get your Worldwide Trading Company's 5 year Guarantee Certificate in order to avail free after Sales Service

SOLE AGENTS IN PAKISTAN FOR ALL SANYO PRODUCTS

WORLDWIDE TRADING CO.

(SANYO CENTRE)
GARDEN ROAD, SADDAR, KARACHI PHONE [illegible]
CABLE: "WORLDBEST" TELEX: 25109 WWTCO PK

786/WW-109/83


فریش ویل
سوئٹس
پاکستانی تہذیب
کا آئینہ دار
صدیوں پرانی روایات کی حامل ہماری مٹھائیاں اور حلوہ جات یقیناً ہمارے ذائقے اور لذت کی غمازی کرتی ہیں۔ احمد نے اس قدیم پیشے کو جدید دور کے تقاضوں سے ہمکنار کیا اور اپنی مصنوعات کو بالکل منفرد انداز میں پیش کیا۔
دنیا کے ہر براعظم میں احمد کی مٹھائیاں اور حلوہ جات پاکستانی تہذیب اور روایات کی شناخت ہیں۔
حلوہ جوزی
Freshwel
جدید ترین نائٹروجن پیکنگ پلانٹ پر سیلوفین پیکنگ کے ساتھ پیک کئے جاتے ہیں تاکہ تازگی اور خستگی ہمہ وقت برقرار رہے
ٹین کے لیڈ بغیر ٹن کو آسانی سے کھل جاتے ہیں۔
سوہن حلوہ
کراچی حلوہ
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
رس گلے
زعفرانی جامن
سوہن ڈیلائیٹ
تلے ہوئے مصالحہ دار بادام
AHMED
مٹھائیوں میں روایتی اور صنعتی معیار کے خالق
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی-۱۱۳۰، سائٹ، کراچی۔ فون: ۲۹۴۷۹۱-۹۸

MASS


THE ORIGINAL
Coca-Cola
Have a Coke and
ile.
THE COCA-COLA
paragon

افکار و آراء

اس عنوان کے تحت شائع شدہ آراء سے ادارہ کا بالکلیہ متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

خراجی زمین کے مسئلہ پر م۔ش (محمد شفیع) کا مکتوب[1]!!

مکرم و محترم جناب ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

آپ کی خدمت اقدس میں یہ عریضہ عجلت میں لکھ رہا ہوں کیونکہ میرے پاس اس وقت آپ کو خط لکھنے کے لئے سفید کاغذ موجود نہیں۔ اور میرے جذبات کا تقاضا ہے کہ میں فوری طور پر آپ سے عرض کروں۔

اس مجمل اور مہمل تمہیدی پیرے کے بعد میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے 'میثاق' کے تازہ ترین شمارے میں ملکی مسائل پر جو تقریر ارشاد فرمائی ہے۔ میں بعض جزئیات کو چھوڑ کر اس سے کلیۃً متفق ہوں۔ آپ نے پاکستان کی اراضیات کے متعلق ان کے خراجی ہونے کے مسئلہ پر جو ارشاد فرمایا ہے اس پر میں آپ کو تحسین اور آفرین کہتا ہوں۔ آپ کی آواز سے مدینے آمین!

موجودہ حکومت جو فوج۔ جاگیرداروں۔ سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے نمائندوں پر مشتمل ہے بوجوہ پاکستان کے عوام کے سیاسی مسائل کے لئے روایاتی مکھی بھی مار نہیں سکے گی۔ ہم پر خونخوار طبقوں کے نمائندے مسلط ہو گئے ہیں انہیں آپ کا اسلام ہی۔ یعنی وہ اسلام جس کی آپ قرآن کریم کی روشنی میں تشریح فرماتے ہیں ختم کر سکتا ہے یعنی ایسا سیاسی دستور جو قرآنی اسلام پر مبنی ہو، موجودہ حکمران استحصال پرست طبقوں سے قوم کو نجات دلا سکتا ہے۔

بے چارے مسلمان داگبہ سے لے کر کاسابلانکا تک فوجی ڈکیٹروں، بادشاہوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے آہنی چنگل میں گرفتار ہیں۔ سو کروڑ مسلمانوں پر مشتمل امتِ محمدیہ اور ملتِ ابراہیمیہ اپنے کردار سے محروم ہو چکی ہے۔ خدا کرے کہ عالم اسلام میں ہر جگہ پر ڈاکٹر اسرار احمد پیدا ہوں جو مسلمانوں کو مسلمان ڈاکو حاکموں سے نجات دلانے کا ذریعہ بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ عاجلہ اور کاملہ عطا فرمائے۔ اور آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ آمین!!

خاکسار: محمد شفیع (م۔ش)

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!!

مکرم جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ میثاق لاہور! السلام علیکم

حال ہی میں ایک دینی ادارے کی جانب سے ڈاکٹر اسرار احمد کے خلاف شائع کردہ ایک پمفلٹ نظر سے

---

[1] مراد ہے ڈاکٹر صاحب کا خطاب جمعہ یکم مارچ ۸۵ء شائع شدہ 'میثاق' بابت اپریل ۱۹۸۵ء (ادارہ)

گزرا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کی بعض تحریروں اور تقریروں کے بعض جملوں کو اپنی طرف سے معانی و مفاہیم پہنا کر اور ان کی آڑ لیکر ڈاکٹر صاحب کی ذات اور ان کے دینی کام پر تنقیدیں ہی نہیں بلکہ مخالفت کی گئی ہے۔ اور اصرار ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے تمام کام کی بساط لپیٹ دیں۔ یہ کام ان کے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ صرف علماءِ حقانی کے کرنے کا کام ہے۔ اغلباً ان علماءِ حقانی سے ان کے خاص حلقے کے علماء مراد ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے ان علماءِ حقانی کی نشان دہی نہیں فرمائی ہے جو دین کا وہ فریضہ انجام دے رہے ہیں جس کی جد و جہد کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی وقف کی ہوئی ہے۔ اگر ایسا کر دیتے تو بہت سے لوگوں کا بھلا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۴۰۴ھ کے آخری جمعہ کو مسجد دارالسّلام لاہور میں ایک تقریر کی تھی جو "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات۔ ان کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات" کے عنوان سے "میثاق" کے ستمبر ۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اس تقریر میں ص۲۴ پر ڈاکٹر صاحب کی بات بایں الفاظ نقل ہوئی ہے:

"دوسری بات یہ کہ تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے درمیان ہمیں ایک معتدل راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ تقلیدِ جامد سے میری مراد کیا ہے! یہ کہ بس ایک فقہ کو اس طرح پکڑ کر بیٹھے ہیں کہ اس سے ذرا بھی ادھر یا ادھر نہ خود ہوں گے نہ برداشت کریں گے۔ انسان اس معاملہ میں اتنا زود حس اور الرجک ہو جائے کہ کسی دوسرے فقہ کی کوئی بات سامنے آئے تو وہ یہ سمجھے کہ میں کوئی اور ہوں اور یہ کوئی اور ہے۔ "من دیگرم تو دیگری" والا معاملہ ہو جائے۔ یہ درحقیقت وحدتِ امّت کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ رہا عوام کا معاملہ تو ان کے بارے میں، میں کہوں گا کہ اتّباعِ رسول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی نیّت سے کسی ایک فقہ کو مستقلاً اختیار کرلیں تو مطلقاً کوئی حرج نہیں۔ وہ تو اپنے مسلک کے معتمد علماء سے جاکر فتویٰ لیں گے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ کی دلیل کیا ہے۔ امام مالکؒ کی دلیل کیا ہے۔ امام شافعیؒ کی دلیل کیا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ کی دلیل کیا ہے۔ اگر معلوم بھی ہو جائے تو ان میں اتنا فہم نہیں ہوتا کہ وہ موازنہ کرسکیں کہ کس کی دلیل قوی اور اقرب الی السنۃ ہے۔ لہٰذا ان کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں۔ چونکہ اہلِ سنّت کے تمام فقہی مسالک و مکاتب کا ماخذ کتاب و سنّت ہی ہے۔"

پھر اسی تقریر میں "میثاق" کے ص۵۰ پر ان کے خیالات بایں الفاظ بیان ہوتے ہیں:

"میں نے اس کے لئے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے۔ میں اپنی بساط سے بڑھ کر ہمّت کر رہا ہوں۔ چونکہ بات سمجھانے کے لئے نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑتی ہیں۔ اصلاً یہ اصطلاح میں نے اپنے فقہی موقف کے لئے وضع کی ہے۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ میں نیم مقلّد

ہوں۔ میں مقلد ہوں پانچ کا، صرف ایک کا نہیں۔ چار تو اہل سنت کے متفق علیہ ائمہ ہیں اور پانچویں امام بخاریؒ جن کی کتاب کے متعلق سب مانتے ہیں کہ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" میں ان پانچ کے دائرے کے اندر اندر رہنے میں اپنے لئے عافیت سمجھتا ہوں۔ اللہ کرے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کسی ایسی عظیم شخصیت کو کھڑا کر دے جس کے تقویٰ، جس کے تدین، جس کے فہم دین، جس کی اصابت رائے، جس کے خلوص و اخلاص پر امت کے بڑے حصہ کا بالخصوص علمائے حق کی اکثریت کا اجماع ہو جائے تو وہ تمام فقہی مسالک میں عمیق غور و فکر کے بعد پوری للّٰہیت اور خدا ترسی کے ساتھ امت کو ایک فقہی مسلک پر مجتمع کر دے تو کر دے اور کسی مسئلہ کے متعلق دین کے دائرے کے اندر اجتہادِ مطلق کر دے تو کر دے۔ اس دور میں میرے نزدیک ہم جیسے ٹٹ پونجیے اس طرح کی حرکت کریں گے تو دین کے خلاف بغاوت اور ایک بہت بڑے فتنہ کا آغاز کرنے کا باعث بنیں گے۔ رہیں اس دائرے کے اندر لیکن یہ نہیں کہ بس ایک ہی ہو۔ عوام کا معاملہ اور ہے وہ اپنے مسلک کے مطابق عمل بھی کریں اور روزمرہ کے مسائل میں اپنے ہی مسلک کے معتمد علماء کی طرف رجوع کریں۔"

ہر وہ شخص جو نظرِ انصاف سے کام لے ان دونوں عبارتوں سے بآسانی یہ بات اخذ کر سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے فقہی مسائل میں اگر توسع کی خواہش ظاہر کی ہے تو وہ وحدتِ امت کے جذبے سے کی ہے اور اس کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ فقہی اصطلاحات کی وجہ سے جو مغائرت پیدا ہوتی ہے وہ دور ہو سکے —— نہ کہ وہ ایک نئی فقہ مدوّن کرنے کی تحریک و دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ عامۃ الناس کے لئے اتباعِ سنت کی نیت سے ایک ہی فقہ کی پیروی میں عافیت سمجھتے ہیں —— دوسرے پیراگراف میں بھی ڈاکٹر صاحب نے صرف اپنی حد تک یہ اجازت چاہی ہے کہ اہلِ سنت کے چاروں ائمہ فقہاؒ اور امام بخاریؒ کے مسالک کے اندر اندر ایک خادم اور داعیٔ دین کی حیثیت سے جس مسلک کو وہ اقرب الی الکتاب والسنۃ خیال کریں، اختیار کر لیں۔ اس میں بھی رخصت کی بجائے عزیمت ان کے پیشِ نظر ہے جس کی وضاحت وہ دسمبر کے شمارے میں کر چکے ہیں —— پھر کسی ایسی عظیم شخصیت کے پیدا ہونے کی بات ایک آرزو اور تمنا کی حد تک بیان کی گئی ہے۔ جس کی للّٰہیت و تقویٰ پر علماءِ امت کی اکثریت کو اطمینان ہو اور جو تمام فقہی مکاتب میں عمیق غور و فکر سے کسی ایک فقہ پر پوری امت کو مجتمع کر دے۔

ویسے مندرجہ بالا اقتباسات سے بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ ڈاکٹر صاحب ایک نئی فقہ کی تدوین کی تحریک و دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہیں اور اسلام کے لئے وہ بزعمِ خود اس کا اہل سمجھتے ہیں لیکن بعض علماء نے ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو یہی معانی و مفاہیم پہنا کر ایک دینی جریدے میں شدید تنقیدیں کیں —— ڈاکٹر صاحب نے بحث میں الجھنے کے بجائے اپنی کج مج بیانی اور مرتب کی کوتاہ فہمی تسلیم کر کے ماہِ دسمبر ۸۴ء کے

میثاق کے شمارے میں صفحہ ۲۴ پر تحریر کیا:

"راقم .... حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ اس بحث میں نہ الجھئے کہ ہماری تقریر کا مطلب تو وہی نکلتا ہے جو ہم نے نکالا تھا۔ اس لئے بھی کہ کم از کم میں خود اپنی اور بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کی (جنہوں نے اس تقریر کو کیسٹ سے منتقل کر کے مرتب اور شائع کیا تھا) کی تقصیر تو پہلے ہی تسلیم کر چکا ہوں اور اس لئے بھی کہ کم از کم 'بقید حیات' لوگوں کے بارے میں یہ حق مسلّم طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اپنے قول کی تاویل کا حق انہیں حاصل رہتا ہے! چنانچہ "تاویلُ القولِ بِمَا لَا یرضیٰ بِہِ القائل" کو سب ہی غلط سمجھتے ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اسی تحریر میں صفحہ ۲۶ پر اپنے قول کی بایں الفاظ صراحت کی:

"......... میں واضح الفاظ میں صراحت کرتا ہوں کہ میرے اس قول سے مراد صرف اس درجے میں 'امکان' کو تسلیم کرنا ہے جس درجے میں ہم عموماً 'بفرضِ محال' کسی بات کا ذکر کرتے ہیں ___ میں اس سے قطعی اعلانِ برأت کرتا ہوں کہ میں اس کا داعی یا مبلغ یا کسی درجے میں بھی مجوّز و محرک ہوں .... میں واضح کئے دیتا ہوں کہ میں اپنے بارے میں کسی ایسے گمان سے پہلے میں اسے پسند کروں گا کہ زندہ آگ میں جلا دیا جاؤں۔ واللہ علیٰ ما اقول وکیل۔"

ڈاکٹر صاحب کی جانب سے ان واضح تصریحات کے بعد بحث کو اصولاً ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن وائے حسرتا! کہ ایک دینی شخصیت نے اپنا یہ دینی فرض سمجھا ہے کہ تقلید، عدم تقلید، نیم تقلید کو دین کا اہم ترین مسئلہ بنا کر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ مجروح کیا جائے اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر ہر فقہ کے ماننے والوں کا دعوت الی اللہ، دعوتِ عبادتِ رب، فریضہ اقامتِ دین کی ادائیگی کے لئے موصوف جو ایک قافلہ ترتیب دینے کی جد و جہد کر رہے ہیں وہ کامیاب نہ ہو ___ ان صاحب علم کی بظاہر خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کام رک جائے اور قافلہ ترتیب ہونے نہ پائے۔ اسی لئے شاید وہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو مجروح کرنے اور اس کے کام کو بڑھنے سے روکنے کو فی الوقت دین کا سب سے اہم اور ضروری کام سمجھتے ہیں۔ ملک میں غیر اسلامی نظریات کا غلبہ، مشرکانہ اوہام اور بدعات کا فروغ نہ ان کو نگاہوں میں کھٹکتا ہے اور نہ ہی اسلامی تعلیمات، اسلامی شعائر کا جو کھلم کھلا استہزاء اور مذاق ہو رہا ہے اس سے ان کی حمیّت و غیرتِ دینی جوش میں آتی ہے ___ بہرحال ان کے حق میں دعا ہی کی جا سکتی ہے اور قرآن حکیم کے اس اٹل قاعدہ پر اس گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے کہ: "کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ"

احقر: ظفر اقبال ۔ کراچی

قرآن اکیڈمی کا ایک اور تعلیمی و تربیتی پروگرام:

موسم گرما کی تعطیلات کے دوران

نوجوان طلبہ کیلئے ایک ۲ دوماہی کورس

یکم جولائی تا ۲۹ اگست ۸۵ء

جس میں

وہ طلبہ داخل ہوسکیں گے جو کالجوں میں زیر تعلیم ہوں یا کم از کم میٹرک کا امتحان دے چکے ہوں اور انہیں ساٹھ دنوں میں:

★ تجوید قرآن ★ عربی زبان کے بنیادی قواعد

★ مطالعہ قرآن وحدیث کا منتخب نصاب

★ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ـــــ اور

★ فرائض دینی کے جامع تصور کی وضاحت پر مشتمل

اساسی لٹریچر کا مطالعہ کرایا جائے گا!

تدریس کے اوقات صبح ۸ تا ایک بجے دوپہر ہوں گے لہٰذا لاہور سے تعلق رکھنے والے طلبہ اپنے گھروں پر مقیم رہتے ہوئے ان اوقات میں استفادہ کرسکیں گے۔

البتہ شام کے وقت اور فجر کے بعد کچھ اضافی تربیتی پروگرام بھی ہوگا جس سے صرف وہی طلبہ مستفید ہوسکیں گے جو قرآن اکیڈمی میں مقیم رہیں گے

(ایسے طلبہ کو دو ماہ کے اخراجاتِ طعام کے ضمن میں پانچ صد روپیہ ادا کرنا ہوگا۔ البتہ ایک محدود تعداد میں غیر مستطیع طلبہ کے لئے رعایت کی گنجائش رکھی جائے گی)

شرکت کے خواہشمند طلبہ زیادہ سے زیادہ پندرہ جون تک درخواست بھیج دیں۔

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ، مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن، لاہور

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن —— لاہور

ماہنامہ
میثاق
لاہور

۳۴ | جولائی ۱۹۸۵ء مطابق شوال المکرم ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۷

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱
سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی
کراچی دفتر کا فون نمبر
۲۱۶۵۸۶

مشمولات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ احوال

جولائی ۸۵ء مطابق شوال المکرم ۱۴۰۵ھ کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ حسبِ سابق اس سال بھی امیر تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماہِ رمضان المبارک کے دوران دورۂ ترجمۂ قرآن مکمل کیا۔ رمضان المبارک کے اس خاص پروگرام کی اجمالی رپورٹ ہمارے رفیقِ کار شیخ رحیم الدین صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں!

▪ ماہِ رمضان المبارک کو جو دوسرے تمام مہینوں پر فضیلت حاصل ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اس میں قرآنِ حکیم نازل ہوا۔ شَھۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ، اور اس مبارک مہینے کی راتوں میں قیام اللیل یا تراویح کا جو نظام قائم ہے یہ دراصل قرآن حکیم کے ساتھ تجدیدِ تعلق کا ایک پروگرام ہے۔ بخاری و مسلم کی متفقہ روایت ہے:

من صام رمضان ایمانًا و	جس نے روزے رکھے رمضان میں
احتسابًا غفرلہ ما تقدم	ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے
من ذنبہ و من قام رمضان	گئے اس کے تمام سابقہ گناہ۔ اور جس
ایمانا و احتسابا غفرلہ	نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں
ما تقدم من ذنبہ	ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے
	گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ

اس حدیث شریف کے پہلے حصہ پر تو عامۃ المسلمین عمل کرنے کی سعی و کوشش کرتے ہیں اور اس کے مناظر معاشرہ میں نظر بھی آنے لگتے ہیں۔ مگر اس حدیث کے دوسرے حصہ پر عمل قریبًا متروک ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اگر ہے بھی تو محض جزوی یعنی رمضان کے دوران روزانہ پوری پوری رات قرآن کے ساتھ بسر کرنے کا تو کوئی تصوّر بھی اس دور میں لوگوں کے ذہنوں میں نہیں رہا تاہم قانونی کارروائی کی حد تک کہ پورے رمضان میں ایک بار قرآن حکیم تراویح میں سن لینے کا کسی قدر اہتمام کیا جاتا ہے اور پھر اس میں بھی اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ تراویح کم سے کم وقت

میں ختم ہو جائیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حافظ صاحبان کو قرأت بھی تیزی سے کرنی پڑتی ہے۔ اور اکثر و بیشتر مقتدی حضرات تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن سے قطعاً بے خبر اور لاتعلق رہتے ہیں۔

قرآن حکیم کو کس طرح پڑھا جائے! اس کے متعلق وہ خود حکم دیتا ہے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ یعنی قرآن کی تلاوت واضح اور آہستہ آہستہ کیا کرو۔ تاکہ سامع یہ سمجھ سکے کہ کیا پڑھا جا رہا ہے ــــ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اپنے متعلق بتلاتا ہے کہ:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ	(یہ قرآن) ایک کتاب مبارک ہے۔
لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ	جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے کہ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝	لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور
(سورہ ص)	سمجھ دار لوگ اس سے نصیحت پکڑیں

قرآن حکیم کتابِ مقدس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو کہ حیاتِ انسانی کی پُرپیچ راہوں پر راہنمائی و دستگیری کے فرائض انجام دیتا ہے ــــ اور یہ بدیہی بات ہے کہ اس سے اسی وقت راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے جبکہ اس کے معانی و مفاہیم کو سمجھا جائے۔

بحمد اللہ ہر دور میں ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہے ہیں کہ جنہوں نے اپنی پوری پوری زندگی اس کتاب کو سمجھنے، اس میں تدبر کرنے اور پھر سمجھانے میں گذار دی اور ان کی زندگی کا نصب العین ہی یہ تھا کہ کتاب اللہ کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور اس کے احکامات بالقوۃ نافذ کئے جائیں ــــ انہی خوش بخت اشخاص میں سے ایک امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دامت برکاتہم ہیں۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی ہے کہ انہوں نے "دعوت رجوع الی القرآن" کو ایک تحریک کی شکل میں بپا کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے اور ۱۹۶۵ء سے تا حال ملک کے طول و عرض میں موصوف کے دروسِ قرآن کا سلسلہ جاری ہے اور وہ کتاب و سنّت کی اساسات پہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔

اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ قرآن حکیم کا ترجمہ اور مختصر تشریح ایک دفعہ لوگوں کے سامنے آجائے، پچھلے سال رمضان المبارک میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دامت برکاتہم

نے تراویح میں اس بات کا اہتمام فرمایا کہ ہر چار رکعت میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ مختصر تشریح بیان فرمائی۔ یہ تجربہ بہت کامیاب اور مفید رہا۔ اس سے سامعین کے سامنے ایک دفعہ پورے قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کی دعوت آگئی۔ واضح رہے کہ اگست ۸۴ء کے میثاق میں اس دورۂ ترجمۂ قرآن کی تفصیلات اور شرکاء کے تاثرات شائع کئے جا چکے ہیں جس سے اس پروگرام کی افادیت کا ایک اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

گذشتہ سال کی افادیت اور لوگوں کے ذوق و شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سال بھی قرآن اکیڈمی میں رمضان المبارک کے دوران نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا اہتمام کیا گیا۔ یہ رمضان المبارک مئی اور جون کے شدید ترین گرم موسم میں تھا۔ اس کے باوجود قرآن حکیم سے محبت و شغف اور وابستگی رکھنے والے حضرات نے رمضان کے دوران دن میں روزہ کی مشقت برداشت کی اور پھر راتیں اس کیفیت میں گذاریں کہ یا تو تراویح میں قرآن مجید کی سماعت ہو رہی ہے اور یا پھر پورے توجہ و انہماک اور ذوق و شوق کے ساتھ قرآن کا ترجمہ اس کے علوم و معارف اور احکامات کو کانوں کے راستے ذہن و قلب میں اتارا جا رہا ہے۔ گویا پوری رات قرآن حکیم کے ساتھ بسر ہو رہی ہے۔

پروگرام کی تفصیل اس طرح سے تھی کہ نمازِ تراویح کی ہر چار رکعت سے قبل ان میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب بیان کرتے تھے اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوتی تھی ربطِ آیات کی جانب بھی اشارہ فرما دیتے تھے۔ اس طرح کل پانچ مرحلوں میں تراویح کا پروگرام مکمل ہوتا تھا۔ ہر چار رکعت اور اس سے قبل ترجمے کے بیان میں قریباً ۵۰ منٹ صرف ہوتے تھے۔ اس طرح مجموعی طور پر قریباً ساڑھے چار گھنٹے میں یہ پروگرام مکمل ہوتا تھا۔ عشاء کی نماز ساڑھے نو بجے کھڑی ہوتی تھی۔ اور نمازِ تراویح اور وتروں سے فارغ ہوتے ہوتے عام طور پر سوا دو بج جاتے تھے۔ اور چونکہ اس کے ساتھ سحری کا وقت شروع ہو جاتا تھا۔ اس طرح یہ پروگرام پوری رات پر محیط ہوتا تھا۔

اس پروگرام میں جہاں سامعین نے پورے رمضان المبارک کے دوران روزانہ شب بیداری کی مشقت برداشت کی وہاں سب سے بڑھ کر مشقت امیر تنظیم اسلامی کو برداشت کرنا پڑی۔ پہلے عشرہ کے دوران ڈاکٹر صاحب مدظلہم کی طبیعت کافی ناساز رہی۔ صورت یہ تھی کہ مسلسل حرارت رہتی تھی لیکن محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے معمولات میں کوئی

فرق نہ آنے دیا ۔ دن بھر دفتری اور انتظامی امور میں مشغول رہتے اور رات کے پروگرام میں بھی سب سے بھاری ذمہ داری آپ ہی کے سر تھی ۔ چنانچہ ترجمہ و تشریح کے ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب کا بیان لگ بھگ ساڑھے تین گھنٹوں پر محیط ہوتا تھا ۔ لیکن اس مردِ مومن نے اس تمام مشقت کو لوجہ اللہ برداشت کیا تاکہ لوگوں تک اس کا پیغام و احکامات پہنچا کر کسی درجے میں تبلیغ قرآن کی ذمہ داری ادا کی جا سکے ۔ ہمیں اپنے رب کے حضور الحاح و زاری سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ امیرِ تنظیم کو درازئ عمر کے ساتھ صحت و تندرستی عطا فرمائیں تاکہ وہ دینِ اسلام کی مزید خدمات انجام دے سکیں ۔ (آمین)

نمازِ تراویح میں قرآن حکیم سنانے کی ذمہ داری حافظ رفیق صاحب کے سپرد کی گئی تھی جو کہ قرآن اکیڈمی کے رفقاء (Residents) میں شامل ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو حسنِ صوت سے نوازا ہے ۔ اور موصوف قرآن حکیم کو اس طرح صاف اور واضح پڑھتے ہیں کہ ایک ایک لفظ صاف اور سمجھ میں آتا ہے ـــــ ۱۴/ رمضان المبارک کو حافظ رفیق صاحب کے والد کا بہاولپور میں انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے انہیں تقریباً دس/ رمضان میں بہاولپور جانا پڑا ۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ مرحوم کے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں ۔ اور درجاتِ عالیہ سے نوازیں (آمین)

۱۴/ رمضان المبارک بروز منگل سے تراویح میں قرآن پڑھنے کی ذمہ داری محترم عاکف سعید صاحب (جو کہ امیرِ تنظیم کے صاحبزادے اور میثاق کے رکنِ ادارۂ تحریر ہیں) نے سنبھالی ۔ اور آپ نے بھی " وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا " کے حکم کے مدِنظر رک رک کر اور صاف و واضح تلاوت فرمائی اور چونکہ شرکاءِ پروگرام پہلے سے ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ سن چکے ہوتے تھے ۔ اس لئے نماز میں شغف و دھیان لگا رہتا تھا ۔ اور مقتدی حضرات جوں جوں قرآن سنتے جاتے اس کا مفہوم بھی ساتھ ساتھ ذہن و قلب میں اترتا جاتا تھا ۔ اور اس سے جو کیف اور روحانی لذت حاصل ہوتی تھی غالباً شرکاء کے لئے تمام رات جاگ کر گزارنے کا سب سے بڑا محرک وہی تھا ۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں یقیناً خیر ہی کا فیصلہ فرماتا ہے اور بلاشبہ اس کے فیصلوں اور اس کی مشیت میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ اس کی مشیت ہی کا یہ مظہر تھا کہ ۱۵/ رمضان المبارک کو، جبکہ حافظ عاکف سعید صاحب کو تراویح میں قرآن سناتے ہوئے ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ ان کے صاحبزادے حسین عاکف، کا ناگہانی طور پر بجلی

کا کرنٹ لگنے سے انتقال ہوگیا۔ (إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ) ۔ حسین عاکف کی عمر لگ بھگ دو برس تھی۔ بھائی عاکف نے اس موقع پر بے انتہا صبر و استقامت سے کام لیا۔ قارئین سے گذارش ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ عاکف سعید صاحب کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور اس کا نعم البدل عطا فرمائیں۔ (آمین) ـــــــ چونکہ بچے کا انتقال افطار سے آدھ گھنٹہ قبل ہوا تھا اور تدفین رات ہی کو عمل میں لائی تھی اس لئے ۱۵ ر رمضان المبارک کو تراویح میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام نہ ہوسکا بلکہ صرف بیس رکعت تراویح پڑھ کر نماز جنازہ گیارہ بجے رات ادا کی گئی اور پھر تدفین عمل میں آئی۔ اور پھر ۱۶ ر رمضان المبارک یعنی دوسرے ہی دن سے حسب سابق دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام شروع ہوگیا اور عاکف سعید صاحب ہی نے آخر تک تراویح میں قرآن حکیم سنانے کی ذمہ داری کو نبھایا۔

۲۸ ر رمضان المبارک بروز منگل دورۂ ترجمۂ قرآن کے شرکاء کو تنظیم اسلامی شرقی کی جانب سے افطار پر مدعو کیا گیا تھا۔ شرکاء میں سے قریباً ۷۰، ۸۰ افراد نے شرکت کی عصر سے مغرب تک ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور عبدالرزاق صاحب نے تنظیم اسلامی کی دعوت پیش کی۔ بعد ازاں ۱۳ شرکاء نے امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت کرتے ہوئے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو صبر و استقامت عطا فرمائیں اور دین اسلام کی سربلندی کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین یارب العالمین)

اس سال رمضان المبارک میں جو دورۂ ترجمۂ قرآن ہوا اس کی ریکارڈنگ کا خصوصی انتظام کیا گیا اور محمد احمد صاحب نے انتہائی جانفشانی اور اہتمام سے اس پورے ترجمۂ قرآن کو C - ۶۰ کے ۸۳ کیسٹس میں ریکارڈ کیا ہے اور اب یہ مکمل سیٹ ریکارڈنگ کے مراحل سے گزر کر آچکے ہیں اور ادارہ نشر القرآن، ۳۶ کے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ترجمۂ قرآن دو طرح کے کیسٹس پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ جاپانی کیسٹوں پر مبنی سیٹ کی قیمت -/۲۰۰۰ روپے اور پاکستانی کیسٹوں والے سیٹ کی قیمت -/۱۲۰۰ روپے معیّن کی گئی ہے۔ دورۂ ترجمۂ قرآن کے اس سیٹ کے ذریعے جہاں قرآن حکیم کا ایک سہل اور رواں ترجمہ سامع کے سامنے آتا ہے وہاں قرآن حکیم کی آیات اور سورتوں کے مابین جو ربط ہے وہ بھی پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے ـــ تعلیم و تعلّم قرآن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے بلاشبہ یہ ایک قیمتی اور مفید متاع ہے۔ اس سیٹ

کے حصول کے خواہشمند حضرات پیشگی مطلع فرمائیں۔ تاکہ آرڈر کے مطابق سیٹ تیار کرائے جا سکیں۔
رفقائے تنظیم سے گذارش ہے کہ وہ اس دورۂ ترجمۂ قرآن کے کیسٹس کو زیادہ سے زیادہ عوام الناس
میں متعارف کرائیں تاکہ پورے ملک میں "دعوت رجوع الی القرآن" کی تحریک آگے بڑھے۔
اور لوگ قرآن حکیم کی تعلیمات و احکامات سے متعارف ہو سکیں رفقائے کرام کی یہ کوشش ان شاء اللہ
اسلامی انقلاب کے لئے ایک سنگِ میل ثابت ہو گی۔

پاکستان ٹیلیویژن کے ایک مستقل پروگرام "رو برو" کے میزبان جناب انور حسین صاحب کی
کچھ عرصہ سے یہ خواہش تھی کہ امیرِ تنظیم کو اس پروگرام میں بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا جائے۔ اس ضمن میں
انہوں نے متعدد بار امیرِ تنظیم سے فون پر رابطہ کیا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر محترم ڈاکٹر صاحب متردد
رہے اور شرکت سے معذوری ظاہر کرتے رہے۔ لیکن جب ان کے اصرار نے زور پکڑا تو بالآخر محترم
ڈاکٹر صاحب نے اپنے قریبی احباب کے مشورے کے بعد ان کی دعوت کو قبول کر لیا۔
اور پروگرام ریکارڈ کروایا جو ۲۸ مئی ۱۹۸۵ء شام چھ بجے پاکستان ٹیلیویژن نے قومی نشریاتی
رابطہ پر تمام اسٹیشنوں سے ٹیلی کاسٹ کیا اور لاکھوں افراد نے اسے دیکھا۔ اس پروگرام میں امیرِ تنظیم
نے سوالات کے جوابات میں تنظیم اسلامی کی دعوت واضح الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ اس پروگرام
کو کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے قارئین میثاق کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح امیرِ تنظیم
کا ایک اہم خطاب "اسلامی انقلاب کے مراحل" کے عنوان سے گذشتہ ماہ شائع ہوا تھا۔ اس
کی اگلی قسط شاملِ اشاعت ہے۔ یہ مضمون انتہائی اہم نکات پر مشتمل ہے۔ اس لئے قارئین سے
گذارش ہے کہ وہ توجہ اور انہماک سے مطالعہ فرمائیں اور ربط کے لئے اگر پچھلی قسط کو دوبارہ
پڑھ لیا جائے تو اور بھی مناسب رہے گا۔

عام طور پر ہمارے یہاں

توحیدِ علمی و نظری — یعنی — توحید فی العقیدہ

پر تو بہت زور دیا جاتا ہے، لیکن

توحیدِ عملی

پر کما حقہٗ توجہ نہیں دیجاتی

ڈاکٹر اسرار احمد

پر اللہ تعالیٰ نے سُورۂ زُمَر تا سُورہ شوریٰ پر تدبّر کے دوران

توحیدِ عملی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں

یعنی: اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین کی فرضیت

کو خوب منکشف بھی فرمایا اور بیان کی توفیق بھی مرحمت فرمائی، اور

شیخ جمیل الرحمٰن کی محنت نے ان خطابات کو کتابی صورت دیدی

سائز ۱۸ × ۲۲ / ۸ ○ صفحات ۱۹۲ ○ عمدہ سفید کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ: ۱۵ روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

مکتبہ تنظیمِ اسلامی: ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور ۱۴

الہدیٰ

تینتیسویں نشست

ایمان اور اس کے ثمرات

سورۃ تغابن کی روشنی میں

(مباحث ایمان)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلی ویژن کے دروس قرآنی کا سلسلہ

(۴)

السلام علیکم! نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ـــــ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ؕ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ○ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ○

صدق اللّٰہ العظیم ○

پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا بھی تمہارے امکان میں ہو اور جتنی تم استطاعت رکھتے ہو اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرو، یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی ہے جو آخری منزلِ مراد تک پہنچ سکے گا۔ اگر تم اللہ کو قرض

حسنہ دو تو وہ اُسے تمہارے لئے دگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا ___
اور اللہ قدر دان بھی ہے اور نہایت حلم والا بھی، نہایت بردبار بھی، وہ چھپے اور کھلے
سب کا جاننے والا ہے، زبردست ہے کمال حکمت والا ہے۔"

محترم حاضرین اور معزز ناظرین!

یہ سورہ تغابن کی آخری تین آیات ہیں، آیات ۱۶ تا ۱۸۔ اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ان میں ایمان کے مقتضیات یا ایمان کے مطالبات کو ادا کرنے کی زوردار دعوت اور ترغیب ہے ___ جیسے اس سورۃ مبارکہ کے پہلے رکوع میں سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا بیان تھا اور پھر کلمہ فا سے آخری آیت شروع ہوئی تھی: فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، اسی طرح دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات و نتائج کا بیان ہے اور اب جو چھٹی آیت ہے وہ پھر کلمہ فا سے شروع ہو رہی ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. جب یہ بات تم پر واضح ہو گئی کہ ایمان کے تقاضے یہ ہیں، ایمان کے مطالبے یہ ہیں، ایمان کے ثمرات یہ ہیں، ایمان کے نتیجے میں یہ تغیر تمہاری سوچ میں، تمہارے نقطۂ نظر میں، تمہارے زاویۂ نگاہ میں پیدا ہو جانا چاہیے، تمہاری عملی زندگی اور تمہارے عملی رویے میں یہ تبدیلی آ جانی چاہیے۔ تو اب انتظار کس بات کا ہے؟ تاخیر کس لئے ہے؟ بسم اللہ کرو اور ان مقتضیات و مطالبات کو پورا کرو۔

اب دیکھئے یہاں ایک نہایت حسین ربط ہے۔ ایمان میں اولین ایمان ہے ایمان باللہ۔ لہٰذا یہاں ایمان کے تقاضوں کو ادا کرنے کی دعوت شروع ہوئی اس بات سے کہ: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. ایمان باللہ کا تقاضا یہ ہے کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے اور تقوے بھی تھوڑا بہت نہیں بلکہ اپنی حدِ استطاعت تک، اپنی امکانی حد تک، اپنے مقدور بھر ___
یہاں ذرا یہ بات سمجھ لیجئے کہ تقویٰ کا ترجمہ عام طور پر لفظِ خوف یا ڈر سے کر دیا جاتا ہے۔ یہ تقویٰ کے مفہوم و معنی کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ ڈر یا خوف ایک تو ہوتا ہے کسی خطرناک، خوفناک اور ڈراؤنی شے کا، اور ایک خوف اور ایک ڈر وہ ہوتا ہے جس میں محبت کی آمیزش اور چاشنی ہوتی ہے، محبت بھرا خوف۔ یہ ہو گی تقویٰ کی بڑی حد تک صحیح ترجمانی۔ بغرض تفہیم مثال دیتا ہوں کہ جیسے آپ کو اپنے والد سے محبت ہے اور آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے والد آپ سے ناراض ہوں چنانچہ آپ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو آپ کے والد کو ناپسند ہے۔ آپ کو شعور ہے کہ آپ نے

پنے والد کی ناپسندیدہ کوئی حرکت کی، کوئی عمل کیا تو وہ آپ سے خفا ہو جائیں گے، ناراض ہو
ائیں گے، لہٰذا آپ والد کی ناراضگی کے خوف سے ان کے ناپسندیدہ کاموں کے ارتکاب سے
حتراز کرتے ہیں۔ اجتناب برتتے ہیں۔ آپ کی یہ جو کیفیت ہے۔ یہ محبت بھرا خوف ہے، اس
ہم تقویٰ سے تعبیر کریں گے۔

اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہو۔
س کے قلب اور اس کے ذہن پر ہر وقت یہ بات مستولی رہے کہ میری کسی حرکت سے میرا خالق،
یرا مولیٰ، میرا مالک، مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ اسے ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہے کہ میں کوئی
یسا کام نہ کر بیٹھوں جو میرے آقا میرے پروردگار کو پسند نہ ہو۔ وہ اس احتیاط کو ہر دم ملحوظ
کھے کہ میری زبان سے کوئی ایسا لفظ کسی وقت نہ نکل جائے جو میرے رب کو پسند نہ ہو۔
ہ کیفیت، یہ طرز عمل، یہ رویہ، یہ سوچ، یہ انداز فکر جو ہے، یہی درحقیقت تقویٰ ہے۔ سورہ
ل عمران میں ایک جگہ اس تقوے کے ضمن میں یہ شدید تاکید آئی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا
تَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ۔ "اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا
ق ہے" اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑے ہی مضطرب اور پریشان ہو گئے کہ اللہ کا
تنا تقویٰ جتنا کہ اس کا حق ہے کون اختیار کر سکتا ہے! جیسے اللہ تعالیٰ کی اتنی معرفت جتنی کہ
اللہ کی معرفت کا حق ہے اس تک رسائی حاصل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ خود نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں: مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَمَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ
مَعْرِفَتِكَ۔ "اے اللہ! ہم تیری بندگی نہ کر پائے جیسا کہ تیری بندگی کا حق ہے اور ہم تجھے
نہ پہچان پائے جیسے کہ تجھے پہچاننے کا حق تھا" یہی معاملہ تقویٰ کا ہے۔ اللہ کا اتنا تقوے
جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے، یہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اسے اختیار کر سکے
اس کا کم سے کم تقاضا یہ ہوگا کہ ایک لمحے کے لئے بھی اللہ کی یاد سے دل غافل نہ ہو، ہم شعوری
طور پر چوکس رہیں کہ ہمارے اعضاء و جوارح سے کہیں اور کبھی کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو، سرزد نہ
ہو جو اللہ کے کسی قانون کے خلاف ہو۔ لہٰذا جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ کو تسکین
حاصل ہوئی کہ: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ "اپنی حد امکان اور اپنی حد استطاعت تک اللہ کا
تقویٰ اختیار کرو" اگرچہ یہی بات سورہ بقرہ میں قاعدہ کلیہ کے طور پر آچکی ہے کہ: لَا يُكَلِّفُ
اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا "اللہ کسی نفس کو مکلف نہیں ٹھہراتا مگر اس کی وسعت کے مطابق" یہی

اصول سورہ مؤمنون میں اللہ تعالیٰ نے جمع متکلم کے صیغے میں ارشاد فرمایا: وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. لیکن چونکہ سورہ آل عمران میں بظاہر الفاظ اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کرنے کا حکم تھا لہذا صحابہ کرامؓ مضطرب ہوگئے اور اس آیت کے اس حصے سے ان کو اطمینان حاصل ہوا فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جب یہ مسئلہ پیش کیا کہ تقویٰ کی جامع و مانع تعریف و مفہوم کیا ہے! یعنی اس لفظ کی کیا ہے! تو حضرت ابی ابن کعبؓ نے اس کی جو وضاحت فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے ،

امیر المؤمنین! جب کسی شخص کو جنگل کی ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہو جس کے دونوں اطراف میں خار دار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت وہ شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر اس راستے کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سنبھل سنبھل کر اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے تاکہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور ان کے کانٹوں سے الجھنے نہ پائیں۔ اس احتیاطی رویے کو عربی میں تقوےٰ کہتے ہیں۔

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس تعریف و مفہوم (DEFINITION) کی تصویب و توثیق فرمائی اور حضرت ابی ابن کعبؓ کو داد دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں یہ بھی ایک سفر ہے، اور اس دنیا میں ہر چہار طرف جھاڑیاں ہیں ——— خار دار جھاڑیاں گناہوں کی، معصیت کی، شہوات و لذات کی۔ ہر قدم پر گناہوں کی ترغیبات ہیں — معصیت کی تحریصات ہیں۔ الغرض طرح طرح کی TEMPTATIONS ہیں۔ اثم و عدوان کی دعوت کی ان جھاڑیوں سے بچ بچ کر نکلنا، اپنے دامن کو ان میں الجھنے نہ دینا۔ اگر انسان اپنے اس دنیوی سفر کو اس طرح طے کر جائے کہ اسکے دامن پر معصیت کا کوئی داغ دھبہ نہ پڑے تو یہ ہے تقوےٰ۔

یہاں پہلی بات تو یہ فرمائی، فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. دوسری بات فرمائی: وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا "سنو اور اطاعت کرو" اس کا تعلق اصولاً تو ایمان باللہ سے ہے لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے، اس لئے کہ مطاع حقیقی تو اللہ ہے، مگر اللہ کا نمائندہ بن کر آتا ہے رسول: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس نے رسول کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا: وَمَآ اَرْسَلْنَا

ن رَسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ" اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس
لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے" رسول کی یہ اطاعت اصلاً مطلوب ہے
مع و طاعت کی شان کے ساتھ کہ سنو اور اطاعت کرو۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔
یک اطاعت وہ ہوتی ہے جو آپ کے فہم، آپ کی سمجھ اور آپ کی پسند پر منحصر ہے، کوئی
کم اگر آپ کی سمجھ میں آگیا یا آپ کو پسند آگیا تو آپ نے اطاعت کر لی اور اگر وہ آپ کی سمجھ میں
نیں آیا یا آپ کو اچھا نہ لگا تو آپ نے اطاعت نہیں کی۔ تو یہ اطاعت اس ہستی کی نہیں ہے
و حکم دے رہا ہے، یہ تو اس کی عدم اطاعت ہے۔ یہ تو اپنی روح اور عمل کے اعتبار سے اپنی
قل کی اطاعت ہے، اپنے دل کی اطاعت ہے، اپنے جی کی اطاعت ہے، اپنی پسند کی
طاعت ہے۔ اطاعت تو وہی ہے کہ جو بھی حکم ملے اس پر سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ سمع وطاعت
ا یہ ہے وہ شان جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کہی گئی: وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا
نو اور اطاعت کرو"۔ جو حکم سمجھ میں آجائے اس کی بھی اطاعت کرو اور جو سمجھ میں نہ آئے اس کی
ی اطاعت کرو۔ اس لئے کہ رسول اللہ کی طرف سے حکم دے رہا ہے: وَمَا یَنْطِقُ عَنِ
لْھَوٰی ہ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

رسول کے احکام اس کی خواہشات پر مبنی نہیں ہیں۔ وہ اس کے ذہن کی پیداوار نہیں
ہیں۔ رسول تو وہ احکام پہنچا رہا ہے، وہ باتیں پہنچا رہا ہے جن کی اس پر اللہ کی طرف سے
س پر وحی ہوئی ہے۔ تمہارا ذہن، تمہارا فکر، تمہاری سوچ محدود ہے، ضروری نہیں ہے
ہ ہر حکم کی علت تمہاری سمجھ میں آجائے، ہر حکم کی مصلحت وغایت تمہاری سوچ کی گرفت میں
سکے۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول کی جو اطاعت ہوگی وہ سمع وطاعت کی شان کے ساتھ
ئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ
ومن عصانی فقد عصی اللّٰہ" جس نے میری اطاعت کی اس نے
اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی" ساتھ ہی ارشاد فرمایا
ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری
فقد عصانی۔ "اور جس نے میرے مقرر کردہ کسی امیر کی اطاعت کی اس نے میری
اطاعت کی اور جس نے اس کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی" تو یہ سلسلۂ اطاعت ہے جس کی

بجاآوری ہر بندۂ مومن پر فرض، لازم اور واجب ہے۔

زیرِ مطالعہ آیت میں ایمان کے تقاضوں کو ادا کرنے کیلئے زوردار ترغیب کے ضمن میں ہمارے سامنے پہلی بات آئی: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ اور دوسری بات یہ آئی: وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا۔ اب اس آیت کی تیسری اور آخری بات کا تعلق ایمان بالآخرت سے ہے۔ ارشاد فرمایا: وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ "اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں، دو اللہ کی راہ میں، تمہاری جانوں کے لئے اسی میں خیر ہے، بھلائی ہے" اللہ کی راہ میں یہ دینا، غربا، فقراء، مساکین اور یتامیٰ کے لئے بھی ہے اور یہی خرچ کرنا اللہ کے دین کے لئے بھی مطلوب ہے۔ اس کے دین کے پیغام کو پھیلانے کے لئے، اس کی نشر واشاعت کے لئے، اس کی تبلیغ و دعوت کے لئے، اس کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کی جد وجہد کے جو مالی تقاضے ہیں ان کو ادا کرنے کیلئے۔ یہ ہے اللہ کے لئے انفاق۔ آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایمان بالآخرت سے اس کا بڑا لطیف تعلق ہے۔ اگر کسی کو آخرت پر یقین ہے تو وہ جو مال اللہ کے لئے صرف کر دے گا خرچ کر دے گا، اس کے بارے میں اسے یہ اطمینان ہوگا کہ یہ مال محفوظ ہوگیا، یہ آخرت کے لئے اللہ کے بنک میں جمع ہوگیا۔ اگر مال اللہ کے پاس جمع کیا گیا ہے تو موت جب آئے گی تو علامہ اقبال کے اس شعر کا نقشہ سامنے ہوگا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم ۔۔۔ چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست!

مردِ مومن کی نشانی یہی ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اُسے معلوم ہے کہ میں نے اپنی توانائیوں، اپنی قوتوں اور اپنے مال و دولت کا بہت بڑا حصہ اللہ تعالیٰ کے بنک میں جمع کرا رکھا ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں جہاں میری بچت میری کمائی اور میری توانائیوں کا حاصل جمع ہے۔ اناجیل اربعہ کے نام سے اس وقت جو کتب موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بڑا پیارا قول ملتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنجناب نے اپنے متبعین سے فرمایا: "اپنا مال زمین پر جمع نہ کرو جہاں اسے کیڑا خراب کرتا ہے اور ڈاکے کا بھی خوف ہے۔ آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے اور نہ ڈاکے کا اندیشہ ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں، جہاں تمہارا مال ہوگا وہیں تمہارا دل ہوگا" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک واقعہ بڑا عجیب اور پیارا ہے۔ انؓ کے یہاں ایک بکری ذبح ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دستی کا گوشت بہت مرغوب تھا تو اس میں سے ایک دستی بچا

کر رکھ لی گئی اور باقی سارا گوشت تقسیم کر دیا گیا۔ نبی اکرمؐ جب تشریف لائے تو آپ نے دریافت کیا: ما بقی منھا۔ اس بکری میں سے کیا بچا؟ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے عرض کیا: ما بقی منھا الا کتفھا۔ اس میں سے کچھ نہیں بچا بس ایک دستی بچی ہے ایک شانہ بچا ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ یہ ہے حضورؐ کا بڑا فطری طریق تزکیہ و تربیت اور طریق تعلیم جو برمحل اور برموقع ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: بقیت کلھا الا کتفھا۔ پوری بکری بچ گئی ہے سوائے اس دستی یا شانے کے جو ہم کھالیں گے۔ جو ہم کھالیتے ہیں۔ وہ تو CONSUME ہو گیا، ختم ہو گیا۔ اور جو اللہ کی راہ میں دے دیا گیا وہ باقی ہے۔ بچت وہ ہے۔ ایمان بالآخرت کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی آجانی چاہیئے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں دے دیا وہ اصل بچت ہے۔ جو ہم نے کھایا، پہنا، استعمال کیا اور ختم کر دیا وہ CONSUMPTION ہے۔ ارشاد فرمایا: وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ۔ "اللہ کی راہ میں خرچ کر دینی تمہارے لئے بہتر ہے"۔

آگے چلئے۔ فرمایا اور جان لو کہ اگر مال کی محبت تمہارے دل میں رہی اور وہ تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی رہی تو یہ شُح ہے۔ بخل ہے۔ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ۔ جو اس شح سے، اس بخل سے، بچا لیا گیا۔ یعنی جس کا یہ کھل گیا۔ جب ہی گاڑی آگے چل سکے گی۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے: فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ فلاح کہتے ہیں کسی کے منزل مراد پر پہنچ جانے کو۔ تو یہاں واضح فرما دیا گیا کہ جو اس شح نفس سے، مال کی محبت سے، بخل سے بچا لیا گیا وہی ان لوگوں میں شامل ہوگا جو آخری منزل مراد تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔

اب دیکھئے یہاں انفاق پر مزید زور دیا جا رہا ہے۔ اگلی آیت میں ارشاد فرمایا: اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو۔ یہ انفاق ہے یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی قدر افزائی کے لئے اسے اپنے ذمہ قرض سے تعبیر فرماتا ہے۔ حالانکہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے: لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ لیکن یہ ہماری حوصلہ افزائی اور قدر افزائی ہے کہ وہ ہماری اپنی راہ میں ہمارے انفاق کو اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے۔ دنیا کا قرض حسنہ تو وہ ہے جس میں صرف رأس المال واپس آتا ہے۔ کوئی اضافہ نہ ہو، اضافہ ہوا تو وہ سود ہو جائے گا

لیکن اللہ کو جو قرضِ حسنہ دیا گیا ہے اسے تو وہ بڑھاتے گا۔ اس میں اضافہ فرمائے گا اور مزید یہ کہ اس کی برکت سے تمہاری مغفرت فرمائے گا۔ اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک جوڑا آیا ہے۔ اس میں بڑا معنوی ربط ہے۔ فرمایا: وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ۔ یہ صفات کی شکل میں اسمِ نکرہ ہے۔ اسے صفت مشبہ کہتے ہیں کہ اللہ قدر دان بھی ہے اور بردبار بھی ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں دیتے ہو، صرف کرتے ہو، خرچ کرتے ہو تو وہ قدر دان ہے، قدر افزائی فرمانے والا ہے۔ نہیں دیتے ہو، بخل برتتے ہو، اللہ کا مال اسی کی راہ میں خرچ کرنے سے کنی کتراتے ہو تو بھی تو وہ فوراً گرفت نہیں فرماتا۔ وہ بڑا بردبار اور حلیم ہے۔ تمہیں چھوٹ دے رہا ہے۔ پھر بھی تمہیں کھانے کو دے رہا ہے۔ تمہارے لئے رزق کا دسترخوان پھر بھی اس تعالیٰ نے بچھایا ہوا ہے۔

آخری آیت کے آخر میں دوسرا جوڑا اسمائے حسنیٰ کی صورت میں العزیز الحکیم آیا ہے۔ وہ زبردست ہے، غالب ہے، جو چاہے کرے اس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہیں ہے، کوئی Limitation نہیں ہے۔ لیکن وہ تعالیٰ الحکیم بھی ہے، وہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے حکمت کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا کوئی فعل الل ٹپ نہیں ہے At random نہیں ہے۔ بغیر حکمت و مصلحت نہیں ہے۔ ایک طرف اختیارِ مطلق ہے العزیز۔ ایک طرف حکمتِ کاملہ ہے الحکیم۔ اور اسماء و صفات کے جوڑوں: شکورٌ حلیمٌ اور العزیز الحکیم کے درمیان اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا بیان پھر تیسری مرتبہ آ گیا: عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ۔ وہ غیب و حاضر چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے۔ کوئی چیز اس کے علمِ کامل سے پوشیدہ اور چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ سورہ مبارکہ اس آیت پر ختم ہوتی ہے: عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

بحمد اللہ اس سورہ مبارکہ کا مطالعہ چار نشستوں میں مکمل ہوا۔ محدود وقت کے پیش نظر نہایت اختصار کے ساتھ اس عظیم و جامع سورۃ کے مضامین اشارات کی شکل میں بیان ہو سکے ہیں۔ ابتداء ہی میں، میں نے عرض کیا تھا کہ ایمان اور اس کے ثمرات کے موضوع پر میرے محدود مطالعے کی حد تک یہ سورہ نہایت جامع ہے۔ اس میں ایمان اور اس کے اجزائے ثلاثہ کی تفصیل بھی آ گئی۔ ان کو تسلیم کرنے کی زوردار دعوت بھی آ گئی۔ پھر اس ایمان کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر طرزِ فکر اور زاویۂ نگاہ میں جو تبدیلیاں آنی چاہئیں اور اس کی عملی روش، طرزِ عمل اور معاملاتِ دنیوی میں جو تغیرات اور انقلاب آنا چاہیئے، اس کا بیان بھی ہو گیا۔ اس سورہ مبارکہ کے دوسرے

رکوع میں وہ کسوٹی بھی ہمارے سامنے رکھ دی گئی جس پر ہم میں سے ہر فرد اپنے ایمان کو پرکھ کر دیکھ سکتا ہے کہ دل میں واقعۃً ایمانِ حقیقی موجود ہے یا نہیں! اگر ہے تو اس کی کیفیت کیا ہے؛ اس سورۂ مبارکہ میں ایمانِ حقیقی کے جو تقاضے اور مطالبے ہمارے سامنے آتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں پورا کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم۔ ونفعنی وایاکم بالاٰیٰت والذکر الحکیم۔

اب آج کے درس کے ضمن میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک اس سے ڈرو۔ جب کہ ہر انسان اپنی استطاعت کا پیمانہ مختلف رکھتا ہے تو پھر استطاعت کا کون سا پیمانہ استعمال کیا جائے گا؟

جواب: اچھا سوال ہے۔ ہر شخص کی اپنی ایک استطاعت ہے اور جیسا کہ میں نے سورۂ بقرہ کے الفاظ مبارکہ کے حوالے سے کہا تھا کہ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اللہ تعالیٰ جب انسان سے حساب لے گا تو اس کی استطاعت کے مطابق لے گا۔ اللہ کا علم کامل ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ اس نے کس میں کتنی استطاعت رکھی ہے، کتنی وسعت رکھی ہے، وہ اسی کے مطابق محاسبہ فرمائے گا۔ البتہ اس میں ایک مغالطہ ہم عملی طور پر خود اپنے آپ کو دیتے ہیں۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جب دین کی بات ہوگی، خیر کی بات ہوگی، تبلیغ و دعوت کی بات ہوگی، دین کے عملی تقاضے ادا کرنے کی بات ہوگی تو ہم کہیں گے ہم میں اس کی استطاعت و استعداد نہیں ہے جب کہ دنیا کے معاملات میں ہماری جولانیاں، ہماری توانائیاں، ہماری تگ و دو پورے طور پر سامنے آ رہی ہوتی ہے۔ یہ اصل میں ایک دھوکہ ہے جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ایک شخص دنیا میں پھل پھول رہا ہے، بڑھ رہا ہے، دوسروں سے آگے نکل گیا ہے تو یہ استطاعت کے بغیر تو ممکن نہیں ہے! اس میں صلاحیت ہے، وسعت عمل ہے، جذبۂ محنت و مسابقت ہے جب ہی وہ آگے نکلا ہے۔ اس پہلو سے یہ جو وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے اور ہم دین کے معاملے میں اپنے آپ کو بری کرنے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ ہم میں استطاعت نہیں ہے ہم میں صلاحیت نہیں ہے تو یہ بڑا دھوکہ ہے۔ صحیح روش اور درست رویہ کیا ہوگا! یہ کہ دین کے اور خیر کے کاموں

میں آگے بڑھنے کی شعوری طور پر امکان بھر کوشش کی جاتے۔ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رہے۔ کوئی تساہل نہ ہو، دین کے کاموں سے فراریت نہ ہو۔ ظاہر بات ہے انسان آگے اتنا ہی بڑھ سکے گا جتنی اللہ نے اس میں وسعت و استطاعت رکھی ہے۔ انسان جب تک اس کے لئے شعوری طور پر اور عزم مصمم کے ساتھ کوشش نہیں کرے گا یہ ظاہر نہیں ہو سکے گا کہ اس میں وسعت و استطاعت اور صلاحیت و استعداد کتنی ہے! البتہ رہا محاسبہ اخروی! تو وہ یقیناً ہر شخص کی وسعت و استطاعت کی بنیاد پر ہوگا اور اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں موجود ہے اور اسی کے مطابق وہ فیصلہ فرمائے گا کہ کس شخص نے اپنی وسعت اور استطاعت کے مطابق دین کے مقتضیات و مطالبات پورے کرنے کی کس حد تک اور کس قدر محنت و کوشش کی ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! اس سورہ مبارکہ میں آیا ہے کہ تم اللہ کو قرض حسنہ دو تو وہ اس کو بڑھاتا چلا جائے گا تو قرض حسنہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: اصل میں انفاق فی سبیل اللہ ہی کو قرض حسنہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ ہم خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کے لئے صرف کرتے ہیں تاکہ اللہ راضی ہو جائے۔ اسی کو یہاں قرض حسنہ فرمایا گیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کی دو مدیں ہیں۔ ایک مد ہے اللہ کی مخلوق میں جو محتاج ہیں، غرباء ہیں، فقراء ہیں، یتامیٰ ہیں، مساکین ہیں، بیوائیں ہیں۔ وہ افراد ہیں جو معاشی جدوجہد میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ جنھیں تعاون اور مدد کی ضرورت ہے۔ ان پر صرف کرنا تاکہ اللہ راضی ہو جائے۔ دوسری مد ہے اللہ کے دین کی نصرت کے لئے خرچ کرنا۔ اللہ کے دین کی نشر و اشاعت کے لئے صرف کرنا، اللہ کے پیغام کی تبلیغ و دعوت کے لئے مالی تعاون کرنا۔ اقامت دین اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی جو ضروریات ہیں، ان کو فراہم کرنے کے لئے اپنا مال، اپنی دولت خرچ کرنا ——— اس ضمن میں جو بندۂ مومن جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے اللہ اسے اپنے ذمہ قرض سے تعبیر فرماتا ہے اور اس میں درحقیقت ہماری حوصلہ افزائی ہے، اگرچہ مالک حقیقی وہی ہے۔ وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اسی کے ہیں"۔ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "آسمانوں اور زمین کی ساری میراث اللہ ہی کی ہے"۔ یہ دونوں آیات میں دورانِ مطالعہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ لیکن اس نے جو مال ہماری تحویل میں دیا

بقیہ ص ۹۲

رُوبرُو

ٹیلیویژن کے پروگرام "روبرو" میں ۲۸ مئی بروز سہ شنبہ شام چھ بجے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا وہ انٹرویو نشر کیا گیا جو ۱۲ اپریل کو ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ اس انٹرویو کو کیسٹ سے قریباً من وعن منتقل کر کے افادۂ عام کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ البتہ گفتگو میں ربط قائم کرنے اور مفہوم واضح کرنے کے لئے چند الفاظ قوسین میں دیئے گئے ہیں۔ (ادارہ)

شرکائے مجلس

——— میزبان : جناب انور حسین صاحب

——— مہمان خصوصی : جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

——— انٹرویو پینل کے اراکین :

(i) جناب ارشاد احمد حقانی صاحب (مشہور صحافی متعلق روزنامہ "جنگ")

(ii) جناب محمد صلاح الدین صاحب (مدیر ہفت روزہ "تکبیر" کراچی)

(iii) مولانا محمد متین ہاشمی صاحب (انچارج ریسرچ سیل، دیال سنگھ لائبریری)

انور حسین صاحب : السلام علیکم ناظرین! آج ہم نے "روبرو" کے لئے جس شخصیت کو مدعو کیا ہے وہ ملک کے نامور مذہبی سکالر ہیں "ڈاکٹر اسرار احمد" — اراکین کے پینل کے معزز اراکین جنہیں ہم نے مدعو کیا ہے وہ ہیں (i) ارشاد احمد حقانی صاحب، ممتاز صحافی اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے سابق رفیق کار[1] اگر ڈاکٹر صاحب کو ہمارے اس کہنے پر اعتراض نہ ہو، — (ii) محمد صلاح الدین صاحب، ہفت روزہ "تکبیر" کراچی کے مدیر اور (iii) مولانا محمد متین ہاشمی صاحب جو ایک محقق اور معروف استاذ ہیں۔ سوالات کی پیشگی اطلاع ہم نے معزز مہمان کو نہیں دی ہے — خاص طور پر میں یہ درخواست کروں گا معزز مہمان سے اور

[1] مراد یہ ہے کہ اوائل ۱۹۵۷ء تک دونوں حضرات "جماعت اسلامی" کے رکن رہے ہیں (مرتب)

پینل کے اراکین سے بھی کہ سوالات اور جوابات بہت مختصر ہوں اس لئے کہ وقت بہت محدود ہے ۔ اس کے ساتھ ہی میں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ اپنے سوال سے گفتگو کا آغاز فرمائیں ۔

ارشاد احمد حقانی صاحب : ڈاکٹر صاحب ! جہاں تک مجھے علم ہے آپ نے اپنی پبلک لائف یا دینی اور سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ایک طلبہ تنظیم سے کیا تھا پھر آپ ایک دینی اور سیاسی جماعت میں شامل ہو گئے جسے آپ نے کچھ عرصہ بعد چھوڑ دیا ۔ کوئی تین ساڑھے تین سال قبل آپ حکومت کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کے رکن بھی بنے جس کا مقصد بھی نفاذِ اسلام کے عمل میں مشورہ دینا ہی بیان کیا گیا تھا لیکن آپ نے اس کی رکنیت بھی کچھ عرصہ بعد ترک کر دی اس وقت آپ دو تنظیموں کے بانی اور سربراہ ہیں پہلے آپ نے انجمن خدام القرآن قائم کی جس کا مقصد رجوع الی القرآن تھا پھر غالباً کوئی دو اڑھائی سال کے بعد آپ نے تنظیم اسلامی قائم کی اور اس کا مقصد بھی انقلابِ اسلامی بیان کیا جاتا ہے ۔ آپ اپنے اس ذہنی سفر کو کس طرح دیکھتے ہیں اور آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی تنظیم اسلامی کی مابہ الامتیاز خصوصیت کیا ہے ؟ جس نے آپ کی نظر میں اس کا جواز فراہم کیا ہے اور کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ پہلی کوششیں ناکام ہوئیں اور اب آپ اس (یعنی تنظیم اسلامی) کے ذریعے بہتر طور پر اپنے مقصد کے لئے کام کر سکتے ہیں ؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب : جی ہاں میرا یہ خیال ہے کہ میرا یہ سارا سفر جو آپ نے TRACE کیا ہے تاریخی اعتبار سے آپ نے اس کا بہت ہی صحیح جائزہ پیش کیا ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ تمام جد وجہد) بالکل ایک خطِ مستقیم میں ہے ۔ میرے ذہن پر اوّلین اثرات جو بالکل بچپن میں ہوتے تھے وہ علامہ اقبال کی ملی شاعری کے تھے انہیں ایک اُمید افزا پیغام تھا ۔ میں CONTRAST (تقابل) کیا کرتا ہوں علامہ کی شاعری کو مولانا حالی کی شاعری سے حالی کے ہاں ہمیں مرثیہ ملتا ہے لیکن مستقبل کیلئے کوئی امید افزا پیغام یا خبر نہیں ملتی ۔ اقبال کے ہاں جہاں بہت بھرپور مرثیہ ہے اور انہوں نے مسلمانوں کی سطوتِ گذشتہ پر نوحہ کرتے

ہوتے بہت ہی عمدہ اشعار کہے ہیں ۔ وہاں دوسری طرف مسلمانوں کے لئے ایک امید افزا پیغام بھی ہے کہ ؎

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

تو یہ ہے دراصل میرا ذہنی پس منظر۔ بالکل بچپن میں جب کہ میں پانچویں جماعت میں تھا تب میں بانگِ درا گنگنا کر پڑھا کرتا تھا ۔ پھر اس کے بعد تحریک مسلم لیگ کے ساتھ بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے ایک تعلق رہا ہے ۔ سٹوڈنٹ فیڈریشن (STUDENTS FEDERATION) میں میں اپنی ہائی اسکول لائف میں حصار ڈسٹرکٹ کا جنرل سیکرٹری تھا ۔ اس لئے کہ ہمارا ضلع چونکہ خاصہ پسماندہ اضلاع میں شمار ہوتا تھا ۔ اس میں کوئی گورنمنٹ کالج تو تھا ہی نہیں صرف ہائی سکول تھے ۔ میں بھی ہائی سکول میں تھا اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں حصہ لیتا تھا ۔ پاکستان بننے کے بعد فوراً ہی احیائے دین اور احیائے اسلام میں سب سے نمایاں ہو کر جماعت اسلامی سامنے آئی اور میں نے اس کی پکار پر لبیک کہا ۔ پاکستان پہنچ کر میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا ۔ کالج کے ان دو سالوں کے دوران چونکہ میں کرشن نگر میں مقیم تھا ۔ لہٰذا میں نے جماعت کے حلقۂ ہمدرداں سے وابستگی اختیار کر لی ۔ اور جب میڈیکل کالج میں میرا داخلہ ہوا ۔ تو پھر جمعیتِ طلباء کی رکنیت اختیار کرتے ہوئے میں نے اس میں بھرپور حصہ لیا ۔ جیسے ہی میں (ایم بی بی ایس مکمل کر کے) فارغ ہوا میں نے جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کر لی ۔ لیکن بہت جلدی مجھے محسوس ہوا کہ ہم محض کسی سیاسی عمل کے ذریعے اسلام کو ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے دوبارہ قائم اور نافذ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے میرے نزدیک ایک تجدیدِ ایمان کی تحریک ضروری تھی ۔ خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقے میں، کہ مغربی تہذیب، مغربی افکار اور مادہ پرستانہ فلسفوں نے ہمارے یقین کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے ۔ جس کے بارے میں اقبال کہتے ہیں ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

لہٰذا میں نے یہ سمجھا کہ اس سلسلے کا پہلا لازمہ (PRE REQUISITE) تو یہ ہے کہ خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقے میں از سرِ نو ایمان کی اقدار کو اجاگر کیا جائے اور اس کے لئے منبع اور سرچشمہ (SOURCE) میرے نزدیک قرآن مجید ہے۔ لہٰذا میں نے زیادہ ، CONCENTRATE کیا یعنی اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا قرآن مجید ہی کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کو اُسی ضمن میں انجمن خدام القرآن لاہور اور قرآن کانفرنسوں کا انعقاد عمل میں آیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پورے طور پر مجھ پر عیاں تھی کہ قرآن درحقیقت ایک انقلابی پیغام دیتا ہے جو دین کی صرف تبلیغ ہی نہیں چاہتا بلکہ دین کی اقامت چاہتا ہے کہ دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے، جس میں کوئی گوشہ بھی خالی نہ رہ گیا ہو، باقاعدہ نافذ کیا جائے اور اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ اس کے لئے ظاہر بات ہے کہ جماعت کی ضرورت ہے جو میں نے "تنظیم اسلامی" کے نام سے قائم کی ہے۔ میرے پیشِ نظر اس کے لئے ایک انقلابی جماعت کی تشکیل ضروری ہے میں یہ نہیں کہتا کہ میں ایسی جماعت (فی الواقع) بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ لیکن یہ کہ اُس انقلابی جماعت کے خدوخال کیا ہوتے ہیں! اس کے کیا خصائص ہوتے ہیں! پھر یہ کہ اسلامی انقلاب کے کیا مراحل ہمیں سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ملتے ہیں — اور یہ کہ اب ہمیں اگر اس طریقِ کار کو اختیار کرنا ہے (اس PROCESS کو اگر ADOPT کرنا ہے) تو اس میں کہاں کہاں حالات کی تبدیلی کے باعث ہمیں کچھ ترامیم اور اضافے (MODIFICATIONS) کرنا پڑیں گے! میں ان چیزوں کو اپنی امکانی حد تک واضح کر رہا ہوں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ الیکشن کے ذریعے سے اس ملک میں اسلام کو ایک بالادست قوت کی حیثیت سے نافذ کرنا ممکن نہیں ہے۔

صلاح الدین صاحب: ڈاکٹر ! آپ انتخابات کی ضرورت اور اہمیت پر غیر معمولی زور دیتے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کی طرف سے یہ وضاحت بھی آتی رہی ہے کہ ہم خود اس انتخابی عمل میں شریک نہیں ہوں گے آج کے دور میں تبدیلیٔ حکومت کا سب سے مؤثر اور معروف ذریعہ انتخابات ہی ہیں ان انتخابات کی ایک طرف

تو آپ ضرورت اور اہمیت واضح کرتے ہیں لیکن دوسری طرف خود اس میں شرکت سے گریز کرتے ہیں اور اسکے ساتھ ساتھ یہ عدم اطمینان بھی آپ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے وہ مطلوبہ اسلامی انقلاب نہیں آسکتا جس کے لئے آپ کوشاں ہیں تو پھر اس سے (یعنی انتخابی طریق کار سے) ہٹ کر آپ کے ذہن میں اس انقلابی عمل کی کیا شکل ہے ؟ اگر ہم انتخابات کے اس طریق کار (PROCESS) کو چھوڑ دیتے ہیں - ذرا سا ایک سوال یہ بھی ہے کہ جس انتخاب پر آپ زور دیتے ہیں، آپ کی اپنی تنظیم میں ہمیں وہ انتخابی عمل نظر نہیں آتا - اس تضاد کی ذرا کچھ وضاحت ہو جائے !

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب : جی ہاں! آپ درست فرما رہے ہیں، میں ملک کے لئے جو انتخابات کو لازم سمجھتا ہوں اور برملا یہ بات کہتا ہوں کہ اس PROCESS ، (یعنی انتخابی عمل) میں جو بھی رکاوٹ آتی ہے - وہ خودکشی کے مترادف (SUICIDAL) ہے اور بہت خطرناک ہے ملک کے لئے لیکن ساتھ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام یہاں انتخابات کے ذریعے نہیں آسکتا - اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں کہ ایک ہے کسی انسان کا زندہ رہنا اور ایک ہے اس کا مسلمان بننا - ان دونوں کے تقاضے بالکل مختلف ہیں کسی بھی انسان کو خواہ وہ مسلمان ہو، ہندو ہو، سکھ ہو، پارسی ہو زندہ رہنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے - ہوا، پانی اور غذا - ان میں سے جو چیز بھی آپ روک لیں گے جلد یا بدیر اس کی موت واقع ہو جائیگی - لیکن اس انسان کے مسلمان بننے کے لئے اُسے ایمان درکار ہے خواہ کسی بھی درجے میں ہو - کچھ نہ کچھ رمق تو اس کے دل میں ایمان یا یقین کی ہو گی - تب ہی وہ اسلام پر عمل پیرا ہوگا - بالکل اسی طریقے سے ایک ملک کے بسنے والوں میں ایک اطمینان کی کیفیت، ان کا یہ احساس کہ (ملک کے انتظامی امور میں) ہماری بھی PARTICIPATION ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں بسنے والے لوگوں میں یہ احساس کہ اس ملک کے نظام میں ہماری رائے کی بھی اہمیت ہے، یہ سب چیزیں اس ملک کے استحکام اور بقا کے لئے نہایت

ضروری ہیں - اگراس عمل میں کوئی رکاوٹ آتی ہے تو یہ چیز اس کے وجود کے لئے انتہائی خوفناک اور بہت خطرناک بن جاتی ہے لہٰذا میں اس PROCESS (یعنی انتخابی عمل) کے جاری رہنے کا شدت کے ساتھ قائل ہوں - البتہ مجھے اسی بات پر یقین حاصل ہے کہ اسلام اس راستے سے نہیں آئے گا اس کی وجہ کیا ہے ؟ آپ نے خود ایک بہت خوبصورت لفظ استعمال کیا "تبدیلیٔ حکومت" میرے پیش نظر تبدیلیٔ حکومت نہیں بلکہ تبدیلیٔ نظام ہے - اصل میں ایک انسان کو سب سے پہلے یہ تشخیص کرنا پڑتی ہے کہ کسی خطۂ زمین میں بنیادی طور پر جو نظام (قائم و رائج) ہے جسے آپ ('The Politico-socioeconomic System as a whole') کہتے ہیں (یعنی بحیثیتِ مجموعی کسی ملک کا سیاسی و معاشی و اقتصادی نظام) اگر وہ درست ہے لیکن اس کے چلانے والے ہاتھ نااہل ہیں تو اس میں ضرورت ہوگی تبدیلیٔ حکومت کی - اور اس کے لئے سیاسی (POLITICAL PROCESS) مفید ہے لیکن اگر تشخیص یہ ہے کہ بنیادی نظام ہی غلط ہے تو نظام کبھی بھی اس انتخابی عمل کے ذریعے سے بدلا نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے تو ایک انقلابی عمل کی ضرورت ہے اب یہ اپنی جگہ بہت طوالت کا حامل سوال ہے کہ یہ انقلابی عمل ہے کیا ! (اور ظاہر بات ہے کہ یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں ہے) میں نے عرض کیا تھا کہ میرے نزدیک اس (انقلابی عمل) کا کامل ترین نمونہ (IDEAL) سیرت محمدی - صلی اللہ علیہ وسلم ہے - اس لئے کہ کامل ترین انقلاب اور گمبھیر ترین انقلاب اور مختصر ترین وقت میں اور یہ کہ ایک شخص واحد کی اپنی زندگی میں انقلاب کی تکمیل ہو جانا ، اس کی تاریخ انسانی میں یہ ایک ہی مثال ہے - (اور وہ ہے انقلاب محمدی) ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس (انقلاب) کا معروضی مطالعہ (OBJECTIVE STUDY) کریں (اور اس سے اپنے لئے رہنمائی حاصل کریں -) باقی رہا یہ معاملہ کہ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اب ہمیں اس میں کہاں کہاں تبدیلیاں کرنی ہونگی یہ موضوع خاصا طوالت طلب ہے --- آپ کے آخری سوال کے ضمن میں عرض ہے کہ میں یہ

سمجھتا ہوں کہ انقلابی جماعت کے اندر اس کا نظم یہی ہونا چاہیئے کہ چونکہ اسے ایک تحریک اور ایک RESISTANCE MOVEMENT کی حیثیت سے اٹھنا ہوتا ہے لہٰذا اس میں جمہوری نظام WORK نہیں کرسکتا (نہیں چل سکتا) سیاسی جماعت میں (جمہوری نظام) WORK کر سکتا ہے اور اس کو کرنا چاہیئے - اسی طرح اسلامی انقلاب کے ذریعے سے جب اسلامی حکومت قائم ہوگی اور صحیح اسلامی ریاست قائم ہوگی اس میں بھی وہ جمہوری نظام رُو بکار لانا ہوگا لیکن جو تحریک انقلابی مقصد کے لئے) اٹھتی ہے اس کے نظام کے اندر ضروری ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد ایک داعی یا ایک قائد کہ جس پر لوگوں کو اعتماد ہوگیا ہو اس کے ساتھ لوگ اپنے آپ کو Attach (وابستہ) کریں اور پھر فیصلے وہاں گنتی سے نہ ہوتے ہوں، مشورہ ہو، باہمی مشاورت کا نظام ہو لیکن اُس شخص کی صوابدید کو آخری بات کا درجہ حاصل ہو (جو تحریک کا داعی اور قائد ہے) میرے نزدیک یہ بالکل ناگزیر ہے کسی انقلابی جماعت کے لئے -

انور حسین : مولانا! (آپ)

مولانا متین ہاشمی :- ڈاکٹر صاحب آپ نے بہت سارے مواقع پر یہ فرمایا ہے کہ جو انقلابی جماعت آپ قائم کرنا چاہتے ہیں اس میں بیعت ہو جہاد ہوگا ہجرت ہوگی تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب ایک مسلم ملک میں آپ رہتے ہیں اور ایک مسلم سربراہ یہاں حکومت کر رہا ہے تو ایک STATE کے اندر STATE قائم کرنا - یا ایک بیعت جسے اعتماد سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اس اعتماد کے ہوتے ہوئے آپ اپنے لئے ایک دعوت دے رہے ہیں[1] بیعت کی اور بعض اوقات ہجرت اور جہاد کی - تو اس کی آپ وضاحت فرمائیں کہ بیعت یا تو بیعت ارشاد ہوتی ہے لیکن یہ جو بیعت آپ لے رہے ہیں لوگوں سے یہ کس سلسلے کی بیعت ہے -؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب : یہ مولانا آپ نے اپنے سوال میں جو تین الفاظ

---

[1] مولانا ہاشمی کی مراد یہ ہے کہ ایک شخص یعنی جنرل ضیاء الحق کے بارے میں لوگ اعتماد کا اظہار کر چکے ہیں گویا معنوی طور پر بیعت ہو چکی ہے لہٰذا اب کسی اور کیلئے قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ وہ بیعت لے۔

استعمال فرمائے ہیں میں چاہتا ہوں کہ پہلے دو کی وضاحت کر دوں، آپ کے سوال نسبتاً اہم ہیں لیکن ان کی وضاحت ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہجرت کا جو تصور میرا ہے وہ صرف کسی ملک کو چھوڑ کر جانے کا نہیں ہے بلکہ جیسے حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں آتا ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ۔ آپ نے فرمایا: اَنْ تَھْجُرَ مَاکَرِہَ رَبُّکَ کہ حضورؐ اسب سے اعلیٰ ہجرت اور سب سے افضل ہجرت کون سی ہے آپ نے فرمایا ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے رب کو پسند نہیں ہے۔۔۔

مولانا متین ہاشمی: (قطع کلامی کرتے ہوئے) تاریخ اسلام میں ہجرت کا جو معروف مفہوم ہے وہ مکروہ چیزوں کو ترک کرنا نہیں ہے۔۔۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب: نہیں معاملہ یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے حدیث نبویؐ QUOTE کر رہا ہوں آخر رجوبات حدیث کے ذریعے سے سامنے آرہی ہے) وہ تو غیر معروف کے دائرے میں نہیں جاتی۔

مولانا متین ہاشمی: وہ تو ہے لیکن میں اس چیز کو عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں ہجرت کی جو اصطلاح مستعمل ہے وہ تزکیہ نفس کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتی۔ استعمال ہوتی ہے ترک وطن کے بارے میں!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب: میں ہجرت کو اس کے اُس وسیع تر مفہوم میں لیتا ہوں جو کتاب و سنت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن یہ کہ جب میں اس کا ذکر کرتا ہوں تو ساتھ وضاحتیں بھی کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اس (ہجرت) کا اول یہی ہے۔ (کہ انسان ہر اُس چیز کو ترک کر دے جو اُس کے رب کو ناپسند ہو) البتہ اس کی نیت انسان کو رکھنی ہوگی کہ اگر کہیں اس دین کے غلبے کی جدوجہد میں کوئی ایسا مرحلہ آجائے کہ انسان کو اپنے وطن کو بھی خیر باد کہنا پڑے تو اس کے لئے بھی تیار رہے۔

مولانا متین ہاشمی: لیکن اس کے لئے بہت شرائط ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب: اسی طرح جہاد کا معاملہ ہے (اس لفظ کا مفہوم بھی بہت وسیع ہے) جہاد کا بنیادی مفہوم ہے جدوجہد۔ اور ہمارے دین میں اس

مراد ہے تمام غیر اسلامی قوتوں سے کشمکش اور پنجہ آزمائی - اس بارے میں حضور اللہ علیہ وسلم سے جب یہ پوچھا گیا کہ سب سے افضل جہاد کونسا ہے آپؐ نے یا کہ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ - ایک روایت میں الفاظ ہیں اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ تو جہاد تو انسان کے اپنے نفس سے روع ہوگا - پھر باطل نظریات کے خلاف ہم دعوتی تبلیغی جو بھی کوششیں کریں مساعی کریں گے اور اپنی امکانی حد تک ذرائع ابلاغ کو استعمال کریں گے ب جہاد میں شامل ہے - اور یہ درحقیقت باطل اور غلط نظریات کے خلاف دہے - پھر یہ کہ اگر وہ مرحلہ آتا ہے کہ ایک RESISTANCE MOVEMENT رات کے خلاف ایک قوت بہم پہنچا کر اور ایک اپنی طاقت کے مظاہرے سے منکرات کے خلاف اقدام کرتی ہے - تو یہ بھی اس جہاد ہی کے ذیل میں آئیگا -

مولانا متین ہاشمی : تو اس میں مسلح جدوجہد کی نوبت بھی آسکتی ہے !

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب : اس کو بھی ایک بالکل آخری امکانی ہے میں RULE OUT (نظر انداز) نہیں کیا جاسکتا -

مولانا متین ہاشمی : ایک اسلامی مملکت میں یا مسلم مملکت میں مسلح جہد کے لئے کوئی تنظیم بنانے کی مثال اسلامی تاریخ میں ملتی ہے ؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب : جی ہاں فقہاءِ احناف نے اس کی اجازت ہے اگرچہ اس کی شرائط بڑی سخت . . . .

مولانا متین ہاشمی : (قطع کلامی کرتے ہوئے) اس کی شرائط تو یہ ہیں اگر کفر کے شعار کو حاکم وقت رائج کرنے لگے اور اسلام کے شعار کو مٹانے تو اس وقت کو اس کے خلاف مسلح جدوجہد کی جاسکتی ہے -

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب : اس وقت ہمیں کیا معلوم کہ کل پاکستان کونسا نظام آنے والا ہے ! ابھی تو ہم ایک جدوجہد کے لئے ایک جمعیت ہم کر رہے ہیں ان تمام شرائط کو ہم بھی اپنے سامنے ضرور رکھیں گے - اب ری بات یہ آتی ہے - بیعت اصل میں تنظیم کی ایک بنیاد ہے تنظیم کی ایک بنیاد یہ ہوتی ہے کہ کچھ لوگ مل جل کر ایک تنظیم بنانا چاہتے ہیں اس کے لئے وہ ممبر سازی

کرتے ہیں اس میں بنیادی اہمیت کی چیز BASIC MEMBERSHIP ہے جو DECISIVE (فیصلہ کن) ہوتی ہے ۔ وہ اپنے میں سے کسی کو اپنا سربراہ چنتے ہیں پھر اس کی GUIDANCE (راہنمائی) کے لئے یا CHECKS & BALANCES کے لئے کوئی انتظامی کمیٹی یا شوریٰ ترتیب دیتے ہیں اور کثرتِ آراء سے

مولانا محمد منیں ہاشمی : (قطع کلامی کرتے ہوئے)

آپ کی جو بیعت ہے اس کی نوعیت کیا ہے ؟ یہ ذرا واضح کر دیں

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

میں یہی عرض کر رہا تھا ۔ اس کی نوعیت صرف یہ ہے کہ میں ایک کام کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں دین کی جدوجہد کے سارے مراحل اس میں شامل ہیں ۔ دعوت، تبلیغ اسلام کا پھیلانا اسلام کے خلاف جو نظریات ہیں ان کا ابطال کرنا پھر یہ کہ لوگوں کو آمادہ کرنا کہ وہ اپنی زندگیوں میں تبدیلی لائیں ۔

انور حسین صاحب (میزبان) :

میں عرض کروں کہ جو آپ کے مقاصد ہیں وہ یقیناً اپنی جگہ پر ہیں لیکن کیا ایک تنظیم کی جو عام ممبرشپ ہوتی ہے اس سے وہ مقاصد پورے نہیں ہوتے بلکہ بیعت کی ضرورت باقی رہتی ہے ؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

جی میں عرض کرتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے ۔ یعنی اصل میں تنظیم کی ایک شکل تو وہ ہوتی ہے، جس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں، جس میں DECI-SION (فیصلہ) ووٹوں کی گنتی سے ہوتا ہے ۔ یہ تنظیم (یعنی بیعت کے نظام پر مبنی تنظیم) اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں ایک شخص کسی مشن کو لے کر کھڑا ہوتا ہے (وہ اس کا داعی ہوتا ہے) پہلے اس شخص پر اعتماد کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ اور جو شخص بھی اس میں شامل ہوتا ہے اس (داعی) کا ساتھی بن کر آتا ہے اور وہ یہ عہد کرتا ہے کہ جب تک تم کتاب و سنت سے باہر کوئی حکم نہیں دو گے ہم تمہارا حکم مانیں گے اگر ہمیں کسی وقتی رائے سے اختلاف بھی ہوا تو رائے ہم دیں گے لیکن یہ کہ اس کے بعد آخری فیصلہ COUNTING OF VOTES

ے نہیں ہوگا۔ وہ آخری فیصلہ آپ کریں گے!۔

صلاح الدین صاحب :

ڈاکٹر صاحب میرا ایک سوال یہ ہے کہ آپ کی دعوت جس انداز پر اور جس نہج پر ل رہی ہے اس کے نتیجے میں فرض کیجئے ایک ذہنی انقلاب آتا ہے اور ایک کثیر تعداد آپ کی ہم خیال ہوجاتی ہے اور اس کثیر تعداد کو یہ موقعہ ملتا ہے کہ وہ ووٹ ں کے ذریعے یعنی انتخابات ہی کے ذریعے حکومت بھی تبدیل کرتی ہے - در اصل انقلاب راستہ تبدیلیٔ حکومت ہی کے بعد کھلتا ہے - لیکن آپ نے اگر انتخابات میں عدم شرکت ایک اصول بنالیا ہے اور یہ نظریہ اپنا لیا ہے کہ یہ (اسلام) انقلاب ہی کے ذریعے ئے گا - تو (میری رائے میں) یہ انقلاب BY VOTE بھی آسکتا ہے اگر ذہنی تبدیلی اس جے تک پہنچ جائے کہ جہاں اکثریت آپ کی ہم خیال ہوجائے لیکن وہ راستہ تو آپ ے کھلا نہیں رکھا ہے!

اکٹر اسرار احمد صاحب :

اصل میں اکثریت کبھی بھی ہم خیال نہیں ہوا کرتی بلکہ ہمیشہ انقلابی عمل میں ہوتا ہے کہ ایک مضبوط NUCLEUS (مرکز) وجود میں آتا ہے جو لوگ اگرچہ اقلیت ں ہوتے ہیں لیکن اپنی COMMITMENT (بھرپور وابستگی) اپنی DEDICATION پنے ایثار اپنی قربانی سے وہ EFFECTIVE MAJORITY (متاثر کن اکثریت) بن جاتے ں - تو میرے نزدیک یہی معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا - عرب کی کوئی کثریت آپ کے ساتھ نہیں تھی جب آپ نے انقلابی عمل کے ذریعے سے جزیرہ نما عرب ں اسلامی نظام قائم و نافذ فرمایا تھا ۔

محمد صلاح الدین صاحب :

وہاں تو کفار و مشرکین تھے اور یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ۔

مولانا محمد متین ہاشمی :

اسلامی ریاست میں یہ کیسے ممکن ہے ؟ ؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

دیکھئے ! جب ہم بات کرتے ہیں انتخاب یا انقلاب کی تو اُبھی اسلامی یا غیر اسلامی

کی بحث کو ذرا علیحدہ رکھ دیجئے۔ کہ کوئی بھی انقلاب جب آتا ہے نظام کو بدلنے کے لئے تو وہاں یہی شکل ہوتی ہے کہ وہ ایک نئی فکر اور نئے نظریئے کے ساتھ آتا ہے۔ لیکن اگر معاملہ یہ ہو کہ کوئی نیا نظریہ اور نیا فکر موجود نہ ہو تو پھر انقلاب کی ضرورت کیا ہے! وہاں انتخابات کا راستہ اختیار کرنا ہی صحیح طرزِ عمل ہوگا۔ لیکن واضح رہے کہ انتخاب کے ذریعے صرف نظام چلانے والے ہاتھ تبدیل کئے جاسکتے ہیں نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔)

مولانا متین ہاشمی :

لیکن خلفاءِ راشدین کے زمانے میں تو انتخاب ہوا ہے!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

یہ تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اسلامی انقلاب کے نتیجے میں جب ایک اسلامی ریاست صحیح اسلامی ریاست، وہ صرف NOMINAL اور نام کی اسلامی ریاست نہ ہو کہ جیسے ہم آجکل مسلمانوں کی حکومت کہتے ہیں بلکہ صحیح اسلامی ریاست قائم ہوگی تو اس کا نظام میرے نزدیک وہی ہوگا کہ انتخابات بھی ہونگے اور پھر یہ کہ آپ کو جدید تقاضوں کے مطابق خلافت راشدہ سے اصول لے کر

مولانا متین ہاشمی : (قطع کلام کرتے ہوئے)

گویا آپ نے یہ تسلیم کر لیا کہ انتخاب کے ذریعے بھی صحیح اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

جی نہیں! ابھی جو گفتگو ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ انتخاب کے ذریعے صحیح اسلامی ریاست چل سکتی ہے۔ . . .

مولانا محمد متین ہاشمی : (بات کاٹتے ہوئے)

گویا چل سکتی ہے۔ قائم نہیں ہو سکتی!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

جی ہاں! جہاں تک اسلامی ریاست کے قیام کا تعلق ہے وہ درحقیقت ایک انقلابی عمل کے بغیر ممکن نہیں۔

ارشاد احمد حقانی صاحب :

ڈاکٹر صاحب! ابھی آپ نے اپنی گفتگو میں 'CREATIVE MINORITY'
یا 'COMMITED MINORITY' کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں آپ نے فرمایا
ہے کہ وہ EFFECTIVE MAJORITY کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے تو
اس کا PROCESS (طریق کار) کیا ہے! 'MODUS OPERANDI' جس
کو کہتے ہیں وہ کیا ہوگا ؟ (یعنی وہ طریق کار کیا ہے جس کے ذریعے ایک مضبوط اقلیت
فیصلہ کن اکثریت کی شکل اختیار کر لیتی ہے بالفاظ دیگر اقدام کی صورت کیا ہوگی ؟)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

اس کو میں چاہتا ہوں کہ وقت کی کمی کے باعث اسے GENERALIZE
(یعنی عمومی طور پر اصول بیان) کرنے کی بجائے ایک متعین شکل میں سامنے رکھوں یعنی
ہمارا جو ایک خصوصی معاملہ ہے کہ مسلمان ملک ہے اور مسلمان ہی حکمران ہیں چاہے وہ
بہت زیادہ PRACTICING (عملی مسلمان) ہیں یا نہیں اور مسلمانوں کی عظیم اکثریت
ہے وہ بھی عمل کے اعتبار سے ان میں کوتاہیاں ہیں - اب جہاں تک اس سوال کا
تعلق ہے کہ اس قسم کی صورت حال میں اگر کوئی ایسی (انقلابی) جماعت وجود میں آ
جائے تو وہ کیسے LAUNCH کرے گی ! (یعنی اس انقلابی جدوجہد کا عملی طریق کیا ہو
گا)، میرے نزدیک اس کے لئے ہمیں احادیث مبارکہ سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ یہ کہ
منکرات کے خلاف قوت کے ساتھ جہاد کیا جائے گا - مثلاً وہ چیز کہ جس کے بارے
میں سب یہ تسلیم کریں کہ دین کے اعتبار سے یہ منکر ہے تو اگر وہ قوت وجود میں آ چکی
ہو، وہ ایک 'جماعت'، ایک ایسی 'انقلابی جماعت' جو DEDICATED ! لوگوں
پر مشتمل ہو کہ جو دین کے لئے اپنے تن من دھن دینے کے لئے تیار ہوں (یہ -PRE
REQUISITE ہے) تو پھر وہ جماعت اس کو چیلنج کرے گی - کہ ہم یہ کام یہاں
نہیں ہونے دیں گے اور اس کے لئے پُرامن مظاہرہ کریں یہ بہت ضروری بات
ہے کہ مظاہرہ پُرامن رہے، اس لئے کہ میرے نزدیک اس معاملے میں آئیڈیل ہے
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا وہ بارہ سالہ دور جو مکے کا ہے جس کو ہم
NON VIOLENT کہہ سکتے ہیں اور اس کو میں کہا کرتا ہوں کہ دراصل اسی کا نام

ACTIVE RESISTANCE ہے اور اس کے بعد وہ PASSIVE RESISTANCE سے بدلتی ہے تو اس میں ایک شکل یہ بھی ہے کہ پرامن مظاہرہ ہو۔ ٹھیک ہے اگر اس وقت کی حکومت یا نظام اس مطالبے کو تسلیم کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹے گا اس کی پسپائی ہو گی جبکہ ہماری پیش قدمی ہو گی اور رفتہ رفتہ اسی عمل سے تبدیلی آئے گی۔

محمد صلاح الدین صاحب :

اور اگر مزاحمت ہو نظام کی طرف سے

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

مزاحمت ہو تو ماریں کھائیں گے لیکن ہم ہاتھ نہیں اٹھائیں گے اور جو بھی مصیبت آئے گی برداشت کریں گے۔ (ان شاءاللہ) دنیا میں اس وقت جو INSTITUTION (ادارے) DEVELOP ہوئے ہیں کہ لوگ اپنے سیاسی حقوق کے لئے جو کچھ کرتے ہیں وہ ہمیں اسلام کے لئے کرنا ہے اپنے لئے نہیں کرنا، کسی پارٹی کی گورنمنٹ کے لئے نہیں کرنا۔ بلکہ جن چیزوں کے بارے میں اتفاق رائے ہے کہ یہ اسلام کے TENETS ہیں، یہ FUNDAMENTALS (اساسی معتقدات) ہیں، یہ اسلام کے نزدیک منکرات ہیں ان کو میدان میں لاکر ۔ ۔ ۔ ۔

محمد صلاح الدین صاحب :

غرض کہ جو جہاد بالسیف کا معاملہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

میں نے عرض کیا ناکہ یہ (یعنی جہاد بالسیف کا معاملہ) تقریباً RULED OUT ہے ۔ میں صرف نظری اعتبار سے یہ کہتا ہوں کہ ہمارے فقہا نے بہت سی شرطیں لگا کر اس کا امکان رکھا ہے کہ کسی وقت اگر ایسی کوئی جماعت محسوس کرے کہ وہ کسی مسلح جدوجہد کے ذریعے سے انقلاب لا سکتی ہے تو اس کے لئے وہ شرائط اگر پوری کر رہی ہے تو وہ حرام نہیں ہے، ناجائز نہیں ہے لیکن موجودہ حالات میں میرے نزدیک وہ تقریباً ناممکن العمل ہے ۔

انور حسین صاحب :

ڈاکٹر صاحب! اب میں گفتگو کا رخ ذرا تبدیل کرنے کی جسارت کروں گا۔

یہ کہ خواتین کے متعلق بھی کچھ سوالات ہیں - ہمارے جو ناظرین ہیں ان میں یقیناً خواتین بھی شامل ہیں اور آپ کا ایک حالیہ بیان ہے جس کے اندر آپ نے شاید یہ ذکر کیا ہے کہ مختلف جو کمپنیاں ہیں، مثلاً پی آئی اے ہے اُس سے خواتین کی ملازمت ختم کر دینی چاہیئے - اور صرف مرد حضرات ہی کام کریں - میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اس کا کس چیز سے تعلق ہے! یعنی خواتین کے حقوق سے تعلق ہے یا آپ کے اپنے ذہن میں خواتین کا معاشرے میں ایک خاص مقام ہے جس سے کہ کسی قسم کا مفر ممکن نہیں ہے

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

جی میں عرض کروں گا کہ اسلام کا جو میرا مطالعہ ہے، اور ظاہر بات ہے وہی مجھے بیان کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام SEXES (یعنی مرد و زن) کا جو آزادانہ میل جول یعنی MIXING ہے اس کو پسند نہیں کرتا - وہ دائرہ کار معین کرتا ہے اور یہ تو گویا کہ اس کے DIRECTIVE PRINCIPLES (رہنما اصول) ہیں کہ خواتین کے لئے وہ گھر کی ذمہ داری کو زیادہ پسند کرتا ہے لیکن یہ کہ استثنائی حالات میں خواتین کو کام کرنے کی اجازت ہے - اسلام اس کو حرام نہیں قرار دیتا - اور اگر ملکی سطح پر بھی اس کی ضرورت ہو تو اس کے لئے بھی مواقع ہیں - مثلاً ہماری یہ جو ملکی معیشت ہے اس کے لئے بھی ان کو کام میں لایا جا سکتا ہے لیکن وہ اصول پیش نظر رکھنا ہو گا کہ ان کی INTER MIXING (اختلاطِ مرد و زن) نہ ہو - بلکہ SEGREGATION OF SEXES کو پورے طور پر ملحوظ رکھنا ہو گا - اور اس میں مثلاً میرے سامنے یہ ہے کہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ یہ DECISION ہم لیں کہ پوری پرائمری تعلیم (EDUCATION) خواتین کو دے دیں پرائمری پر کوئی مرد ٹیچر نہ رکھیں اسی طریقے سے اگر ہم یہ سمجھیں کہ میں ان کو لانا ضروری ہے -

انور حسین : (قطع کلام کرتے ہوئے -)

کھیت کھلیان میں دیکھیں نا وہاں تو مرد اور عورتیں ایک ساتھ کام کرتی ہیں -

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

کھیت کھلیان کی بات یہ ہے کہ کھیت کھلیان میں عورت کام کر رہی ہوتی ہے اپنے محرموں کے مابین۔ وہاں گاؤں میں اس کا جو Immediate Atmosphere (فوری ماحول) ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کا کھانا لے کر کھیت میں جاتی ہے وہاں کھیت کے اندر اُس کا شوہر ہے بیٹے ہیں یا کوئی اور کام کر رہے ہیں وہ معاملہ بالکل مختلف ہے اس ماحول سے مثلاً جیسے پی آئی اے ہے جہاں ہماری بچیاں ملازمت کرتی ہیں۔ وہاں صورت یہ ہے کہ اگر پی آئی اے کی ایک Air Hostess کراچی سے چلتی ہے اور امریکہ تک جاتی ہے پھر وہاں سے واپس آتی ہے تو تقریباً اس کا ایک مہینہ صرف ہوتا ہے۔ وہ بالکل نامحرموں کے ماحول میں ہے۔ اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا اس (پی آئی اے کے معاملے کو) اُس پر (یعنی کھیت کھلیان کے معاملے پر) قیاس نہ کریں۔

حقانی صاحب :

ڈاکٹر صاحب! دفاتر میں بھی ایک خاص قسم کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے کھیت کھلیان میں بھی محرم ہوتے ہیں آپ نے ماحول کو اہمیت دی ہے ایک خاتون دفتر میں کام کر رہی ہے اور وہاں دس بیس سال سے کام کر رہی ہے تو وہاں بھی اس کا مانوس ماحول پیدا ہوجائے گا . . . !

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

یہ تو میں نے آپ سے کہا کہ (کھیت کھلیان میں) اگر نامحرم ہیں تو محرم بھی وہاں موجود ہیں۔ اس میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہوجاتا ہے۔ دفتر میں اگر ہماری کوئی بچی یا ہماری بہن کام کرتی ہے تو وہ تو بالکل اس کا نامحرموں کا ماحول ہے۔ اس اعتبار سے اصل مقصد تو یہ ہے کہ خواتین اپنا جو اصل فریضہ فطرت نے انہیں سونپا ہے اُسے باحسن وجوہ ادا کریں۔ پھر ملک کی معیشت میں اگر ان کا کوئی کردار ہو سکے تو بہت اچھا ہے۔ آپ ایسے INDUSTRIAL UNITS (صنعتی ادارے) بنائیے جس میں عورتیں کام کریں مرد کام نہ کریں!

انور حسین :

ڈاکٹر صاحب! آخری بات کہوں گا چونکہ ہمیں اشارے ہو رہے ہیں کہ وقت ختم ہو رہا ہے، آپ نے جو فرمایا خواتین کے متعلق تو آیا یہ قابلِ عمل ہے ہمارے ملک میں! کہ جیسے پرائمری ایجوکیشن صرف ان کو دے دی جائے یا مکمل طور پر ان کا SEGREGATION اور SEPARATION ہو مردوں سے کیا یہ قابلِ عمل ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب :

یہ بالکل قابلِ عمل ہے صرف ایک WILL چاہیئے، فیصلہ چاہیئے۔ اب دیکھیئے! آپ نے اگر اپنے ہوائی سفر کو DRY کر دیا (یعنی شراب کی سروس بند کر دی) تو پوری دنیا کے اعتبار سے تو یہ دقیانوسیت ہے۔ وہاں آپ شراب SERVE؟ کیوں نہیں کر رہے تو جو بھی اُن کے (یعنی عام دنیا کے) معیارات ہیں اُن کی نگاہ سے ہم کیوں سوچیں ہم نے سمجھا کہ شراب حرام ہے۔ لہٰذا ہم SERVE نہیں کر رہے۔

انور حسین :

گویا اس طرح سے پی آئی اے میں کام کرنا آپ کے نزدیک غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب : جی بالکل!

انور حسین :

یہ بحث (تو کافی طول پکڑ سکتی ہے، جیسے کہ سیاسی اور مذہبی نوعیت کے سوالات ہمارے پینل کے معزز اراکین نے کیئے تو یہ طویل بحثیں ہیں اور یقیناً تشنگی رہی۔ لیکن کیا کر سکتے ہیں وقت اب ختم ہوا۔ میں پینل کے معزز اراکین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ ارشاد احمد حقانی صاحب، محمد صلاح الدین صاحب اور مولانا محمد متین ہاشمی صاحب اور اپنے معزز مہمان ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا۔ آپ کا ہم نے کافی وقت لیا یا شاید آپ یہ کہیں گے کہ بہت کم وقت لیا۔ اس لئے کہ ایک نامور سکالر کی حیثیت سے آپ کو بہت کچھ کہنا تھا۔ سوالات بہت مختصر تو نہیں لیکن مشکل ضرور تھے۔ خدا حافظ!


فریش ویل
سوئیٹس
صدیوں پرانی روایات کی حامل ہماری مٹھائیاں اور حلوہ جات یقیناً ہمارے ذائقے اور لذت کی غمازی کرتی ہیں۔ احمد نے اس قدیم پیشے کو جدید دور کے تقاضوں سے ہمکنار کیا اور اپنی مصنوعات کو بالکل منفرد انداز میں پیش کیا۔
پاکستانی تہذیب
کا آئینہ دار
دنیا کے ہر براعظم میں احمد کی مٹھائیاں اور حلوہ جات پاکستانی تہذیب اور روایات کی شناخت ہیں۔
حلوہ جوزی
جدید ترین نائٹروجن پیکنگ پلانٹ پر سیلوفین پیکنگ کے ساتھ پیک کیے جاتے ہیں تاکہ تازگی اور خستگی ہمہ وقت برقرار رہے
ٹین کے لیڈ بغیر ٹین کٹر آسانی سے کھل جاتے ہیں۔
سوہن حلوہ
کراچی حلوہ
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
رس گلے
زعفرانی جامن
سوہن ڈیلائٹ
تلے ہوئے مصالحہ دار بادام
مٹھائیوں میں روایتی اور صنعتی معیار کے خالق
AHMED
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی ۱۲۰، سائیٹ، کراچی۔ فون: ۹۵-۲۹۴۲۹۱

MASS

اسلامی انقلاب (قسط ۲)

مراحل ۔ مدارج ۔ اور لوازم

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

حضرات! آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے جمعہ سے ہم ان اجتماعاتِ جمعہ میں "اسلامی انقلاب" کے منہجِ عمل کو ایک خاص نقطۂ نظر سے جاننے اور سمجھنے کے لئے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ حضورؐ کی سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ بہت سے پہلوؤں سے ہو سکتا ہے جیسے حضورؐ کے ذاتی محاسن، حضورؐ کے کمالات، حضورؐ کے مقام و مرتبہ کے اعتبارات سے۔ یہ بھی یقیناً سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم ترین موضوعات ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے مطالعہ کا رُخ یہ ہے کہ دنیا کا جو عظیم ترین، گھمبیر اور ہمہ گیر ترین انقلاب جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل بیس برس کی جدوجہد کے نتیجہ میں برپا فرمایا۔ ہم سمجھیں کہ اس کا منہاج کیا تھا! اس کا طریقِ کار کیا تھا! مزید یہ کہ اس انقلابی عمل کے مراحل کون کون سے تھے؟

اس ضمن میں سب سے پہلے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ سے علیحدہ کرتے ہوئے مجرد انداز میں انقلابی عمل کے چھ مراحل کا ذکر کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ میرا ماخذ (Source) سیرت النبیؐ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے انقلابی عمل کے ان چھ مراحل کو سمجھا ہے تو سیرتِ مطہرہ کے معروضی مطالعہ ہی سے سمجھا ہے۔ لیکن میں نے ان مراحل کو آپ کے سامنے رکھنے کے لئے پچھلے جمعہ میں یہ انداز اختیار کیا تھا کہ آپ پہلے کسی بھی انقلابی عمل کے ان چھ مراحل کو پہچان لیں ___ اور وہ تھے ۳ + ۳ ___ تین تمہیدی مراحل ہیں اور تین تکمیلی مراحل۔

تمہیدی مراحل کیا ہیں! پہلا یہ کہ کوئی انقلابی نظریہ ہو جس کی نشر و اشاعت کی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ یہی کسی انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز ہے۔ دوسرا یہ کہ جو لوگ اس انقلابی نظریہ کو قبول کریں

ن کو منظم کیا جائے جس سے ایک انقلابی جماعت اور پارٹی وجود میں آجائے ۔ تیسرا یہ کہ ان لوگوں کی تربیت کی جائے۔ اس لئے کہ خام اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کے ذریعہ سے انقلاب نہیں سکتا۔۔۔ اس ضمن میں، میں نے چند اہم باتیں بیان کی تھیں اور آپ سے عرض کیا تھا کہ ان کو بھی طرح ذہن نشین فرما لیجئے۔

دعوت کے ضمن میں، میں نے عرض کیا تھا کہ 'نظریہ' واقعتۃً اور حقیقت کے اعتبار سے 'انقلابی' ہونا چاہیئے۔ اگر انفرادی زندگی سے متعلق اخلاقی و اصلاحی تعلیمات کی اشاعت کی جائے گی تو کسی انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہو سکے گا۔ اس دعوت کے وہ پہلو نمایاں ہونے چاہئیں وانسان کی اجتماعی زندگی سے متعلق مسائل میں انقلابی نظریہ کے خدوخال کو واضح کرتے ہوں ور یہ بات مبرہن ہو کہ ان مسائل کو کن کن اعتبارات سے حل کرنا اس انقلابی نظریہ کا مقصود ہے۔

اسی طریقہ سے تنظیم کے بارے میں، میں نے عرض کیا تھا کہ اس تنظیم کا نہایت منظم اور منضبط (Disciplined organisation) ہونا ضروری ہے۔ جس کے لئے ہمارے پاس جو عام معیار اور مثال ہے وہ عسکری نظم وضبط (Army Discipline) کی ہے کہ جس میں جو حکم دیا جائے وہ مانا جائے۔ بیچ میں کوئی چون وچرا نہ ہو۔ اگر اس قسم کی کوئی جماعت نہیں ہوگی تو انقلاب برپا نہیں کر سکتی۔ کوئی اصلاحی کام کر سکتی ہے۔ تعلیمی کام کر سکتی ہے ور بہت سے سماجی اصلاح کے کام بغیر اس نوع کی تنظیم کے کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن انقلاب کے لئے ڈسپلن والی تنظیم ہونی لازم ہے۔

تیسری بات تربیت سے متعلق تھی۔ اس کے بارے میں، میں نے عرض کیا تھا کہ تربیت پیش نظر انقلابی نظریہ کے ساتھ مناسبت ہونی لازمی ہے۔ جو انقلاب آپ لانا چاہتے ہیں وہ اگر ادی قسم کا انقلاب ہے تو کارکنوں کی بھی صرف مادی تربیت کفایت کر جائے گی۔ ان کی روحانی اور خلاقی تربیت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر نظام ایسا قائم کرنا پیش نظر ہے جس میں روحانیت ور اخلاقیات کا بھی اہم حصہ ہے اور یہ دونوں صفات اس میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں تو اگر یہ دونوں چیزیں کارکنوں کی تربیت میں بتمام و کمال پیدا نہیں ہوئیں تو انقلاب میں کہاں سے آجائیں گی! ۔۔۔ پس یہ تینوں باتیں ان تینوں مراحل کے بارے میں ذہن میں مستحضر رکھنی بہت ضروری ہیں۔

تکمیلی مراحل کیا ہیں! ۔۔۔ ان کے لئے ایک عنوان ہے **تصادم** ۔ البتہ اس کے تین مراحل کے لئے علیحدہ علیحدہ عنوانات ہیں۔ پہلا عنوان ہے **صبرِ محض** ۔۔۔ یا ۔۔۔

Passive Resistance یعنی صبر کرو، جھیلو، برداشت کرو، ہاتھ مت اٹھاؤ۔ دوسرا عنوان ہے اقدام یا Active Resistance یعنی آگے بڑھو۔ مقابلہ کرو۔ چیلنج کرو۔ اس کے نتیجہ میں تیسرا مرحلہ آپ سے آپ آئے گا اور اس کا عنوان ہے مسلح تصادم یا Armed Conflict ۔ اور میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ اس مرحلے کے انجام دو ہی ہو سکتے ہیں۔ تخت یا تختہ یا انقلاب آجائے گا۔ نظام بدل جائے گا۔ وہ انقلابی جماعت کامیاب ہو جائے گی یا یہ انقلابی جماعت کچل دی جائے گی ـــــ الغرض کسی بھی انقلاب کے یہ چھ مراحل ہوتے ہیں اور میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ میں نے انہیں درحقیقت سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی کے معروضی مطالعہ سے اخذ کیا ہے۔

دو مراحل کے بارے میں پچھلے جمعہ میں، میں نے اپنی گفتگو جو اگرچہ اجمالاً تھی لیکن مکمل کر لی تھی کہ سیرت النبیؐ سے پہلے مرحلہ کے ضمن میں ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے اور دوسرے مرحلہ کے بارے میں کیا رہنمائی ملتی ہے! ـــ اور آج اصلاً مجھے تیسرے مرحلہ یعنی تربیت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ پچھلی مرتبہ اس پر ضمنی طور پر اور بر سبیلِ تذکرہ کچھ بات ہوئی تھی لیکن آج اس پر قدرے تفصیل سے گفتگو ہوگی ان شاء اللہ العزیز ـــ لیکن میں چاہوں گا کہ اس موضوع پر گفتگو سے قبل پہلے دو مرحلوں کے متعلق ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے، ہم اسے تازہ کر لیں ـــ دعوت کے متعلق کیا رہنمائی ہے! پہلی ہے توحید۔ اور اس کے لئے مرکز و محور (Axis) ہے قرآن مجید، فرقان حمید۔ دوسرے انقلابات سے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس اعتبار سے بنیادی طور پر مختلف ہے کہ دوسرے جو دنیوی انقلابات ہیں، ان کے نظریات انسانوں کے ذہن کی پیداوار تھے۔ بالشویک یعنی اشتراکی انقلاب کا فلسفہ کارل مارکس کے ذہن کی اختراع تھا۔ اسی طریقہ سے انقلابِ فرانس کا فلسفہ والٹیئر اور روسو اور دوسرے بہت سے مفکرین کے ذہنوں کی پیداوار تھا۔ اسلامی انقلاب کا فلسفہ اللہ تعالیٰ کا ودیعت کردہ ہے جو وحی کے ذریعہ سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ لہٰذا اس نظریہ کی نشر و اشاعت کے معنی کیا ہوں گے! قرآن حکیم کی نشر و اشاعت۔ اس کی تبلیغ، اس کے ذریعہ سے دعوت، اس کے ذریعہ سے تبشیر و انذار، اس کے ذریعہ سے تذکیر و نصیحت ـــ دوسری یہ کہ قرآن انسان کے لئے جو ہدایت لے کر آیا ہے، اس میں یقیناً انفرادی زندگی کے لئے بھی رہنمائی ہے۔ اور اجتماعی زندگی کے لئے بھی رہنمائی ہے۔ قرآن کے موضوعات انفرادی اعمال و افعال بھی ہیں، اجتماعی اقدار بھی ہیں لیکن انقلابی عمل کیلئے اس کے اس حصہ کو زیادہ نمایاں کرنا ہو گا جس کا تعلق اجتماعی نظام کے ساتھ ہے۔ میں نے عرض کیا تھا

کہ دو اہم نکات ہیں جو ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں ابتداء ہی سے نظر آتے ہیں۔ ایک توحید۔ چنانچہ آپ نے سنا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ کی گلیوں میں دعوت کے لئے نکلا کرتے تھے تو صحیح روایت میں آتا ہے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے: یَا اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا۔ " لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تم کامیاب ہو جاؤ گے"۔ دوسرا انذارِ آخرت۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ــ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ آپؐ نے کوہِ صفا پر جو پہلا عوامی خطاب فرمایا ہے، اس میں انذارِ آخرت پر ہی زور تھا۔ پس معلوم ہوا کہ توحید اور انذارِ آخرت اصل میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کے دو اہم نکات ہیں ــ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی گفتگو میں، مَیں نے یہ وضاحت کی تھی کہ انذارِ آخرت کا زیادہ تر تعلق انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر سے ہے۔ اس کو میں آج ان شاء اللہ تفصیل سے بیان کروں گا ــ البتہ اجتماعی نظام کا جو معاملہ ہے وہ درحقیقت متعلق ہے نکتۂ توحید کی تین توضیحات، بدیہیات، مضمرات (COROLLARIES) سے۔ اور وہ ہیں:

نمبر ایک: اللہ ہی ہے سب کا پیدا کرنے والا۔ لہٰذا اس عالمِ آب و گل میں انسان کے لئے کامل سماجی مساوات ہے۔ پیدائشی طور پر کوئی اعلیٰ نہیں۔ کوئی ادنیٰ نہیں۔ برہمن اور شودر اور کالے اور گورے کی کوئی تقسیم اسلام میں نہیں ہے۔ سب کا پیدا کرنے والا ایک اللہ اور سب کے سب پہلے انسانی جوڑے حضرتِ آدمؑ اور حضرتِ حوّا کی نسل سے ہیں۔ لہٰذا پیدائشی طور پر دنیا کے تمام انسان مساوی ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عقیدۂ توحید کا لازمی اور لابدی نتیجہ ہے "وحدتِ الٰہ و رب اور وحدتِ آدم و حوّا کا انقلابی تصور و نظریہ"[1] جس کی رو سے تمام انسان ایک عالمی برادری میں شامل ہو جاتے ہیں۔ نسل، رنگ، لسان اور وطن کی بنیاد پر انسانوں کے اعلیٰ و ادنیٰ ہونے کی تقسیم یکسر ختم ہو جاتی ہے اور سماجی سطح پر کامل مساوات قائم ہو جاتی ہے۔

نمبر دو: حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کے لئے ہے۔ انسانی حاکمیتِ مطلقہ کی نفی۔ ع "تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے" بس کی گانٹھ یہی انسانی حاکمیتِ مطلقہ کا تصور ہے۔ حاکمِ مطلق صرف اللہ ہے۔ کوئی انسان حاکمِ مطلق نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی فرد، نہ کوئی خاندان، نہ کوئی قوم اور نہ پوری نوعِ انسانی۔

---

[1] اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے ایک مختصر لیکن انتہائی جامع مضمون "قرآن اور امنِ عالم" کا مطالعہ مفید ہوگا جو کتابچے کی شکل میں دستیاب ہے (مرتب)

قرآنِ حکیم انسان کی حاکمیت کے بجائے خلافتِ عمومی کا نظریہ پیش کرتا ہے ۔
نمبر تین : ہر شے کا مالکِ حقیقی صرف اللہ ہے ۔ انسان امین ہے ۔ اللہ کی مرضی کے مطابق تصرف کرے گا تو صحیح ہے ۔ ورنہ غلط ہے ، اس کا ہاتھ پکڑ لیا جائے گا ۔
اجتماعیتِ انسانی سے متعلق یہ تین انقلابی نظریات ہیں ۔ ایک کا تعلق ہے سماج کے ساتھ ۔ معاشرتی نظام کے ساتھ ۔ دوسرے کا تعلق ہے معاشی و اقتصادی نظام کے ساتھ اور تیسرے کا تعلق ہے سیاسی نظام کے ساتھ ۔ یہ سب ایمان بالتوحید کے شجرۂ طیبہ کے برگ و بار ہیں ۔ اس کے COROLLARIES ہیں ۔ یہ سب کیا ہیں ! "فقط اِک نقطۂ ایماں کی تفسیریں" ۔ نقطۂ توحید کے یہ تین لازمی نتائج ہیں ـــــ لہٰذا اسلامی انقلاب کے لئے ان تین نکات پر زور دینا اور ان کو ـــــ EMPHASISE کرنا ضروری ہوگا ۔ اگر ان کو نمایاں نہیں کیا جائے گا اور نماز و روزہ اور دیگر اعمالِ صالحہ ہی کی تبلیغ و تلقین ہوتی رہے گی تو مذہبی اصلاح کا کام تو بڑی حد تک ہو جائے گا ۔ انفرادی سیرتیں بھی کچھ بدل جائیں گی لیکن انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہوگا ۔
پچھلی تقریر میں دوسرے مرحلہ یعنی تنظیم کے بارے میں ، مَیں عرض کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہمیں جو تنظیم نظر آتی ہے ۔ اس کی اصل اساس یہ تھی کہ حضورؐ نے دعویٰ کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں ۔ جس نے اس کی تصدیق کی اور جو ایمان لے آیا اب وہ ہمہ تن ، ہمہ وجود اور ہمہ وقت مطیع ہو گیا ۔ اب وہ چون و چرا نہیں کر سکتا ۔ دنیا کے کسی اور قائد ، کسی اور رہنما اور کسی اور لیڈر کی بات سے اختلاف ممکن ہے ۔ لیکن رسولؐ کی کسی بات سے بھی اختلاف ممکن نہیں ہے ۔ اس لئے کہ یہاں تو یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ آپؐ کے پاس علم کا وہ ذریعہ ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے ۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا ۔ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ۝ " ابا جان ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تھا پس میری پیروی کیجئے ۔ میں آپ کو بتاؤں گا سیدھا راستہ کونسا ہے " ـــــ بظاہر یہ الٹی گنگا بہہ رہی ہے کہ بیٹا باپ سے یہ کہے ۔ دلیل کیا ہے ! دلیل یہ ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ کو وحیٔ الٰہی کے ذریعہ سے علمِ حقائق حاصل ہو رہا ہے جو باپ کو حاصل نہیں ہے ۔ باقی رہا تجرباتی علم وہ والد کو زیادہ ہو تو ہو ـــــ رسول اور امتی کے تعلق کی تفہیم کے لئے اس مجلسِ مشاورت کی روداد بڑی تابناک مثال ہے جو حضورؐ نے غزوۂ بدر سے پہلے مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی منعقد فرمائی تھی ۔ اس موقع پر حضرت سعد ابن عبادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رئیس خزرج نے اس تعلق کے

لُبّ لباب کو چند جملوں میں بیان کر دیا تھا۔ انہوں نے عرض کیا تھا : إنا أصابك وصدقناك ۔ " حضورؐ آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں! آپؐ بھول جائیے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں کیا طے ہوا تھا اور کیا نہیں ہوا تھا ۔ ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ۔ ہم آپ کی تصدیق کر چکے ہیں ۔ ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے۔ اب ہمارے پاس کون سا اختیار باقی رہ گیا ۔ اللہ کی قسم، آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے ۔ اگر آپؐ حکم دیں گے تو ہم برق غماد تک جا پہنچیں گے چاہے ہماری اونٹنیاں دبلی اور لاغر ہو جائیں یا ختم ہو جائیں " ــــ اس تنظیم کے متعلق یوں سمجھئے کہ دنیا میں اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور کر ہی نہیں سکتے ۔ اس لئے کہ معاملہ ہے رسول اور امتی کا۔ لیکن چونکہ یہ کام آگے بھی ہونا تھا۔ اب تا قیام قیامت کسی نبی اور رسول کو آنا نہیں تھا ۔ سوائے جھوٹے مدعیوں کے ۔ ثلاثون کذابون اور دجال کا معاملہ علاحدہ رکھیئے ۔ سچا نبی تو حضورؐ کے بعد کوئی آنا نہیں ۔ حضورؐ کا ارشاد ہے : لا نبی بعدی ــــ تو آئندہ یہ تنظیم کس بنیاد پر ہوگی ! اس کے لئے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے امّت کی رہنمائی کے لئے بیعت کی سنّت چھوڑ دی ۔ یعنی حضورؐ کے بعد اعلاء کلمۃ اللہ، اقامتِ دین اور اظہارِ دین الحق علی الدین کلّہ کے لئے جو تنظیم بنے وہ بیعتِ سمع وطاعت کے اصول پر بنے ۔

غور فرمائیے کہ حضورؐ کو مختلف مواقع پر مختلف انواع کی بیعتیں لینے کی چنداں ضرورت نہیں تھی جب رسول اور امتی کا مضبوط تعلق و رشتہ موجود ہے تو بیعت کی اضافی ضرورت کیا تھی! ــــ لیکن حضورؐ نے یہ مختلف بیعتیں کیوں لیں !! میرے نزدیک یہ اس لئے لی گئیں تاکہ کسی خالص دینی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل کے لئے ہمارے سامنے حضورؐ کی سنّت موجود رہے ــــ میں آغاز میں حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی حدیث آپ کو سنا چکا ہوں کہ حضورؐ بیعت بھی کیسی لیتے تھے ! اس کے الفاظ کس قدر جامع ہیں اور کس طرح **Army Discipline** والی بات کا مکمل احاطہ کر لیتے ہیں ۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس ایک حدیث میں ایک اسلامی تنظیم وجماعت کا پورا دستور موجود ہے ــــ پھر حدیث بھی کس پائے کی ہے ! متفق علیہ ــــ اسے امام بخاری اور امام مسلم رحمھما اللہ نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے ۔ سند کے اعتبار سے کسی حدیث کے صحیح ہونے کا اس سے بلند کوئی اور مقام نہیں ہے کہ اس پر یہ دو جلیل القدر ائمہ حدیث متفق ہو جائیں ــــ میں عرض کروں گا کہ اس مہتم بالشان حدیث اور اس کی ترجمانی نہایت غور اور پوری توجہ کے ساتھ سماعت فرمائیے ۔ حدیث ہے :

عن عبادة بن الصامت قال بايعنا رسول الله صلی الله علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرۃ علینا وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم:

"حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ" ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ جو حکم آپؐ ہمیں دیں گے ہم مانیں گے۔ چاہے آسانی ہو، چاہے تنگی ہو۔ چاہے وہ ہمارے نفس کو اچھا لگے چاہے ہمیں اس کے لئے اپنے نفس کو مجبور کرنا پڑے۔ چاہے آپؐ دوسروں کو ہم پر ترجیح دیدیں اور جس کو بھی آپؐ امیر مقرر فرمادیں گے، ہم اس کا حکم مانیں گے اور اس سے جھگڑیں گے نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو ہماری صحیح رائے ہوگی اور صحیح مشورہ ہوگا اور جس بات کو ہم حق سمجھیں گے اس کو ضرور بیان کریں گے ہم جہاں کہیں بھی ہوں۔ اور اللہ کے معاملے میں حق بات کہنے سے ہم کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈریں گے۔"

میں پھر اپنے اس گہرے تاثر اور احساس کا اعادہ کر رہا ہوں۔ یقیناً آپ حضرات بھی سے اتفاق کریں گے کہ اس ایک حدیث کے اندر اس جماعت کے نظم اور دستور کا مکمل نقشہ ود ہے جو اسلامی انقلاب کے لئے وجود میں آنی چاہیئے ــــــ بہرحال یہ باتیں تو کسی درجہ پچھلے جمعہ کو میں عرض کر چکا ہوں۔ اس وقت صرف ان کا اعادہ مقصود تھا۔ اب آئیے آج تگو کے موضوع کی طرف اور وہ ہے تربیت۔

سب سے پہلے تو اس تربیت کی اہمیت کو سمجھئے۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ اس پر مجھے زیادہ نا لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بار بار چند اشعار سنائے ہیں۔ یہ اشعار میں ں اس لئے سنایا کرتا ہوں کہ بعض حقائق کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے میں ہم بہت سا نا لے لیں۔ تب بھی شاید وہ مسئلہ اتنا نکھر کر ذہن کی گرفت میں نہ آئے جتنا بعض اشعار کے حوالہ وہ واضح ہو جاتا ہے۔ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا: ان من الشعر لحکمۃً وان البیان لسحرًا۔ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں بڑی پختہ اور پرحکمت باتیں بڑی جامعیت ساتھ سمودی گئی ہوتی ہیں اور بہت سی تقاریر ایسی ہوتی ہیں، جن میں جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ ۔ تو میں نے آپ کو اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بارہا سنایا ہے کہ ـــ

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پہ بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

کچے پکے لوگوں کو جمع کر کے اگر کوئی کام شروع کیا جائے۔ خاص طور پر انقلاب کا کام جہاں تصادم کا شدید ترین مرحلہ آتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی ناکامی کا سبب پہلے ہی سے خود فراہم کر لیا ہے۔ اس لئے کہ کچے پکے لوگوں کے ہاتھوں کامیابی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اس کام کے لئے بہت پختہ لوگ اور بہت مضبوط لوگ درکار ہیں۔ اسی کو علامہ اقبال نے یوں کہا ہے کہ

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

پختہ ہونا لازم ہے۔ خام لوگوں سے کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ میں اس بات کو بغرضِ تفہیم یوں بیان کیا کرتا ہوں کہ آپ اگر ریت کے بڑے بڑے گولے بنا لیں اور پھر انہیں کسی دروازے یا کھڑکی کے شیشے پر پوری قوت سے دے ماریں تو شیشے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس پر تو بال بھی نہیں پڑے گا۔ ہاں آپ کے پھینکے ہوئے ریت کے گولے بکھر جائیں گے۔ لیکن اسی ریت کو آپ بھٹی میں پکا کر پختہ اینٹ بنا لیں۔ پھر اس اینٹ کو شیشے پر دے ماریں تو نتیجہ برآمد ہوگا۔ شیشہ کھیل کھیل ہو جائے گا۔ علامہ نے بڑے ہی پیارے اور بڑے ہی مؤثر انداز میں فارسی میں اسے خوب ادا کیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس میں ۲ + ۲ کے مراحل کو ایک ایک مصرع میں سمو دیا ہے۔

با نشۂ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

پہلا مرحلہ ہے تیاری کا۔ اس کے لئے درویشی چاہئے۔ فقر چاہئے۔ خاک میں ملنا پڑے گا آگ میں جلنا ہوگا۔ آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزرنا پڑے گا۔ نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنا ہوگا ان سب سے گزر کر پھر جب پختہ ہو جاؤ تو بقول 'چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن' — تو پھر اپنے آپ کو سلطنتِ جم پر دے مارو۔ یعنی اسلام یہ بھی نہیں چاہتا کہ بس اپنی ذاتی اصلاح ہی کو مقصود و مطلوب بنا لو۔ اپنے خانقاہی نظام ہی میں لگے رہو۔ نسلاً بعد نسلٍ وہی نظام چلتا رہے اور ایک مسلمان کا خانقاہی مزاج ہی پختہ تر ہوتا چلا جائے اور میدان میں آنے کا مرحلہ ہی نہ آئے بلکہ وہ نظروں سے بالکل اوجھل ہو جائے۔ تیاری ضرور کرو، بغیر تیاری کے

یدان میں آگئے تب بھی مار کھا جاؤ گے۔ لیکن یہ کہ تیاری ہی ہوتی رہے۔ باطل کے خلاف نبرد آزما
دنے کا خیال دل میں بھی نہ آئے تو وہ تیاری بے کار ہو جائے گی[1] جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا
واقعہ یہ ہے کہ علامہ نے ۳+۳ = چھ مراحل کو اس ایک شعر میں بڑی جامعیت کے ساتھ سمو دیا
ہے۔ پہلے مصرع میں تمہیدی مراحل خاص طور پر تربیت و تیاری کا ذکر آگیا اور دوسرے مصرع
ں تکمیلی مراحل میں سے آخری مرحلے مسلح تصادم کا بیان آگیا: چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت
م زن۔

پس ان اشعار کے حوالہ سے تربیت و تیاری کی اہمیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔
راس کا ہدف بھی معیّن ہو جاتا ہے۔

اس تربیت کے ضمن میں وہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے جو میں نے پچھلی مرتبہ
ض کی تھی اور آج بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ظاہر بات ہے کہ اگر اشتراکی انقلاب لانا
ش نظر ہے تو اس فلسفے میں روحانی و اخلاقی اقدار سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا اس کے
ئے کارکنوں کی مادّی تربیت کافی ہے۔ لیکن اگر اسلامی انقلاب لانا مقصود ہو تو اسلام کی جڑ
ر بنیاد ہی روحانیت ہے۔ اخلاقیات کو اس میں اساسی اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا جب تک
رکنوں کی تربیت میں یہ چیزیں نہ آئیں۔ جب تک وہ ان دونوں اقدار کا پیکر نہ بن جائیں تو پیش نظر
قلاب میں کہاں سے وہ اقدار آجائیں گی! اور کہاں سے وہ ابعاد (DIMENSIONS)
جائیں گے جو اس نظام کے لازمی اجزاء میں سے ہیں جو آپ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا بنیادی
ور پر فرق واقع ہو جائے گا۔ ایک تربیت وہ ہے جو کسی دنیوی اور مادّی انقلاب کے لئے کافی
ہے اور ایک تربیت وہ ہے جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان
فرق ہے۔

---

[1] اس موضوع پر ارمغانِ حجاز میں علامہ اقبال کے یہ اشعار بھی نہایت موزوں ہیں ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی — یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری
شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

(مرتب)

اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ جو حزب اللہ وجود میں آئے گی اس کے متعلق پہلے یہ سمجھنا ضروری ہوگا کہ اس حزب اللہ کے سامنے ہدف کیا ہے ! اگر ہدف اسلامی انقلاب ہے تو لازماً پھر یہ غور کرنا ہوگا کہ اس کے لئے کس قسم کے کارکن درکار ہیں! وہ نقشہ کیا ہے جس کے مطابق کارکنوں کو جدوجہد کرنی ہے! آپ کو معلوم ہے کہ کسی مہم کے لئے ایک ہدف (TARGET) معیّن کیا جاتا ہے۔ پھر اسی کی مناسبت سے اسباب و وسائل مہیّا کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی طے کرنا ہوتا ہے کہ اس مہم کے لئے کس نوع کے اوصاف اور صلاحیتیں رکھنے والے کارکن اور کس قسم کی سیرت و کردار کے لوگ درکار ہیں۔ اس بات کو سمجھانے کے لئے میں چند مزید باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ آیا ہے: كُونُوا رَبَّانِيِّينَ ۔ "اللہ والے بنو"۔ جب تک اللہ والے وجود میں نہیں آئیں گے، اسلامی انقلاب کا کوئی سوال نہیں محض عسکری تربیت ہو، محض ڈسپلن کی عادت ہو اور محض چلت پھرت ہو، محض حرکت ہو۔ تو ان چیزوں سے انقلاب نہیں آتا۔ خواہ ان چیزوں کی وجہ سے کسی خاص وقت میں کوئی سماں بندھ جائے اور لوگ مرعوب ہو جائیں ــــ لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ اس کام کے لئے اللہ والے درکار ہیں جس کے لئے ایک اور آیت میں لفظ آیا ہے رِبِّيُّونَ ــــ فرمایا گیا: وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۔ " اور کتنے ہی انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر رِبِّيُّونَ، یعنی اللہ والوں نے جنگ کی ہے، قتال کیا ہے تو وہ ان مصیبتوں کی وجہ سے جو انہیں اللہ کی راہ میں پہنچیں نہ پست ہمت ہوئے، نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ انہوں نے دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے"۔ اس آیت میں جو لفظ 'وھن' آیا ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ اس کے معنی ضعف کے ہیں۔ اب یہی لفظ ضعف اس آیت میں آگیا ہے ساتھ ہی استکانہ کا بھی لفظ آیا ہے جس کے معنی بھی کمزوری کے ہیں۔ اگرچہ ان تینوں الفاظ میں کمزوری کا مفہوم مشترک ہے لیکن ان تینوں میں ایک باریک اور نازک سا فرق بھی ہے۔ موت سے خوف اور زندگی سے محبت دل میں جو کمزوری پیدا کرتی ہے وہ 'وھن' ہے۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ ایک حدیث[1] میں بھی آیا

---

[1] مشکوٰۃ۔ باب تغیر الناس ص ۴۵۹

جسمانی کمزوری اور قوتِ ارادی کی کمزوری سے عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا ہے وہ 'ضعف' ہے۔ اس کی وجہ حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کی کمزوری اور بزدلی 'استکانت' ہے ــ چنانچہ اس آیت سے یہ بات واضح ہوئی کہ انبیاء علیہم السلام کے حواریین جہاں شجاع، بہادر اور جنگجو تھے اور کسی قسم کی کمزوری اور بزدلی ان کے پاس بھٹکی بھی نہیں تھی، وہاں وہ رِبِّیُّوْن یعنی اللہ والے بھی تھے۔ بلکہ اگر آیت کے اسلوب کے پیشِ نظر یہ مفہوم لیا جائے کہ ان میں شجاعت، پامردی، جان نثاری کے اوصاف پیدا ہی اس باعث ہوئے تھے کہ وہ رِبِّیُّوْن تھے 'اللہ والے بن چکے تھے' اللہ کی راہ میں جان دینا ان کو زندگی سے عزیز تر ہو گیا تھا۔ تو یہ بھی صحیح ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کا اوّلاً اللہ والا ہونا لازمی ہوگا اور یہی للّٰہیت ان میں وہ بہادری، دلیری اور حوصلہ مندی پیدا کرے گی کہ وہ اپنے سے دوگنی نہیں، دس گنی بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد کی کفار کی فوج سے بھی بے پروانہ وار ٹکرائیں گے۔ ان کو اللہ کی راہ میں گردن کٹانے کی آرزو اور تمنا سے عزیز تر کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اگر صرف عسکری قوت ہی ہے۔ صرف مادی تربیت ہی ہے۔ صرف تنظیم ہے لیکن اللہ سے تعلق مضبوط نہیں ہے، کمزور ہے تو وہ کام نہیں ہوگا جسے اسلامی انقلاب، اعلائے کلمۃ اللہ، اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ الحق علی الدین کلّہٖ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی انقلاب کے لئے جہاں تنظیم ضروری ہے اور اس میں انتہائی مضبوط ڈسپلن ضروری ہے۔ وہاں اس تنظیم کے کارکنوں میں ربّانیّون ــ اللہ والے ہونے کے اوصاف لابدمنہ ہیں۔ ان کے بغیر محض تنظیم اور محض ڈسپلن اسلامی انقلابی عمل کے لئے ہرگز کفایت نہیں کریں گے۔

اس کیلئے میں ایک اور مثال دیا کرتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ نہایت ذہانت کا ثبوت دیا تھا ایرانی جاسوسوں نے ــ حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب انقلابِ اسلامی کے بین الاقوامی مرحلہ کی تکمیل کے لئے جنگیں ہو رہی تھیں تو دو بڑے بڑے محاذ کھل گئے تھے۔ ایک شام کا محاذ اور دوسرا ایران کا محاذ ــ اور ایران کی افواج کا سپہ سالار تھا رستم اس نے چند ایرانی جاسوس بھیجے کہ مسلمانوں کی فوجوں کے حالات معلوم کریں اور رپورٹ دیں تاکہ اندازہ ہو کہ ان کے عزم و ہمت اور حوصلہ و ولولہ (MORALE) کا عالم کیا ہے! ان کا رنگ ڈھنگ کیا ہے؟ ان کے شب و روز کیسے ہیں۔ بے سروسامان اور لوٹ مار کی خوگر اس عرب قوم کی کایا پلٹ اور قلبِ ماہیت کے اسباب کیا ہیں! سامانِ جنگ ان کے پاس کس درجہ کا ہے! رسد رسانی کے انتظامات کیا ہیں؟ [illegible]

کی روشنی میں اپنے لئے جنگ کی حکمتِ عملی مرتب کر سکے۔ ان تحقیقات سے یقیناً مدد ملتی ہے اور اگر کسی سمت میں کمزوری یا ضعف نظر آجائے تو اس سے حریف بھرپور فائدہ اٹھانے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ ان جاسوسوں نے مسلمانوں کے لشکر میں گھوم پھر کر حالات معلوم کئے۔ اس کے لئے کیا بھیس بدلا ہوگا اور کیا کیا پاپڑ بیلے ہوں گے! مجھے اس سے بحث نہیں۔ مجھے تو اصل میں ان کی رپورٹ آپ کو بتانی ہے۔ انہوں نے واپس جاکر رستم کو جامع ترین الفاظ میں جو رپورٹ دی ہے وہ یہ تھی کہ "یہ عجیب لوگ ہیں: **هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ**۔ یہ رات کے راہب اور دن کے شہسوار نظر آتے ہیں"۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ حالانکہ دنیا میں راہب بھی تھے اور فوجیں بھی اور جو فوجی تھے وہ دن کو بھی فوجی، رات کو بھی فوجی۔ جبکہ ایرانی جاسوسوں کی رپورٹ مسلمان فوجوں کے متعلق یہ تھی کہ: ھم رھبان باللیل وفرسان بالنھار یہ رات کے راہب ہیں۔ ان کی راتیں اپنے اللہ کے حضور میں قیام و سجود، الحاح وگریہ اور دعاء ومناجات میں بسر ہوتی ہیں۔ ان کی ڈاڑھیاں اور ان کی سجدہ گاہیں خشیتِ الٰہی کے آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ اور یہی لوگ دن کو شہسوار اور جنگجو نظر آتے ہیں اور میدانِ جنگ میں برق کی مانند کوندتے لپکتے جھپٹتے ہیں۔ اور اس راہ میں گردن کٹا دینے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔ جبکہ دنیا آج تک فوجیوں کے جن طور طریقوں سے واقف چلی آرہی ہے وہ تو یہ ہیں کہ ان کی راتیں شراب و کباب اور شباب سے کھیلنے میں بسر ہوتی ہیں۔ جس بستی یا اس کے گرد و نواح میں کسی فوج کا پڑاؤ ہو جائے تو کیا وہاں کسی جوان خاتون کی عصمت وعفت محفوظ رہ سکتی ہے! لیکن مسلمان وہ انوکھے، نرالے اور اعجوبۂ روزگار سپاہی تھے کہ ان کی شخصیت کے یہ دو رُخ ھم رھبان باللیل وفرسان بالنھار۔ اتنے ظاہر و نمایاں تھے کہ غیر مسلم ایرانی جاسوسوں کو بھی نظر آگئے۔ تو یہ جو دو متضاد کیفیات کو جمع کر دیا ہے یہ ہے درحقیقت کمال تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا۔

یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ اس زمانے میں یہ دونوں اقسام دنیا میں موجود تھیں۔ شام و فلسطین کے علاقوں میں راہب اور راہب خانے بڑی کثرت سے موجود تھے۔ ایران اور روما اس وقت کی دو عظیم ترین سلطنتیں تھیں اور ان کے درمیان وقفہ وقفہ سے سالہا سال تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ چنانچہ ایرانی تو راہبوں اور ان کے روز و شب کے معمولات سے واقف تھے۔ آپ حضرات نے بھی بحیرہ راہب کا نام سن رکھا ہوگا جس نے حضورؐ کو بچپن میں پہچانا تھا۔ جب آپؐ ابوطالب کے ساتھ ایک تجارتی قافلہ میں شامل ہو کر شام تشریف

ے گئے تھے۔ کہ آپؐ نبی آخرالزماں ہیں ۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ اس راہب کا کتنا علم اور
ناقہم ہوگا ! اسی طریقہ سے حضرت سلمان فارسیؓ کی داستان میں کئی راہبوں کا ذکر آتا ہے۔ اور
ے آخری راہب ہی نے جبکہ وہ بسترِ مرگ پر تھا حضرت سلمانؓ کے یہ پوچھنے پر کہ آپ کے بعد میں کس
، پاس جاؤں! تلاشِ حقیقت کی میری جو پیاس ہے وہ ابھی بجھی نہیں ہے اور آپ کے انتقال کا
ت آگیا ہے تو اسی نے بتایا تھا کہ کھجوروں کی سرزمین میں آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے ۔
وقت آچکا ہے۔ لہٰذا کوشش کرو شاید کہ تم ان کے قدموں تک پہونچ جاؤ۔ حضرت سلمانؓ نے اسی
ہب کی نصیحت پر جنوب کی طرف سفر اختیار کیا تھا ۔ راہ میں ڈاکہ پڑا ۔ ڈاکوؤں نے غلام بنا کر بیچ
اور یثرب (مدینہ منوّرہ) کے ایک یہودی نے ان کو خرید لیا۔ چنانچہ وہ مدینہ پہنچ گئے۔ حضوؐر
ی وہاں تشریف بھی نہیں لائے تھے۔ لیکن اب تو یہ غلامی کے بندھن میں بندھ گئے ہیں مگر نہیں
سکتے ۔ خبریں سن رہے ہیں کہ راہب نے جو بات کہی تھی شاید اس کا ظہور مکہ میں ہوگیا ہے ایک
لیف و کریم النفس اور امین و صادق القول انسان نے نبوّت کا دعوٰی کیا ہے ــــــ تو میں عرض کر رہا
کہ راہب تھے اور یقیناً ان میں چند بڑے خدا رسیدہ راہب تھے ۔ لیکن وہ راہب، دن کے بھی راہب
، اور رات کے بھی راہب ۔ ان کے ہاتھ میں تلوار کبھی نظر نہیں آسکتی۔ وہ کسی میدانِ جنگ میں
تے ہوتے نظر نہیں آسکتے ــــ پھر فوجیں جس قسم کی ہوا کرتی تھیں اور ہوا کرتی ہیں ۔ ان کے کردار
متعلق میں عرض کر چکا ہوں ۔ مزید برآں اس دور میں رومن امپائر اور سلطنتِ کسرٰی کی لاکھوں
تعداد میں وقت کے اعلیٰ ترین اسلحہ سے لیس اور بہترین تربیت یافتہ عسکری قوّت موجود تھی ۔
ہ عرب اس وقت ان دونوں چیزوں سے نابلد تھے ــــ پھر تعداد کے تناسب کا یہ عالم تھا کہ
رِ نبوّت میں جنگِ موتہ کے موقع پر مسلمانوں کے تین ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں رومیوں کی
ے لاکھ کی فوج آگئی تھی[1] تو ان دونوں مملکتوں کے پاس لاکھوں کی تعداد میں فوجیں ہر وقت
جود رہتی تھیں ۔ لیکن مسلمان مجاہدین کا عالم یہ تھا کہ ٹھہر رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا ۔
جناب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تربیت کا یہ کمال ہے کہ ان دو متضاد چیزوں کو ایسے

---

[1] دورِ فاروقی میں جنگِ یرموک کے موقع پر خود رومی مؤرخین کی مستند کتب کی رو سے اسلامی لشکر کی کل تعداد پینتیس ہزار تھی جبکہ رومی سپاہ کی تعداد چار اور پانچ لاکھ کے مابین تھی ۔
(مرتّب)

جمع کیا ہے کہ مسلمان رات کے راہب ہیں اور دن کے مجاہد اور مردِ میدان ہیں ۔ جب تک یہ دونوں اوصاف جمع نہیں ہوں گے وہ اسلامی انقلاب کبھی نہیں آئے گا جو اصل مقصود ہے۔ اور جو برپا فرمادیا تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ـــــ اور یہ اصل میں نتیجہ تھا حضورؐ کی تربیت کا کہ اہلِ ایمان رھبان باللیل وفرسان بالنھار کا ایک ایسا مرقع بن گئے تھے جو دشمنوں کو بھی چشمِ سر سے نظر آتا تھا۔

اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس تربیت و تزکیہ کے لئے بنو امیّہ کے دور ہی میں راہبانہ اور خانقاہی نظام بنا تھا۔ جو بہت مؤثر رہا ہے اور اس نے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں لیکن وہ نظام انقلابی کارکن پیدا نہیں کرسکتا۔ وہ نظام اس وقت بنا جب اسلامی حکومت قائم تھی ۔ اگرچہ اس میں ایک خرابی پیدا ہو گئی تھی اور وہ تھی اوپر کی سطح پر تشکیل حکومت کی سطح پر جو حقیقی شورائی نظام تھا کہ جو بھی خلیفہ بنایا جائے وہ کسی خاندانیت اور قبائلیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مشورے سے بنایا جائے تو یہ چیز ختم ہو گئی تھی لیکن پوری اسلامی مملکت میں اسلامی قانون رائج تھا۔ فقہاء تھے، مفتی حضرات تھے، قاضی تھے، عدالتیں تھیں اور اسلام کا پورا دیوانی اور فوجداری قانون رائج تھا ۔ حدود اللہ جاری تھیں، تعزیرات کا اجراء ہو رہا تھا ۔ لہٰذا اس دور میں کسی انقلابی جد و جہد کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔جب انقلابی جد و جہد کی ضرورت نہیں تو انقلابی تربیت کی بھی کوئی ضرورت نہیں ۔یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کا نظام تربیت خالص خانقاہی طرز اور مزاج کا بن گیا تھا۔ جس میں تربیت دی جارہی ہے، قلوب کا تزکیہ کیا جارہا ہے۔ اذکار و اشغال مسنونہ کی تلقین کی جارہی ہے ۔ لوگوں کی نفسیات کے پیشِ نظر ان کو مختلف نفلی، مستحب اور مباح دینی وظائف کی تعلیم دی جارہی ہے ـــــ پیشِ نظر انفرادی اصلاح۔ چونکہ مقبوضاتِ اسلامیہ میں اسلام کا اجتماعی قانون نافذ ہے چنانچہ انقلاب کے لئے کارکنوں کی تربیت کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔کارکنوں کو اس اعتبار سے میدان میں لانے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا انقلابی تربیت اور انقلابی تصوّرات والا حصّہ اس خانقاہی تربیت میں نہیں تھا۔

حاشا وکلّا میں اس بات کو کسی توہین، تنقیص، اور تنقید کے طور پر نہیں کہہ رہا ۔ میری بات کو سمجھئے ۔ میں اسے ایک واقعہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں کہ انقلاب کی تو ضرورت ہی نہیں تھی اسلامی قانون نافذ ہے۔ معاشرہ کے اندر اسلامی شعائر نافذ کئے جارہے ہیں ۔جمعوں کا، خطبوں کا، مساجد کا، دینی مدارس کا نظام موجود ہے ۔ فقہ اسلامی جاری و ساری ہے ۔ شرعی عدالتیں قائم

مقدمات کا فیصلہ شریعتِ اسلامی کے مطابق ہو رہا ہے۔ معاشرتی مساوات کا عالم یہ ہے کہ اسلام کی تابناک ماضی کی تاریخ میں قرآن و حدیث، کتاب و سنّت، فقہ و قانون کی درس و تدریس، تعلیم و تعلّم اور ترتیب و تدوین کی مسندوں پر اکثریت ان بزرگانِ دین کی متمکن نظر آتی ہے جو آزاد کردہ غلام تھے یا غلام زادے تھے۔ جو کفش ساز یا کفش دوز تھے جو روغن یا پارچہ فروش تھے ۔۔۔ قاضی حضرات بڑے بڑے باجبروت خلفاء بلکہ صحیح تر الفاظ میں ملوک و سلاطین کو مدعی علیہ یا شاہد کے طور پر عدالت میں حاضر ہونے کے پروانے جاری کر دیتے تھے۔ حکومت کی سطح پر زکوٰۃ، عشر اور خراج کی تحصیل و تقسیم کا انتظام تھا۔ معاشی ناہمواری اور فرق و تفاوت بہت کم تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کا اٹل اصول نہ صرف تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ اس دائرے کے اندر اندر قانون سازی ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے ہیئتِ اجتماعیہ کی صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔ تو ان حالات میں انقلابی طرز و نوعیت کی جد و جہد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہاں جو تربیت درکار تھی وہ یہ تھی کہ اچھے مسلمان وجود میں آئیں۔ خدا ترس لوگ معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ موجود رہیں۔ ایسے لوگ چشم سر سے نظر آئیں جن کی نگاہ میں دنیا کی حیثیت پرِ کاہ سے بھی فروتر ہو۔ آخرت ہی جن کا مطلوب و مقصود ہو لوگوں میں امانت ہو، دیانت ہو، شرافت ہو، ہمدردی ہو، دمسازی ہو، دلوں میں خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ ہو۔ یہ چیزیں درکار تھیں۔ لہٰذا ان مقاصد کے حصول کے لئے خانقاہی نظام بنایا گیا اور صحیح بنایا گیا۔

میں اس کا ذکر اس لئے کیا کرتا ہوں کہ جب بھی تربیت کا تذکرہ آتا ہے تو پھر پھر کر ہمارا ذہن اس خانقاہی نظام کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ چونکہ صدیوں تک ہمارا نظامِ تربیت وہی خانقاہی نظام رہا ہے۔ جب کہ درحقیقت حالات کی تبدیلی کے باعث ہدف مختلف ہو گیا ہے۔ اب کہیں بھی کامل اسلامی نظام عملاً اور بالفعل قائم و نافذ نہیں ہے۔ اب اسے قائم کرنے کی عملی جد و جہد کرنی ہے۔ اب انقلابِ اسلامی کے لئے تربیت دینی ہے۔ انقلابی تربیت میں جب وہ دونوں عنصر یعنی رہبان باللیل و فرسان بالنہار جمع کریں گے تب ہی حقیقی تربیت کی ضرورت پوری ہو گی۔ اگر محض خانقاہی تربیت ہو گی تو اس کے نتیجہ میں ایک خاص قسم کا مزاج وجود میں آئے گا۔ وہ مزاج میدان میں آکر باطل کو للکارنے والا مزاج نہیں ہے۔ وہ مزاج تو یہ ہے کہ جو بھی خانقاہیں ہیں ان کی چار دیواری میں جو مرشدین و مزکّین بیٹھے ہیں۔ ان تک خود چل کر جو شخص پہونچے گا تو وہ بزرگ اپنے تربیتی نظام سے گزار دیں گے۔ جو طالبین تزکیہ آ جائیں۔ ان کو تزکیہ اور سلوک کی

یاں طے کرا دی جائیں گی۔ ان خانقاہوں کے تربیت یافتہ لوگوں یا ان سے متعلق حضرات کا جہاد دیوانی
ہیدان میں نکل کر باطل کو للکارنا، اس سے نبرد آزمائی اور نظامِ حق کو قائم کرنے کے لئے تن من دھن
ینا یہ عنصر درحقیقت اس خانقاہی طرز کی تربیت کے مزاج میں شامل نہیں ہے ــــ اس بات کو
مہ اقبال نے اپنے کلام میں دو قطعوں کی شکل میں خوب واضح کیا ہے۔ پہلا پایہ ان کا یہ قطعہ کہ ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — ملّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

انقاہی تربیت کا ہدف کچھ اور ہے۔ اس کا نتیجہ کچھ اور ہے اور انقلابی یا مجاہدانہ تربیت کا ہدف
اور ہوگا اور اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا۔ جہاں انقلاب کی ضرورت نہیں وہاں وہ خانقاہی تربیت
نی ہے لیکن جہاں پیشِ نظر انقلاب برپا کرنا ہے۔ جہاں مقصود ہو غلبۂ دین کی جد و جہد کرنا تو ظاہر
ت ہے وہاں وہ خانقاہی تربیت کافی نہیں ہوگی۔

اب اس گفتگو کا میں جو نتیجہ نکال رہا ہوں وہ کیا ہے! یہ کہ ہمیں بالکل OBJECTIVELY
ر معروضی انداز میں دیکھنا ہوگا کہ جنابِ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا طریقِ تربیت کیا تھا! علّامہ
بال نے اسی فرق کو واضح کیا ہے اس دوسرے قطعہ میں جس کا ابھی میں نے حوالہ دیا تھا اور جو میں
ئی بار آپ کو سنا چکا ہوں کہ ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اللہ اکبر کی تسبیح ایک مجاہد بھی کرتا ہے اور ایک وہ ہے جو کسی خانقاہ میں بیٹھا ایک صوفی
ر رہا ہے۔ لیکن ان دونوں تسبیحات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اب دیکھئے الفاظ وہ استعمال کئے ہیں جو تصوّف کے ہیں خود آگاہ اور خدا مست۔ وہ
گ جو اپنے آپ کو بھی پہچان چکے ہیں اور محبّتِ الٰہی میں مست ہو چکے ہیں[۱]۔ لیکن محبّتِ الٰہی میں
ست ہونے کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ آپ مجذوب ہو کر بیٹھ جائیں۔ آپ کی قوّتِ عمل معطل ہو جائے
ور ایک محبّتِ خداوندی وہ ہے کہ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر آپ میدان میں آئیں اور اللہ کے دین کے غلبہ

---

[۱] بعض حضرات کے نزدیک یہ صوفیائے کرام کا قول ہے اور بعض کے خیال میں حدیث ہے کہ: مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ (مرتب)

کے لیے اپنی گردن کٹوادیں۔ اب یہ دو نتیجے علاحدہ علاحدہ ہیں۔ لہٰذا ان کو علّامہ نے اپنے اس قطعہ میں نمایاں کیا ہے۔

اس قطعہ کے ذریعے واضح طور پر یہ فرق و تفاوت سامنے آجاتا ہے کہ ایک ہے مذہبی اور خانقاہی نظامِ تربیت اور دوسری ہے انقلابی و مجاہدانہ نظامِ تربیت۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور جو مجاہدانہ اور انقلابی تربیت ہے اس کا شاہکار ہے تربیتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلّم۔ چنانچہ حضورؐ نے جن اصحاب کو تربیت دے کر تیار فرمایا وہ سربکف ہو کر میدان میں آگئے: یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ۔ "وہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہے ہیں، قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں"۔ ان کے لئے گویا زندگی کی آخری تمنا یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں گردن کٹ جائے جان چلی جائے اور شہادت کی موت حاصل ہو جائے۔ ان کے دلوں میں اس سے بڑی آرزو اور کوئی نہیں ہے۔ میں اس ضمن میں قرآن حکیم کے چند حوالے دینا چاہتا ہوں ـــــ سورۂ فتح کے آخر میں فرمایا:

> هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝

یہ بات میں نے کئی مرتبہ عرض کی ہے کہ یہ آیت اور سورہ توبہ اور سورۂ صف کی آیات ۳۳ و ۹ ان آیاتِ مبارکہ میں سے ہیں جو اسلامی انقلاب کا عنوان بنتی ہیں[1]۔

> "وہی اللہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر تاکہ غالب کرے اسے پوری جنسِ دین پر۔ پورے نظامِ حیات پر اور اللہ کافی ہے بطور گواہ"۔

پورے نظام ہائے زندگی اور نظام ہائے اطاعت پر دینِ حق کا غلبہ ہی تو درحقیقت انقلابی عمل ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے اس فرضِ منصبی کی ادائیگی میں جو کچھ کر سکتے تھے وہ کر گزرے تو اس کے لئے بطور گواہ اللہ کافی ہے۔ کسی اور کی گواہی کی انؐ کو ضرورت نہیں ـــــ اگلی آیت میں فرمایا کہ یہ کام کون کریں گے یا یہ کام کس نے کیا! فرمایا:

> مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ

---

[1] اس موضوع کی مزید تفہیم کے لئے محترم ڈاکٹر صاحب کی تصنیف "نبی اکرمؐ کا مقصدِ بعثت" کا مطالعہ ان شاء اللہ نہایت مفید ہوگا۔ (مرتب)

یہ در حقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ لوگ جو انؐ کے ساتھ ہیں۔ یہ ان سب کی مشترکہ
جد وجہد اور سعی و محنت ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت کو کم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت
دے۔ اللہ تعالیٰ تو انہیں اپنی کتاب مبین میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معین قرار دے رہا ہے۔
ـــــ میں نے کئی مرتبہ یہ بات واضح کی ہے کہ اسلامی انقلاب اکیلے رسول کے ذریعے سے اگر ہو سکتا
ہوتا تو کیوں نہ حضرت نوح علیہ السلام انقلاب برپا کر دیتے! کیوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے دین
کو غالب نہ کر دیتے! لیکن ضرورت ہوتی ہے رسول کے ساتھ ایک ایسی جمعیت کی ' ایک ایسی جماعت کی
جس کی رسول کے ساتھ TOTAL COMMITMENT ہو ' پختہ عہد و پیمان ہو۔ جو اپنے
آپ کو رسول کے مقصد کے لئے ہمہ تن وقف کر لے۔ کامل تعاون و اعانت کا عملی مظاہرہ دکھا دے۔
جہاں رسول کا پسینہ بہے وہ اپنے خون کی ندیاں بہا دے۔ وہ رسول کے چشم و ابرو کے اشارے پر اپنی
گردنیں کٹوا دینے کو اپنے لئے دنیا کی عظیم ترین نعمت و سعادت سمجھے۔ جب تک ایسے لوگوں کی جماعت و
جمعیت موجود نہ ہو انقلاب نہیں آ سکتا۔ اللہ کا دین غالب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی بعثت کی امتیازی خصوصیت والی آیت مبارکہ: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ سے متصلاً بعد فرمایا: مُحَمَّدٌ
رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ ـــ یہ ہے ان دونوں آیات کا باہمی ربط و تعلق۔ یہ ہے نظم آیات۔ جس
میں معانی و مفاہیم اور حِکَم و بصائر کے کبھی ختم نہ ہونے والے خزانے موجود ہیں۔ یہ ہیں جواہرات۔ یہ ہیں
عجائبات جو قرآن و حدیث اور سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں معروضی طور پر تدبر اور غور
و فکر کرنے والے طالب علم کے نصیب میں آتے ہیں۔

سورۂ فتح کی آخری آیت میں جس کا ابتدائی حصہ: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ
میں نے بیان کیا۔ آگے چل کر اس میں پہلے ان لوگوں کی سیرت کے دو اوصاف اور دو ابعاد ـــــ
(DIMENSIONS) بیان ہوئے جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہیں۔ وہ کیا ہیں! پہلے
وصف کو آیت مبارکہ کے پہلے حصہ سے ملا کر سمجھئے۔ فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ
بَيْنَهُمْ ۔

" محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں' کفار کے لئے نہایت
سخت ہیں۔ آپس میں مسلمانوں کے حق میں نہایت نرم دل ' شفیق ' ہمدرد و دمساز ہیں"۔

اسی کو علامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ! رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کسی انقلابی جماعت میں پہلا وصف یہ درکار ہے ۔ وجہ کیا ہے ؟ غور فرمائیے ۔ ایک انقلابی شخص یہ سمجھتا ہے کہ رائج الوقت نظام باطل ہے، ظالم ہے، غلط ہے، استحصالی ہے ـــ اب جو اس نظام سے وفاداری کا رشتہ رکھتا ہے ۔ جو اس نظام کا قیم ہے ۔ جو اس نظام کی گاڑی میں جتا ہوا ہے ۔ وہ چاہے باپ ہو، چاہے بیٹا ہو، چاہے بھائی ہو، چاہے کوئی اور رشتہ دار ہو ۔ اب ان کے ساتھ اس انقلابی کارکن کا کوئی تعلق نہیں رہ سکتا ـــ نظامِ باطل کی فرماں برداری ! نظامِ باطل کی وفاداری ! اگر یہ چیزیں کسی کے اندر ہیں تو ایک انقلابی شخص کے تمام روابط، تمام تعلقات حتّٰی کہ رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی ـــ تمام محبتیں ختم اور منقطع ہو جائیں گی ۔ یہ کام تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام نے عملاً کر کے دکھایا ـــ میدانِ بدر میں عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، کفّار کے ساتھ ہیں اور باپ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورؐ کے جلو میں سرفروشی کے لئے موجود ہیں ۔ عبد المطلب کے ایک بیٹے عباس جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، کفّار کے ساتھ اِدھر ہیں اور ایک بیٹے حمزہ اسد اللہ و اسد رسولہٖ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب ہیں ۔ عتبہ ابنِ ربیعہ سپہ سالارِ لشکرِ کفّار اُدھر ہے اور بیٹے ابو حذیفہ ابن عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورؐ کے ساتھ ہیں ـــ ماموں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ادھر اسلامی لشکر کے ساتھ ہیں اور بھانجا ادھر کفّار کے ساتھ ہے ۔ اس طرح نہ معلوم کتنے قریبی رشتہ دار معرکۂ بدر میں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہیں ۔ تمام رشتے کٹ گئے ۔ اب یہاں قرابت داری کا کوئی سوال نہیں ۔ عبد الرحمٰن ابن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایمان لانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ سے ایک موقع پر کہا " اباجان ! غزوۂ بدر میں آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے ۔ لیکن میں نے آپ کی رعایت کی ؟ اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں " بیٹے تم نے یہ اس لئے کیا کہ تم اس وقت باطل کے لئے لڑ رہے تھے ۔ خدا کی قسم اگر کہیں تم میری تلوار کی زد میں آ گئے ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا اس لئے کہ میری جنگ حق کے لئے تھی " ـــ یہ ہے اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ۔ کفّار کے لئے انتہائی سخت اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے نہایت رحیم، شفیق ـــ جنگِ یرموک کا ایک بڑا دل گداز واقعہ تاریخ میں آتا ہے جو رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی بڑی نمایاں عکاسی کرتا ہے ـــ ایک زخمی کی آواز آتی ہے العطش العطش ۔ ایک مجاہد پانی لے کر اپنے زخمی بھائی کی طرف لپکتے ہیں کہ اچانک دوسری طرف سے ایک زخمی مجاہد کی آواز سنائی دیتی

ہے العطش العطش۔ وہ زخمی کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کی پیاس بجھاؤ۔ پانی لانے والے مجاہد اس کے پاس پہنچتے ہیں کہ تیسری طرف سے آواز آگئی العطش العطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پانی پہلے اس بھائی کے پاس لے جاؤ۔ وہ ادھر لپکتے ہیں۔ پانی وہاں نہیں پہنچا ہے کہ زخمی کی روح پرواز کر گئی۔ وہ پلٹ کر دوسرے زخمی تک پہونچتے ہیں تو دیکھتے ہیں وہ بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا ہے۔ پہلے زخمی کے پاس آتے ہیں تو وہ بھی اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر چکا۔ تینوں بغیر پانی پئے چلے گئے لیکن سورۂ حشر کی آیت ۹ کے درمیان میں مومنین صادقین کے لئے جو الفاظ مبارکہ آئے ہیں: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ "خواہ اپنے اوپر کتنی ہی تنگی ہو اہلِ ایمان اپنے دوسرے صحابیوں کو اپنے سے مقدم رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ شہداء کرام اس کی عملی تصویر بن گئے۔ پھر حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان جو مواخات قائم فرمائی، تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ بس ایک وصف ان کی شخصیت کا تو یہ ہے: أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ محبت کے، دوستیوں کے، قرابت داریوں کے پیمانے بالکل بدل گئے ہوں۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو انقلابی جماعت نہیں ہے۔ ادھر بھی محبتیں ہیں۔ اُدھر بھی تعلقات ہیں۔ دل یہ بھی چاہتا ہے کہ اسلام کا غلبہ ہو جائے لیکن جو لوگ باطل کی گاڑی کھینچ رہے ہیں، ان سے بھی گاڑھی چھن رہی ہے۔ ان سے دلی وابستگیاں بھی نبھائی جا رہی ہیں۔ تو ان طریقوں سے انقلاب نہیں آتا۔ تمام دلی محبتیں، تمام ہمدردیاں ان لوگوں کے لئے سمٹ آئیں جو راہِ حق میں ان کے ہم سفر اور ساتھی ہیں۔ یہ ہے ہمارے دین اور ایمان کا تقاضا اور یہ ہے اسلامی انقلاب کے کارکنوں میں مطلوب و مقصود پہلا وصف!

اس رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کا اللہ کی نگاہ میں کیا مرتبہ، کیا مقام اور کیا وقعت ہے اسے اس حدیثِ قدسی سے سمجھئے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکار ہوگی: أَيْنَ الْمُتَحَابُّونَ بِجَلَالِي الْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ تَحْتَ ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي "کہاں ہیں وہ لوگ جو میرے جلال کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ آج کے اس خاص دن میں ان کو اپنے عرش کے سایہ میں پناہ دوں گا کہ اس دن میرے عرش کے سائے کے سوا کہیں اور کوئی سایہ نہیں ہوگا۔" اسی أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کی تشریح و توضیح اس حدیثِ مبارکہ میں بھی ہمارے سامنے آتی ہے: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطَىٰ لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! جس نے کسی سے اللہ کے لئے محبت کی اور کسی سے اللہ ہی کے لئے علیحدگی اختیار کی اور جس کسی نے کسی کو اللہ کی خوشنودی کے لئے دیا جو کچھ دیا اور اللہ ہی کی رضا کے لئے روکا جو کچھ روکا تو یقیناً اس شخص نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی"۔

دوسرا وصف (DIMENSION) کیا ہے! یہ کہ:

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

"تم دیکھو گے ان کو رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے۔ وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متوالے اور متلاشی رہتے ہیں"۔

یہ دوسرا وصف ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے معمولات کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔ اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کی تربیت کا یہ رُخ ہے جسے ایرانی جاسوسوں نے رہبان باللیل سے تعبیر کیا تھا۔ حضر ہو کہ سفر ہو، امن ہو کہ جنگ ہو، ان اللہ والوں کے ان مشاغل میں فرق نہیں آتا تھا۔ ایک طرف عالم یہ ہے کہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے اللہ کے طاغیوں اور باغیوں سے تمام دوستیاں، محبتیں، تمام رشتہ داریاں اور تعلقات ختم ہو چکے ہوں اور بقول علامہ اقبال ؎

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے! ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

اور دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز!!! — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

اللہ والوں کی اس انقلابی جماعت کے کارکنوں کے سامنے علائق دنیوی اور سامانِ زیست کی محبت کے مقابلہ میں اللہ، اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی اہمیت کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ جھڑکی بطور کسوٹی رہتی تھی کہ:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (توبہ : ۲۴)

"اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہہ دیجئے اگر تمہیں اپنے باپ اور اپنے بیٹے اور اپنے بھائی اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور اپنے وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جن کے مندے کا تمہیں خطرہ اور اندیشہ رہتا ہے اور اپنے وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں جو تم نے بڑے ارمانوں سے بنائے اور سجائے ہیں۔ اگر یہ چیزیں تمہیں محبوب تر ہیں اللہ سے، اسؐ کے رسولؐ سے اور اسؐ کی راہ میں جہاد کرنے سے۔ تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے اور اللہ ایسے فاسقوں اور نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔"

اس آیت کے اختتام کا جو اسلوب ہے اس کے پیشِ نظر میں فَتَرَبَّصُوْا کی ترجمانی اور تعبیر یوں کیا کرتا ہوں" جاؤ دفع ہو جاؤ اور انتظار کرو حتّٰی کہ اللہ تم جیسے فاسقوں کے متعلق اپنا فیصلہ فرما دے"۔ اسی لئے میں نے اس آیت کو جھڑکی اور کسوٹی سے بھی تعبیر کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ غالباً اسی آیت سے تاثر لے کر علامہ نے اپنی مشہور نظم " لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" میں یہ شعر کہا ہے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند — بتانِ وہم و گماں لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ!

پس اللہ والوں کی جماعت کے دو اوصاف تو وہ ہوئے جو سورہ فتح کی آخری آیت کے اس ابتدائی حصہ میں آئے : مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ تَرٰىہُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا۔ لیکن اللہ والوں کی اعلائی جماعت کا تیسرا وصف، ایک تیسری **DIMENSION** ہے۔ بلکہ ایک کامل نقشہ کے اعتبار سے اصل میں سورۃ المائدہ کی وہ آیات ہیں جو میں نے آج آغاز میں تلاوت کی تھیں۔ ان میں آیت نمبر ۵۴ اہم ترین ہے۔ میں اب ان آیات کی تشریح اور توضیح کی طرف آتا ہوں

آیت ۵۴ میں فرمایا جا رہا ہے: یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ۔ "اے اہلِ ایمان! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر گیا" پھر جانے میں ہٹ جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس سے ایک تو ظاہری ارتداد مراد ہے۔ کوئی اسلام ہی کو چھوڑ دے کافر ہو جائے یا کسی کذاب مدعیِ نبوت میں سے کسی پر ایمان لے آئے، جیسے لوگ مسیلمہ پر ایمان

لئے۔ ہمارے دور میں مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان لے آئے۔ ایک تو یہ قانونی اور
ں ارتداد ہے لیکن ایک باطنی اور حقیقی ارتداد ہوتا ہے۔ منافق کون تھے! وہ باطنی مرتد تھے۔
سے کافر لیکن ظاہری طور پر مسلمان، قانونی اعتبار سے مسلمان۔ رئیس المنافقین عبداللہ ابن
بھی نماز جنازہ حضورؐ نے پڑھائی۔ بظاہر وہ مسلمان تھا لیکن بباطن مرتد کافر۔ اسی طریقے
شخص بھی اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے میدان میں آتا ہے اور پھر اپنی جان کی محبت کی وجہ
رشتہ داروں کی محبت کی وجہ سے، مال و اسباب دنیا کی محبت کی وجہ سے اگر وہ پیچھے ہٹتا ہے۔
د یہ بھی ارتداد ہے۔ اگرچہ یہ قانونی ارتداد نہیں ہے۔ جیسے منافق قانونی طور پر مرتد نہیں ہوتا
ت کے اعتبار سے مرتد ہوتا ہے۔ اسی طریقے سے جو شخص اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ الحق
ین کلہ۔ کی فرضیت کو سمجھ کر بھی دنیوی مفادات و تعلقات کی وجہ سے اس فریضہ کی ادائیگی
یان چرا رہا ہے۔ اپنی جان پیاری ہے، یا مال پیارا ہے۔ یا دنیا پیاری ہے۔ لہٰذا پیچھے ہٹ
ہ۔ یہ بھی درحقیقت ارتداد ہے۔ گو اس پر قانونی ارتداد کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا۔ انہی
کو یہاں للکارا جا رہا ہے: يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ۔
ے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ یعنی ایمان کے مدعی ہو۔ جو کوئی بھی تم میں سے ارتداد
پسپائی اختیار کرے گا۔ وہ سن رکھے، "فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ" اللہ تعالیٰ انہیں
رے گا، انہیں **REJECT** کر دے گا۔ اور کسی دوسری قوم کو لے آئے گا" ـــ
ں قوم کے ہاتھ میں اپنے دین کا جھنڈا تھما دے گا۔ وہ قوم اللہ کے دین کے قیام و نفاذ
لئے مجاہدہ کرے گی جس میں یہ یہ اوصاف ہوں گے۔ اب اسی آیت میں آگے تین اوصاف
ہوئے ہیں۔
پہلا کیا ہے! يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ "اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت
ں گے"۔ پہلا تو یہ مع اللہ کا تعلق ہے۔ اسی کا ایک مظہر ہے قیام اللیل۔ ـ دوسرا وصف ہے
ۃٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ "اہل ایمان کے حق میں بہت نرم، کافروں کے حق
بہت سخت"۔ یہ دونوں چیزیں تو وہی ہیں جو سورۂ فتح میں بایں الفاظ آئی ہیں: أَشِدَّاءُ
الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔ البتہ یہاں ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ اب آگے تیسرا وصف آ رہا ہے۔
هِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ "وہ اپنی پوری قوتیں، ہمہ تن،
دجوہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے لگا دیں گے اور اس کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت

سے بددل اور خوف زدہ نہیں ہوں گے۔ اس سے کوئی تاثر نہیں لیں گے"۔ یہ ملامت
مخالفانہ بھی ہوتی ہے اور ناصحانہ بھی ہوتی ہے۔ اس طرح کہ میاں اپنے **CAREER** کی
فکر کرو۔ کچھ تو اپنے مستقبل کا خیال کرو۔ اپنی اولاد کے متعلق سوچو، بچیوں کے ہاتھ پیلے
کرنے ہیں۔ یا تمہیں کیا ہوگیا ہے! پاگل اور دیوانے ہوگئے ہو۔ بس ایک دھن تم پر سوار ہوگئی
ہے۔ کچھ تو سوچو اور اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ یہ ناصحانہ انداز کی مخالفت ہے۔ ایک مخالفانہ انداز
کی ملامت ہوتی ہے۔ کہ شیخ چلی کے خواب دیکھ رہے ہو۔ صدیوں سے جمے جمائے نظام کو بدلنے
کے لئے کھڑے ہو رہے ہو۔ ہم نے اپنے آباء و اجداد سے جو نظام ورثہ میں پایا ہے اس کی مخالفت
کر رہے ہو۔ کیا ہمارے اسلاف کودن تھے جو اس نظام کو قائم کر گئے اور کیا ہمارے موجودہ
عمائدین و قائدین بیوقوف ہیں جو اس نظام کو چلا رہے ہیں! پھر ان کی سیادت و قیادت ہے
ان کا اثر و رسوخ ہے، ان کے ہاتھ میں قوت و طاقت ہے۔ ان کے مالی و معاشی مفادات اس
نظام سے وابستہ ہیں۔ تم مٹھی بھر سر پھرے کیا تیر مار لو گے! ان دونوں ملامتوں سے کوئی اثر
لئے بغیر اپنی توانائیاں، اپنی قوتیں، اپنی صلاحیتیں اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے لگا
رہے ہو۔ یہ ہے تیسرا وصف۔ جو لوگ یہ تینوں اوصاف اپنے اندر پیدا کرلیں گے ان کے
لئے آگے تیسری یعنی سورۂ مبارکہ کی چھپنویں آیت کے آخر میں لفظ 'حِزْبُ اللّٰهِ' آگیا:
فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ جن لوگوں کے اندر یہ بیان کردہ اوصاف پیدا ہوجا
وہ لوگ حزب اللہ بن جائیں گے، یہ وہ پارٹی بن جائیں گے، جن کی محبتیں بھی اپنے ہی دائرہ میں
ہوں گی۔ وہ اللہ سے، اس کے رسول ﷺ سے اور اہل ایمان سے محبت کریں گے۔ اور ان کی جن سے
مخاصمت ہوگی، مخالفت ہوگی، مجاہدہ ہوگا، مجادلہ و مقاتلہ ہوگا وہ بھی صرف اور صرف ا
اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین الحق کی سربلندی کے لئے ہوگا۔ کوئی ذاتی غرض، کوئی ذ
عداوت، کوئی ذاتی دشمنی، اس دنیا کا کوئی ذاتی مفاد ان کے پیش نظر نہیں ہوگا۔ ایسے لوگوں
لئے پہلی نوید تو وہ ہے جو چوّنویں آیت کے آخر میں آئی: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ جن لوگوں میں مطلوبہ اوصاف پیدا ہوجائیں تو یہ ان پر
فضل ہے۔ وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔ انسا
کی اس سے بڑی سعادت اور کون سی ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کے دین کے لئے جبکہ وہ غالب نہ ہو
ہو۔ خود جادۂ حق پر ثابت قدم رہ کر، اس راہ کی مشکلات و موانع کا مواجہہ کرکے اللہ کے دین کی س

کے لئے اپنا تن من دھن لگاتا ہے۔ وہ نوعِ انسانی کو آخرت کے عذاب اور اللہ کے دین سے روگردانی کے باعث دنیا میں جو افراتفری اور فتنہ وفساد جاری رہتا ہے اس سے بچانے کے لئے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں، اپنے وسائل لگاتا ہے۔ اسے یہ توفیق بھی اللہ کے فضل سے ملتی ہے اور اللہ کا فضل غیر محدود ہے اور وہ تو ہی خوب جانتا ہے کہ اس کے فضل کا اہل اور مستحق کون سا بندہ ہے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے: فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ اللہ کا اس حزب اللہ سے وعدہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہے گی ـــــ یہی بشارت اور یہی وعدہ سورۂ آلِ عمران میں بایں الفاظ فرمایا گیا: وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ "اور نہ سست ہو نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم ایمان رکھتے ہو" سربلندی اور غلبہ کا وعدہ یہاں مشروط ہے حقیقی ایمان سے۔ قلبی یقین سے جس کا عملی مظہر ہے اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد ـــــ جیسا کہ سورۂ حجرات میں حقیقی ایمان کی تعریف میں فرمایا: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ "مومنین تو صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، پھر شک میں نہ پڑے اور جنہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اور ایسے لوگ ہی اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہیں۔" ایسے مومنین صادقین، ایسے سرفروشوں اور جاں نثاروں کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے غلبہ اور سربلندی کا ـــــ اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کو وفا کرنے والا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

حزب اللہ کو جو تربیت درکار ہے اس کے ہدف معین ہو گئے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر کوئی خالص مادی اور دنیوی انقلاب پیشِ نظر ہے تو ایسی پارٹی کے کارکنوں کے لئے روحانی و اخلاقی تربیت کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ان کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قیام اللیل و تلاوت قرآن، تعلق مع اللہ اور مکارم اخلاق کی تلقین بے سود ہوگی۔ ان کے لئے مادی قسم کی تربیت اور ڈسپلن کا خوگر ہو جانا کفایت کرے گا۔ البتہ ان کے اندر قربانی کا جذبہ ضرور پیدا کرنا ہوگا۔ اگر یہ جذبہ نہ ہو تو کوئی مادی انقلاب بھی نہیں آتا ـــــ جب انسان تن من دھن دینے کے لئے آمادہ ہوتے تب ہی دنیا میں انقلابات آئے ہیں ورنہ کوئی انقلاب نہیں آسکتا تھا۔ قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جب انسان کو اس نظریہ، اس IDEOLOGY کے متعلق یہ یقین (CON-VICTIO) حاصل ہو جائے کہ اس کو اختیار کرنے پر بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کی بھلائی

مضمر و منحصر ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب کے لئے صرف مجاہدانہ کردار درکار نہیں ہے۔ جہاں وہ مجاہدانہ کردار درکار ہے وہاں اس تربیت کو اقدمیت و اوّلیت حاصل ہے کہ ان کا تعلق اللہ کے ساتھ مضبوط ترین ہو۔ اللہ کی رضا جوئی ہی ان کا مقصود و مطلوب ہو۔ اللہ ہی کے ساتھ ان کو شدید ترین محبت ہو: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ ان کے اندر جب تک یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوں گی۔ مجاہدانہ کردار اور تعلق مع اللہ۔ تب تک اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔

اب میں آپ کے سامنے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس مقصد کے لئے جناب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تربیت کا جو نظام اختیار فرمایا' اس کے عناصر سہ گونہ کون سے ہیں! تربیت محمدی کے تین ELIMENTS ہیں۔ جن کو جان لینے پر ہی اس تربیت کے نظام کے سمجھ لینے کا دار و مدار ہے ـــــ سب سے پہلے تو یہ بات پیش نظر رکھئے کہ میں اب جو کچھ عرض کرنے والا ہوں وہ انقلابی تربیت سے متعلق ہے۔ خانقاہی تربیت کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ اور ہے۔ اپنی جگہ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ آج کے دور میں وہ خانقاہی تربیت نہیں بلکہ مجاہدانہ تربیت درکار ہے اگر آپ کو اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے۔ اس مجاہدانہ تربیت کے لئے سب سے پہلی لازم چیز یہ ہے کہ جو شخص بھی اس میدان میں آئے اس کا اپنے اس انقلابی نظریہ کے ساتھ شعوری تعلق پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ اگر کہیں شعور کی سطح سے نیچے اتر جائے گا۔ اپنی منزل یاد نہ رہے گی۔ اپنے انقلابی نظریہ کے ساتھ ذہنی تعلق کمزور ہو جائے گا تو وہ شخص مضمحل ہو جائے گا پھر وہ انقلابی کام نہیں کر سکے گا۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے حصول کے لئے قرآن مجید اور احادیث شریفہ پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ سب سے زیادہ جو زور دیا گیا ہے وہ قرآن حکیم کی تلاوت پر ہے[1]۔ نہایت نامساعد ماحول ہے اور اس میں مخالفت شدید ترین ہے۔ ان حالات میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حکم کیا دیا جا رہا ہے! سورہ عنکبوت کی پینتالیسویں اور اکیسویں پارے کی پہلی آیت میں وارد ہوا ہے: اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ○ " اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تلاوت کرتے رہا کرو اس کتاب کی جو اللہ نے

---

[1] اس ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب کی معرکۃ الآرا تصنیف "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" ان شاء اللہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔ (مرتّب)

آپؐ پر نازل کی ہے"۔ غور کیجئے کہ یہ حکم صرف حضورؐ کو نہیں ہے بلکہ آپؐ کی وساطت سے تمام اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر اس انقلاب کے لئے تمہیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے تو تمہارا شعوری اور ذہنی اور قلبی تعلق اس نظریہ کے ساتھ مضبوط ہونا چاہیئے۔ اگر وہ کمزور پڑ جائے گا تو اس جدوجہد کے لئے جو جذبہ درکار ہے وہ بھی مضمحل ہو جائے گا۔ آگے فرمایا "اور نماز کو قائم رکھو"۔ بلاشبہ نماز فحش اور برے کاموں سے روکنے والی چیز ہے۔ یہاں دو چیزیں جمع کر لیں قرآن اور نماز۔ اس لئے کہ نماز کا بھی جزوِ اعظم قرآن ہے۔ قرآن کا لُبِّ لُباب ہے سورۂ فاتحہ۔ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت لازمی ہے۔ اس کے ذریعے سے توحید کے ساتھ ہمارے ذہنی رشتہ کی استواری اور ہمارے عہد کی تجدید ہوتی ہے۔ جب پڑھا جاتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ تو اس طرح ہر مسلمان توحید نظری یا توحید فی العقیدہ اور توحید عملی یعنی اللہ کی عبادت و استعانت ان دونوں کا ہر رکعت میں قول و قرار کا اعادہ کرتا ہے۔ محض فرض کی ادائیگی کے لئے غیر شعوری طور پر نماز میں کچھ پڑھ لیا جائے، یہ بات اور ہے لیکن اگر انقلابی تربیت والا نقشہ آپ دیکھیں گے تو اس میں اہم ترین چیز یہی تلاوتِ قرآن اور اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ قرآن اور صلوٰۃ کے باہمی ربط کو میں بعد میں مزید واضح کر دوں گا۔

اسی طرح سورۂ کہف کے متعلق آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی جبکہ مکہ میں قریش کی طرف سے حضورؐ کے قتل کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ یہ مکی دور کا آخری حصہ ہے۔ اس میں حضورؐ کو کیا حکم دیا جا رہا ہے! وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتٰبِ رَبِّکَ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا ○ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تلاوت کیا کرو اس کتاب کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف وحی کی گئی ہے۔ اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں اور دیکھ لو کہ اس کتاب کے سوا تمہارے پاس کوئی اور سہارا اور کوئی دوسری جائے پناہ نہیں ہے"۔ میں پھر عرض کروں گا کہ نبی اکرمؐ کے ساتھ تمام اہلِ ایمان بھی اس حکم کے مخاطب ہیں کہ اس کتاب کے دامن میں پناہ لو۔ اس کتاب کے ساتھ جس کا تعلق جتنا مضبوط ہوگا اتنا ہی انقلابی نظریہ کے ساتھ اس کا شعوری و ذہنی اور قلبی تعلق مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔ میں نے آج کی گفتگو میں عرض کیا تھا کہ دوسرے انقلابات کے نظریے انسانوں کے ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ اسلامی انقلاب کا نظریہ وحی کے ذریعہ

سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا ہے ۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ قرآن سے تعلق، زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت، زیادہ سے زیادہ قرآن کو پڑھنا نماز میں خصوصًا نماز فجر میں تہجد کے وقت اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ۔ اس میں قرآن کی طویل قرأت ہو ۔ اسی لئے اس کا نام رکھا قرآن الفجر ۔ باقی نمازوں میں اتنی طویل قرأت نہیں ہوتی ۔ لیکن فجر کی نماز میں طویل قرأت مطلوب ہے وہ گویا قرآن پڑھنا ہے فجر کا اور جان لو کہ قرآن پڑھنا فجر کا مشہود ہے ۔ اس کی گواہی دی جاتی ہے ۔ اس موقع پر فرشتے سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہ رات کے فرشتے بھی جن کی ڈیوٹی ختم ہو رہی ہوتی ہے اور دن کے فرشتے بھی جو آکر چارج لیتے ہیں، فجر کی نماز کے وقت دونوں جمع ہوتے ہیں ۔

لہٰذا ایک بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ قرآن کو زیادہ سے زیادہ ٹھوک ٹھوک کر اپنے ذہن و قلب میں اتارنا، یہ درحقیقت تربیتِ مہدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نظام کی سب سے اہم اور اوّلین شق ہے ۔ ذہن کی گتھیوں کو سلجھانے، آئینۂ قلب کو صیقل کرنے، ایک بندۂ مومن کے باطن کے نور کو اجاگر کرنے اور اس میں ایک ولولۂ تازہ اور جوشِ عمل پیدا کرنے کے لئے قرآن حکیم سے زیادہ مؤثر شے اور کوئی نہیں ہے ۔ یہ کتاب مبین تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ "سیدھی راہ دکھانے والی اور یاد دہانی ہر اس بندے کے لئے جو اللہ کی طرف رجوع کرے" والی بن کر نازل ہوئی ہے ۔ میں پہلے بھی کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ اسی بات کو علامہ اقبال نے یوں کہا ہے کہ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یہ قرآن اگر کسی کے ذہن میں اتر جائے گا اور اس کے دل میں رچ بس جائے گا تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا اور اس کی شخصیت بدل جائے گی ۔ اور جب اندر انقلاب آئے گا اور مستحکم ہوگا تو بالآخر یہ ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے ۔ اور اس کا پیش خیمہ بن سکتا ہے ۔ پھر علامہ نے یہ بھی کہا کہ اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کے لئے بھی اس قرآن سے زیادہ مؤثر شے اور کوئی نہیں ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی ـــــ!!

ابلیس کو قتل کر دینا آسان کام نہیں ہے ۔ اس لئے کہ وہ تو انسان کے دل میں جا کر

ڈیرا لگاتا ہے وہاں جا کر گھات لگاتا ہے جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا: اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ ۔ اب ظاہر بات ہے کہ جو زہر پورے جسم میں سرائت کر گیا ہو، اس کے لئے تریاق بھی وہ درکار ہے جو پورے وجود میں سرائت کر جائے اور تریاق صرف قرآن ہے۔ اس کو اپنے باطن میں اتارو۔ اس کو اتارنے کا عمل یہ ہے کہ ٹھوک ٹھوک کر اتارو۔ اسے بار بار پڑھو اسے HAMMER کرو۔ یہ نہیں کہ ایک بار پڑھا اور سمجھ لیا بلکہ اس کو پڑھتے رہو۔ اس طریقہ سے یہ قرآن رفتہ رفتہ انسان کے وجود میں سرائت کرتا ہے۔

تلاوتِ قرآن کا انقلابی نظریہ اور تربیتِ محمدی کے ساتھ جو منطقی ربط و تعلق ہے۔ اُسے میں نے واضح کر دیا ہے کہ انقلابی کارکن کے لئے اہم ترین بات یہ ہے کہ اس کا ذہنی و قلبی تعلق اپنے انقلابی نظریہ کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ یہ تعلق کمزور رہے گا تو انقلاب کے لئے قربانی کا جو جذبہ درکار ہے وہ بھی مضمحل رہے گا۔ پہلی چیز یہ ہے اور قرآن چونکہ نظریہ ہے انقلابِ محمدی کا صلی اللہ علیہ وسلم۔ لہٰذا تربیتِ محمدی کی پہلی شق ہے کہ اس قرآن کو مسلسل، پیہم محنت کر کے انسانوں کے اندر اتارا جائے گا۔

دوسرا معاملہ کیا ہے! نفس کی مخالفت، اس سے کشاکش۔ یہ نفس جسے ہم IDD یا LIBIDO بھی کہہ سکتے ہیں اس کے لئے قرآن کی اصطلاح "نفس امارہ" ہے۔ یہی تو راستہ کی رکاوٹ بنتا ہے۔ دنیا کی محبت ہے۔ مال کی محبت ہے۔ شہوت کے تقاضے ہیں۔ اسی نوع کی خواہشاتِ نفس آدمی کا راستہ روکتی ہیں۔ وہ جو جگر نے کہا ہے ؎

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں　　دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

انسان کو عافیت اور عیش و آرام درکار ہے، انسان دولت چاہتا ہے۔ شہرت چاہتا ہے اور یہ سارے حُبِّ مال، حُبِّ جاہ، حُبِّ دنیا اور علائقِ دنیا اور ساز و سامانِ دنیا کی محبت۔ یہی تو رکاوٹ ہے۔ ان سب کو جمع کر لیجئے تو یہ ہے آپ کا نفس ـــ اس نفس کی مخالفت کرو۔ یہ دوسری شق ہے تربیتِ محمدی کی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کے لئے تین چیزیں ذہن میں رکھئے۔ ہمارے دین میں جو عبادات کا نظام ہے۔ اب ہم نے انہیں رسوم (Rituals) بنا لیا ہے۔ یہ بات دوسری ہے ؎

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

اب وہ صرف مراسمِ عبودیت بن کر رہ گئے۔ یہ تو درحقیقت ہمارے انحطاط کا نتیجہ

ہے ۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ سمجھا جائے کہ تربیتِ محمدیؐ میں اس کی اصل غایت
حقیقی مقام کیا ہے ! نماز کی ایک غایت میں بیان کر چکا : اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡ
عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۔ سورہ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا : اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِ
"نماز قائم کرو میری یاد کے لئے" انسان اپنی دنیوی مصروفیات میں دن میں پانچ مرتبہ لگا
وقفہ وقفہ سے اسے یاد دہانی حاصل ہو کہ وہ کسی کا بندہ اور غلام ہے ۔ وہ مختارِ کل نہیں
اسے اپنے روزمرہ کے معمولات بھی اسی اللہ کے احکام کے مطابق انجام دینے ہیں، جس
ذکر یعنی یاد دہانی کے لئے وہ دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرتا ہے ۔

روزہ رکھنے کی بھی ایک غایت ہے تاکہ نفس کے اندر جو بھوک کا تقاضا ہے، زبا
چٹخارے مانگتی ہے ۔ شہوت کا جو تقاضا ہے، ان کا روزہ کے ذریعہ سے مقابلہ کرو ۔ حض
نے فرمایا یہ ڈھال ہے : اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ ۔ نفس کے حملوں سے روکنے والی چیز تمہارے
پاس روزہ کی ڈھال ہے جو اللہ نے تمہارے لئے فرض عبادت کے طور پہ رکھی ہے ۔
میں رمضان کے مہینہ میں تو لازمًا رکھو اور یہ تمام مسلمان رکھیں ۔ ایک اجتماعی ماحول بن ج
لیکن صرف اس پہ اکتفا نہ کرو، نفلی روزے رکھو، ہر مہینہ میں تین دن رکھنے کا اہتمام کرو
اس روزے کے ذریعہ سے اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کرو ۔ تربیتِ محمدیؐ کی یہ دوسری
نماز اور روزہ کو آپ دنیا کے MODE OF WORSHIP کے عمومی تصور سے بالکل علاحد
یہ یقینًا بندگی اور اللہ کے سامنے عاجزی و تذلل کا ایک اظہار بھی ہے ۔ لیکن یہ چیزیں تربیت
علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وہ بنیادی امور ہیں جن کے ذریعہ ہی سے تربیت دی جا
ہے ۔ انہی کے ذریعے سے انسان کی قوتِ ارادی کو تقویت حاصل ہو گی ۔ اس میں صلاح
پیدا ہو گی کہ وہ نفس کے زور آور تقاضوں کا مقابلہ کر سکے گا ۔

اب زکوٰۃ کی مفروضہ عبادت پر غور فرمائیے ۔ آپ کو اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ
زکوٰۃ کا حکم ملے گا ۔ زکوٰۃ ادا کرو ۔ صدقات دو ۔ انفاق کرو ۔ خرچ کرو ۔ انسان کے دل
سے بڑی جو نجاست پیوست ہو جاتی ہے وہ مال کی محبت ہے ۔ میں نے کئی بار بیان کیا ۔
بریک ہے ۔ جب تک گاڑی کا BRAKE نہیں کھلے گا آپ کتنا ہی ایکسی لیٹر دبا
پھڑپھڑا کر بند ہو جائے گا ۔ چونکہ بریک لگا ہوا ہے ۔ مال کی محبت کا بریک لگا ہوا ۔
ہو سکتی ہے جو خود ایک مسلمان اور ایک مجاہد کا کردار ہونا چاہئے، وہ کبھی ا

نہیں چڑھ سکتا۔ لہٰذا اسے دل سے کھرچ کھرچ کر نکالو۔ زکوٰۃ ہے، صدقاتِ واجبہ ہیں، صدقاتِ نافلہ ہیں۔ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں ان صورتوں میں خرچ کرو۔ یہ بات جان لیجئے کہ یہ لفظ زکوٰۃ تزکیہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پاک کرنا۔ صاف کر دینا، یہ یک کھول دینا۔ رکاوٹ کو دور کر دینا۔ تزکیہ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک مالی اپنے باغ میں دیکھتا ہے کہ جو پودے اس نے پھل والے یا پھول والے لگائے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ خود رو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ اگ آیا ہے۔ اب یہ جھاڑ اور خود رو گھاس بھی زمین سے غذا لے رہی ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ پوری غذا ان پودوں کو ملے — ہوا میں جو قوت نمو ہے یہ خود رو چیزیں اس کو بھی جذب کر رہی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو یہ پوری قوت ان پودوں کو ملے گی جن کو وہ چاہتا ہے کہ پروان چڑھیں — وہ مالی کیا کرتا ہے! کھرپا ہاتھ میں لیتا ہے اور ان خود رو تمام چیزوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اس عمل کا نام ہے عربی میں تزکیہ — انسان کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جو اوصاف پروان چڑھیں، ان کی نشو و نما اور ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے مال کی محبت، دنیا کی محبت۔ یہ نجاست ہے، یہ بریک ہے۔ اس کو دل سے نکالو گے، اس بریک کو کھولو گے تو جو صلاحیتیں بالقوہ تمہارے باطن میں موجود ہیں وہ پروان چڑھیں گی۔ تو تزکیہ کا عمل حقیقت میں یہ ہے، اسی لئے زکوٰۃ کا لفظ تزکیہ سے ماخوذ ہے۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد کیا ہے! وہ ہے: اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ۝ وہ جو اپنا مال دیتا ہے حصولِ تزکیہ کے لئے۔ سورہ توبہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا۔ "(اے نبی) ان مسلمانوں کے مالوں میں سے صدقات (زکوٰۃ) لیجئے تاکہ اس طرح آپ ان کو پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں"۔

ان امور کو سامنے رکھ کر تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا سہ گانہ پروگرام نوٹ کر لیجئے۔ نفس کی مخالفت روزے سے، نفس کی مخالفت اللہ کی راہ میں مال خرچ کر کے اور نفس کی مخالفت کا جو تیسرا پروگرام اقدمیت واوّلیت رکھتا ہے اور جو تربیتِ محمدی کا اہم ترین نکتہ ہے وہ ہے رات کو جاگنا۔ یہ نیند بھی انسان کے نفس کا بہت بڑا تقاضا ہے۔ جہاں پیٹ کا بھرنا نفس کا تقاضا ہے، جہاں زبان کا چٹخارا نفس کا تقاضا ہے، جہاں شہوت کا جذبہ نفس کا تقاضا ہے وہاں نیند، آرام، استراحت بھی نفس کا ایک زوردار تقاضا ہے۔ لہٰذا نفس کی مخالفت میں سب سے زیادہ انسان کی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنے والی شے کیا

ہے: اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۔ نفس کو کچلنے، نفس کی قوت کو توڑنے اور قابو میں رکھنے کے لئے سب سے مؤثر شے رات کا جاگنا ہے۔

اب ان تمام چیزوں کو پیشِ نظر رکھیں پھر دیکھیں کہ کس طرح تربیت و سلوکِ محمدی میں اس کو جمع کیا گیا ہے! میں نے پہلی بات عرض کی تھی تلاوتِ قرآن اور صلوٰۃ، دونوں مل کر نظریاتی طور پر اپنے مقصد اور اپنے فکر کو تازہ رکھنے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسری تین چیزیں میں نے عرض کیں وہ ہیں نفس کی مخالفت اور قوتِ ارادی کو تقویت دینے کے لئے روزے کے ذریعے سے نفس کے تقاضوں سے مقابلہ کرنے کی عادت پیدا کرو۔ مال خرچ کرکے دل کی محبوب ترین چیز دل سے نکال کر نفس کی مخالفت کے لئے قوت پیدا کرو۔ اور رات کو جاگنا نفس پر قابو پانے اور اس کی مخالفت کے لئے بہت مؤثر اور مفید ہے: اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۞ ـــــ اب دیکھئے یہ سب چیزیں جمع کر دی گئیں ان الفاظ میں جو سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائے گئے: يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۞ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۞ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۞ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۞ " اے کپڑے میں لپٹنے والے کھڑے رہو رات کو مگر تھوڑا۔ آدھی رات یا اس میں سے کم کر تھوڑا سا یا زیادہ کر اس پر اور اس میں قرآن پڑھا کر ٹھہر ٹھہر کر جیسا کہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا ہوتا ہے۔ ہم تم پر جلد ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ بڑی بھاری ذمہ داری آنے والی ہے"۔ وہ بھاری ذمہ داری کیا تھی! اگلی ہی سورت میں وہ آیات آگئیں: يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۞ قُمْ فَاَنْذِرْ ۞ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۞ یہ ذمہ داری تھی انذار اور تکبیرِ رب کی ذمہ داری عھ وہ وسعتِ افلاک میں تکبیرِ هُوَ اللّٰه ۔ یہ کام آپؐ کو کرنا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اگرچہ نزولِ وحی سے قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انسانِ کامل تھے۔ آپؐ کی شخصیت اور سیرت بے داغ تھی۔ اس پر کوئی دھبہ نہیں تھا۔ دشمنوں نے آپؐ کو الصادق اور الامین مانا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انذارِ آخرت اور تکبیرِ رب کے کام کے لئے مزید تربیت ضروری ہے۔ اے نبی آپؐ خلقِ عظیم کا نمونہ ہیں: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ لیکن با ایں ہمہ ہم آپؐ پر جو بارگراں ڈالنے والے ہیں۔ یہ جو بھاری ذمہ داری آپؐ کے کاندھوں پر آنے والی ہے اس کے لئے اضافی تربیت کی ضرورت ہے اور وہ ہے قیام اللیل۔ اور اس میں کیا کیجئے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ

اس قرآن کا آپؐ کے قلبِ مبارک پر نزول ہو۔ اسے ٹھہر ٹھہر کر، رُک رُک کر پڑھنا ہے۔ جیسے کہ ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی ہے۔ ایک بار کی چوٹ سے بات نہیں بنتی بلکہ بار بار کی چوٹ مقصد کو پورا کرتی ہے۔ کَذٰلِکَ ج لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ "اسی طرح اتارا تاکہ ہم اس کے ذریعے سے آپؐ کے دل کو ثبات عطا فرمائیں۔ لہٰذا پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر۔" تاکہ یہ قرآن آپؐ کے قلب میں جاگزیں ہو جائے۔

میں پھر عرض کروں گا کہ یہ حکم اور یہ کام صرف حضورؐ کے لئے نہیں تھا۔ حضورؐ کے ساتھ آپؐ کی جو جماعت تیار ہو رہی ہے اس کے لئے بھی تھا۔ چنانچہ اسی سورہ مزمل کے دوسرے رکوع میں فرمادیا جو بعد میں نازل ہوا ہے: اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط "اے نبی! ہمیں خوب معلوم ہے کہ آپؐ بھی اور آپؐ کے ساتھیوں کی ایک جماعت بھی اسی طریقہ سے دو تہائی رات اور آدھی آدھی رات اور تہائی رات کے قریب اٹھتے ہیں اور کھڑے رہتے ہیں" مراد ہے وہ ترتیلِ قرآن کا کام سرانجام دے رہے ہیں جس کا حکم ابتداء میں صرف آپؐ کے لئے آیا تھا ___ یہ ہے تربیت محمدیؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰة کا جامع ترین لائحہ عمل جس میں قرأتِ قرآن، صلوٰة اور رات کا جاگنا تین چیزیں جمع ہو گئیں۔ اور معلوم ہوا کہ یہ ہے سب سے مؤثر ترین شئے تربیتِ محمدیؐ میں۔ علیٰ صاحبہا الصّلوٰة والسّلام۔ اندازہ کیجئے کہ تین تہائی رات اور نصف تو بہت ہی زیادہ ہے لیکن ایک تہائی شب بھی کم نہیں ہے اگر سردیوں کی رات چودہ گھنٹوں اور گرمیوں کی رات نو گھنٹوں کی ہو تو بالترتیب قریباً ساڑھے چار اور تین گھنٹے تو لگائے جائیں گے تو جب کہیں جاکر کم از کم تقاضا پورا ہو گا ___ یہ تھا تربیت محمدیؐ کا قیام اللیل کا کم سے کم اور مکی دور کا نصاب ___ مکی دور کے اواخر میں سورۂ بنی اسرائیل میں اس کا جو مستقل نصاب بیان ہوا ہے وہ ہے: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ___ دن کے اوقات میں تو اے نبی آپؐ نماز پڑھتے ہی ہیں۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ ہے اور بعض رکعتوں میں قرآن کا دوسرا حصہ بھی پڑھا جاتا ہے، اور نمازِ فجر تو گویا ہے قرآن الفجر۔ لیکن آپ کے لئے یہ کافی نہیں ہے۔ لہٰذا رات کا ایک حصہ تو اس قرآن کے ساتھ لے کر جاگیئے۔ یہ آپؐ کے لئے زائد ہے"۔ یہاں "فَتَهَجَّدْ بِهٖ" خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ قرآن کے ساتھ جاگنا ہے ___ آپؐ کی وساطت سے امت خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو تکبیرِ رب، اقامتِ دین، اظہارِ دین الحق علی الدین کلّہ کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ یہ نفل مشقت

قرآن جمع صلوٰۃ ہے۔ تاکہ حالتِ نماز میں قرآن حکیم کو اپنے قلب وذہن میں اتارنے کا یہ مؤثر ترین طریقہ جاری وساری رہے ۔ رات کی تنہائیوں میں طویل قیام میں ترتیل کے ساتھ قرآن کی قرأت دل کے آئینہ کو جس طرح صیقل کرتی ہے اور اس سے قوتِ ارادی کو نمو حاصل ہوتی ہے اور اس سے روح کو جو کیف وسرور حاصل ہوتا ہے اس سے لذت آشنا وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کو یہ توفیق وسعادت ملتی ہے ۔

تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں ایک اہم ترین بات مزید نوٹ فرمائیے ۔ نبی اکرمؐ کی تربیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ تربیت میدان کے لئے تربیت تھی ۔ محض گوشے میں بٹھانے کی تربیت نہیں تھی ۔ اس لئے کہ فوراً کشاکش یا عرفِ عام میں کشمکش شروع ہو جاتی تھی ۔ جہاں کہا لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ فوراً مار پڑنی شروع ہو جاتی تھی ۔ اب یہ جو مار پڑ رہی ہے تو عملی تربیت کا مؤثر ترین ذریعہ یہ ہے ۔ اگر اس کو جھیلو گے تو تمہاری قوتِ ارادی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی ۔ تمہارے اندر صبر واستقامت کے اوصافِ عالیہ ترقی پاتے چلے جائیں گے ۔ اگر یہ کشمکش نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ تیرنے کی تربیت خشکی پر دیں اور بتائیں کہ تیرنے کے لئے یہ کرنا ہوتا ہے، وہ کرنا ہوتا ہے ۔ سال بھر کی ٹریننگ سے بھی کوئی شخص تیراک نہیں بنے گا ۔ اسی کو پانی میں اتاریئے اور اسے بتائیے کہ تیرنے کیلئے اسے ہاتھ پاؤں اور پورے جسم کو کس طرح استعمال کرنا ہے تو وہ چند دنوں میں بلکہ اگر کوئی ذہین ہوا تو ایک دن میں تیراک بن جائے گا ـــــ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت خانقاہی نہیں ہے ۔ گوشے میں بٹھا کر دی جانے والی تربیت نہیں ہے ـــــ اور ایک بات اور سن لیجئے ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کیا کہ لوگوں کو نکال کر کہیں اور لے جائیں اور وہاں تربیت دیں بلکہ یہ کیا ہے کہ جو شخص جہاں ہے، وہاں تربیت پائے ۔ اب وہ شخص وہیں کھڑے ہو کر کہے گا کہ میں ایک اللہ کو مانتا ہوں ۔ میں جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ تسلیم کر چکا ہوں اور آپؐ کے نقشِ قدم اور آپؐ کی سنت پر چلنے کا فیصلہ کر چکا ہوں ۔ میں آخرت کے محاسبہ کا یقین رکھتا ہوں کشمکش شروع ہو جائے گی ۔ اپنے گھر میں کشمکش ہوگی ۔ اہل وعیال سے کشمکش ہوگی، رشتہ داروں سے کشمکش ہوگی ۔ آپ ذرا کسی رسم کو چھوڑ کر دیکھئے، آپ کی برادری آپ کا حقہ پانی بند کر دے گی ۔ ذرا آپ زمانے کے جو چلن ہیں، جو رواج ہیں ان کو چھوڑ دیجئے تو آپ کو یہ نظر آ جائے گا کہ آپ کے بچوں کے لئے

رشتے نہیں ملیں گے۔ آپ کی بچیوں کے لئے کہیں سے پیغام نہیں آئیں گے۔ یہ ہے اصل میں تربیت۔ ماریں کھا کر صحابہ کرامؓ نے تربیت حاصل کی تھی۔ اس دورِ سعید اور ہمارے دور میں جو فرق ہے وہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ وہاں شریعت نہیں تھی کلمہ طیبہ پڑھنے پہ مار پڑتی تھی جس نے کہا: اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ، ماریں پڑنا شروع ہو جاتی تھیں۔ یہاں تو کلمہ طیبہ کی ہزار دانے کی تسبیح لے کر بیٹھ جائیں اور اس پہ کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہیں کوئی مخالفت نہیں ہوگی۔ آپ پہ کوئی مار نہیں پڑے گی بلکہ آپ کے احترام و توقیر میں اضافہ ہوگا کہ یہ شخص بڑا اللہ والا ہے۔ آپ راتوں کو جاگیے، قرآن کی تلاوت کو معمولات میں شامل کیجیے۔ نفلی روزوں کا اہتمام کیجیے کوئی مار آپ پر نہیں پڑے گی بلکہ اگر لوگوں کے علم میں بھی یہ بات آجائے تو آپ کے تقویٰ اور تدین کی دھوم ہوگی۔ کشمکش جو شروع ہوگی تو وہ اس سے ہوگی کہ "میرے نزدیک از روئے شریعت یہ کام غلط ہے میں یہ نہیں کروں گا"۔ بس آپ نے جوں ہی یہ کیا وہیں کشمکش شروع ہوگئی۔ آج جو کشمکش ہے وہ شریعت پر عمل کرنے کی کشمکش ہے۔ اس مکی دور میں شریعت نہیں تھی، صرف کلمۂ شہادت پہ مار پڑتی تھی۔ لیکن یہ کہ جب تک مار نہ پڑے کشمکش نہ ہو تربیت نہیں ہوتی۔ یہ بات اچھی طرح جان لیجئے۔ یہ تربیت خانقاہی تربیت ہے جس میں مار نہیں پڑتی۔ ایک شخص ایک گوشہ میں بیٹھا ہے اور اوراد و وظائف کی تسبیحات پڑھ رہا ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فائدہ ضرور ہوگا لیکن اس کا ہدف وہ نہیں ہے جو تربیت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ وہ انقلابی تربیت نہیں ہوگی۔ وہ خانقاہی تربیت ہوگی۔ اچھا مسلمان وجود میں آئے گا۔ اسے روحانی ترفع حاصل ہوگا وہ نیک ہوگا، صالح ہوگا، نماز میں اس کا جی لگے گا۔ ذکر اللہ میں اسے لذت حاصل ہوگی۔ یہ سب کچھ اسے حاصل ہو جائے گا لیکن وہ مردِ میدان کبھی نہیں بنے گا۔ باطل سے وہ پنجہ آزمائی کبھی نہیں کر سکے گا۔ باطل اور طاغوت کو وہ کبھی نہیں للکار سکے گا۔ جبکہ یہاں درکار ہیں وہ لوگ جو میدان میں آئیں، باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کریں۔ اس کے لئے ضرورت ہے اس تربیت کی جس میں ماریں پڑی ہوں، جس میں گھر والوں اور ماحول سے شدید کشمکش سے سابقہ پیش آیا ہو۔ میں اکبر الٰہ آبادی کا شعر پھر دوہرا رہا ہوں کہ ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پہ بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار فی الواقع آگ میں جلے تھے۔ حضرت خباب ابن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا تھا۔ اب جو شخصیت اس طرح پک گئی، پختہ ہو گئی، جس نے صبر و مصابرت کا یہ مورچہ سر کر لیا وہ کیا میدان میں کبھی پیٹھ دکھا دے گی اور مار کھا جائے گی! یہ ہے انقلابی تربیت۔ جس پر جب آپ عمل شروع کرتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ "یہ ہے میرا راستہ جس پر میں چلوں گا چاہے والدین کو ناپسند ہو، چاہے اہل و عیال کو ناپسند ہو، چاہے رشتہ داروں کو ناپسند ہو"۔ وہ شخص جو رشوت لے رہا ہے اور گھر والے عیش کر رہے ہیں وہ آج طے کر کے دیکھے کہ میں رشوت نہیں لوں گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سب سے پہلی لڑائی گھر میں ہو گی۔ اس لئے کہ جو دو دو پراٹھے کھاتے تھے وہ جو ہمارے یہاں کی کہاوت ہے "دو دو اور چپڑی" تو چپڑی نہیں پراٹھے۔ چپڑی میں تو اوپر گھی لگتا ہے، پراٹھے میں تو اندر بھی لگتا ہے تو جن کو دو دو پراٹھے ملتے تھے، اگر ان کو سوکھی روٹی پر گزارا کرنا پڑے تو سب سے پہلے دشمن گھر والے ہوں گے۔ جب تک اس قسم کی کشمکش در کشمکش نہیں ہوتی، اس وقت تک وہ تربیت نہیں ہو گی جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار ہے۔ آپ کسی شخص کو باہر بھیج دیجئے یا ساتھ لے جائیے، اب وہ اپنے ماحول سے نکل گیا۔ وہ دوسرے شہروں میں یا دوسرے ملکوں میں چلا گیا۔ چالیس دن کا چلّہ اس نے پورا کر لیا۔ لیکن ہوتا کیا ہے! وہ وہاں جاتا ہے جہاں اسے کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ شخص رشوت لیتا ہے کہ نہیں لیتا۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ اگر صنعت کار یا تاجر ہے تو سودی کاروبار کرتا ہے کہ نہیں کرتا۔ وہ تو اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ آسمان سے فرشتے نازل ہو گئے۔ دین کی تبلیغ کے لئے اتنی دور چل کر آ گئے۔ لہٰذا ان کے لئے تو وہاں پذیرائی ہی پذیرائی ہو گی۔ وہاں کوئی نہیں جانتا کہ اس کا کردار کیا ہے؟ لیکن جہاں آپ رہتے ہیں، وہاں دین کی دعوت دے کر دیکھئے۔ اب لوگ آئینہ لے کر سامنے کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے "میاں ہم سے یہ کہتے ہو جبکہ تمہارے دامن پر یہ داغ دھبے ہیں۔ تم ہمارے سامنے دین پر وعظ کہتے ہو درآں حالیکہ تم رشوت لیتے ہو۔ تم اپنے کاروبار، اپنی فیکٹری اپنے امپورٹ ایکسپورٹ کے لئے بنک سے سود پر سرمایہ لیتے ہو۔ سود ادا کرتے ہو"۔ یہ تربیت ہے اصل تربیت جو اپنے مقام اور اپنے ماحول میں ہوتی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فرمائی۔

یہ ہیں تربیتِ محمدی کے تین زرّین اصول۔ پہلا یہ کہ اپنے اس انقلابی نظریہ کے ساتھ
شعوری ذہنی و قلبی رشتہ مضبوط سے مضبوط تر رہے۔ اس میں تعطل و جمود پیدا نہ ہونے پائے
یہ تلاوتِ قرآن اور اقامتِ صلوٰۃ۔ دوسرا نفس کی مخالفت۔ اس سے درحقیقت قوتِ
دی کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے سہ گونہ پروگرام ہے۔ فرض روزوں کے
نفلی روزے زیادہ سے زیادہ رکھو۔ زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات زیادہ سے زیادہ دو۔ اللہ
دین کے لئے زیادہ سے زیادہ انفاق کرو اور راتوں کو جاگو: اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ
وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ○ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ رات کے جاگنے کے پروگرام کو سورۂ مزمل کی
ابتدائی چار آیات میں جمع کر دیا گیا اور پھر اس صلوٰۃ و تلاوت کے پروگرام کا خلاصہ سورہ بنی اسرائیل
میں ان الفاظ آ گیا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ
قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ○ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ
مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○ ـــــ اور تیسرا ہے کشمکش و تصادم ـــــ یہ تصادم اس دور میں شریعت پر عمل کرنے
سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ اس دور میں یہ ہوا تھا محض کلمہ توحید و رسالت ادا کرنے پر۔ چونکہ ابھی
شریعت تھی ہی نہیں۔ ابھی شراب، قمار اور سود کی حرمت تھی ہی نہیں۔ ابھی ستر و حجاب کے احکام
آئے ہی نہیں تھے۔ گویا ابھی شریعت کے تفصیلی احکام تھے ہی نہیں لیکن جس دور میں ہم سانس لے
رہے ہیں، اس میں کلمۂ طیبہ پڑھنے سے تصادم شروع نہیں ہوتا۔ مار پڑے گی اور تصادم ہوگا بشرطیکہ
شریعت پر عمل کیا جائے گا۔ اور اپنے گھر اور اپنے قریب ترین ماحول پر رہ کر عمل کیا جائے گا۔ تاکہ
لوگوں کو یہ نظر آئے کہ یہ شخص شریعت پر عمل کر رہا ہے۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کی سیرت و کردار
کے اندر کوئی بڑے بڑے خلا نہیں ہیں اور جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اس پر عمل بھی کر رہا ہے۔ یہ ہیں تربیت
محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے عناصر ثلاثہ ـــــ

اب ان شاء اللہ آئندہ جمعہ میں اس موضوع کا جو اہم ترین حصہ ہے یعنی تصادم اور تصادم
کے مراحل سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کس ترتیب سے نظر آتے ہیں۔ اس پر میری
گفتگو ہوگی ـــــ ان شاء اللہ العزیز!

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ

۸

عن انسؓ عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم

لا یؤمن احدکم

حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جیسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

مسئلہ رجم، چند اشکالات اور انکے جوابات، (۳)

امام دار الہجرہ امام الائمہ مالک بن انس رح

(۹۳ھ تا ۱۷۹ھ)

— مولانا سید حامد میاں (مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور) —

[ربطِ مضمون قائم رکھنے کے لئے اس سلسلے کی پہلی دو اقساط کا مطالعہ مفید رہے گا جو بالترتیب جنوری اور فروری ۸۵ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ (ادارہ)]

امام اعظم ابو حنیفہ رح کے بعد دنیا میں وجود میں آنے والے مسلّمہ امام امام مالک رح ہیں۔ ان کی مختصر کتاب موطأ میں، کتاب الحدود میں پہلا بیان رجم ہی کے متعلق ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

مالك عن نافع عن عبد الله بن عمر انه قال جاءت اليهود الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فذكروا له ان رجلا منهم وامرأة زنيا فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ما تجدون في التوراة في شأن الرجم فقالوا نفضحهم ويجلدون فقال عبد الله بن سلام كذبتم ان فيها الرجم فأتوا بالتوراة فنشروها فوضع احدهم يده على آية الرجم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہودی آئے انہوں نے آپ سے ذکر کیا کہ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے ان سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم رجم کے بارے میں توراۃ میں کیا حکم موجود پاتے ہو کہنے لگے کہ ہم تو انہیں رسوا کر دیتے ہیں اور ان کے کوڑے لگا دیئے جاتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن سلام نے کہا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ توراۃ میں رجم کے حکم کی آیت موجود ہے۔

فقرأ ما قبلها وما بعدها
فقال له عبد الله بن سلام
ارفع يدك فرفع يده
فاذا فيها اٰية الرجم فقالوا
صدق يا محمد ان فيها اٰية
الرجم فامر بهما رسول الله
صلی الله علیه وسلم فرجما
قال عبد الله بن عمر فرأيت
الرجل يحنى على المرأة ويقيها
الحجارة قال مالك معنى
يحنى عليها يكب حتى يقع
الحجارة عليه۔

تورات لاکر پڑھو، انہوں نے توراۃ
لاکر کھولی تو ایک پڑھنے والے شخص
نے اپنا ہاتھ رجم کی آیت پر رکھ لیا
اس سے پہلے اور اس کے بعد کی
عبارت پڑھ دی اس سے حضرت
عبداللہ بن سلام نے فرمایا کہ تو (یہاں
سے) اپنا ہاتھ اٹھا تو (دیں) دیکھا
کہ آیت رجم موجود تھی۔ کہنے لگا کہ اے
محمد! عبداللہ بن سلام نے ٹھیک
کہا ہے اس میں رجم کے حکم کی آیت
موجود ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے ان دونوں کو سنگسار
کر دینے کا حکم فرمایا اور انہیں سنگسار کر دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ
نے فرمایا میں نے اس مرد کو دیکھا کہ وہ عورت پر جھکتا تھا اور اسکو پتھر
لگنے سے بچاتا تھا۔

(۲) مالك عن يحيى بن سعيد عن
بن المسيب ان رجلا من اسلم جاء الى
ابى بكرؓ الصديق فقال له ان الاخر زنى فقال
له ابوبكر هل ذكرت هذا لاحد غيرى
فقال لا فقال له ابوبكر
فتب الى الله واستتر بستر
الله فان الله يقبل التوبة

اسلمی قبیلہ کے ایک شخص حضرت ابوبکر
صدیق رضؓ کے پاس آئے اور کہا کہ اس
تباہ حال نے زنا کا ارتکاب کیا ہے
اس سے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ
کیا تم نے اس بات کا ذکر میرے سوا
کسی سے کیا ہے۔ انہوں نے کہا

ؔلہ مسئلہ: اگر ایسے گناہ کی کسی کو خبر نہ ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ خدا نے یہ پردہ
ہے۔ ایسی صورت میں اسے کسی کو اپنا گناہ نہ بتلانا چاہیئے۔ بس خداوند کر
[illegible] رہنا چاہیئے۔

عن عبادة فلم تقتربه لا نفسه حتى اتى عمر بن الخطاب فقال لهٗ مثل ما قال لابی بکر فقال لہٗ عمر مثل ما قال لهٗ ابو بکر قال فلم تقرره نفسه حتى اتى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقال لهٗ ان الآخر زنى قال سعيد فاعرض عنه رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ثلث مرات كل ذلك يعرض عنه رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حتى اذا اكثر عليه بعث رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الى اهله فقال هل يشتكى ء ابه جنة فقالوا يا رسول اللّٰه واللّٰه انهٗ الصحيح فقال لـه رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ابكر ام ثيب فقال بل ثيب يا رسول اللّٰه فامر به رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم - ترجم -

نہیں ابو بکر رض نے فرمایا کہ اللہ سے توبہ کرو اللہ نے تمہارے گناہ پر جو پردہ رکھا ہے اس سے اپنے آپکو ڈھانپے رکھو - کیونکہ اللہ تعالے اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے - لیکن انہیں ان کے دل نے چین نہ لینے دیا حتی کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور جیسی گفتگو ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کی تھی وہی گفت وشنید حضرت عمر سے بھی ہوئی - سعید بن المسیب نے فرمایا کہ پھر انہیں ان کے دل نے چین نہ لینے دیا حتی کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے - آپ سے عرض کیا کہ اُخِرْ نے زنا کا ارتکاب کیا ہے - حضرت سعید نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے رُخ پھیر لیا تین دفعہ ایسے ہی کیا - ہر دفعہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے مُنہ پھیرتے رہے حتیٰ کہ جب انہوں نے زیادہ ہی کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر آدمی بھیجا دریافت فرمایا کہ کیا انہیں کوئی دماغی شکایت ہے ؟ کیا انہیں جنون کا اثر ہے ؟ گھر والوں نے عرض کیا کہ اللہ کے سچے رسول کوئی ایسی بات نہیں ہے خدا کی قسم وہ صحیح العقل ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت فرمایا کہ یہ غیر شادی شدہ ہیں یا شادی شدہ ہیں انہوں نے

کہا کہ شادی شدہ ہیں تب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے رجم کا حکم دیا تو رجم کر دیا گیا۔

(۳) مالك عن يحيى بن سعيد عن سعيد بن المسيب انه قال بلغني ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لرجل من اسلم يقال له هزال يا هزال لو سترته بردائك لكان خيرا لك قال يحيى بن سعيد فحدثت بهذا الحديث في مجلس فيه يزيد بن نعيم بن هزال الاسلمي فقال يزيد هزال جدي وهذا الحديث حق۔

حضرت سعید بن المسیبؒ نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلمی صحابی سے فرمایا جنہیں ہزالؓ کہا جاتا تھا کہ اے ہزال! اگر تم اسے (ماعزؓ) کو اپنی چادر سے چھپا لیتے تو یقیناً یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا یحیی بن سعید نے کہا یہ حدیث ایسی مجلس میں سنائی گئی جس میں نعیم بن ہزال اسلمی موجود تھے تو یزید نے کہا کہ ہزال میرے دادا ہیں اور ان کے بارے میں یہ حدیث بالکل درست ہے۔

(۴) مالك عن ابن شهاب انه اخبره ان رجلا اعترف على نفسه بالزنا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وشهد على نفسه اربع مرات فامر به رسول الله صلى الله عليه وسلم فرجم۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ: ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ایک صحابی شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنے بارے میں زنا کا اقرار کیا اور اس نے اپنے بارے میں چار دفعہ گواہی دی اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم کر دینے کا حکم دیا تو اسے رجم کر دیا گیا۔

قال ابن شهاب فمن اجل ذلك

ابن شہاب نے فرمایا کہ اسی لئے

مسئلہ: اگر کسی کو کسی شخص کے بارے میں ایسے گناہ کا پتہ چلے تو اسے چھپائے ہی رکھنا چاہیئے۔ اور چھپانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

يؤخذ الرجل باعترافه على نفسه -

یہ قانون ہو گیا کہ آدمی کو اپنے بارے میں اعتراف کرنے پر اس سے مؤاخذہ کیا جاتا ہے۔

مالك عن يعقوب بن زيد بن طلحة عن ابيه عن عبد الله بن مليكة انه اخبره ان امرأة جاءت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فاخبرته انها زنت وهي حامل - فقال لها رسول الله صلى الله عليه وسلم اذهبي حتى تضعي فلما وضعته جاءته فقال اذهبي حتى ترضعيه فلما ارضعته جاءته فقال اذهبي فاستودعيه قال فاستودعته ثم جاءت فامر بها فرجمت .

موطأ امام مالك ص ٦٨٣ وص ٦٨٤

حضرت عبداللہ بن ملیکہ نے بیان فرمایا کہ ایک عورت نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بتلایا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اور وہ حاملہ تھی - اس سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ حتیٰ کہ بچہ کی ولادت ہو - جب بچہ پیدا ہو گیا تو وہ پھر حاضر ہوئی آپ کی دفعہ فرمایا کہ جاؤ حتیٰ کہ اس کے دودھ پینے کی مدت پوری ہو - جب اس نے رضاعت کی مدت پوری کر لی تو حاضر ہوئی ارشاد فرمایا کہ جاؤ اسے کسی کے سپرد کر آؤ انہوں نے بتلایا کہ اس نے بچہ کسی کے سپرد کیا پھر آئی تب آپ نے اس کے بارے میں حکم فرمایا تو اسے رجم کر دیا گیا۔

مالك عن ابن شهاب عن عبيد الله بن عبد الله بن مسعود عن ابي هريرة وزيد بن خالد الجهني انهما اخبراه ان رجلين اختصما الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال احدهما

حضرت ابوہریرہ اور زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہما نے بتلایا کہ دو آدمی جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا جھگڑا لائے ایک نے کہا اے رسول اللہ ہمارے ما بین کتاب

يارسول الله اقض بيننا
بكتاب الله وقال الآخر
وهو افقههما اجل يارسول
الله فاقض بيننا بكتاب الله
وائذن لي ان اتكلم قال
تكلم فقال ان ابني كان
عسيفا على هذا فزنى
بامرأته فاخبروني ان
على ابني الرجم فافتديت
منه بمائة شاة وبجارية
لي ثم اني سألت اهل العلم
فاخبروني ان على ابني
جلد مائة وتغريب عام
وانما الرجم على امرأته فقال
رسول الله صلى الله عليه وسلم
اما والذي نفسي بيده
لاقضين بينكما بكتاب
الله اما غنمك وجاريتك
فرد عليك وجلد ابنه مائة
وغربه عاما وامر انيس
الاسلمي ان يأتي امرأة الآخر
فان اعترفت رجمها قال
فاعترفت فرجمها۔

اللہ سے فیصلہ فرما دیجئے اور دوسرے
نے جو ان دونوں میں زیادہ سمجھدار
تھا کہا جی ہاں اے رسول خدا ہمارے
مابین کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ
فرما دیجئے اور مجھے اجازت دیجئے
کہ میں بات عرض کروں ارشاد فرمایا
کہ بات کرو تو اس نے کہا کہ میرا بیٹا
اسکے یہاں اجرت پر کام کرتا تھا تو
اس نے اسکی بیوی سے زنا کیا
تو مجھے لوگوں نے بتلایا کہ میرے بیٹے
پر رجم کی سزا جاری کی جائے گی میں
نے اس حد سے بچانے کے لئے ایک
سو بکریاں اور اپنی ایک باندی اس
کے عوض فدیہ میں دیں ۔ پھر میں
نے اہل علم سے دریافت کیا تو انہوں
نے یہ بتلایا کہ میرے بیٹے پر سو کوڑے
اور ایک سال جلا وطنی آتی ہے اور
رجم اسکی بیوی پر آتا ہے ۔ جناب
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا قسم اس ذات کی جس کے
قبضہ میں میری جان ہے میں یقیناً
تمہارے مابین کتاب اللہ سے فیصلہ
دوں گا ۔ تیری بکریاں اور باندی
تو تو ہی واپس لے لے اس کے بیٹے کے سو کوڑے لگوائے اور اسے ایک
سال کے لئے جلا وطن کیا اور اُنیس اَسلمی سے فرمایا کہ دوسرے شخص
کی عورت کے پاس جائیں (اس سے دریافت کریں) اگر وہ اعتراف کر

تواسے رجم کردیں اس نے اعتراف کرلیا تو اسے رجم کردیا ۔

قال مالك والعسيف الأجير — امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عسیف اجیر کو کہتے ہیں ۔

(۷) مالك عن سهيل ابن ابي صالح عن ابيه عن ابي هريرة ان سعد بن عبادة قال لرسول الله صلى الله عليه وسلم ارأيت لو اني وجدت مع امرأتي رجلا امهله حتى آتي باربعة شهداء فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم نعم ۔

حضرت سعد بن عبادۃ (جو سردار قوم تھے) نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں اپنی عورت کے ساتھ کسی مرد کو دیکھوں تو کیا اسے اس حالت میں چھوڑ کر چار گواہ لاؤں جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ "ہاں"

یعنی اگر گواہ نہ ملیں گے تو عورت پر حد رجم نہ جاری کی جائے گی ـــ بلکہ یا تو شوہر اسے طلاق دیدے یا فاسقی کے یہاں دعوے کرے تو ایسی صورت میں لعان کرایا جائے گا۔

(۸) مالك عن ابن شهاب عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود عن عبد الله بن عباس قال سمعت عمر بن الخطاب يقول الرجم في كتاب الله حق على من زنى من الرجال والنساء اذا احصن اذا قامت عليه البينة او كان الحبل او الاعتراف ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے سنا ہے ۔ کہ وہ فرماتے ہیں: رجم کتاب اللہ میں حق ہے یہ اس پر جاری ہوگا جو زنا کا ارتکاب کرے مرد ہو یا عورت جبکہ وہ محصن (شادی شدہ) ہو جب گواہ گواہی دیں یا حمل پایا جائے یا ان میں سے

کوئی خود اعتراف کرے ۔

(۹) مالک عن یحیی بن سعید عن سلیمان بن یسار عن ابی واقد اللیثی ان عمر بن الخطاب اتاہ رجل وھو بالشام فذکر لہ انہ وجد مع امرأتہ رجلا فبعث عمر بن الخطاب ابا واقد اللیثی الی المرأۃ یسالھا عن ذلک فاتاھا وعندھا نسوۃ حولھا فذکر لھا الذی قال زوجھا لعمر بن الخطاب واخبرھا انھا لا تؤخذ بقولہ وجعل یلقنھا اشباہ ذلک لتنزع فابت ان تنزع وتمت علی الاعتراف فامر بھا عمر فرجمت ۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے تو ایک شخص آیا اس نے آپ سے ذکر کیا کہ اس نے اپنی بیوی کے پاس ایک مرد کو دیکھا ہے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو واقد اللیثی کو عورت کے پاس بھیجا کہ اس واقعہ کے بارے میں اس سے حال دریافت کریں وہ وہاں پہنچے تو اس عورت کے گرد اور عورتیں بھی تھیں انہوں نے اس کے شوہر کی بات جو اس نے حضرت عمرؓ سے کہی تھی نقل کی اور اسے یہ بتلایا کہ اس سے (محض) اس کے شوہر کے کہنے پر گرفت نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح کی اور باتیں وہ اس سے اس لئے کرتے رہے کہ وہ اعتراف زنا سے رجوع کرلے لیکن وہ اقرار زنا پر ہی مکمل طرح جمی رہی آخرکار حضرت عمرؓ نے حکم دیا تو اسے رجم کردیا گیا ۔

(۱۰) مالک عن یحیی بن سعید عن سعید بن المسیب قال لما صدر عمر بن الخطاب من منی اناخ بالابطح ثم کوم کومۃ بطحاء ثم طرح علیھا رداءہ فاستلقی ثم

حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے بعد منی سے واپس ہوتے تو انہوں نے ابطح نامی میدان میں پڑاؤ ڈالا پھر انہوں نے ایک ریت اور پتھریلی

مد يديه الى السماء فقال
اللّٰهم كبرت سنى وضعفت
قوتى وانتشرت رعيتى
فاقبضنى اليك غير مضيع
ولا مفرط ثم قدم المدينة
فخطب الناس ثم قال ايها الناس
قد سنت لكم السنن وفرضت
لكم الفرائض وتركتم
على الواضحة الا ان تضلوا
بالناس يمينا وشمالا وضرب
باحدى يديه على الاخرى
ثم قال اياكم ان تهلكوا
عن اية الرجم ان يقول
قائل لا نجد حدين فى كتاب
الله فقد رجم رسول الله
صلى الله عليه وسلم ورجمنا
والذى نفسى بيده لولا
ان يقول الناس زاد عمر فى
كتاب الله لكتبتها الشيخ
والشيخة اذا زنيا فارجموهما
البتة فانا قد قرأناها قال
يحيى بن سعيد قال سعيد
بن المسيب فما انسلخ ذوالحجة
حتى قتل عمر بن الخطاب
رحمه الله - قال مالك :

کے) ڈھیر کو درست طرح بنایا پھر
اس پر اپنی چادر ڈالکر لیٹ گئے پھر
آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھاکر
دعا کرنے لگے کہ اے اللہ! میں
کبیرالسن ہوگیا ہوں اور میری قوت
کمزور ہوگئی ہے میری رعایا پھیل
گئی ہے (رعایا میں انتشار ہے) -
مجھے اپنے پاس بلالے نہ میں (لوگوں
کی شرارت سے) ضائع ہونے
(ان پر) زیادتی کروں - پھر مدینہ منورہ
آئے تو خطبہ ارشاد فرمایا! آپ نے
اس بیان میں پھر یہ بھی فرمایا کہ اے
لوگو! تمہارے لئے سنتیں مقرر کی
گئی ہیں اور فرائض بھی مقرر کئے
گئے ہیں - اور تمہیں واضح (صاف
اور کھلے) راستہ پر چلتا چھوڑا گیا
ہے سوائے اس کے کہ تم اور لوگوں
کی وجہ سے دائیں بائیں چل کر گمراہ
ہونے لگو - یہ فرماتے وقت آپ نے
اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا -
پھر فرمایا کہ دیکھو آیت رجم کے بارے
میں بچتے رہنا کہیں اس مسئلہ میں
ہلاکت میں نہ پڑ جانا - کہ کہیں
کوئی کہے کہ کتاب اللہ میں ہمیں
(ایک حد یعنی کوڑے تو ملتے ہیں -

قولہ الشیخ والشیخۃ یعنی الثیب والثیبۃ فارجموھا البتۃ -

دوسری حد رجم) دو حدیں ہم اس میں نہیں پاتے کیونکہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حد رجم جاری فرمائی ہے اور ہم نے بھی رجم کیا ہے قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر لوگ یہ نہ کہیں کہ عمر نے کتاب اللہ میں اضافہ کر دیا تو میں اس آیت کو قرآن میں لکھدیتا کہ شادی شدہ مرد اور عورت جب زنا کا ارتکاب کریں تو انہیں ضرور رجم کر دو - کیونکہ ہم نے اسے آیت قرآنی کی صورت میں پڑھا ہے -

سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ ذوالحجہ نہ گذرنے پایا تھا کہ حضرت عمر شہید کر دیئے گئے - امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ الشیخ اور الشیخۃ سے مراد شادی شدہ ہیں کہ انہیں ضرور رجم کر دو -

قرآن پاک کی منسوخ التلاوت آیات بعد میں بھی وہ صحابہ پڑھتے ہی رہے ہیں جنہیں ان کے منسوخ ہونے کا علم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں نہیں ہو سکا - یہ آیت بھی ایسی ہی ہے جیسے پڑھا جاتا رہا ہے : اس کے بارے میں روایات آئیں گی -

(۱۱) مالک انہ بلغہ ان عثمان بن عفان اتی بامرأۃ قد ولدت فی ستۃ اشھر فامر بھا ان ترجم فقال لہ علی بن ابی طالب لیس ذلک علیھا فان اللہ یقول فی کتابہ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا وقال وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جسکے چھ ماہ میں بچہ پیدا ہو گیا تھا آپنے اسے رجم کر دینے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ (کو علم ہوا) انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اس عورت پر رجم لازم نہیں آتا - کیونکہ حق تعالے نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے : کہ اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ ہیں۔

فالحمل يكون ستة اشهر فلا رجم عليها فبعث عثمان في اثرها فوجدها قد رجمت۔

موطا امام مالك الى ص ۲۸۶

۱۵ اور ارشاد فرمایا: کہ مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جو شیرخوارگی کی مدت پوری کرنے کا ارادہ کرے۔ (ان دونوں آیتوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ بچے کی پیدائش چھ ماہ میں ہوجائے اور دودھ پلانے کی مدت دوسال ہو اس طرح تیس ماہ میں دونوں باتیں جمع ہوجائیں لہٰذا انہوں نے کہا کہ حمل چھ ماہ کا بھی ہوتا ہے۔ اسلئے اس عورت پر رجم لازم نہیں آتا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسکے پیچھے آدمی بھیجا وہ پہنچا تو اسے رجم شدہ پایا۔

یہاں تک جو روایات مؤطا امام مالک رحمہ اللہ سے اس موضوع پر لکھی گئی ہیں ان کی تائیدی روایات مصنف ابن ابی شیبۃ سے لکھی جارہی ہیں! ابن ابی شیبۃ رحمہ اللہ کا تعارف آگے آرہا ہے — ابن ابی شیبۃ رح عبدالرزاق رح، ابوداؤد طیالسی رح اور مسند احمد رح کی روایات اس لئے تحریر کررہا ہوں کہ یہ کتابیں عام طور پر میسر نہیں ہیں یکجا ہوجانے سے سہولت ہوگی اسی لئے مع سند لکھی جارہی ہیں

حدثنا ابو بكر قال حدثنا ابن عيينة عن الزهري عن عبيد الله عن ابن عباس قال قال عمر قد خشيت ان يطول بالناس زمان حتى يقول القائل ما نجد الرجم في كتاب الله فيضلوا بترك فريضة انزلها الله الا وان الرجم حق اذا احصن الرجل او قامت البينة او كان حمل او اعتراف وقد قرأتها الشيخ والشيخة اذا زنيا فارجموهما البتة رجم رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجمنا بعده۔ قيل لسفيان رجم رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ قال نعم۔

المصنف لابن ابي شيبة ج ۳ ص ۸۳۳

حدثنا ابوبکر قال حدثنا یزید بن ھارون قال اخبرنا داؤد عن سعید بن المسیب عن عمر قال رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجم ابوبکر ورجمت انا ۔

ابن ابی شیبۃ ج ۳ ص ۳۴۸

حدثنا ابوبکر قال حدثنا ابن ادریس عن اشعث عن علی بن زید عن یوسف بن مہران عن ابن عباس قال قال عمر الرجم حد من حدود اللہ فلا تخدعوا عنہ و ذلک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجم ورجم ابوبکر ورجمت انا ۔ ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۳۴۸

مالکی مسلک کی معتبر ترین کتاب المدونۃ الکبریٰ میں فقہ مالکی کے مسائل جمع کیے گئے ہیں ۔ اس میں رجم کے حد ہونے کا کتاب الحدود میں متعدد جگہ ذکر ہے اس کے علاوہ ایک حصہ خالصۃ "کتاب الرجم کے عنوان سے لکھا گیا ہے اس میں ہے کہ سحنون نے ابن القاسم سے ۔ (جو کہ امام مالکؒ کے براہ راست شاگرد اور ان کے حامل مسلک تھے) دریافت کیا

قلت ھل یجتمع الجلد و الرجم فی الزنا علی الثیب فی قول مالک قال لا یجتمع علیہ والثیب حدہ الرجم بغیر جلد والبکر حدہ الجلد بغیر رجم ۔ بذالک مضت السنۃ ۔ المدونۃ الکبریٰ الجزء الخامس عشر ۔ ج ٦ ص ۲۳٦	کیا امام مالک رحمہ اللہ کے قول میں ثیب (شادی شدہ) پر حد کوڑے اور رجم جمع ہوں گے انہوں نے فرمایا کہ اس پر دو چیزیں جمع نہ ہوں گی اور ثیب کی حد رجم ہے بغیر کوڑوں کے اور کنوارے کی حد کوڑے ہیں بغیر رجم کے یہی طریقہ چلا آرہا ہے ۔

(جاری ہے)

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے حلقۂ احباب کی خدمت میں ایک گذارش!

ملت کے تین غم خوار و جاں نثار ساتھی: ۱۔ مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ، ۲۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ ۳۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ———— حضرت شیخ الہندؒ کے شب چراغ مولانا سید انور شاہ صاحبؒ نے اِن اصحابِ ثلاثہ کو ملت ہند و پاک و بنگلہ و عالم اسلام اور انسانیت کی خدمت کے لئے تیار کر کے عطا فرمائے تھے

انگریز کے آخری دور پھر تقسیم ملک کے ہولناک، تباہ کن دور میں حق تعالیٰ جل شانہٗ نے مجاہدِ ملت سے جو کام کرایا اور جن حالات میں! اس کی مثالیں عالم اسلام میں بہت کم ہیں ——— یہ دونوں رفیق ان کے آخری سانس تک اور ان کے بعد (یعنی مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ کے بعد) اپنے آخری سانس تک ملت کی غم خواری اور آبیاری میں ڈوبے رہے۔

مفتی صاحب کی وفات کے بعد اکبر آبادی صاحب سے جی چاہتا تھا کہ تینوں کی کہانی لکھیں۔ کچھ شروع بھی کر دی تھی لیکن یہ بھی بہت جلد اپنے دونوں محبوب ساتھیوں سے جا ملے۔ اس عریضے کے ذریعے تعلق والوں سے درخواست کرتا ہوں جو اس کے اہل ہیں، کہ ان پر لکھیں۔ ندوۃ المصنفین دہلی اب ان کی عظیم یادگار ہے۔ خدا اسے سرسبز و شاداب رکھے۔ رسالہ "برہان" کا جو مفتی نمبر نکلنے والا تھا اب وہ تینوں کا نمبر ہونا چاہیئے۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب دام مجدہم کے پرانے چراغوں میں بھی ان حضرات کو ہونا چاہیئے، ان کے تعلق و خدمت کا یہ حق ہے

والسلام

خادم، آفتاب فریدی،

فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ مراد آباد-۲۱

(تجارت)

ناظمین صلوٰۃ اور مسلمانوں سے استدعاء

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دنیا میں اِس وقت توحید و سنت کے ماننے والوں کی تعداد اَن گنت ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے والے بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ اور وہ بھی جو جہاں ہے اکیلا ہے۔ اور دوسروں سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ اور ان میں اتحاد و تعاون اور کوئی رابطہ نہیں۔ بہت سے تو بے عملی۔ بدعت۔ شرک۔ غیر اللہ کی اطاعت و پوجا۔ فحاشی۔ بے حیائی۔ رشوت خوری۔ بد دیانتی۔ ذاتی خواہشات۔ رسومات اور معصیتوں کے تند و تیز طوفانوں میں گھر کر ان کی نذر ہو چکے ہیں۔ اور جو قلیل تعداد راسخ العقیدہ لوگوں کی اِن برائیوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ وہ خود جماعتوں۔ گروہوں مذہبی فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہو کر طاغوتی قوتوں کی آلہ کار بنی ہوئی ہے۔ اور جس دین کی داعی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس کے احکام سے منحرف ہوتی ہوئی مزاحم قوتوں کے آگے سرنگوں ہوتی جارہی ہے۔ اگر یہی لیل ونہار رہے تو وقت زیادہ دور نہیں جب ان باقی ماندہ توحید و سنت کے ماننے والوں کے لیے صراطِ مستقیم پر قائم رہنا محال ہو جائے گا اور یہ خطِ ارضی فسق و فجور کی آماجگاہ بن جائے گا۔

قبل اِس کے کہ مدت مہلت ختم ہو۔ حالات کا دھارا آپکو اپنے ساتھ بہالے جائے، آپ اللہ کی پوری کتاب اور سنتِ رسُول کو اپنی زندگی کا جزو بنالیں۔ اپنے ہر عمل کے شروع ہونے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ آپ کا عمل کب کیسے۔ کس طرح اور کن حدود و قیود کے اندر ہونا چاہیئے۔ اگر اپنے تمام معاملات میں قرآن و حدیث سے راہ نمائی اور رشد و ہدایت حاصل کریں اِس خود سپردگی کے بعد آپ اللہ کی کتاب اور سنتِ رسُول کی مکمل پیروی کرنے والوں کا ساتھ دے کر دین کی سربلندی۔ خلافت ارضی کے حصول اور دنیا کو امن و آشتی کا پیغام دیں تو وہ دن دور نہیں جب آپ منزلِ مراد سے ہم کنار ہو جائیں گے۔ اِس کے بغیر آپ کے ایمان و یقین اور آخرت میں جواب دہی کا احساس نامکمل اور ادھورا رہے گا اور آپ دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے میں رہینگے۔

اگر آپ کو قرآن و سنت کی تعلیمات پر اور آخرت کی سزا و جزا پر یقین محکم ہے۔ تو پھر گروہی اور طبقاتی اختلافات کو ترک کر اپنے اختلافی مسائل اور خیالات فاسدہ کی ترویج واشاعت اور ان کی اطاعت کے اصرار کی بجائے اپنے آپ کو اللہ کے بندوں سے منسلک کر کے اللہ اِس

ے رسُول اور دین کے دشمنوں سے دست بردار ہوکر اللہ کی کتاب اور سنتِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم
مضبوطی سے تھام لیجئے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ آپکو قعرِ ذلت سے نکال کر آپ کو تمکن فی الارض عطا کرے
ر آخرت میں بھی اپنے انعام و اکرام سے نوازے۔ ہمیں چاہیئے کہ بحیثیت مسلمان ہم اپنا ایمان،
۔ آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ کے فرشتوں۔ اس کی کتابوں۔ اور رسولوں، روزِ آخرت
ا اچھائی اور بُرائی کے مِن جانب اللہ ہونے اور روزِ قیامت دوبارہ زندہ ہوکر اپنے تمام افعال و
دار کے حساب دینے پر پختہ یقین رکھیں پھر اس دعوت کو عزیز و اقربا پر۔ رفقاءِ کار۔ ملنے
نے والوں اور خلقِ خدا کو پہنچائیں تاکہ دنیا سے ظلم و جور ختم ہو اور عدل و انصاف قائم ہو۔ عدل و
صاف تو صرف وہی ہے جو خدا اور رسُول کی قائم کردہ حدود کے اندر ہو۔ اور جو بات مقرر کردہ
دود سے باہر ہو وہ تو ظلم و زیادتی اور عدوان ہے۔ ہمارے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے آثارِ قدیمہ
النشانِ عبرت ہیں جو ہمارے اندر یقین محکم پیدا کر سکتے ہیں۔ گردشِ لیل و نہار اور موسمی تغیرات
ر آپ تدبر اور غور و فکر کریں تو نہ صرف آپکا یقین محکم ہو جائے گا بلکہ آپ کے ہاتھ وہ رہنمائیں آ
یں گی جو آپ کی اصلاح اور فلاح و کامرانی کی ضامن ہونگی۔

اگر آپ اپنی فلاح چاہتے ہیں تو پھر آپ قرآن و سنت کی تعلیمات پر توجہ دیں۔ علم حاصل
ں اور تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کریں۔ بغیر عمل کے آپ کی تعلیم اور علم
ں اور ادھورا رہے گا۔ ہر اُس کام کو اختیار کریں۔ جس کے کرنے کا حکم اللہ اور اس کے رسُول
دیا ہے۔ اور ان کاموں سے بچیں جن سے منع کیا گیا ہے۔ جس بات پر خود عمل کریں اس پر اپنے
ں و اقربا۔ بیوی بچوں کو راغب کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ سربراہِ خاندان کی حیثیت سے
سے ان کے بارے بھی پرسش ہوگی۔ اپنے اہلِ محلہ سے جو لوگ آپ سے اللہ اور رسُولؐ کی
ت کرتے ہوئے آپ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوں۔ ان سے مل کر اپنی بستی میں زیادہ سے
لوگوں تک اپنی بات پہنچائیں اللہ اور رسُول کے احکام کو سکھانے اور ان پر عمل کرنے
مدد کریں۔ اپنے رفقاءِ کار اور کاروبار میں بھی خدا اور رسُول کی پیروی کریں تاکہ آپ حلال کی کمائی
ل کر کے خود کو اپنے اہل و عیال کو حرام کمائی سے بچائیں کیونکہ حرام کمائی سے آپ کے تمام
ل اور عبادات اکارت جاتی ہیں۔

یاد رکھیں کہ خالص دین کی دعوت سے کچھ لوگ خدا کے بندوں کو راہِ خدا پر چلنے ــــ
تے ہیں اور روکتے ہیں۔ اِن کے ہر اچھے عمل میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان کی بداعمالیوں پر اس
ت تک صبر و استقامت سے رہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ایسے حالات پیدا نہ کر دے۔ جن
ہ وہ اپنے شر کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں اور یہ زمین فساد سے خالی نہ ہو جائے۔

آپ کے صدق دل سے اللہ اور رسُول کی اطاعت پر رضامندی کے بعد ہی اتحاد و تعاون کی راہوں کو فروغ ملے گا اور پھر خدا اور رسُول کے ماننے والے اس قابل ہو سکیں گے کہ ظلمتوں سے نوعِ انسانی کو نکال کر صراطِ مستقیم پر گامزن کر سکیں۔ آگے بڑھئے اللہ آپ کا حامی و ناصر ہے امید رکھیں کہ ان شاءاللہ اللہ تعالٰے آپ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا اور اس کی مدد ہر جگہ ہر حال میں آپ کے ساتھ ہوگی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ؕ

" اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے "

دعاگو۔ مہتاب الدین مغل۔ کراچی

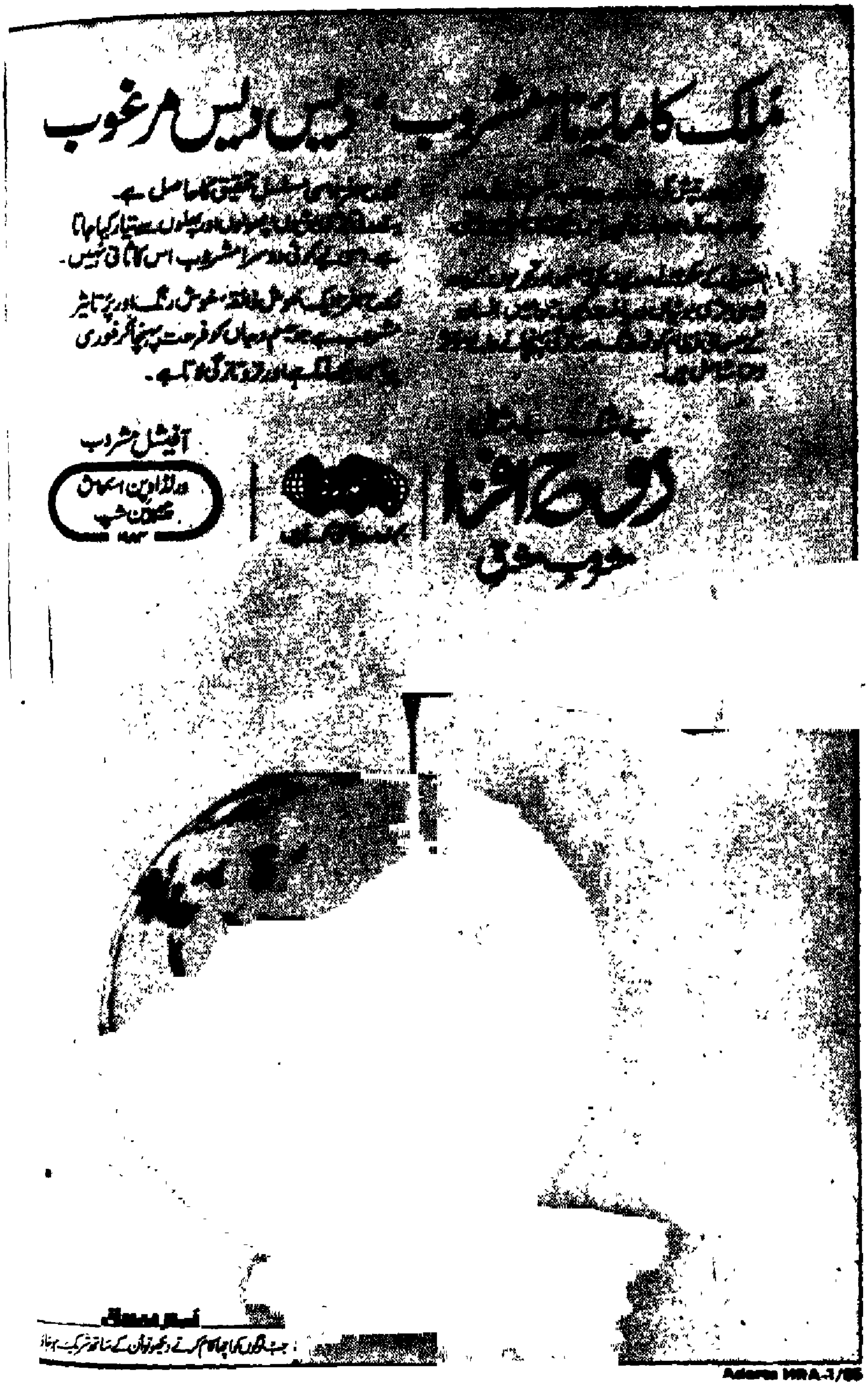
بقیہ: الھدٰی

ہے۔ اگر ہم اس میں سے کچھ مال اسؐ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہیں تو وہ ہماری حوصلہ افزائی کے لئے اسے اپنے ذمہ قرض سے تعبیر فرماتا ہے۔

حضرات! اس نشست کے اختتام پر ایک مرتبہ پھر ہمیں صمیمِ قلب اور حضورِ قلب کے ساتھ اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے دعا کرنی چاہیئے کہ اے اللہ! ہمارے دلوں میں ایمان کا حقیقی نور عطا فرما دے تاکہ ہماری سیرتوں میں، ہمارے کردار میں، ہماری شخصیتوں میں ایمان کے ثمرات، ایمان کے مضمرات پورے طور پر جلوہ گر ہوں اور ہم تیرے صاحبِ ایمان بندے کہلانے کے مستحق ہو سکیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔


COCA-COLA


ملک کا مایۂ ناز مشروب · دیس دیس مرغوب
آفیشل مشروب
روح افزا

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین

چند یادیں —
ید احمد اکبرآبادی کی ڈاکٹر اسرار احمد ک

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن —— لاہور

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۳۴ | اگست ۱۹۸۵ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۸

مشمولات

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد

طابع
چودھری رشید احمد

مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیمِ اسلامی
فون : ۸۵۲۶۱۱

سب آفس : ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

کراچی دفتر کا فون نمبر
۲۱۶۵۸۶

رفقاءِ تنظیمِ اسلامی توجہ فرمائیں:

تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت کے اجلاس منعقدہ ۲ مئی ۸۵ء میں فیصلہ کیا گیا تھا

تنظیم کی دعوت کی توسیع، رفقاء کی تربیت اور رابطہ باہمی کے فروغ کیلئے

کُل پاکستان سالانہ اجتماع

کے علاوہ سال ۸۵-۸۶ء کے دوران کم از کم چار

علاقائی اجتماعات

منعقد کئے جائیں اور ہر رفیق تنظیم اپنے علاقائی اجتماع کے علاوہ کم از کم ایک اور اجتماع میں شرکت کرے

اس سلسلے کا پہلا اجتماع ان شاء اللہ العزیز

۵ تا ۸ اگست ۸۵ء راولپنڈی میں منعقد ہوگا

جسمیں شمالی پنجاب، صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے رفقاء شریک ہونگے

اور دوسرا اجتماع ان شاء اللہ

۱۳ تا ۱۸ ستمبر ۸۵ کوئٹہ میں منعقد ہوگا

بقیہ دو اجتماعات ان شاء اللہ العزیز نومبر میں ملتان اور حیدرآباد میں منعقد ہوں گے

تنظیم اسلامی شمالی پنجاب، صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کا

دعوتی و تربیتی اجتماع

اِن شاء اللہ العزیز

۵ تا ۸ اگست ۱۹۸۵ء

فیض الاسلام کمپلکس، فیض آباد، مری روڈ، راولپنڈی

میں منعقد ہوگا جس میں

روزانہ بعد نمازِ مغرب **امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد** کا خطاب عام ہوگا

اور صبح ۸ بجے سے دن کے ایک بجے تک تربیتی پروگرام جاری رہیں گے!

(نوٹ: سوموار ۵ اگست کی شام کا خطاب عام حسب معمول کمیونٹی سنٹر، آب پارہ اسلام آباد میں ہوگا۔ اور باقی تمام پروگرام فیض آباد ہی میں منعقد ہوں گے۔)

جملہ رفقاءِ تنظیم سے درخواست ہے کہ اولاً ۵ اگست کی

دوپہر تک ورنہ رات تک لازماً فیض آباد پہنچ جائیں

المعلن: (چوہدری) غلام محمد، قیم تنظیمِ اسلامی پاکستان

ادارہ

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

عرضِ احوال

ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ مطابق اگست ۸۵ء کا شمارہ چند اہم مضامین پر مشتمل قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ ان مضامین کی طوالت کے باعث اس ماہ نہ "الہدیٰ" کی قسط شاملِ اشاعت ہو سکی اور نہ "حقِ رحم" کی جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

اس شمارے کا جواہر پارہ وہ گفتگو ہے جو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ نے ۲۳ اپریل برصغیر پاک و ہند کے جید عالمِ دین، محقق و مفکر، متعدد علمی و تاریخی کتب کے مصنف، ندوۃ المصنفین دہلی کے یکے از بانیان، ماہنامہ "برہان" دہلی (بھارت) کے مدیرِ اعلیٰ، سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ اور صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی (بھارت) مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ و نوّر مرقدہٗ سے ان کی اس دارِ فانی سے دار البقاء کی طرف مراجعت سے قریباً ایک ماہ قبل کی تھی۔ یہ اغلباً مولانا مرحوم کی آخری مفصل گفتگو ہے جو ریکارڈ ہو گئی ہے۔

دوسرا اہم مضمون "اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم" کے موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے مسلسل خطابات کی تیسری قسط ہے۔ جو صرف انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تفہیم ہی کے لئے مفید نہیں ہو گی۔ بلکہ ان شاء اللہ جب کبھی بھی اللہ تعالیٰ نے کسی مسلم ملک میں "اسلامی انقلاب" کے لئے حالات سازگار فرمائے تو اس سلسلۂ خطابات سے کافی رہنمائی مل سکے گی۔

"افکار و آراء" کے زیرِ عنوان بھی بعض فکر انگیز خیالات قارئین کی نظر سے گزریں گے — توقع ہے کہ بحیثیتِ مجموعی یہ شمارہ قارئین کافی مفید پائیں گے۔

تنظیمِ اسلامی کی مجلسِ مشاورت کے فیصلے کے مطابق ۵ سے ۸ اگست تک تنظیمِ اسلامی کا ایک تربیتی و تنظیمی اجتماع فیض آباد کمپلکس، مری روڈ میں منعقد ہو رہا ہے جس کا تفصیلی اعلان اسی شمارے میں قارئین کی نظر سے گزر چکا ہو گا۔ توقع ہے کہ متعلقہ علاقوں کی تنظیموں کے جملہ رفقاء اور وہ حضرات جو تنظیم کی دعوت سے دلچسپی رکھتے ہیں اس اجتماع میں شرکت کی ہر امکانی کوشش کریں گے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم!

چند یادیں — چند باتیں

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی

ڈاکٹر اسرار احمد سے گفتگو

---

۲۲ اپریل ۸۵ء کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کراچی میں جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور کی عیادت کو تشریف لے گئے تھے۔ بھائی عبدالواحد عاصم صاحب اور راقم الحروف بھی ہمراہ تھے۔ مولانا مرحوم نے بڑی خوش دلی کے ساتھ ہم سب کا خیر مقدم کیا۔ وہ کافی نحیف لاغر اور کمزور نظر آ رہے تھے لیکن چہرے پر طمانیت اور لہجہ صاف تھا۔ البتہ اندازِ گفتگو سے کسی قدر نقاہت کا اظہار ہوتا تھا۔ مولانا نے محاضراتِ قرآنی کی روداد سننے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اختصار کے ساتھ محاضرات کی کارروائی سنائی جس پر مولانا مرحوم نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا اور ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی کہ آپ نے واقعی نہایت جرأت مندانہ اور قابلِ تحسین قدم اٹھایا تھا کہ خود اپنے پلیٹ فارم پر اپنے "تصوّرِ فرائضِ دینی" پر ملک کے نامور علمائے کرام کو تنقید اور اختلاف کرنے یا توثیق و تصویب کی دعوت دی۔ مولانا نے فرمایا کہ اس دور میں جبکہ تحزّب کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی جماعت اپنے پلیٹ فارم پر اپنے مؤیدین اور متفقین کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کو چاہے وہ کتنا ہی بڑا اور مشہور عالمِ دین ہی کیوں نہ ہو تقریر کی اجازت نہیں دیتی۔ جبکہ اس کا کسی اختلافی بات کہنے کا ارادہ بھی نہ ہو اور وہ صرف دینِ مبین کی مثبت دعوت ہی پر اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہو — اس ضمن میں مولانا مرحوم نے چند واقعات بھی سنائے۔

دوسرے دن ۲۳ اپریل کو ہم مرحوم کی خدمت میں ٹیپ ریکارڈر لے کر دوبارہ حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مولانا سے عرض کیا:

مولانا! آپ نے مختلف دینی تحریکوں کو قریب سے دیکھا ہے اور بڑی بڑی شخصیتوں سے آپ کا جو بھی تعلق رہا ہے تو آج کی گفتگو میں اگر کوئی ایسی بات آئے جو ہمارے لئے مفید ہو اور وہ ریکارڈ ہو کر محفوظ بھی ہو جائے تو بہت سوں کے لئے بھی مفید ہوگی۔ ان شاء اللہ! مولانا مرحوم و مغفور نے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا۔ اسے ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ اس گفتگو نے ایک نوع

کے انٹرویو کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کو قریباً لفظ بلفظ کیسٹ سے منتقل کر کے پیش کیا جا رہا ہے البتہ ربط و تعلق کے لئے بعض باتیں توسین میں لکھی گئی ہیں۔

مولانا مرحوم و مغفور کی گفتگو میں بعض اکابر اور بعض دینی تنظیموں کے متعلق تنقیدی و اختلافی باتیں بھی آئی ہیں۔ یہ مولانا مرحوم کی ذاتی آراء ہیں جو بے کم و کاست پیش کی جا رہی ہیں ضروری نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان سے بالکلیہ متفق ہوں۔ مولانا کی اس گفتگو کا کیسٹ محفوظ کر لیا گیا ہے — مولانا مرحوم نے ارشاد فرمایا:

"میری رائے یہ ہے کہ آپ (اپنے کام میں) اللہ کے فضل و کرم سے مخلص ہیں اور آپ نے اپنے اخلاص کا ثبوت دے بھی دیا ہے کہ کسی سے آپ کو کوئی عداوت نہیں ہے، کسی سے آپ کو کوئی رقابت نہیں ہے۔ آپ سب کا احترام کرتے ہیں۔ دین کے کام میں اہلِ علم و فضل کا تعاون چاہتے ہیں۔ لیکن آپ نے جب (کتاب و سُنّت سے ماخوذ) ایک مرتبہ اپنے لئے ایک راستہ طے کر لیا ہے تو میرے خیال میں اب آپ بالکل اِدھر اُدھر مت دیکھئے کہ کون کیا کہتا ہے۔ کون اختلاف اور مخالفت کرتا ہے۔ آپ کا راستہ صحیح ہے۔ آپ اس پر (یکسوئی سے) چلئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اِسے آپ کے لئے باعثِ اجر بنائے"۔

ڈاکٹر اسرار احمد: — جی ہاں۔ اس کے لیے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہوگی۔ باقی یہ کہ جو مختلف (دینی) تحریکیں چلی ہیں اس دور میں، ان کے بارے میں اگر آپ کا مختصر اظہارِ رائے ہو جائے تو وہ ہمارے لیے رہنمائی کا باعث ہوگا۔

مولانا سعید اکبر آبادی: — اس کے متعلق میں پہلے جو کچھ کہہ چکا ہوں، وہ بہت کافی ہے (مراد ہے وہ انٹرویو جو ۱۹ مارچ ۸۵ء کو لیا گیا تھا اور جو "میثاق" بابت مئی ۸۵ء میں صفحہ ۴۹ پر شائع ہو چکا ہے) آپ نے (مختلف تحریکوں کے متعلق) جو کچھ لکھا ہے، میں اس سے بالکل متفق ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریک کے متعلق آپ نے صحیح لکھا ہے کہ وہ اس لیے نہ چل سکی کہ (وقت کے چند جید) علماء اس سے متفق نہیں ہو سکے۔ اور مولانا آزاد بددل ہو گئے اور مولانا مودودی مرحوم کی تحریک کے متعلق میرا شروع میں خیال تھا جب تک کہ وہ سیاست کے میدان میں عملاً نہیں آئے تھے تو ان کی دعوت کا نہج ٹھیک ہی تھا اگرچہ اس میں تشتت تھا۔ لیکن جب وہ سیاست کے میدان میں آئے تو اُسی وقت سے میرا خیال تھا کہ انہوں نے اصل معاملہ بالکل اُلٹا کر دیا۔ سیاست بعد میں آتی ہے۔ دین جو آتا ہے وہ پہلے آتا ہے۔ انہوں نے سیاست کو دین پر مقدم کر دیا اور دین کا جو جائزہ لیا، اس کی تمام اچھائیوں کا اور اس کے محاسن کا وہ محض

ی نقطۂ نظر سے لیا۔ تو (تقسیم ملک سے قبل) جب تک سیاسی کشمکش رہی تو اس وقت تک تو دین کو پھیلانے اور
ر واضح کرنے کے لیے (انہوں نے) اچھا کام کیا۔ لیکن جب وہ سیاست ختم ہو گئی آزادی کے بعد تو انہوں
(پاکستان میں) عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا جس میں ناکامی رہی۔ دین کا اس کی حقانیت کو ثابت
نے کا) کام پس منظر میں چلا گیا اسلام بطور نعرہ رہ گیا اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک تضاد پیدا ہو گیا۔ تو یہ معاملہ
ں دی ہے کہ اس طرح انہوں نے دین کو سیاست کے تابع کر دیا۔ (میرے خیال میں) یہ بڑے افسوس کی بات
ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں (بھارت میں) مولانا وحیدالدین خاں کا معاملہ ہے جو "الرسالہ" نکالتے ہیں۔
ں نے اس کے بالکل برعکس معاملہ کر رکھا ہے اور وہ ہر چیز کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یعنی اسلام کو
ں ایک تبلیغی مذہب سمجھتے ہیں اور سیاست کو دین کا جزو ہی خیال نہیں کرتے ——— رہی پاکستان میں جماعت
ی کی حصولِ اقتدار کی کوششیں ——— حالانکہ اسلامی فتوحات یا تمکن فی الارض جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔
ر بطورِ نتیجہ آتا ہے۔ اس کے لیے کوشش نہیں کی جاتی۔ تم نیک بن جاؤ۔ اللہ (کے دین) کا کام کرو۔ صحابہ رضؓ
ارح سے ہو جاؤ۔ خود بخود تم کو تمکن فی الارض بطور انعام حاصل ہو جائے گا۔ چونکہ بقاءِ اصلح (-RVIK
VIVAL OF THE) جو ہے یہ عام قانون ہے۔ تم اگر با اصلاح ہو گے (مراد ہے صالح ہو گئے) تو اللہ
۔ خود یہ کہا ہے کہ یہ زمین جو ہے تو صالحون اس کے وارث ہوں گے۔ تو گویا مقصود بالذات نہیں ہوتی وہ
ہ بلکہ مقصود بالذات ہوتا ہے، انسان کو انسان بنانا اس کو مومن بنانا اس کو اللہ اور رسولؐ کا مطیع و فرمانبردار
ا۔ لہٰذا تمکن فی الارض مومنین صالحین کو بطور انعام اور بطور نتیجہ ملتا ہے۔ نہ کہ یہ اسے آپ اپنا AIRI
راس کو اپنا مقصد بنا کر چلیں۔ تو یہ تحریکیں جو ہیں اسی وجہ سے ختم ہو گئیں بالکل ——— اور بہت ساری تحریکیں
ر وقتی اور جزوی حالات کو سامنے رکھ کر چلی ہیں۔ جیسے کہ محمد ابن عبدالوہاب نجدیؒ کی تحریک بڑے زور و شور
ے چلی۔ لیکن اس میں صرف مقامی حالات کی اتنی زیادہ رعایت کی ہے اور ان حالات کو رفع کرنے کے لیے
ں قدر انتہائی STEP لیا کہ اس کا جو مقصد تھا وہ آگے چل کر ختم ہو گیا۔ تو یہ تمام تاریخ آپ کے سامنے ہے
ر ماشاء اللہ آپ کا ذہن کھلا ہوا ہے۔ دل میں حوصلہ ہے۔ قلب میں وسعت ہے۔ ان سب چیزوں کو سامنے
ھ کر اگر آپ چلیں گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت اور آپ کی مدد فرمائے گا۔

ڈاکٹر اسرار احمد: ـــ مولانا! کانگریس اور مسلم لیگ کی جو کشمکش تھی اس میں آپ نے بھی کوئی عملی حصہ
ا تھا یا نہیں!۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: ـــ میں نے اس میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ میں کبھی کسی BODY کا
بر نہیں رہا۔ کبھی نہیں۔ میں ان سب سے بالکل الگ تھلگ رہا۔

ڈاکٹر اسرار احمد: اس زمانے میں آپ کہاں تھے یعنی ۴۰ء سے ۴۶ء تک جب یہ کشمکش زیادہ زوروں پر تھی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: میں دہلی میں تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد: کیا ندوۃ المصنفین میں یا کسی مدرسہ میں بھی۔؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: فتحپوری مسجد میں دینی مدرسہ تھا۔ مدرسہ عالیہ کے نام سے۔ وہاں میں بہت پہلے سے مدرس تھا۔ وہاں مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات کی بھی تیاری کرائی جاتی تھی۔ وہیں رہتے ہوئے میں نے مختلف امتحانات دیئے انگریزی کے۔ پھر سینٹ اسٹیفن کالج سے میں نے ایم۔ اے کیا ایم۔ اے کرنے کے بعد کالج نے مجھے وہیں بلالیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد: ایم۔ اے آپ نے کس سن اور کس مضمون میں کیا تھا۔؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: میں نے سنہ ۱۹۳۶ء میں عربی میں ایم۔ اے کیا تھا اور پوری یونیورسٹی میں TOP کیا تھا اس کے بعد غالباً ۱۹۴۱ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کیا جس کے بعد اس سینٹ اسٹیفن کالج نے مجھے مدعو کیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب اسی زمانے میں وہاں طالب علم تھے۔ ۱۹۴۹ء تک میں وہیں رہا۔ اس کے بعد مجھے مولانا ابوالکلام آزاد نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بناکر بھیج دیا۔ وہاں تقریباً صفایا ہوگیا تھا جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے گیا۔ دس برس میں وہاں رہا۔ اس کے بعد مجھے علی گڑھ یونیورسٹی نے بلالیا۔ وہاں ڈین آف اسلامیات کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ آخر تک میں وہاں رہا۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اللہ کے فضل و کرم سے پوری زندگی میں ایک جگہ کے علاوہ ہر جگہ مجھے خود ہی پیش کش ہوئی۔ ایک جگہ میں نے خود کوشش کی تو ناکام رہا۔ وہ تھی الہ آباد یونیورسٹی۔ وہاں شعبہ عربی کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ میں نے درخواست دی دو مرتبہ انٹرویو ہوا۔ میں تھا (عربی میں) فرسٹ کلاس فرسٹ — Thsough out First — اور میرے بالمقابل تھے ڈاکٹر سعید حسن۔ وہ تھے سیکنڈ کلاس۔ مگر یونیورسٹی نے ان کو لے لیا مجھے نہیں لیا۔ ڈاکٹر شفاعت خاں میرے والد کے بہت گہرے دوست تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا۔ تو انہوں نے جاکر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے جو شعبہ عربی کے سربراہ اور ڈاکٹر (شفاعت خاں) صاحب کے گہرے دوست تھے۔ کہا کہ آپ نے یہ کیا ستم کیا تو صدیقی صاحب نے کہا کہ سعید اکبر آبادی بہت قابل ہے لیکن ڈاکٹر سعید حسن میرا شاگرد ہے میں تو انہی کو لوں گا صاف بات ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب جب میں نے یہ دیکھا تو آپ یقین جانئیے کہ میں نے قسم کھالی کہ میں اب کبھی کہیں درخواست نہیں دوں گا۔ جبکہ اتنے بڑے لوگ بھی جانب داری برتتے ہیں۔ چنانچہ پوری زندگی گزر گئی کہ میں نے کبھی کسی جگہ کے لیے درخواست نہیں دی۔ اللہ نے جو جگہ بھی دی؟

مقام بھی دیا سب پیش کشیں تھیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ الہ آباد یونیورسٹی والی یہ بات کب کی ہے۔؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ (کچھ دیر سوچنے کے بعد) ۱۹۳۶ء میں، میں نے ایم۔اے کیا تھا عربی میں۔ یہ اغلباً سن ۳۸ یا ۳۹ کی بات ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ ہمارے ایک عزیز بھی وہاں رہے۔ ڈاکٹر زبیر احمد صاحب۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ ارے وہ تو میرے گھرے دوست رہے ہیں۔ بڑے صاحب علم اور بزرگ شخص تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ وہ میری والدہ کے حقیقی ماموں تھے۔ ایک اعتبار سے میرے نانا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ ماشاء اللہ۔ بہت عمدہ۔ میں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ بڑے اچھے آدمی تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ ان کے اصغر گونڈوی سے بڑے قریبی تعلقات تھے!

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ جی ہاں، جی ہاں۔ اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی اور میرے والد یہ تینوں پیر بھائی تھے۔ حاجی عبدالغنی مرحوم و مغفور منگلوری سے بیعت تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ کل آپ نے فرمایا تھا کہ مولانا علی میاں (مدظلہ) کا بھی مشورہ تھا کہ آپ علی گڑھ جائیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ جی ہاں۔ جب علی میاں کو علی گڑھ کی پیش کش کا علم ہوا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ میں علی گڑھ یونیورسٹی Join کر لوں میں (مدرسہ عالیہ سے) استعفیٰ دے کر گیا تھا کلکتہ سے، وہاں اس وقت جو گورنر اور چیف منسٹر تھے ان دونوں نے مجھے بہت روکا کہ آپ مت جائیے۔ ہمارا یہ مدرسہ بالکل تباہ ہو جائے گا تو میں نے کہا کہ میں نے جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب سے جو وائس چانسلر تھے علیگڑھ یونیورسٹی کے۔ ان سے میں نے وعدہ کر لیا ہے اور میرے بعض بزرگوں کا بھی مشورہ ہے۔ کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں میری زیادہ ضرورت ہے۔ پھر مدرسہ عالیہ کا تقریباً بیڑا ہو گیا۔ وہاں کے لیے کوئی مناسب پرنسپل ملا ہی نہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد:۔ کس سن میں آپ کی علی گڑھ تشریف آوری ہوئی تھی؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:۔ میں منتقل ہوا ہوں سن ۵۹ء میں۔ ۴۹ء میں کلکتہ گیا تھا۔ تقریباً دس سال سے زیادہ وہاں رہا۔

ڈاکٹر صاحب:۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہو چکا تھا جنہوں نے آپ کو وہاں بھیجا تھا!

مولانا:۔ جی ہاں۔ مولانا آزاد کا ۲۲ر فروری ۵۸ء کو انتقال ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے مجھے جب مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنا کر بھیجا تھا تو فرمایا تھا کہ یہ آپ کی ٹریننگ کے لیے ہے۔ اس کے بعد میں آپ کو علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا کر بھیجوں گا۔ وہ مجھ سے اس قدر خوش تھے۔ وہ تو اللہ کو منظور نہ تھا۔ لیکن مجھے شعبۂ اسلامیات کی سربراہی کی پیش کش ہوئی تو میں نے اُسے منظور کر لیا۔ ... میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ مسلمان کی نئی نسل بہت سے نئے (باطل) نظریات سے مرعوب ہوتی جا رہی ہے۔ اگر جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے دین (کی حقانیت) پر اعتماد پیدا ہو جائے اور انہیں دعوت و تبلیغ کا صحیح نہج معلوم ہو جائے (صحیح استدلال کا سرا) ہاتھ آ جائے تو یہ دین کی بہت مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ مجھے اپنے اُستاد حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یاد نہیں کہ آپ کو پہلے سنایا یا نہیں سنایا۔ شاہ صاحبؒ امرتسر تشریف لے گئے۔ تو وہاں کشمیری خاندان کے ایک بہت بڑے بیرسٹر تھے محمد صادق۔ وہ دیسے دیندار آدمی تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحبؒ سے ملنے آئے۔ لیکن وہ کلین شیو تھے اور سوٹ میں ملبوس۔ وہ شاہ صاحبؒ کے سامنے بڑے شرمائے شرمائے سے تھے۔ شاہ صاحب تاڑ گئے اور ان سے کہا کہ بھئی بیرسٹر صاحب! آپ میرے سامنے بیٹھے ہوئے کیوں شرما رہے ہیں!۔ وہ چپ۔ شاہ صاحب نے کہا۔ اچھا اس لیے شرما رہے ہیں کہ آپکی ڈاڑھی مونچھ صاف اور میری اتنی بڑی ڈاڑھی۔ یہ تو شرمانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس واسطے کہ میری ڈاڑھی بھی دُنیا کے لیے ہے۔ اگر آپ بیرسٹر ہو کر ڈاڑھی رکھیں تو کون آپ کو بیرسٹر سمجھ کر وکیل کرے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ یہ تو ملّا جی ہیں۔ یہ بیرسٹر کہاں سے ہو گئے۔ اور اگر میں مولانا صاحب ہو کر ڈاڑھی منڈوا دوں تو لوگ کہیں گے کہ یہ کہاں کے مولانا ہیں۔ یہ تو مسٹر ہیں۔ تو بھائی فعل اگرچہ مختلف ہے لیکن غرض ایک ہی ہے کہ دنیا میں پہچان ہو۔ کام ہو صرف اللہ (کی خوشنودی) کے لیے تو اس کا اجر ہے۔ تو یہ انداز تھا شاہ صاحب کی حکمتِ تبلیغ کا۔ حضرت والا ڈاکٹر صاحب بات اصل میں یہی ہے اور اصل قصہ یہی ہے کہ اگر آپ نے مولانا ہو کر دین کا کام کیا تو کیوں کیا؟ (اس لیے) کہ آپ کو تو روٹیاں اسی کی مل رہی ہیں۔ لیکن جو انگریزی تعلیم یافتہ لوگ ہیں وہ اگر یہ کام کر رہے ہیں۔ تو قدر و قیمت میں ان کی خدمات بہت آگے ہیں۔ اور عملی طور پر یہی مفید ثابت ہوں گی۔ اگر آپ جیسے تعلیم یافتہ حضرات کا دین کی خدمات کے لیے جو CONTRIBUTION ہے۔ وہ اگر نہ ہوتا تو آج کیا ہوتا۔ اندھیرا ہوتا۔ ہمارے علی میاں نے یہی بات کہی جو میرے دل میں بھی تھی کہ دین کی خدمت کسی کا کوئی اجارہ تو ہے نہیں اللہ کبھی (اپنے دین کا) بادشاہوں سے کام لیتا ہے۔ کبھی مجاہدوں سے کام لیتا ہے۔ کبھی صوفیائے سے کام لیتا ہے۔ کبھی علماء سے کام لیتا ہے کبھی آپ جیسے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے کام لیتا ہے

ل- جیسی ضرورت ہے اسی کے مطابق کام لیتا ہے - آج سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو مسائل پیدا کر دیئے
جو سوالات اٹھا دیئے ہیں- ان کو یہ بیچارے (عام) عالم لوگ کیا سمجھیں گے- (الّا ماشاء اللہ) یہ تو بہی
یہ تعلیم یافتہ) لوگ ہی سمجھتے ہیں- اگر وہ دین بھی جانتے ہیں اور جدید (باطل) نظریات سے بھی واقف ہیں
للہ نے ان کو اتنی دیانت داری اور بصیرت بھی دی ہے کہ وہ دین کی تعلیمات کی روشنی میں ان کا توڑ
لتے ہیں- پھر خود دین پر عمل کرتے ہیں - تو یہ ہے وقت کی اہم ترین ضرورت- آپ تو علی گڑھ ہو آئے ہیں
پ نے (ان کیفیات کو) دیکھا ہوگا- ؟

ڈاکٹر صاحب :- جی ہاں دو مرتبہ - علی گڑھ میں تبلیغی جماعت کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی
دیکھ کر مجھے حیرت آمیز خوشی ہوئی -

مولانا :- جی ہاں تبلیغی جماعت بھی ہے - آپ کی جماعتِ اسلامی بھی ہے - لیکن اس کا اثر
ہت کم ہو گیا ہے - تبلیغی جماعت کا اثر بہت زیادہ ہے - بہرحال وہاں تبدیلی آئی ہے خوشگوار
- جو تعلیم یافتہ حضرات ذہین ہیں اور آزادانہ سوچ رکھتے ہیں ان میں سے بعض آپ کے فکر سے
قریب ہیں -

ڈاکٹر صاحب :- آپ کی علامہ اقبال سے بھی ملاقاتیں رہی ہیں یا نہیں!

مولانا مرحوم :- جی ہاں ۱۹۲۷ء میں ان کے یہاں آنا جانا تھا - اس کو ملاقات تو نہیں کہہ سکتے -
چغتائی کا ان کے یہاں بہت آنا جانا تھا - (دونوں میں) بہت بے تکلفی تھی - اور عبداللہ چغتائی
ا بہت دوستانہ تھا - میں انہی کے ساتھ کبھی کبھار علامہ کے یہاں جاتا تھا تو علامہ اقبال نے ان کو
یؒ کی ایک کتاب دی جو چھپ کر آئی تھی المباحث المشرقیۃ - علامہ کو زمان و مکان کی بحث سے بہت
ا- اس کتاب میں دو CHAPTERS تھے ایک زمان پر اور ایک مکان پر - تو علامہ نے
(صاحب) سے کہا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کرا دو - چغتائی میرے پاس لے کر آئے اور مجھ سے کہا کہ ان
ر دو تم میں تو دیوبند کا فارغ التحصیل تھا ہی - میں نے کہا لائیے - میں نے ترجمہ کر دیا - وہ ترجمہ (چغتائی
نے) لے جا کر علامہ اقبال کو دکھلایا - تو وہ بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ یہ کون ہے جس سے تم نے یہ
رایا ہے - انہوں نے کہا کہ ایک سعید صاحب ہیں یہاں اورینٹل کالج میں پڑھتے ہیں - دیوبند کے
تحصیل ہیں - تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا - ان کو چونکہ حضرت انور شاہ کاشمیریؒ سے بڑی عقیدت
ر میں تلمیذِ خاص تھا حضرت شاہ صاحبؒ کا - تو جب علامہ کو اس نسبت کا علم ہوا تو وہ مجھ سے ہر
ں بڑی محبت سے پیش آتے رہے -

ڈاکٹر صاحب :۔ کیا علامہ اس کو عربی میں خود نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جبکہ علامہ نے خود ایم۔اے عربی میں کیا تھا۔؟

مولانا مرحوم :۔ بات یہ ہے کہ کالج اور یونیورسٹیوں کی عربی کا معیار کوئی بہت اعلیٰ نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب :۔ چٹائی توڑ عربی نہیں تھی۔

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں۔ بات یہ ہے کہ عربی کی فلسفیانہ اصطلاحات تو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر بحث نہیں آتیں اور امام رازیؒ کی تمام فلسفیانہ اصطلاحات خاص دقیق عربی میں تھیں۔

ڈاکٹر صاحب :۔ زمان کے مسئلہ پر تو (علامہ نے سمجھنا بہت چاہا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے بھی اس (مسئلہ) پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ویسے علامہ کی ایک بات بہت نمایاں ہے کہ ان کا آخری وقت تک طالب علمانہ انداز رہا ہے۔ آخری وقت تک انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کشمیری کو بالکل طالب علمانہ انداز میں خطوط لکھے۔ اسی طرح مولانا سلیمان ندویؒ کو بھی نہایت طالب علمانہ انداز میں خطوط لکھا کرتے تھے جب کہ علامہ مولانا سلیمان ندویؒ سے عمر میں خاصے بڑے تھے۔

مولانا مرحوم :۔ ان میں بڑی نیاز مندی تھی۔ شروع میں جب شاہ صاحب کشمیریؒ لاہور آئے تو اس وقت تک ان کا علامہ سے میل جول نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ نے شاہ صاحبؒ کی اپنے یہاں دعوت کی۔ تو شاہ صاحب نے لکھ دیا کہ میں تمہارے یہاں کھانے پر نہیں آؤں گا۔ چونکہ قادیانیت کے متعلق تمہارے خیالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ علامہ نے لکھا کہ مجھے کچھ اشکالات ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جواب بھجوایا کہ مجھے لکھ کر بھیجو۔ (علامہ نے لکھ کر بھیجے) تو شاہ صاحبؒ نے ان کا (مدلل) جواب لکھا علامہ نے جواب میں لکھا کہ میری تسلی ہو گئی۔ میں اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کرتا ہوں اور تائب ہوتا ہوں اور میں اس پر ایک مضمون انگریزی میں برائے اشاعت لکھ رہا ہوں۔ تو علامہ شاہ صاحب کا اتنا لوہا مانتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ یہ تو بہت اہم واقعہ ہے شاید لوگوں کے علم میں نہ ہو۔

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ وہ مضمون کہیں شائع بھی ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ علامہ نے شاہ صاحب سے بڑی مؤدبانہ درخواست کی کہ آپ لاہور تشریف لے آئیں جب شاہ صاحب ڈابھیل جا رہے تھے کہ فقہ اسلامی کی نئی تدوین میں اور آپ مل کر کریں لیکن اللہ کو منظور نہیں ہوا ورنہ وہ کام بہت اعلیٰ ہو جاتا۔

مولانا مرحوم :۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد علامہ بیمار بھی تو ہو گئے اور وہ اس قابل نہیں رہے

کر کام کر سکیں اور اس کی کوئی تنظیم (بھی) نہیں ہو سکی۔ اُدھر ڈابھیل سے آ فر آئی ہوئی تھی لہٰذا (شاہ صاحب) وہاں چلے گئے۔ اگر وہ کام ہو جاتا تو بڑی شاندار چیز ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب:۔ مولانا اگر مناسب سمجھیں تو ذرا یہ بتا دیجئے کہ یہ کیا مسئلہ تھا! کیوں ڈابھیل جانا پڑا حضرت شاہ صاحبؒ کو؟

مولانا مرحوم:۔ ڈابھیل اس لیے جانا پڑا کہ اصل میں بات یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے دارالعلوم کو اپنی ذاتی جائداد سمجھ کر اُسے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں اقربا پروری کا بہت دخل ہو گیا تھا۔ منتظم اعلیٰ حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے جو قاری محمد طیب مرحوم کے والد تھے اپنے ایک قریب ترین عزیز کو ناظم مطبخ بنانے کے بعد آپ نے ان کو سپلائی کا ٹھیکہ بھی دے دیا۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ بھئی یہ کیا تُک ہے!۔ وہ ناظم مطبخ بھی ہیں، ملازم بھی ہیں اور ٹھیکیدار بھی ہیں۔ یہ تو بڑی بے تکی بات ہوئی۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس (بات) کا بہت بُرا منایا گیا۔ اس پر شاہ صاحب نے اس روز عصر کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں پڑھی اور نماز کے بعد کہا کہ لوگو! ذرا ٹھہر جاؤ۔ لوگ رُک گئے تو شاہ صاحبؒ نے اس وقت یہ حدیث پڑھی: اَلْوَقْفُ لَا یُمْلَکُ۔ یہ دارالعلوم جو ہے وقف ہے۔ کسی کی ذاتی جائداد نہیں ہے کہ آپ جس طرح چاہیں، اُسے استعمال کریں۔ آپ نے شوریٰ کو بیکار کر رکھا ہے اور مطبخ کا جو نیا انتظام کیا گیا ہے وہ میں برداشت نہیں کروں گا۔ بس بات بڑھی اور اسی (بات) پر استعفیٰ دینے کی نوبت آگئی۔

ڈاکٹر صاحب:۔ آپ نے مولانا آزاد کے دارالعلوم دیوبند کے داخلے پر پابندی کے سلسلہ میں جو واقعہ سنایا تھا کہ جب (کانپور کی مسجد کے شہید کرنے کے بعد علماء کو مطمئن کرنے کے لیے) گورنر یو پی دارالعلوم دیوبند آیا تھا تو انتظامیہ نے مولانا آزاد کا داخلہ دارالعلوم میں روک دیا تھا اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے بھی بطور احتجاج اس جلسہ میں شرکت نہیں کی تھی تو اس کا ذکر جب مولانا عزیر گل صاحب کے سامنے ہوا تو انہوں نے سختی سے اس کی تردید اور نفی کی۔ ان کے علم میں نہیں ہوگا۔

مولانا مرحوم:۔ یہ تو مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے سامنے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا اور بہت سے لوگوں نے اس کی توثیق کی۔

ڈاکٹر صاحب:۔ میں مزید حیران ہوا کہ مولانا عزیر گل صاحب شیخ الہندؒ کے خدام میں سے ہیں اور ان کے علم میں یہ واقعہ بھی نہیں ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے (حضرت شیخ الہندؒ) کی طرف سے امام الہند بنانے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی کوئی تجویز تھی؟

مولانا:۔ حیرانی کی بات تو ہے۔ ورنہ یہ تو بہت مشہور بات ہے۔ شاید مولانا (عزیر گل) بھول

گئے ہوں۔۔ ان کی عمر بھی تو اب کافی ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب :۔ لیکن میری توجیہ یہ ہے کہ غالباً وہ (مولانا عزیر گل صاحب) نوجوان خدام سے تھے۔ اس لیے ان معاملات میں وہ شریک نہیں ہوتے ہوں گے اس لیے یہ واقعہ ان کے علم میں نہ آیا ہو۔

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں۔ یہ توجیہ صحیح ہے۔ وہ خدام ہی میں سے تھے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ لیکن اب وہ خدام میں سے شاید آخری شخص ہیں جو بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات ہیں اس لیے ان کو ایک تبرک کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔

مولانا مرحوم :۔ جی ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ یہ بات تو تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مجھے تو اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جو سوانح حضرت شیخ الہندؒ کی لکھی ہے اس میں مرض وفات کا ذکر بھی ہے۔ اس کی ساری تفاصیل کا ذکر بھی ہے۔ لیکن اس واقعہ کا انہوں نے بھی ذکر نہیں کیا۔ (یعنی) مولانا آزاد کو امام الہندؒ بنانے کے مسئلہ کا۔ اس کا افسوس ہوا۔ غالباً وہ جو معاصرت ہے وہ بنیاد بنی ہے۔

راقم الحروف :۔ البتہ مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ لیکن مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اس اہم واقعہ کا بالکل ہی ذکر نہ کرنا۔ اس کا کیا ہوسکتا ہے۔؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

مولانا مرحوم :۔ وہ غالباً مولانا ابوالکلام آزاد کی رعایت کر گئے کہ ان کو ناگوار نہ ہو ورنہ یہ تو کھلی بات ہے۔ مشہور و معروف بات ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مولانا آپ نے اپنی پچھلی گفتگو میں (مراد ہے مولانا کا انٹرویو شائع شدہ ... بابت مئی ۸۵ء) تلفیق بین المذاہب کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ تو اب کرنا ہی ہوگا۔ اس کے بغیر تو کام نہیں چلے گا تو یہ لفظ کہاں سے بنا ہے۔ ل۔ ف۔ ق کا اصل مفہوم کیا ہے؟

مولانا مرحوم :۔ تلفیق۔ لفق (سے بنا ہے) لفق کے معنی ہیں ملا دینا۔

ڈاکٹر صاحب :۔ اس مادہ سے قرآن و حدیث میں تو کوئی لفظ آتا نہیں۔ میں نے تحقیق کر لی ہے۔

مولانا مرحوم :۔ شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن تمام مستند لغات عربی میں یہ لفظ مل جائے گا۔ اور ہمارے بعض متقدمین علماء نے تلفیق بین المذاہب کو استعمال کیا ہے اور اس کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- ہمارے بعض علماء تو اس تلفیق کو بہت بڑی گالی خیال کرتے ہیں۔ گویا کہ ان کے نزدیک (تو) یہ درجہ کفر تک پہنچی ہوئی بات ہے۔!

مولانا مرحوم :- ہمارے نزدیک تمام ائمہ فقہا سب برابر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے (تلفیق بین المذاہب) کی ہے۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔ اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تک نے کی ہے۔ مولانا تھانوی ؒ نے بہت سے علماء کو بلا کر لکھا تھا: اَلْحِيلَةُ النَّاجِزَةُ لِلْحَلِيلَةِ الْعَاجِزَةِ بتایئے یہ سب کیا ہے! دیکھا کہ کسی مسئلے میں ... فقہ حنفی پر عمل کرنے سے نقصان ہوگا۔ تو اسے چھوڑ کر امام مالک ؒ کے مذہب کو اختیار کرنے کا فتویٰ دیا۔ اور بہت سے علماء کو بلا کر دکھا دیا۔ بولیے یہ کیا ہے! یا مفقود الخبر کے بارے میں فقہ حنفی کا فتویٰ چھوڑ کر امام احمد ابن حنبل کے فتوے پر فیصلہ طے کیا۔ تو برابر یہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- وہ یہ کہتے ہیں کہ مولانا تھانوی ؒ یہ کر سکتے تھے۔ تم کون ہوتے ہو یہ کرنے والے! میں نے عرض کیا کہ ٹھیک ہے میرا تو یہ مقام نہیں ہے لیکن اصولاً تو بہرحال ایک بات سامنے آگئی۔

مولانا مرحوم :- آپ یہ کہتے کہ مولانا تھانوی ؒ بھی تو مشتبہ ہیں علماء کے ایک کثیر حلقہ کے نزدیک ــ اس کے بغیر تو جناب والا چارا ہے ہی نہیں۔ اس کے بغیر (یعنی تلفیق بین المذاہب کے بغیر) ایک صحیح اسلامی ریاست چل ہی نہیں سکتی ــ

ڈاکٹر صاحب :- میں نے آپ کی سب سے پہلے کتاب حقیقتِ وحی طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھی۔

مولانا مرحوم :- کتاب کا اصل نام ہے "وحی الٰہی" پھر ہے "فہم قرآن"

ڈاکٹر صاحب :- میں نے یہ دونوں ایک ساتھ لی تھیں۔ دونوں کا بہت شوق سے مطالعہ کیا تھا۔ مجھے چونکہ قرآنِ حکیم سے اللہ کے فضل و کرم سے زمانہ طالب علمی ہی میں گہرا شغف ہوگیا تھا تو قرآن سے متعلق جو بھی کسی مستند عالم دین کی کوئی چیز مل جاتی تھی، اس کا میں بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ آپ کی تاریخ اسلام سے متعلق کتابیں میں نے کم ہی پڑھی ہیں ــ یہاں (پاکستان میں) آپ کی تصانیف کون شائع کر رہا ہے؟

مولانا مرحوم :- صاحب! کیا عرض کروں! میں نے کئی جگہ مختلف ناشروں کی طرف سے شائع کردہ یہاں اپنی کتابیں دیکھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب :- کیا یہ سب بلا اجازت ہو رہا ہے؟

مولانا مرحوم :- سب بلا اجازت۔ کسی نے ایک پیسہ آج تک نہیں دیا۔ نہ اجازت لی۔

میں پہلے جب پاکستان آیا تھا تو جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو بطور ہدیہ دینے کے لیے میں چند کتابیں خریدنے کے لیے ایک صاحب کے ساتھ بازار گیا تو کئی جگہ دیکھا کہ میری کتابیں بھی رکھی ہوئی ہیں ۔ تو ایک جگہ ان صاحب نے میرے متعلق بتا بھی دیا کہ فلاں فلاں کتاب کے مصنف سعید احمد اکبر آبادی یہ ہیں اس کے باوجود کوئی اثر نہیں ہوا اور میری کتابوں کے مجھ سے پورے دام لیے گئے ۔ تو لیجیے یہ حالت ہے ۔ اپنی کتابیں خریدنی پڑیں ۔

ڈاکٹر صاحب :۔ اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم آپ کی کتابیں چھاپیں ۔

مولانا مرحوم :۔ بڑے شوق سے ۔ بڑے شوق سے ۔ میری کتاب ہے 'صدیق اکبر' ۔ اور ابھی آ رہی ہے "عثمان غنی ذوالنورین" ۔

ڈاکٹر صاحب :۔ میں یہ دونوں کتابیں دہلی سے خرید کر لے آیا تھا ۔ اسی موقع پر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو بھی دیکھ آیا تھا ۔ وہ بے ہوشی یا گہری نیند کی حالت میں تھے ۔ بہرحال مجھے ان کو دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی ۔ میں ان کو دیکھ آیا تھا ۔

مولانا مرحوم :۔ میری کتاب 'صدیق اکبر' کسی نے یہاں 'الفیصل اکیڈمی' کی طرف سے چھاپ دی ہے ۔

ڈاکٹر صاحب :۔ مولانا ! تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے ۔ ؟

مولانا مرحوم :۔ تبلیغی جماعت ! میں نے کہا نا کہ اچھا کام کر رہی ہے ۔ لیکن اس پر ہم پورا Depend نہیں کر سکتے ۔ اور چونکہ مجھے اس سے دلچسپی رہی نہیں ۔ اس لیے میں نے زیادہ سوچا نہیں ۔ اس سے اگر فائدہ ہو رہا ہے تو اچھا ہے ۔

ڈاکٹر صاحب :۔ لیکن یہ کہ انہوں نے نہی عن المنکر کا راستہ بالکل بند کر رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کو بالکل نظر انداز کر رکھا ہے ۔ یہ تو دین کے لیے بہت مضر ہے ۔

مولانا مرحوم :۔ یہی تو میں نے پہلے کہا تھا اور کل بھی[1] ۔ بہرحال اب وہ اسی پر قانع ہو بیٹھے ہیں ۔ بھ

---

[1] مولانا مرحوم نے اپنی جس پہلی رائے کا حوالہ دیا ہے وہ میثاق بابت مئی کے انٹرویو میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے "میرا خیال ہے کہ تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درمیان عام و خاص کی نسبت ہے ۔ یعنی جہاں کہیں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پایا جائے گا وہاں تبلیغ ضرور ہو گی لیکن جہاں (محض) تبلیغ ہو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہونا نہیں ہے" ۔
(میثاق مئی ۸۵ صـ) (مرتب)

ں میں تحزب بھی بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ بہت ہی زیادہ۔

ڈاکٹر صاحب :- آپ نے کل مولانا بنوری صاحبؒ کا واقعہ سنایا تھا۔

مولانا مرحوم :- جی ہاں، جی ہاں ایک نہیں دسیوں واقعات ہیں۔ یہ لوگ اپنے سوا کسی کو حق پر سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ ان میں تحزب و تخالف بہت بڑھ چکا ہے . . . . (مزید براں) حضرت مولانا شاہ وصی اللہ ال الٰہ آبادی کے ایک مرید خاص ہیں۔ بہت بڑے مولانا۔ بہت بڑے عالم۔ اور بڑے گوشہ نشین ر بہت خاموش طبیعت۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے تبلیغی جماعت کے اوپر۔ اور بڑی سخت تنقید کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ تم بریلویوں کو کہتے ہو کہ بدعتی ہیں۔ اور اس لیے کہتے ہو کہ جو چیز مباح ہے کہ انہوں نے سُنت، واجب اور فرض قرار دیدیا۔ لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو یہ سب بدعات ہیں۔ تم نے اہم دینی اصطلاحات کے معنی اور مفہوم ہی بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ انہوں نے بڑی سخت تنقید کی ہے۔ میں نے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے پوچھا تھا کہ حضرت ہے (اس کا آپ کے پاس) کوئی ب! بولے کوئی جواب نہیں۔

ڈاکٹر صاحب :- مولانا نعمانی نے یہ فرمایا کہ کوئی جواب نہیں؟

مولانا مرحوم :- جی ہاں! یہی کہا مولانا نے۔ صاحب کتاب نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ثابت کیا کہ ان کا جو طریقۂ عمل ہے وہ قطعاً غیر شرعی ہے۔ حدیث نے جس چیز کو لازم نہیں کیا اس چیز انہوں نے لازم کردیا ہے۔ اور جناب والا۔ نہی عن المنکر بالکل نہیں کرتے جبکہ حدیث میں اس کی اتنی کید ہے پھر انہوں نے گشت کو چلّے کو واجب کا درجہ دے رکھا ہے۔ انہوں نے سینکڑوں مثالیں بیان ں ہیں۔ آج ایک لڑکے کی شادی ہوئی ہے۔ کل اس سے کہا کہ تبلیغ کے لیے چلو لندن اور وہ چلا گیا۔ تو لیے یہ شریعت کا کہاں حکم ہے۔! دین اعتدال اور توازن کی تعلیم کا نام ہے۔

ڈاکٹر صاحب :- تبلیغی جماعت کو اصل میں مولانا علی میاں اور مولانا محمد منظور نعمانی کی شرکت کی ہ سے کافی شہرت . . . . .

مولانا مرحوم :- مولانا علی میاں بھی تو ہٹ گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب :- مولانا علی میاں کے متعلق تو معلوم ہوا تھا کہ وہ تبلیغی جماعت سے کچھ مایوس ں۔ لیکن مولانا محمد منظور نعمانی کے متعلق . . . .

لہ اس واقعہ کا آگے ذکر آئے گا۔ (مرتب)

مولانا مرحوم :- جی وہ بھی ہٹ گئے - علی میاں نے تو صاف لکھ دیا اپنی سوانح عمری "کاروانِ زندگی" میں کہ میں نے راستہ بدل دیا ہے - میں نے بہت چاہا کہ یہ لوگ اصلاح کریں مگر ان لوگوں نے میری بات کو نہیں مانا - تو میں نے اپنا راستہ الگ کر دیا - میں نے کہا تھا ان سے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں آپ اپنی دعوت کا نہج اور طریقِ کار تبدیل کریں - لیکن ان حضرات نے میرے دلائل تسلیم نہیں کیے - وہ مطمئن نہیں ہو سکے جب کہ میرا اطمینان بھی ختم ہو چکا تھا - لہذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں ہٹ جاؤں -

ڈاکٹر صاحب :- مجھے اتنی تفصیل سے یہ بات معلوم نہیں تھی - ان شاء اللہ جلد ہی وقت نکال کر میں ان کی کتاب 'کاروانِ زندگی' کا مطالعہ کروں گا -

راقم الحروف :- مولانا - آپ کی یہ محبت وشفقت ہے کہ بیماری وضعف کے باوجود کل بھی آپ نے کافی اہم اور قیمتی باتیں ارشاد فرمائیں اور اپنے تجربات سے مستفید فرمایا اور آج بھی بیش بہا خیالات اور اہم واقعات ریکارڈ کرائے - اب آپ سے درخواست ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے لیے کچھ نصیحت فرمائیں -

مولانا مرحوم :- ارے میں کیا اور میری نصیحت کیا - ہم تو ان سے نصیحت حاصل کرنے کے آئے تھے -

ڈاکٹر صاحب :- مولانا - میرے لیے آپ کی نصیحت بہت قیمتی چیز ہوگی . . . .

مولانا مرحوم :- بس یہی ہے کہ آپ اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنا کام کیے جائیے - ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے - آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے - اخلاص کے ساتھ اسی کو کرتے رہ صرف رضائے الٰہی آپ کا نصب العین سامنے رہنا چاہیئے - اللہ تعالیٰ اس کام میں برکت عطا فرمائے - اس کو آخرت میں شرف قبولیت عطا فرمائے - اس کو آخرت میں آپ کے لیے توشہ بنائے میں دعا ہی کر سکتا ہوں - جبکہ دل تو یہ چاہتا ہے کہ صحت اجازت دے تو جتنا بھی تعاون ممکن ہو وہ پیش کروں -

ڈاکٹر صاحب :- میرے لیے آپ کا یہ فرمانا ہی سرمایۂ زلیست رہے گا - ان شاء اللہ -

---

اس طرح قریباً ایک گھنٹہ تک یہ مبارک مجلس جاری رہی اور ہم مولانا سے ملاقات کر کے رخصت ہوئے - کسے خبر تھی کہ راقم کی یہ آخری ملاقات ثابت ہوگی -

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

استدراک

۲۳ر اپریل ۸۵ کی جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم ومغفور اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے مابین گفتگو ریکارڈ کرلی گئی تھی۔ جو کیسٹ سے قریباً لفظ بلفظ منتقل کرکے شامل اشاعت کی گئی ہے۔ قارئینِ کرام نے اس کا مطالعہ فرمالیا ہوگا — ۲۲ر اپریل ۸۵ کی ملاقات کے موقعہ پر مولانا مرحوم نے تفصیل سے چند اہم باتیں بتائی تھیں اور چند اہم واقعات سنائے تھے۔ چونکہ اس موقعہ پر ٹیپ ریکارڈر ساتھ نہیں تھا۔ لہٰذا اِس روز کی گفتگو ریکارڈ نہیں ہوسکی۔ اس گفتگو کے بعض نکات ۲۳ر اپریل والے انٹرویو میں مجمل اشارات کے طور پر آئے ہیں۔ راقم الحروف اپنی یادداشت سے ۲۲ر اپریل کی گفتگو کے چند اہم نکات قلم بند کررہا ہے۔ مولانا مرحوم کے ارشادات بالمعنیٰ تحریر کیے جارہے ہیں۔ الفاظ مولانا مرحوم کے نہیں ہیں۔ البتہ راقم کو بفضلہٖ تعالیٰ اطمینان ہے کہ مفہوم ومدعا مولانا مرحوم ہی کا ہے۔ مولانا کے ارشادات وخیالات ترتیب وار لکھے جارہے ہیں۔

● — مولانا مرحوم نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا: ”میں آپ کی کچھ کتابیں پہلے بھی پڑھ چکا تھا اور کچھ کراچی کے موجودہ قیام کے دوران پڑھی ہیں۔ ماشاء اللہ آپ کا فکر صحیح ہے۔ قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔ آپ اخلاص کے ساتھ اپنا کام کیے جایئے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھیے۔ ہمارے معاشرہ کے بگاڑ کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے اکثر علماءِ کرام میں رواداری نہیں رہی۔ ان میں تحزب ہے۔ کوئی شخص اِلّا ماشاء اللہ اپنے حلقہ کے سوا دوسرے کی بات پر غور کرنا تو کجا کان دھرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا بلکہ بعض جگہ نہایت فروعی معاملات کا تعاقب کرتے ہیں اور ان کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ دین کی اصل حقیقت ان فروعات کے پردے میں چھپ جاتی ہے۔ جس حلقہ کے علماء کی عظیم اکثریت نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو عالم دین نہیں مانا ان کی نظر میں بھلا آپ کی حیثیت کیا ہوسکتی ہے!۔ جو شخص بھی دین کا بنیادی اور ٹھوس کام لے کر اٹھتا ہے۔ دعوت دیتا ہے اور اس کی دعوت کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں تو اسے ایسے حالات سے سابقہ پیش آتا ہی ہے جیسے آپکو پیش آرہے ہیں آپ اس سے کوئی اثر نہ لیں! کام کرتے رہیں۔ آپ اپنے اخلاص اور محنت کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ پائیں گے۔

● — تبلیغی جماعت کے متعلق مولانا مرحوم نے فرمایا: تبلیغی جماعت ابتدائی چند سالوں تک تحزب سے پاک رہی ہے۔ اس کام کے محرک حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ بڑے اللہ والے شخص تھے۔ بڑے وسیع القلب

تھے۔ بڑے منکسر المزاج اور متواضع شخصیت تھے۔ نہایت متقی و متدین تھے۔ مسلمانوں کی دینی و اخلاقی پستی پر نہایت کرب اور تکلیف محسوس کرتے تھے۔ نہایت مضطرب رہتے تھے۔ نہایت بے نفس اور مخلص انسان تھے۔ اغلباً سن ۴۴ کا واقعہ ہے جبکہ ان کے کام کو تین چار سال گزرے تھے۔ وہ دہلی کے محلہ کشن گنج کی ایک مسجد میں اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائے۔ مقصد لوگوں کو دین کی دعوت دینا اور اپنے کام سے متعارف کرانا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بھی بغرض استفادہ پہنچ گیا۔ مغرب کی نماز وہیں مولانا رحمۃ اللہ کی اقتداء میں پڑھی۔ مولاناؒ نے جب مجھے دیکھا تو خود ہی پیش قدمی کر کے میرے پاس تشریف لائے بڑی محبت و شفقت اور تپاک سے ملے اور گلے لگایا۔ اور فرمایا کہ "تم نے آکر میرا کام آسان کر دیا۔ اب میرے بجائے تم تقریر کرو گے۔" میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں تو آپ کے ارشادات سے مستفید ہونے آیا تھا۔ آپ کی موجودگی میں میں تقریر کروں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی آپ کا وعظ و نصیحت سننے آئے ہیں وہ بھی مایوس ہوں گے۔ فرمانے لگے۔ "بھائی مجھے تقریر کرنی کب آتی ہے یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک جذبہ اور ایک تڑپ ایک لگن دل میں پیدا کر دی ہے جو مجھے کشاں کشاں مختلف جگہوں پر لے جاتی ہے۔ تقریر تم ہی کرو گے۔" میں نے بہت معذرت چاہی۔ لیکن مولاناؒ نے میری ایک نہیں سُنی۔ امتثالِ امر میں مجھے تقریر کرنی پڑی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے "دین کے تقاضے" کے موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ تقریر کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے گلے لگایا اور میرے رخسار کا بوسہ لیا۔ بعد میں صرف چند منٹ میں مولاناؒ نے میری تقریر کی تصویب فرمائی اور مختصر طور پر اپنے تبلیغی کام سے متعارف کرایا۔

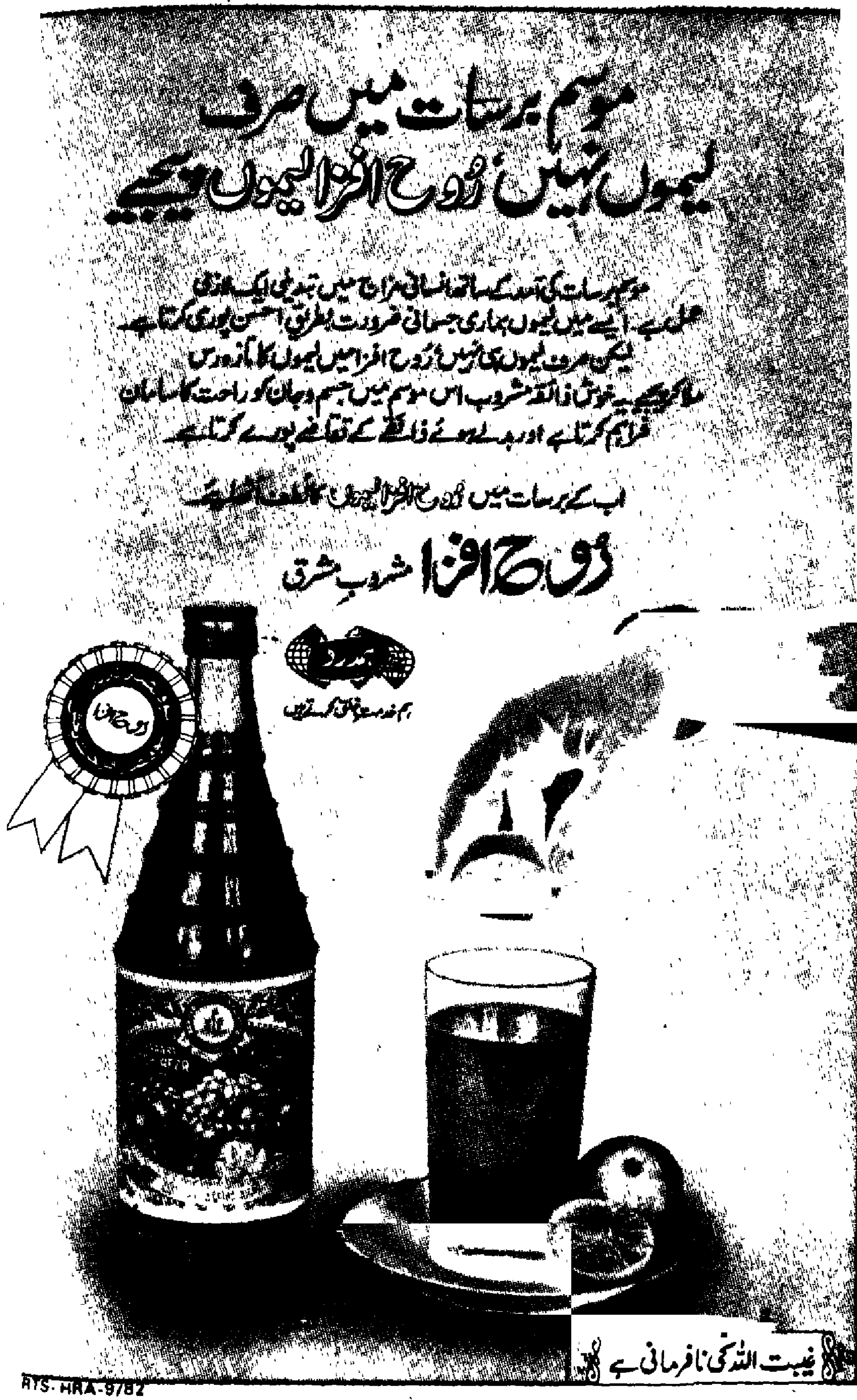
● مولانا مرحوم نے بعدہ فرمایا۔ "آپ نے یہ واقعہ سن لیا۔ اب دوسرا ایک اہم واقعہ سنیئے یہ غالباً ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ مجھے جنوبی افریقہ سے ڈربن یونیورسٹی سے چند لیکچرز دینے کے لیے دعوت نامہ آیا اور میں وہاں چلا گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ڈربن سے تقریباً دس میل دور ایک مضافاتی بستی میں تبلیغی جماعت کا ایک بہت بڑا اجتماع ہو رہا ہے۔ میں استفادہ کے خیال سے وہاں چلا گیا۔ پاکستان سے مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور کہنے لگے کہ اب جبکہ تم آگئے ہو تو تم کو آج کے اجتماع میں تقریر کرنی ہوگی۔ میں نے معذرت کی لیکن مولاناؒ اصرار فرماتے رہے۔ مجھے بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مولانا مرحوم مجھے لے کر منتظمین کے پاس پہنچے۔ میرا تعارف کرایا اور منتظمین سے کہا کہ آج کے پروگرام میں میری تقریر بھی شامل کریں۔ منتظمین نے پہلے تو مختلف عذرات پیش کیے۔ لیکن جب مولانا بنوریؒ نے زیادہ اصرار کیا تو صاف طور پر جواب ملا کہ "مولانا! ہم نے یہ پالیسی طے کر رکھی ہے کہ ہم اپنے پلیٹ فارم سے کسی ایسے صاحب کو تقریر کی اجازت نہیں دیں گے جو ہمارے کام سے مکمل اتفاق نہ رکھتا ہو اور عملاً

ہمارے کام میں شریک نہ ہوئے" مولانا بنوریؒ نے پھر اصرار کیا کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جو اختلافی ہو۔ یہ تو دین کی دعوت ہی پیش کریں گے"۔ لیکن منتظمین کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ مولانا بنوریؒ کی بات بھی نہیں مانی۔ یہ ۳ــہ کا واقعہ ہے جو میرے ساتھ پیش آیا۔ اب تو تحزب اور بھی پختہ ہوگیا ہے۔ ایسے دسیوں واقعات میرے علم میں ہیں کہ یہ حضرات دوسرے علماء کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ میرے علم میں یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ اپنے متوسلین کو باقاعدہ منع کرتے ہیں کہ دوسرے علماء کے مواعظ اور قرآن کے درس میں شرکت نہ کیا کریں۔

● ـــ مولانا مرحوم نے فرمایا۔" میرا اندازہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے اس اجتماع میں دس ہزار سے بھی متجاوز حضرات شریک تھے۔ پاکستان، بھارت اور افریقہ کے مختلف ممالک سے اُردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ آئے ہوئے تھے۔ چار پانچ روز کا اجتماع تھا۔ بڑے معقول انتظامات تھے۔ میں نے منتظمین میں سے ایک صاحب سے جو میرے کچھ زیادہ قریب ہو گئے تھے دریافت کیا کہ ان انتظامات پر اندازاً کیا خرچ آتا ہوگا تو انہوں نے بتایا کہ تقریباً پندرہ ہزار ڈالر روزانہ ـــ میں نے پوچھا کہ فنڈز کا انتظام کیسے ہوتا ہے تو جواب ملا کہ جنوبی افریقہ کے کوئی بڑے سیٹھ ہیں۔ انہوں نے تمام اخراجات اپنے ذمہ لیے ہوئے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاذ اور انتہائی ضعیف احادیث اور بزرگوں کے اقوال سے فضائل کا جو فلسفہ اختیار کیا گیا ہے اس اعتبار سے سیٹھ صاحب کا یہ مالی تعاون ان کے لیے تو آخرت میں بڑے اعلیٰ مقامات کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔

● ـــ مولانا مرحوم نے فرمایا" مجھے جس بات کا سب سے زیادہ افسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان حضرات نے نہی عن المنکر کو اپنے پروگرام سے بالکل خارج کر رکھا ہے۔ دین کے اعتبار سے یہ بہت خطرناک ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کا تو ان کی تقریروں اور گفتگوؤں میں حوالہ شاید ہی ملے۔ حدیثوں کا بھی صرف مطلب بیان ہوتا ہے وہ زیادہ تر فضائل سے متعلق ہوتی ہیں یا پھر عذابِ جہنم سے۔ یہ آخری بات تو بہت پسندیدہ ہے لیکن ان کا زیادہ زور بزرگوں کے فرمودات پر ہوتا ہے۔ اور بزرگوں سے منسوب کر کے یہ بڑی عجیب عجیب باتیں کہا کرتے ہیں۔ بہرحال اگر جماعت کو دین کا صحیح فکر اور فہم مل جائے تو یہ ایک بڑی مؤثر طاقت بن سکتی ہے۔ ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ یہ جو افرادی قوت پیدا ہو رہی ہے یہ صحیح طور پر اسلام کے لیے لگ جائے ـــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرمائے۔ (ج۔ د)

⁂


موسم برسات میں صرف
لیموں نہیں رُوح افزا لیموں پیجیے
موسم برسات کی آمد کے ساتھ انسانی مزاج میں تبدیلی ایک فطری
عمل ہے۔ ایسے میں لیموں ہماری جسمانی ضرورت بطریقِ احسن پوری کرتا ہے
لیکن صرف لیموں ہی نہیں رُوح افزا میں لیموں کا تازہ رس
ملا کر پیجیے یہ خوش ذائقہ مشروب اس موسم میں جسم و جان کو راحت کا سامان
فراہم کرتا ہے اور بدلتے ہوئے ذائقے کے تقاضے پورے کرتا ہے
اب کے برسات میں رُوح افزا لیموں کا لطف اٹھایئے
رُوح افزا مشروبِ مشرق
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
غیبت اللہ کی نافرمانی ہے

RTS-HRA-9/82

اسلامی انقلاب (قسط ۳)

مراحل ۔ مدارج ۔ اور لوازم

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک خطاب

ترتیب و تسوید : جمیل الرحمٰن

الحمد للہ ۔ الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و
نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیاٰت اعمالنا۔ من
یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا
الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیّدنا و مولٰنا محمدًا
عبدہ و رسولہ ارسلہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ
ولو کرہ المشرکون ۔ فصلی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ محمد و علٰی اٰلہ واصحابہ
وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیرا ۔ اما بعد فقد قال اللہ تعالٰی فی سورۃ النساء

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ
اٰتُوا الزَّكٰوةَ ج فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ
النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ج وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا
الْقِتَالَ ج لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ط قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ج
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى قف وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝

وَقَالَ اللہ تعالٰی فی سورۃ الحج
اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ۔
وَقال اللہ سبحانہ وتعالٰی فی سورۃ البقرۃ ۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ
لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۔

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ ھٰذِہِ السُّوْرَۃِ
کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ ج وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا
وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ج وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ط وَاللّٰہُ
یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ہ

وَقَالَ اللّٰہُ سبحانہ وتعالٰی فی سورۃ الانفال
وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔

صدق اللّٰہ العظیم

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ
لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ۔

اَللّٰھُمَّ ربنا الھمنا رشدنا واعذنا من شر ور انفسنا : اللھم ارنا
الحق حقًّا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔
اللّٰھم وفقنا ان نقول بالحق اینما کُنّا لا نخاف فی اللّٰہ لومۃ لائم

آمین یا رب العٰلمین

حضرات! دو جمعوں سے ہمارے یہاں جو مضمون چل رہا ہے۔ وہ ہے انقلاب محمدی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مراحل، مدارج اور لوازم کا تفصیلی جائزہ۔ ان میں سے تین ابتدائی اور تمہیدی مراحل کے بارے میں گفتگو مکمل ہو چکی ہے۔ یعنی دعوت و تبلیغ نمبر ایک۔ تنظیم نمبر ۲۔ اور تربیت و تزکیہ نمبر تین ـــــ ان تینوں کو جمع کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

اس کا حاصل اور اس کا نتیجہ ہے ایک انقلابی جماعت کا وجود میں آجانا۔

وہ انقلابی جماعت جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہوگی جن کا ذہنی و قلبی رشتہ اور تعلق اپنے اس انقلابی نظریہ سے مضبوط طور پر قائم ہو جائے ـــــ پھر ان کا یہ ارادہ و عزم کہ "یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید" ـــ یعنی اب یا تو ہم اپنے اس نظریہ کو غالب کر کے رہیں گے اور یا اپنی جان دے دیں گے۔ جیسے مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ جملہ یاد آ گیا کہ جب ابو طالب کے پاس آخری سفارت آئی ہے۔ جس میں گویا کہ قریش کی طرف سے ابو طالب کو الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اب تک ہم نے تمہارا بہت

لحاظ کیا ہے۔ لیکن چونکہ تم اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ نہیں چھوڑ رہے ہو اور ہم نے تمہارے لحاظ میں اب تک اُن ؐ کے خلاف کوئی براہِ راست اقدام نہیں کیا ہے۔ لیکن اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ لہٰذا تمہیں یہ آخری Warning (انتباہ) ہے کہ یا تو تم اُن ؐ کی حمایت اور پشت پناہی سے دست کش ہو جاؤ یا پھر میدان میں آ جاؤ اور اب کھلا مقابلہ ہو گا۔ اس پر ابو طالب کی ہمت کمزور پڑ گئی۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر ساری بات بتائی اور یہ جملہ بھی کہہ دیا کہ "بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ جسے میں برداشت نہ کر سکوں"۔ اب یہ وہ مرحلہ ہے کہ جس پر گویا کہ حضور ؐ نے یہ محسوس کیا کہ اصل سہارا تو اللہ ہی کا ہے۔ لیکن دنیوی سہارا ایک ہی تھا اور نظر آ رہا ہے کہ اب شاید وہ سہارا بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ اس لئے کہ وہاں قبائلی نظام تھا اور ابو طالب کی حمایت درحقیقت صرف ان کی حمایت نہیں تھی بلکہ پورے خاندان بنی ہاشم کی حمایت تھی۔ چونکہ قبیلے کے سربراہ تھے ابو طالب۔ لہٰذا اگر وہ حضور ؐ کی پشت پناہی سے دست کش ہو جاتے ہیں تو گویا پورے قبیلے کی جو حمایت حاصل تھی، وہ اب ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیوی اعتبار سے کوئی سہارا نہ رہا۔ اس وقت حضور ؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن زبانِ مبارک سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے:

> "چچا جان! اب یا تو یہ کام پورا ہو کر رہے گا یا میں اپنے آپ کو اسی میں ہلاک کر دوں گا۔"

یہ ہے اصل میں ایک انقلابی عزم۔ پہلی بات تو یہ کہ جو انقلابی نظریہ ہے اور وہ جس نظام کو برپا کرنا چاہتا ہے، اس نظریہ اور نظام کے ساتھ پورا پورا مضبوط ذہنی و قلبی تعلق ہو اور دوسری بات یہ کہ یہ عزم اور یہ Determination پیدا ہو جائے کہ یا تو یہ نظام غالب ہو گا، قائم ہو گا، نافذ ہو گا۔ انقلاب آئے گا اور یہ مشرکانہ، ظالمانہ، استحصالی نظام ختم ہو کر رہے گا یا ہم اسی کوشش میں اپنے آپ کو ختم کر لیں گے۔ ان دونوں کے مابین کوئی اور درمیانی راستہ نہ رہے۔ تیسری بات یہ کہ یہ انقلابی اتنے منظم ہوں کہ وہ ایک کمان پر حرکت کریں۔ آگے بڑھنے کا حکم ملے تو آگے بڑھیں اور جہاں رک جانے کا حکم دیا جائے وہیں رک جائیں۔ جب تک یہ نظم نہ ہو، اس وقت تک وہ جماعت ایک انقلابی جماعت نہیں ہے۔ پھر تربیت کا مرحلہ ہے اور ظاہر بات ہے کہ مختلف انقلابی جماعتوں کے اپنے اپنے پیشِ نظر انقلاب کے اعتبار سے یہ تربیت مختلف ہو گی۔ اگر مادی انقلاب برپا کرنا ہے جیسے کہ اشتراکی انقلاب ہے تو صرف مادی تربیت کافی ہے۔ کسی اخلاقی اور

وحانی تربیت میں لوگوں کا وقت ضائع کرنا خواہ مخواہ کی حماقت ہے۔ اگر اسلامی انقلاب پیشِ نظر ہوگا تو اس میں ظاہر بات ہے کہ اخلاق اور روحانیت سرِفہرست ہے۔ جب تک یہ اقدار ان نقلابی کارکنوں میں بتمام و بکمال نہ ہوں کہ جو اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو پھر انقلاب کے نتیجہ میں وہ اقدار کہاں سے پیدا ہو جائیں گی۔ لہٰذا ایک اسلامی انقلابی جماعت میں تربیت کا یہ پہلو اہم ترین اہمیت کا حامل ہے۔ ان سب کا نتیجہ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ نکلتا ہے کہ:

"ایک انقلابی جماعت کی تشکیل اور فی الواقع اس کا وجود عمل میں آ جانا۔"

میں نے یہ جو تین مراحل بیان کئے ہیں، بہت کچھ بیان کرنے کے بعد بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ تشنگی رہی ہے۔ میں چونکہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ اور اس کا اعلان میں نے پچھلے جمعہ کو بھی دیا تھا کہ میں آج سے اگلے تین مراحل کا ذکر کروں گا۔ لہٰذا میں پچھلے ابتدائی و تمہیدی مراحل پر مزید گفتگو نہیں کرتا۔ بعد میں ان شاء اللہ ان کا ذکر آئے گا اور ان پر مزید تفصیلی گفتگوئیں ہوں گی۔ اس لئے کہ ہمارے دین کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا یہ انقلابی پہلو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ ہم نے نوعِ انسانی کے عظیم ترین انقلابی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر ایک تقدس، احترام تعظیم کا ہالہ اور ایک مافوق الفطرت (Super Human) شخصیت کا ہیولیٰ اور نقشہ اپنے ذہن میں رکھا ہوا ہے جس کی وجہ سے عقیدت و عظمت کا احساس تو پوری طرح موجود ہے لیکن یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طور سے یہ انقلاب برپا فرمادیا ہے۔ سطحِ زمین پر حضورؐ کی جد و جہد کن مراحل سے گزری ہے اور حضورؐ نے قدم بقدم خالص انسانی سطح کی کشمکش سے گزر کر اور ہر مرحلہ پر مصائب و شدائد، تکالیف اور مشکلات جھیل کر کس طریقے پر اسلامی انقلاب کو تکمیل تک پہنچایا ہے، ان اہم امور کا ہم نے محبت و عقیدت سے ہٹ کر جائزہ نہیں لیا۔ اس لئے کہ اس پہلو سے حضورؐ کا اتباع پیشِ نظر ہی نہیں رہا۔ یہ تو اس وقت ہوگا جب کہ دل میں یہ عزم پیدا ہو جائے کہ اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے۔ تب انسان سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا خاص طور پر اس پہلو سے مطالعہ کرے گا کہ کیا Land Marks ہیں، وہ کیا اہم نشانات راہ ہیں کہ جو ہمیں سیرتِ مبارکہ سے اسلامی انقلابی عمل کے لئے ملتے ہیں۔

بہرحال میں نے آج سوچا تھا کہ ان تین ابتدائی و تمہیدی مراحل کے بارے میں صرف ایک ایک بات دوبارہ یاد کرا دوں۔ چونکہ الفاظ کے مشترک ہونے کی وجہ سے انسان دھوکہ کھا جاتا ہے ــــ تبلیغ کا لفظ مشترک ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک ہوتی ہے خالص

تبلیغ۔ اور ایک ہوتی ہے انقلابی تبلیغ اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن الفاظ مشترک ہیں، آدمی مغالطہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خالص مذہبی تبلیغ کی سب سے نمایاں مثال عیسائیت کی تبلیغ ہے۔ صرف عقیدہ ہی عقیدہ ہے، شریعت ہے ہی نہیں۔ لہٰذا نظام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس عیسائیت کی تبلیغ کا کیا مطلب ہے! صرف ایک عقیدہ کی تبلیغ۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور انقلابی تبلیغ کی مثال ہے اشتراکی تبلیغ۔ ظاہر بات ہے کہ اشتراکی بھی اپنے نظریہ اور فکر کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اپنا لٹریچر پھیلاتے ہیں۔ اپنے خیالات عام کرتے ہیں۔ اپنا فلسفہ ذہنوں میں اتارتے ہیں۔ امیر و غریب کے فرق کو Exploit کرتے ہیں۔ مزدور، کسان اور معاشرے کے دبے ہوئے طبقات کے دلوں میں سرمایہ دار، صنعت کار، زمیندار کے استحصالی ہتھکنڈوں سے نفرت و عداوت پیدا کرتے ہیں۔ طبقاتی تفاوت کا شعور بیدار کرتے ہیں۔ یہ ان کی تبلیغ ہے لیکن یہ انقلابی تبلیغ ہے، ان کے پیشِ نظر محض تبلیغ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ذریعہ ہے، تو درمیانی منزل ہے۔ اصل میں پیشِ نظر اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے۔ جو لوگ اس نظریہ کو قبول کریں، انہیں منظم کرنا ہے۔ ایک کمیونسٹ پارٹی وجود میں لانی ہے۔ اس کے Cell Organise کرنے ہیں۔ پھر ان کے انقلاب کا جو بھی مخصوص طریقِ کار ہے اس پر عمل پیرا ہو کر انقلاب برپا کرنا ہے۔ پس ایک مذہبی تبلیغ ہے۔ ایک انقلابی تبلیغ ہے ۔۔۔ اگر ہم اس پہلو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ دیکھیں اور سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا معروضی (Objectively) مطالعہ کریں تو کم از کم اس میں ہمیں جو بات نظر آئے گی اس کی محتاط ترین تعبیر یہ ہوگی کہ اس میں ہمیں دونوں تبلیغیں جمع ملتی ہیں۔ عقیدہ کی تبلیغ بھی ہے، یعنی توحید، آخرت اور رسالت کی تبلیغ بھی ہو رہی ہے ۔۔۔ لیکن اس تبلیغ کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ، تکبیرِ رب، اظہارِ دین الحق واضح طور پر نظر آتا ہے: لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ اس تبلیغ کا یہ ہدف و مقصد ہے۔ یہ گویا اس کا انقلابی رنگ ہے۔

اسی طرح تنظیم اور جماعت ہے۔ ایک سیاسی جماعت کو بھی جماعت کہہ دیتے ہیں اور جماعت ایک انقلابی جماعت بھی ہوتی۔ تنظیمی ہیئت کے اعتبار سے کسی ادارے کو، کسی انجمن کو کسی ایسوسی ایشن کو بھی تنظیم کہہ سکتے ہیں چونکہ اس میں بھی لوگ کسی مقصد کے لئے جمع ہوتے ہیں، کوئی دستور ہے، چند قواعد و ضوابط ہیں۔ انتخابات کا طریقِ کار معیّن ہے۔ عہدیدار ہیں، فنڈ ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ انقلابی جماعت یا تنظیم بعینہٖ تمام جماعتوں اور

تنظیموں سے ممتاز ہوتی ہے اپنے ڈسپلن، اپنے نظم کے اعتبار سے۔ ایسی جماعت میں جب تک فوج کا سا ڈسپلن نہ ہو، وہ انقلابی جماعت نہیں ہے۔ کوئی ڈھیلی ڈھالی ایسوسی ایشن کوئی چار آنے والی ممبری والی جماعت وہ انقلابی جماعت نہیں ہوتی ـــــ انقلابی جماعت کے لئے تو قرآن و حدیث کی اصطلاح ہے۔ سمع و طاعت ـــــ وہاں تو معاملہ ہوتا ہے فَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا (یعنی سنو اور اطاعت کرو)۔ اس کے بغیر انقلابی جماعت کے نظم کا تصور ممکن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح میں نے پچھلے جمعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طریق تربیت اور تزکیہ ہے، اس پر بھی گفتگو کی تھی۔ اس کو ان اصطلاحات کے حوالے سے ذہن میں رکھئے کہ ایک ہے خانقاہی نظام تربیت و تزکیہ۔ اور ایک ہے انقلابی نظام تربیت و تزکیہ۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ خانقاہی نظام وہاں وجود میں آتا ہے، جہاں یا تو انقلاب پیش نظر نہ ہو یا انقلاب آچکا ہو جس کے بعد لوگوں کی روحانی تربیت اور ہوائے نفس کا تزکیہ کرنا ہے۔ اب انقلابی تربیت کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ عیسائیوں کے یہاں جو خانقاہی اور راہبانہ نظام بنا وہی کل کا کل ان کا نظام بن کر رہ گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ انقلاب سرے سے ان کے پیش نظر تھا ہی نہیں۔ جب پال (پولوس) نے شریعت ہی ساقط کر دی تو انقلاب کا سوال ہی کہاں رہا۔ لہٰذا ان کے یہاں تو لامحالہ تربیت کا نظام صرف اور صرف خانقاہی اور راہبانہ بننا چاہئے تھا۔ ہمارے یہاں یہ خانقاہی نظام کب آیا! جب کہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی۔ شریعت نافذ ہے۔ عدالتیں ہیں، فقہاء ہیں، مفتی ہیں، قاضی ہیں، شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق فیصلے ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اب انقلاب کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ سے لو لگانے اور اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے کے طریقے سکھائے جائیں۔ باطنی امراض دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ خانقاہی نظام اس وقت وجود میں آیا جب ایک وسیع و عریض خطہ پر انقلاب کے نتیجہ میں اسلامی نظام قائم ہو چکا تھا۔ اس وقت تو ٹھیک تھا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اگر حالات وہی ہیں تب تو بات اور ہے لیکن اگر اسلام بحیثیت حکمران دین قائم و نافذ نہیں ہے اور پیش نظر اسلامی انقلاب لانا ہے تو پھر انقلابی تربیت کا نظام لانا پڑے گا ـــــ اور یہی انقلابی تربیت ہے جو ہمیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام میں ملتی ہے۔ اس موضوع پر میرا ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ

ں ایک تقریر مزید کروں گا۔ اس لئے کہ اصطلاحات مشترک ہیں۔ تہجد ہے، نماز ہے، زکوٰۃ
ہ، روزہ ہے، انفاق ہے۔ یہ سب وہاں بھی ہیں، یہاں بھی ہیں۔ لیکن وہاں ان کا کچھ اور
ن ہے، وہاں ان کا کچھ اور نظام بنتا ہے۔ اور یہاں ان کا کچھ اور نظام بنتا ہے۔ وہ فرق
نیاز اگر سامنے نہ رہے تو بسا اوقات اچھے بھلے انقلابی لوگوں کے سامنے بھی جب تربیت و
یہ کی بات آتی ہے تو خانقاہی تربیت و تزکیہ کی طرف ان کا ذہن مائل ہو جاتا ہے۔ وہ اس
، کہ صرف الفاظ کے اشتراک سے نتیجہ وہ نکل آتا ہے کہ لوگ اسی خانقاہی نظام تربیت و تزکیہ
لو اصل مقصود سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس نظام کے رواج کی دو چار برس کی بات
ں ہے۔ یہ نظام ہمارے یہاں کم از کم بارہ سو سال کی تاریخ رکھتا ہے۔ وہ اتنا پختہ ہو چکا
، اور پھر یہ کہ الفاظ بالکل مشترک ہیں۔ لہٰذا اس قدامت اور اشتراکِ الفاظ کی وجہ سے
لہ ذہن اس طرف چلا جاتا ہے کہ یہ خانقاہی نظام تربیت ہی اصل مقصود و مطلوب ہے اور
ں اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو انقلابی نظام تربیت و تزکیہ ہے اس کی طرف سے توجہات
، جاتی ہیں۔ لہٰذا میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ اس موضوع پر میں ایک علیحدہ مفصل
یر وں گا۔ اور وہ میں ان شاء اللہ کسی اور موقع پر کروں گا۔

آج میں سابقہ اعلان کے مطابق آگے بڑھ رہا ہوں اور وہ ہے اس انقلاب میں
دم کے مراحل جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا۔ اس ضمن میں
ں سے پہلی بات تو میں یہ عرض کروں گا کہ لفظ تصادم سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ دوسری
ہ کہ ہمارا جو انداز معذرت خواہانہ اور Apologatic رہا ہے کہ اسلام میں
ب مدافعانہ جنگ ہے، تصادم اور جارحیت نہیں ہے اس کو پہلے ہی اپنے ذہن سے
ہا دیں۔ ہم پر چونکہ اغیار نے بڑا شدید اعتراض کیا کہ یہ مسلمان قوم بڑی ہی خونی قوم ہے۔ انہوں نے
بی داستانیں گھڑ لیں کہ اسلام کی جو بھی تبلیغ ہوئی ہے، وہ تلوار سے ہوئی ہے۔ *
ے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے۔ لیکن اغیار نے ہم پر یہ تہمت اس شدّ و مد سے
ُ کہ ہم ہاتھ جوڑتے ہی رہ گئے اور ہم معذرت کے انداز سے اس الزام کو اپنے سر سے اتارنے میں حد

---

* اگر اسلام تلوار سے پھیلایا جاتا تو ہسپانیہ اور ہندوستان میں جہاں مسلمانوں نے قریباً ایک
ہزار سال حکومت کی کیا غیر مسلم اکثریت میں رہ جاتے؟ اور کیا مشرقِ وسطیٰ میں کوئی غیر مسلم نظر آتا؟
اس کا اصل سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ الزامات لگانے والوں کے اپنے مظالم کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول
نہ ہو جائے۔ (مرتب)

سے تجاوز کر گئے۔ یہ انداز اب بالکل بدل جانا چاہیئے اور الحمد للہ ہمارے بہت سے
اصحاب علم و فضل کی مدلل تحریروں کی بدولت بڑی حد تک یہ انداز بدل بھی گیا ہے۔ لیکن نام نہاد
دانش وروں کی ابھی اچھی خاصی تعداد خود ہمارے یہاں ایسی موجود ہے جن کے ذہنوں پر سابقہ دور
کی فضا کی چھاپ ابھی موجود ہے ۔ اور وہ اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور یہی راگ الاپتے
رہتے ہیں کہ اسلام میں صرف مدافعانہ جنگ ہے ۔ اسلام میں کوئی جارحانہ جنگ نہیں ہے ۔ حضورؐ
نے صرف مدافعت کے لئے جنگ لڑی ہے ۔ حضورؐ نے کبھی بھی پیش قدمی کر کے جنگ کا آغاز
نہیں کیا ۔ وغیرہ وغیرہ ـــ یہ باتیں جس انداز سے ذہن میں بیٹھی ہوئی ہیں ۔ اصل میں وہ انداز بالکل
غلط ہے ـــــ اس کو بالکل ختم ہونا چاہیئے ۔

میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ایک اصول سمجھ لیجئے کہ کوئی انقلابی تنظیم یا انقلابی جما
جب کسی معاشرے میں اپنی دعوت کا آغاز کرتی ہے تو محض یہ دعوت کا آغاز ہی اس کی طرف
سے تصادم کا آغاز ہے ۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ انقلاب اسی کا نام ہے کہ کوئی کھڑا ہو کر کہے کہ
نظام جو چل رہا ہے یہ سراسر غلط نظام ہے ۔ جب آپ رائج الوقت نظام کو غلط کہہ رہے ہیں او
اس عزم کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس کو بدلنا ہوگا تو تصادم کا آغاز آپ نے کر دیا۔ اس
لئے کہ جو مراعات یافتہ طبقات ہیں، جن کے Vested Interest اس باطل نظام
وابستہ ہیں، ان کی عافیت تو اسی میں ہے کہ رائج الوقت نظام قائم رہے ۔ tus quo
برقرار رہے ۔ دبے ہوئے طبقات جن بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں، انہی میں بندھے
جس طرح کی جکڑ بندیوں میں ہیں اسی طرح کی جکڑ بندیوں میں رہیں ۔ جو ظالم اور استحصا
طبقات ہیں وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ وہ جن ناجائز حقوق کے مالک ہیں، وہ ان سے
جائیں ۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ نظام جیسا بھی ہے ویسا ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ نظا
اس کو ہم تبدیل کر کے رہیں گے یا اس جد و جہد میں ختم ہو جائیں گے ۔ پس تصادم کا آغاز تو
کیا ۔ جو بھی ہو، چاہے وہ فرد واحد ہو۔ یا کوئی گروہ ہو، یا کوئی جماعت ہو اس لئے کہ اس کا
مطلب یہی ہے کہ آپ اس نظام کو غلط کہہ رہے ہیں۔ اس کی تردید کر رہے ہیں ۔ اسے ظالمانہ
کہہ رہے ہیں ۔ اس کو ختم کرنے کا داعیہ لے کر سامنے آئے ہیں تو گویا آپ نے رائج الوقت نظا
کیا ہے۔ البتہ اس کے بعد وہ نظام اور وہ معاشرہ اس دعوت کے خلاف aliate
ہے ۔ اس کے خلاف اقدام اور کارروائی کرتا ہے۔ باطل نظام کی جانب سے جو ردِ عمل (re

ہوتا ہے اس کے مراحل میں بعد میں بیان کروں گا۔

لیکن جو بات اس وقت آپ کے ذہن نشین کرانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ تصادم کا آغاز ہمیشہ انقلابی دعوت دینے والوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی فرد ہو، گروہ ہو، جماعت ہو۔ اگرچہ وہ جماعت ہاتھ نہیں اٹھاتی وہ کسی کو گالیاں نہیں دیتی، کسی کو کسی نوع کی جسمانی تکلیف نہیں پہنچاتی لیکن وہ یہ دعوت لے کر اٹھتی ہے کہ پورا نظام غلط اور فاسد ہے اور اس داعیہ کا اظہار کرتی ہے کہ یا تو اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اپنے نظریہ پر بالکل نیا نظام قائم و نافذ ہو کر رہے گا یا اسی کوشش اور جدوجہد میں ہم اپنی جانیں دیدیں گے ــــ اب آپ اندازہ کیجئے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز کہاں سے فرمایا! تمہارا مذہب غلط، تمہارا معاشرہ غلط، تمہارے اخلاق غلط، تمہارا پورا نظام غلط۔ یہ صدیوں سے قائم و رائج نظام سے بغاوت ہے۔ یہ ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو اس نظام میں قیادت و سیادت کے مناصب پر فائز ہیں اور جو اس نظام سے ناجائز اور استحصالی طور طریقوں سے انتفاع کر رہے ہیں۔ یہ ہے وہ بات جس کے متعلق میں کہہ رہا ہوں کہ تصادم کا آغاز داعیٔ انقلاب کرتا ہے اور وہ جماعت کرتی ہے جو اس دعوت کو قبول کر کے داعیٔ انقلاب کے اعوان و انصار پر مشتمل ہوتی ہے۔

میں نے علامہ اقبال کا یہ شعر آپ کو بار بار سنایا ہے وہ تصادم کے لئے اور اس سے پہلے کے مراحل کو جامعیت کے ساتھ ادا کرنے میں میری رائے ہے کہ شاہکار (Master Piece) ہے۔ دعوت و تبلیغ، تربیت و تزکیہ، تنظیم و جماعت ان سب مراحل کو ایک مصرع میں سمو دیا گیا کہ ؎ بانشہ درویشی درساز و دمادم زن

اب جب تیار ہو گئے، ایک جماعت وجود میں آ گئی۔ ایک قوت فراہم ہو گئی۔ فدائین کا ایک گروہ ہے جو تمہارے حکم پر اٹھنے اور گردن کٹانے کے لئے تیار ہے۔ بلکہ اس کو اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے تو اس کو علامہ نے کہا ہے ؎

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

اب پکے ہو گئے۔ خشت بن گئے تو اب اپنے آپ کو سلطنتِ جم پر دے مارو ــ یہاں سلطنتِ جم سے مراد بطورِ استعارہ وہاں کا قائم و رائج نظام مراد لیجئے۔ انقلاب اسی طرح آئے گا۔ اگر وہ طاقت محفوظ پڑی رہے، وہ Potential جو فراہم ہوا ہے وہ in active رہے، غیر متحرک اور غیر فعال رہے تو ظاہر بات ہے کہ انقلاب نہیں

آسکے گا۔ لہٰذا اس شعر کے حوالے سے بھی یہ بات ذہن میں رکھئے کہ تصادم کا آغاز درحقیقت انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے اور تصادم انقلاب کا ناگزیر خاصہ ہوتا ہے۔

پھر تصادم کا آغاز تو اسی لمحہ ہو جاتا ہے جس لمحہ انقلابی دعوت شروع ہوتی ہے۔ لیکن ابھی اس انقلابی جماعت کو ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ مہلت اسے ایسی ملے، جس میں وہ اپنی دعوت کی توسیع کر سکے۔ اپنے دعوتی Base کو Broad کر سکے۔ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اسے قبول کریں۔ اس جماعت میں شامل ہوں۔ پھر ان کی تربیت ہو۔ ان کو منظم کیا جائے۔ اس کام کے لئے بڑا وقت اور مہلت درکار ہے۔ جس کو انگریزی میں کہتے ہیں ——
'To Buy Time' آپ نے اپنے دشمنوں سے وقت کو خرید نا ہے۔ ان سے کچھ مہلت آپ نے لینی ہے۔ لہٰذا پہلا مرحلہ (Phase) ہوتا ہے صبرِ محض کا۔ جسے میں Passive Resistance سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ معاندین و مخالفین داعی کے متعلق کہیں گے کہ یہ پاگل ہے، دیوانہ ہے، مجنوں ہے، بیوقوف ہے۔ Fanatic ہے۔ ان کی عقل اور مت ماری گئی ہے۔ حکمتِ دعوت کا تقاضا ہے کہ ان سب کو برداشت کرو۔ تمہاری زبان سے کوئی نازیبا جملہ نہ نکلے۔ ان مخالفین کے تمام استہزاء و تمسخر کو خندہ پیشانی سے جھیلو۔ مصابرت و استقامت کا مظاہرہ کرو۔ اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ دعوت و تبلیغ کا کما حقّہٗ فرض انجام دیتے رہو۔ جب مخالفین اس میں ناکام ہو جائیں گے اور دیکھیں گے کہ ہم نے جس کو مشتِ غبار سمجھا تھا اور اسے چٹکیوں میں اڑانا چاہا تھا، وہ تو زبردست آندھی بنتی نظر آرہی ہے۔ عام لوگوں خاص طور پر ہمارے نوجوانوں کو متاثر کر رہی ہے اور وہ داعی کے اعوان و انصار بن رہے ہیں تو پھر مخالفین آگے بڑھ کر ماریں گے —— اس طرح دوسرا مرحلہ (Phase) تشدّد کا شروع ہوتا ہے۔ معاندین دعوت قبول کرنے والوں پر ستم اور مصائب کے پہاڑ توڑتے ہیں۔ دہکتی آگ پر ننگی پیٹھ لٹاتے ہیں۔ مکّہ کی سنگلاخ اور توے کی طرح تپتی ہوئی زمین پر کھینچتے ہیں۔ برچھی سے ایک مظلوم خاتون کو نہایت بہیمانہ طور پر ہلاک کرتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ پاؤں سرکش اونٹوں سے باندھ کر اونٹوں کو بھگاتے ہیں کہ جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں۔ کسی کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں چھوڑتے ہیں۔ کسی کو مادر زاد ننگا گھر سے نکال دیتے ہیں۔ کسی کو اتنا پیٹتے ہیں کہ بس مرنے کی کسر رہ جاتی ہے —— داعی الی اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر دست درازی کرتے ہیں۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھا

ہیں۔ آپؐ کے گھر میں غلاظت پھینکنے کا معمول بنا تے ہیں ۔ آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے ہیں کہ چشم ہائے مبارک اُبل پڑتی ہیں ۔ آپؐ کی پشتِ مبارک پر عین سجدہ کی حالت میں اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھ دیتے ہیں ۔ آپؐ پر پتھروں کی اس قدر بارش ہوتی ہے کہ جسمِ اطہر لہولہان ہو جاتا ہے ۔ آپ کا معاشی مقاطعہ ہوتا ہے اور آپؐ کو تین سال تک آپؐ کے قبیلے کے تمام لوگوں کے ساتھ، چاہے انہوں نے دعوت قبول کی ہو یا نہ کی ہو ایک وادی میں محصور کر دیا جاتا ہے ـــــــ لیکن حکم ہے کہ معاندین و مخالفین کے ان تمام متشدّدانہ طرزِ عمل کو برداشت کرو ۔ جواب میں اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ مت اٹھاؤ ـــــــ البتہ اپنے موقف پر ڈٹے رہو ۔ اس سے پیچھے نہ ہٹو ۔ کوئی بھی معافی اور توبہ نامہ دے کر ان مصائب سے بچنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے لیکن ہاتھ اٹھانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ جواب میں تشدّد کرنے کی اجازت نہیں ہے ۔ یہ ہے صبرِ محض ۔ اسی کو کہا جاتا ہے :

'Passive Resistance'

صبرِ محض کا یہ مرحلہ ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مطہرہ میں مسلسل بارہ برس تک جاری رہا ۔ اور اس بارہ سال کے عرصہ میں اس بہیمانہ تشدّد کی وجہ سے نہ تو کسی نے کمزوری دکھائی نہ اپنے موقف سے ہٹا اور نہ ہی کسی نے جواباً ہاتھ اٹھایا ۔ میں کہا کرتا ہوں کہ آدمی مشتعل (Desperate) ہو جائے اور وہ سمجھ لے کہ مجھے تو مرنا ہی مرنا ہے تو کم از کم چار کو ساتھ لے کر تو مروں ـــ لیکن یہ کمال ہی نہیں معجزہ ہے جناب محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تربیت و تزکیہ کا کہ ایک شخص نے بھی حکم اور ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کی ۔ نہ کوئی اپنے موقف سے ہٹا اور نہ کسی نے جواب میں ہاتھ اٹھایا ۔ یہ اہم ترین وقت ہے ۔ اسی کے متعلق میں نے کہا ہے کہ اگر مہلت ملی جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرپور طریقے پر استعمال فرمایا ہے ۔ اب اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ سیرت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے ہمیں پورا فلسفۂ انقلاب سیکھنا ہے ۔ وہیں سے ہمیں اصول اخذ کرنے ہیں ۔ اب اس بات پر غور کیجئے کہ اس صبرِ محض (Passive Resistance) کے مرحلہ کی حکمت کیا ہے! وہ یہ کہ ابتداء میں چند باہمت اور سلیم الفطرت لوگ اس انقلابی نظریہ کے قائل و حامی ہوتے ہیں ۔ اگر وہ Voilent ہو جائیں یعنی تشدّد کا جواب تشدّد سے دینے لگیں تو اس غلط نظام کے علمبرداروں کو اخلاقی جواز مل جائے گا کہ انقلاب کے حامیوں کو کچل کر رکھ دیں ۔ جب تک انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھایا تو ان مخالفین و معاندین کے چودھریوں اور سرداروں کے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے ۔ چنانچہ اس حال میں اگر

وہ تشدد کر رہے ہیں تو بلا جواز کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رفتہ رفتہ عامۃ الناس کی ہمدردیا
اس انقلابی جماعت کے ساتھ ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں کو آ
کیوں مارا اور ستایا جا رہا ہے! جبکہ یہ ہمارے معاشرے کے شریف، بے ضرر اور بہتر افراد میں سے ہیں۔ اور
لوگ خاموشی سے کیوں ماریں کھا رہے ہیں! اب ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے کہ حضرت بلال رضؓ کو مکہ کی سنگلاخ
تپتی زمین پر گردن میں رسی باندھ کر اس طرح گھسیٹا جا رہا ہے جیسے کسی مردہ جانور کی لاش کو گھسیٹا جاتا ہے۔
دیکھنے والے بھی انسان تھے۔ ان کے اندر بھی احساسات تھے! اگرچہ ان میں جرأت نہیں ہے، ہمت نہ
ہے کہ اس بہیمانہ ظلم پر صدائے احتجاج بلند کریں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں "lent Majority"
کہا جاتا ہے یعنی خاموش اکثریت ــــ یہ نہ سمجھئے کہ وہ خاموش اکثریت اندھی اور بہری ہوتی ہے۔ دیکھ
سنتی بھی نہیں ہے۔ خاموش تو ہے بولتی نہیں ہے لیکن وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہتی ہے کہ یہ ک
ہو رہا ہے! وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ بلال رضؓ جیسے محنتی اور فرض شناس غلام کے ساتھ یہ وحشیانہ
کیوں ہو رہا ہے!

یہ خباب رضؓ ابن ارت کے ساتھ کیا ہو رہا ہے! یہ تو بہت ہی بھلا انسان ہے۔ بڑا شریف النفس
آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیشہ کے اعتبار سے لوہار تھے۔ اور بڑے ہی نیک
نوجوان تھے۔ ظاہر بات ہے کہ جو حضورؐ کے دامن سے وابستہ ہوا ہو اس کی طبیعت میں پہلے ہی سے نیک
سعادت ہوگی۔ پھر نورٌ علیٰ نور کے مصداق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ان کے کردار میں
آیا ہوگا! آخر ان رضؓ کے گاہک اور ان رضؓ سے کام لینے والے جانتے نہیں تھے کہ یہ کس کردار کا آدمی ہے! و
کے مطابق وقت پر کام کر کے دیتا ہے۔ کام بھی اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے۔ پوری ذمہ داری اور جان
کے ساتھ کام کرتا ہے۔ صرف سر پر سے ایک بوجھ اتارنے اور پیسے کھرے کرنے کے لیے نہیں ک
سارا تجربہ مکہ والوں کو ہے اور پھر وہ دیکھتے ہیں کہ دہکتے ہوئے انگارے بچھا کر ان پر اس شخص کو لٹا
اب آپ بتایئے کہ کیا مکہ کی پوری فضا کے اوپر ایک دفعہ جھرجھری نہیں آگئی ہوگی! ٹھیک ہے ہمت
ہے کہ اس ظلم کے خلاف زبان کھولیں چونکہ ان مظالم کرنے والوں میں ابوجہل ہے، ولید بن مغیرہ ہے
ابن خلف ہے، عقبہ ابن ابی معیط ہے، عتبہ ابن ربیعہ ہے۔ یہ بڑے بڑے چودھری اور سردار ہیں۔ ا
خلاف بولنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ کوئی ان کے مقابلہ میں کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ تو عوام کا ان کے خ
کھڑے ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اندر ہی اندر ہمدردی کے احساسات پیدا ہو ر
جگہ بنا رہے ہیں۔ وہ کیفیت ہو رہی ہے جسے ایک شاعر نے ایک مصرع میں یوں ادا کیا کہ "د

نع کرلے وہی فاتح زمانہ! تو دل اندر ہی اندر فتح ہو رہے ہیں کہ نہیں ہو رہے ہیں! وہ اچھی طرح جانتے
ہیں کہ ان مظلوموں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کوئی غلطی نہیں کی۔ کسی کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی۔ بس ایک بات
وہ یہ کہتے ہیں کہ **اللہ ایک** ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ **محمدؐ** اللہ کے رسول ہیں۔ صلی اللہ علیہ
وسلم۔ بس ان دو باتوں کا یہ اقرار کر رہے ہیں۔ کسی کو انہوں نے کبھی گالی نہیں دی۔ کسی پر انہوں نے آج
تک ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کسی کو انہوں نے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر ان کے ساتھ یہ ظلم، یہ تشدد، یہ
تعدی، یہ ستم کیوں ہو رہا ہے!۔

یہ ہے اصل میں صبرِ محض کے مرحلے کی حکمت اور اس کا فلسفہ۔ کسی انقلابی جماعت کا یہ جو صبرِ محض
(Passive Resistance) کا دور ہوتا ہے اس میں ایک طرف تو اُسے اپنے تین ابتدائی کاموں
کو کرنے کی مہلت ملتی ہے اور وہ تین کام ہیں کہ دعوت زیادہ سے زیادہ پھیلانا، دعوت قبول کرنے والوں کو منظم
کرنا اور پھر اس مرحلے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی تربیت کرنا۔ اس لیے کہ اگلے مراحل کی کامیابی کا انحصار
انہی لوگوں پر ہے۔ گویا اگلے تمام مراحل کی کامیابی کا دارومدار ان تمہیدی و ابتدائی مراحل کی پختگی پر ہے۔ اگر
ان مراحل کے تقاضوں کو کماحقہ ادا کیا گیا ہے اور انقلابی کارکنوں کی سیرت و کردار میں پختگی اور مضبوطی آگئی ہے۔
تب تو آگے چل کر کامیابی ہو گی۔ ورنہ جیسا کہ میں بارہا مثال دے چکا ہوں کہ آپ ریت کا گولہ بنا کر شیشے پر
ماریں گے تو شیشہ کھڑا رہے گا اور وہ ریت بکھر جائے گی ——————— خلاصہ
کلام یہ کہ اس صبرِ محض کے دوران ان کاموں کے لیے مہلت ملتی ہے۔ پھر ایک اہم ترین بات یہ کہ ماریں کھا
کر لیکن ہاتھ نہ اٹھا کر ایک طرف ان کارکنوں میں قوت برداشت، قوت ارادی پروان چڑھتی اور اپنے موقف
سے ان کی وفاداری مضبوط ہوتی ہے اور اس پر استقامت حاصل ہوتی ہے، جیسے خام سونا کٹھالی میں تپ
کر کندن اور خالص سونا بنتا ہے، اسی طرح ان انقلابی کارکنوں میں مظالم و مصائب کی بھٹیوں سے گزر کر ایک
آہنی عزم اور پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے نقطۂ عروج
کو پہنچ جاتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ جور و تعدی، یہ تشدد و ستم جھیل کر معاشرہ کی خاموش اکثریت کے دل جیتے
چلے جاتے ہیں۔

اس صبرِ محض (Passive Resistance) کے بھی دو مراحل (Phases) ہیں ان کو
بھی آج اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ شاید ہی وضاحت سے اس کا ذکر میں نے کبھی پہلے کیا ہو۔ پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے
جس میں زبانی کلامی تشدد ہوتا ہے۔ کوفت پہنچاؤ۔ ذہنی اذیت پہنچاؤ۔ لیکن کوئی جسمانی تشدد اور جسمانی
تکلیف نہ دو۔ اس مرحلہ میں اصل ہدف اور نشانہ بنتا ہے خود داعی، دعوت کا آغاز کرنے والا۔ اس کے

ساتھی صرف نہیں بنتے۔ اس لیے کہ ابتداء میں لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص ہے جس کا دماغ خراب ہے اور یہ ہمارے نوجوانوں کے دماغ خراب کر رہا ہے۔ ان نوجوانوں کو تو انہوں نے Claim کرنا ہے۔ انہیں واپس لینا ہے لہٰذا ان کے خلاف ابھی ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ جو داعی ہے اس کی شخصیت کو مجروح کرنے (Character Assasination) کی کوشش ہوگی۔ کہا جائے گا یا ہے۔ دماغ خراب ہوگیا ہے، مجنون ہے، Fanatic ہے، ساحر ہے شاعر ہے اور دیوانہ ہے۔ سیرت مطہرہ میں یہ ساری ہی باتیں ملتی ہیں جن کا تذکرہ ابتدائی مکی سورتوں میں آتا ہے تو مکی دور کے قریباً تیرہ برس کے ابتدائی تین سال میں صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تشدد ہوا ہے اور تشدد جسمانی نہیں بلکہ صرف لسانی، زبانی، کلامی تشدد کر کے ان کو کوفت پہنچاؤ۔ انہیں ذہنی اذیت پہنچاؤ۔ جیسے کہ قرآن مجید میں سورۃ الحجر میں ان معاندین و مخالفین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ "اگر ذرا سی عربی زبان سے واقفیت ہو تو اندازہ ہو کہ کتنا زہر میں بجھا ہوا یہ جملہ ہے۔" اے فلانے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی ذکر نازل ہو رہا ہے ہم تو تم کو پاگل سمجھتے ہیں۔" اب یہ بات سنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اب بتایئے کہ اس کا کیا کوئی اثر نہیں ہوگا! طبیعت پر کوئی ملال نہیں آئے گا کوئی رنج نہیں پہنچے گا اس کو کہتے ہیں اعصابی جنگ یعنی (War of Nerves) ۔ کسی طرح سے ان کی قوت ارادی کو ختم کر دیں۔ ان کے اندر جو آہنی عزیمت ہے، کسی طرح اس کو پگھلا کر رکھ دو۔ یہی سورۃ الحجر ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ٥ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اسلیے اس سے آپ کا سینہ بھنچنے لگتا ہے آپ کو شدید ذہنی اذیت و کوفت ہوتی ہے۔"

صدمہ ہوتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو کل تک میرے قدموں تلے اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔ جو کو دیکھتے ہی کہا کرتے تھے: جَاءَ الصَّادِقُ۔ جَاءَ الْاَمِیْنُ۔ ہر طرف حضورؐ کا خیر مقدم ہوتا تھا۔ ایک ایک آپؐ سے محبت کرتا تھا۔ ہر شخص آپ کا احترام کرتا تھا۔ لیکن یہی لوگ ہیں جو آج آپؐ کا استہزاء کر رہے ہیں۔ کوئی مجنون و دیوانہ کہہ رہا ہے کوئی شاعر و ساحر کہہ رہا ہے۔ قرآن مجید کے مسلسل درس کے سلسلہ میں ہم نے ابھی سورہ دخان کا مطالعہ ختم کیا ہے اس میں ان کفار کا یہ قول بیان ہوا ہے: وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ٥ "اور انہوں نے کہا کہ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تو (معاذ اللہ) سکھایا پڑھایا باؤلا ہے یعنی آپؐ کو کوئی اور سکھاتا پڑھاتا ہے اور یہ آ کر ہم پر دھونس جماتے ہیں کہ یہ کلام مجھ پر اللہ کی طرف سے نازل

ل اسی سورۃ الحجر میں حضورؐ کو یہ الفاظ تسلی بھی دی جاتی ہے: اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَہْزِءِیْنَ

رہا ہے۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ حضورؐ کے قلب مبارک پر کیا گزرتی ہوگی جب یہ باتیں کہی جاتی ہوں گی اور آپؐ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ آپؐ پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک روز حضورؐ کی خدمت میں عتبہ ابن ربیعہ آتا ہے جو قریش کے بڑے سرداروں اور چودھریوں میں سے ہے۔ یہاں میں یہ بات بھی بتا دوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاندین و مخالفین میں سے یہ شخص بڑا شریف النفس تھا۔ میں بعد میں حضورؐ کے معاندین و مخالفین کی مزاجی اور نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ آپ حضرات کے سامنے پیش کروں گا۔ یہ آتا ہے اور بڑے ہی مخلصانہ و مشفقانہ اور بڑے ہی مربیانہ و ہمدردانہ انداز میں حضورؐ سے کہتا ہے کہ "بھتیجے! اگر واقعی تم پر کسی بدروح کا سایہ ہو گیا ہے تو مجھے بتا دو۔ میرے بہت سے عاملوں ماہرین کاہنوں سے تعلقات ہیں۔ میں کسی کو بلا کے تمہارا علاج کرا دوں گا"[1] اب آپ سوچئے کہ حضورؐ کے قلب مبارک پر کیا گزری ہوگی! ۔ میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ یہ جو پہلا تشدد ہوا ہے اس کا نشانہ بحیثیت اول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ میں اس استہزاء و تمسخر کو بھی تشدد کہہ رہا ہوں اس لیے کہ ذہنی اور نفسیاتی کوفت سے بڑا تشدد کوئی اور نہیں۔ جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ تکلیف انسان کو اس وقت ہوتی ہے جب اُسے یہ ذہنی کوفت پہنچتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی تین سال تک اعصاب شکنی کی پوری کوشش ہوتی رہی ہے تاکہ آپؐ کے اعصاب ٹوٹ کر رہ جائیں، بکھر کر رہ جائیں۔ آپؐ میں وہ ہمت نہ رہے کہ کھڑے رہ کر دعوت پیش کرتے رہیں۔

ان کی طرف سے اس کی ایک اور انداز سے بھی کوشش ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض عامل لوگوں نے باقاعدہ اپنی بہت سی ریاضتوں کے ذریعہ سے اپنی آنکھوں کے اندر ایک خاص کشش اور قوت پیدا کر لی ہوتی ہے۔ قوتِ ارادی کو اپنی آنکھوں میں مرتکز کر لیا ہوتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے گھور کر دیکھیں تو وہ جل کر رہ جائے اور اس کی قوتِ ارادی پاش پاش ہو جائے۔ یہ نفسیاتی مشقیں دنیا میں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ آج کے دور میں تو اس نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کوشش بھی کی گئی۔ سورہ قلم میں فرمایا گیا ہے: وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۝ " یہ کفار جب ذکر یعنی قرآن سنتے ہیں تو یہ آپؐ کو ایسی نگاہوں سے گھور کر دیکھتے ہیں گویا آپؐ کے قدم اکھاڑ دیں

---

[1] اسی روایت میں آتا ہے کہ حضورؐ نے جواب میں اس کے سامنے سورہ حٰم السجدہ کی چند آیات کی تلاوت کی جس سے وہ انتہائی متاثر ہوا۔ اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ قریش کے دوسرے سرداروں نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور ان کو اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ربیعہ بھی حضورؐ پر ایمان نہ لے آئے لیکن اس کی قسمت میں یہ شرف نہیں تھا۔ (مرتب)

گے (آپؐ کی آہنی قوتِ ارادی کو پاش پاش کردیں گے) اور زبان سے کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) یہ مرد مجنو
دیوانہ ہے"۔ ایک طرف وہ اپنے مُنہ سے جو استہزاء و تمسخر کر رہے ہیں اور جو الفاظ نکل رہے ہیں وہ قلب
مبارک پر تیر کی طرح جا کر لگ رہے ہیں۔ یہ کوشش بھی اس لیے ہے کہ آپ کی ہمت کو توڑ کر رکھ دیں۔ آ
کے پائے ثبات میں لغزش آجائے۔ ساتھ ہی یہ اپنی نگاہوں کے ذریعہ سے بھی چاہتے ہیں کہ آپؐ کو
کردیں۔ آپؐ کی ہمت جواب دے جائے۔ میرے نزدیک یہی توضیح و تشریح ہے لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَ
کی۔ چنانچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ اس قسم کے عاملین کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ
نگاہوں اور اپنی قوتِ ارادی سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ ارادی کو پاش پاش کر کے رکا
یہ ہوتا ہے اس تشدد کا پہلا دور۔ داعیٔ اوّل کو ذہنی کوفت پہنچانے کی ہر امکانی سعی و کوشش۔ اور ہمیں
تین سال میں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی اور صاحبِ ایمان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا ہو۔ اس لیے کہ ظاہر بات
کہ ان کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے فساد کی اصل جڑ تو داعیٔ اوّلؐ ہی ہے جو یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا
لہٰذا کسی طریقہ سے اس جڑ کو ہلا دیں، اس کو اکھاڑ پھینکیں تو فساد ختم ہو جائے گا۔ ہمارے کچھ جوشیا
سر پھرے نوجوان ہیں اور ہمارے شرفاء میں سے بھی کچھ لوگ اسؐ کی باتوں میں آگئے ہیں۔ لیکن اگ
نفسیاتی و ذہنی حملوں کے ذریعہ سے اسی داعیٔ اوّلؐ کو بددل (Dis-hearted) کردیں
کے حوصلہ کو شکست دے دیں۔ اسیؐ کی قوتِ ارادی کو ختم کردیں تو یہ سب سے اچھا ہے۔ پھر کامیابی
کامیابی ہے۔

بس پہلے تین سال تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بدترین ذہنی و اعصابی تشدد کا نشا
ہے۔ آغازِ وحی کے بعد چوتھے سال میں ان کے یہاں دارالندوہ میں باقاعدہ مشاورت کے بعد فیص
کہ اب تک جو تدبیریں ہم نے کی ہیں وہ سب ناکام ہو چکی ہیں۔ اور جنگل کی آگ کی طرح یہ دعوتؐ
رہی ہے گویا کہ "نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے"۔ پھر یہ کہ یہ آگ ہمارے بارود خا
تک پہنچ گئی ہے اور ہمارے غلاموں کے طبقہ کے لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کے حلقہ بگوش ہو
ہیں۔ اب کیا ہوگا! یہ فکر ان کے دامن گیر ہو گئی۔ آپ خود اندازہ کیجئے کہ غلاموں کا طبقہ اس معاشرے کے
بڑی افرادی قوت (Human Potential) کی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ غلام اس نظام میں اپنی قسمت
قانع تھے اور اس کے ساتھ خود کو Reconcile کر چکے تھے کہ ٹھیک ہے ہمارے نصیب میں
کچھ ہے۔ لیکن اگر کہیں ان کے اندر ان کی عزتِ نفس بیدار کر دی گئی۔ کہیں اُن کے اندر یہ احساس پیدا ہو گ
ہم بھی انسان ہیں اور ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں تو کیا ہوگا! ہمارا نظام تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ یہ طاقت اگ

ہمارے خلاف کھڑی ہو گئی تو اُس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کی اس تشویش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا کہ ان کے نوجوانوں میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نفوذ کر رہی ہے جو ایک بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ عثمان ابن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کون ہیں! خاندانِ بنو امیہ کا ایک صالح نوجوان۔ مصعب ابن عمیر کون ہیں! سعد ابن وقاص کون ہیں! حذیفہ ابن ربیعہ کون ہیں! عبداللہ ابن مسعود کون ہیں! رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ اونچے گھرانوں کے یہ نوجوان اور متعدد دوسرے نوجوان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدموں میں پہنچ گئے ہیں۔ لہٰذا کفارِ مکہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب تک ہماری جو حکمت عملی تھی وہ کامیاب اور مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اب ان پر جسمانی تشدد کرو۔ ان کو مارو تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ ہم میں سے جسکو بھی جس پر کوئی اختیار اور کوئی اقتدار حاصل ہے۔ وہ اُسے ان پر استعمال کرے اور ان کو جور و تعدی اور ظلم و ستم کا نشانہ بنائے وہ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ سکیں۔ چنانچہ اس طرح آغازِ وحی کے چوتھے سال اہلِ ایمان کے لیے جسمانی تشدد کا دور شروع ہوا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ابتدائی تین سال تو ذہنی تشدد اور Torture کا ہدف خاص طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس رہی۔ اب شدید قسم کی تعذیب، تعدی اور بہیمانہ ظلم و ستم کا ہدف بنے قریباً تمام اہلِ ایمان۔ مثلاً حضرت عثمانؓ ہیں۔ وہ غلام نہیں ہیں کوئی آقا تو ان کو نہیں مار سکتا۔ لیکن وہاں کے معاشرے کے اصول ورواج کے مطابق آنجنابؓ کا چچا موجود ہے جو بمنزلہ باپ ہے اور اُسے اپنے بھتیجے پر اختیار حاصل ہے اس نے حضرت عثمانؓ کو مارا بھی۔ اور بالآخر ایک چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھونی دے دی۔ اب دم گھٹ رہا ہے اور مرنے کے قریب ہیں۔ آخر کوئی وجہ تھی کہ جب پانچ سن نبوی میں حضورؐ نے چند صحابہؓ کو ہجرت حبشہ کی اجازت دی ہے تو حضرت عثمانؓ اور آپؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہؓ، جو لختِ جگر ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، یہ دونوں ان میں شامل ہیں۔ جعفرؓ ابن ابوطالب بھی ان میں شامل ہیں۔ بنو ہاشم کے سردار کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے بھائی۔ یہ لوگ غلام تو نہیں تھے۔ ویسے غلام تو اپنے آقاؤں کے مملوک تھے وہ ہجرت کیسے کر سکتے تھے! لیکن وہاں بزرگوں کو خوردوں پر ایک اختیار حاصل تھا چاہے وہ خود جوان ہی کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا یہ نوجوان اور آزاد اہلِ ایمان اپنے گھر والے مشرکین کے تشدد اور مظالم کا نشانہ بن رہے تھے۔

لیکن اس سے بہت آگے بڑھ کر جور و ستم کا معاملہ ہوا ہے غلاموں کے ساتھ۔ ظاہر بات ہے کہ اس چکی میں سب سے زیادہ پسنے والے وہی لوگ تھے۔ ان کے تو کوئی حقوق تھے ہی نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا وہ تو اپنے آقاؤں کے مملوک تھے۔ ان کے آقا انہیں ذبح کر دیں تو ان سے کوئی باز پرس نہیں

کر سکتا تھا۔ کہ تم نے اسے کیوں ذبح کر دیا! جیسے آپ کی بکری ہے آپ جب چاہیں اُسے ذبح کر دیں کوئی آپ سے پُوچھ سکتا ہے! اگر کوئی پوچھنے کی حماقت کر بیٹھے تو آپ یہی جواب دیں گے کہ میری بکر تھی، میں نے ذبح کر دیا، آپ پوچھنے والے کون! یہی وجہ ہے کہ غلاموں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کو کر سخت سے سخت دل میں بھی جھرجھری آجاتی ہے۔ حضرتِ بلال رضؓ کے ساتھ امیہ ابن خلف نے جو کچھ کیا آپ کے علم میں ہے۔ لیکن کوئی نہیں ہے کہ اس سے پوچھ سکے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو۔ ایک گوشت پوست کے زندہ انسان کے ساتھ وہ بہیمانہ سلوک کیا جا رہا ہے جو اگر کسی مردہ جانور کے ساتھ بھی کیا جائے تو طبیعت میں ناگواری کا احساس پیدا ہو جائے لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس وقت مکہ میں ایک اور طبقہ تھا حلیفوں کا طبقہ کہلاتا تھا۔ جو نہ قریشی تھے، نہ غلام تھے۔ بین بین کی ایک کیفیت تھی۔ یہ بات جان لی کہ مکہ صرف ایک قبیلہ کا شہر تھا۔ اس میں صرف قریش آباد تھے۔ اور کوئی دوسرا قبیلہ آباد نہیں تھا۔ ا تفاوت کو پیش نظر رکھیے کہ تمدنی اعتبار سے مدینہ زیادہ ارتقائی مرحلہ پر تھا۔ اس میں پانچ قبیلے آباد تھے۔ عرب کے دو قبائل اوس و خزرج اور یہودیوں کے تین قبائل بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ۔ جبکہ مکہ تمدنی اعتبار سے ابھی بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھا اور صرف ایک قبیلے کا شہر تھا۔ اب اس میں یا تو قریش آباد ہیں یا ان غلام جو ان کی بھیڑ بکریوں کا مقام رکھتے ہیں۔ ایک تیسری کیٹیگری بھی تھی کہ کوئی شخص باہر کا آکر اگر خود کو قریش کی کسی بڑی شخصیت کی حمایت میں دے دے، اس کا حلیف بن جائے تو گویا وہ اس بڑے شخص کی حفاظت میں مکہ میں رہ سکتا ہے۔ اس طرح اُس قریشی کو اس پر پُورا اختیار حاصل ہو جائے گا۔ اس کی حیثیت اگرچہ غلام کی نہیں ہے لیکن وہ پُوری طرح آزاد بھی نہیں۔ وہ آزادوں اور غلاموں کے بین بین ایک نئی مخلوق ہو گئی۔ یہی معاملہ تھا حضرت یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یمن رہنے والے ایک باعزت انسان تھے۔ انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں ان رضؓ کو حضور صلی اللہ علیہ کی بعثت کی بشارت ہوئی تھی۔ اسی کے پیش نظر وہ مکہ میں آئے اور ایک شریف النفس بڑے شخص کے حلیف بن کر اور اس کی پناہ میں آکر مکہ میں بس گئے[1]۔ اسی شخص کی ایک کنیز تھی حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو آقا کی اجازت سے ان سے نکاح ہو گیا۔ اب یہ ایک خاندان بن گیا۔ وہ شخص لاولد مر گیا۔ اس کا جو شخص وارث اور جانشین بنا وہ ابوجہل تھا۔ گویا اب وہی حیثیت آلِ یاسر پر ابوجہل کو حاصل ہو گئی۔ حضرت یاسر غلام تو نہیں ہیں لیکن ابوجہل کے حلیف اور اس کی پناہ میں ہیں۔ اس لیے کوئی اور ابوجہل سے نہیں پوچھ سکتا کہ تم اس خاندان کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مسلسل اور بدترین تشدد کا نشانہ ب

۱؎ قریباً یہی معاملہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا (مرتب)

ں یہ دو میاں بیوی اور ایک ان کے بیٹے حضرت عمارؓ یہ تینوں حضورؐ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان پر شدید
ریں مظالم ابوجہل نے کیے۔ حضرت سمیہؓ کو شوہر اور بیٹے کی نگاہوں کے سامنے انتہائی بہیمانہ طور پر شہید
یا۔ ایک مومنہ کا یہ پہلا خون تھا جس سے مکہ کی سرزمین لالہ زار ہوئی۔ پھر حضرت یاسرؓ کے ہاتھ پاؤں چار
ہرکش اونٹوں سے باندھ کر انہیں چار سمتوں میں ہانک دیا کہ ان کے جسم کے چیتھڑے اڑ گئے۔

میں نے بہرحال اس پہلے دور کو دو حصوں میں منقسم کر کے دکھا دیا کہ اس 'صبرِ محض' (Passive Resistance) کے دو دور تھے پہلے کا ہدف صرف حضورؐ تھے اور وہ تشدد تھا ذہنی کوفت کا۔ دوسرا ر جسمانی تشدد کا تھا۔ جس کا نشانہ بنے قریباً سارے اہلِ ایمان ۔۔۔ اب اگر میں تفصیلی واقعات مزید بیان روں گا تو یہ مسئلہ بہت طویل ہو جائے گا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس وقت اس کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ ملاب کے مرحلہ کے اعتبار سے کیا گیا ہے کہ بہرحال بارہ برس تک یہ حکم تھا کہ کسی تشدد، کسی ظلم، کسی زیادتی ے جواب میں ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ میں نے آج سورۂ نساء کی ایک آیت کی شروع میں تلاوت کی تھی۔ یہ نازل ہو رہی ہے ہجرت کے بعد مدینہ میں اور وہ بھی مدنی دور کے پانچویں یا چھٹے سال۔ اس میں یہ الفاظ ے ہیں: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ ۔۔ "کیا تم نے دیکھا نہیں! ان لوگوں کی طرف ں سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو" میں اغلباً اس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں کہ یہ حکم آپ کو مکی دور کسی سورت میں نہیں ملے گا۔ اس کا ذکر مدنی سورت میں آیا ہے وہ بھی پانچویں یا چھٹے برس۔۔ یہ بھی ایک ت اہم مثال ہے اس بات کی جو میں اپنی بعض تقاریر میں آپ کے سامنے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ عمل کے تبار سے بسا اوقات سنتِ رسولؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام قرآن مجید سے مقدم ہوتی ہے۔ مدنی سورت ایک آیت میں ذکر ہو رہا ہے اور اس اسلوب سے کہ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ ۔ "کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ ے رکھو"۔ تو کہنے والا کون تھا! اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اس نوع کی کوئی آیت قرآن مجید میں بود نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم تھا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ جیسا کہ شاید میں عرض کر چکا ہوں دونوں امکانات ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ یہ حضورؐ کا اپنا ذاتی اجتہادی فیصلہ ہو۔ اس کی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف ے نفی نہیں ہوئی تو توثیق ہو گئی۔ جیسے کہ حدیث کی اقسام میں ایک "تقریری حدیث" ہے کہ حضورؐ کے سامنے ایک م ہوا اور آپؐ نے اس سے اُسے روکا نہیں۔ تو اُسے بھی سنت ہونے کی ایک سند حاصل ہو گئی۔ چونکہ اگر یہ کام غلط تا تو حضورؐ منع فرما دیتے۔ تو یہ گویا اللہ کی طرف سے "تقریر" ہو گئی۔ مقرر کیے رکھنا یہ تقریر ہے۔ دوسرے یہ ممکن ہے کہ وحیِ خفی یا وحیِ غیر متلو کے ذریعے سے حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو اور اُسے آپؐ نے ہ کرامؓ تک پہنچا دیا ہو۔ اور بعد میں سورۂ نساء میں اُس وحیِ خفی کا اس وحیِ جلی اور وحیِ متلو میں ذکر آ گیا

ن سے کہا گیا تھا: كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ ۔ "اپنے ہاتھ بندھے رکھو، روکے رکھو" ـــــ No Retaliation ـــــ کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوگی ۔ اور اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ 'No Raising of Hands even in Self Defence' ـــــ آگے فرمایا: اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۔ اس وقت حکم یہ تھا کہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرو ۔ یعنی تربیت ہی کا مرحلہ تھا۔ ؎

بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

ابھی "بر سلطنت جم زن" سے ٹکرانے کا حکم نہیں آیا تھا ۔ بلکہ مرحلہ تھا تربیت کا ۔ تیاری کرو ۔ اللہ سے زیادہ سے زیادہ لو لگاؤ ۔ اللہ کی محبت اور دلوں میں جماؤ ۔ اپنے عزم و ارادہ کو اور تقویت دو۔ اللہ کی راہ میں مصائب و تکالیف جھیلنے کا خود کو زیادہ سے زیادہ عادی اور خوگر بناؤ ـ مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر بڑا پسند ہے اگرچہ یہ ذرا مختلف بات ہے کہ ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

تو جو ولولہ اور جوش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں پیدا ہو رہا تھا کہ ہمیں باطل کے خلاف اٹھ جانا چاہیئے ۔ کھڑے ہو جانا چاہیئے ۔ لڑنا چاہیئے ۔ چنانچہ سورۂ نساء کی اس آیت کی تفسیر میں آج صبح ہی میں نے دیکھا ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے امام طبری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم مثلاً عبدالرحمٰن ابن عوف، سعد ابن ابی وقاص اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا نام مذکور ہے ۔ کہ یہ وہ حضرات تھے جو بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ اب قتال کا فیصلہ ہونا چاہیئے ۔ کب تک ہم برداشت کریں گے! ـــ میں کہا کرتا ہوں کہ آپ سوچیے کہ جب مکہ میں حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا پر ظلم کیا جا رہا تھا ـ جو صنف نازک میں سے تھیں پھر بوڑھی بھی ـ تو کم از کم چالیس مسلمان موجود تھے ۔ کیا ان کا خون کھولتا نہیں ہوگا؟ کیا وہ جوش میں نہ آتے ہوں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض نہ کرتے ہوں گے کہ یا رسول اللہ! آپ کی ایک نام لیوا بوڑھی خاتون کو اس طرح بے عزت کیا جا رہا ہے اور ستایا جا رہا ہے! آخر کیا ہم بے غیرت ہیں! کیا ہم میں مردانگی کا جوہر نہیں ہے! ہمیں اس بربریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا چاہیئے، لیکن نہیں اس وقت حکم یہی تھا: كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ ـ اپنے ہاتھ بندھے رکھو ـ ابھی اپنے اس جوش کو تھام کر رکھو ـ جلد وہ وقت آئے گا جب اپنا یہ جوش نکال لینا ـــ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ انقلابی عمل کا

یکتیں اسی میں ہیں کہ جوش کو تھامو اور روکو۔ صبر کرو اور جھیلو۔ Retaliate نہ کرو یعنی مدافعت میں ہاتھ مت اٹھاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب سامنے سے گزر رہے ہیں تو تلقین فرما رہے ہیں: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ "اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو اس لیے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے"۔

آگے بڑھنے سے قبل آیئے سورۃ النساء کی اس آیت نمبر ۷۷ کا مکمل مطالعہ کرلیں۔ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝

" (اے نبی) آپ نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے اور بندھے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو! اور اب جب کہ ان پر جنگ فرض کر دی گئی ہے تو ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ایسے ڈر رہے ہیں جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیئے۔ یا کچھ اس سے بڑھ کر۔ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم پر لڑنے کا فرض کیوں عائد فرما دیا! کیوں نہ ابھی ہمیں (تیاری اور تعداد کے اضافہ کے لیے) کچھ اور مہلت دی! (اے نبی) ان سے کہہ دیجئے کہ دنیا کی زندگی کا سرمایہ تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے جو اللہ کا تقویٰ رکھتا ہے کہیں زیادہ بہتر ہے اور (وہاں آخرت میں) تمہاری حبہ برابر بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی"۔ بہرحال اس آیت کے ضمن میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت تو عمومی انداز میں دی ہے تو اس کا ذکر اس طور سے کر دیا گیا۔ ورنہ یہ نہ سمجھئے کہ صحابہ کرامؓ میں بہت سے لوگ تھے جو قتال سے ڈر رہے تھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ صرف گنتی کے لوگوں کی قوتِ ارادی میں تنزلزل ہوا ہو اور ان کے اعصاب پر کچھ تناؤ آیا ہو۔ تو ایسی بات کا اللہ تعالیٰ ایسے عام انداز میں ذکر فرما دیا کرتے ہیں تاکہ کسی کے دل میں ذرا سی بھی لرزش کے آثار پیدا ہو رہے ہوں تو وہ وہیں

رک جائے اور متنبہ ہو جائے اور پھر اپنی قوتِ ارادی کو مضبوط کرے اور اس کے سامنے یہ بات واضح طور پر آجائے کہ دنیا فانی ہے ایک دن تو انسان کو موت سے ہمکنار ہونا ہی ہوتا ہے ۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کی موت راہِ حق کے لیے جد و جہد کرنے میں آئے ۔

پس تو یہ ابتدائی دور ہے جو قریباً ساڑھے بارہ برس مکہ میں جاری رہا ۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دور انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ناگزیر بنیادی لازمہ (Pre requisite) ہے ۔ اسی میں انقلابی نظریہ و فکر کی دعوت و تبلیغ بھی ہو رہی ہے ۔ دعوت قبول کرنے والوں کی تنظیم بھی ہو رہی ہے ۔ اسی میں اہلِ ایمان کے تزکیہ اور تربیت کے مراحل بھی طے پا رہے ہیں ۔ اسکے بھی دو پہلو ہیں ۔ ایک یہ کہ انکے روحانی تزکیہ اور ترفع کا پروگرام بھی چل رہا ہے ۔ دوسرا یہ کہ ماریں کھانے، مصائب جھیلنے کا انکو خوگر بنایا جا رہا ہے اور پھر یہ کہ انکو ڈسپلن کی پابندی کا عادی بنایا جا رہا ہے[1]۔ اور ان کی قوتِ برداشت، ان کی قوتِ ارادی کو چٹان کی مانند مضبوطی بھی حاصل ہو رہی ہے ۔ گویا تطہیرِ افکار اور تعمیرِ سیرت و کردار کے دونوں کام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ۔ میں پھر عرض کروں گا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین معاذ اللہ بزدل نہیں تھے (العیاذ باللہ) کہ خاموشی سے ماریں کھاتے رہے اور ظلم و ستم اور عقوبت و تعذیب جھیلتے رہے ۔ بلکہ یہ اس لیے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا ۔ کُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ ۔ اجازت جب تک نہ ہو ہاتھ نہ اٹھیں ۔ پھر سن لیجئے کہ یہ حکم قرآن میں نازل نہیں ہوا تھا[2]۔ یہ حکم تھا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ پوچھا تک نہیں کہ قرآن میں کہاں آیت اتری ہے کہ ہم ہاتھ نہ اٹھائیں ۔ لہٰذا جان لیجئے علامہ اقبال کا یہ شعر صد فی صد صحیح ہے کہ ؎

به مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

---

[1] غور کیجئے کہ اس سے بڑی ڈسپلن کی پابندی اور کیا ہو سکتی ہے کہ چاہے تمہارے ساتھ یا تمہارے کسی رفیق کے ساتھ یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کتنا ہی ہولناک اور ناقابلِ برداشت معاملہ کیا جائے ظلم و ستم کے کتنے ہی پہاڑ توڑے جائیں تم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے ۔ اس طرح گویا کہ سمع و طاعت کی تربیت بھی ہو رہی ہے (مرتب)

[2] واضح رہے کہ پورے مکی قرآن میں یہ الفاظ کہیں وارد نہیں ہوئے ۔ بعد میں امرِ واقعہ کے اظہار کے طور پر سورۃ النساء میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں جو مدنی سورۃ ہے ۔

"اپنے آپ کو مصطفیٰ کے قدموں تک پہنچاؤ اس لیے کہ دین تو نام ہی مصطفیٰ کا ہے۔ وہاں تک رسائی نہیں ہوئی تو اس کے باہر تو بولہبی یعنی کفر، زندقہ اور ضلالت ہی ضلالت ہے"۔

یہ قرآن جس پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے ہمیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ملا ہے۔ یہ مجھ پر یا کسی اور پر تو نازل نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ابو بکر، عمر، عثمان، علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وارضاہم پر بھی نازل نہیں ہوا۔ رسول اللہ پر قرآن بھی نازل ہوا اور نہ معلوم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید کیا کیا نازل فرمایا ہے! حضورؐ کا ارشاد ہے: اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ۔" مجھے قرآن بھی ملا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی مثل اور بھی ملا ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے حکمت دی ہے، بصیرت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بے پناہ صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ پھر وحی خفی ہے۔ بہت سی باتیں اللہ تعالیٰ بذریعہ الہام حضورؐ کو پہنچا رہا ہے۔ کبھی خواب کے ذریعے سے رہنمائی دی جا رہی ہے۔ کبھی کشف ہو رہا ہے۔ یہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا ایک حصہ ہیں جو اسؐ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی۔

ہاتھ نہ اٹھانے کی بہت سی حکمتوں میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ عادت پڑ رہی ہے اور خوگر ہو رہے ہیں سمع وطاعت کے۔ ہاتھ نہیں اٹھانا! جھیلنا ہے، برداشت کرنا ہے اور صبر کرنا ہے۔ ساتھ ہی ایک حکم اور بھی ہے کہ پیچھے نہیں ہٹنا۔ موقف پر ڈٹے رہنا ہے۔ یہ نہ ہو کہ اس تشدد سے گھبرا کر اپنے انقلابی نظریہ کو خیرباد کہہ دو۔ اس سے کنارا کش ہو جاؤ۔ نہیں! ڈٹے اور کھڑے رہنا ہے۔ جان جاتی ہے تو جائے۔ یہ ہے اس تصادم کا پہلا مرحلہ صبر محض یا Passive Resistance ———— میں نے اس بارے میں مختلف مواقع پر تقاریر کی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے غلط نتیجہ اخذ کیا۔ دو سال پہلے مجھے اسلام آباد میں تقریر کر کے وہیں سے دعوتی دورے پر امریکہ جانا تھا۔ اسلام آباد میں میں نے سیرت النبی علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر تقریر کی تھی جس میں اس Passive Resistance کا بھی ذکر تھا۔ بعض اخبارات میں اس کی رپورٹنگ غلط انداز میں ہوئی اور خواجہ صفدر صاحب نے میرے خلاف ایک بیان داغ دیا تھا۔ مجھے وطن واپس آ کر معلوم ہوا۔ میں اصل میں کہتا یہ ہوں کہ اغیار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ و مبارکہ

اندھی نے عدم تشدد کا جو نظریہ اختیار کیا وہ درحقیقت حضورؐ کی سیرت سے ماخوذ ہے۔
س لیے کہ اس سے پہلے یہ چیز صرف دو جگہ نظر آتی ہے ۔ یا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی حیاتِ طیبہ میں ۔ مسلسل بارہ برس ۔ اس سے بڑا اور طویل عرصہ کہیں نظر آئے گا ہی نہیں ۔ یا پھر
وہ تین سال جو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تھے ۔ اس کو بھی لوگوں نے غلط سمجھا ہے اور
بعض مسلمان بھی غلط فہمی میں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ موجودہ اناجیل میں اس ضمن میں آں جنابؑ کے
جو اقوال ملتے ہیں وہ آپؑ کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں ۔ انجیل میں چونکہ تحریف مسلّم امر ہے
لہٰذا سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ باتیں کسی اور کی ہونگیں جو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کر دی گئی ہیں ۔ لیکن
مجھے یقین ہے کہ وہ جملے آں جنابؑ ہی کے فرمائے ہوئے ہیں ۔ صرف ان کا موقع و محل
سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ غور کرنے سے ان کا مطلب واضح ہو جاتا اور سمجھ میں آجاتا ہے ۔ آنجنابؑ
کے اقوال یہ ہیں کہ "اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو بایاں بھی پیش کر دو" اور
یہ کہ "اگر کوئی نالش کر کے تمہارا چوغہ لینا چاہے تو تم کرتا بھی اتار کر دے دو" اور ۔ "تمہیں
کوئی بیگار میں اپنے ساتھ ایک کوس لے جانا چاہے تو تم دو کوس جاؤ ۔" یہ درحقیقت بالکل
ابتدائی اور تمہیدی دور کی تعلیم ہے جس میں دعوت و تبلیغ کے ساتھ ہی مصائب و تشدد کا مرحلہ شروع
ہو جاتا ہے ۔ اس کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام صبر محض اور ایثار و قربانی کی یہ تعلیم دے رہے
ہیں تاکہ ایک طرف معاندین و مخالفین کا بغض و خبثِ باطنی آشکارا ہو جائے ۔ دوسری طرف
اہلِ ایمان میں قوتِ برداشت پیدا ہو ۔ اب یہ مشیتِ الٰہی تھی کہ اسی صبر محض یعنی Passive
Resistance کے دور میں کہ آں جنابؑ کا رفعِ آسمانی ہو گیا ۔ گو کہ یہودیوں نے تو اپنی
دانست میں آنجنابؑ کو صلیب پر چڑھا کر دم لیا تھا ۔ عیسائیوں کی عظیم ترین اکثریت بھی ایسی
غلط فہمی میں مبتلا چلی آ رہی ہے ۔ جبکہ انجیل برنباس میں وہی باتیں بیان ہوئیں جو قرآن میں ہوئی
ہیں اور جو حقیقت و صداقت پر مبنی ہیں ۔ کتاب و سنت کے مطابق آپؑ بجسدِ شریف زندہ
آسمان پر اٹھا لیے گئے ۔ وہاں جسم و روح کے تعلق و اتصال کے ساتھ حیات ہیں ۔ قربِ قیامت
میں آنجنابؑ کا نزول ہوگا ۔ آپؑ بنفسِ نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے ۔ آپؑ کے ہاتھ میں
تلوار بھی ہوگی یعنی آپؑ قتال فرمائیں گے ۔ اور سیرتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مدنی دور کی
بھی جھلک دنیا سیرتِ عیسوی علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام میں دیکھ لے گی ۔ آپؑ اس نزول
کے وقت نبی و رسول آخر الزماں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہوں گے ۔ آپؑ

ہاتھوں یہودیوں کو عذابِ استیصال کا مزا چکھنا ہوگا۔ دجّال اکبر اس جناب کے ہاتھوں قتل ہوگا۔ یہودی دنیا سے اسی طرح نیست و نابود کر دیئے جائیں گے۔ جیسے قوم نوح، قوم عاد و ثمود، قوم لوط و مدین وغیرہ وقت کے رسولوں کی تکذیب کے جرم میں اس دنیا سے بھی نسیاً منسیاً کر دی گئیں اور آخرت کا عذاب توان کا مقدر ہے ہی۔

سیرت عیسوی میں چونکہ 'اقدام' یعنی ' Active Resistance ' کا دور آیا ہی نہیں۔ لہٰذا مسلح تصادم کا دور کیسے نظر آتا!۔ ویسے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نیا نظام شریعت لے کر تشریف نہیں لائے تھے بلکہ شریعت موسوی کی تجدید و احیاء کے لیے مبعوث ہوئے تھے چنانچہ موجودہ اناجیل میں آپؑ کے پہاڑی کے وعظ میں یہ قول آج بھی موجود ہے کہ "جہاں تک قانونِ شریعت کا تعلق ہے میں اسے بدلنے نہیں آیا۔ قانون تورات ہی کا نافذ رہے گا"۔ قرآن میں قصاص کا قانون تورات کے حوالے سے بیان ہوا ہے اور شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تورات کے اس قانون کو باقی رکھا گیا ہے۔ تو کیسے ممکن تھا کہ قصاص کے اس قانون کو حضرت مسیحؑ ساقط کر دیتے۔ لیکن قانون اور ہوتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی دور میں کسی طرح بھی قصاص کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس موقع پر حکم ہوتا ہے 'کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ' حضرت مسیحؑ کے اقوال میں اگر تدبر اور غور و فکر سے کام لیا جائے، تو وہاں یہی حکمت کارفرما نظر آتی ہے۔

ویسے تورات کا قصاص کا یہ قانون پوری دنیا میں زبان زدِ عام ہو گیا تھا کہ 'آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کان کے بدلے کان۔ دانت کے بدلے دانت اور جان کے بدلے جان'۔ لیکن دیکھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کے اس آفاقی و مسلّمہ قانون کی بجا آوری سے صحابہ کرامؓ کو روک رکھا تھا۔ ورنہ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہوتی، بلالؓ صبر و سکون کے ساتھ امیہ ابن خلف کے بہیمانہ تشدد کا نشانہ نہ بنتے۔ جان پر کھیل جاتے اور اس ظالم کو مزا چکھا دیتے۔ کیا جو ذہنی اور جسمانی کوفت و اذیت مکہ کی گلیوں میں مردہ جانور کی طرح کھینچے جانے کے باعث ہو رہی تھی۔ وہ جان دینے سے کم تھی!۔ اگر اجازت ہوتی تو خبابؓ ابن ارت ننگی پیٹھ دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹنے کے بجائے کیا دو چار کو ساتھ لے کر نہ مرتے۔ ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ یہ سارا اہتمام میرے لیے ہو رہا ہے۔ یہ دہکتے انگارے میرے لیے بچھائے جا رہے ہیں۔ ان سے

کہا جاتا ہے کہ کرتا اتارو اور وہ اتار دیتے ہیں۔ ان انگاروں پر لیٹ جاؤ اور وہ لیٹ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اور نہ آدمی پس و پیش کرتا ہے۔ آدمی Desperate ہو جائے تو اس میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کمزور بھی ہو تو بھی ایسے شخص میں مقابلے کی زبردست طاقت عود کر آتی ہے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر بلی کہیں گھیرے میں آجاتی ہے اور اسے پتہ چلے کہ مجھے راستہ نہیں ملتا تو وہ انسان پر حملہ کرتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جان لیتی ہے کہ اس کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہیں۔ لیکن وہاں اجازت نہیں ہے۔ تو یہ بات بہت اہم ہے۔ معاذ اللہ بزدلی کا وہاں معاملہ نہیں تھا۔ نہ معاذ اللہ بے غیرتی اور بے حمیتی کا کوئی معاملہ تھا کہ اہلِ ایمان یہ تشدد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن حرکت نہیں کرتے۔ یہ فلسفۂ انقلاب ہے اور گاندھی نے عدم تشدد کا فلسفہ سیکھا ہے تو یہاں سے۔ البتہ گاندھی کی حماقت یہ ہے کہ اس نے اسے مستقل فلسفہ بنا لیا۔ یہ فلسفہ ایک دور کا فلسفہ ہے یہ کوئی مستقل فلسفہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس درجے میں عدم تشدد کہ جس درجہ میں بعد میں جا کر گاندھی نے اس کی تبلیغ کی۔ وہ نری حماقت ہے۔ جن لوگوں کی نظر سے مولانا آزاد کی کتاب 'INDIA WINS FREEDOM' گزری ہے، ان کے علم میں ہوگا کہ وہ گاندھی کے اس فلسفہ کا مذاق اڑاتے ہیں کہ گزشتہ جنگِ عظیم میں گاندھی نے اتحادیوں کو ہٹلر کے آگے عدم تشدد کے فلسفہ کے تحت ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی تھی۔ عدم تشدد کے فلسفہ کو اس سطح تک لائیں گے تو یہ پاگل پن ہے لیکن ہاں ایک انقلابی تحریک اپنے ابتدائی مرحلہ میں اسے اختیار کرتی ہے۔ گاندھی نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس لئے کہ اگر شروع میں کانگریس کی پالیسی میں عدم تشدد کی پالیسی نہ ہوتی تو انگریز آناً فاناً پوری تحریک کو کچل کر رکھ دیتا اور تحریک آگے نہ بڑھ سکتی۔ حکومت کے ہاتھ بندھ گئے تھے کہ کیا کرے! تشدد کر نہیں رہے۔ اُسے عالمی رائے عامہ کا بھی لحاظ رکھنا تھا

میں اس کی ایک مثال آپ کو پہلے بھی سنا چکا ہوں آج پھر سنا دیتا ہوں۔ اس کے راوی اور چشم دید گواہ آج بھی الحمد للہ بقیدِ حیات ہیں۔ حاجی عبدالواحد صاحب ایم۔ اے' ۴۹ علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو) یہاں کی رہائش ہے جو شخص چاہے ان کے پاس جا کر اس توثیق کر لے ___ سکھوں کی ایک تحریک تو اب چل رہی ہے۔ یہ تو بالکل برعکس ہے۔ یہ تو Violent ہو گئی۔ خونریزی پہ اتر آئی ہے۔ اس کا نتیجہ بھی سامنے آ رہا ہے کہ بھارت کی موجودہ حکومت اسے پوری طاقت کے ساتھ کچلنے میں مصروف ہے۔ لیکن ایک تحریک سکھوں

کی طرف سے آج سے قریباً پچپن سال قبل یعنی ۱۹۳۰ء میں چلائی گئی تھی۔ جو لوگ اسے پہلی بار سن رہے ہیں وہ یقیناً یہ سن کر حیران ہوں گے کہ سکھوں کے گوردواروں کے ساتھ جو اوقاف تھے ان پر قبضہ ہندوؤں کا تھا۔ چونکہ سکھوں کے بارے میں پورے طور پر یہ تعین نہیں تھا کہ یہ کوئی علیحدہ مذہب ہے۔ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہندو مت ہی کا ایک فرقہ ہے۔ لہٰذا سکھوں کے گوردواروں کے اوقاف پر ہندو قابض تھے اور ان کی آمدنی میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کچھ بڑے لوگ پٹواریوں کی مٹھی گرم کر کے کاغذات اور دستاویز تبدیل کرا کے انہیں ذاتی ملکیت بنا لیتے تھے[1] سکھوں نے تحریک چلائی کہ ہمارے گوردواروں اور ان کے اوقاف کا کنٹرول ہمارے پاس ہونا چاہیئے۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ عبادت گاہیں ہماری اور ان کے ساتھ جو املاک و اوقاف ہیں وہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہندو کی رسائی انگریز کے دربار میں بہت ہو چکی تھی۔ انگریز کو ہندوؤں کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ سکھ چونکہ ایک جنگجو قوم تھی اور قریباً پون صدی قبل انگریزوں نے پنجاب کی حکومت سکھوں سے چھینی تھی تو انگریزی حکومت سکھوں سے اسی طرح خائف رہتی تھی جیسے مسلمانوں سے سوائے پنجاب کے مسلمانوں کے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز نے ہی پنجاب کے مسلمانوں کو سکھا گردی اور مظالم سے نجات دلائی تھی۔ لہٰذا انگریزی حکومت کے خلاف دشمنی کے جذبات پنجاب کے مسلمانوں کے نہیں تھے جو ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے تھے —— اس لئے کہ پنجاب کے مسلمان سکھوں کی حکومت میں انتہائی ذلت و خواری کی غلامی میں مبتلا رہے تھے۔ لہٰذا وہ انگریز کی حکومت سے عموماً خوش رہے اور اس کو غنیمت خیال کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگر پنجاب کے مسلمانوں کی فوجوں نے انگریز کی مدد نہ کی ہوتی تو اسی وقت ہندوستان سے انگریز کا نام نشان مٹ جاتا۔ یہ باتیں برسبیل تذکرہ زبان پر آگئیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انگریز سکھوں سے بھی کسی نہ

---

[1] جیسے ہمارے یہاں مزارات ہیں۔ ان کے ساتھ اوقاف ہیں تو گدی نشین صاحبان ان کے ایک طرح مالک ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی جب اوقاف ایکٹ بنا تو ان گدی نشینوں میں سے بھی بڑی اکثریت نے پٹواریوں کی مٹھی گرم کر کے بہت سی املاک کے لئے اپنے حق میں کاغذات اور دستاویزات تبدیل کرا لیں اور اب ان کی آمدنی پر عیش کر رہے ہیں۔

کسی درجہ میں اسی طرح الرجک تھا جیسے کہ بقیہ ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا۔ لہٰذا انگریز نے ہندوؤں کی پشت پناہی کی اور سکھوں کے اس معقول مطالبہ کو رد کر دیا۔ اور پولیس کو تو حکومت کی شہ اور پیسہ چاہیئے۔ لہٰذا اس کی طرف سے بھی ہندوؤں کا پورا پورا ساتھ دیا گیا۔ حاجی عبدالواحد صاحب جو امرتسر کے رہنے والے ہیں بتاتے ہیں اور وہ عینی شاہد ہیں کہ بالآخر سکھوں نے اس تحریک کو عدم تشدد کے اصول پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ احتجاج کے لئے سکھوں کا جو جتھا نکلتا تھا اس کو حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھیں۔ ہر جتھا عموماً پچاس رضاکاروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اغلباً دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ لہٰذا قانون کی خلاف ورزی ہوگئی۔ اور پولیس کو اختیار حاصل ہوگیا کہ ان پر لاٹھی چارج کرے، ڈنڈے چلائے اور ان کو منتشر کر دے ___ ادھر ان رضاکاروں کو یہ حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھیں اور ماریں کھائیں لیکن پیچھے نہ ہٹیں۔ حاجی صاحب بتاتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لاٹھیاں پڑ رہی ہیں، سر پھٹ گیا ہے، سکھ رضاکار زمین پر گر گیا ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ نہیں کھلے۔ وہ بندھے رہے۔ جتھے کے تمام رضاکار اسی طرح زخمی ہو کر گرتے رہے لیکن کیا مجال کہ کسی کے ہاتھ کھلے ہوں۔ ایک جتھا اسی طرح بری طرح زخمی ہو گیا تو اس کی جگہ لینے دوسرا جتھا آگیا ___ میں نے جب حاجی صاحب سے یہ واقعہ سنا تو میں حیران رہ گیا اور میرا ذہن قرآن کے ان الفاظ کی طرف منتقل ہوگیا: کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ___ یہ ہے صبر محض یعنی Passive Resistance ۔ اس میں بڑی طاقت ہے۔ اس میں بڑی تاثیر ہے۔ یہ انسان کی قوتِ ارادی کا مظاہرہ ہے۔ اس میں اس عزم کا اظہار ہے کہ "ہرچہ بادا باد"۔ پھر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ یہ کوئی بے ترتیب ہجوم نہیں ہے ___ بلکہ نظم و ضبط کی عادی (Disciplined) جماعت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو جو حکم دیا جاتا ہے اسے وہ پورا کرتے ہیں۔ ان دو چیزوں کا مظاہرہ (Demonstration) ہو جائے تو اس میں بڑی قوت ہے۔ چنانچہ انگریز کو جھکنا پڑا ___ اور سکھوں کی تحریک کامیاب ہوئی۔ اور ان کے گوردواروں کے اوقاف کا انتظام و انصرام ان کو مل گیا۔

گاندھی کا واقعہ آتا ہے کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں عدم تشدد کی بنیاد پر انہوں نے ترکِ موالات کی جو تحریک، تحریکِ خلافت کے ساتھ مل کر چلائی تھی تو اس کے دوران پورے ہندوستان میں صرف ایک جگہ عدم تشدد کے اصول کی خلاف ورزی ہوئی۔ صوبہ بہار کا چورا چوری کے نام کا

ایک قصبہ تھا۔ اس کا ایک تھانہ تھا۔ پولیس والوں نے کچھ شرارت کی اور جو جلوس نکلا ہوا تھا اس میں بعض لوگ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے تھانے پر حملہ کیا، بہت سے سپاہیوں کو مار دیا اور تھانہ میں آگ لگا دی جس میں کچھ پولیس والے زندہ جل کر مر گئے۔ اب آپ دیکھئے کہ گاندھی نے صرف اس ایک حادثہ پر پوری تحریک ختم (Call off) کر دی۔ اس وقت گاندھی کی زندگی میں بڑا نازک مرحلہ آیا تھا۔ پورے ہندوستان میں اس کے خلاف جذبات مشتعل ہو گئے کہ کیسا لیڈر ہے کہ اس نے تحریک ختم کر دی۔ ایسے موقع پر تو عموماً لوگ لیڈر کو گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن گاندھی نے اپنی لیڈری کی موت کا خطرہ مول لیا کہا تو یہ کہا کہ اگر تم میرے حکم پر نہیں چل سکتے تو میں رہنمائی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ میرا حکم یہ ہے کہ تمہیں ہاتھ نہیں اٹھانا۔ تشدد نہیں کرنا۔ تم تشدد کر رہے ہو تو گویا تم میرا حکم ماننے کو تیار نہیں ہو۔ میں اس تحریک کی رہنمائی کی ذمہ داری کیسے قبول کر لوں کہ جس کے بارے میں مجھے یہ اعتماد نہ ہو کہ اس تحریک میں حصہ لینے والے میری بات کو مانیں گے۔ گاندھی کی بڑی معقول بات تھی ـــ گاندھی کا ذکر اگر میں کرتا ہوں تو اس اعتبار سے نہیں کہ معاذ اللہ وہ میرے لئے کوئی حجت ہے یا کوئی دلیل ہے یا رہنمائی کے لئے کوئی مثال ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ گاندھی نے یہ اصول سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے سیکھا ہے۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ گاندھی کا اسلام کا مطالعہ تھا ـــ میں آج اس کے لئے دو مثالیں پیش کر دیتا ہوں ـــ

میں حال ہی میں دعوتی دورے پر حیدرآباد دکن گیا تھا۔ وہاں میں نے متعدد تقریریں کیں اور قرآن حکیم کے درس بھی دیئے ـــ تو ایک صاحب جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ہیڈ آف پولیٹیکل سائنس کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے انہیں میری فلسفۂ انقلاب والی تقریر بہت پسند آئی۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ بعد میں وہ مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے میری باتوں کی توثیق کے لئے بہت سے واقعات بتلائے۔ انہوں نے علی گڑھ سے ایم اے کیا تھا ـــ انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ جو غالباً ۱۸ء یا ۱۹ء کا ہے۔ اس وقت وہ وہاں پڑھتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی نے نسلی امتیازات کے خلاف جو تحریک چلائی تھی، اس کی وجہ سے وہ پوری دنیا میں مشہور ہو گئے تھے۔ کالج میں اعلان ہوا کہ گاندھی کالج آ رہے ہیں۔ اس وقت تک علی گڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ لوگوں میں بڑا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ صاحب

ـتے ہیں کہ گاندھی آئے اور سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جس میں سرسید احمد خاں مرحوم کی
ہے ۔ وہاں وہ اکیلے پون گھنٹے تک سرسید مرحوم کی قبر کے پائنتی بیٹھے رہے۔ ایسا کیوں ہوا!
للہ جانے ۔ گاندھی جب باہر آئے تو منتظمین اور طلبہ نے ان سے جلسہ سے خطاب کے لئے
۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو صرف سرسید صاحب کی قبر کی زیارت کے لئے آیا تھا ۔ مجھے اور
ئی کام نہیں ہے ۔ جب بہت زور دیا گیا تو گاندھی نے کہا کہ پہلے میں پورے کالج اور ہوسٹل
یک چکر (Round) لگانا چاہتا ہوں ۔ اس وقت ہوسٹل کی وہ صورت نہیں تھی جو
ل ہے ۔ اس وقت علی گڑھ میں نواب زادوں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے رئیسوں
لڑکے پڑھتے تھے ۔ تو ہر ایک کے کمرے میں قالین بچھے ہوئے اور صوفے لگے ہوئے
۔ کالج کے طلبہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے ۔ گشت کے بعد گاندھی نے ہال
ں تقریر کی اور تقریر میں انہوں نے مختصر سی باتیں کہیں ۔ جن میں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں
ـ یہ کہ میں آپ حضرات کو خوشخبری دیتا ہوں کہ آپ کا یہ کالج جلد ہی یونیورسٹی بن جائے گا۔
ں کا فیصلہ ہو چکا ہے ۔" دوسری خاص بات یہ کہی " اگر آپ کا کالج یا آپ کی یونیورسٹی
ـ بھی حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) پیدا کر دے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی ۔ لیکن میں دعویٰ سے
تا ہوں کہ آپ کا کالج یا یونیورسٹی ایک بھی حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) پیدا نہیں کر سکتی ۔ اس کی
یہ ہے کہ میں نے آپ کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ لئے ہیں، صوفوں اور قالینوں پر پڑھنے والے
ضرت عمر نہیں بن سکتے ۔" آپ بتائیے کہ اس کا کتنا گہرا مطالعہ تھا ۔ کیا حضرت عمرؓ کو جانے بغیر
ئی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے ! ـــــ میں نے جب ان سے یہ واقعہ سنا تو فوراً میرا ذہن علامہ
بال مرحوم کی اس نظم کی طرف منتقل ہوا جو علامہ نے اسی زمانہ میں کہی تھی جس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔
را خیال ہے کہ گاندھی کی اس بات کی اخبارات میں رپورٹنگ ہوئی ہوگی اور شاید علامہ نے اسی
سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا ہوگا کہ ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

بہر حال یہ ایک خیال ہے ۔ اب کوئی اس کی تحقیق کرے تو بات واضح ہو سکے گی ۔
ـــ گاندھی کی بعد والی دوسری بات بہت مشہور و معروف ہے کہ جب ۱۹۳۷ء میں بہت
سے صوبوں میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت کانگریس کی پہلی بار وزارتیں بنیں تو گاندھی نے اپنے

اخبار ہریجن میں لکھا اور شاید تمام وزرائے اعلیٰ کو خطوط بھی لکھے ہوں جس کا مفہوم یہ تھا کہ "میں تمام وزیروں سے کہتا ہوں کہ حکومت میں حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی مثال سامنے رکھنا۔ جنہوں نے درویشی میں ایک عظیم ترین سلطنت کی سربراہی کی ہے"! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے پہلے قرنِ سعید کا گاندھی کا مطالعہ کتنا تھا! ۔ بہرحال میں گاندھی کے عدم تشدد کی بات کرتا ہوں تو اس اعتبار سے کہ انہوں نے یہ سبق سیرت النبی سے سیکھا ہے۔ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام!

بات صبرِ محض یعنی *Passive Resistance* کی ہو رہی تھی۔ جو فلسفۂ انقلاب کی شرطِ اوّلین (*Pre Requisite*) ہے۔ ہمارے یہاں بھی تحریکیں چلتی ہیں گو وہ انقلاب کے لئے نہیں ہوتیں۔ صرف ایک ناپسندیدہ حکمران یا پارٹی کو ایوانِ حکومت سے بے دخل کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ تحریک کے قائدین کہا کرتے ہیں کہ جلوس تو ہم نے نکالا لیکن توڑ پھوڑ کوئی اور کر گیا۔ عجیب بات ہے۔ آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ سڑکوں پر آئیں۔ اگر آپ کی اتنی تنظیم نہیں ہے۔ اگر آپ کا اتنا کنٹرول نہیں ہے اگر آپ کا اتنا ڈسپلن نہیں ہے۔ جلوس نکل رہا ہے حکومتِ وقت کے خلاف اور شامت آ رہی ہے قومی املاک کی۔ کہیں اسٹریٹ لائٹیں توڑ دی گئی ہیں۔ کہیں نیون سائن اور اسٹریٹ سگنلز کی شامت آ گئی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تماشہ! بسوں کے ٹائر پھاڑے جا رہے ہیں۔ بسیں جلائی جا رہی ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ قریباً ساٹھ ستر آدمیوں کو ہم نے بس سے اتار کر کھڑا کر دیا اور بس کو آگ لگا دی تو وہ لوگ ہم کو دل میں گالیاں نہیں دے رہے ہوں گے اور اس طرح رائے عامہ ہمارے حق میں جا رہی ہے یا خلاف جا رہی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر کسی کو چار پانچ میل دور اپنے کسی مقام پر جانا ہے تو اس پر کیا بیتی ہوگی۔ پھر ایسی حرکتوں سے وقت کے برسرِ اقتدار طبقہ کو کیا تکلیف پہنچتی ہے۔ اور اس کا کیا نقصان ہوتا ہے! تکلیف پہنچتی ہے عوام الناس کو اور نقصان ہوتا ہے قومی املاک کا ۔۔۔ اس کا نام مظاہرہ نہیں ہے۔ یہ تو

ؔ محترم ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر کئی ماہ پہلے مسجد دارالسلام میں ارشاد فرمائی تھی۔ حال ہی میں نوائے وقت کے ممتاز کالم نگار جناب م۔ش صاحب کا ایک خط ڈاکٹر صاحب کو موصول ہوا ہے جس میں فاضل کالم نگار نے یہ انکشاف کیا ہے کہ خان عبدالغفار خاں نے ایک بار انہیں (یعنی م ش صاحب کو) یہ بتایا کہ گاندھی نے عدم تشدد کا فلسفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے اخذ کیا ہے۔ (مرتب)

در حقیقت فساد ہے، ہنگامہ ہے۔ اس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ نتیجہ خیز مظاہرہ وہ تھا جس کی میں نے ابھی سکھوں کی مثال دی ہے ــــ اپنے حقوق کے لئے، اپنے جائز مطالبوں کے لئے کسی مستبد اور جابر برسرِ اقتدار طبقے کے خلاف سڑکوں پر نکلنا پڑے تو نکلے لیکن اس شان سے کہ لاٹھی چارج سے سر پھٹ جاتے، گولیوں کی بوچھاڑ سے جسم زخمی ہو جائے آنسو گیس سے آنکھوں میں شدید اذیت پہنچے لیکن ہاتھ بندھے رہیں اور کسی نوع کا Retaliation نہ ہو۔ یعنی جواب میں کسی نوع کا بھی متشددانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے رہا توڑ پھوڑ، بسوں، موٹر سائیکلوں، موٹروں اور قومی املاک کو نقصان پہنچانا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ فساد ہے، بدامنی ہے جو حکومتِ وقت کو پوری قوت کے ساتھ تحریک کو کچلنے اور ختم کرنے کا اخلاقی اور قانونی دونوں جواز فراہم کرتی ہے ــــ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ میں دوسروں کی مثالیں اگر دیتا ہوں تو صرف اس اعتبار سے کہ میرا حقیقتاً علامہ اقبال مرحوم کے ان اشعار پر پورا یقین ہے کہ ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اورا بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سعید و مبارک دور سے ہی بہت کچھ سیکھا ہے یا ابھی نوعِ انسانی نورِ مصطفیٰ کی تلاش میں ہے۔ یعنی بغیر جانے بوجھے اور غیر شعوری طور پر ان راستوں کی تلاش میں ہے اور اسی کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے جو راستے محمد رسول اللہ نے دیئے تھے۔ یہ یقین ہے جس کی وجہ سے میں دوسروں کی مثالیں دیا کرتا ہوں۔

بہرحال میرا ارادہ تھا کہ Resistance کے تینوں پہلو آج ہی مکمل کر دوں لیکن بات کچھ طویل ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سیرت کے وہ پہلو ہیں جو اس طور پر ہمارے سامنے نہیں ہیں اس لئے ان پر بات کچھ تفصیلاً بیان کرنی پڑ جاتی ہے ــــ بقیہ جو دو مراحل نسبتاً مختصر ہیں ان شاء اللہ ان کے بارے میں اگلے جمعہ میں گفتگو ہوگی۔ البتہ یہ بات یاد رکھئے اور میں نے شروع ہی میں اسے نوٹ کرا دیا تھا کہ یہ سیرت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ابھی Objective Study ہے۔ اس کے بعد دو اعتبارات سے فرق واقع ہونا لازمی ہے۔ ایک تو تمدنی و عمرانی ارتقاء کی وجہ سے چودہ صدیوں میں جو فصل ہے اس کے باعث جو فرق واقع ہوا ہے اس کو سامنے رکھنا ہوگا

اور ہمیں غور کرنا ہوگا کہ فلسفۂ انقلاب کے اس Phase کو ہم جوں کا توں Adopt (اختیار) کریں یا اس میں ہمیں سیرتِ مطہرہ ہی کے واقعات و حالات سے اصول لے کر استنباط کے ذریعہ سے تھوڑا بہت فرق کرنا پڑے گا ۔ دوسرے یہ کہ وہاں حضورؐ کا مقابلہ تھا ، غیر مسلموں سے ، مشرکوں سے اور کافروں سے ۔ اور اب جہاں کہیں بھی اسلامی انقلاب کی بات ہوگی تو ظاہر ہے کہ کسی مسلمان ملک میں ہوگی ۔ اس انقلاب کا راستہ روکنے والے بہرحال مسلمان ہی ہوں گے ۔ چاہے وہ محض نام ہی کے ہوں ۔ قانوناً تو وہ مسلمان ہی قرار پائیں گے ، اس اعتبار سے بھی اجتہاد کی ضرورت ہوگی ۔ ان پہلوؤں پر ان شاء اللہ اگلے جمعوں سے ترتیب وار گفتگو ہوگی ۔ ایک بات یہ بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ میں اسلامی انقلاب کے جو مراحل ، مدارج اور لوازم تقاریر کے ذریعے بیان کر رہا ہوں اور ہر تقریر میں ایک ہفتہ کا وقفہ حائل ہوتا ہے ۔ اس لئے خواہی نہ خواہی بعض باتوں کا اعادہ اور تکرار ہو جاتی ہے جو اس صورت میں Avoid کرنی میرے لئے مشکل ہوتی ہے ۔ توقع ہے کہ میری اس مشکل اور دقت کے پیشِ نظر آپ مجھے رعایت (Allowance) دیں گے ۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

انٹرویو کے آئینہ میں

امیرِ تنظیم سے ہفت روزہ "چٹان" کے نمائندے محمد آصف بھلی کا مفصل انٹرویو

س : ڈاکٹر صاحب! کیا آپ ہمیں اپنی ابتدائی زندگی، تربیت اور بچپن کی معصوم خواہشوں کے بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟

ج : میری پیدائش مشرقی پنجاب کے قصبے حصار میں ہوئی، ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو۔ اب بھارت کی ریاست ہریانہ میں یہ ریاست شامل ہے جس زمانے میں ہم اسے چھوڑ کر آئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں۔ تو اس کی آبادی تیس ہزار تھی۔ اب وہ تین لاکھ کو پہنچ چکی ہے۔ اور اس وقت وہاں کالج کوئی نہیں تھا۔ اب یونیورسٹی ہے۔ ہمارے فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی کی سطح کی وہاں زرعی یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔ اصل میں میرے والدین کا تعلق مغربی یوپی کے ضلع مظفر نگر سے ہے۔ قصبہ بنت سے میری والدہ کا تعلق ہے اور حسین پور سے والد صاحب کا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں میرے پردادا پر انگریزی حکومت کی جانب سے کچھ عتاب نازل ہوا تھا۔ جس کی بنا پر ان کو وہاں سے نقلِ مکانی کرنی پڑی اور یہاں مشرقی پنجاب میں منتقل ہونا پڑا۔ میرے ذہن پر سب سے بنیادی اور زیادہ گہرا اثر علامہ اقبال کی ملی شاعری کا ہوا۔ علامہ اقبال کی شاعری میں جو امید افزا پیغام ہے کہ ؎

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہو گی
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

؎ نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

تو اس طرح کے اشعار کا میرے ذہن پر بڑا گہرا اثر مرتب ہوا اور اس سے ایک جذبہ پیدا ہوا۔

اسی زمانہ میں حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام بھی اسی جذبے کے ساتھ پڑھا جس طرح کہ کلام اقبال کو پڑھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات ایسی بھی گزری کہ ہمارے والد صاحب کسی سرکاری کام کے لئے دورے پر تھے تو میں نے پوری رات شاہنامہ ترنم کے ساتھ پڑھا اور والدہ نے سنا۔

اس زمانے میں مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا بھی شوق ہوا۔ ایک ہوتے تھے ماسٹر غلام محمد بھٹی۔ حصار میں ایک انڈسٹریل سکول تھا۔ اس کے وہ استاد تھے۔ ان کا بھی شوق تھا کتابوں کا۔ بڑی عمدہ کتابیں ہوتی تھیں ان کے پاس۔ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں ان سے لینے گیا تو انہوں نے پس وپیش سے کام لیا۔ بالآخر انہوں نے یہ کیا کہ کتاب کھولی اور فارسی کے کچھ اشعار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مطلب بتاؤ اور کتاب لے جاؤ۔ میں نے کبھی فارسی نہیں پڑھی تھی لیکن یہ کہ کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا ہوا کہ میں نے ان کا مفہوم جو اندازے سے بیان کیا وہ درست نکلا اور انہوں نے مجھے کتاب دے دی۔

میرا جو ہائی سکول کا دور ہے وہ ہے تحریک مسلم لیگ کے عروج کا زمانہ۔ اس وقت جو ایک جذبہ مسلم قوم کا، حصولِ پاکستان کا پورے برصغیر کے مسلمانوں میں سرایت کر گیا تھا اس کا رسدی حصہ ہم بچوں تک بھی پہنچ رہا تو میں اس زمانے میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں انتہائی جوش و خروش کے ساتھ حصہ لے رہا تھا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ضلع حصار میں صرف ایک مقام پر ہندوؤں کا کالج تھا۔ حصار شہر میں تو صرف سکول ہی تھے باقی ضلع میں بھی مسلمانوں کے تعلیمی ادارے سکولوں ہی کے درجے پر تھے۔ ظاہر بات ہے کہ ہماری فیڈریشن سکولوں کے طلبہ ہی پر مشتمل تھی اور اس کے عہدیدار بھی ہائی سکول کے طلبہ ہی تھے۔ میں ضلع حصار کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری بھی رہا ہوں اور اسی حیثیت میں میں نے ۱۹۴۱ء میں یہاں لاہور میں ایک کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس سے قائداعظم نے بھی خطاب کیا تھا۔

اس زمانے میں میرا تعارف مولانا مودودی اور ان کی جماعت یعنی جماعتِ اسلامی سے ہو چکا تھا۔ ان ابتدائی پمفلٹ میں نے شوق کے ساتھ پڑھے۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد قریشی ان دنوں بڑے استیعاب ساتھ مولانا مودودی کی تحریروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ تو مجھے بھی دلچسپی ہوئی۔ حصار میں جماعتِ اسلامی کے کارکنوں مرزا مسرت بیگ، چوہدری نذیر احمد کے یہاں میرا آنا جانا تھا۔ ان دونوں حضرات کا ملتان میں انتقال ہوا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب فیڈریشن کے حلقوں میں مولانا مودودی اور ان کی تحریروں پر تنقید ہوتی تھیں تو میں مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی مدافعت میں گفتگو کرتا تھا۔ البتہ جماعت کے کے ساتھ میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے حق میں گفتگو کرتا تھا۔ تو یہ میرا ایک بین بین سا معاملہ تھا تعلق میرا تحریک پاکستان اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے تھا لیکن یہ کہ ذہنی اور قلبی دلچسپی مولانا مودودی

ان کی تحریروں سے تھی۔ یہ بھی میں آپ سے عرض کر دوں کہ میں نے چھٹی جماعت ہی سے عربی کا مضمون لے لیا تھا اور سکول کے ذہین طلباء میں میرا شمار ہوتا تھا اگرچہ میں نے کبھی لکھنے پڑھنے میں محنت نہیں کی۔ اس وقت ترجمان القرآن میں تفہیم القرآن شائع ہو رہی تھی ہم اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس سے قرآن حکیم کی جانب ایک خصوصی رغبت اور لگاؤ پیدا ہوا۔ اس دور کے دلچسپ واقعات کے حوالے ایک یہ بات بھی عرض کر دوں کہ الطاف حسن قریشی جو اردو ڈائجسٹ کے مدیر ہیں وہ رشتے میں میرے چچا لگتے ہیں یہ ہوتے تھے سرسہ میں۔ جب کہ ہمارا زیادہ وقت گزرا ہے حصار میں۔ میٹرک کے امتحان کی تیاری کے لئے وہ میرے پاس آ گئے کہ مل جل کر مطالعہ کریں گے لیکن اس زمانے میں مجھ پہ دوسری قسم کی دلچسپیوں کا کچھ زیادہ غلبہ تھا۔ سیر بلکہ آج کی اصطلاح میں آوارگی کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ ہوتا یہ تھا کہ میں انہیں پڑھنے کے لئے بٹھا دیتا تھا اور خود نکل جاتا تھا۔ والدین یہ سمجھ رہے ہوتے تھے کہ دونوں پڑھ رہے ہیں۔ تو اس سے مجھے ایک طرح کی ڈھال میسر آ گئی تھی اس سیر وغیرہ کے لئے۔

تقسیم کے بعد ہم کرشن نگر لاہور میں رہنے لگے۔ یہاں آ کر میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو ایف ایس سی میں نے گورنمنٹ کالج سے کیا۔ اس کے بعد میں میڈیکل کالج میں آ گیا۔ میرا جو تعلیمی کیریئر رہا ہے اس کے بارے میں بھی عرض کر دوں کہ میں نے پرائمری میں وظیفہ لیا تھا۔ آٹھویں جماعت میں بھی۔ دسویں جماعت میں پورے پنجاب یعنی متحدہ پنجاب میں مَیں مسلمان امیدواروں میں چوتھے نمبر پر آیا ساڑھے آٹھ سو میں سے میرے سات سو اٹھارہ نمبر تھے۔ اس کے بعد میں یہاں آ گیا۔ ایف ایس سی میں بھی میری نورتھ پوزیشن تھی۔ چنانچہ میں بڑی آسانی سے میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا۔ پانچ سال پھر میں نے میڈیکل کالج میں لگائے اور ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کر کے فارغ ہوا۔

پاکستان آتے ہی اب وہ جو مسلم لیگ کی تحریک کا منطقی نتیجہ ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی یہ کہ یہاں اسلام نافذ ہونا چاہیئے تھا اب اس کی علمبردار بن کر جماعتِ اسلامی سامنے آئی۔ مطالبے کئے۔ مہم چلائی کہ اسلامی دستور بننا چاہیئے۔ تو میرا پہلے سے بھی ایک تعارف اور ذہنی قرب جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی تحریروں سے ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً تحریکِ اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ دو سال کے دوران میں جب میں گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھا اس وقت کرشن نگر میں جماعتِ اسلامی کا ایک حلقۂ ہمدرداں تھا میں اس میں کام کرتا رہا۔ اس کے بعد جب میڈیکل کالج میں آ گیا تو میں نے اسلامی جمعیتِ طلبہ میں شمولیت اختیار کر لی اور اس میں مَیں نے بہت بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۵۱ء میں لاہور اور پنجاب کی جمعیت کا ناظم مقرر ہوا ۱۹۵۲ء میں سالانہ اجتماع میں میرا انتخاب ہوا ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے ایم بی بی ایس

پاس کر لیا۔ اس عرصے میں خاص طور پر مجھے وہ دلچسپی جو قرآن حکیم کے ساتھ میرے ہائی سکول کے ایام سے ہو گئی تھی اس میں مولانا مودودی کی تصنیفات سے مزید اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں جمعیت کے اجتماعات میں درسِ قرآن کی ذمہ داری اکثر و بیشتر مجھ پر ہوتی تھی۔ عام طور پر میرا درس پسند کیا جاتا تھا میں اس کے لئے محنت کرتا تھا۔ مطالعہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ تقریری صلاحیتیں بھی اس دور میں پروان چڑھیں۔ اس کے علاوہ کچھ لکھنے کا بھی شغف پیدا ہوا۔ کیونکہ اس زمانے میں ہم ایک رسالہ عزم نکالا کرتے تھے جس کی ادارت بھی میرے ذمے تھی۔ ان ساری چیزوں کا ابتدائی تجربہ مجھے جمعیت میں ہوا اور میں سمجھتا ہوں کہ میری آئندہ زندگی کی تعمیر میں اس دور کا یقیناً بہت زیادہ حصہ ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب! آپ کی گفتگو سے ایک بڑی دلچسپ صورتِ حال سامنے آئی کہ آپ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے مسلم لیگ کے ساتھ بھی وابستہ رہے اور آپ کا ذہنی اور قلبی رشتہ جماعتِ اسلامی سے بھی استوار رہا جو بہر حال اس وقت تحریکِ پاکستان کی ایک مخالف جماعت کا کردار ادا کر رہی تھی تو کیا یہ ایک طرح کا فکری تضاد نہیں۔ آپ بیک وقت اپنی ان دونوں وابستگیوں کا کیا جواز پیش کریں گے!

ج : میرے نزدیک تو اس میں کوئی نظریاتی بُعد نہیں ہے۔ جہاں تک تقسیم سے پہلے دَور کا تعلق ہے میری عملی وابستگی پوری کی پوری تحریکِ پاکستان کے ساتھ تھی۔ البتہ یہ کہ دینی تحریروں کے حوالے سے مجھے جماعتِ اسلامی پسند تھی۔ باقی میں یہ بتا چکا ہوں کہ جب کوئی بحث ہوتی تھی تو میں مسلم لیگیوں سے گفتگو کرتے ہوئے جماعتِ اسلامی کی مدافعت کرتا تھا اور جماعتِ اسلامی والوں سے گفتگو کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے حق میں دلائل دیتا تھا۔ البتہ قیامِ پاکستان کے بعد تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ کا جو موقف تھا جماعتِ اسلامی نے اسی کو اختیار کیا ہے تو اس اعتبار سے تضاد کا سوال ہی نہیں۔ البتہ یہ احساس مجھے بعد میں ہوا کہ جماعتِ اسلامی کا جو اصل موقف تھا انہوں نے اس کو چھوڑ کر یہ نیا موقف اختیار کر لیا۔ اس اعتبار سے میری لائن تو سیدھی ہے لیکن جماعتِ اسلامی کی لائن سیدھی نہیں ہے۔ لیکن اس کا پہلے مجھے اتنا شعور نہیں تھا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ہائی سکول کا طالب علم یا ایف ایس سی کا طالب علم اتنی باریک بینیوں میں نہیں جا سکتا۔

س : اچھا ڈاکٹر صاحب! میں تاریخ کے اس مغالطے کو بھی آپ کی زبان کے ذریعے دور کرانا چاہتا تھا کہ کچھ جماعتیں تھیں جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں تھیں۔ کچھ جماعتیں اپنے اس اختلاف کو تسلیم بھی کرتی ہیں لیکن جماعتِ اسلامی ایک ایسی تنظیم ہے جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ تحریکِ پاکستان کے دَور میں وہ مسلم لیگ اور اس کے مطالبۂ پاکستان کے خلاف رہی ہے۔ تو آپ اس بات کی وضاحت فرما دیجئے کہ تحریکِ پاکستا

کے حوالے سے قیامِ پاکستان سے پہلے جماعتِ اسلامی کا اصل موقف کیا تھا اور بعد ازاں اس میں کیا تبدیلی
آئی ــــ؟

ج : اس موضوع پر میری تو بڑی مفصل تحریریں موجود ہیں لیکن اس وقت آپ اختصار کے ساتھ جو چیز چاہتے
ں تو میں عرض کروں گا کہ اس میں دو چیزوں کو الگ الگ سمجھنا چاہیئے۔ ایک ہے مولانا مودودی کا رول ایک فرد
یثیت سے۔ جماعتِ اسلامی کے قیام سے قبل۔ ایک وہ دور ہے کہ جب جماعتِ اسلامی قائم ہو جاتی ہے
اس کے پلیٹ فارم سے مولانا مودودی کا کردار۔ ان دونوں میں کچھ فرق کیا جانا چاہیئے۔ مولانا مودودی
ے جب اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا ہے تو اس میں ابتداً انہوں نے بڑی سخت تنقیدیں کی تھیں جمعیت علماء
کے موقف پر اور متحدہ قومیت کے تصوّر کے خلاف بہت زوردار تحریریں انہوں نے سپردِ قلم کی تھیں۔
اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ برِ صغیر میں مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے شعور کو ابھارنے میں ان کا
حصّہ ہے۔ کانگریس اور جمعیت علماءِ ہند کا جو موقف تھا اس کی مخالفت میں انہوں نے فعال کردار
یا ہے۔ البتہ یہ کہ پھر انہوں نے خود اپنے موقف میں ایک تبدیلی پیدا کی اور اس تبدیلی کو وہ خود تسلیم
تے ہیں۔ وہ تبدیلی آئی ہے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں کہ انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ مسلم قوم پرستی ہندوستان
اب جو رنگ اختیار کر رہی ہے وہ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے کہ قوم پرستی ہی قوم پرستی اس کے اندر
ڑھتی چلی جارہی ہے اور اسلام کا عنصر اس میں کم ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے مسلم لیگ
اور تحریکِ پاکستان کی قیادت پر تنقید شروع کر دی۔ یہاں سے ان کا تحریکِ پاکستان سے نہ صرف علیحدگی
سلسلہ شروع ہو گیا۔ بلکہ مخالفت کا دور شروع ہو گیا۔ اب یہی زمانہ ہے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک جو
لیگ کی تحریک کا اصل دَور ہے۔ اس پورے دَور میں جماعتِ اسلامی نے مسلم لیگ کی اور تحریکِ پاکستان
کی کر مخالفت کی اور اس میں بعد میں انہوں نے جو تاویلیں کی ہیں وہ کسی طرح بھی درست نہیں ہیں۔
ب خلافِ واقعہ ہیں۔ اور اس پر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تاریخی حقائق کو بھی توڑنے مروڑنے کی
کی گئی ہے۔ حالانکہ ان کی تحریریں موجود ہیں اور کسی فرد یا جماعت کو اس طرح اپنے ماضی سے انحراف
رنا چاہیئے۔ اس سے وقتی طور پر تو شاید کچھ فائدے حاصل ہو جائیں لیکن انجام کار کے طور پر یہ تحریکوں
ئے سودمند نہیں ہوتا بلکہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ۱۹۴۷ء کے اواخر یعنی پاکستان آنے
مد پھر ایک دوسرا رخ اختیار کیا مولانا مودودی نے۔ وہ اپنے اصولی انقلابی موقف کو چھوڑ کر جو
سے لے کر ۱۹۴۷ء کے اواخر تک ان کا رہا۔ اور جس پر کہ جماعتِ اسلامی کاربند رہی پاکستان میں
نے مسلم قومی سیاسی جماعت کا کردار اپنایا۔

س : آج جماعتِ اسلامی کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود
ں آیا تھا۔ اس کے مقابلے میں سردار شوکت حیات اور ممتاز دولتانہ وغیرہ کہتے ہیں کہ پاکستان اسلامی نظام
کے نفاذ کے لئے قائم نہیں ہوا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جماعتِ اسلامی جو ایک تسلسل کے ساتھ
س بات کو دہرا رہی ہے کہ پاکستان اسلام اور صرف اسلام کے لئے قائم ہوا تھا تو پھر آخر کس بنیاد پر جماعتِ
سلامی نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی ؟

ج : اس معاملے میں دو طریق ہو سکتے ہیں میرے جواب کے۔ ایک تو یہ کہ جماعتِ اسلامی والوں کا جو اس
وقت موقف تھا میں اس کو بیان کردوں۔ ایک یہ کہ میں خود اپنی رائے دوں۔ مولانا مودودی کا جو موقف
رہا ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اصولاً درست تھا۔ وہ یہ تھا کہ صرف قومی جدوجہد کے
ذریعے سے ایک ملک کو حاصل کر لینے سے اس میں اسلام کو بالفعل قائم کرنے کا نتیجہ از خود برآمد نہیں ہوتا۔ ایک
سیکولر اور مسلم قومی ریاست تو وجود میں آسکتی ہے لیکن ایک اسلامی ریاست وجود میں نہیں آسکتی۔ مولانا مودودی
کا کہنا یہ تھا کہ ہم محض مسلم قوم نہیں بلکہ ہمیں اسلام کے لئے کام کرنا چاہیے تو اسلامی انقلاب برپا کرنے کا طریق
تو یہی ہے کہ پہلے صحیح صحیح اسلام کی دعوت دی جائے پھر جو لوگ اسے ذہناً قلباً اور شعوری طور پر قبول کریں ان کو منظم
کیا جائے۔ اور پھر انہیں خود اسلام پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ پھر یہ تحریک جب ایک قوت بن کر ابھرے اور یہ لوگ اپنی
دعوت میں توسیع کرتے ہوئے ایک انقلاب کی طرف پیش قدمی کریں تو اس کو میں سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی اسلامی
انقلابی لائحہ عمل۔ میرے نزدیک جماعتِ اسلامی کا وہ دور ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کا دور ہے۔ اس
اعتبار سے میں ان کے موقف کو درست سمجھتا ہوں۔ البتہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت جماعت کی طرف سے
جو شدّت پسندی کا مظاہرہ کیا گیا جس شدّت کے ساتھ انہوں نے مسلم لیگ کی تحریک کی نفی کی وہ انہیں نہیں
کرنی چاہیے تھی۔ اس لئے کہ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ چاہے اسلام ہم مسلمانوں میں اتنا زیادہ نہیں رہا تھا لیکن ہم
لوگ مسلمان تو تھے۔ اور جو شخص بھی مسلمان ہے اس کے کچھ حقوق ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی جو جدوجہد
ان کے قومی تشخص کے تحفظ کے لئے چل رہی تھی اس میں چاہے جماعتِ اسلامی شرکت نہ کرتی کہ ہمارا لائحہ عمل
تو اس سے مختلف ہے لیکن اس کی مذمت کرنا کسی طرح درست نہ تھا۔ اس سے تقویت تحریکِ پاکستان کی
مخالف قوتوں کو حاصل ہوئی تھی تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں کچھ جذباتیت اور شدّت پسندی کو دخل تھا
اختلافات بجا سہی مگر اس طرح کہ مسلم قوم پرستی کی تحریک کو ایک کفر اور شرک قرار دے دینا کسی طرح بھی درست
نہ تھا۔ میرے اپنے نزدیک بات یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی نے جس طرح تحریکِ پاکستان سے پہلے ایک اصولی
اسلامی جماعت کی طرح کام کیا تھا اسی نہج پر ان کو اپنا کام آگے بڑھانا چاہیے تھا اور پاکستان میں اسلا

انقلاب برپا کرنے کے لئے اپنی جدوجہد کرتے رہنا چاہئیے تھا۔ بدقسمتی سے یہاں آکر جماعت اسلامی نے بالکل دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ یہاں آکر اس نے ایک سیاسی جماعت کا روپ دھار لیا۔

رہا یہ معاملہ کہ آیا تحریک پاکستان اسلام کے لئے تھی یا نہیں تھی تو اس میں میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں بہت سا کنفیوژن ہمارے ہاں موجود ہے۔ جہاں تک تحریک پاکستان کے اس نعرہ کا تعلق ہے تو یہ محراب سے بھی اور منبر سے بھی ہے۔ سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارموں سے بھی ہے حکومت سے بھی ہے۔ اپوزیشن سے بھی ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ۔ (اس سے انکار ممکن نہیں)۔ بہرحال اختلافی آراء سامنے آتی رہتی ہیں حسین شہید سہروردی کی یہ رائے تھی کہ تحریک پاکستان خالص معاشی معاملہ تھا۔ جناب نورالامین نے بھی اسی طرح کی بات کی۔ اب آکر دولتانہ صاحب نے فرمادیا کہ پاکستان کی تحریک خالص سیاسی مہم تھی اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی طرح شوکت حیات نے بھی کہا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔ تو یہ نعرہ بھی چند چھوکروں نے ایجاد کیا تھا۔ میرے نزدیک دونوں طرف جزوی حقیقت موجود ہے۔ اصل صورت حال جو میں سمجھتا ہوں کہ وہ یہ ہے کہ اس پرابلم کے تین لیول تھے اور ہر لیول کے حساب سے جواب بدل جاتا ہے۔ مثلاً میں پانی کی مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک تو زمین کی سطح پر ہے جو نظر آرہا ہے۔ ایک کچھ نیچے ساٹھ ستر فٹ پر ہے۔ جسے ہم کنواں بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر یہ کہ بہت گہرائی میں آپ جائیں تو تین چار سو فٹ نیچے بھی پانی ہے۔ اسی طرح سے اس مسئلے کے بھی تین لیول ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے تو میرے نزدیک یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار کرنے والا نہایت ڈھیٹ شخص ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ نعرہ نہ ہوتا چاہے وہ چھوکروں کی ایجاد تھا تو برصغیر کے تمام مسلمان اس جوش و جذبے سے کبھی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع نہ ہوتے قائداعظم کی تقریروں اور بیانات سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم لیگ کو اگر مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بننے کا اعزاز حاصل ہوا تو اسی نعرے کی بدولت تھا کوئی اور بات مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع نہیں کر سکتی تھی۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر پوچھا جائے کہ کیا پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے تو اس کا جواب اثبات میں ہے۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ اصل محرک کیا تھا تحریک پاکستان کا تو اس کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ اختلاف کی گنجائش ہے۔ کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ معاشی مسئلہ تھا تو میں اسے بھی یکسر غلط نہیں سمجھتا۔ کوئی شخص اگر یہ کہتا ہے کہ زبان کا یا سماجی مسئلہ تھا تو میں اسے بھی غلط نہیں سمجھتا۔ کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تحریک پاکستان کی اصل بنیاد سیاسی تھی تو میں اسے بھی بالکل غلط نہیں کہوں گا لیکن میرا اپنا جواب یہ ہوگا کہ تینوں باتوں میں جزوی سچائی ہے۔ ان سچائیوں کو اگر ایک بات میں جمع کریں تو یہ قومی

مسئلہ تھا۔ ایک قومی جذبہ تھا اور یہ قومی جذبہ بھی چاہے اسے منفی جذبہ کہا جائے میرے نزدیک یہ خوف کا جذبہ تھا کہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم سے اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ چھوٹی قوم نے ایک ہزار برس تک حکومت کی تھی اور وہ محسوس کرتی تھی کہ اس حوالے سے بڑی قوم میں انتقامی جذبات ہیں اور کچھ حالات بھی اس طرح کے پیدا ہو گئے تھے کہ انگریزوں کے دور میں بڑی قوم ابھر کر سامنے آ گئی تھی اور وہ ایک بیدار قوم کی حیثیت سے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ سرمایہ اس کے پاس تھا، تعلیم اس کے پاس تھی۔ چھوٹی قوم عددی اعتبار سے بھی کم تھی اور تعلیم، سرمایہ اور تنظیم غرض کہ ہر اعتبار سے وہ بہت پیچھے تھی۔ لہٰذا اس چھوٹی قوم کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ بڑی قوم اس کو ایکسپلائٹ کرے گی۔ معاشی اعتبار سے سیاسی اعتبار سے بھی اور سماجی اور مذہبی اعتبار سے بھی۔ شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں چلائی جائیں گی۔ لہٰذا اگر کوئی مجھ سے کوئی پوچھے کہ تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ کیا تھا تو میرے نزدیک وہ ایک قومی جذبہ تھا، ایک چھوٹی قوم کا کہ بڑی قوم اس کو ساتھ لے کر نہیں چلے گی بلکہ اس کے ساتھ ظلم اور زیادتی روا رکھی جائے گی لیکن اب اس سے بھی نیچے آ یئے وہ سب سے صاف اور شفاف پانی کا لیول ہے۔ تو وہاں جب آئیں گے تو اب سوال یہ ہوگا کہ اس چھوٹی قوم کی جس کو یہ اندیشہ تھا اس کی اساس کیا تھی تو اس کا جواب صرف یہی ہوگا کہ وہ تو صرف اسلام ہی تھا تو ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہی استوار ہوئی تھی

س : اچھا ڈاکٹر صاحب! یہ فرمائیں جماعتِ اسلامی کے ساتھ تعارف، اس کے ساتھ وابستگی اور پھر اس سے علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ آپ نے کن مقاصد کے لیے جماعتِ اسلامی میں شمولیت اختیار کی تھی اور پھر اس علیحدگی کی وجہ آپ کا ان مقاصد سے انحراف ہے یا پھر جماعتِ اسلامی کسی اور راستے پر نکل گئی۔

ج : جماعتِ اسلامی سے میرا تعارف تو ہائی سکول کے ہی زمانے میں ہو گیا تھا پھر کالج کے زمانے میں اس سے عملی وابستگی اور پھر جمعیت طلبہ میں میری بھرپور جدوجہد کا جو دور ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جماعت سے عملی وابستگی میں چاہے جیسے شعور کو دخل نہ ہو میں علامہ اقبال سے متاثر ہوا اور پھر تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور جب قیامِ پاکستان کے بعد جماعت نے بھی ان ہی مقاصد کو اپنا لیا تو اس حوالے سے جماعت میں شامل ہو گیا لیکن یہ مجھے پوری طرح اندازہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں ہی یعنی جب میرے دو سال ایف ایس سی کے اور دو سال میڈیکل کالج کے بیت چکے تھے میں نے اس تحریک کی جو اساس ہے اسے صحیح طور پر سمجھ کر شعوری طور پر قبول کیا۔ اور وہ شعوری احساس یہ ہے کہ اسلام کا تقاضا اپنے ماننے والوں سے یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ خود اسلام پر کاربند ہوں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں ہمہ تن شریک ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی دعوت دوسروں تک پہنچانا اور تیسری بات

کہ اسلامی نظام کو عملاً نافذ کرنے کے لئے تن من دھن سے بھرپور جدو جہد کرنا تاکہ اسلام غالب ہو اور اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسی جماعت میں شمولیت اختیار کی جائے جو ان مقاصد کے لئے قائم ہوئی ہو اور ان کے لئے پیش قدمی کر رہی ہو۔ یہ میرے نزدیک اس تحریک کی اصل اساس ہے۔ اور اس تحریک کو جب میں نے شعوری طور پر اختیار کیا۔ جمعیت میں رہا تو دراصل میں جماعت ہی کے ناطے سے اس میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوشاں رہا۔ جیسے ہی میں نے ایم بی بی ایس کیا تو جماعت اسلامی کا فوراً رکن بن گیا اور میں اس جماعت سے وابستگی کو اس درجے اہم سمجھتا تھا کہ جو روز میرا رزلٹ اناؤنس ہوا فائنل ایم بی بی ایس کا اسی روز میں نے جمعیت سے استعفیٰ لکھ دیا اور اسی روز جماعت کی رکنیت کے لئے درخواست تحریر کر دی۔ اس درخواست میں میں نے درج کر دیا کہ میں ایک رات بھی اپنے اوپر ایسی حالت نہیں آنے دینا چاہتا کہ میں کسی جماعت میں نہ ہوں۔ میرے نزدیک جماعت کی زندگی اقامت دین کے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے لازمی ہے اب جماعت مجھے جب بھی رکن بنائے لیکن میں اپنے آپ کو جماعت ہی کے ڈسپلن کا پابند سمجھتا ہوں۔ میں بغیر جماعت کے زندگی بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو میرے احساسات کی یہ کیفیت تھی اس وقت ـــ غالباً ۵ ار نومبر کو میں نے جماعت کی رکنیت کے لئے درخواست دے دی تھی اور فروری ۱۹۵۵ء میں میری یہ درخواست منظور کر لی گئی۔

تو پھر میرے سامنے جو دو سال آئے ان میں میرے نزدیک ایک بحران آیا۔ جماعت اسلامی میں فکری اعتبار سے ـــ کچھ شواہد پہلے بھی موجود تھے۔ مثلاً ۱۹۵۱ء میں جماعت اسلامی نے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ امیدیں بڑی تھیں کہ ہم نے بڑا کام کیا تھا۔ لیکن جن امیدواروں کے ساتھ الیکشن میں حصہ لیا گیا تھا نتیجہ ان کے برعکس نکلا۔ ایک آدمی بھی اس پنچایتی نظام کے ذریعے سے منتخب نہ ہو سکا جو جماعت اسلامی نے اس وقت اختیار کیا تو اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے اندازے اور سوچ کچھ غلط ہے۔ ہم نے شاید اس معاشرے کی تشخیص صحیح نہیں کی ہے۔ یہ تو میں نہیں کہوں گا کہ اس وقت میں کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن ایک سوال میرے ذہن میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس سوال کا جواب اس وقت میرے ذہن میں آیا جب ۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک میں جماعت اسلامی کا جو رول تھا وہ سامنے آیا۔ وہ بڑا مبہم سا کردار تھا۔ تحریک کے ساتھ جماعت اسلامی تھی بھی اور نہیں بھی۔ پھر یہ کہ جماعت اسلامی نے اس سے پہلے قادیانیت کے خلاف تحریراً یا تقریراً کوئی بات نہیں کی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس تحریک میں اُن کی شمولیت ایک مجبوری بن گئی تھی۔ چونکہ کچھ اور جماعتوں نے اس مسئلے کو اس وقت اتنا

اٹھایا تھا کہ اگر اس وقت اس میں حصّہ نہ لیتے تو شاید سیاسی موت واقع ہو جاتی ۔ تو میرا یہ خیال تھا کہ جماعتِ اسلامی شاید اصولاً اس تحریک میں حصّہ لینا درست خیال نہیں کرتی تھی ۔ ورنہ تو یہ کہ ان کے لٹریچر میں (پہلے سے) کچھ ہونا چاہیئے تھا ۔ کبھی تو انہوں نے یہ کہا ہوتا کہ یہ خطرہ ہے، یہ غلط ہے قادیانیت بہت بڑی گمراہی ہے ۔ بہت بڑا فتنہ ہے ۔ لیکن سرے سے اس مسئلے کو کبھی مودودی صاحب نے چھیڑا ہی نہیں تھا ۔ اب اچانک انہوں نے اگر اس تحریک میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا تو اس میں فیصلہ کن عنصر سیاست تھا ۔ تو اس طرح کے واقعات نے میرے ذہن میں کچھ سوال پیدا کر دیئے

پھر ۱۹۵۵ء میں جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کا جو دینی اور اخلاقی معیار تھا وہ دیکھ کر مجھے شدید دھچکا لگا کہ جو کچھ سمجھ کر ہم جماعت میں آئے تھے وہ بالفعل تو موجود نہیں ہے ۔ مختلف اعتبارات سے جو معیار تھا وہ بہت ہی پست ہو چکا تھا ۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں جب میں نے غور و فکر شروع کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جماعت اپنی اصل اساس جس پر یہ قائم ہوئی تھی اس سے انحراف کر چکی ہے اس کا لٹریچر کچھ اور کہتا ہے اور کارکن کچھ اور کام کر رہے ہیں ۔ اس اعتبار سے دونوں باتوں میں تضاد ہے ۔ یہ اسباب ہیں اس تحریک کی کمزوری کے ۔ تو میں چاہتا تھا کہ اس مسئلے پر میں اپنی رائے پیش کروں گا ۔ جو ہمارا سالانہ اجلاس کراچی میں ہو رہا تھا ۔ اور بھی بہت لوگ تھے جو اس نہج پر سوچ رہے تھے ۔۔ لیکن وہاں مولانا مودودی نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ اس اجتماع میں ان مسائل کو زیرِ بحث نہیں آنے دیا ۔ بلکہ جائزہ کمیٹی بنا دی کہ جائزہ کمیٹی پورے پاکستان کا دورہ کر کے جن لوگوں کو پالیسی سے اختلاف ہے ان کا نقطۂ نظر معلوم کر کے شوریٰ کو رپورٹ پیش کرے ۔

چنانچہ جب وہ جائزہ کمیٹی آئی اوکاڑے میں ۔ میں اس وقت وہاں کی جماعت کا امیر تھا تو میں نے جب ان کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھا تو میں نے محسوس کیا کہ انہیں کچھ حیرانگی سی ہوئی میری باتیں ان کے دل کو لگیں اور جیسے وہ چونک سے گئے اور انہیں کچھ روشنی ۔ اس وقت میں نے کوئی تحریری صورت میں اپنا بیان نہیں دیا تھا بلکہ جب ہم کمرے کے باہر بیٹھے انتظار کر رہے تھے تو اس عرصہ میں میں نے کچھ پوائنٹ لکھ لیئے اور اندر جا کر جب میں نے زبانی گفتگو کی تو وہ چونکے اور مجھ سے کہنے لگے کہ آپ یہ باتیں لکھ نہیں سکتے ؟ میں نے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں اگر میں لکھ سکا تو پیش کر دوں گا ۔ چنانچہ میں نے پندرہ دن کے اندر اندر اپنا بیان تحریر کیا جواب دو سو چھبیس صفحات کی کتاب پر مشتمل ہے ۔ تو وہ حیران رہ گئے ۔ دس روز تو میں اپنا مطب بھی کرتا رہا اور وہ کتاب بھی لکھتا رہا ۔ اور پانچ روز میں ساہیوال سے لاہور چلا گیا ۔ اور اپنی ہمشیرہ کے گھر ایک کمرے میں معتکف ہو گیا اور اس کام کو مکمل کیا ۔ بہر حال

وہ رپورٹ میں نے ان کو دے دی۔

اس کے بعد جو رپورٹ بنی جائزہ کمیٹی کی جانب سے وہ مولانا مودودی کے لئے بڑی پریشان کن ثابت ہوئی۔ اس کا مواد اتنا تفصیلی تھا۔ اصولی باتوں کے حوالے سے تو میرا بیان بڑا مدلل تھا۔ دوسرے لوگوں کے بیانات میں کچھ ایسے واقعات تھے 'خیانت کے' اخلاقی گراوٹ کے۔ یہ دونوں رُخ اتنے واضح ہو کر سامنے آئے کہ مولانا مودودی پریشان ہو گئے۔ تو اس پر مولانا نے جو روش اختیار کی وہ بہت ہی قابلِ افسوس تھی۔ اس رپورٹ پر پندرہ روز تک شوریٰ کے اجلاس نے غور کیا اور اجلاس کا اختتام تو ہوا ایک مصالحتی قرارداد پر۔ کیونکہ شوریٰ دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور نصف سے زائد ارکان کی رائے یہ تھی کہ اب ہمیں سیاست سے اپنا دامن بچا کر اسلام کی اصولی دعوت کے لئے کام کرنا چاہیئے جبکہ مولانا مودودی کی رائے اور کچھ حضرات کی رائے یہ تھی کہ جس طرح ہم کام کر رہے ہیں وہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس طرح کا کچھ کھچاؤ پیدا ہوا کہ پھر مصالحت کی بات اور بین بین معاملہ طے ہوا اگرچہ اصولی انحراف نہیں ہوا لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی معاملات میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے ہمارا کام متاثر ہوا ہے اور اب کوشش کریں گے کہ جو کمی رہ گئی ہے اس کی تلافی کی جائے۔ واضح اقرار نہیں تھا کہ غلطی ہوئی ہے اور اصولی موقف سے انحراف کیا گیا ہے۔

- - - - - - - - - - - - -

قرارداد پاس کر کے دعا کر کے شوریٰ کا اجلاس ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اجلاس کے بعد شوریٰ کے ارکان نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر اس قرارداد کی جو توضیح کی تو ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں کی۔ دو مخالف نقطۂ نظر جو بن چکے تھے تو کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ کہہ رہا تھا تو اس پر ایک ہنگامہ جماعت کے اندر ہو گیا۔ تو پھر مولانا مودودی پر بھی کیا افتاد ہوئی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان پر شدید ردِ عمل ہوا۔ انہوں نے ایک خط لکھ دیا جائزہ کمیٹی کے ارکان کو کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں چاہے آپ نے ارادہ نہ کیا ہو نیتاً نہ کیا ہو لیکن آپ نے جماعت کے خلاف ایک سازش کی ہے اور ایک سازش کے ذریعے ہی ایسے حالات پیدا کئے ہیں کہ میں شوریٰ کے اندر بھی اپنا نقطۂ نظر صحیح طور پر پیش نہ کر سکا اور مجبوراً مجھ سے ایک ایسی قرارداد پر دستخط کروا لئے گئے جو مجھے پسند نہ تھی۔ اور اب میں آپ لوگوں کو آپشن دیتا ہوں کہ آپ شوریٰ سے استعفیٰ دے دیں۔ یا میں آپ لوگوں کا معاملہ ان حلقوں کے سپرد کر دوں گا جن سے آپ منتخب ہو کر آئے ہیں۔ کہ وہ آپ کی رکنیت کالعدم کریں چونکہ میں آپ حضرات کے ساتھ جماعت کی سربراہی نہیں کر سکتا۔

مولانا کا یہ اقدام اتنا شدید تھا کہ اس سے جماعت میں شدید انتشار پیدا ہوا۔ مولانا امین احسن اصلاحی [illegible]

آمرانہ روش ہے اور آپ اپنے مخلص ساتھیوں کی نیت پر حملہ کر رہے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اصلاحی صاحب نے بہت ہی گرم خط لکھا تو انہوں نے جماعت کی امارت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ اخبارات میں چھپ گیا۔ اور جماعت میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ درمیان میں پڑے، مصالحت کروائی۔ پھر ماچھی گوٹھ میں ایک اجتماع ہوا۔

جماعت کے ارکان کا فروری ۵۷ء میں یہ اجتماع بلایا گیا تھا اس مقصد کے لئے کہ جماعت کی پالیسی کے بارے میں جو مختلف نقطۂ نظر ہیں ان پر وہاں کھل کر گفتگو ہوگی۔ اور غور کر کے فیصلہ کیا جائے گا کہ کدھر جانا ہے۔ لیکن کچھ حضرات اجلاس سے پہلے ہی مصالحت کرانے کے لئے میدان میں آ گئے۔ مولانا ظفر احمد انصاری نے اس میں خاصا کردار ادا کیا۔ مذاکرات کے وہ بادشاہ ہیں۔ مولانا اصلاحی اور مودودی صاحب کے درمیان یہ طے کروا دیا کہ تم لوگ ایک مصالحت پہلے ہی کر لو ورنہ اگر جماعتِ اسلامی کے ارکان کے سالانہ اجتماع میں یہ باتیں زیرِ بحث آگئیں تو جماعت ختم ہو جائے گی۔ تو پھر ایک مصالحت کر لی انہوں نے۔ اب میں کیونکہ شوریٰ میں نہیں تھا لیکن مجھے معلوم ہوا تو میں نے ایک خط لکھ دیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ان مسائل پر گفتگو نہیں ہوگی اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس اجتماع میں شریک ہونا لاحاصل ہے۔ لہٰذا میں اس اجتماع میں شریک نہیں ہوں گا۔ اور یہیں سے میں اور میرے کچھ ہمخیال ساتھی آپ کو استعفیٰ بھیج دیتے ہیں۔ جواب دیا گیا کہ آپ آئیے اور آپ کو ضرور موقعہ دیا جائے گا۔ جب ہم وہاں گئے تو فضا بدلی ہوئی تھی۔ مصالحت ہو چکی تھی۔ بڑے لوگ تو بیٹھ گئے پیچھے اور چپ ہو گئے یا مولانا مودودی کی تائید کرنے لگے۔ اب سامنے میں ہی رہ گیا۔ یا پھر ارشاد احمد حقانی نے کچھ بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن زیادہ جو معاملہ تھا مجھ سے متعلق رہا۔ میں نے اپنے بیان کو وہاں پڑھنے کی کوشش کی۔ اوّل تو اس کا مجھے موقعہ بھی نہیں دیا گیا۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی تو وہ بھی محدود وقت کے ساتھ۔ پھر اس پر ووٹنگ بھی ہوئی۔ بہر حال اس کا نتیجہ کچھ نہ نکل سکا۔ سوائے اس کے کہ اس اجتماع نے مولانا مودودی پر اپنے اعتماد کا اظہار کر دیا۔ کیونکہ دوسرا جو نقطۂ نظر تھا اکابر کی زبان سے تو وہ سامنے آیا ہی نہیں۔

اسی اثنا میں ترجمان القرآن میں مولانا مودودی کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے میرا نام لئے بغیر اپنا یہ نقطۂ نظر بیان کیا تھا کہ اختلاف کرنا ضعف ارادہ کے مساوی اور اس کی علامت ہے جن لوگوں کی اپنی ہمتیں جواب دے گئی ہیں اور اب اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ اس مضمون کے بعد پھر میں نے اعتکاف کی حالت ہی میں اپنا استعفیٰ لکھ دیا۔ جب نیتوں پر شک ہو جائے تو دینی کام میں پھر شراکت نہیں چلتی۔ یہ تو سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں جن میں سب ایک دوسرے کو کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اکٹھے رہتے ہیں لیکن دینی کام میں تو اخلاص اور باہمی اعتماد ہی سے بات بنتی ہے۔

س : اسلام میں تنظیم سازی کے لئے مقاصد کے تعین کے ساتھ ساتھ کیا ان کے حصول کے لئے لائحۂ عمل اور دائرۂ کار بھی متعین کر دیا گیا ہے؟

ج : ان چیزوں پر دو اور دو چار کی طرح احکامات آپ کو کتاب و سنّت میں نہیں ملیں گے۔ بلکہ ان میں اکثر باتوں کا ہم استنباط کرتے ہیں۔ کتاب اللہ سے حدیث سے اور سیرتِ رسولؐ سے۔ اس سلسلہ میں میرا جو حاصلِ مطالعہ ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔ اسلام میں جس طرح کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ جب شعوری فکر پر میں نے سمجھا کہ جماعتِ اسلامی کی اساس تھی اس میں میں نے شعوری طور پر ۵۴ء میں شمولیت اختیار کی۔ اس سے پہلے کے دور کو میں اپنی جذباتیت کا اور غیر شعوری دور تصوّر کرتا ہوں۔ اس میں یہ ہے کہ تین لیول ہیں مقاصد کے۔ پہلا لیول ہے خود اسلام پر عمل کرنا، اسلام پر کاربند ہونا۔ اس کے لئے ہمیں ایمان اور یقین کی ضرورت ہے۔ ایمان ہوگا تو اسلام پر عمل کریں گے نہیں تو کیسے عمل کریں گے۔ پھر تو قول و فعل میں تضاد ہوگا۔ منافقت ہوگی، ریاکاری ہوگی۔ دوسرا درجہ ہے دعوت اور تبلیغ کا۔ تیسرا اور بلند ترین مقام ہے اللہ کے دین کو قائم کرنا، غالب کرنا، نافذ کرنا، جس کو میں جدید اصطلاح میں کہتا ہوں اسلامی انقلاب برپا کرنا۔ یہ سب سے بلند ترین درجہ ہے لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ تین منزلہ عمارت ہو تو سب سے اہم پہلی ہے کیونکہ سارا بوجھ تو اس نے اٹھایا ہوا ہے۔ اگر وہ مضبوط نہ ہوگی تو دوسری اور تیسری دھڑام سے گر پڑیں گی۔ اس سے بھی زیادہ اہم وہ بنیاد ہے کہ جس پر پہلی منزل کھڑی ہے۔ میرے نزدیک ایمان کی حیثیت تو بنیاد کی حاصل ہے ـــــــــــــ پہلی منزل کے لئے چار ستون ہیں نماز روزہ زکوٰۃ اور حج اور اس کے اوپر ہیں حلال و حرام کے احکامات اوامر اور نواہی کی چھت۔ دوسری منزل ہے دعوت، امر بالمعروف نہی عن المنکر، شہادت علی الناس، دعوت الی اللہ اور تیسری منزل ہے اقامتِ دین، اسلامی انقلاب یا دین کا غلبہ تو بلند ترین عمارت یہ ہے اور اہم ترین بنیاد ہے جس کو میں ایمان سے تعبیر کرتا ہوں۔

اب ان تینوں کے حصول کے لئے جو لائحہ عمل ہے اور جو اس کے لئے تنظیمی ہیئت ضروری ہے وہ کچھ مختلف ہیں۔ مثلاً صرف مسلمان بننے کے لئے ایمان لانے کے لئے صوفیاء کا طریق کار کہ ذکر اور مراقبے وغیرہ سے ایمان کو تقویت ہوتی ہے۔ دین کے لئے اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ علماء جو کام کرتے ہیں کہ مسجد ہے، خطاب ہے، درس ہے۔ یہ بھی ایک تنظیمی ہیئت ہے۔ اس کے ذریعے سے بھی دین کے کام کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے! اور جائز کیا ہے؟ ناجائز کیا ہے۔ پہلے لیول کے لئے ہمارے یہ ادارے، علماء کا ادارہ، درس و تدریس کا نظام اور اولیاء کا

سلسلہ یہ دونوں کافی ہیں۔ اب دوسرے لیول پر آئیے تو ضرورت [illegible] وجود میں
آئیں۔ جو ذرائع ابلاغ کو زیادہ استعمال کریں اور اس میں بھی مختلف درجے ہیں لوگوں کے ان کی
ضروریات کو پورا کیا جائے۔ مثلاً دانشوروں کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق اسلام کا پیغام پہنچایا جائے۔
اور جو عوام ہیں ان کو ان کی سطح پر اسلام کی دعوت دی جائے۔ مسلمانوں کو اسلام سے روشناس کرانے کا
انداز اور ہوگا۔ غیر مسلموں کے لئے اور انداز اپنایا جائے گا۔ دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لیے ضرورت
ہوگی کچھ ادارے وجود میں آئیں۔ وہ انجمنیں بھی ہو سکتی ہیں۔ قرآن حکیم کی اشاعت کے لیے انجمنیں قائم کی جائیں۔
یا یہ کہ ایسی اکیڈمی قائم کی جائے جو لوگوں کو تیار کرے کہ وہ علمی سطح پر دوسروں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں۔
ایسے تبلیغی ادارے قائم ہوں جو مبلغین تیار کریں۔ ایسے ادارے تشکیل دیئے جائیں کہ جن میں مناظرین کو تربیت
دی جائے۔ اس قسم کے ادارے جب قائم کئے جائیں گے تو ظاہر ہے ان کا کوئی سربراہ ہوگا کوئی منتظم ہوگا
مختلف شعبوں کے حوالے سے کوئی انچارج وغیرہ مقرر کئے جائیں گے۔ یہ ساری چیزیں جائز ہیں اور انہیں
اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ذرائع ابلاغ جو بھی میسر ہیں ان کے ذریعے اگر باطل کا پرچار ہو رہا ہے اور وہ اتنے
موثر ہیں کہ اگر ہم نے انہیں استعمال نہ کیا تو حق کی دعوت باطل کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ تو میرے نزدیک اس
دوسرے مرحلے کے لئے یعنی دین کی نشر و اشاعت کے لئے ان تمام ذرائع کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے
البتہ جب ہم تیسرے لیول پر آتے ہیں، وہ تیسرا لیول اقامتِ دین کی جدوجہد، دین کو قائم کرنے کی
جدوجہد، دین کے غلبے کی جدوجہد کا ہے۔ تو یہ ایک پورے نظام کو بدلنے کا معاملہ ہے۔ صرف کسی نظریہ
کے پھیلانے کا معاملہ نہیں ہے۔ جس نظام کو بدلنا ہے اس میں مراعات یافتہ طبقے ہوتے ہیں جن کے
خصوصی مفادات ہوتے ہیں۔ اختیارات اور اقتدار کے حامل طبقات ہوتے ہیں تو جن لوگوں کے مفادات
کسی نظام کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں چاہتے کہ اس نظام کو بدلا جائے۔ وہ ہر حال میں اس
نظام کو قائم اور جاری و ساری رکھنے کی کوشش کریں گے۔ تو اس کے لئے ایک انقلابی جدوجہد کی ضرورت
ہے۔ نظام کو بدلنے کے عمل میں مزاحمت بڑی شدید ہوگی، کشمکش بڑی شدید ہوگی۔ اب اس کا میرے
نزدیک جو آئیڈیل، نمونہ ہے وہ حضورؐ کی سیرت ہے۔ اس جدوجہد کے لئے جب ہم قریب ت
قریب نہیں جائیں گے سیرت نبویؐ کے تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس بات سے کوئی شخص
اختلاف نہیں کر سکتا کہ حضور نبی کریمؐ نے صرف تبلیغ نہیں کی بلکہ انقلاب بھی برپا کیا۔ صرف آپؐ نے
اسلام کے پیغام کو پھیلایا نہیں بلکہ اللہ کے کلمے کو بلند کیا۔ تو وہاں تبلیغ کے لئے بھی ہمارے لئے
اسوہ موجود ہے اور وہ تبلیغ محض مذہبی تبلیغ نہیں ہے۔ جس طرح کہ عیسائیت میں ہے۔ تو وہ

مبلغ اور پھر انقلاب کے مراحل۔ ان سب سے تسلیم کو نمایاں کیا ہوا ہے۔ یہ سب ہمارے لئے کامل نمونہ حضورؐ کی سیرت میں ہے۔ اسی لئے میں سیرت پر زیادہ زور دیتا ہوں بجائے سنت کے۔ اس لئے کہ سنت کے لئے ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے احادیث کی کتابوں کی طرف۔ یقیناً مستند ذریعہ وہی ہے ہمارے پاس لیکن حدیث کی کتابوں میں یہ چیز اس واقعاتی ترتیب کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ یہ مسائل کی ترتیب کے ساتھ ہیں حدیث کی آپ کوئی بھی کتاب اٹھائیں گے تو پہلے طہارت کے مسائل ہی ہوں گے، پھر نماز کے مسائل آئیں گے، زکوٰۃ کے مسائل ہوں گے۔

لیکن ایک انقلاب کے جو مراحل ہیں ان میں کیا ترتیب ہوتی ہے! وہ اصل میں سیرت سے راہنمائی ملتی ہے۔ حضورؐ نے پہلے کیا کیا پھر کیا کیا، پہلے دور کا کیا تقاضا تھا، دوسرے دور کا کیا تقاضا تھا کس وقت تک آپ نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا اور کوئی جوابی کارروائی نہیں کی چاہے صحابہؓ پر تشدد ہوا اور آپؐ پر ہوا ذاتی طور پر۔ پھر کب مرحلہ آیا کہ آپ نے اقدام کیا اور چیلنج فرمایا کفار کو اور ان کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن لیا تو یہ ساری چیزیں ہمیں سیرت سے ملتی ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک جو طریق کار ہے وہ بیعت کے ذریعے ہے۔ وہ بیعت ہے سمع و طاعت فی المعروف اور بیعتِ جہاد۔ یہ دو اصطلاحات ہمیں حدیث سے بھی ملتی ہیں۔ سیرت سے بھی ملتی ہیں۔ حضورؐ کو تنظیم کے لئے کسی بیعت کی ضرورت نہیں تھی۔ کہ وہ تو رسولؐ تھے اور جو ایمان لے آیا وہ خود بخود مطیع ہے۔ ایک علیحدہ سے بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حضورؐ نے یہ بیعتیں اس لئے لیں تاکہ بعد والوں کے لئے ایک نظیر اور ایک اسوہ قائم ہو جائے ـــــ اقامتِ دین کے لئے جو تنظیم قائم کی جائے گی اس کا ڈسپلن آرمی ڈسپلن ہے کہ جو حکم دیا جائے مانا جائے گا۔ جب حکم دیا جائے حرکت کرے اور جب حکم دیا جائے رک جائے۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو انقلاب نہیں آسکتا اس لئے کہ وہ تو بڑا سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک مضبوط نظام کے ساتھ جس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی ہیں جس کے ساتھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ ڈھیلی ڈھالی تنظیم ایک نظام کو اکھاڑ کر اس کی جگہ ایک دوسرا نظام نہیں لا سکتی تو یہ مضبوط نظام بیعت کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے۔

ایک شخص کھڑا ہوتا ہے نیکی کے کاموں کے لئے کہ کون ہے جو میرا ساتھ دے۔ جو لوگ اس سے متفق ہوں گے وہ اس کے ساتھ آ جائیں گے اور معاہدہ کریں گے کہ جب تک آپ ہمیں کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے حکم دیں گے، ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ اپنی جو رائے ہوگی وہ پیش کر دیں گے لیکن آخری فیصلہ آپ کا ہوگا۔ وہ گنتی سے نہیں ہوگا۔ آپ کی صواب دید پر ہوگا۔ ہاں اگر آپ شریعت کے خلاف حکم دیں گے تو ہم نہیں مانیں گے۔

س: حضورؐ نبی کریمؐ کے دور میں کسی باقاعدہ تنظیم کی کوئی صورت موجود تھی؟

ج: حضورؐ کے زمانے میں تو جو آپؐ پر ایمان لے آیا وہ گویا آپؐ کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ اس لئے کہ باقی ماحول تو کفار کا ہے۔ حضورؐ نے اپنی ذات میں اسلام کا معیار ہیں۔ جو حضورؐ سے منسلک نہیں وہ مسلمان ہی نہیں چاہے وہ بڑے سے بڑا متقی ہو، موحد ہو، سب کچھ ہو۔ اس لئے کسی اضافی تنظیم کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے مکّہ والوں سے بیعت بھی نہیں لی۔ اس لئے کہ جب تک اتنی محدود سی جمعیت تھی اور حضورؐ چوبیس گھنٹے موجود ہیں ان کے درمیان ہر حکم آپؐ براہِ راست دے رہے ہیں۔ لہٰذا آپؐ نے کسی اور کو وہاں امیر مقرر نہ کیا۔ نہ کوئی جماعت نہ کوئی بیعت۔ وہ ایک فطری نظام ہے۔ حضورؐ موجود ہیں۔ اور آپؐ خود بخود امیر ہیں۔ حضورؐ کبھی سپہ سالار ہوتے ہیں، کبھی حضورؐ قاضی ہوتے تھے اور امیرِ مملکت کی حیثیت سے وفود سے ملتے۔ تو وہ ایک فطری جماعت تھی۔ جب مدینے کے لوگ ایمان لائے تو وہاں پر آپؐ نے بارہ نائبین مقرر کئے۔ اور اس وقت آپؐ نے مدینے والوں سے بیعت لے لی۔ اس بیعت میں یہ تھا کہ ہم آپؐ کا حکم مانیں گے۔ سرتابی نہیں کریں گے اور آپؐ جس کو امیر مقرر کریں گے اس کی اطاعت کریں گے۔ لیکن کسی باقاعدہ جماعت کا تصور حضورؐ کے دور میں نہیں تھا اس کے بعد بھی خلافتِ راشدہ جب تک رہی تو حکومت اور جماعت وہ سب ایک ہی تھے۔ ایک حکومت ایک جماعت ایک امیر، وہ امیر مذہبی تھا، وہ امیر سیاسی بھی تھا۔ سیاست اور مذہب میں تو تفریق نہیں تھی اُس وقت ——— اب جب خلافتِ راشدہ ختم ہو گئی اب مسئلہ پیدا ہوا۔ ایک تو حکمران ہیں وہ مسلمان ہیں لیکن بہر حال اُس معیار کے نہیں ہیں کہ لوگ دینی معاملات میں بھی ان سے رجوع کر سکیں۔

لہٰذا ایک بیعت تو ہوتی تھی خلفائے بنو امیہؓ اور بنو عباس کی۔ یہ تو ہو گئی سیاسی بیعت حکومت کی بیعت اور ایک بیعت اب شروع ہو گئی اولیاء کی کہ یہ ہمارے دینی پیشوا ہیں۔ ان کے پاس ہم جائیں گے دینی رہنمائی کے لئے۔ یہ ہمیں اللہ کے رستے پر چلائیں گے۔ اب یہ تقسیم ہو گئی کہ دو بیعتیں ہو گئیں۔ حضورؐ کی زندگی میں ایک ہی تھی۔ اچھا جب ہمارا حکومت کا نظام ختم ہو گیا۔ کہیں انگریز آ گیا، کہیں کوئی اور آ گیا تو اب وہ بیعت حکومت تو ختم ہو گئی نا۔ لیکن وہ بیعتِ ارشاد چلتی رہی۔ یہ سہروردیہ سلسلہ ہے یہ چشتیہ سلسلہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لہٰذا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ البتہ اب جب دوبارہ تحریکیں اٹھیں مسلمانوں کی بلکہ صحیح الفاظ میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے۔ وہ پھر بیعت ہی کی بنیاد پر ہی اٹھیں۔ جس طرح کہ سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے بیعت لی اور اس کی بنیاد پر جمعیت فراہم کی اور جہاد کیا۔

س : آپ کی گفتگو سے مجھے کچھ اس طرح کا تاثر ملا ہے کہ آپ انتخابات وغیرہ کے مخالف ہیں۔ یہ ہیں کہ آپ اقامتِ دین کے لئے جو کام کر رہے ہیں اور جب ملک میں الیکشن ہوتے ہیں اس میں ہر طرح کے لوگ حصہ لیتے ہیں تو کیا آپ جیسے لوگ جو دین کی اقامت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں الیکشن کے ذریعے کو دین عناصر کے لئے کھلا چھوڑ دیں گے یا ان کے مقابلے کے لئے کوئی لائحہ عمل اختیار کریں گے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک دینی جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے انتخابات کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

ج : اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ وضاحت کر دوں کہ اس حوالے سے میری گفتگو زیادہ تر نظری اور اجتہادی نوعیت کی ہوگی۔

میں اصولاً یہ بیان کر دوں کہ میرے نزدیک کسی بھی شخص یا جماعت کے لئے سب سے پہلے جو فیصلہ کرنے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ جس ملک میں وہ کام کرنا چاہتی ہے۔ آیا اس کا نظام بنیادی طور پر صحیح ہے اور اسے چلانے والے ہاتھ غلط ہیں۔ یا یہ کہ کچھ جزوی خرابیاں ہیں۔ یا یہ کہ نظام ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ یہ دو چیزیں بڑی۔

ایک تو ہے جزوی اصلاح کا کام اور ایک ہے بنیادی اصلاح کسی نظام کی۔ تو یہ جو بنیادی نظام کو بدلنے کی بات ہے یہ انقلابی جد و جہد کا کام ہے۔ جزوی اصلاح کے کام کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ سماجی اصلاح اور سیاسی اصلاح۔ اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ جیسا کہ امریکہ ہے، برطانیہ ہے۔ جو سیاسی پارٹیاں وہاں موجود ہیں ان کے نزدیک ان ملکوں کا نظام غلط نہیں ہے۔ اختلاف جزوی باتوں میں ہو سکتا ہے مثلاً خارجہ پالیسی یا دفاعی پالیسی میں۔ تو وہاں تو ہوگا سیاسی عمل۔ اس لئے کہ نظام کو نہیں بدلنا ہے۔ نظام کو چلانے والے ہاتھ بدلنے ہیں۔ لیکن فرض کیجئے کہ امریکہ یا برطانیہ میں اگر کمیونسٹ لوگ ہوں جن کے نزدیک وہ نظام غلط ہے تو ظاہر بات ہے وہ وہاں انقلاب لانا چاہیں گے۔ وہ الیکشن میں کبھی حصہ نہیں لیں گے۔ بلکہ الیکشن میں جا کر ان کی توانائیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہ تو انقلابی نظام کے ذریعے سے ہی نظام کو بدل سکتے ہیں۔ یہ ہے میری اصل سوچ۔ میرے نزدیک ہمارا نظام غلط ہے۔ یہ سارا سود خورانہ اور مفاد پرستانہ اور استحصالی نظام جو ہے یہ سارا حرام کے اوپر قائم ہے۔ تو اس میں جزوی اصلاح سے کچھ نہیں ہو سکتا اس میں نہ سماجی اصلاح کارگر ہو سکتی ہے۔ نہ اس میں صرف اخلاقی تعلیم کافی ہو سکتی ہے۔ نہ اس میں سیاسی عمل سے کوئی تبدیلی آئے گی۔ سیاسی عمل سے نظام برقرار رہتا ہے۔ وہی لوگ آگے آتے ہیں جو اس نظام میں جڑیں گہری رکھتے ہیں۔ تو ایسے نظام میں جزوی اصلاح سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مفاد پرست اور مراعات یافتہ طبقہ سرمایہ دار اور زمیندار لوگ ہی بھاری اکثریت سے ایوانِ اقتدار تک پہنچتے ہیں

ری پبلکن پارٹی ہو یا پیپلز پارٹی آپ کو ہمیشہ وہی چہرے برسرِ اقتدار نظر آئیں گے۔ یہ لوگ اپنے مفادات کو دیکھیں گے اور اس نظام کو برقرار رکھیں گے۔ اس لئے جہاں تک الیکشن میں حصہ لینے کا تعلق ہے میں اس کو حرام بالکل نہیں سمجھتا۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس ذریعے سے اسلام لا سکتا ہے وہ کرے۔ میرے نزدیک اس سے اسلام کا نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سارا سلسلہ وقت کا ضیاع ہے۔ دولت کا ضیاع ہے، صلاحیتوں کا ضیاع ہے اس سلسلے میں میرا موقف بالکل واضح ہے۔ اور اسی بنیاد پر تو میں نے جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی لیکن میں الیکشن کی مخالفت میں وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہتا جو جماعتِ اسلامی نے تحریکِ پاکستان کے متعلق کیا تھا کہ جماعت نے مسلم لیگ سے صرف اختلاف نہیں کیا بلکہ اس کی تحریک کو کفر کے درجے تک پہنچا دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الیکشن میں حصہ لینا ناجائز ہے۔ یہ ایک مباح چیز ہے، جائز ہے۔ پھر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اسلامی انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر اس اسلامی ریاست کو چلانے کے لئے الیکشن کا کوئی نہ کوئی نظام قائم کرنا پڑے گا۔ چاہے اس میں اصول ہمارے مختلف ہوں.
اس میں عورتوں کا ووٹ ہو یا نہ ہو۔ کس عمر کے شخص کو ووٹ دیا جائے۔ تعلیم کا بھی معیار مقرر کر دیا جائے۔ اخلاقی اعتبار سے بھی یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر کوئی سنگین جرم کسی سے سرزد ہو جائے تو ہمیشہ کے لئے اس کا ووٹ کا حق ساقط کر دیا جائے۔ بہرحال ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی انتخابی نظام رائج کرنا پڑے گا اس کے بغیر اسلامی ریاست نہیں چل سکتی لیکن اسلامی ریاست قائم کرنے کے لئے اس الیکشن میں حصہ لینا قطعاً مفید نہیں ہے کہ یہ کام صرف انقلابی عمل ہی سے انجام پا سکتا ہے۔

س : اس انقلابی عمل کے خدوخال کیا ہوں گے؟ اس پر بھی کچھ روشنی ڈال دیجیے۔

ج : میرے نزدیک کسی بھی انقلاب کے چھ مراحل ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ جو نظام آپ لانا چاہتے ہیں اس کی جو نظریاتی اساس ہے اس کو آپ نے پھیلانا ہوگا۔ اور جو قائم نظام ہے اس کی تردید کرنا ہوگی۔ اس پر تنقید کرنی ہوگی۔ اسے باطل و فاسد اور استحصالی دلائل و شواہد سے ثابت کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہر نظام کسی فلسفے پر قائم ہوتا ہے۔ مارکس ازم کی بنیاد پر اگر آپ نے انقلاب لانا ہے تو پہلے اس کے اساسی نظریے کو پھیلانا پڑے گا۔ اس کے لئے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اپنے نظریے کی تبلیغ اور جو غلط نظام قائم ہے اس کے نظریے کی نفی۔ اس کے لئے سارے ذرائع ابلاغ، قوتیں پوری طرح سے استعمال کی جائیں۔
دوسرا مرحلہ، اب جو لوگ آپ کے نظریے کو ذہناً، قلباً اور شعوری طور پر تسلیم کر چکے ہوں ان کو ایک تنظیم کے تحت منظم ہونا چاہیے اور یہ تنظیم ہونی چاہیے آرمی ڈسپلن والی۔ تیسرا کام ہوگا ان کی تربیت کا۔ اب اس

میں فرق ہو جائے گا کہ اگر تو اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے تو خالص عسکری تربیت اور خالص جسمی تربیت۔
ڈسپلن کا خوگر بنا دینا کافی ہوگا۔ اخلاقی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب لانا ہے تو افراد کی اخلاقی
اور روحانی تربیت لازمی ہوگی۔ جہاں وہ خوگر ہو جائیں نظم کی پابندی کے اور مصائب کو برداشت کرنے
کے اور قربانیاں دینے کے وہاں وہ ساتھ ہی عادی ہوں تزکیۂ نفس کے، نماز، روزہ اور دین کے
اور خود کاربند ہونے کے۔ یہ تین مراحل ہیں ابتدائی۔ اب چوتھا مرحلہ جو شروع ہو جاتا ہے پہلے مرحلے
کے ساتھ ہی وہ یہ ہے کہ جب آپ نے دعوت دینا شروع کی تھی تو آپ نے کہا تھا کہ موجودہ نظام غلط ہے
تو ظاہر بات ہے اس نظام کے ماننے والے غصّے میں آئیں گے یا نہیں۔ تو وہ آپ پر تشدد کریں گے،
مزاحمت ہوگی۔ شروع میں جب وہ سمجھیں گے کہ چند سر پھرے لوگ ہیں تو نظر انداز کریں گے۔ پھر مذاق اڑائیں
گے، تمسخر کریں گے، چٹکیوں میں اڑائیں گے۔ لیکن جب انہوں نے سمجھا کہ ان کے کچھ پاؤں جمتے جا رہے ہیں۔
ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ لوگ ہمارے نظام کو متاثر کر سکتے ہیں تو پھر وہ جبر و تشدد،
مار دھاڑ اور جیلوں میں ٹھونسو اور یہ کرو وہ کرو ہوگا۔ اس مرحلے میں عدم تشدد کو اپنا شعار بنانا ہوگا
کوئی مزاحمت نہ کی جائے، صبر کیا جائے، جو تکلیف آئے اس کو برداشت کیا جائے۔ لیکن بدلہ نہ لیا جائے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں انقلابی کارکنوں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ اگر وہ راست اقدام پر اتر آئیں
تو کچل دیئے جائیں گے۔ تو اس لئے وہ ردِّ عمل ظاہر کرنے کے بجائے اپنے اوپر مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ لیکن
ہاتھ نہیں اٹھاتے اس کا اثر یہ پڑتا ہے عوام پر کہ ان کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہیں۔
پھر جب یہ محسوس ہو کہ ہمارے پاس طاقت اتنی ہے کہ ہم کوئی ڈائریکٹ ایکشن اب کر سکتے ہیں۔ ہماری
جمعیت اتنی تعداد میں اور تربیت یافتہ ہے کہ ہم راست اقدام کر سکتے ہیں تو اس طرح پانچواں مرحلہ شروع
ہوتا ہے۔ یہ ہے اقدام کا مرحلہ۔ وہ اقدام کیا ہوگا۔ آپ کسی بھی مسئلے کو لے کر موجودہ نظام کی جو دکھتی رگ
ہے اسے چھیڑیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا کہ اب وہ نظام پوری طاقت کے ساتھ آپ کے خلاف حرکت میں
آئے گا۔ اب مسلح تصادم کا آغاز ہوگا۔ اس مسلح تصادم کے بعد آخری اور چھٹا مرحلہ آتا ہے کہ پھر تخت یا
تختہ۔ اب اگر پوری تیاری کر کے ہی اس مرحلے کا آغاز کیا ہے تو انقلابی جماعت کامیاب ہو جائے گی اور اگر
تعداد کم تھی، تربیت میں کمی تھی، لوگ ایثار پیشہ نہ تھے، اپنے نظریے کے ساتھ پکی وابستگی نہ تھی تو ناکامی کا
منہ دیکھنا پڑے گا۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ چھ مراحل جو میں نے گنوائے ہیں میں نے سیرتِ رسولؐ سے
حاصل کئے ہیں۔ پہلے حضورؐ نے دعوت و تبلیغ شروع کی۔ جن لوگوں نے اسے قبول کیا انہیں جمع کیا

ہ کیا اور ان کی تربیت کی۔ یہ تینوں مرحلے تھے جو ہو رہے تھے بارہ برس تک۔ ساتھ ہی یہ حکم ہے
بارہ برسوں میں کہ ہاتھ مت اٹھانا۔ چاہے تمہیں قتل کر دیا جائے۔ حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ دونوں
شہید کر دیا ابوجہل نے۔ اور مسلمان آخر تھے تو انسان، تیس تھے، چالیس تھے، کچھ تو تھے۔ ان کا خون کھول رہا ہوگا۔
ن حکم تھا کہ ہاتھ نہیں اٹھانا۔ تو یہ چار مراحل مکے کے دور میں مکمل ہو گئے۔ جیسے ہی ہجرت ہوئی اللہ تعالیٰ نے یہ
عطا کر دی۔ اس وقت تک مسلمانوں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہاں اب اقدام کرنے کی
درت حاصل ہو چکی تھی تو ہاتھ بھی کھول دیئے گئے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ آج تک تمہارے ہاتھ بندھے
دئے تھے مومنو، اب تمہارے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ اب تم جواب دو۔ اب حضورؐ نے اقدام فرمایا۔
حضورؐ نے تجارتی راستوں پر اپنے دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ انہیں مخالفین کے لئے مخدوش بنا دیا گیا۔
مسلمانوں نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مختلف غزوے ہوئے۔ بالآخر آٹھ
ہجری کو مکہ فتح ہو گیا اور اسلام غالب ہو گیا۔

ساتواں مرحلہ ہوتا ہے برآمدِ انقلاب کا۔ ایک ملک میں کامیابی کے بعد اب اس انقلاب کی توسیع۔
اس انقلاب کو ایکسپورٹ کرنا۔ مثلاً فرانس کا انقلاب تھا تو صرف فرانس تک ہی نہیں رہا۔ روس کا انقلاب
تھا روس تک نہیں رہا۔ حضورؐ کا انقلاب مکے تک نہیں رہا وہ پھر پھیلا ہے۔ اس کا آغاز تو حضورؐ کے
دور میں ہو چکا تھا لیکن خلافتِ راشدہ کے زمانے میں پھر اس کام میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ تو یہ ہیں انقلاب
کے مراحل۔ اب اس میں ہمارے ہاں ایک تبدیلی آئے گی۔ وہ تبدیلی یہ ہے کہ چونکہ معاملہ مسلمانوں کا ہے
تلوار اٹھانا مسلمان کا مسلمان کے خلاف یہ بہت ہی استثنائی حالت میں جائز ہو سکتا ہے۔ دوسری بات
یہ ہے کہ اب حالات اس قدر بدل چکے ہیں کہ عوام نہتے ہوتے ہیں، حکومت کے پاس ہتھیار ہوتے ہیں
پولیس ہے، فوج ہے، اس طرح کی بہت ساری قوتیں ہیں۔ لہٰذا یہ عملاً ممکن بھی نہیں رہا کہ کوئی مسلح
جدوجہد کی جائے۔ لہٰذا یہاں یہ صورت حال ہو گی انقلاب کے پانچویں مرحلہ میں کہ پرامن مظاہرہ کیا جائے
گا۔ آپ سڑکوں پر نکلیں گے۔ اگر آپ کے پاس منظم لوگ ہیں اور اتنی تعداد میں کہ آپ ان کو قابو میں رکھ
سکتے ہیں تو اس طرح آپ پرامن مظاہرے کی صورت میں مطالبہ کریں گے۔ صاحب یہ کام دین کے خلاف
ہے لہٰذا ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔ اب یا تو یہ ہوگا کہ حکومت آپ کی قوت سے متاثر ہو کر آپ کی بات
تسلیم کرے گی اور ایک ایک کر کے منکرات تبدیل ہوتے جائیں گے اور اسلام آ جائے گا۔ لیکن اگر حکومت
بنا لے اسے اپنی انا کا مسئلہ کہ ہم تو یہی کریں گے جو کر رہے ہیں اور ہم تو اس نظام میں تبدیلی نہیں
لائیں گے تو اب ہوگا تصادم۔ لاٹھیاں برسیں گی، گولیاں چلیں گی، جیلوں میں ٹھونسا جائے گا۔

بواب اگر ان لوگوں میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہے تو وہ جانیں دے دیں گے۔ تو جب لوگ قربانیاں
پر آجائیں گے تو کتنوں کو ماریں گے، شہنشاہ ایران نے کتنوں کو مار لیا۔ یہاں پاکستان میں بھٹو کو فوج
جواب دے دیا تھا کہ ہم اپنے ہم وطنوں پر گولیاں نہیں چلائیں گے۔ لوگ سڑکوں پر نکلے ہوئے ہیں۔ کتنوں کو
با دو سو کو چار سو کو ہزار کو تو پھر ایک انقلاب آجائے گا۔ یہی واحد راستہ ہے جو قابل عمل ہے۔

ایک بات ذہن میں رکھئے کہ اس راستے میں آپ کو تمام مذہبی قوتوں کی تائید حاصل ہوگی۔ کیونکہ منکرات
ب متفق ہیں۔ ہمارے ہاں فضائل میں یا نیکیوں میں تو اختلاف ہے کہ نماز اس طرح پڑھنے میں زیادہ ثواب
۔ یا اس طرح پڑھنا زیادہ موزوں ہے۔ یہ تو ہو گیا اختلاف لیکن منکرات میں اختلاف نہیں ہے کون
ان ہے چاہے وہ اہلحدیث ہو، بریلوی ہو، دیوبندی ہو، جسے یہ معلوم نہ ہو کہ اسلام میں پردہ ہے۔ سب
تے ہیں کہ بے پردگی منکر ہے۔ بے حیائی منکر۔ فحاشی منکر ہے۔ کون نہیں مانتا کہ سود حرام ہے۔ تو جو چیزیں
ہیں، منکرات ہیں، ان پر اتفاق ہے۔ لہٰذا اگر ان مسائل پر کوئی تحریک اٹھتی ہے تو سب عناصر اور جماعتوں کی تائید
حاصل ہوگی۔ جبکہ الیکشن کے راستے میں جہاں مخلصین آسکتے ہیں وہاں وہ لوگ بھی آسکتے ہیں جو محض
کے طالب ہوں گے۔ ایسی مثالیں ہمارے ہاں موجود ہیں کہ دینی جماعتوں میں لوگ آئے اور کامیابی
ند حکومتی پارٹی میں شامل ہو گئے۔

: آپ تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے جو جد و جہد کر رہے ہیں دعوت حق کے لئے۔ آپ کیا تجزیہ
ہیں کہ انقلاب کے لائحہ عمل کے حوالے سے آپ اس وقت کس مرحلہ میں کھڑے ہیں اور ابھی آپ کی
نی دور ہے!

: ابھی ہم بالکل ابتدائی مرحلے میں ہیں کہ دعوت، تنظیم اور تربیت۔ یہ کرنے کی ہم کوشش کر رہے ہیں۔ اس
مارا مذاق اڑایا جا رہا ہے، تمسخر کیا جا رہا ہے مگر ہم اپنا کام کئے جا رہے ہیں۔

: پاکستان میں جتنی اسلامی تنظیمیں قائم ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ یہاں صحیح معنوں میں ایک اسلامی معاشرے
ل اور دین کی اقامت کے لئے جد و جہد کر رہی ہیں۔ اسلام کے حوالے سے جماعتوں کی ایک بھیڑ کی موجودگی
پ تنظیم اسلامی کا قیام کن مقاصد کے حصول کے لئے عمل میں لائے ہیں۔ آپ کے نزدیک اس نئی تنظیم کی ضرورت
از کیا تھا!

: وہ جو پہلی تنظیموں کا جواز تھا۔ آخر جو تنظیم بھی بنی ہے اس سے پہلے بھی تو جماعتیں موجود تھیں تا تو
ی تنظیم کیوں بنائی گئی۔ یہ تو خیر الزامی جواب ہو گیا۔ لیکن اپنی تنظیم کے جواز کے حوالے سے میں عرض کروں گا۔
۔ اسلام کے حوالے سے ہمارے ہاں جو تنظیمیں موجود تھیں۔ ان سب کے دل میں اسلام کا درد موجود ہے

راس امت کا۔ امت محمدؐ کا۔ سب یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا بول بالا ہو اور مسلمانوں کے مسائل کو حل کیا جائے۔ تشخیص اور تجویز میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ اب نبیؐ تو کہیں بھی نہیں کہ جس کی بات کو حرف آخر سمجھا جائے۔ لہٰذا حق پہنچتا ہے کہ ایک آدمی یا جماعت کی جو تشخیص یا نقطۂ نظر ہے اس سے اختلاف کیا جائے۔ تو اگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میرے نزدیک مسائل کا حل اس طرح ہے جو اس سے اتفاق کرتا ہے وہ اس کے ساتھ چلا جائے اور اگر دوسرا شخص یہ کہتا ہے کہ میرا نقطۂ نظر یہ ہے تو جو اس سے اتفاق کرتا ہے وہ اس کیساتھ تعاون کرے۔ اس طرح متعدد جماعتوں کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ دینی جماعتوں کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ آپس میں تلخی نہ رہے۔ یہ سمجھیں کہ ہمارے مقاصد ایک ہیں بس صرف لائحہ عمل میں فرق ہے۔ اس کی میں مثال دیا کرتا ہوں حج کی۔ اگر آپ گئے ہوں گے جب حاجی صاحبان روانہ ہوتے ہیں عرفات کو۔ آپ اندازہ کریں کہ کم از کم پچیس لاکھ افراد کو وہاں جانا ہوتا ہے۔ اب ان سب کی منزل عرفات ہے لیکن اب کوئی دس راستے بنا دیئے گئے ہیں۔ کوئی کسی راستے سے جا رہا ہے کوئی کسی راستے سے۔ کوئی پیدل جا رہا ہے، کوئی سواری کے ذریعے سے۔ مختلف گروپوں نے اپنے اپنے معلموں کے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں تاکہ الگ سے شناخت رہے اور کوئی حاجی گم نہ ہونے پائے۔ تو قافلے بھی علیحدہ ہیں، جھنڈے بھی علیحدہ ہیں، راستے بھی علیحدہ ہیں لیکن منزل ایک ہے تو اس طرح دین کے لئے مختلف جماعتوں میں کام کرنے والوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا کام ایک ہے۔ اس کے لئے مختلف طریق کار یا عمل پیرا ہیں لہٰذا مختلف تنظیموں کا وجود اور کسی نئی تنظیم کا قائم ہونا بالکل جائز ہے۔

س: کہا جاتا ہے کہ اسلام میں عہدہ طلبی اور اقتدار کے لئے ہم جوئی جائز نہیں۔ کیا نیکی کے فروغ، برائی کے تدارک اور دین کی اقامت کے لئے اقتدار کی طاقت کے حصول کے لئے جد وجہد بھی اسی ضمن میں آتی ہے؟

ج: ایک تو یہ ہوتا ہے کہ ہم عہدہ طلب کرنے کا مسئلہ پہلے رکھیں اور اصلاح کے عمل کو مؤخر کریں کہ جب ہمیں عہدہ اور اختیارات مل جائیں گے تو اصلاح کریں گے۔ یہ معاملہ تو ہے غلط۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ آپ انقلاب کے عمل کو شروع کریں جس طرح کہ میں نے انقلاب کے مراحل کا ذکر کیا ہے۔ اور اگر آپ اپنی جد وجہد کے نتیجے میں اور اصلاح کی تحریک کے بعد ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں آپ کو اقتدار سنبھالنا پڑ جائے تو یہ تو ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ پھر اس ذمہ داری کو پورا کرنا ہوگا۔ جس طرح کہ نبیؐ نے اس ذمہ داری کو نبھایا لیکن جب ایک اسلامی ریاست قائم ہو جائے اس میں عہدہ طلبی جائز نہیں ہے۔ کے لئے ہمیں کوئی ایسا راستہ اپنانا ہوگا کہ لوگوں کی بہتر ... سے بہتر آرا ہو جائیں اس کے مطابق فیصلہ

جائے۔ تو اس نظام میں ایسے افراد کی حوصلہ شکنی کی جائے گی جو از خود عہدہ کے طالب ہوں گے۔
: کوئی ایسا نظام تشکیل دے رکھا ہے آپ نے کہ جس میں اقتدار کے حریص افراد کو آگے
سے روکا جاسکے۔
: ایسے کسی نظام کے خدوخال تو میں نے ابھی نہیں بنائے لیکن ایسا ممکن ہے اور وقت آنے پر
ظام ترتیب دیا جاسکتا ہے۔
: آپ نے اسلامی انقلاب کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر کو بتایا ہے۔ لیکن جو دینی جماعتیں اقامتِ
کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے الیکشن کے راستے کو اپنائے ہوئے ہیں ان کے بارے میں
کیا خیال ہے؟ آخر کوئی جواز تو ان کے پاس بھی ہوگا الیکشن وغیرہ میں حصّہ لینے کا۔
: اس حوالے سے جماعت اسلامی کا طرزِ عمل تو بہت افسوسناک ہے۔ جماعت نے ۵۱ء میں انتخابات
صّہ لیا تو اس کے لئے ایک متبادل نظام تجویز کیا تھا۔ اور امیدواری کو حرام قرار دیا تھا۔ اس کے ساتھ
پارٹی ٹکٹ کو حرام قرار دیا تھا۔ ایک پنچایتی نظام انہوں نے بنایا تھا کہ جو لوگ بھی ہمارے اس منشور
متفق ہیں وہ ووٹر کا عہدنامہ پُر کریں گے۔ ان کی پھر پنچایتیں بنیں گی۔ وہ پنچایتیں اپنی نظر سے دیکھیں
کون ہے قابل، اہل اور صالح آدمی۔ اس کو وہ امیدوار منتخب کریں گی۔ پھر وہ شخص پیسہ نہیں لگائے گا۔
بھاگ دوڑ نہیں کرے گا۔ یہ پنچایتوں کا کام ہوگا کہ اس کے لئے بھاگ دوڑ کریں۔ اس کے لئے
بھی لگائیں۔ تو یہ تھا ایک آئیڈیل نظام، ایک بڑا خوبصورت نظام اور اسلام کے اصولوں کے مطابق۔
اس کے مطابق تو جماعت کو ایک سیٹ بھی نہ ملی تو جماعت کو اس میں ترمیم کرنی پڑی۔ گویا اگر زمانے نے
کے ساتھ موافقت اختیار نہ کی تو انہوں نے زمانے کے ساتھ موافقت اختیار کر لی۔ تکلیف دہ پہلو اس
یہ ہے کہ جماعت نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا تھا پھر ان ہی چیزوں کو اختیار کر لیا۔ جماعت کا معاملہ
ہے افسوسناک۔ باقی جماعتوں کے پاس الیکشن کے مروّجہ نظام میں حصّہ لینے کا جواز کیا ہے اس کا
پورے طور سے تو علم نہیں۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ کسی عہدے کے حصول کے لئے الیکشن
حصّہ نہیں لے رہے بلکہ دین کی طرف سے ایک ذمّہ داری ہے جسے پورا کرنے کے لئے وہ اس
حصّہ لے رہے ہیں۔ تو یہ نیّتوں کا معاملہ ہے جسے اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن میرا اعتراض تو یہ ہے
سلام کو قائم کرنے کے لئے بالفعل یہ طریقہ درست نہیں ہے۔
: آج امّتِ مسلمہ جس انتشار، خود غرضی، غلط رہنمائی اور قوّتوں اور صلاحیتوں کے ضیاع

...کا کیا موقف ہے!

ج: میرا ان تحریکوں کے بارے میں یہ نقطۂ نظر نہیں ہے جو آپ نے بیان کیا ہے بلکہ اس کو میں ایک ...یع تناظر میں لیتا ہوں۔ ہماری امت کی چودہ سو سالہ تاریخ میں دو ہمارے دور عروج کے آئے ہیں، دو زوال کے آئے ہیں۔ پہلا عروج تھا عربوں کی قیادت۔ اسلام جو ہے سو فیصد اسلام وہ تو ہے حضورؐ ...ر خلافت راشدہ کا دور۔ اب آگے میں مسلمانوں کی تاریخ لے رہا ہوں۔ حضورؐ اور خلافتِ راشدہ کے ...د سب سے اعلیٰ دور ہے بنوامیہ کا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں عروج و زوال کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ایک ...روج عربوں کی زیرِ قیادت تھا بنوعباس کے نصف آخری دور میں ہمارا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دوبارہ ابھارا اور ترک اقوام کو اسلام میں داخل کر دیا۔ یہ جو نیا خون آیا اسلام میں تو ایک نیا عروج آیا پھر اس کے بعد زوال آیا ہے مغربی استعمار کے ہاتھوں۔ مغربی استعمار اپنے کمال کو پہنچا تو پھر اسلام پر زوال کا آسیب ختم ہونے لگا۔ یہاں سے اسلام کے عروج کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے اور اس میں وقت لگے گا ابھی۔ پھر اس کے کئی مراحل ہیں۔ مثلاً پہلے صرف آزادی کی تحریکیں چلیں ان کا دین سے اتنا گہرا تعلق نہیں تھا لیکن ان تحریکوں نے بھی اسلام کے احیاء کے عمل میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ آزادی ملی ہے تو اب یہاں بات کرنے کا موقع ملنے لگا ہے کہ یہاں اسلام آنا چاہیے۔ اس کے بعد جو تحریکیں چل رہی ہیں، جماعت اسلامی کی تحریک ہے، علماء کی تنظیمیں ہیں، دوسری اسلامی تنظیمیں ہیں۔ ان کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر تنظیم کو اس کا کریڈٹ دینا چاہیے۔ جماعتِ اسلامی نے سینکڑوں جوانوں کو متحرک کیا۔ میں خود ان میں سے ایک ہوں۔ اسی طرح تبلیغی جماعت نے ہزاروں نوجوانوں کو مسجدوں کا رُخ دکھلایا ہے۔ گویا ہر تحریک کا کچھ نہ کچھ مثبت کردار ہے لیکن حقیقت میں ہم اتنی پستی میں جا چکے تھے کہ اس سے ابھر کر آ جانا یہ کوئی دو چار یا دس سال کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک طویل عمل کی ضرورت ہوگی۔ اس میں جو کوئی بھی اپنا حصہ ڈال رہا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

س: کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں علماء کرام نے اپنی ذمہ داریوں کو ایک پیشے کی صورت دے دی ہے۔ علماء کے اس طرزِ عمل سے امتِ مسلمہ میں جو بگاڑ اور خرابی جنم لے رہی ہے اس کے بارے میں آپ کا تجزیہ کیا ہے!

ج: آپ نے پیشے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں علماء کرام کے تذکرے میں اس کو پسند نہیں کروں گا لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں علماء کا ایک طبقہ درس و تدریس، امامت اور خطابت کے فرائض کے بدلے کچھ پیسے وغیرہ لیتا ہے اور اس اعتبار سے ایک مشابہت پیشے سے ہو جاتی ہے۔ یہ

یہ سمجھتا ہوں کہ یہ چیز اسلام کے اساسی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسلام میں کوئی متعین طبقہ مذہب کے حوالے سے تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن یہ بالکل ابتدا ہی میں ہوگیا تھا کہ بعض لوگ جو ہمہ وقت دینی خدمات انجام دیتے تھے تو معاشرے کی طرف سے ان کے معاش کا کچھ اہتمام کر دیا جاتا تھا۔ یہ حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں کچھ تنخواہ اور وظائف وغیرہ کا تعین ہوگیا تھا۔ اب جو صورت حال اس وقت ہے ایک تو یہ کہ جب مغربی استعمار یہاں آیا اس کے نتیجے میں ہمارے ہاں دو طبقات وجود میں آئے۔ ایک طبقہ وہ جس نے جدید تعلیم حاصل کی اور سرکاری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں وہ آگے بڑھ گیا۔ جب کہ علماء کرام نے اس وقت بڑے ایثار سے کام لیا۔ انہوں نے جدید تعلیم اور اعلیٰ معاش کے راستے اپنے اوپر بند کیے اور دینی علوم کی تحصیل کے بعد اسلام کی خدمت میں ہمہ تن منہمک ہوگئے۔ اس طریقہ سے ہمارے ہاں ایک طبقاتیت پیدا ہوگئی۔ ایک طبقہ علماء کا۔ ان کا درس و تدریس کا نظام علیحدہ، ان کی وضع قطع، بود و باش، شکل و صورت، لباس، بالکل علیحدہ۔ اور دوسرا جو یونیورسٹیوں سے اور کالجوں سے پڑھ کر نکلتا ہے۔ ان دونوں میں بہت بعد ہوگیا ہے۔ میرے نزدیک علماء کے اس طبقہ کا علیحدہ وجود میں آجانا اسلام کے معیار کے عمل میں مفید نہیں ہے۔ مضر ہے۔ لیکن اس کا الزام ہم علماء کو تو نہیں دے سکتے۔

س : ڈاکٹر صاحب! اب پاکستان میں اسلامائزیشن کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ موجودہ حکمرانوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے بہت اہم اقدامات کئے ہیں — زکوٰۃ و عشر، بلاسود بینکاری نظام، اسلامی حدود کے نفاذ اور قاضی کورٹس کے قیام کو وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے!

ج : اس سلسلہ میں آغاز میں مجھے بھی کچھ توقعات تھیں۔ جنرل ضیاء الحق کے بارے میں مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ وہ ایک نیک اور پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان ہیں اور ان کا کچھ دینی مطالعہ بھی ہے۔ جب میں نے پہلی جلد شائع کی ہے تدبر قرآن کی اور یہ آپ ہی کے پریس میں چھپی تھی، "پٹھان پریس" میں۔ جنرل ضیاء الحق اس وقت ملتان میں جی او سی تھے تو ان کے ایک جونیئر میرے پاس آئے تھے اور ان کے لئے کتاب لے کر گئے تھے۔ اب تدبر قرآن کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ اس کا ایک خاص علمی معیار ہے۔ اس لئے اسے عام پڑھا لکھا آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ جنرل ضیاء الحق کی اس کتاب سے دلچسپی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دینی ذوق کا ایک معیار ہوگا۔ جب قرآن کانفرنس ہوئی تھی تو اس موقعہ پر بھی انہوں نے از خود پیغام بھیجا تھا اور خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے پڑھ کر سنایا جائے۔ تو اس سے ان کی دین کے ساتھ رغبت کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری جنرل ضیاء الحق

نصیحت ہے یا مشورہ کہہ لیں کہ آپ بھرپور طور پر پورے کے پورے اسلام کو نافذ کریں ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انتہائی اہم موقع فراہم کیا ہے ۔ اس لئے آپ جرأت مندانہ اقدام کے ساتھ اسلام کے نفاذ کے لئے اقدام کریں۔ ساتھ ہی میں نے یہ کہا تھا کہ یہ معاشرہ اسے قبول نہیں کرے گا اور آپ کو اٹھا کر پھینک دے گا۔ لیکن آپ کا اس چیز کو قبول کر لینا کہ معاشرہ اگر اسلام کو قبول نہیں کرتا تو آپ بھی حکومت چھوڑ دیں یہ اس سے بہتر ہے کہ آپ اقتدار پر تو قائم رہیں مگر اسلام کو چھوڑ دیں۔ اگر کسی مسلمان کے پاس اقتدار ہو اور پھر وہ اسلام کو نافذ نہ کرے تو یہ اللہ کے ہاں ناقابلِ معافی جرم ہے ۔ میں نے ۸۲ء کے اواخر میں جنرل ضیاء کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں میں نے یہ بات کہی تھی کہ میں آپ سے بالکل مایوس ہو چکا ہوں ۔ اسلام کا آپ کوئی کام نہیں کر سکے ۔ یہ سعادت آپ کے حصّہ میں نہیں ہے۔ تو اب آپ نے اسلام کے نام پر اس ملک کی جو سیاسی گاڑی رکی ہوئی ہے خدا کے لئے اس سیاسی گاڑی کو چلنے دیجئے۔ سیاست کا رک جانا اور خلاء پیدا ہو جانا یہ اس ملک کے لئے بہت خوفناک ہے۔ سندھ کے اندر نوجوانوں میں اس طرح کی ایک تحریک جڑ پکڑ چکی ہے جس رخ پر بنگلہ دیش کی تحریک شروع ہوئی تھی اور جو منتج ہوئی مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر ـــــ !

باقی موجودہ حکومت کے آٹھ سالوں کے بارے میں میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ اسلام کے لئے کچھ بھی نہیں ہوا۔ موجودہ حکمرانوں نے اوپر اوپر کچھ رنگ و روغن لگانے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے معاشرے میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ اس کا نتیجہ یہ کہ عوام اسلام سے مایوس ہو رہے ہیں ۔ اگر عوام کے دل میں یا ذہن میں کسی گوشے میں ایک امید تھی کہ اسلام ایک عادلانہ نظام ہے اور بہت اعلیٰ نظام ہے ۔ سماج، معاش اور سیاست سب کے لئے راہیں متعین کرتا ہے تو ان کے دلوں میں امید تھی اسلام آئے گا تو ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے، ظلم و ناانصافی کا دور ختم ہو جائے گا۔ رشوت کا قلع قمع ہو جائے گا ۔ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا۔ جب ان سے یہ کہا جائے گا کہ اسلام تو آ گیا نافذ کر دیا گیا مگر اب انہیں معاشرے میں کوئی خیر کا پہلو نظر نہیں آتا بلکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہی پریشانیاں، وہی مشکلات، وہی مصائب، وہی نظام جوں کا توں موجود ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ سوچیں کہ اسلام میں بھی ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں منفی کام زیادہ ہوا ہے ۔ بجائے کسی مثبت کام کے ۔

س : ایک اور دعویٰ جو حکومت کی طرف سے بڑے شد و مد کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔ وہ سادگی، رزقِ حلال، انسدادِ رشوت اور چادر اور چار دیواری کے تحفظ کا ہے ۔ اس حوالے سے کیا آپ موجودہ حکومت کی کارگزاری پر اطمینان کا اظہار کر سکتے ہیں ؟

ج : ان میں سے کسی چیز میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ بلکہ میرے نزدیک حالات پہلے سے بھی دگرگوں ہو گئے ہیں۔ رشوت کے بارے میں تو انہوں نے خود تسلیم کر لیا ہے کہ ہم اس کے انسداد میں بالکل ناکام ہو گئے ہیں بلکہ رشوت پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے۔ اسی طرح چادر اور چار دیواری کا جو معاملہ ہے اس میں سے ضیاء صاحب کا اور پوری حکومت کا جو کردار رہا ہے وہ بہت ہی افسوسناک ہے۔ انہوں نے جس قدر بے پردگی اور خواتین کی آزادی کی تحریک کو شہ دی ہے اور جس قدر اس کو سپورٹ کیا ہے پروموٹ کیا ہے اور اس کے لئے جو عملی اقدامات کئے ہیں پہلی کسی حکومت نے بھی ایسا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بھی اس حد تک نہیں گئی تھی جس حد تک یہ گئے ہیں۔ ستم ظریفی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ موجودہ حکمران دین کے باقی معاملات میں تو علماء سے رجوع کرنے کو تیار ہیں لیکن خواتین کے مسئلے پر وہ علماء کی رائے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اس معاملے میں خاموش ہے۔ میں نے حکومت سے کہا کہ وہ خواتین کے حوالے سے پردے کے مسئلے پر یا دیگر مسائل پر میری بات نہ مانے۔ شاید میرے خیالات انتہا پسندانہ ہوں مگر آپ دوسرے علماء سے تو رجوع کریں کہ وہ ان مسائل میں کیا راہنمائی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حوالے سے حکمرانوں کے دل میں کوئی چور ہے۔ اس لئے وہ اسلامی معاشرے میں خواتین کے مقام کو متعین کرنے کے لئے علماء سے رہنمائی لینے کو تیار نہیں۔

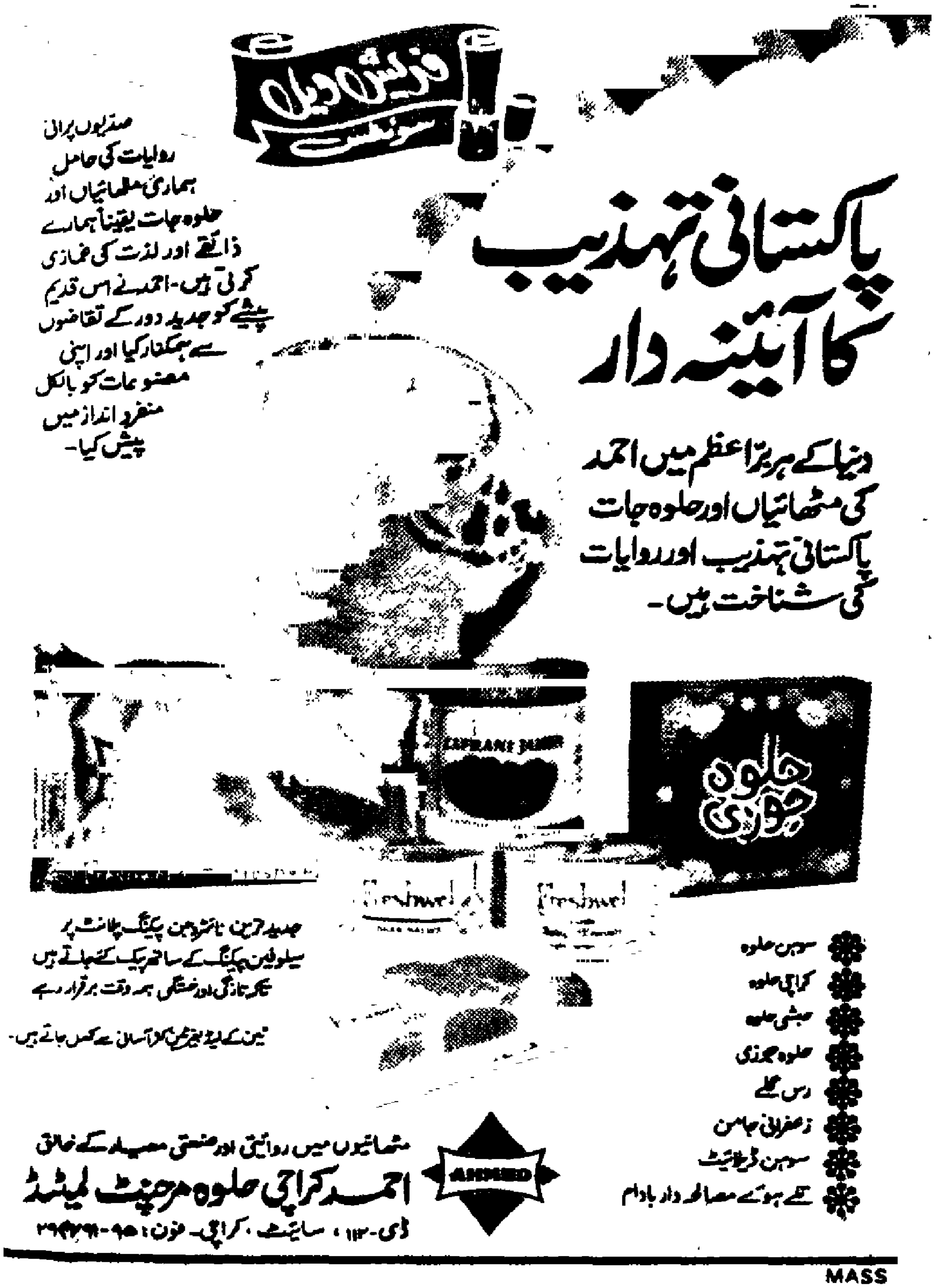
س : حکمرانوں کی طرف سے اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام میں حزب اختلاف کا وجود نہیں۔ اسلامی تاریخ اور تعلیمات کے حوالے سے اس مسئلہ پر آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : رسول اللہ اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں تو حزبِ اقتدار تھی نہ حزبِ اختلاف، اسلام میں مقتدر قوت تو خود اسلام ہی ہوتا ہے۔ اب اگر جدید تقاضوں کے پیش نظر اگر کوئی باقاعدہ حزبِ اقتدار تشکیل پائے گی تو پھر حزبِ اختلاف کے وجود کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

س : اسلامی معاشرے میں صحافت کا کردار کیا بنتا ہے۔ موجودہ صحافت کس حد تک اسلامی معاشرے کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے؟

ج : میرے نزدیک صحافت ایک بہت ہی مفید ادارہ ہے اور عوام کے لئے معلومات کا ایک اہم ذریعہ ہے مگر ایک بات میں پاکستانی صحافت کے حوالے سے کرنا چاہتا ہوں کہ ادب برائے ادب یا زندگی برائے زندگی کی طرح صحافت برائے صحافت کا بھی ایک نظریہ بنا ہے۔ اس سے بھی زیادہ خرابی یہ آئی ہے کہ صحافت نے ایک کاروبار کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہماری صحافت کا میدان نہایت مایوس کن منظر پیش کر رہا ہے۔ تجارت میں جو اصول ہوتا ہے کہ جو بھی عوام کو پسند ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس طرح کی چیزیں

بات میں چھاپنا اور کوئی اپنی اخلاقی ذمہ داری قبول نہ کرنا کہ جو ہم شائع کر رہے ہیں وہ کتاب و سنت
متصادم تو نہیں۔ گویا ہم اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ میرے خیال میں دو
ادسے اصحاب صحافت کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ اطلاعات فراہم کرتے وقت اپنی
نی حد تک تحقیق کرنے کے بعد کوئی خبر شائع کریں۔ دوسرا یہ کہ لوگوں کی رائے جاننے کے لئے ان کو
نہ اور فکری غذا دینے کا عمل جو اخبارات نے شروع کر رکھا ہے اس حوالے سے جو مضامین یا آراء اخبارات
شائع کی جاتی ہیں ان کے بارے میں پوری طرح سے اطمینان کر لینا چاہیئے کہ یہ کہیں قرآن و سنت کے
ف تو نہیں۔ ہر اخبار کو علماء کا ایک بورڈ تشکیل دینا چاہیئے کہ جو مضامین اور تجزیے مذہب کے حوالے سے
ئع کئے جائیں۔ اشاعت سے پہلے علماء سے ان پر رائے لے لی جائے۔ یہ نہیں کہ اختلافی آراء شائع نہ ہوں
اس بات کا خیال رہنا چاہیئے کہ آخر اختلافات کی بھی حدود ہیں۔ آپ اگر قرآن و سنت کی حدود سے باہر
کوئی چیز شائع کر دیں گے تو یہ ہزاروں لوگوں تک پہنچنے والا مواد کسی کو بھی گمراہ کر سکتا ہے۔ اس صورت میں
ایسی کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ (بشکریہ "چٹان" لاہور)



ونیش دیلا سرنس
پاکستانی تہذیب
کا آئینہ دار
صدیوں پرانی روایات کی حامل ہماری مٹھائیاں اور حلوہ جات یقیناً ہمارے ذائقے اور لذت کی غمازی کرتی ہیں۔ احمد نے اس قدیم پیشے کو جدید دور کے تقاضوں سے ہمکنار کیا اور اپنی مصنوعات کو بالکل منفرد انداز میں پیش کیا۔
دنیا کے ہر بڑا اعظم میں احمد کی مٹھائیاں اور حلوہ جات پاکستانی تہذیب اور روایات کی شناخت ہیں۔
حلوہ جوزی
جدید ترین نائٹروجن پیکنگ پلانٹ پر سیلوفین پیکنگ کے ساتھ پیک کئے جاتے ہیں تاکہ تازگی اور خستگی ہمہ وقت برقرار رہے
ٹین کے لئے بغیر کسی اوزار آسانی سے کھل جاتے ہیں۔
سوہن حلوہ
کراچی حلوہ
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
رس گلے
زعفرانی جامن
سوہن کریمی
تلے ہوئے مصالحہ دار بادام
مٹھائیوں میں روایتی اور صنعتی معیار کے خالق
AHMED
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی-۱۱۲، سائٹ، کراچی۔ فون: ۹۵-۲۹۴۷۹۱
MASS

افکار و آراء

مکتوب گرامی مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)

گرامی قدر حضرت ڈاکٹر صاحب   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

مزاجِ محترم!

علی محمد صاحب شیر میوات متولی جامعہ رحیمیہ کی زبانی آپ کی عنایات کا علم ہوا۔ آنجناب نے جامعہ کی جو مالی اعانت فرمائی ہے اس کے لیے ہدیہ تشکر قبول فرمائیے۔ دونوں پرچے برابر مل رہے ہیں اور آنجناب کی سرگرمیوں سے استفادہ کا موقعہ مل رہا ہے۔

کل ہی فرید مکیؒ صاحب سے ملاقات ہوئی، انہیں آپ کے کام سے اسقدر دلچسپی ہے کہ مجھے دورانِ گفتگو میں تاکید کی کہ ڈاکٹر صاحب کے کام سے تعلق رکھنا۔ ڈاکٹر صاحب کے اندازِ کار سے پاکستان کے اندر مختلف مکاتب فکر کے اندر اتحادِ عمل پیدا ہوگا جو ملت کی شدید ضرورت ہے۔

مولانا علی میاں صاحب ندوی کا تذکرہ بھی کر رہے تھے مولانا دلی میں مقیم ہیں، فرماتے تھے کہ میں نے علی میاں کو ڈاکٹر صاحب کے کام کی طرف متوجہ کیا اور علی میاں نے تحسین کے کلمات فرمائے۔ طالبِ دعا

اخلاق حسین قاسمی

(۲)

"رُوبرو" کے متعلق ایک تأثر

محترمی، زاد مجدہ۔ السلام علیکم

دو تین روز اخبارات میں "رُوبرو" کا اشتہار پڑھتا رہا۔ اور کچھ مشوش بھی ہوتا رہا۔ کہ طبعاً میں مجادلہ

- 'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن'،
- مولانا افتخار احمد فریدی (مراد آباد۔ بھارت)

اور مناظرے کے خلاف ہیں فطری کمزوری یا کم علمی کی وجہ سے ۔ بہرحال تبلیغ دین کے لیے اس کو پسندیدہ نہ
سمجھنا ۔ پھر "مناظرہ" میں کچھ سختی کا استعمال بلکہ اہتمام بھی ہوتا ہے ۔ جس کا ثبوت ، آپ کی تقریر میں بار بار
ناشر کی مداخلت سے ظاہر بھی ہو گیا۔

آپ نے نجاست "مناظرہ" سے بہرحال صحیح قدم اٹھایا۔ جو نتیجہ سے ظاہر ہو گیا۔

کل T.V. پر یہ مباحثہ سن کر ، بے حد خوشی ہوئی اور فخر بھی ۔ وجہ محتاج بیان نہیں
آپ کی تقریر نے بہت سے ذہنوں ۔ عوام و خواص ۔ کی اُلجھنوں اور کج فہمیوں کو صاف
اور اسلام بر پا کرنے کے زور دار پراپیگنڈا کی قلعی بھی کھول دی۔ جزاک اللہ!

ڈاکٹر شیر خان بنی ایبٹ آباد

(۳)

ایرانی انقلاب ــــ علمائے کے لیے لمحۂ فکریہ

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

مئی ۱۹۸۵ء کے "میثاق" میں "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" کی تیسری اور آخری
پڑھ کر ابھی فارغ ہوا ہوں ، یہ امر واقعی ہے کہ آپ نے اس اہم موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے "
کفایہ" ادا کیا ہے در حقیقت یہ ذمہ داری ان علمائے عظام پر عاید ہوتی ہے جو ماشاء اللہ علم دین کی باعتبا
مستند رکھنے کے ساتھ ساتھ "لغت ہائے حجازی" کے اصل امین و وارث ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ
ہو سکتی ہے کہ وہ اس موضوع پر کچھ کہنا یا لکھنا خلاف مصلحت سمجھتے ہوں ۔ یہاں علمائے عظام سے میری مراد وطن
کے علمائے عظام ہیں ورنہ علمائے ہند میں سے خاص طور پر شیخ الحدیث مولانا محمد منظور احمد نعمانی اور مفکرِ اسلام
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خمینی صاحب کے "اسلامی انقلاب" پر باقاعدہ ایک ایک کتاب لکھی۔

شہنشاہ ایران کی جلاوطنی کے بعد جب خمینی صاحب مع اپنے "اسلامی انقلاب" کے واردِ ایران ہوئے
تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے دو نمائندے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پاس بھیجے ان نمائندوں ۔
خمینی صاحب کا کیا پیغام مودودی صاحب کو دیا واللہ اعلم لیکن یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ کسی بھی "
تعلق" کی بنا پر جماعت اسلامی کے ذرائع ابلاغ نے بڑے پُر جوش انداز میں خمینی صاحب کے "اسلامی انقلا
کو وطن عزیز میں Project کیا اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے ۔ اس موقع پر میں بڑی کشادہ دلی
ساتھ خمینی صاحب کی "جرأت رندانہ" کی تعریف کروں گا کہ انہوں نے "ایرانی انقلاب" کو "اسلامی انقلا

کا رنگ دینے اور ...... "سنی شیعہ" کی عدم تفریق کا نعرہ لگانے کے باوجود بعض کتبِ تقیہ "پاکستان" کے مذہب جعفریہ کے اصل عقاید بلاکم وکاست اپنی کتابوں میں وضاحت سے کر دیا ان کی بلکہ ان کتابوں کو پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ راقم الحروف کو "قائد انقلاب ایران" کی تصانیف جلیلہ" اور "خطبات عالیہ" کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے، خمینی صاحب کی تصانیف و خطبات میں دو اصطلاحیں خاص طور پر نظر آئیں گی یعنی "طاغوت" اور "طاغوتیت" جو موصوف نے خاص طور خلفائے ثلثہ یعنی ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے لیے وضع کی ہیں "طاغوتیت" کا نعم البدل ایک اور نعرہ ہے" جسے "نعرہ یزیدیت" کہتے ہیں جس کی "معنوی بلاغت" کو بھولے بھالے مسلمان نہیں سمجھ پاتے یہ نعرہ دراصل خلافت راشدہ کے خلاف بطور "علامت" استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے مخاطب صرف حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ ہیں نہ کہ یزید پلید۔

جنابِ والا!

یہ بات ببانگ دہل کہی جاتی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اس ملک کا قیام سنیوں اور شیعوں کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے سنی شیعہ بھائی بھائی ہیں چلیے تھوڑی دیر کو یہ بھی مان لیتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنی تو شیعوں کے بھائی ہو گئے۔ اب اس رشتہ کے قائم ہونے کے بعد ان سنیوں کا کیا بنے گا جو صحابہ کرام کی محبت وعقیدت کو اپنا جزو ایمان سمجھتے ہیں؟ کیونکہ خمینی صاحب کے اسلام میں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابوذرؓ، عمارؓ یاسرؓ، سلمان فارسیؓ اور مقدادؓ کے علاوہ تمام صحابہ کرامؓ نعوذ باللہ "مرتد" ہو گئے تھے ایسی صورت میں لمحہ فکریہ خمینی صاحب یا ملتِ جعفریہ کے لیے نہیں بلکہ "سواد اعظم" اور اس کے علمائے عظام کے لیے ہے ..... حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ "سنی شیعہ اتحاد" کے لیے بعض دیوبندی اور بریلوی علماء پیش پیش ہیں غالباً انہیں اس اتحاد کا انجام معلوم نہیں، جب ان سے اس سلسلہ میں وضاحت طلب کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ملک کے حالات نازک ہیں اس لیے ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ملک کے حالات نازک ہوں تو دشمنانِ صحابہؓ سے اتحاد کیا جا سکتا ہے اس مسئلہ پر تو علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین ہی روشنی ڈال سکتے ہیں:

تیسری قسط میں آپ کا یہ کہنا کہ:۔

"سنی اسلام اور شیعی اسلام میں عقائد کا فرق اتنا واضح اور اتنا متضاد اور متصادم ہے کہ ان میں سرے سے کوئی مصالحت محال مطلق اور قطعی ناممکن ہے کوئی دور از کار تاویل بھی ان دونوں میں کوئی مطابقت پیدا نہیں کر سکتی" ص ۶۹

ہر اعتبار سے درست ہے اس سے قبل سنی، شیعہ معتقدات کا یہ فرق وتفاوت امام ابن تیمیہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز، مولانا عبد الشکور لکھنوی، مولانا احتشام الدین مراد آبادی اور احمد رضا خاں بریلوی اپنی

اپنی تالیفات میں بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں در حقیقت آپ نے انہیں حضرات کے دینی موقف کو آگے بڑھایا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنے موشوعہ خطبات کو جلد از جلد کتابی شکل میں شائع کریں کتاب کی تعداد زیادہ اور قیمت بہت کم ہو تاکہ یہ مفید مضمون ہر تنگ مسلمان کی نظر سے گزر سکے۔ والسلام

آپ کا نیازمند سلیم فاروقی کراچی

(۴)

'قبلہ' درست ہو گیا ہے

جنابِ مدیر ماہنامہ میثاق۔ لاہور علیکم السلام والتحیہ!

آٹھ سال ہونے کو آرہے ہیں یہ نوید جانفزا سنتے ہوئے کہ پاکستان میں اسلام آرہا ہے۔ لیکن بقول چچا غالب ؎

تیرے وعدے پر جئے تو جان کہ جھوٹ جانا   خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

حدود آرڈی ننس کے اجراء کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں چوریاں، ڈاکے، زنا، اغوا جیسے جرائم بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ جب ہی تو اس کے بعد کسی اسلامی حد کے اجرا کی تاحال نوبت نہیں آئی۔ رہی کوڑے لگانے کی خبریں! یہ تو سیاسی کارکنوں اور ان لوگوں پر بھی لگائے جا رہے ہیں جو اپنے جائز حقوق کے لئے ہمت کر کے کبھی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

عرصہ ہوا کہ یہ خوشخبری بھی پاکستانیوں کو سنائی گئی تھی کہ ٹیلی ویژن کا 'قبلہ' درست ہو گیا ہے معلنات کے لئے لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ سر پر دوپٹہ اوڑھ کر خبر نامہ نشر کیا کریں۔ اوّل تو یہی بات محلِ نظر ہے کہ مستورات کو مکشوفات بنانے کا کس اسلام سے تعلق ہے! دوسرے یہ کہ چند دن تک تو سر پر دوپٹہ نظر آیا لیکن پھر وہ محض محرم الحرام کے پہلے عشرہ کے لئے محدود ہو کر رہ گیا۔ اور کیوں نہ ہوتا جبکہ ہماری خاتون اوّل کے سر سے بھی دوپٹہ ڈھلک گیا ہے۔ اگر ٹی وی کی معلنات نے خاتونِ اوّل کی تقلید میں سر پہ دوپٹہ ڈالنا چھوڑ دیا ہے تو یہ بات قابلِ اعتراض کیسے ہو سکتی ہے!

پھر ٹی وی پر بہن بھائی مل کر رومانی اور عشقیہ گیت گاتے ہیں۔ ٹی وی کے اربابِ بست و کشاد اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہماری ثقافت کتنی ترقی پذیر ہو گئی ہے۔ ثقافت کے نام پر "اسلام" کا جو نیا ایڈیشن تیار کیا جا رہا ہے اس پر موجودہ اربابِ اقتدار مذمت کے نہیں بلکہ 'مبارکباد' کے مستحق ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کا ناخنِ مسیحائی اسی طرح کام کرتا رہا تو اکبر کا دینِ الٰہی نئی شکل میں پھر زندہ ہو جائے گا اور جو کام اسلام دشمن عناصر نہ کر سکے وہ 'اسلام دوستوں' کے ہاتھوں سرانجام پا جائے گا۔ برصغیر پاک و ہند میں کئی بار مصنوعی قبلے اور کعبے بنانے کی کوشش ہوئی ہے لیکن اب جس مہارت سے نیا "قبلہ" بنایا جا رہا ہے وہ قابلِ داد ہے

مارشل لاء حکومت' اسلام کے نفاذ کے لئے کتنے اہم اقدامات کر رہی ہے اس کا ثبوت لاہور کے ایک
بڑا اسکول کے پرنسپل کا مندرجہ ذیل نوٹس مہیا کرے گا جو اس اسکول کی طالبات کے والدین کو بھیجا گیا ہے۔

(School Office

LAHORE GRAMMAR SCHCOL-II

FOR BOYS & GIRLS

1-Shah Jemal

Lehore, Feb:13, 1985.

The School will be starting a Dance Club every Saturday from 10-30 a.m. to 12 O'Clock. The dance teacher will be Amy Minwalle. The charges for the Club will be Rs. 100/- a month. The fee should be deposited during school hours by Februery the 28th. The joining of this Club will be purely optional. This Dance Club will only be operational should there be 15 or more students.

آج ملتِ اسلامیہ پاکستان کو ایک ایسے مردِ مومن، مردِ حُر اور بطلِ عزیمت کی ضرورت ہے جو موجودہ دور
"سامری" کے بت کو پاش پاش کر دے۔ قالین کے شیر قالین پر سجتے ہیں۔ جو لوگ ان کو حقیقی اور اصل شیر سمجھ
رہے ہیں ان کے حق میں یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عقل و فہم عطا فرمائے۔

نیاز کیش : جمال رحمانی - لاہور

(۵)

ایک رباعی!

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

التماس ہے کہ ۲۱ اپریل ۸۵ کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب از راہِ لطف و کرم ہمارے یہاں تشریف لائے
موصوف کے ساتھ جناب حکیم نصیر الدین نظامی ندوی جناب شہاب الدین کریمی اور جناب سید راغب مرادآبادی کا
چند دوسرے حضرات نے بھی قدم رنجہ فرمایا تھا۔ مکان کے کمرۂ نشست میں اس شعر کا طغریٰ لگا ہوا تھا جو صحابہ
کرام غزوہ احزاب میں پڑھا کرتے تھے۔

نحن الذین بایعوا محمدا

علی الجہاد ما بقینا ابدا

محترم ڈاکٹر صاحب نے جناب راغب مراد آبادی سے فرمائش کی کہ اس شعر کو اردو میں منتقل کر دیں
چنانچہ راغب صاحب نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد یہ رباعی کہہ دی :

حاصل یہ جہاد میں سعادت کی ہے
پیغمبرِ اسلام کی بیعت کی ہے !!!
تا زیست محمد ہی کے ہم ساتھ رہیں
اے بارِ الٰہ ، بس یہ نیّت کی ہے !

خواہش ہے کہ راغب صاحب مراد آبادی کی یہ فکری کاوش قارئینِ میثاق تک پہنچ جائے
لہٰذا اس عریضہ کو "میثاق" میں جگہ دینے کی درخواست ہے۔

نیاز مند ، انور جمیل ۔ کراچی

فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریر سے ایک اقتباس

"یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف جماعت علماء کا فریضہ ہے۔ لیکن درحقیقت یہ خیال عملاً اور اعتقاداً ایک ایسی خطرناک غلطی تھی جس کو میں نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں سے تعبیر کروں۔ ان تیرہ سو برس میں اسلام کو اُن تمام غلط فہمیوں سے سابقہ پڑا جو اس سے پہلے امم سابقہ کو پیش آ چکی ہیں۔ لیکن کسی سخت سے سخت غلط فہمی نے بھی مسلمانوں کو ایسا لاعلاج نقصان نہیں پہنچایا، جیسا اس غلط فہمی سے پہنچا۔ رؤسائے رُوحانین اور پیشوایانِ مذہب نے جو مُشترکہ اختیارات اپنے لئے محفوظ کر لئے تھے، اُن کی بیڑیاں پھر اس غلط فہمی کی لعنت سے مسلمانوں کے پاؤں میں پڑ گئیں۔ پھر وہ مصائب پیش آئے جن کی پاداش میں اقوام گذشتہ نے خدا سے اپنا رشتہ توڑا تھا جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو نیابت الٰہی سے معزول کر کے مسلمانوں کو اس پر سرفراز کیا تھا۔

...... دنیا کے تمام مذہب کے انحطاط و ہلاکت کی ایک بڑی علت مذہبی رؤسا کا معبودانہ اقتدار ہے۔ اسلام نے اس زہر کا تریاق اس اصل الاصول کو تجویز کیا تھا کہ امر بالمعروف کو عام اور ہر فردِ ملت پر پھیلا دیا۔ تاکہ مخصوص گروہ کے لئے کبھی ذریعہ اقتدارِ مطلقہ حاصل کرنے کا موقع نہ رہے۔"

مرسلہ: ڈاکٹر متین بہادر خان ینحصے مدظلہٗ، ایبٹ آباد۔

اس شمارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کا تذکرہ و تبصرہ

اسلامی اور علمائے کرام

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن ــــــ لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ـــــ ۳۴

شمارہ ـــــ ۹

ستمبر ۱۹۸۵ء

بمطابق

ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ

زرِ سالانہ
۳۰ روپے

فی شمارہ ۳/- روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

چودھری رشید احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۹۳

سب آفس، ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی، فون ۶۱۶۵۸۶

مشمولات

براہِ کرام خط و کتابت کے موقع پر اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے!

تفصیلی پروگرام

علاقائی اجتماع

تنظیمِ اسلامی

سندھ و بلوچستان

بمقام:

کوئٹہ

۱۳ تا ۱۶ ستمبر ۸۵ء

جمعہ تا سوموار

زیرِ اہتمام

تنظیمِ اسلامی کوئٹہ

دفتر: کمرہ نمبر ۲۷، ۲۸ سید بلڈنگ بالمقابل پبلک ہیلتھ سکول جناح روڈ

کوئٹہ میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطاباتِ عام

(۱)

۸ ر ستمبر بعد نماز مغرب، سنٹرل گورنمنٹ سرونٹس کالونی

عنوان: 'جہاد بالقرآن'

(۲)

خطابِ جمعہ

۱۳ ر ستمبر ساڑھے بارہ بجے قبل جمعہ

جامع مسجد ڈیری فارم، کوئٹہ کینٹ

(۳)

۱۳ ر تا ۱۵ ستمبر روزانہ بعد نماز مغرب

درس قرآن **مسجدِ طوبیٰ** مسجد روڈ

تنظیمی و تربیتی پروگرام

بمقام اسلامیہ ہائی اسکول میکانگی روڈ

اس موقع پر ——— ان شاء اللہ العزیز

ڈاکٹر اسرار احمد

بلوچستان

کے حسب ذیل مقامات کا بھی دورہ فرمائیں گے اور درس قرآن دینگے۔

(۱)

خضدار

جامع مسجد خضدار کالونی ✻ ۹ ر ستمبر بعد نماز مغرب

(۲)

لورالائی

جامع مسجد تحصیل روڈ ✻ ۱۱ ر ستمبر بعد نماز مغرب

(۳)

پشین

جامع مسجد بند روڈ ✻ ۱۲ ر ستمبر بعد نماز عصر

زیادہ سے زیادہ تعداد میں خود بھی شرکت فرمائیں اور
اعزہ و احباب کو بھی دعوت دیں کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کسی کی ہدایت کا ذریعہ بنادے

تنظیم اسلامی پاکستان کا علاقائی اجتماع

ان شاء اللہ العزیز

۲۴ تا ۲۷ ستمبر ۸۵ء پشاور

میں منعقد ہوگا۔ جس کا پروگرام حسب ذیل ہوگا:

★

خطاب عام ڈاکٹر اسرار احمد بعنوان: "اسلام کا فلسفہ شہادت"

جامع مسجد ہشت نگری، ہشت نگری چوک

منگوار ۲۴ ستمبر بعد نماز عشاء

★

بقیہ تمام پروگرام

مرکز علوم اسلامی، راحت آباد، نزد فارسٹ کالج پشاور یونیورسٹی

میں منعقد ہونگے جو حسب ذیل ہیں:

(۱)

درس قرآن، ڈاکٹر اسرار احمد سورۃ صف (کامل)

۲۵، ۲۶ ستمبر ۸۵ء بعد نماز مغرب

(۲)

درس قرآن حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ) فیلو قرآن اکیڈمی

(خلف الرشید ڈاکٹر اسرار احمد)

۲۵-۲۶-۲۷ ستمبر ۸۵ء بعد نمازِ فجر

(۳)

تربیتی پروگرام برائے کارکنان تنظیم اسلامی (شرکت کی عام اجازت ہے)

۲۵، ۲۶ ستمبر ۹ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر

(۴)

نشست سوال و جواب

ڈاکٹر اسرار احمد

جمعہ ۲۷ ستمبر ۸۵ء ۹ بجے صبح تا ۱۱ بجے قبل دوپہر

(انتظامی ہدایات)

۱ - قیام کا انتظام بھی مرکز علوم اسلامیہ' راحت آباد ہی میں ہوگا -

۲ - باہر سے تشریف لانے والے رفقاء و احباب ۲۴ ستمبر کو عشاء کے وقت تک ہشت نگری کی جامع مسجد میں پہنچ جائیں جو گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے بس اسٹینڈ اور پشاور سٹی ریلوے سٹیشن دونوں کے بہت قریب واقع ہے - رفقائے پشاور ان شاء اللہ سٹی اسٹیشن پر عوامی ایکسپریس اور تیزرو دونوں گاڑیوں سے آنے والوں کے استقبال کا اہتمام کرلیں گے — ان تمام حضرات کو قیام گاہ تک پہنچانا مقامی رفقاء کی ذمہ داری ہوگی - بعد میں آنے والے حضرات وہاں پہنچنے کے ازخود ذمہ دار ہوں گے -

المعلن: اشفاق احمد میر، امیر تنظیم اسلامی، پشاور

۵/بی-۱، پاک روڈ، یونیورسٹی ٹاؤن، پشاور (فون: ۴۱۸۶۱)

اسرار احمد

تذکرہ و تبصرہ

قارئینِ 'میثاق' اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ راقم الحروف نے اپنی زند
کو غلبۂ و اقامتِ دین کی جس جدوجہد کے لئے وقف کیا ہے اُس کے ضمن میں اُسے
علماء کرام کی سرپرستی اور تعاون کی ضرورت کا شدّت کے ساتھ احساس ہے۔ اور اِس
سلسلے میں یوں تو اگرچہ وہ اہل علم کے تمام سلسلوں اور خانوادوں کے دَر کا سو
ہے اور سب ہی کی خدمت میں کشکول بدست حاضری اُس کے پروگرام میں شامل
ہے تاہم ابتداءً اُسے سب سے زیادہ توقع علماء کرام کے اُن حلقوں سے ہے جن
براہِ راست یا بالواسطہ تعلّق حضرت شیخ الہندؒ سے ہے کہ اُن سے منسلک بز
اور معمّر علماء اُس کی سرپرستی فرمائیں گے اور غلطیوں پر متنبّہ فرمائیں گے اور ص
باتوں کی تائید و توثیق کریں گے ورنہ کم از کم دُعاءِ خیر سے ضرور نوازیں گے ا
نوجوان علماء اُس کے ساتھ عملی تعاون کے لئے پیشقدمی کریں گے اور اُس
دست و بازو بنیں گے —— لیکن افسوس کہ گذشتہ سال کے دوران اس ض
میں جو تحریریں راقم کے قلم سے نکل کر 'میثاق' میں شائع ہوئیں اُن کے حوا
سے بعض ضمنی اور فروعی مباحث کا سلسلہ اسقدر طول اختیار کر گیا کہ کم از
وقتی طور پر اصل مقصد غت ربود ہو گیا اور بظاہر احوال صورت یہ بن گئی کہ

> خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
> کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے!

اس ضمن میں اس امر کا فیصلہ تو مستقبل کرے گا کہ اس صورت حال کے
ہونے میں کس قدر دخل راقم کے قصورِ فہم یا عجزِ بیان کو حاصل ہے اور کس
علماءِ حق کے بار بار کے تلخ تجربات کی بنا پر ضرورت سے زیادہ حسّاس بلکہ متو

ہونے کو اور کسقدر بعض علماء سوء کی ریشہ دوانیوں کو ـــــ بہرحال راقم اس معاملے میں ہرگز مایوس یا بددل نہیں ہے اور اگرچہ اُس کے بہت سے رفقاء نے اسے پورے شدّ و مد کے ساتھ مشورہ دیا ہے کہ اس سعیِ لاحاصل میں وقت ضائع مت کرو بلکہ بعض اکابر جو خود علماء ہی کے حلقے سے تعلق رکھتے ہیں اُن کی بھی یہ رائے سامنے آئی ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو اور علماء سے نہ کوئی معارضہ کرو نہ تعارض یا تعرض ـــ تاہم راقم کا فیصلہ یہی ہے کہ اس سلسلے میں اُس کی کوششیں بھرپور طور پر جاری رہیں گی۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنے خلوص و اخلاص کی بنا پر یقین ہے کہ وہ علماءِ حق کا اعتماد حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز!

اس ضمن میں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ اس میں راقم نہ کسی تکلّف یا تصنّع سے کام لے رہا ہے نہ ہی کوئی وقتی مصلحت اس کی داعی بنی ہے بلکہ الحمد للہ ثمّ الحمد للہ کہ یہ راقم کے مزاج اور افتادِ طبع کا جزوِ لاینفک ہے۔ راقم نے بارہا ذکر کیا ہے کہ بالکل نوعمری میں جبکہ راقم ابھی ہائی اسکول کا طالب علم تھا اُس کا حال یہ تھا کہ اگرچہ اس کا فکری و جذباتی تانا بانا کُل کا کُل علامہ اقبال مرحوم کی ملّی شاعری سے بنا تھا اور اسی بنا پر اُس کی عملی وابستگی تحریک پاکستان کے ساتھ تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس نے نہ صرف یہ کہ مولانا مودودی مرحوم کے بہت سے کتابچے پڑھے تھے اور مسلم لیگ اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے حلقوں میں وہ اُن کی جانب سے مدافعت کیا کرتا تھا بلکہ لیگی حلقوں کی اُس وقت کی مبغوض ترین شخصیت یعنی مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی بعض کتابیں (جن کے نام غالباً مضامین الہلال اور مقالاتِ ابوالکلام تھے) میں نے ماسٹر غلام محمد مجتبیٰ مرحوم سے لے کر کچھ سمجھ کر اور کچھ بے سمجھے بوجھے پڑھیں تھی۔

پھر جماعتِ اسلامی کی تحریک کے ساتھ دس سالہ شدید فعال وابستگی کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے راقم "حُبّكَ الشيءَ يُعميكَ وَ

یُصِیۡو" کا مصداق نہیں بنا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوّت کے ضمن میں راقم کی رائے یہ ہی تھی جس کا اُس نے برملا اظہار بھی کیا تھا کہ اس معاملے میں جماعت نے شدید بے اصولے پن کا مظاہرہ کیا ہے، پھر جب بعض فقہی مسائل میں مولانا مودودی مرحوم اور مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رح کے مابین قلمی مناظرہ ہوا تو اُس کے ضمن میں بھی راقم نے برملا کہا کہ مولانا کو کھلی شکست ہوئی ہے۔ پھر جب مولانا نے حضرت مدنی رح کی خود نوشت سوانح حیات (نقش حیات) پر تنقید کی تو راقم نے اصل کتاب جامعہ رشیدیہ ساہیوال سے حاصل کر کے پڑھی اور جماعتِ اسلامی کے اجتماعِ ارکان میں برملا کہا کہ اس معاملے میں مولانا سے علمی خیانت کا صدور ہوا ہے! ـــ پھر جب راقم کی رائے یہ بنی کہ جماعت اسلامی اپنے اصل انقلابی طریق کار سے منحرف ہو کر غلط رُخ پر چل نکلی ہے تو سب جانتے ہیں کہ راقم نے کس جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کیا یہاں تک کہ ماچھی گوٹھ میں خود مولانا مودودی مرحوم کے بالمقابل اپنی رائے کو پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی! یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت اُس کی بات نقار خانے میں طوطی کی صدا بن کر رہ گئی!

اس سلسلہ کا ایک واقعہ یاد آیا - یہ ۵۳-۱۹۵۲ء کی بات ہے - راقم میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور اسلامی جمعیتِ طلبہ کا ناظم اعلیٰ ـــ راقم کے دو کلاس فیلو جن میں سے ایک حیدر شاہ صاحب پاکستان کی موجود الوقت معروف اور مقتدر دینی شخصیت پیر کرم شاہ صاحب کے حقیقی برادر خورد تھے اور دوسرے محبوب شاہ صاحب اُن کے چچازاد بھائی، ـــ یہ دونوں حضرات جماعتِ اسلامی کے شدید ترین مخالف تھے بلکہ "نقل کفر کفر نباشد" کے مصداق نقل کر رہا ہوں کہ وہ "ایک مودودی سو یہودی" کا نعرہ لگایا کرتے تھے ـــ تو میں نے ایک بار اُن سے عرض کیا تھا کہ "شاہ صاحب ہم مولانا مودودی کے پیچھے اندھے بہرے ہو کر نہیں چل رہے ہیں بلکہ الحمد للہ کہ کھلی آنکھوں اور بیدار ذہن و قلب کے ساتھ چل رہے ہیں اگر کبھی محسوس ہوا کہ وہ غلط راہ پر چل نکلے ہیں تو ان شاء اللہ اُن سے اختلاف کرنے والا پہلا شخص میں ہوں گا!" اس کے بعد میں نے بارہا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا

کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اس قول کی لاج رکھی اور مجھے کسی "ذہنی غلامی" میں مبتلا ہونے سے بچالیا ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

جماعت سے علیحدگی کے بعد ایک عرصہ تک جماعت کے سابقین ہی کے "صحرائے تیہہ" میں بھٹکتے رہنے اور بالآخر اُن سے مایوس ہونے کے بعد راقم نے جیسے ہی اپنی ذاتی سوچ اور خود اپنی افتادِ طبع کے مطابق آزادانہ کام کا داغ بیل ڈالی تو اُس کے مزاج کے اُس جزو لازم کا ظہور شروع ہوگیا۔ اور اگرچہ راقم کے اُس وقت کے "سرپرست" مولانا امین احسن اصلاحی کو یہ چیز شدید ناگوار تھی تاہم راقم نے علمائے کرام سے ربط و ضبط بڑھانا شروع کردیا — چنانچہ اُس کی قائم کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام پہلی سالانہ قرآن کانفرنس دسمبر ۷۳ء میں منعقد ہوئی اُس کی شان، کا کچھ اندازہ اُس اشتہار سے ہوسکتا ہے جو اس کے لئے اخبارات میں شائع کرایا گیا تھا۔ جس کا عکس صفحہ ۱۲ میں شائع کیا جارہا ہے!۔ (راقم ان دنوں بعض پرانے کاغذات کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک لفافے سے اُس اشتہار کا پوزیٹو برآمد ہوگیا۔ اصل میں ہم اخبار کے لئے اشتہار کی کتابت خود اپنے اہتمام میں کراتے ہیں۔ اور پھر اُس کے پوزیٹو بنوا کر اخبارات کو دیتے ہیں۔ غالباً اُس وقت کچھ زائد کاپیاں بن گئی ہوں گی جن میں سے دو میرے کاغذات میں محفوظ رہ گئیں۔) اس کانفرنس کے پانچ اجلاس ہوئے تھے جن کے جملہ مقررین اور مقالہ نگار حضرات کے نام تو اشتہار میں نہیں آسکتے تھے۔ صدر حضرات کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ
۲۔ مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ
۳۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم
۴۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم
۵۔ مولانا امین احسن اصلاحی

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِينَ (حدیثِ نبویؐ)

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی ۔ شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی ✶ اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ ۔ در بغل داری کتابِ زندۂ (اقبالؒ)

تفصیلی پروگرام ✶

پہلی سالانہ سہ روزہ

قرآن کانفرنس

بمقام ٹاؤن ہال، لوئر مال لاہور

۱۴، ۱۵، ۱۶ دسمبر ۱۹۷۳ء

• جمعہ ۱۴ دسمبر

اجلاسِ اوّل: ۹ بجے صبح تا ۱۲ بجے دوپہر۔ عنوان "عظمتِ قرآن" زیرِ صدارت حضرت مولانا عبید اللہ انور

اجلاسِ دوم: ۵½ بجے شام تا ۹ بجے رات " "قرآن اور سنتِ رسولؐ" " حضرت مولانا محمد یوسف بنوری

• ہفتہ ۱۵ دسمبر

اجلاسِ اوّل: ۹ بجے صبح تا ایک بجے بعد دوپہر " "قرآنِ حکیم اور علامہ اقبالؒ" " پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اجلاسِ دوم: ۵½ بجے شام تا ۹ بجے رات " "قرآن اور علمِ جدید" " علامہ علاؤ الدین صدیقی

• اتوار ۱۶ دسمبر

آخری اجلاس: ۹ بجے صبح تا ایک بجے بعد دوپہر "تدبرِ قرآن اور مولانا فراہیؒ" اور "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور قرآنِ حکیم" " مولانا امین احسن اصلاحی

زیرِ اہتمام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۲۔ افغانی روڈ سمن آباد **لاہور**

فون: ۶۸۲۴۵

اِن میں سے چار اس دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اللہ اُن کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور مراتبِ عالیہ سے نوازے ـــــ اور خصوصاً جو تعاون اُن حضرات نے مجھ ایسے بے بضاعت اور حقیر انسان سے کیا تھا اُس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے! پانچویں بزرگ بحمداللہ بقیدِ حیات ہیں، اللہ تعالےٰ انہیں صحت و عافیت سے رکھے اور اپنی علمی غلطیوں خصوصاً حدِّ رجم سے متعلق اپنی انتہائی گمراہ کن رائے سے رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین ـ!! ان کے ساتھ اپنے وصل

ل" کی طویل داستان راقم نے دسمبر ۶۶ء کے 'میثاق' میں شائع کر دی تھی
بعدازاں میری بعض دوسری تحریروں کے ساتھ یکجا صورت میں 'حکمت
ان' کی خصوصی اشاعت بابت جولائی اگست ۸۲ء میں دوبارہ شائع
ئی۔ اس میں مَیں نے صراحت کر دی تھی کہ اُن کے ساتھ تعلق کی گرم جوشی
ابتدائی کمی میرے اسی رجحان طبع کی بنا پر ہوئی تھی کہ میں صرف اُن ہی کا
کیوں نہیں رہتا اور دوسرے علماء خصوصاً قائلین تصوّف سے کیوں ربط
نبط بڑھا رہا ہوں چنانچہ ایک موقع پر تو انہوں نے حسبِ عادت طیش میں
یہاں تک فرما دیا تھا کہ "ان علماء کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان ہی کی
یں تردید کرنی ہے!" جس پر میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔
بہرحال اس وقت یہ ساری تفصیل اس لئے نوکِ قلم پر آ گئی کہ ہو سکتا
کہ بعض حضرات خود اپنی ذہنیت پر قیاس کرتے ہوئے یہ خیال فرمائیں کہ علماءِ
ام سے رابطے کی یہ پوری کوشش محض کسی "وقتی حکمتِ عملی" کا مظہر ہے۔
خہ یہ ہے کہ اس معاملے میں مَیں پورے انشراح صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں
"وما انا من المتکلفین!" اور جس طرح کسی شاعر نے کہا تھا کہ
"مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے!" اسی طرح میں بھی یہ بات پورے
راح صدر کے ساتھ لیکن "وَلَا فَخْرَ!" کی قید کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ
امزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ ؎

"اُحِبُّ الصّالحینَ وَ لَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِی صَلَاحًا!"

(۲)

میرے اس ذاتی رجحان طبع کو تقویت پہنچانے میں جماعت اسلامی ہی کے
البقین' کے حلقے کے ایک بزرگ کی مساعی کو جو دخل حاصل ہے میں محسوس
تا ہوں کہ اُس کا تذکرہ اور اُن کا شکریہ مجھ پر واجب ہے! اور وہ ہیں
اعتِ شیخ الہندؒ" کے حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت یعنی رحیم آباد
رحیم یار خاں) کے سردار محمد اجمل خاں لغاری ـــــ ان کا تذکرہ راقم کی

اوّلین تالیف "جماعتِ اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ" میں بھی ہے اور میثا
کے آج سے چھ سات سال قبل کے بہت سے شماروں میں بھی ـــــ واقعہ یہ
کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد کسی "تشکیلِ نو" کی سعی کے ضمن میں را
کے سب سے زیادہ سفر اوّلاً لائلپور (حال فیصل آباد) کے ہوئے تھے اور بعدازاں
ضلع رحیم یار خاں کے! "تنظیم اسلامی" کے قیام کے ضمن میں اوّلین قرارداد بھی
نے رحیم آباد ہی میں سردار صاحب سے طویل بحث و تمحیص کے بعد مرتب کی
اور وہ "میثاق" (بابت اگست، ستمبر ۱۹۶۷ء) میں "قراردادِ رحیم آباد"
کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ میرا اُن سے ۱۹۵۵ء سے نہایت گہرا نیازمند
تعلق قائم ہوا تھا جو آج سے چند سال قبل تک نہایت گرمجوشی کے ساتھ
برقرار رہا، میں انہیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں، اس لئے بھی کہ وہ عمر میں مجھ
لگ بھگ بیس سال بڑے ہیں اور اس لئے بھی کہ وہ میری طرح جماعت
اسلامی کے "سابقین" ہی میں سے نہیں ہیں بلکہ اُس کے "سابقون الا
میں سے بھی ہیں۔ اس لئے کہ سابق ریاست بہاولپور میں جماعت سے
منسلک ہونے والے پہلے شخص تو تھے مولانا عبدالحق جامعیؒ اور اُن کے
"شکار" تھے سردار صاحب ـــــ اور اس کے بعد پوری ریاست میں ج
کی دعوت کی توسیع میں سب سے بڑھ کر حصہ انہی کا ہے! ـــــ تاہم وہ از
شفقت و مروّت مجھے خطاب میں برابری کا درجہ دیتے ہیں۔ میرے علم
حد تک غیر عالم لوگوں میں سے جو لوگ جماعت میں شامل ہوئے اُن
واحد شخص ہیں جن کو جماعت میں شمولیت سے قبل بھی علماء کرام سے حسن
اور تعلقِ خاطر تھا ـــ پھر جماعت کے ساتھ بھرپور اور فعال وابستگی کے
بھی علماء کے ساتھ رابطہ برقرار رہا ـــــ اور جماعت سے مایوسی اور علیحدگی
سے تو اُن کا کُل ربط و ضبط حلقۂ دیوبند کے علماء کرام ہی سے ہے! اور انہیں
ظن اور مخلصانہ و مربیانہ تعلقِ خاطر مجھ سے ہے اُس کی بنا پر ان کی بھرپور
رہی ہے کہ میرا رابطہ بھی علماء حقانی کے ساتھ پختہ اور گہری بنیادوں پر قا
میرے اور اُن کے مابین تعلق میں کچھ عرصہ سے کچھ جمود بھی طاری تھا

کسی قدر سرد مہری بھی دَر آئی تھی جس کا سبب سوائے میری مدّ سے بڑھی ہوئی مصروفیت کے اور کچھ نہ تھا ۔ یہ سراسران کا بزرگانہ کرم ہے کہ خود انہوں نے پہل کر کے اس جمود کو توڑا اور حسب ذیل گرامی نامہ ارسال فرمایا جو چونکہ از اوّل تا آخر اس وقت کے زیر بحث موضوع ہی سے متعلق ہے لہٰذا ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحیم آباد ، ۲۱ر اگست ۸۵ء

بخدمت مکرم و محترم برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ! زاد لطفہٗ !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ !

آپ صادق آباد تشریف لاتے ہیں ۔ ملاقات کا موقعہ دیتے ہیں ۔ ہم دُعا کرتے ہیں ۔ عرصہ ہوا ۔ نہ آپ آئے ، نہ ہم نکل سکے ۔ نہ ہی آپ نے نامۂ پیام سے یاد کیا ۔ تاہم دُعا کرتے ہیں ۔ میثاق ، بیّنات ، الخیر ، الحق ، تدبّر ، البلاغ وغیرہ بالاستیعاب پڑھتا ہوں ! ملاقات کے وقت آپ کو عزیز جان کر آپ سے باتیں کر لیتا ہوں ۔ پڑھ کر تبصرہ کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں ۔ اور حق یہ ہے کہ تبصرہ کے لائق نہیں ہوں ۔

میری عین تمنا رہی ہے کہ آپ کے برخوردارانہ تعلقات راسخ العلم علماء اور برحق مشائخ عظام سے ایسے وابستہ ہوں کہ اُن کی رہنمائی اور اشیر باد سے "اسلامی انقلاب" کی پُرپیچ اور کٹھن راہیں ، آپ پر کشادہ ہوتی چلی جائیں ۔ آپ اپنی سمجھ کے مطابق اس کا اہتمام کرتے ہیں ۔ لیکن ، دعوت و عزیمت کے داعی کے لئے یہ اہتمام ناکافی ہے ۔ آپ محض صحافی ، ایڈیٹر ، مضمون نگار یا کسی عام ادارہ کے سربراہ نہیں ہیں ۔ آپ کے دعوے بلند ہیں ۔ ایسے بلند دعویٰ کا اوّلین تقاضا تھا جو آپ کی خدمت میں شروع سے پیش کرتا چلا آیا تھا ، اور اُسی تقاضے کی طرف آپ کی توجہ اس عریضہ میں مبذول کرا رہا ہوں ۔

مَیں فقط خوش اعتقادی کی وجہ سے یہ مشورہ نہیں دیتا رہا ۔ اور نہ دے رہا ہوں ، اور نہ میں ایسے ویسے ہر عالم یا ہر شیخ سے متاثر ہوتا ہوں میں ایمانداری سے اور خلوص سے سمجھتا ہوں کہ اس گئے گزرے وقت

میں بھی کچھ لوگ بیٹھے ہیں جن کی راہ نمائی کی آپ کی ایسی ہی حاجت ہے جیسی ایک پیاسے کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ جس "اسلامی انقلاب" کی تڑپ رکھتے ہیں اُس کا قبلہ تبھی دُرست ہو سکتا ہے جب آپ کے سوز و ساز اور پیچ و تاب کی باگیں ان لوگوں سے مطلق آزاد نہ ہوں۔

والسلام عبدہٗ محمد اجمل لغاری"

اس کا راقم نے جو جواب ارسال کیا وہ درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لاہور۔ ۴ / اگست ۸۵ء

برادرم مکرّم و معظّم دامت فیوضکم!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

ایک طویل عرصے بعد آپ کا 'بدستِ خویش' اور 'بقلمِ خود' گرامی نامہ پا کر بہت خوشی ہوئی —— اِدھر میرا یہ حال تو آپ کے علم میں ہے ہی کہ میں خط لکھنے کا بہت چور ہوں۔ یہاں تک کہ طویل سفر کر کے حاضرِ خدمت ہو جانا۔ میرے نزدیک خط لکھنے کے مقابلے میں آسان ہے، اور جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا ہے۔ میرا جب بھی اُدھر گزر ہوتا ہے۔ آپ کی خدمت میں حاضری پروگرام میں لازماً شامل ہوتی ہے۔ البتہ اِدھر خاصے عرصے سے اُدھر کا چکر ہی نہیں لگا۔

علماءِ حق کی خدمت میں حاضری کو مَیں اپنی ایک ضرورت اور اپنے لئے یقیناً موجبِ سعادت سمجھتا ہوں، اور اس ضمن میں یقین کیجئے کہ جان بوجھ کر کوتاہی نہیں کرتا۔ ضرورت سے زیادہ مشغولیت اور مصروفیت آڑے آجائے تو دوسری بات ہے۔ مجھے اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے اس امر کا حق الیقین حاصل ہے کہ مَیں اور میری بساط تو ہے ہی کیا، کوئی بڑی سے بڑی اسلامی تحریک بھی علماءِ حق کی سرپرستی اور تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک نیا فرقہ جنم دے سکتی ہے۔ اس لئے مَیں اپنی امکانی حد تک اس کے لئے کوشاں ہوں۔ کہ علماءِ ربانیین میں سے بزرگوں کی اشیرواد اور دعائیں

حاصل کروں اور نوجوانوں کا مکمل تعاون! اور اگرچہ مجھے اس میں تاحال کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تاہم میں مایوس نہیں ہوں۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ میں جلد اُن کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤنگا۔ انشاء اللہ العزیز، اس ضمن میں میں نے آپ کی رائے اور مشورے کو پہلے بھی کبھی نظرانداز نہیں کیا اور اب بھی بسر و چشم حاضر ہوں۔ آپ جب ضرر رہنمائی فرمائیں سر کے بل حاضری دونگا۔ اور اس سلسلے میں اگر آپ کی معیت بھی حاصل ہو تو کیا ہی کہنے ۔ ۔ ۔ فقط والسلام مع الاکرام   خاکسار اسرار احمد"

اس پر سردار صاحب کی جانب سے نہایت فوری طور پر جو گرامی نامہ موصول ہوا وہ بھی ہدیۂ قارئین ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت مکرم و محترم مجمع حسنات برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زاد لطفہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ   مزاج آں برادر!

مودت نامہ ملا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس اختلاف کو رہنے دیا جائے کہ "اسلامی انقلاب" لانے کی جدوجہد کے آغاز میں مذہبی قوتوں کی تائید حاصل کرنا چاہیئے یا آگے چل کر تمام مذہبی قوتوں کی تائید حاصل کی جائے۔ بہرحال کسی مرحلہ میں ہی سہی۔ لیکن اس تائید کی ضرورت و تحصیل میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے آپ کی توجہ شروع ہی سے اس طرف مبذول کرائی تھی۔ لیکن گذشتہ میثاق کے متعدد شماروں میں حصولِ تائید کو نقصان زیادہ پہنچا ہے۔ اور فائدہ کم۔

اب اگست کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ الحمد للہ جس سے حوصلہ پا کر عرض پرداز ہوں کہ مذہبی قوتوں کی سنہری تائید حاصل کرنے کے لئے برائے نام کام نہ کریں۔ بلکہ اپنے کام کا اسے ضروری حصہ بنائیں۔ آخری مرحلۂ انقلاب کے دوران حکومتِ وقت سے لاٹھیاں کھا کر صبر کرنے کا عزم ہے۔ تو بزرگان کی ناراضی، تیز و تند انتباہ، سخت تنقید اور بعض اوقات انکی تنقیص کو برداشت کرنے کی پہلے سے مشق فراہم کریں۔ گذشتہ شماروں میں آپ نے بہت سی باتیں ایسی شائع کی ہیں،

بہت سے مسائل ایسے چھیڑے ہیں جن کی قطعاً کوئی حاجت نہ تھی۔ جیسے سنجیدہ سے سنجیدہ بزرگان نے بھی محسوس کیا ہے۔

میرا تعلق جو آپ سے ہے۔ وہ چند مسائل میں اختلاف کے باوجود ہنوز مودّت کی راہ میں کسی چیز کو حائل نہیں ہونے دے رہا۔ اس محبت کی بنا پر ایسے عریضے لکھ کر بارِ خاطر بنتا ہوں۔!

اور سے گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف!

--- - - - - - والسلام عبدہٗ محمد اجمل لغاری"۔

بہرحال اس خالص نصح و اخلاص پر مبنی مشورے پر راقم بموجب فرمانِ نبویؐ "مَن لم یشکر الناس لا یشکر اللّٰہ" سردار صاحب کا علی رؤس الاشہاد شکریہ ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے کہ وہ راقم کو سردار صاحب کے مشورہ پر عمل کی وافر توفیق عطا فرمائے!

(۳)

ویسے پیشِ نظر تحریر کے آغاز میں غالبؔ کے ایک شعر کے حوالے سے جو مایوس کُن صورت بیان ہوئی ہے وہ صرف وقتی اور عارضی سی کیفیت ہے جو صرف اس لیے پیدا ہو گئی کہ اتفاقاً جولائی و اگست ۸۵ء کے دوران متعدد دینی جرائد میں راقم پر تنقیدی مضامین شائع ہو گئے --- ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو اس معاملے میں سورۂ مریم میں وارد شدہ حضرت زکریا علیہ السلام کے اس قول کے مصداق کہ "وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا" بالکل محروم نہیں رکھا ہے اور اُس کی حالیہ مساعی کے بھی نہایت مثبت نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ چنانچہ بہت سے بزرگ اور مسلمہ دینی و علمی مرتبہ کے حامل علمائے کرام کی سرپرستی راقم کو حاصل ہے۔ جن میں ایسے بزرگوں کی تعداد تو اگرچہ بہت محدود ہے جنہوں نے تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں باضابطہ شمولیت بھی اختیار فرمالی ہے تاہم ایک معتدبہ تعداد ایسے حضرات کی ہے جو بوجوہ "بے ہمہ اور باہمہ" رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، بایں ہمہ کسی ضابطے کے تعلق کے بغیر راقم اور اس کی تنظیم و تحریک کی "مربیانہ نگرانی" کا فرض سرانجام دے

رہے ہیں ــــ دوسری طرف حال ہی میں ایسے متعدد نوجوان علماء نے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی ہے جو ملک کی مؤقر جامعات سے فارغ التحصیل ہیں اور مختلف مقامات پر مساجد جامع میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں نمایاں ترین مثال مولانا سعید الرحمٰن علوی کی ہے جن کے خاندانی اور دینی و تعلیمی پس منظر، فراغت کے بعد سے اب تک کی دینی خدمات اور دینی جماعتوں اور تحریکوں سے عملی تعلق کی تفصیل اور راقم الحروف کے ساتھ ابتدائی تعارف سے لے کر تنظیم میں باضابطہ شمولیت تک کی مفصل روداد پر مشتمل ایک طویل تحریر اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے جو انہوں نے راقم کی فرمائش پر سپردِ قلم کی ہے! ــــ یہ تحریر اگرچہ قدرے زیادہ طویل ہو گئی ہے تاہم اس کے ابتدائی اور طویل ترین حصے میں ایک خاص مکتبِ فکر کے اعاظمِ رجال کا تذکرہ اور ایک خاص خطے کے دینی اور روحانی سلسلوں کا جو تعارف آ گیا ہے وہ بہت مفید ہے اور اس سے خود راقم کی معلومات میں بہت اضافہ ہوا ہے، بنابریں اُسے من و عن شائع کیا جا رہا ہے!

سعید الرحمٰن علوی صاحب کے معاملے کو راقم نے خصوصی اہمیت اس لئے دی ہے کہ تعلیمی، دینی اور سیاسی پس منظر کے اعتبار سے میرے اور اُن کے مابین بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف جانب اسکول و کالج کی تعلیم اور دوسری جانب حفظِ قرآن اور درسِ نظامی کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی کہاں اوّلاً تحریکِ پاکستان اور ثانیاً جماعتِ اسلامی سے ذہنی اور قلبی بلکہ فعّال عملی تعلق اور کہاں ابتداءً مجلسِ احرارِ اسلام اور بعد ازاں جمعیت علماء اسلام سے والہانہ وابستگی ــــ اسی طرح کہاں اُن کا بقولِ خود "متعصب حنفی" ہونے کا معاملہ اور کہاں راقم کا یہ موقف کہ نہ وہ سکّہ بند حنفی ہے نہ عرفِ عام کے مطابق اہلحدیث بلکہ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی مسلک ولی اللّٰہی سے منسلک ہے! گویا اسے ہر اعتبار سے اجتماعِ ضدّین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

لیکن راقم کے نزدیک یہ ایک نہایت نیک فال اور اعلیٰ مثال ہے جو ان شاء اللہ العزیز "قرآن السعدین" کی تمہید بنے گی۔ اس لئے کہ اگر احیاء و اقامتِ

دین کے بلند و بالا اور اعلائے وارفع نصب العین کے لئے مختلف فقہی مسالک اور رُوحانی سلاسل سے منسلک اور ماضی کی شخصیات اور تحریکات کے ضمن میں کسی قدر مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے لوگ اُس شان کے ساتھ جمع ہوں جس کا نقشہ قرآن حکیم کے حسب ذیل الفاظ میں سامنے آتا ہے :-

" تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ "

تو امید کی جا سکتی ہے کہ مختلف مسالک اور مکتبہ ہائے فکر و نظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مابین فاصلوں میں کمی آئے گی اور ذہنی و قلبی قرب پیدا ہو گا۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اجنبیت کے حجابات اور فکری و جذباتی بُعد اور " من دیگرم تو دیگری " کی کیفیت کے تشویشناک اور مایوس کُن حد تک بڑھ جانے کا اصل سبب یہ ہے کہ ہر گروہ اور ہر طبقہ عملاً " اپنے ہی حُسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں " کے مصداق اپنے ہی حلقے کے بزرگوں کی محبت و عقیدت سے سرشار، اپنے ہی مسلک کی مطبوعات و جرائد کے پڑھنے پڑھانے اور اپنے ہی مخصوص فکر کے تانے بانے میں ایسا گم رہتا ہے کہ دوسروں سے تعارف اور واقفیت کی نوبت ہی کبھی نہیں آتی - نتیجۃً " كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ " کی کیفیت کی شدت اور اس کی گہرائی و گیرائی ہی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے! اسی صورتِ حال میں تبدیلی کی ایک کوشش تھی جو راقم الحروف گزشتہ تیرہ سالوں سے کرتا چلا آ رہا ہے یعنی قرآن کانفرنسوں اور قرآنی محاضرات کے پلیٹ فارم پر مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر کے اصحابِ علم و فضل کو جمع کیا جائے تاکہ ذہنی اور قلبی فاصلے کم ہوں اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور سننے کے مواقع میسر ہوں ——— اور راقم کو اللہ کے اُس خصوصی فضل و کرم سے امید واثق ہے جو اس کے اس حقیر اور عاجز و ناتواں بندے کے شاملِ حال ہے کہ ان شاء اللہ العزیز اس کی قائم کردہ تنظیم کے ذریعے مختلف ذہنی و فکری پس منظر کے حامل، مختلف مسالکِ فقہیہ سے وابستہ اور ماضی کی مختلف سیاسی تنظیموں اور تحریکوں سے تعلق رکھنے والے لیکن ... کھنے ... اتنے ... کی ... بڑھنے والے اور ... کی نصرت

اقامت کے لئے تن من دھن لگا دینے کا عزم رکھنے والے لوگ ایک مضبوط تنظیمی سلسلے اور محکم جماعتی رشتے کے "بنیانِ مرصوص" میں منسلک ہو کر "حزب اللہ" کی صورت اختیار کرلیں گے! و ما ذالک علی اللہ بعزیز!!

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی وضاحت ہو جائے تو مناسب ہے کہ اس کا امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس صورت میں کہ تنظیم کی اساس شخصی بیعت پر ہو نہ کہ کسی دستوری یا جمہوری ڈھانچے پر ——— اس لئے کہ موخر الذکر صورت میں تنظیمی فیصلوں اور مناصب کی تفویض کے جملہ معاملات "ووٹوں کی گنتی" کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں لہذا منطقی طور پر لازمی ہے کہ "ووٹ" کا حق صرف اُن لوگوں کے پاس ہو جن کے کسی خاص مکتبۂ فکر اور نقطۂ نظر سے کامل آہنگی اور اصول اور کلیات ہی نہیں فروعات اور جزئیات تک کے بارے میں ذہن و مزاج کے ایک مخصوص رُخ پر ڈھل چکنے اور ایک خاص رنگ میں رنگے جانے کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کر لیا گیا ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر و نظر میں کسی وسعت کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا بلکہ اُس خاص ذہن و مزاج ہی کے پختہ سے پختہ تر اور شدید سے شدید تر ہونے کا عمل جاری رہتا ہے جس سے لامحالہ تنگ نظری، گروہ پرستی اور تحزب و تعصب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے ——— جبکہ شخصی بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم میں باہمی مشاورت کی فضا تو بتمام و کمال برقرار رہتی ہے بارہ سکتی ہے لیکن فیصلوں کا دار و مدار "بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" اور "کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید!" کے مصداق ووٹوں کی گنتی پر نہیں بلکہ "صاحبِ امر" کی صوابدید پر ہوتا ہے! بنا بریں مختلفُ المزاج، مختلفُ المسلک، مختلفُ المشرب اور مختلفُ الرائے لوگوں کے جمع ہونے میں قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے! ——— اس لئے کہ یہاں تنظیم میں شمولیت کا فیصلہ صرف اس ایک امر پر مبنی ہوتا ہے کہ آیا کسی کو ایک شخص معین کے افکار و نظریات سے بحیثیت مجموعی اتفاق اور اُس کے خلوص و اخلاص پر فی الجملہ اعتماد ہے یا نہیں! اگر ہے تو اس سے بیعتِ جہاد و سمع و طاعت فی المعروف کے رشتے میں منسلک ہو جائے۔ پھر "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا" کے مطابق کھلے کانوں اور کھلی آنکھوں کے ساتھ اور عقل و فہم کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اُس کا ساتھ دے۔ کوئی غلطی نظر آئے تو تنقید کرے، غلط رجحانات نظر آئیں تو پیشگی متنبہ کرے، کسی معاملے میں رائے کا اختلاف ہو تو برملا اظہار کرے اور اس میں کسی کی شخصی عقیدت، یا اُس کے ذاتی رُعب یا ملامت کے خوف کو آڑے نہ آنے دے لیکن جب تک وہ "بحیثیت مجموعی اتفاق" اور "فی الجملہ اعتماد" کی کیفیت برقرار رہے "اطاعت فی المعروف" کے دائرے سے باہر نہ نکلے ——— البتہ جب اُن دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی برقرار نہ رہے تو بیعت فسخ کرنے کا اعلان کرے اور علیحدگی اختیار کرلے — !! اور "هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ" کی قسم کے قضیئے کھڑے کرکے نہ اپنا وقت ضائع کرے نہ دوسروں کا!

اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ اُس حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام کے الفاظ مبارکہ کی عظمت و جامعیت، ہیبت و جلالت اور محکمیت و شدیّت کا جو انکشاف راقم الحروف کے شعور و ادراک پر ہوا ہے اور جو نقش اُس کے قلب پر قائم ہوا ہے اسکے بیان سے وہ ازبس قاصر ہے اس لئے کہ اس ایک مختصر حدیث میں "اسلامی انقلابی پارٹی" یا "حزب اللّٰہ" کا پورا دستور موجود ہے یہ حدیث بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت عبادہ ابن صامتؓ رضی اللّٰہ عنہ سے روایت کی ہے جس میں انہوں نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے الفاظ نقل فرمائے ہیں (حدیث میں الفاظ کی نسبت حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی جانب ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تلقین خود نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم ہی نے فرمائے ہونگے!)

"بایعنا رسول اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی السمع
والطاعۃ فی العسرِ والیسرِ وَالمنشطِ والمکرہ
وعلٰی اثرۃٍ علینا وَعلٰی ان لا ننازع الامرَ اھلہٗ
وعلٰی ان نقول بالحق اینما کُنّا لا نخاف فی اللّٰہ لومۃ
لائمٍ"

(ترجمہ) "ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کہ آپؐ کا ہر حکم سُنیں گے اور اسکی اطاعت کریں گے خواہ ہم پر تنگی ہو خواہ آسانی - اور خواہ ہمارے دل آمادہ ہوں خواہ اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے اور خواہ دوسروں کو (مناصب اور ذمہ داریوں وغیرہ کی تفویض میں) ہم پر ترجیح دی جائے اور یہ کہ ہم امراء سے نظم کے معاملے میں رسہ کشی نہیں کریں گے ___ البتہ ہم حق بات ضرور کہیں گے خواہ کہیں بھی موقع پیش آئے اور اللہ (اور اس کے دین) کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے :

اس وقت ظاہر ہے کہ راقم کو نہ "بیعت" کے مسئلے پر مفصل گفتگو کرنی ہے نہ خود اس حدیث کی تفصیلی تشریح بلکہ یہ بات صرف برسبیل تذکرہ قلم پر آ گئی کہ یہی وہ واحد نظام ہے جس میں عمر دو "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کے کیفیت کے حامل لوگ جمع ہو سکتے ہیں اور راقم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے اس کی اس جانب رہنمائی فرمائی اور ایک سُنّت کو زندہ کرنے کی سعادت بخشی ___ اور وہ اپنے اس صدمہ اور رنج و غم کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہاں ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا حال یہ ہے کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے رُوح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

___ وہاں "حامیان دین" اور "خادمان شرع متین" کی بھی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اپنی تنظیموں اور جماعتوں کو اس "بیعت سمع وطاعت فی المعروف" کی اساس پر استوار کرنے کی بجائے مغرب سے درآمد شدہ طریقوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں چنانچہ تشتت و انتشار اور تقسیم در تقسیم کا جو عمل عام غیر مذہبی سیاسی جماعتوں میں نظر آتا ہے بعینہٖ وہی ان کے یہاں بھی موجود ہے - فاعتبروا یا اولی الابصار !! -

راقم یہ عرض کر چکا ہے کہ غلبہ و اقامتِ دین کی جد وجہد میں تعاون اور سرپرستی کی درخواست کے فہ
اس کے ذہن میں اوّلیت ان حلقوں کو حاصل ہے جن کا راقم کے فہم کے مطابق براہِ راست یا بالواسط
حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی جماعت سے ہے۔ البتہ اس سلسلے میں وہ انشاء اللہ العزیز برِّصغ
ہند کے علم و فضل کے جملہ سلسلوں اور خانوادوں کے دروازوں پر دستک دے گا۔ اس سلسلے میں اس کے ز
دوسرے نمبر پہ وہ سلسلے اور خانوادے ہیں جو ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماءِ ہند کے اجلاس دہلی کے پلیٹ فارم پر
شیخ الہندؒ کی زیرِ صدارت جمع تھے یا بعد میں کم از کم تحریکِ خلافت میں شریک تھے ——— ان میں سے تیز
کے ساتھ راقم کے ربط و تعلق کا تذکرہ اس مقام پر بے محل نہ ہوگا۔

اہلِ حدیث حضرات میں سے اس اجلاس میں مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ بنفسِ نفیس شریک تھے۔
راقم کا تعلق ۵۶-۱۹۵۵ء میں بالکل اتفاقاً قائم ہوا اور پھر ان کے انتقال تک قائم رہا۔ اس سلسلے کا ایک دا
یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں جب راقم کو پہلی بار والدین کی معیت میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی تو اسی
عالمِ اسلامی کا تاسیسی اجلاس ہوا جس کے لئے پاکستان سے دو علماء مدعو کئے گئے تھے۔ ایک مولانا مود
مغفور اور دوسرے مولانا داؤد غزنویؒ۔ میری ملاقات حرم شریف میں اتفاقاً مولانا غزنویؒ سے ہوئی تو ا
فرمایا کہ تم رابطے کے تاسیسی اجلاس میں میرے سیکرٹری کی حیثیت سے شرکت کرو۔ میرے لئے تو یہ ایک ن
تھی۔ اس طرح میں اس اجلاس کا مستقل شریک اور نتیجۃً بہت سے رازہائے درون پردہ کا عینی شا
یہ موقع "ع مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز" کے مصداق ان امور پر بحث کا نہیں ہے (مولانا داؤ
اپنے تعلق کی تفصیلی داستان میں نے مولانا محی الدین سلفی مرحوم کے اصرار پر 'الاعتصام' کے لئے سپردِ قلم کی تھی
مولانا سید ابوبکر غزنوی مرحوم نے اپنی تالیف "سیدی و ابی" میں بھی شامل کی تھی ——— ان شاء اللہ
کی کسی قریبی اشاعت میں اسے ہدیۂ قارئین کروں گا۔ (اس لئے کہ اس میں بعض سبق آموز باتیں شامل ہیں

برصغیر پاک و ہند کے مشہور و معروف خیرآبادی مکتبِ فکر کے گل سرسبد مولانا معین الدین اجمیریؒ ؟
میں شریک تھے ——— اور ان ہی کے ایک نہایت محکم لیکن خالص فنّی اعتراض کی بنا پر اس اجلاس
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی امامتِ ہند کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا تھا۔ ان کے شاگرد رشید اور اس سلسا
مخاتم، مولانا منتخب الحق قادری ہیں جن سے میرا رشتہ تلمذ ۶۵-۱۹۶۴ء میں قائم ہوا تھا جبکہ میں کراچی یو
ایم اے (اسلامیات) کر رہا تھا۔ ان کے برادرِ نسبتی تھے مولانا افتخار احمد بلخی مرحوم جو ہماری ہی ا
اسلامی کے "سابقین" میں سے تھے اور ان کا رشتہ تلمذ بھی مولانا معین الدینؒ سے تو تھا ہی غالباً

ے بھی تھا۔ مجھ پر وہ حد درجہ شفیق تھے اور انہوں نے ہی زبردستی مجھے ایم اے میں داخلہ لے کر دیا تھا۔ (وہ خود بھی شعبۂ اسلامیات میں لیکچرار تھے) ——— ادھر مولانا معین الدینؒ کے بھتیجے ہیں مولانا حکیم محمد نصیر الدین ندوی مدظلہ، مالک نظامی دواخانہ، شاہراہِ لیاقت، کراچی ——— قارئین 'میثاق' میں سے بہت سے حضرات کے علم میں ہوگا کہ جب راقم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی امامتِ ہند کے ضمن میں ایک قول جو اس نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم سے سنا تھا 'میثاق' میں نقل کر کے مخمصے میں پھنس گیا تھا تو اس سے نکلنے میں جہاں اولاً ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم اور ثانیاً مولانا منتخب الحق قادری مدظلہ نے مدد فرمائی تھی وہاں اصل فیصلہ کن مواد حکیم صاحب موصوف ہی سے حاصل ہوا تھا۔ میرا ان سے نیازمندانہ تعلق تو اسی وقت سے ہے لیکن گزشتہ چار پانچ ماہ کے دوران اس نے بڑھ کر نہایت مضبوط قلبی رشتے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دو ماہ قبل انہوں نے بایں پیری و ضعیف العمری (ان کا سن غالباً ۵، سے بھی متجاوز ہے، اگرچہ دیکھنے میں اتنا محسوس نہیں ہوتا!) میری 'شامِ الھدیٰ کراچی' کی ڈھائی تین گھنٹے کی تقریر جم کر سنی ——— اور بعد ازاں اسے بہت سراہا۔ اور اب شاذ ہی ہوتا ہے کہ میرا کراچی جانا ہو اور ان کی معیت میں کم از کم ایک مرتبہ کسی نہ کسی مقام پر دعوتِ طعام میں شرکت نہ ہو جس میں بعض اوقات استاذی المکرم مولانا منتخب الحق مدظلہ بھی موجود ہوتے ہیں ——— اسی دوران میں اس سلسلے کی ایک اور اہم شخصیت سے بھی تعلق قائم ہوا ہے اور وہ ہیں مولانا معین الدین اجمیریؒ کے استاذ گرامی مولانا حکیم برکات احمد ٹونکیؒ کے پوتے مولانا حکیم محمود احمد صاحب برکاتی ——— اور قارئین 'میثاق' کے لئے یہ اطلاع یقیناً موجب مسرت ہوگی کہ ان شاء اللہ العزیز اکتوبر ۸۵ء کے اواخر میں غالباً ۲۵، تا ۲۷ قرآن اکیڈمی، لاہور میں ایک خاص اجتماع خیرآبادی مکتبِ فکر ہی کے موضوع پر منعقد ہوگا جس میں شرکت کا حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی اور حکیم محمود احمد صاحب برکاتی نے تو حتمی وعدہ کر لیا ہے، ——— مولانا منتخب الحق قادری مدظلہ نے بھی کوشش کا وعدہ کیا ہے! (یادش بخیر پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ نے اس مکتبِ فکر کی بعض امہاتِ کتب کا درس مولانا منتخب الحق صاحب سے لیا تھا اور وہ ان کے لئے نہایت شاندار الفاظ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے یہ علم ان کی جوتیاں سیدھی کر کے حاصل کیا ہے")۔

ایک ضمنی سی بات یہ بھی بیان ہو جائے تو حرج نہیں ہوگا کہ کراچی میں صدر کے انتہائی اہم اور مرکزی علاقے میں حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی (المعروف بہ نصیر میاں) کا مطب میرے مشاہدے کے مطابق 'دار العلاج' کم اور 'دار الحکمت' زیادہ ہے جہاں ہر وقت اصحابِ علم و فضل اور ارباب

ادب وسخن کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چنانچہ وہیں جناب راغب مراد آبادی سے ملاقات ہوئی جن کے بارے میں مولانا منتخب الحق صاحب کا فرمانا ہے کہ "وہ از سرتاپا 'شعر' ہیں!" ارتجالاً شعر گوئی میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ چنانچہ پہلی ہی ملاقات کے بعد چند ہی ثانیوں میں انہوں نے کی شرمندگی کا سامان اس رباعی کی صورت میں پیش کر دیا ؎

لاریب نکو نام ہیں اسرار احمد ہاں، ناسخ اوہام ہیں اسرار احمد
قرآن کے کرتے ہیں حقائق کا بیاں، شیدائی اسلام ہیں اسرار احمد

ابھی ۲۰ اگست ۸۵ء کو جب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے مکان واقعہ جاپان مینشن ریگل چوک کراچی میں خیر آبادی مکتبِ فکر کا اجتماعِ طعام ہوا تو وہاں پھر راغب صاحب نے ارتجالاً ایک قصیدہ سپردِ قلم کر دیا جو فی الحال بھائی جمیل صاحب کے پاس امانت ہے۔

برصغیر پاک وہند کی بیسویں صدی عیسوی کی عظیم دینی شخصیات میں ایک مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی (والدِ ماجد مولانا شاہ احمد صاحب نورانی) بھی تھے جنہوں نے تبلیغ اسلام کے لئے متعدد بار پوری د کا دورہ کیا اور جن کی تبلیغ سے بالخصوص جزائر غرب الہند میں اسلام کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ راقم کو معلوم نہیں ہے کہ وہ ۱۹۲۰ء کے جمعیت العلماءِ ہند کے اجلاس میں شریک تھے یا نہیں، اس لئے اس اجلاس کا کھلم کھلا بائیکاٹ خانوادہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے کیا تھا اور مولانا میرٹھی کو خرقہ وہیں سے عطا ہوا تھا۔ تاہم مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کی تالیف (جس کا حوالہ 'میثاق' کی کسی گذ اشاعت میں آچکا ہے) سے معلوم ہوا کہ تحریک خلافت میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ حالا خانوادۂ بریلی نے اس سے بھی لاتعلقی کا فتویٰ دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحانی تعلق کے با مولانا میرٹھی آزاد ذہن وفکر کے انسان تھے۔ بہرحال ان کا تذکرہ اس وقت اس لئے ہوا کہ ان کے کلاں ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاریؒ بھی میری طالب علمی کے زمانے میں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ معارفِ ا سے وابستہ تھے۔ اس طرح میرا تلمذ کا رشتہ ان سے بھی قائم ہوا —— کراچی کے گذشتہ تین دوروں کے دوران ان کے داماد ڈاکٹر عمران حسین صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں ——

یہ ویسٹ انڈیز ہی کے رہنے والے ہیں، اردو سمجھتے اچھی طرح ہیں لیکن بولتے دقت سے ہیں نہایت سلیم الفطرت اور ذہین وفہیم نوجوان ہیں۔ چند ماہ سے وہ میرے دروس قرآن اور خطا عام میں جس التزام اور پابندی سے شرکت کر رہے ہیں اس کا میرے دل پر بہت اثر ہے۔ اس بار اصرار سے وہ مجھے اپنے مکان پر لے گئے۔ جہاں ان کی خوش دامن یعنی مولانا عبد العلیم میرٹھیؒ کی

ی صاحبزادی صاحبہ کی خدمت میں بھی سلام نیاز پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور مولانا میرٹھی
نواسی اور استاذی ڈاکٹر انصاری کی صاحبزادی کی نہایت پرتکلف مہمان نوازی سے بھی (اپنے معالجین
ہدایات کے بالکل برعکس) بھرپور طور پر لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔
الغرض ـــــ راقم کسی ایک کنوئیں کا مینڈک ہے نہ کسی ایک گھر کا ملازم بلکہ ـــــ
ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست!" کے انداز میں اور فرمانِ نبویؐ "الحکمۃ ضالۃ المؤمن
احق بھا حیث وجدھا!" کے بموجب راقم حق و صداقت کا جویا اور علم و حکمت کا متلاشی
اور اسے معلوم ہے کہ یہ چیزیں ہمارے یہاں ؎

اڑائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اور ؎

اڑالی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

مصداق مختلف حلقوں اور گروہوں میں منقسم و منتشر ہو گئی ہیں اور اب انہیں پھر سے "گرتا ہوں جمع
لختِ لخت کو!" کے انداز اور بمصداق "ڈھونڈ اب ان کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر!" کی شان کے
جمع کرنا ہو گا ـــــ اسی طرح غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کسی ایک گروہ کے بس کا روگ
ہے۔ اس کے لئے امت کے زیادہ سے زیادہ مکاتبِ فکر کو اسی طرح ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا
جس طرح وہ ۱۹۲۰ء میں دہلی میں جمع تھے ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی ازمنۂ قدیمہ کی بات نہیں
کل پینسٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے ـــــ تو پھر مایوسی کیوں! ـــــ اور بددلی کس بنا پر؟!

(۵)

راقم کو اس دوران میں امید کی دو کرنیں اور بھی نظر آئی ہیں جن سے اس کا حوصلہ بڑھا
در راقم اس کیفیت میں اپنے رفقاء و احباب اور جملہ قارئینِ 'میثاق' کو بھی شامل کرنا ضروری
ا ہے۔
ایک ایبٹ آباد میں مولانا غلام النصیر چلاسی مدظلہ سے ملاقات جس کے دوران ہم دونوں
لکل وہ کیفیت محسوس کی کہ ؎
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا : میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
علاقہ کوہستان کے، جو پاکستان کے "شمالی علاقہ جات" میں محل وقوع سمیت ہر اعتبار سے نہایت

مرکزی اہمیت کا حامل ہے، ایک نہایت مقبول اور معتمد دینی اور روحانی رہنما ہیں۔ نسلی اور لسانی اعتبار سے "شین" ہیں، اردو لکھنا پڑھنا دقت کے ساتھ ہے۔ البتہ اپنی مادری زبان اور پشتو کے علاوہ عربی اور فارسی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان چاروں زبانوں میں ان کی ۲۵ ہزار اشعار سے زائد پر مشتمل کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ـــــ میں نے لاہور میں تنظیم کے رفقاء کے اجتماع میں اپنا جو تاثر بیان کیا تھا، سردست صرف اسی کے نقل پر اکتفا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ "میں نے آج تک کسی دینی شخصیت کو اپنے مزاج اور خیالات و نظریات کے جملہ پہلوؤں سے اس درجہ ہم آہنگ نہیں پایا جتنا مولانا غلام النصیر چلاسی کو!"

(میرے اس تاثر کی بنا پر میرے چند قریبی رفقاء نے جا کر ان سے ملاقات کی اور میرے احساس کی حرف بحرف توثیق کی!) ـــــ خود انہوں نے راقم کے بارے میں اپنا جو تاثر بیان فرمایا ہے وہ راقم کے لئے حد درجہ شرمندگی بلکہ شرمساری کا موجب ہے لیکن جبکہ راقم کو بہت سے دینی حلقوں کی جانب سے 'دھتکارا' جا رہا ہے جس سے اس کے رفقاء بد دلی محسوس کر رہے ہیں میری رائے میں ہمت افزا قول کا نقل کر دینا مفید ہوگا ـــــ اور وہ یہ کہ: "آپ کو دیکھ کر میرا یقین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر مزید گہرا ہو گیا ہے کہ میری امت میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ ضرور حق پر قائم رہے گا!" اللہ تعالیٰ انہیں اس حسن ظن اور ہمت افزائی پر اجر عظیم عطا فرمائے اور مجھے اور میرے ساتھیوں ان کی ان نیک توقعات پر کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے ہی میں سہی پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز!!

میں نے ان کی خدمت میں اپنی جملہ مطبوعات کا جو سٹ ارسال کیا اس پر ان کا جو والا نامہ موصول ہوا وہ من وعن درج ذیل ہے۔

۱۰ اگست ۱۹۸۵ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے ارسال کردہ تمام کتب اور خط موصول ہوئے۔ فرصت کے اوقات میں آپ کے چند رسائل کا اجمالی جائزہ لیا۔ جس سے آپ کی تنظیم کا عزم محکم کا بخوبی علم ہوا۔ آپ کے کتب و رسائل جو مجھے موصول ہو چکے ہیں لوگوں میں تقسیم کر دوں گا تاکہ عامۃ الناس استفادہ کر سکیں۔ میں چند اپنی کتب آپ کو مطالعہ کے لئے پیش کرنا چاہتا تھا جو کہ دستیاب نہ ہو سکیں۔ "تحائف قدسیہ" اور "ینابیع الحکمت" بڑی ضخیم کتب تھیں۔ ابتدائی مطالعہ کے لئے بہتر تھیں۔ فی الحال جو کتابیں دستیاب ہیں ارسالِ خدمت ہیں جنکے بالترتیب مطالعہ سے آپ ہمارے عزائم کی کیفیت سے آگاہ ہوں گے۔ سب سے پہلے "خیابانِ چلاسی" کا مکمل مطالعہ کریں پھر

معدنِ توحید" "گنجینۂ معرفت" اور "گلدستۂ عشاق" ــ دوسری کتب دستیاب ہونے پر یاد دہانی اوقات میں آپ کو دیں گے۔ چند حروف پریشاں بطورِ تحفۂ درویشاں آپ کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔

بہ مطلب می رسی اسرارِ احمد
اگر محکم بگیری تارِ احمد

مرادِ احقر از محکم گرفتن
بود اخلاص در ہر کارِ احمد

صداقت حلِ ہر یک مشکل ہست
ہمی دانست یارِ غارِ احمد

دگر عرض اینکہ از گفتار بگذر
بمیدان آبہ آن کردارِ احمد

امید ماست باشی ابرِ نیساں
بکم مدت پئے گلزارِ احمد

خدایا آور آں ساعت کہ بینیم
دوبارہ گرم تر بازارِ احمد

بسعیِ ایں رجالِ پاک فطرت
بہ ہر جا تازہ کن آثارِ احمد

چلاسی را سر و مال است حاضر
برائے یاریِ ہر یارِ احمد

فقط والسلام
منجانب: غلام النصیر چلاسی "

ایکؔ دوسری امید کی کرن اسلام آباد سے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر (میجر) صاحب کی صورت میں نظر آئی جو اسلام آباد کی ایک مسجد میں روزانہ درسِ قرآن دیتے ہیں اور اپنی زندگی کو اسی کام کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بالکل راقم کے ہم عمر اور راقم ہی کی طرح 'عالم' نہیں بلکہ 'عامی' انسان ہونے کے ناطے مجھے اپنے اور انکے درمیان "کند ہم جنس......" کی کیفیت کا شدت سے احساس ہوا اور اسی بنا پر شدید کشش محسوس ہوئی۔ چنانچہ راقم نے ان کے ایک درسِ قرآن میں بھی جزوی شرکت کی اور

خصوصی کیا گیا قرآن کا درس "تذکیر بالقرآن" کا نہایت عمدہ نمونہ اور " از دل خیزد بر دل ریزد " کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ مزاج کی جامعیت' کا حال بھی یہ ہے کہ ذہناً جماعت اسلامی کے بہت قریب ہیں۔ عملاً تبلیغی جماعت کے ساتھ طویل عرصہ فعال انداز میں لگایا ہے اور ان کے چوٹی کے اصحاب مشورہ میں سے رہے ہیں اور ادھر راقم کے ساتھ بھی کم از کم اتنا انس ضرور ہے کہ ایک روز کھانے پر مدعو فرمایا جس میں مولانا ظفر احمد انصاری اور جسٹس ریٹائرڈ محمد افضل چیمہ سمیت متعدد اہم شخصیات سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ حال ہی میں تنظیم اسلامی کا جو علاقائی اجتماع راولپنڈی میں ۵، تا ۸ راگست منعقد ہوا اس کے دوران ان کی شدید خواہش تھی کہ میں ان کے یہاں قیام کروں اور ایک رات کے لئے میں وہاں گیا بھی لیکن بعد میں بعض رفقاء کے چہروں پر بد دلی کے آثار دیکھ کر میں نے اپنی طبیعت کی خرابی کے علی الرغم میجر صاحب کے آراستہ پیراستہ گھر کی سہولتوں کو خیر باد کہا اور اپنے ساتھیوں ہی کے ساتھ آ ڈیرا لگایا ——— میجر صاحب کا اسم گرامی ہے میجر محمد امین منہاس اور ان کا درس اسلام آباد کے سیکٹر 6 / ۴ میں واقع جامع مسجد مؤتمر عالم اسلامی میں روزانہ بعد نماز مغرب ہوتا ہے ——— میجر صاحب کے قول کے مطابق ان کے پاس راقم کے دروس وخطابات کے تین صد سے زیادہ کیسٹ موجود ہیں ——— اور ان سب پر مستزاد اس اجتماع کے موقع پر انہوں نے لگ بھگ پانچ ہزار روپے کے کیسٹ مزید خرید فرمائے ہیں ——— لیکن راقم کے لئے اہم ترین بات یہ ہے کہ ان سے پہلی ملاقات میں ان کے ساتھ ان کے ایک صاحبزادے بھی تھے جو ابھی ابھی امریکہ سے کمپیوٹر سائنس کی اعلیٰ ترین تعلیم و تربیت حاصل کر کے آئے ہیں اور اپنی غیر معمولی ذہانت کی بنا پر بالکل نوعمری میں انہوں نے اس میدان میں بہت بلند مقام حاصل کر لیا ہے اور امریکہ میں ان کے لئے نہایت شاندار کیریئر متوقع ہی نہیں بالفعل شروع ہو چکا تھا۔ لیکن یہ ان کی حد درجہ سعادت ہے کہ انہوں نے وطن مراجعت کو ترجیح دی ——— راقم کی زبان سے بے اختیار الفاظ نکل گئے "میجر صاحب! انہیں ہمیں دو سالہ تعلیمی کورس کے لئے عنایت فرما دیں!" اس پر میجر صاحب نے ایک لمحہ کا توقف کئے بغیر فرما دیا کہ " حاضر ہے، لے جائیے!" لیکن اصل مسئلہ خود صاحبزادے کا تھا وہ جلد از جلد اپنے کیریئر کا آغاز کر دینے کی دھن میں تھے۔ لہٰذا انہیں فیصلہ کرنے میں تھوڑا سا وقت لگا لیکن عربی کہاوت " الولد سِرٌّ لابیہ! " کے مصداق انہوں نے فیصلہ کر ہی لیا اور اب وہ کلاس میں شرکت کے لئے لاہور منتقل ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ذوق و شوق عطا فرمائے اور ثبات و استقامت سے نوازے۔

(۶)

ایک " من حیث لا یحتسب " قسم کی تائیدِ ایزدی کی مثال ابھی ان دنوں سامنے آئی ہے
ہے کہ وہ بھی 'میثاق' کی وساطت سے رفقاء و احباب کے علم میں آجائے۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارا
پریس سے رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں کچھ تو ہمارے کام کی نوعیت کا بھی تقاضا تھا کہ جب تک
کسی حد تک زمین میں جڑیں نہ جمالیتا خواہ مخواہ کی مصنوعی پبلسٹی مفید ہونے کی بجائے مضر ہوتی۔ اور کچھ
مزاج کو بھی دخل حاصل ہے کہ اپنی میڈیکل پریکٹس کے زمانے میں بھی میرا حال یہ تھا کہ جب کوئی صاحب
ین کو دکھانے کے لئے اپنے گھر لے جانے کی خواہش کا اظہار کرتے تھے تو مجھے سخت ناگوار محسوس ہوتا
میری انتہائی کوشش یہی ہوتی تھی کہ مریض خود میرے مطب میں آئے' ـــــــ لیکن اب جبکہ راقم خود
رت کو محسوس کر رہا تھا کہ پریس سے مناسب رابطہ قائم ہو اللہ تعالیٰ نے جس طرح چھپر پھاڑ کر ایک
انی کی ہمہ تن اور ہمہ وقت خدمات ہمیں عطا فرما دی ہیں۔ اس کا اندازہ درج ذیل خط سے ہو سکتا ہے

مکرم و محترم جناب ڈاکٹر صاحب! زاد لطفکم

سلام مسنون!

اکتوبر ۱۹۸۴ء میں ایک دو روز کے لئے لاہور آیا تھا حسنِ اتفاق سے برادر نسبتی جناب محمد طاہر صدیقی
کی معیت میں جمعہ کی نماز باغِ جناح میں ادا کرنے اور آپ کا خطبہ سننے کی سعادت حاصل ہوئی ـــــ
راولپنڈی واپس آیا تو میثاق اور حکمتِ قرآن کے اکتوبر کے شمارے 'تنظیم اسلامی کی دعوت' 'تنظیم اسلامی کی قرارداد
تاسیس مع توضیحات' سرانگندیم بنا تھ لایا: میں آپ کے موقف سے متفق تھا لیکن اس سے پہلے
راے ونڈ کے سالانہ اجتماع میں شرکت کا وعدہ کر چکا تھا۔ ـــــــــــــــــــ

ـــــــــــ چنانچہ ایفائے وعدہ کے طور پر اس اجتماع میں شرکت کی اور وہیں یہ فیصلہ
کیا کہ مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیئے۔ چنانچہ رائے ونڈ سے واپسی پر ارادۃً لاہور میں رکا اور
آپ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن شرفِ ملاقات سے اس لئے محروم رہا کہ آپ ملتان تشریف رکھتے تھے۔
اس ضمن میں اتنا عرض کرتا چلوں کہ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں جو آپ کا خطبہ سنا وہ میرے لئے آپ کا پہلا خطاب
نہیں تھا۔ دراصل میں آپ کے ان دروسِ قرآن میں شرکت کی سعادت حاصل کر چکا تھا جو آپ نے
برسوں پہلے فیض الاسلام کے ہال میں دیئے۔ پھر ٹیلیویژن پر آپ کی تقاریر التزام کے ساتھ سنیں۔ ہرچند
کہ میں اس سے قبل ڈاک کے توسط سے یا بالمشافہ آپ کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل نہ کر سکا،
لیکن باور کیجئے کہ

"لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا۔"

اس وقت میں عمر کی اس منزل میں ہوں (تعارف کے لئے زندگی کے مختصر کوائف منسلک ہیں) جہاں کندھے پر بستہ رکھ کر انجانے مقامات کے سفر کی نہ سکت اور نہ اجنبی مساجد میں میلے کچیلے کپڑے دھوکر سکھانے کی فرصت اور نہ اس خیال سے اتفاق کہ دین کی راہ میں نکلنے والے کے میلے کچیلے لباس پر جہنم کی آگ اثر نہیں کرتی۔ میری خواہش یہ ہے کہ دین کی خدمت کے لئے تنظیم اسلامی کے شعبۂ نشر و اشاعت سے منسلک ہو جاؤں۔ میں نے قرآن اکیڈمی (ماڈل ٹاؤن) میں آپ کے دفاتر دیکھے ہیں۔ ان دفاتر کی خاکروبی اور فراشی کے علاوہ تعارریہ کی ٹیپ سے کاغذ پر منتقلی اور پروف ریڈنگ کا کام کر سکتا ہوں۔ اگر آپ یہ یا کوئی اور خدمت میرے سپرد فرمائیں گے تو میں آپ سے یا تنظیم اسلامی سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کروں گا۔ آپ سے صرف اکادمی کی مسجد کی چٹائی پر سونے کی اجازت چاہوں گا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تنظیم اسلامی سے متعلق کسی بھی شعبہ میں حقیر ترین خدمت بھی دین کی خدمت کے ذیل میں آئے گی۔ اگر اللہ جلّ شانہٗ اسے کسی بھی طور قبول فرمالیں گے تو یہ ان کا کرم ہوگا۔ اور میرے لئے تو بڑے نصیب کی بات۔ اپنے طور پر تو میں پابہ رکاب ہوں اور حاضری کے لئے صرف آپ کی اجازت کا منتظر۔ ویسے میرا خیال ہے کہ شرفِ ملاقات حاصل ہونے میں اب زیادہ تاخیر نہ ہوگی (انشاءاللہ) کہ ۵، ۶، ۷، اور ۸ اگست کو آپ راولپنڈی میں تشریف فرما ہوں گے۔ ۵ اگست کے لئے تو صلائے عام ہے۔ ۶ اور ۷ اگست کو منعقد ہونے والے کارکنوں کے تربیتی اجتماع میں شرکت کے لئے میں نے اجتماع کے ناظم جناب واسطی سے خصوصی اجازت حاصل کر لی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر آپ کو تادیر سلامت رکھے اور دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے۔ والسلام مع الاکرام

احقر، اقبال

اس خط کے ساتھ ان کا جو ذاتی کوائف نامہ (BIODATA) جو بزبان انگریزی منسلک تھا اس کا عکس بھی ہدیۂ قارئین ہے۔

BIO DATA

AME:	IQBAL AHMAD SIDDIQUI
te of Birth:	March 20, 1919.
ddress:	94 - A, Satellite Town, Rawalpindi
one:	843256
ucation:	B. A. from Agra University in 1942.
perience:	1943-1948: Member of the Editorial Team of daily 'Anjam', Delhi, rising to Editorship of the paper. (Migrated to Pakistan on September 1947, to start all over again for the new State).

Dec. 1947 - May 1953: Member editorial staff of daily Zamindar, Lahore, starting as Sub-Editor, rose to be the Chief Reporter and then News Editor of the paper.

1952 - 1954: Correspondent Agence France-Presee (AFP).

1955 - March 1964: Bureau Chief AFP, Lahore.

(In March 1964 AFP seized independent functioning in Pakistan and linked up with Pakistan Press International, closing down this bureau).

Oct. 1964 - March 1965: AFP Correspondent at Karachi.

June 1966 - March 1968: Editor Pakistan Press International for East Pakistan (Dacca).

Sep. 1966 - July 1968: AFP Correspondent for East Pakistan stationed at Dacca.

1959 worked for six months at Extreme Orient Desk of AFP in Paris.

1953-1954: Assistant Editor of Star weekly (Egnlish), Lahore

1958 - 1971: Freelace Journalist, contributing articles and write-ups to various newspapers and to Radio Pakistan.

1972-73: Special Correspondent and News Features Producer, Pakistan Television Corporation.

During

During this period produced a number of special reports and documentaries including the weekly feature "Around Town" dealing with civic problems.

1973-1975: Producer Current Affairs Programmes (on contract) Pakistan Television Corporation.

1975 - Todate: Freelance Journalist. Have been contributing articles and write-ups for the newspapers and participating in Radio & T.V. programmes. Have produced the entire copy of special supplements for the Canadian press for the December 1982 visit of the President of Pakistan to Canada.

الحمدللہ کہ جناب اقبال احمد صدیقی صاحب لاہور منتقل ہوکر اکیڈمی میں 'مورچہ بند' ہوگئے ہیں اور اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں استقامت عطا فرمائے اور ان کی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے (بعد میں جب صدیقی صاحب سے تفصیلی تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ راقم کے ذرا دور کے عزیز اور رشتہ دار بھی ہیں اور میری والدہ ماجدہ مدظلہا کے پھوپھا صاحب کے خاندان سے ان کا بہت قریبی رشتہ ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر گہرے دوستانہ مراسم ہیں)۔

اس تحریر کے ابتدائی حصّہ میں ۷۳ء کی پہلی سالانہ قرآن کانفرنس کے ضمن میں مولانا امین احسن

اصلاحی صاحب کا ذکر بھی آیا تھا اور حدِّ رجم کے بارے میں ان کی انتہائی گمراہ کن" رائے کا بھی ـــــ اس ضمن میں میرے رویّے کے بارے میں بعض احباب اور بزرگوں کے ذہنوں میں کچھ اشکال ہے جسے میں اس موقع پر رفع کر دینا چاہتا ہوں ۔ (چنانچہ مولانا سیّد وصی مظہر ندوی صاحب نے بھی اپنے ایک خط میں اس سلسلے میں ایک شبہ کا اظہار کیا تھا اور حال ہی میں مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ نے بھی الحمدللہ کہ کوئی شبہ وارد کرنے یا فیصلہ صادر کرنے کی بجائے "استفسار" کیا ہے اور وضاحت طلب فرمائی ہے) شبہ یہ ہے کہ مولانا اصلاحی کے بارے میں میری رائے میں شدّت پیدا ہونے کے اصل اسباب کوئی اور ہیں اور حدِّ رجم کے بارے میں ان کی رائے کو میں نے صرف بہانہ بنایا ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ میں 'میثاق' کے اوّل یومِ اشاعت سے اس کا خریدار ہی نہیں 'اس کے معاونین' اور 'سرپرستوں' میں شامل تھا تاہم اس میں شائع ہونے والی تفسیر کو کبھی شاذ ہی پڑھتا تھا (اس لئے کہ اس طرح بالاقساط شائع ہونے میں تسلسل قائم نہیں رہتا) ۔ بہرحال جب ۱۹۶۶ء میں میں لاہور منتقل ہوا اور میں نے 'میثاق' کی ادارت بھی سنبھالی اور 'دارالاشاعت الاسلامیہ' بھی قائم کیا تو اس وقت تک 'تدبّرِ قرآن' کی جلد اوّل تسوید و تبییض کے جملہ مراحل طے کر کے مولانا کے ایک دوست کے پاس 'رہن' تھی (اس لئے کہ مولانا نے اپنی کسی ضرورت کی بنا پر ان سے پانچ ہزار روپے قرض لئے تھے، اور جب وہ قرض واپس نہ کر سکے تو انہوں نے تفسیر کا مسوّدہ اٹھا کر ان کے حوالہ کر دیا کہ یہ "متاعِ فقیر" حاضر ہے ۔ ادھر وہ صاحب مسلکاً مولانا سے اختلاف رکھتے تھے لہٰذا تفسیر کو شائع بھی نہیں کر رہے تھے !) بہرحال میں نے اسے ان سے واگذار کرایا اور شائع کر دیا ۔ جسے اس وقت مولانا نے اپنی ذات پر میرا "احسانِ عظیم" قرار دیا ۔ اس کے بعد دوسری اور پھر تیسری جلد کی بالاقساط اشاعت 'میثاق' میں ہوتی رہی ۔ چنانچہ جلد دوم کی کتابی صورت میں اشاعت بھی "دارالاشاعت" کے زیرِ اہتمام ہوئی ۔ البتہ تیسری کی کتابی صورت میں اشاعت سے پہلے پہلے 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کا قیام عمل میں آگیا اور میں نے 'دارالاشاعت' کو بند کر دیا اور جملہ اشاعتی سلسلہ انجمن کو منتقل کر دیا ۔ چنانچہ تیسری جلد مکتبۂ انجمن کے زیرِ اہتمام طبع ہوئی مزید یہ کہ اس وقت تک مولانا کے پاس جلد چہارم کا مسوّدہ بھی تیار ہو چکا تھا ۔ چنانچہ جلد چہارم میں شامل سورتوں میں سے سوائے ا یعنی سورہ کہف کی تفسیر کے اور کسی کی 'میثاق' میں اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی براہِ راست کتابی صورت ہی میں منصّۂ شہود پر آئی ۔ ——— اور اس میں

نور کی تفسیر شامل ہے جس کی پہلی تین آیات ہی کے ضمن میں حدِ رجم سے متعلق مولانا کی رائے پہلی بار سامنے آئی۔

ادھر راقم کا حال یہ رہا کہ 'میثاق' میں تفسیر کا مطالعہ اس نے ترجیحاً اشاعت سے پہلے یا بعد میں، اس کے مطالعۂ تدبرِ قرآن کا سلسلہ اس درس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جو اس نے مسجدِ خضرا سمن آباد میں اپنے مرتب کردہ منتخب نصاب کا دو بار درس دے چکنے کے بعد مصحف کی ابتدا سے مسلسل جیسا تو شروع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ 'تدبرِ قرآن' کی جلد چہارم ۱۹۷۶ء کے دوران کسی وقت شائع ہو گئی تھی لیکن راقم کے علم میں حدِ رجم کے ضمن میں مولانا کی رائے مئی ۱۹۷۸ء میں آئی۔ اس لئے کہ الحمد للہ اس کی وہ ذاتی ڈائری محفوظ ہے جس میں درج ہے کہ سورہ نور کی آیات ۱ تا ۲ کا درس راقم نے مسجد خضرا میں جمعہ ۵ مئی ۷۸ء کو دیا تھا۔ چنانچہ راقم کو اب تک یاد ہے کہ راقم نے لاہور میں اپنے درسِ قرآن کی دس بارہ سالہ تاریخ کے دوران پہلی بار نام لے کر ایک جانب مولانا اصلاحی پر شدید تنقید کی ـــــ اور ان کے مقابلے میں نام لے کر مولانا مودودی کی رائے کی بھرپور تحسین کی اور اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اس جلد کی اشاعت پہلی بار تو میری لاعلمی میں ہو گئی ہے جس میں جو حصہ بھی میرا ہے اس پر اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوں لیکن دوبارہ کم از کم یہ جلد میرے یا انجمن کے اہتمام میں شائع نہیں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ چونکہ اس وقت تک اس کتاب کی ایک مارکیٹ بن چکی تھی چنانچہ جلد اوّل دوسری بار انجمن کے زیرِ اہتمام تین ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی تھی اور جلد دوم اور غالباً جلد سوم کے بھی دوسرے ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔ چنانچہ جلد چہارم جیسے ہی بازار میں آئی ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور فوراً ختم ہو گئی۔ اور جلد ہی اس کے طبعِ ثانی کا شدید تقاضا پیدا ہو گیا لیکن راقم نے کسی صورت اسے دوبارہ شائع نہیں کیا (یہ دوبارہ شائع ہوئی تو ۱۹۸۳ء میں، گویا پورے چھ سال بعد، اور وہ بھی 'فاران فاؤنڈیشن' کے زیرِ اہتمام!) ـــــــ

ساتھ ہی یہ بھی نوٹ کر لیا جائے کہ مولانا سے میں نے ملاقات کا سلسلہ مارچ ۷۶ء میں منقطع کر دیا تھا۔ اس کا مفصل پس منظر میں نے دسمبر ۷۶ء کے 'میثاق' میں درج کر دیا تھا (جو دوبارہ 'حکمتِ قرآن' کے جولائی اگست ۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوا) وصل و فصل کی اس طویل داستان کا اختتام راقم نے ان الفاظ پر کیا تھا:

"اسی پس منظر میں راقم نے مارچ ۷۶ء میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت مولانا کو دی۔

اور حسبِ سابق اسے بھی مولانا نے منظور فرمالیا لیکن بعد میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر شرکت سے انکار کر دیا ـــــــ یہ گویا ان دو طرفہ تعلقات کے ضمن میں اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا اور راقم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تاکہ وہ بار بار اس طرح کی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار نہ ہوں اور اس طرح ربع صدی پر پھیلے ہوئے وہ تعلقات اختتام پذیر ہو گئے جو پورے بیس سال نہایت گرمجوشی کے ساتھ قائم رہے اور بعد ازاں "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی" کے مصداق پورے پانچ سال میں رفتہ رفتہ کم ہو کر اس حد کو پہنچے کہ اب آٹھ ماہ سے صورت وہی پیدا ہو چکی ہے کہ ؎

بس اتنا سا تعلق اب ان سے رہ گیا ہے ۔۔۔ وہ مجھ کو جانتے ہیں، میں ان کو جانتا ہوں"

آج بھی ہر شخص اس پوری داستان کو حرفاً حرفاً پڑھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ 'انقطاعِ تعلق' کے شدید ترین' فیصلہ کے باوصف اس وقت تک میری مولانا کے بارے میں رائے میں ہرگز کوئی شدت موجود نہ تھی اور میں نے وہ پوری داستان مولانا کے ادب اور مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے سپردِ قلم کی تھی (جس پر مجھے باضابطہ سند ہی نہیں باقاعدہ داد سردار محمد اجمل خاں لغاری نے دی تھی!) ـــــ میری رائے میں 'شدت' جو بھی پیدا ہوئی وہ کل کی کل مولانا کی اس رائے اور اس سے بڑھ کر ان کے اس طرزِ استدلال اور اندازِ تحریر پر مبنی ہے جو انہوں نے حدِ رجم کے ضمن میں اختیار کیا ہے اور جسے میں " انکارِ سنت " سے کم تر کوئی نام دینے کو ہرگز تیار نہیں! (یہی وجہ ہے کہ 'حکمتِ قرآن' کے محولہ بالا شمارے کے آخر میں 'پس نوشت' کے عنوان سے جو جلی حاشیے کے ساتھ چوکھٹا شائع کیا تھا وہ حسبِ ذیل ہے:۔

مولانا امین احسن اصلاحی سے 'وصل و فصل' کی داستان کے آخر میں عرض کیا گیا تھا کہ: "مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدام القرآن اور مولانا کے مابین ہے ۔۔"

قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب یہ تعلق بھی ختم ہو چکا ہے ۔ اور انجمن نے اپنی ادا کردہ رقم واپس لیکر مولانا کو ان کی جملہ تصانیف کے حقوقِ اشاعت واپس لوٹا دیئے ہیں ۔

سبب اس کا یہ ہوا کہ 'تدبرِ قرآن' کی جلد چہارم میں سورۂ نور کی تفسیر کے ضمن میں مولانا نے حدِ رجم کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اس نے کم از کم اس مسئلے میں انہیں اہلِ سنت کی صفوں سے نکال کر منکرینِ حدیث کی صف میں لا کھڑا کیا ہے ۔ جس وقت یہ جلد چھپی راقم نے

اٹھی اسے پڑھا نہیں تھا - بعد میں جب یہ بات راقم کے علم میں آئی تو سخت صدمہ ہوا کہ اس رائے کی اشاعت میں راقم الحروف اور اُس کی قائم کردہ 'انجمن خدام القرآن' بھی شریک ہے - تاہم جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اُس پر تواب سوائے استغفار کے اور کچھ نہ کیا جا سکتا تھا - البتہ اس جلد کی دوبارہ اشاعت پر طبیعت کسی طور سے آمادہ نہ ہوئی ——— ادھر یہ بھی کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک مصنّف کی تصنیف کی اشاعت صرف اس کے لئے رُک جائے کہ وہ اُس کے حقوق اشاعت کسی ادارے کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے ———
بنا بریں تفسیر 'تدبر قرآن' کی بقیہ چار جلدوں کے ناشر برادرم ماجد خاور صاحب نے جیسے ہی مولانا کی جملہ تصانیف کے حقوقِ اشاعت کی واپسی کے سلسلہ میں گفتگو کی' راقم نے فوری آمادگی کا اظہار کر دیا اور الحمد للہ کہ خاور صاحب کی مساعیٔ جمیلہ اور مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کی مجلسِ منتظمہ کی منظوری سے یہ معاملہ بغیر کسی تلخی کے باحسنِ وجوہ طے پاگیا ——— الغرض مولانا سے اب یہ رشتہ بھی بالکلیہ منقطع ہو گیا ہے!

——————— اسرار احمد

اس سب کچھ کے باوجود گذشتہ رمضان مبارک کے دوران راقم کی طبیعت میں ایک شدید داعیہ پیدا ہوا - خیال یہ آیا کہ تمہارا راستہ ۱۹۵۷ء میں مولانا مودودی سے جدا ہوا - اس کے باوجود ۶۲ء تک تم ان سے ملتے رہے اور ۶۲ء میں حج کے لئے روانگی سے قبل تو باضابطہ منٹگمری (حال ساہیوال) سے لاہور اسی لئے گئے کہ حج کے لئے روانہ ہونے سے قبل مولانا سے کم از کم دل کا معاملہ صاف کر لوں - پھر مکہ مکرمہ' منیٰ' اور مدینہ منورہ میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں - (اس لئے کہ بعد میں مولانا بھی رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی اجلاس کے لئے بلا لئے گئے تھے !) البتہ اس کے بعد سے مسلسل ۱۷ برس اس حال میں گزرے کہ صرف ایک پبلک جلسہ میں انہیں دیکھا (اس کے اسباب کیا تھے ! ——— یہ ایک طویل داستان ہے جسے راقم نے لکھنا شروع کیا تھا لیکن جاری نہ رکھ سکا ——— اب جب موقع ہوگا اور اللہ کو منظور ہوگا یہ سب صفحۂ قرطاس پر آجائے گا) لیکن پھر ۱۹۷۹ء میں یہ شدید خواہش لئے ہوئے امریکہ گئے کہ وہاں مولانا سے ضرور ملاقات کروں گے ——— اگرچہ مشیت ایزدی کے تحت ملاقات کی بجائے صرف نمازِ جنازہ کی سعادت حاصل ہو سکی! ——— تو سوچو کہ اگر آج تم مر جاؤ تو کیا مولانا اصلاحی تمہارے جنازے میں شریک نہ ہوں گے [illegible] مولانا [illegible] گے؟ اسی طرح

یا اگر تمہاری زندگی کے دوران مولانا کا انتقال ہو جائے تو کیا تم ان کی نماز جنازہ ادا نہ کرو گے ! اس جواب تو حتمی اور قطعی ہے کہ لازماً کروں گا ـــــ تو سوال پیدا ہوا کہ کیوں نہ زندگی ہی میں از کم ملنا جلنا تو دوبارہ شروع کر لیا جائے ـــــ یہ خیال تقریباً دو ہفتے ذہن کا بار بنا رہا۔ بالآخر رمضان المبارک کی ـــ ۱۱ر تاریخ کو راقم نے حسب ذیل عریضہ مولانا کی خدمت میں ارسال کر ہی دیا :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکم جون ۸۵ء

مطابق ۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ

محترمی مولانا ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے ۔ ایک خیال اگرچہ اس سے قبل بھی کئی بار دل میں آیا ـــ لیکن ادھر چند دنوں سے اس نے اتنا زور باندھا ہے کہ یہ سطور ارسال خدمت کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

ہمارے تعلقات میں سرد مہری یا گاہے گاہے تلخی کا سلسلہ تو اگرچہ اس سے بھی کئی سال قبل سے چل رہا تھا لیکن ملاقات کے انقطاع کا آغاز مارچ ۷۶ء میں ہوا تھا ۔ گویا اسے یہ دسواں سال ہے ۔ اس عرصہ میں مَیں آپ کی خدمت میں صرف دو بار حاضر ہوا : ایک اپنی 'خوشی' کے موقع پر یعنی اپنے بڑے بیٹے کی دعوت ولیمہ میں شرکت کی درخواست لے کر جسے آپ نے نامنظور فرما دیا تھا اور دوسرے 'غمی' کے موقع پر یعنی آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال پر نماز جنازہ میں شرکت کے لئے ۔

اس طویل عرصہ کے دوران جانبین کی طرف سے اپنے اپنے اصولی موقف کی وضاحت پر مستزاد غائبانہ تلخ کلامیاں بھی ہوئیں اور گرما گرم تحریریں بھی سپردِ قلم ہوئیں اور اس ضمن میں لامحالہ زیادتیاں بھی ہوئیں اگرچہ جیسے کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ ہر فریق اپنے آپ کو حق بجانب یا معذور قرار دے کر سارا الزام فریق ثانی پر ڈال دیتا ہے ، ہم بھی اپنے اپنے مقام پر اپنے آپ کو حق بجانب اور دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے رہے ـــ تاہم کم از کم نظری طور پر اس کا انکار ممکن نہیں ہے کہ زیادتیوں کا امکان دونوں ہی جانب سے موجود ہے ۔

تو اب جبکہ ہمارے اختلافات کا علم سب کو ہے اور ایک دوسرے کے موقف کے فرق کو بھی سبھی جانتے ہیں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنے اختلاف کو برقرار رکھتے ہوئے ، اس عرصہ کے دوران جانبین کی طرف سے جو بھی زیادتیاں ہوئی ہیں انہیں تہ دل سے معاف کر دیں اور قطع تعلق کی موجودہ فضا کو ختم کرتے ہوئے کم از کم نجی سطح پر گاہے گاہے ملاقات کی صورت پیدا کریں ! ـــ میرا خیال ہے کہ اگر ہم " We agree to disagree " کی یہ صورت پیدا

کر سکیں تو یہ ایک نہایت عمدہ مثال ہوگی ـــــ اور کم از کم میں اپنی طبیعت میں اس کے لئے ایک شدید داعیہ محسوس کرتا ہوں۔ تاہم اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ بھی اس کے لیے ذہناً اور قلباً آمادہ ہوں۔

اگر ایسا ہو تو میری درخواست ہے کہ آپ مجھے مطلع فرمادیں تاکہ میں پہلی فرصت میں ملاقات کے لئے حاضر ہوجاؤں۔ اس کے لئے آپ کے یہاں سے کوئی بھی مندرجہ بالا تین ٹیلیفونوں میں سے کسی پر مجھے اذنِ باریابی کی اطلاع دے سکتا ہے۔ فقط والسلام مع الاکرام

بخدمت گرامی مولانا امین احسن اصلاحی، خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور (دستی)

اس کا جو جواب راقم کو ملا وہ تو صرف 'خاموشی' پر مشتمل تھا ـــــ البتہ میرے ان رفیقِ کار کو جو عریضہ لے کر مولانا کے پاس گئے تھے یہ لینے کے دینے پڑ گئے کہ ان سے مولانا نے دریافت کیا کہ "آپ کب سے ڈاکٹر اسرار کے ساتھ ہیں؟" اور جب جواب ان کی توقع کے خلاف ملا کہ تقریباً شروع ہی سے یعنی جب سے ڈاکٹر صاحب نے سمن آباد سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا! "تو مولانا نے فرمایا کہ "پھر آپ سے کیا بات کی جائے!" گویا کہ آپ یا تو عقل و فہم سے عاری ہیں یا غیرت و حمیت سے تہی دست! ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون!!

(۸)

'تفسیر تدبر قرآن' کے ضمن میں ایک واقعہ اور بھی ہے جو میرے بہت سے بزرگوں اور احباب اور رفقاء کے علم میں ہے لیکن آج میں اسے بھی برملا ریکارڈ پر لے آنا چاہتا ہوں ـــــ اور وہ یہ کہ بالکل آغاز میں جب میں نے 'میثاق' کی ادارت سنبھالی ہی تھی اس میں سورۂ نساء کی تفسیر شائع ہونی شروع ہوئی۔ اتفاقاً اس کی بھی بالکل ابتدائی آیات کے ضمن میں مولانا نے ایک بات سلف کے مجمع علیہ موقف سے ہٹ کر کہی جس سے منکرین سنت اور متجددین کے طبقے کو تقویت حاصل ہوتی تھی اور وہ یہ کہ سورۂ نساء کی آیت ۳ میں وارد شدہ لفظ "النساء" کو عموم پر برقرار رکھنے کی بجائے "امہاتِ یتامیٰ" کے مفہوم میں خاص قرار دیدیا تھا، حسبِ عادت میں نے اسے پڑھا بھی نہیں تھا لیکن منٹگمری میں میرے ایک عمر کے اعتبار سے بزرگ ویسے بے تکلفی کے اعتبار سے مشفق دوست مولانا برکات احمد خاں نامی تھے جن کا تعلق ٹونک[1] ہی سے

---

[1] مولانا برکات احمد خاں مرحوم مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی کے قریبی اعزہ میں سے تھے اور ان سے ملاقات [illegible]

عالم جہاں کے مشہور عالم دین مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکیؒ استاذِ گرامی مولانا معین الدین
اجمیری تھے) انہوں نے فرمایا کہ یہ تفسیر تو سلف کی رائے کے خلاف ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تفصیلی
خط لکھ دیں میں مولانا اصلاحی صاحب کی خدمت میں پہنچا دوں گا۔ اس خط کو پڑھ کر مولانا نے مجھ
سے سوال کیا کہ "یہ صاحب کون ہیں؟" میں نے عرض کیا کہ ایک جیّد عالم دین ہیں، کبھی نواب صاحب
ٹونک کے مصاحب خاص اور ناک کے بال تھے ——— اب صرف ایک ہائی سکول میں عربی ٹیچر ہیں۔"
اس پر مولانا نے ان کا خط پھینک دیا اور فرمایا کہ "اگر کوئی بڑا شخص لکھے گا تو میں غور کروں گا۔
ہرایرے غیرے کا جواب دینے کا وقت میرے پاس نہیں ہے!" ——— ان ہی دنوں
میرا جانا کراچی ہو گیا اور وہاں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی تو خیال
آیا کہ کچھ ہی عرصہ قبل حضرت مفتی صاحب، مولانا اصلاحی، حکیم عبدالرحیم اشرف اور جناب کوثر نیازی
نے مل جل کر ایک "مجلس اصلاح و دعوت" تشکیل دی تھی۔ گویا مفتی صاحب کے اس وقت
قریبی مراسم مولانا اصلاحی سے ہیں تو کیوں نہ ان سے درخواست کروں ——— جب میں نے حضرت مفتی
صاحب کے سامنے اصلاحی صاحب کی رائے بیان کی تو انہوں نے فرمایا "یہ تو بڑی گمراہی ہے"
اس پر میں نے عرض کیا کہ "حضرت آج کل آپ کے ان سے قریبی مراسم ہیں اگر آپ متنبہ فرمائیں تو شاید
اصلاح ہو جائے۔ اس لئے کہ ابھی تفسیر صرف 'میثاق' میں شائع ہوئی ہے۔ کتابی صورت میں نہیں
آئی!" اس پر مفتی صاحب نے اپنی علالت اور مصروفیات کا عذر پیش کیا تو میں نے اپنی روائتی
بے تکلفی کے ساتھ عرض کیا "حضرت! جب کوئی فتنہ شروع ہوتا ہے تو اس وقت اس کی سرکوبی
کے لئے آپ حضرات کے پاس وقت نہیں ہوتا ——— اور جب وہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور تناور درخت
کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو آپ لوگ تیشے اور کلہاڑیاں لے کر آتے ہیں اور پھر آپ کے کئے
نہیں ہوتا!" اس پر مفتی صاحب نے وعدہ فرمایا لیکن افسوس کہ کم از کم تین بار کی یاد دہانی
باوجود وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے ——— میں اس وقت بھی شدید متردد تھا کہ جلد دوم
شائع کروں یا نہ کروں لیکن مفتی صاحب کے اس واقعہ کے بعد میں نے غلط یا صحیح یہی گمان
میں اب بری الذمہ ہوں۔ اللہ کے یہاں جواب دہی علمائے کرام کے ذمے ہوگی۔" چنانچہ میں
جلد دوم شائع کر دی۔! ——— بہر حال راقم کا مزاج جو بھی ہے اس کی ایک جھلک اس
میں بھی نظر آسکتی ہے!

(۹)

جولائی اور اگست ۸۵ء کے دوران "بینات" کراچی "الخیر" ملتان اور "تعلیم القرآن" راولپنڈی میں جو مضامین راقم کے بارے میں شائع ہوئے ہیں ان پر راقم کا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ بقول "اک بندۂ عاجز کی اور اتنی مدارائیں" ـــــ اور دوسرا وہ جو غالب کے شعر کی صورت میں اس تحریر کے آغاز میں درج ہو چکا ہے۔ تاہم راقم کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ان مباحث میں مزید وقت ضائع نہیں کرے گا۔ ان تحریروں میں اکثر و بیشتر باتیں وہی پرانی دہرائی گئی ہیں کہ جو اس سے پہلے زیرِ بحث آ چکی ہیں اور راقم ان کے ضمن میں اپنا موقف شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکا ہے ـــــ اب تو دونوں جانب سے دعا یہ ہونی چاہئے کہ ؎

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دل اور دے ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ـــــ چنانچہ

- اپنے عالم یا عامی ہونے کے بارے میں میں تفصیلاً عرض کر چکا ہوں ـــــ یہاں تک کہ میں تو "عصمت بی بی است بے چادری" کے مصداق اپنی کم علمی اور بے حیدانی کے اعتراف کو اپنے لئے حفاظت اور عافیت کا حصار سمجھتا ہوں! (ویسے اس ضمن میں مولانا غلام النصیر چیلاسی دامت فیوضہم کا ایک جملہ افادۂ عام کے لئے نقل کئے دیتا ہوں کہ جب میں نے ان سے عرض کیا کہ میں عالم نہیں ہوں تو انہوں نے فرمایا " اصل علم توحید ہے۔ جسے یہ حاصل ہے اسے کل علم حاصل ہے"۔ واللہ اعلم!
- اسی طرح تقلید یا عدم تقلید یا نیم تقلید یا "مسلکِ اعتدال" یا مسلکِ ولی اللّٰہی کے ضمن میں بھی میں اپنی بات بیان کر چکا ہوں ـــــ اور زیرِ تذکرہ مضامین میں اس ضمن میں بھی کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔

البتہ صرف ایک وضاحت اور ایک احتجاج ریکارڈ پر لے آنا ضروری سمجھتا ہوں:

- وضاحت اس کی کہ میں نے اگر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو "جماعت شیخ الہندؒ" سے خارج قرار دے کر انہیں ایک "متوازی شخصیت" قرار دیا تھا تو اس میں خدا شاہد ہے کہ ان کی کوئی توہین یا تنقیص مقصود نہیں تھی بلکہ میرے نزدیک وہ عمر اور رتبے ہر اعتبار سے حضرت شیخ الہندؒ کے جملہ شاگردوں کے مقابلے میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ البتہ سیاسیات

اور اجتماعیات میں ان کا ایک اپنا مستقل اور جداگانہ مسلک تھا جس سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ ویسے ذاتی حیثیت میں میرے نزدیک ان کا مقام حضرت شیخ الہندؒ سے نیچے اور ان کے باقی تمام شاگردوں سے بلند تر ہے۔

- احتجاج اس پر کہ بیعت ایسے اہم دینی و علمی مسئلے پر کیا 'البینات' اور 'الخیر' جیسے وقیع اور مؤقر علمی جرائد کے پاس بھی صرف ایک مجھ جیسے غیر عالم اور ہر اعتبار سے عامی انسان عبدالمجیب صاحب نبی کی تحریر 'حرف آخر' کا درجہ رکھتی ہے! یہ تحریر جو ملک کے ہفتہ وار جرائد کے لئے تو موزوں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ 'تکبیر' میں بھی چھپ چکی تھی اور 'حرمت' میں بھی۔ کیا اس کی ان علمی اور دینی جرائد میں اشاعت کچھ لوگوں کے نزدیک "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کا مصداق قرار نہ پائے گی — اور کیا اس سے ان جرائد کے مدیران گرامی نے ان اداروں کے مؤسسین حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا خیر محمد جالندھری کے مقام اور مرتبے کو نقصان نہیں پہنچایا ——— میری درخواست ہے کہ اس خالص دینی اور علمی موضوع پر کوئی مسلّمہ علمی حیثیت والی شخصیت کلام کرے تاکہ ہمیں بھی روشنی حاصل ہوسکے۔ اس لئے کہ اب یہ مسئلہ زندہ ہو چکا ہے، اور ملک کے طول و عرض میں زیر بحث ہے اور اس سے نہ صرف نظر ممکن ہے نہ "غضِ بصر" ——— اور ظاہر ہے کہ میرے اسلامی جمعیت طلبہ کے زمانے کے برادرِ خورد عزیزم عبدالمجیب سلمہٗ کا نہ یہ مقام ہے کہ وہ اس پر قلم اٹھائیں نہ یہ حیثیت ہے کہ ان کے جواب میں وقت ضائع کیا جائے!

رہ گیا محترم مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کا مضمون تو ایک شدید مخمصے میں مبتلا ہوں کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ ایک جانب ان کا مقام و مرتبہ اور ان کا ادب و احترام ہے جو زبان کھولنے میں مانع ہے۔ دوسری جانب ان کی تحریر ہے جو سراسر غلط مفروضات اور احتیاطاً عرض ہے کہ جھوٹی اطلاعات پر مبنی ہے۔ (وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے داماد کی حیثیت رکھتے ہیں (اس لئے کہ اگرچہ مولانا تھانویؒ تو لاولد ہی فوت ہوئے تاہم ان کی دوسری اہلیہ کی اپنے سابقہ شوہر سے ایک صاحبزادی تھیں یعنی مولانا تھانویؒ کی ربیبہ جو مفتی صاحب کے گھر میں ہیں) اور غالباً اس وقت حلقۂ دیوبند کے معمر ترین مفتیوں میں سے ہیں! انہیں تو اپنی عمر کی بنا پر 'مرفوع القلم' قرار دیا جاسکتا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے ان حضرات پر جو ان کی تحریر شائع کر کے نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ کا سامان فراہم کر رہے ہیں: بہرحال میں ان کے مضمون کے بھی

ان مغالطوں کو دور کرنے کے لئے وضاحت کئے دیتا ہوں کہ :

- میں نے کبھی نکاح کے خطبہ مسنونہ کو "جنتر منتر" نہیں کہا البتہ اسے جیسے بالعموم پڑھا جاتا ہے اسے ضرور جنتر منتر پڑھنے سے تشبیہ دی ہے ۔
- میں نے خود بلا مبالغہ سینکڑوں نکاح پڑھائے ہیں (اور دوسرے نکاح خوانوں کے برعکس آج تک ایک پیسہ نہ بطور فیس لیا ہے نہ بطور ہدیہ) اور سب میں نکاح کا وہی خطبۂ مسنونہ پڑھا ہے جو جملہ علماء پڑھتے ہیں ! ــــــ البتہ خطبہ سے قبل یا بعد خطبہ میں شامل آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ کا کبھی صرف ترجمہ بیان کر دیتا ہوں کبھی قدرے مزید وضاحت بھی تاکہ خطبہ کا اصل مقصد کسی درجے میں حاصل ہو سکے ۔
- میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ نکاح صرف مسجد میں ہو سکتا ہے کہیں اور ہو ہی نہیں سکتا ! البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ ترمذی شریف کی روایت کی رو سے یہ کم از کم افضل ضرور ہے کہ عقدِ نکاح کی محفل مسجد میں منعقد ہو ۔
- میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ لڑکی والوں کی طرف سے دعوت حرام ہے ۔ البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ اس کا ثبوت کوئی نہیں ہے ــــــ اور خود اپنے اوپر پابندی عائد کی ہے کہ میں نہ کبھی ایسے نکاح میں شریک ہوں گا جو مسجد میں نہ ہو ــــــ نہ لڑکی والوں کی جانب سے کسی دعوتِ طعام میں شریک ہوں گا ــــ (اس میں سے مؤخر الذکر پابندی کا اپنے اوپر عائد کر لینا حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے ثابت ہے)
- جہیز کی رسم کو البتہ میں قطعاً غیر اسلامی قرار دیتا ہوں اور اس ضمن میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے ثبوت لانے والوں کی عقلوں پر ماتم کرتا ہوں کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس شادی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت دوہری تھی : ایک طرف آپ دلہن کے والد ماجد تھے اور دوسری جانب دولہا کے ولی ــــــ پھر یہ صراحت بھی بعض روایات میں ملتی ہے کہ جو چند ضرورت کی چیزیں آنحضورؐ نے اس وقت فراہم فرمائی تھیں وہ مہر کی اس رقم کے ایک حصے سے تیار کی گئیں تھی جو حضرت علیؓ نے ادا کیا تھا ــــــ مزید برآں ذرا غور کیا جانا چاہئے کہ آنحضورؐ کی دو بیٹیاں حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آئیں ان کے جہیز کا ذکر بھی کہیں ملتا ہے ! اور خود آنحضورؐ کے حبالۂ عروسی میں آنے کی متعدد ازواج مطہرات کو سعادت حاصل ہوئی وہ کونسا جہیز لے کر تشریف لائیں تھیں !
- یہ ایک سراسر بہتان ہے کہ میں عیسائیوں کی نقل کرتے ہوئے دلہنوں کو بھی بے پردہ محفل نکاح

میں لانا چاہتا ہوں، دوسروں کو تجدید ایمان اور تجدید نکاح کی تلقین کرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ اس صریح بہتان طرازی پر خود ان امور کا اہتمام فرمائیں! ——— اس ملک میں پردے کے ضمن میں کیا راقم ہی تجدد پسندوں کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور مغرب پرست بیگمات کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت انسان نہیں ہے! ——— راقم نے کراچی کی ایک مسجد میں جہاں اپنی ایک عزیزہ کے نکاح کے موقع پر صدر مملکت جناب ضیاء الحق صاحب پہلی صف میں تشریف فرما تھے۔ تقریر قبل از خطبۂ نکاح میں برملا سوال کیا تھا کہ جو لوگ پردہ کے قائل نہیں ہیں اور مرد اور عورت کے شانہ بشانہ ہونے کے فلسفے کے سب سے بڑے داعی ہیں وہ مجھے جواب دیں کہ اس محفل میں لڑکی کیوں موجود نہیں ہے! یہ اس کی زندگی بھر کا معاملہ ہے جو یہاں طے ہو رہا ہے اور ایک اتنا بڑا معاہدہ ہے جس کی کوئی نظیر بین الانسانی معاہدات میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ یہاں معاہدے کا صرف ایک فریق (دولہا) اصالتاً حاضر ہے۔ ——— اور دوسرا فریق (یعنی دلہن) صرف وکالتاً حاضر ہے!

خاص اس معاملے میں تو میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت مفتی صاحب قبلہ کو مجھ سے تو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف اشارہ کر دیں میں خود ان کی قدم بوسی کو حاضر ہو جاؤں گا لیکن اللہ تعالیٰ سے ضرور استغفار کریں اور معافی کے خواستگار ہوں!

- اسی طرح آج تک جتنے نکاح میرے اہتمام میں مسجد میں ہوئے ان میں سے کسی میں فوٹوگرافی نہیں ہوئی! ——— اور نہ ہی خواتین مسجد میں آئی ہیں، ——— قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد کے ساتھ ایک ہال تعمیر کیا گیا ہے جو مسجد کے حکم میں نہیں ہے۔ اس کے نیچے تین رہائشی کوارٹر ہیں اور اوپر بھی طلبہ کی رہائش گاہیں ہیں۔ خواتین صرف اس ہال میں آتی ہیں۔ اسی طرح مسجد دارالسلام باغ جناح کے ساتھ ہی ایک لائبریری بھی ہے، خواتین کا اہتمام اس کے برآمدے میں ہوتا ہے یا اس سے متصل لان میں ہوتا ہے جو مسجد میں شامل نہیں ہے۔ (اور یہ کام مفتی صاحب برا نہ مانیں، سالہا سال سے کراچی کی مسجد خضراء میں جہاں کے امام وخطیب تھانوی سلسلہ ہی کے ایک اہم بزرگ مولانا شمس الحسن تھانوی مدظلہٗ ہیں، وہاں بھی ہوتا ہے کہ مسجد سے متصل گھاس کے پلاٹ میں شامیانے لگ جاتے ہیں اور خواتین وہاں جمع ہوتی ہیں)۔

بہرحال راقم اس ضمن میں تھانوی سلسلہ سے منسلک جملہ بزرگ اور نوجوان حضرات سے اپیل کرتا ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کو سمجھائیں کہ وہ بزرگوں کی عزت کو اس طرح چوراہے میں لاکر رسوا کرنے سے بازرہیں۔

عام طور پر تو خیال یہ ہے کہ ۱۴ اگست ۸۵ء کو پاکستان اپنی عمر کے ۳۸ سال پورے کر کے انتالیسویں سال میں داخل ہوگیا ہے ـــــــ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تقویم (یعنی قمری حساب) سے پاکستان نے گذشتہ رمضان المبارک کی ۲۷ ر تاریخ کو اپنی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا تھا ۔ اور اب اس کو بھی ڈھائی ماہ گذر چکے ہیں ـــــــ اور واقعہ یہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل آلِ فرعون کی غلامی سے نجات پانے کے بعد اپنی بزدلی کے باعث چالیس سال تک "صحرائے تیہہ" میں بھٹکتے رہے تھے اسی طرح ملتِ اسلامیہ پاکستان بھی انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے خالصتہً اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نجات پانے کے بعد سے اب تک اپنی نااہلی کے باعث سیاسی اور دستوری اعتبار سے اس بُری طرح بھٹک رہی ہے کہ ایک جانب یہ شعر جس طرح اس پر آج سے ثلث صدی قبل صادق آتا تھا اسی طرح آج بھی آ رہا ہے کہ ؎

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہوگا ؟ دستورِ بہاراں کیا ہوگا؟

اور دوسری جانب بارہا ایسا ہوا کہ کٹر سے کٹر مسلم لیگی اور سرتاپا پاکستانی حضرات نے بھی اپنے آپ کو مایوسی کے اتھاہ اندھیروں میں ڈوبتے محسوس کیا ۔ چنانچہ پروفیسر مرزا محمد منوّر صاحب کی ایک غزل جو دوبار 'میثاق' میں شائع ہوئی اس کا مقطع یہ ہے کہ ؎

خنک روزے بود یابیم اگر خضرِ ہدایت را
کہ رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شد

راقم الحروف کے ان موضوعات پر بہت عرصہ کے سوچ بچار کا حاصل بعض نہایت محکم نظریات ہیں اور پاکستان کے اس چالیسویں سال کو راقم مستقبل کے اعتبار سے بہت فیصلہ کن سمجھتا ہے ـــــــ بنابریں اس نے اولاً ۲ر اگست ۸۵ء کی شام کو لاہور کے واپڈا آڈیٹوریم میں ایک پونے تین گھنٹے کی تقریر 'استحکامِ پاکستان' کے موضوع پر کی جس کے عام آڈیو کیسٹوں کے علاوہ وڈیو کیسٹ بھی تیار کر لیا گیا اور پھر راولپنڈی میں ۶ر اور ۷ر اگست کو اسی موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کر کے "استحکامِ پاکستان کا واحد ذریعہ : اسلامی انقلاب" اور "انقلابِ اسلامی کے لوازم و مراحل" کے عنوان سے مجموعی طور پر پونے پانچ گھنٹے خطاب کیا ۔

محترم اقبال احمد صدیقی صاحب ان خطابات پر کام کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ العزیز ان دونوں

کے مضامین کو باہم مربوط اور یکجا کر کے "میثاق" کی اگلی ہی اشاعت میں ہدیۂ قارئین کر دیا جائے گا۔ اس عرصے کے دوران جو حضرات عام" آڈیو" ــــــ اور بہتر ہے کہ" وڈیو" کیسٹوں کے ذریعے تقریر کو خود سنیں اور اپنے رفقاء و احباب کو سنانے (بلکہ دکھانے!) کا انتظام کریں وہ ان شا اس کی افادیت کو خود محسوس کرلیں گے!

اس مستقل اور اساسی موضوع کے ساتھ ساتھ ــــــ یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ شاید چند ماہ میں پاکستان کی تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرائے اور سن ۶۹ء کے سے حالات دو ملک میں پیدا ہو جائیں۔ راقم کے اس ضمن میں بھی بعض سوچے سمجھے نظریات ہیں جن سے 'میثاق' موجودہ قارئین کی اکثریت واقف نہیں ہے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ راقم اب اس موضوع پر قلم ان شاء اللہ آئندہ ہی اشاعت میں راقم اپنے ان سیاسی تجزیوں کے بعض اہم حصے دوبارہ کر دے گا جو اس نے اس زمانے میں تحریر کئے تھے تاکہ ریکارڈ درست رہے اور یہ نہ کہا جاسکے سب کچھ خیالات کی ایک وقتی اور فوری سی لہر کا مظہر ہے۔

'میثاق' کے اس شمارے سے ایک اہم تبدیلی یہ ہو رہی ہے کہ مولانا سعید الرحمٰن علوی اس ادارۂ تحریر میں باضابطہ شامل ہو گئے ہیں ــــــ چونکہ مسلسل آٹھ سال سے (یعنی اکتوبر سے) محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب 'میثاق' کی ترتیب و تدوین ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کا بیشتر بھی راقم کے دروس و خطاب کو کیسٹوں سے خود منتقل کر کے فراہم کر رہے تھے اس ماہ انہوں نے عرضِ احوال تحریر کیا تھا اس میں کچھ 'الوداعی' سا انداز اختیار کیا تھا لیکن میں اسے شائع نہیں کر اس لئے کہ اب بھی 'میثاق' کی مجلسِ ادارت میں سرِفہرست نام ان ہی کا رہے گا اور اگرچہ میں نے لا کے قیام کی صورت میں اپنی عمر اور علالت کے باعث جو مشقت وہ جھیل رہے تھے اس سے انہیں دے دی ہے اور اب وہ سارا کام کراچی ہی میں قیام فرما کر سرانجام دیں گے لیکن 'میثاق' کے سا کے ربط و تعلق میں ہرگز کمی نہیں آئے گی۔ ان شاء اللہ ــــــ انہوں نے تو اپنے تحریر 'عرضِ احوال' میں اپنے بہت سے ساتھیوں کا الوداعی انداز میں شکریہ ادا کیا تھا ــــــ حقیقت پوری تنظیم اور سب سے بڑھ کر میرے ذاتی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے دن رات کام کر کے کی شمع کو اپنی بساط بھر روشن رکھا! اللہ انہیں اس کا اجر و ثواب عطا فرمائے۔ آمین یا رب العٰلمین!! ●●●●

دِل افگندیم

بسم اللہ مجرٖھا ومُرسٰھا

از قلم

مولانا سعید الرحمٰن علوی

(1)

خاندانی اور دینی و تعلیمی پس منظر

احقر ایک متوسط گھرانے کا فرد ہے۔ آباد و اجداد کا قریبی حد تک جو علم ہے اس کے مطابق ان حضرات کا مستقر سرگودھا راولپنڈی روڈ پر واقع مشہور کوہستانی سلسلہ "کلر کہار" تھا۔ تقسیم شعوب و قبائل" کے جس تعارفی سلسلہ کا قرآن عزیز نے ذکر کیا، اس کے مطابق خاندان کا سلسلہ حضرت الشیخ محمد حنفیہ بن امام راشد خلیفہ چہارم سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ اسی سبب سے ہم لوگ "علوی" کہلاتے ہیں۔ والد بزرگوار حضرت الشیخ مولانا محمد رمضان العلوی خطیب الجامعہ گلشن آباد راولپنڈی کے ذاتی کتب خانہ میں اس سلسلہ کا شجرہ موجود ہے جس کا معاملہ بس اتنا ہی ہے کہ یہ ایک تعارفی چیز ہے اور قرآن عزیز کی سورۂ حجرات کی آیت کریمہ (۱۳) سے بہر طور اس کا ثبوت ملتا ہے ورنہ اصل بات وہی ہے جس کا ذکر امام عادل و راشد سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:۔ "نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہُ بِالْاِسْلَام

اور سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ تک جیسے مردانِ احرار و فدایانِ اسلام نے جس طرف اشارہ کیا، جب ان سے ان کے والدین کی نسبت کا سوال ہوا تو فرمایا: سلمان بن اسلام —— عبیداللہ بن الاسلام

اصل نسبت یہی ہے اور اسی پہ موت و حیات کی خواہش و تمنا ہے۔ ع

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

میرے پردادا بزرگوار حضرت الحافظ چراغ دین قدس سرہٗ نے کلر کہار (سابقہ ضلع سرگودھا حال خوشاب) سے مشہور قصبہ "بھیرہ" ضلع سرگودھا میں نقل مکانی کی۔ یہ قصبہ بہت قدیم ہے اور کبھی ایک معقول شہر تھا، خیر و شر کی قوتوں کے حامل اعاظم رجال اس قصبہ سے اٹھے، کبھی یہ بابر کا عارضی مستقر رہا۔ اور سلطان الہند شیر شاہ سوری مرحوم کی یادگار عظیم جامع مسجد تو اب بھی اس شہر کے ماتھے کا جھومر ہے جو سکھ گردی کے دور میں تعلیم و تدریس اور رکوع و سجدہ سے محروم ہو گئی تا آنکہ یہ روزِ ظلمت اپنے انجام کو پہنچا تو قریب ہی کے گاؤں بگہ ضلع جہلم کے ایک علمی خاندان کے فرزند مولانا احمد دین بگوی رحمہ اللہ تعالیٰ فیض یافتہ و شاگرد حضرت الامام الشاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہٗ اس کی از سرِ نو آبادی کا اہتمام کیا۔ انہی کے خاندان کے اخلاف اس کا نظم و انتظام چلانے والے ہیں۔ مولانا مرحوم کے بعد مولانا ظہور احمد بگوی علیہ الرحمۃ بانی امیر مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ کا دور بڑا مثالی تھا۔ اب انہی کے نبیرہ برادرِ عزیز صاحبزادہ ابرار احمد بگوی امام و خطیب اور مدرسہ کے منتظم و نگران ہیں۔

پردادا مرحوم کی کلر کہار میں اچھی خاصی جائیداد تھی لیکن فقر و درویشی اور توکل و استغنا کی یہ شان تھی کہ سب سے منہ موڑ کر رزقِ حلال کے لئے محنت مزدوری، کھیتی باڑی کا سلسلہ رکھا اور خدمتِ قرآن عزیز میں لگے رہے۔ انہوں نے اور ان کی اولاد نے کبھی پلٹ کر اپنی جاگیر و جائیداد کی فکر نہ کی۔ احقر کی بچپن کی زندگی تک وہاں سے تقاضے آتے رہے لیکن دادا مرحوم اور والد صاحب مدظلہ نے توجہ نہ دی اور فرمایا کہ جو چیز بڑوں نے چھوڑ دی اب اس کی جانب رجوع کا کیا فائدہ!

میرے دادا مرحوم حضرت الحافظ الحاج غلام یٰسین صاحب قدس سرہٗ پانچ بھائی تھے۔ سمیت تین حضرات کا علم و فضل، خدمتِ قرآن اور نیکی و تقویٰ کا شہرہ ہے۔ دو پڑھے پڑھائے نہ لیکن عبادت اور خیر کے کاموں میں انہماک ان کا بھی بہت تھا۔

دادا مرحوم ابتدا میں کھیتی باڑی کا شغل فرماتے تاکہ رزقِ حلال کا اہتمام ہو سکے اور ساتھ حفظِ قرآن کا اہتمام تھا اور اس کتابِ مقدس کے طالبوں کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے اور اپنے ساتھ کھلاتے پلاتے۔ اغلباً ۱۹۳۰ یا اس کے لگ بھگ اپنے شیخ و مربی کے حکم سے انہوں نے شیر شاہی جامع مسجد (بگویہ) میں درس و تدریسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔

مرحوم کے شیخ کا اسم گرامی تھا " احمد خان " جو بانی تھے خانقاہ سراجیہ مجددیہ کندیاں ضلع میانوالی کے، سلاسل اربعہ کا مشہور سلسلہ نقشبندی " جس کو عروج تک پہنچانے کا سہرا حضرت الامام مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے سر ہے، اتباعِ سنّت کی شان میں دوسرے سلاسل سے فائق شمار ہوتا ہے۔ دور کی بات تو نہیں کرتا لیکن حضرت الامام مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ سے لے کر اب تک کے حضرات، جن میں سے بعض کو پڑھا، بعض کو دیکھا، اس شان میں نہایت درجہ ممتاز ہیں۔ حضرت الامام مجدد الف ثانی، ان کے خلف الرشید حضرت خواجہ محمد معصوم، حضرت شاہ ابوسعید، حضرت مرزا مظہر جانجاناں، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ حضرت حاجی دوست محمد قندھاری، حضرت خواجہ سراج دین موسیٰ زئی شریف (ڈیرہ اسمٰعیل خان)، حضرت مولانا احمد خان، شیخنا المکرم مولانا محمد عبد اللہ لدھیانوی، موحّد اعظم مولانا حسین علی، محدّث کبیر مولانا نصیر الدین غورغشتوی، مولانا سید زوّار حسین (کراچی)، مولانا عبد الغفور مدنی، خواجہ غلام نبی للّٰھی، مولانا محمد عمر بیربلوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے حضرات اسی سلسلہ کے چشم و چراغ تھے اور اب اس کی چلت پھرت تسویۂ استاذنا المحترم حضرت الشیخ مولانا محمد سرفراز خاں صفدر، مخدوم گرامی مولانا خان محمد امیر مجلس تحفظ ختم نبوت، مولانا سید علاء الدین شاہ صاحب اور مولانا محمد ادریس انصاری جیسے حضرات ہیں اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ملّت کے سروں پر قائم رکھے۔

حضرت الامام مجدد قدس سرہٗ کا ذکرِ خیر آگے آئے گا۔ حضرت مولانا احمد خان کے متعلق مختصراً اس لیے کہ ان کے شیخ تھے خواجہ سراج الدین موسیٰ زئی والے، اور انہیں علم سے گہرا لگاؤ تھا جس کی زندہ شہادت خانقاہ سراجیہ مجددیہ کندیاں کا وہ عظیم الشان کتب خانہ ہے جسے موصوف نے بڑی محنت سے فراہم کیا اور اس کی اس طرح حفاظت کی کہ چشم فلک نے اس کی مثال کم ہی دیکھی ہوگی۔ امام العصر حضرت السید محمد انور شاہ کاشمیری محدّث دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت کی دعوت پر وہاں تشریف لائے، بہت متاثر ہوئے۔ بعض کتب جو دیوبند کے کتب خانہ میں نہیں وہ مستعار لے گئے۔ جس زمانے میں اس فدائے علم و حرّیت نے اس خانقاہ کی بنیاد رکھی یہاں محض ریت کے تودے تھے، برائے نام رہائشی مکان، چند حجرے، مسجد اور کتب خانہ، لیکن ان کی گرمیٔ نفس نے "جنگل میں منگل" کی کیفیت پیدا کر دی اور اب وہاں علم و عرفان کے چشمے اُبلتے ہیں۔ اس خانقاہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے وابستہ حضرات میں کثرت علماء کرام کی ہے، حضرت الشیخ الشاہ عبد القادر رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کو

خانقاہ رحیمی رائے پور کے ساتھ یہ دوسری خانقاہ ہے جہاں کثرت سے علماء حاضر ہوتے
علاج روحانی کا اہتمام کرتے ہیں ان سے بہت سے حضرات نے کسب فیض کیا لیکن اِ
دولت ہوئی لدھیانہ کے ایک بظاہر دنیادار شخص کے بیٹے مولانا محمد عبید اللہ نے، جنہ
علم و روحانیت کی طرف راغب کیا مولانا عبدالعزیز رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ج
تھوڑا عرصہ ہوا انتقال ہوا چکا ہے ۱۱ جیجہ وطنی میں، مولانا محمد عبداللہ شاگرد تھے امام
سید انور شاہ کے اور خادم و مجاز تھے مولانا احمد خان کے، نہایت درجہ غیور و جسور
روحانیت کا پہاڑ، مجاہد و غازی اور غیرت دینی کی زندہ مثال، اور اب اس مسند پر فرد
ہیں مخدوم و محترم مولانا خان محمد مدظلہ جو خانقاہی ذمہ داریوں کے ساتھ مرزائیت کے
میں سرگرم عمل ہیں (ان حضرات کے تذکرے مولانا محمد نذیر عرشی مرحوم کی کتاب "تحفۂ سعد
میں ملاحظہ فرمائیں)۔

ہمارے خاندان میں احقر اور اس کے چھوٹے بھائی عزیزی حافظ عبدالرحمٰن سلمہ کے
باقی سب کا تعلق اسی خانقاہ اور انہی بزرگوں سے ہے۔ ہم دونوں بھائیوں کا روحانی تعلق
شیخ الاسلام، مجاہد فی سبیل اللہ، امام حریت السید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے فرزند
ارشید مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ سے ہے۔ تاہم ان حضرات سے عقیدت و احترام کا مع
بحمد اللہ قائم ہے۔

بگوی خاندان کے بہت سے حضرات جہاں ضلع سرگودھا کی مشہور چشتی نظامی خا
"سیال شریف" سے وابستہ تھے وہاں بہت سے حضرات اس نقشبندی خانقاہ سے
تھے۔ اس تعلق سے ان حضرات نے حضرت مولانا احمد خان سے درخواست کی اور دادا
کو شیخ نے حکماً مسند تدریس پر بٹھایا۔ دادا مرحوم نے چند سال قبل وفات پائی۔ سا
کے لگ بھگ عرصہ انہوں نے تدریس کا فریضہ بے لوث طریق سے ادا کیا۔ اور بلاشبہ
کو قرآن پڑھایا۔ ان کی وفات پر سارا شہر سوگوار تھا اور ہر شخص اس خوبی کا باچشم گریاں م
۳۱ برس کا عرصہ تو انہوں نے جامع مسجد بگویہ میں گزارا۔ پھر ۱۹۶۱ء میں بوجوہ وہاں سے
ہو کر ایک ماہ اپنے مکان کی بیٹھک میں اور بعد میں اہل محلہ کی درخواست پر محلہ کی مسجد
۶۰، ۵۰ طلبہ ہمیشہ رہتے جن میں ۲۰، ۲۵ وہ ہوتے جن کی کفالت کے وہ خود نگران
وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق) کی کیفیت ہم نے ان کی زندگی میں

جب تک جامع مسجد شیر شاہی (گوجرہ) میں تھے تو گھر سے مسجد کا لگ بھگ ۶ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ صبح منہ اندھیرے جاکر طلبہ کو محبت سے جگانا، فجر کی نماز پڑھانا، دوپہر تک تدریس بعد ازظہر تا عصر تدریس، پھر طلبہ کے کھانے کی فکر اور مغرب وعشا کی نمازیں پڑھا کر واپسی ہوتی۔ کیسا ہی موسم ہو اس معمول میں فرق نہ آتا۔ ایک زمانہ میں بھیرہ سیلاب کی زد میں رہا۔ ہر سال سیلاب میں سارا شہر ڈوب جاتا لیکن مرحوم طلبہ کی خبر گیری اور ذوق تدریس کی تکمیل کو کئی کئی فرلانگ پانی میں چل کر جو بسا اوقات گھٹنوں سے زائد ہوتا، مسجد پہنچتے۔ محلہ کی مسجد مکان کے پڑوس میں تھی۔ پنجگانہ نماز اور خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے۔ زندگی کے آخری چند برس بالکل مضمحل ہو گئے اپنی زندگی میں مجاہدہ بہت کیا، خوراک ہمیشہ برائے نام رہی۔ آخر میں گھل گئے تھے۔ ہمارے شدید اصرار پر چچا محترم مولوی حافظ حفیظ الرحمٰن صاحب کو اس مسند پر بٹھایا۔ خود چارپائی پر پڑے رہتے۔ کبھی تو اٹھ کر درس میں جا بیٹھتے اور کبھی منزل سنانے والے طلبہ کو اپنے پاس بلا کر سننا شروع کر دیتے۔ اس کے علاوہ اپنا پڑھنا ہوتا ایسے حال میں بھی پندرہ پارے روزانہ پڑھ جانے اور خواہش یہ تھی کہ رب العزت اسی حال میں دنیا سے لے جائے۔ بڑے بیٹے (احقر کے والد) مولانا محمد رمضان علوی جنازہ پڑھائیں اور جملہ عزیز موجود ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر خواہش پوری کی۔

(تغمدہ اللہ تعالیٰ بغفرانہٖ ورحمہ اللہ تعالیٰ)

الحمد للہ خاندان میں یہ روایت قائم ہے کہ پہلے حفظ قرآن کا اہتمام ہو۔ اسی سعادت سے ہم سب بھائی (پانچوں) بلغیر استحقاق اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بہرہ ور ہوئے، بڑے تین مولانا عزیز الرحمٰن خورشید، احقر اور مولوی عبدالرحمٰن سلمہٗ نے داداجی سے حفظ کیا۔ دو چھوٹے عتیق اور خالد سلمہما نے پنڈی ہونے کے سبب اباجان سے۔

احقر کی تعلیم ساری کی ساری بڑے بھائی جان کے ساتھ ہوئی۔ حفظ اکٹھا، سکول کا برائے نام سلسلہ اکٹھا اور درس نظامی اکٹھا۔ حفظ، احقر نے بحمد اللہ تعالیٰ ۸½ برس کی عمر میں کر لیا تھا، اس کے بعد عصری تعلیم کے لئے سکول میں داخل ہوئے۔ سمجھ لیں کہ مڈل کا قصہ ہوا اور داداجی کی خواہش اور بعض دوسرے عوامل کے سبب درس نظامی میں لگ گئے۔ اس موقعہ پر سکولی اساتذہ سمیت بعض دوسرے حضرات نے سابقہ لائن میں ہی آگے بڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بعض احباب اباجان سے بگڑے بھی تاہم دو مخلص احباب الحاج عبدالمجید اور حکیم ایرانی صاحب نے اس فیصلہ کی دل وجان

مجلس احرارِ اسلام سے گہرے تعلق و ربط کے سبب مولانا محمد علی جالندھری قدس سرہ العزیز سے حضرت والد صاحب کو جو تعلق خاطر تھا اس کے سبب اس سلسلے میں آپ نے ان سے مشورہ کیا اور دوسرا مشورہ اغلباً علامہ خالد محمود صاحب سے ہوا۔ ہر دو حضرات نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ارشد و اجل استاذنا المحترم مخدوم گرامی مولانا خیر محمد قدس سرہ کے مدرسہ خیر المدارس ملتان کی رائے دی۔ بلکہ مولانا محمد علی نے داخلہ کے سلسلہ میں زبردست تعاون و امداد فرمائی۔ مولانا محمد علی کا تعلق مولانا خیر محمد سے نہ صرف عزیز داری کا تھا بلکہ استاذی شاگردی کا بھی تھا۔ جالندھر کے زمانہ قیام میں انہوں نے مدرسہ کی تعمیر و ترقی میں مخلصانہ ہاتھ بٹایا جس پر خیر المدارس کے پرانے رجسٹر گواہ تھے۔ وہاں تدریس کا فریضہ سرانجام دیا اور تحریکی زندگی کے بعد بھی اس تعلق کو بڑے اخلاص سے نبھایا۔ ۱۹۴۲ء میں اپنے شیخ شاہ عبدالقادر رائے پوری اور مجلس احرار کے رہنماؤں کے حکم سے انہوں نے ملتان میں مسجد سراجاں حسین آگاہی میں خطبہ جمعہ کا اہتمام کیا تو وہاں ایک درسگاہ کی بھی داغ بیل ڈالی اور تقسیم ملک کے بعد جب خیر المدارس ملتان آگیا تو مدرسین، طلبہ، لائبریری سب کچھ استاذ مرحوم کی نذر کر دیا۔ ہم خیر المدارس پہنچے تو عجب بہار تھی۔ مولانا خیر محمد مختصر وجود کے انسان تھے لیکن تدبیر و تنظیم میں اپنی مثال آپ۔ چہرے سے اخلاص و روحانیت ٹپکتی تھی۔ ان کی نگرانی میں اچھے اساتذہ کی ٹیم موجود تھی۔ مولانا محمد علی نے بڑی محبت سے اساتذہ سے تعارف کرایا جس کا ہمیں ہمیشہ فائدہ ہوا۔

ہمارے اساتذہ میں حضرت الشیخ قاری رحیم بخش اور مولانا محمد شریف جالندھری رحمہما اللہ تعالیٰ تو انتقال کر گئے۔ مولانا فیض احمد مہتمم مدرسہ قاسم العلوم ملتان (حالاً) مولانا محمد صدیق ناظم مدرسہ خیر المدارس۔ مولانا مفتی عبدالستار مفتی خیر المدارس، مولانا محمد اسحٰق مفتی مدرسہ قاسم العلوم، مولانا قاری عبدالحنان مقیم مدینہ منورہ، مولانا علی اصغر مقیم ملتان اور مولانا اللہ یار جیسے صاحبانِ علم و فضل اور سراپا خلوص و محبت حضرات زندہ ہیں (اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے)، ان کی محبتیں شفقتیں ہماری زندگی کا سرمایہ ہیں، میں رب ذوالجلال کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایسے مخلص، بے لوث محنتی اور فدایانِ علم و تدریس لوگ اپنی زندگی میں نہیں دیکھے۔ اعتقادات و معاملات کی دنیا میں حضرات کی تربیت نے جو سانچہ بنایا وہی بحمداللہ قائم ہے۔ وقت کا کوئی تھپیڑا، طوفان اور تبدیلی کو بدل نہ سکی اور یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اور ان حضرات کی دعاؤں سے اس کو اسی طرح رکھیں گے۔

حضرت مولانا خیر محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے تقاضا کر کے چند سبق تبرکاً پڑھے۔ ملتان کے قیام

زمانہ میں حضرت امیر شریعت، امام احرار السید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی جی بھر کر زیارت کی۔ ہر جمعہ قریب قریب ۲ گھنٹہ ان کی خدمت میں حاضری رہتی۔ حضرت والد صاحب پر ان کی شفقتیں بے پایاں تھیں۔ لیکن اس مرد حُر کا یہ دَور ایسا تھا کہ وہ بیماریوں کے سبب کہیں آجا نہ سکتے۔ زیادہ گفتگو بھی نہ فرماتے۔ مسلم لیگی حکومت کی کہہ مکرنیاں۔ رفض و سبائیت کے فتنے ان کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسی دور میں فقر و بوذری اور غیرت اسلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سکندر مرزا جیسے رجل عیّار سے ملنے سے انکار کیا تھا۔ حالات کی رفتار سے وہ بہت رنجیدہ خاطر تھے اور کبھی کبھار افسوس کے سے انداز میں فرماتے کہ اب ہمت و طاقت نہیں رہی ورنہ پھر ایک بار "انا الحق" کا نعرہ لگا کر میدان میں آتا۔ تاہم آنے جانے والوں کو غیرت کی خاص طور پر نصیحت فرماتے۔ معاصرین میں مولانا مدنی، مولانا آزاد، مولانا لاہوری، چودھری افضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا کبھی ذکر آجاتا تو ان کا چہرہ خوشی سے کھل جاتا۔ عزیزوں میں قاضی احسان احمد، مولانا محمد علی، مولانا محمد حیات اور مولانا لعل حسین جیسے حضرات کے بڑے قدر دان تھے اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی سے تو ان کا تعلق دیدنی تھا نہ کہ شنیدنی۔

ملتان ہی کے زمانہ میں امام التفسیر مولانا احمد علی کی پہلی بار زیارت کی۔ متانت، وقار اور سنجیدگی و حلم کا ایک پہاڑ تھا، اللہ اللہ۔ چہرے پر وہ نورانیت کہ تاب دید نہیں۔ مولانا غلام غوث ہزاروی اور قاضی احسان احمد جیسے مردان حر اور غیرت مند لوگ نہیں دیکھے۔ سب حضرات سے ابا حضور کا گہرا تعلق تھا لیکن ہماری عمر بہت کم تھی۔ اب یہاں ان بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ہر ایک نے بے پناہ محبتوں سے نوازا۔ مولانا مفتی محمد شفیع (کراچی) مولانا مفتی محمد شفیع (قاسم العلوم ملتان) ، مولانا شمس الحق افغانی مولانا محمد شفیع (سرگودھا) ، مولانا سید محمد یوسف بنوری، مولانا عبد الحق (اکوڑہ خٹک) ، جیسے ارباب علم کی زیارت اور خدمت کا یہاں بہت موقعہ ملا۔ اصل میں خیر المدارس علماء کی چھاؤنی تھی۔ تھانہ بھون سے تعلق کے باوصف حضرت بانی کے مزاج میں توسع تھا۔ سب سے میل جول تھا۔ قومی مسائل میں اجتماعی سوچ بچار کی عادت تھی۔ مدرسہ کے جلسہ پر سبھی حضرات کی آمد ہوتی۔ کوئی تفریق نہ تھی۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب اور مولانا احتشام الحق کی زیارت بھی یہیں ہوئی۔ اور مولانا مفتی محمود کا ابتدائی دور بھی یہیں دیکھا۔ اب تو ایک آدھ کے سوا سب وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آیا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے!

- - - - - - - - - - - - - - - -

تحریک علمی دار العلوم دیوبند سے وابستہ مدارس کی عظیم تنظیم "وفاق المدارس العربیہ" اسی دور میں

معرض وجود میں آئی۔ خیرالمدارس نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیئے۔ ہمارے اساتذہ گرامی نے کراچی سے پشاور تک سے آئے ہوئے سینکڑوں علماء کی دو دن رات شبانہ روز خدمت کی اور چند طلباء کی ایک ٹیم ساتھ رکھی۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس ٹیم میں ہم دونوں بھائی بھی شامل تھے تعلیم کے ساتھ تربیت، بزرگوں اور اساتذہ کی خدمت اور ایسے معاملات میں گھریلو ماحول کے بعد خیرالمدارس کا حصہ ہے اور ہم اپنے مرحوم و زندہ اساتذہ اور اس عظیم دینی درسگاہ کے بے حد ممنون ہیں۔ اس کا شکر ادا ہونا بڑا مشکل ہے۔

مولانا خیر محمد کے بعد ان کے صاحبزادہ گرامی۔ استاذ محترم مولانا محمد شریف نے اس درسگاہ کو سنبھالا اور حق ادا کر دیا۔ جب انہوں نے سرزمین وحی مکہ معظمہ میں پیغام اجل پر لبیک کہا تو مدرسہ کے بہی خواہوں نے لاہور سے در آمدی منتظم کی سازش ناکام بنا کر مولانا کے صاحبزادے برادر عزیز مولانا محمد حنیف کو" صاحبزادگی نہیں، استحقاق کی بنیاد پر" اہتمام کی ذمہ داری سونپی اور مدرسہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد شریف کاشمیری جیسے عظیم استاذ سمیت باقی تمام اساتذہ نے وفاداری بشرط استواری کا حق ادا کیا جس کا نتیجہ ہے کہ تیسری پشت میں یہ مدرسہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ (رب العزت اس جماعت نظم میں برکت دے اور مدرسہ کو شر اعداء سے بچائے)۔

- - - - - - - - - - - - -

دو سال مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ دوسرے سال کے آخری حصہ میں احقر یرقان اور پھر ٹائیفائیڈ کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اس بیماری نے ادھ موا کر دیا اور میں اس شہر کی شدید گرمی کی تاب نہ لا کر وہاں سے نکل بھاگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مدرسہ میں تعلیم کی عدم تکمیل کا مجھے شدید احساس ہے لیکن "وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ" کا معاملہ ہے۔ قدرت نے اس کے بعد بھی نہایت درجہ مخلص، شفیق اور مہربان اساتذہ نصیب فرمائے اور جہاں رہے خوب پڑھنے کی توفیق ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے فضل سے نوازا۔ مدرسہ خیرالمدارس ملتان کے بعد اپنے آبائی ضلع کے صدر مقام سرگودھا کی مشہور دینی درسگاہ "جامعہ عربیہ سراج العلوم" جامع مسجد بلاک ۱۹ میں داخلہ لیا۔ اس مدرسہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ موجودہ ضلع خوشاب کے ایک قصبہ "گنجیال" کے رہنے والے تھے۔ وہیں سے اس مدرسہ کی ابتدا ہوئی پھر کچھ عرصہ خوشاب یہ مدرسہ رہا اور آخر میں سرگودھا۔ حضرت الشیخ خود امام العصر سید محمد انور شاہ قدس سرہٗ کے شاگرد خاص تھے۔ بڑے غیور، فقیہ النفس اور نکتہ رس عالم تھے۔ خطابت میں بھی جاہ و جلال تھا۔ سرگودھا جس کی سیاست پر انگریزی اقتدار کے مہرے ہمیشہ مسلط رہے اور بعض پیران عظام نے افسوسناک طریقے سے ان کی سرپرستی کی، وہاں مفتی صاحب کا وجود بتکدۂ نمرودی میں "آوازِ ابراہیمؑ" کا

ق تھا۔ انہوں نے مومنانہ غیرت سے حالات کا مقابلہ کیا اور آوازۂ حریت کو پورے علاقہ میں پہنچایا۔
روحانی تعلق ان کا بھی خانقاہ سراجیہ کندیاں سے تھا۔ حضرت مولانا احمد خان قدس سرہ کے خلفاء
شامل تھے اور حضرت الشیخ کا بڑا قرب حاصل تھا۔ اس نسبت سے ان کی خواہش بھی تھی۔
سہ کو ہم نے اختیار کیا۔ ان کی مدرسانہ اور بزرگانہ شفقتوں کے ساتھ وہاں جن اکابر اساتذہ کے
ین کی توفیق نصیب ہوئی۔ ان میں سب سے اہم مقام تو ہمارے لئے مولانا صالح محمد صاحب
ڈیرہ اسمٰعیل خان کی خواجہ برادری کے فرد تھے لیکن علم کی کشش مولانا مفتی محمد شفیع تک لائی۔
بند میں شیخ مدنی سے کی اور پھر واپس استاذ و شیخ کے قدموں میں رہ گئے اور مسلسل ۵۸ برس
اہ کو اپنے خلوص اور علوم سے مالا مال فرمایا۔ ان سے ہمیں خاص نیازمندی حاصل تھی اور اب ان
ل کے بعد بھی ان کے صاحبزادگان بالخصوص مولانا محمد صادق سے گہرا تعلق اور ایک طرح کے گھریلو
) مفتی صاحب کے دونوں صاحبزادے مولانا احمد سعید (حال خطیب مسجد) اور قاری عبد السمیع
ب (مہتمم مدرسہ) جیسے نکتہ رس علماء اساتذہ اور مربیوں کی فہرست میں شامل تھے۔ اسی مدرسہ کے فیض یافتہ
ت میں سے مولانا غلام غوث محمد اور مولانا عبد اللطیف جیسے جید اساتذہ سے استفادہ کیا۔ بنوں کے
یب اعظم مولانا حضرت علی کچھ عرصہ مدرس رہے اور ان سے استفادہ کا موقعہ ملا۔ جبکہ حضرت مفتی اعظم ہند
انا کفایت اللہ دہلوی کے خاص شاگرد مولانا خدا بخش رحمہ اللہ تعالیٰ سے خارج اوقات استفادہ کا
عہ ملا۔ ان حضرات نے خیر المدارس کی علیحدگی کو محسوس نہ ہونے دیا اور کہنا چاہئے کہ اس بنیاد پر بالائی
ت کی تعمیر کا سروسامان کیا۔ تین سال اس مدرسہ میں گزرے۔ احقر کی علالت و بیماری جوں کی توں
نا اس لئے والد صاحب قبلہ نے حضرات مدرسہ سے اجازت لے کر احقر کو پنڈی میں بلا لیا اور بھائی جان
بار ہے۔ دو سال کا یہ عرصہ ہم دونوں بھائی جدا جدا رہے۔

راولپنڈی میں جس مدرسہ میں احقر نے پڑھا اس کے بانی اور مہتمم تو تھے مولانا عبد الحکیم، جو احقر
ابا جان کے عزیز دوست اور خانقاہ سراجیہ سے وابستہ تھے لیکن میری اصل دلچسپی کا مرکز تھے حضرت
ماذ الشیخ مولانا محمد عثمان حسین ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ، جنکی الف سے یا تک ساری تعلیم دیوبند میں
راشد سید مدنیؒ کی نگرانی میں ہوئی اور اس کے بعد دس برس خانقاہ مدنی میں وہ فروکش رہے۔
رت الشیخ مدنی کے آخری غسل میں وہ شریک تھے۔ میرے شیخ مولانا اسعد سے ان کا گہرا رابطہ تھا اور
رت محدث عصر مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی اور حضرت الشیخ بنوری قدس سرہما العزیز سے بہت ہی
بدت تھی اور ان حضرات کی بھی ان پر بے حد شفقت تھی۔ ان کے پاس اسباق کے ساتھ ساتھ

معلومات کا وسیع خزانہ نصیب ہوتا اور ہم ان کی شفقتوں سے بے حد محظوظ ہوئے۔ میرے ابا جان ان کا تعلق بے حد محبت واحترام کا تھا جس سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا حتیٰ کہ ان کی بارگاہ میں گستا کی سٹیج پر پہنچ گیا۔ لیکن واہ رے ان کی محبت اور عفو و درگذر کی عادت، میں نے ہمیشہ انہیں متبسم پایا۔ علم سے گہری وابستگی تھی اور تدریس کا انداز بہت خوب، اُدھر اسی مدرسہ میں استاذی مولانا حبیب ا جیسے مجاہد، نڈر، بے باک اور زبردست مدرس انسان سے واسطہ پڑا جو غیرت وحمیت کا مرقع اور محنت و خلوص کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔

آخری مرحلہ دورۂ حدیث کا تھا۔ راولپنڈی میں ہمارے امتحان کے لئے محدث عصر، مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدر زیدمجدہم تشریف لائے، مشکوٰۃ شریف کا امتحان انہوں نے لیا مختلف مدا میں دورہ کے متعلق سوچ بچار تھی۔ بالآخر انہی کی خدمت میں حاضری کا فیصلہ ہوا۔ مولانا اور ان کے براد اصغر، استاذنا المحترم مولانا صوفی عبدالحمید دونوں دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ ہیں۔ اصل تعلق سوا سے ہے۔ آباء واجداد ہزارہ آگئے اور اب زندگی گوجرانوالہ گذر رہی ہے۔ مولانا محمد سرفراز خاں صاح کا روحانی تعلق مولانا حسین علی قدس سرہٗ سے ہے تو صوفی صاحب کا شیخ الاسلام مدنیؒ سے۔ اوّل الذکر رجالِ حدیث کے بلاشبہ اس وقت سب سے بڑے استاذ اور ماہر ہیں۔ ردِّ بدعات میں ان کا تحریری سرمایہ بے پناہ اور نہایت درجہ محققانہ ہے جس کی ہر سلیم الفطرت نے تعریف کی اور ہزارہا کی اس سے اصلاح ہوئی۔ گوجرانوالہ کے مشہور قصبہ گکھڑ میں خطابت کے فرائض کے ساتھ مسجد میں درس اُج کی تعلیم اور ایک سرکاری ادارہ میں بھی درس کا سلسلہ انجام دیتے ہیں اور روزانہ گوجرانوالہ تشریف لاکر مدرسہ نصرۃ العلوم میں حدیث کی کلیدی کتابوں بخاری ومسلم کا درس ارشاد فرماتے ہیں اور اب چند سال۔ شعبان ورمضان کی تعطیلات میں دورۂ تفسیر پڑھانے لگے ہیں جس میں بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔ مو کا انداز محققانہ ہوتا ہے مناظرانہ نہیں۔

صوفی صاحب قبلہ مدرسہ نصرۃ العلوم کے بانی ہیں۔ گوجرانوالہ کے وسط میں گھنٹہ گھر کے قریب ا بہت بڑے جوہڑ کو پاٹ کر مسجد نور و مدرسہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ یہ عمارت اپنی وسعت، استحکام ا علمی وروحانی مرکز کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت صوفی صاحب کو حضرت الامام الشاہ ولی قدس سرہٗ اور ان کے خاندان بالخصوص شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کے علوم سے گہری مناسبت ان کی کئی کتابیں بڑے اہتمام سے ایڈٹ کرکے انہوں نے چھپوائیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کتاب "اجوبہ اربعین" جو تردید رفض میں لاجواب کتاب ہے اس کو بعد از تصحیح اہتمام سے انہو

ے چھاپا۔ شیخ الاسلام مدنی، امام انقلاب سندھی، امام الہند مولانا آزاد اور شیخ التفسیر مولانا لاہوری
ے انہیں غایت درجہ تعلق ہے۔ ان کا خطبہ جمعہ اور صبح کا درس قرآن علوم و معارف کا خزینہ ہوتا
ہے اور اس میں لوگوں کی حاضری مثالی ہوتی ہے۔ انہی حضرات کی خدمت میں تکمیل علوم کی توفیق نصیب
ئی۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا قاضی محمد اسلم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (ہری پور ہزارہ) ہمارے استاذ تھے۔
ے مسلم اور ابو داؤد پڑھنے کا موقعہ ملا۔ نہایت درجہ محقق اور معقولات کے ماہر انسان تھے۔
رت اور انکساری انمیں بے حد تھی۔ اور بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ ہمارے چوتھے استاذ مولانا
عبد القیوم تھے جو اب بھی وہاں مدرس ہیں۔ اخلاص وللّٰہیت کا نمونہ۔ علم سے گہری مناسبت،
عقدات دینی و سیاسی میں بے حد مستحکم اور اٹل، غیور اور جسور انسان ہیں۔ ان حضرات کی تدریسی
تربیتی صحبتیں کندن بنانے کے کام آئیں۔ گوکہ اپنا ذاتی معاملہ "خضر از آب حیواں تشنہ می آرد
سکندر را" کا سا رہا۔ اور فیض کے اتنے چشموں سے قریبی تعلق رکھنے کے باوجود محرومی رہی۔
ہم تحدیث نعمت کے طور پر اتنی بات ضرور ہے کہ ہر جگہ حضرات اساتذہ کرام کی محبت و شفقت
اور ان کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور ان کی دعائیں اب بھی میرا سرمایہ ہیں۔ جب کبھی کسی
بھی خدمت میں حاضری کا موقعہ نصیب ہوتا ہے تو پہلے سے زیادہ رحم و کرم کی دولت میسر آتی ہے۔
ب العزت میرے ان اساتذہ و مشائخ کو صحت و عافیت سے ملت کی سرپرستی و رہنمائی کیلئے زندہ رکھے)

(۲)

گذشتہ بیس سالوں کے دوران

دینی مشاغل اور تحریکی و جماعتی تعلق

۱۹۶۶ء میں فراغت ہوئی تو چند ماہ راولپنڈی مولانا عبد الحکیم کے ہی مدرسہ میں پڑھانے کا
موقعہ ملا۔ اور پھر مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حکم و ایماء سے حضرو ضلع اٹک جانا ہوا۔
مولانا ہزاروی ایک درویش منش، مخلص اور بہادر انسان تھے۔ امام العصر انور شاہ رحمہ اللہ
تعالیٰ کے خاص الخاص شاگرد۔ جید عالم، صاحب نظر مدرس، دیوبند میں سال بھر پڑھانے کے بعد
اساتذہ کے ایماء سے حیدر آباد دکن گئے۔ سبائیت اور بدعات کے خوفناک سیلاب کے خلاف بند باندھا۔

دارالعلوم کی تعلیم کے زمانے میں جمعیۃ طلبہ قائم کر کے سارے ملک میں انگریز راج کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا پھر حیدر آباد سے واپس آ گئے۔ مقامی حالات دگرگوں تھے۔ فتنہ مرزائیت سر اٹھا رہا تھا اسے کچلا۔ اسلام و بدعات کے خلاف جنگ کی۔ مجلس احرار اسلام کے مخلص قائدین میں سے تھے صبر آزما جدوجہد ان کی زندگی کا لازمہ رہی اور انہوں نے اس دور میں اگلے وقتوں کے اہل اخلاص و ایثار کے کردار کو زندہ کیا۔ عمر کے آخری مرحلہ میں بیگانوں سے زیادہ اپنوں کی شعوری اور غیر شعوری سازشوں کا شکار ہوئے لیکن جس کو حق سمجھا اس پر ڈٹے رہے۔

ہمیں ان سے بے حد تعلق تھا۔ والد صاحب انہیں چچا کہتے، روحانی تعلق خانقاہ سراجیہ کندیاں سے تھا۔ اس نسبت سے اور مجلس احرار کے حوالے سے چند در چند اسباب و جہ تعلق تھے انہی کے حکم سے حضرو جانا ہوا

صوبہ پنجاب کا آخری ضلع اٹک ہے۔ اس کا ایک حصہ جو جی ٹی روڈ پر دائیں ہاتھ واقع چھچھ کہلاتا ہے۔ ۸۴ گاؤں پر مشتمل اس خطہ کا صدر مقام "حضرو" ہے۔ زرعی علاقہ ہے اور بے حد زرخیز۔ اور اس سے زیادہ علمی اعتبار سے زرخیز۔ بڑی بڑی نامور ہستیاں اس خطہ سے اٹھیں اسے پنجاب کا "بخارا" کہا جاتا ہے۔ حضرو شہر کے وسط میں بہت بڑا مندر ہے۔ اس سے متصل بعض حضرات نے ایک عظیم الشان مسجد بنوائی۔ حضرت لاہوری قدس سرہ نے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور اب میں اس کا خطیب تھا۔

مسجد کی خطابت و تدریس کے ساتھ جمعیۃ علماء اسلام کی خدمت بلکہ اس علاقہ میں اس کے تعارف و تنظیم کے کٹھن مرحلے سے مجھے دوچار ہونا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ بزرگوں کا تعلق احرار سے تھا لیکن ایک روایت کے مطابق شاہ جی علیہ الرحمہ نے احرار کی سیاسی حیثیت ختم کر کے ختم نبوت کے محاذ پر اپنی صلاحیتیں اور اپنے رفقاء کی صلاحیتیں کھپانے کا فیصلہ کیا تو اب میدان صاف تھا۔ جمعیۃ علماء موجود تھی لیکن اس کے کرتا دھرتا وہ بزرگ حضرات تھے جن کی عقیدتوں کا مرکز مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔ دیوبند کے مدنی اسکول کے سرخیل مولانا لاہوری نے سابقہ خلیج کو پاٹ کر مل جل کر کام کرنا ہی نکالنا چاہی لیکن "مصلحت و احتیاط" کے رسیا بزرگ جب آمادہ پیکار نہ ہوئے تو ان کو الگ سے قافلہ ترتیب دینا پڑا جس کی سرپرستی امام لاہوری نے کی تو شبانہ روز محنت سے مولانا غلام غوث ہزاروی کے خون پسینے سے پروان چڑھا۔ جب مولانا ہزاروی جمعیۃ کی تنظیم میں منہمک تھے ادھر تن تنہا طوفان۔

رہے تھے تو مفتی محمود مرحوم ملتان کے مدرسہ قاسم العلوم کے مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔ مولانا ہزاروی نے
نہیں اس چار دیواری سے نکالا۔ اور بہت سے حضرات اس میں ممد و معاون بنے جن میں سے اکثر و بیشتر
حضرات اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، جن کی غالباً ایک کڑی مولانا عبیداللہ انور تھے (رحمہم اللہ
تعالیٰ) کم از کم اس قافلہ کا اب ایک فرد بھی باقی نہیں۔ غالباً اسی وجہ سے حالات کا موجودہ رخ سامنے آیا
ہے۔ اللہ تعالیٰ جانے والوں کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور اخلاف کو حقیقت پسندی کی توفیق دے۔

شعور کی آنکھیں کھلیں تو جمعیۃ کو دیکھا۔ مرحوم ایوب خان کا مارشل لاء ختم ہوا تو سرگودھا میں ہم
زیر تعلیم تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں میں سے سب سے پہلے سرگودھا میں عوامی اجتماع جو
شاندار و فقید المثال تھا، جمعیۃ کا ہوا۔ اس میں ہمارا خونِ جگر شامل تھا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۷۸ء
تک تعلیم، تدریس اور خطابت کے فرائض کے ساتھ میرے نزدیک سب سے بڑا فرض جمعیۃ کی خدمت
تھی۔ طبیعت سازش و فریب کی عادی نہیں بقول کسے مزاجاً اور ذہناً بلد قسم کا احراری ہوں۔ کام کا
عادی ہوں اس لئے جمعیۃ میں جو لگے تو علیٰ وجہ البصیرت اور جو کام کیا تو کشتیاں جلا کر۔ میرے تحت الشعور
میں جمعیۃ کا پروگرام اور اس کے مقاصد اب بھی اسی طرح اُجلے ہیں جس طرح پہلے تھے۔ میری عقیدتوں
اور محبتوں میں اس اعتبار سے کوئی کمی نہیں آئی لیکن جمعیۃ کے دائرہ کار میں شخصیت پرستی سے مردہ پرستی
تک کے رجحان، روایتی سیاست بازی اور مخلص کارکنوں کی جگہ نہ ہونے جیسے عوامل نے جی کھٹا کیا،
اے کاش کوئی "رجلِ حُر" اس قافلۂ حُرّیت و استقلال کو اب بھی سنبھالا دے تو مجھے یقین ہے کہ
اکابر و اسلاف کے انفاسِ قُدسیہ اور مخلص ورکروں کی محنتیں اب بھی کام آ سکتی ہیں۔ لعل اللہ یحدث
بعد ذالک امرا۔

۱۹۷۷ء کا سال ملک کے لئے جیسا کیسا تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ بھٹو صاحب اور ان کے
بالمقابل قومی اتحاد، ہم بھی جمعیۃ کے خادم و ورکر کی حیثیت سے قومی اتحاد کے پلیٹ فارم پر تھے اور بعض
نازک مواقع پر اندرونی کہانیاں دیکھنے کا اتفاق ہوا اتحادی قائدین کا معاملہ قرآن کے الفاظ میں
"تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى" کا تھا۔ عوامی جذبات نے ان معاملات کو دبائے
رکھا تھا لیکن افسوس کہ بعد میں اصغر خان اور نورانی میاں نے رستے خون سے بے وفائی کی تو بعض
دوسرے حضرات نے "فوجی جنتا" کے قدموں میں "جمہوریت" کی قربانی دے کر اپنے موقف کی خود
بنیاد بودی۔ اس موقع پر احقر نے شدید احتجاجی رویہ اختیار کیا لیکن ملک کے لئے بنیادی حقوق کے
طالب اپنے ورکر کی زبان و قلم سے یہ احتجاج برداشت نہ کر سکے، جس کے بعد محسوس کیا گیا کہ پروگرام
بے شک صحیح، دستور بہت اچھا اور مقاصد بہت بلند ہیں لیکن میرِ کارواں خوشامدیوں کے نرغے میں

ہے۔ لہٰذا اب بادیدۂ پرنم چھٹی کرو۔

حضرو کے خوفناک جاگیردارانہ ماحول میں جس غیرت وخودداری کے ساتھ عواقب سے بے نیاز ہوکر کام کی توفیق نصیب ہوئی اور جمعیۃ کو ایک زندہ، فعال اور متحرک قوت کے طور پر اس گنہگار نے وہاں کے مخلص احباب کی معیت میں میدان میں لا کھڑا کیا اور ازلی لوڈیوں کی سطوت کو للکارا وہ میری زندگی کا سنہری کارنامہ ہے اور میں اسے اپنی نجات وبخشش کا ذریعہ سمجھتا ہوں (رب رحیم اپنے کرم بے پایاں سے قبول فرمائیں تو زہے سعادت)

۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے چند ماہ عارضی طور پر وہاں سے الگ ہوکر سلانوالی ضلع سرگودھا میں خدمات سرانجام دے کر پھر واپسی حضرو ہوئی اور ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کو بڑے حوصلہ سے آگے بڑھانے اور وہاں کے اجارہ دار طبقوں کی اجارہ داریاں توڑنے اور انہیں للکارنے کی توفیق ہوئی تاہم بوجوہ ۱۹۷۰ء میں وہاں سے الگ ہوکر چند ماہ سرگودھا میں خدمت دین کی منازل قطع کرتا ہ ۱۹۷ء کے اواخر میں حضرت الشیخ المخدوم مولانا عبیداللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی خواہش پر ہفت روزہ خدام الدین کی ادارت سنبھال لی۔ اور لاہور قیام کر لیا، مولانا المحترم سے میرے تعلق کی داستان دس سال پر محیط ہے جس کی تفصیل ایک دفتر کی متقاضی ہے۔ مولانا کی جو تحریرات میری ناچیز خدمات کے سبب میرے پاس محفوظ ہیں وہ سامنے آجائیں تو بہت سے گوشے بے نقاب ہوجائیں اور بہت سے "اجارہ دارانِ عقیدت" کا بھانڈا پھوٹ جائے لیکن اس کی ضرورت نہیں، مختصراً اس کہانی کو ہفت روزہ خدام الدین کی قریبی اشاعت میں جو مولانا کے انتقال کے بعد، ان کی یاد میں لکلی نئے ناخداؤں کی مسلسل فرمائش پر لکھ چکا ہوں۔ خدام الدین کے ساتھ قدیم ضلع لاہور (جس میں قصور شامل تھا) اور جدید لاہور میں جمعیۃ علماء اسلام کی کلیدی آسامیوں پر مجھے خدمات انجام دینا پڑیں لیکن میری شوخیٔ طبع ہمیشہ میرے لئے بلا بنی رہی اور میں حاسدین کے حسد کی نذر ہوکر رہ گیا۔ اصولوں پر ڈٹ جانا اور ان کے لئے ہر قربانی تو بحمداللہ تعالیٰ میرے لئے آسان ہے۔ لیکن شخصیات کی پوجا میرے مسلک میں حرام ہے اور یہی میرا جرم ہے جو بار بار مجھے کرنا پڑتا ہے اور جس کے نتیجہ میں میں اب تک دسیوں مرتبہ مجرم وگردن زدنی قرار پا چکا ہوں اور اب تو چند سال سے بعض حضرات نے ہاتھ تک ملانے سے گریز کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ شاید کہ اس سے بعض قد آور شخصیات کی ناراضی کا انہیں خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ تاہم میرا ضمیر مطمئن ہے، اور میرے معتقدات اٹل!

میں واضح کرنا چاہتا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہ:

- میں عبادت و بندگی کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھتا ہوں۔
- محمد عربی علیہ التحیۃ والتسلیم کی غیر مشروط اطاعت و تابعداری میرا جزوِ ایمان ہے۔
- صحابہ علیہم الرضوان کے ہر ہر فرد کو معیارِ حق وصداقت سمجھتا ہوں اور اس معاملہ میں کسی رواداری، مصلحت یا ایسی کسی بات کا قائل نہیں۔
- قرآن وسنّت ملّت کا اصل سرمایہ ہیں، انہی پر اس کی نجات کا انحصار ہے۔ تاہم اجماع وقیاس کو ملّت کے اہلِ نظر کی طرح "ادلّہ اربعہ" میں سمجھ کر ان کی افادیت کا پوری طرح قائل ہوں۔
- گردشِ لیل ونہار کچھ ہو، لیکن ائمہ اربعہ کی تقلید علیٰ وجہ البصیرت اور دلائل کی روشنی میں ضروری خیال کرتا ہوں۔ تسلیم کرتا ہوں کہ ان کا سرمایہ علمی براہِ راست کتاب وسنّت سے ماخوذ ہے۔ آج کے "مجتہدانِ بے بصیرت" ان کے مقابلہ میں پرِ کاہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ بالخصوص امام الائمہ، سراج الائمہ محدثِ کبیر حضرت الامام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عظمت واحترام آئے دن میرے لئے بڑھ رہی ہے۔ ان کی فقہی اور قانونی کاوشیں ایسی ہیں کہ مدتوں کی شکر گذاری ان کا بدل نہیں ہوسکتی۔ ماوراء النہر کے لوگوں کے لئے بقول حکیم امت امام ولی اللہ الدھلویؒ، ان کی تقلید ضروری خیال کرتا ہوں۔ تاہم مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرح "ضرورت کی حد تک" دوسرے حضرات کی فقہی کاوشوں سے استفادہ غلط نہیں سمجھتا۔ جیسے مولانا تھانوی نے عورتوں کے بعض مسائل میں "الحیلۃ الناجزۃ" کے عنوان سے مجتہدانہ روّیہ اختیار کیا۔ ساتھ یہ واضح کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ ہر دور کی اٹھتی گھٹاؤں اور طوفانوں کے مقابلہ کے لئے "اجتہاد" کی ضرورت مسلّم لیکن اس کا اہل ہر کس وناکس کو نہیں سمجھتا بلکہ مخصوص رجال کار جو مسلّمہ شرائط پر پورے اترتے ہوں انہیں ہی اس کا مستحق گردانتا ہوں۔

(۳)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے تعارف اور

تنظیم اسلامی میں شمولیت

واقف تھا لیکن یاد نہیں کہ اس کا کوئی پرچہ نظر سے گذرا ہو۔ لیکن میرے قیام حضرو کے زمانہ میں جو
اس میں مخدوم گرامی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب علیہ الرحمۃ والغفران کا وہ معرکۃ الآراء مقالہ چھ
جس میں انہوں نے حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ سے متعلق اپنی گستاخیوں پر اظہار ندامت
تھا تو احقر نے لاہور ایک دوست کو عریضہ لکھ کر وہ پرچے منگوائے۔ چشتی صاحب مرحوم مسلم
کے بہت اہم کارکن رہے۔ علامہ اقبال مرحوم سے ان کا گہرا لگاؤ تھا حتیٰ کہ وہ ان کے کلام کے شا
و مترجم تھے۔ انہی حوالوں سے انہوں نے مجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا سید حسین احمد
رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بعض نازیبا کلمات کہے۔ چشتی صاحب کا مولانا احمد علی لاہوری سے
تھا۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے اشاعتِ اسلام کالج کے پرنسپل چشتی صاحب تھے
حضرت لاہوری اغلباً تعلیمی کمیٹی کے سربراہ۔ چشتی صاحب نے احقر کی درخواست پر اس ضمن میں
باتیں لکھی تھیں جو ہفت روزہ خدام الدین میں شائع ہوئیں۔ ابتداءً مولانا لاہوری نے ہی
توجہ دلائی پھر حضرت لاہوری کے بہت عزیز خادم اور خلیفہ مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی نے
سلسلۂ خیر کو جاری رکھا تا آنکہ چشتی صاحب کا شرح صدر ہوا اور انہوں نے وہ معرکۃ الآ
مضمون لکھا جس نے ایک خاص طبقہ کے ایوان میں کھلبلی مچادی۔ چشتی صاحب کا یہ مضمون ہم
خدام الدین کے مدنی نمبر میں چھپا تھا لیکن افسوس کہ اس دور میں مدیر خدام الدین نے اس
جملہ میٹر اور مواد کو ذاتی تصرف میں لے کر اس کو کھٹائی ہی میں نہیں ڈالا بلکہ اس کی اشاعت
امکان ہی ختم کر دیا۔ لگ بھگ دو برس یہ مضمون وہاں پڑا رہا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے چھ
کا اہتمام کیا تو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ذریعہ، جو مولانا مدنی کے سیاسی افکار سے اخ
کے باوصف ان کے مجاہدانہ اور علمی کردار کے زبردست مداح ہیں۔ بعد میں یہ مضمون ج
علماءِ اسلام کے آرگن "ترجمانِ اسلام"، کے قائم مقام "نوائے گوجرانوالہ" میں چھپا۔
ساہیوال کی ایک خصوصی اشاعت میں چھپا۔ میرے بعض دوستوں نے کتابی شکل میں مع
توسط سے چھپوایا۔ یہ دوست صادق آباد سے متعلق تھے۔ اور اب حال ہی میں میرے
دوست حافظ محمد یوسف عثمانی آف گوجرانوالہ نے اپنے مکتبہ مدنیہ گوجرانوالہ سے "الجمعیۃ
کے شیخ الاسلام نمبر کے جدید ایڈیشن میں اضافہ کر دیا ہے۔

"الجمعیۃ" دہلی سے نکلنے والا "جمعیۃ علماء ہند" کا آرگن ہے۔ اس کے سنڈ
کی خاص طور پر بڑی شہرت ہے۔ مولانا مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے سانحہ ارتحال پر ا
... نکلا۔ اس کے علاوہ مولانا مفتی کفایت ا

الکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن رحمہم اللہ جیسے حضرات پر عظیم الشان نمبر آ چکے۔ حافظ یوسف
ثانی صاحب نے ۱۹۸۵ء کے اسی نمبر کا جدید ایڈیشن مخدوم گرامی مولانا سید اسعد مدنی صدر
جمعیۃ علماءِ ہند کی اجازت سے یہاں سے شائع کیا ہے جس کا دوسرا ایڈیشن عنقریب آنے
والا ہے۔ اسی جدید ایڈیشن میں چشتی صاحب کے مضمون کا قابلِ قدر خلاصہ شامل کیا گیا ہے
ہم اولیت کا سہرا ڈاکٹر صاحب کے سر تھا۔ اور مجھے حضرت مدنی سے بے پناہ عقیدت
رہی اور رہے۔ اس لئے میں نے اسے منگوایا اور پڑھا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کا ایک صفحہ
ابتدائیہ بہت خوب اور لائق مطالعہ تھا۔ اس کے بعد گاہ بگاہ "میثاق" حاصل
کرتا اور دیکھتا۔

چشتی صاحب کے اس مضمون پر غلام احمد صاحب پرویز اور چشتی صاحب کے شاگرد
مولانا عبدالستار نیازی نے بہت ہنگامہ کیا جس کا جواب لکھنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی۔
ترجمانِ اسلام میں چھپا۔ اس جواب کو پڑھ کر چشتی صاحب نے مجھے ایک عجیب و غریب خط
لکھا جو میرے سرمایہ میں محفوظ ہے۔ نہایت درجہ قیمتی خط اور بعض انکشافات کا حامل۔ اس خط
کے بعد چشتی صاحب سے خط و کتابت رہی حتیٰ کہ ۱۹۷۴ء میں لاہور آنے کے بعد مسلسل
ملاقاتیں رہیں۔ اغلباً میں واحد فرد تھا جس کی درخواست پر وہ کتابیں اور اپنی نوٹس بکیں عاریتہً
دے دیتے۔ میری ادارت میں خدام الدین کا ضخیم حضرت لاہوری نمبر چھپا تو اس کی تقریب رونمائی
میں میری درخواست پر تشریف لا کر نہ صرف تقریر کی بلکہ بھری محفل میں یہ کہہ کر مجھے اعزاز بخشا کہ

"سعید الرحمٰن میں تمہاری وجہ سے آ گیا ورنہ کہیں نہیں جاتا اور
خاص طور پر ایسی مجالس میں کہ میری نہ کوئی سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔"

ان کی معروف کتاب "تاریخ تصوف" جس کا اصل باب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے چھاپا وہ جب
پاکستان کے ایک مخصوص فرقہ کے شور و غوغا کے سبب ضبط ہو گئی تو میں نے چند دوستوں کے ساتھ اس کے
خلاف ہائی کورٹ لاہور میں رٹ دائر کی۔ مقدمہ میں ہمارے وکیل محبِ گرامی ارشاد احمد قریشی تھے جنہوں
نے کمال درجہ خلوص اور محنت سے مقدمہ لڑا اور جیتا۔ میری ذاتی درخواست پر چشتی صاحب نے وکالت نامہ
پر دستخط بھی کر دیئے اور فرمایا کہ:

"زندگی میں پہلی مرتبہ تمہاری وجہ سے یہ کام کیا۔"

لاہور میں آ کر ڈاکٹر صاحب کا میثاق تو دیکھتا رہا لیکن چند سال ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ ہاں کبھی کبھار

مسجد شہدا میں درس سننے کا موقع ملتا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تفہیم کی طاقت بخشی ہے۔ اس دوران مسجد شیرانوالہ میں حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ کی صدارت میں سیدنا الامام عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت و شہادت پر ان کی مبسوط و مفصل تقریر سنی جسکی مولانا انور نے اور بعد میں مطبوعہ شکل میں دیکھنے کے بعد چشتی صاحب نے بے حد تعریف کی اور واقعہ یہ ہے کہ وہ تقریر قابلِ تعریف تھی۔ دروس اور بعض دوسری تقریروں کے باوصف ابھی تک دل میں انشراح نہ تھا تاآنکہ چند سال قبل جب محرم الحرام کی سات تاریخ کو انہوں نے اپنے ایک لڑکے کی شادی کی اور ایک غلط و مکروہ روایت کے خلاف عملی جہاد کیا تو میرے دل میں ان کے لئے کچھ مزید انشراح کی کیفیت پیدا ہوئی۔

لاہور کے نام نہاد سنیوں نے شیعہ حضرات کے ساتھ مل کر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ حتیٰ کہ مولانا نورانی جیسے حضرات نے لاہور کی بعض مساجد میں ان کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیں اور حکومت پاکستان کو للکارا کہ ٹی وی پر ان کا مقبول سلسلہ "الھدیٰ" بند کیا جائے ورنہ .... "الہدیٰ" کے ذریعہ جو اصلاح ہو رہی تھی اور جس کے سبب لوگوں کی توجہات قرآن کی طرف بڑھ رہی تھیں، ان کا مجھے ذاتی طور پر احساس و مشاہدہ تھا۔ لیکن اس رویہ نے مجھے سخت دل گرفتہ کیا اور "فقیہانِ شہر" کی اس بے راہ روی پر میں خون کے آنسو رو کر رہ گیا۔

یہ تسلیم کہ ڈاکٹر صاحب بعض حضرات کے بقول "مستند عالم" نہیں۔ نہ ہی انہیں ماہرِ لسانِ عربی ہونے کا دعویٰ ہے، نہ ہی میرے جیسے لوگ انہیں مجدد یا محدث و فقیہہ یا مفتی و شیخ طریقت مانتے ہیں لیکن "خدمتِ قرآن" کی ایک لگن تو ہے جس کا انکار مشکل ہے اور یہ کہ وہ اس شہر میں جس میں کبھی امام الاولیاء لاہوریؒ نے درس قرآن کی مشعل جلائی تھی، اس میں اسی کام میں مشغول ہیں۔ کلامی اور فقہی مسائل میں بھی وہ دخل نہیں دیتے۔ اور کوشش ان کی یہی ہوتی ہے کہ محض اصلاح کا فرض انجام دے کر ایک ایسی جماعت فراہم کی جائے جو پوری دلجمعی اور خلوص کے ساتھ منکرات کے خلاف جہاد کر سکے۔ خود مجھے بھی فقیہہ و مفتی ہونے کا اعزاز حاصل نہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ایک خادم دین حق اور قرآن کے طالب علم کے طور پر ان کی اصلاحی کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹایا جائے اور منکرات کی گرم بازاری میں ان کی آواز کی تائید و تقویت کا سامان فراہم کیا جائے تو شرعاً، دیانتہً اور اخلاقاً اس میں حرج نہیں۔

لیکن ستم یہ ہے کہ "تعاون علی الخیر" کے بجائے رنگارنگ کی باتیں کہہ کر حدود تک کو پھلانگا جاتا ہے ــــ میرے جذبات میں اس صورت حال سے تلاطم تو تھا ہی کہ رمضان آگیا۔ جس مسجد میں احقر خطیب و امام ہے، اس کا محل وقوع اچھرہ لاہور کے قریب ہے۔ جدید اور ماڈرن قسم کی کالونی ہے

نام ہے " شاہ جمال کالونی " ۔ ہر سال رمضان میں اس مسجد میں تراویح میں قرآن سنانے کی سعادت بھی حاصل ہوتی ہے اور سالہا سال سے (میری آمد سے قبل ہی) آخری عشرہ میں بالعموم ہر روز اور کبھی طاق راتوں میں مختلف حضرات کی تقریروں کا اہتمام ہوتا ہے ۔ جس سال (۱۹۸۲ء) " الہدیٰ " بند ہوا اس سال میرے مسجد کے احباب نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ایک پروگرام میں بلانے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے کہا کہ حرج نہیں ۔ چنانچہ ۲۷ رمضان کو ڈاکٹر صاحب نے ایک بڑے اجتماع میں تقریر کی اور میری درخواست پر توحید و شرک کے موضوع پر بہت زوردار تقریر کی ۔ ان کی تقریر سے قبل " الہدیٰ " کی بندش اور حرم میں شادی کے موضوع پر احقر نے مختصراً تقریر کی اور اس بات کا اظہار کیا کہ اپنی کم ہمتی آڑے آتی ہے لیکن جی چاہتا ہے کہ ان منکرات کے خلاف جدوجہد میں ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ بٹایا جائے ۔

اس کے بعد احقر کا ان سے رابطہ بڑھ گیا ۔ چند مرتبہ وہ میرے یہاں تشریف لائے ، میں کئی مرتبہ حاضر ہوا ۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی ، اسی اثنا میں ان کا معروف سلسلہ " محاضراتِ قرآنی " کا موقعہ آگیا ۔ جس میں ایک مقالہ کے لیئے انہوں نے مجھ سے بھی فرمائش کی ۔ احقر نے " قرآن کی محفوظیت " پر ایک مقالہ لکھا ۔ اس میں شیعہ اسکول کے عقیدہ تحریفِ قرآن پر مدلل تنقید کی ۔ پاکستان کے عوام اور خاص طور پر حکمرانوں کی دین کے معاملہ میں بے حسی کے سبب مقالہ سخت تھا لیکن سنا بھی گیا اور خطرات مول لے کر ڈاکٹر صاحب نے چھاپا بھی ۔ اگلے سال پھر نہ صرف مجھ سے بلکہ مولانا عبید اللہ انور سے بھی میری درخواست پر مقالہ کی فرمائش ہوئی ۔

جن حضرات کی قدر میرے دل میں بہت ہے ان میں سے حضرت مولانا شمس الحق افغانی اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ ڈاکٹر صاحب کے یہاں شریکِ محاضرات ہوتے رہے ۔ مولانا عبید اللہ انور بھی ابتدا میں شریک رہے ۔ مولانا سید حامد میاں تو برابر مقالہ ارسال کرنے کی شکل میں شریک ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے " حلقۂ مستشارین " میں شامل ہیں اور علمی سرپرستی فرماتے ہیں ۔ اسی طرح میرے بہت ہی مخلص اور محترم کرم فرما مولانا محمد طاسین ناظم مجلس علمی کراچی اس حلقہ میں سرپرستانہ شریک ہیں اور اپنے مقالات سے مسلسل نوازتے ہیں کبھی آ بھی جاتے ہیں کبھی مقالہ ارسال کر دیتے ہیں ۔ مولانا محمد مالک کا بھی آنا جانا ہے گو انہیں پوری طرح اتفاق نہیں ہوتا لیکن علمی سرپرستی اور رہنمائی کو وہ تشریف لاتے ہیں اور اب چند سالوں سے میرے بہت ہی مخلص اور کرم فرما مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی مصنف محاسن موضح القرآن کا رابطہ علمی و سرپرستی ہے اور وہ بھی " حلقۂ مستشارین " کی بزم میں شریک ہیں ۔

مولانا عبید اللہ انور نے نہ صرف دعوت قبول فرمائی بلکہ دہلی میں مولانا عبید اللہ سندھی کی خدمتِ قرآن

کے حوالہ سے مقالہ کی تیاری کرائی۔ جو عین وقت پران کی علالت کے سبب ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے برادرم حافظ عاکف سعید نے پڑھا اور احقر کا مقالہ "تحریک نظم جماعت" بھی کسی دوست نے پڑھا کر میں عین وقت پر کسی ہنگامی مصروفیت کے سبب حاضر نہ ہو سکا۔

سال گذشتہ محاضرات کا اہتمام میونسپل ہال میں ہی تھا۔ وہاں ایک دن کی نشست اس صدی کے چند بڑے مظلوم حضرات میں سے ایک یعنی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد سے منسوب کی گئی جو ایک کارنامہ تھا اور اس میں خصوصی خطاب فرمایا، دورِ حاضر کے عبقری اور رشد دماغ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس میں احقر کو بھی مولانا آزادؒ کی تحریک حزب اللہ پر مقالہ پڑھنا تھا لیکن بوجوہ وہ اگلے دن ہوا اور وہ بھی مقالہ کی شکل میں نہیں بلکہ زبانی اور اس طرح دو دن لاہور جیسے شہر کی فضا میں ابوالکلام کے علم و فضل کا ڈنکا بجا۔

ڈاکٹر صاحب کی بجا طور پر خواہش تھی اور ہر شخص اپنے قافلہ کے لئے ایسی خواہش رکھتا ہے کہ اس کے ساتھیوں میں اضافہ ہو گو کہ میرا معاملہ ایسا ہے کہ

؎ در جبیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

لیکن بہت سے دوسرے حضرات سمیت ڈاکٹر صاحب بھی "خوش فہمی" کا شکار تھے اس لئے انہوں نے باقاعدہ اپنے ساتھ مل کر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں چونکہ قلباً ذہناً اور ہر اعتبار سے دیوبندی تحریک کے اس حصہ کا خادم تھا اور ہوں جسے مولانا نانوتوی، شیخ الہند اور مولانا مدنی کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس لئے سوچتا تھا کہ میرا عملی تعاون اور اقدام میری روایات کے خلاف تو نہ ہوگا۔

احقر ۱۹۶۲ء سے مسلسل بے جگری سے جمعیۃ علماء اسلام کا کام کر رہا تھا ۱۹۷۸ء میں اس میں تعطل پیدا ہوا اور چندے بعد دل پر پتھر رکھ کر اپنی محبوب جماعت اس کے مقاصد سے اتفاق رکھنے کے باوصف علیحدگی اختیار کر لی۔ اور اس علیحدگی کے اسباب ایسے ہیں کہ اب ان کا دہرانا بے سود ہے۔ جمعیۃ سے اس اختلاف کے باوجود "خدام الدین" کی خدمت جاری رہی لیکن ۱۹۸۴ء کی ابتدائی گھڑیاں "نئی نسل" کے مخصوص حالات کے سبب اس تعلق کے انقطاع کا بھی سبب بن گئیں تو میں نے گوشہ نشینی کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب مسلسل دعوت دیتے رہے تا آں کہ چند ماہ قبل اپنی انجمن کے علمی پرچہ کے لئے انہوں نے قلمی تعاون کی فرمائش کی جسے میں نے قبول کر لیا اور بعض اہم موضوعات پر لکھا جن میں سے بعض مضامین پر بعض اہل نظر نے مبارک کے پیغام بھیجے۔ م

شب و روز چل رہے تھے کہ موجودہ رمضان سے قبل ڈاکٹر صاحب نے ایک نئی دعوت دی (پرانی اپنی جگہ پر قائم تھی) کہ انجمن کے دو سالہ تدریسی نصاب میں بطور مدرس شرکت کر لو۔ گو کہ مجھے اچھے اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی لیکن روایتی نالائقی اور بعد میں تدریس سے وابستگی نہ ہونے کے سبب گھبرایا ضرور لیکن بعد از رمضان اس بات کو قبول کر کے حدیث اور فقہ کے دو سبق میں نے اپنے ذمہ لے لئے جن کی تدریس کا فی الوقت تیسرا ہفتہ ہے، منتخب طلبہ کی ایک کلاس اور پرسکون ماحول میں یہ تجربہ میری زندگی کا خوش گوار تجربہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ تدریسی اور تعلیمی کوتاہی کی میں جلد ہی تلافی کر لوں گا۔ اپنے اساتذہ بالخصوص مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھویؒ، مولانا محمد سرفراز خان صفدر، مولانا فیض احمد، مولانا محمد صدیق اور مولانا محمد عثمانؒ کی اس وقت کی دعائیں، سرپرستی اور شفقت اور ان کے انفاسِ طیبہ کی گرمی میرے شامل حال ہے اور الحمدللہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ مسندِ تدریس پر بیٹھ کر اپنا فرض ادا کرتا ہوں (اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس راہ کی مشکلات آسان فرما کر علم و معرفت کے دروازے کھول دے)

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

تنظیم کے معاملہ میں ان کی دعوت مسلسل موجود تھی اور روز بروز اس میں شدت ہو رہی تھی۔ اپنی تحریرات انہوں نے مجھے دیں، اپنے ناقص علم و فہم کے مطابق انہیں بھی دیکھا۔ سوچ بچار بھی کی۔ رمضان المبارک اور بعد میں استخارے بھی کئے اور اس طرح امکانی حد تک اپنا فرض ادا کر کے اس میں شمولیت کا اعلان اور کلی تقاضا پورا کر لیا۔

میں آئندہ چل کر اس موضوع پر کھل کر لکھنے کا قصد رکھتا ہوں لیکن اس موڑ پر اتنی بات عرض کرنا چاہوں گا کہ اس وقت ہمارے ملک میں متعدد تنظیمیں موجود ہیں۔ سیاسی، سماجی، دینی اور مختلف حوالوں سے ہر جماعت میں شمولیت اور اس کے نظم کے کچھ ضوابط ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں اس کا انداز و طریق بیعت کا ہے جس پر بحث برائے بحث کی حد تک تو بہت گفتگو ہو سکتی ہے لیکن بحث کو اگر سمیٹا جائے تو بات اتنی رہ جاتی ہے کہ فارم رکنیت کا پُر کرنا، حلف نامہ اور بیعت سب ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ بیعت کی پشت پر مسلمہ تاریخی روایات ہیں۔ اس میں تقدس کا ایک پہلو ہے اور کارِ خیر کی غرض سے ایسی روایت کو اپنانا خیر کے راستوں کی کشادگی کا باعث بن سکتا ہے۔

رہ گیا معاملہ انتخاب و انقلاب کا تو پاکستان کی تاریخ میں چند اچھے برے جو انتخاب ہوئے ان کے نتائج سے صرفِ نظر ممکن نہیں اور یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ اس راہ سے معاشرہ میں خیر کا غلبہ، عدل و انصاف کا چلن، اخلاقی روایات کی عظمت و بلندی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی مخلوق کے حقوق کی حفاظت کا داعیہ پیدا ہونا ناممکن ہے۔

اس کے لئے عزیمت و استقامت کی راہیں اور اللہ تعالیٰ سے جان و مال کے سودے کے ہی مؤثر ذریعہ ہوسکتی ہے۔ تاریخ میں ایسی کوششیں اہلِ نظر نے کیں (جن کا ذکر آئے گا) تسلیم کہ راستہ کٹھن اور مشکل ہے لیکن اگر کچھ لوگ پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس راہ پہ چلنے کا عزم رتے ہیں تو دبی زبان سے ان پر بغاوت و فساد کی پھبتی کسنا انصاف اور شیوۂ اہلِ نظر نہیں؛

ملکی دستور و آئین میں ہر شخص ایک نظم بنانے اور اس کے ذریعہ ملکی معاملات میں تبدیلی کا جاز ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس تبدیلی کے لئے مروّجہ راہوں سے ہٹ کر ایک ایسی راہ اختیار کرتا ہے جس کے لئے بہر حال تاریخی نظائر موجود ہیں تو اس کو پھبتی کے انداز میں یاد کرنا مناسب نہیں۔ ہاں اس کے افکار و انداز میں شرع و قانون کی رو سے جھول یا غلطی ہے تو اسے سمجھانا مناسب ہے۔

میں نے دیانت داری کے ساتھ جو محسوس کیا اس کے بعد اس راہ پہ قدم بڑھایا۔ گو کہ میرا اصل دائرہ عمل تدریس و تحریر ہے دیثاق کی مجلس ادارت میں شمولیت اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اور غالباً ایسا اس لئے ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے میری کوتاہ ہمتی اور جسمانی ضعف و اضمحلال کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے آسان ذمہ داری سونپی۔

تدریس کا کام میں نے چند ماہ مولانا عبد الحکیم کے مدرسہ فرقانیہ پنڈی میں کیا۔ پھر لاہور جب آیا تو مولانا عبید اللہ انور کی زیرِ نگرانی شیرانوالہ کے مدرسہ قاسم العلوم میں دو سال یہ خدمت بھی انجام دی۔ بعد میں یہ مدرسہ بند کر دیا گیا تو میں نے لاہور کے چند مدارس سے درخواست کی لیکن شاید میرے گناہ ایسے تھے کہ کسی نے اپنے پاکیزہ ماحول میں میرا دخل اندازہونا پسند نہ کیا ہاں دو سال سے محبِ گرامی قاری محمد عبد القیوم صاحب کے مدرسہ جامعہ صدیقیہ گلشنِ راوی سکیم ملتان روڈ سے تدریسی رابطہ ہے جس کی اب بھی ایک شکل بحمد اللہ موجود ہے کہ اس مدرسہ سے مجھے قلبی لگاؤ ہے۔

رہ گیا تحریر کا معاملہ تو بچپن سے اوٹ پٹانگ لکھنا شروع کیا۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی سے لے کر "الحق" اکوڑہ خٹک، "شمس الاسلام" بھیرہ، سہ ماہی منہاج لاہور، سہ ماہی "المعارف" لاہور، ہفت روزہ "حرمت" راولپنڈی، ہفت روزہ "ترجمانِ اسلام" لاہور، ہفت روزہ "لولاک" فیصل آباد، روزنامہ "مشرق" وا ہ

اور جٹان لاہور تک میں مختلف حوالوں سے لکھا اور بہت ، اور جو بیڑ لکھا ہوا دوسروں کے نام سے چھپا اس کی داستان طویل بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔

لکھنے میں علمی، فکری اور سیاسی سبھی عنوانات پر لکھا بعض کتابوں کے تراجم ہوئے جو چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں بعض کا ترجمہ ہو رہا ہے بعض مستقل تالیفات زیر تجویز تھی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر خدام الدین کی دس سالہ خدمات اور مولانا انور کی سرپرستی نے بہت کچھ سکھا دیا۔ اللہ کے کرم، اساتذہ، والدین، بزرگوں اور مخلصین کی دعاؤں سے توقع ہے کہ وہ میری بے کسی کی لاج رکھ کر معاملہ فہمی، جرأت و بے خوفی اور دیانت سے میثاق و حکمت قرآن کی خدمت کی توفیق بخشے گا (سب حضرات سے محتاج دعا ہوں)

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک بات کی وضاحت ضروری ہے، اگر بھر لمبی زبانیں تو ہر کسی کے خلاف کھلتی ہیں، اس کا تو مجھے ڈر ہے نہ خوف، بلکہ بے پر کی اڑانے والوں کا ممنون ہوں کہ ان کے سبب میرے گناہوں کی معافی کی شکل بنے گی۔ لیکن سب نوٹ کر لیں کہ اگر کبھی "علوی" نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب اس کی جائز آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں یا بنیادی عقائد و افکار میں ان کی راہیں الگ ہو رہی ہیں تو افہام و تفہیم کے ذریعے سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ نہیں تو

ما بخیر شما بسلامت!

یہ بات میں نے تنظیم اسلامی، لاہور کے ایک اجتماع میں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں کہہ دی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ۔ کیونکہ میں آنکھیں کھلی رکھ کر چلنے کا عادی ہوں۔ اور اسی کی اللہ تعالیٰ سے توفیق چاہتا ہوں۔ میرے مسلک و مشرب میں غیر مشروط اطاعت صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محترمؐ کی ہے۔ باقی معاملہ اطاعت فی المعروف اور تعاون علی الخیر کا ہے اور بس۔

اس سے الگ کچھ ہوا تو سب دیکھ لیں گے کہ جس نے بعض قدآور حضرات سے سالوں کے تعلقات آنِ واحد میں منقطع کر لئے وہ یہاں بھی دیر نہیں کرے گا ——— مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو سراہا اور برا نہ منایا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کوئی شخص جو کسی بڑے مقصد کے لئے کوئی قافلہ لے کر نکلا ہو۔ اسے برا منانا

بھی نہ چاہیئے اور کسی وقت بھی "خود اعتمادی" میں اس حد تک آگے نہ جانا چاہیئے / "عقلِ کل" سمجھ کر دوسروں کو "بونا" قرار دینے لگے۔ جب بھی کسی "رہنما" نے رویہ اختیار کیا تو اس کی بنائی ہوئی عمارت دھڑام سے گر کر رہ گئی۔ جس کی ان گنت مثال اگلے حصے میں آئیں گی۔ حقیقت کے اظہار میں بخل سے کام نہ لینا چاہیئے۔ ابھی تک تو ڈاکٹر میں سننے، مشورہ کرنے اور اس پر غور کرنے بلکہ بوقتِ ضرورت "رجوع" کرنے کی عادت ہے۔ (کل کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے) اللہ کرے کہ معاملہ اسی طرح رہے۔ ایسا رہا تو بڑی خیر و برکت ہوگی۔ ورنہ ایک نیا المیہ رونما ہوگا۔ جس سے اہلِ دین کو ایک نئے صدمے سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اللہ رب العزت اپنے کرمِ بے پایاں سے معتقداتِ دینی پر ثابت قدمی کی توفیق سے نوازیں۔ اعمالِ خیر کی بہتر سے بہتر توفیق نصیب ہو۔ اسلاف کا ورثہ فکری و علمی ہماری نگاہوں کے سامنے رہے، اس کی قدر اور اس سے استفادہ کی توفیق نصیب ہو اور ہر قسم کے زیغ و ضلال سے بچائے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَ
هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ

الہدیٰ

نشست ۲۴

اثباتِ آخرت

سورہ قیامہ کی روشنی میں

(درسِ ہشتم)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۱)

السلام علیکم۔ نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۗ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۗ بَلٰى قٰدِرِیْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ○ (سورۃ القیامہ آیت ۱ تا ۴)

صدق اللہ العظیم ○

"نہیں! قسم کھاتا ہوں میں قیامت کے دن کی، اور نہیں! قسم کھاتا ہوں میں اُس ضمیر کی جو انسان کو اسکی بدی پر ملامت کرتا ہے۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اسکی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اسکی ایک ایک پور کو درست کر دیں۔"

محترم حاضرین و معزز ناظرین!

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا درس ان مجالس میں سلسلہ وار ہو رہا ہے اس کا درس نمبر ۸ سورہ قیامہ مکمل پر مشتمل ہے۔ جس کی ابتدائی چار آیات کی تلاوت آپ نے ابھی سماعت فرمائی اور ان کا ترجمہ بھی سنا۔ یہ سورہ مبارکہ جو دو رکوعوں اور چالیس آیات پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم کے انتیسویں پارے کے آخر میں درج ہے۔ سورہ تغابن پر اُن چار دروس کی تکمیل ہو چکی ہے جن میں ایمانیات ثلاثہ کا بیان جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ یعنی ایمان باللہ۔ ایمان بالمعاد یا ایمان بالآخرہ اور ایمان بالرسالت ــــ لیکن چونکہ ہمارے دین کے اعتقادی نظام میں یا یوں کہیے کہ اسلام کی فکری اور نظریاتی اساسات میں قیامت اور آخرت پر ایمان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ ایک مکمل سورتِ مبارکہ کا درس خاص اسی موضوع پر اس منتخب نصاب میں شامل کیا جائے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قیامت اور آخرت کے ضمن میں قرآن حکیم کی نسبتاً چھوٹی سورتوں میں جامع ترین سورت سورۃ القیامہ ہے۔

اس سے قبل کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کے مضامین اور مفاہیم و مطالب پر غور کریں، ایمان بالآخرت کے ضمن میں بعض تمہیدی باتیں نوٹ کر لینی چاہئیں۔

قیامت اور آخرت پر ایمان کا معاملہ کتنی اہمیت کا حامل ہے، اسکا اندازہ قرآن مجید کے ہر پڑھنے والے کو بہ آسانی ہو جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ قرآن کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جس میں آخرت کا ذکر نہ ہو اور شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو کہ جس میں جزا و سزا، بعثِ بعد الموت، حساب کتاب، جنت دوزخ میں سے کسی کا ذکر نہ ہو ــ ان مقامات کا بھی اگر ہم دوبارہ سرسری جائزہ لے لیں جن کا ان دروس کے سلسلے کی مجالس میں ہم مطالعہ کر چکے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہر ایک میں آخرت کا ذکر موجود ہے ــ ہمارا درس نمبر ایک سورۃ العصر پر مشتمل تھا، اس میں تو ایک جامع اصطلاح کے طور پر ایک لفظ آیا تھا: اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ــ اس کی کوئی تفصیل نہیں تھی ــ لیکن دوسرے ہی درس میں جو آیۂ بر پر مشتمل ہے، ہم نے دیکھا کہ ایمان باللہ کے فوراً بعد یوم الآخر پر ایمان کا ذکر

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اس کے بعد ذکر ہوتا ہے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۔ ہمارا تیسرا سبق جو سورہ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل تھا، اس میں ایک تو قانون مجازات ومکافات کا ذکر ہے جو بڑے جامع الفاظ میں حضرت لقمان کی وصیت میں آیا ہے: يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ "اے میرے بچے! اس حقیقت کو ذہن نشین کرلے کہ انسان کے عمل کو خواہ وہ نیکی ہو یا بدی - پھر خواہ وہ رائی کے دانے کے ہم وزن ہو، پھر خواہ وہ کسی غار اور چٹان کے اندر چھپ کر کیا جائے خواہ فضاؤں، خلاؤں میں جاکر یا زمین کی گہرائیوں میں اتر کر کیا جائے، اللہ اس کو لے آئے گا" اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ "اللہ بہت باریک بین ہے، باخبر ہے"۔ اس کے علاوہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس رکوع میں ایک جگہ یہ الفاظ آئے: اِلَيَّ الْمَصِيْرُ - "میری ہی طرف لوٹنا ہے"۔ اور دوسری جگہ یہ الفاظ: ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ "پھر میری ہی طرف تم سب کو آنا ہے، پھر میں تم سب کو جتلا دوں گا وہ سب کچھ جو تم کرتے رہے ہو"۔ چوتھا درس سورۃ الفاتحہ پر مشتمل تھا - اس میں تو ایک عظیم آیت مبارکہ اسی حقیقت کبریٰ کے اظہار کے لئے وارد ہوئی ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ - "وہ اللہ جزا و سزا کے دن کا مالک ہے"۔ پانچواں سبق سورہ آل عمران کی ۱۹۰ تا ۱۹۵ آیات پر مشتمل تھا - اس میں آپ نے دیکھا کہ کس شدّ و مد کے ساتھ آخرت کا ذکر آیا ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ "اے ہمارے رب! یہ سلسلۂ کون ومکان تو نے فضول اور بیکار پیدا نہیں کیا ہے - تو پاک ہے منزہ ہے اس سے کہ کوئی بے مقصد اور عبث کام کرے - پس اے ہمارے پروردگار! ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لیجیو۔ تو نے جس کو دوزخ میں ڈالا اُسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈالا

اور پھر ایسے ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہ ہوگا!" — آگے چل کر الفاظ آئ
وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ — پھر آگے چل کر ا
نے اپنے فرماں بردار بندوں سے بایں الفاظ وعدے فرمائے : لَاُكَفِّرَنَّ
سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ "میں لاز
نیکوکار بندوں کی برائیاں اُن سے دور کر دوں گا اور میں لازماً ان کو ان با
میں داخل کر دوں گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں" — تو آپ د
رہے ہیں کہ اس میں کتنا زور ہے، کتنا EMPHASIS ہے
قیامت و آخرت کے بیان اور ایمان پر — اس کے بعد ہم نے سورۂ نو
کے پانچویں رکوع میں پھر دیکھا : يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ
الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ "اللہ کے نیک اور محبوب بندے لرزاں
ترساں رہتے ہیں، ڈرتے رہتے ہیں اُس دن کے خیال سے جس دل
اور نگاہیں دونوں الٹ جائیں گے" — سورۂ تغابن کا جو ہمارا پچھلا درس
اس میں تو بلاشک و شبہ یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج CLIMAX پر
پہنچ گیا — اس کی تیسری آیت ختم ہوتی ہے ان الفاظ مبارکہ پر : وَاِلَيْهِ
الْمَصِيْرُ ۝ "اور اسی اللہ کی طرف لوٹ جانا ہے" — آگے ساتویں آیت
پہلے تو منکرینِ قیامت کا یہ اعتراض یا مغالطہ نقل کیا گیا : زَعَمَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ "ان منکرین کو یہ مغالطہ لاحق ہ
ہے کہ انہیں اٹھایا نہ جائے گا!" پھر نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا : قُلْ بَلٰى
وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ
"اے نبی کہہ دیجئے کیوں نہیں! مجھے میرے پروردگار کی قسم ہے تم لازماً اٹھ
جاؤ گے اور پھر تم لازماً جتلا دیئے جاؤ گے جو کچھ تم کرتے رہے تھے — او
پر بہت آسان ہے" — پھر آگے چل کر اسی سورۂ مبارکہ میں فرمایا
يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ "جان لو کہ وہ دن
دن کہ وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن — وہ ہے اصل ہار جیت
کے فیصلے کا دن" — اس روز جو کامیاب قرار دیا گیا وہ کامیاب ہ

ی کامیابی کا ذکر اسی آیت کے آخر میں بایں الفاظ مبارکہ فرمایا گیا : وَ
یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○ — اور جو ناکام قرار پائے گا جو ناکام و خاسر رہے گا وہ
جس انجام بد سے دوچار ہوگا اس کا بیان اگلی آیت میں بیان کر دیا گیا :
وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۭ وَ
بِئْسَ الْمَصِیْرُ ○

یہ میں نے ایک جائزہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے کہ جو مقامات اب تک ہم نے پڑھے ہیں، ان میں کس قدر شد و مد کے ساتھ بعث بعد الموت، قیامت اور آخرت کا ذکر آ چکا ہے — ایک نکتہ، ایک POINT اور بھی نوٹ کر لیں کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایک تقابل سامنے آتا ہے کہ اور دوسرے ایمانیات کے لئے لفظ ایمان آیا ہے وہاں آخرت کے لئے عموماً لفظ یقین کا استعمال ہوا ہے — جیسے سورہ بقرہ کے آغاز ہی میں فرمایا گیا :
وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ○ معلوم ہوا کہ ایمان بالآخرہ پر اس درجہ کی شدت مطلوب ہے جس کو لفظ یقین میں ہم دیکھتے ہیں — آخرت پر ان کا یقین ہے —

یہ بات اس سے پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اصولی اور نظری اور منطقی اعتبار سے ایمان اصل میں نام ہے ایمان باللہ کا — یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان مجمل میں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے : اٰمنت باللہ کما هو باسمائه وصفاته وقبلت جمیع احکامه — اقرارٌ باللسان وتصدیقٌ بالقلب — واقعہ یہ ہے کہ ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت دونوں ایمان باللہ کی فروع ہیں، اس کی شاخیں ہیں اس کی (COROLLARIES) ہیں — ایمان بالآخرت اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا مظہر ہے، ایمان بالرسالت اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت کا مظہر ہے لیکن اگر عملی اور اخلاقی اعتبار سے غور کیا جائے تو سب سے مؤثر ایمان، ایمان بالآخرت ہے۔

جزا و سزا کا یقین ہوگا۔ جنت و دوزخ کا یقین ہوگا تو انسان کے رویہ میں عملاً تبدیلی آئے گی۔ اور اگر اس میں کوئی کمی ہوئی تو ایمان باللہ بھی ذات و صفات کی ایک علمی بحث بن کر رہ جائے گا۔ ضمناً یہ بھی جان لیجئے کہ قانونی، فقہی اور شرعی اعتبار سے اہم ترین ایمان، ایمان بالرسالت ہے۔ ایمان باللہ اُسی وقت معتبر ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ کو اُن اسماء و صفات کے ساتھ مانا جائے جن کی خبر ہمیں دی ہے محمد رسول اللہ نے ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایمان بالآخرت بھی معتبر ہوگا جبکہ بعثِ بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ کی ان تفاصیل کو مانا جائے جن کی خبر دی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے —

یہ بھی جان لیجئے کہ انکارِ قیامت یا انکارِ آخرت کی متعدد شکلیں ہیں۔ مثلاً ایک تو صاف اور صریح انکار ہے کہ مرنے کے بعد کوئی جی اٹھنا نہیں ہے، کوئی آخرت نہیں ہے۔ اس کو آپ الحاد کہیں گے — اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ خاص اسی دور کا امتیاز ہے۔ اس خیال کے لوگ اُس وقت بھی موجود تھے جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا۔ اُن کا قول قرآن مجید میں نقل ہوا ہے: وَقَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا — "اور لوگ کہتے ہیں کہ نہیں ہے کوئی زندگی سوائے ہماری اس دنیا کی زندگی کے، ہم خود ہی مرتے ہیں، خود ہی جیتے ہیں —" وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ ج۔ "اور ہمیں ہلاک کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے سوائے گردشِ افلاک کے" یہ وہ دہریت ہے جس کا پورا خلاصہ اس ایک آیت کے اندر قرآن مجید میں نقل کر دیا گیا۔ تو یہاں آخرت کا صریح و واضح انکار ہے۔ ایک دوسرا درجہ ہے کہ نہ اقرار ہے نہ انکار ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ نتیجہ پھر انکار ہی کا ہے۔ قرآن مجید میں یہ بھی چند لوگوں کے قول کے بطور نقل ہوا ہے: وَاِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۔ "آخرت کا کچھ گمان سا تو ہوتا ہے کہ شاید ہو لیکن اس پہ ہمارا دل نہیں ٹھکتا۔ یقین پیدا نہیں ہوتا" جب یہ صورت ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ انسان کا طرزِ عمل تو اُن ہی لوگوں کے مشابہ ہوگا جو آخرت کو مانتے نہیں

تو یہ نہ انکار اور نہ اقرار کی صورت نتیجۃً انکار ہے۔ ۳۔ اور سب سے خطرناک صورت تیسری ہے کہ بظاہر اقرار ہے پورے طور پر۔ لیکن اسکے ساتھ کچھ ایسی باتیں مانی گئی ہیں کہ جن کے نتیجہ میں وہ اقرار، وہ ایمان بالآخرہ بالکل غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ اس کا انسان کے عمل پر، اس کے اخلاقی رویہ پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا۔

اس تیسری صورت کی بھی تین ہی شکلیں ممکن ہیں۔ سب سے پہلے شفاعت باطلہ کا تصور ہے کہ آخرت ہوگی تو سہی، لیکن ہماری دیویاں ہیں، ہمارے دیوتا ہیں، کچھ بزرگ اور مقربین بارگاہِ الٰہی ہستیاں ہیں، وہ ہمیں وہاں چھڑا لیں گی۔ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ ۔ "یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی بنیں گے" اور یہ اللہ کے بڑے لاڈلے ہیں، بڑے چہیتے ہیں، ان کا کہنا اللہ نہیں ٹال سکتا۔ معلوم ہوا کہ اس شکل میں بھی آخرت کا ماننا نہ ماننا برابر ہو گیا۔ قرآن مجید میں ایک شکل یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ کچھ مرفہ الحال لوگ، دولت مند لوگ، خوش حال لوگ، آسودہ حال لوگ، اپنی دولت مندی، آسودہ حالی کو دلیل بناتے تھے کہ ہم تو اللہ کے چہیتے ہیں ہم پر تو یہاں اس دُنیا میں بھی اللہ کا فضل ہو رہا ہے۔ اس نے ہمیں یہاں دولت دی ہے، عزت دی ہے لہٰذا ہم وہاں بھی عزت پائیں گے قطع نظر اس سے کہ ہمارے اعمال کیا ہیں۔ سورہ کہف میں دو افراد کے مکالمہ کے ضمن میں بیان ہوا: وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا "۔ اوّل تو پتہ نہیں کہ اللہ کی طرف لوٹنا ہے یا نہیں ہے لیکن اگر بالفرض لوٹنا ہو بھی گیا تو میرے پروردگار نے جو کچھ مجھے یہاں دیا ہے وہاں مجھے اس سے بھی بہتر دے گا"۔ اور آخری شکل جو سب سے زیادہ لطیف لیکن اتنی ہی زیادہ خطرناک بھی ہے۔ وہ یہ کہ شیطان انسان کو دھوکہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی اور شان غفاری کے حوالے سے کہ وہ بڑا بخشن ہار ہے، وہ بڑا بندہ نواز ہے، وہ رحیم ہے، وہ کریم ہے، وہ غفور ہے۔ لہٰذا وہ ہمیں معاف کر ہی دیگا۔ آخری پارے میں ایک پوری سورۃ ہے

جس کا مرکزی خیال یہی ہے : یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِ
"اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈا
دیا ہے!" — وہ جہاں غفور ہے اور رحیم ہے، وہ وہاں عادل بھی ہے،
وہاں سزا دینے والا بھی ہے، وہ ذوالانتقام بھی ہے - شدید الانتقام بھی
وہ نافرمانیوں پر بدلہ لینے والا بھی ہے سخت بدلہ -

تو یہ مختلف شکلیں ہیں - میں نے ان کا اختصار کے ساتھ تجزیہ آ
آپ کے سامنے رکھ دیا کہ ہم اپنے ذہنوں کا بھی جائزہ لیں مبادا ہمارے قل
و اذہان میں بھی اس قسم کے کسی وسوسے اور موہوم خیال کا عکس موجود
کہیں ایسا نہ ہو کہ بظاہر ہم مطمئن ہوں کہ ہم تو آخرت کے ماننے والے
لیکن غیر محسوس طور پر ہمارے تحت الشعور میں یہ مغالطے موجود ہوں
کا بھی میں نے ذکر کیا - اور حقیقی ایمان بالآخرت کے جو اثرات ہما
سیرت پر، ہمارے کردار پر، ہماری روش پر، ہمارے رویّہ پر، ہمارے اع
اور معاملات پر اس سبب سے ظاہر نہ ہو رہے ہوں کہ ہم نے اس ا
کے ساتھ کوئی ایسی چیز بھی مانی ہوتی ہے جس نے اس ایمان بالآخرت
مؤثر کر کے رکھ دیا ہو -

یہ تمام باتیں جو آج عرض کی گئی ہیں، تمہیدی نوعیت کی ہیں -
القیامہ کا مطالعہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم اگلی نشست سے شروع کر
اگلی نشست میں ہم اس پوری سورہ مبارکہ کی تلاوت کریں گے اور
ایک رواں ترجمہ دیکھیں گے - اس کے بعد اس کے اہم نکات پر اللہ نے
محدود وقت کے پیش نظر ممکنہ حد تک تفصیلاً گفتگو ہو گی - فی الوق
جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کے ضمن میں کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں
ہوں -

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب! آخرت میں جزا و سزا کا جو تصور قرآن
کیا اس کا مقصود یہ ہے کہ اس دنیا میں ہماری معاشرتی اور اجتماعی

ترسے بہتر ہو؟
واب: آپ کا سوال اس لحاظ سے تو درست ہے کہ آخرت کے عقیدے
ر آخرت پر ایمان رکھنے کا اثر دنیا میں ہمارے رویّے پر مترتب ہونا چاہیئے۔
ی تو میں نے عرض کیا ہے کہ انسان کی سیرت پر، اس کے کردار پر، اس کے اخلاق
اور اس کے اعمال و معاملات پر سب سے زیادہ اثر ایمانیاتِ ثلاثہ میں سے
ان بالآخرت ہی کا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا مقصود صرف دنیا ہی میں ہماری
تاعی زندگی کی بہبود نہیں ہے بلکہ محاسبہ اُخروی میں سرخرو ہونا اور کامیاب
نا بھی ہے جو ہماری دنیوی زندگی کے رویّہ ہی سے متعلق، مربوط اور منسلک
ہے۔ ایک ضروری بات کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے وہ یہ کہ آپ نے اپنے
وال میں ایک لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ یہ صرف تصوّر نہیں ہے بلکہ واقعہ
ہے۔ اگر اس کو تصوّر قرار دیا جائے گا پھر تو جو مقصود آپ کے پیشِ نظر ہے وہ
ی حاصل نہیں ہوگا۔ وہ بھی اُسی وقت حاصل ہوگا جب کہ یہ یقین ہو کہ
رت فی الواقع ظہور پذیر ہو کر رہے گی۔ انسان کو لازماً آخرت میں اللہ
لے کے حضور میں اس دنیا کی زندگی کے محاسبہ کے لئے کھڑا ہونا ہوگا۔
بہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے
بات پر زور دیا گیا ہے: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ وَاِنَّ الدِّيْنَ
قِعٌ ۙ" جس قیامت و آخرت کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل برحق
سچ ہے۔ اور جزا و سزا کا دن لازماً واقع ہو کر رہے گا۔" لہٰذا اس
ں ایک تصوّر کہہ کر ہلکا نہ کر دیجیئے۔ یہ ایک واقعہ ہے جو لازماً ظہور پذیر
اور اس کا علم اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولوں اور اپنی کتابوں کے ذریعہ
ہیں پیشگی عطا فرما دیا ہے تاکہ ہمارے تمام اعمال کا اصل محرک آخرت
اللہ کی رضا کا حصول بن جائے۔

ل: ڈاکٹر صاحب! قیامت سے مراد اس دنیا کی تباہی ہے یا
ت کا اختتام ہے؟

، دیتا ہوں - اصل میں تین مراحل ہیں - ایک اس دنیا کی تباہی کا مرحلہ
- پھر ایک بعث بعد الموت کا مرحلہ ہے - جس میں جزا و سزا کے فیصلے ہونگے -
مُ التَّغَابُنِ ہ یَوْمُ الدِّیْنِ - پھر اس کائنات کے آخری انجام کا مرحلہ
، جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے - قرآن مجید زیادہ تر گفتگو پہلے
رحلوں کے بارے میں کرتا ہے - ایک تو اَلسَّاعَۃ ، جب ایک بڑی ہل چل
ی، ایک بڑی تباہی آئے گی، دنیا کا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔
جرامِ فلکیہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے
ند ہو جائیں گے - ایک نقشہ تو یہ ہے اَلسَّاعَۃ - اسے قرآن بہت سے
دں سے موسوم کرتا ہے - جیسے اَلْقَارِعَۃ ہ اَلْحَاقَّۃ ہ اَلطَّامَّۃ ہ اَلطَّاغِیَۃ
برھا - اس کے بعد ہے بعث بعد الموت کا مرحلہ - تمام انسان دوبارہ
ا کئے جائیں گے - پھر انہیں ایک میدان میں جمع کیا جائے گا جہاں وہ
نے پروردگار کے حضور محاسبہ کے لئے کھڑے ہوں گے - وہ کھڑے ہونے
دن یَوْمُ الْقِیَامَہ ہے -

حضرات ! جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا، آج ہم نے سورہ
یامہ کے مطالعہ کے ضمن میں چند تمہیدی باتوں پر غور کیا ہے - ان شاءاللہ
لعزیز اگلی نشست میں ہم اس پوری سورۃ مبارکہ کی تلاوت بھی کریں گے
ور اس کا ایک رواں ترجمہ بھی بیان ہو گا جس سے اس سورت کا ایک مجموعی
اثر واضح اور روشن ہو کر ہمارے سامنے آجائے گا -

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ہ

رُوداد

سہ روزہ علاقائی اجتماع تنظیم اسلامی

(منعقدہ ۶ تا ۸ اگست ۱۹۸۵ء بمقام فیض الاسلام کمپلیکس راولپنڈی)

مرتب: عبدالرزاق

تنظیم اسلامی کے توسیع دعوت کے پروگرام کے ضمن میں ایک سہ روزہ دعوتی، تربیتی ناع ۶ تا ۸ اگست کو فیض الاسلام کمپلیکس، فیض آباد راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ جس میں ظیم اسلامی میں شامل مختلف شہروں میں مقیم رفقاء نے شرکت کی۔ یہ اجتماع علاقائی بنیاد پر مالی پنجاب، صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں رہائش پذیر رفقاءِ تنظیم کی تربیت ان علاقوں کے لوگوں تک رفقاءِ تنظیم کے ذریعے تنظیم کی دعوت پہنچانے کے لیے منعقد ا گیا تھا۔ میزبانی کے فرائض تنظیم اسلامی راولپنڈی اور تنظیم اسلامی اسلام آباد نے مشترکہ ور پر انجام دیئے۔

اس پروگرام کی تشہیر کے لیے راولپنڈی اور اسلام آباد کے رفقاء نے دونوں شہروں ں نمایاں مقامات پر بہت سے بڑے بڑے خوب صورت بینرز لگائے۔ مزید برآں سٹرز، ہینڈبل اور مقامی اخبارات میں اشتہارات کے ذریعے وسیع پیمانے پر پبلسٹی ا گئی۔

علاقائی بنیاد پر اس طور سے یہ پہلا بڑا اجتماع تھا جس کی میزبانی ہماری متذکرہ بالا تنظیمیں کر رہی تھیں۔ چنانچہ ان کی مدد کے لیے ایک ایڈوانس پارٹی میاں محمد نعیم صاحب نائب امیر تنظیم اسلامی کی قیادت میں مرکز سے اجتماع سے دو دن قبل راولپنڈی پہنچ گئی۔ اس دوران راولپنڈی/اسلام آباد کے رفقاء اپنے طور پر اجتماع کے انتظامات کو آخری شکل دے چکے تھے۔ کچھ مفید مشورے اس پارٹی کی طرف سے بھی دیئے گئے جسے ہمارے ساتھیوں نے خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیا۔

فیض الاسلام کمپلیکس کے حیات بخش ہال کو قرآنی آیات کے خوب صورت بینرز سے

بنایا گیا تھا۔ ہال کے باہر بھی مختلف مقامات پر آیاتِ قرآنی، احادیث اور علامہ اقبال مرحوم کے اشعار پر مشتمل بینرز لگائے گئے تھے۔ کمپلیکس کے صدر دروازے کے باہر پروگرام کی اطلاع کے لیے بینرز آویزاں کیے گئے تھے۔ اضافی روشنی کے لیے متعدد سرچ لائٹس کا انتظام تھا۔ رفقاءِ تنظیم مختلف علاقوں سے ۵ اگست بعد دوپہر ہی فیض الاسلام کمپلیکس پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ رفقاء کو خوش آمدید کہنے کے لیے کمپلیکس کے صدر دروازہ کے ساتھ استقبالیہ کاؤنٹر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جہاں اس پروگرام میں شرکت کی غرض سے آنے والے رفقاء و دیگر حضرات کے مختصر کوائف درج کرنے اور شرکاء کو مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کا پورا انتظام کیا گیا تھا۔ کوائف کے اندراج کے فوراً بعد ہر شریکِ اجتماع کو تعارفی بیج ( ) اور طعام گاہ کے لیے کارڈ مہیا ( ) کر دیا جاتا تھا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کے ساتھی جناب محمد نعیم صاحب جناب نذیر احمد صاحب اور جناب ابوہریرہ صاحب ساتھیوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہر وقت استقبالیہ پر موجود رہتے تھے۔

۵ اگست کی شام کو کمیونٹی سنٹر، اسلام آباد میں امیرِ تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ماہانہ درسِ قرآن کا پروگرام تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے سورہ عنکبوت کی منتخب آیات کے حوالے سے دین کا کام کرنے والے حضرات کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور آزمائشوں کا تفصیل سے ذکر کیا اور پھر ان آزمائشوں میں صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنے اور ثابت قدم رہنے کے لیے قرآنی ہدایات کو وضاحت سے بیان کیا۔

کمیونٹی سنٹر حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پونے دو گھنٹے تک درسِ قرآن دیا۔ حاضرین نے پورے صبر و سکون کے ساتھ درس سنا۔ تنظیم کے رفقاء نے کمیونٹی سینٹر کے صدر دروازے پر مکتبہ اور کیسٹس کا اسٹال لگا رکھا تھا۔ درس کے آغاز سے قبل اور اختتامِ درس پر اسٹال پر خاصی رونق دیکھنے میں آئی۔

دوسرے شہروں سے آنے والے کئی رفقاء اس پروگرام میں شرکت کے سبب براہ راست یہاں پہنچ گئے تھے اور یہاں سے فارغ ہو کر ہی فیض الاسلام کمپلیکس پہنچے میزبان تنظیم نے کمپلیکس کے دارالطعام میں رفقاء کے طعام کا اہتمام کر رکھا تھا۔ تمام معاملات میں نظم و ضبط کی کیفیت نمایاں تھی۔

اس سہ روزہ اجتماع کے لیے جو پروگرام طے کیا گیا تھا، اس کی تفصیلات حسبِ ذیل

روزانہ نمازِ فجر کے فوراً بعد سے ڈیڑھ گھنٹہ - رفقاء کا تعارف۔

۶-۳۰ بجے تا ۸-۰۰ بجے صبح	ناشتہ اور دیگر ضروریات سے فراغت۔
۸-۰۰ بجے تا ۱۱-۰۰ بجے "	تربیتی پروگرام
۱۱-۰۰ " تا ۱۱-۳۰ "	وقفہ چائے
۱۱-۳۰ " تا ۱-۰۰ " دوپہر	ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تنظیمی و تربیتی موضوعات پر خطاب۔
۱-۱۵ " تا ۴-۴۵ سہ پہر	نماز ظہر، کھانا، قیلولہ
نماز عصر تا مغرب	تنظیمی اُمور کا جائزہ۔
مغرب تا عشاء	خطابِ عام۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

۶؍اگست کی صبح نماز فجر کے فوراً بعد اجتماع کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہُوا۔ میاں محمد نعیم صاحب، نائب امیر تنظیم اسلامی نے کچھ رفقاء کا تعارف کروایا۔ رفقاء کے تعارف کے ضمن میں ایک سوالنامہ تیار کیا گیا تھا۔ جس میں درج ذیل سوالات کیے گئے تھے۔

(۱) اسم گرامی (۲) مقامِ رہائش (۳) تعلیمی قابلیت (۴) ذریعہ معاش
(۵) تنظیم کے نصب العین کو خود کس حد تک سمجھا ہے۔
(۶) تنظیم کی دعوت کو پھیلانے کے ضمن میں انفرادی کوشش۔

تعارف کے پروگرام کے بعد حسبِ پروگرام صبح آٹھ بجے تک ناشتے وغیرہ کے لیے وقفہ ہُوا۔ ۸ بجے رفقاء تعلیمی و تربیتی پروگرام کے لیے دوبارہ ہال میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ تعلیمی اور تربیتی پروگرام محترم ڈاکٹر صاحب کے منتخب نصاب نمبر۲ کے نو اسباق کے دروس پر مشتمل تھا۔ تین دنوں میں تین تین اسباق کے دروس کے لیے ایک ایک گھنٹہ کا درس طے کیا گیا۔ چنانچہ صبح ۸ بجے تا ۹ بجے تک چوہدری غلام صاحب قیّم تنظیم اسلامی نے اس سلسلے کا پہلا درس دیا۔ جو ایک اعتبار سے منتخب نصاب نمبر ۱ کے خلاصے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس درس میں سورۂ حج کی آخری دو آیات اور سورہ صف کی آیت ۴ اور آیات ۹ تا ۱۱ شامل ہیں۔ جن کے مطالعہ سے فرائض دینی کا جامع تصوّر اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقاصد و مراحل پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسرا درس صبح ۹ بجے تا ۱۰ بجے تک حافظ عاکف سعید صاحب، ریسرچ فیلو قرآن اکیڈمی

دیا۔ اس درس کا موضوع تھا: " اقامتِ دین کی فرضیت اور اس کے لیے زور دار دعوت"،
ں پر سورہ شوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵۔ اور آیات ۴۷ تا ۴۸ کی روشنی میں مربوط گفتگو
ی گئی ۔

تیسرا درس جناب حافظ محمد رفیق صاحب نے دیا۔ آپ بھی قرآن اکیڈمی کے ریسرچ
بورڈ میں سے ہیں۔ ان کے درس کا موضوع بہت اہم اور نازک تھا۔ انہوں نے سورہ
آل عمران آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴۔ اور سورہ توبہ آیات ۱۱۱، ۱۱۲ کی روشنی میں "بگڑے ہوئے
مسلمان معاشرے میں اسلامی انقلاب کے آخری اقدام کا عنوان نہی عن المنکر اور محافظتِ
حدود اللہ کے ضمن میں طاقت کا مظاہرہ اور چیلنج" جیسے موضوعات پر بڑی جرأت اور خوبی کے
ساتھ مدلل گفتگو کی۔

۱۱ بجے تا ۱۱½ بجے تک وقفہ رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے پھر اجتماع کی کارروائی شروع ہوئی۔
میر تنظیم اسلامی نے ایک خاکے ( ) کے ذریعے دینی فرائض کے تصور کو واضح
فرمایا اور ان دینی فرائض کی باہمی نسبت و اہمیت کو اجاگر کیا۔ مزید برآں صبح کی نشست
میں دیے گئے دروس کے باہمی ربط کے بارے میں مفید اشارات و نکات بیان فرمائے —
نمازِ ظہر کی اذان کے ساتھ یہ نشست ایک بجے اختتام پذیر ہوئی۔

بعد نمازِ عصر پروگرام کے مطابق مختلف علاقوں کی تنظیموں کے امراء نے تنظیموں
کی کارکردگی اور دعوتی سرگرمیوں کی رپورٹیں پیش کیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے خطاب عام کے لیے فیض الاسلام کمپلکس کے حیات بخش ہال
ہی میں اہتمام کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ موسمی صورتِ حال غیر یقینی تھی۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ
بھرا ہوا تھا۔ ہال کے باہر اضافی کرسیوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہال کے باہر کھلی جگہ پر لگائی
گئیں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سامعین محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب سننے میں اس قدر
منہمک تھے کہ معمولی بوندا باندی سے ان کی توجہ و انہماک میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔
البتہ جب موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تو لوگوں نے اپنی کرسیوں سمیت ہال اور ہاسٹل
کے وسیع برآمدوں میں پناہ لی۔

ڈاکٹر صاحب نے دو گھنٹے کے خطاب میں پاکستان میں اسلامی انقلاب کی ضرورت
اور اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے ان حالات کا ذکر فرمایا جن حالات میں پاکستان وجود

میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہندوؤں اور انگریزوں کی مسلمانوں سے شدید نفرت اور مخالفت کے باوجود پاکستان کا وجود میں آنا واضح طور پر ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسے بجا طور پر مملکتِ خداداد پاکستان کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب نے تصویر کا دوسرا رُخ دکھلاتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان بننے کے بعد ہم نے جس طرح آزادی کی ناقدری کی اس کی سزا کے طور پر پاکستان کا ایک بازو اس سے الگ ہو چکا ہے اور اڑتیس سال گذرنے کے باوجود ابھی تک یہ ملک اپنی بقاء اور سلامتی کے تحفظ کے لیے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن مراعات یافتہ طبقہ نے یہاں اپنے ناجائز مفادات کی حفاظت کے لیے جان بوجھ کر اسلام کے ورود کو روکا ہے۔ اور اسی کی سزا ہے، کہ آج یہ ملک وہ نہیں ہے جو قائدِ اعظم نے ہمارے سپرد کیا تھا۔ اور ظلم یہ ہے کہ آج پاکستان میں کھُلم کھلا پاکستان کو توڑنے اور کنفیڈریشن کی باتیں ہو رہی ہیں، اور اگر ہماری روش یہی رہی تو اس بچے کھُچے پاکستان کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ پاکستان کے استحکام کے لیے ان عوامل میں سے کوئی ایک بھی اس کی پُشت پر نہیں ہے جو عام طور پر ملکوں کے استحکام کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً طویل تاریخی پس منظر، قدرتی سرحدیں، وہاں کے لوگوں کا زبان، نسل، رنگ، لباس، وضع قطع وغیرہ میں ایک جیسا ہونا، مختصراً یہ کہ ان معروف عوامل میں سے کوئی بھی عامل پاکستان کے وجود اور استحکام کے لیے جواز فراہم نہیں کرتا۔ پاکستان واحد ملک ہے جو ایک نظریہ کی بنیاد پر قائم ہُوا تھا اور اس کے استحکام اور سلامتی کے لیے بھی واحد ذریعہ حقیقی اور واقعی اسلام کا نفاذ ہے۔ ایسا اسلام جو بیک وقت عوام کی ذہنی سطح کے مطابق ہو اور جسے جمہور علماء کی سند حاصل ہو۔ خطاب کے اختتام پر نمازِ عشاء باجماعت ادا کی گئی۔

۷ راگست کو حسبِ پروگرام نمازِ فجر کے بعد تعارفی پروگرام ہُوا۔ جس میں میاں محمد نعیم صاحب نے گذشتہ روز ہی کے انداز میں مزید رفقاء کا تعارف کروایا۔ ناشتے وغیرہ سے فراغت کے بعد ۸ بجے صبح دوسری نشست کا آغاز ہُوا۔ جس میں چوہدری غلام محمد صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کے چوتھے درس میں شامل آیاتِ قرآنی کے حوالے سے اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف کی وضاحت فرمائی۔ اس درس میں سورہ فتح

کی آخری آیت اور سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۴ شامل ہے۔

۹ بجے صبح اس تربیتی پروگرام کے دوسرے مقرر جناب حافظ عاکف سعید صاحب نے پانچویں درس میں شامل آیاتِ قرآنی کے حوالے سے یہ واضح کیا کہ "حزب اللہ" کی تشکیل میں فیصلہ کن عامل یہ ہے کہ حزب اللہ کے ارکان کی محبتیں اور دوستیاں صرف اُن لوگوں تک محدود رہیں جو اُن کے ہم مقصد ہوں اور اس عظیم مشن میں اُن کے ساتھ شریک ہوں۔ کسی اور کی محبت، خواہ وہ باپ ہو، بھائی ہو، بیٹا ہو، اگر اس کے مشن کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تو یہ چیز اس حزب اللہ (یا انقلابی جماعت) کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

اس درس میں سورہ مائدہ آیات ۵۰ تا ۵۶، سورہ مجادلہ آیات ۲۰ تا ۲۲۔ اور سورہ مجادلہ آیات ۱۴ تا ۱۹ شامل تھیں۔

اس پروگرام کے آخر میں حافظ محمد رفیق صاحب نے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی اور تنظیمی اساس یعنی "بیعت" کو قرآن و حدیث سے بالوضاحت بیان فرمایا۔ اس موضوع کے ضمن میں جو آیات زیرِ مطالعہ آئیں اُن میں سورہ صف آخری آیت، سورہ فتح کی آخری آیت کا پہلا جزو، سورہ توبہ آیات ۱۱۱، ۱۱۲۔ سورہ فتح آیت نمبر ۱۰ اور آیت نمبر ۱۸ شامل ہیں۔ ان آیات کے علاوہ اس موضوع سے متعلق متعدد احادیث بھی بطور حوالہ پیش کیں۔ چائے کے وقفہ کے بعد ساڑھے گیارہ بجے تا ایک بجے تک محترم ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ دروس کا باہمی ربط واضح کیا اور ان سے متعلق بعض امور کی وضاحت فرمائی۔ یہ نشست نمازِ ظہر پر اختتام پذیر ہوئی۔ بعد نماز عصر پروگرام کے مطابق آج مختلف تنظیموں کی دعوتی سرگرمیوں کی رپورٹیں پیش کی گئیں۔

بعد نماز مغرب خطاب عام میں محترم ڈاکٹر صاحب نے پاکستان میں اسلامی انقلاب لانے کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت پر زور دیا جو پوری طرح نظم (DISCIPLIN کی پابند ہو اور اس کی قوت اتنی ہونی چاہیے کہ اگر وہ ملک میں پھیلے ہوئے منکرات میں سے کسی بھی منکر کو روکنے کا حکومت سے مطالبہ کرے تو حکومت کو اس پر سنجیدگی سے سوچنا پڑے۔ اور اگر حکومت کی طرف سے اس معاملے میں اس جماعت پر تشدد کیا جائے تو اس کو بھی پورے صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کرے۔ یہاں تک کہ شدید

تشدد بھی اسے اپنے مؤقف سے نہ ہٹا سکے۔ ایسی مضبوط جماعت، بلاشبہ، بیعت سمع و طاعت ہی کی بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اگر کوئی جماعت اپنے ڈسپلن اور صبر و ثبات سے حکومت کے تشدد کو برداشت کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ تو اس کے نتیجے میں یا تو حکومت کو اس برائی کو ختم کرنا پڑے گا۔ اور اگر حکومت ایسا کرتی ہے تو فہو المطلوب اس کے بعد دوسری برائی کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ وقس علیٰ ذالک! یا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت اس برائی کو ختم کرنے کی بجائے اس جماعت پر تشدد میں اضافہ کرتی ہے تو یہی روش اس کے زوال کا باعث بن جائے گی۔ اس لیے کہ عوام میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو ظاہراً تو خاموش تماشائی ہوتے ہیں لیکن وہ لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت کی جانب سے شدید تشدد کے باوجود اس انقلابی جماعت کے ارکان صبر و ثبات کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور حق کے پرچار اور برائیوں کے خاتمے کے لیے ڈٹے ہوئے ہیں، تو اس خاموش اکثریت، (   ) کی ہمدردیاں از خود اس جماعت کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ اور یہی چیز بالآخر اس باطل نظام کی ناکامی اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کا سبب بن جائے گی۔

پروگرام کے اختتام پر نماز عشاء باجماعت ادا کی گئی۔

۸ راگست کو نماز فجر کے بعد ۶ افراد نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی ـــ تعارفی نشست کی بجائے ڈاکٹر صاحب نے مختصر خطاب فرمایا۔ ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک حسبِ معمول منتخب نصاب کے دروس کے سلسلے میں چوہدری غلام محمد صاحب نے "نظمِ جماعت کی پابندی اور اس سے رخصت اور معذرت وغیرہ" کے ضمن میں سورہ نور آیات ۶۲ تا ۶۴، اور سورہ توبہ آیات ۴۳ تا ۴۹ میں موجود قرآنی ہدایات کی توضیح و تشریح فرمائی۔ بعد میں حافظ محمد رفیق صاحب نے امیر کی اطاعت، "تنازع فی الامر اور نجویٰ جیسے اہم اجتماعی زندگی سے متعلق موضوعات پر سورہ نور آیات ۵۴ تا ۵۶۔ سورہ نساء آیت ۵۹، سورہ انفال آیت ۴۶، سورہ آل عمران آیت ۱۵۲، اور آیت ۱۵۴۔ اور سورہ مجادلہ آیات ۹ تا ۱۱ کے حوالے سے گفتگو فرمائی۔ آخر میں حافظ عاکف سعید صاحب نے سورہ شعراء آیات ۲۱۴ تا ۲۱۷، سورہ حجر آیت ۸۸، سورہ کہف آیت ۲۸،

سورہ انعام آیات ۵۲ تا ۵۴، سورہ توبہ آیت ۱۲۸۔ اور سورہ آل عمران آیت ۱۵۹ کی
روشنی میں جماعتی نظم میں امراء کا اپنے رفقاء کے ساتھ طرزِ عمل اور اس ضمن میں اُسوۂ
رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

...۔ ۱۱ بجے تا ۳۰-۱۱ بجے تک وقفہ رہا۔ ۳۰-۱۱ بجے کی نشست میں تنظیمی و تربیتی
دروس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے محترم امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد
نے فرمایا کہ اس منتخب نصاب پر خصوصاً اس کے سبق نمبر ۴، ۵، ۶، ۷ پر یہ اعتراض
ہو سکتا ہے کہ مذکورہ آیات کے مضامین نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے لیے مخصوص
ہیں اور یہ کہ ان کو عام لوگوں پر منطبق نہیں کیا جانا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان متوقع
اعتراضات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن مجید کتاب ہدایت ہے اور زندگی
کے تمام معاملات میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ دوسری جانب دین اگر قائم ونافذ
نہیں ہے تو اس کی اقامت کے لیے جدّوجہد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ایسے اہم
دینی فریضہ کی ادائیگی کے لیے قرآن مجید کا ہدایات نہ دینا قرآن حکیم کے مکمل ضابطہ حیات
ہونے کے منافی ہے۔ اور مزید یہ کہ نبی اکرمؐ نے جو انقلاب برپا کیا اس میں وہ سب
مراحل آئے جو کسی بھی انسانی انقلابی جدّوجہد میں آسکتے ہیں۔ اور قرآنِ حکیم کا ایک
قابلِ ذکر حصّہ اس انقلابی جدّوجہد کے مختلف مراحل پر دی جانے والی ہدایات پر مشتمل
ہے۔ لہٰذا وہ سب ہدایات جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم
اجمعین کو اس جدّوجہد کے مختلف مراحل پر دی گئیں ان سب کا اطلاق اس دینی جماعت
کے امیر اور مامورین پر اس استثناء کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ اطاعت امیر کو اطاعت
فی المعروف کی شرط کے ساتھ محدود کر دیا جائے۔ اس امر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے
ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ حضورؐ ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے لیکن
آپ کی رسول ہونے کی حیثیت نمایاں اور غالب نظر آتی ہے۔ اگر غور کیا جائے،
آپؐ کی زندگی کے ہر گوشے اور معاملے میں تمام نوعِ انسانی کے لیے اسوہ موجود ہے
آپؐ کی زندگی میں حکومت کے سربراہ سے لے کر ایک بیوی کے شوہر اور کسی بیٹی کے
باپ تک کے لیے بھی اسوہ اور نمونہ موجود ہے۔ اسی طرح ایک انقلابی جماعت کے
امیر کی کیا خصوصیات ہونی چاہئیں، اس کے لیے بھی حضورِ اقدس کی ذات ہی مینارہ

کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب محترم نے اس وضاحت کے بعد مذکورہ درس کے باہمی ربط کو واضح فرمایا اور چند مقامات کی مزید تشریح و توضیح فرمائی۔ اور آخر میں اس سہ روزہ علاقائی اجتماع کے اختتام کا اعلان فرمایا۔ البتہ راولپنڈی / اسلام آباد کے رفقاء کو نماز عشاء تک ٹھہرنے کے لیے کہا گیا۔ کیونکہ ابھی شام کو بعد نماز مغرب سوال و جواب کی نشست ہونا باقی تھی۔ نماز عصر کے بعد مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل صاحب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ نماز مغرب تک گفتگو ہوتی رہی۔ محترم مفتی صاحب نے نماز مغرب اور عشاء وہیں باجماعت ادا کیں۔ اور نماز مغرب کے بعد سوال و جواب کی پوری نشست میں محترم ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ اجتماع میں شریک رہے۔ نماز مغرب کے بعد سوال و جواب کی نشست کا آغاز ہوا۔ گذشتہ دو دنوں کے سامعین کی بڑی تعداد سوال و جواب کی نشست میں شرکت کے لیے موجود تھی۔ اس نشست میں سامعین کی تعداد اور ان کی دلچسپی ہماری توقعات سے بہت بڑھ کر تھی۔ ڈاکٹر صاحب محترم نے پورے صبر و سکون کے ساتھ ایک گھنٹہ سے کچھ زائد وقت تک شرکاء کے سوالات کے جوابات دیئے اور تقریباً نو بجے شب لاہور واپسی کے لیے ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔

یہ اجتماع اپنے بنیادی مقاصد یعنی رفقاء کے باہمی تعارف ان کی تربیت اور توسیع دعوت کے اعتبار سے بہت کامیاب رہا۔ راولپنڈی / اسلام آباد کے تمام رفقاء مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے اس اجتماع کے انعقاد کے ضمن میں شب و روز کام کیا۔ خصوصاً جناب محمد اکرم واسطی صاحب، ناظم اجتماع، جناب عابد اکرام اللہ صاحب، عبدالغفور رانا صاحب، محمد نعیم صاحب، ابوہریرہ صاحب اور محمد نذیر صاحب نے جس جذبے، محنت، لگن سے مہمان رفقاء کی خدمت کی، اس کا ذکر نہ کرنا ناانصافی قرار پائے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو ان کی محنت اور کوشش کا بھرپور بدلہ عطا فرمائے۔ آمین

یقیناً احسان ناشناسی ہو گی اگر ہم فیض الاسلام کمپلکس کے بانی جناب حیات بخش صاحب اور وہاں کی انتظامیہ کا شکریہ ادا نہ کریں جنہوں نے کمالِ مہربانی سے ہمیں اپنے کمپلکس میں تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچانے کا اہتمام فرمایا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و سلامتی سے نوازے۔ آمین


Freshwel
SOHAN HALWA
حلوہ جوزی
RASGULLA
مہمان نوازی کے رنگ
فریش ویل سویٹس
کے سنگ
فریش ویل سویٹس
اور حلوہ جات نہ صرف بیرون
ملک بلکہ اندرون ملک بھی
معزز مہمانوں کی تواضع، عزیز و اقارب
اور دوست احباب کو سوغات کے
طور پر دینے کے لیے خوش ذوق حضرات
احمد کی مصنوعات ہی کا انتخاب کرتے ہیں۔
احمد کے حلوہ جات پاکستان میں پہلی بار
جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر سیلوفین پیکنگ
کے ساتھ ایئر ٹائٹ ڈبوں میں پیش کئے جاتے
ہیں جس کا ڈھکن آسانی سے کھل جاتا ہے۔
ہم نے پہلی بار پاکستان میں متعارف کرایا۔
احمد
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی سائٹ کراچی۔ فون: ۲۹۳۳۹۱-۹۵
MASS

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

کی 'میثاق' میں شائع شدہ گفتگو سے متعلق

دو ۲ نہایت اہم وضاحتی خطوط

(1)

مکتوب گرامی مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ (دہلی)

گرامی قدر محترم ڈاکٹر صاحب. السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مرحوم کا انٹرویو میثاق میں نظر سے گزرا، آپ کے اور میثاق کے تعلق اس انٹرویو کی بعض باتیں بعض دینی حلقوں میں باعث شکایت بن سکتی ہیں اس لیے یہ چند سطریں میثاق میں ارکے ممنون فرمائیں،

مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کے استعفےٰ کا واقعہ اور اس کا پس منظر اس سے بالکل مختلف ہے جو ہماری آخری ایام میں مولانا اکبر آبادی کی زبان سے نکلا، اس وقت کی مجلس شوریٰ اس دور کے نہایت معتمد اور بن حضرات پر مشتمل تھی، اس شوریٰ نے اس وقت کے اہتمام پر خویش پروری کا الزام لگایا اور نہ مالی کمزوری کا صاحب کا استعفےٰ ان کے جوشیلے شاگردوں کی ایک پارٹی کی سیاست کا نتیجہ تھا — جس پارٹی سے مولانا اکبر ی کا بھی وابستہ رہے،

مولانا محمد سالم صاحب خلف مولانا محمد طیب صاحب اس الزام کی وضاحت میں خود ہی ایک بیان ارسال ے گے.

تبلیغی جماعت کے عام کارکنوں سے — خواص سے نہیں — کچھ شکایات ضرور رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود ئ اس تحریک کو مستحسن نظروں سے دیکھتے ہیں، بعض جزوی کمزوریوں کے سبب ایک بنیادی تبلیغی جدوجہد ل قدر مطعون کرنا قطعی طور پر نامناسب ہے، مولانا علی میاں صاحب ہوں یا منظور نعمانی صاحب یا دوسرے علماء

مدارس سب اس تحریک سے وابستہ ہیں، اصلاح حال کی کوشش کی جاتی ہے اور کی جانی چاہیئے۔

ایسی صورت میں جبکہ یہ تحریک اپنے سربراہ شیخ الحدیث کی بھاری بھرکم شخصیت سے محروم ہو گئی ہے اد
مولانا انعام الحسن صاحب عدالت طبع کے سبب وقت کم دیتے ہیں اس جد و جہد کو سہارا دینا ضروری ہے ۔ نہی ؟
المنکر تبلیغ کا ایک اہم رکن ہے مگر اس کی ادائیگی کے لیے صرف تبلیغی جماعت کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ باہر
علماء اس کام میں کتنا وقت دیتے ہیں ۔ وہ غور کریں، ہم غور کریں،

اکبر آبادی صاحب نے مولانا تھانوی کے بارے میں فرمادیا کہ وہ علماء کی نظروں میں مشتبہ تھے ۔
خدا جانے اس کا کیا مطلب ہے ۔ مولانا اکبر آبادی تاریخ و ادب کے آدمی تھے ، حدیث و فقہ کے آدمی
تھے ، اس لیے حدیث و فقہ کے مسائل میں مولانا کا اجتہاد اور تلفیق بین المذاہب اہل علم کو شبہ میں ڈالتی تھی۔

فقہی مسائل میں ضرورت کے لحاظ سے ترجیح اور تلفیق اصحاب فن کی ایک جماعت بحث و تذکرہ ؟
کرسکتی ہے ۔ یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا نہیں ہے علامہ اقبال نے صحیح طور پر ایک مکتوب میں لکھا ہے
اور سماجی زوال کے دور میں اجتہاد سے تقلید بہتر ہے ۔

آمین رفع یدین فاتحہ خلف الامام وغیرہ بعض مشہور مسائل عبادت میں ترجیح اور تلفیق کی کوئی اہمیت
ہے ۔ نہ یہ مسائل آج مسلم معاشرہ کو پریشان کر رہے ہیں۔

جو مسائل پریشان کر رہے ہیں وہ تمدنی، معاشی اور اجتماعی مسائل ہیں جنکو سمجھنے کی اہلیت بھی ہر مذ
میں نہیں ہے ۔ انہیں حل کرنے کی منزل تو بعد میں آتی ہے یہ مسائل جدید و قدیم اہل علم کے اجتماعی اجتہاد ؟
کرتے ہیں۔

دراصل آپ دارالعلوم دیوبند کے حالیہ قضیہ میں مولانا اکبر آبادی صاحب کا جو رویہ تھا اس سے ؟
باخبر نہیں ہیں ورنہ آپ مرحوم کو نہ چھیڑتے، مرحوم کی شخصیت اس قضیہ میں متنازع بن گئی تھی اور اس د ؟
ان کا ذہن اسی گروہ بندی سے متاثر رہا،

مولانا مرحوم کی جدائی ایک عظیم دینی اور ملی سانحہ ہے ، جوان العمر صاحبزادے کی اندوہناک وفات۔
وہ بجھتے چلے جا رہے تھے ، ۔ خدا تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

تمام اکابر و احباب کی خدمت میں سلام مسنون ۔

اخلاق حسین قاسمی
۲۴ر اگست ۸۵ء

(۲)

مکتوبِ گرامی مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ (لکھنؤ)

محمد منظور نعمانی
لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم و محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! احسن اللہ الیکم و الینا

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔ خدا کرے مزاج بعافیت ہو ۔

یاد آتا ہے کہ کسی عریضہ میں اپنا یہ حال آپ کو لکھ چکا ہوں کہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہوں ۔ اس کی
ے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرلی ہے کہ شدید ضرورت ہی سے کسی چیز کا مطالعہ کرتا ہوں ۔ دفتر الفرقان
کہہ ہے کہ جو رسائل و جرائد آتے ہیں میرے پاس نہ بھیجے جائیں ۔ تقریباً دو ڈھائی سال سے اس پر عمل
رہا ہے اور ان کے مطالعہ سے محرومی پر اپنے کو قانع کرلیا ہے ۔ اب یاد نہیں کہ کتنی مدت سے میثاق
اور اسی طرح دوسرے رسائل کی صورت بھی نہیں دیکھی ـــــ دو تین دن ہوئے مولوی خلیل الرحمن سجاد
نے ذکر کیا کہ تازہ میثاق میں آپ کا ذکر آیا ہے اس کو دیکھ لینا چاہیئے ۔ میں نے کہدیا کہ وہ مجھے پہونچا
ہوا انہوں نے پہنچا دیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ صفحہ ۱۲ اور ۱۸ پر آپ کا ذکر ہے ۔ میں نے اس کو دیکھا ۔ اس
کے بعد مولانا اکبرآبادی مرحوم کے اور آپ کے اس پورے سلسلۂ کلام کو بھی پڑھا ۔

اس وقت صرف اپنے بارے میں ضروری سمجھ کر ممکن حد تک اختصار کے ساتھ کچھ عرض کرنا چاہتا
ہوں ۔ بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ۔

میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس کا وہم اور وسوسہ بھی نہیں ہے کہ آپ نے یا اس مکالمہ کے مرتب کرنے
والے صاحب نے کوئی بات غلط طور پر مولانا مرحوم کی طرف نسبت کرکے نقل فرمائی ہوگی ۔ یا مولانا مرحوم نے
میرے بارے میں کوئی بات دانستہ طور پر غلط طور پر بیان فرمائی ہوگی ـــــ اور پورے یقین اور وثوق کیساتھ
عرض کرتا ہوں کہ جو دو باتیں میرے بارے میں لکھی گئی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ۔ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہوں گی ۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی شکل و صورت الگ بنائی ہے غالباً اسی طرح ہر ایک
کی ساخت بھی الگ ہے ۔ بعض حضرات کے متعلق میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک بات ان کے ذہن اور خیال میں
آتی ہے پھر وہ ایک واقعہ کی طرح ان کے ذہن میں مرتسم ہو جاتی ہے پھر وہ اس کو واقعہ کے طور پر بیان

فرما دیتے ہیں بلکہ لکھ بھجا دیتے ہیں ـــــ

میرا خیال وقیاس ہے (واللہ اعلم) کہ میثاق کی روایت کے مطابق مولانا مرحوم نے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی (وصی احمد خاں نہیں) کے کسی "مرید خاص" کے کسی رسالہ کے بارے میں مجھ سے متعلق جو بیان فرمایا میں اپنے حافظہ پر پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی کوئی بات مولانا مرحوم کے اور میرے درمیان کبھی نہیں ہوئی۔ میں نے یہ بات میثاق میں پہلی دفعہ پڑھی ہے ـــــ میرا خیال یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا خیال فرمایا ہوگا اور پھر وہ واقعہ کے طور پر ان کے ذہن میں قائم ہوگیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح کی بات مولانا مرحوم کی کسی اور صاحب سے ہوئی ہو واللہ اعلم !

اسی طرح صفحہ ۱۸ کی پہلی ہی سطر میں مجھ سے متعلق مولانا مرحوم کا جو بیان نقل ہوا ہے کہ (تبلیغی جماعت کے کام سے مایوس ہوکر) "وہ بھی ہٹ گئے" خیریت ہے کہ یہاں میری کسی گفتگو یا تحریر کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے ـــــ میرا قیاس اور اندازہ ہے کہ مولانا مرحوم نے یہ بات میرے اس حال اور طرز عمل سے سمجھ لی ہوگی کہ جس سرگرمی سے میں کسی زمانہ میں اس دعوت و تبلیغ کے کام میں حصہ لیتا تھا ۔ ملک کی تقسیم سے پہلے کراچی ، کوئٹہ ، قلات اور پشاور اور کوہاٹ تک کے سفر کرتا تھا اور تقسیم کے بعد بھی بنگال ، حیدرآباد اور مدراس جیسے دور و دراز علاقوں تک پھرتا تھا ۔ کچھ مدت کے بعد میرا وہ حال نہیں رہا ۔ اور ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیدا کئے ہوئے بعض دوسرے دینی و ملی مسائل کی طرف میری توجہ کچھ زیادہ رہی ۔ اور اب تو قریباً ۱۰ ۔ ۱۲ سال سے معذوری کی وجہ سے خانہ نشینی کی زندگی گذار رہا ہوں ۔ غالب گمان اور قرین قیاس یہی ہے کہ مولانا مرحوم نے میرے اس حال سے وہ سمجھا جو انہوں نے آپ سے فرمایا لیکن حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ دینی دعوت کی اس جد و جہد کے بارے میں میری فکر اور رائے میں کوئی ایسی تبدیلی کبھی نہیں آئی جس کو "ہٹ جانے" سے تعبیر کیا جاسکے ۔

اس کام کے ساتھ میرے تعلق کی سرگزشت مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس کی وفات سے قریباً ایک سال پہلے اس دینی دعوت کے سلسلہ ہی کے ایک سفر میں ایک ہفتہ ان کے ساتھ میں نے اس کام کو کچھ سمجھا تھا اور عملی حصہ لینا شروع کر دیا تھا ۔ پھر ان کے مرض وفات کے آخری چار مہینوں میں میرا زیادہ تر قیام نظام الدین دہلی حضرت کی خدمت میں رہا ۔ اس قیام کے زمانے میں حضرت کی ذات اور ان کی دعوت سے میرا قلبی تعلق بہت بڑھ گیا اور میں نے اپنے وقت کے بڑے حصے اس کے لئے گویا وقف کر دیا ۔ پھر حضرت کی وفات کے بعد قریباً ۳ ۔ ۴ سال تک یہی حال رہا ۔ اس

ہ (جہاں تک یاد ہے) غیر ارادی طور پر اس میں کچھ کمی شروع ہوئی ـــــ یہ کمی صرف عمل اور جدوجہد میں تھی۔

اس کے بعد ایک وقت آیا کہ ہندوستان کے مخصوص حالات سے پیدا ہونے والے دینی و کاموں کی ضرورت کے احساس نے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور پھر ایک مدّت تک زیادہ مشغولیت ان کاموں میں رہی لیکن دینی دعوت والے کام سے بے تعلقی کبھی نہیں ہوئی۔ پھر اب دس سال سے اس معذوری کے حال میں ہوں جو آپ کے علم میں ہے۔

اپنی گذری ہوئی زندگی کے بارے میں میرا احساس یہ ہے کہ اس کا نسبتاً اچھا اور آخرت میں زیادہ آنے والا حصہ وہی تھا جب میں نے اپنے وقت کا بڑا حصہ اس دینی دعوت کے کام کے لئے وقف کر رکھا تھا اور اس راستے میں مالی اور جانی قربانی کی توفیق مل رہی تھی۔ اپنی زندگی کے بارے میں یہ میری رائے ہے اور ہر صاحب رائے کو اس سے اختلاف کرنے کا حق ہے۔

آخری گذارش یہ ہے کہ اس عریضہ کو میثاق کی کسی قریبی اشاعت میں شائع فرما کر ممنون کرم فرمایا جائے۔ تاکہ اس کے قارئین کو میرا حال اور موقف معلوم ہو جائے۔ ولکم جزیل الشکر۔

دعا کا محتاج و طالب اور دعا گو ہوں۔ والسلام محمد منظور نعمانی


Coca-Cola
THE COCA-COLA

"سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟"

شادی بیاہ کے سلسلے کی ایک اصلاحی تحریک اور اس پر مفتی جمیل احمد صاحب کی تنقید کا جائزہ

"حسّاس"

کے قلم سے ——— بشکریہ "حرمت" اسلام آباد

۱۸۵۷ء کا حادثہ اس قدر سنگین تھا کہ الامان، ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت بالکلیہ ختم ہو گئی اور وہ غلام بن کر رہ گئے اور ان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور اس جیسے دوسرے مدارس کا قیام بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت تھی۔ مدارسِ عربیہ کی اس تحریک کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے درویشِ خدامست تھے جو شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے خاندان کے فیض یافتہ اور اس خاندان کے اساتذہ کے علوم و معارف کے وارث تھے۔ اتفاق یہ ہے کہ جناب سرسید احمد خان اور مولانا نانوتوی دونوں نے ہی مولانا مملوک علی نانوتوی سے کسبِ فیض کیا۔ لیکن دونوں کی عملی راہیں جدا تھیں۔ مولانا قاسم نانوتوی اپنے رفقا سمیت جہاد ۱۸۵۷ء میں باقاعدہ حصہ لے کر حکومت کو بچانے کی فکر کر چکے تھے اور اس میں ناکامی پر انہوں نے ان مدارس کی طرف توجہ دی۔ جن کا مقصد مسلمانوں کی روایات، تہذیب و تمدن اور ان کے علوم و فنون کی حفاظت تھی۔ ساتھ ہی وہ مسلمانوں کو جنگِ آزادی کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے جیسا کہ آپ کے سب سے محبوب شاگرد مولانا محمود حسن (شیخ الہندؒ) کے تاثرات اور ان کی جدوجہد سے ثابت ہے۔ لیکن سرسید احمد خاں مرحوم بدیسی حکومت سے تعاون کا رویہ اختیار کرنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ گویا دونوں حضرات کے مسلک میں بُعد المشرقین تھا۔ لیکن اس کے باوجود شخصی احترام تھا جس کا اندازہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خطوط اور سرسید احمد خاں کے تعزیتی نوٹ سے ہو سکتا ہے۔

مولانا نانوتوی ان کے احباب یا اخلاف کو کسی بھی دور میں کالجی تعلیم سے نفرت نہیں رہی

انہوں نے اس کے خلاف کبھی محاذ آرائی کی بلکہ مولانا کے ایک قریبی عزیز سب سے پہلے وہاں
ذمہ دار حضرات کی خواہش پر وہاں دینیات کے مدرّس بن کر گئے۔ اور پھر ہمیشہ ہی مختلف دائروں
سے تعلقات قائم رہے مولانا محمود حسن اور صاحبزادہ آفتاب احمد کے دور میں تعلقات عروج پر تھے
اور معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دھارے آپس میں مل جائیں گے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ملت کی قسمت
بدل جاتی لیکن علی گڑھ کے بعض عزیزوں کے منفی رویہ نے صورتِ حال سنبھلنے نہ دی۔ اور شاید اسی
ردِ عمل تھا کہ مولانا محمود حسن کی مالٹا کے قید خانہ سے واپسی پر علی گڑھ میں انہی کے ہاتھوں جامعہ
ملیہ کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں بوجوہ دہلی منتقل ہو گیا۔ اور آج ہندوستان کے باوقار تعلیمی اداروں
میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

دیوبندی تعلیمی اسکول میں مولانا اشرف علی تھانوی ایک ایسے بزرگ تھے جو تحریکات ملیہ سے
نہ صرف الگ تھلگ رہے اور محتاط روش اختیار کی بلکہ انہوں نے بسا اوقات تلخی کا بھی مظاہرہ کیا اور
اتفاق یہ ہے کہ ان کے متعلقین کا قریب قریب ہمیشہ ہی یہ رویہ رہا۔ ان کے خدّام میں مولانا خیر محمد
جالندھری البتہ ایسے بزرگ تھے جنہوں نے جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس کی داغ بیل
ڈالی۔ ان کے رویہ میں کمال درجہ کا توازن و اعتدال تھا۔ وہ واقعتہً ایسے بزرگ تھے جنہوں نے ہمیشہ
جوڑنے کی فکر کی حتٰی کہ اسی فکر میں وہ دنیا سے رُخصت ہوئے۔

مرحوم ایوب خان کے بعد جب ملک میں سیاسی جھگڑے بڑھے اور جمعیۃ علماء اسلام کے بالمقابل
مرکزی جمعیۃ علماء اسلام کے نام سے ایک نئی جماعت کا اہتمام ہوا تو مولانا مرحوم نے اس تلخی کو ختم کرنے
کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ اور یہی صدمہ انہیں دنیا سے لے جانے کا باعث بنا۔

ان کا خلوص، تدبّر اور متوازن اندازِ فکر ہی تھا جس نے تقسیم ملک کے بعد ملتان میں خیر المدارس
کی نشأۃ ثانیہ کا اہتمام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مدرسہ ملک کی مثالی درسگاہ بن گیا۔ ان کے سانحہ
ارتحال کے بعد ان کے منجھلے صاحبزادے مولانا محمد شریف نے بڑی ہمت و استقامت سے اس
درسگاہ کا نظام سنبھالا اور جب وہ مکّہ معظمہ کی مقدس وادی میں اپنے اللہ کے حضور پہنچ گئے تو مدرسہ
میں بھونچال آ گیا ــــ بعض حضرات نے مدرسہ میں شب خون مار کر اس پر بیرونی قیادت مسلط کرنے
کی کوشش کی اور لاہور سے ایک منتظم کو امپورٹ کرنا چاہا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور مدرسہ کے ہی خواہوں
نے مولانا کے نبیرہ اور مولانا محمد شریف کے صاحبزادے مولانا محمد حنیف کو اس کی صلاحیتوں کی بنا پر ادارہ
کا نگران و مہتمم بنا دیا۔

مولانا حنیف کے دَور میں مدرسہ سے ایک ماہنامہ مجلّہ کا اہتمام بنام "الخیر" کیا گیا۔ ا
ذمہ دار اور متوازن ادارہ کی نسبت و حوالہ سے اہل ملک نے اس کا خیر مقدم کیا اور توقع رکھی
ملک میں صحت مند صحافت کے فروغ میں مؤثر کردار ادا کرے گا۔

اپنے مخصوص مزاج کے تحت واقعہ یہ ہے کہ رسالہ کی ابتدا خوب تھی۔ لیکن اب چند
سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے خلاف جس انداز سے
مہم شروع کی گئی ہے اسے دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے اور رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس کی
کیا ہے! شاید یہ سوچا گیا ہو کہ اس طرح رسالہ کی اشاعت خوب ہوگی اور ممکن ہے ایسا ہو بھی
لیکن آخر ہم سب نے اپنے کئے دھرے کا حساب بھی تو دینا ہے، اس کا اگر ہم سب کو احسا
ہو جائے تو ہم بہت سے منفی کاموں میں اپنی صلاحیتیں کھپانے کے بجائے مثبت کاموں میں
جائیں ــــــ!!

مئی ۱۹۸۵ء کا رسالہ ہمارے سامنے ہے اسی حلقہ کی ایک بڑی درسگاہ جامعہ اشرف
لاہور کے مفتی مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی کا ایک مضمون شائع ہوا جس سے ازحد کوفت ہوئی او
سطور لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اس جامعہ کے بانی مولانا مفتی محمد حسن حضرت تھانویؒ کے بڑے خلفاء
سے ایک تھے۔ جنہوں نے تقسیم ملک سے قبل امرتسر میں اس مدرسہ کی داغ بیل ڈالی تقسیم
نیلا گنبد لاہور کی ایک متروکہ عمارت میں اس کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور پھر مسلم لیگی حکومت کے تع
کے سبب فیروز پور روڈ پر لبِ نہر ایک وسیع قطعۂ اراضی پر اس جامعہ کی شاندار عمارت بنی ج
مفتی جمیل احمد صاحب یہیں کام کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی سے روحانی ہی نہیں خاندانی نسب
ہے۔ حضرت مرحوم کی چھوٹی اہلیہ محترمہ آپ کے پاس ہی لاہور میں مقیم ہیں اور انہی کی سرپرستی میں موصو
کے صاحبزادگان نے دینی کتب کی خرید و فروخت کا ایک ادارہ بھی بنا رکھا ہے۔

اپنی عمر اور تجربہ کے اعتبار سے حضرت مفتی صاحب پاکستان کے معمر ترین مفتی ہیں، عمر
تقاضوں کا انسان کے مزاج پر لازمی اثر پڑتا ہے۔ شدّتِ زبان و بیان شاید اسی سبب سے
ویسے موصوف ایک عرصہ سے فتوٰی پر دستخط نہیں فرماتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ کسی فتوٰی
عدالت میں حاضری دینا پڑی جس کے بعد یہ احتیاط برتی گئی۔

"الخیر" مئی ۱۹۸۵ء میں موصوف کے نام سے ایک مضمون چھپا۔ عنوان ہے

— نیا فرقہ ، نئی تحریک —

ڈاکٹر اسرار کا اصلاح کے نام سے افساد

ڈاکٹر صاحب نے شادی بیاہ کے سلسلہ میں ایک اصلاحی تحریک شروع کی، جس کی ابتدا سرگودھا سے ہوئی۔ آپ کے بھائی کا نکاح تھا۔ مسجد سری پورہ پھاٹک میں نکاح ہوا۔ اس موقعہ پر دوسرے حضرات کے علاوہ معروف عالم دین اور شیخ طریقت مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھوی کے دونوں ہونہار اور صاحب علم وفضل صاحبزادے مفتی احمد سعید اور قاری عبدالسمیع موجود تھے۔ انہوں نے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دی اور فرمایا کہ یہ کام ہمارے کرنے کا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق آپ کو دی۔

اس اصلاحی تحریک کے خلاف مفتی جمیل احمد صاحب کا مضمون بصورت پمفلٹ چھپا اور تقسیم ہوا۔ اور اب وہی مضمون غالباً کسی قدر اضافہ کے ساتھ "الخیر" میں شائع ہوا۔

اس مضمون کو پڑھ کر سخت رنج ہوا۔ ایک شخص خدمت قرآن میں مشغول ہے۔ ہر جگہ علماء کے دروازوں پر جاتا ہے۔ ان سے اصلاح و رہنمائی کی درخواست کرتا ہے، فقہی مسائل میں الجھنے سے گریز کرتا ہے۔ کسی قسم کی فرقہ بندی کا دشمن ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی، رہنمائی اور ہمدردی کے بجائے اس طرح کا منفی رویہ، طعن و تعریض اور مفروضات کی بنا پر غم و غصہ نہایت درجہ رنج دہ ہے۔

مضمون کی تمہید میں مفتی صاحب قبلہ نے "کالج تعلیم" کو لتاڑا اور باور کرایا کہ اس اسکول کے لوگ آگے چل کر امت میں فساد کا باعث بنتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے ماضی قریب کی بعض علمی تحریکات اور اداروں کا نہایت درجہ طعن کے انداز میں ذکر کیا جو سنجیدہ اور ثقہ علماء کے شایان شان نہیں۔ اس ضمن میں موصوف نے ندوی اور جامعی تک کو نہ بخشا۔ حالانکہ ندوہ وہ عظیم الشان علمی تحریک ہے جس کے بانیوں میں وقت کے اکابر علماء و صلحاء شامل تھے۔ حضرت تھانوی کے خادم اور سیرت النبی کے مصنف سید سلیمان ندوی مرحوم طویل عرصہ اس کے کرتا دھرتا رہے۔ اسی طرح مولانا حکیم عبدالحئی صاحب نزہتہ الخواطر ان کے بڑے فرزند ڈاکٹر سید عبدالعلی اور چھوٹے فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (عالم اسلام کے مشہور سکالر اور داعی اسلام) وقتاً فوقتاً کار مختار رہ چکے ہیں۔ علی میاں اب بھی اس کے حقیقی نگران اور منتظم ہیں۔ اسی طرح جامعہ ملیہ کے بانی اصولی طور پر مولانا محمود حسن شیخ الہند ہیں اور ہمیشہ ہی اس ادارہ کو ثقہ قسم کے لوگوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ افسوس کہ مفتی صاحب نے کسی چیز کا لحاظ نہ فرمایا —— پھر حیرت ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب

کی تنظیم اسلامی کو جماعتِ اسلامی کا چربہ کیسے قرار دیا ۔ حالانکہ ایک اہم موقعہ پر ڈاکٹر صاحب نے کم عمری کے باوجود جماعتِ اسلامی کے اندازِ فکر پر شدید علمی تنقید کی اور اس سے علیحدگی اختیار کر لی ۔

موصوف نے ڈاکٹر صاحب اور تنظیم کے متعلق فرمایا کہ "یہ لوگ بہ بانگِ دُہل چلّا رہے ہیں کہ صرف ہم ہی ہم اسلامی ہیں اور سارے صحیح ادارے اور سارے مسلمان غیر اسلامی ہیں" انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ نہ معلوم محترم مفتی صاحب نے کس تحریر یا تقریر سے یہ نتیجہ نکالا، اے کاش دوسروں پر اس طرح کے الزام سے متعلق محاسبہ آخرت ہمارے سامنے رہتا ۔

آج کل شادیاں جس انداز سے ہوتی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ۔ ہندوانہ رسومات عام ہیں نکاح کے دن یا آدھ ایک دن قبل مسجد سے رجسٹرار کو بلایا جاتا ہے ۔ وہ غریب رجسٹر بغل میں دبائے بے کسی کے انداز میں آتا اور فارم پر کرتا ہے ۔ نکاح کے وقت سے بہت دیر پہلے ہی اسے بلا کر پابند کر لیا جاتا ہے ۔ وہ غریب اس محفلِ عیش و طرب میں ایک بے کس و فقیرِ بے نوا کے سے انداز میں گھنٹوں اپنی قسمت کو کوستا رہتا ہے ۔ خطبۂ نکاح جس میں صرف ۴، ۵ منٹ صرف ہوتے ہیں اس کے دوران بھی بدتمیزی کے دسیوں اسباب موجود ہوتے ہیں ۔ سگریٹ کا دھواں، موسیقی کی دُھنیں، بڑوں کے قہقہے اور بچوں کا ہنگامہ سبھی کچھ ہوتا ہے لیکن کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ اس طوفانِ بدتمیزی کو روکے ۔ ڈوم اور مراثی جو کچھ کرتے ہیں وہ ایک مستقل تکلیف دہ امر ہے، مولوی ایسے موقعہ پر غریب کچھ نہیں کرسکتا ۔ اس کے پریشان کن معاشی حالات اسے اجازت ہی نہیں دیتے ورنہ تو سو پچاس روپے فیس نکاح سے بھی محروم ہو جائے ۔

اس پس منظر میں اگر کوئی شخص ترغیب دے کر اللہ کی مخلوق کو مسجد میں لے آتا ہے اور انہیں سمجھاتا ہے کہ اس موقعہ پر خطبہ میں پڑھی جانے والی آیات خاص اس مقصد کے لئے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ ہیں ان کا مفہوم و مقصد سمجھو، محض انہیں تبرک کے طور پر نہ دہراؤ تو آپ اس پر پل پڑتے ہیں کہ دیکھا اس نے خطبہ کو "جنتر منتر" کہہ دیا ہے حالانکہ وہ غریب محض اس روش پر تنقید کر رہا ہے اور لوگوں کو معقولیت کا راستہ دکھانے کی فکر میں ہے ۔ وہ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے کہ نکاح کا معاہدہ عبادت ہے اس کا مفہوم سمجھو اور قباحتوں سے بچو لیکن آپ اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اس کے پیچھے پڑ جائیں اور اس طرح کہ گویا کسی غیر مسلم نے اسلامی ریاست پر حملہ کر دیا ہے یا کسی نے اسلامی شریعت کی کسی مسلّم حقیقت سے انکار کر دیا ہے ۔

ڈاکٹر صاحب نے مسجد میں نکاح کو فرض و واجب نہیں کہا ۔ ہاں مسجد کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی ترغیب ضرور دی کہ مسجد میں نکاح ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے ۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ شادی بالوں

ہوٹلوں وغیرہ میں جو قباحتیں ہیں ان کے بجائے اللہ کے گھر میں اللہ کے بندوں کا اکٹھا اور اجتماع اور اس کا اہتمام نفع کا باعث ہوگا۔

مفتی صاحب موصوف نے جمع وتفریق کا سلسلہ شروع کرکے ثواب وگناہ کے درجات گنوانے شروع کردیئے اس تکلف کی ضرورت نہیں نکاح چھوڑ نماز، درس وتدریس اور حلقہ ذکر کے دوران بھی اگر کوئی مسجد کا ادب ملحوظ نہ رکھے گا تو اس پر بھی گناہ لازم آئے گا، گناہ تو ہر حال میں گناہ ہے۔

اے کاش کہ حضرت مفتی صاحب مساجد کے معاملے میں بے اعتدالی کے دور کرنے کی غرض سے کوئی اصلاحی چیز تحریر فرماتے تاکہ اہل ثروت کو معلوم ہوسکتا کہ سود سے لے کر زکوٰۃ تک کا پیسہ مسجد پر لگانا اور اس کی ظاہری خوبصورتی کا تو اہتمام کرنا لیکن نماز کا اہتمام نہ کرنا کتنا برا عمل ہے۔!

اور سچی بات تو یہ ہے کہ جو شخص نکاح کو اور اس کی مجلس کو قباحتوں سے بچانے کی غرض سے مسجد میں لے آیا ہے وہ مسجد کے آداب کا حاضرین کو کیوں نہ بتاتا ہوگا وہ تو ہر حال میں مسجد کے تقدس کا لحاظ کرتا ہوگا۔ لیکن افسوس کہ مفروضوں کی بنیاد پر ایک چنگے بھلے عمل خیر کی تائید وتحسین کے بجائے ایسا رویہ اختیار کیا گیا ـــــ!!

ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ عیسائیوں میں اپنے مذہب کا احترام نہیں اور مذہبی روایات یکسر ختم ہیں اس کے باوجود کلیسا اور پادری کا احترام ہے کہ ایسی تقریبات کلیسا میں ہوتی ہیں اور پادری کا حد درجہ احترام کیا جاتا ہے۔ اس پر مفتی صاحب نے "اندرونی راز" کی سرخی سجا کر مسجد میں نکاح کو کلیسا سے تشبیہ دے ڈالی ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون، سوال یہ ہے کہ نیکی کا عمل مسجد میں ہو اور مولوی باوقار طریق سے آئے یہ اچھا ہے یا یہ اچھا کہ نکاح ہوٹل میں ہو اور مولوی بے کسی کا تماشہ بنے؟

مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مسلمان کنواری بچیوں کو بے حجاب کرنے کی دھن میں کلیسا والی بنانا چاہتے ہیں" فیا حسرتا " اے کاش مفتی صاحب محسوس فرماتے کہ خواتین کی بے راہ روی اور بے حجابی پر سب سے زیادہ احتجاج ڈاکٹر صاحب نے کیا جس کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی اس کے برعکس حضرت مفتی صاحب کا پورا قبیلہ مسلسل آٹھ برس سے موجودہ حکمرانوں کی مدح وتوصیف میں مشغول ہے جبکہ اسلامی روایات کا جتنا تمسخر اس دور میں ہوا کبھی نہیں ہوا۔

افسوس کہ حضرت مفتی صاحب نے مفروضات کی آڑ میں طعن وتشنیع کا باب کھولا۔ اگر مسجد

سے ملحقہ ہال جو مسجد کا حصہ نہیں یا ہو تو اس میں عورتیں شرعی حدود کا لحاظ کر کے جمع ہوں، خطبۂ نکاح ہو۔ اور وہیں سے بچی کو رخصت کر دیا جائے تو شرعاً اس میں کیا قباحت ہے؟

یہ ارشاد کہ عورتیں مسجد میں باتیں کریں گی، چغلی، غیبت اور تفاخر کریں گی، بن سنور کر جائیں گی، بچوں کو ساتھ لے جائیں گی جبکہ بچوں کو مسجد سے دور رکھنا لازم ہے اور ممکن ہے کہ حیض و نفاس میں مبتلا ہوں، فوٹو کا اہتمام ہو کہ کالجی مولوی اسے برا نہیں سمجھتے (اور اہل دین؟) شور و شغب ہوگا۔ مسجد میں بچوں کے پیشاب کا خطرہ ہے، مرد بھی آجکل پیشاب کر کے بغیر طہارت پتلون پہن لیتے ہیں تو بقول مفتی صاحب یہ سب کام مسجد کے احترام کے منافی ہیں —— اس میں کسی کافر کو شبہ نہیں لیکن ہم عرض کریں گے کہ مفروضات کے سہارے اچھے کاموں اور اچھی اصلاحی تحریکوں کے متعلق نفرت پیدا کرنا تو اچھا نہیں، آپ کیوں نہیں خیال فرماتے کہ شادی بیاہ کو رسومات اور فضولیات سے بچانے کی جد و جہد کرنے والا مسجد کا لحاظ نہیں کرے گا اور ان باتوں سے متعلق عوام کو آگاہ نہیں کرے گا؟ اگر [illegible] رضات کا ہی سہارا لیا جائے تو زندگی کا نظام معطل ہو کر رہ جائے۔

آج کل لڑکیوں والے بالخصوص متوسط طبقہ کے لوگ جس قسم کی الجھنوں کا شکار ہیں ان کا اندازہ حضرت مفتی صاحب جیسے اہل ثروت علماء کو نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس طبقہ کو جس کی ترجمانی حضرت مفتی صاحب جیسے حضرات فرما رہے ہیں۔ غربت کے سبب رشتہ کا معاملہ الجھ کر رہ جاتا ہے پھر جہیز اور بے ہنگم دعوتوں کا چکر ان غریبوں کا کچومر نکال دیتا ہے۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر صاحب نے لڑکی والوں کے سلسلہ میں جو دعوت کی بات کہی ہے اور کہا کہ یہ لازم و ضروری ہوتا یا مستحب ہی ہوتا تو حدیث میں کہیں اس کا ذکر ہوتا تو اس میں کیا غلط بات کہی؟

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب حدیث نہیں پڑھاتے لیکن آپ نے جو حدیث کے حوالے دیئے خود ہی فرمائیں کہ وہ مناسب حال ہیں؟

ارشادِ نبوی کہ "ہدیہ دیا کرو اس سے محبت بڑھے گی" سر آنکھوں پر لیکن غریب لڑکی والوں کی دعوت کا لزوم اس میں کہاں ہے؟ دوسری حدیث کہ "جو بغیر عذر دعوت میں شریک نہ ہوگا وہ اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان ہے" بالکل بجا لیکن لڑکی والوں کو دبوچنے کے لئے اس حدیث کا حوالہ کیوں؟ اس میں ایسی کونسی علامت یا اشارہ ہے؟

رہ گیا سیدتنا فاطمہؓ کی شادی کا قصہ، کہ اس موقعہ پر کھجوروں کا طباق منگوایا گیا اور وہ تقسیم ہوا یا لوٹا گیا تو اللہ کے لئے بتائیں کہ مروجہ دعوت سے اس کا کیا تعلق؟ کھجور یا چھوہارے بالعموم

دولہا والوں کی طرف سے ہوتے ہیں۔ حضور علیہ السلام سیدنا علی کے مربی و سرپرست بھی تھے۔ اور تاریخ خمیس کا جو حوالہ آپ نے دیا اس میں اس کی صراحت نہیں کہ وہ سیدنا علی لائے یا ان کا اہتمام حضور علیہ السلام نے کیا۔ آج بھی اگر ۱۰، ۲۰ روپے کے چھوہارے دلہا کا اہتمام لڑکی والے ہی کرلیں تو اس پر اعتراض نہیں اعتراض اس کر تو ڑ دعوت پر ہے جس کا ثبوت آپ کے پاس بھی نہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے بدعت کی بحث کو بلا وجہ الجھایا، سب کو معلوم ہے کہ تمدنی ضروریات اور اس نوع کی اشیاء بدعت نہیں۔ بدعت وہی ہے جو دین میں اضافہ ہو۔ باقی برات کی لغوی بحث کا اہتمام کرکے یہ فرمانا کہ چونکہ پہلے سواریاں نہ ہوتی تھیں۔ اس لئے جہیز وغیرہ لانے کی غرض سے برات کا اہتمام ہوا کہ ڈاکو لوٹ کر نہ لے جائیں، جواب سواری اور امن کے سبب گھٹ جائے تو حرج نہیں لیکن گواہ تو بقول مفتی صاحب ضروری ہیں تو سوال یہ ہے کہ گواہوں کا انکار کس نے کیا، اعتراض ہے تو اس برات کی فوج ظفر موج پر جس کا آجکل رواج ہے کم از کم دو چار بسیں اور ۱۰، ۲۰ کاریں تو معمولی بات ہے۔ اے کاش آپ کبھی تنہائی میں غور فرماتے تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ یہ کس طرح کے بوجھ ہیں اور غریب لڑکی والے کتنے پریشان ہوتے ہیں، احساس ہو جائے تو آپ بھی یہی فرمائیں جو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، اعلان نکاح کا ارشاد تو بہرحال حدیث میں ہے اس میں وسیع پیمانے پر تبلیغ کے نقطہ نظر سے ڈاکٹر صاحب نے اخباری اعلان مناسب سمجھا لیکن انہیں اس پر اصرار نہیں کہ ہر شخص ایسا ہی کرے۔

مقصد اعلان ہے چاہے اس کی کوئی شکل ہو لیکن اعتراض برائے اعتراض کے طور پر حضرت مفتی صاحب اس کو لے کر بیٹھ گئے کہ پندرہ سو سال میں مسلمانوں نے کونسا اخبار میں اعلان کیا؟ فیا للعجب! معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی احساس ہے جو موصوف کو قدم قدم پر اعتراض پر ابھارتا ہے۔ اس ضمن میں موصوف کا یہ اعتراض ہے کہ ابھی تو قصدِ نکاح ہے اسے آپ اعلان نکاح کیوں کہہ رہے ہیں؟ بزرگانہ غضب ہے ہم کیا عرض کریں؟

دعوتِ ولیمہ کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حضور نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد نقل کیا جس کا مفہوم ہے

"دعوتِ ولیمہ اس حیثیت سے کہ اس میں اغنیاء اور صاحبِ حیثیت لوگوں کا خیال ہوتا ہے اور فقراء لوٹا دیئے جاتے ہیں، بُری ہے"۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ دعوت بری نہیں اس کا طعام برا ہے، چلیں قبلہ ایسے ہی سہی، فرمایا کہ جو آپ نے فرمایا اور جو ڈاکٹر صاحب نے کہا انجام کے اعتبار سے اس میں کیا فرق ہے؟

آج جو ولیمہ کی دعوتیں ہوتی ہیں ان میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کو بلایا جاتا ہے، احباب و اعزا

سبھی ہوتے ہیں۔ اب بالعموم ہوٹلوں وغیرہ میں اہتمام ہونے لگا ہے۔ لاکھوں کے بل اٹھتے ہیں، وقت کی پابندی نام کو نہیں۔ ۲، ۳ گھنٹہ کی تاخیر معمولی بات ہے۔ پھر وہاں کوئی محتاج راہ پائے توبہ! وہاں تو غریب ڈرائیور تک کا گزر نہیں۔ وہ بے کسی کی تصویر ہوتا ہے اور صاحب گل چھرّے اڑانے میں مصروف! ایسے مواقع پر افراتفری، بدنظمی اور کھڑا ہو کر کھانے کے سبب بے پناہ کھانا ضائع ہوتا ہے۔ پیٹ بھرے لوگ بھوکے گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بیرا اسٹینڈ تک نہیں پہنچ پاتا کہ یار لوگ پرات الٹ لیتے ہیں۔ کھانے کی جو درگت بنتی اور بے احتیاطی ہوتی ہے اس پر غضب الٰہی کا ڈر لگتا ہے۔ لیکن کوئی فقیر و محتاج صدا لگا دے تو سب غیظ و غضب کا شکار ہو کر اسے دھکے دے کر باہر نکالنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔

حضور علیہ السلام اور صحابۂ کرام کی مقدس جماعت میں ایسا نہ تھا وہاں غربا اور مساکین سے ابتدا ہوتی لیکن ہمارے یہاں جاگیرداری سسٹم نے اخلاق و شرافت کے سانچے توڑ دیئے۔ عام غربا کیا اعزہ میں سے غربا کی فکر نہیں ہوتی۔ مخصوص نوع کے مذہبی اداروں سے متعلق مخصوص حضرات کی البتہ ہر جگہ آؤ بھگت ہوتی ہے اور وہ بھی اسی ماحول میں رچ بس کر اسی طرح شریک محفل ہو جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے حضرات کو اہل ثروت کے اعمال بد کی سرپرستی کرنا پڑتی ہے جس سے مذہبی اقدار کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

کتنی صحیح بات فرمائی حضرت مولانا تھانوی نے، ایک شخص نے لکھا کہ آپ کہتے ہیں نکاح سنّت ہے لیکن جو خوشدامن اور بہو شادی سے قبل ایک دوسرے کے لئے بے پناہ محبّت و احترام کا اظہار کرتی ہیں وہ شادی کے ایک ہفتہ بعد آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہوتی ہیں کہ خاوند بیچارہ گیر بن کر رہ جاتا ہے؟ مولانا نے فرمایا نکاح تو سنّت ہے لیکن چند منٹ کے خطبے سے قبل اور بعد جو خرافات اور رسومات ہوتی ہیں اور جن بدعات کا ارتکاب ہوتا ہے وہ اس برکت کو کہاں باقی رہنے دیتی ہیں؟

تو آج کل جو معاشرتی جھگڑے اور فسادات ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ برائے نام خطبۂ نکاح کے سوا باقی کچھ نہیں ہوتا اور خوب خوب خرافات، اسراف و تبذیر اور ایسی باتیں ہوتی ہیں، ان کی اصلاح ہم سب کا اجتماعی فریضہ ہے نہ کہ ایسی جدوجہد کرنے والے پر پھبتی کسنا۔

ربّ العزّت ہم سب کو اپنی رحمتوں سے نواز کر اصلاحِ اعمال کی توفیق دے اور ایک دوسرے کے ساتھ دینی معاملات میں جذبۂ تعاون سے نوازے۔

افکار و آراء

مکتوبِ گرامی ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی بنام شیخ جمیل الرحمٰن

محترمی زاد عنایتہٗ ! السلام علیکم

آپ نے ' میثاق ' کے سات شمارے اور پھر اگست کا شمارہ بعد میں ارسال فرما کر ممنون فرمایا۔ اتنی
مدت ' میثاق ' کے مطالعے سے محروم رہا۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ آپ نے یہ سلسلہ پھر سے جاری فرما کر مجھے ممنون
فرمایا: ؎ " وقتِ تو خوش، کہ وقتِ ما خوش کردی " ! جزاک اللہ۔

آپ کی مصروفیت اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی مصروفیت سے باخبر ہوں لیکن کسی نہ کسی تقریب کے
پیدا ہو جانے پہ دل چاہتا ہے کہ آپ دونوں سے ملاقات ہوتی رہے ۔

ماہِ مئی کے شمارے میں مراد آباد (بھارت) سے ایک مکتوب کی آخری سطر ہے :

" .... اب آپ کام کرنے والے بنائیں۔ خود کرنے کے بجائے دوسروں سے
کام لیں اور ان کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دیں ۔"

گو کام مشکل تو ہے ۔ مگر ضروری ہے ۔

" خیالات و افکار کا پیدا کرنا آسان ہے مگر خیالات و افکار کے بقا و قیام کے لئے
اشخاص کا پیدا کرنا مشکل ہے " (بحوالہ الہلال)

لیکن یہ کام ضروری ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ تو بڑی عزیمت کا کام ہے ۔
اس میں عمریں کھپ جاتی ہیں اور پھر آج کل جب دنوں میں صدیاں بیت رہی ہیں، اس کام میں کامیابی کے لئے
عمرِ دراز درکار ہو گا

" درخت سب بوتے ہیں لیکن ہر شخص کے نصیب میں یہ نہیں ہوتا کہ پھل بھی
کھائے۔ پس نہایت مبارک ہے وہ ہاتھ جو تخم پاشی کے بعد ہی اپنے دامن میں
اس کے پھلوں کو بھی دیکھے ۔" (الہلال)

مگر بالفاظ " الہلال " مرحوم

" خلوص کے لئے موت نہیں اور حق و صداقت کے لئے ناکامی نہیں، دنیا میں
ہر چیز مٹ سکتی ہے ۔ پر حق و صداقت ہی ایک بیج ہے جو پامال نہیں ہو سکتا "

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف موم بتی کو دونوں سروں سے نہ جلائیں
؎ ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

یہ چند باتیں ڈاکٹر صاحب سے قلبی تعلق کی وجہ سے زبانِ قلم پر آگئیں وگرنہ من آنم کہ من دانم ـــ ـــــ "میثاق" کو تو آپ نے باقاعدہ اور بر وقت شائع کرنے کا اہتمام کر دیا لیکن "حکمتِ قرآن" بھی آپ کے دَمِ عیسیٰ کا محتاج ہے ۔ ابھی تک اس ماہ کا شمارہ نہیں آیا ۔ شاید حسبِ معمول دو ماہ کا یکجا شائع ہو جائے ۔ وقت اور عہد کی پابندی مسلمان کا بنیادی شعار ہے ۔ خط کی طوالت کی معافی چاہتا ہوں ؎

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را من از شوقِ حضوری طول دادم داستانے را

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا ، محترم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیں ۔

طالبِ دعا **شیر بہادر خان** (ایبٹ آباد)

(۲)

رُوبرُو سے متعلق مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کے تاثرات

گرامی قدر حضرت ڈاکٹر صاحب ، السلام علیکم ،

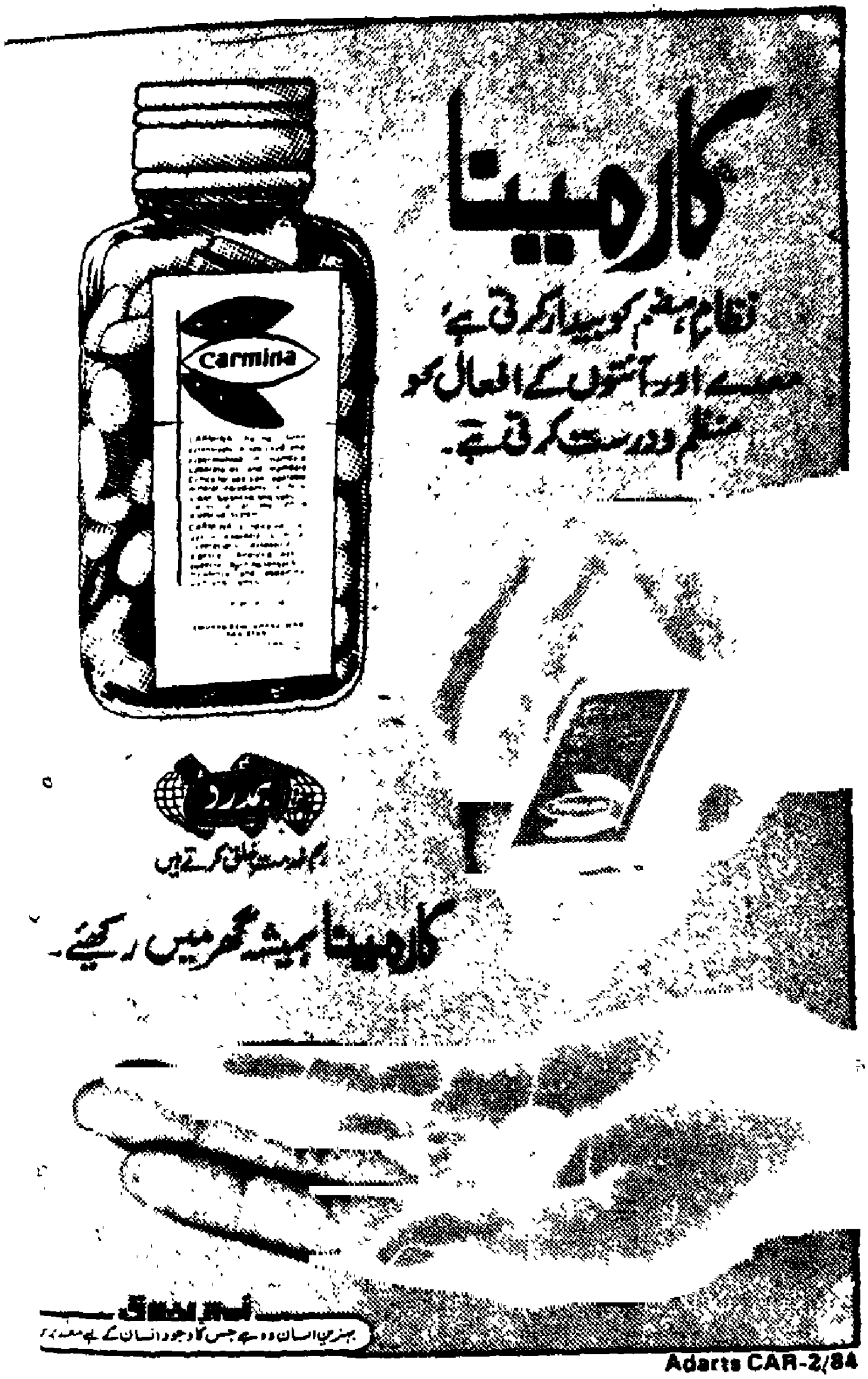
آنمحترم نے جامعہ رحیمیہ کی اعانت میں جو توجہ فرمائی ، خدا تعالیٰ اس پر آپ کو اجرِ جزیل فرمائے ۔ خاکسار نے شکریہ کا ایک رسمی خط ارسال کیا تھا ، امید ہے مل گیا ہوگا ۔

ٹی وی پر آنجناب کا انٹرویو پڑھا ، سوالات کی پیچیدگی اور اہمیت کا آپ نے جس انداز تدبیر سے سامنا کیا وہ قابلِ تحسین ہے ـــ اُن جوابات میں اتنی گہرائی اور پھیلاؤ ہے کہ ایک دفعہ کافی نہ ہوا ـــ اسے پھر پڑھوں گا ، آپ نے برجستہ جوابات میں اتنا پھیلاؤ کیا ہے کہ کمال ہی کر دیا

علوی صاحب اور دوسرے احباب کی خدمت میں سلام مسنون ، ہاں ! میاں عاکف کا حادثہ افسوسناک ہے ، آپ کے دونوں بچے صالح اور لائق ہیں ، خداوندِ عالم اُن دونوں کو آ جانشین بنائے ، بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی سلام مسنون ،

طالبِ دُعا
اخلاق حسین قاسمی (د...)

۲۸ رجولائی ۸۵ء


کارمینا
نظامِ ہضم کو بیدار کرتی ہے
معدے اور آنتوں کے افعال کو
منظم و درست کرتی ہے۔
carmina
ہمدرد
کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے۔
Adarts CAR-2/84

"گاہ گاہے باز خواں ......"

ڈاکٹر اسرار احمد کے ۶۹ء کے بعض سیاسی

کیا پاکستان میں دوبارہ ۷۰-۱۹۶۹ء کے حالات پیدا

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ میثاق لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن ــــ لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد	۳۴
شمارہ	۱۰
اکتوبر	۱۹۸۵ء
بمطابق	
محرم الحرام	۱۴۰۶ھ
زرِ سالانہ	۳۰ روپے
فی شمارہ	۳/- روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

○

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

○

حافظ عاکف سعید

○

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ - کے [illegible] ماڈل ٹاؤن [illegible]
[illegible] فون ۸۵۲۶۶۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی، فون ۲۱۶۵۸۶

مشمولات

اسرار احمد

تذکرہ وتبصرہ

راقم الحروف نے 'میثاق' کی ادارت ۱۹۶۶ء میں سنبھالی تھی ــــ اور اس کے زیرِ ادارت
ثاق' کا پہلا شمارہ جولائی ۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ گویا اس کے 'زیرِ اہتمام' ــــ 'میثاق' کو شائع
تے یہ بیسواں سال ہے۔

اس طویل عرصے کے دوران سوا بارہ برس تک یہ بالکلیہ میرے ہی اہتمام، میری ہی ادارت اور میری
ترتیب کے مطابق شائع ہوا۔ بعدازاں (اکتوبر ۷۸ء سے) راقم الحروف اس کا صرف "مدیرِ مسئول"
لیا ترتیب وغیرہ کی جملہ ذمہ داری بھی رفیقِ مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے برداشت کی اور اشاعت
ے لئے بیشتر مواد بھی انہوں نے ہی میری تقاریر اور دروس کو کیسٹوں سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے
ہم کیا ــــ تاہم اس دور میں بھی گاہے گاہے راقم خود اپنی تحریروں کے ذریعے "تذکرہ وتبصرہ"
ے صفحات میں حاضری دیتا رہا۔

اس سب کے باوصف، واقعہ یہ ہے کہ راقم جس طرح نہ مروّجہ معنی میں سیاسی آدمی ہے، نہ معروف
ٰی میں 'عالمِ دین' ــــ بالکل اسی طرح وہ اصطلاحی مفہوم کے مطابق 'صحافی' بھی نہیں ہے۔

یہ تذکرہ اس لئے نوکِ قلم پر آ گیا کہ گذشتہ اشاعت میں راقم نے عرض کیا تھا کہ چونکہ اس کے اندازے
ے مطابق عنقریب پاکستان کے سیاسی حالات کے اعتبار سے تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے اور
ِبارہ کچھ اُسی قسم کے حالات و واقعات پیش آنے والے ہیں جو ۶۹ء میں رُونما ہوئے تھے، اور
راقم کے اس ضمن میں بھی بعض سوچے سمجھے نظریات ہیں جن سے 'میثاق' کے موجودہ قارئین کی اکثریت واقف نہیں
ہے، لہٰذا قبل اس کے کہ راقم اب اس موضوع پر قلم اٹھائے، ان شاء اللہ آئندہ ہی اشاعت میں راقم اپنے اُس
یاسی تجزیوں کے بعض حصے دوبارہ شائع کر دے گا جو اس نے اُس زمانے میں تحریر کئے تھے تاکہ ریکارڈ
ست رہے اور یہ نہ کہا جا سکے کہ یہ سب کچھ خیالات کی ایک وقتی اور فوری سی لہر کا مظہر ہے" ــــ تو جب
ا خیال سے راقم نے 'میثاق' کے پرانے فائلوں پر نظر ڈالی تو اسے جولائی ۶۸ء کی اشاعت میں
ا ایک تحریر نظر آئی جسے پڑھ کر واقعہ یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے شکر و حمد کے
[illegible]

دعجبات[illegible]یت " اَلْآنَ كَمَا كَانَ " کے مصداق بالکل وہی ہے جو اُس وقت تھی چنانچہ موجودہ اسباب[illegible]وں سے قبل راقم نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنے احباب و رفقاء اور 'میثاق' کے جملہ قارئین کو بھی اپنے اس گہرے احساسِ شکر و حمد میں شریک کرنے کے لئے اپنی وہ تحریر من وعن نقل کر دے

______ وھو ھذا

" گزشتہ شمارے کے ساتھ راقم الحروف کے زیرِ ادارت 'میثاق' کے دو سال مکمل ہو گئے تھے اور زیرِ نظر اشاعت سے تیسرے سال کی ابتدا ہو رہی ہے۔ دو سال کی اس مدت میں 'میثاق' کے ذریعے اگر دین کی کوئی بُری بھلی خدمت ہوئی ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے ——— اور اگر کسی کوتاہی یا غلطی کا صدور ہوا ہے تو وہ یقیناً میری نااہلی اور شرارتِ نفس کی بنا پر ہے۔ آئندہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی کی اُمید اور اُس کے اس حتمی وعدے پر پختہ یقین کی بنا پر کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۶۹)

"اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کریں گے ہم لازماً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے۔"

اس دعا کے ساتھ اس سفر کو جاری رکھنے کا عزم ہے کہ:

رَبَّنَا اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ (آمین)

"پروردگار، ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کی پیروی کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل دکھا اور اس سے بچنے کی ہمت عطا فرما۔"

'صحافت' نہ تو راقم الحروف کا 'پیشہ' ہے اور نہ 'مشغلہ'۔

جہاں تک کسبِ معاش کا تعلق ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے وہ ذریعہ عطا فرمایا تھا جو سب کے نزدیک دنیا کا شریف ترین پیشہ ہے۔ پھر میرے بارے میں کسی نے چاہے اور کچھ بھی کہا ہو، مجھ پر 'ذہبی' ہونے کا الزام آج تک کسی نے نہیں لگایا ——— یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اپنے دورِ تعلیم کے انتہائی اہم زمانے میں مَیں ایک تحریک اور اس کی دعوت سے متاثر ہوا اور فوری طور پر میں نے پورے فہم اور شعور کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا — کہ میری زندگی میں اوّلیت اس تحریک اور اس کی دعوت کو حاصل ہو گی۔ معاش اور کسبِ معاش کے ذریعے (یعنی PROFESSION & CAREER) کو بالکل ثانوی مقام حاصل ہوگا۔ تعلیم کے اختتام اور عملی زندگی کے آغاز کے بعد بھی قلب کی گہرائیوں سے اُبھرنے والے بعض تقاضوں اور روح کی پہنائیوں سے اٹھنے والے بعض مطالبوں

نے مسلسل بے چین کئے رکھا، چنانچہ مروّجہ معیارات کے مطابق "پیشہ ورانہ کامیابی" کے بنیادی لوازم ـــــــ یعنی توجہ کا ارتکاز ـــــــ اور ایک مقام پر مستقل قیام ـــــــ کبھی پورے نہ کئے جا سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دوران میں جب بھی کبھی ایسا ہوا کہ پیشہ ورانہ معروفیت میں اضافہ ہوتا اور وقت اور توجہ کا معتد بہ حصّہ اس میں صرف ہونے لگتا تو قلب و روح کی گہرائیوں سے وہی صدا بلند ہونے لگتی جو ایک روایت کے مطابق شکار کے دوران ایک بیابان میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو سنائی دی تھی کہ:

یا ابراھیمُ! أَلِهٰذا خُلِقْتَ أَمْ لِهٰذا أُمِرْتَ؟

(اے ابراہیم! کیا اسی کام کے لیے تمہیں پیدا کیا گیا ہے۔ یا کیا اسی کا تمہیں حکم ملا ہے؟!)

نتیجۃً طبیعت میں توحش پیدا ہو جاتا ـــــــ اور پیشہ ورانہ معروفیت سے دل بالکل اچاٹ ہو جاتا ـــــــ معاش میں استحکام ـــــــ اور پیشہ و فن میں تمکن کا اصل زمانہ یعنی اختتام تعلیم سے لے کر مسلسل دس بارہ سال تک کا عرصہ میں نے اس حال میں گزارا کہ جہاں کی فضا اپنے "مقصد زندگی" کے لئے نسبتاً زیادہ سازگار نظر آئی اپنا سارا بوریا بستر سمیٹ کر وہاں چل دیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ ایک مقام پر ایک عرصہ تک قیام کی بنا پر معاشی وفنی اعتبار سے جو حیثیت بنی ہے اس کو اس طرح نظر انداز کر دینے سے معاشی مستقبل کتنا مخدوش ہو جائے گا ـــــــ حد یہ ہے کہ ایک بار "مقصدِ زندگی" کے نام پر دی جانے والی ایک دعوت کی بنا پر پیشہ و فن کی پوری بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ـــــــ الغرض مسلسل آج یہاں، کل وہاں، پرسوں کہیں اور، اور اگلے روز کہیں اور کی حالت طاری رہی ـــــــ لوگ تلوّن اور غیر مستقل مزاجی کی پھبتیاں کستے رہے ـــ لیکن میں اپنے باطن کا جائزہ لیتا تو یہ معلوم کر کے مطمئن ہو جاتا رہا کہ میرے اس ظاہری "تلوّن" کا اصل سبب بحمد اللہ اپنے اس قدیم فیصلے پر پوری "مستقل مزاجی" کے ساتھ عمل پیرا رہنا تھا کہ میری زندگی میں اوّلیت بہر حال "مقصدِ زندگی" کو حاصل رہے گی۔ معاش اور اس کے متضمنات ہمیشہ ثانوی رہیں گے! ـــــــ ایک طویل عرصے تک ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آج سے دو ڈھائی سال قبل حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی کے تحت یہ صورت پیدا ہوئی کہ میں لاہور منتقل ہوا ـــــ اور یہاں "مقصدِ زندگی" کے لئے "خالص ذاتی حیثیت" میں ایک حقیر جد و جہد کے آغاز کے طور پر پہلے "تحریکِ جماعت اسلامی" کی اشاعت اور پھر "میثاق" کے از سرِ نو اجراء کا اہتمام کیا ـــــــ!

"ذوق و شوق" کا معاملہ۔ تو خدا جانتا ہے کہ "لکھنے" کا شوق مجھے کبھی نہیں رہا۔ اس کے

برعکس واقعہ یہ ہے کہ 'لکھنا' مجھے ہمیشہ ایک نہایت مشکل اور نہایت کٹھن کام نظر آیا۔ نہ تو یہ کبھی میرا مشغلہ (HOBBY) رہا۔ اور نہ ہی کبھی میں نے اس کی مشق کی اور واقعہ یہ ہے کہ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ اس 'فن' کے ابجد تک سے میں تاحال ناواقف ہوں۔ اسلامی جمعیتِ طلبہ سے وابستگی کے دوران خالص تنظیمی نوعیت کی چند تحریروں یا ایک آدھ وارداتِ قلبی کے اظہار کے قبیل کی چیزوں کے علاوہ پورے زمانہ طالب علمی میں میں نے کچھ نہیں لکھا ——— اس کے بعد مسلسل دو سال ایک حرف بھی قلم سے نہ نکلا۔ لیکن پھر اچانک مقصدِ زندگی کی لگن اور اس کے ساتھ شدید ذہنی وابستگی سے یہ 'معجزہ' صادر ہوا کہ اکتوبر ۵۶ء میں دس پندرہ دن کی مدت میں سوا دو سو صفحات پر مشتمل وہ بیان تحریر میں آ گیا جو اب 'تحریکِ جماعتِ اسلامی' کی صورت میں مطبوعہ موجود ہے ——— اس کے بعد مسلسل دس سال پھر اس حال میں گزرے کہ ایک حرف بھی قلم سے نہ نکلا حتیٰ کہ اس پورے عرصہ میں خطوط بھی چند بالکل گنے چنے ہی لکھنے میں آئے ——— تا آنکہ جولائی ۶۶ء میں 'میثاق' کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا۔ اس کے بعد کی 'قلمی داستان' سے قارئینِ 'میثاق' بخوبی واقف ہیں۔

یہ پوری داستان بے اختیار اس لئے نوکِ قلم پر آ گئی کہ حال ہی میں چند مخلصین نے یہ شکوہ کیا ہے کہ "رسائل و اخبارات کے اداریئے وقتی حالات و مسائل پر تبصرے کے لئے ہوتے ہیں، تم ان میں بھی ثقیل مضامین بھر کر 'صحافت' کے معروف اصولوں کو توڑ رہے ہو۔" اور بعض دوسرے حضرات نے یہ طعنہ دیا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے پاس 'لکھنے' کے لئے کچھ ہے ہی نہیں!" ——— میری گذارش اپنے ان تمام دوستوں اور بزرگوں سے یہ ہے کہ واقعۃً 'صحافت' نہ میرا 'پیشہ' ہے نہ 'مشغلہ' ——— لہٰذا صحافت کے مروّجہ معیارات کے مطابق میری جانچ پرکھ مجھ پر شدید زیادتی ہے۔ علامہ اقبال کو جو گلہ اپنے دوستوں سے تھا کہ ؎

مرا یاراں غزل خوانے شمردند !!

وہی مجھے اپنے ان مخلصوں سے ہے، وہ مجھے بھی ایک صحافی سمجھ رہے ہیں، میں نے ہرگز صحافت کا شوق پورا کرنے کے لئے اس کوچے میں قدم نہیں رکھا۔ بلکہ 'میثاق' کا اجراء صرف اپنے مقصدِ زندگی کے حصول کی جد و جہد کے لئے کیا ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس وسیع و عریض دنیا میں اپنے مقصد اور اس کی جد و جہد سے بڑھ کر اہم چیز کوئی نظر ہی نہیں آتی! موجودہ حالات و واقعات میرے نزدیک بذاتہٖ اور فی نفسہٖ نہ کوئی علیحدہ وجود رکھتے ہیں نہ مستقل اہمیت کہ ان پر تبصرہ کیا

فادیت کا حامل ہو۔ مجھے اس ایک مقصد کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے کہ مسلمان جیوں اور مومن مریں۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ خود میرا سینہ بھی نورِ ایمان سے منور ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے قلوب و اذہان بھی اسی نور سے جگمگا اٹھیں۔ تاکہ وہ بھی اسلام پر زندہ رہیں اور ایمان پر اس دنیا سے رخصت ہوں۔ پھر کوئی جماعت یا تنظیم ایسی مل جائے جو اس مقصد کے لئے کام کرنا چاہتی ہو تو کیا کہنا! ۔ بصورتِ دیگر میں تن تنہا اسی مقصد کے لئے کام کرتے رہنے ہی کو اصل کامیابی و سعادت و فلاح سمجھتا ہوں چاہے پوری زندگی کی جد و جہد کے بعد بھی اس کا کوئی محسوس و مشہود نتیجہ سامنے نہ آئے "

راقم الحروف خود بھی اللہ تعالٰی سے دعا کرتا ہے اور جملہ رفقاء و احباب اور قارئینِ 'میثاق' سے بھی استدعا کرتا ہے کہ وہ اس کے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالٰی نے جس طرح بالکلیہ اپنے فضل و کرم سے راقم کو ستمبر ۸۵ء میں اپنی جون ۶۸ء کی ایک تحریر کے آئینے میں " وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا " کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی ہے اسی طرح تا اختتامِ حیاتِ دنیوی اور " يَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ " اسے کسی ادنٰی سے ادنٰی درجہ میں اپنے ان محبوب بندوں کا کفش بردار بنا دے جن کی شان میں یہ الفاظِ مبارکہ سورۂ احزاب میں وارد ہوئے ہیں :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ
يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝
(الاحزاب : ۲۳)

ایمان والوں میں کتنے ہی مرد ہیں جنہوں
نے سچ کر دکھلایا اپنا وہ عہد جو اللہ سے
کیا تھا ، تو کوئی تو ان میں سے پورا کر چکا اپنا
ذمہ اور کوئی ہے اس کا منتظر اور نہیں
تبدیلی کی انہوں نے ذرہ برابر۔

جہاں تک موعودہ سیاسی تجزیوں کا تعلق ہے تو راقم نے جب 'میثاق' کے پورے فائل کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو (حفیظ جالندھری مرحوم سے معذرت کے ساتھ) "نصف صدی کا قصہ ہے ' دو چار برس کی بات نہیں!" کے مصداق بہت طوالت طلب معاملہ ہے اور ان سب کا ایک اشاعت میں شائع کر دینا تو سرے سے ناممکن ہے ہی ' سب کی اشاعت ضروری بھی نہیں ہے۔ —— راقم نے گذشتہ سوا انیس سالوں کے دوران جو سیاسی یا تجزیاتی تحریریں سپردِ قلم کی ہیں ان کا جائزہ (BREAK - UP) حسبِ ذیل ہے :

[illegible] کے دوران جو سیاسی اور ثقافتی تجزیئے 'میثاق' میں شائع ہوئے وہ " اسلام

اور پاکستان" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع شدہ موجود ہیں۔

۲۔ ۱۹۶۹ء میں جنوری تا مئی کی اشاعتوں میں جو خالص سیاسی تجزیئے شائع ہوئے ان کا ایک انتخاب اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں دوبارہ "پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش اور اسلام" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ اسی کو اب ٹھیک پندرہ سال بعد ایک بار پھر پیشِ نظر اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے لئے اُسی وقت کی شائع شدہ تحریروں کا عکس من و عن شائع کیا جا رہا ہے تاکہ یہ بات مستقل طور پہ ذہن میں رہے کہ یہ تحریریں آج کی نہیں، ۱۹۶۹ء کی ہیں!

ان تجزیوں کی اس وقت بھی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔ (چنانچہ اِس وقت کے معروف سیاسی رہنما اور اُس وقت کے صحافی و دانشور اور ابھرتے ہوئے سیاسی کارکن، جناب حنیف رامے نے ان میں سے بعض کو مِن و عَن اپنے ہفتہ وار جریدے 'نصرت' میں شائع کیا تھا) اور ان شاء اللہ اب بھی قارئین 'میثاق' انہیں نہ صرف دلچسپ پائیں گے بلکہ اس اعتبار سے مفید بھی پائیں گے کہ ان کے آئینے میں وہ "آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!" کی کیفیت محسوس کریں گے!

۳۔ ۱۹۷۰ء میں جب پاکستان کی سیاست میں واقعۃً گھمسان کے رَن کی کیفیت پیدا ہو گئی تو اس سال کی بھی چند اشاعتوں میں تفصیلی تجزیئے شائع ہوئے جن میں زیادہ تر اس وقت کی برسرِ پیکار سیاسی جماعتوں کا تجزیہ تھا۔ ان کا بھی ایک انتخاب راقم نے مرتب تو ابھی کر لیا ہے لیکن ان کی اشاعت کا فی الحال ارادہ نہیں ہے۔ (ہو سکتا ہے کہ آئندہ کسی مرحلہ پہ ان کی اشاعت مفید محسوس ہو)۔

۴۔ البتہ جون ۱۹۶۹ء میں راقم کی جو تحریر 'میثاق' کے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں شائع ہوئی تھی اس میں قضیۂ مشرقی پاکستان اور خود پاکستان کی ہیئت ترکیبی اور اس میں مضمر پیچیدگیوں کے بارے میں بعض نہایت اہم مباحث شامل تھے، ——— اسی طرح جب دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آ ہی گیا تو اس پر جو مفصّل تبصرہ جنوری فروری ۱۹۷۲ء کی مشترک اشاعت میں شائع ہوا تھا اس میں بھی بعض مباحث نہایت اہم ہیں، جن کا فہم و شعور موجودہ "بچے کھچے" پاکستان میں چلنے والی علاقائی و نسلی قومیتوں کے تصور پر مبنی علیحدگی پسند یا مرکز گریز تحریکوں کے پس منظر کے فہم و ادراک کے لئے نہایت ضروری ہے ———

چنانچہ ان شاء اللہ العزیز یہ دونوں تحریریں بشمول اس خط کے جو اس ... نے ان تحریروں ...

کے ٹھیک دس سال بعد (دسمبر ۱۹۸۲ء میں) پاکستان کے موجودہ صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اور جس میں راقم نے عرض کیا تھا کہ سندھی نوجوانوں میں بالکل بنگلہ دیش کی تحریک کے مماثل سندھو دیش کی تحریک جڑ پکڑ چکی ہے اور یہ لاوا کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ (چنانچہ ایک سال کے اندر اندر یہ صورت فی الواقع پیدا ہو بھی گئی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے پاکستان کو بچا لیا اور ہمیں اصلاحِ حال اور تلافیٔ مافات کا ایک مزید موقع عنایت فرما دیا) ——— 'میثاق' کی آئندہ اشاعت میں قارئین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں گی۔

پاکستان کے ۱۹۶۹ء کے سیاسی حالات کے ضمن میں اپنے متذکرہ بالا تجزیوں کے ساتھ راقم اس اشاعت میں بطور ضمیمہ بھارت کے دو مؤقر مسلم جرائد کے تبصرے بھی شائع کر رہا ہے تاکہ پاکستان کے اُس دَور کے سیاسی حالات کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ فکر کی ایک جھلک بھی قارئین کے سامنے آ جائے۔

"استحکامِ پاکستان" کے موضوع پر راقم الحروف کی جن تقاریر کا ذکر گذشتہ شمارے میں آیا تھا ان پر محترم اقبال احمد صدیقی صاحب نے بہت محنت کی ہے اور انہیں ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا کام تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر خود ان کا اور بعض دوسرے رفقاء کا اصرار ہے کہ ان پر میں بھی ایک نظر ضرور ڈالوں اور ہو سکے تو انہیں خود اَز سرِ نو مرتب کروں، چنانچہ خود میرا ارادہ بھی اب یہی بن گیا ہے، لیکن اس کی تکمیل ظاہر ہے کہ سراسر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اسی ہی کی تائید و توفیق پر منحصر ہے۔ بلکہ ع "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے!" کے مصداق میرے دل میں تو یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اگر اللہ حالات سازگار فرما دے تو ماہ اکتوبر میں عمرہ کے لئے سفر کروں اور اس کے دوران حرم کے کسی گوشے ہی میں بیٹھ کر اس تقریر کو مرتب کروں۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

اس اثنا میں لاہور کی 'شامِ الہدیٰ' والی تقریر کو وڈیو کیسٹ کے ذریعے جن حضرات نے دیکھا اور سُنا ہے ان میں سے علماءِ ہند کے خیر آبادی سلسلے کی ایک عظیم شخصیت مولانا حکیم برکات احمد ٹونکیؒ کے پوتے حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کا جو تاثر موصول ہوا ہے وہ ہدیۂ قارئین ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم المقام ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

محترم .... صاحب کے یہاں آپ کی تقریر سُنی۔ حسب ارشاد اپنے تاثرات عرض کر رہا ہوں، ———

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک غیر معمولی تقریر ہے۔ تقریر میں عالم اسلام کی اسلامی تحریک یا تحریکوں، تحریک پاکستان اور پاکستان کے حال اور مستقبل کا آپ نے جو جائزہ لیا ہے وہ بھرپور ہے، ہمہ جہتی ہے، جامع ہے، متوازن ہے اور یہ جائزہ خالص دینی نقطۂ نگاہ سے ہے اور ایک مسلمان کی نگاہ سے ہے، خیالات اور تبصرے توازن اور دیانت کے ساتھ آپ کی سیاسی بصیرت اور وسعتِ نگاہ پر بھی دال ہیں۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ مقرر کو دین کے ہر خادم (فرد یا جماعت) سے ہمدردی اور تعلقِ خاطر ہے مگر ساتھ ہی وہ تنقید میں بے باک بھی ہے !!!

اس تقریر کو جلد تحریر میں بدل کر شائع کر دیجئے ....

میں اس مفصل اور مربوط تقریر پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

۵ ستمبر ۸۵ء   خاکسار، محمود احمد برکاتی "

کراچی کے جس اجتماع میں یہ تقریر سُنی اور دیکھی گئی اس میں مولانا حکیم برکات احمد ٹونکیؒ کے دو معنوی اور علمی پوتے بھی شریک تھے یعنی ایک ان کے شاگرد رشید مولانا معین الدین اجمیریؒ کے تلمیذ رشید اور راقم کے استاذ مولانا سید منتخب الحق قادری مدظلہٗ اور دوسرے مولانا معین الدین اجمیریؒ کے بھتیجے اور میرے مشفق حکیم محمد نصیر الدین ندوی! ان دونوں بزرگوں کا بھی اگر کوئی تبصرہ موصول ہوا تو قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا

خیر آبادی مکتب فکر پر جس اجتماع کا اعلان گذشتہ ماہ کیا گیا تھا اب اُسے ذرا مؤخر کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ایک تو تا حال مولانا سید منتخب الحق مدظلہٗ کی جانب سے پروگرام کی توثیق موصول نہیں ہوئی اور دوسرے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے راقم نے ماہ اکتوبر میں عمرہ کی نیت کر لی ہے، ——— لہٰذا اس سلسلے میں اب پروگرام از سر نو ترتیب دینا ہوگا۔

مولانا سعید الرحمٰن علوی اس ماہ اپنی بعض خاندانی مصروفیات کے باعث کافی عرصہ لاہور سے باہر رہے۔ لہٰذا ان کی جس طویل اور سلسلہ وار تحریر کی قسط اوّل گذشتہ ماہ شائع ہوئی تھی اس کی ق

ثانی اس شمارے میں شامل نہیں کی جا سکی۔ یہ انشاء اللہ آئندہ ماہ شائع ہو گی ــــــ البتہ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں ان کی ایک علمی اور تحقیقی تحریر یہ شامل اشاعت ہے۔

بلوچستان کے ایک تفصیلی دورے اور علاقائی اجتماع سے حد درجہ تکان کے ساتھ واپسی ہوئی ہی تھی کہ تنظیم اسلامی کے سال رواں کے علاقائی اجتماعات کے سلسلہ کی تیسری کڑی یعنی اجتماع پشاور سر پر ہے اور راقم کی کیفیت "پا بر کاب" کی سی ہے۔ بلوچستان کے دورے اور اجتماع کوئٹہ کی مختصر روداد اس شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ اجتماعِ پشاور کی روداد ان شاء اللہ آئندہ ماہ شائع ہو گی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک اس دنیا میں رکھے اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول کئے رکھے ــــــ اور جب یہاں سے دار الخلد کو روانگی ہو تو ایمان کے ساتھ ہو۔

ولدی السعید عزیزم عاکف سعید سلمہ کے بچے اور راقم کے پوتے حسین عاکف کے انتقال پر جو اسی سال ماہِ رمضان مبارک میں ہوا تھا، چونکہ بہت سے رفقاء و احباب نے تعزیتی خطوط ارسال فرمائے تھے۔ لہٰذا راقم اپنے جملہ رفقاء و احباب کو اپنی اس خوشی میں بھی شامل کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزیزم عاکف سعید سلمہ کو نعم البدل کے طور پر ایک بیٹا ۹ ستمبر ۸۵ء کو بوقتِ سحر عطا فرما دیا ہے۔ ہم نے اس کا نام بھی "حسین" ہی رکھا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نومولود کو مومن و مسلم بنا کر اٹھائے اور اسے بھی اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف

پرچہ مکمل ہو چکا تھا ــــــ اور کاپیاں جوڑی جا رہی تھیں کہ مولانا سعید الرحمٰن علوی کے نام محترم ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی (ایبٹ آباد) کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ ڈاکٹر صاحب راقم کے بزرگ اور دیرینہ کرم فرما ہیں، لہٰذا طبیعت میں شدید داعیہ پیدا ہوا کہ ان کے جذبات قارئین تک ضرور پہنچا دیئے جائیں اگرچہ اس کے لئے "سفر بلوچستان" کی روداد کے بعض حصے حذف کرنے پڑے ــــــ !!!

مکتوبِ گرامی

ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنّی بنام مولانا سعید الرحمٰن علوی

محترمی! زندہ باد

مدت ہوئی کہ کوئی تقریب ہاتھ نہ آئی کہ آپ سے نصف ملاقات کا شرف حاصل کر سکتا۔ اب کہ 'میثاق' میں "دل افگندیم" پڑھا۔ تقریب حاصل ہوگئی اور عریضہ لکھنے کا موقع مل گیا۔

کچھ مدت سے آپ کی نگارشات "میثاق"۔ خاص کر "حکمتِ قرآن" میں پڑھتا رہا اور اپنے ردِّ عمل سے آپ کو آگاہ کرتا رہا، گویہ تعلق ہوا کا رُخ بتا رہا تھا لیکن یہ معلوم نہ کر سکا کہ آپ تنظیمِ اسلامی سے ملحق ہو جانے والے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب میرے کرم فرما ہیں۔ اور میں ان کے مشن کا ہم نوا آغازِ کار (اغلباً ۱۹۶۷ء) سے ہوں اور ان کے مشن کا مخلصانہ خیر خواہ، قلمے و درمے بھی تھا۔ خدا نے ان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کی اسی صلاحیت کا اثر ہے کہ انہوں نے آپ جیسے شہبازِ علم کو شکار کر لیا۔ یہ کتبِ قرآن کی کرامت ہے یا امیرِ تنظیمِ اسلامی کی فراستِ مومنانہ کہ انہوں نے آپ کی رفاقت حاصل کر لی۔ اب یقیناً ان کے مشن کو توانائی ملے گی۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ اس قِرانُ السعدین کو خدا مبارک کرے۔ آمین!

آپ نے اپنی (Bio Data) تفصیل۔ خاندانی، تعلیمی، مجاہدانہ سرگزشت بیان فرمائی۔ گویا اسماء الرجال علماء و شیوخ کا ایک دفتر کھل گیا۔ آپ کے اساتذان اور مربیان تو ایک سلکِ مروارید ہے۔ جن میں نامور علماء اور عالی قدر شیوخ شامل ہیں۔

ذاتی طور پر میں خانقاہ سراجیہ مجددیہ کندیاں کے مقامِ علم و معرفت سے باخبر ہوں۔ ان کے کتب خانہ کی شہرت کو خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے سجّادہ نشین صاحبان بھی صاحبِ علم و معرفت ہوئے۔ علم کو تو ویسے بھی خدا کے یہاں عبادت پر افضلیت حاصل ہے لیکن جہاں علم و عبادت کے دو بحرین ساتھ ساتھ جاری ہوں وہاں لؤلؤ اور مرجان ہی نکلتے ہیں۔

آپ نے صوفی عبدالحمید صاحب اور ان کے برادرِ اکبر کا ذکر بھی فرمایا۔ ان دونوں اساطینِ علم سے غائبانہ تعارف اور عقیدت رکھتا ہوں اور اسے اپنے لئے منفرد اعزاز جانتا ہوں۔

حضرت مولانا اسحاق ... [illegible]

مدت ہوئی، ہدیۂ ارسال فرما کر زیر بار احسان فرمایا اور اس کے بعد ان سے تعلق خاطر دن بدن زیادہ ہو رہا ہے۔ مولانا سورتی کے درس قرآن کی انفرادیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ ان کے بعض تفسیری نکات تو اس سے پہلے کہیں بھی مجھے نظر نہ آئے۔

پھر آپ کے تعلق کا مولانا غلام غوث ہزاروی خلاصت درویش و عالم، سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے والا مجاہد، فخر ہزارہ ہی نہیں، فخر پاکستان کی زندگی کا کیا کہنا۔ ان سے واقفیت ۱۹۲۹ء تک سے تھی۔ وہ کلمۂ حق گزشتہ دور کے آمر مطلق کے سامنے کہہ سکتے تھے جہاں مشہور جگر دگردے والے سیاست دان بھی خاموش رہتے تھے۔ یہی مرد حق تھا جس نے مجلس عام میں، جب وہ آمر پیالۂ شراب بدست آیا۔ تو پیالہ اس کے ہاتھ سے چھین کر فرش پر دے مارا اور کہا "جہاں غلام غوث ہوگا وہاں کوئی شراب نہیں پی سکتا۔ وہ آمر جو اپنے شراب کے جواز کے لئے علامہ پر ہر وقت پھبتیاں کستا رہتا تھا:

"صبح حلوہ، شام حلوہ، دن حلوہ، رات حلوہ! میں تو کبھی کبھی تھکان دور کرنے کے لئے، تھوڑی سی شراب پی لیتا ہوں۔"

یہ عریضہ جواب طلب نہیں۔ بلکہ دعا طلب ضرور ہے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا والسلام طالب دعا: شیر بہادر پنی

(بقیہ: ڈاکٹر اسرار احمد کا انٹرویو)

بلیک میل کرنا شروع کر دیا تو خدانخواستہ پاکستان ہی ختم ہو جائے گا تو کم از کم اس وقت مارشل لاء پاکستان کے تحت چل رہا ہے۔ یہ ہیں ان لوگوں کے فلسفے۔ اسی لیے کوئی ادھر اتحاد کر رہا ہے اور کوئی اُدھر اتحاد کر رہا ہے۔ میں اپنا تجزیہ بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے ہاں مذہبی عناصر جتنے بھی ہیں وہ سیاسی تحریکوں کے ضمیمے بن گئے ہیں۔ اب یا تو کوئی ضیاء الحق کا ضمیمہ ہے اور کوئی ایم آر ڈی کا۔ اور انھوں نے وہ فلسفے تراشنے شروع کر دیئے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی جمہوریت ہے ہی نہیں۔ یہ درحقیقت دوسروں کو سپورٹ کر رہے ہیں۔ ایک طبقے نے ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کو بہت غنیمت سمجھا ہے اور اس کی نہت حمایت کی ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ بعض طبقے ایم آر ڈی کا ضمیمہ بن گئے ہیں۔ کچھ لوگ بیچ بیچ میں رہ گئے ہیں۔ میرے نزدیک پاکستان کی بنیاد خالص اسلام پر ہے اور اگر اس میں اسلامی انقلاب نہ آیا تو خدانخواستہ میرے نزدیک اس کا خاتمہ یقینی ہے۔ یہ اپنا تشخص کھو بیٹھے گا۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

پاکستان کی

موجودہ سیاسی کش مکش

اور

اسلام

میثاق جنوری تا مئی ۶۹ء کے اداریوں سے اقتباس

ڈاکٹر اسرار احمد

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝
(یہ تو بس ایک یاد دہانی ہے)

(۱)

پاکستانی سیاست کا دورِ جدید
اور — ہوا کا نیا رُخ

تذکرہ و تبصرہ - میثاق، جنوری ۱۹۶۹ء

(۲)

عوامی ایجی ٹیشن سے
دُوسرے مارشل لاء کے نفاذ تک

— بعض اہم حوادث و واقعات

تذکرہ و تبصرہ "میثاق" فروری ۱۹۶۹ء سے ماخوذ

(۳)

جمہوریت، سوشلزم اور اسلام

(ایضاً)

ضمیمہ

پاکستان کے سیاسی حالات پر دو مسلم بھارتی جرائد کے تبصرے

پاکستانی سیاست کے دورِ جدید کا آغاز اور ہوا کا نیا رُخ

تذکرہ و تبصرہ 'میثاق' جنوری ۱۹۶۹ء سے ماخوذ

اب سے ڈھائی تین ماہ قبل پاکستان کی سیاسی فضا میں جو زبردست طوفانی ہلچل پیدا ہوئی تھی اس کا زور تو اگرچہ اب کم ہو گیا ہے اور دوبارہ کچھ ویسی ہی سکون آمیز کیفیت سیاسی میدان پر طاری ہو گئی ہے جیسی کسی بڑے طوفان بادوباراں کے بعد فضا پر طاری ہوتی ہے۔ تاہم اس طوفان نے سیاسی میدان کے بہت سے گوشوں کو نکھار دیا ہے اور بہت سے زیرِ سطح رجحانات کو سطح پر لا کر نمایاں کر دیا ہے ——— 'میثاق' اگرچہ ملکی سیاسیات سے بالعموم زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا۔ تاہم اس وقت جو صورتِ حال سامنے ہے اس سے بالکل صرفِ نظر بھی ممکن نہیں ——— بنابریں ہم بعض مسائل و معاملات کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

میدانِ سیاست کی اس حالیہ سرگرمی کی ابتدا کچھ تو واقعتہً طوفانی انداز کی تھی اور کچھ اس بنا پر بہت زیادہ طوفانی محسوس ہوئی کہ ایک عرصے سے ہمارے ملک میں سیاست کے میدان پر قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی ——— ورنہ ظاہر ہے کہ ہر آزاد ملک میں کچھ نہ کچھ سیاسی سرگرمی تو ہر وقت ہی جاری رہتی ہے جو انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی کبھی کبھی طوفانی انداز اختیار کر لیتی ہے (جیسا کہ حال ہی میں فرانس میں ہوا تھا!) رہے درمیانی درجے کے ممالک تو ان میں تو اکثر و بیشتر سیاست چلتی ہی اس انداز پر ہے۔ مثلاً ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان سال بھر کے دوران شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اس کے کسی نہ کسی حصے میں بالکل اسی طرح کی صورتِ حال موجود نہ رہتی ہو جیسی ہمارے یہاں اس طوفان کے ابتدائی دنوں میں تھی ——— ہمارے یہاں چونکہ ایک طویل

---

[1] اگرچہ کچھ نہیں کہا جا سکتا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو!

عرصے کے تسلسل کے بعد سیاسی سرگرمی کا آغاز ہوا تھا لہٰذا کچھ تو یہ فی نفسہٖ تیز و تند (RASH) تھی اور کچھ انتظامیہ بھی اس کے لئے تیار نہ تھی چنانچہ اس کی جانب سے صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے میں شدید غلطیاں ہوئیں۔ نتیجۃً آگ مزید بھڑکی اور کچھ ایسا سماں بندھا کہ ایک بار تو بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے صدر ایوب کی حکومت خطرے پر ہے اور پاکستان فوری طور پر کسی نئی سیاسی و انتظامی صورتِ حال سے دوچار ہونے والا ہے ——— لیکن رفتہ رفتہ صورتِ حال سنبھل گئی۔ چنانچہ ایک طرف کچھ تو ایجی ٹیشن کا زور مدھم پڑا اور کچھ حکام سنبھلے اور دوسری طرف کچھ اپوزیشن کی اپنی صفوں کے بعض رخنے منظرِ عام پر آئے اور کچھ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح کی جانب سے بھی سیاسی گفتگو پر آمادگی کا اظہار ہوا ——— نتیجۃً حالات و واقعات نے کسی فوری اور ہنگامی معاملے کی بجائے مسلسل اور مستقل سیاسی سرگرمی کی صورت اختیار کر لی ——— !!

ہمارے نزدیک سیاسی میدان کی یہ سرگرمی بجائے خود ملک و ملت کے حق میں ایک فالِ نیک ہے۔ قبرستان کی سی خاموشی یا جیل کا سا "سب اچھا!" حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے چاہے کتنا ہی خوش آئند ہو کسی آزاد ملک اور زندہ قوم کے حق میں زہرِ ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں

ہمارے نزدیک عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملکی و ملی مسائل سے بھرپور دلچسپی لیں اور اپنے بھلے اور برے کے بارے میں خود سوچیں۔ اپنے ملک کے انتظامی معاملات کا فیصلہ اور اپنی قومی پالیسیوں کے رُخ کا تعین عوام کا حق ہی نہیں فرض ہے ——— اور خاص طور پر پاکستان ایسے زیرِ ترقی ملک میں تو اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ عوام انتظامیہ پر نہ صرف یہ کہ کڑی نظر رکھیں بلکہ اسے پوری طرح لگام دے کر رکھیں ورنہ سیاسیات کے اس مشہور و معروف اصول کے مطابق کہ "اختیار و اقتدار میں بے راہ روی کا رجحان فطری طور پر موجود ہوتا ہے اور اقتدارِ مطلق تو قطعاً بے راہ ہو کر ہی رہتا ہے[1]!" ایک بے لگام اور مطلق انتظامیہ کا بے راہ اور کج رو ہونا قطعی و یقینی ہے!!

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دس سالوں میں ملکی سیاست کے بازار میں خاصی رونق رہی تھی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ "پارلیمانی سیاست" کی گہما گہمی اور حالات کی تبدیلی اور واقعات و حوادث کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا ——— اگرچہ مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں کے فقدان کے باعث میدانِ سیاست کی یہ ساری گرما گرمی خیر کے بجائے شر پیدا کرتی چلی گئی۔ جس کا منطقی نتیجہ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہم نے مئی ۱۹۶۷ء میں ان ہی صفحات میں ۱۹۵۸ء کے اس فوجی انقلاب کی نوعیت، اس کے اسباب و عِلل اور عواقب و نتائج کے بارے میں جو رائے پیش کی تھی وہ حسبِ ذیل ہے :-

---

[1] "Authority tends to corrupt; and absolute authority corrupts absoutely"

"میدانِ سیاست کے اس اختلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر رفتہ رفتہ سرو سز کے جانب منتقل ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ ۵۸ء میں صدر ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر فوجی حکومت قائم کر دی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طرف حکومت کا پورا نظم و نسق طبقۂ سروسز کے حوالے کر دیا اور دوسری طرف بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سیاسی حقوق اور اختیارات کو تدریجاً عوام کے جانب منتقل کرنے کا وہی سلسلہ از سرِ نو شروع کیا جس پر تقریباً نصف صدی قبل غیر ملکی حکمران عمل پیرا ہوتے تھے — گویا پاکستان کی عوامی سیاست ایک دم واپس نصف صدی قبل کے مقام پر پہنچ گئی!

ملی اور قومی نقطۂ نگاہ سے یہ صورتِ حال یقیناً نہایت تشویشناک اور پریشان کن تھی اور ہر مخلص اور محبِ وطن پاکستانی کو لازماً اس پر سخت مضطرب اور غمگین ہونا چاہیے۔ لیکن اس حقیقت کو ہر آن پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس کا اصل سبب قوم میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی اور ملی و قومی احساسات کا خوفناک حد تک فقدان ہے! کسی ایک یا چند افراد کے سر اس پوری صورتِ حال کی ذمہ داری تھوپ دینا یا سیاسی بے بصیرتی کا شاہکار ہے یا علمی خیانت کا!"

بہرحال مارشل لا کے نافذ ہوتے ہی فطری طور پر ملکی سیاست کا بازار ایک دم بند ہو گیا اور تمام سیاسی حلقے موت و زیست کی کشمکش سے دوچار ہو گئے

مارشل لاء تو ہمارے ملک میں اگرچہ چند ہی سال جاری رہا اور چاہے کسی کو پاکستان کے موجودہ دستور سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ ۱۹۶۲ء سے ہمارے ملک میں باقاعدہ ایک دستوری حکومت قائم ہے —— لیکن بالکل ایسے جیسے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد بھی ایک عرصے تک جنوں اور شیطانوں پر ان کی ہیبت و دہشت کے اثرات قائم رہے تھے۔ ہمارے سیاسیین کو بھی مارشل لاء کے صدمے سے ہوش میں آنے میں کافی وقت لگا —— اور مارشل لاء کے خاتمے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ملک کی سیاست کے میدان میں مکمل سرد بازاری کا سماں طاری رہا!

یہ واقعہ ہے کہ مارشل لا کے صدمے سے سب سے پہلے ہوش میں آنے والی جماعت 'جماعتِ اسلامی' تھی جو سیاسی جماعتوں پر سے پابندی اٹھ جانے کے فوراً بعد ایک منظم جماعت کی حیثیت سے برسرکار ہو گئی —— اور یہ اس لئے ممکن ہو سکا کہ اس کے کارکنوں نے مارشل لا کے دوران بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنی اجتماعیت کو برقرار رکھا تھا —— دوسرے نمبر پر حرکت میں آنے والا گروپ نظام اسلام کا تھا —— مسلم لیگ کے احیاء کی کوشش ہوئی تو وہ فوراً سرکاری اور مخالفِ سرکار دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ رہے پاکستان کے اکثر قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان تو ان کی اکثریت صورتِ حال کو کچھ زیادہ امید افزا نہ پا کر بدستور

گوشۂ عافیت میں دبکی رہی۔

۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے موقع پر ۱۹۵۸ء کے بعد پہلی مرتبہ ملکی سیاست کے میدان میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح کی ہمت و جرأت نے دیمک کی طرح مارشل لا کے عصائے سلیمانی کو چٹ کر لیا۔ تب سیاسی سورماؤں کو ہوش آیا۔ اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ لیکن اب وقت کم تھا اور صدر ایوب کی سیاسی حکمتِ عملی نے انتخابات کو ملتوی کرنے سے انکار کر کے احزابِ مخالف کے ہاتھوں سے موقع چھین لیا!

اس موقع پر مخالف احزاب نے "COP" کے نام سے جو متحدہ محاذ قائم کیا تھا اس کے پاس عوام کو اپیل کرنے کے لئے تو آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کے قیام کا بھاری بھرکم نعرہ تھا لیکن تجزیے سے جو بات سامنے آتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ صدارتی طرزِ حکومت کے بجائے پارلیمانی طرز کا احیاء مطلوب تھا اور بس۔ اس مطالبے اور اس کے لئے متحدہ محاذوں کے قیام کے بارے میں ہماری پختہ رائے وہی ہے جو ہم نے مئی ۱۹۶۶ء کے متذکرہ بالا تذکرہ و تبصرہ میں عرض کی تھی یعنی یہ کہ :-

"ساتھ ہی یہ موٹی سی بات بھی ہر مخلص پاکستانی کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اس کا علاج نہ صدارتی اور پارلیمانی جمہوریت یا بلاواسطہ و بالواسطہ انتخابات کے مسئلوں پر وقتی ہنگامے اٹھانے سے ہو سکتا ہے نہ مینڈکوں کی پنسیری کی طرح کے بالکل اٹل بے جوڑ متحدہ محاذوں کے قیام سے ———! اس صورتِ حال کی اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ بالکل فطری طریق پر عوام میں سے کوئی سیاسی جماعت ایسی اٹھے جو مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جد و جہد کے ذریعے ایک طرف ان میں سیاسی شعور اور اپنے بھلے اور برے کی حقیقی پہچان پیدا کرے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ایسے قومی کارکنوں کو تربیت دے کر تیار کرے جو ہر طرح کے مفادات سے صرفِ نظر کر کے خاص اصولوں کے لئے کام کر سکیں اور اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور قوم کی بہتری اور بھلائی کے لئے انتھک محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی صلاحیت رکھتے ہوں ———!"

۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کے چار سالوں کے بعض حالات و واقعات کا تذکرہ ملک کی موجودہ سیاسی صورتِ حال کے صحیح تجزیے اور ان مختلف عوامل کے صحیح فہم کے لئے ناگزیر ہے جو اس وقت ملک کی سیاسی فضا میں برسرِ کار ہیں۔

۱: ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران جو زلزلہ سا صدر ایوب کے ایوانِ اقتدار میں محترمہ فاطمہ جناح کی شرکت کے باعث آ گیا تھا۔ اس سے خبردار ہو کر صدر ایوب نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے اور اس غرض کے لئے اپنی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر ازسرِنو منظم کرنے کی جانب توجہ کی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے انہوں نے سر توڑ کوشش کی۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں جبکہ احزابِ اختلاف کچھ تو اپنی انتخابی شکست کے زخم

چاہتے ہیں معروف تھیں اور کچھ باہم دست و گریباں بھی ہو گئی تھیں۔ کنونشن لیگ کی تنظیم نو کا خاصہ چرچا ہوا اور کچھ عرصے تک تو یہ محسوس کیا گیا کہ شاید آئندہ اس ملک کی واحد سیاسی تنظیم سرکاری لیگ ہی ہوگی ـــــ لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ نہ تو صدر ایوب عوام میں کوئی "جذبہ تازہ" پیدا کر سکے اور نہ ہی مخلص اور محنتی کارکنوں کی کوئی ٹیم تیار کر سکے ـــــ چنانچہ ادھر کچھ عرصے سے صدر ایوب کے قریبی حلقے کے لوگ بھی برملا اعتراف کر رہے ہیں اور غالباً حالیہ سیاسی ہنگاموں کے بعد تو صدر ایوب خود بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کو ایک منظم اور فعال جماعت بنانے کی کوشش میں قطعاً ناکام ہو گئے ہیں اور اس کوشش میں جو وقت اور سرمایہ صرف ہوا وہ اکثر و بیشتر ضائع ہو گیا ہے!

> حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں کسی عوامی جدّ و جہد کے دوران محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے ذریعے منظم و مستحکم ہوا کرتی ہیں اور مصائب و تکالیف کے الاؤ اور ابتلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹیوں سے گذر کر ہی ان کے کارکنوں کا مس خام کندن بنتا ہے۔ مسندِ اقتدار تک رسائی کے بعد سے تو فوری طور پر کسی سیاسی جماعت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ حکومت کے ایوانوں اور اقتدار کی مسندوں پر بیٹھ کر سیاسی جماعتوں کی تنظیم کی کوشش ویسا ہی احمقانہ خیال ہے جیسا یہ منصوبہ کہ پہلے سیدھے یا ٹیڑھے جس راستے سے بھی ممکن ہو اقتدار پر قبضہ جما لیا جائے اور پھر اس کے ذریعے ایک عوامی اسلامی انقلاب برپا کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ کنونشن لیگ سے منسلک لوگوں میں سے اکثر و بیشتر کی اصل نظر مفادات پر ہے اور ان ہی کی باہمی بندر بانٹ پاکستان مسلم لیگ کی اصل اجتماعی سرگرمی ہے نہ اس کے پاس مخلص کارکن ہیں اور نہ ہی عوام کی پشت پناہی اسے حاصل ہے ـــــ نتیجۃً صدر ایوب کی حکومت یا تو خود ان کی اپنی ذات کے بل پر قائم ہے یا سرو سنز کے سہارے، اس کی کوئی حقیقی اور واقعی سیاسی اساس موجود نہیں ہے۔

۲: ۶۵ء کی پاک ہند جنگ بلاشبہ گذشتہ صدارتی انتخابات کے بعد کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ملک کے بقا و دفاع اور خاص طور پر اس کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے ہی، ملک کی داخلی سیاست پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس سترہ روزہ جنگ کے اسباب و علل سے تو سرے سے کوئی بحث ہی نہیں، اس کے تمام عواقب و نتائج کا استقصاء بھی مطلوب نہیں البتہ ان میں سے چند ایسے امور کا تذکرہ ناگزیر ہے جن کا براہ راست تعلق ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال سے ہے۔

ان میں سے اہم ترین امر تو یہ ہے کہ اس جنگ کے جو نتائج برآمد ہوتے ان کی بنا پر صدر ایوب کی سیاسی حیثیت کو شدید دھچکا لگا اور ان کا جو ستارہ دنیائے ایک عظیم رہنما تا نا دیگر ایشیائی ڈیگال کی حیثیت میں عروج کی جانب حرکت کر رہا تھا ایک دم زوال پذیر ہو گیا۔

● دوسرے یہ کہ پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی جو چند سال قبل سے مسلسل ایک خاص رخ پر بڑھتی چلی جا رہی تھی ایک انتہا پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رک گئی بلکہ واپس قدیم سمت میں گردش کرنے لگی ـــــ اور بہ ظاہر احوال یہی اس میں کم از کم اعتدال کا رنگ نمایاں ہو گیا۔

● تیسرے یہ کہ مسلم قومیت کا جو جذبہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنا تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی سرد پڑ گیا تھا۔ اس جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ ایک دم پھر بیدار ہوا بلکہ ایک بار پھر اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا۔ اگرچہ اس کا یہ زور شور (TEMPO) اب کی بار بھی عارضی ہی ثابت ہوا اور جنگ کے بعد جلد ہی یہ جذبہ پھر سرد پڑنا شروع ہو گیا۔

پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی اور پاکستانی قومیت دونوں کے اعتبار سے پاکستان کی سیاسیات میں جو مدّ اس جنگ کے دوران آیا تھا صدر ایوب کو تو اپنی مخصوص ذمہ دارانہ حیثیت کی مجبوریوں کی بنا پر اسے ایک خاص حد تک لے جانے کے بعد واپس جزر کی جانب لوٹنا پڑا ـــــ لیکن ان کے اپنے ایک تربیت دادہ نوجوان ساتھی نے مدّ سے جزر کی جانب رجوع سے انکار کر دیا اور وہ اسی مقام پر کھڑا رہ گیا۔ نتیجۃً اس نے اس مدّ کے لئے علامتی حیثیت اختیار کر لی ـــــ بس یہیں سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اصل ذاتی سیاسی زندگی اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہو گیا!!

۳: قدیم سکّہ بند احزابِ اختلاف، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کچھ عرصہ تو کچھ اپنی انتخابی شکست کے زخموں کو سہلانے میں مصروف رہیں اور کچھ باہمی اختلافات میں الجھی رہیں اس کے فوراً بعد ۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ واقع ہو گئی جس میں پوری قوم متحد اور یکسو تھی اور اختلاف و افتراق کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد اعلانِ تاشقند سے انہیں صدر ایوب کی حکومت کے خلاف عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کا ایک سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اور مخالف جماعتوں کے جوشیلے کارکن اس پر مُصر بھی تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن بعض 'بزرگ سیاست دانوں' نے عوامی ایجی ٹیشن کی تجویز کو رد کر کے ایک پُر امن آئینی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی، عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان کے قومی جمہوری محاذ پر مشتمل ایک متحدہ محاذ پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (PDM) کے نام سے معرضِ وجود میں آ گیا جو تقریباً دو سال سے سہل انداز میں اور سبک چال سے لیکن بڑے تسلسل و استقلال کے ساتھ دھیمے دھیمے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مسٹر بھٹو نے ہنگامہ کھڑا کر کے اسے بالکل نئی صورت حال سے دو چار کر دیا۔

پی ڈی ایم کو اس بات کا کریڈٹ بہرحال دیا جانا چاہیئے کہ اس نے تقریباً دو سال تک بحالی جمہوریت کے لئے بڑی مستقل مزاجی سے کام کیا ہے اور اس کے لئے واقعی اور حقیقی محنت کی ہے۔ اور اگرچہ وہ جس شائستہ اور بے ضرر قسم کے طریق کار کی عادی ہے اس سے کسی بھی حکومت کو فوری طور پر خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ایک ملک کی اپنی نوکر شاہی (BEAUROCRACY) کی حکومت کو جو ایک حقیقی

واحی جمہوری حکومت کے سوائے باقی تمام قسم کی حکومتوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے ——— تاہم اس میں شک نہیں کہ کم ازکم پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پی ڈی ایم کی حالیہ دو سالہ جدّ و جہد ایسی منظّم اور مسلسل اور آئینی و پرامن جد و جہد کی کوئی دوسری مثال جماعت اسلامی کی ابتدائی دستوری مہموں کے سوا نہیں ملتی

اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ P D M کا اصل تنظیمی ڈھانچہ بھی جماعت اسلامی ہی کے سہارے قائم ہے اور اس کی اصل روحِ رواں بھی جماعت اسلامی ہی ہے۔ پی ڈی ایم میں شامل دوسری تمام جماعتیں اور پارٹیاں چند معروف سیاست دانوں کی باہمی ایسوسی ایشنوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں وہ اصل جماعتی تنظیم جس کے بل پر پی ڈی ایم کا سارا کاروبار چل رہا ہے صرف جماعت اسلامی کی ہے۔

پی ڈی ایم کے بارے میں ایک اور اہم بات جو پیشِ نظر رہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس پر دائیں بازو کے رجحانات کا فیصلہ کن غلبہ ہے۔ بائیں رجحانات کے حامل صرف نہایت نرم طبع اور معتدل مزاج لوگ ہی اس میں کھپ سکے ہیں اور انہیں بھی جلد یا بدیر اس سے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی ——— یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس اعتبار سے بھی اصل علامتی حیثیت اس گروہ میں جماعت اسلامی ہی کو حاصل ہے اور یہ جیساکہ ہم بعد میں قدرے تفصیل سے عرض کریں گے۔ اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے ایک بہت بڑی بدقسمتی کا آغاز ہے۔

: سوشلسٹ ذہن اور بائیں بازو کے رجحانات مشرقی پاکستان کی حد تک تو کم ازکم اتنے ہی 'قدیم' ہیں جتنا خود پاکستان، لیکن مغربی پاکستان میں یہ رجحانات زیادہ تر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ابھرے ہیں۔ اور گذشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رجحانات تیزی کے ساتھ پھیلے بھی ہیں اور مختلف تنظیمی ہیئتوں کی شکل میں نمودار بھی ہوئے ہیں۔ اس کا ایک سبب ملک کی معیشت میں 'صنعتی انقلاب' کے اثرات بھی ہیں جن سے موجودہ استحصالی نظامِ معیشت کی گھناؤنی صورت کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیکاری سے بھی ان رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری گذشتہ پانچ چھ سال کی خارجہ پالیسی نے بھی جس کے مدّو جزر کے جانب ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں ان رجحانات کو تقویت دی ہے ——— غرض کہ مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی قوت کی صورت اختیار کرلی ہے۔

مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں، لیکن ان کے اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے۔ اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تا حال سامنے نہیں آئی تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (NUCLEUS)

ہوگا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

۵۔ گذشتہ دو ڈھائی سال کے دوران تدریجاً ایک اور قوت بھی پاکستانی سیاست کے منظر عام پر نمودار ہوئی ہے ہماری مراد جمعیت علمائے اسلام سے ہے جس نے اس عرصے میں رفتہ رفتہ خاصی قوت بہم پہنچالی ہے اور اپنے منتشر اثرات کو خاصا مضبوط تنظیمی سلسلے میں منسلک کر لیا ہے۔ یہ تنظیم اگرچہ اپنی ہیئت اور نوعیت کے اعتبار سے دوسری تنظیموں مثلاً جماعت اسلامی سے بہت مختلف انداز کی ہے (مثلاً اس کے یہاں کا غذی کارروائی اور دفتری نظام شاید بالکل ہی دقیانوسی اور PRIMITIVE طرز کا ہو) لیکن ایک مشترک ذہنی ساخت اور مشترک انداز فکر اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شاندار ماضی کے ورثے کی بنا پر اس گروہ نے بہت جلد ایک نہایت منظم اور فعال فطری تنظیم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عوام میں اس کی جڑیں انتہائی زیریں سطحوں (SUBSTRATA) تک گہری اتری ہوئی ہیں۔ دینی مدارس اس کے مستقل مراکز اور اللہ کے گھر اس کے مستقل دفاتر ہیں۔ اس کے عام کارکن ہی نہیں اکابر تک سب خالص عوامی کارکن ہیں، سادگی، دینداری اور غایت درجہ خلوص کے ساتھ نہایت زوردار جذبۂ عمل اس کے شعار ہیں۔ ان تمام چیزوں کے پیش نظر یہ اندازہ قطعاً مبالغہ پر مبنی نہیں ہے کہ آئندہ پاکستان کی سیاست کے میدان میں جمعیت علمائے اسلام نہایت موثر رول ادا کرے گی۔

ہم انہی صفحات میں چند ماہ قبل یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ گروہ ذہناً و قلباً خالص حسینی[1] ہے۔ یعنی علمائے دیوبند کے اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے سرگروہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح تھے۔ اس طرح ان کا تعلق تحریک آزادیٔ ہند و استخلاص وطن کے اس قدیم و عظیم سلسلے سے جا ملتا ہے جو تحریک شہیدینؒ سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی سے ہوتا ہوا اور پھر تحریک خلافت اور ریشمی رومالوں کی تحریک ایسی دوسری مستند و چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے گزر کر بالآخر جمعیت علمائے ہند پر ختم ہوا تھا۔ اور اس پورے عرصے میں اسلامیان ہند کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا رہا تھا۔ آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل مسلمانان ہند کی ایک عظیم اکثریت نے اس گروہ کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا جو بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اوّل اوّل اس طبقے پر شکست کا احساس طاری رہا۔ اور ان حضرات نے ایک عرصے تک حلقۂ دیوبند کے ان دوسرے اکابر کی سیادت قبول کر کے جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا گوشۂ عافیت میں پناہ لے رکھی ۱۹۵۳/۵۲ء میں مجلس احرار اسلام نے جو عظیم سیاسی ایجی ٹیشن برپا کیا تھا اس کی پشت پر اصل قوت اسی گروہ کی تھی۔ اس کے فوراً بعد جب پاکستانی سیاست میں انتشار پیدا ہوا اور مسلم لیگ کو فیصلہ کن سیاسی حیثیت حاصل نہ رہی تو اس گروہ نے بھی اپنی حامیٔ مسلم لیگ قیادت کا جُوا گردن سے اتار پھینکا اور خالصتاً اپنا اصل اور قدیم رنگ اختیار کر لیا۔

---

[1] اس اہم موضوع پر ہم مفصل اظہار خیال مارچ ۱۹۶۷ء کے تذکرہ و تبصرہ میں کر چکے ہیں۔

——— اس وقت سے اب تک اندر ہی اندر ان کی تنظیم وسعت اختیار کرتی رہی اور اس کے کارکنوں میں
یہ بیدار ہوتا رہا ——— گذشتہ سال ان کی جو کانفرنس لاہور میں موچی دروازے کے باہر ہوئی تھی۔ اس
ہو گیا تھا کہ جلد ہی جمیعت پاکستان کی ملکی سیاست میں موثر طور پر دخیل ہو گی ——— اور واقعہ بھی
رشل لاء کے بعد سے جو سکوت و سکون پاکستانی سیاست پر طاری تھا اور لوگ جس طرح سہمے سہمے سے تھے اس
ل اور اوّلین سیاسی سرگرمی جمیعت ہی کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ ہماری مراد اس کامیاب ایجی ٹیشن سے ہے جو
الرحمان کی کتاب کے خلاف برپا ہوئی تھی اور جس سے چھٹکارا پانے کے لئے حکومت وقت کو ڈاکٹر صاحب
قربانی کا بکرا بنانا پڑا تھا!

ں گروہ کے بارے میں اہم ترین بات جو نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا رجحان بائیں بازو
ا جانب ہے اور چاہے اس کا سبب مغربی استعمار سے شدید نفرت کا وہ قدیم جذبہ ہو جو انہیں اپنے
سلاف سے ورثے میں ملا ہے اور گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے، چاہے یہ واقعہ ہو کہ چونکہ یہ خود ایک
مالص عوامی قوت ہیں لہذا عوام کی دقتوں اور مشکلات کا زیادہ قریبی احساس رکھتے ہیں، اور
ہا ہے یہ ہو کہ ماضی میں ان کا اشتراک عمل جس عظیم سیاسی تحریک کے ساتھ رہا ہے (ہماری مراد ماضی کی
مڈین نیشنل کانگرس سے ہے!) اس پر بالعموم سوشلسٹ خیالات کا غلبہ تھا ——— سبب یا اسباب
راہ کچھ بھی ہوں بہرحال واقعہ یہی ہے کہ جمیعت علمائے اسلام کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے۔ اور
ا ہے اس کے اکابر و رہنما خالص اور بے آمیزش اسلام ہی کے علمبردار ہوں۔ اس کے کارکنوں میں کثیر
عداد ایسے جوشیلے لوگوں کی شامل ہے جو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند نظری طور پر درست اور بحالات
وجودہ عملاً لازمی خیال کرتے ہیں ——— !

، وجہ ہے کہ مشرق اوسط کی سیاست میں بھی یہ حضرات صدر ناصر کے حامی و مؤید اور شاہ فیصل کے ناقد و
ں ——— اور تازہ سیاسی ہنگامے میں بھی ان کی شرکت اوّلاً نیشنل عوامی پارٹی اور بھٹو صاحب کی
پیپلز پارٹی کے شانہ بشانہ ہوئی ہے۔ اس صورت حال کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان
ں پر جب مولانا مودودی نے غیر معمولی گھن گرج کے ساتھ سوشلزم کے حامیوں کو چیلنج کیا تو اس کے جواب
ء علمائے اسلام کے سرکاری آرگن ترجمانِ اسلام نے "مودودی صاحب کی تازہ گھن گرج" کے عنوان
: فرمایا کہ :-

منے ملک کی سرد آب و ہوا سے صحت یاب ہو کر مودودی صاحب پاکستان کے نسبتاً گرم ماحول میں تشریف
، چکے ہیں جس کی گرمی میں کافی اضافہ ان کی غیر حاضری کے دوران کے پیدا شدہ گرم سیاسی موسم نے کر رکھا ہے
نپ نے ۔ سو دسمبر کی شام کو لاہور میں مختلف حصوں سے آئے ہوئے اپنی جماعت کے کارکنوں سے زبردست
ھن گرج کے عالم میں فرمایا کہ " جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک کسی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ یہاں
سلام کے سوا کسی اور نظام کو لا سکے " ۔ مودودی صاحب کی یہ گھن گرج اگر اس دعویٰ کی حقیقتاً حامل
ہوتی اور اپنے ان فرمودات کے دوسرے حصوں میں خود ہی انہوں نے اپنی اس "گھن گرج" کی بالمعنیٰ تردید
نہ فرما دی ہوتی تو اس اعلان کا خیر مقدم پاکستان کا ہر دین دار مسلمان تہ دل سے کرتا۔ لیکن ہے ا سے

کیا سمجھئے کہ اس ساری "گھن گرج" کا مقصد صرف یہاں پہنچ کر ختم کر دیا گیا کہ "اسلام اور سوشلزم کا پیوند لگانا ممکن نہیں" اور یہ کہ "یہ محمد عربی صلعم کی اُمّت کا ملک ہے، یہ مارکس یا ماؤزے تنگ کی اُمّت کا ملک نہیں ہے" ـــــ سوال یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے پیوند کا انکار کرنے والا اسلام اور برطانوی پارلیمانی نظام کے پیوند کا بھی انکار کیوں نہیں کرتا؟ اور محمد عربی صلعم کی اُمّت کے اس ملک کے مارکس اور ماؤزے تنگ کی امت کا ملک ہونے کی نفی کرنے والا اس ملک میں اس برطانوی سیاسی نظام کی بحالی کی جد و جہد میں کیوں مصروف ہے؟ جو کلیڈ اسٹون، لائڈ جارج، چرچل وغیرہ کا تراشیدہ اور رائج کردہ ہے؟ آخر اسلامی نظام کے قیام کی یہ جدوجہد بانگ صدا صرف سوشلزم کے ہی مقابلہ میں کیوں اتنی "گھن گرج" دکھاتی ہے اور کیوں برطانوی پارلیمانی نظام کی حمایت میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس نظام کے ہر چھوٹے بڑے جزو کو بھی قبول کرتی چلی جاتی ہے۔" (ترجمان اسلام ۱۰ جنوری ۶۹ء)

الغرض ایک طویل مدت کے حبس کے بعد جو طوفانی کیفیت گذشتہ ڈھائی تین ماہ کے دوران پاکستانی سیاست کے میدان پر طاری رہی تھی اس کے مدھم پڑتے ہی جو نئی صورت حال سامنے آئی ہے اور گذشتہ چند سالوں سے جو رجحانات زیر سطح تقویت پاتے رہے ہیں ان کے ایک دم سطح پر آجانے سے سیاست کی جو تازہ بساط پاکستان میں بچھی ہے اس کا مختصر نقشہ یہ ہے :۔

۱ : جہاں تک حکومت وقت کا تعلق ہے وہ کچھ ایک فرد کی ذاتی شخصیت کے سہارے اور زیادہ تر نوکر شاہی کے بل پر قائم ہے اس کی عوامی و سیاسی جڑیں اوّل تو کوئی ہیں ہی نہیں اور جو ہیں ان کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ ان اضافی جڑوں (ADVENTITIOUS ROOTS) کی سی ہے جو بعض درختوں (مثلاً برگد) کی شاخوں سے اتر کر زمین میں پیوست ہو جاتی ہیں اور درخت کے پھیلاؤ کے لئے اضافی سہاروں کا کام دیتی ہیں۔

۲ : پاکستانی سیاست کا وہ دور اب گذر چکا جب سیاست صرف اصحاب دولت و ثروت کے مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی اور گنتی کے چند جاگیردار اور سرمایہ دار (جن میں تازہ اضافہ بعض نو دولتیے صنعت کاروں کا ہوا تھا) اس پر کامل اجارہ داری رکھتے تھے۔ اب یہاں عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو گیا ہے اور وہ دور قریب آیا چاہتا ہے جس کی خبر علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں دی تھی کہ ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور ؎

گیا دور سرمایہ داری گیا تماشہ دکھا کر مداری گیا

۳ : پاکستان کی موجودہ بساطِ سیاست کے عناصر اربعہ حسب ذیل ہیں۔ ایک دائیں بازو کے قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان جو اکثر و بیشتر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ اس وقت متعدد سرکاری و غیر سرکاری لیگوں میں منقسم ہیں لیکن درحقیقت "ملت واحدہ" ہیں اور کسی بھی وقت ع "آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک" کے مصداق باہم متحد ہو سکتے ہیں ـــــ دوسرے دائیں بازو کی منظم مذہبی جماعت ـــــ جماعت اسلامی۔ ـــــ تیسرے بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں جن میں سے کچھ فی الوقت پی ڈی ایم (یا تازہ تر ڈی اے سی) میں شامل ہیں اور کچھ اس کے باہر ہیں ـــــ چوتھے

بائیں بازو کی مذہبی جماعت —— جمعیت علمائے اسلام

۳: پاکستان کی آئندہ سیاست کا اصل محور (AXIS) دائیں اور بائیں بازوؤں کے رجحانات کا تصادم ہوگا اور متذکرہ بالا موجودہ بساطِ سیاست میں جو گروہ بندیاں اس محور کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہیں یا ابھی قائم ہو رہی ہیں وہ جلد یا بدیر ٹوٹ کر رہیں گی اور نئی صف بندی (ALIGNMENT) اسی محور کے گرد ہوگی۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ حذر، لیکن قطعاً یقینی امر یہ ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کی بیرونی قوتیں بھی اب پاکستانی سیاست میں پہلے سے کہیں زیادہ دخیل ہوں گی اور اپنے اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کے دفاع اور ان میں توسیع کے لئے زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گی۔

۱؎ جس کی ایک ناخوشگوار ابتداء لاہور اور کراچی میں دائیں بازو کی انتہائی جماعت یعنی جماعت اسلامی اور بائیں بازو کے انتہا پسند لوگ یعنی پی پی پی کے کارکنوں کے سر پھٹول کی شکل میں ہو چکی ہے۔

عوامی ایجی ٹیشن سے دوسرے مارشل لا کے نفاذ تک

بعض اہم حوادث و واقعات

(۱)

ماخوذ از تذکرہ و تبصرہ میثاق فروری ۱۹۶۹ء

مظاہروں اور ہنگاموں کا دوسرا دور

گزشتہ ماہ کا تذکرہ و تبصرہ ہم نے اس نسبتاً پرسکون وقفے کے دوران تحریر کیا تھا جو پاکستانی سیاست کے میدان میں پہلی طوفانی ہلچل کے بعد کچھ دنوں کے لئے آیا تھا اور اگرچہ ہم نے اس وقت کی سکون آمیز کیفیت کے بارے میں اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ "عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو"! تاہم واقعہ یہ ہے کہ ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس قدر فوری طور پر ایک دوسرا طوفان آ جائے گا جس کی تیزی و تندی سابقہ تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گی!

بہرحال متوقع یا غیر متوقع، طوفان کا یہ دوسرا ریلا تھا بہت سخت، جس میں معاملہ جلسوں، جلوسوں، مظاہروں، لاٹھی چارج اور اشک آور گیس کے استعمال سے بہت آگے نکل کر عوام کی طرف سے توڑ پھوڑ، لوٹ مار، آتش زنی و خشت باری بلکہ بعض مقامات پر جابجا ہتھیاروں کے استعمال تک —— اور حکومت کی جانب

سے پولیس کی فائرنگ، فوج کی طلبی اور کرفیو کے نفاذ تک جا پہنچا چنانچہ مشرقی و مغربی پاکستان کے درجن بھر بڑے بڑے شہروں میں مسلسل کئی روز تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا اور شہری زندگی پر کامل تعطل کی کیفیت طاری رہی ——— اور اگرچہ ان سطور کی تحریر کے وقت صورت حال یہ ہے کہ بالعموم حالات پر قابو پایا جا چکا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ فوج کی آمد اور کرفیو کے نفاذ کے بعد کسی جگہ سے بھی کسی خاص واقعے یا حادثے کی اطلاع نہیں ملی۔ چنانچہ اکثر مقامات سے کرفیو اٹھایا بھی جا چکا ہے تاہم حالات کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیئے جا سکتے اور عین ممکن ہے کہ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ ناخوشگوار واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

لاقانونیت اور انارکی

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست سخت تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے اور ملک و قوم کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ جماعتی سیاست کے تقاضوں سے بلند تر ہو کر خالص ملی و قومی سطح پر غور و فکر کریں اور اس پیچیدہ صورت حال کو جلد از جلد سلجھانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ سیاسی ایجی ٹیشن کے اس دوسرے ریلے میں لاقانونیت اور انارکی کا رنگ غالب تھا اور اگرچہ تمام مخالف جماعتوں نے تخریبی سرگرمیوں کی ذمہ داری سے اظہار برأت کیا ہے اور توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کی ساری ذمہ داری کسی قدر غنڈہ عناصر پر اور زیادہ تر خود حکام کے غلط اقدامات پر ڈالی ہے اور یہ الزام بھی لگایا ہے کہ یہ ساری کارروائی حکام نے سخت تر اقدامات کا جواز مہیا کرنے کے لئے از خود اپنے ایجنٹوں سے کرائی ہے تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ عوامی سطح پر سیاسی شعور اور جماعتی تنظیم کی ابھی ہمارے یہاں بہت کمی ہے اور اپوزیشن کسی طرح بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ قوم کی ایک ایسی واضح اکثریت کا اعتماد و تعاون اسے حاصل ہے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک کو طے کردہ خطوط پر چلانے اور اسے کوئی غلط رخ اختیار کرنے سے روکنے پر قادر ہے۔

آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے ایک مرتبہ اپنی سیاسی تحریک کو عین عروج کے موقع پر محض اس بنا پر ایک دم بند کر دیا تھا کہ ایک مشتعل ہجوم نے ایک تھانے پر حملہ کر دیا تھا اور اس کے باوجود کہ ان کے تمام اہم رفقاء اس پر سخت برہم ہوئے تھے اور مُصر تھے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے تھے اور گویا ان کا موقف یہ تھا کہ ایسے واقعات کا ظہور ہماری سیاسی پوزیشن کی کمزوری اور عوام پر ہماری گرفت کی کمی کا ثبوت ہے اور ہمیں ابھی ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

کے مصداق عوامی تحریک چلانے سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی توجہات عوام کے سیاسی شعور کی تربیت اور عوامی تنظیم کے استحکام پر مرکوز کرنی چاہئیں۔

ہمارے یہاں، جیساکہ ہم نے گزشتہ ماہ میں عرض کیا تھا اس وقت عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بالکل شروع ہی سے سیاست کے میدان میں صحت مند روایات قائم ہوتی چلی جائیں اور مختلف الخیال عناصر اپنی اصل توجہ رائے عامہ کو بیدار کرنے اور اپنی جماعتی تنظیم کو مستحکم کرنے پر صرف کریں۔ ہلڑبازی اور ہنگامہ آرائی میں کسی کی بھی خیر نہیں ہے اور تخریبی سرگرمیوں سے موجودہ حکومت ہی کو پریشانی نہیں ہوگی بلکہ اگر یہ عادت پختہ ہو گئی تو آئندہ بھی ہر حکومت کو مسلسل دقت کا سامنا رہے گا۔ ہمارا سیاسی شعور ابھی بہت کچھ پختگی کا محتاج ہے اور اس نیم خام و نیم پختہ حالت میں اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ تمام محب وطن اور محب قوم عناصر پوری طرح ہوشیار رہیں۔ مبادا ملک و ملت کے دشمن انارکی کے پردے میں قوم و وطن کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

طلبہ کا مسئلہ

خاص طور پر طلبہ کا مسئلہ اس وقت نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ ان میں عام بے چینی اور اضطراب کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں اور یہ مسئلہ صرف ہمارے ملک کا ہی نہیں پوری دنیا کا ہے۔ تہذیب جدید نے انسان کو روحانی قدروں سے جس طرح بے گانہ کیا ہے اور اخلاقی معیارات جتنی تیزی سے پست ہوتے ہیں اس کا مظہر اتم بہرحال نوجوان نسل ہی کو ہونا چاہیے اور کسی اعلیٰ نصب العین کے فقدان کے باعث جو عجیب خلا انسانی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے اس کا سب سے نمایاں اثر بھی نوجوان طلبہ ہی میں نظر آنا چاہیے۔ ان پیچ در پیچ اسباب کی بنا پر پوری دنیا میں نوجوان طلبہ کے طبقے کی کیفیت بالکل بارود کی سی ہے جو ذرا سی چنگاری سے بھڑک اٹھنے کو تیار ہوتا ہے۔ پھر خاص طور پر زیر ترقی ممالک کے اپنے مخصوص مسائل ہیں جن سے طلبہ کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا ہے —— چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہ طبقہ ع "دیوانہ را ہوئے بس است!" کے مصداق گویا منتظر ہی تھا کہ کہیں سے کوئی صورت ایجی ٹیشن کی پیدا ہو اور یہ اس میں کود پڑیں۔

گزشتہ چند سالوں کے دوران ہماری حکومت نے طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں پر جو پابندیاں عائد کیے رکھی ہیں ان سے بھی ان کے اندر ہی اندر ایک لاوا سا پکتا رہا ہے جسے بہرحال ایک نہ ایک دن پھٹنا تھا چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حالیہ سیاسی ایجی ٹیشن میں اصل زور شور طلبہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور موجودہ سیاسی ہنگامے ان ہی کی رہین منت ہے۔ تین ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ یونیورسٹیاں اور کالج بند ہیں اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ قطعاً معطل پڑا ہے۔ اور اب بھی اگرچہ کچھ کالج کھل گئے ہیں بہت سے طالب علم کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں اور اس کے باوجود کہ ان کے کچھ مطالبات تسلیم بھی کیے جا چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے گویا ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں لیکن ان کا ایجی ٹیشن علی حالہ قائم ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی کمی نہیں آ رہی بلکہ ان کے مطالبات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے —— حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے تو اپنے مطالبات میں تمام سیاسی طبقات کے جملہ مطالبات کو شامل کر لیا ہے۔

یہ صورت حال بھی متقاضی ہے کہ ملک و ملت کے بہی خواہ اس پر بیٹھ اپنے اپنے جماعتی و گروہی نقطہ ہائے نظر سے ہٹ کر قومی و ملی نقطہ نظر سے سوچیں۔ جو سیاسی حلقے طلبہ کو اپنے مخصوص سیاسی انقلاب کے لئے استعمال کرنے کی کوشش میں ہیں وہ درحقیقت آگ سے کھیل رہے ہیں اور انہیں کسی طرح قوم اور وطن کا بہی خواہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سیاست اصلاً ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو تعلیم سے فارغ ہو کر ملک کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طلبہ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنے زمانہ تعلیم میں آئندہ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کریں۔ اسی تعلیم و تربیت کا ایک جزو یقیناً سیاسی شعور اور ملی و قومی مسائل کی سوجھ بوجھ بھی ہے۔ لیکن دوران تعلیم کسی سیاسی دھڑے کا آلہ کار بننا طلبہ کے اپنے مستقبل کے اعتبار سے بھی نقصان دہ ہے اور ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبارات سے بھی سخت مضر ہے۔

صدر ایوب کی مصالحانہ روش

اس تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا ردعمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لئے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورت حال کو صرف "بعض شرپسند لوگوں" کی جانب منسوب کر کے تشدد کی راہ اختیار کر لیتے اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقیناً دانش مندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہیے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی صاف محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کئے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی عنصر کے لئے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں۔ انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے، معاملہ جو بھی ہو سکتا ہے، دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہو سکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں ——— لہٰذا اصل خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی ——— پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے۔ مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لئے بھی بہت مشکل ہو گئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ "آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک" کی سی کیفیت سے بغل گیر ہو جانا چاہیے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود

پورا ہوگا ——— اور انتشار، لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورت حال کے پیشِ نظر ہمارے نزدیک فی الوقت ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح ترجیح ہے۔

اس مقصد کے لئے اس وقت خاص طور پر ایسے لوگوں کو میدان میں آنا چاہئیے جو تحریک مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہے تھے۔ لیکن بعد میں مختلف اسباب کی بنا پر میدانِ سیاست سے ہٹتے اور گوشہ گیر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ اس وقت نہ کونسل لیگ سے وابستہ ہیں نہ کنونشن لیگ سے ——— متحدہ ہندوستان جب انگریزی غلامی سے نجات پانے کی جد و جہد میں مصروف تھا تو بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جب حکومت وقت اور تحریک آزادی کی علمبردار جماعتوں کے مابین کسی مسئلے پر ڈیڈلاک ہو جاتا تھا تو کچھ ایسے لوگ حرکت میں آتے تھے جو اپنی نرم طبیعت اور دھیمے مزاج کی بنا پر سرکار دربار میں بھی رسائی رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی مخلص محب وطن بھی تھے۔ ایسے لوگ اگرچہ نہ تاریخ تحریک آزادی میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں نہ ہی عوام نے انہیں کبھی اپنا ہیرو تسلیم کیا۔ تاہم اصحاب فہم و بصیرت جانتے ہیں کہ حصول آزادی کی جد و جہد میں انہوں نے بھی ایک مثبت کردار ادا کیا ہے ——— ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ ہماری ملکی سیاست کی موجودہ پیچیدہ صورت حال بھی کچھ ایسے ہی لوگوں کے ناخن تدبیر سے سلجھ سکتی ہے۔ اور اگر ایسے لوگ اس مرحلے پر سامنے نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ صورت حال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جائے گی اور انتشار بڑھتا چلا جائے گا جس سے پاکستان کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

(۲)

ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق مارچ ۱۹۶۹ء

غیر فوجی انقلاب

وقت کا وہ اہم تقاضہ جس کی جانب ہم نے گذشتہ ماہ اشارہ کیا تھا ہونے کو تو پورا ہو گیا لیکن جو "موانع و مشکلات" اس کی راہ میں پیش آئی ہیں اور ان کے دوران پاکستان اپنی سیاسی تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گذرا ہے اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔

صدر ایوب کی گفت و شنید کی دعوت نے پوری ڈی۔ اے۔ سی کو بالکل اچانک آ لیا تھا چنانچہ کچھ عرصہ تو وہ عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا رہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ صدر ایوب تو ایک فرد تھے انہوں نے ایک رخ پہ چلتے چلتے اچانک اباؤٹ ٹرن کر لیا۔ لیکن ایک تحریک کی رواں دواں گاڑی کو تو بریک لگاتے لگاتے بھی آخر وقت لگتا ہے۔ دوسری جانب یہ خطرہ بھی واقعی اور حقیقی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ایک قیادت عوامی تحریک کو بریک لگا کر نیچے اترے ادھر دوسری قیادت اس کے انجن کو دوبارہ سٹارٹ کر کے لے کر چلتی بنے۔ تیسری طرف یہ معاملہ بھی صاف تھا کہ اب یہ عوامی تحریک اگر مزید آگے بڑھی تو اس کا روکنا مشکل تر ہو جائے گا اور پھر اس کا تمام تر فائدہ بائیں بازو کے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔

یہ اسباب و عوامل تھے جن کی بنا پر وہ عمل اندرونی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ لیکن ظاہری اعتبار سے بڑی تدریج اور مدھم چال کے ساتھ شروع ہوا جسے اب

مسٹر بھٹو بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (CIVILIAN COUP DE TAT) سے تعبیر کر رہے ہیں[1] ——

مفاہمت اور مصالحت کا یہ عمل بنیادی طور پر تین لیڈروں ہی کے مابین ہوا ہے اور اگر کوئی "عبوری قومی حکومت" وجود میں آتی جس کا امکان بالکل خارج از بحث نہیں تو وہ اصلاً ان ہی کے نمائندوں ہی پر مشتمل ہوگی۔

اس عمل کی مخالفت و مزاحمت بھی جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا، باتیں بازو کے انتہا پسند لوگوں ہی کی جانب سے ہوئی۔ مسٹر بھٹو چونکہ ایسی کوئی مستحکم تنظیم نہیں رکھتے اور بدلتے ہوئے حالات نے گویا کم از کم وقتی طور پر تو ان کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے لہٰذا انہیں محض منفعلانہ مزاحمت (PASSIVE RESISTANCE) پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن مولانا بھاشانی چونکہ اپنی پشت پر ایک واقعی عوامی سیاسی قوت بھی رکھتے ہیں لہٰذا انہوں نے اس مفاہمت کو برسرِ میدان للکارا اور بالفعل یہ کوشش کی کہ اب جبکہ ڈی اے سی عوامی تحریک کو بریک لگا رہی ہے وہ خود اس کی قیادت سنبھال کر اپنے پیشِ نظر انقلاب کی داغ بیل ڈال دیں۔

—— اور واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں اس "انقلاب" کی ابتدا ہو گئی تھی۔ فروری ۱۹۶۹ء کی سترہ تاریخ سے اکیس تاریخ تک کے چند دن واقعۃً پاکستان کی تاریخ میں وہ تیسرا نازک موقع تھے جبکہ پاکستان کا وجود سخت خطرے سے دوچار تھا۔ اور اس کی سالمیت سخت مشکوک ہو گئی تھی۔

پاکستان کی معجزانہ حفاظت کے پہلے دو مواقع

ہم نے گذشتہ ماہ ان صفحات میں برسبیلِ تذکرہ عرض کیا تھا کہ "ہم تحریکِ پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا لیکن پاکستان کے معجزنما ظہور —— اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقا کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیا اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور پورے عالمِ ارضی میں علبۂ اسلام کی خدائی اسکیم کی ایک کڑی ضرور ہے!" تحریکِ پاکستان کے اساسی محرکات اور پاکستان کے معجزنما قیام کے ضمن میں تو ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ مارچ تا مئی ۱۹۶۷ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ظاہر کر چکے ہیں، رہے وہ دو اہم مواقع جن پر ہمارے نزدیک پاکستان کے وجود و بقا کا تحفظ بالکل معجزانہ طور پر ہوا تو ان میں سے پہلا موقع تو وہ تھا جب صدر ایوب نے، اس وقت جبکہ وہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے بالکل تنہا مالک تھے، امریکی اثرات کے تحت "متحدہ دفاع" (JOIN-DEFENCE) کی تجویز کی صورت میں گویا پاکستان کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر بھارت کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت و

---

[1] عین اس مرحلے پر جبکہ پاکستان اس "غیر فوجی انقلاب" سے گذر رہا ہے، مسٹر آدم ملک وزیر خارجہ انڈونیشیا جہاں کچھ عرصہ قبل ایک باقاعدہ فوجی انقلاب آیا تھا کا دورہ پاکستان اور حکومتِ پاکستان کی طرف سے مہرِ نو حکومت کے ساتھ مزید تعلقات بڑھانے کی خواہش کا اظہار بہت معنی خیز ہے!!

مشیت کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو کی عقل اس وقت ماری گئی اور انہوں نے کمال رعونت کے ساتھ صدر ایوب کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا[1] اور اس طرح خالصتہً معجزانہ طور پر پاکستان کا مستقل وجود برقرار رہ گیا[2] ——— دوسرا موقع ۱۹۶۵ء کی جنگ تھی جس میں پاکستان کا بچ جانا کسی دنیوی حساب کتاب سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو پاکستان کا تحفظ ابھی مطلوب ہے :

> ہمارے تجزیے میں ہر اعتبار سے ان دونوں مواقع ہی کے برابر نازک موقع سترہ تا اکیس فروری ۱۹۶۹ء کے چند دن تھے اور ہمارے نزدیک اگر اس موقع پر صدر ایوب وہ بھاری قیمت ادا نہ کرتے جو انہوں نے اوّلاً انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کرکے ادا کی جو ایک کھلے اعتراف شکست کے مترادف تھا اور پھر اگرتلہ سازش کیس واپس لے کر ادا کی جو داخلی و بین الاقوامی دونوں حیثیتوں سے سخت ذلت آمیز صورت تھی تو کم از کم مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی کے جاری کردہ " انقلاب " کو روکنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی ! ———[3]

اور اس صورت میں مشرقی و مغربی خطوں کے حالات ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہو جاتے کہ پھر ان کے ساتھ رہنے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور عوامی جمہوریہ چین کی زیر سرپرستی مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال

---

[1] یاد رہے بجز بالکل اسی مقام سے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے "چین نواز" دور کا آغاز ایک بالکل ناگزیر ضرورت کے طور پر ہوا تھا۔ راقم نے بارہا نجی گفتگوؤں میں اس صورت حال کو اس تشبیہ سے تعبیر کیا ہے کہ امریکہ کے زیر اثر صدر ایوب نے پنڈت نہرو اور بھارت کے سامنے رکوع تو کر لیا تھا لیکن پنڈت جی شاید اپنے تہذیبی پس منظر کی بنا پر چاہتے تھے کہ وہ باقاعدہ سجدہ کریں جسے ایک مسلمان کا بیٹا گوارا نہ کر سکا چنانچہ بجائے سجدہ کرنے کے صدر ایوب الٹے تن کر کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد مسلسل نہ صرف بھارت بلکہ اس کے معنوی سرپرست امریکہ سے بھی دور ہوتے چلے گئے نتیجتہً پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا جھکاؤ چین کی جانب ہوتا چلا گیا !

[2] یاد رہے کہ آنجہانی پنڈت نہرو ہی کی ایک پہلی حماقت کے نتیجے میں پاکستان اپنی موجودہ صورت میں دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا تھا ورنہ مسلم لیگ نے تو کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا اور اگر کہیں تین خطوں پر مشتمل " مہا بھارت " ایک بار وجود میں آ جاتا تو پھر کسے معلوم کہ پھر علیحدگی کبھی ممکن ہو سکتی یا نہیں !

[3] مولانا بھاشانی کی سیاسی قوت کا جو مظاہرہ اس موقع پر ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ شیخ مجیب الرحمان پیرول پر رہائی کی صورت میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہی نہیں بے تاب تھے۔ لیکن مولانا بھاشانی کی سیاست نے پورے ملک کو تعطل اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا کئے رکھا تا آنکہ صدر ایوب نے متذکرہ بالا بھاری قیمت ادا کر کے مولانا بھاشانی کو بے بس کر دیا !

پر مشتمل ایک علیحدہ کمیونسٹ ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی۔[1]

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے پاکستان اور اہل پاکستان پر کہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اس موقع پر بالکل گھٹنے ٹیک دینے کی سخت ذلت آمیز کیفیت کو گوارا کر لیا اور اس طرح پاکستان کی سالمیت کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ کم از کم فوری طور پر ٹل گیا ——— !

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی پہلی نشست اگرچہ کل نصف گھنٹے کی تھی اور اس کی نوعیت خالص رسمی ملاقات کی تھی تاہم اس سے آئندہ صورت حال کا پورا نقشہ سامنے آ گیا ہے اور اگرچہ فی الحال شرکائے کانفرنس بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں چنانچہ کسی جانب سے "عبوری قومی حکومت" کا نام لیا جا رہا ہے اور کوئی صرف نئے انتخابات ملک کے لئے "عارضی نگران ادارے" کا نام لے رہا ہے۔ کوئی ۱۹۵۶ء کے دستور کی کامل بحالی کا مطالبہ کر رہا ہے تو کوئی بالکل نئے سرے سے دستور سازی کا تقاضہ کر رہا ہے۔ ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ تو پرانا ہی تھا۔ اب شیخ مجیب الرحمان صاحب مشرقی و مغربی خطوں کے مابین مساوات (P A R I T Y) کے اصول کو بھی ختم کرنے پر تل گئے ہیں۔ الغرض وہ تمام مسائل از سر نو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کی بنا پر پاکستان میں دستور سازی کے کام میں ابتداً تاخیر و تعویق ہوئی تھی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پاکستان کی ان تمام دستوری پیچیدگیوں کے حل کی عملی صورت کیا ہوگی ——— تاہم یہ بات واضح ہے کہ کنونشن، کونسل اور عوامی تینوں لیگیں ہی کے مابین کچھ لے اور دے کر اور کسر و انکسار کے اصول کے تحت کوئی معاہدہ ہو جائے گا اور ان ہی کے اتحاد و اتفاق سے کوئی مضبوط حکومت مرکز میں بن سکے گی۔ ——— دوسری جانب یہ بھی بالکل واضح ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو کے اتحاد سے اصل اپوزیشن وجود میں آئے گی اور مقابل کے اصل دھڑے یہی دو ہوں گے۔ باقی رہے ڈی اے سی کے دوسرے شرکاء تو ان میں سے بعض ادھر اور بعض ادھر ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان کا دولتانہ و قصوری گروپ اور مشرقی پاکستان کے شش نکاتی عوامی لیگ کے انتہا پسند طبقات اپوزیشن کے جانب آئیں گے۔ اور مذہبی جماعتوں میں سے جمعیت علمائے اسلام بالواسطہ یا بالواسطہ ان ہی کے پلڑے میں وزن ڈالے گی ——— دوسری طرف نظام اسلام اور جماعت اسلامی چاہے فوراً حکومت میں شرکت کو ترجیح دیں یا فی الحال باہر رہنے کو پسند کریں۔ بہرحال متذکرہ بالا اتحاد ثلاثہ کو سہارا دیں گی ——— !!

آئندہ کی سیاست کا عملی نقشہ یہ بنے یا کوئی اور، ہماری دلی خواہش جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا صرف یہ ہے کہ سارے معاملات سیاست کے کھلے میدان میں معروف طریقے پر طے ہوں اور نہ "تشدد"

---

[1] مغربی بنگال کے درمیانی زمانے کے انتخابات کے جو نتائج حال ہی میں سامنے آتے ہیں ان کے پیش نظر یہ خطرہ خیالی و وہمی نہیں ——— بالکل حقیقی تھا ! ——— !

انارکی اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو نہ انقلابی طور طریقے اختیار کئے جائیں۔

خدا کرے کہ اب ملک کے دونوں خطوں میں حالات معمول پر آجائیں۔ تعلیمی ادارے کھل جائیں اور زندگی کا عام کاروبار معمول کے مطابق جاری رہے اور طوفانی سیاست کی کوئی نئی لہر ملک کو اپنی گرفت میں نہ لے سکے[1] اس لئے کہ اب اگر کوئی نئی لہر اٹھی تو اس کا رنگ بالکل مختلف ہوگا۔ صدر ایوب اور ان کی حکومت تو اب میدان سے ہٹ ہی گئے ہیں۔ اب اگر تصادم ہوا تو عوام کا عوام سے ہوگا اور اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔

ہماری دلی دعا ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو دونوں اپنی موجودہ شکست کو کھلے دل سے قبول کر کے معروف طریقے پر اپوزیشن کا کردار اختیار کر لیں اور اپنی قوت کے مظاہرے اور کسی انقلابی اقدام کا خیال دل میں نہ آنے دیں ——— بصورت دیگر پاکستان کے مشرقی و مغربی دونوں خطوں میں عوامی تصادم شدید ترین صورت میں ظاہر ہوگا۔ مشرق میں اصل مقابلہ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمان کے مابین ہوگا۔ اور مغرب میں مسٹر بھٹو اور جماعت اسلامی کے حامی طلبہ میں۔ مغرب میں تو جھڑپوں اور جوابی دھمکیوں کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ مشرق میں فی الحال خاموشی ہے۔ لیکن یہ خاموشی کسی بہت بڑے ٹکراؤ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے ——— !!

اللہ تعالیٰ ہی اس نازک موقع پر پاکستان کی حفاظت فرمانے والا ہے !!

(۳)

ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق مئی ۱۹۶۹ء

دوسرا مارشل لاء

ملک میں مارشل لاء نافذ ہوئے سوا مہینہ ہو گیا ہے اور اس عرصے میں وہ گومگو کی سی کیفیت اور غیر یقینی سی صورت حال ختم ہو چکی ہے جو کسی اچانک تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ تک فطری طور پر طاری رہتی ہے۔ اس دوران میں نہ صرف یہ کہ حالیہ فوجی حکومت کے ذمہ دار حضرات نے قوم کو بار بار یہ اطمینان دلایا ہے بلکہ اب تو ان کے طرز عمل سے بھی بہت حد تک ثابت ہو گیا ہے کہ نہ وہ کوئی سیاسی عزائم رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے دورِ اقتدار کو غیر ضروری طول دینے کے خواہش مند ہیں بلکہ ان کا مقصد محض ایک ایسی صورت حال کو جو بالکل بے قابو ہوتی جا رہی تھی قابو میں لانا اور ملک کی سیاسی زندگی کی گاڑی کو از سرِ نو صحیح پٹڑی پر ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امر انتہائی اطمینان بخش ہے اور موجودہ فوجی قیادت اس پر پوری قوم کے تشکر و امتنان کی مستحق ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حالیہ مارشل لاء گذشتہ مارشل لاء سے بہت مختلف ہے جو بڑی آن بان کے ساتھ ملک و ملت کے جملہ عوارض و امراض کی مسیحائی کے دعوے کے ساتھ آیا تھا اور جس نے صرف ایک نیا تنظیمی ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل جدید سیاسی فلسفہ اور مختلف عمرانی معاملات حتیٰ کہ دینی و مذہبی مسائل میں بھی ایک نیا

---

[1] افسوس کہ طوفانی سیاست کی یہ لہر اور عوامی مظاہروں اور ہنگاموں کا تیسرا شدید ریلا مارچ ۱۹۶۹ء میں ہی آ گیا۔ جس کے نتیجے میں صدر ایوب نے ملک کو فوج کے حوالے کر دیا اور پاکستان میں دوسری بار مارشل لاء نافذ ہو گیا۔

...فکر قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی ——— حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے معاملات مارشل لاء کے فوری دائرہ کار سے باہر ہیں۔ مارشل لاء بھی کسی قوم یا ملک کے امراض و عوارض کا مستقل یا پائیدار علاج نہیں ...تا۔ اس کی مثال زیادہ سے زیادہ ان فوری اور سریع الاثر مگر خالص وقتی اور عارضی افاقہ بخش ادویہ کی سی ہے جو کسی مرض کی بحرانی کیفیت میں فوری خطرے کو ٹالنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

ہم ان صفحات میں اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ دیانت دار اور باضمیر ...کارکنوں، منظم و محکم سیاسی جماعتوں اور مسلسل اور پیہم سیاسی سرگرمی کا فقدان ہماری قومی و ملی زندگی کا عجیب اور خطرناک خلا ہے جسے لازماً پر کیا جانا چاہیئے ——— اب ظاہر ہے کہ یہ خلا اگر پر ہو سکتا ہے تو ...ی سرگرمی ہی سے ہو سکتا ہے کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی اور مارشل لاء ہرگز اس خلا کو پر نہیں کر ... ——— مارشل لاء زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ ملک کی انتظامی مشینری کو پوری رفتار سے حرکت میں لے ... سستی اور کاہلی کا قلع قمع کر دے۔ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں جمع شدہ کام تیزی سے پورا کرا دے۔ دھاندلی اور ...گردی کا سد باب کر دے۔ شہری زندگی کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کرا دے اور سرکاری واجبات کی وصولی کا فوری ...بست کرا دے اور الحمد للہ کہ یہ سارے کام پورے زور شور کے ساتھ اس وقت جاری ہیں ——— رہا ملک و قوم میں فکری و نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرنا اور ملک و ملت کو ایک جذبۂ تازہ دے کر سرگرم عمل کرنا تو ظاہر ہے کہ ...ی فوجی حکومت سے اس کی توقع کی جاتی ہے اور نہ ہی، خدا کا شکر ہے کہ ان معاملات میں موجودہ فوجی قیادت ...ند یا تنگ دماغی کے ساتھ کسی لمبی چوڑی مہم کا آغاز ہی کیا ہے ——— خدا کرے کہ یہ صورت حال برقرار ...، ——— اور صدر مملکت آغا محمد یحییٰ خان اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے کی بجائے جلد از جلد ان ...سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ایک طرف تو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کو اپنا فرض ...سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ہر اس شخص کو جو کسی وقت کسی طرح برسر اقتدار آ جائے قوت و اقتدار کے نشے میں ...ت کر کے اس کے ذریعے اپنا الو سیدھا کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں ——— ایسے لوگ سرو مزید بھی ...ت سے ہیں اور پرانے زمینداروں اور نئے صنعت کاروں میں بھی۔ حال ہی میں ان کی صفوں میں کچھ سرگرمی کے ...ر بھی نظر آتے ہیں ——— خدا کرے کہ موجودہ فوجی قیادت ایسے لوگوں کے منحوس اثرات سے محفوظ رہے۔ ...کم سے کم مدت میں ان نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر جو اس وقت اس کے کاندھوں پر آ گئی ہیں اپنی تمام تر ...انت اور مساعی کو اپنی اصل اور مستقل ذمہ داری یعنی دفاع وطن عزیز پر مرکوز کر دے۔

جمہوریت، سوشلزم اور اسلام

(۱)

اصل نوعیت مسئلہ

"ہمارے نزدیک اس وقت ملک کی داخلی سیاست کے اصل بنیادی مسائل دو ہیں: ایک یہ کہ سیاسی اختیارات —— جو مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عوام کے بجائے ڈکٹیٹرشاہی کے قبضہ میں چلے گئے ہیں۔ وہ اختیار و اقتدار کے اصل مالکوں یعنی جمہور کو منتقل کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ دولت اور خصوصاً ذرائع پیداوار جو عوام الناس کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بن گئے ہیں انہیں پوری قوم میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے —— گویا کہ پہلی "سلطانیٔ جمہور" کے نظام کے دائمی اور حقیقی نفاذ کی کوشش ہے اور دوسری " دورِ سرمایہ داری" کے منحوس اثرات اور نقوش کہنہ کو مٹانے کی سعی و جہد ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی کوششیں درست بھی ہیں اور مبارک بھی! اور ملک کے ہر ذی شعور شہری کا فرض ہے کہ وہ ان میں اپنی اپنی صلاحیت، استعداد اور قوتِ کار کے مطابق حصہ لے۔ اسلام کے نزدیک یہ دونوں ہی مقاصد محمود ہیں۔ اسلام ایک طرف اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بندگانِ خدا کی گردنوں پر کوئی ایک فرد یا کچھ افراد یا کوئی مخصوص طبقہ خدائی کا تخت جما کر بیٹھ جائے —— اور دوسری طرف عدل و انصاف پر بھی انتہائی زور دیتا ہے۔ چنانچہ "وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ"[۱] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ہے اور "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ"[۲] کتابِ الٰہی کا مقصد نزول ہے اور "دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ"[۳] کی کوئی صورت اسلام کے نزدیک کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں!

لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اس وقت ان دونوں ہی میں شدید افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ دائیں بازو کے اہلِ سیاست نے صرف پہلے کام پر نگاہوں کو مرکوز کر دیا ہے اور دوسرے معاملے کے ضمن میں وہ "دعوۂ فردا" سے

---

[۱] سورۃ شوریٰ۔ رکوع ۲۔ ترجمہ: "اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین انصاف کروں!"

[۲] سورۃ حدید۔ رکوع ۳۔ ″ ″ : "تاکہ لوگ عدل و انصاف کے نظام پر قائم رہیں!"

[۳] سورۃ حشر۔ رکوع ۱۔ ترجمہ: "(مبادا کہ) دولت پھیرا اہلِ ثروت ہی کے مابین!"

آگے قدم بڑھانے کو تیار نہیں اور مزید یہ کہ مسلمان جمہور کے ذہنوں میں بھی ان کے سارے تصورات یا یورپ کے سیکولر الحاد و فکر سے مستعار لئے ہوتے ہیں ——— دوسری طرف بائیں بازو کے حامی لوگوں نے اپنی اصل توجہ دوسرے کام پر مرکوز کر دی ہے یعنی عدل اجتماعی کے لئے نظام میں ان کے پیش نظر خدا نہ کا عطا کردہ نہیں بلکہ مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ کا وضع کردہ ہے ——— !!

اس صورت حال میں ہر اس شخص کے لئے جو فی الواقع مسلمان ہو اور جس کے نزدیک دین و مذہب ہر چیز پر مقدم ہو، ایک اہم لمحۂ فکریہ ہے ——— ایسے سب لوگوں کو خواہ وہ موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں کسی حیثیت سے شریک ہوں، خواہ کسی خالص غیر سیاسی کام میں مصروف ہوں اس صورت حال کا بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہئے اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے مدنظر دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مناسب لائحۂ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہو جانا چاہئے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!"

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق جنوری ۱۹۶۹ء)

———(۲)———

خواہ مخواہ کا بپتسمہ اور فتووں کا تکلف

حال ہی میں جمعیت علمائے اسلام کی پاکستان میں نشاۃ ثانیہ کے اصل معمار مولانا غلام غوث ہزاروی کے ایک بیان پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ بحث زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی ہے کہ آیا سوشلزم کا اسلام کے ساتھ پیوند لگ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گزشتہ شمارے میں جمعیت کے بارے میں جو تفصیلی رائے پیش کی تھی۔ مولانا غلام غوث صاحب کے اس بیان سے اس کے اہم ترین جزو کی تصدیق ہو گئی۔ مولانا کے اس بیان کا اصل تعاقب حلقۂ دیوبند ہی کے ان علماء کی جانب سے ہوا ہے جنہوں نے ماضی میں تحریک مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ ان حضرات کی ہمارے دل میں واقعۃً بڑی عزت ہے۔ لیکن انہوں نے سوشلزم کو اسلام کی عین ضد اور جمہوریت کو عین اسلام ثابت کرنے کے لئے جس قسم کے دلائل دیئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگوں کی جانب سے اور ایسی بچگانہ باتیں[1]

---

[1] اس میدان میں اول اول تو مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے دعوے ہی پر اکتفا کی، دلائل کوئی نہ دیئے ——— اس کے بعد جب ایک موقع پر اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے داعی اعظم اور مجدد جدید ہی اسلام کے مفکر اعلیٰ نے جمہوریت کے عین اسلام ہونے کے لئے یہ دلیل ارشاد فرمائی کہ "ہماری فقہ کی کتابوں میں جمہور کی اصطلاح کا بکثرت استعمال ہوا ہے!" تب تو واقعہ یہ ہے کہ ہم "انگشت بدنداں" ہو کر رہ گئے ——— کہ اب کوئی کیا کہے اور کیا لکھے ——— اس کے بعد کچھ کہنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی ——— البتہ اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ہم پوچھیں کہ حضرت! اگر اسی اصول پر کسی نے یہ دلیل دے دی کہ چونکہ ہماری فقہ کی تمام کتابوں میں 'شراکت' پر مستقل باب موجود ہیں لہٰذا 'اشتراکیت' بالکل درست اور از روئے اسلام بالکل جائز ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟

اسلام بلاشبہ اپنی ذات میں ایک مکمل نظام ہے اور اساسی عقائد و نظریات سے لے کر حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی تفصیلی تشکیل تک اس کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے جو کسی دوسرے نظریے یا نظام کی پیوندکاری قبول نہیں کرتا۔

چنانچہ نہ اس کے کسی جزو کا پیوند کسی اور نظام کو لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور نظام کے کسی جزو کی پیوندکاری اس کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس بنا پر کہ اس کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے کے بعض اجزا جمہوریت کے بعض اجزا سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں اس کا تعلق جمہوریت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے تو یقیناً اس کے معاشی نظام عدل و قسط کے بھی بعض اجزا سوشلزم کے بعض اجزا سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس بنا پر اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ بھی ممکن ہے ——— بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خلافتِ راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں اختیارات کا جس قدر ارتکاز تھا اس سے مشابہت کی بنا پر آمریت کا رشتہ بھی اسلام کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے ——— ! اسلامی نظامِ معیشت و حکومت کا عروج یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور اس میں جہاں جمہوریت کا ملے ایسے مظاہر دیکھنے میں آتے تھے کہ ایک عام مسلمان ان کو بر سرِ منبر ٹوک دیتا تھا وہاں ان کے سفرِ بیت المقدس میں سوشلزم کی بلند ترین منزل کی شان بھی موجود ہے۔

ویسے ہمارے نزدیک ان دونوں ہی کے ساتھ اسلام کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا نرا تکلف ہے ہمارے یہاں نہ حامیانِ جمہوریت، جمہوریت کے داعی اس لئے بنے ہیں کہ انہیں اسلام کی بارگاہ سے اس کا حکم ملا ہے اور نہ ہی سوشلزم کے حامی اس کی جانب اس لئے جھکے ہیں کہ انہیں اسلام کا تقاضہ یہی معلوم ہوا ——— یہ سب کچھ تو تاریخ کے ایک عام بہاؤ کے تحت ہو رہا ہے جو گذشتہ دو تین صدیوں سے خالصتاً غیر مذہبی و لادینی رخ پر بہہ رہا ہے۔ اور جس میں مذہب سے سرے سے کوئی بحث (REFERENCE) ہی نہیں حامیانِ دین و مذہب کی اس عام بہاؤ کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کو بپتسمہ دینے کی کوشش بالکل خواہ مخواہ ہے ——— !

موٹی سی بات ہے کہ فکر و فلسفے کے اعتبار سے موجودہ پوری دنیا کا امام تا حال یورپ ہے۔ اور جو خالص بے خدا و مادہ پرستانہ تہذیب وہاں سے اٹھی تھی وہ تا حال پورے کرۂ ارضی پر حکمراں ہے۔ وہاں کے ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کی کوکھ سے خالص تاریخی عوامل کے زیرِ اثر جو جدید نظام برآمد ہوا تھا اس نے اوّلاً سیاسی شعبۂ زندگی میں جمہوریت (DEMOCRACY) کی صورت اختیار کی جس کے مختلف مراحل میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے۔ اسی جمہوریت نے بعد میں معاشی نظام میں آزاد معیشت کی راہ سے سرمایہ داری (CAPITALISM) کی کریہہ صورت اختیار کر لی جس کا ردِّ عمل سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جو درحقیقت نظریہ و فکر کے اعتبار سے اسی قدیم لادینی مادہ پرستانہ سلسلۂ فکر کی اگلی منطقی کڑی اور نظام کے اعتبار سے سرمایہ داری کا فطری ردِّ عمل ہے ——— اس ردِّ عمل کے بھی مختلف ملکوں میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے اور ان میں سے جو پیداوار معیشت کی تباہ کاریوں کی روک تھام میں انسان کے ایک دوسری انتہا پر پہنچ کر زندگی آزادی کو بالکل سلب کر کے اسے اجتماعیت کے ساتھ بیت چڑھا

دیا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس صورت میں بھی انسان اپنے اوپر کسی اور بالاتر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا سوشلزم کے تمام ایڈیشن بھی چاہے وہ روسی ہوں یا چینی مغربی جمہوریت ہی کے ہیں ——— چنانچہ اس وقت عالمی کیمونسٹ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ملک بھی "عوامی جمہوریہ چین" ہی کہلاتا ہے ——— !!

> سیاسی و معاشی نظاموں کے انقلابات کا یہ سلسلہ اوّلاً تو صدی ڈیڑھ صدی میں تکمیل کو پہنچا تھا لیکن اب دنیا کے تمام زیرِ ترقی ممالک میں یہ داستان بڑی تیزی کے ساتھ دہرائی جا رہی ہے اور یہ حالات کا ایک خالصتاً اپنا رخ ہے جو کسی مرحلے پر بھی دین و مذہب سے کوئی فتویٰ طلب نہیں کرتا۔ مفتیانِ دین و مذہب خواہ مخواہ اس کے مختلف موڑوں پر اپنے دارالافتاء سے فتوے صادر کرنے کا تکلف کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور نیم پس ماندہ ملک ہے اور اس میں بسنے والے عوام بھی ایک نیم خوابیدہ و نیم بیدار قوم ہیں۔ اس لئے دروں و بیروں حالت میں جتنے دوسرے ممالک مبتلا ہیں، عام اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہی یہاں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے ——— اور ہوتا رہے گا۔ جب تک کہ دین و مذہب اس معاشرے میں واقعتہً ایک موثر عامل کی حیثیت اختیار نہ کر لیں ——— جس کے امکانات بحالاتِ موجودہ دُور دُور تک نظر نہیں آتے !!

ہمارے اس وقت کے جملہ اجتماعی مسائل کی اصل صورت یہ ہے کہ :-

۱ : آج سے اکیس سال قبل آزادی کی صورت میں دفعتہً جو سیاسی حقوق و اختیارات ہمارے ہاتھ آئے، ہم بحیثیت قوم اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے اور چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ یہ حقوق و اختیارات عوام کے ہاتھوں تک کبھی پہنچے ہی نہیں بیچ ہی میں کچھ جاگیرداروں (FEUDAL LORDS) اور کچھ سابق حکمرانوں کی تربیت دادہ سروسز (SERVICES) نے انہیں اُچک لیا۔ خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ عوام اس کے لئے تیار نہ تھے لہٰذا رفتہ رفتہ یہ اختیارات پہلے چند پیشہ ور سیاست دانوں اور پھر ان کے بھی نااہل ثابت ہو جانے پر کلیتہً سروسز کو منتقل ہو گئے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور اس کا ردِّ عمل عوامی جمہوریت کی بحالی یا از سرِ نو قیام کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے !

۲ : آزادی کے وقت ہمارا ملک ایک خالص زرعی ملک تھا۔ اور ان اکیس سالوں کے دوران رفتہ رفتہ صنعت نے ترقی کی تا آنکہ اب ہم ایک نیم زرعی و نیم صنعتی ملک بن چکے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سارا کام مغرب سے مستعار لئے ہوئے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے تحت ہوا ہے لہٰذا ہمارے یہاں بھی سرمایہ داری اپنی کریہہ ترین صورت میں ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ ملک کی زرعی دولت پر جو اجارہ داری پہلے سے قائم تھی اس میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملک کی پوری صنعت و تجارت پر بھی چند خاندانوں کا قبضہ ہو گیا ہے ——— اس کے ردِّ عمل کے طور پر یہاں بھی وہی کچھ سوچا جا رہا ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں سوچا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ تقسیمِ دولت اور ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کے پورے نظام کو بیخ و بن سے اکھیڑ ڈالا جائے

ظاہر ہے کہ یہ دونوں ردِ عمل تاریخ کے متذکرہ بالا طوفانی بہاؤ ہی کے اجزاء ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں!!—— !!

لیکن چونکہ اتفاقاً ہمارے ملک کے عوام کو مذہب سے ایک جذباتی سا تعلق بھی ہے لہٰذا اس غریب کا نام خواہ مخواہ اچھالا جاتا ہے۔ خود تحریکِ پاکستان کے دوران بھی جس کے اصل اساسی عوامل معاشرتی و معاشی تھے، اس کا نام زور شور سے لیا گیا اور پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ" بنایا گیا جس کی حقیقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ربع صدی گزر جانے کے باوجود اس غریب اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نام و نشان یہاں نظر آتا ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ بلکہ ہمارے اندازے کے مطابق اس سے بھی کم —— اور اب بھی مختلف کمرانی نظریات کے حامل لوگ خواہ مخواہ اس کا نام بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں —— !!

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء)

شریعتِ اسلامی میں دستوری اور معاشی مسائل کے حل کے لیے وسیع گنجائشیں موجود ہیں

سوچنا چاہیے کہ اس وقت جو مسائل بالعموم ملک اور قوم کے سامنے ہیں ان میں سے آخر کون سے مسئلے کا کوئی خاص تعلق دین و مذہب سے ہے؟ طرزِ حکومت وحدانی ہو یا وفاقی، جمہوریت صدارتی ہو یا پارلیمانی، انتخابات بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ، مغربی پاکستان ایک صوبہ رہے یا دوبارہ متعدد صوبوں میں منقسم ہو جائے۔ جس طرح ان تمام مسائل میں اسلام کا کوئی ایک منصوص حکم نہیں ہے بلکہ حالات و ضروریات کے اعتبار سے مناسب تر کوئی صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے اسی طرح ان مسائل میں بھی اسلام میں حالات و ضروریات کے مطابق مناسب صورتیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش ہے کہ زمین کا بندوبست کن بنیادوں پر ہو اور بڑی بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت برقرار رکھی جائے یا انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مزارعت کا مسئلہ ہمارے یہاں سلف سے متنازعہ فیہ چلا آ رہا ہے اور حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے کی بجائے پوری ملتِ اسلامی کی اجتماعی ملکیت قرار دے کر ایک اہم اجتہاد فرمایا تھا جس پر پوری امت کا اجماع بھی ہو گیا تھا لہٰذا ان مسائل میں دلیل کی بنیاد پر کوئی ایک یا دوسرا موقف تو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنی کسی رائے کو اسلام کا حتمی فیصلہ قرار دے کر بقیہ آراء کو کفر و الحاد قرار دے دینا یقیناً زیادتی اور حدود سے تجاوز ہے۔ ہماری رائے میں بالکل صحیح کہا ہے مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مسائل و معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان کے حل کی مخلصانہ کوشش کی جائے نہ یہ کہ جو بھی ذرا عام روش سے ہٹ کر بات کرے اس کے خلاف کفر و الحاد کے فتووں کی توپیں داغنی شروع کر دی جائیں —— !!

پاکستان میں بحالیِ جمہوریت کے علمبردار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اب پھر بس قبل از مارشل لاء کی سی جمہوریت ملک میں دوبارہ قائم ہو سکتی ہے اور بالکل اسی طرح کے سے حالات لوٹ کر آ سکتے ہیں تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس ملک میں

اب حقیقی عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور جمہور اب صرف اس بات پر کبھی قانع نہ ہوں گے کہ ان کو ووٹ کی صورت میں سرمایہ داروں سے کچھ "نوٹ" حاصل کرنے کا ایک عارضی سا حق مل جائے بلکہ وہ اپنے تمام سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس صورت حال میں اگر کسی نے مذہب کو ان کے خلاف ویٹو کی حیثیت سے استعمال کیا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ مذہب کے ساتھ عوام کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہو جائے گا اور مذہب سے بیزاری کی عام رَو چل نکلے گی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہوشمند لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ (ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق مارچ ۱۹۶۹ء)

—————— (۴) ——————

مذہبی سیاست کی بے بسی اور کرنے کا اصل کام

جمعیت علماء اسلام کا ذکر تو اس وقت رہنے دیجئے اس لئے کہ وہ پاکستان کی موجودہ سیاست کے میدان میں فی الحال نو وارد ہے اور ابھی اس کی سیاست کے خطوط بالکل مبہم ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ این اے پی اور پیپلز پارٹی کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور کبھی پی ڈی ایم سے اشتراک کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک پلڑے میں وزن ڈالتی ہے کبھی دوسرے میں ——— !!

البتہ جماعت اسلامی اس لئے قابل ذکر ہے کہ اسے پاکستان کی سیاست میں برسرِ عمل ہوئے پورے بائیس سال بھی ہو چکے ہیں اور اس پورے عرصے میں وہ اس امر کی مدعی بھی رہی ہے کہ اس کا اصل مقصد احیائے اسلام اور اقامت دین ہے !!

بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پورے سفر کے دوران اس کی دینی و مذہبی حیثیت اگر کوئی تھی بھی تو کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی بجائے خود تنکے کی طرح تاریخی بہاؤ کے رخ پر بہہ نکلی ہے ——— !! اور اب چاہے ایک مضبوط اور منظم گروہ کی حیثیت سے ملکی سیاست کے میدان میں اس نے اپنا کوئی وقار قائم کر بھی لیا ہو۔ دینی و مذہبی حیثیت سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ——— !

پاکستانی سیاست کے افق پر اوّل اوّل جماعت اسلامی بڑے اعتماد اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تحریک پاکستان کے جذباتی پس منظر کو ابھار کر کے اور پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے خالص مسلم لیگی نعرے کو اپنا کر اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے نام پر وہ انقلاب قیادت کی مہم تنہا اپنے بازوؤں کے بل پر بہت جلد سر کر لے گی چنانچہ اس وقت اگر کسی اور نے اس کو تعاون و اشتراک کی پیش کش بھی کی تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔

لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں اور تنہا اپنے زور بازو سے کام نہیں چل سکے گا تو جماعت نے مذہب ہی کے نام پر علماء اور مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک عرصے تک جماعت اسلامی کی مذہبی سیاست "۳۱ علماء کے متفقہ و منفقہ مطالبات" کی بنیاد پر چلتی رہی۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر محسوس ہوا کہ چڑھائی بہت سخت ہے اور گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں

بلکہ ملک تو ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر خالص "جمہوریت" کے نعرے پر سیاست کی نئی بساط بچھائی گئی جس پر تاحال سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے ——— !! ——— اور جس کا منظر کمال یہ ہے کہ "ڈی اے سی" جس میں پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے دونوں مذہبی پہلوان اس وقت مجتمع ہیں، اس کے مطالبات اور متفقہ نکات میں غریب اسلام کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں!

خدا شاہد ہے کہ ہمارے پیش نظر کسی جماعت کی تنقیص ہرگز نہیں۔ ان گزارشات سے ہمارا مقصد صرف اپنی اس رائے کی وضاحت ہے کہ موجودہ سیاست کا دین و مذہب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور وقت کا جو دھارا خالص غیر مذہبی ولادینی رخ پر بہہ رہا ہے اس کی مختلف لہروں کی باہمی آویزش میں اسلام کا نام استعمال کرنا اور خاص طور پر اسے موجودہ بوسیدہ، گلے سڑے اور ظالمانہ و استحصالی نظام معیشت کا پشت پناہ بنا کر کھڑا کر دینا اسلام کی دوستی نہیں اس کے ساتھ دشمنی ہے۔ تاریخ کے رخ کا جو "دھارا" ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے، اس کا رخ مذہب کی جانب موڑنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے فلسفہ و فکر کے میدان میں انقلاب برپا کیا جائے اور روحانی اقدار کا از سر نو احیا ہو۔ ایمان و یقین کی روشنی دنیا میں پھیلے اور اخلاق و اعمال میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جب یہ انقلاب کسی انسانی معاشرے میں ایک معتد بہ حد تک رونما ہو چکے گا تب کہیں جا کر اس کا امکان پیدا ہو گا کہ اس کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو۔ اور وہاں خدا پرستانہ نظام زندگی پوری شان کے ساتھ جلوہ آرا ہو سکے ——— ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ ان اعتبارات سے دین و مذہب کی روح سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا جن کا اصل تعلق اسلام اور صرف اسلام سے ہو، اور جن کی زندگیوں کا مقصود صرف اور صرف احیائے اسلام و اقامت دین ہو، موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی قوتوں، صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ یہ کہ ——— اگر علمی و فکری کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو تعلیم و تعلّم قرآن کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیں اور کتاب اللہ کے علم و حکمت کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہو جائیں۔ اس لئے کہ ایمان و یقین کے احیا کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ——— اور اگر علمی کام سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو معاشرے کے کروڑوں ہمدردوں میں بیٹھ جائیں اور خلوص و اخلاص کی قوتوں کو بروئے کار لا کر عوام الناس میں دینی و روحانی اقدار کی از سر نو ترویج کی کوشش کریں۔

ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا، بلکہ پاکستان کے معجزنما ظہور ——— اور متعدد اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقا کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور پورے عالم ارضی میں غلبہ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے۔ اور اسی بنا پر ہمیں اس کا بقا و وجود بھی عزیز ہے اور اس میں انتشار اور فساد کی کسی صورت گوارا نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس مبارک انقلاب کی ابتدا سیاسی میدان

سے نہیں بلکہ علم و فکر اور فلسفہ و حکمت کے میدان سے ہوگی۔ اور ایک علمی و تعلیمی انقلاب کے سوا اس کی کوئی راہ موجود نہیں —— اس میدان میں بالکل ابتدائی اور کمیت کے اعتبار سے نہایت حقیر کوشش کئے چلے جانا بھی چاہے اس کے کوئی محسوس نتائج سامنے نہ آئیں، ہمارے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ سیاسی میدان میں بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شرکت کی جائے۔ لیکن بجائے اس کے رُخ کو دین و مذہب کے جانب موڑنے کے خود اس کی رو میں بہہ جایا جائے! ؎

دیکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے!!

اللہ تعالیٰ ہمیں مسلمان جینے اور ایمان پر مرنے کی سعادت نصیب فرمائے!! —— آمین!

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء)

—— (۵) ——

مارشل لاء کے نفاذ سے قبل مسلسل پانچ چھ ماہ سے جو ہنگامی صورتِ حال پورے ملک پر طاری چلی آ رہی تھی اس کے یک لخت خاتمے سے جو پُر سکون کیفیت پیدا ہوئی اس میں ملک و ملت کے بہی خواہوں میں سے بہت سے اصحاب فکر و نظر نے ان عوامل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جن کے نتیجے میں ہمارے یہاں سیاسی عدم استحکام اور فکری و نظریاتی انتشار پیدا ہوا ہے اور یوماً فیوماً بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخبارات و رسائل میں بہت سے عمدہ مضامین اس موضوع پر شائع ہوتے ہیں جن سے یہ تو مزید معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے اصحاب فکر و نظر اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ قوم میں فکر و نظر کی وہی یک جہتی اور جذبہ و عمل کی وہی ہم آہنگی دوبارہ پیدا کی جائے جو آج سے تقریباً ربع صدی قبل کچھ عرصے کے لئے ملت اسلامیہ پاک و ہند میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے نتیجے کے طور پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اس وقت وہ کیفیت کیوں اور کن اسباب و عوامل سے پیدا ہوئی تھی اور آج اسے کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مبہم طور پر یہ کہہ دینا کہ اس وقت بھی وہ جذبہ اسلام کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا —— اور آج بھی اسے اسلام ہی کی بنیاد پر دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شاعری میں تو شاید روا ہو لیکن ملک و ملت کے ٹھوس مسائل سے بحث کرنے والی سنجیدہ علمی تحریروں کے شایانِ شان نہیں —— اس لئے کہ اس کے معاً بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ اسلام ہی کی بنیاد پر تھا تو بعد میں وہ ختم کیوں ہو گیا؟ جبکہ اسلام سے نہ اس قوم کے عوام منحرف ہوئے نہ خواص —— بلکہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو یہاں کبھی کسی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہا ہو اور اٹھتے بیٹھتے اسلام کا کلمہ نہ پڑھتا رہا ہو اور اپنے جملہ مسائل و مشکلات کا حل اسلام ہی میں نہ بتاتا رہا ہو۔

ہمارے یہاں "اسلام"! —— "اسلام"! اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے اس وقت جس قدر شدومد کے ساتھ لگ رہے ہیں وہ یقیناً ہمارے لئے ہر حال میں خوش آئند ہیں اور ہم بہر صورت انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سے ربع صدی قبل کسی منظم اور پائیدار اساس کے بغیر محض جوش میں ان نعروں کی گونج پیدا کر کے مسلسل بائیس سال تک ہم جس طرح ان کی مٹی پلید کرتے آئے ہیں، ہمیں خدشہ

ہے کہ آج جس انداز سے یہ نعرے لگ رہے ہیں اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں ان کی حرمت کو کچھ اور بھی زیادہ ہی بٹا لگایا جائے گا اور ان مقدس الفاظ کی رسوائی پہلے سے بھی کچھ سوا ہی ہوگی۔ اس کا تھوڑا سا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت جو جلوس یہ نعرے لگاتے تھے ان میں شامل خواتین کی اکثریت باپردہ اور برقع پوش ہوتی تھی ــــ اور آج وہ نوجوان لڑکیاں ان کی علمبردار ہیں جو پردے اور برقع کی قید سے بالکل آزاد ہو چکی ہیں اور نیم عریاں ٹیڈی لباس میں جلوس میں ــــــ ع "قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا!"

ہمارے یہاں اس وقت جن اصحاب قلم و قرطاس نے 'اسلام' کی دہائی دی ہے ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو سوشلزم کے ہوّے سے خوفزدہ ہو کر اسلام کی پناہ گاہ کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور جن کے دین و مذہب سے تازہ شغف کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ع

"جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا!"

ان کو ایک طرف رکھتے ہوئے بعض ایسے حضرات کا حال بھی جن کے خلوص اور اخلاص کے ہم بھی معترف ہیں اور جن کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ اسلام کے قدیم شیدائی و فدائی ہیں یہ ہے کہ خود ان کا مسجد سے کوئی رشتہ و تعلق نہیں اور ان کی جوان لڑکیاں بے پردہ گھومتی اور "تارکِ عالم" کا لقب پاتی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!

خدا کے لئے حقائق کا مواجہہ کرنا سیکھئے! ــــ حقائق سے گریز محض خود فریبی ہے، اس سے نہ یہ ارض و سماء دھوکا کھاتے ہیں، نہ خالقِ ارض و سماوات، اور "وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ!" کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا ــــ واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے تو پوری اُمتِ مسلمہ بحیثیت مجموعی کب کی دستبردار ہو چکی۔ دین و مذہب کے ساتھ اس کا مخلصانہ رشتہ استوار ہوتا تو یہ عالمگیر ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں ہوتی۔ قطعی "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ٥" میں نہیں اُمت کے دعوے ایمان میں ہے ؎

میر کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہو جی، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

مدت مدید گذری کہ اسلام کا شجرۂ طیبہ بیخ و بن سے اکھڑ چکا۔ اور اب از سرِ نو تخم ریزی و آبیاری کا محتاج ہے دین و مذہب کی عمارت محض شکستہ ہی نہیں ہوئی کہ ادھر ادھر کی مرمت سے کام چل جائے۔ یہ عظیم تعمیر کبھی کی زمین بوس ہو چکی اور اگرچہ اس کے کھنڈر اب بھی اس کی عظمتِ رفتہ کے شاہد ہیں۔ تاہم اب ضرورت بالکل بنیاد سے از سرِ نو تعمیر کی ہے اور افسوس کہ امتِ مسلمہ تا حال اس حقیقت کے اعتراف تک پر آمادہ نہیں۔ بلکہ مسلسل مغالطے ہی میں مبتلا رہنے پر مصر ہے ــــــ! تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہر تدبیر الٹی پڑتی نظر آتے۔ اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ آج سے ربع صدی قبل ملتِ اسلامیہ ہند و پاک کی باسی کڑھی میں جو اُبال آیا تھا اس کا اصل محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا۔ نہ آج اس کی ملی و اجتماعی زندگی میں دین و مذہب کو کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل ہے! اُس وقت کا سارا جوش و خروش ایک ایسی قوم کے جذبۂ تحفظِ خود اختیاری کا رہینِ منت تھا۔ جس کی بنیاد تو

صدیوں پہلے مذہب ہی کی اساس پر قائم ہوتی تھی۔ لیکن جس کا دین و مذہب سے تعلق اب محض برائے نام رہ گیا تھا اور جسے کچھ مخصوص حالات میں یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا قومی تشخص ختم ہو جائے گا اور وہ ایک بڑی قومیت میں جذب ہو کر رہ جائے گی۔ اس خالص قومی تحریک کے آخری ایام میں خالص وقتی اور عارضی طور پر کچھ رنگ آمیزی دینی و مذہبی جذبے کی بھی کی گئی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک فوری ضرورت (EXPEDIENCY) کے تحت تھا نہ کہ کسی مستقل اور محکم اساس پر ——— چنانچہ جب تحریک ایک حد تک کامیاب ہو گئی اور اس قوم کو اپنے معاشی و سیاسی تحفظ کی ضمانت کے طور پر ایک علیحدہ خطہ مل گیا تو وہ جوش و خروش بھی فوراً ختم ہو گیا ——— اور دوبارہ اس کا سراغ کبھی ملا تو صرف اس وقت جب ایک بار پھر ۱۹۶۵ء میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں قوم کا یہ دفاعی حصار ٹوٹ نہ جائے ——— اور ہندو امپیریلزم کا سیلاب اس قوم کو بہا کر نہ لے جائے ——— پھر جونہی یہ خطرہ دوبارہ ٹلا وہ جذبہ بھی سرد پڑ گیا ——— ! اور پھر وہی صورت حال طاری ہو گئی کہ

"اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر"

یہ ہیں وہ حقائق جن کا ادراک اس لئے ضروری ہے کہ ملک و ملت کا ہر بہی خواہ اچھی طرح سمجھ سکے کہ مسئلے کی حقیقی نوعیت کیا ہے ——— اور اصلاح احوال کے لئے کس جگہ سے کام کی ابتدا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ علاج کی کامیابی کا سارا دارومدار تشخیص کی صحت و درستی پر ہے ——— ہمارا مرض سطحی نہیں، بہت گہرا اور نہایت مزمن ہے، اس کا علاج بھی سطحی تجاویز سے نہیں بڑی گہری حکیمانہ تدبیر ہی سے ممکن ہے۔

> یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت شاید ہی کوئی کر سکے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں محض وجود و بقا بھی اسلام ہی سے وابستہ ہے ——— لیکن خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اسلام اس وقت ہمارے عقیدہ و عمل دونوں سے خارج ہو چکا ہے اور اب اس کی بازیافت محض نعروں، تقریروں، مقالوں اور بیانوں سے ممکن نہیں ———

اس کے لئے مسلسل اور پتہ مار کر کام کرنے اور پیہم جدّ و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس جدّ و جہد کا اصل اور اوّلین میدان علم و فکر کا میدان ہے ——— اور علم و فکر کا رشتہ ایمان و یقین کے ساتھ از سر نو استوار کرنا وقت کی اہم ترین اور مقدم ترین ضرورت ہے ——— پھر اخلاق و اعمال کی دنیا میں انقلاب لانا لازمی ہے ——— اس لئے کہ تطہیر افکار اور تزکیۂ اخلاق کی کٹھن مہموں کے سر ہونے کے بعد ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ قوم کے رگ و پے میں دینی و اسلامی جذبہ سرایت کر جائے اور " إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ " کی صورت عملاً پیدا ہو۔

ہماری ان گذارشات سے ممکن ہے کہ بعض احباب کو یہ بدگمانی پیدا ہو کہ شاید ہم فوری طور پر اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں کے حامی نہیں، یا یہ کہ ہم پر مایوسی کا غلبہ ہے ——— حالانکہ درحقیقت صورت واقعہ نہ یہ ہے نہ وہ ——— ہم تجدید دین اور احیائے اسلام کی ہر کوشش کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اور خود بھی بحمد اللہ اپنی صلاحیتوں کی حقیر سی پونجی کو اسی مقصد کے لئے کھپا دینے کا عزم مصمم رکھتے ہیں۔ پھر ہم یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ بہت

جلد انسانیت اپنے مسائل کے حل اور اپنے دکھوں کے مداوا کے لئے اسلام ہی کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوگی اور وہ دور زیادہ دور نہیں جب پورے عالم ارضی پر اسلام ہی کا غلبہ ہوگا ——— لیکن اس کے لئے کیا کام ——— اور کس طرح سے کیا جانا چاہیئے۔ اس کے بارے میں ہمارا ایک پختہ نقطۂ نظر ہے اور ہم علی وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ یہ کام کس نہج پر کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے تو اس وقت۔ اور ہمارے لہجے میں تلخی پیدا ہوتی ہے تو تب جب ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے بھلے سمجھدار لوگ اس معاملے میں غالباً صرف تساہل فکر کی بنا پر محض سطحی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور مسئلے کی حقیقی و واقعی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایک بے اختیار ہوک اٹھتی ہے اس وقت جب ہمیں خیال آتا ہے کہ برصغیر کی ایک اچھی بھلی دینی تحریک جو صورت حال کی صحیح تشخیص کے ساتھ ایک بہت حد تک صحیح طریق کار پر برسرعمل ہوتی تھی ——— وہ بھی قیام پاکستان کے وقت، حالات اور موقع کی ایک وقتی سی ترغیب و تحریص (TEMPTATION) کے زیر اثر اپنے موقف سے منحرف اور اپنے نہج کار سے دستبردار ہو گئی اور سطحیت فکر و عمل کا شکار ہو کر وہی خالی نعرے لگانے میں مصروف ہو گئی جن کی شدید مذمت ماضی میں وہ خود کرتی رہی تھی ——— اور آج بھی جبکہ تقریباً ربع صدی گذر چکی ہے وہ سیاست کے ریگزار میں حکومت و اقتدار کے سراب کے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے فاعتبروا یا اولی الابصار ——— اس تحریک کا خیال ہمیں بار بار اس لئے آتا ہے کہ خود ہم نے اسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تڑپ اسی کے طفیل پائی تھی ؎

گذشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی!

دین و مذہب سے قطع نظر کر وہ بے چارے تو ہمارے یہاں اب صرف "بوقت ضرورت" استعمال کے لئے رہ گئے ہیں۔ اور اسلام و ایمان کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہ وہ غریب صرف لیڈروں کی تقریروں کا مصالح و مقطع فراہم کرنے کے کام آتے ہیں، خالص قومی سطح پر بھی غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہم زندہ قوموں کے لازمی اوصاف سے خطرناک حد تک تہی دست ہیں اور اس میدان میں بھی ہماری تہی دامنی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے ——— ہماری قومی و ملی زندگی جس طرح پے بہ پے حادثوں سے دوچار ہو رہی ہے اور ملکی سیاست کی گاڑی جس طرح بار بار زور دار جھٹکوں کے ساتھ رک جاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ آزادی ایسی نعمت عظمیٰ کے حصول سے قبل قومی تعمیر کا کام جس حد تک لازماً ہو جانا چاہیئے تھا وہ ہمارے یہاں نہیں ہوا، اور اس عظیم ذمہ داری سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ناگزیر حد تک بھی پیدا نہیں ہوئیں۔ گویا آزادی ہمیں ایک ایسے عطیے کی حیثیت سے ملی جس کے لئے ہم عملاً تیار نہ تھے۔

یہ صورت حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جس سے بعض وہ طالب علم جو نچلے درجوں میں رعایتی پاس ہوتے چلے آتے ہیں کسی بڑے امتحان کے موقع پر دوچار ہو جاتے ہیں ——— کہ

تاکہ کوشش کرنے پر بھی ان کی وہ قیادتی کمی کسی طرح پوری نہیں ہوتی جو بالکل ابتدا میں ہو گئی تھی۔

برصغیر کی ہندو قوم میں قومی تعمیر نو کا کام انیسویں صدی کے اواخر ہی سے شروع ہو گیا تھا اور بیسویں صدی کی ابتدا سے تو اس میں بے پناہ جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر جہت اور ہر سمت میں تعمیر و اصلاح کا کام تیزی کے ساتھ شروع ہوا۔ بے شمار انجمنیں بنیں۔ لاتعداد ادارے وجود میں آئے، ہزاروں ٹرسٹ قائم ہوئے۔ چھوٹی بڑی لاکھوں درس گاہیں تعمیر ہوئیں ——— اور لاکھوں قومی کارکن جذبۂ اخلاص کے مظہر، سادگی و کفایت شعاری کے پیکر اور مجسم قربانی و ایثار بن کر میدان عمل میں کود پڑے ——— پھر تعمیر جدید کا یہ کام کسی ایک ہی میدان میں نہیں ہوا بلکہ ایک طرف اگر سیاسی میدان میں ہلچل اور ہنگامہ تھا تو دوسری طرف خالص معاشرتی اور سوشل اصلاح اور معاشی فلاح و بہبود کے لئے بھی زور شور سے کام جاری تھا اور ایک طرف مذہبی اصلاح و تجدید کی کوششیں ہو رہی تھیں، اور مذہبی افکار کے تنقیدی جائزے اور ان میں شکست و ریخت اور تالیفِ جدید سے نئے نئے دھرم ایجاد ہو رہے تھے۔ تو دوسری طرف صحت و تندرستی کے اصولوں کے پرچار اور ورزش و ریاضت کے عملی پروگراموں سے جسم اور جسمانی قوتوں کے نشوونما کا کام بھی پورے انہماک سے ہو رہا تھا ——— غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی ہلچل اور نئی سرگرمی پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں پوری ہندو قوم میں بیداری اور حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فی الجملہ آزادی کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور استعداد اس میں پیدا ہو گئی۔

مسلمان قوم میں صورت اس کے برعکس رہی۔ اس کی اکثریت "عظمتِ رفتہ" کی یاد ہی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی اور "پدرم سلطان بود" کا راگ الاپ کر ہی دل کو تسلی دیتی رہی۔ قومی و ملی تعمیر جدید کا کام تقریباً نہ ہونے کے برابر رہا اور تعطل اور جمود کا تسلط اور بدنظمی، انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ دفعۃً محسوس ہوا کہ غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہونے کو ہے اور اس صورت میں ہندوستان کی مسلمان قوم ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ چنانچہ فوری طور پر اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوئی اور جیسے تیسے ایک قومی تحریک اٹھی جسے ابتداءً صرف کچھ نوابوں اور جاگیرداروں کی پشت پناہی حاصل تھی اور جس کا دائرہ کار ابتدا میں صرف کچھ آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر قوم کے وہ مذہبی طبقات اس سے بدظن بھی ہو گئے جو حریت و آزادی کی راہ میں مسلسل قربانیاں دیتے آئے تھے اور جن میں عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اور اس طرح قوم بے شمار مخلص کارکنوں سے محروم ہو گئی ——— آزادی سے متصلاً قبل ایک دو سال کے لئے اس قومی تحریک میں بھی کچھ عوامی رنگ پیدا ہوا تھا۔ لیکن ابھی اس کے کارکن بالکل خام حالت ہی میں تھے کہ آزادی کی گھڑی آ پہنچی اور اللہ تعالیٰ کے ایک خصوصی عطیے اور انعام کے طور پر اس قوم کو بھی ایک علیحدہ آزاد مملکت مل گئی۔

پھر آزادی کیا ملی ——— گویا دولت و ثروت کا سیلاب آ گیا جو قوم کی دیانت و شرافت اور خلوص و اخلاص کی رہی سہی پونجی کو بھی بہا کر لے گیا۔ اولاً متروکہ دولت پر چھینا جھپٹی ہوئی۔ پھر تجارت و صنعت کے میدانوں میں دولت کے دریا بہنے لگے۔ دیکھا دیکھی سرکاری ملازموں نے بھی ہاتھ رنگنے شروع کئے اور دشتِ دولت کے "ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج" وصول کرنا شروع کیا ——— غرض پوری قوم کے سر پہ دولت کا بھوت سوار ہو گیا ——— قومی تعمیر نو کا کام پہلے ہی نہیں ہوا تھا جبکہ اس کے لئے تمام تر اسباب و عوامل بھی موجود تھے۔ تو اب کیا خاک ہوتا! خلوص، دیانت، ایثار اور قربانی نام کی

کوئی شے پہلے کہیں کچھ موجود تھی بھی تو اس دور میں بالکل ختم ہو گئی۔ ذمہ داری و احساسِ فرض، تدبر اور محنت کالعدم ہو گئے سیاست نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی۔ اور روپے پیسے یا زیادہ سے زیادہ کنبہ و برادری کے سوا اس میدان میں کوئی سکہ رواں نہ رہا۔ چنانچہ طبقہ متوسط کے وہ لوگ جو قومی تحریک کے آخری ایام میں ملی و قومی جذبات کے تحت سیاست کے میدان میں آ گئے تھے رفتہ رفتہ مایوس اور بد دل ہو کر اسے خیر باد کہہ گئے۔ اور سیاست اور حکومت کا پورا معاملہ صرف بڑے زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا مشغلہ بن کر رہ گیا۔ ان میں سے جو کبھی کسی وجہ سے مات کھا جاتا تھا ایسے خاموش اور بیکار ہو کر بیٹھ رہتا تھا جیسے سیاست بازی کے علاوہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے کرنے کا کوئی اور کام ہے ہی نہیں —— نتیجۃً سیاسی اختلال پیدا ہوا۔ جوڑ توڑ اور سازشوں کا بازار گرم ہوا، حکومتیں آئے دن بدلنے لگیں۔ بین الاقوامی ساکھ اور قومی و ملی معیشت کا دیوالہ نکل گیا —— تو پہلا مارشل لاء لگا —— جس نے کچھ عرصہ کے لئے ان امراض کی ظاہری علامتوں کو دبا دیا۔ لیکن جونہی خالص فوجی حکومت سے کسی قدر سیاسی و دستوری حکومت کی طرف رجعت ہوئی وہی پہلا سماں پھر بندھ گیا۔ اور علاماتِ مرض پھر ظاہر ہو گئیں —— بلکہ حالت پہلے سے بدتر ہو گئی —— !!

یہ ہیں وہ حالات جن سے ہم بحیثیت قوم دوچار ہیں —— کہ قوم کے سوادِ اعظم کے پیشِ نظر نہ کوئی نظریہ ہے نہ مقصد، نہ قومی و ملی ذمہ داریوں کا احساس ہے نہ شہریت کے فرائض کا —— پھر نہ کوئی مستحکم قومی تنظیم موجود ہے نہ قابلِ اعتماد قومی قیادت۔ سیاسی شعور کی کمی کا یہ حال ہے کہ جو چاہے وقتی طور پر نعرے لگاتے اور عارضی طور پر قوم کو اپنے پیچھے لگا لے —— اور قیادت کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ جس شخص کے بارے میں ذرا یہ معلوم ہو کہ دیانت دار اور مخلص آدمی ہے۔ قوم بالکل یتیموں کی طرح سرپرستی کے لئے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی ہے چاہے وہ سیاست کے میدان میں بالکل نو وارد ہی ہو اور سیدھا کسی سرکاری محکمے کی ملازمت سے فارغ ہو کر چلا آ رہا ہو —— وقس علیٰ ھٰذا۔

اس میں شک نہیں کہ حال ہی میں بعض گروہ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جو کچھ واضح نظریات بھی رکھتے ہیں اور کسی قدر تنظیمی سلسلے بھی۔ لیکن چونکہ ابھی ان کا حلقۂ اثر بہت محدود ہے۔ وہ وسیع تر ملی و قومی تقاضوں کا جواب نہیں بن سکتے۔

یہ حالات متقاضی ہیں کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے ان کو ادا کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے اور ان بنیادی کمزوریوں، کمیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کے لئے کوشاں ہو جو عرصہ دراز سے چلی آ رہی ہیں اور اس طرح دین و مذہب، علم و فکر، تعلیم و تربیت، تطہیر اخلاق و عمل، سماجی و معاشرتی اصلاح، قومی و ملی تنظیم غرض ہر میدان میں اصلاح و تعمیر کا عمل تیزی سے شروع ہو جاتے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم بحیثیت ملک و ملت اس وقت موت و زیست کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قدرت کی جانب سے عطا کردہ مہلت ہماری غفلت میں ضائع کا موجب ہو۔ اور پھر قانونِ خداوندی کا کوئی کوڑا ہم پر اچانک برس پڑے!

—— ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین آمین ——

[illegible] [illegible] دسمبر ۱۹۶۹ء

افکار و آراء

"یہ غلطی کب تک"

ہفت روزہ "الجمعیۃ" دہلی، اشاعت ۷ مارچ ۱۹۶۹ء کا اداریہ

پچھلے ہفتہ پاکستانی اخبارات جمہوری مجلس عمل کے لیڈروں کی تصویروں کے ساتھ بھرے ہوتے تھے۔ صدر ایوب نے اپنے مخالف لیڈروں سے غیر مشروط گفتگو کی جو پیشکش کی تھی اس نے راولپنڈی کو چند روز کے لئے تمام پاکستانی لیڈروں کا مرکز بنا دیا۔ کہیں مولانا مودودی مسٹر ایم انور سے مصروف گفتگو ہیں کہیں میاں ممتاز دولتانہ اور خان ولی خان باہم سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ کہیں مسٹر نور الامین اور خواجہ خیر الدین رازدارانہ گفتگو میں مشغول دکھائی دے رہے ہیں۔ کہیں چودھری محمد علی اور نواب زادہ نصر اللہ خاں تبادلہ خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آخری وقت آ گیا ہے جبکہ پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کیا جانے والا ہو۔

لیڈروں کی یہ سرگرمیاں ان طویل ہنگاموں کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں جن کی مثال پاکستان کی تاریخ میں قبل از تقسیم کے ڈائرکٹ ایکشن کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ پچھلے چند مہینوں سے پاکستان اپنی زندگی کے انتہائی ہنگامہ خیز دور سے گزرا ہے۔

پاکستان کے لوگوں میں یہ زبردست حرکت کیوں پیدا ہوگئی۔ صرف ایک مقصد کے لئے۔ وہ یہ کہ صدر ایوب کو صدارت کی گدی سے ہٹا دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں صدر ایوب کو ان کے عہدہ سے ہٹانا ضروری ہو۔ مگر پاکستانی سیاست کے اس بھونچال نے ثابت کیا ہے کہ مسلمان آج بھی اسی لاحاصل جذباتیت میں مبتلا ہیں۔ جہاں وہ سو برس پہلے تھے۔

پاکستان کو بے شمار نہایت اہم مسائل درپیش ہیں۔ مثال کے طور پر تمام مسلم ممالک بشمول پاکستان صنعت اور سائنس میں پیچھے ہونے کی وجہ سے مغربی ممالک کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں ان کی سیاسی آزادی نے انہیں صرف اقتصادی غلامی کے ایک نئے دور سے دوچار کیا ہے۔ اگر پاکستان اس معاملہ میں کم از کم جاپان کی حد تک بھی ترقی کر جائے تو وہ مسلم ممالک کو اقتصادی غلامی سے نجات دلانے کا نقیب بن سکتا ہے اسی طرح آج تمام دنیا ایک پر امن اور عادلانہ سماج کیلئے ترس رہی ہے۔ اگر پاکستان اس معاملہ میں اسلام کا نمونہ بننے کی کوشش کرتا تو وہ موجودہ دنیا میں ایک روشن مینار بن کر کھڑا ہو سکتا تھا۔ اسی طرح دنیا کے بہت سے علاقوں میں مسلمان آبادیاں صرف اس لئے پس رہی ہیں کہ کوئی طاقتور مسلم ملک ان کی پشت پناہی کرنے والا نہیں۔ آج اگر پاکستان اتنا ہی طاقتور ہو جائے جتنا کہ مثال کے طور پر امریکہ ہے تو اس کی صرف ایک گرجدار آواز کتنے علاقوں میں مسلمانوں کی حفاظت اور سالمیت کے لئے کافی ہوگی۔

اسی طرح کے کتنے مسائل ہیں جو پاکستان کی قسمت بن کر اس کے اوپر لٹک رہے ہیں مگر ان میں سے کسی مسئلہ پر پاکستانی عوام یا پاکستانی لیڈروں اور پیشواؤں میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوسکی البتہ ایوب کو صدارت سے ہٹانے کے لئے اتنا

زبردست طوفان برپا ہے کہ گویا ایوب ہٹتے نہیں کہ پاکستان جنت نظیر بن گیا۔

افسوس کہ ہم طویل ترین مدت سے ایک ہی غلطی میں مبتلا ہیں۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سیاسی تبدیلیاں ساری تبدیلیوں اور کامیابیوں کا دروازہ ہے اور اگرچہ تجربات نے اس طریقہ کی غلطی آخری حد تک واضح کر دی ہے مگر اس معاملہ میں ہمارا ذہن کسی طرح بدلنے کا نام نہیں لیتا۔

انگریز کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ہم نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ہمارے تمام اصاغر و اکابر سمجھ بیٹھے تھے کہ انگریز کے ہٹتے ہی اسلام کی روایتی عظمت و شوکت کا دور دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ انگریز نے سیاسی گدی چھوڑ دی اور اس واقعہ پر تقریباً چوتھائی صدی گزر گئی مگر ہمارا کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہ ہوا بلکہ شدید تر ہو گیا۔

ایسے سنگین تجربہ کا کم سے کم فائدہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم سیاسی تبدیلیوں کا بے حقیقت ہونا سمجھ جاتے۔ اور یہ جان لیتے کہ زندگی اور تقدیر بنانے میں کچھ دوسرے عوامل زیادہ اہم حصہ ادا کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ سب کچھ کھونے کے باوجود ہمیں یہ فائدہ بھی حاصل نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی لیڈروں کی موجودہ سرگرمیاں اور گفت و شنید کی دوڑ دھوپ طفلانہ ہنگاموں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ صدر ایوب کو ان کے سیاسی عہدے سے ہٹا دینا کسی بھی درجہ میں پاکستان کے کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

پاکستانی لیڈروں کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ پاکستان میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ قوم وجود میں لاتے اس کو ایک مضبوط ملک بناتے مگر اس مشکل کام کی تاب وہاں کے کسی لیڈر میں نہیں تھی اس لئے انہوں نے اس آسان راستہ کو اپنا لیا کہ دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامے برپا کر کے اپنی اہمیت کا مظاہرہ کریں۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ آج کے لحاظ سے خواہ پاکستانی عوام کو ان کے نعرے کتنے ہی پر امید نظر آتے ہوں مگر مستقبل کے اعتبار سے ان نعروں میں پاکستان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ مستقبل کی تعمیر کے لئے قوم و ملک کو بدلنے کی ضرورت ہے نہ کہ سیاسی عہدوں کو بدلنے کی۔

پاکستانی سیاست ایک اہم موڑ پر

ماہنامہ 'معارف' اعظم گڈھ، اپریل سنہ ۱۹۶۹ء کا اداریہ:

از قلم شاہ معین الدین احمد ندوی

[برِ صغیر ہند و پاک کا کون سا پڑھا لکھا مسلمان ہوگا جو مجلس دار المصنفین، اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا کے ماہوار علمی مجلہ 'معارف' کے نام سے واقف نہ ہو۔ اس علمی جریدے کی اشاعت بابت اپریل سنہ ۱۹۶۹ء میں اس کے فاضل مدیر شاہ معین الدین احمد ندوی نے پاکستان کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ اگرچہ کسی تحریر کے جملہ مشتملات سے مکمل اتفاق تو شاذ ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ تحریر

بحیثیت مجموعی اس قابل ہے کہ پاکستان کا ہر درد مند مسلمان اسے پڑھے اور اس کی روشنی میں اپنے گرد و پیش کے حالات کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرے ——— اسرار احمد]

• پاکستان کا انقلاب مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی بلکہ بدبختی کا نمونہ ہے۔ دوسرے اسلامی ملکوں کو ان کے دشمنوں کے ہاتھوں جو نقصان پہنچا ہے اس انقلاب نے پاکستان کو اس سے کم نقصان نہیں پہنچایا۔ جنرل ایوب خاں میں متعدد خامیاں ہوں گی ورنہ ان کے خلاف اتنا بڑا انقلاب نہ ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان ہی نے پاکستان کو آئے دن کے انقلاب سے نجات دلائی۔ اس کو استحکام بخشا۔ بیرونی دنیا میں اس کی ساکھ قائم کی اور مختلف حیثیتوں سے اس کو بڑی ترقی دی۔ ان ساری ترقیوں کو موجودہ انقلاب نے برباد کر کے رکھ دیا جس کی تلافی مدتوں میں ہو سکے گی۔ یہ بھی ایوب خاں کا تدبر ہے کہ فوجی جنرل ہوتے ہوئے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا اور مخالفین کے بنیادی مطالبات مان لئے ورنہ اس سے بھی زیادہ کشت و خون ہوتا۔

ان کے مخالفین نے عوام کے جذبات تو ابھار دیئے لیکن ان کو قابو میں نہ رکھ سکے اور ان میں ایسا جنون پیدا ہو گیا کہ پورے پاکستان میں غدر کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کے ناعاقبت اندیش عوام نے خود اپنے بھائیوں پر ایسے وحشیانہ مظالم کئے جن سے روس اور فرانس کے انقلاب کی یاد تازہ ہو گئی۔ اور یہ کارِ خیر اس امت کے ہاتھوں انجام پایا جو ساری دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیام لائی تھی اب جمہوریت اور سوشلزم کے علمبرداروں کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ انہوں نے جس آتش فشاں کو بھڑکایا تھا۔ وہ پورے پاکستان کو جلا کر خاکستر کر دے گا۔ جمہوریت اور سوشلزم کا نعرہ محض ایوب خاں کی مخالفت تک محدود نہیں رہ گیا بلکہ اس نے نسلی، جغرافی، لسانی ہر قسم کی عصبیتوں اور دوسرے فاسد عناصر کو ابھار دیا ہے۔ اگر ان سب کے مطالبات مان لئے جائیں تو پاکستان کا وجود باقی نہ رہے گا۔

عوامی جمہوریت یعنی برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت اور سوشلزم تو خود یورپ کے سب ملکوں میں نہیں ہے بلکہ اس کی شکلیں ہر ملک کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ یہ نظام حکومت ان ہی ترقی یافتہ ملکوں کے لئے مفید ہے جن کا سیاسی شعور پختہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان جیسے غیر تعلیم یافتہ اور پسماندہ ملکوں کے لئے انتہائی مہلک ہے اسی لئے یہ جمہوریت ایشیا کے کسی ملک میں بھی کامیاب نہیں۔ ہندوستان میں اس کی کامیابی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے مگر اس کی کامیابی ملک کی موجودہ بدنظمی اور انتشار سے ظاہر ہے۔ اسی لئے اب ہندوستان کے بہت سے مفکرین اس کے خلاف ہو رہے ہیں۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ یورپ خصوصاً برطانیہ صدیوں کے علم و تجربہ کے بعد جس منزل پر پہنچا ہے، ہندوستان و پاکستان چند برسوں میں وہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ شیر خوار بچہ کو ثقیل غذائیں کھلائی جائیں۔ اس کا نتیجہ ہلاکت کے سوا کیا نکل سکتا ہے۔ ہم اس جمہوریت اور سوشلزم کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن وہ پاکستان جیسے نو مولود ملک کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ اس کے لئے محدود جمہوریت کے ساتھ اچھا صدارتی نظام ہی مناسب ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو وسیع جمہوریت کی طرف بڑھایا جائے ورنہ اس کے جو تلخ نتائج ایک مرتبہ نکل چکے ہیں وہی آئندہ بھی نکلیں گے۔ لیکن اگر پاکستان کی فلاح اسی میں ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔

لطف یہ ہے کہ اس جمہوریت اور سوشلزم کو اسلام کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے جو سراسر فریب
۔ اسلام کا اپنا مستقل نظام ہے جو ان سب سے مختلف، ان کی خرابیوں سے پاک لیکن ان کے صالح عناصر
جامع ہے۔ اس معنی میں اسلام کا نظام بلاشبہ جمہوری ہے کہ اس میں مطلق العنان آمریت نہیں اور امیر
حکمران کے انتخاب اور دوسرے اہم معاملات میں اصحاب رائے کا شوریٰ ضروری ہے لیکن بالغ رائے دہندگی نہیں۔
ی طرح ملکی حقوق میں ملک کے سارے باشندے برابر ہیں لیکن اشخاص کے لئے جائز طریقوں سے حصول دولت
وتی پابندی نہیں اور مذہب کے مقرر کردہ صدقات اور حکومت کے عائد کردہ ٹیکس کی ادائیگی کے بعد ہر شخص
ی دولت کا مالک رہے گا۔ وہ حکومت کی ملک نہیں بن سکتی۔ درحقیقت اسلام کا مالی اور معاشی نظام اتنا
رزوں ہے اور اس نے دولت مندوں پر اتنے فرائض عائد کر دیئے ہیں کہ اگر ان سب پر عمل کیا جائے تو ملک
میں نہ معزز سرمایہ داری پیدا ہو سکتی ہے اور نہ عزبت و افلاس۔ حیرت ان علماء پر ہے جو اسلامی نظام کی
دعوت کے باوجود ان ہی گمراہ کن اصطلاحوں کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

اس وقت ساری دنیا میں کمیونزم، جمہوریت اور سرمایہ داری کی تحریک ہے۔ اور ان میں ہر فریق ایشیا اور
افریقہ میں اپنا اثر قائم کرنے کے لئے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ پاکستان کا انقلاب بھی اس سے خالی
نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں تو کمیونزم کے اثرات بالکل نمایاں ہیں۔ وہاں مہاجرین کے خلاف بھی تعصب پیدا ہو
گیا ہے۔ یہ کس قدر شرم اور افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان میں جہاں دینی اخوت کا کوئی تصور نہیں، شرنارتھی اپنے
پرانے وطن کی طرح سکون اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پاکستان میں جس کی بنیاد اسلام کے نام
پر قائم ہوئی ہے ان دینی بھائیوں کو جن کی قربانیوں کے بدولت پاکستان بنا ہے غیر سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ
افسوسناک بات تصور میں نہیں آ سکتی۔

پاکستان میں نسلی اعتبار سے مختلف قومیں آباد ہیں۔ جن کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ ان میں وحدت کا
رشتہ صرف اسلام ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹا تو پھر اس کو کوئی قوت انتشار سے نہیں بچا سکتی۔ موجودہ انقلاب نے
اس کی اہمیت اور زیادہ واضح کر دی ہے۔ اس وقت پاکستان میں نہ صرف ہر صوبہ اور ہر نسل بلکہ ہر طبقہ مطالبات
کی ایک طویل فہرست لے کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اگر ان کو مان لیا جائے تو پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور
وہ سیاسی حیثیت سے دیوالیہ ہو جائے گا۔ اس کی بقا و استحکام زیادہ سے زیادہ وحدت اور ایک مضبوط
مرکزی حکومت پر موقوف ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ صوبوں خصوصاً مشرقی پاکستان کی جائز شکایتوں کا ازالہ بھی
ضروری ہے اور ایسا حل نکالنے کی ضرورت ہے جس سے پاکستان کی وحدت بھی قائم رہے اور صوبوں کی شکایتیں
بھی دور ہو جائیں۔ ورنہ اگر ہر فریق اپنے مطالبات پر اڑا رہا تو پاکستان کی تباہی کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکل
سکتا۔ مشرقی پاکستان تو یقیناً کمیونزم کی گود میں چلا جائے گا اور اس کے نتائج کا اس وقت اس کو اندازہ ہوگا
جب اس کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے اس وقت ایوب کے مخالفین اور جمہوریت و سوشلزم
کے علمبرداروں کے تدبر کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ان کو اپنا بھلا برا سمجھنے کی توفیق عطا
فرمائے اور پاکستان کو ہر گزند سے محفوظ رکھے۔"


TRADE-MARK REGD.
THE COCA-COLA
darago

الہدیٰ

نشست ۲۵

اثباتِ آخرت

سورۂ قیامہ کی روشنی میں

(درسِ ہشتم)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ﴿۱﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ﴿۲﴾ اَيَحْسَبُ
الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ
بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۚ﴿۵﴾ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ
الْقِيٰمَةِ ؕ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ﴿۷﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ﴿۸﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَ
الْقَمَرُ ۙ﴿۹﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۚ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ؕ﴿۱۱﴾ اِلٰى
رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣالْمُسْتَقَرُّ ؕ﴿۱۲﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ؕ﴿۱۳﴾
بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ؕ﴿۱۵﴾ لَا تُحَرِّكْ

بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ
فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾
وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾
وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾ كَلَّآ اِذَا
بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَ
الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ
وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾
اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ
يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ
عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾
اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی — اور نہیں! مجھے قسم ہے نفس ملامت گر کی — کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ — کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس کی ایک ایک پور کو ٹھیک ٹھاک اور برابر کر دیں — اصل بات یہ ہے کہ انسان اپنے فسق و فجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے — پوچھتا ہے کب ہوگا قیامت کا دن؟ — تو جب نگاہ چندھیا جائے گی — اور چاند بے نور ہو جائے گا — اور سورج اور چاند یک جا کر دیے جائیں گے — تو اس دن کہے گا یہی انسان کہ کہاں ہے بھاگ جانے کی جگہ؟ — کوئی نہیں! کہیں ٹھکانا نہیں! — اس روز تو تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے — اس روز جتلا دیا جائے گا ہر انسان ہر اس چیز سے جو اس نے آگے بھیجی اور جو کچھ پیچھے چھوڑی — بلکہ انسان خود اپنے بارے میں پورے طور سے

آگاہ ہے ۔ خواہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے ۔۔۔ اے نبیؐ! آپ اس قرآن کے ساتھ تیزی سے اپنی زبان کو حرکت مت دیجئے کہ اسے جلدی سے حاصل کرلیں ۔ تحقیق ہمارے ذمّے ہے اس کو جمع کرنا بھی اور اسکو پڑھوانا بھی ۔۔۔ پس جب ہم پڑھوائیں تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کیجئے ۔۔ پھر بلاشبہ ہمارے ہی ذمّے ہے اس کی مزید تشریح بھی اور توضیح بھی ۔۔ کوئی نہیں! بلکہ تم لوگ دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو ۔ اور آخرت کو نظر انداز کردیتے ہو ۔۔۔ بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے ۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوئے ۔۔۔ اور بہت سے چہرے اُس دن سوکھے ہوئے اداس ہوں گے ۔ یہ گمان کررہے ہوں گے! کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے ۔ کوئی نہیں! جب جان ہنسلیوں میں آ پھنسے گی ۔ اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ۔ ؟ اور انسان یہ سمجھ لے گا کہ اب دنیا سے جدائی کا وقت آگیا ہے ۔ اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی ۔ اور اس روز تیرے رب ہی کی طرف ہانکے جانا ہے ۔ پس نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی ۔ بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ موڑلی ۔ اور چل دیا اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا اینٹھتا ہوا ۔ افسوس ہے تجھ پر! پس افسوس ہے تجھ پر ۔ پھر افسوس ہے تجھ پر، پس پھر افسوس ہے تجھ پر ۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا ؟ ۔ کیا نہیں تھا وہ منی کی ایک بوند جو ٹپکائی گئی ۔ پھر وہ تھا ایک لوتھڑا جسے اللہ نے بنایا اور سنوارا ۔ پھر اُسی میں سے بنادیئے جوڑے نر اور مادہ ۔۔ کیا وہ ہستی تعو اس پر قادر نہیں! کہ مُردے کو زندہ کرسکے ؟"
"یقیناً اے ہمارے رب! تو اس پر قادر ہے اور ہم اس پر گواہ ہیں ۔"
اور وہ سبح فرمایا ہمارے آقا عظمت والے اللہ نے ۔"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!
یہ ہے سورہ قیامہ اور یہ ہے اس کی کسی حد تک ترجمانی جو آپ کے سامنے آئی۔ اس سورۂ مبارکہ کا جو ایک مجموعی تاثر ہے اور اس کے جو مضامین ہیں، اس ترجمانی سے ان کا ایک اجمالی نقشہ ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اس سورہ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم پر قدرے گہرائی میں اتر کر غور کرنے سے قبل میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سورۂ مبارکہ کے حوالے سے دو باتیں آپ اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور یہ دونوں باتیں فہم قرآن کے ضمن میں بنیادی کلیدوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سب سے پہلی بات قرآن مجید کے اسلوب سے متعلق ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ قرآن حکیم ہماری عام تصانیف کے مانند کوئی تصنیف نہیں ہے۔ ہماری اپنی تصانیف اور تالیفات کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے۔ اس کی ایک اپنی ترتیب اور اپنی ایک نہج ہوتی ہے۔ اس میں ابواب ہوتے ہیں۔ ایک باب میں مضمون کا ایک حصہ مکمل ہوجاتا ہے۔ پھر اس کو اگلے باب میں دوہرایا نہیں جا[تا]۔ جو لوگ قرآن حکیم کو دنیا کی عام تصنیفات و تالیفات پر قیاس کرکے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں ناکامی بھی ہوتی ہے اور بے دلی بھی ہوتی ہے۔ اچھی طرح جان لیجئے کہ قرآن حکیم نہ عام تصانیف و تالیفات کے مانند ہے اور نہ ہی اس کی سورتوں کی حیثیت کتاب کے ابواب کی ہے یا مضامین یا مقالات کی ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کا اسلوب ہے خطبے کا۔ اور قرآن حکیم کی سورتیں گویا کہ خطباتِ الٰہیہ ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید کو آپ مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اب خطبے کے اسلوب میں چند چیزیں ایسی ہیں جو اس کے لازمی جزو کی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان کو سمجھ لیا جائے تو قرآن مجید کے فہم میں بڑی آسا[نی] ہوجائے گی۔

پہلی بات یہ کہ جب کوئی شعلہ بیان خطیب کوئی خطبہ دے رہا ہو تو ایک

نمایاں بات تو یہ سامنے آئے گی کہ اس میں بار بار خطاب کا رخ بدلے گا۔ ابھی وہ داہنی طرف مخاطب تھا اور گفتگو کر رہا تھا۔ پھر وہ بائیں جانب کے لوگوں کی طرف مخاطب ہو گیا، اب ان سے گفتگو کر رہا ہے۔ اکثر اس کے مخاطبین اس کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ ہوتے ہیں ۔۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ موجود نہیں ہوتے ان کو وہ موجود اور حاضر فرض کر کے اُن سے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ حاضرین سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے لیکن صیغۂ خطاب میں نہیں بلکہ صیغۂ غائب کے انداز میں گویا وہ اس وقت وہاں موجود نہیں ہیں ۔۔ پھر آپ خطبات میں یہ بھی دیکھیں گے کہ جو مخاطبین ہیں، ان کے اعتراضات کو نقل کئے بغیر اور ان کے سوالات کو بیان کئے بغیر ان کا جواب دیا جاتا ہے۔ جواب کا انداز و اسلوب ایسا ہوتا ہے کہ حاضرین و مخاطبین خود جان لیں کہ یہ بات فلاں اعتراض کے جواب میں کہی جا رہی ہے۔ یہ تشریح فلاں سوال کے طور پر آئی ہے۔ یہی انداز آپ کو قرآن مجید میں ملے گا ۔۔ اگر خطبہ کے اسلوب اور انداز کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو فہم قرآن میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اس سورہ مبارکہ میں آپ دیکھیں گے کہ یہ اسلوب خطابت اور خطبہ کا یہ انداز بہت نمایاں ہے۔ ساری گفتگو منکرین قیامت سے ہو رہی ہے۔ کبھی صیغہ حاضر و خطاب میں براہِ راست ان سے بات ہو رہی ہے۔ کبھی الانسان کے حوالے سے بصیغہ غائب گفتگو ہو رہی ہے۔ درمیان میں چند باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرما دی گئیں۔ اس طرح تحویل خطاب ہو گیا۔ پھر خطاب کا رُخ دوبارہ منکرین قیامت و آخرت کی طرف منتقل ہو گیا۔ تو تحویل خطابت اور خطبہ کا یہ جو اسلوب و انداز ہے، اس کے اعتبار سے یہ سورہ مبارکہ اس کا ایک نمایاں نمونہ ہے۔

دوسری بات یہ کہ ابتدائی مکی سورتوں کا اپنا ایک خاص الخاص اسلوب و انداز ہے۔ مکی دور کے بھی آخری حصے میں جو سورتیں نازل ہوئی ہیں، ان کا اسلوب

کچھ مختلف ہے — پھر مدنی سورتوں میں جا کر وہ جو رنگِ دگر ہے وہ پختہ اور بہت نمایاں ہو جاتا ہے — ابتدائی مکّیات اور بعد کی سورتوں کے مابین جو فرق ہے ان کو یوں سمجھئے کہ ابتدائی مکّی سورتوں میں خطابت کا رنگ بہت زیادہ گہرا اور بہت نمایاں ہے — ان میں جوش و خروش بھی زیادہ ہے جیسا کہ آپ نے اس سورہ مبارکہ میں محسوس کیا ہو گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعلہ بیان خطیب خطبہ دے رہا ہے۔

— پھر یہ کہ ابتدائی مکّی سورتوں میں آیات چھوٹی چھوٹی ہیں۔ بعد کی سورتوں بالخصوص مدنی سورتوں میں آیات کا حجم بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ ہم ایک فوری تقابل کر سکتے ہیں — یہ سورہ قیامہ ہے، جو ابتدائی مکّی سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس سے متصلاً قبل ہم نے سورۂ تغابن کا مطالعہ کیا ہے جو مدنی سورہ ہے۔ وہ بھی دو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ سورہ قیامہ بھی دو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ مصحف میں اگر ان دونوں سورتوں کے حجم کا آپ تقابل کریں گے تو سورہ قیامہ، سورہ تغابن کے تین چوتھائی سے بھی کم ہے۔ لیکن اس کی آیات کی تعداد اٹھارہ ہے، اس کی آیات کی تعداد چالیس ہے — پھر آپ دیکھیں گے کہ ابتدائی مکّی اکثر سورتوں میں موزونیت اور ترنّم ہے، Rhythm ہے۔ روانی Flow ہے۔ روانی بھی بلا کی ہے اور جوش و خروش بھی بے پناہ ہے۔ ان میں آپ کو یہ رنگ بھی غالب نظر آئے گا کہ صوتی آہنگ کا خاص طور پر خیال گیا ہے۔ فواصل ہیں اور عموماً آیات کے آخری الفاظ کے مابین ایک صوتی مناسبت ہے — یہ تمام اوصاف ابتدائی مکّی سورتوں میں بہت نمایاں ہیں جبکہ آخری دور کی مکّیات اور بالخصوص مدنی سورتوں میں آپ اس کے برعکس کیفیت دیکھیں گے۔ آیات طویل ہو گئی ہیں، بہاؤ تیز نہیں ہے بلکہ بڑے پُرسکون انداز جیسے کہ کوئی دریا بہہ رہا ہو اس طرح مضمون بہتا اور آگے بڑھتا ہے۔ ان میں ق[illegible] کا بھی اُتنا اور ویسا اہتمام نہیں ہے جو ابتدائی مکّیات کا خصوصی وصف نظر آ[illegible] ہے — اس تقابل کو اگر آپ ایک تشبیہ سے سمجھنا چاہیں تو بڑی پیاری تشب[illegible]

ہے - ایک تو ہوتے ہیں پہاڑی ندی اور نالے - ایک ہوتے ہیں میدانی دریا -
آپ کو معلوم ہے کہ پہاڑی نالے اور ندیوں کے پاٹ بہت ہی کم ہوتے ہیں -
عموماً چوڑائی کم اور گہرائی زیادہ ہوتی ہے - البتہ بہاؤ میں نہایت تیزی اور
اور جوش و خروش ہوتا ہے - جبکہ یہی ندیاں اور نالے جب کسی دریا میں آکر
ملتے ہیں اور وہ دریا میدان میں آتا ہے تو اس کا پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا ہے -
گہرائی اتنی نہیں رہتی - پھر یہ کہ میدانی دریا بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ، بڑے سکون
کے ساتھ، یکسانی اور ہمواری کی سی کیفیت کے ساتھ، تسلسل کے ساتھ
رواں رہتا ہے - تو ابتدائی مکیات کو پہاڑی ندی نالوں کے سے جوش و خروش
اور آخری دور کی مکیات پھر مدنیات کو ایک ہموار اور یکسانیت کے ساتھ
بہنے والے میدانی دریا سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے - لہٰذا ابتدائی مکیات پھر آخری
مکیات نیز مدنی سورتوں کے اسلوب کے مابین جو فرق و تفاوت ہے اس کو اس
تشبیہہ پھر بالخصوص سورۂ قیامہ کے حوالے سے آپ اچھی طرح ذہن نشین کر سکتے ہیں
اس سورہ مبارکہ کا آغاز دو قسموں سے ہوتا ہے - پھر ان دونوں قسموں سے
پہلے حرف "لا" آیا ہے - یہاں یہ بات اچھی طرح جان لیجئے کہ لَآ اُقْسِمُ میں "لَا
اُقْسِمُ" سے متصل نہیں سمجھا جائیگا" بلکہ لا منفصل ہے" لا علیحدہ ہے" "اُقْسِمُ علیحدہ
ہے - لیکن چونکہ عربی زبان میں انگریزی کی طرح کے 'Punctuations'
یعنی علامتیں اور اوقات نہیں ہیں - لہٰذا یہ فرق اسلوب بیان سے اور مضمون کے سیاق
و سباق پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے - ایک خطیب خطبہ شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے
اس کے جو سامعین و مخاطبین ہیں، ان کے ذہنوں میں کچھ اشکالات ہیں، اعتراضات ہیں،
سوالات ہیں - لہٰذا خطیب انکی تردید سے اپنی گفتگو شروع کرتا ہے اور کہتا ہے: "لا" ہرگز
نہیں! تمہارے خیالات غلط ہیں، تمہارے اشکالات باطل ہیں، تمہارے اعتراضات
بے وزن ہیں: اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ۔ "میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی"
- گویا قیامت اتنی یقینی حتمی اور قطعی ہے کہ میں اسکی قسم کھا رہا ہوں - اسی طرح انگریزی میں
NAY کا استعمال ہوتا ہے - لہٰذا اس آیت کو انگریزی میں یوں ادا کیا جائے گا
'Nay! I swear by the Day of Judgement'

اب یہاں کے بعد ایک (کوما ، د) آجاتا ہے جس سے بات واضح ہو جاتی ہے — آپ یہاں "اِنّی کوما" کو محذوف سمجھئے، مقدر جانیئے، سمجھیے — پھر آیت کر پڑھیئے : لَآ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ — وہ نہیں! — میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی"۔ اسی طرح دوسری آیت : وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ٥ "نہیں! — میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ یہ آغاز خود بتا رہا ہے کہ انداز د اسلوب خطیبانہ ہے جیسے کہ ایک خطیب ہے جو اپنا خطبہ شروع کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کے سامنے جو سامعین، حاضرین اور اسکے مخاطبین ہیں ان کے ذہنوں میں کیا کیا وسوسے ہیں! کیا کیا اشکالات ہیں! کیا کیا اعتراضات ہیں! خیالات ہیں! وہ کن کن وجوہ اور اسباب کی بنیادوں پر وقوعِ قیامت و آخرت کو بالکل ناممکن سمجھ رہے ہیں! محال جان رہے ہیں!" — وہ کن کن طریقوں سے اس بات کا اظہار کر رہے ہیں — لہذا خطیب اُن کے ان تمام اشکالات، اعتراضات اور وسوسوں کی نفی سے اپنے خطبے کا آغاز کر رہا ہے : لَآ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ٥ وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ٥

اب ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ ان قسموں سے مراد کیا ہے! ان کا اصل مفاد فائدہ کیا ہے! — اور ان میں اللہ تعالیٰ نے اثباتِ قیامت و آخرت کے لیے مثبت استدلال کو جس طرح کوزے میں دریا کو بند کرنے کا محاورہ ہے عین اس کے مطابق ان قسموں کے اسلوب میں کس طرح جامعیت اور حد درجہ ایجاز و اعجاز کے ساتھ تمام اشکالات واعتراضات کے جواب کو سمو دیا ہے! اس پر ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیلی گفتگو اگلی نشست میں ہوگی — آج اس سورۃ مبارکہ کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا — اس ضمن میں اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں —

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب! یہ جو قرآن مجید کا ٹھیٹھ عربی انداز ہے، اس کی اہمیت آج کل کی جو عربی ہے اس میں کس حد تک ہے ؟

جواب : مناسب سوال ہے — عربی زبان پر قرآن مجید کا ایک بہت بڑا

یہ ہے کہ عربی کی ادبی زبان کی روایات کا جو قدیم تسلسل ہے تو گویا ایک ستون کی طرح قرآن مجید عربی زبان کی ان ادبی روایات کو تھامے ہوئے ہے۔ اب بھی عربی ادب میں قرآن مجید کا مقام وہی ہے جو اس کے نزول کے وقت تھا۔ پھر عربی کو بحیثیت مادری زبان رکھنے والے معتدبہ یہودی اور عیسائی اب بھی موجود ہیں۔ وہ اگرچہ قرآن مجید کے منزّل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے لیکن وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت اور ادبیت و سلاست کی معراج ہے قرآن مجید۔ قرآن حکیم کے ان اوصاف میں سے کسی کے بارے میں بھی ان کو کوئی اشتباہ نہیں ہے، یہ بات اپنی جگہ زیادہ تفصیل طلب بلکہ ایک علیحدہ وسیع موضوع ہے کہ قرآن مجید کے اعجاز کے کون کون سے رُخ ہیں، کون کون سے پہلو ہیں! لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے معانی، اس کے مفاہیم، اس کا طرزِ استدلال، اسکی رہنمائی، اس کی رُوحانی واخلاقی تعلیمات۔ پھر انسان کی عمرانی اور تمدنی زندگی کے مسائل کا خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، ان کا جو متوازن اور صحیح حل قرآن پیش کرتا ہے، وہ سب اپنی جگہ معجزے ہیں لیکن اس کے نزول کے وقت اسکی جو فوری طور پر سب سے زیادہ تاثیر محسوس ہوئی تھی وہ اس کا اسلوب بیان ہے۔ اس کی ادبیّت، اسکی فصاحت، اسکی بلاغت، اس کی سلاست، اس کی حلاوت، اس کی چاشنی ہے۔ اور وہ تاحال اُسی طرح آفتاب عالم تاب کی مانند قائم۔ باقی اور تابندہ ہے اس پر کہیں بھی فرسودگی، بوسیدگی باسی یا پرانے پن کا کوئی اثر نہیں ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کتاب ہے، کہ: وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهُ ۔ وہ علماء اس کتاب سے کبھی سیر نہیں ہونگے اس پر باسی پن کبھی طاری نہیں ہوگا نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی نئے نئے علوم ومعارف کا خزانہ کبھی ختم ہوگا" گویا یہ ہمیشہ تر وتازہ کلام رہے گا جیسا کہ اپنے نزول کے وقت تھا۔

سوال : ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں عام دنیوی کتابوں کی طرح Parts یا Chapters نہیں ہیں۔ لیکن ہم نے سنا ہے کہ

جب وحی نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو آیت یا آیتیں ہیں، ان کو فلاں سورت کے ساتھ یا فلاں آیات کے بعد شامل کر لو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کچھ Paets یا اس کی کوئی تقسیم ضرور ہے اس بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟ -

جواب : بہت عمدہ سوال ہے — اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید کا اپنا ایک اندرونی نظام ہے - ہر سورت کا ایک مرکزی خیال ہے، اسکا عمود ہے - جس کے ساتھ اس کی آیات متعلق ہیں - لہذا ترتیب نزولی میں اگرچہ کچھ فرق ہوتا تھا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ترتیب مصحف میں اس معنوی ربط و تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے آیات کو مرتب فرماتے تھے - البتہ یہ بات جان لیجئے کہ یہ کام بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق انجام دیا جاتا تھا جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے آپ کو دی جاتی تھی — البتہ میں نے جو بات عرض کی تھی وہ یہ کہ قرآن مجید کا یہ اندرونی نظام اور اسکی ترتیب ہماری جو دنیوی تصانیف و تالیفات ہیں ان کے chapters کے مانند نہیں ہیں قرآن مجید کا اپنا ایک منفرد انداز ہے - اس کا اپنا ایک Unique اسلوب ہے اس کو اپنے مقام پر رکھ کر اگر غور کیا جائے اور سمجھا جائے تو اس نظام میں ہمیں بہت سی حکمتیں نظر آئیں گی - اگر ہم ان پر دنیوی تصانیف کے chapters پر قیاس کر کے غور کریں گے تو ہمیں دقتیں بھی محسوس ہوں گی اور ہم قرآن مجید سے صحیح طور پر استفادہ سے محروم رہ جائیں گے -

حضرات! آج ہم نے اس سورہ مبارکہ کے حوالے سے قرآن مجید کے بارے میں چند بڑی بنیادی باتیں سمجھی ہیں - ان کو اگر آپ ذہن نشین کر لیں گے مطالعہ اور فہم قرآن حکیم کے لئے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ باتیں بہت مفید ثابت ہوں گی - البتہ سورہ قیامہ پر غور و فکر کا سلسلہ ابھی پوری طرح ختم نہیں ہو سکا ہے - ان شاء اللہ العزیز وہ ہم آئندہ نشست میں شروع کریں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین -

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۴)

صبرِ محض سے اقدام تک

امیرِ تنظیمِ اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

حضرات! آج ہمیں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ایک نہایت اہم اور حد درجہ غیر معروف باب (Chapter) کا مطالعہ کرنا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد میں صبرِ محض، یعنی (Passive Resistance) سے 'اقدام' (یعنی Active Resistance) کی طرف پیشقدمی کا مرحلہ کب اور کیسے آیا؟" اس ضمن میں سب سے پہلے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ چونکہ ہر اجتماع میں اس بات کا امکان رہتا ہے کہ کچھ اصحاب بالکل نئے ہوں۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان اجتماعاتِ جمعہ میں جو سلسلۂ گفتگو گذشتہ دو ماہ سے چل رہا ہے اس کی طرف ایک اجمالی اشارہ کر دیا جائے۔[۱]

گذشتہ مباحث کا خلاصہ اور ربطِ مضمون

ہم آج کل سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ خاص اس پہلو سے کر رہے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عظیم انقلاب برپا فرمایا وہ کن مراحل سے ہو کر گزرا تھا! اس کے ابتدائی، درمیانی اور اختتامی مراحل کون کون سے تھے اور پھر یہ کہ اس انقلاب میں کس طرح درجہ بدرجہ ایک مرحلے سے دوسرے کی جانب پیش رفت ہوئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس ضمن میں 'انقلابِ نبویؐ' پر گفتگو سے قبل میں نے مجرّد انقلاب کے موضوع پر مفصل گفتگو کی تھی کہ کوئی بھی انقلاب جو حقیقی معنوں میں انقلاب ہو اور جو واقعتاً انسان کی اجتماعی زندگی کے کسی گوشے میں ایک بنیادی تبدیلی پر منتج ہو، ایسے انقلاب کا طریقِ کار (Methodology) کیا ہوتا ہے ــــ ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس ضمن میں میرا ماخذ (Source) صرف اور صرف سیرت النبی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) البتہ میں نے ابتداءً اسے سیرتِ مطہرہ سے علیحدہ کرتے ہوئے مجرّد انداز میں بیان کیا تھا ــــ ذہن پھر تازہ کر لیجیے کہ کسی بھی انقلاب کے چھ مراحل ناگزیر ہیں۔ تین مراحل تمہیدی نوعیت کے ہیں اور تین کو

---

[۱] تفصیلات کے لئے ماہنامہ میثاق کے [illegible] کے جنوری، مئی، جون، جولائی اور اگست کے شمارے ملاحظہ فرمائیں

تکمیلی مراحل قرار دے سکتے ہیں ـــــــ تمہیدی مراحل میں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی نظریہ سامنے لایا جائے اور اس کی نشر و اشاعت کی جائے ـــــ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو لوگ اس انقلابی نظریئے کو شعوری طور پر قبول کرلیں۔ انہیں منظم کر کے ایک اجتماعی شکل دی جائے ـــــ اور تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس انقلابی جماعت میں شریک لوگوں کی تربیت کی جائے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ تربیت پیش نظر انقلاب کی مناسبت ہی سے ہوگی۔ اگر خالص مادی انقلاب برپا کرنا ہے تو ساری تربیت مادی نوع کی ہوگی لیکن اگر پیش نظر انقلاب میں روحانی اور اخلاقی پہلو (Dimension) بھی شامل ہیں بلکہ انہیں اوّلیت حاصل ہے تو لامحالہ انقلابی جماعت کی تربیت میں اخلاقی و روحانی تربیت کا جزء مادی تربیت پر مقدم رہے گا ـــــ ان تین تمہیدی اقدامات کے ذریعے ایک 'انقلابی قوت' درحقیقت ایک 'انقلابی جماعت' کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس کے بعد تصادم کے مراحل ہیں۔ یعنی اب وہ انقلابی جماعت ٹکراتی ہے اس موجود الوقت نظام کے ساتھ جو باطل اور فاسد ہے جس کی بنیاد غیر اللہ کی حاکمیت کے تصوّر پر قائم ہے۔ گویا عمر بانشہ درویشی درساز و دمادم زن!" کے مراحل سے گزرنے کے بعد ایک انقلابی جماعت "چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!" کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔

اس تصادم کے بھی تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب داعیٔ اوّل اس انقلابی دعوت کا آغاز کرتا ہے۔ اس لئے کہ جیسے ہی کوئی شخص کسی معاشرے میں انقلابی دعوت پیش کرتا ہے تو یہ بات پس پردہ موجود ہوتی ہے کہ اس کے خیال کے مطابق رائج الوقت نظام فاسد ہے؛ وہ اسے صحیح نہیں سمجھتا۔ گویا انقلابی دعوت کا آغاز ہی اس نظام کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ یہ ہے وہ مرحلہ جس کا ردِّعمل پھر اس معاشرے اور اس نظام کی طرف سے ظاہر ہونا لازم ہے۔ بالخصوص اس معاشرے کے وہ طبقات جن کے مفادات پر زد پڑتی ہے۔ وہ اسے کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اس نظام کو غلط اور فاسد کہا جائے کہ جس کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہیں۔ لہٰذا وہ اس نظام کے تحفظ کی پوری کوشش کریں گے اور تصادم کا پہلا مرحلہ یوں آئے گا کہ ان کی طرف سے اس انقلابی جماعت کے وابستگان پر تشدّد کیا جائے گا۔ لیکن اس مرحلہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انقلابی جماعت اس تشدّد (Persecution) کو برداشت کرے گی۔ اور کوئی جوابی کارروائی نہیں کرے گی۔ حتیٰ کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھائے گی۔ یہ صبرِ محض کا مرحلہ ہے۔ جسے میں Passive Resistance سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر وہ انقلابی جماعت شروع ہی سے مشتعل (Violent) ہو جائے۔ مدافعانہ جدوجہد (Retaliation) شروع کر دے تو گویا رائج الوقت باطل نظام کو اس بات کا اخلاقی جواز حاصل ہو جائے گا کہ وہ انقلابی جماعت کو ابتداء ہی میں کچل دے۔ چنانچہ اس مرحلے پر صحیح طرزِ عمل یہی

ہے کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس طرزِ عمل کے دو نتائج نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس صبرِ
محض کے مرحلے میں جماعت کے کارکنوں کی تربیت ہوتی چلی جاتی ہے، ان میں قوتِ برداشت اور قوتِ
ارادی پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے، ان کا اپنے نظریہ کی حقانیت پر یقین و اعتماد بڑھتا چلا جاتا ہے۔
دوسرا یہ کہ اس معاشرے کی خاموش اکثریت (Silent Majority) ہے۔ اس کی ہمدردیاں
رفتہ رفتہ اس انقلابی گروہ کے ساتھ ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اس
جماعت کے لوگ جو ماریں کھا رہے ہیں اور مصائب برداشت کر رہے ہیں انہوں نے کوئی اخلاقی
جرم نہیں کیا، ان کا جرم صرف اتنا ہے کہ جس بات کو حق سمجھ رہے ہیں، اسے علی الاعلان بیان
کر رہے ہیں ـــــ کسی بھی انقلابی جدوجہد کے لئے یہ اہم ترین مرحلہ ہے۔ اس کے لئے میں
ایک لفظ استعمال کیا کرتا ہوں 'To Buy Time' یعنی یہ عدم تشدد یا Passive
Resistance کا مرحلہ درحقیقت وقت حاصل کرنے کا مرحلہ ہوتا ہے کہ جس میں دعوتی اساس
(Base) مضبوط بھی ہو جائے اور وسیع بھی ہو جائے۔ بالفاظِ دیگر افراد بھی معتدبہ تعداد میں شامل
ہو جائیں، پھر ان کی تربیت بھی ہو جائے، ان کو نظم کی پابندی کا خوگر بنا دیا جائے۔ ڈسپلن اور سمع
و طاعت کا جذبہ ان کے رگ و پے میں اس طور سے سرایت کر جائے کہ وہ حکم سنیں اور بے
چون و چرا اس پر عمل کریں۔ یہ ساری تیاری جو پہلے مرحلہ سے متعلق ہے۔ اس کے لئے
وقت درکار ہے۔ وہ وقت اسی صورت میں ملتا ہے کہ وہ انقلابی جماعت ابتداءً کوئی جوابی
کارروائی نہ کرے۔ بلکہ پوری دلجمعی سے متذکرہ بالا تیاری میں مصروف رہے ـــــ یہ ہے
Passive Resistance یعنی صبرِ محض کا مرحلہ۔ اس کے بعد جب وہ انقلابی جماعت
یہ محسوس کرے کہ اب ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس باطل و فاسد، ظالم و استحصالی اور
غلط نظام کے خلاف راست اقدام کر سکتے ہیں تو صبرِ محض (Passive Resistance) کا
مرحلہ اس موقع پر راست اقدام (Active Resistance) میں تحویل
ہو جائے گا۔

زیرِ بحث دو مراحل کی قرآنی اصطلاحات

اس انقلابی عمل کے لئے اکثر و بیشتر میں انہی اصطلاحات کو استعمال کرتا ہوں جو دورِ جدید میں مستعمل ہیں اس لیے کہ اگر
میں خالص قرآنی اصطلاحات کے حوالہ سے بات کروں گا تو آپ کے اذہان میں وہ خالص ایک
مذہبی سی بات بن کر رہ جائے گی۔ اور اس دور میں ان اصطلاحات کے جو انطباقات (Appli-
cations) ہیں ان کی جانب آپ حضرات کا ذہن منتقل نہیں ہوگا۔ اسی لئے میں

کے الفاظ استعمال Active Resistance اور Passive Resistance
کرتا ہوں ورنہ ان کے لئے قرآن مجید کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ اس ضمن میں آج میں نے آغازِ خطبہ میں آپ کو سورہ آل عمران کی آخری آیت سنائی تھی جس کے شروع میں امر کے صیغہ میں فرمایا گیا ہے: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا " اے ایمان والو! صبر سے کام لو، باطل کے علمبرداروں کے مقابلہ میں پامردی اور استقامت وثبات کا مظاہرہ کرو، حق کے بول بالا کے لئے کمربستہ ہو جاؤ"۔ یہاں ایک لفظ آیا 'صبر' اور دوسرا آیا 'مصابرہ'۔۔۔ یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ "مصابرت" کا لفظ قرآن مجید مدنی دور میں استعمال کر رہا ہے۔ جبکہ مکی دور میں ہمیں قرآن میں صرف صبر کا لفظ ملتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بار بار متعدد سورتوں میں مختلف اسالیب میں صبر کی تاکید کی گئی۔ مثلاً: فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف)۔ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (هود) وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا (الطور) وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (المزمل)۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صبر کی اسی تاکید کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جانب منتقل فرما رہے ہیں۔ آلِ یاسر سے فرماتے ہیں: اِصْبِرُوْا یَا اٰلَ یَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ "اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو! برداشت کرو، جھیلو، اس لئے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے"۔

پس آپ دیکھتے ہیں کہ مکی دور میں جو سورتیں اور آیات نازل ہوئیں ان میں بار بار ہمیں صبر کی تاکید ملتی ہے۔۔۔ جھیلو! برداشت کرو۔ اس لئے کہ یہ صبر یک طرفہ ہو رہا ہے۔ ابھی اہلِ ایمان پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور وہ جھیل رہے ہیں۔ ابھی انہیں تشدد و مظالم کا ہدف بنایا جا رہا ہے اور وہ برداشت کر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے، کسی کو مکہ کی تپتی سنگلاخ زمین پر رسیاں باندھ کر گھسیٹا جا رہا ہے، کسی کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھونی دی جا رہی ہے۔ الغرض جس کا جس پر زور چلتا ہے وہ تشدد میں کمی نہیں ہونے دیتا۔ لیکن کوئی بھی اپنے دفاع میں ہاتھ تک نہیں اٹھا رہا۔ اس لئے کہ اجازت نہیں تھی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مکی دور کے قریباً بارہ سال تک یہی حکم رہا ہے کہ کُفُّوْا اَیْدِیَكُمْ لہٰذا مکی دور میں آپ کو قرآن مجید میں صرف 'صبر' کا لفظ ملے گا۔ یہ ایک طرفہ عمل ہے۔ اب مدنی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ کچھ بدلی ہوئی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اب حکم ہو رہا ہے 'مصابرہ'

کا ۔ اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۔ مصابرہ یا مصابرت کا حکم آتا ہے ۔ یہ لفظ باب مفاعلہ سے بنا ہے ۔ اور اس باب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں آمنے سامنے دو فریق ہونے لازمی ہیں ۔ گویا 'مصابرہ' کے معنی ہوں گے صبر کا صبر سے ٹکراؤ ۔ جیسے قتل ایک طرفہ عمل ہے کوئی شخص اپنے کسی کام سے گھر سے نکلا کہ کسی نے گولی مار دی ۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس طرح قتل کر دیا جائے گا ۔ لیکن مقاتلہ کے معنی ہیں جنگ ۔ جس میں دو فریق ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہوتے ہیں ۔ یہی فرق ہوگا 'جہد' اور 'مجاہدہ' کا ۔ 'جہد' یک طرفہ کوشش ہے ۔ جبکہ 'مجاہدہ' یا 'جہاد' کے معنی ہوں گے کوشش کا کوشش سے مقابلہ ۔ بالکل یہی نسبت 'صبر' اور 'مصابرہ' میں ہے ۔ اب صبر کا مقابلہ صبر سے ہوگا ۔ وہ تم پر زیادتیاں کر رہے ہیں تو اب تم بھی ان کے خلاف اقدام کرو ۔ معلوم ہوا کہ اب دو طرفہ صبر کا مظاہرہ ہوگا ۔ مشرکین کو بھی جھیلنا پڑے گا ، انہیں بھی جان کی بازیاں کھیلنی ہونگی ۔ اگر وہ اپنے باطل نظریہ اور فاسد نظام کا تحفظ چاہتے ہیں ۔ تو انہیں بھی قربانیاں دینی پڑیں گی ۔ 'مصابرۃ' اسی عمل کا نام ہے کہ صبر کا صبر سے ٹکراؤ اور مقابلہ ہو جس فریق میں قوتِ صبر زیادہ یعنی برداشت کی طاقت زیادہ ہوگی بازی اس کے حق میں جائے گی ۔ اب اسی مرحلے پر معلوم ہوگا کہ اہلِ حق اور اہلِ باطل میں سے کون سا فریق زیادہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرسکتا ہے ۔ کون اپنے مشن (Cause) کے لئے کتنی قربانیاں دے سکتا ہے ! ۔ تو صبر جب مصابرت میں بدلتا ہے تو یہ ہے درحقیقت Passive Resistance کا Active Resistance میں تبدیل ہو جانا ـــــ تو ہماری آج کی گفتگو کا خاص موضوع یہی ہے ۔

چونکہ میں نے ابھی جہاد اور قتال کی وضاحت کی ہے ۔ لہٰذا اسی موقع پر اس بات کو بھی پیش نظر رکھئے کہ گویا اب جہاد بھی قتال میں بدلے گا ۔ اس لئے کہ اب تک کشمکش اور کشاکش تو ہو رہی تھی لیکن اہلِ ایمان کو ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی ۔ لیکن جب اجازت مل گئی اور اہلِ ایمان کی طرف سے بھی اقدام ہوا تو اب مسلح تصادم تک نوبت جا پہنچی ۔ لہٰذا درحقیقت یہ وہ مرحلہ ہے جہاں جہاد قتال میں بدل جاتا ہے ۔ 'صبر' کا 'مصابرت' میں تبدیل ہونا اور 'جہاد' کا 'قتال فی سبیل اللہ' میں تبدیل ہونا ' یہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں ہمیں آج گفتگو کرنی ہے ۔

موضوع کی اہمیت

میں اس سلسلہ میں یہ عرض کر دوں کہ اس وقت ہم مجرّد گفتگو نہیں کر رہے بلکہ یہ تمام تر گفتگو سیرت النبی کے پس منظر میں ہو رہی ہے بالفاظ دیگر انقلابی مراحل کے حوالے سے ہم درحقیقت سیرت النبی کا مطالعہ کر رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی انقلابی جد وجہد کے جس مرحلے پر ہم آج کی نشست میں گفتگو کر رہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ انتہائی اہم ہے، یہ درحقیقت حضورؐ کی سیرت کا ایک نہایت نازک موڑ اور لمحہ (Critical Moment) ہے کہ منہج تبدیل ہو رہا ہے، صبرِ محض کی پالیسی ترک کرکے اقدام کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے اس کو تضاد قرار دے کر اس کا محاکمہ کیا ہے اور اس ظاہری تضاد (Contrast) کو کافی نمایاں کیا ہے۔ مسٹر منٹگمری واٹ نے سیرت مبارکہ پر دو علاحدہ علاحدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کا نام ہے —— 'Muhammad at Macca' اور دوسری کا نام ہے 'Muhammad at Medina'، گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مکہ والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دراصل مدینہ والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مختلف ہیں۔ اس کے خیال میں مکہ والے محمد ایک داعی ہیں، مبلغ ہیں، مزکّی ہیں، مربّی ہیں۔ غرضیکہ ان حضرات کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے اندر نبوت کے جو اوصاف نظر آتے ہیں وہ مکی دور کی حد تک حضور میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن مدینہ میں نقشہ کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ آپؐ فوج کے سپہ سالار ہیں اور جرنیل ہیں، آپؐ مدینہ کی ریاست کے سربراہ ہیں۔ آپؐ ہی چیف جسٹس کا رول ادا کر رہے ہیں، معاہدے کر رہے ہیں۔ گویا مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک مدبّر سیاست دان کے روپ میں نظر آ رہے ہیں —— میں نے ٹائن بی (TOYN BEE) کا یہ جملہ آپ کو بارہا سنایا ہے۔ درحقیقت یہ ہے بنیاد جہاں سے مسٹر منٹگمری واٹ کو بھی یہ پورا فکر ملا ہے۔ وہ کہتا ہے

> *Muhammad* (صلی اللہ علیہ وسلم) *failed as a Prophet but succeeded as a Statesman.*[ف]

گویا کہ انہیں مکہ والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں تو نبوت کی شان نظر آ رہی ہے۔ اس لئے کہ ان کے اذہان میں نبیوں کی جو تصویر ہے حضرت یحییٰ کی حضرت عیسیٰ کی علیہما السلام۔ وہی تصویر ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں نظر آ رہی ہے لیکن مدینہ میں سیرتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا جو نقشہ ان کو نظر آتا ہے وہ ان کے خیال کے مطابق نبوت والا معاملہ نہیں ہے۔ وہاں تو ان لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک سیاست دان و مدبّر، ایک سربراہِ مملکت اور ایک جرنیل کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بات واقعی سمجھنی چاہئے کہ یہ منہجِ عمل کیسے تبدیل ہوا ہے۔! وہ تحویلی مرحلہ (Transitory Phase) کب آیا اور کیسے آیا! اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظامِ باطل کے خلاف راست اقدام کیسے کیا تھا!!

ترجمہ: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بحیثیتِ نبی ناکام ہو گئے اور بحیثیت سیاست دان کامیاب رہے۔
(نعوذ باللہ من ذٰلک)

سیرتِ مطہرہ کے اس پہلو کے مطالعہ سے پہلے یہ بات جان لیجئے کہ کسی انقلاب کے لئے براہِ راست اقدام (Active Resistance) کا فیصلہ بہت نازک (Crucial & Critical) ہوتا ہے۔ آپ نظری طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ راست اقدام کا فیصلہ قبل از وقت ہو جائے گا تو دنیوی اعتبار سے انقلاب ناکام ہو جائے گا۔ اگر آپ کی تعداد معتدبہ نہیں ہے، اگر آپ کی تربیت خام رہ گئی ہے تو دنیاوی ناکامی کا سامنا ہوگا۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ کشتہ میں اگر ایک آنچ کی کسر رہ گئی اور بعض اوقات یہی ذرا سی آنچ کی کسر تباہ کن ہو جاتی ہے اور وہ کشتہ مقوی جسم و جاں بننے کی بجائے ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی طرح اگر تربیت میں خامی اور کمی رہ گئی۔ ابھی "چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!" والا معاملہ نہیں ہوا۔ قبل از وقت اقدام کر دیا گیا تو ناکامی ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ بڑا نازک لمحہ ہوتا ہے۔ اس کے صحیح یا غلط ہونے پر انقلاب کے کامیاب یا ناکام ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر Premature (قبل از وقت) اقدام کر دیا گیا تو دنیا میں اس جدوجہد کا ناکام ہونا لازم ہے۔ خواہ خلوص و اخلاص کا کتنا ہی ذخیرہ اس جدوجہد کی پشت پر موجود ہو۔

انبیاء و رسل کا خصوصی معاملہ

البتہ یہ بات جان لیجئے کہ جہاں تک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء و رسل کا معاملہ ہے، یہ فیصلے درحقیقت اللہ کی طرف سے وحی جلی یا وحی خفی کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ اجتہادی طور پر اگر رسول کوئی قدم اٹھاتے تھے تو اللہ کی طرف سے اس کی تصویب یا اصلاح ہو جاتی تھی لیکن اگر وحی کے ذریعہ نہ تصویب ہوئی ہو نہ اصلاح تو گویا رسول کے اس اجتہادی فیصلہ کی اللہ کی طرف سے خاموش توثیق حاصل ہو گئی۔ لہٰذا اس معاملہ میں رسولؑ تو محفوظ و مامون اور معصوم ہیں — اس ضمن میں عرض کر دوں کہ حضورؐ کی سیرتِ مطہرہ میں ہمیں ایک واقعہ ملتا ہے کہ حضورؐ کا ایک اجتہادی فیصلہ تھا اور وہ فیصلہ حضورؐ نے سن دس نبوی میں اس وقت کیا جب مکہ میں مشرکین نے دارالندوہ میں حضورؐ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا تو حضورؐ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا۔ اس فیصلہ کی تصویب یا اصلاح وحی کے ذریعے نہیں ہوئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ طائف والے بھی ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صبر و ثبات اور عزیمت کی خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر لیں۔ چنانچہ طائف میں ایک دن میں رحمۃ للعالمین کے ساتھ وہ سلوک ہوا جو مکی زندگی کے دس برس میں نہیں ہوا۔ جس کو بیان کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے اور جس کو پڑھتے ہوئے دل کانپ جاتا ہے۔ وہاں دعوتی اعتبار سے حضورؐ کے لئے کامیابی کی کوئی شکل نہ بن سکی[1] اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یہ بات طے شدہ تھی کہ "مدینۃ النبی"

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

بننے کی سعادت یثرب کے حصّے میں آنے والی ہے۔ طائف کے نصیب میں یہ سعادت نہیں تھی۔ حالانکہ آپ غور کیجیے کہ طائف دعوت و تبلیغ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں سے ناکام لوٹنا پڑا اور دوسری جانب صورت یہ ہے کہ آپؐ مکہ میں مقیم ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یثرب کے لئے کھڑکی کھول دی۔ اسی سال یعنی سن ۱۰ھ میں حج کے موقع پر یثرب کے چھ حضرات ایمان لے آئے۔ ان چھ حضرات کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ اور یہ قبیلہ افرادی و مادی قوت کے لحاظ سے یثرب کا بڑا مضبوط قبیلہ تھا۔ اگلے سال ان چھ میں سے پانچ آگئے اور سات مزید افراد کو ساتھ لے آئے، جن کو انہوں نے اپنی تبلیغ و دعوت سے مسلمان کر لیا تھا۔ چنانچہ اس دفعہ بارہ حضراتؓ نے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور ہمیں اپنا کوئی ایسا جاں نثار شاگرد

(حاشیہ صفحہ ۷۱)

چودھویں صدی کے جید و باعمل عالمِ دین، عارف باللہ، علوم جدیدہ و قدیمہ پر گہری بصیرت کے حامل، اعلیٰ پایہ کے محقق و مفکر، صاحب طرز ادیب، متعدد اعلیٰ علمی و تحقیقی کتب کے مصنف مولانا سید مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہٗ کی سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر "النبی الخاتم" کے نام سے ایک مختصر لیکن نہایت جامع کتاب جو اپنی جگہ ادب کا بھی ایک شہ پارہ ہے۔ اس کتاب میں مولانا مرحوم و مغفور نے مکہ کے دس سالہ جاں گسل مصائب اور طائف کے ایک دن کے شدائد پر جس انداز میں تبصرہ فرمایا ہے وہ روح کے لئے مضراب کا کام دیتا ہے۔ مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

"منفی قانون ختم ہو چکا تھا، طائف کی گھاٹیوں میں ختم ہو چکا تھا اور قطعاً ختم ہو چکا تھا کہ اس کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا تھا، اندر باہر آگیا، پوری طاقت سے آیا، ہر شکل میں، ہر صورت میں آیا۔ دیکھ بھی دیکھا گیا اور پورے طور پر دیکھا گیا لے کر بھی جانچا گیا اور جی بھر کر جانچا گیا، سال دو سال نہیں، ایک جگ، ایک قرن سے زیادہ موقع دیا گیا تاکہ ٹھونکنے والے ٹھونک لیں، بجانے والے بجا لیں، کسنے والے کس لیں، تاننے والے تان لیں، آزمائش کی کون سی بھٹی تھی، جس میں قدرت کے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا یہ زر خالص نہیں ڈالا گیا۔ حرارت کا کون سا درجہ ہے جو اس کی غیر معمولی لاہوتی حقیقت کو نہیں پہنچایا گیا۔ جو کچھ کر سکتے تھے، سب کچھ کر لیا گیا۔ اس کے آگے کیا کچھ اور بھی سونچا جا سکتا ہے۔ جیسے تم نے مکی زندگی کے ان سالوں میں مسلسل تابڑ توڑ پیہم "صدق" و "دیانت" کے اس بے نظیر سرچشمہ کے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھا، شہادتیں تمام ہو گئیں، گواہیاں پوری ہو چکیں، تجربات مکمل طور پر ہو چکے، مشاہدات اکٹھے ہو چکے، الغرض عالمِ امکان میں جو کچھ ہو سکتا تھا، سب کچھ ہو گیا، منفی قوانین اپنے سارے حقوق لے کر اپنے حدود کے آخری، بالکل آخری نقطہ پر پہنچ کر ختم ہو چکے تھے ـــــ یقیناً وہی وقت آگیا تھا، اور اب نہ آتا تو کب آتا کہ واقعات کے دوسرے رُخ کا آغاز ہو۔"

بیجئے کہ جو ہمیں قرآن پڑھائے اور یثرب والوں کو قرآن کے ذریعہ سے دعوتِ توحید دے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ تبلیغ و دعوتِ محمدی کا مرکز و محور اور منبع و مدار قرآن مجید ہے۔ گویا یثرب میں اس انقلابی دعوت کی نشر و اشاعت کے لئے یثرب والوں کی جانب سے یہ تقاضا سامنے آیا کہ کوئی ایسا شخص انہیں دیا جائے جو انہیں قرآن پڑھا سکے۔ علہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند "کے مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ اور عبداللہ ابن مکتوم رضؓ کو اس اہم کام کے لئے منتخب کیا۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات یثرب تشریف لے گئے۔ ان دونوں کی دعوت و تبلیغ کا ثمرہ اگلے سال حج کے موقعہ پر ظاہر ہو گیا ـــــ سیرت کی مختلف کتابوں میں مختلف تعداد ملتی ہے۔ کسی میں ستر مرد اور دو عورتیں اور کسی میں بہتر مرد اور تین خواتین۔ یہ تعداد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بہرکیف پچھتر افراد لاکر انہوں نے گویا حضورؐ کی جھولی میں ڈال دیئے۔ بیعتِ عقبہ ثانیہ ہو گئی۔ مردوں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ اگر مکہ والے آپؐ کے خون کے پیاسے ہیں تو آپؐ ہمارے یہاں تشریف لائیے۔ اگر مکہ والوں نے مدینہ (یثرب) پر حملہ کرنے کی جسارت و جرأت کی تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں ـــــ یہ ہے بیعتِ عقبہ ثانیہ جسے سیرتِ مطہرہ میں ایک اہم نشانِ راہ (Land Mark) کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ ہے سیرت کا وہ اہم موڑ جس کی وجہ سے یثرب کو 'مدینۃ النبیؐ' اور 'دار الہجرت' بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔

میں نے یہ تمام تفصیل اس وقت صرف یہ واضح کرنے کے لئے آپ کے سامنے رکھی ہے کہ یہ فیصلہ کون نہیں کر رہا ہے! یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ یثرب کو دار الہجرت بننا ہے طائف نہیں۔ وہ تبارک و تعالیٰ قدم قدم پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی متلو (یعنی قرآن مجید) اور وحی غیر متلو (یعنی کشف، القاء الہام اور رؤیائے صادقہ) کے ذریعے حضورؐ کی رہنمائی فرما رہا ہے۔ حضورؐ کے کسی اجتہادی عمل پر خاموشی ہے تو یہ گویا اللہ کی طرف سے اس کی توثیق و تائید ہے ـــــ لیکن مابعد کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ نبوت و رسالت کا اتمام و اکمال حضورؐ کی ذات پر ہو گیا۔ اب تا قیام قیامت کسی نوع کا نبی نہیں آئے گا۔ لہٰذا اس کے بعد جو بھی اسلامی احیائی تحریکیں اٹھی ہیں یا اٹھیں گی وہ، ظاہر بات ہے کہ ان کی قیادت انبیاء و رسل کے ہاتھوں میں نہ رہی ہے نہ رہے گی۔ یہ قیادت کی ذمہ داری تو کسی امتیِ محمدؐ ہی نے ادا کی ہے اور آئندہ بھی یہ کام کسی امتی ہی کے ذریعے ہوگا۔ اور کوئی امتی بھی معصوم عن الخطاء نہیں ہے۔ معصومیت خاصۂ نبوت ہے۔ نبوت ختم ہوئی تو معصومیت بھی ختم ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں خاتم النبیین ہیں وہاں خاتم المعصومین بھی ہیں ـــــ شیعہ مکتبِ فکر کا معاملہ بالکل علاحدہ ہے کہ وہ بزعم خویش جن اماموں کو مامور من اللہ مانتے ہیں تو ان کو معصوم عن الخطاء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس امکان کو اپنے ذہن سے بالکل محو کر دیجئے اور جان لیجئے کہ اب تجدیدِ دین، احیاءِ اسلام کی جو تحریک بھی برپا ہوگی، اس کے ہر مرحلہ کا معاملہ

اجتہادی ہوگا ـــــ اور اس اجتہاد میں خطا کا امکان رہے گا۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کسے
راشد، کہ خطا کا امکان نہیں ہے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا وہ اہل سنّت والجماعت کے دائرہ سے خارج
ہو جائے گا۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں 'تحریک شہیدین' کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔
میں نے اپنا یہ تاثر بارہا عرض کیا ہے کہ دورِ صحابہ کے بعد ایک خالص اسلامی تحریک ہونے کے اعتبار سے،
تحریک شہیدین کے ہم پلہ کوئی دوسری تحریک مجھے نظر نہیں آتی۔ اس تحریک کے قائد تھے سید احمد بریلوی
رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہیدؒ بھی شامل
تھے۔ تقویٰ، تدیّن، خلوص و اخلاص کا اتنا بڑا سرمایہ دورِ صحابہؓ کے بعد اسلامی تاریخ میں مجھے کہیں اور نظر
نہیں آتا۔ انفرادی سطح پر بڑی بڑی عظیم شخصیتیں ہر دور میں نظر آتی ہیں۔ مجدّدینِ امّت ہیں، ائمہ امت ہیں،
محدثین کرام ہیں، فقہاءِ عظام ہیں۔ انفرادی سطح پر علم، تقویٰ، تدیّن اور خلوص و اخلاص کے اعتبار سے
ہر شخص کوہ ہمالیہ نظر آتا ہے لیکن اجتماعی سطح پر، ایک گروہ کی شکل میں، ایک جماعت کی صورت میں
اتنے متقی و متدیّن حضرات اور اتنا خالص اسلامی جہاد بالسیف کم از کم مجھے دورِ صحابہؓ کے بعد کہیں
اور نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم ـــــ لیکن وہاں بھی ایک اجتہادی خطا ہو گئی۔ قبل از وقت
اقدام ہو گیا۔ حضرت سیّد احمد بریلویؒ نے اپنے ان ساتھیوں کی بھرپور تربیت کی تھی جن کو ساتھ لے کر وہ
سرحد کے علاقہ میں پہنچے تھے ـــــ لیکن انؒ کی اصل جد و جہد شروع ہوئی تھی ضلع پشاور اور ضلع
مردان سے ـــــ وہاں جا کر اقدام سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں کی تربیت کی بھی ضرورت تھی۔
یا تو وہاں کے تمام خوانین اور رعایا سیّد صاحب رحمہ اللہ کو قطعی طور پر اپنا امیر تسلیم کر لیتے اور انؒ کے ہاتھ
پر بیعت سمع و طاعت اور جہاد کر لیتے۔ تب بھی کوئی مضبوط اساس قائم ہو جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ
ایک یا دو قبیلوں کے خوانین نے بیعت کر لی تھی جو میری رائے میں کافی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ مقامی لوگوں کی
تربیت سے پہلے اور وہاں اپنے آپ کو مستحکم (Consolidate) کرنے سے پہلے، ایک
طرف سکھوں کے ساتھ جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ دوسری طرف اسلامی شریعت کے حدود و تعزیرات
نافذ کر دی گئیں جو مقامی لوگوں کے لئے بڑی شاق تھیں۔ چونکہ وہ لوگ ایک مدت سے دین کے صحیح
و حقیقی علم سے ناواقف تھے، اور اگرچہ وہ مسلمان تھے لیکن ان میں سے اکثر حقیقی ایمان کی لذت آشنا
نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اکثریت نے نہ صرف سیّد صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ بعض بااثر خوانین
نے سیّد صاحب کے خلاف سازشیں کیں، آپ کو زہر دیا گیا۔ مجاہدین کے کیمپوں پر شب خون مارا گیا

اور بے شمار مجاہدین کو شہید کر دیا گیا۔ آپؒ کے خلاف مخبری کی گئی اور سکھوں کو مجاہدین کے لشکر کی نقل و حرکت اور اس کی قوت و وسائل کی خبریں پہنچائی گئیں۔ الغرض مقامی لوگوں کی اکثریت کی ناپختہ سیرت و کردار اور عدم تربیت کے باعث یہ عظیم اسلامی تحریک دنیاوی اعتبار سے ناکام ہو گئی۔

میں نے تحریک شہیدین کا ذکر اس غرض سے کیا ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ تربیت کی کیا اہمیت ہے اور اقدام کے مرحلے کے لئے صحیح وقت کا تعین کیا اہمیت رکھتا ہے۔ سیدؒ صاحب نے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے مقامی لوگوں کو سچا اور پکا مسلمان سمجھ کر جو اقدام کیا اور سکھوں سے جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا تو میرے نزدیک یہ خطا تھی لیکن یہ بات جان لیجئے کہ یہ خطا اجتہادی ہے اور اہل سنّت کے نزدیک خطا اجتہادی پر بھی آخرت کا اجر محفوظ رہتا ہے۔ ایک انسان اپنی امکانی حد تک غور کرنے کے بعد اپنی رائے میں صحیح فیصلہ کر رہا ہے۔ اس نے سوچ بچار اور غور و تدبر میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے اور اس کے بعد اس نے اقدام کیا ہے تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا اُخروی اجر و ثواب بالکل محفوظ ہے۔ اس میں قطعاً کوئی کمی نہیں ہوگی۔ لیکن دنیوی اعتبار سے وہ جدوجہد، وہ تحریک ناکام ہو جائے گی۔ یہ بات نہ صرف ماضی کے لئے ہے بلکہ آئندہ کے لئے بھی ہے بہرحال کسی تحریک میں وہ وقت آتا ہے کہ جب اس کے قائد کو 'اقدام' کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہوگا کہ پوری طرح سوچ بچار کر کے حدِ استعداد کے مطابق حالات کا پورا جائزہ، اقدام کا فیصلہ اور اپنی جمعیت کی تعداد اور اس کی تربیت کو پوری طرح تول کر اقدام کا فیصلہ کرے اور اس میں بھی اس کا تمام تر توکل اللہ ہی کی ذات پر ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہی اصل حامی و ناصر ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست! تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن تحریک کا قائد اور اس کے ساتھی ذہناً اس کے لئے تیار رہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خطا ہو جائے اس لئے کہ اب کوئی نبی نہیں ہے کوئی معصوم نہیں ہے۔



ہر دانہ منتخب
فریش ویل
بادام اور پستہ
نمکینیت کے نئے پہلو اور
بھرپور ذائقے کے ساتھ
Freshwel
ناشتے پر
چائے پر یا کسی بھی وقت
لذت میں ایک خوشگوار اضافہ
جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر
پیک کیے جاتے ہیں۔
سیل بند ڈبے کو کھولنے کا سہل ترین
طریقہ پاکستان میں پہلی بار
ہم نے متعارف کرایا۔
MASS

شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک
اور — اس سے متعلق بعض تنقیدات کا جائزہ

از قلم : مولانا سعید الرحمٰن علوی

"نکاح" جسے رسولِ رحمت علیہ السلام نے "سُنّتِی" قرار دیا، اس کا لغوی معنی وابستگی اور پیوستگی کا ہے جیسا کہ مصر کے معروف عالم علامہ عبدالرحمٰن الجزیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی معروف کتاب "الفقہ علی مذاہب الاربعہ" میں تفصیل سے لکھا (ج ۴)

مولانا عبیداللہ سندھی علیہ الرحمہ نے اس عمل کو "تدبیرِ منزل" میں شمار کیا۔ "تدبیرِ منزل" نام ہے اس قانون کا جو انسان کے باہمی تعلقات و روابط کے استحکام کا باعث ہو۔ ان کے نزدیک گھر کی چار دیواری اس نظم و انتظام کی سب سے اچھی درسگاہ ہے۔ جہاں شادی بیاہ کے حوالہ سے انسانیت کی تربیت کا بیج بویا جاتا ہے اور پھر وہ تناور درخت بن کر پورے عالم و جہان پر چھا جاتا ہے۔ بقول ان کے گھر کی چار دیواری میں اس کا عنوان "تدبیرِ منزل" ہوتا ہے تو قوموں اور ملکوں پر پھیل کر یہی قانون "سیاستِ مدن" اور "خلافتِ کبریٰ" کا عنوان اختیار کر لیتا ہے (ملاحظہ فرمائیں الفرقان فی معارف القرآن ص ۲۵۵، ۲۵۶، مطبوعہ دارالارشاد جامعہ ملیہ علیگڑھ) اسی کتاب میں آگے چل کر بطور خاص سورۂ بقرہ کی ان آیات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے جن میں نکاح اور اس ضمن کے دوسرے مسائل کا ذکر ہے۔

حضور نبی کریم علیہ السلام سے ایک روایت ام المؤمنین سیدتنا عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ذکر فرمائی جسے امام بیہقی علیہ الرحمہ نے نقل کیا۔ اس روایت کا ترجمہ ہے:

"وہ نکاح بہت ہی بابرکت ہے جس کا بار کم سے کم پڑے"

اس روایت کو ہمارے دور کے نہایت درجہ ذمہ دار عالم مولانا محمد منظور نعمانی زید مجدھم نے نقل کر کے جو تبصرہ کیا اور جو تشریح فرمائی وہ لائقِ مطالعہ ہے:

"ظاہر ہے کہ اس حدیث کا مقصد صرف ایک حقیقت بیان کر دینا نہیں ہے بلکہ اس میں

[اُ]مت کو ہدایت و رہنمائی دی گئی ہے کہ شادیاں ہلکی پھلکی اور کم خرچ ہوا کریں اور بشارت سنائی گئی ہے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری شادیوں اور اس کے نتیجوں میں بڑی برکتیں ہوں گی ـــــ آج ہم جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور خاص کر خانگی زندگی میں جو الجھنیں ہیں ان کا بہت بڑا سبب یہی ہے کہ نکاح و شادی کے بارے میں حضور علیہ السلام کی ان ہدایات سے انحراف کر کے ہم آسمانی برکات اور خداوندی عنایات سے محروم ہو گئے ہیں۔" (معارف الحدیث ص۲۹ ، ج : ۷)

مولانا نعمانی کے اس ارشاد کو سامنے رکھ کر ذرا اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں اور روایتی طور پر دین نا آشنا اور اس قسم کے لوگوں کی شادیوں کا نہیں اہلِ دین کی شادیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو دل پر پتھر رکھ کر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم نے اس نیک عمل ، سنتِ رسولؐ و مرسلینِ سابقہ اور اس ایک طرح کے عملِ عبادت کو دعوتوں ، جہیز ، برات اور نمائشی مہر کے ذریعہ ایک مصیبت بنا دیا ہے ۔ اس کے اثرات جو معاشرہ میں سامنے آ رہے ہیں وہ بالکل ظاہر ہیں ۔ لاتعداد خاندان اپنی جوان سال بچیوں کو گھروں میں بٹھانے پر اس لئے مجبور ہیں کہ ظالم معاشرے کے سنگدلانہ ضوابط اور خود ساختہ اقدار و قوانین کا پورا کرنا ان کے بس میں نہیں ، اس صورتِ حال کا مقابلہ اور اس کی اصلاح ہر اس انسان کا فرض ہے جسے اسلام سے وابستگی کا دعویٰ ہے اور خاص طور پر ان پر فرض ہے جنہیں اہلِ علم ہونے کا شرف حاصل ہے اور مختلف حوالوں سے خدمتِ دین کے دعویدار ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اب تو اہلِ دین کی شادیاں دیکھ کر انگلی دانتوں میں دبانا پڑتی ہیں چہ جائیکہ کوئی ایسی لہر اٹھے جس سے اس صورتِ حال کی اصلاح ہو ۔ ہاں اگر کوئی اس کی بات کرتا ہے تو اس پر تنقید و اعتراض کی بوچھاڑ اس طرح ہوتی ہے کہ الاماں ۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس سلسلہ کی ایک تحریک برپا کی تاکہ شادی و نکاح کا عمل سادگی سے انجام پائے، امکانی حد تک اس پر سنتِ نبوی کی چھاپ ہو ۔ اسراف و تبذیر اور تکلفات سے بچا جائے ۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء کو اپنے برادرِ اصغر ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کی شادی غالباً اس سلسلہ کی ابتداء کی اور اسی دور میں ایک ۴ ورقی پمفلٹ بھی شائع کیا جو گویا اس سلسلہ میں ان کے ایک طے شدہ پروگرام کا اعلان تھا ۔ اس میں انہوں نے اپنے لئے تین باتوں کا اعلان کیا :

کسی برات میں شریک نہ ہوں گا ۔ نکاح کے موقعہ پر کسی دعوتِ طعام میں شرکت نہ کروں گا ۔
غیر مسجد کسی تقریبِ نکاح میں شرکت نہ کروں گا ۔ (ص۵)

نیز انہوں نے جملہ احباب و رفقاء کو توجہ دلائی کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور فرمائیں ۔ اگر بان

لگے تو ہمت کر کے عمل کی راہیں نکالیں۔ ان کا یہ پمفلٹ بڑی تعداد میں تقسیم ہوا۔ ان کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ "میثاق" لاہور میں یہ تحریر چھپی۔ کراچی کے معروف ادارے صدیقی ٹرسٹ نے بڑی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کیا اور بعد میں اس میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ ترمیم نہیں اضافہ کر کے اسے ایک معقول رسالہ بنا ڈالا جو شائع شدہ میسر ہے۔ اور جس میں بڑی کام کی باتیں ہیں۔

لیکن تعجب ہوا اس پر کہ ملک کی ایک معروف دینی درسگاہ کے ایک معمر اور قابل احترام عالم و مفتی نے اس پر تنقید کر ڈالی۔ اور اب پھر ایک عرصہ کے بعد وہی تنقید میری محبوب درسگاہ جامعہ خیر المدارس ملتان کے آرگن "الخیر" میں چھپی۔ جن بزرگ عالم نے یہ تنقید کی یعنی حضرت مولانا مفتی جمیل احمد زید مجدہم، ان کی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے عزیزداری بھی ہے اور غالباً انہوں نے حضرت کے زیرِ نگرانی افتاء کا کام بھی کیا۔ بہرحال انہیں حکیم الامت علیہ الرحمہ سے جسمانی و روحانی نسبت حاصل ہے۔ مرشد تھانوی نے مختلف دوائر میں جس طرح اصلاح کا کام کیا اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اور ان کے اصلاحی کام پر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے استاذ فلسفہ مولانا عبدالباری علیہ الرحمہ نے ۴ ضخیم کتابیں لکھیں۔ مرشد تھانوی نے معاشرت کے حوالہ سے بھی بڑی تفصیل سے لکھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سی غلطیوں کی بڑی ہمت سے اصلاح فرمائی۔ شادی نکاح کے بارے میں انہی کا ارشاد ہے، جب کسی نے پوچھا کہ یہ عمل ہے تو سنّت لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو ساس ایک بہو کو بڑے ارمان سے لاتی ہے، چند دن بعد وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوتی ہیں اور مرد بیچارہ بھیگی بلّی بن کر تصویرِ حسرت نظر آتا ہے! تو آپ نے فرمایا کہ محض بے سوچے سمجھے خطبۂ نکاح پڑھ کر یہ سوچ لینا کہ برکت ہوگئی، عجیب بات ہے، اس موقعہ پر جو چند در چند خلافِ سنّت کام ہوتے ہیں ان کی نحوست نہ ہوگی ــــ؟

حضرت الشیخ مفتی جمیل احمد زید مجدہم اسی مقدس خانقاہ سے وابستہ ہیں۔ ایک "کالجی مولوی" کی اس ضمن میں اصلاحی تحریک پر انہیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے تھا۔ غلطی کہیں نظر آتی تو محبت و شفقت کے انداز میں سمجھاتے۔ لیکن افسوس کہ انہوں نے اپنی بزرگانہ عظمت کا لحاظ کئے بغیر مفروضات کے سہارے جلی کٹی سنائیں اور پھر اس مضمون و مقالہ کو اسی خانقاہ تھانہ بھون کے ایک نہایت ہی بیدار مغز اور مصلح خادم خیر العلماء مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مدرسہ کے آرگن میں چھاپ دیا

ــــ فیا للعجب ویا حسرتا۔

گذشتہ "میثاق" میں راولپنڈی کے معروف ہفت روزہ "حرمت" کے حوالہ سے کسی صاحب

"حساس" کا ایک مضمون اس کے تعاقب میں چھپا ہے جس میں گو کہ کہیں کہیں لب و لہجہ کی تلخی ہے۔
لیکن اصولی طور پر یہ بات درست ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے محض اور محض مفروضات پر عمارت قائم کی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ہم نے اپنی محبوب درسگاہ کے اس آرگن میں شائع شدہ اس مضمون کو ۳۰،۴۰ بار پڑھا۔ علمی تنقید ہوتی یا ڈاکٹر صاحب کی کسی واضح غلطی کی نشان دہی ہوتی تو ہم خود ان سے کہتے اور پورے زور سے کہ آپ اس غلطی کی اصلاح فرمائیں لیکن ہمیں اعتراف ہے کہ ایسا نہ ہوسکا۔ اور ہم نے محسوس کیا کہ جذبات کی شدت ہے۔ "کالجی مولویوں" (جن سے حضرت مفتی صاحب نے تمہید باندھی) پر غصہ ہے اور اس غصہ میں سارا ملبہ گرایا گیا ہے۔ کالج کی تعلیم ایسی بری تو نہیں کہ اس پر ایسا غصہ کیا جائے۔ آخر کو قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم قدس سرہ نے اپنے بھانجے کو علیگڑھ میں ارباب علیگڑھ کی خواہش سے بطور مدرس بھیجا۔ دیوبند اور ندوہ کے بہت سے حضرات جب بھی اور اب بھی علیگڑھ کی مختلف کمیٹیوں میں رہے۔ دیوبند کے مایۂ ناز سپوت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے علیگڑھ کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد کو دیوبند بلا کر دونوں اداروں کے طلبہ کے تبادلہ کی تجویز پیش کی جو منظور ہوئی۔ حضرت حکیم الامت کے خدام میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب، مولانا عبد الماجد دریاآبادی، مولانا عبد الباری ندوی سے لے کر مخدوم گرامی ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی تک بہت سے "کالجی مولوی" موجود ہیں۔ اب اگر کوئی "کالجی مولوی" ایسی بات کہتا ہے جس میں خیر غالب ہے تو اسے سراہنا چاہیے نہ کہ غضب ناک ہو کر ایسا رویہ اختیار کیا جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اس تحریر میں شاید ایک لفظ ہے جس کو باعث اعتراض کہا جاسکے۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے خطبہ نکاح کے متعلق لکھا:

"میرا معمول ان مواقع پر یہ رہا کہ خطبہ نکاح کی صورت یہ نہ ہوتی کہ جیسے محض دولہا ہی کو سنانا مطلوب ہے یا صرف بطور "جنتر منتر" پڑھ دینا مقصود ہے.... الخ (ص۲)"

لفظ "جنتر منتر" ظاہر ہے کہ کسی اہانت کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھا گیا بلکہ خطبہ نکاح کو جس میں ایک مکمل رہنمائی ہے، جس بے توجہی سے پڑھا جاتا ہے اس میں صرف اس کا اظہار مقصود ہے اور اردو محاورہ ایسے مواقع پر اس طرح بولا جاتا ہے۔ لیکن مفتی صاحب نے اس لفظ کو بہت لیا اور پھر غصہ میں بہت کچھ فرما گئے۔ حالانکہ اگر یہ لفظ ثقیل محسوس ہوتا تو مشورہ دیا جاسکتا تھا کہ اسے بدل دیا جائے ایک لفظ کی آڑ میں ایک اصلاحی پروگرام کو تو نہ رگیدا جائے ——
خطبہ کے معاملہ میں "صاحب زجاجۃ المصابیح" نے جامع الترمذی سے نقل کیا کہ:

نستر الایات الثلاث سفیان الثوری ا..... الخ (زجاجۃ ص۳۰ ج۲ مطبوعہ دکن)
کہ جو تین آیات خطبہ میں پڑھی جاتی ہیں امام سفیان ثوری قدس سرہٗ ان کی تفسیر بیان فرماتے۔
ر مولانا محمد منظور نعمانی خطبہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

افسوس یہ خطبہ پڑھنا بھی اب ایک رسم بن کر رہ گیا ہے، ورنہ اسمیں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی نصیحت اور یاد دہانی کی نکاح کے فریقین کو اور سب ہی کو ضرورت ہوتی ہے

(معارف الحدیث ص۲۲ ج ۷)

جو بات مولانا نعمانی نے کی اور جس طرح انہوں نے رونا رویا، اس کا اظہار یہاں بھی بے اس سے زیادہ کچھ نہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ بقول مولانا نعمانی اب ایک رسم ہے کہ حمد و صلوٰۃ کے بعد قرآن کی یہ تین آیات پڑھیں اور قصہ تمام۔ باقی پورے عرصہ میں بلکہ نکاح سے کئی دن پہلے سے اسراف و تبذیر، لہو و لعب اور فرائض سے غفلت کا جو چکر چلتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ مظلوم اور ستم رسیدہ امام مسجد تصویر بے کسی مجلس میں موجود ہوتا ہے۔ وہ جب ان آیات کو پڑھتا ہے اس وقت بھی غافل منش انسان کھیل کود اور گپ شپ میں مشغول ہوتے ہیں، موسیقی کی دھنیں، سگریٹ کا دھواں سب جاری ہوتا ہے۔ اگر اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے گھر میں نکاح کر کے ان آیات کے مطالب سے حاضرین کو آگاہ کیا جائے تو باہمی حقوق کے ساتھ ساتھ اور بہت سی حقیقتوں سے انہیں آگاہی ہوگی اور کیا عجب کہ کسی کی زندگی میں اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب جب مسجد میں نکاح کا کہتے ہیں تو اس کی بنیاد احادیث نبوی ہیں۔ ترمذی میں حضرت ام المؤمنین سیدتنا عائشہ طاہرہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی واضح روایت ہے۔ جس کا ترجمہ ہے:

"نکاح بالاعلان کیا کرو۔ اور مسجدوں میں کیا کرو"

بقول مولانا نعمانی "مسجد کی برکت بھی حاصل ہوگی اور لوگوں کو جمع کرنے اور جوڑنے کی زحمت بھی نہ ہوگی۔ گواہوں اور شاہدوں کی شرط بھی آپ سے آپ پوری ہو جائے گی۔" (ص۱۹، ج ۷)

"صاحبِ زجاجۃ" نے "مرقاۃ" "شرح مشکوٰۃ کے حوالہ سے لکھا۔

"مسجد میں نکاح کا انعقاد حضرت امام ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مستحب ہے کیونکہ یہ عمل بذات خود عبادت ہے۔ (زجاجۃ ص۵۲ ج ۲)

اب جیسے مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے مسجد کا تقدس مجروح ہوگا، وہ ہوگا یہ

ہوگا۔ یہ سب مفروضات ہیں اور ہم نے بڑے احترام سے عرض کیا اور دوبارہ عرض کریں گے کہ مفروضات پر قلعہ کی تعمیر مناسب نہیں۔ ایک تو یہ واقعہ ہے کہ نکاح کے جملہ شرکاء بہر طور مسلمان ہوتے ہیں۔ اچھے ہوں یا برے، نیک ہوں یا بد، انہیں کچھ نہ کچھ مسجد کے آداب کا علم ہوتا ہے۔ اور وہ ضرور لحاظ و خیال کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص اس قسم کی احادیث کے حوالہ سے مسجد کے نکاح کی ترغیب دیتا اور اس طرف بار بار توجہ دلاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اپنی ذات کی حد تک مسجد کو اس طرح اہمیت دیتا ہے تو اسے یہ الزام دینا کہ وہ اس کو ضروری قرار دیتا ہے، ایک ایسی بات ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ایک دوسرے کے معاملہ میں زبان و قلم کی جس احتیاط کا شریعت ہم سے تقاضا کرتی ہے اس کو ہم لوگ بھول چکے ہیں اور ہم نے تقویٰ کا سارا انحصار محض چند عبادات میں سمجھ لیا ہے۔ اگر ہمارے سامنے "مفلس" کی وہ تعریف ہوتی جو حضور علیہ السلام نے کی اور جس میں حقوق العباد کے ضائع کرنے والے شب بیدار کی بے کسی و بے بسی کا صبح قیامت ذکر کیا تو شاید ہم احتیاط برتتے ــــــ

ڈاکٹر صاحب اگر کہتے ہیں کہ نکاح کے موقعہ پر کسی قسم کی دعوت طعام نہ ہو تو اس پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک ایسے والدین جن کے گھر میں بچی ہوتی ہے، انہیں بچی کے رشتے سے کہیں زیادہ بھاری بھرکم برات کے کھانے اور منہ مانگے جہیز کی فکر ہوتی ہے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے خود متعدد نکاح کئے اپنی چار صاحبزادیوں کے نکاح کئے۔ ولیمہ کا ذکر تو موجود ہے۔ اور وہ بلاشبہ سنت ہے ہونا چاہیئے لیکن اس طرح کہ اس میں سارا لحاظ اہل ثروت عزیزوں اور احباب کا ہی نہ ہو بلکہ غربا اور فقراء کو بھی شامل کیا جائے۔ باقی ایک حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے علاوہ کسی دعوت و جہیز کا کم از کم مجھ جیسے حقیر اور کم مطالعہ انسان کو ثبوت نہیں ملا۔ میں نے امکانی حد تک کتب سیرت کو کھنگالا۔ احادیث کے بیسیوں مجموعے دیکھے ایک اس بات کے علاوہ (یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا والی بات)، کوئی بات نظر نہ آئی۔ اب ذہن میں ایک اور الجھن پیدا ہوئی کہ آخر یہ اہتمام محض ایک صاحبزادی کے لئے کیوں ہوا! باقی تین کے لئے کیوں نہ ہوا اور یہ کہ خود آپ کے نکاح ہوئے انمیں یہ اہتمام کہیں نظر نہیں آتا ــــــ ولیمہ آپ نے کیا کبھی بکری کے گوشت سے، کبھی جو کے آٹے اور کھجور و پنیر سے، کبھی احباب کے توشہ دانوں میں موجود کھانا منگوا کر دسترخوان پر رکھ لیا اور فرمایا کہ اسے اپنے نبی کا ولیمہ سمجھ لو ــــــ صحابہ میں اس حد تک سادگی کا عنصر ہے کہ عشرہ مبشرہ کے صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نکاح کرتے

ہیں تو کسی برات واہتمام کے بغیر، حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کو نہیں بلاتے ؟ آپ بعد میں بعض علامات سے اندازہ لگاتے ہیں، جہاں یہ سب ہے وہاں حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے وقت جہیز و دعوت جس میں شربت وغیرہ ہے، اس کا اہتمام کیوں؟

اللہ تعالیٰ نے ذہن میں بات ڈالی بعض احباب اور مخلصین سے ذکر کیا۔ انہوں نے تائید کی کہ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معاملہ محض داماد کا نہیں وہ بچپن سے حضور علیہ السلام کی خدمت میں ہیں۔ آپ ان کے سرپرست ہیں۔ گویا یہ چھوٹا موٹا اہتمام معروف معنوں میں بچی والے نہیں کر رہے بلکہ گویا دولہا والے ہی کر رہے ہیں —— لطیفۂ غیبی یہ ہے کہ مولانا نعمانی کے ایک نوٹ نے اس کی ایک حد تک تائید کی۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں عرب میں نکاح شادی کے موقع پر لڑکی کو "جہیز" کے طور پر کچھ سامان دینے کا رواج بلکہ تصور بھی نہیں تھا اور "جہیز" کا لفظ بھی استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانہ کی شادیوں میں کہیں اس کا ذکر نہیں آتا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ حضور علیہ السلام کی دوسری صاحبزادیوں کے نکاح کے سلسلہ میں بھی کہیں کسی قسم کے "جہیز" کا ذکر نہیں آیا۔ حدیث کے لفظ "جھّز" کے معنی اصطلاحی جہیز دینے کے نہیں بلکہ ضروریات کا انتظام اور بندوبست کرنے کے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے حضور علیہ السلام نے ان چیزوں (چادر مشکیزہ وغیرہ) کا انتظام حضرت علی کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے انہی کی طرف سے اور انہی کے پیسوں سے کیا تھا۔ کیونکہ یہ ضروری چیزیں ان کے گھر میں نہیں تھیں۔ روایات سے اس کی پوری تفصیل معلوم ہوجاتی ہے۔ (معارف الحدیث صد ۲۹-۳۰)

مولانا نعمانی مدظلہٗ نے بات بالکل واضح کردی ہے۔ سید الملۃ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ خلیفہ مجاز حکیم الامت تھانوی قدس سرہ سے سن لیں۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

حضرت علیؓ نے خواہش (نکاح) کی تو آپؐ نے فرمایا تمہارے پاس مہر ادا کرنے کو کچھ ہے؟ بولے ایک گھوڑا اور زرہ کے سوا کچھ نہیں۔ فرمایا گھوڑا لڑائی کے لئے ضروری ہے۔ زرہ فروخت کردو۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۴۸۰ درہم میں خرید لی اور حضرت علی نے قیمت لاکر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دی۔

(یہ دلیل ہے کہ یہاں معاملہ سرپرستی کا تھا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ بازار سے خوشبو لائیں۔

(ص ۱۴۲ سیرت النبی مطبوعہ اعظم گڑھ ایڈیشن ۱۳۷۵ھ)

ان بیانات سے جو ذمہ دار لوگوں کے ہیں سارا معاملہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کوئی برات لے کر نہیں گئے۔ نہ ہی حضور علیہ السلام نے کوئی دعوت بطور رخصتی کے والد کے کی۔ بلکہ آپؐ کا معاملہ حضرت علیؓ کی سرپرستی کا تھا جو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اگر برات، جہیز اور رخصتی والوں کی دعوت کا کو مسئلہ ہوتا تو نبی پاک علیہ السلام کی باقی تین صاحبزادیوں کا بھی ذکر ہوتا اور کہیں سے تو اس کی بھنک پڑتی ـــــ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہزار خواہش و کوشش کے باوصف ایسی بات نہ مل سکی جو دلیل ہے اس بات کی کہ ایسا نہ ہوتا تھا اور یہی بات اسلام کی سادگی سے مناسبت رکھتی ہے، چلتے چلتے ایک مزید حوالہ ملاحظہ فرمالیں:

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے زندہ خلیفہ جناب ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی نے "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" کے نام سے ایک بہت ہی قابل قدر اور لائق مطالعہ کتاب لکھی جسے بڑی ہی قبولیت حاصل ہوئی اس میں "معاشرت" کے عنوان سے ایک مستقل باب ہے۔ صفحہ ۶۰۹ پر ایک عنوان ہے "نکاح کے بعض اعمال مسنونہ" ـــــ اس میں یہ جملہ ہے:

> "مسنون نکاح وہ ہے جو سادگی کے ساتھ ہو اور جس میں ہنگامہ اور نام و نمود کے لئے اسراف نہ ہو۔"

برات وغیرہ ساری باتوں کی بڑی خوبصورتی سے تردید سامنے آتی ہے ـــــ مزید ص ۶۱۲، ۶۱۱ پر سیدۃ فاطمہ سلام اللہ تعالیٰ علیہا ورضوانہٗ کی شادی کا بیان ہے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خواہش پھر نبی کریم علیہ السلام کے ارشاد سے زرہ بیچنا، پھر انہی کے مال سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے خوشبو وغیرہ منگوانے کا ذکر ہے۔ مزید ہے:

> اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ جاؤ ابوبکر، عثمان، طلحہ، زبیر اور چند انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بلا لاؤ۔ جب یہ لوگ آکر بیٹھ گئے تو آپؐ نے نکاح کا خطبہ پڑھا... الخ

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غایت درجہ سادگی کے ساتھ بغیر برات وغیرہ محض چند احباب کو خود نبی کریم علیہ السلام نے شہادت و اعلان کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے

(بقیہ ص ۹۲ پر)

فنارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا نو روزہ دورۂ بلوچستان و سہ روزہ علاقائی اجتماع صوبہ سندھ و بلوچستان

سید برھان علی

امیر محترم گذشتہ کئی سالوں سے مختلف اوقات میں کوئٹہ کا دورہ فرماتے رہے ہیں، آپ کا یہ پہلا دورہ مئی ۱۹۸۲ء میں ہوا تھا۔ کوئٹہ کی تنظیم میں نو وارد رفقاء کی مناسب تربیت کے لیے ۵ اکتوبر تا ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۳ء ایک تربیت گاہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ سے کوئٹہ کے رفقاء شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہے تھے کہ گذشتہ سالوں میں تنظیم کی دعوت اہالیانِ کوئٹہ تک نہایت مؤثر انداز میں پہنچتی رہی ہے۔ مختلف اوقات میں امیر محترم کے دورے اسی سلسلہ کی کڑی تھے۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ایک قدم آگے بڑھا کر بلوچستان کے دیگر علاقوں تک دعوت کا دائرہ کار وسیع کیا جائے۔ علاوہ ازیں مختلف اوقات میں رفقاء کے مشوروں سے یہ نکتہ بھی سامنے آیا کہ رفقاء کی عملی تربیت کے لیے بھی کچھ انقلابی لائحہ عمل اختیار کیا جانا چاہیئے۔ کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس میں چند روز کے لیے گھربار اور دیگر مصروفیات سے قطع تعلق کر کے ہمہ تن اور ہمہ وقت اللہ کے راستے میں کام کیا جائے۔ چنانچہ مذکورہ بالا ہر دو وجوہات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ کوئٹہ سے باہر نکل کر کچھ مقامات پر عملی کام کیا جائے تاکہ امیر محترم کے دورہ کے لیے راہ ہموار کی جا سکے۔ اسی جذبہ کے پیشِ نظر کوئٹہ کے رفقاء نے منصوبہ بندی کر کے ایک پروگرام ترتیب دیا اور ماہ رمضان المبارک کے اختتام کے فوراً بعد تمام رفقاء نے ٹولیوں کی صورت میں مختلف مقامات کے دورے شروع کیے۔ دو دو تین تین روز ہر شہر میں گذارے اور کام کیا۔ بعد ازاں امیر محترم کے دوروں کے لیے تین مقامات یعنی خضدار، لورالائی اور پشین کو منتخب کیا گیا۔ تینوں شہروں میں مختلف مکاتب فکر کے حضرات کے ساتھ ملاقاتیں کی گئیں اور متعلقہ حضرات سے امیر محترم کے دروس کے لیے اجازت حاصل کی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ تنظیم اسلامی کے دسویں سالانہ اجتماع منعقدہ لاہور میں علاقائی اجتماعات کے انعقاد کے فیصلہ کے پیشِ نظر صوبہ بلوچستان میں علاقائی اجتماع ماہ ستمبر کے دوران طے پایا تھا

موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امیر محترم سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ اجتماع سے متصل مندرجہ بالا تین مقامات کے دوروں کو بھی اپنے پروگرام میں شامل فرمالیں۔ اگرچہ رفقاء کو اس امر کا بھی احساس تھا کہ گذشتہ کئی ماہ سے امیر محترم کی طبیعت مسلسل خراب چل رہی ہے۔ لیکن اللہ کے دین کی سربلندی کی کٹھن جدوجہد میں جس طرح امیر محترم نے اپنی جان کو کھپا رکھا ہے۔ اور اس سلسلہ میں وہ اپنی علالت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ رفقاء کو یقین تھا کہ وہ اس درخواست کو قبول فرمالیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ امیر محترم نے مذکورہ دوروں اور علاقائی اجتماع کے لیے ۸ ستمبر تا ۱۲ ستمبر ۱۹۸۵ء کی تاریخوں کا تعین فرما کر رفقاءِ کوئٹہ کی انتہائی پذیرائی فرمائی۔

ملک کے دیگر حصوں کے قارئین کے لیے یہ امر شاید باعثِ تشنگی رہے اگر اس موقعہ کی مناسبت سے صوبہ بلوچستان اور منتخب کردہ مقامات کا مختصر پس منظر اور جائزہ پیش نہ کر دیا جائے۔ بلوچستان بہ لحاظ رقبہ پاکستان کا سب سے بڑا اور بہ لحاظ آبادی سب سے چھوٹا اور ایک پسماندہ صوبہ ہے، آبادی کئی اقوام پر مشتمل ہے اور پورا علاقہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں پختونوں کی آبادی ہے جبکہ دوسرا علاقہ بلوچ آبادی کا ہے اس کے مختلف شہر دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں۔ یہاں کے شہروں کی آبادی بھی قلیل ہے۔ پنجاب کے قصبات سے بھی بعض شہروں کی آبادی کم ہے۔ آبادی کا اکثر حصہ روائتی طور پر دین سے وابستہ ہے۔ ذرائع معاش محدود ہیں، پانی کی کمیابی کی وجہ سے زراعت بھی محدود ہے اور صنعت و حرفت بھی نہ ہونے کے برابر۔ ناخواندگی کی شرح بہت زیادہ ہے۔ غربت و افلاس کی بھی زیادتی ہے۔

خضدار: یہ شہر کوئٹہ کے بعد بلوچستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ کوئٹہ سے جنوب میں آر سی ڈی شاہراہ پر تقریباً ۳۵۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر کراچی اور کوئٹہ کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ بلوچ آبادی کا شہر ہے اور قلات ڈویژن کا ہیڈکوارٹر ہے یہاں پر ایک انجینیرنگ کالج اور ائیرپورٹ زیرِتعمیر ہیں۔ گذشتہ عشرہ سے اس شہر میں زبردست ترقیاتی کام ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے اس شہر کو کافی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور یہ مقام صوبہ کے دوسرے نمبر پر آگیا ہے۔

ماہ جولائی کے دوران کوئٹہ کے رفقاء کے ایک گروپ نے اس شہر کا تین روزہ دورہ کیا اور امیر محترم کے مجوزہ دورہ کے سلسلہ میں یہاں پر کام کیا۔ ہمیں یہاں پر بعض مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ شہر کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب صاحب نے امیر محترم کے درس قرآن کے لیے اپنی مسجد کے استعمال سے معذوری کا اظہار فرمایا۔ دوسری بڑی جامع مسجد خضدار کالونی میں واقع ہے جس کے خطیب حضرت مولانا احمد شاہ صاحب ہیں۔ انتہائی پرخلوص انسان ہیں۔ شریعت کورٹ کے ممبر بھی ہیں۔ جس روز ان سے رابطہ کیا اتفاق سے اُسی روز حج پر تشریف لے جارہے تھے۔ انہوں نے ازراہ کرم امیر محترم

کے پروگرام اپنی مسجد میں منعقد کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اپنے نائب خطیب صاحب کو بھی اس سلسلہ میں ہدایات عطا فرمائیں علاوہ ازیں نماز جمعہ سے قبل اسی مسجد میں ہمارے رفیق جناب عبدالواحد خان کو سورہ صف کے درس کی بھی اجازت عنایت فرمائی۔ شہر کے کچھ اور اہل علم حضرات سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ امیر محترم اور تنظیم اسلامی کا تعارف بھی کرایا گیا۔ مختلف حضرات سے تعاون کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد یہ گروپ واپس کوئٹہ پہنچا۔ چونکہ امیر محترم کے دورہ خضدار کی تاریخ ۹ ستمبر مقرر ہوئی تھی۔ لہذا کوئٹہ سے پانچ رفقاء کا ایک گروپ رفیق محترم عبدالواحد خانصاحب کی سرکردگی میں دوبارہ ۷ ستمبر کو عازم خضدار ہوا۔ جہاں پر انہوں نے اہم مقامات پر بینرز آویزاں کیے پوسٹر چسپاں کیے اور ہینڈ بلز تقسیم کیے۔ نیز علاقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں شروع کیں۔ وہاں پہنچنے پر محسوس ہوا کہ حالات کچھ مختلف ہیں اور مخالفت کا سامنا ہے۔ درس کے لیے متعین مسجد کے نائب خطیب صاحب بھی کچھ زیادہ معاون ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ امیر محترم کی شب گذاری کے لیے مناسب جگہ کا بندوبست بھی طے نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن مسلسل تگ و دو اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے سبب رفتہ رفتہ تمام رکاوٹیں دور ہوتی چلی گئیں۔ خضدار شہر سے باہر شاہراہ پر ایک پٹرول پمپ ہے جس کے مالک جناب عزیز احمد شاہوانی ہیں اُن کے علم میں جب امیر محترم کے دورہ کا پروگرام آیا تو انہوں نے از خود ہمارے ساتھیوں سے رابطہ قائم کر کے امیر محترم کے لیے میزبانی کی خواہش کا اظہار فرمایا اور اللہ کریم کی نصرت سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اس سلسلہ میں ہم موصوف کے انتہائی شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اللہ کے دین کے کام کے سلسلہ میں جس پرخلوص طریقہ پر تعاون فرمایا یہ ان کا ہی حصہ ہے ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی اُنکا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔

امیر محترم کوئٹہ سے صبح سات بجے جناب میاں محمد نعیم امیر تنظیم کوئٹہ کے ہمراہ خضدار کے لیے بذریعہ کار روانہ ہوئے۔ اور ایک بجے خضدار پہنچے۔ جہاں پر آپ نے بعد نماز مغرب "دینی فرائض کا جامع تصور" کے موضوع پر سورۃ البلد کے حوالہ سے دلنشیں انداز میں خطاب فرمایا۔ حاضرین کی تعداد کا اندازہ چار سو کے لگ بھگ تھا۔ سامعین نے ذوق و شوق کے ساتھ پروگرام میں شرکت فرمائی اور مجموعی طور پر خضدار کا یہ پہلا دورہ کامیاب رہا۔

لورالائی

امیر محترم اگلے روز دس ستمبر کی صبح خضدار سے روانہ ہو کر کوئٹہ واپس پہنچے۔ اور ۱۱ ستمبر کی صبح بذریعہ کار لورالائی صوبہ بلوچستان کا ایک قدیم ضلع ہے اور کوئٹہ سے شمال مشرق میں تقریباً ۲۷۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر پشتون آبادی کا ایک شہر ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ کاکڑ پٹھانوں پر مشتمل ہے اہالیان پنجاب کی بھی اچھی خاصی تعداد کاروبار اور ملازمتوں سے وابستہ ہونے کی بنا پر یہاں آباد ہے۔ ماہ جولائی ۸۵ء کے دوران

چار رفقاء کے گروپ نے اس شہر کا تین روزہ دورہ کیا تھا۔ امیر محترم کے متوقع دورہ کے انتظامات کا جائزہ لیا اور مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد سے رابطے قائم کیے شہر کی مرکزی جامع مسجد کی کمیٹی کے صدر جناب خواجہ محمد لطیف صاحب نے ازراہِ عنایت امیر محترم کے درس کی اجازت عنایت فرمائی اور مکمل تعاون فرمایا۔ چھاؤنی کے علاقہ کی ایک مسجد میں رفیق محترم عبدالواحد خانصاحب نے سورۂ صف کا درس بھی دیا جس میں کافی تعداد میں سول اور آرمی کے حضرات نے شرکت کی اور نہ صرف عام لوگوں لوگوں نے بلکہ مسجد کے پیش امام صاحب نے بھی درس کو سراہا۔ لورالائی کے لیے امیر محترم کے دورہ کی تاریخ ۱۱ ستمبر مقرر ہوئی تھی۔ چنانچہ دورہ کے انتظامات کے سلسلے میں چار رفقاء کا ایک گروپ رفیق محترم جناب اکرام الحق صاحب کی سرکردگی میں ۹ ستمبر کو لورالائی روانہ ہوا۔ جہاں انہوں نے اہم مقامات پر بینرز آویزاں کیے۔ اشتہار چسپاں کیے اور ہینڈ بلز تقسیم کیے۔ نیز شہر میں مختلف حلقوں میں رابطے قائم کیے اور ملاقاتیں کیں لورالائی کے انتظامات میں کوئی قابل ذکر دشواری پیش نہیں ہوئی جس کی خصوصی وجہ یہ ہے کہ لورالائی میں ایک صاحب جناب افتخار احمد جو تنظیم کی دعوت اور کام سے متفق تھے۔ اپنے رفقاء کے ہمراہ کافی دنوں سے وہاں کام کر رہے تھے اور انہوں نے وہاں پر ایک حلقہ قائم کر رکھا تھا۔ انہوں نے وہاں پر اس سلسلہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس دورہ میں امیر محترم کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر اقامت دین کی جدوجہد کے لیے اس قافلہ میں باقاعدہ شمولیت بھی اختیار فرمائی ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ دیگر شہروں کے مقابلہ میں لورالائی میں امیر محترم کا تعارف بھی نسبتاً کچھ زیادہ تھا۔ امیر محترم اور ہمارے رفقاء کے قیام و طعام کا بندوبست بھی جناب افتخار صاحب نے ہی اپنے ایک رفیق کی رہائش گاہ پر فرمایا۔ ۱۱ ستمبر بعد نماز مغرب لورالائی کی مرکزی جامع مسجد میں امیر محترم نے اپنے مخصوص اور پُراثر انداز میں "دینی فرائض کا جامع تصور" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ خضدار اور لورالائی دونوں مقامات پر امیر محترم نے مذکورہ بالا موضوع کی مناسبت سے اپنے خطاب میں اس امر پر زور دیا کہ درحقیقت مسلمانوں کی کامیابی و فلاح اسی نکتہ میں مضمر ہے کہ وہ خود اللہ کے احکامات کے تحت اپنی زندگیوں کو ڈھالیں، دین کے احکامات دوسروں تک پہنچائیں، اور اقامت دین کی جدوجہد میں جان، مال اور اوقات کھپائیں۔ آپ نے فرمایا کہ چونکہ پاکستان کا قیام ایک مخصوص دینی نظریہ اور عہد کی بناء پر عمل میں آیا تھا۔ لہٰذا اُس کی بقاء بھی اُس عہد کی پابندی سے وابستہ ہے۔ قمری حساب سے پاکستان اب چالیس برس کی عمر کو پہنچ چکا ہے۔ ہم نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اُسکو آج تک پورا نہیں کیا جس کی پاداش میں اللہ کے عذاب کا ایک کوڑا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں ہم پر برس چکا ہے اور اب بھی اگر ہم نے اپنے عہد کی خلاف ورزی جاری رکھی اور ہم متنبہ نہ ہوئے تو نہ معلوم کہ آئندہ ہمارا کیا حشر ہو؟ اور کہیں اس مملکت خداداد کا وجود ہی خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ درس میں عوام کی کثیر تعداد نے شرکت کی جس سے اندازہ ہوا کہ یہاں کے لوگوں میں دوسرے مقامات کی نسبت زیادہ پیاس اور طلب تھی۔ اسی وجہ سے لوگوں نے نہایت ذوق و شوق اور دلجمعی

سے درس سے استفادہ کیا۔ امیر محترم کی کتب اور کیسٹ بھی کثیر تعداد میں فروخت ہوئیں اور اس طرح لورالائی کا یہ پہلا دورہ ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر کامیاب ہوا۔

پشین

امیر محترم لورالائی سے ۱۲ ستمبر کی صبح روانہ ہو کر شام ۵ بجے پشین پہنچے۔ پشین پشتون آبادی پر مشتمل کوئٹہ سے میں تقریباً ۵۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر چمن روڈ سے ذرا ہٹ کر واقع ہے۔ چھوٹا سا شہر ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ سادات نیز کاکڑ اور ترین قبائل پر مشتمل ہے۔ چند سال قبل اس شہر کو ضلع کا درجہ دیا گیا۔ قبل ازیں ضلع کوئٹہ میں شامل تھا۔ اکثریت دینی ذہن رکھنے والی اور پرانی روایات کی پابند ہے۔ سیاسی طور پر جمعیت العلماء اسلام کا زیادہ اثر ہے۔ ماہ جولائی کے دوران رفقاء کے ایک گروپ نے اس شہر کا دورہ کیا تھا۔ اور ایک رات یہاں قیام کیا تھا جس کے دوران شہر کے مختلف افراد سے ملاقاتیں کیں۔ شہر کی مرکزی جامع مسجد میں ہمارے رفیق عبدالواحد خانصاحب نے سورۂ صف کا درس بھی دیا۔ مسجد کے خطیب حضرت مولانا محمد طاہر خانصاحب نے ازراہِ کرم اپنی مسجد میں امیر محترم کے درس کی منظوری دی اور مکمل تعاون کا یقین دلایا بلکہ وعدہ بھی فرمایا کہ وہ خود لوگوں تک اس بات کو پہنچائیں گے۔ ہم اُن کے اس دینی جذبہ و تعاون کے لیے حقیقتاً شکرگزار ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ قرآن کی دعوت عام کرنے کے سلسلہ میں انکا یہ تعاون آئندہ بھی جاری رہے گا۔ بلوچستان اسمبلی کے ایک ممبر جناب سردار خیر محمد ترین نے اپنی رہائش گاہ پر ایک خصوصی نشست کے اہتمام کی خواہش ظاہر کی۔ پشین کے جناب حاجی عبدالرحیم خاکسار و حاجی نصر اللہ خاں صاحب خاکسار جو کہ دونوں بھائی ہیں نے بھی اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا جس کے لیے ہم اُن کے انتہائی شکرگزار ہیں چونکہ اس دورہ کے وقت پشین کے دورہ کی تاریخ کا تعین نہیں ہوا تھا لہٰذا امیر تنظیم کوئٹہ جناب میاں محمد نعیم صاحب اور راقم الحروف نے ماہ اگست کے اواخر میں دوبارہ پشین کا دورہ کیا اور جناب سردار خیر محمد ترین صاحب ایم پی اے اور حضرت مولانا محمد طاہر صاحب سے ملاقات کر کے ۱۲ ستمبر کا پروگرام طے کیا۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۵ء کو راقم الحروف کی سرکردگی میں چار رفقاء کا ایک گروپ پشین پہنچا۔ اہم مقامات پر بینرز آویزاں کیے۔ اشتہار چسپاں کیے اور ہینڈ بلز تقسیم کیے۔ نیز درس کے لیے متعین مسجد میں ہی قیام کیا۔ مسجد کے خطیب حضرت مولانا محمد طاہر صاحب نے درس میں شرکت سے معذوری ظاہر فرمائی۔ کیونکہ ان کو ۱۱ ستمبر کو اپنے چچا کے استقبال کے لیے کوئٹہ جانا تھا جو کہ حج بیت اللہ سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں ہمارے لیے بعض مشکلات پیدا ہوئیں۔ لیکن خوش قسمتی سے مولانا اس وقت تک کوئٹہ کے لیے روانہ نہ ہوئے۔ ان کے تعاون سے اللہ تعالیٰ نے ان مشکلات کو رفع کرنے کی سبیل پیدا کی۔

علاوہ ازیں جناب سردار خیر محمد ترین صاحب ایم پی اے بھی پشین میں موجود نہیں تھے اور بعض وجوہات

کی بنا پر وہ ۱۲ ستمبر کی دوپہر تک واپس پشین نہ پہنچے شہر میں بھی جابجا کچھ غلط فہمی کی بنا پر مخالفت کا سامنا کرنا گالیاں بھی سنیں اور دھمکیاں بھی سہیں۔ ایک لمحہ تو ایسا بھی آیا جب راقم الحروف کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ پشین کا پروگرام نہ ہو سکے گا۔ لیکن اپنے مولا سے دعائیں کرتے ہوئے کام کو جاری رکھا اور تائید ایزدی ہمارے شامل حال رہی۔ اس سلسلہ میں محترم حاجی عبدالرحیم صاحب خاکسار کے فرزند جناب عبدالحکیم نے جس بھرپور انداز میں تعاون فرمایا اُسکا اعتراف نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی۔ خصوصی طور پر راقم الحروف اُنکا انتہائی شکرگزار ہے کہ انہوں نے اللہ کے دین کے راستہ میں بھرپور جدوجہد فرمائی بلکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ وہ تنظیم اسلامی میں شمولیت فرما کر پشین میں خدمت و دعوتِ دین کے لیے جدوجہد کریں۔

امیر محترم نے بعد نماز عصر نہایت جامع اور سادہ انداز میں سورۃ العصر کا درس دیا جو نماز مغرب تک جاری رہا۔ حقوق کے بیان کے ضمن میں آپ نے اس امر کو واضح کیا کہ چونکہ زمین اللہ کی ہے۔ لہٰذا یہ اس کا ہے کہ اُس کی زمین پر اسی کا نظام نافذ ہو۔ تین سو کے لگ بھگ سامعین نے نہایت اطمینان اور دلجمعی سے درس سُنا اور بعد نماز مغرب سوال و جواب کی محفل بھی منعقد ہوئی۔ جس کے اختتام پر امیر محترم نے جناب حاجی عبدالرحیم خاکسار کی رہائش گاہ پر ما حضر تناول فرمایا اور رات ساڑھے دس بجے کوئٹہ واپس پہنچے اور یوں انتہائی رکاوٹوں کے باوجود پشین کا یہ پہلا دورہ بھی توقعات کے برعکس کامیاب رہا۔

بیرون کوئٹہ روانگی سے قبل ۸ ستمبر کو کوئٹہ پہنچنے کے کچھ دیر بعد امیر محترم نے بعد نماز مغرب سیٹلائٹ ٹاؤن کوئٹہ کی سینٹرل گورنمنٹ سرونٹس کالونی کے کمیونٹی سنٹر میں "جہاد بالقرآن" کے موضوع پر خطاب تھا جس میں علاقہ کے تقریباً تین سو اہل علم حضرات نے شرکت فرمائی اور امیر محترم کے خطاب سے مستفید ہو اور یہ خطاب سے مستفید ہوئے اور یہ خطاب کامیاب رہا۔

مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۵ء کو امیر محترم نے کوئٹہ چھاؤنی کی جامع مسجد ڈیری فارم میں نماز جمعہ سے قبل "توحید عملی" کے موضوع پر نہایت مدلل اور جامع خطاب فرمایا جو ساڑھے بارہ بجے سے دو بجے تک جاری رہا۔ جسمیں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ۱۱ بجے سے ہی شہر اور چھاؤنی سے سول اور آرمی کے لوگ جوق در جوق مسجد میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ اور مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ عید کا سا سماں تھا۔ یہاں پر بھی امیر محترم کی کتب کافی تعداد میں فروخت ہوئیں جن میں "توحید عملی" نامی کتاب کی فروخت نمایاں تھی۔

مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو امیر محترم نے اسلامیہ ہائی سکول میں خواتین کے ایک خصوصی اجتماع سے "اسلام میں خواتین کے حقوق اور انکی دینی و ملی ذمہ داریوں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

مورخہ ۱۳ ستمبر و ۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو امیر محترم نے جامع مسجد طوبیٰ میں روزانہ بعد نماز مغرب "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا، کیوں اور کیسے؟" کے موضوع پر خطاب فرمایا، اور تفصیل سے انقلاب کی تعریف اُ

مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۵ء کو جامع مسجد طوبیٰ میں ہی سوال و جواب کی نشست بھی منعقد ہوئی جس میں کافی حد معیاری سوالات کیے گئے جن کے جوابات امیر محترم نے تفصیل کے ساتھ عنایت فرمائے جن سے سائلین امعین مطمئن نظر آتے تھے۔

مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو تنظیم اسلامی کا علاقائی تنظیمی و تربیتی اجتماع اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ میں شروع جو ۱۶ ستمبر تک جاری رہا جس میں قیّم تنظیم اسلامی جناب چوہدری غلام محمد صاحب، جناب عبدالرزاق صاحب ناب عبدالواحد خان صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کی روشنی میں تنظیمی و تربیتی امور پر گفتگو فرمائی۔ محترم نے بھی پہلے دو دن خطاب فرمایا۔ اور اپنی دینی فکر کے مآخذ بیان فرمائے۔

۱۶ ستمبر ۱۹۸۵ء کو جناب شیخ جمیل الرحمٰن نے امیر محترم کے نمائندہ کی حیثیت سے اجتماع سے اختتامی طاب فرمایا۔ اور اس طرح یہ اجتماع اختتام پذیر ہوا۔ مذکورہ اجتماع میں مختلف مقامات سے کافی رفقاء نے رکت فرمائی ـــــ تمام رفقاء کے قیام و طعام کا بندوبست مکمل طور پر تنظیم اسلامی کوئٹہ کی جانب سے اسلامیہ ئی سکول میں کیا گیا تھا۔ امیر محترم نے رفقاء کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ وہ یکسو ہو کر اجتماع میں شرکت کریں اور اپنے ذاتی کاموں کو اجتماع کے اختتام تک موقوف رکھیں۔ چنانچہ اسوجہ سے کوئٹہ تنظیم نے ۱۶ ستمبر کی بجائے ۱۸ ستمبر تک تمام رفقاء کے قیام و طعام کا بندوبست کیا تاکہ رفقاء اجتماع سے فارغ ہو کر اگر کوئٹہ میں اپنے کوئی کام کرنا چاہیں یا گھومنا پھرنا چاہیں تو ان کو قیام و طعام کی تکلیف نہ ہو۔ اس سلسلہ میں اسلامیہ ہائی سکول کی انتظامیہ اور خصوصی طور پر سکول کے ہیڈ ماسٹر جناب محمد یوسف بھٹی صاحب اور اُن کے دیگر رفقاء کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اجتماع کے دوران اپنے سکول کے استعمال کی پُر خلوص پیشکش کی بلکہ عملی طور پر اُس سے بھی زیادہ اخلاص کا ثبوت دیا اور بھر پور تعاون فرمایا۔ اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اُن کے اس عمل کا اجر یقیناً اُن کے رب کے پاس محفوظ رہے گا۔

دراصل اسلامیہ سکول کے ساتھ امیر محترم کا ایک دیرینہ تعلق بھی ہے کوئٹہ میں امیر محترم نے ۱۹۷۵ء میں ایک دس روزہ تربیت گاہ اسی سکول میں منعقد کی تھی، جناب بھٹی صاحب نے امیر محترم کو دعوت دی کہ وہ سکول کے طلباء کو بھی اپنے خطاب سے مستفید فرمائیں۔ چنانچہ ۱۶ ستمبر کو صبح امیر محترم نے بیس منٹ کے لیے طلباء سے خطاب فرمایا۔ دیگر نصائح کے علاوہ امیر محترم نے طلباء کو خصوصی تلقین فرمائی کہ وہ عربی کی تعلیم ضرور حاصل کریں تاکہ وہ قرآن کو بہتر طور پر سمجھ کر اپنی آئندہ زندگی میں مختلف حیثیتوں سے دین کی بہتر خدمت کر سکیں اور غیر مسلم دنیا کے ماہرین کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ امیر محترم نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" نامی کتابچہ کی ایک سو کاپیاں بھی تحفہ کے طور پر سکول کو ارسال کرنے کی ہدایت فرمائی۔ تاکہ خصوصی طور پر ہائی سکول کے طلباء اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکیں۔ اُسی روز ۹ بجے صبح کوئٹہ تنظیم کے رفقاء کا ایک خصوصی اجلاس امیر محترم نے طلب فرمایا چونکہ میاں محمد نعیم صاحب نائب امیر تنظیم کی حیثیت سے اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے

اگلے ماہ مرکز روانہ ہو رہے ہیں۔ لہٰذا کوئٹہ تنظیم کی امارت کے لیے امیر محترم نے جناب عبدالواحد خان کی نامزدگی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان دونوں ساتھیوں کو اپنی نئی ذمہ داریوں سے احسن طریق پر عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ بعدازاں جو حضرات تنظیم اسلامی میں شمولیت کا فیصلہ کر چکے تھے ان سے بیعت لی گئی۔ کوئٹہ میں کل آٹھ افراد نے جن میں سے ایک کا تعلق کراچی۔ ایک کا صادق آباد سے ہے اور بقیہ چھ کوئٹہ کے رہنے والے ہیں۔ امیر محترم کا دستِ مبارک تھام کر اقامتِ دین جیسی دشوار اور کٹھن راہ پر گامزن ہونے کا عہد کیا۔ انہوں نے تجدیدِ ایمان۔ توبہ۔ تجدیدِ عہد کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عہد کیا۔ ہم اُن کے حق میں اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرتے ہیں۔ دس بجے امیر محترم ایرپورٹ روانہ ہوئے جہاں سے وہ لاہور کے لیے عازم سفر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ حسب سابق اس مرتبہ بھی میزبانی کا شرف کوئٹہ میں قیام کے دوران جناب چوہدری محمد یوسف صاحب ہی کو حاصل رہا۔

رفقاء تنظیم اسلامی کوئٹہ کے لیے یہ امر انتہائی باعث فخر و مسرت ہے کہ امیر محترم نے اپنے حالیہ دورہ بلوچستان کو بے حد کامیاب قرار دیا۔ اور کوئٹہ کے رفقاء کو اس دورہ کی کامیابی کے لیے منظم انداز میں محنت اور جدوجہد کرنے پر مبارکباد دی۔ امیر محترم نے فرمایا کہ خضدار، لورالائی اور پشین کے دورے کے سلسلہ میں کوئٹہ کے رفقاء نے جس انداز میں کام کیا وہ تنظیم کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا ہے جو دوسروں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ نہایت نامساعد حالات میں کوئٹہ کے رفقاء کی قلیل تعداد (صرف ۱۳ رفقاء) نے لاتعداد رکاوٹوں کو عبور کر کے امیر محترم کے دورے اور اجتماع کو ممکن بنایا۔ ہمارے رفقاء نے اپنے رب سے دعائیں کیں اور سخت محنت اور خلوص کے ساتھ کام کیا اسی لیے ربّ العزت کی امداد اُن کے شامل حال رہی اور تمام رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی چلی گئیں۔ اس دوران اُن کو گالیاں بھی سننا پڑیں لیکن صبر و استقامت اور حکمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

چنانچہ اللہ نے اُنکو اُنکے مقصد میں کامیابی عطا فرمائی۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہمارے دیگر شہروں کے رفقاء بھی انقلابی انداز میں دعوت کو پھیلانے کے لیے باہر نکلیں ہم نے محسوس کیا کہ جو تربیت ہماری فیلڈ میں جا کر ہوئی وہ ایک جگہ بیٹھے رہنے سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ہمیں اس تجربہ سے ایک نیا حوصلہ اور ولولہ ملا ہے اور اُمید ہے کہ اب ہم اپنے دین کی سربلندی کی جدوجہد میں ایک نئے جذبہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرتے ہوئے مزید آگے قدم بڑھائیں گے!

(بقیہ: شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک)

کی غرض سے بلوالیا اور بس۔

اس کے ساتھ ہی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند اور اس سے نسبت و تعلق رکھنے والے ایک ایک فرد کے خادم و نیاز مند کے طور پر بندۂ ناچیز نہایت درجہ احترام سے عرض کرے گا کہ اس نے محض تقاضائے عدل پورا کرنے کی غرض سے یہ سطور لکھیں۔ مقصد صرف حقیقت شناسی اور اس کی طرف توجہ ہے۔ امید کہ میرے بزرگ اور مخلصین میرے جذبات اور نیتِ خیر کا لحاظ کرتے کرتے ہوئے اسی نقطہ نظر سے اس پر غور فرمائیں گے۔

واللہ ما اقول وکیل ——— ان ارید الا الاصلاح ما استطعت

وما توفیقی الا باللہ!!

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

سے ڈاکٹر اسرار احمد کا انٹرویو

ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور میں راقم الحروف کا ایک طویل انٹرویو چھپا ہے جس کا من وعن عکس قارئین "میثاق" کی خدمت میں ہدیہ کیا جا رہا ہے۔

اس انٹرویو کے ضمن میں راقم کے ساتھ یکبار پھر وہی حادثہ ہوا ہے جو تین سال قبل روزنامہ "جنگ" لاہور کے مستقل مضمون نگار جناب ارشاد احمد حقانی کے بارے میں ہوا تھا کہ جب انہوں نے فون پر وقت مانگا تھا تو میرا خیال یہ ہرگز نہیں تھا کہ یہ کسی انٹرویو کے لئے ہے بلکہ میں اس خیال میں تھا کہ یہ سابقہ جماعتی تعلق کے حوالے سے محض مشفقانہ ملاقات (COURTESY VISIT) ہے۔ بالکل اسی طرح جب علی سفیان آفاقی صاحب کا فون آیا تو اس پر بھی وہی گمان ہوا کہ "حلقہ ادب اسلامی" کے قدیم ترین وابستگان میں سے ایک سے مل کر بہت خوشی ہوگی اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ اب وہ کن وادیوں میں سرگرداں ہیں ——— بقول شاعر ؎

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں !!!

میری لاعلمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ وہ اب فلموں کے سٹوری رائٹر ہیں ——— بہر حال وہ آئے تو معلوم ہوا کہ حال ہی میں انہوں نے "سیارہ ڈائجسٹ" کی ادارت سنبھالی ہے اور اس کے لئے انٹرویو درکار ہے:

طبع شدہ انٹرویو میں کتابت کی فاش غلطیاں تو ہیں ہی کہ "مکتب" کو "مکتبہ" بنا دیا گیا۔ بعض مقامات میں میرے مفہوم کی ادائیگی بھی صحیح نہیں ہے ——— تاہم اس وقت ان تفاصیل سے قطعِ نظر صرف ایک بات کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"راقم نے اس انٹرویو میں بھی اور اس سے قبل بھی علماء کی تنظیموں کے بارے میں جو یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ دوسری عظیم تر سیاسی تحریکوں کے ضمیمے بن کر رہ گئے ہیں تو اس میں حاشا وکلّا علماء کی نیت زیر بحث نہیں ہے ——— بلکہ برعظیم کی ماضی قریب کی تاریخ میں نتائج کے اعتبار سے جو صورت واقعہ بن گئی اس کی جانب اشارہ ہے۔ ورنہ علماءِ کرام کی تنظیمیں خصوصاً جمعیت العلماء ہند ایک مستقل نظام اور مستقل پروگرام رکھنے والی تنظیم تھی اور اس نے کبھی اپنے آپ کو کسی کا ضمیمہ نہیں بنایا ———"

ڈاکٹر اسرار احمد

نہ عالم ہیں مگر علماء انہیں اپنے حدود
سے باہر سمجھتے ہیں۔
درسِ قرآن دیتے ہیں مگر خطیب نہیں ہیں
تقریریں کرتے ہیں مگر۔
نہ مقرر ہیں نہ سیاست دان،
تحریر پر قدرت ہے مگر اہلِ قلم کی براداری سے
باہر ہیں۔
ڈاکٹر ہیں مگر نسخے نہیں لکھتے۔

یہ متنازعہ شخصیت ڈاکٹر اسرار احمد ہیں

سماجی اور معاشرتی انقلاب ان کا نصب العین ہے اور
اسلامی نظام کا قیام منزلِ آخر
مجلسِ شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے
مگر مختاری کی تہمت نہ اٹھا سکے اور مستعفی ہو گئے
اپنی صاف گوئی اور بے باکی کے لیے بدنام ہیں
اسی کی پاداش میں ریڈیو اور ٹی وی کے دروازے ان پر بند ہو گئے

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

انٹرویو
علی سفیان آفاقی

ڈاکٹر اسرار احمد

کو ٹیلی فون کیا تو ایک آواز نے شائستگی سے ساتھ نام دریافت کیا اور چند لمحے بعد ڈاکٹر صاحب
بذاتِ خود فون پر تھے۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ کہنے لگے" اوہو۔ یہ نام تو بہت پرانا ہے۔ جس زمانے
میں ہم پڑھا کرتے تھے اس وقت سے یہ نام سن رہے ہیں۔"

عرض کیا" ڈاکٹر صاحب۔ نام ضرور پرانا ہے مگر آدمی پرانا نہیں ہے۔"

پوچھنے لگے" آج کل کہاں ہوتے ہیں کیا کرتے ہیں؟"

ہم نے اپنے بارے میں مختصر کوائف فراہم کئے۔" فرمائیے۔ کیسے یاد فرمایا؟"

ملاقات کی خواہش ظاہر کرنے پر کہنے لگے" ممکن ہو تو اسی وقت آجائیے۔ رات کو سوا آٹھ بجے مجھے ایک تقریب پر جانا ہے اور کل صبح اسلام آباد روانگی ہے۔"

میری دوسری فوری مصروفیات تھیں۔ چنانچہ دو دن بعد اسلام آباد سے واپسی کے بعد نمازِ عصر اور مغرب کے مابین ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔

ہم وقتِ مقررہ پر قرآن اکیڈمی کی بلند و بالا زیرِ تکمیل عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ بتایا گیا ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ناساز ہے آرام کر رہے ہیں۔ نمازِ عصر ادا کرنے مسجد میں بھی نہیں آئے۔ اندر پیغام بھجوانے کی کوشش کی۔ پیغام بر نے آکر اطلاع دی کہ میں

نے ایک ذمہ دار شخص کو خبر کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بیدار ہوں گے تو آپ کی خبر دے دی جائے گی۔ ہم نے ایک کاغذ پر اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھا اور قاصد کے حوالے کرتے ہوئے درخواست کی کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب بیدار ہوں انہیں یہ کاغذ دے دیا جائے۔ ہم گھر پر ان کے فون کے منتظر ہیں۔ گھر پہنچ کر فون کا انتظار شروع ہوا۔ مغرب کا وقت گزر گیا مگر کوئی فون نہیں موصول ہوا۔ آخر ایک بار پھر فون پر رابطہ قائم کیا۔ اس بار تنظیم اسلامی کے ناظم سے گفتگو ہوئی۔ شکایتاً کہنے لگے: "آپ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" ہم نے روداد سنائی۔ چند لمحے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ مناسب ہو تو آپ اسی وقت آ جائیے۔ ہم دوبارہ قرآن اکیڈمی پہنچ گئے۔ اس بار ناظم صاحب نے پذیرائی کی اور ڈاکٹر صاحب کے دفتر تک راہنمائی بھی فرمائی۔

ڈاکٹر اسرار احمد سفید کرتے اور شلوار میں ملبوس اپنی مخصوص ٹوپی سر پہ رکھے ایک بڑی میز کے سامنے تشریف فرما تھے کمرے میں فرنیچر، کرسیوں اور ایک گلوب کے سوا کوئی اور سامان آرائش موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ مضمحل نظر آ رہے تھے۔ مزاج پرسی پر بتایا کہ اس وقت بھی ایک سو ڈگری بخار ہے۔ رات ہی اسلام آباد کے سفر سے واپس آئے ہیں اور ایک حادثہ یہ بھی گزرا کہ لاہور میں ان کی ہمشیرہ انتقال فرما گئی ہیں۔ سہ پہر کو ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر آئے ہیں۔

ہم نے اظہارِ تعزیت کیا اور ساتھ ہی معذرت بھی طلب کی۔ "مناسب ہو کہ ملاقات کا کوئی اور وقت رکھ لیا جائے۔"

کہنے لگے: "اب آپ آ ہی گئے ہیں تو کیا حرج ہے۔ ہم اپنی گفتگو کر لیتے ہیں۔"

میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ تھکن کے سوا کوئی اور علامت ان کے چہرے پر نظر نہیں آئی۔ وہ صبر و شکر کی تصویر بنے میرے سامنے موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ابھی کچھ دیر پہلے اتنے بڑے جذباتی اور ذہنی صدمے سے گزرے ہیں۔ ان کی گفتگو، نشست و برخاست، بلند اخلاقی اور رکھ رکھاؤ بالکل معمول کے مطابق تھا۔ فضا میں جو بوجھل پن پیدا ہو گیا تھا وہ انہوں نے چند لمحوں میں اپنے بے تکلفانہ انداز سے ختم کر دیا۔ کچھ دیر خالص ذاتی قسم کی بات چیت ہوئی، مگر پھر میں نے فوراً گفتگو کا رُخ انٹرویو کی طرف موڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب اس کے لیے بھی بالکل تیار تھے۔

میں نے دریافت کیا: "ڈاکٹر صاحب سیاست اور دین کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر اسرار نے بے تکان بولنا شروع کر دیا۔ "اسلام میں دین اور سیاست کی علیحدگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ۲۰ ویں صدی کے آخری رُبع میں تو یہ خیال ایک عالمگیر تصور بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی پڑھا لکھا باشعور مسلمان اس بات سے اختلاف نہیں رکھتا۔ مشکل یہ ہے کہ فی زمانہ سیاست کا لفظ مخصوص معنوں میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ انتخاب کے بعد حکومت کے حصول کی کوشش۔ یہ ایک وسیع اصطلاح ہے کہ حکومت کو سیاست کا اہم شعبہ سمجھا جاتا ہے اور بلاشبہ ایسا ہے بھی۔ لیکن اس سلسلے میں وضاحت طلب امر یہ ہے کہ سیاست دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عملی سیاست اور دوسری نظری سیاست۔ نظری سیاست سے تو کوئی بھی باشعور مسلمان بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ ملک و ملت کے مسائل کے بارے میں اظہار رائے ہر باشعور شہری بالخصوص مسلمان کا فرض ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص عملی سیاست میں بھی حصہ لے۔ میرے نزدیک سیاست کی دو اقسام ہیں۔ انقلابی سیاست اور انتخابی سیاست۔ اس میں فیصلہ کن چیز یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی ملک میں جو سیاسی اور سماجی نظام قائم ہے آیا وہ بنیادی طور پر صحیح ہے یا نہیں؟ اور اگر اس میں خامیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں تو وہ ثانوی درجے کی ہیں یا وہ نظام ہی غلط ہے؟ اگر پہلی رائے ہو تو انتخابی سیاست کے ذریعہ حکومت کی تبدیلی یا نظام کو چلانے والے ہاتھوں کی تبدیلی درست ہو گی اور اگر دوسری رائے ہو تو انقلابی عمل کے ذریعے اس نظام کو بدلنا ضروری ہو گا۔ انقلابی عمل کے ذریعہ کسی نظام کو تبدیل کرنے کو میں "انقلابی سیاست" کا نام دیتا ہوں۔ میں نے "تنظیم اسلامی" کے نام سے جو تنظیم قائم کی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے۔ میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ انتخابی سیاست سے تو ہم بالکل کنارہ کش ہیں اور رہیں گے۔ البتہ نظری سیاست کے سلسلے میں اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اور میرا مقصد یہ ہے کہ انقلابی جماعت کے ذریعہ ملکی نظام میں تبدیلی لائی جائے۔

نہیں علمائے دین کہتے ہیں انکی اکثریت محض ایک مذہبی پیشے سے متعلق ہے

سوال: سیاست اور نظام حکومت کی بات چل نکلی ہے تو میں اس سلسلے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ عام تاثر ہے کہ علما نے ہمیشہ سیاست میں زور شور سے حصہ تو لیا لیکن سیاسی شعور سے بہرہ ور ہونے کا ثبوت نہیں فراہم کیا؟ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: برِصغیر کے حالات کو اگر بالخصوص زیرِ بحث لانا چاہیں تو اس کے پس منظر کی طرف جانا پڑے گا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے آخری ایام میں مسلمانوں کا من حیث القوم اسلام سے تعلق بہت کمزور ہو چکا تھا اور اسلام نے صرف رُسوم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ تب ہی تو یہ ہوا کہ ہم نوالۂ تر ثابت ہوئے اور مغربی امپیریلزم نے ہمیں ہڑپ کر لیا۔ دیکھا جائے تو یہ سارا مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب انگریزی راج یہاں مستحکم ہو گیا۔ اُس وقت کے حالات میں وقتی طور پر یوں محسوس ہوا کہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور ہم محکوم و مغلوب ہو کر رہ گئے چنانچہ اب سیاست کے ساتھ کیسے عہدہ برآ ہوا جائے۔ خصوصاً علمائے دیو بند نے اس مسئلے کو سب سے پہلے محسوس کیا اور یہ حکمتِ عملی ان کے حقیقت پسندانہ شعور کا ثبوت ہے کہ انگریز کے ساتھ کھلے میدان میں مقابلہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اس لیے کونوں کھدروں میں گھُس کر اپنے دین، کلچر اور ثقافتی روایات کا تحفظ کیا جائے۔ اس پہ فراریت کی پھبتی بھی کَسی جا سکتی ہے لیکن علماء کے نزدیک اُس وقت کے حالات میں یہ حکمتِ عملی درست تھی۔

اس کے برعکس علی گڑھ تحریک کے حامیوں اور سرسید احمد خاں کے معتقدوں نے ایک دوسری پالیسی اختیار کی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ برِصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نے ان ہی کی پالیسی کو اختیار کیا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سے برِصغیر کی سیاست سے علماء کا عملی تعلق منقطع ہونا شروع ہوا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی سیاست کے میدان میں ہمیں زبردست شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے جرأت، ہمت اور سیاسی شعور کا ثبوت دیا۔ میری مراد حضرت شیخ الہندؒ سے ہے۔ لیکن اپنوں کی غداری کی وجہ سے وہ بھی ناکام ہوئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بعد برِصغیر میں علمائے دین اکثر و بیشتر دوسری عظیم تر سیاسی تحریکوں کے ضمیمے کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مثلاً کانگریس کے ساتھ جمعیت العلمائے ہند اور مسلم لیگ کے ساتھ جمعیت العلمائے اسلام۔ یا بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء اور مشائخ۔ اس میں ایک نائین ذرا مختلف ہے اور اسے میں براہِ راست "اسلامی احیائی تحریک" کا نام دیتا ہوں۔ اس کے نقیبِ اوّل مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تھے، جنہوں نے ۱۹۱۲ء میں روزنامہ الہلال اور البلاغ کی وساطت سے

جماعتِ اسلامی عملی سیاست میں کودنے کے باوجود اس کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکی

دعوت کے ذریعے مسلمانوں کو احیائے اسلام کے لیے دین کی دو عظیم ترین حقیقتوں، قرآن اور جہاد کی طرف متوجہ کیا حضرت شیخ الہند نے ان کے جوہرِ قابل کو پہچان کر ۱۹۲۰ء میں جبکہ ان کی زندگی کا چراغ گل ہوا چاہتا تھا یہ کوشش کی کہ علماء من حیث الجماعت مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت کو قبول کر لیں اور ان کے ہاتھ پہ بیعت کر کے انہیں امام الہند مان کر آزادیٔ وطن اور احیائے اسلام دونوں کی تحریک بیک وقت شروع کریں۔ مگر بعض علماء کی مخالفت کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس سے بددل ہو کر مولانا آزاد نے اپنا راستہ ہی تبدیل کر لیا اور اپنی بقیہ زندگی پورے ثبات و استقلال کے ساتھ ہندوستان کی نیشلسٹ سیاست میں گزار دی۔

پھر تقریباً ۱۲، ۱۴ سال بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اس ڈور کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں زیادہ محنت و مشقت اور زیادہ ثبات و استقلال کا ثبوت دیتے ہوئے تحریکِ جماعتِ اسلامی کا آغاز فرمایا۔ انہوں نے مسلمانوں کی قومی سیاست سے ہٹ کر ایک اصُولی اسلامی انقلابی جماعت قائم کی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی مانند اپنے اصولی مؤقف پر صرف سات آٹھ سال ہی قائم رہ سکے اور قیامِ پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی کا جزوِ اعظم یہاں کی قومی سیاست میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اِس وقت پاکستان میں جماعتِ اسلامی اور علماء کے جو حلقے سیاسی میدان میں فعال نظر آتے ہیں ان کے بارے میں یہ صحیح تجزیہ ہے کہ جماعتِ اسلامی عملی سیاست میں کودنے کے باوجود اس کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکی۔ علماء کے سامنے بھی کوئی خاص مطمحِ نظر محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ دوسری سیاسی تحریکوں کے ضمیموں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اور ان کا مقصدِ اوّلین بھی حصولِ اقتدار ہی رہ گیا ہے۔

سوال: کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ علمائے دین سیاست کی کوچہ گردی کرنے کی بجائے لوگوں کی اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ دیتے؟

جواب: اصل میں اخلاق کا تعلق انسان کے نظریات سے ہے۔ ہمیشہ اخلاق کو کسی نظریاتی اَساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے نظریاتی اساس ایمان ہے۔ بدقسمتی سے مغربی خیالات کے تسلط کی وجہ سے ہمارے ایمان کی جڑیں بہت کمزور ہو چکی ہیں اور ہم مجموعی طور پر ایک خلا میں ہیں۔ وطن پرستانہ اور قوم پرستانہ اخلاق ہمارے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہاں اخلاق کے لیے جو اساس یعنی ایمان درکار ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اسی طریقے سے جنہیں ہم علمائے دین کہتے ہیں ان کی اکثریت محض ایک مذہبی پیشے سے متعلق ہے۔ نہ علم کی گہرائی حاصل ہے نہ یقین و ایمان کی وہ کیفیت جس سے ان کے کردار کی تخلیق ہو اور وہ دوسروں کے اخلاق تخلیق کر سکیں۔

ہم علماء کیا ہیں یہ ایک مذہبی سول سروس ہے جو بدقسمتی سے آرگنائزڈ بھی نہیں ہے

یوں سمجھئے کہ یہ ہمارے ہاں ایک مذہبی سول سروس ہے جو بدقسمتی سے آرگنائزڈ بھی نہیں ہے۔ کوئی معیار، کوئی درجہ بندی نہیں ہے۔ بمقابلہ ایرانی علماء کے کہ ان کے ہاں علماء کا پورا نظام بہت منظم اور مربوط ہے۔ ان میں قوت عمل اور ایک نظم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اینٹی بھٹو تحریک اور ایران کی اینٹی شاہ تحریک اگرچہ بہت سے اعتبارات سے مماثل تھیں مگر ہمارے ہاں اس کا نتیجہ ایک نئے مارشل لاء کی شکل میں سامنے آیا جبکہ ایران میں کم از کم ایک مذہبی حکومت (تھیاکریسی) قائم ہوئی۔ اس پس منظر میں اصل حل وہی ہے کہ ایک زبردست انقلابی تحریک برپا ہو جو سب سے پہلے مسلمانوں کے قلوب و اذہان کو اسلام کے حق میں مسخر کرے۔ اس کے نتیجے میں خالص ایمانی اور اسلامی اخلاق اور سیرت و کردار وجود میں آئے گا اور پھر ایسے لوگوں کی اجتماعی جدوجہد سے انقلاب برپا ہوگا۔

سوال۔ لیکن یہ کام کون کرے گا؟

جواب۔ یہ کام وہ ہے جس کی نشان دہی مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی اور اس جہت میں کچھ پیش قدمی مولانا مودودی نے کر کے دکھائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ امت کا مستقبل اس کام سے وابستہ ہے اس لیے میں اپنی حقیر سی مساعی کو اسی رخ پر صرف کروں گا۔

سوال۔ علمائے کرام پر ملت کی طرف سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کیا وہ ان سے عہدہ برآ ہوئے ہیں؟

جواب۔ یہ کہنا آسان ہے کہ علماء کو یہ کرنا چاہیے وہ کرنا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان علماء کی تعلیم کا نظام کون سا ہے۔ معاشرے نے انہیں کیا سٹیٹس دیا ہے؟ کوئی کھاتا پیتا آدمی اپنے بچے کو علم دین کی طرف بھیجنے کو آمادہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے قومی زیاں اور اضمحلال کا ایک مظہر ہے۔ لہٰذا علماء کو DISOWN کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ ان کی جانب سے یہی غنیمت سمجھنا چاہیے کہ وہ اسلامی شعائر کا ایک ڈھانچہ تو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک بے روح ڈھانچہ ہے۔ مسجدیں ہیں جہاں نمازیں ہوتی ہیں۔ خطبے ہوتے ہیں۔ ختنے ہوتے ہیں۔ جنازہ اور نکاح کی سروس موجود ہے۔ حلال و حرام کے مسائل بتانے کے لیے لوگ موجود ہیں۔ ہمارے علماء کیونکہ بحیثیت مجموعی آج سے سالہا سال پہلے کی ذہنی اور فکری فضا میں رہ رہے ہیں اس لیے ان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرنا زیادتی ہے۔

جب عوام کو جان دینے پر آمادہ کرنا ہو تو تحریک میں نام اسلام کا ڈال دیا جاتا ہے

سوال۔ لیکن ہمارے علماء کی بدنظمی اضمحلال اور بے عملی کا سبب کیا ہے؟ جب کہ آپ نے ابھی ایرانی علماء کی مثال بھی پیش کی ہے۔

جواب۔ آپ یہ نہ بھولیے کہ ہم براہ راست انگریز کے غلام ہوئے۔ ایران کبھی غلام نہیں ہوا۔ لہٰذا ان کا مذہبی علماء کا نظام بھی محفوظ (INTACT) رہا۔ جبکہ ہمارے ہاں وہ انتشار کا شکار ہو گیا۔ جو بھی شخص ایک کمرے میں مکتبہ بنا کر بچوں کو پڑھاتا ہے وہ بورڈ جامعہ کا لگا دیتا ہے۔ یہ ایک خود رو اور جنگلی افزائش ہے۔

سوال۔ بھٹو حکومت کے خلاف تحریک کے دوران علماء نظام مصطفےٰ کا نعرہ بلند کیا۔ اس نعرے کی خاطر لوگوں نے سینوں پر گولیاں کھائیں، جان و مال کی قربانیاں پیش کیں لیکن جیسے ہی بھٹو حکومت کا خاتمہ ہوا ہمارے علماء نظام مصطفےٰ کو بھول گئے اور اس سمت میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس ایسی طاقتوں کے ساتھ علماء نے اشتراک کر لیا جو اس کی قائل ہی نہیں ہیں اور ملکی مسائل کا حل سوشلزم میں تلاش کرتی ہیں نظام مصطفےٰ کی تحریک کا یہ حشر کیوں ہوا؟

جواب۔ دیکھئے۔ اصلاً بھٹو مخالف تحریک نہ علماء نے اٹھائی اور نہ ہی یہ علماء کی تحریک تھی، یہ تو ایک خالص سیاسی تحریک تھی جو ایک حکمرانِ وقت کے خلاف ہمہ جہتی ردِ عمل کی صورت میں شروع ہوئی اس میں ہمارے ملک کے جملہ سیاسی عناصر شامل تھے۔ دائیں بازو والے بھی اور بائیں بازو والے بھی۔ سیکولر بھی اور مذہبی بھی۔ اور مذہبی میں لبرل بھی اور آرتھوڈکس (قدامت پسند) بھی چنانچہ اس تحریک کا نام بھی "پاکستان قومی اتحاد" تھا۔ اس کے نام میں بھی اسلام کا لفظ شامل نہ تھا۔ بعینہٖ یہی معاملہ ایران میں تھا۔ شاہ ایران کے خلاف تحریک میں تودہ پارٹی بھی شریک تھی اور دوسری غیر مذہبی جماعتیں بھی علماء کے شانہ بشانہ برسرِ پیکار تھیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی مسلمان ملک میں کوئی تحریک جب اس مرحلے پر آتی ہے کہ عوام کو جان دینے پر آمادہ کیا جائے تو ؏

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر میں علمائے دین اکثر و بیشتر عظیم تر سیاسی تحریکوں کے ضمیمے کی حیثیت سے

اس لیے نام اسلام کا ڈال دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ نظامِ اسلامی کی تحریک بن گئی اور ایران میں بھی تحریک نے اسلامی انقلابی تحریک کا رُخ اختیار کر لیا۔ چنانچہ اس کی علامت کے طور پر پاکستان میں اس تحریک کی قیادت بھی مفتی محمود مرحوم کے سپرد کر دی گئی۔ ایران میں اس کی قیادت امام خمینی کے ہاتھ میں آئی لیکن یہاں سے آگے فرق ہے۔ مفتی مرحوم کی قیادت صرف علامتی قیادت تھی اس لیے کہ یہاں دینی عناصر کی کوئی تنظیم موجود نہ تھی بلکہ چار پانچ جماعتیں تھیں۔ جو صرف ایک وقتی ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے تعاون کر رہی تھیں۔ لہذا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہاں نتیجہ نکلا مارشل لاء کی صورت میں جبکہ ایران میں علماء کی تنظیم بہت مضبوط تھی اور خمینی صاحب کی قیادت بھی حقیقی اور واقعی قیادت تھی۔ اس لیے وہاں فوری طور پر ایک مذہبی حکومت قائم ہو گئی۔

سوال۔ یہاں میں یہ دریافت کروں گا کہ ہمارے عوام نے جان بوجھ کر دھوکہ کھایا یا انہیں عمداً دھوکہ دیا گیا؟

جواب۔ دراصل یہ فیصلے کی خامی تھی۔ ہمارے علماء اس مغالطے میں تھے کہ عوام بعد میں بھی ہمارا ساتھ دیں گے وہ صحیح سچویشن کو نہ سمجھ سکے اور آپس کی نااتفاقی کی وجہ سے نقصان اُٹھایا۔

ابھی ڈاکٹر اسرار کا فقرہ ختم ہی ہوا تھا کہ قرآن اکیڈمی کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ہماری گفتگو کو کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا ہے۔ ڈاکٹر اسرار نمازِ باجماعت کی امامت بذاتِ خود کرتے ہیں۔ یوں بھی جن حالات میں وہ میری ساتھ گفتگو کے لیے آمادہ ہو گئے تھے اس کے بعد ان کو مزید مصروف رکھنا سراسر بداخلاقی ہوتی۔ اس لیے میں نے ان سے اجازت چاہی اور انہوں نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود اگلے روز نمازِ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت مقرر کیا۔

اگلے روز میں نمازِ عصر کے وقت پہنچا۔ جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر اسرار امامت کے لیے کھڑے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ عقبی دروازے سے دفتر کی طرف چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد میں ان کے پُرسکون اور پُرعافیت دفتر میں موجود تھا۔ آج میرے ساتھ ایک فوٹوگرافر صاحب بھی تھے۔

ہمارے لوگ رہنمائی کے لیے علماء کی طرف بالکل نہیں دیکھتے

ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور بولے "بھئی کل تو آپ بہت شریفانہ طریقے پر آئے تھے لیکن آج کیا معاملہ ہے؟"

عرض کیا" اعتراض نہ ہو تو آپ کی چند تصاویر اتار لی جائیں۔ اس کے بعد فوٹوگرافر صاحب رخصت ہو جائیں گے اور ہم اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔"

وہ بولے" مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

میں نے کہا" اجازت طلب کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض علماء تصویر کشی کو جائز نہیں سمجھتے ۱۹۵۵ء میں جب میں نے مولانا مودودی مرحوم سے تصویر کشی کے بارے میں معلوم کیا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا: میں اسے جائز نہیں سمجھتا لیکن چند سال بعد مولانا کی تصاویر اکثر اخبار و رسائل کے صفحات پر نظر آئیں۔ اس کا جواز وہ یہ پیش کرتے تھے کہ اگر کوئی اجازت

کے بغیر میری تصویر اُتار لے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب بولے مولانا کی بعض تصاویر خود ان کے دفتر میں بھی آتاری گئی ہیں۔ اگر ایسا تھا تو مولانا فوٹو گرافر کو منع فرما سکتے تھے۔" اس اثنا میں فوٹو گرافر صاحب تصاویر اُتار کر رخصت ہو گئے۔

مَیں نے پہلا سوال کیا۔ ڈاکٹر صاحب یہ کیا بات ہے کہ ہمارے اکثر علمائے کرام پہلے ایک چیز کو رَد کر دیتے ہیں لیکن بعد میں اسی چیز کو آہستہ آہستہ اپنا لیتے ہیں۔ عوام الناس کے ذہنوں میں اس طرح اُلجھن اور ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

جواب۔ صحیح فرمایا آپ نے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

سوال۔ یہ فرمایئے کہ ہمارے کئی علمائے کرام نے سیاست میں حصّہ لیا لیکن کوئی نمایاں کارکردگی نہ دکھا سکے جب کہ ان سیاسی مصروفیات کی بنا پر وہ اپنے مذہبی فرائض کی طرف کما حقہٗ توجہ نہ دے سکے۔ مثال کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، علّامہ مشرقی۔ اگر یہ حضرات خود کو مذہبی اُمور کے لیے وقف رکھتے تو زیادہ بہتر نہ ہوتا؟

جواب۔ علّامہ مشرقی کو میں علما میں شمار نہیں کرتا۔ رہا دوسرے علما کا سیاست میں حصّہ لینے کا مسئلہ تو بعض علماء نے بلند اور نیک مقاصد کے پیشِ نظر سیاست کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے اپنی بساط کے مطابق سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ بعد میں ان سے غلطی ہوئی یا حالات ہی کچھ ناسازگار رکھتے اس لیے وہ اس میدان میں کارہائے نمایاں نہ دکھا سکے۔ جنہوں نے سیاست

ہر شخص بھی مکتبہ بنا کر بیٹھتا ہے وہ بورڈ جامعہ کا لگا دیتا ہے

میں حصّہ لیا میرے نزدیک علماء میں ان کا تناسب بہت کم ہے۔ ہمارے ہاں اب بھی ایسے علماء ہیں جو سیاست میں حصّہ نہیں لیتے۔ جو اپنی مساجد اور خانقاہوں میں بیٹھے ہیں۔ جن کا کام دین کی تبلیغ اور اخلاق و تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ یا وہ علماء ہیں جن پر زیادہ چھاپ تصوّف کی ہے سیاست کی ان پر چھاپ نہیں ہے۔ وہ اپنے اپنے میدان میں بیٹھے کام کر رہے ہیں اور یہ کہ بہت بڑا دیوبندی اور تھانوی حلقہ ہے وہ اسی کام کے اندر مگن ہے۔ بعض علماء نے خود کو صرف تدریس کے اندر گُم کر دیا ہے جیسے مولانا یوسف بنوری نے۔ اگر یہ ختم نبوّت کی تحریک میں ۱۹۷۴ء (جو سیاسی تحریک نہیں تھی) میدان میں نہ آتے تو شاید پاکستان میں اُن کو لوگ عام طور پر نہ جانتے۔ اپنی پُوری زندگی اُنھوں نے اپنے آپ کو اسلامی دارالعلوم بنوری ٹاؤن کی خاطر وقف کر دیا۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں علماء کی مختلف پہلوؤں سے خدمات ہیں۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد جن لوگوں نے سیاست میں حصّہ لیا اُن کے بارے میں آپ بہت سی باتیں کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا کوئی مؤثر رول بھی نہیں ہو سکا۔ میرے خیال میں وہ دوسری تحریکوں کے ضمیمہ بن کر چلتے رہے۔ اب اُن کی صفوں میں کوئی ایسی شخصیت بھی نظر نہیں آ رہی جو انہیں یکجا کر کے ایک بہت بڑی طاقت بنا دے۔ اسی طریقے سے مکاتیبِ فکر ہیں جن میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری ہے۔ مثلاً جمعیت علمائے اسلام یہ دیوبندی علماء کا سیاسی گروپ رہا ہے۔ دیوبندی علماء میں ایک تھانوی گروپ جنہوں نے کبھی سیاست میں براہِ راست حصّہ نہیں لیا۔ جیسے درس و تدریس میں دلچسپی رکھنے والے علماء جنہوں نے کبھی سیاست میں حصّہ نہیں لیا جیسے مولانا بنوری انہوں نے کبھی سیاست میں حصّہ نہیں لیا۔ اب جو بھی سیاسی طور پر دیوبندیوں کا سرگرم حلقہ تھا اسی گروپ کا ایک حصّہ صدر ضیاالحق سے اچھی اُمیدیں وابستہ کر کے ان کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ ایک گروپ اُس کے برعکس ایم آر ڈی میں ہے۔ اور ایک گروپ وہ ہے جو نہ اِدھر کا ہے اور نہ اُدھر کا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں یہ حالات کی جو تصویر ہے اُس کو اگر ہم پس منظر میں نہ رکھیں تو پھر علماء کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ پھر ہمارے مسائل کی جو پیچیدگیاں ہیں اور اس قسم کا جو رول ہے اُس کے اندر سے مثبت پہلو کو تلاش کیا جائے۔ میری اپنی سوچ کا جو انداز ہے وہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ تنقید کروں کہ فلاں نے یہ نہیں کیا فلاں نے وہ نہیں کیا۔ مَیں کوشش کرتا ہوں کہ مَیں یہ سوچوں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟

تحریکِ نظامِ مصطفےٰ میں علماء کی قیادت صرف علامتی تھی

سوال۔ ڈاکٹر صاحب لوگوں کے کردار اور عمل کو بہتر بنانے اور اُن کی رہنمائی کرنے کی ذمّہ داری کس پر ہے؟ کیا علمائے کرام پر اس کی ذمّہ داری عائد نہیں ہوتی؟

جواب۔ یہ تو ہر باشعور مسلمان کا فرض ہے۔ آپ اس کو صرف علماء کے ذمّے کیوں ڈالتے ہیں؟

سوال۔ اس لیے کہ باشعور مسلمان اپنی رہنمائی کے لیے زیادہ تر علمائے کرام سے رجوع کرتے ہیں۔

جواب۔ علماء کی طرف رہنمائی کے لیے ہمارے لوگ بالکل نہیں دیکھتے اگر علماءؒ کی طرف وہ دیکھتے ہیں تو صرف مسائل جاننے کے لیے اصل صورت یہ ہے کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق اور کردار رفتہ رفتہ بہت نیچے گر گیا ہے۔ یہ عمل کوئی چھوٹا موٹا نہیں ہے یہ صدیوں سے چلتا آرہا ہے۔ جیسے حفیظ کا ایک شعر ہے ؎

؎ تشکیل و تعمیر فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے — نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

تو ہمارا تو یہ نصف صدی کا نہیں ہے بلکہ اس صدی کا (PROCESS) ہے جس میں قوم گرتی جارہی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جن لوگوں کو کچھ شعور حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کی بہتری کے لیے سوچتے ہیں، اس میں اب دو قسم کے نقطۂ نظر تو خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہمارے زوال کا اصل سبب کیا ہے؟ اُس کی وجہ تلاش کریں پھر اُس کی جو تعمیر نو ہے جڑ بنیاد سے شروع کریں۔ اس حد تک جہاں ہم پہنچ چکے ہیں کم از کم اُس کا سدِّ باب کیا جائے۔ کچھ مسلمانوں کی سیاسی بہتری اُن کے مسائل اور مشکلات کا حل کیا جائے۔ میرے نزدیک قومی تحریکیں یا علماء کا رول اس پہلو سے اہم ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی دینی اور مذہبی رہنمائی کی ہے۔ تو یہ کام سیاسی تحریکوں اور علماء نے کیا ہے۔ علماء کا ایک بہت اہم رول یہ رہا ہے کہ اس دَور میں اسلام پر جو حملے آور ہوئے ہیں خواہ وہ عقیدے کے راستے آئے ہیں یا نئے نظریات کے ذریعے انہوں نے کم از کم اُن کا مقابلہ کرکے اسلام کو محفوظ کیا۔ اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ ہم گرے کیوں؟ ہمارے اخلاق کا جنازہ کیوں نکلا؟ ہمارا یقین اور اعتماد کیوں ختم ہوا؟ اب اس یقین کی دوبارہ تعمیرِ نو کرنا میرے نزدیک اصل کام ہے۔ یہ وہ اچھا کام ہے جس کے لیے ہمیں بہت منظم ہونا پڑے گا اور اس میں ہمیں اپنے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت مبارک کو سامنے رکھنا ہوگا کہ حضورؐ نے جو کچھ کیا اُس میں سب سے پہلے کس بات کو اہمیت دی گئی اور بعد میں کیا کام کیا؟ سیرت النبی کو سامنے رکھ کر یہ کام ہوگا۔ اس نوعیت کا کام جسے میں احیائے دین کہتا ہوں۔ باقی یہ کہ جو حالات پوچھے گئے ہماری سیاسی تحریکیں ہوں یا ہمارے علماء کا طبقہ انہوں نے اس حالت میں جو کچھ بہتر طور پر کر سکتے تھے کیا۔

انتخابی سیاست سے توجہ بالکل ہٹا دی، کوشش ہیں البتہ نظری سیاست کے سلسلے میں جدوجہد جاری رکھیں گے

سوال۔ تبلیغی جماعتوں اور تحریکوں کی کارکردگی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اصل میں تھوڑی سی آپ کی تصحیح اس طرح کروں گا کہ تبلیغی جماعتیں یا تحریکیں یہ اصطلاح غالباً کچھ صحیح نہیں۔ اس وقت صحیح معنوں میں تبلیغی جماعت ایک ہے جو بڑے پیمانے پر کام کرتی ہے۔ ویسے تو یہ کہ ہمارے ہاں جو بھی مکتبۂ فکر ہے، مذہبی مکتبۂ فکر، وہ ایک تبلیغی حلقہ رکھتا ہے اپنے خیالات پھیلاتا ہے کوئی جلسہ کرتا ہے تو اس کے لیے عظیم الشان کانفرنس ہوتی ہے اور بڑے بڑے پوسٹر چھپتے ہیں حالانکہ اُس میں سوائے فرقہ وارانہ مسائل کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ محض اختلافی مسائل ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا عظیم تحریک کی حیثیت سے آغاز کیا تھا مولانا الیاس شمس اللہ نے۔ اس تحریک کا مفید پہلو کیا رہا؟ اُسے بھی ہمیں اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس تحریک کو کام کرتے ہوئے کم از کم پچاس سال ہو گئے ہیں۔ اصل میں یہ تحریک شروع ہوئی تھی ہندوؤں کی شدھی تحریک کے جواب میں۔ اس لیے کہ جب شدھی تحریک چلی تو دہلی کے آس پاس کا جو قبائلی علاقہ تھا اس کا حال یہ تھا کہ کبھی کوئی ایمان لے آیا کسی روحانی شخصیت کے زیرِ اثر مگر باقاعدہ طور پر اُن کی تعلیم و تربیت کا کوئی اہتمام نہیں ہوا۔ کلمہ کبھی نہیں پڑھا۔ لہٰذا جواب میں مسلمانوں نے بھی تبلیغی کوششیں کیں مگر ان میں سے کوئی بھی کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ پھر مولانا الیاس شمس اللہ کی جو تحریک ہے انہوں نے لوگوں کو موبلائز کیا کہ وہ اپنا کھائیں اپنا پئیں اور وہ گروپس کی شکل میں جائیں اور جو اُن کے بنیادی فرائض ہیں اُن کی طرف مسلمانوں کو راغب کریں۔ انہیں کلمہ سکھائیں۔ اُن مسجدوں میں جھاڑو دیں جو بند پڑی ہیں۔ لوگوں کی خوشامد کر کے مساجد میں لائیں۔ انہیں وضو کرنا سکھائیں، انہیں نماز پڑھنی سکھائیں۔ یہ جو کام تھا سب اہم تھا۔ انہوں نے یہ رویہ رکھا تھا کہ نہ کسی سے کچھ کھانا پینا نہ اُن سے کوئی شے لینا، نہ اُن سے کوئی خدمت لینا بلکہ اپنے خرچ پر جانا اور اپنے ساتھ کھانے کے لیے چاہے بھنے ہوئے چنے لے گئے۔ مسجدوں میں جھاڑوں دے رہے ہیں گندے اور میلے کچیلے لوگوں کی منت سماجت کر کے انہیں مساجد میں لا رہے ہیں یہ کام جو تھا اُس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے اور یہیں سے تحریک شروع ہوئی اس تحریک

نے بعد میں بڑھ کر عالمی شکل اختیار کرلی لیکن مجھے یہاں اختلاف یہ ہے کہ انہوں نے اسی میتھڈولوجی کو یونیورسلائز کرلیا ہے۔ اسی طرح وہ امریکہ میں بھی جاکر جو کام کرتے تھے اُس میں ہمارے ہاں ایک تقدس کا پہلو شامل ہوتا تھا۔ اور یہ وہی مشن تھا جس کا آغاز

سوال یہ ہے کہ معاشرے نے علما کو کیا حیثیت دی ہے؟ کوئی کھاتا پیتا آدمی اپنے بچے کو علمِ دین کی طرف بھیجنے کو آمادہ نہیں ہے۔

مولانا الیاس شمس اللہ نے کیا تھا۔ بلاشبہ انھوں نے اس سلسلے میں بہت ٹھوس کام کیا لیکن ہمارے ہاں اُس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے کثیر تعداد میں نوجوان پروفیسر اور ملازمت پیشہ لوگ اس کی لپیٹ میں آگئے ہیں اور انھوں نے کم ازکم مذہبی اعتبار سے دوسروں کو دیکھ کر ہی نماز پڑھنا شروع کردی۔ مسجدوں میں جانے لگے، دینی مسائل اور فضائل میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ سو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سارے کام یقیناً قابلِ ستائش ہیں۔ لیکن اس سے آگے جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ سیرت و کردار کی تعلیم دینا، نہی عن المنکر کی بدیوں سے روکنے کے کام کو نظرانداز کردیا گیا۔ اسی طرح انھوں نے قرآن مجید کو اپنے مرکزی ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ تقاریر سے ہی سارا کام کر رہے ہیں اور تیسری کمی مجھے جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے آگے کا کوئی نقشہ وہ لوگوں کو نہیں دے رہے کہ اسلام کو دنیا پر غالب لانے اور اُسے پھیلانے کا کیا طریقہ اور لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ وہ صرف سامنے محسوس نہیں ہو رہا جیسے میں اکثر مثال دیا کرتا ہوں کہ بیل جو ہوتی ہے وہ زمین پر پھیلتی ہے مگر درخت اُوپر کی طرف اٹھتا ہے۔ میرے نزدیک انقلابی تبلیغ کی ایک اعلیٰ مثال کمیونسٹ تبلیغ ہے کہ وہ جس طرح لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے ہیں، اپنے مذہب اور نظریات کا جس انداز سے پرچار کرتے ہیں وہ انتہائی مؤثر ہوتا ہے لیکن اُن کی ساری کوشش کا ہدف ہے "کمیونسٹ انقلاب" کہ وہ ان لوگوں کو ہم خیال بناکر معاشرے کے اندر اپنے نظریہ کے مطابق ایک انقلاب بپا کریں۔ اسی طرح خالص مذہبی تحریک کی ایک اور واضح مثال عیسائیت کی تبلیغ ہے۔ اس میں کوئی نظام نہیں، عجیب مذہب ہے جس میں کوئی شریعت نہیں محض ایک عقیدہ ہے جسے

دُنیا میں مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوئیں لیکن اسلامی حکومتیں بہت کم نہیں ہوئیں

پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔ تو یہ مذہبی تبلیغ ہے جس کی مثال کرسچین مشنری جدوجہد ہے۔

جبکہ اسلام میں درحقیقت دونوں عناصر موجود ہیں یعنی عقیدہ بھی پھیلایا، توحید اور آخرت کی تعلیم دی اور نبوت، رسالت، عقیدۂ قرآن اور ختمِ نبوت پر ایمان پختہ کرایا۔ اور پھر یہ ہے کہ جو لوگ اس تحریک کو قبول کریں وہ اس کو منظم کرکے دینِ حق کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کرنے کی انقلابی جدوجہد کریں۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے ۲۲ برس میں یہ دونوں چیزیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں کہ آپ نے اسلام کو بھی پھیلایا اور ایک انقلابی تحریک بھی چلائی۔ تو یہ دوسرا عنصر ہماری تبلیغی جماعت میں نہیں ہے۔ جہاں تک کردار کا تعلق ہے تو یہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے نصب العین کے حوالے سے بنتا ہے۔ اگر ایک انسان کا اپنی ذات کو اُبھارنا ہی نصب العین بن جاتا ہے تو یہ بھی درست ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کے اندر محنت کا جذبہ بڑھے گا۔ وہ مشقت کرے گا کیونکہ وہ آگے بڑھنا چاہے گا۔ کسی کا یہ نصب العین بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک و قوم کا نام بلند کرنا چاہتا ہے اُس کے لیے اُس میں ایثار پیدا ہوگا۔ وہ قومی مفادات کو سب سے مقدم سمجھے گا تو ایک قوم پرستانہ اخلاق وجود میں آجائے گا۔ اسی طرح اسلام کا جو اخلاق ہے وہ وجود میں ہی تب آتا ہے جب کہ انسان اسلام کے غلبے کی جدوجہد ہی کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتا ہے کہ اسلام کا بول بالا کرنے کے لیے کام کیا جائے۔ اس جدوجہد میں جب انسان بڑھے گا تو اس کی رُو سے اس میں مومنانہ کردار پیدا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کردار کے لیے کوئی بنیاد ہونی چاہیے۔ کوئی نہ کوئی آئیڈیل کوئی نہ کوئی نصب العین ہونا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ من حیث القوم مسلمانوں کے نصب العین کے لیے کوئی آئیڈیل اور کوئی بنیاد نہ تھی۔ اس لیے باقی دنیا میں کردار کے جو احساسات ہیں ان کی تو ہم اپنی نظریاتی Commitment کی وجہ سے نفی کردیتے ہیں۔ نہ ہم قوم پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں اور نہ ہم وطن پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ان ساری پرستشوں کی عقیدۂ شرک کے ساتھ نفی ہو جاتی ہے۔ گویا ہم اخلاقی اعتبار سے خلا میں ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے۔

سوال۔ یہ کہا جاتا ہے کہ آج تک کسی ملک میں صحیح اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی؟

جواب۔ یہ غلط ہے کہ آج تک قائم نہیں ہوئی۔

سوال۔ آج کے زمانے سے میری مراد ماڈرن اور جدید معاشرے سے ہے۔

جواب۔ جی بالکل یہ سچ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے ایک نظریاتی مملکت کا تصور پیش کیا، جو حضورؐ نے پیش کیا۔ آپ نے ایک انقلابی جدوجہد کی وجہ سے اُسے قائم بھی کر دیا اور ہم مانتے ہیں وہ اپنی تصوراتی یعنی آئیڈیل شکل میں صرف تیس برس تک قائم رہی۔ اُس کے بعد مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوئی ہیں لیکن آئیڈیل قسم کی اسلامی حکومتیں کہیں قائم نہیں ہوئیں۔

سوال۔ آپ کے خیال میں مغربی جمہوریت جس میں عوام کی شرکت ہو اسلام میں کہاں تک جائز ہے؟

جواب۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اپنے کینوس کو وسیع کریں تو یہ رویہ تیسری دنیا سے متعلق ہے۔ اُس میں مسلمان بھی شامل اور غیر مسلم اقوام کی اکثریت بھی شامل ہے۔ یہ وبائی کیفیت ہے جو پوری تیسری دنیا میں موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت یہ تہذیبوں کا ٹکراؤ تھا۔ کیونکہ جب مسلمان دنیا کو اپنے کلچر اور مذہب کے اعتبار سے تسخیر کر رہے تھے۔ اُس وقت یورپ ظلم و تاریکی

: یہ عملی ... سامنے ... خاص مقصد نظر محسوس نہیں ہوتا اور اُن کا مقصد ذہنی ... اقتدار ... رہ گیا ہے

اور بربریت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کے بعد مسلمانوں نے انہیں جگایا۔ قرطبہ اور غرناطہ یونیورسٹیوں سے جو روشنی پھیلی وہ یورپ تک بڑھی۔ اُس کے نتیجے میں دو تحریکیں سامنے آئیں۔ ایک تحریک اصلاح مذہب جو مسلمانوں کے زیر اثر تھی اور دوسری تحریک احیائے علوم اور بلاشبہ ان دونوں تحریکوں کے نتیجے میں یورپ میں ایک نئی تہذیب نیا کلچر نئی فکر نئی روشنی پیدا ہوئی علوم سے رغبت اور ایجادات وغیرہ کا عمل شروع ہوا۔ اُس وقت ہم زوال میں جا رہے تھے عیش میں تھے لہٰذا تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ کے حوالے سے اس بات کو آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ درحقیقت اسلام سے ان تحریکوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب ایک طرف یورپ نے اپنے عروج میں جو چیزیں حاصل کی ہیں اُن کے پس منظر میں جب عالم اسلام یا پوری تیسری دنیا کا جائزہ لیں گے تو یقیناً مایوسی ہوگی۔ ہم فنونِ علوم اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے اُن سے پیچھے ہیں۔ اس طریقے سے ہمارے اندر جمہوری شعور بھی ابھی پورے طریقے سے نہیں آیا۔ ابھی اس میں تعمیرِ نو کا بہت سا عمل ہونا باقی ہے۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب مسلمانوں میں عالمگیر سطح پر کردار کی پستی اس قدر کیوں ہے؟

جواب۔ اس کا تجزیہ تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ ہماری اپنی بنیاد تو ہمارے ہاتھ سے گئی اب دوسری کوئی بنیاد اپنے کردار کی تعمیر کے لیے اختیار کر نہیں سکتے۔ اب تو یہی دیکھنا ہے کہ اُس طرز پر کوئی تحریک اللہ تعالیٰ اس خطے کو کب عطا فرماتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے نقشِ قدم پر پھر کسی سطح پر کوئی تحریک اُبھرے جس کی وجہ سے ایمان کی تجدید بھی ہو۔ اور ایک تحریک کی شکل بن کر وہاں انقلاب آئے۔ لیکن درحقیقت یہ شروع سے ہی کرنے کا کام ہے اور انشاء اللہ ایسا ضرور ہوگا۔ میرے نزدیک اس وقت جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں عام اسلام کے اندر تو بھی عمل ہے اُس کے اندر جو گندہ عناصر ہیں اُس میں ایک یہ تصور بھی بتدریج آگے آ رہا ہے اس کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ ایک دور وہ تھا کہ ہمارے اندر شدید مرعوبیت تھی علامہ اقبال نے اُس پر تنقیدیں کیں۔ پھبتیاں کسیں نتیجہ نکلا کہ اب اُس قسم کی مرعوبیت نہیں ہے۔ کچھ جوابی تحریکوں نے جیسے جماعت اسلامی کی تحریک تھی۔ انہوں نے کہا ہم بھی ہیں۔ ہمارا بھی نظام ہے لیکن ابھی ان چیزوں نے ذہنوں اور دلوں پر کچھ زیادہ اثرات نہیں چھوڑے اور نہ ہی اتنی تعداد میں مسلمان اس سے متاثر ہوئے

اخلاقی اعتبار سے اس وقت ہمارے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے

سوال۔ ڈاکٹر صاحب کیا یہ ممکن ہے کہ اسلامی بنیادوں پر پاکستان میں خالص معاشی اور اقتصادی نظام قائم کیا جا سکے؟

جواب۔ یقیناً ممکن ہے لیکن اُس کے لیے ہمیں محنت کرنا پڑے گی کیونکہ ہمارے ہاں ابھی ایسے عناصر ہیں جو صحیح معنوں میں اسلام کا معاشی نظام نہیں لانا چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے لیبل کے ساتھ اور اسلام کی آڑ لے کر موجودہ سرمایہ دارانہ جاگیردارانہ ڈھانچے کو اسلام کی کاسمیٹکس کے نام پر برقرار رکھا جائے اور اس طرح لوگوں کو بہلایا جائے۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب پچھلے دنوں قومی اخبارات میں ایک تحریک چلی تھی کہ اسلام میں جمہوریت کا کوئی تصور نہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب۔ میرے نزدیک اس ضمن میں جن لوگوں نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے دراصل وہ مارشل لا کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور انہوں نے کچھ دوسرے طبقات کے خوف سے کہ اگر پیپلز پارٹی یا بائیں بازو کے بعض دوسرے عناصر دوبارہ اقتدار

میں آتے ہیں تو شاید وہ اسلام کا نام ونشان تک مٹا دیں گے ایسا کیا ہے موجودہ آمنہ سالوں میں جو کچھ ہوا ہے انہوں نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے مارشل لاء حمایت کی ہے اور اب اسی کے تحت انہوں نے یہ فلسفہ ایجاد کیا ہے جو میرے نزدیک بالکل غلط ہے۔ اسلام کا نظام سیاست کیا ہے' اسلامی ریاست کا فلسفہ کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں بعض اختلافات رکھنے کے باوجود مولانا مودودی کے نظریے کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اُنھوں نے اسلامی ریاست کا ایک بالکل صحیح تصور پیش کیا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اصل جمہوریت سے اسلام کس اعتبار سے مختلف ہے کہ مغربی جمہوریت دراصل حاکمیت کا نام ہے اور اس میں حکمران کو قانون سازی کے لامحدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ جو چاہیں طے کر دیں۔ جس چیز کو چاہیں نافذ کریں اور جس قانون کو چاہیں معطل کر دیں۔ اور یہ تو یقیناً اسلام کے اعتبار سے بہت غلط ہے۔ اسلام کبھی اس قسم کی باتوں کی اجازت نہیں دے سکتا البتہ مولانا مودودی نے ایک بہت خوبصورت اصطلاح استعمال کی ہے کہ اسلام میں' پاپولر وائسری جینسی' ہے خلافت ہے لیکن خلافتِ عامہ ہے۔ یہ خلافت کسی ایک فرد یا کسی ایک خاندان کی جاگیر نہیں ہے بلکہ یہ خلافتِ عامہ ہے جسے کامن ویلتھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب اس خلافت میں جب' پاپولر وائسری جینسی' آئے گی تو اس میں لوگ اپنے خلیفہ کو منتخب کریں گے۔ یہاں جمہوریت کا عنصر اس کے اندر ہی انٹروڈیوس ہو جاتا ہے مگر میں جب اپنے

زمیندار کون ہے؟ اسلام میں زمین کی ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہے

نزدیک ایک اسلامی ریاست کا تصور قائم کرتا ہوں تو یہ میرے نزدیک جدید دَور کی اسلامی ریاست اور ہر اعتبار سے جدید ترین اور ترقی یافتہ جمہوریت ہوگی ماسوائے اس کے کہ اُس میں جمہور کا قانون سازی کا حق محدود ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون وضع نہ کیا جائے۔ یہ بات ہمارے پاکستان کے ہر دستوری خاکے میں ضرور موجود رہی ہے بشرطیکہ اس کو سو فیصد کی قابلِ عمل بنا دیا جائے اور سپریم کورٹ کو اس بات کا اختیار مل جائے کہ وہ اس کی بنیاد پر جو بھی رٹ چاہے سماعت کے منظور کرے اور اس کے بارے میں فیصلہ دے کہ کوئی شخص موجودہ قانون یا کوئی بل جو کہ ابھی پارلیمنٹ میں زیرِ بحث ہے اس کے بارے میں جو چاہے سپریم کورٹ میں جا کر رٹ دائر کر دے۔ لہٰذا جب آئین میں یہ شق موجود ہوگی جس کے تحت کوئی بھی شخص عدالتِ عالیہ کی گھنٹی کھٹکھٹا سکے تو پھر وہاں جا کر علماء کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے دلائل دیں' ثبوت فراہم کریں کہ فلاں قانون یا شق قرآن وسنت کے منافی ہے باقی ہر اعتبار سے یہ جدید دور کی ترقی یافتہ ترین جمہوریت ہوگی۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب۔ پاکستان میں یہ جو اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے اس کے بارے میں ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ عملی طور پر یہ ممکن نہیں ہے اگر اسلامی نظامِ حکومت قائم ہوگا تو یہ کس نظریئے کے تابع ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں تو ہمارے علماء کسی مسئلے پر متفق ہی نہیں ہوتے؟

جواب۔ پاکستان میں معاملہ بہت آسان ہے بلکہ جتنا یہ ایران میں آسان ہوا ہے اتنا ہی پاکستان میں بھی آسان ہے ایران میں صورت یہ ہے کہ وہاں اکثریت شیعہ حضرات کی ہے وہ فقہ جعفریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سُنّی ہیں لیکن وہ اقلیت میں ہیں

امام حنیفہ کے نزدیک مزارعیت کی ہر شکل حرام مطلق ہے

لہٰذا انہوں نے فقہ جعفریہ کے تحت اپنا قانون بنالیا ہے۔ باقی سُنّیوں کو اُن کے پرسنل لاء کے تحت اجازت ہوگی کہ وہ جیسے چاہیں چلیں۔ یہی معاملہ پاکستان میں ہوگا۔ پاکستان میں فرقہ وارانہ اعتبار سے تو بہت زیادہ کشمکش ہے۔ بریلوی اور دیوبندی کے حوالے سے سارے جھگڑے ان ہی میں ہیں۔ لیکن دونوں کا فقہ ایک ہے یعنی دونوں حنفی ہیں۔ جہاں تک قانونِ سنّت کا تعلق ہے تو اُس کے مطابق ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس طرح پاکستان میں آبادی کی جو اکثریت ہے وہ حنفی بن جاتی ہے۔ باقی رہ گئے شیعہ تو وہ چند معاملات میں فقہ حنفی سے اختلافات رکھتے ہیں لہٰذا یہاں اگر کوئی مشکل ہوتی ہے تو شیعوں کے ساتھ بھی پاکستان میں وہی معاملہ کیا جائے جو ایران میں سُنّیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ معقول ہوگا۔ باقی رہ گیا یہاں پر اہلِ سنّت کا معاملہ تو بہتر صورت میرے نزدیک یہ ہے کہ صرف کتاب وسنّت ہی کو مدِنظر رکھا جائے۔

چونکہ سنّت میں معاملہ یہ ہے کہ فقہ جعفریہ کے سنّت کے ذرائع مختلف ہیں۔ اُن کی احادیث کی کتابیں مختلف ہیں۔ لیکن اہلِ حدیث کی اور حنفیوں کی سُنّت اور حدیث کی جو کتابیں ہیں وہ آپس میں تقریباً متفق ہیں وہ ہیں سے ریفرنس آنے کا دروازہ ہے لہٰذا ان دونوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب۔ یہاں فقہ جعفریہ کی بہت بڑی تحریک چل رہی ہے اور حکومت نے اُن کے بہت سے مطالبات تسلیم بھی کر لیے ہیں۔

جواب۔ تحریک چلانا اور بات ہے اگر ایک چھوٹی اقلیت اپنی تنظیم کے ذریعے کسی وقت آپ پر دباؤ ڈالے اور اُس وقت کی حکومت پر بھی وہ کسی طریقے سے اثر انداز ہو جائے تو یہ اور بات ہے لیکن ظاہر بات ہے وہ اقلیت ہیں۔ ہم سُنی اور شیعہ کو ایک فقہ میں نہیں لا سکتے کیونکہ سُنیوں اور شیعوں کی قرآن و حدیث کی کتابوں میں بہت فرق ہے۔ قرآن مجید میں بھی کچھ ہمیں شبہ ہے کہ ہمارے شیعہ بھائی اس پر پورا اعتماد کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ لیکن جب مسئلہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اسی قرآن کو مانتے ہیں۔ تو وہاں تک تو بات چل جائے گی۔ لہٰذا اس اعتبار سے جہاں تک جعفریہ فقہ کا تعلق ہے تو اُس کو ہمیں علیحدہ رکھنا پڑے گا۔ باقی رہے مالکی شافعی اور اہلِ حدیث وغیرہ تو اگرچہ یہ ہمارے ہاں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتے مگر ان کو ایک چھتری کے نیچے لایا جا سکتا ہے کہ کسی خاص فرقہ کا نام استعمال کیے بغیر کتاب و سنت کو استعمال کیا جائے۔ البتہ یہ بھی ہو سکتا ہے یہاں پر۔ چونکہ اہلِ حدیث کی تعداد

شیعوں کے ساتھ پاکستان میں وہی معاملہ کیا جائے جو ایران میں سنیوں کے ساتھ کیا گیا ہے

کم ہے لہٰذا یہاں پر بنیادی طور پر فقہ حنفی کو ہی اختیار کیا جائے۔ اصل میں جو چیز فیصلہ کن ہے تو وہ ہے ایک چیز یعنی ایک فرد کے مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی ذات میں ایک تو ارادہ پیدا ہو جائے کہ مجھے مسلمان جینا ہے اور مسلمان مرنا ہے۔ اسی طریقے سے کسی ملک یا کسی خطۂ زمین میں اسلامی نظام کے آنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کی آبادی اپنے اندر اسلام کی حمایت میں ایک جذبہ اور تحریک پیدا کرے اُس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ انتخابات کے ذریعے سے ثابت کریں لیکن میرے نزدیک یہ طریقہ درست نہیں ہے کیونکہ انتخابات صرف موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھیں گے۔ جہاں تک نظام کا تعلق ہے انتخاب سے بھی نظام تو نہیں بدلا کرتا جبکہ ہمارا اصل مسئلہ ہی نظام کا ہے۔ انتخابات تو صرف قوانین اور تعزیرات کو تبدیل کرتے ہیں لہٰذا دوسرا طریقہ ہے انقلابی عمل کا جس میں ایک عددی اعتبار سے اقلیتیں اپنے آپ کو اپنی تنظیم قربانی اور ایثار کے جذبے کو منظم کرتی ہیں۔ اور وہ یوں اس نظام کو بدل ڈالتی ہیں تو ہمارے ہاں تو یہ ہونا چاہیے کہ الیکشن کے ذریعے سے یا کسی انقلابی تحریک کے ذریعے سے اجتماعی سپرٹ پیدا ہو جائے۔ صرف اس صورت میں اسلام آئے گا انقلاب آئے گا اور پھر کبھی فرقہ وارانہ قسم کے اختلافات اس کے راستے میں نہیں آئیں گے۔

سوال۔ موجودہ طرز کا جو اقتصادی نظام جا رہا ہے اس میں زمینداری اور جاگیرداری نظام بہتر خطوط پر تبدیل کیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ یہ تو ایسا ہے کہ آپ لیبل بدل دیں گے مگر شراب نہیں بدلے گی اس لیے کہ ذہنیت نہیں بدلے گی۔ آپ کی سوسائٹی کا جو طاقت کا ڈھانچہ ہے وہ تبدیل نہیں ہوگا لیکن ایک انقلاب کے بعد ایسا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ سود کا ہے۔ ایک نقد قسم کا سود ہے اور ایک زمین کا سود ہے۔ جسے آپ زمینداری اور جاگیرداری سود بھی کہہ سکتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے ہاں سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہے جس پر ابھی سرے سے توجہ ہی نہیں دی گئی۔ اب اگر آپ صرف فقہ حنفی کے اعتبار سے لیں تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک مزارعت کی ہر شکل حرام مطلق ہے بعد میں امام صاحب کے دو شاگردوں نے کچھ شرائط لگا کر مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا لیکن خود امام ابو حنیفہ کے نزدیک وہ حرامِ مطلق ہیں کسی مرحلے پر مسلمانوں نے بزورِ شمشیر فتوحات کیں وہاں کی زمین انفرادی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اُمت کی اجتماعی ملکیت ہے اور اس پر جو کام کرنے والے ہیں ان کی حیثیت مزارعین کی سی ہے لیکن اُن سے خراج وصول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم خالص فقہ حنفیہ کی رو سے چلیں تو ایک عظیم انقلاب آ سکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ زمیندار کون ہے؟ اگر کاشتکار ہے تو وہ یقیناً کاشت کرے گا۔ جسے آپ موروثی مزارعت بھی کہتے ہیں۔ یعنی اس میں زمین کی ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہ ہوگا۔ اسلام کے حوالے سے

ہمارے بینک درحقیقت سود کی دلالی کرتے ہیں

تو یہ ہے کہ قمری حساب سے پاکستان میں چالیسواں سال شروع ہو چکا ہے۔ البتہ شمسی حساب سے ۳۹ برس پورے ہوتے ہیں مگر قمری حساب سے پاکستان کے چالیس برس پورے ہو چکے ہیں۔ لیکن اس مسئلے پر اس اعتبار سے اب تک کوئی معقول معاشی

یا اقتصادی ڈھانچہ نہیں بنایا گیا۔ کیا ضروری ہے کہ ہم بنک کو ایک لازمی جزو بنائیں جبکہ آپ کے پاس لمیٹڈ کمپنیاں ہیں جن کا اپنا ایک تصور ہے۔ جن سے لوگ لین دین کا کاروبار کرتے ہیں۔ لوگوں کے ان میں شیئرز ہیں۔ وہ کمپنی جو اچھا کاروبار کرتی ہے اور محنت سے اپنی ساکھ بناتی ہے اُس کے حصص بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جو اس کی اہل ثابت نہیں ہوتیں اُن کے حصص کم ہو جاتے ہیں۔ تو وہ جو ہمارے پاس موجود ہے اسی انویسٹمنٹ کے ذریعے سے آپ بڑی سے بڑی انڈسٹری لگا سکتے ہیں اس طرح جو ایک مضاربت کا اصول ہے اس کے تحت کمپنیاں خود بخود چلیں گی۔ کیا ضروری ہے کہ سود کی بنیاد پر پہلے معاشرے کے اندر سے روپیہ اکٹھا کریں اور پھر اس روپے کو جمع کر کے سود کے تحت آگے آپ کمپنیوں کو دیں۔ اس طرح تو ایک اور ادارہ اس کام میں ملوث ہو گیا۔ بنک دراصل سُود کی دلالی کرتا ہے۔ وہ کم ریٹ پر لوگوں سے سیونگ بنک میں روپیہ جمع کرواتا ہے اور پھر اُسے زیادہ ریٹ پر کام کرنے والوں کو دیتا ہے۔ یہ دراصل دلالی ہے کمیشن کی جس میں سُود دو طرح کا ہوتا ہے۔

سوال۔ مگر ڈاکٹر صاحب باقی دنیا میں بھی تو ایسا ہی نظام ہے ؟

جواب۔ دیکھئے دنیا مدِنظر رکھتی ہے اپنے اصولوں اور مفادات کو۔ کوئی بھی ہماری مصلحتوں کو نہیں دیکھے گا۔ کیا کمیونسٹ ممالک ہماری پالیسی کے تابع ہو سکتے ہیں ؟ مگر ہماری زیادہ سے زیادہ تجارت بھی بیرونی ممالک کے ساتھ ہوتی ہے۔ اچھا ہے کہ ہم اس لعنت سے بچیں کیونکہ ہمارے اوپر لوگوں کے حقوق کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنے اندرونی ذرائع پر زور دینا ہوگا اور اس وقت جو مصنوعی خوش حالی قائم ہوگئی ہے اس سے لوگ بچ جائیں گے۔ اس سے آدمی اپنی چادر کے اندر رہ کر پاؤں پسارے گا۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب یہ پاکستان میں جو سیاسی اتحاد یا سیاسی اشتراک ہوا ہے آپ اسے کیا نام دیں گے ؟ یہ خالص سوشلسٹ ہے یا جمہوری ؟ میرا اشارہ ایم آر ڈی کی طرف ہے کیونکہ اُس میں دو بڑی سوشلسٹ پارٹیاں موجود ہیں کیا اُن کی موجودگی میں مذہبی جماعتیں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں گی ؟

جواب۔ میں اس کا جواب آپ کو عمومی شکل میں دوں گا۔ آپ ایم آر ڈی کی مثال کو ذہن سے نکال دیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا جو اسلامی انقلابی تحریک ہے اس کیلئے اس قسم کے اتحاد سرے سے غلط ہیں اور اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہیں۔ البتہ جو سیاسی پارٹیاں ہوں گی۔ سیاست میں جیسی بھی صورت ہے وہ اصل شے ہوتی ہے جو اُن کی پالیسی کو بناتی ہے ـــــ سیاست میں ہمیشہ یہی چلتا ہے کہ اس وقت کس پوزیشن کو اختیار کر کے اپنی پالیسی اور لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ اب تک ہمارے ہاں جو سیاسی اتحاد قائم ہوئے وہ بھی اسی بنیاد پر وجود میں آئے تھے۔ ایک زمانے میں یہ کہا گیا تھا کہ صدر ایوب تمام بُرائیوں کی جڑ ہیں وہ ہٹ جائیں گے تو معاملہ درست ہو جائے گا۔ لہٰذا اُن کو ہٹانے کے لیے مختلف قسم کے اتحادات وجود میں آئے۔ میں اس کو بھی غلط سمجھتا ہوں۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اگرچہ اُس تحریک میں بعض اسلامی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ اُس کے بعد سب لوگوں نے یہ سمجھا کہ بھٹو غاصب ہے اسے ہٹاؤ۔ لہٰذا ہمارے لیڈر محض بھٹو کو ہٹانے کے لیے ایک محاذ پر متحد ہوئے کہ پہلے اسے ہٹاؤ پھر آپس میں بھی دیکھ لیں گے۔ جیسے کہ برصغیر کے نیشنلسٹ علماء کا خیال تھا کہ آزادی کے لیے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد دوسرے مسائل حل کر لیں گے۔ یہ رویہ سیاست کے اندر ہمیشہ رہتا ہے اور یہی رویہ ہمارے ہاں ایوب خان اور بھٹو کے خلاف تحریکوں میں بھی موجود رہا۔ اب یہی چیز اینٹی مارشل لاء ہے کہ پہلے اسے ہٹاؤ۔ اس سلسلے میں ان کے پاس دلائل بھی موجود ہیں کہ مارشل لاء اس ملک کو ختم کر دے گا۔ توڑ کر رکھ دے گا۔ اس کے اندر صوبوں کا احساسِ محرومی بڑھتا جائے گا۔ یہی وہ رویہ ہے جس نے مشرقی پاکستان کو ہم سے علیحدہ کیا۔ یہی رویہ سندھ میں تعصبات کی تحریکیں پیدا کر چکا ہے۔ ایسا دوبارہ ہوا تو پاکستان اس کا متحمل نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس وقت مل جل کر پہلے مارشل لاء ختم کریں پھر آپس میں نپٹیں گے۔

اسلامی انقلاب نہ آیا تو خدانخواستہ پاکستان قائم نہ رہ سکے گا

سوال۔ ڈاکٹر صاحب کیا بہتر نہ ہوتا اگر اسلامی جماعتیں اپنے نظریات کی بنیاد پر متحد ہوتیں۔ اس طرح ایک متحدہ محاذ بنا کر وہ غلط قسم کے نظامِ حکومت کو درست کرانے میں بھی کامیاب ہو جاتیں ؟

جواب۔ اگر یہ ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا لیکن نہ یہ ہوا اور نہ اس کی توقع ہے جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے لہٰذا اگر کسی مذہبی جماعت نے ایم آر ڈی کے ساتھ اشتراک کیا ہے تو وہ بھی اسی ملنے کی بنیاد پر ہے اور اگر کسی مذہبی جماعت نے صدر ضیاء الحق کو سپورٹ کیا تو وہ بھی اُسی بدترین بنیاد پر ہے لیکن اگر کوئی ایسی تحریک چل پڑی کہ روس یا بھارت نے پاکستان کو


کارمینا
Carmina
کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے

افکار و آراء

بقائے امت کا راز

اہل علم تو بخوبی جانتے ہیں کہ تقلید ائمہ کی حیثیت شریعت میں کیا ہے۔ ضرورت ان کم علم حضرات کو سمجھانے کی ہے جو تقلید میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ اپنے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہ کے لوگوں کو گمراہ، بے دین اور اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ یا علمائے سلف کی آراء، اجتہاد اور تحقیق ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگوں پر یہ حقیقت واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ آپ جس امام، مجتہد پر اعتماد کریں، اس کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں اور اس کی پیروی کریں مگر یہ سمجھ کر کہ آپ کی یہ پیروی دراصل اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کے لئے ہے نہ یہ کہ خود ائمہ کی۔ تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یہ سب مومن ہیں مسلمان ہیں اور ان کے درمیان کوئی کدورت، بغض و عناد نہیں ہے۔ عبادات و معاملات میں تحقیق، تعبیر اور تشریح سے، اصولِ شریعت سے جزئیات میں استنباط کرنے سے وہ خود آمر و ناہی نہیں بن گئے نہ ہی مطاع و متبوع۔ اگر یہ اصل ہمارے محترم مسلمان رہنما سمجھ لیں اور اپنے حلقہ اثر میں عوام کو یہ بات سمجھا دیں تو مسلمان بھائیوں کے درمیان تمام جھگڑے ختم۔ جھگڑے تو حق کو اپنے ہی فرقے میں محدود کر دینے سے شروع ہوتے ہیں اور اسی پر مذہب و مسلک کی بنیادیں رکھ دینے سے دلوں میں دوری اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ نمازیں علیحدہ، شادی بیاہ ممنوع اور میل جول ختم ہو جاتا ہے۔ مسجدیں علیحدہ ہو جاتی ہیں، تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں اور مسجدوں پر مسلکوں کی چھاپیں لگ جاتی ہیں اور قبضے کے لئے مقدمے اور ڈنڈے چلنے لگ جاتے ہیں اسی بے بنیاد اور لایعنی تشدد نے بیت اللہ میں چار چار مصلے بچھوائے، ایک اللہ کے گھر میں، ایک ملت سے، ایک وقت میں چار اماموں کے پیچھے نمازیں ادا کرائیں، ایک حنفی امام، ایک شافعی امام، ایک مالکی امام اور ایک حنبلی امام۔ کیسی بدنصیبی اور کوتاہ اندیشی تھی کہ اللہ کے بندوں کو ایک ساتھ تکبیر کہنے، ایک ساتھ قیام، رکوع اور سجدہ کرنے سے روک دیا۔ سوچیں کہ اگر یہ ائمہ بزرگ ایک ہی وقت میں بیت اللہ میں جمع ہوتے تو وہ کیا ایسے ہی علیحدہ علیحدہ نمازیں پڑھتے۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں وہ ایسا ہرگز نہ کرتے

کرتے اُن کے تو حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ فقہی و جزوی مسائل کے حل سے پوری امت مسلمہ یوں فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کی تحقیر، تکفیر اور تذلیل کرے گی۔ خدا شاہ سعود فیصل بن عبدالعزیز کو اس بابرکت عمل پر جنت الفردوس میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمائے کہ انہوں نے افتراق و انتشار کی اس بساط ہی کو لپیٹ دیا اور صرف ایک مصلّٰی باقی رکھا۔ آج اسی عمل کی بدولت خانۂ خدا یعنی کعبۃ اللہ میں ایک ہی امام کے پیچھے پوری امت مسلمہ نمازیں ادا کرتی ہے۔

اثنا عشری ۱۲ اماموں کے تعلق سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مامور من اللہ تھے تو لازمی نہیں ہے کہ اہل سنت بھی اپنا یہ عقیدہ بنالیں کہ ائمہ اربعہ مامور من اللہ تھے اور اُن کی اطاعت کرنا ضروری ہے ورنہ اسلام اور ایمان نامکمل رہ جاتا ہے۔ اگر اہل سنت بھی اپنا یہ عقیدہ بنالیں تو پہلی صدی ہجری کے وہ مسلمان جو ان ائمہ کی پیدائش سے پہلے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری میں جانیں کھپا گئے وہ کیا تھے۔ کیا وہ مسلک نبوی کے پیروکاروں کے علاوہ کچھ اور بھی تھے یعنی کہ حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی وغیرہ وغیرہ۔ اگر نہیں تو سیدھی بات یہ ہے کہ مسلمان تھے اور بس۔ یہی اُن کا دین، یہی مذہب اور یہی مسلک تھا۔

پاکستان کے قیام سے پہلے تو بات صرف ائمہ اربعہ اور اُن کے مسلکوں ہی کی تھی لیکن وہ تشدد کہیں دیکھنے میں نہیں آیا تھا جو اس پُرآشوب دور میں خود احناف ہی میں مزید مسلکوں کی تقسیم سے دیکھنے میں آیا ہے۔ یعنی مسلک دیوبندی و مسلک بریلوی۔ اِن مسلکوں کی تقسیم در تقسیم نے تو وہ کمال دکھا دیا ہے کہ ایک غیر مسلم کو یورپ، امریکہ یا افریقہ میں اسلام کو سمجھنے کے لئے پہلے مذہب یا دین کو نہیں بلکہ مسلک کو اپنانا پھر تحقیق و جستجو میں اپنی عمر کا قیمتی سرمایہ صرف کر کے اس نتیجہ تک پہنچنا کہ وہ ایک مسلک کو اپنائے تو دوسرے مسلک کے واسطے قابل گردن زدنی مشرک اور کافر اور دوسرے کو گلے سے لگائے تو پہلے کے نزدیک گمراہ، بے دین، منافق اور گستاخ ٹھہرے۔ وہ سوچے گا کہ یا اللہ یہ کیسا دین ہے جس کے ماننے والوں کو اُن کی مقدس کتاب میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور ہرگز ہرگز تفرقوں میں نہ پڑو۔ ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تم تباہ ہو جاؤ گے مگر ان کے علماء ایک گروہ کے ساتھ دوسرے گروہ پر حملہ کرتے ہیں اور اسے بڑے ثواب کا کام تصور کرتے ہیں۔ وہ اُس وقت اور متحیر ہوگا جب مسجدوں کے

ں سے اللہ کے حضور دعا کرنے والے یہ دعا بھی کریں گے کہ اے اللہ مسلمانوں
محبت و اتفاق دے جبکہ ابھی چند لمحوں قبل ہی اسی ممبر سے یہ تقاریر بھی اس
ذہن میں گردش کر رہی ہونگی کہ فلاں گروہ مشرک، فلاں کافر، فلاں گمراہ
ایسا ویسا ہے !

" زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں "

پوری دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو مسلمانوں کے درمیان اس قسم کی
وہ بندیوں سے نالاں ہیں۔ مگر وہ اس قدر بے بس، بے اثر اور بے آواز ہیں
ن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ انفرادی کوششوں سے یہ فرقہ بندیاں کم نہیں ہو
سکتیں۔ انہیں منظم ہو کر ان کے خلاف جدوجہد کرنا ہوگی اور اُن علماء کرام کو
ساتھ لینا ہوگا بلکہ انہی کی رہنمائی میں یہ کام کرنا ہوگا جو اس صورت حال سے
پریشان ہیں اور اس کے مضر اثرات سے اسلام، مسلمان اور دنیائے انسانیت
بچانا چاہتے ہیں۔ ہر چند کہ کام بڑا کٹھن اور صبر آزما کام ہے جس کے لئے اُمت
مسلمہ کا درد رکھنے والے صاحب علم و عمل علماء ہی کو پیش قدمی کرنا ہوگا۔ تنگ نظر،
علم قدم قدم پر رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کریں گے کیونکہ اتحاد بین المسلمین
ن کے مفادات کے خلاف ہے مگر حکومت اور وہ عوامی سیاسی جماعتیں جن کی
بنیاد اسلام کا نظامِ حیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا
ان قیام ہے تعاون کریں تو یہ بہت آسان بھی ہے۔ نظامِ مصطفےٰ اُس وقت
ب نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کے ماننے والے یا مدعی اُس کے نفاذ
یں مخلص نہ ہوں اور ایک قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی اُس معاشرہ میں موجود
ہو جن پر یہ نظام نافذ کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اسلام سے اخلاص کا منہ بولتا ثبوت
جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماءِ پاکستان اور جماعتِ اسلامی وغیرھا اپنے
اپنے پلیٹ فارموں سے اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ دیوبند اور بریلی کی زبان میں
بات کرنے کے بجائے مکہ اور مدینہ کی زبان میں بات کریں۔ اور مسالک پر لوگوں
کو اکٹھا کرنے کے بجائے دینِ اسلام پر جمع کریں جس میں سکڑنے کی نہیں پھیلنے
کی صلاحیت ہے، جمود کی نہیں تحریک کی قوت ہے اور اسی میں اُمتِ مسلمہ
کی بقا کا راز مضمر ہے !

محمد صدیق خان

میثاق

لاہور

ماہنامہ

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

واذکروا نعمة الله علیکم ومیثاقه الذی واثقکم به اذ قلتم سمعنا واطعنا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳۴

شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۸۵ء

مطابق

صفر المظفر ۱۴۰۶ھ

زرِ سالانہ ۳۰ روپے

فی شمارہ ۳/- روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون [illegible]

سب آفس: ۱۱ - داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی، فون ۲۱۶۵۸۶

مشمولات

دوران سال ۸۶-۱۹۸۵ء

تنظیمِ اسلامی پاکستان کا علاقائی اجتماع

اِن شآء اللہ العزیز

۸ تا ۱۰ر نومبر ۸۵ء: حیدر آباد (سندھ)

میں منعقد ہوگا ——— جس میں ——— امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد کے تین عمومی خطاب ہونگے:

(۱)

جمعہ ۸ر نومبر کو قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد قبا، حیدر آباد میں

عنوان:

"حکمت و احکام جمعہ"

(۲)

جمعہ ۸ر نومبر کو بعد نماز عشاء، ہوم اسٹیڈ ہال نزد گاڑی کھاتہ میں

عنوان:

"پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا اور کیوں؟"

(ورق الٹیے)

ہفتہ ۹ نومبر کو بعد نماز عشاء، جامع مسجد دار العلوم لطیف آباد میں

عنوان: "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیسے؟"

مزید برآں

۹ و ۱۰ نومبر ۸۵ء بروز ہفتہ و اتوار

حیدرآباد کاٹن اینڈ آئل ملز اولڈ پاور ہاؤس روڈ میں

صبح ساڑھے آٹھ تا ایک بجے دوپہر

تربیتی پروگرام

جاری رہے گا جس میں

نائب امیر تنظیم اسلامی میاں محمد نعیم، قیم تنظیم چوہدری غلام محمد،

اسد الرحمٰن فاروقی (کراچی) اور ضمیر اختر صاحب (کراچی) مختلف تنظیمی و تربیتی موضوعات پر درس دینگے۔

المعلن: عبد القادر امیر تنظیم اسلامی حیدر آباد

(فون: ۳۴۲۰۴ - ۳۴۲۳۵ - ۲۴۸۳۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

الحمدللہ والمنۃ 'میثاق' کا شمارہ بابت نومبر ۸۵ مطابق صفر المظفر ۱۴۰۶ھ ہدیۂ ناظرین ہے — رب کریم کا فضل ہے کہ ماہنامہ 'میثاق' معنوی اور صوری اعتبارات سے مسلسل ترقی پذیر ہے اور محترم مولانا سعید الرحمٰن صاحب کی ادارۂ تحریر میں شمولیت نے اس معاملے میں گویا مہمیز کا کام دیا ہے۔ نیز گذشتہ دو شماروں میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ امیر تنظیم اسلامی کے قلم سے لکھی ہوئی دو اہم تحریریں "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان کے تحت شائع ہوئی ہیں۔ توقع ہے کہ اب جبکہ موصوف کے قلم کی گرہ کھل گئی ہے تو ان شاء اللہ آئندہ بھی ان کی تازہ ترین تحریریں شامل ہوتی رہیں گی اور قارئین کرام ان سے مستفید ہوں گے۔

گذشتہ شمارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ 'میثاق' جنوری تا مئی ۶۹ کے اداریوں کے چند اقتباسات ہدیۂ قارئین کئے گئے تھے اور اس ارادہ کا اظہار بھی کیا گیا تھا کہ بعض اہم چیزیں جو جولائی ۶۹ء، دسمبر ۷۱ء اور جنوری/فروری ۷۲ء میں موصوف کے قلم سے نکل کر "میثاق" میں شائع ہوئی تھیں اس خط کے ساتھ جو دسمبر ۸۲ء میں جناب صدر مملکت کو ارسال کیا گیا تھا، آئندہ شمارے میں شامل کی جائیں گی۔ چنانچہ یہ تمام چیزیں زیر نظر شمارہ میں قارئین کرام کے مطالعہ سے گزریں گی۔ توقع ہے کہ وہ ان تحریرات کو دلچسپ اور مفید بھی پائیں گے اور اس طرح ماضی کے آئینے میں ع "آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ" کے مصداق ان کیفیات کو محسوس بھی کریں گے۔

امیر محترم کی پاکستان میں دعوتی مصروفیات کا وہی عالم ہے جو تقریباً چودہ پندرہ سال سے چل رہا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مہینہ ہوتا ہو جس میں موصوف کا ہفتہ میں دو روز سے زیادہ لاہور میں قیام رہتا ہو — اب نومبر و دسمبر میں بیرونِ پاکستان کے دو دورے طے ہو چکے ہیں۔ پہلا دورہ قریباً پندرہ دن کا بھارت بالخصوص حیدر آباد دکن کا ہوگا اور دوسرا دورہ ۱۰ تا ۲۰ دسمبر ۸۵ء ابوظہبی اور شاید متحدہ عرب امارات میں سے ایک دو مزید ممالک کا ہوگا — دوسری جانب قارئین میثاق کے علم میں ہے کہ ماہِ رمضان المبارک کے بعد سے امیر محترم کی صحت مسلسل خراب چل رہی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ موصوف کی مصروفیات کے باعث لاہور یا پاکستان کے کسی اور شہر میں آرام ملنا خاصا دشوار نظر آ رہا تھا چنانچہ چند احباب کے مشورہ پر امیر محترم نے عمرہ اور چند روز بغرض آرام طائف میں قیام کا ارادہ کیا۔ اگرچہ

آج کل سعودی عرب کے لئے VISIT VISA کا حصول ایک نہایت مشکل امر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور ایسی شکل پیدا فرمادی کہ ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر امیر محترم کو VISIT VISA مل گیا۔ چنانچہ موصوف ۱۱ اکتوبر کو بعد نمازِ فجر اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ بغرض عمرہ عازم سفر ہوئے۔ عمرہ سے فارغ ہوکر وہ طائف تشریف لے جائیں گے جہاں ایک عشرہ سے زیادہ ایک رفیق کے مکان پر قیام رہے گا۔ ان شاء اللہ وہاں سے حرم نبوی علیٰ صاحب الصلوٰۃ و السلام کی زیارت سے شادکام و مشرف ہوتے ہوئے ان کی ۳۱ اکتوبر کو لاہور مراجعت ہوگی۔ اور موصوف یکم نومبر بروز جمعہ حسب دستور مسجد دارالسلام لاہور کے پروگرام نیز بعد مغرب واپڈا آڈیٹوریم میں "شام الہدیٰ" کے پروگرام کو سرانجام دیں گے ـــ قارئین کرام سے عرض ہے کہ وہ ان کی صحت کے لئے دعا کو اپنے معمولات میں شامل فرمائیں۔ اور حرمین شریف سے ان کی مراجعت صحت کاملہ اور ایک نئے ولولہ و جوشِ ایمانی کے ساتھ ہو۔

امسال تنظیمِ اسلامی کی مجلسِ مشاورت نے پہلی بار پانچ علاقائی اجتماعات کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و نصرت سے تین علاقائی اجتماعات ـــ (i) راولپنڈی/اسلام آباد (ii) کوئٹہ اور (iii) پشاور میں منعقد ہوچکے ہیں۔ الحمد للہ تینوں اجتماعات انتظامات اور توسیع دعوت کے نقطۂ نظر سے بہت کامیاب رہے۔ اب چوتھا علاقائی اجتماع ۸ تا ۱۰ نومبر ۸۵ء حیدرآباد (سندھ) میں منعقد ہورہا ہے جس کا مفصل پروگرام اسی شمارہ میں شامل ہے۔ توقع ہے کہ صوبہ سندھ کے تمام رفقاءِ تنظیم اس اجتماع میں شرکت کی بھرپور کوشش کریں گے اور کوئی رفیق بھی واقعی عذرِ شرعی کے بغیر اس اجتماع سے غیر حاضر نہیں رہے گا ـــ رفقاء کے علاوہ جو حضرات تنظیم اسلامی کی دعوت اور اس کے کام کو قریب سے دیکھنا چاہیں ان کو بھی اس اجتماع میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ایسے حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنے ارادہ اور حیدرآباد تشریف آوری کے پروگرام سے جلد از جلد امیر تنظیم اسلامی حیدرآباد کو بذریعہ خط یا فون مطلع فرمادیں ـــ ان شاء اللہ العزیز پانچواں اور آخری علاقائی اجتماع ملتان میں فروری ۸۶ء میں منعقد ہوگا۔ جس کی تاریخوں اور مقام کا اعلان "میثاق" جنوری ۸۶ء کے شمارے میں کردیا جائے گا۔

شامِ الھدیٰ کراچی کے ماہانہ انعقاد کا آغاز اکتوبر ۸۴ء سے ہوا تھا۔ الحمد للہ ستمبر ۸۵ء کو اس سلسلہ کا ایک سال مکمل ہوگیا ہے۔ اس دوران شامِ الہدیٰ کی ماہانہ حساب سے تو دس نشستیں منعقد ہوئیں چونکہ دسمبر ۸۴ء اور جون ۸۵ء میں ایک مجبوری اور رمضان المبارک کی وجہ سے دو نشستوں کا انعقاد نہ ہوسکا۔ لیکن تعداد کے لحاظ سے پوری بارہ نشستیں منعقد ہوچکی ہیں۔ چونکہ جنوری ۸۵ء میں مسلسل تین نشستوں کا انعقاد ہوا تھا۔ تاج محل ہوٹل کی انتظامیہ کا شکریہ ہم پر واجب ہے کہ انہوں

نے اس مقصد کے لئے موتی محل آڈیٹوریم کو بلامعاوضہ استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے جبکہ اس آڈیٹوریم کا ایک تقریب کے استعمال کے لئے پندرہ ہزار روپے معاوضہ مقرر ہے۔

فاران کلب کراچی تبلیغ دین کا ایک معروف ادارہ ہے۔ ستمبر کی شام الھدیٰ منعقدہ ۳۰ ستمبر ۸۵ء کے متصلاً بعد یکم اکتوبر ۸۵ء کو اس کلب کی طرف سے موتی محل آڈیٹوریم تاج محل ہوٹل میں ایک محفل کا جناب جسٹس عبادت یار خاں صاحب جسٹس سندھ ہائی کورٹ کی صدارت میں بعد نماز مغرب انعقاد ہوا جس کے مہمان مقرر محترم ڈاکٹر صاحب تھے اور خطاب کا موضوع تھا "عقیدۂ توحید کے عملی تقاضے"۔ اس محفل میں بھی شرکاء کی تشریف آوری کا عالم قریباً وہی تھا جو "شام الھدیٰ" کا ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام نشستوں کے پُر ہونے کے بعد کثیر تعداد میں شرکاء کو اسٹیج پر اور اسٹیج اور نشستوں کے درمیان خالی جگہ پر فرش پر بیٹھنا پڑا۔ الحمد للہ فاران کلب کا یہ اجتماع بہت کامیاب رہا۔ امیر محترم کی قریباً ڈھائی گھنٹہ کی تقریر کو حاضرین نے پورے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ سماعت فرمایا اور اس سے اثر قبول کیا۔ ہم منتظمین فاران کلب کی خدمت میں اس مبارک اور عظیم اجتماع کے انعقاد پر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔

اس دورے میں امیر محترم نے ۲ اکتوبر ۸۵ء کو بعد نماز عشاء شمالی ناظم آباد بلاک جے کی جامع مسجد "مسجد بطحا" میں "اسلامی انقلاب کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟" کے موضوع پر نہایت مفصل مدلل اور مؤثر خطاب ارشاد فرمایا۔ ان سطور کے عاجز راقم کا ارادہ ہے کہ جلد ہی اس خطاب کو کیسٹ سے منتقل کرلے تاکہ اس کی میثاق میں یا کتابی شکل میں اشاعت کا اہتمام ہوسکے۔ اللہ تعالیٰ سے اس کام میں توفیق اور نصرت کی دعا ہے: وما ذالک علی اللہ بعزیز!

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور سے ان کے انتقال سے قریباً ایک ماہ قبل ۲۲ اپریل ۱۹۸۵ء کو ان کے اور امیر محترم کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی ریکارڈنگ کے وقت بھی یہ عاجز موجود تھا اور اسی نے اُسے کیسٹ سے مِن و عَن منتقل کرکے 'میثاق' کے اگست ۸۵ء کے شمارے میں "چند باتیں ــــ چند یادیں" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ مولانا مرحوم نے اس گفتگو میں تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں جناب مولانا منظور نعمانی دامت برکاتہم اور جناب مولانا ابوالحسن علی میاں زید مجدہم کی کتاب "کاروانِ زندگی" کے حوالے سے کچھ باتیں ارشاد فرمائی تھیں۔ مولانا نعمانی مدظلہ نے اپنے مکتوب میں مولانا اکبر آبادی مرحوم کی ذات کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں تردید فرمادی کہ مرحوم نے ان سے جو باتیں منسوب کی ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ کتنا پیارا انداز ہے مولانا نعمانی مدظلہٗ رقم طراز ہیں کہ:

بعض حضرات کے متعلق میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک بات ان کے ذہن و خیال میں ہوتی ہے

پھر وہ ایک واقعہ کی طرح ان کے ذہن میں مرتسم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اس کو واقعہ کے طور پر بیان فرما دیتے بلکہ لکھ بھی دیتے ہیں۔ میرا خیال (قیاس) ہے کہ .... کسی رسالہ کے بارے میں مجھ سے متعلق جو بیان فرمایا میں اپنے حافظہ پر پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی کوئی بات مولانا مرحوم کے اور میرے درمیان کبھی نہیں ہوئی۔ میں نے یہ بات میثاق میں پہلی دفعہ پڑھی ہے — میرا خیال ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا خیال فرمایا ہوگا اور پھر وہ واقعہ کے طور پر ان کے ذہن میں قائم ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح کی بات مولانا مرحوم کی کسی اور صاحب سے ہوئی ہو۔ واللہ اعلم!" (مکتوب مولانا نعمانی۔ شائع شدہ میثاق ستمبر ۸۵ء)

مولانا علی میاں مدظلہ کی کتاب "کاروانِ زندگی" کے حوالہ کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ پیش آیا۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم نے اس کتاب کے حوالہ سے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا، اس کے متعلق چند احباب نے اس عاجز سے زبانی فرمایا۔ بعض نے خطوط لکھے کہ مولانا مرحوم نے علی میاں مدظلہ کی اس کتاب سے منسوب کر کے جو کچھ فرمایا ایسی کوئی بات کتاب میں موجود نہیں ہے — اس عاجز نے ان آراء کی روشنی میں کتاب حاصل کی اور اس کو بالاستیعاب پڑھا۔ واقعہ یہی ہے کہ اس میں اس عاجز کو کوئی ایسی بات نہیں ملی — یقیناً اس معاملہ میں مولانا اکبر آبادی مرحوم و مغفور کو کوئی مغالطہ یا تسامح لاحق ہوا ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ایسی کوئی غلط بات کسی نے ان کو سنائی ہو اور عمر کے تقاضے اور پھر قریباً دو ماہ کی مسلسل علالت کے باعث مولانا مرحوم کے ذہن میں یہ بات مرتسم ہو گئی ہو کہ انہوں نے خود اس کو پڑھا ہے —— مولانا مرحوم کے متعلق ہرگز یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے مولانا نعمانی مدظلہ اور مولانا علی میاں مدظلہ سے یہ باتیں دانستہ منسوب کر کے فرمائی ہوں ———— اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنی رحمت سے مولانا مرحوم کی اس خطاء نسیان کو معاف فرمائے۔ تبلیغی جماعت کے ہمارے بھائیوں کو یقیناً اس سے ذہنی صدمہ ہوا ہوگا۔ ہم ان سے عفو و درگزر کے خواستگار ہیں اور ملتجی ہیں کہ وہ ہمارے اور مولانا اکبر آبادی مرحوم کے حق میں اس فروگذاشت پر بارگاہ رب الرحیم میں عفو و مغفرت کی دعا فرمائیں۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۔

عاجز

اسرار احمد عفی عنہ

۱۴ر اکتوبر ۸۵ء

حالاتِ حاضرہ پر ——

ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی کا

ایک مبسوط تبصرہ ——

قارئینِ "میثاق" کے علم میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ امیر محترم انگریزی ماہ کی ہر پہلی سوموار کو کمیونٹی سنٹر آبپارہ اسلام آباد میں درسِ قرآنِ حکیم اور خطابات کے لیے تشریف لے جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے امیر محترم ۷ر اکتوبر ۱۹۸۵ء اسلام آباد میں تشریف فرما تھے۔ موصوف کے راولپنڈی میں قیام سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے راولپنڈی یونین آف جرنلسٹس (نواز رضا گروپ) نے راولپنڈی پریس کلب میں "MEET THE PRESS" پروگرام میں امیر محترم کی شرکت کا اہتمام کیا اس پروگرام میں موصوف نے پہلے سے تیار شدہ بیان پڑھا اور صحافیوں کے سوالات کے جوابات دیے۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کے جملہ اخبارات نے اس پروگرام کی روئیداد شائع کی لیکن اختصار کے ساتھ، راولپنڈی سے باہر کے اخبارات میں امیر محترم کا بیان اور بھی مختصر شائع ہُوا۔ بلکہ بعض اخبارات نے تو محض حوالہ دینے پر ہی اکتفا کیا۔ اس اختصار در اختصار کی وجہ سے اس اہم بیان کے بعض نکات اُجاگر ہونے سے رہ گئے۔ بنا بریں بیان کا مکمل متن قارئینِ "میثاق" کے مطالعہ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے (ادارہ)

سب جانتے ہیں کہ میں معروف معنی میں سیاسی آدمی نہیں ہوں، بلکہ قرآنِ حکیم کا

ایک ادنیٰ طالب علم اور مدرّس و مبلّغ اور اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ تاہم پاکستان کے ایک شہری کی حیثیت سے بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وطنِ عزیز کے حال اور مستقبل کے بارے غور و فکر کروں اور اس کے ضمن میں جو رائے قائم ہو، اُس کا برملا اظہار و اعلان کروں۔ اور خاص طور پر دین کے خادم ہونے کے اعتبار سے تو میں اسے اپنا اوّلین اور اہم ترین فرض سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں اسلام کے مستقبل کو "زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر" بنانے کے لیے قولاً اور عملاً جو کچھ کر سکتا ہوں اُس سے دریغ نہ کروں۔

میرے نزدیک استحکامِ پاکستان کا دار و مدار دو امور پر ہے:

ایک یہ کہ اس میں اسلام کے فکری و اعتقادی، اخلاقی و عملی اور قانونی و فقہی نظام کو ایک حیاتیاتی وحدت (Organic whole) کی حیثیت سے رائج و نافذ کیا جائے۔ اور ـــــ دوسرے یہ کہ اس میں بسنے والوں میں یہ اعتماد اور ثرق پیدا کیا جائے کہ نہ صرف یہ کہ اُن کے جملہ سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق بحیثیت مجموعی محفوظ ہیں بلکہ اُن کے مابین ایک جانب علاقائی اور طبقاتی اور دوسری جانب تہذیبی، لسانی اور ثقافتی سطح پر عدل و انصاف کا معاملہ ہوگا ـــــ ان میں سے پہلی چیز کو ہم "نظریۂ پاکستان" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہی قیامِ پاکستان کی واحد وجہ جواز بھی ہے۔ اور استحکامِ پاکستان کی اصل اساس بھی! لیکن دوسرا معاملہ بھی ہرگز کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اصول تو دائمی اور مستقل ہے ہی کہ "ملک یا حکومت کفر کے ساتھ باقی رہ سکتے ہیں لیکن ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے۔" اور فی الوقت تو اس معاملے نے ملک کی بقاء و سالمیت کی شرطِ لازم کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس کے ضمن میں تین باتیں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ اسلام کی تعبیر کا حق کسی فردِ واحد کو حاصل ہے۔ نہ ہی یہ چند دانشوروں کو سونپا جا سکتا ہے بلکہ اس ضمن میں اُن علماءِ کرام کے متفق علیہ مؤقف کو اصل اساس کی حیثیت حاصل ہے جن پر دین کے معاملے میں اس ملک میں رہنے والوں کی عظیم اکثریت اعتماد کرتی ہے۔ اگر اس کے برعکس کوئی فردِ واحد طاقت کے بل پر اپنی من مانی

تعبیرات کو عوام پر ٹھونسنا شروع کر دے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ عوام کی خاموش اکثریت (Silent majority) کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کرے۔ لیکن بہر وہ محض خاموش تماشائی بن کر رہ جائے گی۔ نہ اُس کے دل و دماغ سے اِس "اسلامائزیشن" کی بھرپور تائید برآمد ہوگی، نہ اُس کے احساسات و جذبات میں مطلوبہ تحریک (Motivation) پیدا ہو سکے گی۔

دوسرے یہ کہ اسلام کے پورے انفرادی و عائلی، سماجی و معاشرتی، معاشی و اقتصادی، قانونی و دستوری اور سیاسی و حکومتی نظام کو ایک کُل کی حیثیت سے نافذ و لاگو کیا جائے اور نہ اُس کے مختلف اجزاء کے مابین تفریق و تقسیم کی جائے کہ یہ از روئے قرآن (سورۃ البقرہ: آیت نمبر ۸۵) ایک ناقابلِ معافی جرم ہے جس کی سزا بہت سخت ہے، نہ تنفیذ کے ضمن میں اپنے ذہن کی تراشیدہ ترجیحات کے تحت تدریج کے خوشنما عنوان سے تقدیم و تاخیر کی صورت اختیار کی جائے۔

تیسرے یہ کہ یہ مقصد صرف ایک انقلابی عمل کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے کسی سیاسی یا انتخابی عمل کے ذریعے نہیں، اس لیے کہ بہتر سے بہترین انتخابی عمل بھی پہلے سے قائم شدہ نظام کو بنیادی طور پر تبدیل نہیں کر سکتا بلکہ بنیادی طور پر STATUS QUO کو برقرار رکھتے ہوئے صرف جزوی اصلاحات کر سکتا ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے جو تنظیم "تنظیمِ اسلامی" کے نام سے قائم کی ہے اُس کی طے شدہ پالیسی یہ ہے کہ وہ وقتی سیاسی و انتخابی عمل سے کنارہ کش رہ کر اپنی ساری توانائیاں مطلوبہ اسلامی انقلاب کے اساسی تقاضوں (Pre-requisites) کی تکمیل کے لیے وقف رکھے گی! اور وقتی سیاسی مسائل پر اظہارِ رائے کی صورت میں صرف فکری رہنمائی فراہم کرنے کی بساط بھر کوشش کرے گی۔

البتہ جہاں تک استحکامِ پاکستان بلکہ پاکستان کے بقا کی دوسری شرطِ لازم کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے ضروری اور لازمی ہے کہ یہاں انتخابی اور سیاسی عمل کو بلا روک ٹوک جاری رکھا جائے۔ تاکہ ملک میں طبقاتی اور علاقائی سطح پر وہ محرومی کا احساس پیدا نہ ہونے پائے جو ملک کے بقاء و وجود کے لیے سمِ قاتل ہے۔ اس لیے کہ اگر خدانخواستہ یہاں کے عوام کو ایک طرف بحیثیتِ مجموعی اپنے سماجی، سیاسی

اور معاشی حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ ملی اور دوسری طرف مختلف علاقائی یا نسلی و لسانی قومیتوں کو عدل و انصاف کی اُمید نہ رہی تو خاکم بدہن یہ ملک ہی باقی نہ رہے گا ــــ پھر اسلام کہاں نافذ کیا جائے گا؟

اس پس منظر میں پاکستان کے دستور سے متعلق جو بحث اس وقت پارلیمنٹ کے اندر اور اس کے باہر ملک کے پورے طول و عرض میں جاری ہے، نہایت اہمیت کی حامل ہے، اس سلسلے میں بھی دو امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

ایک یہ کہ اسلام نے موجودہ دَور کے دستوری مسائل میں سے اکثر و بیشتر کے ضمن میں کوئی حتمی اور قطعی احکامات نہیں دیے ہیں" جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" کے دستور کو اسلامی بنانے کے لیے "قراردادِ مقاصد" کے ساتھ صرف اُس دفعہ کو صدفی صد واجب التنفیذ اور واجب التعمیل بنا دینا کافی ہے جو ہمارے تمام دساتیر میں رہنما اصول کی حیثیت حاصل رہی ہے جس کی رو سے کوئی بھی قانون سازی جو کتاب و سنت کے منافی ہو ممنوع قرار پاتی ہے ــــــــــــ اس کے سوا جملہ معاملات یعنی یہ کہ نظامِ مملکت وحدانی ہو یا وفاقی اور صدارتی ہو یا پارلیمانی، یا یہ کہ فیڈرل نظام اختیار کرنے کی صورت میں مرکز اور صوبوں کے حدود و اختیارات کا تعین کس طور سے ہو یا یہ کہ پارلیمانی نظام کی صورت میں صدر اور وزیر اعظم کے مابین اختیارات کا توازن کیا ہو ــــ تو یہ سارے امور قرآن کی اصطلاح میں "اَمْرُهُمْ" یعنی "لوگوں کا معاملہ" ہیں اور ان کے ضمن میں قرآن نے "شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کا اصول متعین کیا ہے یعنی ان امور کے ضمن میں لوگ خود باہمی مشورے سے جو چاہیں طے کر سکتے ہیں!

دوسری بات جو پہلی بات کا لازمی نتیجہ ہے، یہ ہے کہ ان معاملات میں کسی فردِ واحد کو اپنی مرضی یا فیصلے کو ٹھونسنے کا حق حاصل نہیں ہے ـ یہ عوام کا معاملہ ہے اور ان ہی کو حق حاصل ہے کہ اپنے نمائندوں کے ذریعے جو فیصلے مناسب سمجھیں کر لیں!

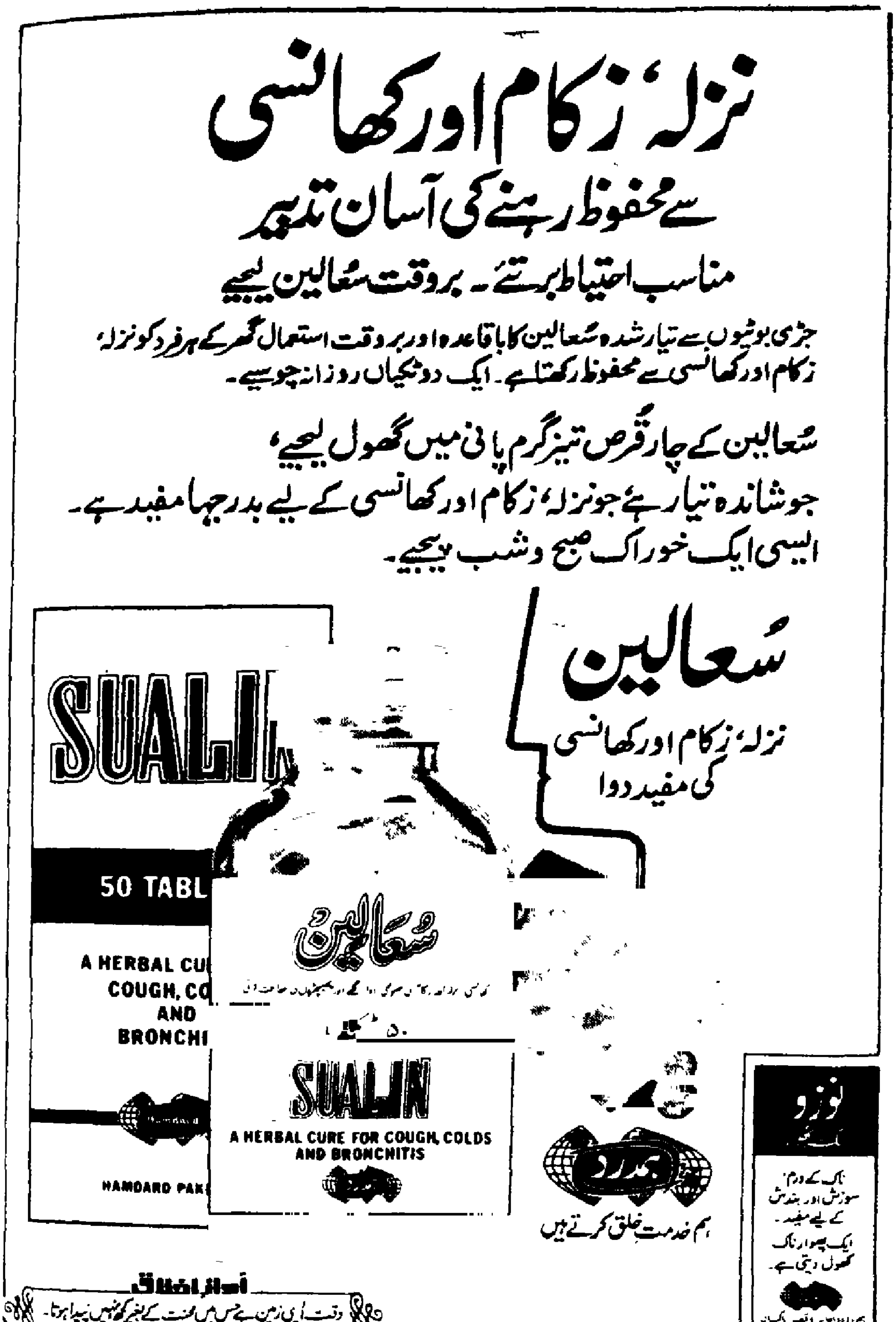
بنا بریں موجودہ صورتِ حال کا بہترین حل تو یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کو صرف اُس ایک ترمیم کے ساتھ جس کی رُو سے قادیانی غیر مسلم قرار دیئے گئے تھے بحال کر دیا جائے ـ اِس لیے کہ یہ دستور کامل اتفاقِ رائے (Consensus)

ے ساتھ عوام کے اُن نمائندوں نے بنایا تھا جو اُن انتخابات کے ذریعے منتخب ہوئے تھے جس میں کسی جماعت کے حصہ لینے پر پابندی نہ تھی اور جسے پوری دنیا میں منصفانہ اور غیر جانبدارانہ قرار دیا گیا تھا ـــ اور مذکورہ بالا ترمیم بھی دوسری ترامیم کے برعکس حزبِ اقتدار کی اپنی مصلحتوں کے بنا پر نہیں بلکہ شدید عوامی دباؤ کے تحت کی گئی تھی۔ اگر یہ کام موجودہ پارلیمنٹ کے ذریعے سرانجام پا جائے تو یہ اُس کا ملک و ملت پر ایک عظیم احسان ہوگا جسے آئندہ نسلیں تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ یاد رکھیں گی۔ اس صورت میں ضروری ہوگا کہ موجودہ پارلیمنٹ مارشل لا کے صرف ان اقدامات کو تحفظ دے کہ جن کا تعلق ماضی سے ہے اور جن پر عملدرآمد ہو چکا ہے رخصت کر دے اور ۱۹۷۳ء کے دستور کو مذکورہ بالا واحد ترمیم کے ساتھ بحال کر دے اور جلد از جلد اُس کے تحت نئے انتخابات کا انعقاد عمل میں لائے۔

اور اگر ایسا نہ ہوا تو واحد منطقی راہ یہ رہ جائے گی کہ دستوری مسائل کے حل کے لیے نیا انتخاب ہو اور ان کے نتیجے میں منتخب ہونے والی اسمبلی خواہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں ترمیم کرے خواہ از سرِ نو نیا دستور بنائے۔

یہ دوسرا راستہ، اس میں ہرگز کوئی شک نہیں، کہ نہایت مخدوش ہے لیکن ۱۹۷۳ء کے دستور کو چھیڑنے کی صورت میں اس کے سوا کوئی اور منطقی طریق کار باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے دسمبر ۱۹۸۲ء میں جو خط صدر ضیاء الحق صاحب کو لکھا تھا، اُس میں اُن کے "اسلامائزیشن" کے عمل سے اپنی کلی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اُن سے استدعا کی گئی تھی کہ اسلام کے نام پر انتخابی اور سیاسی عمل کو روکے رکھنے اور مارشل لاء کو طول دینے سے باز آجائیں ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل کا مؤرخ یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے موجودہ دنیا کی جو سب سے بڑی مسلمان مملکت قائم ہوئی تھی، اسے اوّلاً تو ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی لوٹے نے اور پھر اس کی مزید شکست و ریخت (Balkanisation) کا معاملہ سرانجام پایا ایک نمازی اور پرہیزگار انسان کے ہاتھوں! ساتھ ہی میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اگر آپ غیر جماعتی انتخاب ہی کا فیصلہ کیے ہوئے ہیں تو ان کا انعقاد تشکیل حکومت کے لیے نہ ہو بلکہ دستوری مسائل کے ضمن میں اختلافات کے حل کے لیے

بقیہ ص ۵۷ پر



Adarts SUA-2/84

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۳)

صبرِ محض سے اقدام تک (قسط ۱)

امیر تنظیمِ اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

سیرتِ مطہرہ میں اقدام کا مرحلہ کب آیا؟

ان تمہیدی باتوں کے بعد میں سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا وہ دور آپ حضرات کے سامنے لا رہا ہوں کہ جس میں یہ صبرِ محض (Passive Resistence) کا مرحلہ تبدیل ہوا راست اقدام (Active Resistence) کی شکل میں — اور میں یہاں یہ بھی گذارش کر دوں کہ چونکہ میرا احساس یہ ہے کہ سیرتِ مطہرہ کے اس مرحلہ اور اس دور پر تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے بلکہ انقلابِ محمدی کے منہجِ عملی کی تفہیم کے نقطۂ نظر سے تو اس جانب قطعاً توجہ نہیں دی گئی ۔ چنانچہ مجھے اس سلسلے میں ان دنوں میں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی قدیم و جدید کم و بیش چھ کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہے ۔ ایک نقشہ تو پہلے ہی سے ذہن میں تھا لیکن ظاہر بات ہے کہ تفصیل اور استدلال کے ساتھ اس بات کو آپ کے سامنے رکھنا تھا ۔ لہٰذا کتبِ سیرت کے بھرپور مطالعہ کے بعد یہ حقائق میں پیش کر رہا ہوں ۔

اصل میں یہ جو راست اقدام کا مرحلہ ہے یا بالفاظِ دیگر نظامِ باطل کو چیلنج کرنے کا جو مرحلہ ہے اس کے متعلق آپ پہلے ہی یہ بات جان لیجیے کہ اس کا تعلق ہجرت کے متصلاً بعد کے زمانے سے ہے بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرحلہ ہجرت کے متصلاً ساتھ ہی سے شروع ہو جاتا ہے ۔ جیسے ہی ہجرت ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو خیر باد فرما کر عازمِ طرفِ مدینہ ہوئے اسی لمحے یہ مرحلہ شروع ہو گیا ۔ اس مرحلہ کے لئے قرآن مجید کی جو متعلق آیات ہیں وہ سورہ حج کی ہیں ۔ میں بالکل ابتدا میں ان آیات کی تلاوت کر چکا ہوں ۔

فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُ ۙ
یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے قتال کا اذنِ عام ہوگیا کہ اب تک انہیں حکم تھا کہ ہاتھ بندھے رکھیں۔ اب ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے، انہیں بھی جنگ کی اجازت ہے۔ یہاں میں نے تلاوت کی ہے: اُذِنَ۔ ترجمہ ہوگا "اجازت دی گئی"۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ جو حضرات مزید دلچسپی رکھتے ہوں اور وہ تحقیقی مطالعہ کرنا چاہیں گے تو ان کے سامنے یہ باتیں آئیں گی۔ لہٰذا ان کی رہنمائی کے لئے عرض کردوں کہ اس آیتِ مبارکہ کی دو معروف قرأتیں ہیں جو اہلِ سنّت کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ ایک ہے:۔ اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ ــ دوسری ہے: اَذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتِلُوۡنَ ــ فرق یہ ہے کہ اُذِنَ کی جگہ اَذِنَ اور یُقٰتَلُوۡنَ کی بجائے یُقٰتِلُوۡنَ ہے ــ ہمارے یہاں یہ دو قرأتیں ہیں۔ ان دونوں کے اعتبار سے مراد میں فرق نہیں آئے گا۔ اوّل الذکر قرأت میں صیغہ مجہول ہے۔ ترجمہ یوں ہوگا "اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونس دی گئی ہے"۔ گویا اس میں اشارہ کیا جارہا ہے کہ قریش نے تو کوئی کمی نہیں کی۔ میں نے آپ حضرات کو بتایا تھا کہ جسمانی تشدّد کا سلسلہ سن چار نبوی سے شروع ہوچکا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم کو آٹھ نو برس ہوگئے ہیں مصائب و شدائد اور مشکلات و تکالیف کو جھیلتے ہوئے۔ قریش کی طرف سے کھلا کھلا ظلم ہورہا تھا ــ انہوں نے تو اہلِ ایمان پر جنگ ٹھونسی ہوئی تھی۔ لیکن اہلِ ایمان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ان کو جوابی کارروائی کرنے کی اجازت نہیں تھی مگر اب ان کے ہاتھ بھی کھولے جاتے ہیں۔ ان کو بھی اجازت ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ اَذِنَ اور یُقٰتِلُوۡنَ یعنی معروف کے صیغہ میں قرأت کی جائے تو ترجمہ ہوگا: "اللہ نے اجازت دے دی ہے اہلِ ایمان کو کہ جو جنگ کررہے ہیں (اللہ کی راہ میں)"۔ اس ترجمہ سے ایسا ظاہر ہوگا کہ شاید یہ آیت جنگ کے دور کے شروع ہونے کے بعد نازل ہوئی ہے ــ چنانچہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ ۲ھ کے ماہ صفر میں نازل ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اگر یُقٰتِلُوۡنَ پڑھیں گے تو مطلب ہوگا کہ گویا صحابہؓ کی طرف سے جنگ کا آغاز ہوچکا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توثیق کی جارہی ہے۔ اگر پہلا ترجمہ کریں گے تو گویا یہ پیشگی اجازت ہوگی بغیر صحابہ کے اقدام کے۔ یہاں یُقٰتَلُوۡنَ سے مراد ہوگا قریش کا وہ سارا رویہ جو ہجرت تک رہا۔ میرا ایک وجدانی خیال ہے وہ میں عرض کردیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ یہ آیات نازل ہوئی ہیں اثنائے سفرِ ہجرت میں۔ سفر میں کم از کم ۲۰ دن لگے ہیں اور ۱۲ ربیع الاوّل ۱ھ کو حضورؐ کا مدینہ منورہ میں ورودِ مسعود ہوا ہے۔ اس اعتبار سے ۱۲ ربیع الاوّل کی تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہی حضورؐ کی تاریخ وفات ہے۔

اب آیت کا اگلا حصہ دونوں ترجموں کے ساتھ کہ "چونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور یقیناً اللہ ان کی نصرت، مدد اور حمایت پر قادر ہے"

اسی آیت کے متصلاً بعد والی آیت میں فرمایا: اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ " یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے محض اس جرم اور قصور کی پاداش میں کہ وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا رب اللہ ہے" اس آیت مبارکہ کے بعد والے حصہ کا ترجمہ اور شرح وقت کی کمی کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں۔ یہ سورۂ حج کی چالیسویں آیت ہے۔ اس کا آپ خود مطالعہ کر لیجئے گا۔ اس سلسلۂ آیات کا اختتام ہوتا ہے اس عظیم آیت پر کہ:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکن و اقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے۔"

اس آیت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ مدینہ منورہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو جو تمکن فی الارض عطا کیا جانے والا تھا اور اس میں جو توسیع ہونے والی تھی تو یہ آیت گویا حزب اللہ اور اسلامی انقلاب کے منشور (Manifesto) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے آج کل کوئی سیاسی جماعت الیکشن میں حصہ لیتی ہے تو اپنا ایک منشور شائع کرتی ہے کہ اگر ہمیں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو ہم کیا کریں گے اور ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ یہاں یہ Divine Manifesto نبی اکرم اور آپ کے صحابہ کو دیا جا رہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ مفہوم ہوا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مدینہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ جہاں آپ کا داخلہ ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہوگا۔ تو آپ کے اور آپ کے صحابہ کے لئے یہ منشور ہے جسے رُو بعمل لایا جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ پس ہجرت کا واقعہ اور ہجرت کے ساتھ ہی ان آیات کا نزول یہ سب درحقیقت قرآن مجید میں وہ Land Marks جہاں سے صورت تبدیل ہو رہی ہے۔ اب تک صبر محض تھا۔ اب اس صبر کے ساتھ مصابرت بھی ہوگی۔ اب تک صبر

جہاد تھا اب جہاد کے ساتھ قتال بھی ہوگا۔ اب تک تم صرف جھیل رہے تھے، برداشت کر رہے تھے۔ اب تمہیں اجازت دی جا رہی ہے کہ تم جوابی کارروائی بھی کرو اور بدلہ بھی لو۔

اب میں سیرت کے وہ واقعات آپ حضرات کو سنانا چاہتا ہوں جو ہجرت کے بعد غزوۂ بدر سے قبل دو برس میں وقوع پذیر ہوئے۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ میں ۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۱ھ میں ورودِ مسعود ہوا۔ چھ مہینے تک تو حضورؐ نے نہ کوئی جوابی کارروائی فرمائی نہ مکہ کی طرف کوئی اقدام کیا۔ بلکہ یہ چھ مہینے استحکام کے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے حالات ایسے بنا دیئے تھے کہ حضورؐ کو تو خود مدینہ سے دعوت ملی تھی کہ آپ یہاں تشریف لائیے۔ یہاں آ کر آپؐ کو دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مدینہ میں اوس و خزرج کے دو بڑے قبیلے آباد تھے۔ دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار اور رؤساء حضورؐ پر ایمان لا چکے تھے اور ان میں سے اکثریت بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت موجود تھی اور حضورؐ کے دستِ مبارک پر دو سال قبل بیعت کر چکی تھی۔ لہٰذا آپؐ نے استحکام کے لئے چھ ماہ صرف فرمائے ہیں اور اس عرصہ میں کئے جانے والے تین اقدامات بہت اہم ہیں۔

مدینہ میں حضورؐ کے اقدامات بغرضِ استحکام

پہلا فوری اقدام اقامتِ صلوٰۃ سے متعلق تھا۔ اس لئے کہ منشورِ الٰہی کی پہلی شق یہی ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے پہلا کام جو کیا وہ تھا مسجدِ نبوی کی تعمیر۔ اس کے لئے جگہ کا انتخاب پھر اس کا حصول۔ پھر تعمیر کا آغاز۔ اس تعمیر کا یہ پہلو ضرور سامنے رکھئے کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں بنفسِ نفیس شریک رہے ہیں۔ گارا اٹھا کر دے رہے ہیں، پتھر اٹھا کر دے رہے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ آپؐ نے ایک مزدور اور کارکن کی حیثیت سے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر میں حصہ لے کر اپنے آباء و اجداد کی سنت کی تجدید فرمائی۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ۔ بیت اللہ کی دیواریں اٹھائی تھیں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے علیہما الصلوٰۃ والسلام۔ تو مسجدِ نبویؐ کی تعمیر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توانائیاں اور آپؐ کی محنت کا پسینہ بھی اس کے گارے میں شامل تھا۔

دوسرا اقدام جو آپؐ نے فرمایا اس کا عنوان ہے مؤاخات۔ یہ بہت بڑا کام تھا۔

۱۔ مہاجرین کو مدینہ کی آبادی میں مدغم (Integrate) کرنا۔ تاکہ وہ اس

معاشرہ میں علاحدہ طبقہ کی حیثیت سے نہ رہ جائیں۔ بلکہ اس کا ایک جزو لاینفک بن جائیں۔ مہاجرین میں جو اہم لوگ تھے ان کے بالکل سگے بھائیوں کی طرح انصار کے ساتھ رشتے کرا دیئے گئے۔ مواخات کا یہ اقدام داخلی استحکام کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مواخات کا یہ معاملہ سیرت مطہرہ کے ابواب میں ایک نہایت اہم باب ہے۔ ایسی کوئی دوسری مثال شاید ہی تاریخ سے مل سکے۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ انبیاء و رسل کی تاریخ میں ایسے واقعات ہوئے ہوں جو ہمارے علم میں نہ ہوں لیکن معلوم تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ انصار نے مہاجرین کے لئے اپنے گھر تقسیم کر دیئے۔ دوکانیں تقسیم کر دیں۔ ایک انصاری صحابی کے بارے میں یہاں تک آتا ہے کہ ان کی دو بیویاں تھیں۔ وہ اپنے مہاجر بھائی کو گھر میں لے گئے۔ چونکہ اسوقت تک حجاب کا حکم نہیں آیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے پیش کش کی کہ ان میں سے جو تمہیں پسند ہو میں اسے طلاق دیتا ہوں۔ آپ اس سے نکاح کرلیں۔ اس لئے کہ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے گھر میں دو دو بیویاں ہوں اور میرے بھائی کا گھر آباد نہ ہو۔ یہ مواخات بھی نہایت انقلابی اہمیت کا حامل اقدام ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کی سرشت کے اندر جو کمزوریاں ہیں اس میں طبقاتی تفاوت و امتیاز اور کشمکش بہت خوفناک ہوتی ہے۔ اوس و خزرج میں قبائلی و طبقاتی کشمکش اور عصبیت پہلے سے موجود تھی۔ لیکن اسلام اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنفسِ نفیس ورودِ سعید نے اس کو ختم کیا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ عرصہ بعد ہی منافقین اور یہود کسی نہ کسی بہانہ سے اس چنگاری کو بھڑکانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی طریقہ سے اگر مہاجرین اور انصار کا اس طرح ادغام و انضمام نہ کر دیا گیا ہوتا۔ ان کے مابین مواخات قائم نہ کر دی گئی ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ بہت سی داخلی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ منافقین اور یہود نے اس کی موقع بموقع کوششیں کیں لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست، تدبر، معاملہ فہمی اور حکمت نے ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

جو تیسرا اقدام حضورؐ نے مدینہ میں استحکام کے لئے فرمایا وہ یہودیوں کے ساتھ معاہدوں سے متعلق تھا جن کے تین قبیلے مدینہ میں آباد تھے اور وہ بہت اہم، بااثر اور طاقتور تھے۔ مدینہ کے اقتصادی شعبہ پر ان کا بڑا تسلط (Hold) تھا۔ ان کی قلعہ نما گڑھیاں تھیں، ان میں کافی اسلحہ جمع تھا، ساز و سامان جمع تھا۔ بالکل صورت حال وہ تھی جس کی میں کئی بار مثال دیتا رہا ہوں کہ جیسے غیر منقسم ہندوستان میں ہم دیکھتے تھے کہ گاؤں تو مسلمانوں کا ہے لیکن

جو تین چار گھر بنیوں کے ہوتے وہ پکّی حویلیوں کی صورت میں ہوتے تھے۔ باقی مسلمانوں کے گھر کچے ہوتے تھے۔ ہندو بنیوں کے پاس سرمایہ ہوتا تھا اور گاؤں بھر کے مسلمان ان کے سودی قرضوں میں بندھے ہوتے تھے۔ ان کے گھر اور کھیت ان بنیوں کے پاس رہن ہوتے تھے۔ تو یہی کچھ معاملہ اس وقت مدینہ میں تھا۔ اگرچہ یہود اصل مالکانِ وہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ مالکانِ وہ تو اوس وخزرج تھے۔ لیکن سرمایہ، تنظیم، تعلیم یہ چیزیں یہود میں بہت زیادہ تھیں اور وہ بہت مؤثر عامل کی حیثیت سے وہاں موجود تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوراندیشی کا یہ شاہکار ہے کہ آپؐ نے مدینہ تشریف لے جاتے ہی فوراً یہود کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ میں نے "جکڑنے" کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ ان سے معاہدہ میں طے پاگیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔ ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے۔ اور اگر کبھی مدینے پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کے حلیف کی حیثیت سے ساتھ دیں گے یا بالکل غیر جانب دار رہیں گے۔ وہ اس معاہدے میں ایسے بندھ گئے کہ وہ کھلم کھلا مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے۔ اگرچہ بعد میں اسلام کی اشاعت اور استحکام کو دیکھ کر وہ انگاروں پر لوٹتے رہے۔ اور اگرچہ پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہے اور ان کی مشرکین قریش سے سازباز تھی۔ لیکن یہ سب چوری چھپے ہو رہا تھا۔ علی الاعلان مقابلہ میں نہیں آسکتے تھے۔ اسی لئے میں نے اس کیفیت کو جکڑبندی سے تعبیر کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے تینوں قبیلوں کو معاہدوں کا پابند بنانے کے لئے جو اقدام فرمایا وہ ہر لحاظ سے دوراندیشی اور فراست و ذہانت کا ایک شاہکار تھا۔ اس اقدام نے اسلامی تاریخ میں نہایت اہم اور مثبت کردار ادا کیا ہے۔ اور بلاشبہ یہ نہایت اہم اقدام تھا۔

راست اقدام کا مرحلہ

بہر حال یہ چھ مہینے ہیں۔ ربیع الاول سے لے کر رمضان ۲ھ تک کہ اس دوران آپؐ نے کوئی مہم باہر نہیں بھیجی۔ یہ چھ مہینے آپؐ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے اور ہجرت کی وجہ سے اسلامی انقلابی جماعت کے جو دو عناصر ہو گئے تھے، یعنی مہاجرین و انصار، ان کو باہم شیر و شکر کرنے اور بنیانِ مرصوص بنانے میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد راست اقدام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے ۔۔۔ وہ مرحلہ کیا ہے؟ اس کو صرف تاریخی اعتبار سے سمجھنے کے بجائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاجِ انقلاب کے نقطۂ نظ

سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ حضورؐ نے آٹھ فوجی مہمیں مکہ کی طرف روانہ فرمائیں۔ جن میں سے چار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ لہٰذا انہیں غزوات کہا جاتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ وہ غزوات ہیں جو غزوۂ بدر سے پہلے کے ہیں۔ عام طور پر ہمارا جو تصور اور تاثر ہے وہ یہ ہے کہ پہلا غزوہ، غزوۂ بدر ہے۔ پہلی باقاعدہ جنگ یقیناً غزوۂ بدر ہے ـــــــ غزوہ عربی میں کہتے ہیں اللہ کی راہ میں نکلنے کو اور غزوہ خاص ہوگیا اس مہم کے لئے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس نکلے ہوں۔ تو ابتدائی چھ ماہ کے بعد چار فوجی مہمیں وہ ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ سے باہر نکلے۔ اور چار سرایا ہیں۔ سریہ اس فوجی مہم کو کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے کوئی مہم بھیجی یا کوئی لشکر روانہ فرمایا اور کسی صحابی کو اس کا سربراہ یا سپہ سالار مقرر فرما دیا۔ خود آپؐ اس میں شامل نہیں ہوئے۔ ان آٹھ مہموں کے حالات و واقعات کو ہمارے اکثر سیرت نگار اور مورخین نے بمشکل تمام دو یا تین صفحات میں سمیٹ لیا اور اس میں بھی نہایت ایجاز و اجمال سے کام لیا۔ حالانکہ یہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کا وہ اہم اور نازک (Critical and crucial) مرحلہ جس میں اقدام اب حضورؐ کی طرف سے ہو رہا ہے؛ پیش قدمی اب حضورؐ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر صبرِ محض (Passive Resistence) اب راست اقدام، (Active Resistence) میں تبدیل ہو رہا ہے۔

اب میں چاہوں گا کہ پہلے آپ کو جدید اصطلاحات میں بات سمجھا دوں کہ اس راست اقدام (Active Resistence) کی نوعیت تھی کیا! اصل میں حضورؐ نے مکہ کے خلاف جو اقدام کیا اس کے دو مقصد سامنے آتے ہیں جو جدید اصطلاحات کے حوالہ سے سمجھ میں آئیں گے۔ پہلا مقصد جس کو آج کل کہا جاتا ہے ' Economic Blockade '۔ یعنی معاشی ناکہ بندی؛ آپ کو معلوم ہے کہ مکہ کی اور قریش کی معاشی زندگی کا دار و مدار تجارت پر تھا۔ مکہ کا اپنا حال تو یہ تھا کہ جسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے " بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ "، وہاں کسی نوع کی پیداوار تھی ہی نہیں۔ وہ تو کھانے پینے کی چیزوں کے لئے باہر کی منڈیوں کے محتاج تھے۔ وہاں ایک دانہ تک نہیں اُگتا تھا۔ ہاں بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے، ان کا دودھ اور گوشت البتہ انہیں حاصل تھا لہٰذا ان کی معیشت کا سارا دار و مدار تجارت پر تھا اور درحقیقت اس دور کی مشرقی اور مغربی ساحلوں کے مابین تجارت میں قریش کو ایک اہم کڑی اور واسطہ (Link) کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ آپ غور کیجئے کہ آج کل نہر سوئیز کی کتنی اہمیت ہے۔ کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جائے

تو تجارت کا کیا حال ہو جائے گا۔ حالانکہ دوسرے راستے موجود ہیں جو طویل پڑیں گے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن جس زمانہ میں کوئی اور راستہ تھا ہی نہیں۔ یہ جنوبی افریقہ سے ہندوستان اور مشرقی ایشیا سے بحری راستے تو پندرھویں صدی عیسوی میں دریافت ہوئے ہیں۔ لہٰذا مشرق و مغرب کی تجارت حضورؐ کی بعثت کے دور میں عرب کے راستہ سے ہوتی تھی ــــ ہوتا یہ تھا کہ ہندوستان، انڈونیشیا، ملائیشیا اور دوسرے مشرقی ممالک کا سارا سامان تجارت بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے یمن کے ساحل تک پہنچتا تھا۔ ادھر مغرب کے ممالک یعنی یونان، اٹلی اور بلقان کی ریاستوں کا سارا سامانِ تجارت شام کے ساحلوں پر اتر جاتا تھا۔ اس طرح یورپ کے ممالک کا سامانِ تجارت بحیرہ روم سے ہو کر ادھر پہنچتا تھا اور اُدھر بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ہند سے ہو کر مشرقی ممالک و جزائر کا سامانِ تجارت یمن پہنچ جاتا تھا۔ اب ان کے مابین کاروبار کی جو ساری نقل و حمل (Shuffling) تھی وہ صرف قریش کے ہاتھ میں تھی۔ جس کا قرآن مجید میں سورۃ قریش میں بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا گیا ہے :-

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝ قریش ــــــــ سردیوں میں سفر کرتے تھے یمن کی طرف اُدھر ان کے قافلے جاتے تھے اور گرمیوں میں ان کے قافلے شمال یعنی شام کے ساحلوں کی طرف سفر کرتے تھے۔ ایک بڑا تجارتی سفر سردیوں میں اور ایک بڑا تجارتی سفر گرمیوں میں ان کے معمولات میں شامل تھا اور انہیں ان دونوں اسفار میں مکمل امن حاصل رہتا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ آخر عرب کے دوسرے قبائل بھی اس کاروبار میں حصّہ لیتے تھے۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ ان کے قافلے اکثر لوٹ لئے جاتے تھے۔ چونکہ عرب کے اکثر قبائل کا تو پیشہ ہی لوٹ مار، رہزنی اور غارت گری تھا۔ تو کسی اور قبیلہ کا قافلہ شاذ ہی لوٹ مار سے بچ کر نکلتا تھا۔ سوائے قریش کے ان کے قافلہ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ ایسا کیوں تھا! اس لئے کہ قریش کعبہ کے متولی تھے اور تمام عرب اسے اللہ کا گھر تسلیم کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ سارے کے سارے قریش کے تو نہیں تھے۔ بلکہ صورت یہ تھی کہ تمام عرب قبائل کے "خدا" قریش کے پاس بطور یرغمالی (Hostages) رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے قافلہ کے اوپر کوئی قبیلہ ہاتھ ڈالے تو قریش اس قبیلہ کے "خدا" کی گردن مروڑ دیں گے کہ نہیں! یہ وجہ تھی کہ قریش کے قافلوں کو تحفظ حاصل تھا ــــــ سورہ قریش میں آگے فرمایا گیا : فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ بدبختو! تمہیں اللہ کے اس گھر کی وجہ سے رزق مل رہا ہے اور تم نے اس کی حرمت کو بٹہ لگا رکھا ہے۔ تم پر

تو لازم ہے کہ اس گھر کے مالک اللہ واحد کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو بھوک سے نجات دلا رکھی ہے۔ اور خوف سے محفوظ رکھا ہے۔

تو اس منظر کو سامنے رکھئے کہ مغرب و مشرق کی تجارت میں قریش کو بلا شرکت غیرے اجارہ داری (Monopoly) حاصل تھی۔ اس وجہ سے کہ یہ کعبہ کے متولی تھے اور کعبہ میں تمام قبیلوں کے بت رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے قافلوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ ڈالنا شروع فرمایا۔ یہ بات خوب اچھی طرح نوٹ کیجئے۔ آپؐ نے اب ایک قوت کے اعتبار سے اپنی موجودگی (Presence) ثابت فرمادی۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ کون سی مہمیں ہیں جن کے ذریعے سے حضورؐ نے اقدام فرمایا۔ اس اقدام کا مقصد کیا تھا! سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مقصد تھا مکہ کی معاشی ناکہ بندی یعنی (Economic blockade)۔ حضورؐ نے درحقیقت قریش کی رگ جاں (Life-line) پر ہاتھ ڈالا، ان کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنا دیا اور انکی معاش کے لئے ایک خطرہ کھڑا فرمادیا۔ چنانچہ ایک مقصد تو تھا معاشی ناکہ بندی اور دوسرا مقصد تھا قریش کی سیاسی ناکہ بندی جس کو کہا جائے گا ' Isolation of Quresh ' ——— یا (Political containment of Quresh)۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس علاقے میں جو دوسرے قبیلے آباد تھے ان کے قریش سے معاہدے تھے، وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ حضور نے اس علاقے میں متعدد سفر کئے، اپنی قوت کا بھی مظاہرہ فرمایا اور اپنی تبلیغ و دعوت کو بھی استعمال فرمایا۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ وہ جو اقبال نے کہا ہے ع عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد ——— تو تبلیغ و دعوت بھی ہے اور اس کے ساتھ طاقت بھی شامل ہو جائے تو اب یوں سمجھئے کہ جیسے سونے پر سہاگہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں ہجرت کا ذکر آرہا ہے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا تلقین کی گئی تھی: وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝" اے اللہ! جہاں تو مجھے داخل کرنے والا ہے وہاں میرا داخلہ سچائی اور راست بازی کے ساتھ ہو اور جہاں سے تو مجھے نکال رہا ہے سچائی اور راست بازی کے ساتھ نکال۔ اور پروردگار خاص اپنے خزانۂ فضل سے قوت و طاقت کے ساتھ میری مدد فرما"۔ یہ ہے وہ قوت و طاقت جو حضورؐ کو مدینہ میں تشریف لانے کے بعد حاصل ہو گئی تھی ——— تو اب حضورؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ نکلتے تھے، کسی قبیلہ میں جا کر آپ نے دس بیس دن قیام فرمایا، ان کے ساتھ معاہدے کئے، اوّل تو ان کو اپنا حلیف بنالیا ورنہ کم از کم انہیں غیر جانبدار ضرور بنالیا کہ اگر تمہارا معاہدہ قریش کے ساتھ ہے تو ہمارے

ساتھ بھی کر دو۔ ہمارے خلاف ان کی مدد نہ کرو اور ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرو۔ بالکل غیر جانب دار (Neutral) ہو جاؤ۔ یہ ہیں حضورؐ کے وہ اقدامات جن کو میں جدید اصطلاحات کے حوالے سے Isolation and Political containment of Quresh قرار دیتا ہوں۔

ان مقاصد کے لئے چار سفر تو حضورؐ نے بنفسِ نفیس فرمائے اور چار مہمیں ایسی ہیں کہ جن میں آپ شریک نہیں تھے۔ یہاں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ ان مہموں میں آپؐ نے کسی انصاری صحابی کو شامل نہیں فرمایا۔ یہ جملہ مہمیں مہاجرینؓ پر مشتمل تھیں۔ اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ تھی کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصارؓ نے عرض کیا تھا کہ "آپؐ مدینہ تشریف لے آئیے۔ اگر قریش نے آپؐ کی وجہ سے مدینہ پر حملہ کیا تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔" دوسری خاص بات یہ کہ کل ایک سال کے اندر یہ ساری کارروائی عمل میں آ گئی۔ یعنی رمضان ۱ھ سے لے کر رمضان ۲ھ تک کے عرصہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ مہمیں سرانجام دیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس قدر کم وقت میں کس قدر شدومد اور زور و شور کے ساتھ یہ عمل ہوا۔ ایسا نہیں تھا کہ کبھی بند گاڑیوں پر آپؐ نے کوئی مہم بھیجی ہو۔ بلکہ یہ تمام مہمیں اونٹوں کے ذریعے یا پاپیادہ طے کی گئیں

میں ان آٹھ مہموں کی تفصیلات سیرت کی متعدد کتب (Consult) کر کے نوٹ کر کے لایا ہوں اور کافی محنت سے میں نے مختلف کتابوں سے ان کو مرتب کیا ہے اور ان مہمات کے مقاصد اور ان کی غرض و غایت کو سمجھا ہے۔ جو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ سیرت نگاروں نے ان مہمات کا بہت ہی سرسری طور پر ذکر کیا ہے اور اس مقام سے ایسے گزر گئے ہیں کہ جیسے یہ سیرت کے غیر اہم واقعات تھے۔ ان کے یہاں ہجرت کے بعد پہلا قابلِ ذکر واقعہ غزوۂ بدر ہے حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ غزوہ بدر کیوں ہوا! غزوۂ بدر سے تو اصل میں حضورؐ کی انقلابی جدوجہد آخری اور چھٹے مرحلے (Final and sixth phase) میں داخل ہوتی ہے۔ یعنی مسلح تصادم۔ (Armed Conflict)۔ لیکن Passive Resistence (یعنی صبر محض) ہجرت کے بعد Active Resistence (یعنی راست اقدام) کی شکل میں کیسے بدلی! جس کے نتیجہ میں مسلح تصادم کی نوبت آئی۔ یہ ہے وہ قریباً ڈیڑھ دو سال کی تاریخ جس پر غور و تدبر سے حضورؐ کا منہج انقلاب صحیح طور پر سمجھ میں آسکے گا اور یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ حضورؐ

کو تلوار کیوں اٹھانی پڑی ۔ اس دو سال کی تاریخ کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ حضورؐ نے قریباً چھ مہینے لگائے ہیں داخلی استحکام (Consolidation) کے عمل میں ۔ اس کے بعد پہلے چھ مہینوں میں تین مہمات آپ نے بھجوائیں جن میں آپؐ خود تشریف نہیں لے گئے ۔ بعد کی ششماہی کی چار مہموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے ۔ ان مہمات کے دو مقاصد تھے ۔ پہلا مقصد تھا مکہ کی معاشی ناکہ بندی اور دوسرا قریش کو سیاسی طور پر Isolate کرنا یعنی مکہ اور مدینہ کے درمیان کے علاقہ میں جو قبائل آباد ہیں یا تو ان کو اپنا حلیف بنا لینا ' ان کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کر لینا یا کم از کم یہ کہ ان کو غیر جانبدارانہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر راضی کر لینا کہ وہ نہ قریش کا ساتھ دیں اور نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیں بلکہ قطعی غیر جانبدار ہو جائیں ـــــ ان آٹھ مہموں کو ترتیب وار بیان کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ دو واقعات آپ کو اور سنا دوں ۔

ہوا یہ کہ پہلے چھ مہینوں میں جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی کوئی اقدام نہیں فرمایا تھا ایک واقعہ پیش آیا جو بہت اہم ہے ۔ حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ' رئیس اوس ' مکہ گئے ۔ ابھی تک مسلمانوں اور کفارِ مکہ کے مابین کھلا اعلانِ جنگ (War Declare) نہیں ہوا تھا مکہ میں حضرت سعدؓ کا حلیف امیہ ابنِ خلف تھا جو کبھی حضرت بلالؓ کا آقا ہوا کرتا تھا ۔ اور اس نے ان کو بہت ستایا تھا ۔ حضرت سعدؓ نے ان کے یہاں قیام کیا اور پھر طواف کے لئے حرم گئے ۔ وہاں ابوجہل سے آمنا سامنا ہو گیا ۔ اس نے امیہ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں ! اس نے بتایا کہ یہ اوس کے رئیس سعد ابنِ معاذؓ ہیں ۔ ابوجہل انؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا ۔ اور اس نے کہا کہ " اگر تم امیہ کے حلیف نہ ہوتے تو تم بچ کر نہیں جا سکتے تھے ۔ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ تم ہمارے دشمنوں اور بے دینوں کو پناہ دو اور خود آ کر بیت اللہ کا طواف کرو " ـــــ اس کے نزدیک تو نعوذ باللہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیؓ بے دین تھے ۔ چونکہ انہوں نے قریش کا بت پرستی کا آبائی دین چھوڑ دیا تھا ۔ حضرت سعد ابن معاذؓ نے اسی وقت ترکی بہ ترکی جواب دیا " اگر تم نے ہم پر طواف بند کیا تو جان لو کہ ہم تمہارے تجارتی راستوں کو روک دیں گے "۔ یہ واقعہ سیرت النبیؐ میں موجود ہے ـــــ دیکھئے ان واقعات سے حقائق کو سمجھنا ضروری ہے ۔ کہ کس طرح انقلابِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا منہاج مختلف مراحل سے گزرا ہے ـــــ حقائق اور واقعات کو اس طرح سمجھنا چاہئے جیسے وہ پیش آئے ہیں ۔ اور ان سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں ان پر غور کرنا چاہئے ـــــ میں نے کئی بار سیرت کی تقریروں میں یہ بات عرض کی ہے کہ سیرت

مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس میں معجزوں کا دخل بہت کم نظر آتا ہے۔ سیرتِ مبارکہ بغور مطالعہ کیجئے تو آپ کو روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت نظر آئے گی کہ حضورؐ کے منہج عمل میں انسانی جدوجہد (Human Efforts)، محنت، کوشش، کشاکش، کشمکش، ایثار و قربانی، صبر و مصابرت، جہاد و استقامت کے عناصر غالب نظر آئیں گے۔ میں اپنی اس بات کی مزید وضاحت کے لئے کہا کرتا ہوں کہ یہ سارا عمل زمین پر قدم بقدم چل کر مصائب و شدائد جھیل کر، قربانیاں دے کر انجام دیا گیا ہے۔ انقلابِ محمدیؐ کا یہ سارا راستہ اور فاصلہ انسانی سطح پر ان تمام مرحلوں سے گزر کر طے کیا گیا ہے جو ہر انقلابی عمل کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بے شمار حسّی معجزات، کرامات اور خرقِ عادت واقعات ہیں، حضورؐ کے دستِ مبارک سے متعدد بار عظیم ترین برکات کا ظہور ہوا ہے ـــــ لیکن اس انقلابی جدوجہد میں ان کا کتنا کچھ دخل ہے۔ اس اعتبار سے کبھی سوچیے گا اور اس نقطۂ نظر سے سیرتِ مطہّرہ کا مطالعہ کیجئے گا تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے جس پر میں پہنچا ہوں کہ درحقیقت اس میں غالب ترین عنصر انسانی سطح کی جدوجہد کا نظر آئے گا، جس میں مشکلات ہیں، مصائب ہیں، جور و ستم ہے، تعدّی و ظلم ہے۔ شدائد ہیں۔ خود محبوبِ رب العالمین کے لئے، قید و بند اور معاشی مقاطعہ ہے۔ رحمۃ للعالمین پر پتھروں کی بارش ہے۔ جس سے جسمِ اطہر سے اتنا خون بہا ہے کہ نعلین مبارک پیروں میں جم گئے ہیں۔ زخموں سے چور اور نڈھال ہو کر آپؐ طائف کی گلیوں میں کئی بار گرے ہیں اور ظالموں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر پھر کھڑا کر دیا ہے۔ اور چلنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ سب کچھ خود آپؐ کے ساتھ ہوا ہے لیکن نہ دشمنوں کے ہاتھ شل ہوئے اور نہ وہ زمین میں دھنسائے گئے ـــــ ایسا کیوں ہوا! اس کی بھی وجہ ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان تمام مراحل سے گزر کر اللہ کا دین غالب فرمایا جزیرہ نمائے عرب پر۔ اب حضورؐ کی امّت کو اللہ کا یہ دین غالب کرنا ہے پوری دنیا پر ـــــ تو اگر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی یہ جدوجہد معجزوں کے ساتھ کامیاب اور غالب ہوئی ہوتی تو معجزے بعد والوں کے لئے بھی ہونے چاہیئے تھے۔ حالانکہ معجزہ صرف انبیاء و رسل کے ساتھ مختص ہوتا ہے، امّت کے لئے معجزات نہیں ہوں گے۔ یہ بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد وہاں بھی آئی تھی اور جب کبھی بھی حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دین کے غالب کرنے کی جہاں جدوجہد کی جائے گی۔ اللہ کی غیبی مدد یہاں بھی ضرور آئے گی ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو !!!\
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

تو اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور نصرت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ لیکن معجزہ! وہ صرف انبیاء و رسل کے لئے مختص ہوتا ہے۔ نبوت و رسالت کے اختتام کے ساتھ ہی معجزات کا سلسلہ بھی ختم ہوا۔۔۔ اب جو بھی کوشش اور جدوجہد کرنی ہوگی۔ وہ زمین پر قدم بقدم چل کر خالص انسانی سطح پر کرنی ہوگی۔ لہٰذا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر یہ حجت قائم فرما دی کہ آپؐ نے بالکل انسانی سطح پر، زمین پر قدم بقدم چل کر، مصائب و شدائد جھیل کے اور ہر طرح کے موانعات سے نبرد آزما ہو کر جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی انقلاب برپا فرما دیا۔۔۔۔ بہرحال یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت سعد ابن معاذؓ کا یہ قول بھی یاد رکھئے۔

دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ ابن ابی خزرج کا بہت بڑا سردار تھا اور اوس و خزرج کے دونوں قبیلے باہمی مشاورت سے اُسے مدینہ کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے لئے تاج بھی تیار ہو گیا تھا۔ اور یہی بات اس شخص کی بدبختی کا اصل سبب بن گئی کہ وہ منافقین کا سردار بن گیا چونکہ اس کی بادشاہت کا آئینہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری کے باعث چکنا چور ہو گیا۔ اب ان بے تاج بادشاہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورودِ مسعود کے بعد اس باتاج بننے والے کے لئے گنجائش کہاں رہی! وہ ایمان تو لے آیا چونکہ دونوں قبیلے ایمان لے آئے تھے۔ لیکن پہلے ہی دن سے اس کے دل میں جو نفاق کا بیج پڑا تو وہ پروان چڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کے پاس قریش کے خطوط آ رہے تھے کہ تم حضورؐ اور آپؐ کے ساتھ مہاجرین کو مدینہ سے باہر نکالو۔ تم کھڑے ہو جاؤ۔ تمہیں اقدام کرنا چاہیئے۔ ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ہم لشکر لے کر آنے کے لئے تیار ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اس کی یہ ریشہ دوانیاں ابتدا ہی سے شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے استحکامات کے متعلق جو تین اقدامات آپ کو گنوائے تھے ان میں جو تھا یہ بھی شامل کیجئے کہ آپؐ بنفسِ نفیس چل کر عبداللہ ابن ابی کے پاس تشریف لے گئے۔ حالانکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حضورؐ اس کو طلب فرماتے اور خود انتظار فرماتے۔ لیکن نہیں۔ معاملہ دین کا ہے۔ اس میں کسی کی کوئی ذاتی نہیں ہو جاتی۔ چاہے وہ رسول ہو۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہ جو غالب نے کہا ہے کہ ؎ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا۔۔۔۔ یہاں دربدر جانا پڑتا ہے۔۔۔۔

حضورؐ نے خالص دنیوی انداز اور دلیل سے اسے سمجھایا اور فرمایا: دیکھو اگر تم نے کوئی اقدام کیا تو کیا اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ کرو گے! حضورؐ اسے سمجھا رہے ہیں کہ تمہارا سارا قبیلہ ایمان لا چکا ہے۔ اگر تم نے اس طرح کی کوئی حرکت کی جو ہمارے علم میں آئی ہے تو اچھی طرح سوچ

لوکہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا انہیں اپنے بھائی بندوں کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی ــــ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے اسے کوئی عملی اقدام کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اگرچہ وہ ساری عمر سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرتا رہا جیسے یہودی کرتے رہے لیکن اسے کبھی بھی کھلم کھلا سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات

میں نے غزوۂ بدر سے قبل جن آٹھ مہمات کی طرف اشارہ کیا تھا اب ان کی تفصیل سماعت فرمایئے!

رمضان المبارک ۱ھ میں سب سے پہلا سریّہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں بھیجا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان مہمات میں آپؐ نے کسی انصاری صحابی کو شامل نہیں فرمایا۔ یہ سریہ تیس مہاجرین پر مشتمل تھا۔ یہ لشکر ساحلِ بحر تک پہنچ گیا۔ وہاں ابوجہل تین سو کی نفری کے ساتھ کوئی تجارتی قافلہ لے کر جا رہا تھا۔ وہاں دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی لیکن وہاں مجدی ابن عمرو جُہنی ایک شخص تھا جس کا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے معاہدہ ہو چکا تھا۔ وہ بیچ میں پڑ گیا اور اس نے کوئی مسلّح تصادم نہیں ہونے دیا۔ کوئی جنگ یا خونریزی نہیں ہوئی ورنہ مقابلہ ہوتا۔ تیس صحابہؓ کا تین سو مشرکین مکّہ سے۔ گویا ایک اور دس کی نسبت تھی۔ یہ پہلی مہم تھی جو حضورؐ نے رمضان سن ایک ہجری میں بھیجی تھی۔ اگلے رمضان ۲ھ میں غزوہ بدر ہوا تھا۔ یہ بات تاریخ کے حوالہ سے سامنے رکھئے۔ اس سریہ کے بارے میں تاریخ میں آیا ہے کہ پہلا جھنڈا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بلند فرمایا ہے وہ اس سریّہ کے لئے تھا جو حضورؐ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا تھا۔

دوسری مہم ایک ماہ بعد ہی شوال ۱ھ میں حضرت عبیدہؓ ابن الحارث کی سرکردگی میں مہاجرین کے ساتھ بھیجی گئی۔ اس کا بھی آمنا سامنا ابوسفیان کے ایک قافلہ کے ساتھ رابغ کے مقام پر ہو گیا اور ٹکراؤ کی نوبت آ گئی تھی ــــ اب ذہن میں رکھئے یہ رابغ بھی ساحلِ بحر پر ہے۔ حج اور عمرہ کرنے والے حضرات اس مقام سے بخوبی واقف ہیں۔ مدینہ کے راستہ میں رابغ بھی آتا ہے۔ آگے چل کر مدینہ سے جو سڑک بدر تک آتی ہے اس پر حاجی حضرات نے بدر کے نزدیک سڑک پر تیر کے نشان دیکھے ہوں گے جو ینبوع کی طرف نشان دہی کرتے ہیں جو اب ایک بڑی بندرگاہ بن گئی ہے ینبوع کا ذکر بھی آگے آئے گا۔ بہرکیف اس موقع پر بھی جنگ نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ابھی تک کسی کی طرف سے بھی باقاعدہ اعلانِ جنگ (War Declare)

نہیں ہوا تھا۔ حضورؐ کا مقصد اصل میں یہ تھا کہ اپنی موجودگی (Presence) ثابت کر دیں۔ کہ اب یہ تجارتی راستہ تمہارے لئے پہلی کی طرف محفوظ و مامون نہیں ہے کہ بے کھٹکے گزرتے رہو۔ بلکہ یہ اب ہماری زد میں ہیں۔ اس موقع پر پہلا تیر چلایا حضرت سعد ابن ابی وقاص نے رضی اللہ تعالیٰ عنہ —— یہ دو باتیں خاص طور پر نوٹ کر لیجئے کہ ہجرت کے بعد پہلا جھنڈا تھا محمد رسول اللہ صلّی اللہ کا جو آپؐ نے پہلی مہم کے موقعہ پر حضرت حمزہؓ کو عطا کیا تھا۔ ہجرت کے بعد جو پہلا تیر چلایا گیا وہ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے چلایا اگرچہ اس سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ یہاں بھی بیچ بچاؤ ہو گیا اور باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تیسرا سریّہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیر کرگی ذی قعدہ میں بھیجا جو تیس مہاجر صحابہؓ پر مشتمل تھا۔ آپ نے دیکھا کہ مسلسل ہر ماہ حضور ایک ایک مہم روانہ فرما رہے ہیں۔ اس سریہ کے لئے حضورؐ نے خرّار کا مقام متعیّن فرمایا تھا۔ میں تا حال معیّن (Locate) نہیں کر سکا کہ اس وقت وہ مقام کس جگہ پر ہے۔ بہرحال تاریخ میں آتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمادیا تھا کہ وہاں تک جاؤ، اس سے تجاویز نہ کرنا۔ میں پھر عرض کر دوں کہ ان مہموں کا مقصد دراصل قریش کے تجارتی راستوں پر اصل میں اپنی موجودگی ثابت کرنا تھا اور قریش کو ان راستوں کے مخدوش ہونے کی تشویش میں مبتلا کرنا تھا۔ حضورؐ کے یہ اقدامات ان کی معیشت کے اعتبار سے نہایت نازک اور پریشان کن (Critical and cruical) تھے۔ چونکہ ان کے شام کے لئے تجارتی قافلے ان راستوں سے گزرتے تھے۔

اس کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا جن میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بنفسِ نفیس تشریف لے گئے —— اس سلسلے کا پہلا سفر ۲ھ میں ہوا۔ بنوزمرہ کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا وہاں حضورؐ نے قیام فرمایا۔ اس سفر کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اپنی موجودگی (Presence) کا اظہار ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ اس قبیلہ کے ساتھ حلیف ہونے کا معاہدہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ طے پا گیا۔ دوسرا سفر ربیع الاوّل یا ربیع الآخر میں ہوا۔ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ اس میں غزوۂ بواط واقع ہوا ہے۔ اس میں حضور خود شریک تھے۔ مقام کا نام اور مہینہ تو سیرت کی کتابوں میں موجود ہے لیکن اس کی تفاصیل سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔

اس کے بعد حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک نہایت اہم سفر کا ذکر کتب سیر میں غزوۂ عشیرہ کے عنوان سے ملتا ہے۔ حضورؐ کا یہ سفر قریباً دو ماہ پر محیط تھا۔ یعنی جمادی الاُولیٰ اور جمادی الاُخریٰ ۲ھ

اور حضورؐ نے یہ سفر اختیار فرمایا تھا اس قافلے کو روکنے کے لئے جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کو جا رہا تھا۔ یہی وہ قافلہ ہے کہ جب واپس آ رہا تھا تو حضورؐ نے اس کو Intercept کرنے یعنی روکنے کا ارادہ فرمایا تو اس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر واقع ہو گیا —— اس قافلہ کا بھی ایک مخصوص تاریخی پس منظر ہے، اسے بھی سمجھ لیجئے —— آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ کی ہجرت سے متصلاً قبل اور بعد مکہ سے مہاجرینؓ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی لیکن اکثر و بیشتر مہاجرین اپنے اہل و عیال کو ساتھ نہیں لا سکے تھے۔ وہ مکہ ہی میں رہ گئے تھے اور اسی طرح ان کا ساز و سامان اور ان کا اثاثہ و سرمایہ بھی مکہ ہی میں رہ گیا تھا۔ لہٰذا دارالندوہ میں مشرکینِ مکہ نے یہ طے کیا تھا کہ تمام مہاجرین کی تمام چیزیں ضبط کر لی جائیں اور ان کی فروخت سے ایک بہت بڑا فنڈ قائم کیا جائے، اس سے ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تشکیل دیا جائے اور اس سے جو منافع ہو گا اس کو ہم مسلمانوں پر لشکر کشی کے لئے استعمال کریں گے۔ تو گویا یہ محض ایک تجارتی قافلہ نہیں تھا بلکہ آئندہ جو مسلح تصادم ہونے والا تھا اس کے لئے مالی ذرائع فراہم کرنا بھی اول روز سے اس قافلہ کی ترتیب میں پیشِ نظر تھا —— یہ خبر مدینہ پہنچ چکی تھی اور بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست بھی کی تھی کہ اب ہمیں جنگ کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ ہم جو ساز و سامان اور جو اثاثہ بیت مکہ میں چھوڑ کر آئے تھے وہ سارا کا سارا انہوں نے ضبط کر لیا ہے اور اس کے منافع سے جنگی تیاری قریش کے پیشِ نظر ہے۔

بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قافلے کے تعاقب کے لئے نکلے اور یہاں نوٹ کیجئے کہ حضورؐ کے ساتھ ڈیڑھ سو مہاجرین اور تیس اونٹ تھے۔ میں اسے خاص طور سے کیوں بیان کر رہا ہوں! اس لئے کہ غزوۂ بدر میں تین سو تیرہ اصحابِؓ رسولؐ تھے اور ستر اونٹ تھے معلوم ہوا کہ غزوۂ بدر میں جتنی طاقت موجود تھی غزوۂ عشیرہ میں اس سے لگ بھگ نصف تعداد شریک تھی۔ حضورؐ نے قافلے کے تعاقب میں ینبوع تک پہنچ گئے۔ لیکن چند دنوں کا فصل پڑ گیا تھا اور قافلہ چند راتیں قبل شام کی طرف نکل چکا تھا۔ لہٰذا اس کا راستہ روکا نہیں جا سکا۔ البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں قیام فرمایا اور وہاں جو قبیلہ آباد تھا یعنی قبیلۂ بنی مطلق، اس کے ساتھ مصالحت کی۔ طے یہ ہوا کہ قبیلہ بنی مطلق کے لوگ غیر جانبدار رہیں گے۔ نہ تو قریشِ مکہ کے خلاف مسلمانوں کی مدد کریں گے نہ مسلمانوں کے خلاف قریشِ مکہ کی۔ یہ غزوہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کا بالواسطہ تعلق غزوۂ بدر سے جڑ جاتا ہے۔ اس کی نوبت کیوں آئی! میں اسے آگے بیان کر دوں گا۔

غزوۂ بدر سے متصلاً قبل ایک غزوۂ اور ہے جسے غزوۂ بدر اُولیٰ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہوا یہ

کہ ایک شخص کرز ابن جابر فہری نے مسلمانوں پر اپنی ذاتی حیثیت سے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور مدینہ کے قرب و جوار میں لوٹ مار کی اور چند مویشی پکڑ کر لے گیا۔ اس میں قریش کا ہاتھ نہیں تھا۔ حضورؐ نے تعاقب کیا بدر تک آپؐ پہنچے لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ اس سے آگے حضورؐ تشریف نہیں لے گئے اور مراجعت فرمائی۔ چونکہ یہ بھی حضورؐ کا ایک سفر ہے، طاقت کے ساتھ، نفری کے ساتھ۔ لہٰذا یہ بھی ان غزوات کی فہرست میں شامل ہے۔

غزوۂ بدر کا ایک اہم سبب

اب میں اس سلسلہ کا اہم ترین واقعہ بیان کر رہا ہوں جس نے اصل میں مکہ میں آگ لگائی۔ یہ واقعہ سریہ عبداللہ ابن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے سیرت کی کتب میں مذکور ہے۔ اس کا خاص معاملہ یہ ہے کہ حضورؐ نے حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کو ایک خط دیا۔ خط بند تھا۔ اور یہ فرما دیا کہ مکہ کی طرف جاؤ اور جب مدینہ سے دو دن کی مسافت طے کر لو تب یہ خط کھولنا پھر اس میں دیکھنا کہ کیا لکھا ہے! اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا ـــــ اب آپ اندازہ کیجئے کہ راز داری (Secrecy) کس درجہ کی ہے! حضورؐ نے اس درجہ اس کو مخفی رکھا ہے نہ خود کمانڈر کو معلوم نہیں ہے کہ وہ مہم کیا ہے جو میرے سپرد کی گئی ہے! بعض روایات میں بارہ صحابہ اور بعض میں آٹھ کی تعداد کا ذکر آتا ہے جو حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کے ساتھ تھے۔ مدینہ سے دو دن کی مسافت کے بعد انہوں نے خط کھولا تو اس میں ہدایت تھی کہ "وادیٔ نخلہ پہنچو"۔ یہ وادیٔ نخلہ کہاں ہے! اب ذرا جغرافیہ کو ذہن میں لائیے۔ مکہ جنوب میں ہے مدینہ شمال میں اور طائف مکہ سے جنوب مشرق میں ہے۔ مدینہ سے وہاں کا فاصلہ کم از کم تین سو میل کا ہے۔ یہاں مہم بھیجنا بغیر کسی اہم منصوبہ کے اور بغیر کسی سوچے سمجھے اقدام کے ممکن نہیں تھا، یہ تمام کارروائی بلاسبب نہیں تھی۔ تو حضرت ابن جحشؓ کو حکم ہوا کہ "مکہ اور طائف کے درمیان جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کرو اور قریش کی جو نقل و حرکت ہے اس کو اچھی طرح Watch کرو۔ یعنی اس پر کڑی نظر رکھو"۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یمن کی طرف قریش کے قافلے یہاں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یمن کا راستہ طائف سے ہو کر گزرتا ہے اور وادیٔ نخلہ طائف اور مکہ کے درمیان واقع ہے ـــــ جو قافلے شام کو جاتے تھے ان کے راستوں کے متعلق میں نے اس سے قبل سات مہمیں آپ کو گنوادی ہیں جو ان راستوں میں اپنی موجودگی (Presence) کا ثابت کرنے اور ان کو مخدوش بنانے کے لئے گئی تھیں۔ لیکن یہ مہم اس راستہ کے لئے تھی جو طائف ہو کر یمن جاتا

تھا۔ تو حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کو ہدایت کی گئی کہ "وادیٔ نخلہ میں جاکر قیام کرو اور قریش کی
نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور ہمیں ان کے بارے میں اطلاعات دیتے رہو"۔ حضرت عبد اللہ
ابن جحشؓ نے جب خط پڑھا تو چونکہ مہم بڑی سخت اور کڑی آپڑی تھی۔ لہٰذا آپؓ نے اپنے
ساتھیوں کو آزاد کر دیا کہ میں تو جاؤں گا اس لئے کہ حضورؐ کا حکم ہے لیکن تم سے جو میرا ساتھ دینا
چاہے دے۔ میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ ان سب نے کہا جو حضورؐ کا حکم ہے وہ ہمارے سر
آنکھوں پر ——— ان سب نے جاکر وادی نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں ایک قافلہ آگیا۔ مختصر سا قافلہ تھا۔
قریش کے کل پانچ افراد اس قافلہ میں شامل تھے۔ اگرچہ تھے سبھی بڑے اونچے گھرانے کے لوگ متعدد
اونٹوں پر لدا ہوا کافی سامان تجارت ان کے ساتھ تھا جو وہ طائف سے مکہ لے جا رہے تھے۔
قافلہ جب وہاں سے گزرا تو مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہم کیا کریں۔ اگرچہ حضورؐ
کے خط میں صراحت نہیں تھی کہ حملہ کیا جائے۔ لیکن ان کی رائے یہ ہوئی کہ ہمیں حملہ کرنا چاہیئے۔
یہاں ایک بات میں آپ سے عرض کر دوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صورت حال ایسی ہو جاتی ہے کہ اگر
مڈبھیڑ ہو جائے تو جنگ کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہوتا ——— اور اندازہ ہوتا ہے کہ صورتحال
(Situation) کچھ ایسی ہوئی ہے کہ مقابلہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ والوں میں سے ایک شخص
جس کا نام عمرو ابن عبداللہ الحضرمی، بیان کیا گیا ہے، وہاں قتل ہو گیا ——— عمرو بن عبداللہ الحضرمی
کا باپ عبداللہ اگرچہ حضرموت کا رہنے والا تھا لیکن مکہ میں امیہ ابن حرب (ابوسفیان کے والد)
کا حلیف تھا اور وہاں حلیف کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس تجارتی قافلے میں مغیرہ کے دو
اور ایک آزاد کردہ غلام شامل تھے۔ مغیرہ کے خاندان کا شمار قریش کے چوٹی کے گھرانوں میں ہوتا
تھا۔ بہر کیف مقابلہ کے نتیجہ میں عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ دو افراد جان بچا کر فرار ہو گئے
اور بقایا دو کو انہوں نے قیدی بنا لیا۔ ان دو قیدیوں اور مال غنیمت، جو بھی ہاتھ لگا، کو لے کر
یہ حضرات مدینہ واپس آگئے۔

اس واقعہ کے متعلق ہمیں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ ایک روایتؒ کے مطابق حضورؐ نے
حضرت عبداللہ بن جحش پر کوئی عتاب نہیں فرمایا۔ آپؐ نے مال غنیمت میں سے خمس بھی قبول فرما لیا۔
دو قیدی تھے، ان کا فدیہ قبول کر کے انہیں آزاد فرما دیا۔ ان میں سے ایک قیدی حکم ابن کیسان

لہ اس روایت کو محمد ابن عبدالوہابؒ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ (مرتب)

وہیں مسلمان ہوگئے ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ! مغیرہ کے پوتوں میں سے ایک بھاگ گیا تھا ۔ دوسرا قید ہوا جو فدیہ دے کر چلا گیا ۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہ ابن جحش اور ان کے ساتھیوں پر نہ عتاب فرمایا نہ کوئی سرزنش فرمائی اور نہ ہی کوئی Explanation call کیا کہ تم نے میرے حکم سے تجاوز کیوں کیا ! یہ ایک رائے ہے ــــــ دوسری رائے جو بہت سی کتابوں میں بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ ناراضگی فرمایا ۔ مالِ غنیمت قبول نہیں فرمایا ۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں حملہ کی اجازت نہیں دی تھی ۔ میری ہدایت صرف یہ تھی کہ وہاں قیام کرو ۔ قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور اس کی ہمیں اطلاع دیتے رہو ۔ لہٰذا یہ اقدام تم نے خود کیا ہے ـــ اس میں ایک مسئلہ اور پیدا ہوگیا تھا ، وہ بھی عرض کر دوں ۔ وہ ماہِ رجب کی آخری تاریخ تھی ۔ رجب کا مہینہ اشہرِ حُرم میں شامل ہے ۔ یعنی ان چار مہینوں میں سے ایک ہے جن میں مشرک و کافر بھی جنگ نہیں کرتے تھے ـــ محمد ابن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے یعنی مہم کے ارکان نے مشورہ کیا کہ ہمارے سامنے دو متبادل صورتیں ہیں ۔ اگر ہم ان کو چھوڑ دیتے ہیں تو رجب کی حُرمت تو بچ جائے گی لیکن پھر یہ حدودِ حرم میں داخل ہو جائیں گے ۔ وہاں ان پر حملہ ممکن نہ ہوگا ۔ ہم دو حُرمتوں کے مابین آ گئے ہیں ۔ رجب کی آخری تاریخ تھی ۔ رات شروع ہوئی تو رجب بھی ختم اور اشہرِ حُرم بھی ختم ـــ بہرحال ان کا مشورہ یہ ہوا کہ جنگ کی جائے اور جنگ کا نتیجہ وہ نکلا جو میں بیان کر چکا ہوں ۔

اس پوری صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد میں جو نتیجہ اخذ کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ ناراضگی فرمایا تب بھی یہ بات مسلّم ہے کہ سزا کوئی نہیں دی ۔ یہ یقینی بات ہے ۔ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ صورتِ حال (Situation) ایسی بن گئی تھی کہ اس میں اگر صحابہ کرامؓ اپنے ہاتھ باندھے رکھتے تو ہو سکتا تھا کہ سب شہید ہو جاتے ـــــــ مڈبھیڑ ہوئی ہے ، آمنا سامنا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے ۔ واللہ اعلم ۔ واقعہ کی تفاصیل تو مجھے نہیں مل سکیں ۔ اللہ کرے کہ کچھ باحوصلہ حضرات کمر کس لیں اور سیرت کی جو اور بہت سی مستند کتب متقدمین کی موجود ہیں ان کا تحقیقی مطالعہ کریں اور اس واقعہ کی تفاصیل کو جمع کریں ۔ چونکہ یہ بہت اہم واقعہ ہے ۔

اس کا نتیجہ کیا نکلا ! اب اسے پہچان لیجئے ۔ مکہ میں جب یہ خبر پہنچی ہے تو وہاں آگ لگ گئی ۔ اس لئے کہ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد پہلا علَم (جھنڈا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند فرمایا ۔ پہلا تیر چلا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے ۔

پہلا قتل ہوگیا اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے۔ حضورؐ نے حکم دیا تھا یا نہیں دیا تھا بہرحال بالفعل یہ کام ہوا حضورؐ کے آدمیوں کے ہاتھوں! ظاہر بات ہے کہ اس کی ذمہ داری تو یقیناً آئے گی۔ جماعتی سطح پر تو یہی ہوتا کہ اس جماعت کا کوئی فرد جب کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری جماعت کے قائد پر آتی ہے۔ یا پھر یہ ہوتا ہے کہ حضورؐ اس سے بالکلیہ برأت کا اظہار فرماتے۔ یا اقدام کرنے والوں کو سزا دیتے اور مشرکین کے نقصان کی تلافی فرماتے۔ ایسی کوئی شکل حضورؐ نے اختیار نہیں فرمائی۔ گویا آپؐ نے اپنے اصحابؓ کے اس اقدام کو قبول (Own) فرمالیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ میں چیخ پکار شروع ہوگئی کہ قتل کا بدلہ قتل، خون کا بدلہ خون! مکہ میں یہ جو آگ لگی ہوئی تھی آپ اس کا تصور کرسکتے ہیں کہ کسی قبائلی معاشرے میں یہ معاملہ کس قدر جذباتی اور اہم ہوتا ہے۔

ایک طرف مکہ میں ہیجان خیز صورتِ حال تھی، دوسری طرف ابوسفیان کے قافلہ کی واپسی کا وقت آگیا۔ وہی قافلہ جسے عشیرہ والے غزوہ کے موقع پر حضورؐ نے روکنے (Intercept کرنے) کی کوشش فرمائی تھی۔ تو ابوسفیان کی طرف سے مکہ میں یہ ہنگامی پیغام (S.O.S Call) پہنچ گیا کہ مجھے خطرہ ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں سے کہ وہ ہمارے قافلہ کو لوٹ لیں گے اور قافلہ میں مال بہت ہے۔ بہت بڑا قافلہ تھا ــــ لہٰذا مجھے فوراً کمک پہنچائی جائے اور قافلہ کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے ــــ یہ دونوں باتیں تھیں کہ جن کی بنا پر مکہ میں جو جنگجو، جوشیلے اور مشتعل مزاج لوگ (Hawks) تھے وہ قابو سے باہر ہوگئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک دلیل آگئی تھی اسی طرح کے نمایاں اشخاص تھے ابوجہل اور ابوسفیان ــــــــ

اس کے ساتھ ساتھ مکہ میں ٹھنڈے مزاج، بردبار طبیعت کے حامل اور شریف النفس لوگ (یعنی Doves) بھی موجود تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ خانہ جنگی ہو۔ ان میں نمایاں شخصیتیں تھیں عتبہ ابن ربیعہ اور حکیم ابن حزام کی۔ آخر الذکر تو بعد میں ایمان لے آئے۔ جلیل القدر صحابی ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کی پھوپھی تھیں تو اس رشتہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پھوپھا ہوئے۔ عتبہ ابن ربیعہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس نے ہجرت کے بعد قریش سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف کوئی اقدام مت کرو۔ اب انہیں عرب کے حوالے کردو۔ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عرب سے ٹکراؤ ہوگا۔ ہم تو اب تماشا دیکھیں گے۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیت جاتے ہیں اور پورے عرب پر ان کا قبضہ و تسلط ہو جاتا ہے تو ہماری ہی جیت ہے۔ آخر وہ قریشی ہیں۔ وہ

ہمارے ہی آدمی ہیں، بڑا دُور اندیش، سیاست دان اور مدبّر آدمی تھا ـــــــ اس نے مزید کہا کہ "اگر عرب (محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو ہلاک کر دیں تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تمہیں اپنے بھائی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگنا نہیں پڑے گا!" اس قدر دُور اندیشی کا مشورہ تھا جو عُتبہ نے دیا تھا۔ تو عتبہ اور حکیم ابن حزام آپس کی خونریزی سے بچنا چاہتے تھے۔ دوسری جانب ابوجہل Hawks کا چیف تھا وہ چاہتا تھا کہ فوری اقدام کیا جائے ـــ اب جب یہ صورت حال پیش آ گئی تو یوں سمجھئے کہ ان کے جوشیلے اور جنگ پسند لوگوں (Hawks) کو تقویت حاصل ہو گئی کہ ایک تو ہمارا آدمی عمرو بن عبد اللہ الحضرمی وادی نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لہٰذا خون کا بدلہ خون سے ہوگا اور دوسری طرف ہمارے تجارتی قافلہ کو شدید خطرہ در پیش ہے۔ لہٰذا ان بہانوں سے ایک ہزار جنگجوؤں کا کیل کانٹے سے لیس لشکر تیار ہوا۔ یہ دو دلیلیں جنگ پسند عناصر (Hawks) کے ہاتھوں ایسی آ گئی تھیں کہ جو امن پسند اور صلح جو (Doves) تھے وہ مجبور ہو گئے۔ ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ اس آگ کو فرو کر سکیں۔ چنانچہ ایک ہزار کا لشکر مکہ سے مدینہ روانہ ہوا۔ جس کے نتیجہ میں غزوہ بدر ہوا۔ چونکہ یہ غزوۂ انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا نقطۂ آغاز ہے۔

میرا یہ خیال تھا کہ میں آج مسلح تصادم کے متعلق اپنی گفتگو مکمل کر لوں گا۔ لیکن بات مکمل نہیں ہو پا رہی۔ وقت معمول سے زیادہ گزر گیا ہے۔ لہٰذا بقیہ حصہ پر کسی قدر تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ اگلے جمعہ ہو گی۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات !!!!

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کیلئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں ـــــــ!

(دوسری قسط)

دلِ افگندیم

بسم اللہ مجرھا و مرسٰھا

از قلم

مولانا سعید الرحمٰن علوی

حضور نبی مکرم، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین والمعصومین صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم
ے محبوب صحابی، عزیز اور کاتبِ وحی سیدنا امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک
وایت ہے جسے صاحبِ مشکوٰۃ نے "باب ثواب ہذہ الامۃ" میں نقل کیا امام بخاری قدس سرہٗ سے
ں کے جو الفاظ منقول ہیں وہ یہ ہیں:

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی
ولن تزال ھذہ الامۃ قائمۃ علی امر اللہ لایضرھم من خالفھم
حتی یاتی امر اللہ ۔

(بخاری ص۱۶، ج ۱ ۔ اصح المطابع، کراچی / دارمی ص۷۳، ج ۱ ۔ مطبوعہ دمشق)

ی سلسلہ کی مزید روایات

اس سے قبل کہ ہم اس حدیث پر گفتگو کریں اور بات کو آگے بڑھائیں امتِ
محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے اجر و ثواب اور اس کے مقام و مرتبہ کے
تعلق چند اشارات عرض کرنا ضروری خیال کرتے ہیں:

قرآنِ عزیز نے اس امت کو "خیر امۃ" کہا جس کا مفہوم بالکل واضح ہے اور اس کا سبب
س کا وہ اجتماعی فعل و عمل ہے جس کا اسی آیت (آل عمران ۔ ۱۱۰) میں متصل ذکر ہے یعنی امر بالمعروف اور
ہی عن المنکر ۔ دوسری طرف قرآنِ عزیز ہی نے اس امت کو امتِ وسط (البقرہ ۔ ۱۴۳) جس کا مفہوم
ہے اعتدال ۔ اور اسی آیت میں اس کی اس حیثیت کا ذکر ہے کہ وہ "شہادت علی الناس" کے منصب
پر فائز ہے ۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے شیخ الصحابہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے
ایک روایت نقل کی ہے جس میں اس بات کا حضور علیہ السلام نے ذکر فرمایا کہ تمہارا اور باقی امتوں کے

اوقات کی تقسیم کا معاملہ اس طرح کا ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں تمہارا وقت اتنا ہے جتنا دن میں عصر مغرب کے درمیان کا مختصر وقت ۔ تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی شخص کسی سے محنت مزدوری کراتا ہے اور نصف دن کی مزدوری ایک قیراط (ایک سکہ) ادا کرتا ہے پھر دوپہر سے عصر تک دوسرے سے اسی مزدوری پہ کام کراتا ہے اور تیسرے سے عصر سے مغرب تک کام کراتا ہے لیکن مزدوری ۲ قیراط دیتا ہے ۔ پہلا مزدور یہودی ہے دوسرا عیسائی اور تیسرا مسلمان ۔ اس پہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نے ناراضی کا اظہار بھی کیا یا بقول بعض قیامت میں کریں گے کہ ہمارا وقت زیادہ اور مزدوری کم ہے لیکن حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رب العزت نے ان سے فرمایا:

فهل ظلمتكم من حقكم شيئا ؟ تمہارے طے شدہ حق سے میں نے کچھ
قالوا لا . رکھ لیا ہے ؟ جو تمہیں نہیں دیا ۔ انہوں
نے اعتراف کیا کہ ایسا تو نہیں ۔

(بحوالہ زجاجۃ المصابیح صـ۲۹۹ ج ۵ ۔ حیدرآباد دکن)

امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (یکے از محدثین صحابہ) کی روایت نقل کی جس کا مفہوم یہ ہے کہ :

"میری امت میں میرے ساتھ سب سے زیادہ محبت تو ان لوگوں کو ہے جو میرے بعد ہوں گے لیکن میرے دیکھنے کی تمنا اور خواہش میں مبتلا ہوں گے ۔" (زجاجہ صـ۳۹۹)

حضور نبی کریم علیہ السلام نے صحابہ کرام سے پوچھا :

اى الخلق اعجب اليكم ايمانا کونسی مخلوق ایمان کے اعتبار سے تمہارے لئے باعثِ تعجب ہے ؟

صحابہ نے "ملائکہ" کا عرض کیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا :

"کہ یہ کونسا تعجب کا معاملہ ہے ؟ ملائکہ کا ہے کو ایمان نہ لاتے ، وہ اپنے رب کے پاس رہتے ہیں ۔"

اب صحابہ نے انبیاء علیہم السلام کا کہا تو آپ نے فرمایا : "یہ بھی کوئی بات نہیں ۔ وہ تو ایسی جماعت ہے کہ والوحى ينزل عليهم ان پر وحی نازل ہوتی ہے

ظاہر ہے کہ اب مسئلہ خود صحابہ کا تھا ۔ اس لئے انہوں نے اپنے متعلق عرض کیا تو پیغمبر اسلام علیہ السلام نے فرمایا :

"ومالکم لا تومنون وانا بین اظہرکم"
تم کیوں کر ایمان نہ لاتے حال یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں "
پھر آپ نے از خود ہی اس عقدہ کو حل کیا اور فرمایا :
"ان اعجب الخلق الی ایمانا لقوم یکونون من بعدی یجدون صحفا فیہا کتاب یومنون بما فیہا ۔" (البیہقی / زجاجہ ۳۹۹)
گویا آپ نے انہیں قابلِ مبارکباد و باعثِ تعجب بتلایا جو بعد میں آئیں گے اور "کتاب مبین" کو دیکھ کر اور اس میں موجود تقاضوں کو جان کر اس پر ایمان لائیں گے ۔
ایک روایت مسند احمد میں حضرت ابو امامۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی گئی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا :
"طوبی لمن رانی وطوبی سبع مرات لمن لم یرنی و آمن بی" (زجاجہ ۴۰۱)
میرے دیکھنے والوں کے لئے ایک بار مبارکباد لیکن نہ دیکھنے کے باوجود ایمان لانے والوں کے لئے سات بار مبارک باد ۔
عشرہ مبشرہ کے صحابی" امین امت حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کیا ۔
"ہم سے کوئی اچھا ہے ۔ ہم نے اسلام قبول کیا اور آپ کی رفاقت میں جہاد کیا"
اس کا جواب ملا :
نعم یکونون من بعدکم یومنون بی ولم یرونی (احمد / دارمی / زجاجہ ۴۰۰)
حضرت عبد الرحمٰن بن العلاء الحضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ .... حضور علیہ السلام نے فرمایا :
"میری امت کے آخری دور میں ایک ایسی قوم ہوگی جس کو پہلوں کی مانند اجر ملے گا ۔ (اس کا سبب یہ ہوگا کہ) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہوں گے اور اہلِ فتن سے قتال کریں گے ۔" (بیہقی / زجاجہ ۴۰۱)
(اہلِ فتن سے مراد صاحب مرقاۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خوارج، روافض اور سبھی اہلِ بدعت ہیں ۔ نیز اہلِ بغاوت بھی)
امام ترمذی قدس سرہٗ خادم رسول حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ارشادِ رسول ؐ نقل کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا کہ :

"میری امت کی مثال بارش کی سی ہے، نہیں معلوم کہ اس کے پہلے حصّہ سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے یا آخری حصّہ سے!" (ترمذی ۱/۱۰۴، ج ۵)

یہ ارشادات جہاں امّت کی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں۔ وہاں بین السطور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ہر دور و ہر قرن میں خیر و بھلائی کی جدوجہد جاری رہے گی۔ اس لئے کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں (صحابہ کرام) کی مطلق فضیلت تو ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ اس کے متعلق سرے سے دو رائیں نہیں ہو سکتیں پھر "ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" کے ارشادِ نبوّت کے مطابق متصل حضرات کی فضیلت و برتری بھی طے ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ہے کہ کبھی بارش کا ابتدائی دور زیادہ نافع ہوتا ہے کبھی آخری دور۔ بارش ہونے کے اعتبار سے ہر دور برابر ہے۔ نفع کی بات کہ کس دور سے زیادہ نفع ہوگا، الگ معاملہ ہے۔ بہرحال خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ہر دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دینی جدوجہد ان روایاتِ مبارکہ سے ثابت ہوتی ہے اور اسی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

ابتداء میں سیدنا معاویہ بن ابی سفیان اموی رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے جو روایت نقل کی گئی۔ اس میں ارشاد ہے:

اللہ تعالیٰ جس کسی کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں، اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں (مزید ارشاد ہوا کہ) میں قاسم (تقسیم کنندہ) ہوں فی الحقیقت عطا فرمانے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور ہمیشہ یہ امّت امرِ الٰہی پر قائم رہے گی، اس کے مخالفین اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ جب تک "اللہ تعالیٰ کا امر" نہ آجائے۔

روایتِ معاویہؓ میں الفاظ کی کمی بیشی اور اس کا مفہوم

بعض دوسری روایات میں کچھ الفاظ کی کمی بیشی ہے۔ مثلاً جو روایت اور اس کا مفہوم نقل ہوا اس میں پوری امّت کا ذکر ہے تو ایک دوسری روایت میں الفاظ اس طرح ہیں:

یقول لایزال من امّتی امّۃ ــــ گویا پوری امّت میں سے ایک طبقہ کا ذکر ہے۔ پھر "قائمۃ علی امر اللہ" کے بجائے یہاں دوسری روایت میں "قائمۃ بامر اللہ" ہے۔ (اے بامر دینہ واحکام شرعیتہ من حفظ الکتاب وعلم السنتہ والاستنباط منھما والجھاد فی سبیلہ والنصیحۃ لخلقہ وسائر فروض الکفایہ) لایضرھم کے بعد "من خذلھم ولا من خالفھم" ہے اور "حتی یاتی امر اللہ" کے بعد یہ جملہ ہے "وھم

علی ذلک ۔ محدثین کے بقول یہ جملہ "کہ مخالفین اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس جماعت کی مدد و نصرت ترک کر دیں گے وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ وہ اپنا نقصان کریں گے اور اپنے طور پر گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لادیں گے۔

"حتی یاتی امر اللّٰہ" سے مراد "موت" ہے کہ جب موت آجائے گی، انفرادی یا اجتماعی تب تک یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ ایک روایت میں وہ امت اور طبقہ جو "قائمۃ بامر اللّٰہ" ہوگا اس کے لئے "منصورین" کا لفظ ہے جو بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے افراد اور جماعتوں کی مدد من جانب اللّٰہ اس طرح ہوگی جس کا نقشہ قرآن نے "من حیث لا یحتسب" کے الفاظ سے کھینچا یعنی "بے وہم و گماں" اور محدثین نے "منصورین" کا ترجمہ کیا "غالبین علی اعدائھم الدین"

اصحاب حدیث و ارباب معرفت اس حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فیہ اشارۃ الی ان وجہ الارض......... الخ (زجاجہ ۰۰، ۵)

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین صلحاء سے کبھی خالی نہ ہوگی، ان صلحاء کی شان و کمال یہ ہوگا کہ وہ خود اللّٰہ تعالیٰ کے اوامر پر ثابت قدم ہوں گے۔ اللّٰہ تعالیٰ کے نواہی سے دور ہوں گے، امور شریعت کی حفاظت کرنے والے ہوں گے۔ لوگ ان کی اعانت کریں یا مخالفت، اس کی انہیں پرواہ نہ ہوگی، ان کے لئے ہر معاملہ یکساں ہوگا۔"

گویا وہ برابر اپنا کام کرتے جائیں گے اور کسی بات کی پرواہ نہ کریں گے، انہوں نے اپنی کشتیاں جلا ڈالی ہوں گی اور کسی کی مخالفت و معاونت پر نہیں بلکہ اللّٰہ رب العزت کی مدد و نصرت پر ان کی نظر ہوگی ـــــ بقول شاعر ـــ

ہم کو طوفانِ حوادث کیا ڈرائے گا حمید جب سے ہم پیدا ہوئے یہ آندھیاں دیکھا کئے

اور صاحب مرقاۃ قدس سرہٗ نے (ج ۱۱) یہ مطلب بھی لکھا:

ان شوکۃ اھل اسلام لا تزول بالکلیۃ

کہ اہل اسلام کی شوکت بالکلیہ زائل نہ ہوگی۔

حضرت عبد اللّٰہ ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہ روایت قریب قریب انہی الفاظ میں امام دارمی قدس سرہٗ نے اپنی مسند صـ۲۹۷، ج ۲ پر نقل کی اور مختلف حوالوں سے امام مسلم رحمہ اللّٰہ تعالیٰ نے اپنی صحیح صـ۱۴۳ ج ۲ پہ اسے نقل و درج کیا۔

اس روایت میں چونکہ "تفقہ فی الدین" کا ذکر ہے اس لئے حافظ ابن حجر عسقلانی

رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"اس روایت میں سبھی لوگوں پر علماء اور سبھی علوم پر فقہ کی فضیلت کا واضح اور ظاہر بیان ہے"

(فتح الباری ۔ صہ ۱۳۲، ج ۱)

طائفہ منصورہ کی تشریح | محدثین اور شراح حدیث نے اس "طائفہ منصورہ" کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بظاہر مختلف آراء کا اظہار کیا لیکن فی الحقیقۃ متعاصب کا ایک ہے۔ مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ھم اھل العلم (بخاری صہ ۱۰۸۷، ج ۲، اصح المطابع، کراچی)

اور امام کا ایک قول ان کے شارح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لکھا: ھم اھل العلم بالآثار (فتح الباری صہ ۱۳ ج ۱) امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ "اصحاب الحدیث" کہتے ہیں۔ (ترمذی صہ ۴۲ ج ۲) اسی طرح امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح مسلم میں (صہ ۱۴۳، ج ۲)، شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ غنیۃ الطالبین صہ ۱۹۸ مطبوعہ مصر میں اور خطیب بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ مجاہد، محدث، مفسر اور حنفی امام عبد اللہ ابن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے (صہ ۲۶) یہی ارشاد فرماتے ہیں:

اور دورِ حاضر کے مشہور عالم مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"بعض جگہ اہلِ حدیث، بعض جگہ اصحاب حدیث، بعض جگہ اہل اثر، بعض جگہ محدثین مرجع ہر لقب کا یہی ہے۔" (تاریخ اہل حدیث صہ ۱۲۸)

علامہ میر سیالکوٹی کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر کوئی خاص طبقہ کسی خاص سبب سے اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہلائے تو وہ سر آنکھوں پر، لیکن طائفہ منصورہ کا معاملہ کسی خاص گروہ و جماعت میں محدود کرنا کسی طور درست نہیں کیونکہ ہر قرن اور ہر دور میں ایسے رجالِ کار اور جماعتیں موجود رہیں جو اس حوالہ سے سرگرم عمل رہیں اور جن کا کردار بلاشبہ بہت بلند ہے ـــ محدثِ کبیر امام نووی قدس سرہ لکھتے ہیں:

"احتمال یہ ہے کہ یہ طائفہ مسلمانوں کے مختلف طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجا لاتا ہو مثلاً مجاہد، محدث، زاہد، آمر بالمعروف وغیر ذالک اور اس طبقہ کا ایک جگہ ہونا بھی ضروری نہیں۔ بلکہ جائز و ممکن ہے کہ یہ طبقہ اور گروہ دنیا میں بکھرا ہوا ہو"

(صہ ۱۴۳، ج ۲)

ے بعد کا دور : اہلِ سنّت اور شیعی موقف

یہاں تک جو گفتگو تھی وہ حدیث کے ایک طالب علم کے طور پر تھی، اب ہم کوشش کریں گے کہ تاریخی
ے ہم گفتگو کر کے اپنے قارئین کے سامنے وہ تصویر پیش کر سکیں، جس کے ذریعہ پورے
ان پر منکشف ہو جائیں۔

اس گفتگو کو شروع کرنے سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہماری گفتگو اہلسنّت والجماعت
ں صحیح اور مبنی بر صداقت موقف کے گرد گھومتی ہو گی جس میں نبوّت و معصومیت کا سلسلہ حضور
رتبت صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلّم کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا اور آپ کے بعد کسی بھی حوالہ سے کسی فرد
یت کو وہ مقام حاصل نہیں کہ اسے حلال و حرام کے اختیارات حاصل ہوں یا یہ کہ ایسے منصب کا حامل
ا کے ساتھ وحی کا معاملہ ہو۔ اس قسم کا تصوّر شیعی ہے جو حضور ختمی مرتبت کے بعد ۱۲ حضرات کیلئے
یں سے ان کے بقول ۱۱ آچکے بارہویں آئیں گے) ایسے ہی اختیارات و مقام کے قائل ہیں جو انبیاء کا
ہے بلکہ وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ "امامت برتر از نبوت است"۔

ی موقف کی خرابیاں

اس تصوّر کی رو سے حضور علیہ السلام کے سانحہ ارتحال کے بعد ۲۵ سال تک کا عرصہ جو امّت کی مجموعی روش کے اعتبار سے نہایت درجہ
نذار و تابناک ہے محض خلار کا دور ہے کہ اس دور میں بقول ان کے غاصب (نقل کفر کفر نہ باشد) مسلط
ہے اور خلافت کے حقیقی حقدار (امام اوّل) سیّدنا علی رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ جان بچانے کی فکر میں مبتلا رہے
ا برس کا خلائی دور ختم ہوا تو خلافت کے حقیقی وارث کو اس کا مقام ملا اور وہ بھی اس طرح کہ اسے چین
ے نہ بیٹھنے دیا گیا تا آنکہ اس کی شہادت ہو گئی، اس کے بڑے صاحبزادے (امام ثانی) سیدنا حسن
ی اللّٰہ تعالیٰ عنہ اس منصب پر فائز ہوئے۔ لیکن چند ماہ بعد بطائف الحیل اس منصب سے الگ
د گئے۔ پھر وہ دن اور یہ دن نو اماموں کا دور بیت گیا اور بات نہ بن سکی، اتنا ضرور ہوا کہ یہ امام خاموشی
ے سرچھپائے اپنے شیعوں کو یہ تلقین کرتے رہے کہ بس خاموشی سے وقت گزارو اور بارہویں امام کا
انتظار کرو جو تمہارے غلبہ کا نشان ہو گا۔ اب صدیاں بیت گئیں وہ امام ابھی نہیں آئے اور دیکھیں کب
ن کا ظہور ہوتا ہے!

اس تصوّر کو مان لینے کا مطلب سیدھا سادا یہ ہے کہ حضور نبی اکرم علیہ السلام دنیا سے کیا رخصت
ہوئے ان کا سارا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔ اور اب تک اس کے سلجھنے کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو رہی، لیکن ظاہر
ہے کہ ہم اس تصوّر کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں مان سکتے، ہمارے نزدیک اسلام اور اسلامی تاریخ کی یہ

تصویر خود حضور علیہ السلام کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے ــــ ہمارے نزدیک اسلامی تاریخ ایک جگمگاتی اور روشن تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں کئی مواقع پر زبردست آندھیاں چلیں لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ کے بقول

اِنَّ شَوْکَۃَ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لَا تَزُوْلُ بِالْکُلِّیَّۃِ !

حدیثِ تجدید ساتھ ہی ذرا تائید کے طور پر اس حدیث کو ملاحظہ فرمالیں :

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اِنَّ اللہ عزوجل یَبْعَثُ لھٰذہِ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ مَن یجدد لھا دینھا

(ابوداؤد عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بحوالہ مرقاۃ ص۳۰۲ ج ۱ مطبوعہ ملتان)

اس روایت میں ہر صدی کے سرے پر (صدی کا ابتدائی سرا یا انتہائی سرا جبکہ علم اور سنت کا علم گھٹ جائے اور جہالت و بدعات کی گرم بازاری ہو جائے" مرقاۃ ص۳۰۲ ج ۱) ایک مجدد کے مبعوث کئے جانے کا ذکر ہے جس کا کام بقول صاحبِ مرقاۃ یہ ہوگا۔

"سنت کا معاملہ بدعت سے واضح کرے گا، علم کو کثرت سے پھیلائے گا، اہلِ علم کی عزت کا باعث ہوگا، بدعت کا قلع قمع کرے گا اور اہلِ بدعت کی کمر توڑ دے گا"

صاحبِ مرقاۃ نے صاحب جامع الاصول کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "ہر شخص نے اس حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے ہم ذوق و ہم مسلک علماء کی اس ضمن میں ایک فہرست تیار کر دی، جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شافعی مسلک کے اکابر علماء کی ایک فہرست تیار کر دی ــــ جو بہر طور دل لگنے والی بات نہیں۔

حدیثِ تجدید پر اصولی گفتگو دورِ حاضر کے معروف عالم مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے معروف رسالہ "الفرقان" کا تقسیم ملک سے قبل ایک عظیم الشان نمبر نکالا تھا جس کی نسبت حضرت الامام مجدد الف ثانی قدس سرہ کی طرف تھی۔ اس نمبر میں حضرت مجدد سے متعلق بہت نہایت درجہ قابلِ قدر مضامین تھے جن میں سے مولانا عبدالشکور لکھنوی (امام اہلسنت) مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور خود مولانا نعمانی کے بہت قیمتی مضامین ہیں، اس میں ایک مضمون حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تھا جس میں اس حدیث پر تفصیلی بحث تھی ــــ اس وقت اس کے نقل اور دہرانے کی ضرورت نہیں، صاحبِ مرقاۃ نے جو اصولی گفتگو کی اس کا خلاصہ دیکھ لیں۔ بات بن جائے گی۔

والاظہر عندی واللہ تعالیٰ اعلم ...... الخ

اس سے ان کی گفتگو کا آغاز ہوتا ہے، فرماتے ہیں: جو تجدید کا کام کرے گا وہ شخص واحد نہیں ہوگا بلکہ اس سے مراد ایک جماعت ہے جو تجدید کا فرض سرانجام دے گی، ایسی جماعت ہر ملک اور شہر میں ممکن ہے۔ ہر فن اور علم کے شعبہ میں ایسی جماعتیں ممکن ہیں، جو ان کے بس میں ہو تقریراً یا تحریراً۔ ان کی یہ کاوشیں علم کے بقا کا سبب ہوں گی۔ "امر الٰہی" (موت یا قیامت) تک یہ کاوشیں اس کا باعث ہوں گی کہ علم محفوظ رہے اور مٹنے کے خطرات اس پر طاری نہ ہوں ـــــ

صاحبِ مرقاۃ نے جو موقف اختیار کیا واقعہ یہ ہے کہ ہر دور کے ذمہ دار اہل علم و محدثین کا قریب قریب یہی موقف ہے کہ ایسا کام اللہ رب العزت ہر دور اور ہر ملک و علاقہ میں مختلف افراد، جماعتوں اور اداروں سے لیتے رہے ہیں، لے رہے ہیں، لیتے رہیں گے۔ پہلی روایات کے ساتھ یہ روایت بھی اس کی مؤید ہے کہ "خادمانِ دین" ہر دَور میں موجود رہیں اور تاریخی حقائق بھی اسی کی شہادت دیتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے بعد کا دور جسے خلافت راشدہ کا دَور کہا جاتا ہے، اس کی عمر عام حضرات کے نزدیک ۳۰ برس ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان غنی اور سیدنا علی کے بعد (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا چند ماہ کا دور بھی اس میں شامل ہے۔ اسی بنیاد پر انہی حضرات کو خلفاء راشدین کہا جاتا ہے۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ حکومت کی نوعیت !!

لیکن میں اس معاملہ میں بڑے احترام سے اختلاف کرتے ہوئے سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس فہرست میں شامل کرتا ہوں وجہ یہ ہے کہ وہ آخری صحابی ہیں جنہیں حکومت وسلطنت کا موقعہ ملا۔ صحابہ کی جماعت کو اللہ رب العزت نے "راشدون" (حجرات: ۷) کہا۔ وہ اہلسنت کے اجتماعی موقف کے مطابق "عدول" اور "معیار حق و صداقت" ہیں ـــــ دورِ حاضر کے محدثِ کبیر مولانا ظفر احمد عثمانی الحنفی التھانوی قدس سرہ نے مولانا مودودی کی کتاب "خلافت وملوکیت" کا ایک جواب لکھا تھا جو کوثر نیازی صاحب کے رسالہ "شہاب" میں بالاقساط نکلا۔ حضرت امیر شریعت السید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ الباری کے خلف الرشید سید عطاء المنعم صاحب بخاری نے مولانا المرحوم کی تحریری اجازت سے ایک جاندار مقدمہ کے ساتھ ان اقساط کو کتابی شکل میں شائع کیا، عنوان تھا "براءۃ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ" اس جواب پر جماعت اسلامی کے حلقوں کی جوابی کارروائی ہوئی

مولانا عثمانی کی نگرانی میں ان کے صاحبزادے نے جواب لکھا جو سید عطاء المنعم صاحب نے "تذکرہ یاراں" کے نام سے شائع کیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب جیسے محدث اور نقاد نے جس خوبصورتی سے چیزیں لکھیں یا لکھوائیں، وہ ان کا اہلسنت پر احسان ہے اور ان کی زبردست تدریسی اور محدثانہ خدمات پر زبردست اور خوبصورت اضافہ۔ اس میں مولانا نے بعض احادیث صحیحہ نقل کی تھیں جن میں اسلام کی چکی تیس برس سے زائد چلنے کا بھی ارشاد ہے، انہی روایات سے مولانا المرحوم نے سیدنا معاویہ کے لئے بھی استدلال کیا کہ انہیں اس فہرست میں شامل کیا جائے اور یہ کہ وہ اسمیں شامل ہیں۔ احقر نص قرآنی "راشدین" کے حوالہ سے پہلے سے ایک ذہن رکھتا تھا۔ مولانا عثمانی کے اس ارشاد سے اور تقویت ملی اور اطمینانِ قلب نصیب ہوا۔ جزاھم اللہ تعالیٰ ورحمھم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

بہرطور ان حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کا دورِ سعادت تو ایسا ہے کہ اس کے متعلق کسی لمبی چوڑی گفتگو کی ضرورت نہیں، محدثین اور علماءِ اہلسنت کے بقول کسی شخص کے "صحابی" مان لینے کا معنی ہی یہ ہے کہ وہ مجموعی خوبیوں کا حامل ہے اور یہ کہ اس میں ہر وہ خوبی اور کمال ہے جسے خوبی اور کمال سمجھا جا سکتا ہے ــــــ ان کے دور میں جس طرح اسلام کی گاڑی آگے بڑھی اور قافلہ اہلِ اسلام نے اقصائے عالم میں پہنچ کر دین اسلام کا پھریرا لہرایا وہ تاریخ کا تابناک باب ہے ایسا باب جس کا دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں۔ اس دور میں نہ صرف زمین فتح ہوئی، ملک قبضے میں آئے بلکہ سب سے بڑھ کر اسلام کے پیغامِ حیات، اسلام کی دعوت اور اس کے نظریۂ حیات کو ترقی ہوئی اسلامی عقائد اور اسلامی اعمال کی روشنی چار سو پھیلی اور گلستانِ اسلام کی خوشبو سے ساری دنیا مہک اٹھی۔ جو لوگ اس چھتری تلے اس طرح آئے کہ انہوں نے اسے اپنا لیا تو وہ دارین کے حوالہ سے بامراد و کامیاب قرار پائے لیکن جنہوں نے اسے بطور فکر نہ اپنایا وہ بھی اس کی برکات، اس کے عدل اور اس کے ہمدردانہ رویہ سے مستفید ہوئے۔ کیونکہ بیگانہ رہ کر بھی اس ماحول میں انہیں جان و مال اور تحفظ حاصل تھا۔"

اس میں شک نہیں کہ درمیان کا کچھ حصہ بالخصوص خلافت مرتضوی کا دور اس انداز سے گذرا کہ اس میں افراتفری اور باہمی انتشار کی سی کیفیت رہی لیکن باہمی احترام کا معاملہ ایسا تھا کہ اس سرِ مو فرق نہ آیا۔ اسلامی قدروں اور اخلاقی روایات کو گزند نہ پہنچی۔ اور بنیادیں سلامت رہیں ــــــ!!

امیر یزید کا معاملہ اور اس سلسلہ کی بعض گذارشات ــــ!

سیّدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد" واقعۂ کربلا" ایک ایسا واقعہ ہے جو اب تک امّت کے گلے کا ہار بنا ہوا ہے۔ جس گروہ اور طبقہ کے نزدیک" امامت" ہی سب کچھ ہے اس نے اس کے حوالے سے جو ادھم مچایا یا مچا رہے ہیں' اس کا نہ گلا نہ شکوہ لیکن ستم یہ ہے کہ برادرانِ اہلسنّت نے ایک تاریخی واقعہ کو دین اور عقیدہ کا حصّہ بنا کر اغیار کے پروپگنڈا کا اپنے آپ کو شکار کر لیا۔ اگر قاضی ابوبکر بن العربی' امام ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیز قدس سرہم جیسے حضرات کا ذکر آتا ہے تو بہت سے دانشور انہیں صحابہ کرام کا وکیل صفائی کہہ کر مسترد کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ گویا صحابہ کا وکیل صفائی ہونا جرم ہے۔ یزید کی جانشینی کا معاملہ ہے تو آپ دیکھیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے طیب و پاک بیٹے کی جانشینی کا سوال ہوا' سوال کرنے والے صحابہ' سوال ہوا محدّثِ امّت فاروق اعظم سے' حرام نہ تھا' حرام ہوتا تو کوئی سوال نہ کرتا' فاروق اعظم نے گریز کیا تو کسی دوسرے سبب' فرمایا کہ یہ نعمت ہے تو بنو عدی اپنا حصہ پا چکے' آزمائش ہے تو بھی اب دوسرے آگے بڑھیں ــــــــ مزید فرمایا کہ کیا اس شخص کو نامزد کر دوں جسے طلاق دینی بھی نہیں آتی! سیّدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ان کے صاحبزادے سیّدنا حسن کا سوال ہوا' یہاں بھی سائل آج کے دین داروں سے زیادہ دین دار تھے۔ سیّدنا مرتضیٰ نے جواب دیا کہ میں تم کو نہ اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے روکتا ہوں ــ یہ تمہاری صوابدید کا معاملہ ہے ــــ تو جب امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بعض صحابہ نے ملّی مصالح کے تحت اس کا تقاضہ کیا تو ظاہر ہے کہ حرام کام تو نہیں کیا؟ یزید کے شخصی کردار کا معاملہ کیا تھا ــــ واللہ تعالیٰ اعلم ـــ کسی کو علم نہیں' کہانیاں ہیں اور روایات۔ جب پہلے سے ایک بات طے کر لی گئی کہ بنو امیّہ بُرے ہیں۔ (معاذ اللہ) تو اب ان کے ایک فرد کو کوئی اچھا کاہے کو کہے؛ لطیفہ سمجھیں یا کچھ ــــ ہم علوی سیّدنا علی مرتضیٰ سے نسبت و تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے باوا محمد ابن حنفیہ رحمہ اللہ تعالیٰ انہی کے فرزند تھے ــــ ان کی شہادت یزید کے حق میں تاریخ میں بہت اچھی ہے اور شہادت مشاہدہ کی بنیاد پر ہے ــــ پھر اس کو ذہن میں رکھیں کہ کربلا کے افسانوی انداز سے ہٹ کر واقعاتی حیثیت سے سیّدنا حضرت حسین سلام اللہ تعالےٰ علیہ و رضوانہٗ کی "تین شرائط" ایسی ہیں (اور وہ شرائط خود شیعہ کی کتب میں موجود ہیں) جس سے معاملہ صاف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر مسئلہ وہ تھا جس کا اظہار آج ہو رہا ہے کہ اسلام کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور نظام کا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا تو سیّدنا علی کا بیٹا مکّہ واپسی' سرحدات پر مصروفِ جہاد ہونے یا یزید کے پاس جا کر اپنا معاملہ طے کرنے کی بات نہ کرتا (بعض روایات میں اضع یدی علی ید یزید کے الفاظ ہیں) سیّدنا

[illegible] اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ عقیدت و مروّت کا مظاہرہ کر کے انہیں مدینہ سے جو لوگ کوفہ لائے انہوں نے اب بھی اپنا کام دکھایا اور حضرت حسین کو سفر پر مجبور کیا اور جب اثنائے سفر ان شرائط کو سنا تو بھ گئے۔ اپنے ہزاروں خطوط کی واپسی کا مطالبہ کیا، حضرت حسین کے انکار پر شب خون مار کر انہیں خون میں نہلا دیا ـــــــ عقل کی بات ہے کہ وہ رخ ہوتا جو بیان کیا جاتا ہے تو سیدنا حسین کے قافلہ میں خواتین اور بچے نہ ہوتے، کچھ اور ہوتا، پھر صحابہ کے لئے دفاعی مورچے بنانے والے سُنّی اس پر غور کریں کہ اس انسان کی کی بیعت بہت سے صحابہ نے کی جن میں شیخ الصحابہ سیدنا عبداللہ بن عمر اور ترجمان القرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم شامل ہیں ـــــــ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ جیسے فقیہہ النفس اور محدّث کبیر نے بہت اچھی اور صحیح بات ارشاد فرمائی۔

یزید پر لعنت کے سلسلہ میں ایک تفصیلی سوال کے جواب میں حضرت مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"حدیث صحیح ہے کہ جب کوئی کسی پر لعنت کرتا ہے، اگر وہ شخص قابل لعن کا ہے تو لعن اس پر پڑتی ہے ورنہ لعنت کرنے والے پر رجوع کرتی ہے۔ پس جب تک کسی کا کفر پر مرنا محقق نہ ہو جاوے اس پر لعنت کرنا نہیں چاہئے کہ اپنے اوپر عود لعنت کا اندیشہ ہے لہٰذا یزید کے وہ افعالِ ناشائستہ ہر چند موجب لعنت کے ہیں مگر جس کو محقق اخبار اور قرائن سے معلوم ہو گیا کہ وہ ان مفاسد سے راضی اور خوش تھا اور ان کو مستحسن اور جائز جانتا تھا اور بدون توبہ کے مر گیا تو وہ لعن کے جواز کے قائل ہیں اور مسئلہ یوں ہی ہے اور جو علماء اس میں تردد رکھتے ہیں کہ اوّل میں وہ مومن تھا اس کے بعد ان افعال کا وہ مستحل (حلال جاننے والا) تھا یا نہ تھا اور ثابت ہوا یا نہ ہوا بتحقیق نہیں ہوا۔ پس بدون تحقیق اس امر کے لعن جائز نہیں۔ لہٰذا وہ فریق علماء کا بوجہ حدیث منع لعن مسلم کے لعن سے منع کرتے ہیں اور یہ مسئلہ بھی حق ہے۔ پس جواز لعن و عدم جواز کا مدار تاریخ پر ہے۔ اور ہم مقلدین کو احتیاط سکوت میں ہے کیونکہ اگر لعن جائز ہے تو لعن نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، لعن نہ فرض ہے نہ واجب نہ سنّت نہ مستحب محض مباح ہے اور جو وہ محل نہیں تو خود مبتلا ہونا معصیت کا اچھا نہیں۔ فقط واللہ اعلم (فتاویٰ رشیدیہ مبوّب ص ۲۵۰ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء)

اس دَور کے ضمن کی تاریخ روایات

ہم نے پہلی صدی ہجری کے اس قضیہ کے متعلق یہ گفتگو اور اس ضمن میں ایک محقق و محتاط عالم کا فتویٰ اس لئے پیش کیا کہ یہیں سے ہماری تاریخ کو غلط رُخ پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی اور اسی حوالہ سے کہا جاتا ہے کہ بس چند سالوں بعد اسلام

کی توچھٹی ہوگئی پھر ایک کھیل تھا جو اب تک کھیلا جا رہا ہے اور یہ کہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم" کے زمانہائے خیر و برکت کے افراد کے علی الرغم ہم زیادہ دین دار مصلح اور خادم دین وملت ہیں کہ اس گاڑی کو جو پہلی ہی صدی میں راہ راست سے مڑ گئی تھی، دوبارہ صحیح رُخ پہ ڈالنے کی فکر کر رہے ہیں؟ اسلاف و اکابر کا حوالہ دے کر ایک جویائے حق کا منہ بند کرنے والے حضرات کم از کم اتنا سوچیں کہ اکابر و اسلاف کی فہرست میں سرے پہ صحابہ کرامؓ کے اسماءگرامی آئیں گے جو امّت کے لئے معیارِ حق و صداقت ہیں، انہوں نے اور ان کی ذمّہ دار شخصیات نے جب یزید کی بیعت کرلی اور کسی قسم کا اقدام نہیں کیا تو اس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہوجاتی ہے کہ کوئی کھلا کفر اس میں نہ تھا اسلام کی روایاتِ حسنہ کو گزند نہیں پہنچا تھا۔ اس حقیقت کو ہمارے دور کے مشہور آغا خانی رہنما سر آغا خان اوّل نے محمد حارث صاحب کی کتاب "گریٹ دی امیّہ" کے مقدمہ میں تسلیم کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ "بنو امیّہ" کے عہد معدلت گستر جس میں علم و عرفان کے چشمے پھوٹے اور ابلے، اس کو عوام کے سامنا لانا بے حد ضروری ہے، لیکن برا ہو تعصبات اور کج روی کا کہ روافض کے ہاتھ مفضوط کرنے کی غیر شعوری کوششیں ہمارے یہاں زوروں پر ہیں، انحصار تاریخ پہ ہے، کونسی تاریخ جو مفید مطلب ہو ورنہ تاریخ میں یہ بھی تو ہے کہ:

وقد اورد ابن عساکر احادیث فی ذم یزید بن معاویہ کلہا موضوعة لا یصلح شئی منہا (البدایہ ص۲۳۱، ج ۸)

مؤرخ ابن عساکر نے یزید ابن معاویہؓ کی مذمت کے سلسلہ میں جس قدر روایات بیان کی ہیں وہ تمام من گھڑت ہیں ان میں سے ایک بھی تو صحیح نہیں۔

اور صاحب "موضوعاتِ کبیر" جیسے سکّہ بند حنفی محدّث چلّا چلّا کر کہتے ہیں کہ:

"روافض نے سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہل بیت کے فضائل سے متعلق قریب قریب تین لاکھ روایتیں گھڑیں۔" (موضوعاتِ کبیر ص۱۰۶)

ساتھ ہی وہ فرماتے ہیں:

"حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور دیگر بنو امیّہ خصوصاً یزید، ولید اور مروان بن حکم کی برائی اور خلیفہ منصور و سفاح کی تعریف سے متعلق روایات بھی من گھڑت اور وضعی ہیں۔" (ص۱۰۶)

"خیر القرون" کے متعلق کم از کم اس بات کا لحاظ رہنا چاہیئے کہ اس دور کے حضرات کی تعریف

بیت اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول علیہ السلام نے کی۔ اسلام کی لئے ان کی قربانی و ایثار
یصر و کسریٰ جیسی متمدن اور طاقتور حکومتوں سے ٹکر جیسی حقیقتوں کو سامنے رکھیں اور پھر سوچیں
یا سالینؑ کے حوالہ سے جو داستان ہے وہ اگر اسی طرح سچی ہے جو ہمارے اپنے ہمارے حلق سے
نے کی فکر میں ہیں تو پھر صحابہ کرام کس موڑ پر کھڑے ہوں گے ؟

اسلام — منزل بمنزل

اسی طرح بنو امیہ کے بعد ایک لمبے عرصہ تک مسلم سلاطین اور امرا اپنی ہزار شخصی کمزوریوں کے باوصف دین اسلام کے معاملہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کرتے رہے (جس کی تفصیل کا موقعہ نہیں) رہ گیا علماء رجال دین کا جنہوں نے اپنے تمام ہموم و غموم کو بس ایک ہی "غم" کی نذر کر دیا اور زندگی کے لیل و نہار دعوت دین و ترویج دین کے لئے کھپا دیا" ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہم نے بڑی دقتِ نظر سے ایک مطالعہ کے دوران مختلف صدیوں کے ان رجال دین کی فہرست مرتب کی ہے جو اس معیار پر طور پورے اترتے ہیں۔ ان رجال دین میں محدث و مفسر فقیہہ و مقنن اور مجاہد فی سبیل اللہ سبھی طرح کے لوگ ہیں اور گویا گلدستہ تجدید کے رنگا رنگ پھول۔ گو محض نام گنوانا بعض طبائع پر گراں گذرے گا ن ایک تلاش ہے اس لئے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے "تاکہ نوجوانان عزیز ذخیرہ کتب سے ان حضرات کے جم (حالاتِ زندگی) پڑھ کر ہمارے دعویٰ کو پرکھ سکیں ۱۳۲ھ میں خلافت بنو امیہ کا اختتام ہوتا ہے اور اس سے متصل بنو عباس کی خلافت کی ابتدا ہوتی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں قریب ری دور تک صحابہ کرام علیہم الرضوان کے وجود سے یہ دنیا معمور رہی اور صرف خطۂ عرب ہی نہیں ین و بلوچستان تک ان حضرات کی بغرض دین آمد ثابت ہے۔ پھر یہی دور کبار تابعین کا ہے، ن کے متعلق ارشاداتِ نبوت میں بڑے فضائل موجود ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات ملحوظ خاطر رہے مظلوم بنو امیہ نے انہی سالوں (ابتداء ۱۳۸ھ) اندلس (جسے مغرب کہا جاتا ہے) میں ایک ظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی خدمات کا انکار آسان نہیں۔ اور ایسا کوئی شپرہ چشم ہی رسکتا ہے — اب ذرا دوسری صدی کے کبار رجال کے محض اسمار گرامی دیکھ لیں۔ پھر اسی تسلسل سے اگلی صدیوں کا ذکر آئے گا۔

عمر بن عبد العزیز، عطا بن یسار، قاسم بن محمد بن ابی بکر، طاؤس بن کیسان، حسن بصری، مکحول، وہب بن منبہ، حماد الکوفی، شہاب الزہری، مالک بن دینار، ایوب سختیانی، رابعہ بصری، ابن ابی لیلیٰ، جعفر صادق، ہشام (محدث بصرہ)،

امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی، امام زفر، سفیان ثوری، ابراہیم بن ادھم، امام مالک، عبداللہ بن مبارک، قاضی ابویوسف، امام محمد، ابوبکر بن عیاش، وکیل بن الجراح، یحییٰ بن سعید القطان، سفیان بن عیینہ، معروف کرخی، زیاد (فقیہہ اندلس) موسیٰ کاظم، حماد بن ابی حنیفہ، عبدالعزیز بن ماجشون رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ان حضرات میں سے اکثر وہ بزرگ ہیں جنہیں تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جبکہ باقی "تبع تابعین" ہیں اور سب کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ تیسری صدی جن حضرات کی خدمات روشن ومنور ہے، ان کے اسماءِ گرامی کا نامکمل خاکہ یہ ہے:

امام شافعی، حسن بن زیاد، ابوداؤد طیالسی، فضل بن ربیع، عیسیٰ الغافقی (مفتی اندلس) یحییٰ بن معین، ابوبکر بن ابی شیبہ، مفتی بلخ ابراہیم الباہلی، امام احمد بن حنبل، قاضی یحییٰ بن اکثم، ذوالنون مصری، سری سقطی، امام بخاری، حسن عسکری، امام مسلم، ابراہیم المزنی، امام ابوداؤد، ابن قتیبہ، امام ترمذی، امام دارمی، ابوزرعہ دمشقی، قاضی ابوبکر شیبانی، جنید بغدادی، محمد بن یزید المحدث، عبران المروزی محدث رحمہم اللہ تعالیٰ۔

چوتھی صدی کے رجالِ دین وخدامِ اسلام

امام نسائی، ابراہیم الخاطی مفسر، فقیہہ مغرب عثمان الحداد، ابویعلی الموصلی، حافظ دولابی ابوعوانہ (صاحب مسند) ابونعیم الفقیہہ، ابوالحسن الاشعری، ابوبکر بن الانباری، شیخ کوفہ ابوالحسن، حسان فقیہہ الاموی، حافظ عبدالباقی، ابن حبان، احمد السندی (سندھی) محدث قرطبی، ابن ماسی محدث، ابوالنصر الصوفی، محدث اندلس محمد بن مفرج، امام دارقطنی، صاحب الصحاح الجوہری، حافظ خلف مغربی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

پانچویں صدی ہجری (اسی صدی میں عظیم درسگاہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی ابتدا ہوئی)

ابوحسین الفقیہہ، قاضی منصور ہراتی، فقیہہ خراسان ابوبکر المروزی، محدث بغداد ہبۃ اللہ، قاضی عبدالوہاب، حافظ کبیر احمد البرقانی، امام المفسرین ابواسحٰق، فقیہہ احناف قدوری، حافظ المستغفری المحدث، فقیہہ موالک ابوذر، شیخ الاسلام ابوعثمان الصابونی، ماوردی صاحب الاحکام السلطانیہ، ابن حزم الظاہری، امام بیہقی، ابوجعفر بن ابی موسیٰ الفقیہہ، امام الحرمین الجوینی، قاضی القضاۃ محمد الناصحی، یوسف بن تاشفین رحمہم اللہ تعالیٰ۔

چھٹی صدی ہجری:

امام غزالی، شیخ الحنفیہ ابوبکر بن الفضل، ابن رشد القرطبی، محدث قرطبہ ابوبحر سفیان، قوام السنۃ اسمٰعیل الحافظ الاصبہانی، حافظ ابوسعد البغدادی، ابوبکر بن العربی، شہرستانی، قاضی ابن رشد، شیخ عبدالقادر جیلانی، نورالدین زنگی، امام سہیلی، صلاح الدین ایوبی، قاضی ابوبکر الاموی، عبدالوہاب الحنفی، ابوعلی الفارسی، رحمہم اللہ تعالیٰ

ساتویں صدی ہجری:

مفسر رازی۔ ردزی خاں صوفی مفسر، عطار، نجم الدین کبریٰ، قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ اجمیری چشتی، الصوفی ابن العربی، شمس تبریز، عزالدین عبدالسلام دمشقی، شیخ فرید گنج شکر، مولانا روم، سعدی شیرازی، حضرۃ الشیخ صابر کلیری رحمہم اللہ تعالیٰ۔

آٹھویں صدی ہجری:

ابن دقیق العید، بوعلی قلندر پانی پتی، خواجہ نظام الدین دہلوی، امام ابن تیمیہ، امیر خسرو، ابن قدامہ حنبلی، ذہبی، امام ابن قیم، مفسر سبکی، نصیرالدین چراغ دہلوی، فقیہ عماد، مخدوم شرف الدین بہاری، حضرت جہانیاں جہاں گشت (اُچ بہاولپور) شیخ زادہ الحنفی رحمہم اللہ تعالیٰ

نویں صدی ہجری:

خواجہ گیسو دراز، محدث بعلبک تاج الدین، قاضی شرف الدین یمانی، علامہ مقدسی، حافظ ابن حجر عسقلانی، خواجہ بہاءالدین نقشبند، شہاب الدین احمد جونپوری، ابن امیر الحاج، خواجہ عبیداللہ احرار نقشبندی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

دسویں صدی ہجری:

ملا زادہ سمرقندی فقیہ احناف، امام سیوطی، امام سمہودی، صاحب خزانۃ الفتاویٰ، قسطلانی شارح البخاری، قاضی نجم الدین شافعی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، طاش کبریٰ، شیخ زادہ حنفی، شیخ علی متقی ہندی، غزالی احمد آبادی، مولانا عرفی رحمہم اللہ تعالیٰ

گیارہویں صدی ہجری:

حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی الشیخ احمد سرہندی، حضرت میاں میر لاہوری، شیخ محب اللہ الہ آبادی، حضرت شیخ عبدالحق دہلوی، حاجی خلیفہ، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ہویں صدی ہجری:

حضرت کلیم اللہ جہان آبادی، امام شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت شاہ عبدالحکیم لاہوری، نواب نجیب الدولہ، حافظ رحمت خان (مجاہد کبیر)، حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید، خواجہ میر درد۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ھویں صدی ہجری:

بیہقیٔ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ مجاہد اُمت شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی، بحرالعلوم عبدالعلی، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالحق، امیر کبیر حضرت سید احمد شہید، مجاہد کبیر شاہ اسمٰعیل شہید، شاہ رفیع الدین، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا فضل امام، مولانا فضل حق خیر آبادی۔

پندرھویں صدی ہجری:

مولانا عبدالحی فرنگی محلی، نواب صدیق حسن خان، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، سید جمال الدین افغانی، مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی، فقیہ العصر مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا میاں نذیر حسین دہلوی، انور پاشا، جمال پاشا، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا شبلی نعمانی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، علامہ رشید رضا مصری، الشیخ محمد عبدہٗ، مولانا عبدالعزیز گوجرانوالہ، مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری، مولانا محمد اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، سید سلیمان ندوی، مولانا محمد میاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا برکات احمد ٹونکی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری، شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (وغیرہم) رحمہم اللہ تعالیٰ۔

زندہ افراد و شخصیات کی ضرورت کیوں؟

یہ فہرست ظاہر ہے نہ آخری ہے نہ حتمی، ہم نے تو اپنے محدود مطالعہ کے پیش نظر "رجالِ دین" میں سے چند حضرات کے نام لکھے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی اس سرزمین پر ہر دَور

ہر قرن اور علاقہ میں ایسے حضرات وافر تعداد میں موجود رہے جنہوں نے دینِ اسلام کی خدمت کو اپنا مقصدِ زندگی بنایا۔ بہت سے اہلِ علم و اہلِ قلم نے اس سلسلہ میں مفید تصانیف و تالیفات فراہم کی ہیں۔ جن میں ایسے رجالِ کار کا ذکر ہے، اس دور کے نامور اہلِ قلم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، جن کا حضرت الامیر السید احمد شہید قدس سرہ سے خاندانی تعلق ہے، نے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے نام سے پانچ ضخیم جلدیں مرتب کی ہیں، جبکہ ایسے رجال دین کے متعلق ان کی مستقل تصانیف اور مضامین اس کے علاوہ ہیں۔ مولانا کا ایک مضمون ان سطور کی تحریر کے وقت اچانک نظر سے گذرا، جو لکھنؤ کے ہی ایک دوسرے مصلح عالم مولانا محمد منظور نعمانی کے رسالہ "الفرقان" کی اشاعت خصوصی بحریہ ربیعین وجمادی الاولی ۷، ۱۳۷ھ میں "تاریخ اسلام میں اصلاح و انقلاب کی جد وجہد اور اس کی اہم شخصیتیں" کے عنوان سے چھپا۔ الفرقان کے معروف سائز کے ۳۲ صفحات پر مشتمل یہ مضمون بڑا وقیع ہے۔ یہ مضمون دراصل بنیاد ہے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کی جو بعد میں مولانا کے قلم سے نکلی۔ حضور علیہ السلام آخری نبی ہیں لیکن آپ کے دین کا معاملہ ایسا ہے کہ دنیا سے ظاہری طور پر آپ کے تشریف لے جانے کے بعد بھی اسے باقی رہنا ہے، اس وقت تک جب تک اللہ چاہیں گے، پھر یہ کہ زمانہ متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ آئے دن نئے نئے مسائل کا پیدا ہونا قدرتی سی بات ہے، اس لئے بقول مولانا یہ سارا سلسلہ دعوت و تجدید اسلام کی بقا اور اس کے تسلسل کے قدرتی انتظامات کا حصہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کی تاریخ میں غیر انبیاء میں اس نوع کی شخصیات کا موجود نہ ہونا اور اس امت میں غیر انبیاء میں سے ایسی شخصیات کا موجود ہونا قدرتی بات ہے۔

وہ فرماتے ہیں :-

> "دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا اور اپنی خصوصیات زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوتِ عمل پیدا کر دیں۔ زندگی کے تقاضے ہر وقت جوان ہیں۔ مادیت کا درخت سدا بہار ہے۔ نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتاً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُرجوش داعیوں اور کامیاب

مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ جنہوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔

اگرچہ پیر ہے مؤمن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابلہ جب تک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی۔ تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا ٹکنا رہنا مشکل ہے۔ (الفرقان صد ۱۴۱)

محدثین اور فقہاء امت کے دو محسن طبقے

امت کے بڑھتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے اقتدار کے پیش نظر دو فوری ضرورتیں ایسی تھیں جو اگر پوری نہ ہوتیں تو دین اسلام دم توڑ کر رہ جاتا اور ایسا ہوتا "وعدہ حفاظت ربانی" کے منافی ہوتا۔ ان دو ضرورتوں میں سے پہلی ضرورت مولانا کے نزدیک (اور یہ بالکل صحیح ہے) حدیث و سنت کے سرمایہ کی حفاظت و تدوین کی تھی جو کلام الہی کے سمجھنے کا بنیادی ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ "نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا۔

اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچہ کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے، وہ زمانہ نبوت کے ۲۳ برسوں کا ایک طرح کا روزنامچہ ہے جو کسی پیغمبر کو حاصل نہ تھا، اس کا ضائع ہو جانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا۔ (الفرقان صد ۱۶۲)

جو لوگ "محض قرآن" کے کافی ہونے کے دعویدار تھے یا ہیں یا جن کا خیال یہ تھا یا ہے کہ حدیث و سنت سے صرف نظر کر کے قرآن کی تہہ تک پہنچنا ممکن ہے، انہوں نے کل بھی ٹھوکر کھائی آج بھی ٹھوکر کھا رہے ہیں، اسی طرح فقہ و قانون شریعت اور استنباط و اجتہاد سے ناک منہ چڑھانے والے اور "قرآن و سنت" کو کافی شافی سمجھنے والے کل بھی تہی دامن تھے اور آج بھی وہی حال ہے، مولانا کے بقول:

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی۔ قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے اصول و کلیات موجود ہیں اور ان سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بیحد متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے

کے لئے اور ہر نئی حالت اور ضرورت کے لئے ان کی ترجمانی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔

(صـ۱۶۲)

پھر انہوں نے بڑی تفصیل سے ان دو طبقات محدثین و فقہاء کا ذکر کیا اور گویا یہ دونوں طبقے اسلام کی تجدیدی سلسلہ کی بہت اہم کڑیاں ہیں۔ محدثین کی بلند ہمتی اور ان کی جفاکشی کا کوئی ٹھکانا ہے! انہوں نے فن "اسماء الرجال" ہی کے سلسلے میں جو کام کیا وہ ہی اتنا عظیم ہے کہ اس کی مثال اقوام عالم کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ دشمن اعتراف حقیقت پر مجبور رہے:

> کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہو۔

(ڈاکٹر اسپرنگر مقدمہ انگریزی ایڈیشن الاصابۃ فی احوال الصحابۃ صـ۱۶۳)

محدثین کی احتیاط و امانت، قوتِ حافظہ اور استحضار کس کس بات کا ذکر ہو، واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ امت کے محسن، اس کے سرمایہ علمی کے محافظ اور اس کی روایات و اقدار کے نگہبان ہیں — رہ گیا معاملہ فقہ کی تدوین کا تو بقول مولانا:

> "یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل تھا اور اس امت کی اقبال مندی، کہ اس کارِ عظیم کے لئے ایسے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم پر تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں۔ پھر ان میں سے چار شخصیتیں — امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰) امام مالک (م ۱۷۹) امام شافعی (م ۲۰۴) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱) جو فقہ کے چار دبستانِ فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے اپنے تعلق باللہ، للہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبہ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انہوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا۔
>
> (صـ۱۶۶-۱۶۷)

تدوینِ فقہ اور فقہاء کی ان کاوشوں کا فائدہ یہ ہوا کہ:

> "اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمہ فن اور صاحبِ اجتہاد علماء کا پیدا ہونا اس دین کی زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی۔ ان کی کوششوں اور

زبانوں سے اس امت کی عملی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہو گئی اور وہ اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی جس کی قومیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں، انہوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیئے جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل و مشکلات کے حل کرنے میں مدد کی جا سکتی ہے اور عام اور معتدل زندگی کو باقاعدگی اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جا سکتا ہے۔" (ص ۱۶۸)

—جاری ہے—

بقیہ: حالاتِ حاضرہ پر ایک مبسوط تبصرہ

د۔ اس لیے کہ دستورِ پاکستان کے ضمن میں محض اپنی صواب دید کی بنا پر فیصلے کرنے آپ کو کوئی اخلاقی یا قانونی حق حاصل نہیں ہے!

مجھے اندیشہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کے اختیار رنے کی بجائے موجودہ کوشش جاری رکھی گئی تو ملک میں ۷۰-۱۹۶۹ء کے سے حالات وبارہ پیدا ہو کر رہیں گے جن کے نتیجے میں ملک کی بقاء اور سالمیت کو شدید نقصان پنچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اس ملک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے!

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ


paragon

نار کار

پشاور میں تنظیم اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع

تنظیم اسلامی کے پچھلے سالانہ اجتماع کے موقع پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ آئندہ سالانہ
تماع چھ سات دن کی بجائے صرف تین دن کا ہوگا اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے
مختلف علاقوں میں تنظیم کی دعوت کو وسعت دینے کے لئے علاقائی سطح پر اجتماعات
منعقد کئے جائیں گے - اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پانچ شہروں کا انتخاب کیا گیا
یہاں پر ترتیب وار اجتماعات منعقد کرنے کے انتظامات کیے گئے اس ترتیب کے لحاظ
سے پہلا اجتماع راولپنڈی میں دوسرا کوئٹہ میں منعقد ہوا جبکہ پشاور اس ترتیب کے لحاظ
سے تیسرے نمبر پر تھا - حیدرآباد اور ملتان بالترتیب چوتھے اور پانچویں نمبر پر ہیں -
پشاور کے علاقائی اجتماع کے لئے ۲۴ تا ۲۷ ستمبر کی تاریخوں کا تعین کیا گیا - پشاور
میں اجتماع کے انعقاد کی تیاریوں کے سلسلے میں رفقاءِ پشاور نے آپس میں صلاح و مشورہ
کے لئے متعدد خصوصی اجتماعات منعقد کئے اور کافی سوچ بچار کے بعد مختلف کاموں
کو آپس میں تقسیم کر کے اُن کے لئے انتظامی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں - اس طرح تین
کمیٹیاں وجود میں آئیں - استقبالیہ کمیٹی ، انتظامی کمیٹی برائے طعام جبکہ ان تینوں
کمیٹیوں کے ناظمین پر مشتمل ایک آرگنائزنگ کمیٹی بنائی گئی - جس کے ناظم پشاور کے امیر
جناب اشفاق احمد میر صاحب تھے ۔ اجتماع پشاور یونیورسٹی سے ملحقہ مدرسے مرکزِ علوم
اسلامیہ راحت آباد میں ہونا قرار پایا جبکہ تشہیر کے لئے تنظیم کے مرکز کی جانب سے
چار ہزار ہینڈ بل چھپوا کر بھجوائے ـــــــ جبکہ پشاور کے ایک صاحب خیر
پروپرائیٹر جالندھر سویٹ ہاؤس نے (۱۲۰۰) بارہ سو فل سائز ـــــــ
کے پوسٹرز چھپوا کر دیئے اور مقامی تنظیم نے شہر ، صدر اور یونیورسٹی کے متعدد مقامات
لگائے اس کے علاوہ مقامی اخبارات میں خبریں بھی چھپوائی گئیں اس
طرح تشہیر کے تمام ممکنہ ذرائع اختیار کئے گئے -
اجتماع سے ایک دن پہلے مرکز سے چھ افراد پر مشتمل ایک ہراول دستہ چودھری

غلام محمد صاحب قیم تنظیم اسلامی کی قیادت میں انتظامات کا جائزہ لینے اور کام کی نگرانی کیلئے پشاور پہنچ گیا ان تمام اصحاب کو سب سے پہلے اجتماع گاہ پہنچایا گیا اور تمام انتظامات سے آگاہ کیا گیا جس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور چند مفید مشورے دیے۔

۲۵ ستمبر کو اجتماع کا آغاز امیر محترم کے خطاب بعنوان "اسلام کا فلسفۂ شہادت" سے ہوا یہ خطاب پشاور شہر کے وسط میں واقع جامع مسجد ہشت نگری میں بعد از نماز عشاء ہوا اس خطاب کے موقع پر تاریخی ہجوم دیکھنے میں آیا اردگرد کی تمام سڑکوں کو بند کر کے دریاں وغیرہ بچھائی گئی تھیں لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں کو جگہ کی تنگی کی وجہ سے واپس جانا پڑا یا پھر کھڑے ہو کر سننا پڑا یہ خطاب تقریباً دو گھنٹے جاری رہا باہر سے آنے والے تمام رفقاء کو بھی ریلوے سٹیشن اور بسوں کے اڈے سے سیدھا جامع مسجد ہشت نگری لیجایا گیا اور پھر وہاں سے خطاب کے اختتام پر رات ۱۱ بجے تمام رفقاء کو بسوں کے ذریعے اجتماع گاہ پہنچایا گیا جہاں پر انہیں فوراً ہی کھانا کھلایا گیا اور اسکے بعد تمام مہمان سونے کی تیاری کرنے لگے۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے درس دیا اور پھر ناشتے کے بعد نو بجے تربیتی اجتماع کا آغاز ہوا جس میں چوہدری غلام محمد صاحب اور عبدالرزاق صاحب نے اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کرنیوالی جماعت کے اوصاف اور تنظیمی مسائل کے بارے میں قرآن حکیم کی مختلف آیات کا درس دیا۔ جسے امیر محترم نے منتخب نصاب کی شکل میں تیار کیا ہے۔

چائے کے وقفے کے بعد امیر محترم نے ان دروس کے بارے میں مختلف سوالات کے جوابات دیئے اور مختلف تنظیمی امور کے بارے میں اظہار خیال فرمایا۔ اس طرح سلسلہ سوا بجے تک جاری رہا۔

عصر تا مغرب کا وقت باہمی تعارف اور ملاقاتوں کے لئے مخصوص تھا جبکہ مغرب کے بعد امیر محترم نے سورۃ صف کا درس دیا اور اسکی ابتدائی چار آیات کی تشریح اور تفسیر بیان فرمائی جسے حاضرین نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا۔

۲۶ ستمبر کو بھی صبح کی نماز کے بعد ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا درس ہوا

ے بعد ناشتہ ہوا اور پھر نو بجے تربیتی اجتماع کا آغاز ہوا جس میں حسب سابق
ری صاحب اور عبدالرزاق صاحب نے درس کے سلسلے کو آگے بڑھایا اور چائے
وقفے کے بعد امیرِ محترم نے سوالات کے جوابات دیئے اور تنظیمی امور کے بارے
ں اظہار خیال فرمایا اور اس طرح یہ سلسلہ بھی حسبِ سابق سوا بجے تک جاری
ا جبکہ عصر کے بعد پشاور کے تمام رفقاء کا فرداً فرداً تعارف کروایا گیا اور مغرب
ے بعد امیرِ محترم نے سورۃ صف کے درس کا دوسرا حصہ ارشاد فرمایا اس درس
و بھی بہت توجہ اور دلچسپی سے سُنا گیا اور بہت زیادہ سراہا گیا۔

۲۷ ستمبر کو صبح نماز کے بعد چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے درس دیا
ور ناشتے کے بعد باہر سے آئے ہوئے مہمان رفقاء رخصت ہونا شروع ہو گئے
جبکہ نو بجے سے گیارہ بجے تک سوال وجواب کی نشست ہوئی جس میں کافی
لوگوں نے شرکت کی اور سوالات کئے جنکے جوابات امیرِ محترم نے تسلی بخش طور
ر دیئے۔ اُس دن چونکہ جمعہ کا دن تھا لہذا امیرِ محترم کے جمعہ کے خطاب کیلئے
جامع مسجد گنج علی خان میں انتظام کیا گیا تھا جس کے لئے کوئی خاص قابلِ ذکر
تشہیر نہیں کی گئی تھی لیکن اُسکے باوجود ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت
کی اور بڑی توجہ سے امیرِ محترم کا خطاب سنا اور اس خطاب کے ساتھ ہی پشاور
کا اجتماع بھی بخیر وخوبی بفضلِ تعالیٰ انجام پذیر ہوا۔ باہر سے آئے ہوئے تمام
رفقاء واپس اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے اور مقامی رفقاء نے اپنے اپنے
کاموں کو سمیٹنا شروع کیا۔ اس اجتماع میں لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد،
نیل آباد اور باجوڑ سے آئے ہوئے رفقاء شریک ہوئے۔

اس اجتماع کے انعقاد کے سلسلے میں ہم جناب راحت گل صاحب مہتمم مرکز
علوم اسلامیہ کے بہت ہی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اجتماع کے لئے ہمیں اپنے
مدرسے میں جگہ دی اور تمام شرکائے اجتماع کو دعوتِ طعام بھی دی۔

امیرِ تنظیم کا دورۂ پشاور، ۵ تا ۷، اکتوبر ۸۵ء

پشاور کے علاقائی اجتماع کے سلسلے میں جب امیرِ تنظیم پشاور تشریف لائے

تو اس دوران شعبۂ فلسفہ کے طالبِ علم جناب موسیٰ وزیر صاحب نے امیرِ محترم سے
ملاقات کی اور شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر سلیم صاحب کی طرف سے امیرِ
محترم کو پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے زیرِ اہتمام خطاب کی دعوت دی جسے
امیرِ محترم نے قبول کر لیا اور اپنے آئندہ دورے کے موقع پر خطاب کا وعدہ فرمایا۔

اس کے چند دن بعد ہی پاکستان اکیڈمی برائے دیہی ترقی کی دعوت پر ۵ اکتوبر
کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پشاور تشریف لائے ۔ امیرِ محترم اپنی پشاور آمد کے
فوراً بعد پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ پشتو کے چیئرمین اور گومل یونیورسٹی کے سابق
وائس چانسلر جناب پریشان خٹک صاحب کے ہاں تشریف لے گئے جہاں پر وہ
رات کے کھانے پر مدعو تھے ۔ یونیورسٹی کے چند اور پروفیسر صاحبان بھی وہاں
موجود تھے ۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے وقت امیرِ محترم تین رفقاء کے ہمراہ پشاور یونیورسٹی
کے شعبۂ عربی کے سابقہ چیئرمین اور مشہور عالمِ دین جناب مولانا اشرف صاحب
سے ملاقات کی غرض سے اُنکی قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور وہاں سے صبح سات
بجے واپس اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے ۔

اُسی دن صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک امیرِ محترم نے NIPA کے افسران سے
مختلف موضوعات پر وقفے وقفے سے خطاب فرمایا ——— امیرِ محترم وہاں
سے فراغت کے بعد اشفاق میر صاحب کے گھر منتقل ہو گئے اور بعد از نمازِ عصر
مولانا اسرائیل صاحب اور مولانا راحت گل صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے
جبکہ مغرب کے بعد رفقاء کا خصوصی اجتماع ہوا جس میں امیرِ محترم نے بھی شرکت
فرمائی اور پشاور کی تنظیم کے بارے میں گفتگو فرمائی اور ہدایات دیں ۔ اس کے
بعد امیرِ محترم پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر جناب انتصار صاحب کے گھر تشریف لے
گئے جہاں پر اُنہیں رات کے کھانے کی دعوت دی گئی تھی ۔ ۷ ۔ اکتوبر کو دن گیارہ بجے
امیرِ محترم شعبۂ فلسفہ تشریف لے گئے جہاں پر یونیورسٹی کے شبر یاؤ ہال میں امیرِ محترم
نے "ایمان باللہ" کے موضوع پر خطاب فرمایا

اس تقریب کی صدارت پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب رشید احمد

طاہر خیلی نے کی ۔ شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر سلیم صاحب نے تمام شرکاء سے
امیر محترم کا تعارف کروایا اور روایتی انداز میں امیرِ محترم کے مختصر تعارف کے بعد
امیر محترم کو خطاب کی دعوت دی گئی ۔

امیرِ محترم نے سب سے پہلے عقیدۂ توحید کی تشریح کی اور اس ضمن میں قدیم
اور جدید فلاسفہ اور پیغمبروں کی تعلیمات کا موازنہ فرمایا اور دلائل کی روشنی
میں ثابت کیا ۔
کہ اس کائنات کا وجود ایک خالقِ حقیقی کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور
اُس کے بعد ایمانیات ثلاثہ کا ذکر فرمایا اور آخر میں نظریۂ توحید کے لوازمات
اور اُس کے معاشرے پہ اثرات کا پورے دلائل کے ساتھ ذکر فرمایا ۔ امیر محترم
کا یہ ایمان افروز اور فکر انگیز خطاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء و طالبات
نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سُنا ۔ اس تقریب کی تشہیر کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں
کیا گیا تھا اس کے باوجود شیریار ہال میں گنجائش سے زیادہ لوگ موجود تھے اور
دیواروں کے ساتھ کھڑے ہو کر سُن رہے تھے طلباء کے اس حُسنِ ذوق کو مدِنظر
رکھتے ہوئے پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے امیرِ محترم سے ماہانہ
خطاب کی درخواست کی جسے امیر محترم نے قبول کر لیا ۔ آخر میں میزبان کی
جانب سے مہمانوں کے لئے چائے کا انتظام کیا گیا تھا ۔ اس تقریب کے انعقاد
کے لئے ہم پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر سلیم صاحب
اور دوسرے اساتذہ کے علاوہ طلباء بالخصوص موسیٰ وزیر صاحب کے انتہائی شکر
گزار ہیں ۔

اس کے علاوہ ہم پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب رشید احمد
خیلی صاحب کے بھی انتہائی مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے
وقت نکال کر اس تقریب کی صدارت فرمائی اور امیر محترم کو پشاور یونیورسٹی
جانب سے ماہانہ خطاب کی دعوت دی ۔

مرتب :

راجہ سردار احمد قیم تنظیم اسلامی پشاور

"گما ہے گا ہے باز خواں . . . "

مُتّحدہ پاکستان

کی دستوری اور سیاسی پیچیدگیاں

اور

سقوطِ مشرقی پاکستان

اور

موجودہ مارشل لاء کی طوالت

اور

بچے کھچے پاکستان کا مُستقبل

*

ڈاکٹر اسرار احمد

کی جون ۱۹۶۹ء، دسمبر ۱۹۷۱ء، فروری ۱۹۷۲ء اور دسمبر ۱۹۷۳ء کی بعض تحریریں

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اس سوچ میں غنچے سُوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہوگا، دستورِ بہاراں کیا ہوگا؟

(۱)

متحدہ پاکستان

دستوری، سیاسی اور داخلی و خارجی پیچیدگیاں

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق جولائی ۱۹۶۹ء

(۲)

"حیراں ہوں دل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں!"

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق ستمبر اکتوبر ۱۹۶۹ء

(۳)

"وقتِ دعا ہے!"

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق دسمبر ۱۹۷۱ء

(۴)

سقوطِ مشرقی پاکستان

اور ذلت آمیز شکست کے اسباب و عوامل

"تذکرہ و تبصرہ" میثاق جنوری فروری ۱۹۷۲ء

(۵)

موجودہ مارشل لا کی طوالت

اور بچے کھچے پاکستان کے مستقبل کے لیے خطرات

مدیر "میثاق" کا صدرِ مملکت ضیاء الحق صاحب کے نام خط۔

تحریر ۲۷ دسمبر ۱۹۸۲ء۔ شائع شدہ "میثاق" ستمبر ۱۹۸۳ء

(۱)

مُتّحدہ پاکستان

دستوری وسیاسی اور داخلی وخارجی پیچیدگیاں

"تذکرہ وتبصرہ" میثاق جولائی ۱۹۶۹ء

میڈیکل کالج لاہور میں اپنے پانچ سالہ عرصۂ تعلیم کے دوران راقم الحروف نے معمارِ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کا حسب ذیل فقرہ جو کالج ہال کی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ پڑھا ہوگا :

"God has given us a golden opportunity to show our worth as architects of a new State and let it not be said that we did not prove equal to the task."

یعنی " (مملکتِ خداداد پاکستان کی صورت میں) اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نئی مملکت کے معماروں کی حیثیت سے اپنی اہلیت وصلاحیت کے اظہار کا ایک سنہری موقع عطا فرمایا ہے اور دیکھنا! ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیا یہ کہے کہ ہم اس عظیم کام کے اہل ثابت نہیں ہو سکے!"

کچھ تو اس بنا پر کہ فقرہ بجائے خود نہایت جاندار تھا اور اس کے الفاظ کا دروبست نہایت موزوں تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا اور ہر پاکستانی کے دل میں ایک "ولولۂ تازہ" موجزن تھا اور اس جملے میں گویا ہر شخص کو اپنے ہی دل کی صدا سنائی دیتی تھی۔ یہ فقرہ کچھ اس طرح ذہن میں ثبت ہوگیا تھا کہ آج تک مِن وعَن یاد ہے۔

لیکن ـــــ افسوس ـــــ کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا، مملکت خداداد پاکستان بزبانِ حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و مؤسس کا خدشہ ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آسکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق "اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ

بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے !¹ ــــــــــ بائیس سال گذر جانے کے بعد بھی اگر کسی مملکت کا "اساسی نظریہ" تک زیرِ بحث چلا آ رہا ہو اور دستور سازی ہنوز معرضِ بحث میں ہو بلکہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے بارے میں نئی نئی بحثیں اٹھ رہی ہوں اور ردّ و قدح اور تکرار و نزاع کی نت نئی صورتیں پیدا ہو رہی ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساری مادی ترقیوں اور معاشی منصوبہ بندیوں کے باوجود ابھی مملکت کی اصل تعمیر کی ابھی ابتدا بھی نہیں ہوئی اور قومی تعمیرِ نو کا کام شروع بھی نہیں ہو سکا۔

پاکستان کی زندگی کے بائیس سال درحقیقت گیارہ گیارہ سالوں کے دو مساوی ادوار پر مشتمل ہیں۔ پہلے گیارہ سالوں (۴۷ تا ۵۸ء) کے دوران پاکستان کے سیاست دانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی ــــــــــ اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن بہت جلد اس نے ایک سابق فوجی کے زیرِ سربراہی ایک خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی۔ اور اہلِ سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا چنانچہ دوسرا دور (۵۸ تا ۶۹ء) درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی ــــ لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کرنے کے لیے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا ــــــــــ اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ــــــــــ ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا ہے یعنی فوج، چنانچہ بدرجۂ مجبوری پھر اسی کو آگے بڑھ کر ملک و ملت کی زمام

"They build a Nation's pillars deep, and lift them to sky!"

اپنے ہاتھ میں لینی پڑی ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ شرافت، دیانت، امانت، اخوت، وطن، محبت
قوم، ایثار، قربانی، احساسِ فرض اور تن دہی و جاں فشانی کے اوصاف کے اعتبار سے قوم اپنے
اس طبقے پر مکمل اعتماد بھی کرتی ہے ——— لیکن ظاہر ہے کہ اس ادارے کا اصل فریضہ دفاعِ وطن
ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ ناانصافی ہے۔
بین الاقوامی حالات جس رُخ پر جا رہے ہیں اس کے پیشِ نظر مستقبل میں دفاعِ وطن کی ذمہ داری
یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر
زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاعِ وطن کے محاذ کے
متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور یہ خطرہ (RISK) اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول
نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف ملک کی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی صفوں میں خاصی سرگرمی
اور ہلچل کے باوجود تاحال کوئی ایسی صورت حال سامنے نہیں آ رہی ہے کہ یہ امید کی جا سکے کہ اگر حکومت
ان کے حوالے کر دی جائے تو یہ اطمینان بخش طور پر اسے سنبھال سکیں گی اور دوبارہ وہی صورت
حال پیدا نہ ہو جائے گی جس کے پیشِ نظر مارشل لاء کا نفاذ لازمی ہو گیا تھا۔

الغرض ——— نظریاتی اور دستوری بحثوں اور مناقشوں پر مستزاد یہ ہے کہ وہ نازک
صورت حال اور عظیم الجھاؤ (Dilemma) جس سے مملکتِ خداداد پاکستان اس وقت
دوچار ہے۔

اس صورتِ حال کے اسباب میں سے تین عوامل تو ہماری گذشتہ نصف صدی کی تاریخ
متعلق ہیں اور تین پیچیدگیاں وہ ہیں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوئیں اور مسلسل
چلی جا رہی ہیں۔

تاریخی عوامل کے بارے میں ہم ان صفحات میں مفصل لکھ چکے ہیں اور یہاں ان کے
اعادے کی گنجائش بھی نہیں۔ وہ مختصراً یہ ہیں کہ:-

اولاً ——— آج سے تقریباً نصف صدی قبل ملتِ اسلامیہ ہند و پاک کی قوت
و توانائیاں منقسم ہو گئیں اور قومی لائحہ عمل اور پالیسی سے اختلاف کی بنا پر علماء کا وہ طبقہ جو
قوم کا اصل رہنما رہا تھا اور جس میں مخلص اور بے لوث عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی
اپنے متوسلین سمیت قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ کر رہ گیا اور اس طرح قوم اپنی بہترین متاع

ہوگئی۔ رہا یہ سوال کہ یہ حادثہ کیسے اور کیوں واقع ہوا تو یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر گفتگو کی اب وقت گنجائش نہیں (ویسے ہم میثاق مارچ ۱۹۶۷ء) کے تذکرہ و تبصرہ میں اس موضوع پر مفصل کر چکے ہیں[1]

ثانیاً ——— اسلامیانِ ہند کی قومی قیادت قومی تعمیر نو اور قوم کی تنظیم و تربیت کے ضمن میں ہرگز کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر سکی۔ اب چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ اسے اس کا وقت نہیں ملا، چاہے یہ کہ اس نے اس کی جانب توجہ نہیں کی۔ فرق کوئی واقع نہیں ہوتا۔ اور واقعہ بہر حال یہی ہے کہ تحریک نے بس ایک ہنگامی اور فوری سی ضرورت کو تو ضرور پورا کر دیا لیکن اس نے قوم کو نہ کوئی قوم تنظیم دی نہ قومی قیادت!

ثالثاً ——— قیامِ پاکستان سے تقریباً ایک دہائی قبل ایک اور صاحب نے 'قومی تحریک' کو مطعون کر کے ایک "بین الاقوامی اور خالص اصولی اسلامی تحریک" کے نام پر قوم کے جسد سے مخلص کارکنوں کا ایک اور ٹکڑا کاٹ لیا اور قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اسی ٹکڑی کی مدد سے "اسلامی دستور" اور "انقلابِ قیادت" کے نعروں کے ساتھ قومی قیادت پر ایک زوردار شبخون مارا ——— نتیجۃً قومی قیادت کے رہے سہے مخلص عناصر کو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ایک جانب قومی تنظیم کے اندرونی خلفشار کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری طرف ان صاحب کی بیرونی یلغار کا۔ اس دوگونہ کش مکش نے قومی قیادت کے ان مخلص عناصر کو کمزور کرتے کرتے بالآخر بالکل میدان سے خارج (Knock out) کر دیا اور میدان بالکلیہ ان لوگوں کے ہاتھ آ گیا جن کا کوئی دین تھا تو خالص اغراض پرستی اور ایمان تھا تو محض مفادات پر، اور جو کبھی یونینسٹ ہوتے تھے، کبھی لیگی پھر کبھی ری پبلکن بن جاتے تھے اور کبھی پھر لیگی! ——— ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں پاکستان کی قومی سیاست کے تابوت میں وہ آخری کیل ٹھکی جس کے بعد خالص بیوروکریسی کا دور شروع ہو گیا

ان تین تاریخی عوامل پر مستزاد ہیں۔ وہ تین پیچیدگیاں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے ——— آئندہ ہم ان کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] یہ تحریر اب 'اسلام اور پاکستان' نامی کتاب میں شامل ہے۔

ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے۔ یعنی یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دور دراز خطوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالتِ جنگ ہی میں نہیں عین حالت امن میں بھی ایک بالقوہ دشمن (Potential enemy) کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار ہی سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اعتبار سے تو یہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور غیر المعقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کر دیا ہے ـــــ یعنی ایک اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدن، زبان، لباس، طرز بود و باش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا ـــــ اور دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطہ از محل وقوع، دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات، الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے وہ بلحاظ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ ایک نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت موثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لئے ہوئے ہے، تعدادِ نفوسِ انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطے سے بڑا ہے ـــــ ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل نے اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں ابھی پاکستان

لہ ممکن ہے ہماری یہ عریاں حقیقت نگاری بعض لوگوں کو ناگوار معلوم ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی کارکن اس حقیقت کے اظہار کی جرأت نہیں کرے گا تاہم ہمارے نزدیک واقعہ یہی ہے اور اسے طور پر قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ جمود روز اوّل کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا ۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیش نظر رہنی ضروری ہے ۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس 'سنجوگ' کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی پر ہی منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا ۔ بلکہ اس معاملہ میں جبر و تشدّد کا ردّ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے ۔

دوسرے یہ کہ اس 'آزاد مرضی' کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملی احساسات پر ہے اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے ۔ اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں ۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی 'علیحدگی' کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکان غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے ۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا؟ ـــــ اگر وہ واقعتہً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی خواہش کے آڑے نہیں آسکتی ـــــ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دین فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے کہ اگرچہ طلاق 'حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے ـــــ بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعتہً یہ محسوس

کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کے بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل "معطل" رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا ——— اور اب مزید وضاحت سے کہے دیتے ہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین "مساوات" کا مفہوم اگر یہ ہے کہ دارالحکومت ایک مغربی پاکستان میں ہو اور دوسرا مشرقی پاکستان میں اور مرکزی حکومت چھ ماہ وہاں رہے اور چھ ماہ یہاں اور دفاعی اخراجات میں بھی لازماً کامل مساوات برتی جائے تو یہ خالص احمقانہ تصور ہے۔ ایسی مساوات خاندان کے مختصر سے ادارے میں بھی نہیں چل سکتی کجا یہ کہ ایک عظیم مملکت جو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے دوچار ہو، اس کے انتظام و انصرام میں برتی جا سکے اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ دونوں خطے آزاد ہو کر اپنے اپنے بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کی فکر کریں۔!

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہش ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوں اور اگرچہ ماضی قریب میں ان پر یہ "بہتان" کثرت سے لگایا گیا ہے کہ ان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان موجود ہے۔ ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان حقائق و واقعات اور موجودالوقت ظروف و احوال سے اتنے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ ان خطرات کا اندازہ نہ کر سکیں جو ایسی کسی تجویز میں لازماً مضمر ہیں ——— ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بس "صوبائی خود اختیاری" کے حصول کی خواہش ہے اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور یہ ہمارے نزدیک ان کا ایسا حق ہے جس سے کسی بھی معقول انسان کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا اور مرکزی حکومت کے مؤثر طور پر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو امور ضروری ہیں انہیں مرکز کی تحویل میں دینے بعد بقیہ تمام معاملات میں مشرقی پاکستان کو کامل صوبائی خود اختیاری لازماً ملنی چاہئے۔

انہی متذکرہ بالا امور کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر بھی ایک بار حتمی طور پر فیصلہ کر لینے کی شدید ضرورت ہے اور تمام حالات و واقعات کا مردانہ وار مواجہہ کر کے اس مسئلے کو ایک قطعی طور پر طے کر لینا لازمی ہے اور اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک کسی مملکت کے انتظام و انصرام میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت دیانت و امانت کو حاصل ہے نہ کہ قواعد و اور تدابیر تحدید و توازن (CHECKS AND BALANCES) کے اس بے جان ڈھانچے

جسے "دستور" کہا جاتا ہے تاہم ہمارے یہاں جو خلا اس میدان میں چلا آرہا ہے اسے ایک بار جمہات وبحث کے ساتھ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق پُر کرلینا ہی بہتر ہے۔

دستور کے مسئلے پر ہمارے یہاں اس وقت بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں۔ بہت سے لوگ ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی کے خواہاں ہیں۔ اگرچہ وہ ساتھ ہی یہ تصریح بھی کررہے ہیں کہ اس میں بنیادی ترمیموں کی ضرورت ہے اور اگرچہ خان قیوم نے ایک علیحدہ آواز بلند کی ہے یعنی یہ کہ فی الحال ایک عبوری دستور نافذ کردیا جائے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دائیں بازو نے اپنے حلقہ اثر کی تمام جماعتوں اور شخصیتوں کو اس معاملے میں تقریباً متفق کرلیا ہے (جس کی تازہ ترین مثال شیخ مجیب الرحمٰن کا بھی ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی سے متفق ہوجانا ہے) دوسری طرف ایک مطالبہ یہ ہے کہ بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں آئے اور اسے ایک معین مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اندر دستور سازی کا پابند کیا جائے ——— بعد میں یہی اسمبلی پارلیمنٹ کی حیثیت سے کام کرسکتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے منطق کے ہر اصول کے مطابق اقرب الی الصواب ہے۔ اور اگرچہ ہمیں، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، ۱۹۵۶ء کے دستور سے بھی کوئی کد نہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک حقیقت یہی ہے کہ ہمارے یہاں اب تک کی کسی دستوری دستاویز کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی پشت پر عوام کی رائے اور مرضی موجود ہے۔ اور ان میں سے کسی کو بھی آئندہ انتخاب کی بنیاد بنایا گیا، تو یہ اعتراض جائز طور پر موجود رہے گا کہ ایک غیر نمائندہ دستور کے تحت منعقد شدہ انتخابات کے نتائج بھی قابلِ اعتماد نہیں قرار دیئے جاسکتے ——— ——— ہمارے نزدیک صدر مملکت محمد یحییٰ خان کی وہ رائے نہایت صحیح ہے جو انہوں نے خان قیوم خان کی متذکرہ بالا تجویز کے جواب میں ظاہر کی ہے یعنی یہ کہ موجودہ مارشل لاء خود ایک "عبوری دستور" کی ضرورت پوری کررہا ہے ——— اب اس معاملے میں جو اقدام بھی ہو وہ عارضی اور عبوری اور ہنگامی طور پر واجب الترمیم نوعیت کا نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کرلیا جائے ——— اور ظاہر ہے کہ اس کی کوئی صورت اس مؤخر الذکر تجویز کے سوا ممکن نہیں۔

دوسری بڑی پیچیدگی جو پاکستان کی تعمیر میں مضمر ہے اور روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے

ہے کہ اپنے اوّل یومِ پیدائش ہی سے پاکستان کو ایک ایسی مملکت کی عداوت و دشمنی کا سامنا ہے جو ایک طرف تو نہ صرف یہ کہ اس کے بالکل قریبی ہمسائے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ پاکستان کے دونوں خطوں کے مابین حائل ہونے کی بنا پر گویا پاکستان کے چھوٹے سے جسم میں ایک بہت بڑے خنجر کی طرح پیوست ہے اور دوسری طرف اپنی وسعت، قوت، آبادی اور وسائل تمام اعتبارات سے پاکستان سے کم از کم چوگنی ہے۔؎

> بھارت کی یہ مستقل عداوت نہ صرف یہ کہ ہمارے محدود وسائل و ذرائع پر ایک بہت بڑے بوجھ کا سبب بنی رہی ہے جس کی بنا پر اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیر و ترقی کے جملہ امکانات بروئے کار نہ آسکے ـــــ بلکہ بدقسمتی سے اسی ایک مرکز کے گرد ہماری پوری خارجہ حکمتِ عملی کو ہمیشہ گھومنا پڑا ہے۔

اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گزشتہ بائیس سالوں کے دوران دو دور گزر چکے ہیں اور اب تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے ـــــ پہلا دور آرام و آسائش بلکہ عیش اور گلچھرّے اُڑانے کا دور تھا۔ اب دوسرے میں ہمیں نسبتاً مشکل تر حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اب جو دور شروع ہو رہا ہے آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ہمیں اپنی آزادی اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت شدید جدوجہد اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا ہوگا۔

پہلے دور میں دنیا کی بڑی طاقتیں دو دھڑوں میں منقسم تھیں۔ ایک طرف روس اور چین مشتمل کمیونسٹ بلاک تھا اور دوسری طرف اینگلو امریکی اتحاد اور ان کے مابین شدید کشمکش اور سرد جنگ جاری تھی جو کبھی گرم ہو جاتی کبھی سرد۔ بھارت نے ایک نئی طاقت کی حیثیت سے ان کے ما

؎ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بھارت اور اسرائیل میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں دنیا کے نقشہ پر اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل خنجروں سے مشابہ ہیں۔ ایک بلادِ عرب کے سینے میں پیوست ہے اور دوسرا اسلامیانِ پاکستان کے جسد میں ـــــ بلادِ عرب وسعت میں زیادہ ہیں تو اسلامیانِ پاکستان تعداد میں مسلمانانِ عرب کی مجموعی تعداد سے بھی کہیں زیادہ ہیں اور اسرائیل بھارت کے مقابلے میں چاہے بہت چھوٹا ہے لیکن مغربی استعمار کی پشت پناہی کی بنا پر بھارت سے کسی طرح بھی کمزور نہیں!!

"ثالثی" کا کردار اختیار کرنے کی کوشش کی اور اپنی نام نہاد آزاد اور غیر جانبدار خارجہ پالیسی کے نام پر خصوصاً مغربی بلاک کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اس صورت حال کا عروج تھا وہ وقت جب ہندوستان میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے لگ رہے تھے! اس وقت مغربی بلاک کو شدید ضرورت تھی کہ اس علاقے میں کوئی ملک ایسا ہو جہاں اس کے قدم بھی کسی قدر جم سکیں۔ ان کی اس ضرورت کو اپنی خارجہ حکمت عملی میں فٹ پاکر پاکستان نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ یہ وہ دور تھا جب ہم پر چچا سام نہایت مہربان تھے اور ہمارے ہر طرح کے ناز نخرے برداشت کرنے کو تیار تھے ——! اور دوسری طرف ہم بھی ان کے کامل نیاز مند تھے اور ان کے اشارے پر کبھی سیٹو میں حاضری دیتے تھے کبھی سنٹو میں ——!!

اس کے بعد حالات بدلے۔ ایک طرف چین اور روس کے مابین اختلافات کی خلیج نمودار ہوئی دوسری طرف روس کا رویہ مغربی اتحاد کے ساتھ بدلنا شروع ہوا، تیسری طرف بھارت کو 'عقل' آئی اور اس نے اندر ہی اندر چچا سام سے تعلقات استوار کر لئے —— اور چوتھی طرف روس، مغربی اتحاد اور بھارت تینوں نے چین کو اپنے مشترک دشمن کی حیثیت دینی شروع کر دی —— نتیجۃً بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملی کے میدان میں ہم نے جس زمین پر تعمیر کی تھی وہ پیروں تلے سے کھسکنی شروع ہو گئی —— اور بھارت کو امریکہ اور روس دونوں کے منظور نظر کی حیثیت حاصل ہو گئی —— یہ ہمارے لئے مشکلات کے دور کا آغاز تھا۔ اس دور کے بالکل ابتدا میں ایک کوشش امریکہ نے یہ بھی کی کہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کے مابین ایسی مکمل 'مفاہمت' کرا دی جائے کہ یہ دونوں سوکنوں کی بجائے بہنوں کی صورت اختیار کر لیں اور دونوں ہمارے اشاروں پر یکساں حرکت کر سکیں۔ اسی غرض سے اس نے پنجاب کے دریاؤں کے پانی کے مسئلے کو جیسے تیسے حل کرانے کا کھکیڑ مول لیا اور بعض دوسرے معاملات میں بھی صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کا عروج (Climax) تھی وہ تجویز جو امریکہ نے سابق صدر ایوب کے ذریعے پیش کرائی کہ پاکستان اور ہندوستان کا دفاع مشترک ہو جائے —— اس تجویز پر پنڈت نہرو کے احمقانہ ردعمل سے جس کی تلخی ...... (Anti-climax) کے دور کا آغاز ہوا۔ اور پاکستان میں آزاد خارجہ حکمت عملی کا چرچا شروع ہو گیا۔

اب ظاہر ہے کہ کسی کے گھڑے کی مچھلی بنے رہنے میں جو آسانی اور عافیت ہے وہ اپنی آزاد رائے اور آزادانہ حیثیت و تشخص کو برقرار رکھنے اور دوسروں سے منوانے (یعنی Assert کرنے)

ں کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ آزادی بہرحال جدوجہد اور محنت ومشقت اور ایثار وقربانی کا مطالبہ رتی ہے ـــــ چنانچہ اس دور میں ہمیں لامحالہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں اور اب جس تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ وہ اسی صورتِ حال کی گویا ایک منطقی انتہا کا درجہ ہے۔ اس وقت جن حالات سے ہم دوچار ہیں وہ یہ ہیں: کہ ایک طرف صاحب برطانیہ بہادر تو بالکل ہی پنی بساط مشرق سے لپیٹ گئے ہیں۔ خود چچا سام بھی پہلے کوریا اور پھر ویٹ نام میں اس قدر مار کھا چکے ہیں کہ اب اس علاقے سے کسی قدر باعزت طور پر کھسک جانے ہی میں عافیت محسوس کر رہے ہیں۔ دوسری طرف روس نے امریکہ کی خاموش رضا کے تحت اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی پاؤں پسارنے شروع کر دیئے ہیں اور تیسرے جنوب مشرقی ایشیا میں ان دونوں کا اصل اتحادی بھارت اور اصل دشمن چین بن چکا ہے ـــــ اور اب امریکہ، روس اور بھارت تینوں مل کر زور لگا رہے ہیں کہ ہم ان کے تابع مہمل بن کر ان کی مرضی کے مطابق چین کی مخالفت میں ان کا پسندیدہ کردار ادا کریں اور اس علاقے میں بھارت کے مقابلے میں گھٹیا درجے کی شہریت (Second rate citizenship) قبول کرلیں ـــــ اس طرح یہ دور ہماری قومی غیرت اور حمیت کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج بن کر شروع ہو رہا ہے اور اس کے لئے ہم پر ہر ممکن دباؤ کو استعمال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف بھارت نے ایران اور عرب ممالک میں اپنے تجارتی وصنعتی اثر ورسوخ کے جال کو تیزی کے ساتھ پھیلانا شروع کر دیا ہے اور یہ امر ہمیں ہوشیار کرنے کے لئے کافی ہونا چاہئے کہ ان ممالک کی جانب سے بھارت کے ان عزائم کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ دوسری طرف بھارت نے افغانستان سے اپنے پرانے معاشقے کی از سر نو تازہ جوش وخروش کے ساتھ تجدید کرنی شروع کر دی ہے اور ایک فراخہ بند سے جو خطرہ مشرقی پاکستان کی زرعی معیشت کو تھا۔ اس کا حل بھی ابھی نہیں ہوا تھا کہ افغانستان سے آنے والے دریاؤں کو خشک کر کے مغربی پاکستان کی معیشت پر خطرناک وار کرنے کی سکیم پر سوچ بچار شروع ہو گیا ہے۔ تیسری طرف خاص اس موقع پر سرحدی گاندھی سے اندرا گاندھی کی ملاقات انہیں نہرو پرائز وصول کرنے کے لئے بھارت آنے کی دعوت اور ان کی خدمت میں اسی لاکھ روپے کی رقم بطور نذرانہ پیش کرنے کی سکیم سے بھارت کے عزائم واضح طور پر سامنے آ رہے ہیں ـــــ اور بھارت کی ان ساری کوششوں اور تدبیروں پر مستزاد ہیں روس کی تجاویز جو کبھی کوسیجن صاحب کے پیش کردہ معاشی تعاون کے منصوبے کی صورت میں سامنے آتی ہیں اور کبھی برزنیف صاحب کی پیش کردہ "اجتماعی سلامتی" کی سکیم کی شکل اختیار کرتی ہیں ـــــ اور ان سب پر ثبت

پاسام کی منظوری ورضامندی کی مہر جو ایسی تمام تجاویز پر خاموشی یا "محتاط ردعمل" کی صورت
ہر ہوتی ہے۔

یہ صورتِ حال ہر غیور اور باحمیت پاکستانی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ کمرِ ہمت کس کر حالات کا
ںرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ اس مشکل کے وقت میں ہماری اصل قوت مدافعت و مزاحمت
آزاد اور باعزت و باوقار ملک و ملت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے ایک شدید داعیہ ہی سے
دسکتی ہے۔ اور یہ داعیہ محض "زندگی برائے زندگی" کے نظریئے سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔
ظریئے کے تحت تو انسان بسا اوقات ذلت اور بے عزتی کی حالت کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ یہ داعیہ
مقصدِ زندگی سے آشنا ہو کر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے اندر اگر کسی مقصد کا عشق
و جائے اور یہ انسانیت کے لئے کسی نظریئے اور پیغام کی علمبردار بن کر اٹھ سکے تبھی اس میں وہ
، وہ جرأت، وہ ایثار، وہ قربانی، اور محنت و مشقت کا وہ جذبہ بیدار ہو سکتا ہے جو ان حالات
س کے بقاء و تحفظ ہی نہیں ترقی و استحکام اور عزت و وجاہت کا ضامن بھی بن سکتا ہے ——
ظاہر ہے کہ یہ نظریہ وہی ہو سکتا ہے جس کے نام پر پاکستان قائم ہوا تھا اور وہ پیغام اسلام کے
کے سوا اور کوئی نہیں —— گویا جس طرح پہلی پیچیدگی کا اصل اور مستقل حل
جذبات اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے میں ہے، اسی طرح اس دوسری پیچیدگی اور اشکال
ں حل اور اس سے پیدا شدہ چیلنج کا اصل جواب بھی یہی ہے کہ ہم بحیثیت قوم ایمان کے داعی اور اسلام
لمبردار بن کر کھڑے ہوں اور اس مقصد کے لئے ایک ایسا والہانہ عشق ہمارے اندر پیدا ہو جائے
ں کے لئے بڑی سے بڑی محنت اور کٹھن سے کٹھن مشقت ہمیں آسان معلوم ہونے لگے اور
ے سے بڑا ایثار اور اونچی سے اونچی قربانی حقیر محسوس ہو ——!!

اس پیچیدہ صورتِ حال کا ایک ضمنی تقاضہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہماری خارجہ حکمتِ عملی کو اب
ثانی کے مقابلے میں بھی زیادہ 'آزاد' ہونا چاہیئے اور ان حالات میں ہمیں عوامی جمہوریہ چین کے
قہ اپنے تعلقات پر پہلے سے بھی زیادہ زور دینا چاہیئے۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ اس موقع
یک طرف 'دائیں بازو' کی چوٹی کی قیادت (Top brass) نے بھی اس امر
زور دیا ہے کہ ہمیں چین کی مخالفت میں بڑی طاقتوں (Super Powers) کا آلۂ کار
نہیں بننا چاہیئے اور دوسری طرف وزیر اعظم روس کے دہلی سے واپسی پر 'سر راہے' دورہ
تان اور اب صدر امریکہ کی خلائی جہاز کی واپسی کے منظر کو دیکھنے کے بعد ٹہلتے ٹہلاتے پاکستان کو

بھی نوازتے جانے کے پروگرام سے یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم چو این لائی کو بھی جلد پاکستان آنا چاہیئے (جس کا سب سے بڑا مظہر آج ۵ جولائی کے اخبارات میں شائع شدہ صدر مملکت محمد یحییٰ خان کا یہ بیان ہے کہ چو این لائی عنقریب پاکستان کا دورہ کریں گے۔

نہ صرف یہ، بلکہ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کو روس، امریکہ اور بھارت کے اتحادِ ثلاثہ کے احمقانہ دباؤ کے تحت کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ چین کی جانب جھکنا ہوگا اور یہ حالات کا ایسا بہاؤ ہوگا جس کے رُخ کو روکنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں رہے گا ۔۔۔۔!!

OOOOOOOOOOO

— (۲) —

"حیراں ہوں دل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں!"

— "تذکرہ و تبصرہ" میثاق ستمبر اکتوبر ۱۹۹۹ء —

سالِ رواں کے اس ربع ... کے دوران میں جو واقعات عالمِ اسلامی میں رونما ہوئے اور جن حوادث کا سامنا امتِ مسلمہ کو رہا ان کی یاد سے کلیجہ شق ہوتا ہے۔ اتنے گوناگوں مصائب اور ایسے پے بہ پے حوادث کہ انسان حیران و پریشان ہو کر رہ جائے کہ ع

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!"

ایک طرف مسجدِ اقصیٰ کو نذرِ آتش کیا گیا اور عالمِ اسلامی کے روحانی مراکز میں سے تیسرا عظیم ترین مرکز، حرمِ ثالث، اور ان تین مقدس ترین مقامات میں سے ثالث ثلاثہ جن کی زیارت کی نیت سے شدِ رحال کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے ——— آگ کے شعلوں میں لپٹ کر پورے عالمِ اسلام کے لئے مجسم دعوتِ آہ و فغاں بن گیا ؎

"روئے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننا بہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!!"

پورا عالمِ اسلام بے قرار ہو گیا، قلوب مضطرب ہو گئے، روحیں بے چین ہو گئیں، غم و اندوہ اور غیظ و غضب کی ایک لہر پوری ملتِ اسلامی کے جسد میں دوڑ گئی ——— لیکن آخرش "قہرِ درویش بر جانِ درویش!" کے سوا کچھ نہ ہو سکا۔ پوری ملتِ اسلامی بس تلملا کر رہ گئی۔ اس لئے کہ: ع

"ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!"

جس طرح بسا اوقات کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے ہی میں عافیت دیکھتا ہے اسی طرح جی چاہتا ہے کہ اس صورتِ حال کے عواقب سے بھی آنکھیں بند کر لی جائیں اور قطعاً نہ سوچا جائے کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا!! ——— بصورتِ دیگر سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے، اعصاب جواب دینے لگتے ہیں اور نبضیں چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں ——— دشمن ہمیں ٹٹول رہا ہے اور رفتہ رفتہ ہماری کمزوریوں سے آگاہ ہوتا چلا جا رہا ہے، صورتِ حال یک دم تبدیل ہو گئی ہے ——— اور دفعتہً عالمِ ارضی کی پوری نام

بنا دِ ملتِ اسلامی کا جرم محل گیا ہے ——— ابھی تک معاملہ صرف فلسطینی عربوں کے حقوق کا تھا، جسے خود عربوں نے سخت ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنا ایک داخلی سا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ لیکن اب معاملہ پوری ملتِ اسلامیہ کی دینی غیرت و حمیت کا ہے۔ اس ذلت کو اگر یہ پوری امت اس طرح گوارا کر گئی تو دشمن حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر وار کرنے سے کب باز رہے گا! ——— آج کے دور میں جبکہ لاکھوں میل کے فاصلے کی بھی کوئی وقعت نہیں رہی، اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے مسجد نبوی کا فاصلہ کل چھ سو میل ——— اور مسجد حرام کا فاصلہ قریباً آٹھ سو میل رہ گیا ہے ——— اور کم از کم حرم نبوی پر اپنے دعویٔ استحقاق کو تو اسرائیل نے کبھی مخفی بھی نہیں رکھا! ——— ادھر قرآن حکیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان اُمتوں کو ان کی بدعملی و بدکرداری کی سزا، ان کے مقامات مقدسہ کی اغیار کے ہاتھوں بے حرمتی کی صورت میں بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کی امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو یہ سزا دو بار دی گئی:-

"فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوٓءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا"
(سورہ بنی اسرائیل، آیت ۷)

پھر جب آیا دوسری وعید کا وقت (تو مسلط کیا تم پر لوگوں کو) تاکہ بگاڑ دیں وہ تمہارا حلیہ اور داخل ہوں مسجد میں اسی طرح جس طرح داخل ہوئے تھے اس میں پہلی بار اور تباہ کر دیں ہر چیز کو جس پر بھی بس چل جائے!"

تو کیا اب ہماری سیہ کاریوں کی کالک حرمین شریفین کی مقدس پیشانیوں پر بھی مل جائے گی!! ———
عیاذاً باللہ! عیاذاً باللہ!!

دوسری طرف بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی ——— اور تاحال یہ شغل جاری ہے!! یوں تو ہندی مسلمانوں پر ظلم و تشدد اور تعدی و عدوان بھارت کی ہندو جاتی کا روز کا معمول ہے۔ لیکن احمد آباد اور اس کے گرد و نواح میں تو ان دنوں بالکل ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستان دہرائی گئی اور بعینہٖ وہی نقشہ سامنے آ گیا کہ ع: ——— "ہو گیا مانند آبِ ارزاں مسلماں کا لہو!"

اللہ کی شان ہے کہ جو شہر خود احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے معنون ہو، اُس میں اُنؐ ہی کے دین کے نام لیوا اس طرح بھیڑ بکریوں کے مانند ذبح ہو رہے ہیں اور پورا عالم اسلام ہے کہ "ملک ملک دیدم دم نہ کشیدم!" کا نقشہ پیش کر رہا ہے ——— درآنحالیکہ کتاب الٰہی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ:

"وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ　　　اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ
وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ
اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ
اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ
وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ؕ"
(سورہ نساء : آیت ۷۵)

اللہ کی راہ میں اور ان مغلوب و مقہور مردوں، عورتوں اور بچوں (کی داد رسی) کے لئے جو کہتے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی جانب سے کوئی حامی اور مددگار اٹھا!"

اس معاملے میں یوں تو اس عالم ارضی کی پوری امت مسلمہ کی ملی غیرت و حمیت کا مرثیہ کہنا چاہیئے ـــــ خصوصاً اس لئے کہ یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی ملت اسلامی نے ہمیشہ پورے عالم اسلامی کے رنج و غم کو اپنا دکھ درد شمار کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ صورت حال یہ رہی کہ چاہے کبھی بلقان و ترکی پر برا وقت آیا ہو، چاہے طرابلس و شام پر ہندوستانی مسلمان بالکل اس طرح تڑپ اٹھا رہا جیسے خود اس کے پہلو میں خنجر بھونکا گیا ہو ؎

"خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر!
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!!"

لیکن اُدھر یہ عالم ہے کہ بھارت میں "فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ" مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے لیکن عالم اسلام ـــــ اور بات کہنے کی نہیں لیکن سچ "خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!" کے مصداق کہنی پڑتی ہے کہ خصوصاً عالم عرب کا حال یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت بھارت کی نیاز مندی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے ایک دوسرے سے زیادہ بے تاب نظر آتی ہے ـــــ ماضی میں پنڈت نہرو کو عین مملکت عربیہ سعودیہ میں حرمین شریفین کی خادم محافظ حکومت نے "رسول السلام" کے خطاب سے نوازا ـــــ اور اس موقع پر تو حد ہو گئی کہ عین اس وقت جبکہ بھارت کے ایک صوبائی دارالحکومت میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور گھاس پھونس کی طرح جلایا جا رہا تھا، زعمائے عرب، رباط کی مسلم سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت پر زور دے رہے تھے اور اس معاملے میں ان کی صفوں میں ایک غیر معمولی اتحاد و اتفاق نظر آ رہا تھا حتیٰ کہ اس حمام میں "رجعت پسند شاہ پرست" اور نام نہاد "ترقی پسند" سب یکساں ننگے تھے ؎

"ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!"

عالم اسلام اور خصوصاً عالم عرب سے یہ گلہ شکوہ قدرے دور کی بات سہی، لیکن ملت اسلامیہ پاکستان

کے لئے تو یہ واقعتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ جن کی قربانیوں کے طفیل آج نہ صرف یہ کہ آزادی کے سانس لے رہی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گلچھرے اڑا رہی ہے ان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر بھی یہ ٹس سے مس نہیں ہوتی —— خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور مکافاتِ عمل صرف عالمِ آخرت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اقوام و ملل کے اجتماعی جرائم کا حساب تو اکثر و بیشتر یہیں چکا دیا جاتا ہے —— ہمارے لچھن اگر وہی رہے کہ جو اب ہیں اور ہم اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے خون کی سرخی کو شرابِ ارغوانی اور غازۂ چہرۂ نسوانی میں تبدیل کرتے رہے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا ——

کم از کم ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم ہندی مسلمانوں پر ظلم و ستم کی اس پیہم یلغار کو اسی طرح خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے اور ہماری رگِ حمیت صرف اسی قدر جوش کھاتی رہی کہ ہر بار ظالموں کی اس منڈلی کی دہائی دی جاتی رہی جسے اقوامِ متحدہ کہا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ ہماری حمیتِ قومی اور غیرتِ کا جنازہ بالکل نکل جائے گا اور وہ وقت زیادہ دور نہیں جب صورت وہ ہو جائے گی کہ ؏ :

"غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!"

پھر تاریخ کی یہ شہادت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس گھرانے سے غیرت رخصت ہو جائے اس آزادی اور خود اختیاری کو بھی رخصت ہوتے دیر نہیں لگتی۔! اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے! آمین

اندرونِ ملک کے حالات کو دیکھئے تو مزید مایوسی کی صورتِ حال نظر آتی ہے اور ؏ :

"تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم!"

کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اوپر کا سارا گلہ شکوہ ہی بے بنیاد نظر آنے لگتا ہے اس لئے کہ 'استغاثہ' تو صرف 'ملتِ اسلامیہ' کے نام مناسب ہو سکتا ہے اور یہاں یہ تصور ہی کم ہوتے ہوتے معدوم کے درجے کو پہنچ چکا ہے ؏ :

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!"

چنانچہ جس قسم کے نعرے آج سے پچیس تیس سال قبل عالمِ عرب میں لگے تھے یعنی "المصر للمصریین (مصر مصریوں کا ہے!) اسی قسم کے نعرے آج سرزمینِ پاک میں بلند ہو رہے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں تو بنگالی قومیت کا راگ شروع ہی سے الاپا جا رہا تھا اب سندھ بھی "جئے" کے نعروں سے گونج رہا ہے اور یہی حال بلوچستان اور سابق صوبہ سرحد کا ہے ——

پختونستان کا شوشہ تو قدیم تھا ہی، ایک نئی دو عملی یہ ایجاد ہوئی ہے کہ 'عظیم باپ' افغانستان میں آزاد پختونستان کے نعرے کو ہوا دے رہا ہے اور اس کی صلبی و معنوی ذریت پاکستان میں بیٹھ کر اس

...ابل اعتراض تعبیر پیش کر رہی ہے ——— الغرض وہ نعرہ کہ سہ

"بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
کہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی!!"

...یب پاکستان کے دوران خوب زور شور سے بلند ہوا تھا، ایران و افغانستان تک کیا پہنچتا خود پاکستان ...ذر رہا ہے۔ پوری ارضِ پاک میں ایک خطۂ پنجاب ہے جو شاید اپنے اس مایہ ناز سپوت کی لاج رکھنے ...تیا علامہ اقبال کے نام سے جانتی ہے "رجوع الی الجاہلیت" کی اس وبا سے قدرے بچا ہوا ہے ... لیکن تابہ کے! ——— اگر یہ ایک واقعی قانونِ فطرت ہے کہ "ہر عمل ایک ردّ عمل کو جنم ...!" تو جلد یا بدیر یہاں بھی وہی صورت پیدا ہو کر رہے گی ———!

...یسے صورتِ حال میں ہندی مسلمانوں کی دادرسی کی توقع کس سے ہو! ——— یہاں تو بنگالی مسلمان نے ...مسلمان کا خون بہانے سے دریغ نہ کیا۔ کوئٹے میں بار بار فسادات کی آگ بھڑکی اور سندھ کے متعدد ...یں غیر سندھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا باقاعدہ پروگرام بن چکا تھا ——— یہ تو بھلا ہو ...لاء کا کہ بروقت نافذ ہو گیا ورنہ مغربی پاکستان بھی اس میدان میں مشرقی پاکستان کی ہمسری کا شرف ...کر لیتا۔

...تشتت و انتشار کی اس گرم بازاری میں مزید اضافہ دائیں اور بائیں بازو کی قوتوں کی ایک دوسرے کے خلاف ...لائی سے ہو گیا ہے، چنانچہ دونوں کیمپوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور بیزاری بڑھتی جا رہی ہے اور اشتعال ...میں اضافہ ہو رہا ہے حتیٰ کہ تشدد اور تصادم اور فیصلہ کن مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور نوجوان ایک

ہم نے جولائی کے شمارے میں پاکستان کی اجتماعی زندگی کی جن الجھنوں اور پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا تھا ان میں سے تیسری الجھن جو مضمون کی دوسری قسط میں بیان ہونی تھی یہ ہے کہ پاکستان میں "قومیت" کا ایک ہولناک خلا ہے جو کوئی آج پیدا نہیں ہوا بلکہ بالکل ابتدا سے چلا آ رہا ہے لیکن بعد میں ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے اس لئے احتراز کیا کہ: ع "اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں!" سردست صرف اس اشارے پر اکتفا مناسب ہے کہ پاکستان قائم تو "ملت از وطن است!" کی پُر زور نفی اور "ملتِ اسلامی" کے تصور کے زوردار اثبات پر ہوا تھا۔ لیکن خود اس کے قائم کرنے والے نے پہلے ہی روز غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ کر کہ "پاکستان میں نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان، مذہبی اعتبار سے نہیں اس لئے کہ وہ تو ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے..." "ملتِ اسلامی" کے تصور کی نفی اور "وطنی قومیت" کا اثبات کر دیا تھا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دوسرے پر پل پڑنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔

رہی سہی کسر علمائے دیوبند کے دو متحارب گروہوں نے ایک دوسرے کے مقابل آکر پوری کر دی ہے۔ ان کے مابین بعض حادثہ نہیں قدیم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک ان کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کے مظاہرے دیکھنے میں آتے تھے لیکن معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ " تحسبھم جمیعا و قلوبھم شتّٰی " والا معاملہ تھا، چنانچہ جونہی دوبارہ اختلاف رونما ہوا فضا ایک دم شرعی گالیوں سے معمور ہو گئی ——— بنائے نزاع " سوشلزم " کو قرار دیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ سرمایہ داری کے دونوں ہی گروہ یکساں مخالف ہیں۔ اور مزدوروں اور کسانوں کی حالتِ زار کا دونوں ہی کو برابر رنج و غم ہے۔ حتیٰ کہ معاشی عدل و اعتدال کے لئے فوری تدابیر میں بھی دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ——— ہاں ہم کفر کے فتوے عام ہو رہے ہیں اور " کانگرسی مولوی " کی گالی میں تو خیر کوئی مضائقہ ہی نہیں ؏

" بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است "

عجیب طرفہ تماشا ہے کہ " اسلامی جمہوریت " کی اصطلاح تو سر آنکھوں پر لیکن " اسلامی سوشلزم " کی اصطلاح قطعاً ناجائز و حرام ——— پھر مزید یہ کہ جس شخص نے سب سے پہلے یہ اصطلاح استعمال

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) چنانچہ اسی وقت سے ہمارے یہاں ملتِ اسلامی اور پاکستانی قومیت کے مابین ایک کھچا جاری ہے۔ اور یہ اسی کھینچے کے اثرات ہیں جو آج علاقائی و لسانی قومیتوں کے فروغ کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ نظریۂ ملت کو خود ہم نے منہدم کر دیا اور پاکستانی قومیت کا تصور ہمارے مزاج کے مناسب نہ تھا۔ چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی میں وہ خلا پیدا ہوا جو رفتہ رفتہ مذکورہ بالا قومیتوں اور عصبیتوں سے پُر ہوا ——— چنانچہ اب شکایت ہو تو کس سے اور گلہ ہو تو کس کا ؟ ؏ " اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست !! "

اگرچہ یہ اندیشہ بھی شدید ہے کہ بات کہیں ' حدود ' سے تجاوز نہ کر جائے، لیکن دردِ دل بالکل خاموش بھی نہیں رہنے دیتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے ' جیتہ ' الفاظ پر تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آج تک بھی ان کا قصور معاف نہیں ہوا حالانکہ جب انہوں نے اپنے بیان کی وضاحت فرمائی تو علامہ اقبال نے بھی اپنے اشعار سے رجوع کر لیا تھا۔ لیکن بانیٔ پاکستان کے اس نظریۂ وطنیت پر تنقید کی جرأت کسی کو نہ ہوئی حتیٰ کہ علما بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے ؎

دیکھ مجھے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ !

بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ !!

کی بیٹی محمد علی جناح مرحوم وہ تو سب کے نزدیک قائد اعظم اور رحمۃ اللہ علیہ لیکن اب جو بھی یہ لفظ م
سے نکالے وہ کافر و مرتد۔ بحالی جمہوریت کے لئے تو ہر کس و ناکس سے تعاون کو جائز ہی نہیں لازمی و نا
قرار دیا جائے اور معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کی غرض سے کوئی مزدوروں سے اتحاد کرلے تو گردن زدنی!

"خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!"

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کا انجام کیا ہوگا —— اور ہماری قومی و
زندگی کسی حادثے سے دو چار ہوگی۔ بظاہر احوال تو امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی!

ان حالات میں جس کسی سے جو کچھ بن آئے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ فساد اتنا ہمہ گیر ہے کہ کسی بھی تدبیر سے صدفی صد کارگر ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک ہی صورت ممکن ہے کہ نتائج سے بالکل بے پروا ہو جس سے جو خدمت دین و مذہب اور ملک وملت کی بن پڑے اسے کرتے رہنا چاہیئے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی حقیر سی مساعی کو خدمت قرآن کے لئے وقف کرنے کے فیصلے کی توفیق ہے۔ چنانچہ جیسے بھی بن آرہا ہے ہم اپنی صلاحیتوں اور اوقات کی حقیر سی پونجی اسی کام میں صرف کئے رہے ہیں۔ ہم اس توفیق پہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اسی سے اخلاص کی بھیک مانگتے ہیں تا ہمارا عمل اس کی بارگاہ میں قبول ہو۔

(۳)

"..... وقتِ دعا ہے!"

"تذکرہ وتبصرہ" میثاق دسمبر ۱۹۷۱ء

ان سطور کی تحریر کے وقت مشرقی پاکستان پر بھارت کا باقاعدہ حملہ شروع ہوئے بیس روز ہو چکے ہیں اور مغربی پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ شروع ہوئے بھی آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت دونوں محاذوں پر میدانی جنگ بھی نہایت گھمسان کی ہو رہی ہے اور دونوں ملکوں کی بحری و فضائی قوتوں میں بھی خوفناک ٹکراؤ جاری ہے ——— ادھر اقوام متحدہ میں بھی گفت و شنید کا سلسلہ چل رہا ہے اور دنیا بھر کے تمام اہم دارالسلطنتوں کی توجہات بھی برصغیر پر مرکوز ہیں۔

کل کیا ہوگا وہ " وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا "[1] کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی " وَاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا "[2] کے مصداق کسی کے علم میں نہیں! —— حتیٰ کہ یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ جنگ کے خاتمے سے قبل یہ سطور بھی طبع ہو کر قارئین تک پہنچ پاتی ہیں یا نہیں!

تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان کے وجود اور بقا کے لیے یہ جنگ فیصلہ کن ہے اور ہر پاکستانی مسلمان کے لیے یہ وقت جان کی بازی کھیل جانے کا ہے، اور ساتھ ہی چونکہ پاکستان کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہی تھا اور اس کا اب تک قائم رہنا بھی اسی کے رحم و کرم کا نتیجہ ہے لہٰذا ہر پاکستانی کو بارگاہِ خداوندی میں صدقِ دل سے دعا بھی ہونی چاہیئے۔

لیکن یہ واضح رہنا چاہیئے کہ دعا بس کچھ رٹے ہوئے الفاظ کے زبانوں سے ادا کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ ہر وہ شخص جو خدا کی رحمت کو پکارتا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ خود اس نے اپنے پروردگار سے کوئی وفادارانہ رشتہ بھی استوار کیا یا نہیں!

---

[1] " اور نہیں جانتا کوئی ذی نفس کہ وہ کل کو کیا کمائے گا "۔ سورہ لقمان آیت ۳۴

[2] : " اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کی شامت آگئی ہے یا ان کا رب ان پر کرم فرمائی کا ارادہ رکھتا ہے " سورہ جن آیت

اور خود اس نے اس کے دین کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ کیا یا نہیں؟ - اس لئے کہ خدا کا تو واضح فرمان یہ ہے کہ " اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ "[1]

واقعہ یہ ہے کہ ہم نے پاکستان ایسی نعمتِ غیر مترقبہ اور دولتِ خداداد کی نہ کوئی قدر کی اور نہ ہی اس کا کوئی حق ادا کیا اور ہم بحیثیت قوم عدالتِ خداوندی میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور اب بھی کوئی آثار ایسے موجود نہیں کہ یہ امید کی جا سکے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا دھارا دین کی طرف مڑ سکے گا۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرد اس پوزیشن میں نہیں کہ پوری قوم کی جانب سے بارگاہِ خداوندی میں " اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ "[2] کا توبہ نامہ پیش کر سکے " اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا "[3] کی استفہامی درخواست اور دعا پیش کر سکے! ——— ہاں ایک بات ممکن ہے اور وہ یہ کہ:

ہر وہ شخص جو واقعتاً صدقِ دل سے خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہتا ہو پہلے بارگاہِ خداوندی میں اپنے تمام گناہوں پر صدقِ دل سے اظہارِ ندامت بھی کرے اور عزمِ توبہ بھی! اور پھر یہ عہد کرے کہ کم از کم اس کی اپنی زندگی اور اس کے بیشتر اوقات اس کی دین کی نصرت کیلئے وقف رہیں گے اور اس کی قوتیں، صلاحیتیں اور توانائیوں کا بہتر اور اکثر حصہ اللہ کی ہدایت کی نشر و اشاعت اور اس کے دین کے غلبے کے مقصد میں صرف ہوگا اور وہ پاکستان میں ایک صحیح معنی میں اسلامی معاشرہ اور حقیقی معنوں میں اسلامی ریاست کے قیام کو اپنی زندگی کا اصل نصب العین بنائے رکھے گا!

تب اگر وہ اللہ تعالیٰ سے پاکستان کی سلامتی کی دعا کرے گا تو وہ یقیناً مقبول ہوگی۔ راقم خود اسی عزم اور ارادے کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں پاکستان کی فتح کی درخواست پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی جاننا چاہتا ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اس عزم اور ارادے میں اس کے ساتھ ہیں ——— رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ - اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ - اٰمِيْن يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ!!

---

[1] " اگر تم خدا کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا " سورہ محمدؐ آیت ۷

[2] " ہم تیری جانب رجوع کرتے ہیں " سورہ اعراف: آیت ۱۵۶

[3] " کیا تو ہمیں ہمارے ناسمجھ لوگوں کے کرتوتوں کے سبب ہلاک فرما دے گا " سورۂ اعراف آیت ۱۵۵

(۴)

سقوطِ مشرقی پاکستان

اور ذلت آمیز شکست کے اسباب و عوامل

"تذکرہ و تبصرہ" جنوری، فروری ۱۹۷۲ء

دسمبر ۷۱ء کا شمارہ پاک ہند جنگ کے دوران شائع ہوا تھا اور اس کے 'تذکرہ و تبصرہ' میں ہم نے "دقتِ دعا ہے .... !" کے عنوان سے عرض کیا تھا کہ

"کل کیا ہوگا وہ — 'وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا'[۱]
کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی 'وَاَنَّا لَا نَدْرِيْ
اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا'[۲]
کے مصداق کسی کے علم میں نہیں ...."

تو اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے تو نہیں تھے جو "فتح لازماً ہماری ہوگی !" اور "ہم عید کی نماز دہلی اور کلکتہ میں پڑھیں گے !" کی قسم کی بڑیں ہانکتے تھے۔ تاہم اس اقرار میں ہمیں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ ایسی ذلت آمیز شکست کا تو ہمیں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ مشرقی پاکستان کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے سبب سے یہ خدشہ تو ہمیں کبھی کبھی ہوتا تھا کہ کہیں مشرقی پاکستان ہماری فوج کا قبرستان نہ بن جائے[۳] لیکن یہ کبھی تصور میں بھی نہ آسکتا تھا کہ مشرقی پاکستان عالمِ ارضی کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کی عزت و ناموس کی شمشان بھومی کی صورت اختیار کرے گا اور ایک ایسی فوج کے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور افسر انتہائی ذلت کے ساتھ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے جس کی شجاعت

---

[۱] "اور نہیں جانتا کوئی ذی نفس کہ کل وہ کیا کمائے گا" سورۂ لقمان آیت ۳۴

[۲] "اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کی شامت آگئی ہے یا ان کا رب ان پر کرم فرمائی کا ارادہ رکھتا ہے" سورۂ جن آیت ۱۰

[۳] چنانچہ مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے یاد دلایا کہ بالکل انہی الفاظ میں ایک بار راقم نے اس خدشے کا اظہار ان کے سامنے کیا

کا ڈنکا صرف عالم اسلام ہی میں نہیں پوری دنیا میں بجتا ہے اور جس کی بہادری کے اپنے ہی نہیں دشمن بھی معترف ہیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے دوران کئی بار ایسا ہوا کہ انہیں دشمنوں کے ہاتھوں عبرتناک شکستیں اٹھانی پڑیں۔ تاریخ کے اوراق میں ایسے کئی مواقع کی داستانیں تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں۔ چنانچہ جب کبھی پڑھنے میں آتا کہ اس طرح کے مواقع پر کئی کئی لاکھ کی تعداد میں یہودی مرد عورتیں اور بچے اسیر بنا لیے جاتے تھے تو حیرت ہوتی تھی کہ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم ابھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہو لیکن اسیری کی ذلت کو قبول کرے۔ اور جیسا کہ نبوکد نصر کے حملے کے بعد ہوا، بالکل بھیڑ بکریوں اور ڈھور ڈنگروں کی طرح لاکھوں کی تعداد میں ہنکا کر ایک ملک سے دوسرے ملک کو لے جائی جائے ——

افسوس کہ ملت اسلامیہ پاکستان نے اپنی آنکھوں سے جیتے جی یہ منظر دیکھ لیا کہ اس کے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل جوانوں نے نہ صرف یہ کہ انتہائی ذلت آمیز طریقے پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے بلکہ انہیں اس حال میں "بنگلہ دیش" سے بھارت منتقل کیا گیا کہ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے ——

انا للہ و انا الیہ راجعون

اس حادثۂ فاجعہ پر جو کرب و الم نہ صرف مسلمانان پاکستان بلکہ مسلمانان عالم نے محسوس کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ بیان سے باہر ہے۔ کتنے ہی لوگوں کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش کہ ہماری یہ فوج ایک ایک کر کے کٹ مرتی لیکن ہتھیار نہ ڈالتی۔ ہر شخص اپنے دل میں رنج و غم کا ایک بند طوفان لیے پھرتا ہے اور پوری قوم کے احساسات میں تلخی کا زہر گھل کر رہ گیا ہے۔

کاش کہ اس موقع پر قوم کو کوئی "زبان" میسر ہوتی جو اس کے احساسات کی ترجمانی کر کے اس کے دل کے بوجھ کو کسی قدر ہلکا کر دیتی۔ قومی اور ملی سطح پر ہماری تہی دامنی کا عالم یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس ایسی کوئی "زبان" بھی موجود نہیں۔ بغداد کی تباہی پر جو نوحے شیخ سعدیؒ نے کہے تھے ان سے اس وقت نہ معلوم کتنے لوگوں کے دلوں کا بوجھ ہلکا ہوا ہوگا۔ ان کا یہ شعر جو زبان زد خاص و عام ہے ان کے اپنے احساسات کی شدت کا کس درجہ غماز ہے کہ ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

پھر جب دولت ہسپانیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھنی تو بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی!

پھر جب دہلی پہ قیامت ٹوٹی تو علامہ اقبال مرحوم ہی کے الفاظ میں "داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر!" یہاں تک کہ اسی صدی میں شمالی افریقہ پر یورپی استعمار کے مظالم پر علامہ شبلی مرحوم نے دردناک مرثیے کہے، اور خود علامہ اقبال نے جزیرہ صقلیہ (سسلی) پر بایں الفاظ نوحہ کہا کہ ؎

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

لیکن افسوس کہ آج حال یہ ہے کہ روئے ارض کی عظیم ترین مسلمان مملکت پر قیامت گزر گئی پھر بھی کوئی ایسا نالہ کسی جانب سے سننے میں نہیں آیا جو قوم کی آواز قرار پاتا اور جسے سن کر قوم محسوس کرتی کہ کم ازکم اس کے جذبات کا اظہار تو ہو گیا ——— ان حالات میں بے ساختہ نوک قلم پہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ مبارک آتے ہیں جو آپؐ کی زبان مبارک سے غزوہ اُحد کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لانے پر جوشِ گریہ سے نکلے تھے کہ " اَمَّا حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ ! " ——— " ہائے ! حمزہؓ کے لیے رونے والیاں بھی نہیں !" بالکل اسی طرح حقیقت یہ ہے کہ آج سقوطِ مشرقی پاکستان کا رونے والا بھی کوئی موجود نہیں۔

یہ رونا رلانا، واقعہ یہ ہے کہ محض رسمی نہیں ہوتا بلکہ اس سے حقیقتاً قوم کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ ورنہ بسا اوقات اِس طرح کے صدمے اندر کی اس بند چوٹ کے مانند جو کسی مریض کو اندر ہی اندر ختم کر دیتی ہے کسی قوم کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ " سقوطِ مشرقی پاکستان " پر قوم کے جذبات کا اظہار نہ ہو سکنے کے باعث اندر ہی اندر کا صدمہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے جذبۂ خود اعتمادی کو گھن کی طرح چٹ کر رہا ہے اور عوام کی اکثریت نہ صرف یہ کہ اس طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں ہے کہ آیا ہماری کوئی حقیقی بنیاد ہے بھی کہ نہیں ؟ اور آئندہ بقیہ ملک بھی قائم رہ سکے گا یا نہیں ؟ - بلکہ لوگ یہاں تک سوچنے لگے ہیں کہ کیا واقعی پاکستان کا قیام درست اور صحیح تھا ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پاکستان کا قیام ہی ایک غلطی ہو اور اب تاریخ کے بے رحم ہاتھ اس غلطی کی جبری اصلاح کے درپے ہو چکے ہوں۔

یہ صورت حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جو زلزلے کے کسی جھٹکے کے بعد اعصاب پر طاری ہوتی ہے یعنی یہ کہ انسان ہل کر رہ جاتا ہے اور اسے نہ اپنے نیچے زمین ہی محسوس ہوتی ہے نہ سر پر آسمان بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ فضا میں معلق ہو۔ پھر یہ حالت زلزلے کے جھٹکے کے بعد فوراً ختم نہیں جاتی بلکہ دیر تک طاری رہتی ہے، اور انسان بہت دیر تک غیر یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے

اس صورت حال میں اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ رنج و الم اور درد و کرب کے احساسات

کو زبان اظہار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی سے تجزیہ بھی کیا جائے کہ جو کچھ پیش آیا اس کے اسباب کیا تھے۔ حقیقی غلطی کہاں تھی اور کتنی تھی، بلکہ یہ بھی کہ یہ واقعہ جو پیش آیا ہے وہ حقیقت میں ہے کیا؟ اور اس سے ہماری کمزوریاں یا خامیاں ظاہر ہوئی ہیں تو کونسی؟ ——— تاکہ قوم پر بحیثیت مجموعی ناامیدی اور مایوسی کی جو کیفیت طاری ہو گئی ہے وہ ختم ہو اور بے اعتمادی اور غیر یقینی کے بادل جو ملک و ملت کی فضا پر چھا گئے ہیں وہ چھٹ جائیں۔

ہمارے نزدیک "سقوطِ مشرقی پاکستان" ایک حادثہ نہیں بلکہ دو واقعات کا مجموعہ ہے، اور کسی حقیقی تجزیئے کے لیے لازمی ہے کہ ان دونوں پر آغاز ہی سے علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے۔ ان میں سے ایک ہے مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی اور وہاں ایک نئی خود مختار مملکت کا "بنگلہ دیش" کے نام سے قیام اور دوسرا ہے ——— پاک ہند جنگ میں پاکستان کی ذلت آمیز شکست اور عبرت ناک ہزیمت'۔ ان دونوں حوادث کے جمع ہو جانے اور بیک وقت وقوع پذیر ہونے کو چاہے روایتی طور پر اپنی بدقسمتی پر محمول کر لیا جائے چاہے چند افراد کی نااہلی اور بے تدبیری یا غداری پر، چاہے پوری قوم کی سیاسی بے شعوری اور اجتماعی نابالغی پر، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ ہیں دو بالکل جدا حادثات اور انہیں گڈمڈ کرنا کسی طور پر درست نہیں، اس لیے کہ اس حادثے کی اصل تلخی دوسرے جزو سے متعلق ہے نہ کہ پہلے سے!

جہاں تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا تعلق ہے، اس سے پہلے کہ ہم اس واقعے پر اپنا حالیہ' تبصرہ' پیش کریں مناسب ہے کہ آج سے ڈھائی سال قبل جولائی ۱۹۶۹ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' میں ہم نے اس مسئلے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اسے دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں[1]

اس قدر طویل اقتباس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی حادثے کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد تو ہر شخص ہی 'پنڈت' بن جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اپنی اس تحریر میں اس "اشکال اور الجھاؤ" کے جس مستقل حل کی طرف اشارہ کیا تھا یعنی یہ کہ "دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل ابھارا جاتا رہے اور اس جذبے کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا" وہ تو نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ البتہ جتنی قابلِ حذر چیزوں کا ذکر ہم نے کیا تھا، شامتِ اعمال سے وہ سب کی سب بدترین صورتوں میں رونما ہو کر رہیں۔ چنانچہ جب یہ کمزور رشتہ کمزور تر ہوتا نظر آیا تو وہ "مشرقی پاکستان

---

[1] یہ اقتباس چونکہ اسی شمارے کے ص ۹۱ پر آچکا ہے لہٰذا یہاں اسے حذف کر دیا گیا ہے (مرتب)

کے عوام کی آزادانہ مرضی " کو بروئے کار آنے کا موقع دیا گیا ، نہ ان سے سیدھی طرح بات ہی کی گئی ، بلکہ اس کے برعکس " جبر و تشدد " کی راہ اختیار کی گئی اور وحشیانہ طاقت و قوت کا سخت ترین استعمال کر دیا گیا ۔ چنانچہ اس کا " ردِ عمل " بھی نہایت خوفناک صورت میں سامنے آیا ۔ اور آج ہم اس صورتحال سے دوچار ہیں کہ ایک طرف مغربی پاکستان کے عوام کی گردنیں شدید ترین احساسِ ذلت و رسوائی سے جھکی ہوئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں مایوسی اور دل شکستگی کے مہیب سائے ڈیرہ ڈالے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ حسین و زرخیز اور سرسبز و شاداب خطہ جسے دنیا ربع صدی تک ' مشرقی پاکستان ' کے نام سے جانتی رہی ہے نہ صرف یہ کہ ہم سے کٹ گیا ہے بلکہ اس وقت دشمن کے قبضے میں ہے اور اس بات کا حقیقی خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ مستقل طور پر مہا بھارت " میں ضم " اور ہندی قومیت میں " جذب " ہو کر نہ رہ جائے ۔

حقیقت یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد پاکستان میں جو حالات و واقعات رونما ہوئے وہ ہمارے سابق حکمران ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی و بے تدبیری حتیٰ کہ بدنیتی اور بددیانتی کے شاہکار تو ہیں ہی ۔ مجموعی اعتبار سے ہماری پوری قوم کے سیاسی افلاس کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں ہم نے گزشتہ پورے سال کے دوران اس موضوع پر بالکل قلم اس لئے نہیں اٹھایا کہ مارشل لاء کی تلوار سر پر لٹکی ہوئی تھی اور زبان و قلم پر سخت پہرے قائم تھے ۔ چنانچہ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۱ء کے ' تذکرہ و تبصرہ ' میں ہم نے عرض بھی کر دیا تھا کہ :

> جہاں تک ملکی حالات کا تعلق ہے ان پر کچھ لکھنے پر ابھی طبیعت بالکل آمادہ نہیں ہوتی ۔ اس لئے کہ بحالاتِ موجودہ " پورا سچ " (Whole Truth) کہنا ممکن نہیں اور جزوی صداقت (HALF TRUTH) کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ وہ بسا اوقات جھوٹ اور کذب کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ لہٰذا اب تک تو ہم غیر معمولی حالات کی بنا پر عائد شدہ پابندیوں سے آزاد نہیں ہو جاتے ہم منقار زیرِ پر رہنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں ۔ . . . "

ہماری حتمی رائے جو مندرجہ بالا اقتباس کے بین السطور میں بھی موجود ہے ، یہ ہے کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کو ابتدا ہی سے ایک ملک متصور کر کے سفر کا آغاز اگرچہ نہایت خلوص کے ساتھ اور " (In absolute good faith) " ہوا تھا تاہم تھی یہ ایک غلطی ۔ اس کے برعکس صحیح شکل وہی تھی جس کی جانب مشہور و معروف ' قرارداد لاہور ' میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ بجز انیائی حقائق کا منہ چڑانے کی بجائے ان کا مناسب لحاظ کیا جاتا اور ان دونوں خطوں کو ابتدا ہی سے دو آزاد اور خود مختار ملک تصور کر کے سفر کا آغاز کیا جاتا ۔ اس صورت میں غالب امکان یہی تھا کہ ایک طرف تو یہ دونوں ملک بھارت کی مشترک دشمنی کے زیرِ اثر آپ سے آپ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ایک دوسرے

کے ساتھ نہایت قریبی تعاون اور اشتراکِ عمل رکھنے پر مجبور ہوتے اور دوسری طرف مشرقی پاکستان میں مقامی ہندو سرمایہ داروں کے غریب مسلمان عوام کے معاشی استحصال کا وہ احساس و شعور بھی برقرار رہتا جو پاکستان کے وجود میں آنے کا اصل اور بنیادی محرک بنا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم بحیثیت قوم چاہے خالص عارضی اور محض وقتی طور پر ہی سہی بہرحال آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل کے زمانہ میں 'جذباتیت' سے اس درجہ سرشار ہو گئے تھے کہ نہایت ٹھوس حقائق بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ہم نے ان دونوں دور دراز خطوں کو "سیمنٹ" کر کے "ایک متحدہ ملک" کی صورت میں قائم کر دیا۔ یہ درحقیقت قومی سطح پر ہمارے سیاسی افلاس کا ایک بہت بڑا ثبوت اور ہمارے قومی مزاج کی 'جذباتیت' کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر بحیثیت قوم ہم میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا تو ہم بہت جلد اس غلطی کا احساس و ادراک کر لیتے۔ اس لیے کہ خان لیاقت علی خان مرحوم کی بی پی سی رپورٹ کا حد درجہ حسرت ناک انجام اسی لیے ہوا تھا کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین بندھن کے لیے کوئی قابلِ قبول دستوری فارمولا تلاش نہ کیا جا سکا۔ لیکن ہماری "جذباتیت" اور حقائق سے گریز کی مستقل عادت پھر آڑے آئی اور ہم نے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد پاکستان میں حکومت کی سطح پر سازشوں اور انقلابوں کا جو چکر چلا اس کا اصل اور بنیادی سبب تو اگرچہ یہ تھا کہ یہاں جو قوم آباد تھی وہ دفعۃً "آزاد" تو ہو گئی تھی لیکن اس کا سیاسی و اجتماعی شعور ابھی بالکل خام تھا اور یہاں قومی سطح پر نہ کوئی محکم تنظیم موجود تھی نہ مضبوط قیادت لیکن اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ جب ملک کی کوئی دستوری اساس ہی قائم نہ ہو سکی تو لامحالہ "جو خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میرا" کے مصداق بے دستوری ہی یہاں کا دستور اور بے آئینی ہی یہاں کا آئین قرار پایا۔ چنانچہ ملک و ملت کا سفینہ کچھ عرصہ تو سازشوں اور انقلابوں کے چھوٹے چھوٹے گردابوں میں ہچکولے کھاتا رہا اور بالآخر ایک بڑے بھنور میں آ پھنسا۔ اور ایوب خان کا گیارہ سالہ "سنہری دور" شروع ہو گیا جس کے دوران میں 'صدارتی طرزِ حکومت' نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے سیاسی محرومی کے احساس کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ دورِ ایوبی میں مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی وغیرہ کی صورتوں میں وہاں کے عوام کی اشک شوئی اور دلجوئی کی بہت سی کوششیں بھی ہوئیں لیکن اس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ان تمام کوششوں کے علی الرغم رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان واقعتہً مغربی پاکستان کی 'نو آبادی' (Colony) بنتا چلا گیا جس سے وہاں فطری طور پر سیاسی بے چینی مسلسل بڑھتی چلی گئی۔

اس صورتِ حال سے دشمن نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ایک طرف مشرقی پاکستان کی ہندو اقلیت جلتی پر تیل ڈالا جو خود ہمارے الفاظ میں "نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے

نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی حق شناس
اور جو وہاں زبان اور کلچر کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کے احساس کو اجاگر کرنے کا کام بھی مسلسل بیس سال سے کر رہی
تھی۔ ہندوؤں کو ابھی اس منہج پر کام کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے میں یقیناً بہت مدت تک جدوجہد کرنی پڑتی لیکن
کی سیاسی بے چینی نے ان کے لیے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا اور انہوں نے سیاسی محرومی کے احساس کو
باسانی مغربی پاکستان کے خلاف جذبہ نفرت (Hate Complex) میں تبدیل کر دیا۔ اور دوسری
طرف ہمارے 'عظیم ہمسائے' نے اس آگ کو نہ صرف ہوا دی اور بھڑکایا بلکہ اس کے لیے ہر طرح کا ایندھن بھی فراہم
کیا ——— نتیجۃً علیحدگی پسندی کا ایک زبردست رجحان پیدا ہوا اور اس کے لیے ایک عوامی تحریک
جڑ پکڑ گئی۔

۱۹۶۹ء میں دوسرے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اگرچہ حکومتِ وقت نے بہت سی سابقہ ایسی غلطیاں
بھی کیں مثلاً یہ کہ مغربی پاکستان کی وحدت کو بلا وجہ ختم کر دیا تاہم دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے بعد تک بحیثیت
مجموعی سابق صدر یحییٰ کی نیک نیتی پر شک کے لیے کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ اور ان کا ملک کو ہنگاموں اور ایجی ٹیشنوں
کی فضا سے نکال کر معروف سیاسی سرگرمی حتیٰ کہ عام انتخابات کی راہ پر لے آنے میں کامیاب ہو جانا تو بلاشبہ
بہت قابلِ قدر تھا۔ لیکن اس کے بعد کی داستان نہایت تلخ ہے اور جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں حکمرانوں نے
کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی اور بے تدبیری ہی نہیں بدنیتی اور بددیانتی کا عظیم شاہکار ہے۔ اور
یہی وہ مقام ہے جہاں سے 'سقوطِ مشرقی پاکستان' کے اصل تلخ جزو یعنی ہماری ذلت آمیز شکست
اور عبرتناک ذلت و رسوائی کے اسباب کا آغاز ہوتا ہے۔

دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ مشرقی پاکستان نے بحیثیت مجموعی
علیحدگی پسندی کے حق میں واضح فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی آزاد رائے کو عملاً
بروئے کار آنے کا موقع دیا جاتا یا کم از کم یہ کہ ان سے واضح انداز میں بات کی جاتی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی
کہ حقیقتاً وہ چاہتے کیا ہیں؟ آیا مغربی پاکستان سے کلی علیحدگی کے خواہاں ہیں یا کسی درجے کا کوئی بندھن قائم
رکھنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ راقم نے انتخابات کے نتائج مدینہ منورہ میں سنے تھے اور اسی وقت احباب سے عرض
کر دیا تھا کہ اب مشرقی اور مغربی پاکستان کو کوئی طاقت ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا
وہ یہ ہے کہ ؎

ہر چہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار!

کے مصداق یہ علیحدگی خوش اسلوبی سے نہ ہو بلکہ بھونڈے طریق پر ہو اور صرف خرابی ہی نہیں خون خرابے سے

ساتھ ہی ساتھ ہی بارگاہِ رب العزت میں دعا بھی کی تھی کہ پروردگار! پاکستان کے موجودہ فوجی حکمران کو بھی کچھ خیال یہی کی سمجھ عطا فرما دے کہ وہ اس علیحدگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں لے آئیں! لیکن افسوس کہ ہماری یہ دعا بارگاہِ رب العزت میں قبول نہ ہوئی اور قوم کے سیاسی افلاس اور اجتماعی شعور کے فقدان کے نتائج سامنے آکر رہے۔

اب یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے مشیروں کا "عام انتخابات" کے انعقاد کا کریڈٹ حاصل کرنے کا فیصلہ اس غلط اندازے پر مبنی تھا کہ دونوں خطوں میں چاہے کچھ بڑے بڑے گروپ بھی انتخابات جیت لیں لیکن اکثریت چھوٹے چھوٹے سیاسی گروپوں کی ہوگی جن کو مہرے بنا کر ہم سیاست کی شطرنج پر بازی کھیلتے رہیں گے۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ ان کے یہ اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مغربی پاکستان میں تو پھر بھی پیپلز پارٹی کے بڑے دھڑے کے ساتھ کچھ نہ کچھ چھوٹے گروپ بھی آ گئے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں تو ساری کی ساری سیٹیں عوامی لیگ نے حاصل کر لیں۔ اور اس طرح شطرنج کی کسی بساط کے بچھنے کا امکان ہی موجود نہ رہا۔

بس یہیں سے بدنیتی کے اس سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ جو بالآخر انتہائی ذلت و رسوائی پر منتج ہوا۔ پہلے تو تین ماہ کشمکش و پیچ ہی میں گزار دیئے گئے۔ پھر اسمبلی کا اجلاس طلب بھی کیا تو اس پیشگی اہتمام کے ساتھ کہ وہ بالفعل منعقد نہ ہونے پائے۔

اسی مرحلہ پر پاکستان کے موجودہ صدرِ مملکت اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا کردار بھی نہایت مشکوک اور حد درجہ تباہ کن ثابت ہوا۔ اور اب چاہے بھٹو صاحب اپنے اس وقت کے موقف کی کیسی ہی خوشنما تاویلیں کر لیں حقیقت یہ ہے کہ یہ داغ ان کے دامن پر ہمیشہ قائم رہے گا کہ وہ چاہے دانستہ اس سازش میں شریک نہ رہے ہوں اور محض نادانستہ ہی استعمال ہوئے ہوں بہرحال ایک بہت بڑی تباہی کے اسباب میں شامل ضرور ہو گئے۔ ان کے بارے میں ہمارا اندازہ یہ تھا کہ ان کی جذباتی، سیماب وش، جلد باز اور VOLATILE شخصیت کے ظاہری خول کے اندر ایک سنجیدہ، حقیقت بین اور ٹھوس CALCULATING شخصیت چھپی ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مشرقی پاکستان کے معاملے میں انہوں نے کسی تدبر اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا۔

اس مسئلے میں تھوڑا سا الزام ہماری رائے میں مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے ان شکست خوردہ سیاست دانوں پر بھی آتا ہے جنہوں نے انتخابات کے فوراً بعد بھٹو دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر شیخ مجیب الرحمٰن کی مدح سرائی اور ہمنوائی شروع کر دی اور اس طرح گویا بھٹو صاحب کو بالکل CORNER کر دینے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہمارے نزدیک یہ ان لوگوں کی بہت بڑی بے تدبیری اور ناسمجھی کا بہت بڑا ثبوت تھا لیکن مگر بھٹو صاحب کا یہ

انکی اس طرح کے دستور کے مطابق بننے پر بھی یہ بھٹو صاحب کے اپنے قومِ اقتدار کے دامن پر ایک بہت بڑا داغ ہے۔

بہرحال اسمبلی کے انتہائی تاخیر کے ساتھ طلب کئے جانے اور پھر ملتوی کر دیئے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم اپنا مقصود آئینی طریق پر حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حالات بگڑنے شروع ہوئے، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، جس پر پہلے تو حکومتِ وقت نے نہایت پُر اسرار خاموشی اختیار کی اور پھر یکبارگی سخت ترین فوجی ایکشن کا آغاز کر دیا۔

اس کے بعد کی داستان بہت طویل ہے، اور داستان سرائی یہاں مقصود نہیں۔ مختصراً یہ کہ فوجی ایکشن کے نتیجے میں لاکھوں افراد گھر بار چھوڑ کر بھارت بھاگ گئے جسے بھارت نے اپنا مسئلہ بنا لیا اور اس کے پردے میں پہلے گوریلے اور مسلح تخریب کار بھیج کر اور پھر براہِ راست حملہ کر کے مشرقی پاکستان کے لیے فوری خطرہ پیدا کر دیا۔ اور پھر وہ باقاعدہ جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" بن گیا۔

جہاں تک اس 'ذلت آمیز شکست' اور 'عبرت ناک ہزیمت' کے اسباب کا تعلق ہے اب تک اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے یہی ہمارے عوام کی گفتگوؤں کا موضوع بھی رہا ہے اور 'دانشوروں' کے تجزیوں کا بھی۔ اور اب تو اس قضیئے کے باقاعدہ تصفیے کیلئے ایک عدالتی سطح کا کمیشن بھی کام کر رہا ہے۔ تاہم اس مسئلے کے بعض پہلو ایسے ہیں جو عوام کی نظروں سے تو اوجھل ہیں ہی، ہمارے علم کی حد تک 'دانشوروں' نے بھی کم از کم تا حال دانستہ یا نادانستہ ان سے اعراض ہی کیا ہے۔ رہا حمود الرحمٰن کمیشن تو غالباً یہ پہلو اس کے دائرۂ تحقیق و تفتیش (SCOPE) سے بھی باہر ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہماری رائے میں ان صفحات میں ان کی جانب مختصر اشارہ مناسب رہے گا۔

اب تک جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اس کا مرکز و محور سابق صدر یحییٰ خاں اور ان کے رفقائے کار فوجی حکمران رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس شکست کے فوری اسباب (EXCITING CAUSES) بہرحال ان لوگوں کی شدید ترین نا اہلی، حد درجہ کی بے تدبیری اور بے بصیرتی، حوصلے کی کمی، قوتِ فیصلہ کے فقدان اور اعصاب کے ضعف کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں براہِ راست نتیجہ ہیں ان کی عیاشیوں اور بدکاریوں کا اور ان کے کردار کی پستی، اخلاق کی دناءت اور سیرت کے گھناؤنے پن کا۔ خمر تو کہتے ہی اسے ہیں جو عقل کو ڈھانپ لے، (الخمرُ ما یخامر العقل) لہٰذا ہمارے ان حکمرانوں کی کچھ بوجھ اور معاملہ فہمی تو اس راہ سے رخصت ہوئی تھی رہی سہی جرأت اور حوصلہ و ارادہ تو ان سب کا جنازہ بدکاریوں نے نکال دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف یہ کہ یہ لوگ خود ذلت کی طرح بیٹھ گئے بلکہ ساتھ ہی ایک پوری قوم بلکہ روئے ارض کی پوری اُمّتِ مسلمہ کی عزت و

ناموس کا دھیلہ کر گئے۔

لیکن، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، یہ سب شکست کے صرف فوری اسباب ہیں اور اس بحر کی گہرائیوں میں "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کے مصداق تہہ بر تہہ تاریکیاں موجود ہیں اور صرف سطح آب پر چلنے والی چیزوں پر نگاہ رکھنا اور گہرائیوں میں اتر کر حقائق کا سامنا کرنے سے گریز کرنا بھی منجملہ ان بیماریوں کے ہے جو ہمیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ اس لیے کہ یہ درحقیقت قومی سطح پر گریز اور فراریت کا وہ مرض ہے جس نے پوری قوم کا مزاج اس طرز پر ڈھال دیا ہے کہ ہر ناکامی اور ہر خرابی کی ساری ذمہ داری کسی ایک یا چند افراد یا کسی ایسے گروہ یا طبقے کے سر تھوپ کر پوری قوم اپنی جگہ مطمئن ہو جائے اور بڑی سے بڑی ناکامی پر بھی نہ اس کا اجتماعی شعور بیدار ہو، نہ اسے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس و ادراک ہو سکے اور نہ ہی اس کے قومی ضمیر میں کوئی خلش یا چبھن پیدا ہو۔ اس صورتِ حال کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر دانشوروں اور خصوصاً صحافیوں پر عائد ہوتی ہے کہ ان کا دماغ اور قلم اکثر و بیشتر قوم کے اجتماعی شعور کو تھپک تھپک کر اور لوریاں دے دے کر سلانے ہی کا کام کرتا ہے۔ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اس طبقے کے فہم و ادراک کے قصور کا نتیجہ ہے یا مصلحت بینی اور عافیت کوشی کا ثمرہ۔ اس لیے کہ اس دور میں اصل "سلطانِ جائر" عوام ہیں اور ان کے سامنے "کلمۂ حق" کہنا ——— "لانا ہے جوئے شیر کا!"

ہمارے نزدیک ہماری ذلت آمیز شکست کے متذکرہ بالا فوری اور سطحی سبب کے نیچے کے تہ در تہ اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ نہ صرف اس جنگ بلکہ اس پورے قضیے میں ہمارا سرے سے کوئی اخلاقی موقف ہی موجود نہیں تھا، بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے انعقاد کے بعد سے جو کچھ ہوا وہ سب بڑی دھاندلی اور صریح بددیانتی پر مبنی تھا۔ نتیجتاً چاہے ہم خود اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے میں کتنے ہی کامیاب ہو گئے ہوں بہرحال پوری دنیا کے سامنے ہم بالکل ننگے (exposed) ہو گئے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دنیا میں جس کسی نے بھی ہمارے ملٹری ایکشن کی کسی درجے میں مدافعت کی اسے کس قدر بوجھ اپنے ضمیر پر ڈالنا پڑا ہو گا۔ خود ہم اپنے موقف کی مدافعت میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکے وہ یہ تھی کہ اس حمام میں صرف ہم ہی ننگے نہیں ہیں بلکہ بقول "ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند!" بھارت نے بھی تو کشمیر میں یہی کیا تھا اور خود روس بھی تو اپنے نئے حلیف ممالک میں یہی کچھ کر چکا ہے ——— !

اس معاملے کا افسوسناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس مسئلے میں بعض ایسے لوگوں نے بھی نہ صرف یہ کہ حکومتِ وقت کی تائید کی اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے بلکہ عملاً امداد اور تعاون کی روش اختیار کی اور ایک بددیانت اور شرابی و زانی ٹولے کا آلۂ کار بننا قبول کر لیا جو اس ملک کے سیاسی میدان میں حق و صداقت

کے سب سے بڑے علمبردار رہے ہیں اور جن کا سارا سیاسی کاروبار دین و مذہب کے نام پر چل رہا ہے۔ ہمارا دل اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اگر یہ "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!" کے مصداق اسی واقعے کو ہماری پوری قوم کی اخلاقی حِس کو ماپنے کے لیے پیمانہ بنا لیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا! —— ظلم اور دھاندلی کے خلاف بولنے کی جرأت اور ہمت نہ ہو تو کم سے کم خاموش تو رہا جا سکتا ہے۔ یہ کتنی بڑی ابن الوقتی اور جواری پن ہے کہ انسان اپنے مفادات پر نگاہ رکھتے ہوئے اور ذاتی مواقع کے پیش نظر کسی ظالم کے ظلم میں اس کا ساتھی اور مددگار بن جائے۔ ہماری قوم کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس دھاندلی کے آغاز میں تو مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کا لیڈر اس کا آلۂ کار بن گیا اور دوسرے مرحلے (PHASE) میں جب اس لیڈر کو ہوش آ گیا اور اس نے دبی زبان سے ہی سہی ظلم کے خلاف کسی قدر بولنا شروع کیا تو اس ملک میں مذہبی سیاست کی سب سے بڑی علمبردار جماعت کو اس ظلم اور زیادتی کا آلۂ کار بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔

شکست کے اسباب و عوامل میں سے دوسرا گہرا سبب یہ ہے کہ ہم تاحال سیاسی اعتبار سے ایک 'نابالغ' قوم ثابت ہوئے ہیں اور ہمارے یہاں جو ذمہ داریاں کسی قومی قیادت کو سنبھالنی چاہئیں تھیں ان کا بوجھ بھی فوج کو اٹھانا پڑا ہے۔ جدید دور کی 'ریاست' (State) ایک بڑا عظیم اور ہمہ گیر ادارہ ہے اور اس میں مختلف ذمہ داریاں مختلف طبقوں کو اٹھانی پڑتی ہیں اور "ہر کسے را بہر کارے ساختند!" کے مصداق ہر طبقے کو اپنی مخصوص ذمہ داریوں کے لیے مناسب تربیت (Training) دی جاتی ہے اور جس طرح ملک کے دفاع اور اس کی سرحدوں کا تحفظ نہ عوام کے بس کا ہے نہ سول انتظامیہ کے، اسی طرح اہلِ سیاست کے حصے کا بوجھ نہ فوج اٹھا سکتی ہے نہ سول انتظامیہ۔ اور کسی قومی تنظیم اور قومی قیادت کے خلا کو کوئی دوسرا ادارہ پُر نہیں کر سکتا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری حالیہ شکست قومی اور اجتماعی سطح پر ہماری مسلسل ناکامیوں —— (FAILURES) اور درجہ بدرجہ پسپائی کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے۔ اور بظاہر تو یہ نتیجہ ہے صرف ہماری فوج بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی بھی صرف سابق عیاش اور بدکردار قیادت کے بودے پن کا لیکن درحقیقت یہ منطقی انتہا ہے ہمارے سیاسی دیوالیہ پن کی اور مظہر اتم ہے پوری پاکستانی قوم کی نااہلیت اور ناقابلیت اور اجتماعی دیوالیہ پن کا!

جیسا کہ ہم نے جنوری ۱۹۷۲ء کے محولہ بالا 'تذکرہ و تبصرہ' میں بھی عرض کیا تھا، پاکستان کی ربع صدی کی مختصر تاریخ کے ابتدائی گیارہ سالوں کے دوران یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کے عرصے میں پاکستان کے سیاستدانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا [illegible] ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت

کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن اس نے بہت جلد ایک ایسی فوج کے زیر سرپرستی خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا چنانچہ دوسرا گیارہ سالہ دور جو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک جاری رہا درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساس فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کما حقہ ادا کرنے کے لیے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نا اہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا۔ اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا تھا یعنی فوج چنانچہ اب کی بار ایک خالص "جرنیلی حکومت" قائم ہوئی اور فوج نے ملک کے پورے نظم و نسق کو سنبھالا۔ ہم نے اسی وقت عرض کیا تھا:

> "اس ادارے کا اصل وظیفہ دفاع وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر 'مستقبل' میں دفاع وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاع وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔"

اب اگر یہ ادارہ ان دو طرفہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں ناکام ہوا تو اس کا الزام جتنا اس کے سر آتا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ پوری قوم پر آتا ہے کہ اس نے اس پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ ڈالا ہی کیوں۔ لہٰذا صدر یحییٰ خان اور ان کے رفقائے کار کی نا اہلیت کے پردے میں درحقیقت پوری قوم کی ناقابلیت کا ظہور ہوا ہے اور ان کی ناکامی اصلاً پوری قوم کی ناکامی ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ ارباب سیاست اور بیوروکریسی کی نا اہلیوں اور ناکامیوں کے نتائج صرف اندرون ملک بدانتظامی اور بے چینی و خلفشار تک محدود رہتے تھے اور فوج کی ناکامی نے ہماری ناکامیوں اور نا اہلیوں کا بھانڈا بین الاقوامی چوراہے میں پھوڑ کر رکھ دیا اور ہم اپنے قدیم دشمن کے ہاتھوں

(۵)

موجودہ مارشل لاء کی طوالت

اور پیچھے پاکستان کے مستقبل کے لیے خطرات

○○○○

ڈاکٹر اسرار احمد

کا خط بنام ــــ صدر پاکستان

جنرل محمد ضیاء الحق بالقابہٖ

(تحریر: ۲۷ ؍دسمبر ۱۹۸۲ء)

شائع شدہ میثاق ستمبر ۸۳ء

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر و صدر پاکستان

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

مزاج گرامی ۔ مندرجہ ذیل گذارشات پیش خدمت ہیں:۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ میں معروف اور مروّجہ معنی میں ہرگز سیاسی آدمی نہیں ہوں اور میرے بیشتر اوقات اور تمام تر مساعی مستقبل کے اسلامی انقلاب کے لئے میدان ہموار کرنے کی غرض سے دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کے لئے وقف ہیں۔ (چنانچہ یہی میرے وفاقی کونسل یا مجلسِ شوریٰ سے استعفے کا اہم ترین سبب تھا۔!)

ساتھ ہی مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ یہ حقیقت بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتی کہ کوئی باشعور مسلمان خالص غیر سیاسی نہیں ہو سکتا۔ بایں معنیٰ کہ وہ ملک و ملت کے حالات سے قطعاً بے خبر یا لاتعلق رہے اور قوم و وطن کی صلاح و فلاح یا اُن کو درپیش خطرات و خدشات کے بارے میں سوچ بچار اور غور و فکر سے بھی کام نہ لے۔

چنانچہ میں بھی اس ضمن میں اپنی امکانی حد تک حالات کا مشاہدہ بھی کھلی آنکھوں سے کرتا ہوں اور دوسروں سے تبادلۂ خیال بھی کھلے قلب و ذہن کے ساتھ کرتا ہوں (اور اس سلسلے میں مجھے اپنے اُن دوروں اور سفروں سے بھی مدد ملتی ہے جو مجھے اپنی دعوتی و تبلیغی مساعی کے ضمن میں اندرونِ ملک یا بیرونِ وطن کرنے پڑتے ہیں) ۔۔۔ اور پھر خود غور و فکر بھی کرتا ہوں اور اس کے نتیجے میں جو رائے بھی میری بنے، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے مطابق مشورہ پورے نصح و خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ عوام کو بھی دوں اور ان کو بھی جن کے ہاتھوں میں ملک و قوم کی زمام کار ہے۔ از روئے فرمانِ نبویؐ: "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" یعنی "دین تو نام ہی نصح و اخلاص اور خیر خواہی و وفاداری کا ہے" اور جب پوچھا گیا "لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟" یعنی "حضورؐ! کس کے ساتھ؟" تو ارشاد ہوا: لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ

بِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ "۔ یعنی " اللہ اور اس کی کتاب
ور اس کے رسول کے ساتھ اخلاص و وفاداری اور مسلمانوں کے اُولوا الامر اور عوام
دونوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی !"

یہی وجہ ہے کہ آج سے سوا دو سال قبل اغلباً ۸ اراگست ۸۰ء کو اسلام آباد میں
لما کنونشن سے قبل منعقدہ مشاورتی اجلاس کے موقع پر جب میں نے آپ سے چند
ٹ علیحدگی میں گفتگو کی تھی، تب بھی بعض مشورے آپ کے گوش گذار کئے تھے جن کا
لق اکثر و بیشتر ملک کی سیاسی صورتِ حال سے تھا اور پھر جب اوائل مئی ۸۲ء
ں لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں، میں شوریٰ سے اپنا استعفیٰ پیش کرنے حاضر
اتھا۔ تب بھی میں نے بعض مشورے دیئے تھے جن کا تعلق اس ملک میں اسلامی
ظام کے قیام و نفاذ سے تھا — اور اللہ گواہ ہے — اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا دل
ی گواہی دے گا کہ ان دونوں مواقع پر میرا محرک مندرجہ بالا حدیث نبویؐ کے مطابق
ح و خیر خواہی کے جذبے کے سوا اور قطعاً کچھ نہ تھا! — اور خالصتاً اسی جذبے
ے تحت آج پھر میں اس عریضے کے ذریعے حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں، اس دعا
ے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے حق کہنے اور آپ کو حق سننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق
رانی فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ
بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ، آمِیْن یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

جہاں تک اس ملک میں اسلامی شعائر کی ترویج اور شریعتِ اسلامی کے
اذ — یا بالفاظ دیگر اسلامی نظام کے قیام کا تعلق ہے اس کے بارے میں مجھے
ں وقت کچھ عرض نہیں کرنا — جس کا اصل سبب، میں معذرت کے ساتھ عرض
رتا ہوں، یہ ہے کہ اس معاملے میں میں آپ سے قطعاً مایوس ہو چکا ہوں —
ر عرض و معروض یا گلہ شکوہ وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی توقع موجود ہو!
مجھے خوب معلوم ہے کہ اِس ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی ہر اعتبار سے نہایت
ڑے ہوئے معاشرے میں اسلام کا قیام و نفاذ کوئی آسان کام نہیں اور اس کیلئے

یقین محکم پر مبنی جرأتِ مومنانہ اور علم راسخ پر مبنی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ کو تقدیر الٰہی نے جو ایک موقع عطا فرمایا تھا کہ آپ کے "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا" کے مصداق اگر دینِ حق کے قیام و نفاذ کے لئے بھرپور کوشش اور پورے جرأت مندانہ اقدام کے باوجود خدانخواستہ ناکام رہتے تو کم از کم ایک ایسی مثال تو تاریخ میں چھوڑ جاتے کہ اگر ایک غیر مسلم (پرنس آف ویلز بعدہٗ ڈیوک آف ونڈسر) ایک عورت کی خاطر وقت کی عظیم ترین سلطنت کے تخت سے دست بردار ہو سکتا ہے تو ایک مسلمان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی اسلام کی خاطر حکومت و اقتدار کو قربان کر سکتا ہے ۔ مجھے شدید افسوس ہے کہ آپ اس موقع کا حق ادا نہ کر سکے ۔

اس ضمن میں، جیسا کہ میں نے ۲۰ اگست ۸۰ء کو علماء کنونشن میں اپنی تقریر میں عرض کیا تھا، ابتدائی تین سال، جو اس اعتبار سے نہایت قیمتی تھے کہ "تحریکِ نظامِ مصطفیٰ" کا جوش و خروش برقرار تھا اور ملکی فضا میں وہ کیفیت قائم تھی کہ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے ضمن میں بڑے سے بڑا اقدام بھی بلا روک ٹوک کیا جا سکتا تھا، تعطّل اور تربّص کے نذر کر دیئے گئے (اس طرح اُسی غلطی کا اعادہ ہو گیا جس کا ارتکاب پاکستان میں برسرِ اقتدار آنے والی اوّلین قیادت نے کیا تھا۔)

پھر جب حدود اور زکوٰۃ آرڈی نینس کا اجرا ہوا اور اس پر اہلِ تشیّع کی جانب سے جارحانہ ردِّ عمل ظاہر ہوا تو نہ صرف یہ کہ گھٹنے ٹیک دیئے گئے بلکہ ——— زیادہ قابلِ افسوس اور اہم تر بات یہ کہ نظامِ زکوٰۃ کے ضمن میں شیعہ اور سُنّی کے مابین تفریق کر کے ضعیف الایمان یا ناواقف سُنّیوں کے شیعہ بن جانے کا دروازہ کھول دیا گیا ——— اس کے باوجود کہ میں نے ۱۸ اگست ۸۰ء کے مشاورتی اجلاس میں خدا کا واسطہ دے کر عرض کیا تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ زکوٰۃ آرڈی نینس پورے کا پورا واپس لے لیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو حسبِ سابق عوام کا نجی معاملہ قرار دیدیں ۔ لیکن خدارا اس میں شیعہ اور سُنّی میں فرق و امتیاز نہ قائم فرمائیے گا۔

اجتماعیاتِ انسانیہ کے ذیل میں اوّلین معاملہ عائلی اور سماجی نظام کا ہے اور اس ضمن میں ایک طرف عائلی قوانین کو شریعت کورٹ کے دائرہ کار اور حدودِ اختیار میں لانے کی جرأت آپ اس لئے نہیں کر پائے ہے کہ بعض اعلیٰ طبقات کی بیگمات اور کچھ مغرب

زدہ خواتین کی جانب سے ناموافق ردِ عمل کا اندیشہ ہے — اور دوسری طرف معاشرے میں خواتین کے مقام و کردار اور ستر و حجاب یا خود آپ کے الفاظ میں "چادر اور چاردیواری" کے ضمن میں اسلام کے نقطۂ نظر کے بارے میں جو اختلافات گذشتہ دنوں ہمارے ملک میں زور شور سے ظاہر ہوئے، اس کے بارے میں اگرچہ زبانی تو آپ نے کچھ باتیں ایسی بھی کہیں جو دینی طبقات کے لئے اطمینان بخش تھیں، لیکن عملاً اپنا پورا وزن مغرب زدہ اور اباحیت پسند طبقے میں ڈال رکھا ہے (بالخصوص آپ کے حالیہ غیر ملکی دوروں کے دوران آپ کی اہلیہ صاحبہ محترمہ کا یہ طرزِ عمل کہ سر سے چادر بھی اتر گئی — اور نامحرموں سے مصافحہ بھی ہو گیا — از خود بھی فیصلہ کن تھا، لیکن اس پر مزید مہرِ تصدیق آپ کے اُن فرمودات سے ثبت ہو گئی جو آپ نے اغلباً ہوسٹن میں ارشاد فرمائے تھے۔)

بنا بریں پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے عظیم معرکے کے آپ کے ہاتھوں سر ہونے کی اب کم از کم مجھے کوئی امید باقی نہیں رہی — اور مجھے اس رائے تک پہنچنے میں کہ یہاں اسلام صرف انقلابی طریق کار ہی سے آ سکتا ہے، آپ کے اس جملے نے بھی مدد دی ہے جو رحیم یار خان میں بلدیاتی نمائندوں کے ایک اجلاس میں ایک برقع پوش خاتون کونسلر کے تابڑ توڑ سوالات کے جواب میں (کہ آپ نفاذِ اسلام کے لئے یہ کیوں نہیں کرتے؟ اور وہ کیوں نہیں کرتے؟) آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "بیٹی! اس ملک میں اسلام کسی انقلابی عمل کے نتیجے میں نہیں آ رہا کہ ہم اتنے بڑے بڑے قدم اٹھا سکیں!!" (یہ روایت ہے رحیم یار خاں کے معروف دینی اور سماجی کارکن ڈاکٹر محمد نذیر مسلم صاحب کی، جو اس خاتون کونسلر کے والد...

تاہم پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کے ضمن میں ایک مشورہ میں آ... کی خدمت میں ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں اور اصلاً اسی کے لئے یہ عریضہ تحریر کر... چونکہ مجھے اپنے ذاتی مشاہدات و معلومات اور حالات کے تجزیئے اور جائزے کے ... اندیشہ لاحق ہے کہ مستقبل کا مؤرخ کہیں یہ نہ لکھے کہ "۱۹۴۷ء میں پاکستا... کے نام سے مسلمانوں کی جو عظیم ترین مملکت وجود میں آئی تھی اُسے اوّلاً تو سا... میں دو لخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے نے اور پھر اس کے مزید ٹکڑے ...

(Balkanistan) کا عامہ نہ رونما ہوا ایک پابند صوم وصلوٰۃ اور

دین دار۔ پرہیزگار شخص کے ہاتھوں!!" معاذاللہ! ثم معاذاللہ!!!

آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۸ اگست ۸۰ء کو بالکل علیحدگی میں گفتگو کے دوران میں نے

آپ سے سوال کیا تھا کہ "ملک میں جو سیاسی خلا مارشل لاء کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے،

اُس کو دور کرنے کے لئے آپ کے ذہن میں نقشہ کیا ہے۔؟ میری رائے میں تو یہ سیاسی

خلا (Political vacuum) خودکشی (Suicide)

کے مترادف ہے!!" —— اس پر آپ نے گہرے تاثر کے انداز میں فرمایا تھا کہ "ڈاکٹر

صاحب! میں نے اپنا تو جائزہ لے لیا ہے کہ میرے اندر ہمت نہیں ہے (جس کے

معنی میں نے یہ لئے تھے کہ آپ صدر ایوب مرحوم کے طرزِ عمل کی جانب اشارہ کر رہے

ہیں) لیکن موجودہ سیاسی جماعتوں کو حکومت دے دینے کو بھی میں انتہائی (Suicidal)

سمجھتا ہوں اور تیسری کوئی شکل موجود نہیں ہے!" —— جس پر میں نے عرض کیا تھا کہ

"نہیں جناب! تیسری صورت موجود ہے اور وہ یہ کہ آپ No party basis

اور (Shortest possible notice) پر الیکشن کرادیں!!" —— تو

آپ نے فرمایا تھا کہ "ہاں اس پر ہم غور کر رہے ہیں کہ SHORT NOTICE

اور (No party basis) نیز ایک .L.F.O کے ساتھ الیکشن کرا

دیں!" —— آخر میں میں نے عرض کیا تھا کہ "یہ بالکل درست خیال ہے لیکن آپ

آخر کب تک سوچتے رہیں گے؟ جلدی کیجئے'! "Time is running ou

for you" —— آج اس گفتگو کو سوا دو سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا

لیکن افسوس ہے کہ وہ سیاسی خلا جوں کا توں موجود ہے اور آپ کی جانب سے اس

کے دور کرنے کے لئے تاحال کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اس ضمن میں اغلباً آپ کے اطمینان کا باعث یہ امر ہے کہ آپ کے خلاف کوئی

عوامی تحریک نہ تاحال چل سکی ہے، نہ ہی اس کا کوئی فوری اندیشہ موجود ہے ——

اس سلسلے میں میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ خدارا اس صورت حال

سے دھوکہ نہ کھائیے۔ اس لئے کہ اس کا اصل سبب بین الاقوامی حالات ہیں

جن کے باعث پاکستان کے محبِ وطن بالخصوص دینی و مذہبی مزاج کے لوگ کوئی

Risk لینے کو تیار نہیں ہیں — لیکن ایک تو کون نہیں جانتا کہ بین الاقوامی
الات میں کوئی تبدیلی کسی بھی وقت رُونما ہو سکتی ہے اور دوسرے کسی ملک کے
قا واستحکام کے لیے یقیناً بین الاقوامی صورتِ حال بھی کسی قدر اہم ہوتی ہے لیکن
ل اہمیت اس ملک کے اپنے عوام کا اطمینان ہوتا ہے -

اس سلسلے میں بالخصوص اندرونِ صُوبہ سندھ جو لاوا پک رہا ہے، مجھے یقین ہے
کہ اس کا علم آپ کو بھی لازماً ہو گا - لیکن میں اس امکان کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا
کہ بعض اوقات صاحبِ اقتدار لوگوں کے اردگرد جن لوگوں کا حصار قائم ہو جاتا ہے
وہ اُسے صحیح صورتِ حال سے مطلع نہیں ہونے دیتے - واللہ اعلم!

میرے اندازے میں سندھ میں "سندھو دیش" کے لیے میدان پوری طرح
اُسی طرح ہموار ہو چکا ہے جیسے مشرقی پاکستان میں "بنگلہ دیش" کے لیے ہوا تھا اور
اب فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور کٹا ہوا تھا، اس لیے
مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کر سکی اور سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے - لہٰذا
یہاں ایسی کسی بھی تحریک کو بآسانی کچلا جا سکتا ہے، لیکن میرے نزدیک اس عامل
(Factor) پر بہت زیادہ انحصار بھی سخت ناعاقبت اندیشی ہے -

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ہمارے سیاسی مبصروں اور تجزیہ نگاروں نے
مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اس سبب کو
بیان کیا تھا کہ پاکستان میں (ایوب خان مرحوم کے) مارشل لا کے نفاذ نے وہاں کے
لوگوں میں سیاسی محرومی کا احساس پیدا کر دیا تھا اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھ میں سب سے
بڑی دلیل یہ آ گئی تھی کہ فوج چونکہ ساری مغربی پاکستان کی ہے لہٰذا فوج کی حکومت
کے معنی یہ ہیں کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان پر حکومت کر رہا ہے — آج بعینہٖ یہی
دلیل سندھ کے علیحدگی پسند لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ فوج کا اکثر و بیشتر حصہ پنجاب سے ہے
اور کچھ تھوڑا سا سرحد سے - لہٰذا مارشل لا کے پردے میں اصلاً "پنجاب" ہم پر حکومت
کر رہا ہے — اور ہر گزرنے والا دن اس دلیل کو قوی سے قوی تر کر رہا ہے —!

بنا بریں میں عرض کرتا ہوں کہ خدارا اس تعطّل کو جلد از جلد رفع کرنے کی جانب واضح پیش قدمی فرمائیے
السا نہ ہو کہ یہ آتش فشاں پھٹ پڑے اور پھر ملک و ملت کے کسی بھی بہی خواہ کے کیے کچھ نہ ہو سکے —!!

مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایک جانب ہم اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس میں اکثر سیاسی جماعتوں کے مبیّنہ موقف کے مطابق ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت انتقالِ اقتدار کے لئے فوری انتخاب میں بہت سی پیچیدگیاں مضمر ہیں — دوسری جانب ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں آپکے ذہن میں جو مختلف تجویزیں ہیں وہ بھی ملک و ملت کی خیر خواہی کے جذبے پر مبنی ہیں — اور تیسری جانب مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے بھی جو اختلافِ رائے اِن موضوعات پر سامنے آ رہا ہے کہ انتخابات جداگانہ ہوں یا مخلوط؟ — اور حسب سابق ہوں یا متناسب نمائندگی کے اصول پر — ؟ وغیرہ وغیرہ — وہ بھی یقیناً خلوص و اخلاص ہی پر مبنی ہیں — لیکن میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ ان معاملات میں آخری فیصلہ کرنے کا مجاز کون ہے کیا صرف آپ اور آپکے "رفقاءِ کار" یعنی مارشل لاء انتظامیہ ؟ یا زیادہ سے زیادہ وہ سیاسی جماعتیں جو کسی درجے میں آپ کی منظورِ نظر ہیں یا کم از کم آپ کے لئے قابلِ قبول ہیں — ؟ ؟ یا کوئی اور — ؟ ؟ ؟

میں اس مسئلہ پر کم و بیش چھ ماہ سے مسلسل غور کرتا آ رہا ہوں — اور ایک رائے جس پر میرا دل ٹھک گیا ہے، تجویز کی صورت میں خالصۃً ملک و ملت اور خود آپکی خیر خواہی کے جذبے کے تحت آپکے سامنے رکھ رہا ہوں وہ تجویز یہ ہے کہ :-

(۱) ملک میں ایک انتخاب فوراً ہو — یعنی فروری یا مارچ ۱۹۸۳ء میں — لیکن یہ انتخاب انتقالِ اقتدار یا تشکیلِ حکومت کے لئے نہ ہو بلکہ ایک منتخب 'مجلسِ شوریٰ' یا 'مجلسِ ملی' کے لئے ہو — اس میں حق رائے دہی کی اہلیت اور حلقہ جات کی تشکیل تو بالکل وُہی ہو جس پر فروری ۷۷ء میں انتخابات ہوئے تھے - لیکن ہو یہ خالص غیر جماعتی بنیاد (No party basis) پر —

(۲) اس طرح جو مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملی وجود میں آئے ، اس کے سامنے ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں جو تجاویز آپکے سامنے ہیں، وہ آپ رکھیں اور طرزِ انتخاب وغیرہ کے ضمن میں جو باتیں دوسرے لوگوں کے سامنے ہیں، انہیں وہ رکھیں — اور ان تمام امور پر یہ مجلس ایک سال کے عرصے کے اندر اندر فیصلہ دے، جو نہ صرف یہ کہ دو تہائی اکثریت پر مبنی ہو بلکہ ہر صوبے سے منتخب

ندہ لوگوں کی بھی کم ازکم نصف تعداد لازماً اس میں شامل ہو — !
اگر یہ مجلس اس مشکل مرحلے کو کامیابی سے سر کر لے اور مطلوبہ اکثریت کے ساتھ نظام تجویز کر دے تو مارشل لاء انتظامیہ تین سے چھ ماہ کے عرصے کے اندر اندر اس کے مطابق انتقالِ اقتدار اور تشکیلِ حکومت کے لئے الیکشن کرا دینے کی پابند ہو — اور اگر وہ مجلس ایک سال کے اندر اندر تفویض کردہ ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو وہ از خود تحلیل (Dissolve) ہو جائے اور پھر تین سے چھ ماہ کے عرصے میں اسی 'مجلسِ شوریٰ' یا 'مجلسِ ملّی' کا انتخاب دوبارہ ہو اور جب تک مطلوبہ اتفاقِ رائے (Consensus) حاصل نہ ہو، یہ سلسلہ جاری رہے — اور اس دوران میں فوج کے لئے نہ صرف اخلاقاً جائز بلکہ ملک و قوم کی حفاظت و سالمیت کے اعتبار سے لازم سمجھا جائے کہ وہ Care Taker کی حیثیت سے کاروبارِ حکومت چلاتی رہے — !

اس تجویز کے محاسن یا روشن پہلوؤں پر گفتگو کو میں اس لئے تحصیل حاصل سمجھتا ہوں کہ وہ اظہر من الشمس ہیں — البتہ اس کے خلاف اس واحد دلیل کا جائزہ لینا لازمی ہے جو بادی النظر میں بہت قوی معلوم ہوتی ہے یعنی کہ کہیں مجوزہ مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملّی ایک بھرپور "دستوریہ" (Full fledged Constituent Assembly) کا کردار اختیار نہ کر لے اور دستورِ ملکی کے خطرناک صندوقچے (Pandora's Box) کو کھول کر اُن نازک اور پیچیدہ مسائل کو از سرِ نو نزاعی نہ بنا دے جو ۷۳ء کے دستور میں طے شدہ ہیں۔

میرے نزدیک یہ دلیل بہت کمزور اور بودی ہے، اس لئے کہ مسائل کا حل ان سے اعراض اور صرفِ نظر سے نہیں بلکہ مقابلے اور مواجہے (یعنی Face کرنے) ہی سے ممکن ہوتا ہے — پاکستان کا قیام محض ایک وقتی حادثہ نہ تھا بلکہ ہندوؤں [illegible] بیدار قوم اور وقت کی حکمران طاقت (برٹش گورنمنٹ) کی متفقہ خواہشات

کے علی الرغم پاکستان صرف اس لئے قائم ہوا کہ ایک طرف مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں کے انتقامی طرزِ عمل کے اندیشے کا منفی محرک موجود تھا تو دوسری طرف احیائے اسلام کا مثبت جذبہ بھی موجود تھا جسے قائدِ اعظم مرحوم کے مسلسل اعلانات نے ایک نہایت قوی امید کی صورت دے دی تھی ـــ اور تیسری طرف ارادہ الٰہی اور مشیتِ ایزدی بھی شاملِ حال تھی جو اصل فیصلہ کن عامل (Factor) ہے ـــ اور یہ تینوں عوامل اب بھی پوری قوت و شدت کے ساتھ موجود ہیں ـــ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے (یعنی Mobilise کیا جائے!) اور یہ کام ان شاءاللہ اس مجوزہ مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملّی اور اس کیلئے منعقد ہونے والے انتخابات کے ذریعہ ہو جائیگا ـ اسلئے کہ چونکہ یہ انتخابات نہ تشکیل حکومت کے لئے ہوں گے اور نہ ہی جماعتی بنیاد (Party Basis) پر ہوں گے لہٰذا اس میں سیاسی حلقوں اور جماعتوں کی صف بندی (Polarisation) خالصتہً اس اساس پر ہو گی کہ کون محبِّ دین اور محبِّ وطن ہے ـــ اور کون لا دینیت، الحاد، مادہ پرستی، اباحیت اور علاقائی و لسانی قومیتوں کا عاشق اور پرستار ـــ !! ـــ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تقسیم اس واضح اساس پر ہو تو ان شاء اللہ فیصلہ کن فتح محبِّ اسلام اور محبِّ پاکستان قوتوں کو حاصل ہو گی ـ جیسے کہ اکثر مبصرین اور تجزیہ نگار حضرات نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کہا تھا کہ وہاں اگر لوگوں کے سامنے اصل مسئلہ یہ رکھا جاتا کہ 'پاکستان' کے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اس سے علیحدہ ہونا ؟ ـــ تو وہاں کے عوام کی غالب اکثریت لامحالہ 'متحدہ پاکستان' کے حق میں رائے دیتی!) مجھے اس تجزیہ سے کامل اتفاق ہے ـــ اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ میری تجویز پر عمل درآمد کے نتیجے میں ان شاءاللہ العزیز 'تحریک پاکستان' کے از سرِ نو احیاء کا وہ مقصد بہ حسن و خوبی حاصل ہو جائے گا جس کے لئے آپ ہر سال 'یوم پاکستان' ـــ 'یوم اقبال' ـــ اور 'عید میلاد النبیؐ' منانے کے ضمن میں کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں ـ (جو معاف فرمایئے، اکثر و بیشتر ضیاعِ محض ہے ـــ!)

میں اپنی اس تجویز اور اس کی افادیت پر بحمداللہ عقلی اور نظری اعتبار سے پوری طرح مطمئن ہوں ـ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا ایک وجدانی احساس

ہے، جسے میں آپ پر ظاہر کر دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا — اور وہ یہ
قرآن حکیم میں سورۃ مائدہ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ مصر کے
ل دورِ غلامی کے نتیجے میں ان میں سیرت و کردار کا جو زوال و اضمحلال پیدا ہو گیا تھا،
چالیس برس کی صحرا نوردی کے بعد رفع ہو سکا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے
کہ ہمیں بھی آزادی کے بعد بے یقینی اور بے مقصدیت کے صحرائے تیہ میں بھٹکتے
ہوئے چالیس برس کے لگ بھگ ہونے کو آئے ہیں تو کیا عجب کہ اب اس بھٹکے
ہوئے راہی کو منزل کا سراغ مل ہی جائے — !! اور مملکتِ خداداد پاکستان عالمی
سطح پر احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کے انقلاب آفریں عمل کے ضمن میں اپنے مثبت
کردار کو ادا کرنے کے لئے کمربستہ اور سرگرم عمل ہو ہی جائے — !!! وَمَا
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۔

بصورتِ دیگر مجھے شدید اندیشہ ہے کہ ہمارا ملک تدریجاً جس محاذ آرائی کی جانب
بڑھ رہا ہے اس کے دھماکہ خیز صورت اختیار کرنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی
اور آپنے تاحال امریکہ اور روس کے مابین جو نازک توازن برقرار رکھا تھا، اس
میں آپکے حالیہ دورۂ امریکہ کے بعد جو تبدیلی آئی ہے اُسکی بنا پر روس اور بھارت
دونوں ایسی کسی بھی صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ہر ممکن کوشش کریں
گے — اور اس کا نتیجہ ملک و ملت کے حق میں کسی طرح بھی خوش آئند نہ ہوگا۔

فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

۲۷ دسمبر ۸۲ء

مطابق ۱۰ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ

وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

میثاق

لاہور

مدیر

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳۴

شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۸۵ء

مطابق

ربیع الاول ۱۴۰۶ھ

زرسالانہ ۳۰ روپے

فی شمارہ ۳/ روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

عرضِ احوال

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم!

بفضلہ تعالیٰ و عونہٖ "میثاق" بابت دسمبر ۸۵ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۶ھ پیشِ خدمت ہے۔ اس شمارہ سے تحریکِ تجدیدِ ایمان، توبہ، تجدیدِ عہد یعنی تنظیم اسلامی کے اس نقیب اور دعوت رجوع الی القرآن کے اس ترجمان کی چونتیسویں جلد اختتام پذیر ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ العزیز جنوری ۱۹۸۶ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ سے "میثاق" کی پینتیسویں جلد کا آغاز ہوگا۔

گزشتہ شمارے میں تذکرہ کیا گیا تھا کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ امیرِ تنظیم اسلامی عمرہ اور طائف میں چند روز بغرضِ آرام تشریف لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ موصوف ۱۱ر اکتوبر کو Visit-Viza پر سعودی عرب تشریف لے گئے جہاں سے ۱۳ر اکتوبر کو مراجعت ہوئی۔ امیر محترم کا یہ بھی ارادہ تھا کہ عمرہ کی سعادت سے شادکام ہونے کے بعد اپنے طائف کے قیام کے دوران موصوف اپنی ان مفصل و طویل تقاریر کی روشنی میں جو انہوں نے "استحکامِ پاکستان" کے موضوع پر اگست، ستمبر و اکتوبر ۸۵ء میں مختلف اسالیب اور زاویوں سے اسلام آباد کمیونٹی سنٹر، "شام الہدیٰ" لاہور اور "شام الہدیٰ" کراچی کی ماہانہ مجالس میں ارشاد فرمائی تھیں ایک بسوط و مدلل کتاب بھی تحریر فرمائیں گے۔

لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ امیر محترم کا طائف میں قیام تین دن سے زیادہ نہ رہ سکا چونکہ سعودی عرب میں دعوت رجوع الی القرآن کے داعی اور تنظیم اسلامی کے امیر کی تشریف آوری کی خبر ایسی نہیں تھی جو پوشیدہ رہ سکتی۔ چنانچہ تحریک و دعوت کے رفقاء، متفقین و متوسلین نے جو وہاں مختلف شہروں میں مقیم ہیں، اپنے اپنے شہروں میں امیر محترم کے دروس و خطابات کے پروگرام بنا رکھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب دعوت و تبلیغ کے ان مواقع کو جو خاص طور پر فضل و مشیتِ الٰہی سے مہیا ہو رہے تھے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا امیر محترم نے دعوت و تبلیغ کی خاطر اپنے آرام کو تج دیا اور جدہ، مکہ مکرمہ، طائف، ریاض، الخبر، دھران اور مدینہ منورہ میں محدود نشستوں اور بڑے اجتماعات میں دروس و خطابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ دھران میں تو ۳۰ر اکتوبر کا پورا دن نہ صرف مختلف دینی مصروفیتوں میں گزرا بلکہ ایسی صورت درپیش آئی کہ بعد عشاء قریباً ڈھائی گھنٹہ کا خطاب ارشاد فرمایا اور اس سے فارغ ہو کر جلد از جلد تیاری کر کے ائیرپورٹ پہنچے چونکہ اسی روز ایک بجے شب کی فلائٹ سے روانہ ہو کر ۳۱ر اکتوبر کی صبح کو

لاہور پہنچا تھا۔

البتہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے طائف کے دو تین دن کے قیام کے دوران اور فرصت کے ان اوقات میں جو مختلف مقامات پر امیر محترم کو میسر آئے انہوں نے "استحکام پاکستان" کی تقاریر کی روشنی میں اس موضوع پر پیش نظر کتاب کا مکمل مقدمہ تحریر فرما لیا۔ مزید یہ کہ اس کا ایک بڑا حصہ بھی ضبط تحریر میں آگیا۔ توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز کتاب کا بقیہ حصہ بھی جنوری ۸۶ء کے اوائل تک رقم ہو جائے گا۔ اور کتاب مکمل ہو جائے گی۔

"استحکام پاکستان کے موضوع پر" امیر محترم کی اس مبسوط و مدلل تحریر کے متعلق کوشش ہو رہی ہے کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کرنے سے قبل ملک کے کثیر الاشاعت اور بین الاقوامی سطح پر مشہور و معروف ایک روزنامہ میں بالاقساط شائع کرانے کا انتظام کیا جائے۔ الحمد للہ اس کوشش کے مشکور ہونے کی صورت پیدا ہو چلی ہے۔ آگے جو اللہ کو منظور ہو۔ وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّآ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہ

"میثاق" کے جنوری ۸۶ء کے شمارے سے اللہ نے چاہا تو اس تحریر کا قسط وار اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ان شماروں کو جن میں یہ تحریر بالاقساط شائع ہوگی، معمول سے زیادہ طبع کرایا جائے گا تاکہ اس کو ملک کے نامور علماء کرام، سیاست دان اور حلقۂ دانشوران تک پہنچایا جاسکے۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ ابھی سے مصمم ارادہ کر لیں کہ وہ اپنے حلقۂ تعارف میں اہل فکر و نظر تک ان شماروں کو پہنچانے کی سعی بلیغ کر کے تعاون علی البر فرمائیں گے۔ خاص طور پر تنظیم اسلامی کے رفقاء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان شماروں کو مذکورہ بالا حلقوں میں زیادہ سے زیادہ پہنچانے کی کوشش کریں۔

علاقائی اجتماعات کے ضمن میں الحمد للہ تنظیم اسلامی کا چوتھا دعوتی و تربیتی اجتماع ۸ نومبر ۸۵ء سے ۱۰ نومبر ۸۵ء تک حیدر آباد میں جو صوبہ سندھ کا دوسرا اور پورے پاکستان کا چوتھا بڑا شہر ہے منعقد ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت سے موانع کے باوجود یہ اجتماع کافی کامیاب رہا۔ تربیتی پروگرام کے علاوہ اس موقع پر امیر محترم کے دو مقامات پر خطابات عام ہوئے۔ دونوں اجتماعات حاضری کے اعتبار سے کسی عظیم سیاسی جلسۂ عام کی کیفیات کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ لیکن متانت اور سنجیدگی کے لحاظ سے یہ جلسے نہایت پرسکون اور وقار دینی اجتماع کے جملہ محاسن کے حامل تھے۔ کیا مجال کہ ان اجتماعات میں کوئی نعرہ بازی یا افراتفری ہوئی ہو۔ امیر محترم نے ان اجتماع کے لئے موضوع "اسلامی انقلاب کیا، کیوں اور کیسے؟" مقرر فرمایا تھا۔ پہلے اجتماع میں "کیا اور کیوں؟" پر قریباً تین گھنٹے تقریر جاری رہی اور دوسرے اجتماع میں قریباً ڈھائی گھنٹے کے خطاب میں "کیسے؟"

کی وضاحت ہوئی یعنی پاکستان میں اسلامی انقلاب کے منہاج کو مفصل و مدلل طور پر بیان کیا گیا۔
ان شاء اللہ العزیز پانچویں علاقائی دعوتی و تربیتی اجتماع کا انعقاد فروری ۸۶ء کے آخری عشرہ میں ملتان میں ہوگا۔ مقام اور تاریخوں کا اعلان جنوری ۸۶ء کے 'میثاق' میں کر دیا جائے گا۔

امیرِ محترم ۲۰ نومبر ۸۵ء کو عزیزم حافظ عاکف سعید سلمہ کے ہمراہ بارہ روزہ دعوتی دورے پر بھارت تشریف لے گئے ہیں جہاں سے توقع ہے کہ ان شاء اللہ ۳ دسمبر ۸۵ء کو مراجعت ہوگی۔ بھارت میں امیرِ محترم کا زیادہ تر قیام حیدر آباد دکن میں رہے گا اور وہیں موصوف سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مختلف مقامات پر خطابات ارشاد فرمائیں گے۔ موصوف کا دہلی اور لکھنؤ میں بھی ایک دو دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ بھارت سے مراجعت کے بعد امیرِ محترم ۹ دسمبر کی شام کو کراچی سے ان شاء اللہ ابوظہبی تشریف لے جائیں گے۔ جہاں سے ۲۰ دسمبر کو کراچی مراجعت ہوگی اور توقع ہے کہ کراچی میں ۲۵ دسمبر تک قیام رہے گا۔ جہاں ۲۲ دسمبر کو شام الہدیٰ کی ماہانہ نشست کے علاوہ امید ہے کہ دو تین دروس یا خطابات کے پروگرام بھی ہوں گے — ہو سکتا ہے کہ ایک سہ روزہ تربیتی پروگرام بھی مرتب ہو جائے۔

یہ امر نہایت دلی صدمہ کا باعث ہے کہ مارچ ۸۵ء کے بعد سے ملک کے بعض دینی جریدوں نے تنظیم اسلامی کی دعوت، بالخصوص امیرِ محترم کی شخصیت کو مجروح کرنے کا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے تعمیری تنقید اور فروگذاشتوں پر توجہ دلانا بالکل علیحدہ بات ہے اور یہ امر نہ صرف مطلوب ہے بلکہ مستحسن ہے لیکن طنز و تعریض کا انداز اختیار کرنا اور مسائل کو اپنی طرف سے غلط مفاہیم و معانی پہنا کر ان پر جارحانہ اور غیر محتاطانہ انداز سے تلخ و تند تنقیدیں شائع کرنا ان دینی جرائد کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔ اس ضمن میں نومبر ۸۵ء کے 'حکمتِ قرآن' کے شمارہ میں محترم قاری سعید الرحمٰن دامت برکاتہم کے قلم سے ایک نہایت مؤثر تحریر 'حلم و صبر' کے مستقل عنوان کے تحت رقم ہو کر شائع ہوئی ہے جو نہایت خلوص و اخلاص اور نصح و موعظت پر مبنی ہے۔ ہم قارئین کرام 'میثاق' کو اس مضمون کے مطالعہ کی خصوصی طور پر دعوت دیتے ہیں نیز دینی جرائد کے معاصرین کے اربابِ اختیار سے نہایت دردمندی کے ساتھ اس مضمون کے مطالعہ کی درخواست کے ساتھ یہ التجا بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی فرمائیں — جو انداز اختیار کیا جا رہا ہے اس کے متعلق ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ وہ دین کے لئے کسی اعتبار سے بھی مفید نہیں ہے بلکہ مضر ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ!

نظمِ دین اور سُنّتِ نبوی

جلوسِ میلاد جیسی بدعات سُنّتِ رسول کی واضح نفی ہے

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کہ مسلمان قوم کی عزّت کا راز صرف اور صرف اسلام میں ہے۔ امیر المومنین سیّدنا عمرِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّا كُنَّا اَذَلَّ قَوْمٍ فَاَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ فَمَهْمَا نَطْلُبُ الْعِزَّ بِغَيْرِ مَا اَعَزَّنَا اللّٰهُ بِهٖ اَذَلَّنَا اللّٰهُ۔

(مستدرک حاکم، صہ ۶۲ ج ۱)

ہم ایک ایسی قوم تھے جو ذلت و خواری کا شکار تھی لیکن اللہ تبارک و تعالےٰ نے دین اسلام کے ذریعہ ہمیں عزّت عطا فرمائی۔ اب جب ہم کسی ایسی چیز کے ذریعہ عزّت کے حصول کی کوشش کریں گے، جس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں عزّت نہیں دی تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل و رُسوا کرکے چھوڑ دے گا۔

گویا محدّثِ اُمّت" سیّدنا فاروق رضؓ نے صرف اسی حقیقتِ کبریٰ کی طرف توجّہ نہیں دلائی کہ ہماری عزّت کا راز اسلام میں ہے بلکہ اس طرف بھی توجّہ دلا دی کہ اگر کبھی اس "حقیقی سببِ عزّت" کے بجائے کسی دوسرے "سببِ عزّت" کی طرف نگاہ اُٹھی تو پھر "عزّتِ سادات" گنوا کر رہ جائیں گے اور حال وہ ہوگا کہ ؎

نہ خدا ہی مِلا نہ وصالِ صنم

غالباً ہی نہیں بلکہ یقیناً یہی احساس تھا جس کے پیشِ نظر پہلی صدی کی عظیم دینی اور حکومتی شخصیت سیّدنا عمر بن عبد العزیز رحؒ نے اپنی ایک تقریر میں توجّہ دلائی تھی کہ:

"حضور اکرم محمد عربی علیہ السلام کے بعد نبی کوئی نہیں اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید کے بعد کوئی کتاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو حلال کرنا تھا وہ ہو گیا اور اب قیامت تک اس میں تبدیلی نہ آئے گی۔ اسی طرح حرام ہونے والی اشیاء کا فیصلہ ہو گیا اور یہ بھی اٹل فیصلہ ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔ میں تو احکامِ الٰہی نافذ کرنے والا ہوں۔"

اور آگے اسی کو مزید اس طرح بیان کیا:

"وَاِنِّیْ لَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ وَلٰکِنِّیْ مُتَّبِعٌ" — میں بدعتی نہیں متبع سنت ہوں۔" (الاعتصام للشاطبی ص ۱۰۱ ج ۱)

جس کا معنیٰ صاف لفظوں میں یہ ہے کہ ایک مسلمان پابند ہے تو اس بات کا کہ وہ دین کی حقیقت کو سامنے رکھے — قرآن و سنت پر اس کی نگاہ رہے اور امت کے اہلِ صلاح و تقویٰ کی وہ تعبیرات و تشریحات سامنے رہیں، جو قرآن و سنت کے سلسلے میں منقول ہیں — اور ظاہر ہے کہ اس میں اولیت حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کو حاصل ہے — صحابہ کرام علیہم الرضوان کا ذکر محض برنبائے عقیدت نہیں بلکہ ان کی اِس حیثیت و مقام کو خود اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کیا۔ طوالت سے بچتے ہوئے محض ایک ارشاد نبوی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں،

"بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ چکے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی، سب کے سب فرقے دوزخ میں جائیں گے۔ مگر صرف ایک فرقہ۔ لوگوں نے اس ایک فرقہ کی بابت پوچھا تو ارشاد فرمایا: "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ۔ وہ فرقہ جس نے وہ کام کیے جو میں نے اور میرے صحابہ رض نے کیے۔"

(ترمذی ص ۸۹ ج ۲ — مستدرک ص ۱۲۹ ج ۱ — مشکوٰۃ ص ۳۰ ج ۱)

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق حضرت ملّا علی القاری الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وہ سب کے سب مطلقاً عادل اور ثقہ ہیں۔"

یہی بات امام ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :

فَإِنَّهُمْ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ" (اسد الغابۃ صہ ۲ ج ۱)

تقریر الاصول (صہ ۲۶۰ ج ۲) فواتح الرحموت (صہ ۱۵۶ ج ۱) اور مسامرہ صہ ۱۵۸ جیسی معتمد کتب میں صحابہ کرام کے نقد وجرح سے بالاتر ہونے پر تفصیلی گفتگو ہے اور بقول ابن حجر عسقلانی الشافعی اللہ تعالیٰ :

" اہلِ سنت اس بات پر متفق ہیں کہ حضرات صحابہ رض کا اجماع حجت ہے"

(فتح الباری صہ ۲۶۶ ج ۳)

حکیم امت حضرت الامام الشاہ ولی اللہ الدہلوی قدس سرہٗ اسی اصولی مسئلہ سے متعلق اپنی مایہ ناز کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :

" میں کہتا ہوں کہ فرقہ ناجیہ صرف وہی ہے جو عقیدہ اور عمل دونوں میں کتاب وسنت کی اور جس پر جمہور صحابہ کرام رض اور تابعین کاربند تھے، پیروی کرے —— اور غیر ناجی ہر وہ فرقہ ہے، جس نے سلف کے عقیدہ کے خلاف کوئی عقیدہ یا اُن کے عمل کے خلاف کوئی عمل اختیار کیا۔"

(حجۃ اللہ البالغہ صہ ۱۷۰ ج ۱ مطبوعہ لاہور)

قرآن وسنت کی واضح رہنمائی اور اسلاف کے بتلائے ہوئے عقیدہ وعمل کے خلاف جو کاوش وکوشش ہوتی ہے، اسے دین اسلام کی ذمہ دار شخصیات کس قدر بُرا سمجھتی ہیں اس کا اندازہ ان ارشادات سے لگائیں :

" جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے، تو گویا اس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے ادائیگی رسالت کے سلسلہ میں خیانت کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ پس جو چیز اس وقت دین نہ تھی آج بھی ہرگز دین نہیں ہو سکتی ۔"

(ارشاد ۔ امام دار ہجرت سیدنا امام مالک رح ۔ الاعتصام صہ ۴۸ ج ۱ اصہ ۱۵ ج ۲ للشاطبی رح)

علامہ حسام الدین علی متقی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

" بدعتی اپنے عمل سے اسلاف پر طعن کرتا ہے کہ انہوں نے گویا پورا دین

بیان نہیں کیا۔ نبی علیہ السلام پر، کہ آپ نے (فلاں فلاں کا حق) بیان
نہیں کیا اور خود اللہ تعالےٰ پر کہ اس نے شریعت مکمل نہیں کی۔"

(بحوالہ "راہِ سنت" صـ ۱۶-۱۷)

حضرت الامام الشیخ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

" اللہ تعالیٰ اہلِ بدعت کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دے اور انہیں اس پر چلائے۔ وہ نہیں جانتے کہ دین تو ان بدعات و محدثات سے قبل مکمل ہو چکا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت تمام ہو چکی ۔۔۔ پس اب دین کا کمال ان بدعات سے تلاش کرنا درحقیقت آیتِ تکمیلِ دین کے انکار کے مترادف ہے۔"

(مکتوبات حصہ چہارم صـ ۹۴ مطبوعہ امرتسر)

اور یہی بات ملا علی قاری اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

" ہمیں دین کی تکمیل میں کسی ایسے امر کی حاجت اور ضرورت نہیں جو کتاب و سنت سے خارج ہو۔" (شرح فقہ [illegible])

بدعت سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اور بدعتی کی جو مخصوص نقصانات ہیں، انہی کے سبب حضور خاتم المعصومین محمد عربی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا:

مَا أَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً إِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ إِحْدَاثِ بِدْعَةٍ۔

(مسند احمد صـ ۱۰۵ ج ۴ - مشکوٰۃ صـ ۳۱ ج ۱)

کوئی قوم بدعت ایجاد نہیں کرے گی مگر اسی کی مقدار میں سنت اس سے اٹھالی جائے گی۔ پس سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

اور ایک جلیل المرتبت تابعی حضرت حسان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"کوئی قوم دنیا میں بدعت نہیں نکالے گی مگر اللہ تعالیٰ اتنی ہی مقدار میں سنت ان سے اٹھالے گا اور پھر قیامت تک وہ سنت ان کو واپس نہ دے گا۔" (دارمی صـ ۲۱)

یہ ہے بدعت کا واضح نقصان کہ اس کے سبب "سنت سے محرومی" کا وبال بھگتنا پڑتا ہے۔ اور بعض دوسری روایات میں حضور اکرم علیہ السلام نے "کل بدعۃ ضلالۃ۔ ہر بدعت کو گمراہی اور ہر گمراہی کو جہنم کا سبب بتلایا۔ جو لوگ یہ مشغلہ اور کاروبار کرتے ہیں وہ

حضور اکرم علیہ السلام کے ارشاد کے تحت "انسانی شکلوں میں شیطان ہیں۔"

امام مسلم قدس سرہ روایت نقل کرتے ہیں ــــ جس کے راوی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں:

"میرے بعد کچھ مقتدا اور پیشوا ایسے ہوں گے جو میری سیرت و اسوہ پر نہیں چلیں گے اور میری سنت پر عمل نہیں کریں گے ان میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جن کے دل شیطانوں کے دل ہوں گے مگر شکل و صورت انسانی ہوگی۔"

(مسلم ص۱۲۷ ج ۲ مجتبائی دہلی)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ "نظم و انتظام دین" کے لیے کتنی صحیح بات ارشاد فرماتے ہیں: نور انتظام الدین یتوقف علی اتباع سنن النبی (حجۃ اللہ البالغہ ص۱۴ ج ۱)

"نظم دینی اس پر موقوف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی سنتوں پر عمل کیا جائے۔"

بدعت، جس کی نحوست کے سبب انسان دوزخ کا مستحق ہوتا ہے، سنت کے نور سے محروم ہوتا ہے، انسانی شکل میں شیطان بن جاتا ہے۔ اعتماد علی السلف کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے اور عملاً تکمیل دین کا منکر بنتا ہے ــــ وہ ہے کیا؟ اس موقعہ پر لغوی بحث سے قطع نظر کر اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم ذمہ دار محدثین و ائمہ دین کے حوالہ سے اس کی شرعی تعریف پیش کرتے ہیں:

حافظ عینی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

"وہ نو ایجاد چیز جو زمانۂ نبوت میں نہ تھی۔" (عمدۃ القاری ص۲۵۶ ج ۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"کسی سابق مثال اور نمونہ کے بغیر ایجاد شدہ چیز ــــ شریعت میں اس کا اطلاق سنت کے بالمقابل ہوتا ہے۔ فلہذا وہ مذموم اور بری ہے۔"

(فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۴)

علامہ مرتضیٰ الزبیدی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں:

"اصول شریعت کے خلاف، سنت کے ناموافق" (تاج العروس ص۲۷ ج ۵)

حافظ ابن رجب حنبلی قدس سرہ کہتے ہیں:

...کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو۔ جو اس پر دلالت کرے۔"

(جامع العلوم والحکم ص ۱۹۳)

البدعۃ ص ۱۰۹ پر یہی تعریف علامہ معین بن صفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھی:

علامہ ابو اسحاق غرناطی رحمہ اللہ تعالیٰ "بدعتِ شرعی" کی جامع مانع تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" وہ دین کے اندر اختراع کیا ہوا ایسا طریقہ ہے جو شریعت کے مشابہ ہے اور جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ کا قصد ہوتا ہے۔" (الاعتصام للشاطبی ج ۱ ص ۳۷)

افسوس یہ ہے کہ بدعت پسند اور بدعت کی رسیا طبائع نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایک قول کی بنیاد پر بدعت کی تقسیم شروع کر دی اور بعض بدعات کو "بدعت حسنہ" کہنا شروع کر دیا۔

تراویح کے متعلق قارئین جانتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم نے تین دن تو پڑھیں لیکن پھر اہتمام ترک کر دیا جس کا سبب یہ ارشاد فرمایا کہ:

"مجھے ڈر ہوا کہ تم پر یہ فرض نہ کر دی جائیں۔" (مشکوٰۃ ص ۱۱۶ مطبع گلزار محمدی لاہور)

پھر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ تا آں کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے " لو جمعتُ ھؤلاء علی قارئٍ واحدٍ لکان امثل " کے داعیہ سے عزم فرما کر سب کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جمع کر دیا۔ دوسری شب جب اس اجتماعیت کو دیکھا" والناس یصلّون بصلاۃ قارئھم" تو فرمایا نعمت البدعۃ ھذہ (مشکوٰۃ ص ۱۱۵) نورِ سنت سے محروم لوگوں نے اس کی آڑ میں "بدعت حسنہ" کا ہنگامہ گرم کر کے روحِ دین و حقیقتِ اسلام کو غارت کرنے کی سعیٔ نامسعود کی۔ ہداہم اللہ تعالیٰ حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ تراویح کا عمل اجتماعی طور پر خود رسالت مآب علیہ السلام کے دور میں ہوا۔ ایک خاص مصلحت سے پھر اسے موقوف کیا گیا۔ تاہم لوگ اپنے طور پر پڑھتے رہے حضرت ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور اسی طرح گذر گیا کہ اس میں امت کو شدید قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ دورِ فاروقی آگیا، جس شب آپ نے "جمع علی القاری" کی خواہش و ارادہ ظاہر کیا، اس شب بھی لوگ مشغول تراویح تھے، فرداً فرداً بھی، اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں بھی، جیسا کہ اسی روایت میں تصریح ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ بدعت شرعی کہاں رہی؟ اور یہی بات حضرت امام ابن تیمیہ
رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد سے جو یہ سمجھتا ہے وہ
...ق ہے (دیکھیں حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۱۵ مطبوعہ کراچی) پھر بات کیا ہوئی ـــ اصل یہ ہے کہ
بدعت کی تقسیم "حسنہ اور سیئہ" میں کرنا ہی غلط ہے۔ ہاں "لغوی اور شرعی" کا عنوان
بالکل صحیح ہے۔ لغوی ہر نو ایجاد کو کہتے ہیں۔ وہ عبادت کے قبیل سے ہو یا عادت کے
قبیل سے ـــ اس کی قسمیں واجب، مندوب، حرام، مکروہ اور مباح بیان کی گئی ہیں، جن
کی تفصیل کا وقت نہیں۔ اس کے بالمقابل بدعت شرعی ہے، جس سے متعلق شارع
کی اجازت صراحۃً، دلالۃً، اشارۃً کسی طرح نہ ہو۔ اسی کو ضلالۃ، جہنم میں دخول کا باعث
اور رفع سنت کا سبب وغیرہ کہا گیا ـــ "صاحب الجنۃ" کہتے ہیں:

"بدعت دو قسم ہیں لغوی، شرعی ـــ شرعی وہ ہے جو طاعت کی مد
میں کسی مشروع امر پر زیادت (یا کمی) کی جائے ـــ اس پر شارع کا
قول ہو نہ فعل، صراحت ہو نہ اشارہ ـ یہی بدعت ضلالہ ہے" ص ۱۲

اس سلسلے میں مزید بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

ارشاد الساری شرح بخاری للعلامہ قسطلانی رحمہ اللہ تعالیٰ ص ۲۴۴ ج ۱،
عمدۃ القاری ص ۳۵۶ ج ۵، نووی شرح مسلم للامام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ
ص ۲۸۵ ج ۱، مدخل ص ۲۵۷ ج ۲، فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۴، ارشاد امام
شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ منقول منہاج السنۃ لابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ ص ۲۲۴ ج ۲

یہی وجہ ہے کہ الف ثانی کے مجدد کبیر حضرت الامام الشیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں

ع چیزے کہ مردود باشد حسن از کجا پیدا کند (مکتوبات ص ۱ ج ۳)

"جو چیز حضور علیہ السلام کے ارشاد کے تحت "مردود" ہے، وہ حسن کہاں سے
پیدا کرے گی؟"

بدقسمتی یہ ہے کہ "اہل بدعت" اپنی ہر خرافات کے لیے دلائل کا انبار لگانے
کی فکر کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں:

"تم کوئی ایسا مبتدع نہ پاؤگے جو ملت سے وابستگی کا مدعی ہو مگر یہ کہ وہ
اپنی بدعت پر کسی شرعی دلیل سے ضرور استشہاد کرے گا اور اس طرح

اس کو اپنی عقل اور خواہش کے مطابق بنا لے گا۔" (الاعتصام ص۱۷۱ ج ۱)

اس قسم کی بات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے (مکتوبات حصہ سوم ص۸) فرما کہ بدعت پسند طبائع بظاہر ہتھیاروں سے لیس ہو کر لوگوں کو قائل کرنے کی فکر کر کرتی ہیں ۔۔۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح بے دینی، دین اور بدعت، سنت نہیں بن جا حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ اسی وجہ سے ایک بہت قیمتی نصیحت فرما ہیں (جس کا ترجمہ ہے)

"میں تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے حکم کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنے نیز اس کے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اور اس کی وصیت کرتا ہوں کہ اہلِ بدعت نے جو بدعتیں ایجاد کی ہیں، ان کو ترک کرنا جبکہ سنت اس سے قبل جاری ہے اور سنت کی موجودگی میں بدعت کی ایجاد کی آخر مصیبت کیا ہے؟ (ضرورت کیا ہے؟) سنت کو مضبوطی سے پکڑنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سنت حفاظت کا ذریعہ ہے اور اچھی طرح جان لے کہ لوگوں نے جو بدعت ایجاد کی ہے، اس سے قبل ہی وہ چیز گذر چکی ہے جو اس پر دلیل ہو سکتی تھی یا اس میں عبرت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ سنت ان پاک نفوس کی طرف سے آئی ہے، جنہوں نے اس کے خلاف خطاء، لغزش، حماقت، اور تعمق کو بغور دیکھ لیا تھا۔ اور اس کو اختیار نہ کیا تو بھی صرف اس چیز پر راضی رہ، جس پر قوم (صحابہ واسلاف) راضی ہو چکی ہے۔ کیونکہ انہوں نے علم پر اطلاع پائی اور دور رس نگاہ سے دیکھ کر بدعت سے اجتناب کیا اور البتہ وہ معاملات کی تہ تک پہنچنے پر قوی تھے اور جس حالت پر وہ تھے وہ افضل ترین حالت تھی، سو اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم گامزن ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اُن سے (اسلاف) فضیلت میں بڑھ گئے۔"

(ابوداؤد۔ ص۲۷۷ ج ۲)

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ کی اس قیمتی نصیحت کے بعد مزید ضرورت کلام نہیں رہتی۔ تاہم علماء و فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی احتیاط اور حزم نے ہمارے لیے جو مخا

جمع کیے ہیں، ان میں سے ایک کا ذکر بے حد ضروری ہے، اور وہ یہ کہ جب کسی چیز کے سنّت یا بدعت ہونے میں اشتباہ کی کیفیت ہو تو پھر ایک مسلمان کیا کرے ؟ کتنا نازک اور باریک سوال ہے۔ لیکن اللہ تعالٰے ہمارے اسلاف کی قبروں کو منوّر فرمائے انہوں نے خوب خوب رہنمائی کی۔ حضور علیہ السّلام نے دل میں کھٹک بننے والی چیز کو گناہ سے تشبیہہ دی۔ اگرچہ نام کے مفتی اس کے جواز کا فتویٰ بھی دے دیں (مشکوٰۃ ص ۲۴۲ ج ۱) اور بخاری ص ۱۳ ج ۱ میں مشتبہات میں پڑنے سے روکا اور فرمایا۔

" جو ان سے بچ گیا اس نے اپنا دین بھی بچالیا اور عزت بھی بچالی۔"

انہی ارشادات کی روشنی میں فقہا فرماتے ہیں :

" کوئی حکم سنّت و بدعت کے درمیان دائر ہو تو اس کا ترک ضروری ہے"

(علّامہ برکلی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ بحوالہ "راہِ سنّت" ص ۱۵۰)

یہی بات عالمگیری ص ۱۷۹ ج ۱، شامی ص ۶۰ ج ۱، مجالس الابرار ص ۱۲۹، مکتوبات شیخ عبدالحق محدّث دہلوی برحاشیہ اخبار الاخبار ص ۱۰ اور بحر الرائق ص ۱۲۵ ج ۱ پہ ہے ـــــ گویا اس قدر احتیاط کی ضرورت ہے۔

اِن تفصیلات کے بعد ذرا اس طرف توجہ فرمائیں کہ ماہِ ربیع الاوّل جس میں حضور سرورِ کائنات علیہ السلام کی ولادت، وفات اور ہجرت کے واقعات پیش آئے، اس میں "مدعیانِ اسلام" کیا حرکات کرتے ہیں ؟ اور جو کچھ کرتے ہیں آیا وہ دین ہے ؟ سنّت و طریقِ نبوّت ہے ! آثارِ صحابہ رضہ سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے ؟ حاشا للہ ! سب سے بڑا ستم تو یہ ہے کہ تحقیقی روایات کے مطابق ولادت باسعادت محمدیؐ ۹ ربیع الاوّل روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء ہے (سیرت النبی ص ۱۷۱ ج ۱ مطبوعہ اعظم گڑھ) اور وفات یقیناً ۱۲ کو ہے ـــــ لیکن وہ غم واندوہ کا دن "ولادت کا دن" ہی قرار نہ پایا بلکہ سرکارِ دوعالم علیہ السلام کی واضح تعلیمات کے علی الرغم "عید کا دن" کہلایا۔ مشکوٰۃ ص ۱۲۶ پر تصریحات ہیں کہ بطور عید بس " الفطر اور الاضحیٰ " کے دو ہی ایّام ہیں لیکن وائے برحال ما کہ اس امامِ ہدیٰ، خاتم الانبیاء والمعصومین مقتدائے کائنات علیہم السّلام کی تعلیم کے علی الرغم ہم نے ایک "تیسری عید" کا اہتمام پھر اس کے لیے حکومت سے لے کر علماء و صلحاء تک نے جس طرح کا رویّہ اختیار کیا

وہ اتنا المناک ہے کہ ڈر لگتا ہے کہ ہم عتابِ الٰہی کا شکار ہو کر روزِ محشر شافع محشر کی شفاعت سے محروم نہ ہوجائیں۔ حضور اکرم رحمت دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر تو مندوب ہے جیسا کہ فقیہہ عصر مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فتاویٰ رشیدیہ میں صـ۱۰۲ ج ۱ و صـ۱۱۱ پر تصریح کی ہے لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا ہے ۔
افسوس کہ اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

خیر القرون کے مقدس ادوار سے بھی صدیوں بعد سنہ ۶۰۴ھ میں "موصل" کے ایک حکمران مظفر الدین کوکری بن اربل (م سنہ ۶۳۰ھ) نے یہ دھندا شروع کیا۔ یہ ذات شریف کون تھی۔ فضول خرچ بادشاہ۔ ہر کس و ناکس کو "اجتہاد" کی ترغیب دے کر اس پر عمل کی تلقین کرنے والا۔ پہلا شخص جس نے میلاد کی بدعت گھڑی۔
(القول المعتمد بحوالہ "راہ سنت" صـ۱۶۳)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ "دول الاسلام صـ۱۰۳ ج ۲ پر لکھتے ہیں :
"ہر سال اس تقریب میلاد پر تین لاکھ روپیہ خرچ کرتا۔"

جس "دنیا پرست مولوی" نے اسے اس کام پر لگایا اس کا نام "عمر بن دحیہ ابوالخطاب" تھا جو سنہ ۶۳۳ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ ایک ہزار پونڈ کا انعام اس کے جواز کے سلسلے میں مواد فراہم کرنے پر اُسے ملا۔" (دول الاسلام - صـ ۱۰۴ ج ۲)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :
"یہ مولوی ائمہ دین اور سلف کی شان میں بہت گستاخی کرتا۔ گندی زبان کا مالک، احمق، متکبر، دین کے کاموں میں حد درجہ سست اور بے پروا تھا۔" (لسان المیزان صـ۲۹۶ ج ۴)

اور حافظ ہی علامہ ابن نجار رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :
"لوگ اس کے جھوٹ اور ضعف پر متفق اللسان تھے۔"
(لسان المیزان صـ۲۹۵ ج ۴)

علامہ ابن امیر الحاج مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں :
"۔ لوگوں نے جو بدعتیں نکالیں، جن کو وہ بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور جن کے کرنے کو شعائر اسلامیہ کا اظہار کہتے ہیں، ایک مجلس میلاد ہے، جس کو وہ

ربیع الاول میں کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے۔"
(مدخل ص۸۵ ج ۱)

علامہ عبدالرحمٰن المغربی اپنے فتاویٰ میں اور علامہ احمد بن محمد مصری مالکی "قول معتمد" میں فرماتے ہیں:

"یہ بدعت ہے۔ نہ نبی علیہ السلام سے ثابت، نہ صحابہ رضی سے نہ ائمہ مجتہدین سے ـــ چاروں فقہی مسلک کے علماء اس پر متفق ہیں۔"

خادمِ رسول سیدنا انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"حضرات صحابہ کرام رضی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے بڑھ کر اور کوئی محبوب نہ تھا لیکن وہ جب آپؐ کو دیکھتے تو قیام نہ کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس عملِ قیام کو پسند نہیں فرماتے۔" (ترمذی ص۱۰۰ ج ۲، مسند احمد ص۱۳۲ ج ۳)

گویا حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان جیسے حضرات جو ذاتِ نبوت کے معاملہ میں حد درجہ حساس تھے، آپؐ کے وضو کا پانی تک زمین پر نہ گرنے دیتے۔ ان کے عمل کا یہ حال ہے اور یہاں گلی گلی کوچہ کوچہ محفلِ میلاد اور اس میں قیام ایک ایسی رسم بن کر رہ گئی کہ ایک دو نسل کے بعد جو طبقہ آئے گا وہ اسی کو دین سمجھ کر بیٹھ جائے گا۔ فیا حسرتا۔ اور اس پر بس نہیں ـــ اس سے آگے جلوس، اس میں مرد و زن کا اختلاط، نماز وا ضیاع، معاشی نقصان، نمائشی محرابوں، جھنڈیوں اور چراغاں کے ذریعہ شدید قسم کا اسراف، ایسی باتیں نہیں جن کا نام نہاد علماء، پیرانِ عظام اور حکومتی اداروں کو علم ہو۔ ان منکرات و خرافات کے خلاف جو جذبۂ خیر خواہی کے تحت آواز اٹھائے، اس کے خلاف جو زبانِ طعن دراز ہوتی ہے وہ سب کو معلوم ہے؛ لفظ "وہابیت" یہاں کی وہ گالی اور وہ طعن ہے کہ الامان ـــ اور اس کا پس منظر یہ ہے کہ فلاں شخص کے نام سے چڑتا اور ان کا ذکر نہیں سن سکتا ـــ گویا جو شخص مقصدِ بعثتِ محمدیؐ کی طرف توجہ دلاتا ہے، آپؐ کی سیرت و اسوہ پر عمل کی بات کرتا ہے، اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ "اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ کے قرآنی حقائق کے سے آپؐ کی اطاعت و تابعداری پر زور دیتا ہے، وہ گردن زدنی لیکن جو نماز کا خم

نہیں کرتا، سودی کاروبار کرتا ہے، سمگلنگ، سٹہ، چور بازاری، رشوت خوری اور اقربا پروری کا رسیا ہے لیکن بس ان رسوم و رواج کا عادی ہے ـــ خوفِ خدا سے عاری بندگانِ شکم کی شکم پری کا اہتمام کرتا ہے اور بدعات و خرافات کی گرم بازاری میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے، وہ بہت اچھا، مسلمان اور سنی ـــ

جنوں کا نام خرد ، خرد کا جنوں رکھ دیا
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

لوگوں کو احساس نہیں کہ حضور علیہ السّلام نے چھ قسم کے افراد پر لعنت بھیجی ہے جن میں ایک ہے ، و التارک لسنتی (میری سنّت کو ترک کرنے والا)

اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے حجۃ الوداع میں فرمایا تھا :

" میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ دی ہیں، اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑا تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ان میں سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنّت رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہے۔ "

(مستدرک ص ۹۳ ج ا۔ روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ)

انسان کی نجات " اتباع و اطاعتِ رسول میں ہے نہ کہ خود ساختہ طریق محبّت میں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

فَعَلَی الْمُؤمِنِ اتِّبَاعُ السُّنَّةِ وَ الْجَمَاعَةِ

مومن پر سنّت و جماعت کا اتباع لازم ہے۔ (غنیۃ الطالبین ص۱۹۵)

وجہ ظاہر ہے کہ : ـــ

دھوکہ کی محبّت سے عداوت بہتر بگڑی ہوئی عقل سے حماقت بہتر

محبّت وہی صحیح ہے جس میں " اطاعت و اتباع " ہو ورنہ محض دھوکہ اور فریب ہے۔ اور اس کا انجام بہت عبرتناک ـــ اللہ تعالےٰ ہمیں قرآن و سنّت کے چشمہ ہائے صافی نہ اسلاف کی تعبیرات کے مطابق ہدایت و رہنمائی کی توفیق بخشے اور عملِ صالح کی توفیق ارزانی

الہدیٰ

نشست ۲۶

اثباتِ آخرت

سورہ قیامہ کی روشنی میں

(درسِ ہشتم)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝١ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝٢

"نہیں! قسم کھاتا ہوں میں قیامت کے دن کی — نہیں! قسم کھاتا ہوں میں نفسِ ملامت گر کی"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ ان دو قسموں میں اللہ تعالیٰ نے اس تمام استدلال کو سمو دیا ہے جو اثباتِ آخرت کے ضمن میں طویل مکی سورتوں میں پھیلا ہوا ہے

چنانچہ پہلی قسم ہے خود قیامت کے دن کی — گویا اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ تمہارے ذہنوں میں شبہات ہیں، اشکالات ہیں — تمہارے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ آفرینش سے لیکر الساعۃ یعنی قیامت تک پیدا ہو کر مرنے والے تمام انسان کیسے دوبارہ زندہ اٹھائے جائیں گے! ان سب انسانوں کے اعمال کہاں محفوظ ہوں گے! یہ جزا و سزا کا معاملہ کیسے ظہور پذیر ہو سکے گا! لیکن یہ وقوعِ قیامت اس قدر یقینی، قطعی اور حتمی ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں — یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس میں دلیل کون سی ہے! اگر کوئی شخص اپنا کوئی دعوےٰ پیش کر رہا ہو اور اس سے اس کے دعوے کیلئے کوئی دلیل طلب کی جائے تو جواب میں وہ اس پر صرف قسم کھالے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی — لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس اصول میں بھی ایک دلیل مضمر ہے — اور اصل میں وہ دلیل ہوتی ہے متکلم کی شخصیت کی — اگر کوئی صاحبِ کردار انسان جس پر اعتماد کیا جاتا ہے جس کی صداقت کی گواہی دی جاتی ہے — جب وہ کوئی بات کہتا ہے اور قسم کھا کر کہتا ہے تو اس کے قسم کھانے سے اس بات میں ناقابلِ تردید وزن پیدا ہو جاتا ہے — درحقیقت یہ وزن اصلاً اس شخص کی اپنی شخصیت کا ہوتا ہے — اب یہاں غور کیجئے کہ قسم کھانے والا کون ہے! ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتے ہیں، قسم کھانے والا خود اللہ ہے — اس کلام کا متکلم اللہ ہے — اسی نے قسم کھالی ہے — اس کا یہ اثر ماننے والے پر، صاحبِ ایمان پر پڑے گا کہ اس کا دل لرز کر رہ جائے گا — وہ کانپ اٹھے گا کہ قیامت کا دن اتنا یقینی، قطعی اور حتمی درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ سبحانہٗ نے اس دن کی قسم کھائی ہے — لیکن جو لوگ قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے وہ بہرحال اس قسم کو منسوب کریں گے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب — یہاں بھی وہ تاثیر ختم نہیں ہوگی — اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتِ مبارکہ و مطہرہ کا وزن اس کی پشت پر پھر بھی موجود ہے — یہ قسم کون کھا رہا ہے! جس کی صداقت و امانت کی گواہی ان کے دشمنوں تک نے دی ہے جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل سے یہ پوچھا گیا کہ وہ کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ

نہ جھوٹ بولتے ہیں" صلی اللہ علیہ وسلم - تو اس نے کہا "ہرگز نہیں، انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا" - پھر جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ "پھر تم اُن کی تصدیق کیوں نہیں کرتے! ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے!" تو اُس نے بڑی صفائی کے ساتھ اقرار کیا کہ "اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنو ہاشم کے مابین ایک مسابقت کا مقابلہ جاری ہے - انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے، انہوں نے مہمان نوازیاں کیں، ہم نے ان سے بڑھ کر کیں - ہم ان کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے چلے آ رہے ہیں - اب اگر ہم ان کے ایک فرد کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ہمیشہ ہمیش کے لئے ان کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے اور یہ مجھے گوارا نہیں" - معلوم ہوا کہ ابوجہل بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ کا الزام نہیں لگا سکا -

یہ بات جو میں نے عرض کی ہے اس کی اہمیت کو اس بات سے بھی سمجھئے کہ جب حضورؐ کو حکم ہوا ہے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ - "اب آپ برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہیے وہ بات جس کا آپ کو حکم ملا ہے" - تو آپؐ کوہِ صفا پر کھڑے ہوئے، جیسے اُس زمانے میں رواج تھا کہ اگر کوئی اہم خبر لوگوں کو پہنچانی ہوتی تھی تو خبر پہنچانے والا کوہِ صفا پر مادر زاد عریاں ہو کر کھڑا ہوتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا "واصباحاہ!" "ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے" لوگ اس کی آواز سن کر اور جن تک آواز نہیں پہنچتی تھی تو وہ دور سے دیکھ کر کہ ایک نذیر عریاں کھڑا ہے - اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے - حضورؐ نے صرف یہ ترمیم فرمائی کہ آپؐ نے کپڑے نہیں اتارے - یہ بات کسی طرح بھی آپؐ کے شایانِ شان نہ تھی - آپؐ کی حیاء کا عالم تو یہ تھا کہ بالکل بچپن میں کعبہ کی تعمیرِ نو کے لئے جب بچے اپنا تہبند اتار کر اور اس کی منڈھی بنا کر سر پر رکھ لیتے تھے اور پھر سر پر پتھر رکھ کر ڈھوتے تھے تو آپؐ نے بھی مشقت کو ہلکا کرنے کی غرض سے ساتھیوں کے اصرار پر تہبند اتارنے کا ارادہ کیا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے - آپؐ نے بھی دستور و رواج کے مطابق نعرہ لگایا "واصباحاہ" لوگ جمع ہو گئے - اس وقت آپؐ نے اپنی دعوت پیش کرنے سے پہلے لوگوں سے سوال

کیا "لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا!" لوگوں نے بیک زبان تسلیم کیا "الصادق اور الامین ۔" "آپ سچے بھی ہیں امانت دار بھی ہیں"۔ تو جو نہ ماننے والے تھے ان کے نزدیک بھی اس کلام کے متکلم کم از کم محمد ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور حضورؐ کی شخصیت کا پورا زور اور وزن اس قسم کی پشت پر موجود ہے : لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ "کیوں نہیں مجھے قسم ہے قیامت کے دن کی"۔ میں اس کے وقوع کو اتنا یقینی، قطعی اور حتمی مانتا ہوں کہ اس کی قسم کھا رہا ہوں ۔

چنانچہ سورہ تغابن کے درس میں بھی آپ نے دیکھا کہ یہی انداز تھا: قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ۔ "اے نبی! ان سے کہہ دیجئے کیوں نہیں مجھے میرے رب کی قسم ہے تم لازماً دوبارہ اٹھائے جاؤ گے"۔ اس کو اصطلاح میں دلیل خطابی کہتے ہیں ۔ یہ دلیل ایقانی ہے، جس میں اصل دلیل متکلم کے اپنے یقین کو حاصل ہوتی ہے ۔ دلیل کی حیثیت متکلم کی اپنی شخصیت ہوتی ہے ۔ اس کا یقین مخاطبین تک منتقل ہوتا ہے، ان میں سرایت کرتا ہے ۔ تو یہ پہلی دلیل، دلیل خطابی یا دلیل ایقانی ہے ۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۔

اب آئیے دوسری دلیل کی طرف ۔ ارشاد فرمایا گیا : وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ "اور کیوں نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ انسان کے اپنے باطن میں ایک حقیقت ہے جسے وہ ضمیر سے تعبیر کرتا ہے ۔ انگریزی میں جسے Conscience کہا جاتا ہے، اخلاقی تمیز سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ جس کے بارے میں ایک آفاقی و عالمی حقیقت کے طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان جب کوئی بُرا کام کرتا ہے تو اُسے اندر سے اس کا یہ ضمیر، اس کا یہ نفسِ لوّامہ Conscience ملامت کرتا ہے کہ تم نے اچھا نہیں کیا ۔ یہ تم نے بُرا کام کیا ہے ۔ بُرے سے بُرا انسان بھی یہ جانتا ہے کہ بُرائی بُرائی ہے، بدی بدی ہے ۔ اگرچہ وہ مختلف اسباب اور مختلف محرکات کے تحت وہ اس بُرائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے لیکن عین اسوقت بھی وہ یہ جانتا ہے کہ یہ کام بُرا ہے ۔ اس کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ میرا ضمیر مجھے کچوک رہا ہے ۔ جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے : "My conscience is biting me"

یہ چیز درحقیقت وقوعِ قیامت پر سب سے زیادہ قوی
اور سب سے زیادہ قطعی دلیل ہے - یعنی یہ بات کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے
نیکی اور بدی کو پہچانتا ہے - ان میں تمیز رکھتا ہے - یہ پہچان فطرتِ انسانی میں
ودیعت کی گئی ہے - چنانچہ آخری پارے کی سورۃ الشمس میں یہ الفاظ آئے: "وَ
نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا ۝" اور گواہ ہے وہ نفسِ انسانی
اور جو اُسے بنایا اور سنوارا پھر اس میں فجور اور تقویٰ کا علم الہامی طور پر ودیعت
کر دیا۔" ہر انسان جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برائی ہے اور سچ بولنا اچھائی ہے
وعدہ کر کے پورا کرنا بھلائی ہے، وعدہ خلافی برائی ہے - کسی کو دھوکہ دینا یہ شر ہے کسی
کی صحیح رہنمائی کرنا یہ خیر ہے - ظلم، تعدی، ستم یا استحصال یہ بدی کے کام ہیں، عدل و
انصاف اور ہمدردی - خدمتِ خلق یہ نیکی کے کام ہیں - ان باتوں میں کہیں بھی انسانوں
کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے -

اگر یہ کوئی حقیقت ہے اور اسکے حقیقت ہونے پر گواہ ہے ہمارا نفس لوّامہ -
ہمارا اپنا ضمیر، ہمارا اپنا نفس ملامت گر، ہمارا اپنا Conscience اس
پر سب سے بڑی دلیل اپنا ذاتی احساس ہے کہ اگر کسی نہ کسی سبب سے ہم سے کوئی غلط حرکت
سرزد ہو جاتی ہے تو خود ہمارا اپنا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے کہ تم نے یہ برا کام کیا ہے!
- اگر یہ واقعہ ہے اور یقیناً ہے — اُن لوگوں کا معاملہ چھوڑ دیجیے جن کی فطرت مسخ
ہو چکی ہو، جن کے دل پتھر بن گئے ہوں، جن کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو — تو اگر ہم اس پر غور
کریں تو ایک حقیقت واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس دنیا کی زندگی میں
نیکی کا بدلہ بھلائی کی صورت میں اوّل تو ضروری نہیں کہ ملے - اکثر و بیشتر بالکل نہیں ملتا
اگر ملے بھی تو نیکی کی مناسبت سے نہیں ملتا - اسی طرح بدی کی سزا اکثر و بیشتر تو بالکل ملتی ہی نہیں،
اگر ملتی بھی ہے تو جرم کے تناسب کے ساتھ نہیں ملتی - مثلاً ہٹلر کا نام ذہن میں لایئے
جس کی ہوسِ اقتدار اور جوعِ ارض کی وجہ سے لاکھوں انسان مارے گئے، ہزارہا
اپاہج ہو گئے، لاکھوں خواتین بیوہ ہوئیں، کروڑوں بچے یتیم ہو گئے لاکھوں گھر تباہ و برباد
ہو گئے اور ان کے مکین بے خانماں ہو گئے - نوعِ انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انسانا

لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتنا بڑا جانی اور مالی نقصان نوعِ بشر کو مجموعی طور پر ہٹلر کی ہوسِ ملک گیری اور اعلیٰ نسل سے ہونے کے زعمِ باطل کے باعث پہنچا ہے۔ اب اگر ہٹلر گرفتار ہو جاتا اور اس کے جسم کا ایک ایک ریزہ بھی علٰحدہ کر دیا جاتا تو کیا اُسے اپنے جرم کی پوری سزا مل جاتی!۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک گولی سے اپنی جان ختم کی اور وہ اس سزا سے بھی بچ گیا۔ معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے یہ دنیا ناقص ہے یہاں Physical Laws یعنی قوانینِ طبعیہ تو پورے طور پر بروئے کار آ رہے ہیں۔ آپ اگر آگ میں انگلی ڈالتے ہیں وہ جل جاتی ہے۔ آپ زہر کھائیں گے تو مر جائیں گے۔ لیکن لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو اکثر و بیشتر کچھ گزند نہیں پہنچتا۔ زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا۔ لوگ حرام خواریاں کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر بچ بچ جاتی ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں گلچھرے اڑاتے ہیں، عیش کرتے ہیں۔ وہ لوگ بہتر حالت میں رہتے ہیں اور آسودہ رہتے ہیں جن کے کوئی اصول نہیں ہیں، جن کے کوئی Principles نہیں ہیں۔ جو جائز سے اور ناجائز سے، حلال سے اور حرام سے، خیر سے اور شر سے الغرض ہر طرح سے کمانے کے لئے آمادہ ہیں — اس کے برعکس ان کیلئے دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی ملنی بھی بسا اوقات مشکل ہو جاتی ہے جو جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں، حلال اور حرام میں فرق کریں، صحیح اور غلط کا لحاظ رکھیں۔

اب یا تو یہ مانا جائے کہ یہ دنیا نری اندھیر نگری چوپٹ راج ہے یہ تخلیق عبث ہے۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے۔ معاذ اللہ ایسا نہیں ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا — "اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بیکار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا"۔ تو دوسرا Alternative صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اگر خیر خیر ہے، شر شر ہے، نیکی نیکی ہے، بدی بدی ہے تو ایک دوسری زندگی ہونی چاہئے جس میں ان اعمال کے پورے نتائج ظاہر ہوں۔ نیکی کا بھرپور صلہ اور بھرپور بدلہ ملے۔ بدی کی بھرپور سزا، پورا بدلہ ملے۔ وہاں کے قوانین اخلاقی اقدار کے تابع ہوں۔ اخلاقی اقدار Physical Laws یعنی قوانینِ طبعیہ کے تابع نہ ہوں۔ یہ ہے استدلال قرآن حکیم کا جو وہ متعدد انداز سے، مختلف اسالیب

ے متعدد مقامات پر کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اجمال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ — جیسے سورہ القلم میں فرمایا جاتا ہے: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ "سوچو تو سہی کیا ہم اپنے فرماں برداروں اور باغیوں کو برابر کر دیں گے کیا تم لوگوں کی عقل ماری گئی ہے کہ ایسے حکم لگاتے ہو — ؟" اگر واقعۃً کوئی اور زندگی نہیں ہے! آخرت نہیں ہے! محاسبہ نہیں ہے! جزا و سزا نہیں ہے تو باغی مزے میں رہے ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست — پھر تو عقلی طور پر ان کی روش زیادہ درست ہے جنہوں نے خیر اور شر کے مابین کوئی امتیاز نہیں کیا، جنہوں نے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی — لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ دوسری زندگی ہونی چاہیئے جس میں انسان کو اپنے اعمال کی بھرپور جزا اور بھرپور سزا مل جائے۔

یہ ہے درحقیقت خلاصہ اُس پورے استدلال کا جس کو یہاں پر قسم کے اسلوب میں پیش کر دیا گیا ہے: لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ "نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی"۔ وہ بات ذہن میں رکھیئے جو سورۃ العصر کے سبق کے ضمن میں بھی میں نے عرض کی تھی کہ قسم کا اصل مفاد اور فائدہ ہوتا ہے گواہی کا۔ گویا کہ ایک تو قیامت پر خود قیامت گواہ ہے — ع آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ قیامت اس درجے کی حتمی، یقینی اور قطعی چیز ہے کہ گویا قیامت کے وقوع پر خود قیامت گواہ ہے — پھر یہ کہ قیامت پر دوسری گواہی مطلوب ہے تو تمہارا اپنا ضمیر، تمہارا اپنا Conscience گواہی دے رہا ہے کہ نیکی نیکی ہے، بدی بدی ہے — آخر میں، میں حوالہ دیدوں کہ جدید مغربی فلسفے کا جسے باوا آدم کہا جاتا ہے — یعنی کانٹ (KANT)۔ اس نے Moral law اخلاقی قانون کو بڑی اہمیت دی ہے — Critique of practical Reason میں اس نے یہ بات ثابت کی ہے کہ وجودِ باری تعالٰے پر اللہ تعالٰے کی ہستی کے اثبات پر سب سے بڑی دلیل انسان کے اندر کا اخلاقی قانون ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے۔ یہ خیر و شر اور نیکی و بدی کی تمیز کہاں

سے آئی! مادّے میں یہ شعور کیسے پیدا ہو گیا! انسان کے سوا حیوانات میں یہ شعور موجود نہیں ہے۔ حیوانات صرف جبلت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ انسان کی امتیازی شان ہے کہ وہ اخلاقی شعور رکھتا ہے اور خیر کی قدر و قیمت کو جانتا ہے۔ بدی کو، شر کو وہ بُرا سمجھتا ہے۔ پھر اس نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر دو دلیلیں سب سے زیادہ قوی ہیں:

The stars having above and the moral law within

— ایک تو یہ ستاروں بھرا ہمارے اوپر آسمان اللہ کی ایک عظیم کی نشانی ہے جس کے متعلق ہم پڑھ چکے ہیں۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ اور دوسرے یہ اخلاقی قانون جو فطرتِ انسانی میں مضمر ہے، ودیعت شدہ ہے — کانٹ نے اس دوسری بات کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کے لئے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے۔ قرآن اُسے لاتا ہے وقوعِ قیامت اور جزا و سزا کے واقع ہونے کی دلیل کے طور پر: لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ۝ آج اسی پر اکتفا کرتے ہیں بقیہ سورت پر گفتگو ان شاء اللہ آئندہ نشست میں ہو گی۔ اس وقت جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کے بارے میں کوئی سوال ہو یا اشکال ہو تو آپ پیش فرما سکتے ہیں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک شخص کو دُنیا میں اس کے اعمال کی سزا مل گئی ہے اور دوسرے شخص کو دُنیا میں بھی اس کے اعمال کی سزا نہیں ملی۔ تو کیا ان دونوں کے ساتھ آخرت میں مختلف سلوک ہو گا؟

جواب: اصل میں منطقی اور اصولی اعتبار سے دنیا کی سزا کا کوئی تعلق آخرت کی سزا سے نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں نے ایک نشست میں عرض کیا تھا کہ دُنیا تو دارالجزا یا دارالسزا ہے ہی نہیں — یہ دارالامتحان ہے۔ یہاں انسان کو جن حالات، واقعات، کیفیات سے سابقہ پیش آتا ہے وہ سب امتحانی کیفیات ہیں — البتہ اہلِ

ان کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے
اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہ رعایت برتے گا کہ دنیا میں اگر انہیں کچھ تکالیف پہنچی ہیں
کسی غلط عمل کی ان کو یہاں سزا مل چکی ہے تو ان کو اُن کی خطاؤں کا کفارہ بنا دے گا۔
یہ اہل ایمان کے حق میں اللہ کی خصوصی رعایت و عنایت ہے۔ رہا کفار کا معاملہ تو
ہم سورۃ تغابن میں پڑھ آئے ہیں: فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝ "دنیا میں بھی انہوں نے اپنے کئے کا مزا چکھا اور ابھی ایک دردناک سزا،
ایک عذاب الیم ہے جو ان کو مل کر رہے گا"۔ لہٰذا ان کے بارے میں تو جو منطقی اور اصولی
بات ہے وہی Apply ہوگی۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا اس دنیا میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن
نہیں ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں مل جائے؟

جواب: جہاں تک امکان کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی کام بھی بعید
نہیں ہے وہ جو چاہے کرے۔ وہ ایک دنیا اس اصول پر تخلیق فرما سکتا ہے کہ
اس میں ہر شخص کو اس کی نیکی یا بدی کا صلہ اور بدلہ اسی دنیا کی زندگی میں مل جائے۔
لیکن ہماری اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے جس اصول پر تخلیق فرمایا ہے وہ وہ ہے جو
قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے: ایک مثال سورہ ملک کی ہے:
خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ اسی سے علامہ
اقبال نے خیال لے کر کہا ہے ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

یہ جو ہماری اس دنیا کی زندگی کا وقفہ ہے، یہ امتحانی وقفہ ہے۔ "اس میں ہم
جانچے اور پرکھے جا رہے ہیں" اور اس امتحان کے نتائج قیامت کے دن نکلیں گے
ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ـــ وہ ہے ہار جیت کے فیصلے کا اصل دن ـــ

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا روزِ قیامت کے بارے میں کوئی سائنسی ثبوت دیا
جا سکتا ہے؟

جواب : آپ کے سوال میں سائنسی ثبوت سے آپ کی کیا مراد ہے! یہ بات واضح نہیں ہے۔ اگر سائنسی ثبوت سے آپ کی مراد ہے کوئی حسی ثبوت۔ حواس خمسہ کی گرفت میں آنے والی کوئی چیز جو اس کی گواہی بن سکے، تو اس کا جواب تو نفی اور انکار میں ہے۔ اس لئے کہ ایمان بالآخرہ بھی دوسرے ایمانیات کی طرح ایمان بالغیب کی ایک شق ہے۔ اس میں انسان کے حواس خمسہ کا عمل دخل نہیں ہو سکتا۔ البتہ آپ کو علم ہو گا کہ Social Sciences. بھی باقاعدہ Sciences, ہیں۔ منطق بھی سائنس ہے، فلسفہ بھی سائنس ہے، عمرانیات بھی سائنس ہے۔ اس پہلو سے ان دو آیات کے مطالعہ سے جو بات سامنے آئی ہے، وہ یقیناً ایک سائنسی ثبوت ہے۔ چونکہ جب ہم غور کرتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں، اس کے باطن میں خیر و شر، نیکی و بدی کا شعور ہے اور اس زندگی میں ان کے نتائج یا تو الٹے نکل رہے ہیں۔ یا بالکل نہیں نکل رہے۔ یا اگر نکلتے بھی ہیں تو نیکی یا بدی کے تناسب و نسبت سے نہیں نکلتے۔ لہٰذا آپ سے آپ ثابت ہوتا ہے کہ ایک دوسری زندگی ہونی چاہیئے، جس میں انسانی زندگی کے اعمال کی جزا یا سزا پورے طور پر ظہور پذیر ہو سکے۔ چنانچہ میں تو اس کو ایک سائنسی دلیل ہی قرار دوں گا۔

حضرات! آج ہم نے سورہ قیامہ کی پہلی دو آیات پر غور کیا جو دو قسموں پر مشتمل ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اثباتِ قیامت کے لئے مثبت دلائل کو بڑی جامعیت اور اختصار کے ساتھ پیش فرما دیا ہے۔ اب آگے اصلاً مخاطبین اور منکرین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ خطیبانہ انداز میں، جوش و خروش کے ساتھ۔ اس پر ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ نشست میں گفتگو ہو گی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

---

(۴) نشست ۲۷

السلام علیکم! نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی۔

حضرات! گذشتہ نشست میں پوری سورہ قیامہ کی تلاوت آپ نے سماعت

فرمائی تھی اور اس کا رواں ترجمہ بھی آپکے سامنے آگیا تھا - میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ اس سورہ کے موٹے موٹے مضامین اور نکات آپ حضرات کے ذہن میں محفوظ ہوں گے - میں تین باتوں کی طرف آج آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں -

پہلی یہ بات تو عرض کی جا چکی ہے کہ سورہ قیامہ کا اسلوب بالکل ایک خطبہ کے مانند ہے - خطیب کے سامنے وہ لوگ ہیں جو قیامت اور آخرت کا انکار کر رہے ہیں - اور اسکے ضمن میں انکے کچھ شبہات ہیں، ان کے کچھ اعتراضات ہیں جو انہوں نے وارد کئے ہیں - ان کا جواب دینا خطیب کے پیشِ نظر ہے - پہلے یہ جان لیجئے کہ منکرینِ قیامت اور آخرت کی دلیل کیا تھی - ؟

قرآنِ مجید میں بار بار ان کی یہ دلیل پیش ہوتی ہے کہ وہ اس کو محال سمجھتے تھے - ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ جب سب لوگ مٹی ہو کر مٹی میں مِل جائیں گے - حضرت آدمؑ سے لے کر تا قیامِ قیامت تمام انسان دوبارہ کیسے زندہ کئے جاسکتے ہیں - چنانچہ کہیں ان کے الفاظ نقل ہوئے - ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذَالِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ "کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو پھر ہمیں اٹھا لیا جائے گا ؟ یہ تو بہت دُور کی بات معلوم ہوتی ہے" یہ لوٹنا قرینِ قیاس نظر نہیں آتا - کہیں ان کا یہ قول نقل ہوا : ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ "جب ہماری ہڈیاں گل سڑ جائیں گی کیا اس کے بعد بھی ہمیں اٹھایا جاسکے گا ؟ کہتے ہیں کہ یہ دوبارہ اٹھایا جانا تو پھر بڑے گھاٹے کا معاملہ ہوگا !" یہ گویا بعث بعد الموت پر ان کا طنز ہے - کہیں ان کا تبصرہ نقل ہوا ہے : هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ "بڑی دُور کی بات ہے، بڑی اَن ہونی بات ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے" کہیں ان کے الفاظ ہیں : وَقَالُوْا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ "وہ کہتے ہیں کہ جب ہم صرف ہڈیاں ہوں گے گلی سڑی تو کیا پھر ہمیں دوبارہ پیدا کر کے اٹھا لیا جائے گا - ؟" - ان کے اس استفہامی انداز میں طنز اور انکار مضمر ہے - وہ ایسا ہونا امرِ محال سمجھتے تھے -

سورہ قیامہ میں دو قسموں کے بعد، جن کے بارے میں، مَیں عرض کر چکا ہوں کہ اس اسلوب میں تو قرآن مجید کا مثبت استدلال جامعیت کے ساتھ آگیا۔ اب ان کے اعتراضات، ان کے شبہات، ان کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا: اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ؕ "کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟" اس کے جوابات اس سورہ مبارکہ میں دیئے گئے ہیں، ان کے متعلق جان لیجئے کہ وہ بھی دو نوعیت کے ہیں۔ ایک وہی خطابی انداز کا جواب، اذعانی وایقانی انداز کا جواب: بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰۤی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ؕ "کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس کی ایک ایک پور کو برابر کردیں" ۔۔۔ یہاں، جیسا کہ میں نے پچھلی مرتبہ عرض کیا تھا، اصل وزن متکلم کی شخصیت کا ہے۔ کہنے والا کس یقین سے کہہ رہا ہے۔ کس اذعانی کیفیت کے ساتھ کہہ رہا ہے بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰۤی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ؕ یقیناً ہم کو اس پر کامل قدرت حاصل ہے کہ ہڈیاں تو ہڈیاں ہم انکی ایک ایک پور کو درست کردیں ۔۔۔ بظاہر تو صرف ایک دلیلِ خطابی ہے۔ لیکن غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک منطقی دلیل بھی مضمر ہے۔ وہ منطقی دلیل یہ ہے کہ مخاطب اس بات پر غور کرے کہ آیا وہ اللہ کو بھی مانتا ہے یا نہیں۔! اگر تو وہ اللہ ہی کو نہیں مانتا تو اس سے قیامت اور بعثِ بعد الموت کے بارے میں گفتگو بیکار ہے بے معنی ہے۔ ایسے شخص سے پہلی گفتگو تو وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہوگی۔ لیکن اگر وہ اقرار کرے کہ وہ اللہ کو مانتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ اللہ کو عاجز یا لاچار مانتا ہے یا عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ مانتا ہے! اگر اس نے اللہ کو Omini-potent مانا ہے۔ علٰی کل شیءٍ قدیر مانا ہے تو اب اس کا اعتراض خود بخود ہوا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو پھر تمہارا اعتراض کس بات پر ہے تمہارے تمام شکوک وشبہات کے غبارے کی ہوا خود نکل گئی۔ اب تمام اعتراضات کے منطقی جواب تک تم خود پہنچ سکتے ہو۔ اگر اللہ کے وجود سے انکار ہے تو پہلے گفتگو ہوگی وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں اس کی صفاتِ کاملہ کے بارے میں ۔۔ اگر مانتے ہو اور مانتے

علیٰ کل شیٍٔ قدیر تسلیم کرتے ہو تو اب تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جو علیٰ کل شیٍٔ قدیر ہے وہی ہے جو مردوں کو دوبارہ زندہ کردے گا۔

دوسری دلیل انسان کے مشاہدات سے دی گئی ہے۔ یہ دلیل اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں وارد ہوئی ہے کہ "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائیگا۔ ذرا غور تو کرو۔ انسان خود اپنی تخلیق پر غور کرے، اپنی اس تخلیق کے اس حصے پر جو اس کے علم میں ہے۔ انسان جانتا ہے کہ اس کا آغاز ایک گندے پانی کی بوند سے ہوا جو ٹپکائی گئی۔ پھر اس بوند نے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ پھر اسی لوتھڑے کے اندر سے یہ تمام اعضاء و جوارح، یہ سماعت و بصارت، یہ شعور و ادراک، یہ عقل و فہم یہ انسان کی حیرت انگیز اور حیران کن مشینری وجود میں آئی۔ اس کی تخلیق بھی ہوئی اس کا تسویہ بھی ہوا۔ اس کی نوک پلک سنواری گئی۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھکر اسی ایک بوند سے جس میں بڑی سے بڑی Microscope بھی تاحال کوئی فرق نہیں کر سکے گی کسی کو نر بنا دیا کسی کو مادہ بنا دیا۔ پھر ان کا جسمانی نظام کتنا مختلف ہے نہ صرف جسمانی بلکہ نفسیاتی ساخت میں عورت و مرد کے مابین کتنا مختلف ہے! اللہ تعالےٰ کی یہ ساری خلاقی تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس سب کو دیکھ کر بھی تمہیں اب بھی یہ وسوسے لاحق ہوتا ہے اور یہ شبہ اور یہ اعتراض تمہارے ذہنوں میں آتا ہے کہ وہ اللہ کیا اس پر قادر نہیں ہوگا کہ وہ مردوں کو زندہ کر سکے! یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے لئے اس سورہ مبارکہ کی آخری یہ آیات پیشِ نظر رکھیئے:

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ۝ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۝

یہ ہے استشہادی دلیل۔ انسان کے مشاہدے سے ایک دلیل لاکر ان کے وسوسے اور ان کے اعتراض کا ابطال کیا جا رہا ہے۔ ان کا اعتراض منطقی نہیں ہے۔ ان کا اعتراض فلسفیانہ نہیں ہے۔ فلسفہ کے اعتبار سے تو وہ بھی ماننے پر مجبور ہوں گے کہ ہم

کا بدلہ بھلا ملنا چاہیئے ۔ گندم از گندم بروید جوز جو ۔ بدی کی سزا ملنی چاہیئے ۔ دنیا میں نہیں مل رہی تو دوسری زندگی ہونی چاہیئے اس کا عقل تقاضا کرتی ہے فطرت مطالبہ کرتی ہے ۔ ان کو جو اشکال تھا وہ اس کے محال ہونے کے بارے میں تھا ۔ کیسے ہوگا کہ انسان جو مر کر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے ۔ اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ جاتی ہیں وہ دوبارہ زندہ اٹھایا جائے ۔ !

اس کا جواب ایک تو اس خطابی انداز میں دے دیا : بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ۔ جس میں یہ منطقی دلیل بھی مضمر ہے کہ جب تم نے اللہ کو مانا اور اُسے عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ مانا تو اب تمہارے پاس اعتراض کی کوئی بنیاد باقی نہیں ہے دوسرا جواب انسان کی اس تخلیقِ اُولیٰ سے دیا گیا کہ ذرا اندازہ تو کرو اس ہستی کی خلاقی کا ، اسکی قدرت کا ۔ کیا تم اس سے یہ بعید سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا !! ظاہر بات ہے کہ اس کا جواب ہر سلیم الفطرت اور ہر سلیم العقل انسان اثبات میں دے گا ۔ اور یہی بات ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی اور آپؐ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ اس سورت کے اختتام پر آپؐ فوراً فرمایا کرتے تھے : بَلٰی وَ رَبِّنَا ۔ "اے پروردگار ! ہم اس پر گواہ ہیں کہ تو مردوں کو زندہ کر سکتا ہے "۔

اس سورۂ مبارکہ میں جو دوسرا اہم مضمون آیا وہ یہ کہ اگر ان کا یہ اعتراض باطل ہے تو پھر ان کے انکار کا اصل سبب کیا ہے ! یہ آخرت کے منکر کیوں ہیں !! اس کو تسلیم کیوں نہیں کر رہے !!! ـــ اس کا بہت ہی اہم اور بہت بنیادی جواب دیا گیا :

بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ ۔

اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ انسان جب فسق و فجور کا عادی ہو جاتا ہے ۔ حرام خوری کی جب اُسے عادت پڑ چکی ہوتی ہے ۔ حرام کی کمائی سے حاصل ہونے والے عیش کا جب وہ خوگر ہو جاتا ہے ۔ لذات کوشی جب اس کی گھٹی میں رچ بس جاتی ہے ۔ تو اب ان سب کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا ۔ اگر آخرت کو مانے تو اُسے

حلال و حرام میں تمیز کرنی پڑے گی - جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ رکھنا پڑے گا - وہ جو کہاوت ہے کہ کبوتر جب بلی کو دیکھتا ہے تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے حالانکہ کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی معدوم نہیں ہو جاتی - لیکن یہ کہ کبوتر اس خطرے کی تاب نہیں لا سکتا لہٰذا اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے - بالکل یہی نفسیاتی کیفیت ہے ان منکرینِ آخرت کی کہ یہ جس فسق و فجور کے عادی ہو چکے ہیں - جس کو چھوڑنے کے لئے یہ تیار نہیں ہیں، اس کو جاری رکھنے کے لئے یہ آخرت ہی کا انکار کر رہے ہیں - اسی میں انہوں نے اپنے لئے عافیت سمجھی ہے کہ آخرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں -

ایک دوسرا سبب یہ ارشاد فرمایا گیا جو اسی تصویر کا دوسرا رُخ ہے -

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝

اصل سبب تمہاری گمراہی کا یہ بھی ہے کہ تم عاجلہ سے محبت کرتے ہو - تم اس کے پرستار بن گئے ہو - لفظِ عاجلہ عجلت سے بنا ہے مراد اس سے دُنیا ہے - اس لئے کہ اس کا نفع بھی نقد ہے، نقصان بھی نقد ہے - اس کی لذتیں بھی محسوس ہیں اور اس کی کلفتیں بھی فوری اثر کرنے والی ہوتی ہیں - یہ دنیا کی زندگی عاجلہ ہے - تم اس عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو اور آخرت کی زندگی کو نظر انداز کرتے ہو - اُسے فراموش کر دیتے ہیں -- اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ کوتاہ بین ہوتے ہیں - جو فوری لذتوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے - فوری آسائشوں کو قربان نہیں کر سکتے، وہ آگے نہیں بڑھ سکتے - جنہیں آگے بڑھنا ہوتا ہے، جو دور اندیش ہیں - جن کی نگاہ دُور بین ہے وہ راحت و آرام کو تج کر محنت کرتے ہیں - راتوں کو جاگتے ہیں تاکہ اپنے دنیوی مستقبل کو اپنے Career کو روشن کر سکیں - تو جو لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے، وہ دُنیا میں بھی پیچھے رہ جاتے ہیں - اسی طرح جو لوگ دنیا کی فوری لذت اور عیش و راحت کو تج دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے - جو اس عاجلہ کی محبت میں اس کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں - اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آخرت کو نظر انداز کرتے ہیں - اُس انجام سے غافل ہو جاتے ہیں جس سے بہر حال ہر ذی نفس کو حیاتِ اُخروی میں سابقہ پیش آ کر رہے گا - اسی رویّہ کو اچھے انداز سے اس شعر میں پیش کیا گیا ہے -

اب تو آرام سے گزرتی ہے
آخرت کی خبر خدا جانے

اس شعر میں اسی نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔
اس سورۂ مبارکہ میں انکارِ قیامت کا جو تیسرا سبب بتایا گیا ہے وہ تکبر ہے:
فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۔ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۔ ثُمَّ ذَھَبَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ یَتَمَطّٰی ۔ "پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی۔ بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا" ــ اگر انسان تصدیق کرے تو گویا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لی۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ تابعین کرامؒ میں سے جن حضرات کو تفسیرِ قرآن سے خصوصی شغف تھا وہ کہتے ہیں کہ یہاں اگرچہ الفاظ عام ہیں اور ان میں ایک عام متکبر انسان کی نقشہ کشی کی گئی ہے لیکن یہاں معین طور پر ابوجہل مراد ہے اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کے اعتراض کا "تکذیب کا" انکار کا سب سے بڑا سبب تکبر تھا۔ وہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نیچا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ فَلَا صَدَّقَ ــ اب اگر وہ نبی اکرمؐ کی تصدیق کرتا ہے جو خبریں دے رہے ہیں وقوعِ قیامت کی ــ تو وقوعِ قیامت کی تصدیق کرنے کے معنی نبیؐ کے سامنے جھکنے کے ہیں۔ اس کے لئے اسکی متکبرانہ طبیعت آمادہ نہیں ــ نماز پڑھے گا تو اللہ کے سامنے جھکنا ہوتا ہے۔ اسکی اکڑی ہوئی گردن اپنے خالق کے سامنے جھکنے کے لئے بھی تیار نہیں ــ اس لئے کہ اس طرح توحید کو تسلیم کرنا ہوگا اور توحید پر ایمان کی دعوت لے کر آتے ہیں۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بنو ہاشم کے فرد ہیں۔ وہ قبائلی عصبیت اور اپنے ذاتی پندار کے باعث اس کے لئے تیار نہیں کہ بنو ہاشم کے فرد کی نبوت و رسالت کی تصدیق کرے ــ لہٰذا اس کی گمراہی کا سب سے بڑا سبب ہی تکبر بن گیا۔

ایسی مختصر سی کسی نشست میں تسلسل کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ کے تمام مضامین کا مطالعہ اور احاطہ ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میں سورہ مبارکہ کے مطالبِ معانی اور مفاہیم کا تجزیہ بیان کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں ــ اب اس سورہ مبارکہ کے مضامین کے تیسرے

ہے کے متعلق میں اختصار سے اہم باتیں عرض کئے دیتا ہوں -
تین مختلف مواقع کی ایسی تصویر عالم کی گئی ہے کہ نگاہوں کے سامنے پورا نقشہ
آجاتا ہے - ایک نقشہ ہے السّاعۃ کا - وہ بڑی ہلچل جو اس کائنات کے نظام
میں آنے والی ہے، جس کے بارے میں سورۂ حج میں فرمایا: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا
رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ "لوگو اپنے
پروردگار کا تقوٰی اختیار کرو، اسکی نافرمانی سے بچو، حقیقت یہ ہے الساعۃ
کا زلزلہ بڑا خوفناک چیز ہوگا - بہت بڑا حادثہ ہوگا" یہ قیامت کی آمد کا پہلا نقشہ
ہے جسے قرآن مجید یہاں الساعۃ سے موسوم کرتا ہے - اسی کو القارعۃ، الحاقۃ،
الطاغیہ اور الطامۃ الکبریٰ بھی فرمایا گیا ہے - اسی الساعۃ کا نقشہ اس سورہ
مبارکہ میں یوں کھینچا گیا: فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝ —
"جب نگاہ چندھیا جائے گی - چاند بے نور ہو جائے گا - سورج اور چاند یک جا کر دئیے
جائیں گے" - معلوم ہوتا ہے کہ کششِ ثقل کا جو باہمی نظام ہے، اس کا معاملہ درہم
برہم ہو جائے گا - اور یہ بڑے بڑے کرّے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے اور
چاند سورج میں دھنس جائے گا تو یہ اس الساعۃ کے ابتدائی احوال ہیں جب یہ کیفیت
نظر آئے گی تو یہی انسان جو اس وقت اکڑ رہا ہے، بڑے متکبرانہ انداز میں
Challange کر رہا ہے کہ کب ہوگا قیامت کا دن! یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ۝
— اُس روز اس کی گھگھی بنی ہوئی ہوگی اور اُس روز یہی انسان کہہ رہا ہوگا - ہے
کوئی پناہ گاہ! ہے کوئی جائے فرار!!" — كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ یَوْمَىِٕذِ
الْمُسْتَقَرُّ ۝ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝ "ہرگز نہیں!
اس روز کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی - اس روز رلے نی، تیرے رب ہی کے سامنے جاکر
ٹھہرنا ہوگا - اُس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا جتلا دیا جائے گا" -
ایک نقشہ تو یہ کھینچا گیا -
دوسرا نقشہ ہے - یَوْمُ الْقِیٰمَةِ کا - جس روز لوگ اپنے پروردگار کے
حضور کھڑے ہوں گے - نتیجے کا اعلان ہونے والا ہوگا - جیسے کہ آپکے اسکولوں میں

دیکھا ہوگا کہ جس روز سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے تو طالبعلم جب کھڑے ہوتے ہیں تو نتیجہ انکے اپنے چہروں پر لکھا ہوتا ہے جو پاس ہونے والے ہیں، جن کو معلوم ہے کہ ہم کیا کر کے آئے ہیں۔ ان کے چہرے تر و تازہ ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اور جنہیں معلوم ہے کہ ہم فیل ہونے والے ہیں جیسا کہ اسی سورہ مبارکہ کی آیات نمبر ۱۴، ۱۵ میں فرمایا: بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝ ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے یا وہ کہاں کھڑا ہے! اور چاہے وہ کتنے ہی بہانے تراشے، معذرتیں پیش کرے لیکن وہ اپنی تمام باطنی کیفیات، اپنے اصل محرکاتِ عمل کو اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا بارہ گاہ رب العزت میں جب وہ کھڑے ہونگے تو ان کے چہروں پہ ان کا انجام، ان کے امتحان کا نتیجہ لکھا ہوگا: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ "اس روز بہت سے چہرے ہونگے تر و تازہ اور شاداں"۔ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ "اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار۔ اپنے پروردگار کی رحمت کا انتظار کرتے ہوئے"۔ اور اس روز کچھ چہرے ہوں گے: وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۝ "سوکھے ہوئے، اداس، پریشان و افسردہ"۔ تَظُنُّ أَن يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝ "ان کے چہروں پر یہ خوف طاری ہوگا کہ اب ہمارے ساتھ کمر کو توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے۔"

تیسرا نقشہ جو کھینچا گیا ہے، وہ ہے قیامتِ صغریٰ کا نقشہ عالمِ نزاع کا نقشہ موت کا۔ موت کے وقت کا نقشہ۔ انسان کی موت درحقیقت قیامتِ صغریٰ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ "جو مر گیا اس کی قیامت تو واقع ہو گئی"۔ مہلتِ عمل ختم ہوئی۔ جیسے کہ امتحان گاہ میں کہا جاتا ہے کہ وقت ختم ہو گیا لکھنا بند کر دیا جائے، قلم رکھ دیئے جائیں۔ تو یہ موت درحقیقت اس مہلتِ عمل کے خاتمے کا نام ہے۔ اس وقت کا نقشہ کھینچا گیا: كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ "جس دن کہ جان ہنسلیوں میں آن پھنسے گی اور کہا جائے گا ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا!"۔ ساری تدبیریں ناکام ہو چکیں، معالج جواب دے چکے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس موقع پر بڑے سے بڑا Rationalist اور بڑے سے بڑا پھنے خاں بھی اس تگ و دو میں لگ

جاتا ہے کہ کوئی ٹوٹا کوئی ٹوٹکا کام کر جائے، کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہی اگر جان
بچالے۔ لیکن اس وقت صورتِ واقعہ یہ ہوگی کہ یقین ہو جائے گا کہ اب جدائی کا
وقت آن پہنچا ہے: وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ "اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹی ہوگی"
وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ یہ موت کے وقت کی مختلف حالتوں میں سے ایک
حالت کے لئے استعارہ ہے۔ اس روز کہہ دیا جائے گا کہ: اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ
الْمَسَاقُ ۝ "آج تو اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے، چار و ناچار، کشاں کشاں"۔
یہ تین نقشے ہیں۔ ان نقشوں کو پیش کرنے سے جو مطلوب و مقصود ہے جو اس
کا حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کے منکر ہیں جو کبوتر کے مانند اپنی آنکھیں بند
کئے ہوئے ہیں، جو اپنی فطرت کی گواہی پر غور نہیں کر رہے۔ اپنے ضمیر کی پکار کو نہیں
سن رہے۔ اس کی خلش پر دھیان نہیں دے رہے۔ اس کی ملامت کی پرواہ نہیں
کر رہے۔ جو عقل و شعور سے کام نہیں لے رہے اور جو ان واقعات سے جن کا ہونا حتمی
و یقینی ہے۔ جیسا سورہ ذاریات میں فرمایا گیا: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ
الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝ "بلاشبہ تم سے جو وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ سچا ہے، حق ہے اور
یقیناً جزا و سزا کا دن واقع ہو کر رہے گا"۔ ان سے اپنی نگاہوں کو بالکل دور رکھے
ہوئے ہیں۔ ان کے لئے افسوس ہے، ہلاکت ہے، بربادی ہے:

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝

اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے اور ہمارے دلوں میں وقوعِ قیامت
اور آخرت کا یقین پیدا بھی فرما دے اور اسے اپنی رحمتِ کاملہ سے راسخ اور پختہ بھی
فرما دے۔ اب آج کے اس بیان کے ضمن میں کوئی سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک صحیح العقل انسان اور ایک فاتر العقل انسان کے
محاسبے میں کوئی فرق ہوگا یا دونوں کا ایک جیسا محاسبہ ہوگا؟

جواب: نہیں یہ تو بالکل خلافِ عقل بات ہوگی کہ ان کا محاسبہ ایک ہی سطح
پر ہو۔ مجنون اور فاتر العقل انسان کے بارے میں جان لیجئے کہ دینی اصطلاح وہ مرفوع

المقلم ہے۔ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے ۔ وہ حساب کتاب سے بری ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک شخص ساری زندگی برائی کرتا ہے اور عیش و عشرت میں پڑا رہتا ہے۔ لیکن جب وہ بسترِ مرگ پر پڑا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ توبہ استغفار کرتا ہے تو کیا اس کی توبہ قبول ہوگی ۔؟

جواب: یہ بہت صحیح سوال ہے ۔ اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں ہوتی، جس پر موت کے آثار شروع ہو چکے ہوں ۔ سورہ نساء میں اس کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:
اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ لَیَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ۔ "بے شک اللہ جو بڑی عزت و جلالت کی شان کا حامل ہے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک نزع کا گھنگرو اس کے حلق میں بولنے نہ لگے" معلوم ہوا کہ جب تک موت کے آثار شروع نہیں ہوتے اور عالمِ نزع طاری نہیں ہوتا، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے ۔ جب موت کے آثار شروع ہو جائیں تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔
اب تو گویا کہ امتحان کی مدت ختم ہو رہی ہے ۔ مہلتِ عمل تمام ہو رہی ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! فلسفۂ ارتقا کے بعض حاملین کے نزدیک روزِ قیامت دراصل وہ ہوگا ۔ جس دن خالق اور مخلوق آپس میں سما جائیں گے اور اس طرح سے تخلیقِ آدم کا مقصد پورا پورا ہو جائے گا ۔ اس کیفیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب: اوّل تو میرے علم میں نہیں ہے کہ فلسفۂ ارتقاء کے کن حاملین کا یہ خیال ہے ۔ بعض صوفیوں سے یہ بات البتہ منسوب ہے کہ ان کے خیال میں یہ کیفیت ہونے والی ہے کہ بالآخر یہ سلسلہ وجود پھر اپنے خالق کے ساتھ متحد ہو جائیگا۔ جیسے ایک قطرہ سمندر میں شامل ہو جائے لیکن یہ محض ایک خیال ہی ہے ۔ ہمارے دین میں جو باتیں ہمیں واضح طور پر بتائی گئی ہیں ، ان میں اس خیال کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے ۔ حتمی طور پر دین یہ تعلیم دیتا ہے کہ اس دُنیا کے بعد آخرت کا مرحلہ لازماً آنے والا ہے ۔ وہ تو واقع ہو کر رہے گا ۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے ۔ سورہ تغابن کے مطالعہ کے دوران ہم پڑھ چکے ہیں کہ نبی

اکرم سے فرمایا گیا: قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۔ اسی ضمن میں، میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبے کا بھی حوالہ دیا تھا، جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ: وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّ بِالسُّوْءِ سُوْءً وَاِنَّھَا الْجَنَّۃُ اَبَدًا اَوْ نَارٌ اَبَدًا ۔ "خدا کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے روزانہ سو جاتے ہو! پھر لازماً اٹھائے جاؤ گے جیسے ہر صبح بیدار ہو جاتے ہو ۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا ۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی"۔ البتہ اس کے بعد بھی کیا کچھ مراحل ممکن ہیں! ان کو قرآن مجید زیر بحث نہیں لایا ۔ جبکہ آخرت کے متعلق واضح نصوص کتاب وسنّت میں موجود ہیں ۔ ان کو عقلی دلائل یا قرآن کے محض کسی اشارے کی بنا پر درمیان میں سے نکال دینا صریح طور پر گمراہی ہو گی ۔

حضرات! آج ہم نے سورۃ قیامہ پر غور ایک حد تک مکمل کر لیا ہے ۔ البتہ اس سورۂ مبارکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرما کر جو نہایت اہم باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، وہ اس بات کی متقاضی اور مستحق ہیں کہ ہم اس پر ایک پوری نشست مزید لگائیں ۔ ان شاء اللہ آئندہ نشست میں ان آیات پر گفتگو ہو گی ۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ٥

(۵) ـــــ نشست ۲۵ ـــــ

السّلام علیکم! ۔ نحمدہ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ۔ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ٥ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ٥ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ٥ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ٥

ـــــ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ـــــ

"نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)، آپ اس قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو تیز

سے حرکت مت دیجیے کہ اسے جلدی سے حاصل کر لیں۔ ہمارے ذمہ ہے اسے جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا۔ تو پھر جب ہم پڑھائیں تو آپ اسی کے پڑھنے کی پیروی کیجیے۔ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی مزید تشریح اور توضیح بھی۔"

محترم حاضرین و معزز ناظرین ۔

یہ سورہ قیامہ کی چار آیات ہیں، آیات نمبر ۱۶ تا ۱۹ ۔ اگرچہ بحیثیت مجموعی سورہ قیامہ پر ہم اپنی گفتگو مکمل کر چکے ہیں اور اس کا جو اصل مضمون ہے یعنی اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے ضمن میں منکرینِ قیامت کے اعتراضات و شبہات کا جواب تو وہ بحث مکمل ہو چکی ہے لیکن اس سورۃ مبارکہ میں ایک اہم مضمون ضمناً آیا ہے آج ہم اس پر غور کریں گے ۔

یہ بات تو ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن مجید کا اسلوب چونکہ خطبہ کا ہے اور خطبہ میں تحویلِ خطاب ہوتا ہے کہ ابھی خطیب کسی ایک جانب مخاطب ہے پھر اس کا خطاب دوسری جانب ہو گیا۔ کبھی وہ حاضر کو غائب فرض کر کے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ کبھی غائب کو حاضر فرض کر کے گفتگو شروع کرتا ہے۔ تو سورہ قیامہ میں ساری گفتگو تو منکرینِ قیامت کے ساتھ ہے۔ لیکن درمیان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرما کر بہت ہی اہم امور ہیں، جنہیں بیان فرما دیا گیا ۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھیے کہ اس سورہ مبارکہ کا جو اصل مضمون ہے، اس کے ساتھ اس گفتگو کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لئے کہ چاہے کوئی بات ضمناً آئی ہو لیکن ظاہر بات ہے کہ اس سورہ مبارکہ کا جو عمود ہے، جو مرکزی مضمون ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی ربط و تعلق ہونا ضروری ہے ۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ مبارکہ میں لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب بیان فرمایا گیا حُبِّ عاجلہ: كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۙ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۙ "تمہاری اصل گمراہی یہ ہے" یا یوں کہیے کہ تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو۔ اور عاجلہ سے مراد ہے یہ دنیا۔ جس کی لذتیں بھی فوراً محسوس ہوتی ہیں، اور اس کی کلفتیں اور اذیتیں بھی فوری طور پر انسان محسوس کرتا ہے، جس کا نفع بھی نقد ہے اور نقصان بھی نقد ہے ۔ جب یہ عاجلہ یہ جلدی والی چیز انسان کا اصل مطلوب اور مقصود بن

تی ہے تو ظاہر بات ہے کہ جو وسیع ترین حقائق ہیں یا بلند ترین حقائق ہیں
ی سے نگاہیں خود بخود محجوب ہو جاتی ہیں۔ وہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے
ں اور یہ اصل سبب ہے انسان کی گمراہی کا۔

یہاں ایک چھوٹی اور ہلکی لفظی مناسبت سے بات کا رُخ حضورؐ کی طرف موڑ دیا
یا: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ — اے نبی آپ اپنی زبان مبارک
و تیزی سے حرکت نہ دیں کہ قرآن مجید کو جلدی سے یاد کر لیں — اب رہا یہ معاملہ
ر انسان اس عاجلہ یعنی دنیا کا پرستار بن گیا ہو تو اس کی ہلاکت خیزی، اسکی خطرناکی
اور اسکی انسان کے حق میں مہلک ہونے کی کیفیت اظہر من الشمس ہے — یہاں اشارہ
کر دیا گیا کہ "جلدی" وہ چیز ہے۔ جو خیر کے لئے بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ نیکی اور بھلائی
یں بھی عجلت پسندی یہ مطلوب شے نہیں ہے۔ بلکہ خیر میں، نیکی میں اور بھلائی میں
بھی تدریج پیش رہنی چاہیئے — سہج پکے سو میٹھا ہو — ہر کام کو مہلت کے ساتھ اور اس
پر مناسب توجہ، ہمت اور محنت صرف کر کے اُسے مکمل کیا جائے۔ تب ہی کام صحیح ہوتا
ہے۔ نتائج صحیح نکلتے ہیں۔ تو یہ ایک بڑی لطیف معنوی ربط و تعلق کی بات تھی جس کے
حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کا رُخ مڑ گیا۔

عجلت پسندی کے متعلق یہ جان لیجئے کہ قرآن حکیم اس کو انسان کی طبعی کمزوریوں
میں شمار کرتا ہے چنانچہ سورہ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ
عَجَلٍ ۝ جیسے سورہ نساء میں فرمایا گیا: خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝ "انسان کمزور
پیدا کیا گیا ہے" اس کی خلقت میں بعض پہلو ضعف کے ہیں — اسی طرح فرمایا کہ اس
کی خلقت میں اس کی سرشت میں کچھ عجلت پسندی کا مادّہ موجود ہے۔ یہی بات سورۂ
بنی اسرائیل میں فرمائی: وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ "انسان بہت جلد باز واقع ہوا
ہے" اب دیکھئے کہ اگر اس عجلت پسندی کا رُخ شر کی طرف اور نفس پرستی کی طرف
ہو جائے تو اس کی تباہ کاری، اس کی ہولناکی اور اس کی خطرناکی اظہر من الشمس
ہے ہی۔ لیکن اگر اس عجلت پسندی کا رُخ خیر کی جانب ہو، تب بھی یہ چیز غیر مطلوب
اور ناپسندیدہ ہے۔ اسکی بہت نمایاں مثال سورہ طٰہٰ میں آئی ہے۔ حضرت موسیٰ
علیہ السلام کو جب کوہ طور پہ اللہ تعالیٰ نے طلب فرمایا تو آں جناب وقت مقررہ سے
قبل پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا: وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝

"اے موسیٰ! یہ وقتِ مقررہ سے قبل اپنی قوم کو چھوڑ کر کیوں آ گئے ہو؟" جواباً حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا: قَالَ هُمْ أُولَاءِ عَلَىٰ أَثَرِي "پروردگار وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں"۔ وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ۝ "اور میرے رب! میں تو جلدی کر کے آیا ہوں تاکہ تو راضی ہو جائے"۔ وہ جو ایک مصرعہ ہے ع "تو میرے شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ"۔ اس میں تھوڑا سا تصرف کر لیجیے کہ ع "تو میرا شوق دیکھ میرا اشتیاق دیکھ!" میں تیری ملاقات کے شوق میں جلدی کر کے آ گیا ہوں۔
لیکن اب اللہ تعالیٰ کا جواب سنیے: قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِن بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! اس عجلت کا نتیجہ نکل چکا ہے ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو فتنے میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے"۔ معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ عجلت ضرور تھی لیکن اللہ سے ملاقات کی جلدی تھی، مخاطبہ الٰہی سے شاد کام ہونے کی جلدی تھی۔ لیکن اس کا بھی ایک نتیجہ برآمد ہوا۔ اسی سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرمایا گیا: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِن قَبْلِ أَن يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۝ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)، آپؐ کا ذوق اور آپ کا شوق ہمارے علم میں ہے۔ آپ کا شوق اور اشتیاق اپنی جگہ لیکن نزولِ قرآن کیلئے ہم نے ایک ترتیب اور ایک تدریج معین کر دی ہے۔ آپ اس سے قبل اس قرآن کیلئے جلدی نہ کیجیے۔ جو بھی اس کا وقت ہماری حکمتِ بالغہ میں معین ہے، اسی کے مطابق اس کا نزول ہو گا اور آپ دعا کرتے رہا کیجیے کہ میرے علم میں اور اضافہ فرما"۔ سورہ مریم میں اسی ضمن میں یہ بات بھی آئی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی زبان سے حضورؐ کے شوق و اشتیاق کے سلسلہ میں یہ بات کہلوائی گئی۔ محسوس ہوتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت جبرئیلؑ سے شکوہ کیا ہو گا کہ آپ دیر سے آتے وقفہ دے کر آتے ہیں، ہمیں انتظار رہتا ہے تو جواباً کہلوایا گیا: وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝ "ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اختیار بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اس کا اختیار بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اس کا اختیار بھی کلیتہً اسی کے اختیار میں

۔ اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ یہ تاخیر و تعویق کسی نسیان کے باعث
ہے ۔ اسی سورہ مریم میں حضورؐ سے خطاب کر کے فرمایا گیا: وَلَا تَعْجَلْ
ہِمْ ۔ اور اے نبی! ان کفار کے حق میں بھی کچھ جلدی نہ کیجئے ۔ کہ ہم ان کا جلدی
رچکا دیں ۔ یہ ہماری گرفت میں ہیں ۔ کہیں بھاگ کر نہیں جائیں گے ۔ ہر ایک کو
کے کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے گا ۔ لیکن اس کے لئے بھی ایک مہلت ہمارے
کامل اور ہماری حکمتِ بالغہ میں معین ہے، اس سے پہلے آپ جلدی نہ کیجئے :
نَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۝ — اور جیسے سورۃ الطارق میں ارشاد فرمایا گیا:
مَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ " پس اے نبی ان کافروں کو اک ذرا کی
یان کے حال پر چھوڑ دیجئے، ان کے لئے جو مہلت ہم نے مقرر کر رکھی ہے ذرا اسکو
م ہو لینے دیجئے " ۔ ہمارے علم کامل میں ہر چیز کا ایک وقت معین ہے ۔
تو یہاں پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ : لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝
دو اس عجلت کے لفظ کی لفظی مناسبت کے ساتھ اسے سورہ قیامہ میں جوڑ دیا گیا
ر عجلت پسندی تو وہ شے ہے کہ وہ نیکی اور بھلائی اور خیر کے لئے بھی پسندیدہ نہیں
لا یہ کہ انسان پر اس عجلت پسندی اور جلد بازی کا بھوت اتنا سوار ہو جائے کہ اسکی
ساری جد و جہد اور سعی و محنت کا مقصود و مطلوب صرف یہ عَاجِلَہ یعنی دنیا بن کر رہ
جائے تو اس کے جو نتائج نکلیں گے تو اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو: كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ
الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝
دوسرا اہم مضمون جو یہاں بیان ہوا وہ جمع و حفاظتِ قرآن کا ہے ۔ چونکہ حضورؐ
جو جلدی جلدی زبان کو حرکت دے کر یاد کرنے کی کوشش فرماتے تھے، اس میں یہ اندیشہ
بھی ہوتا تھا کہ میں کہیں کچھ بھول نہ جاؤں ۔ کہیں وحیِ الٰہی کا کچھ حصہ ضائع نہ ہو جائے ۔
اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو کمالِ شفقت کے ساتھ اس سے بری فرما دیا کہ آپ اس مشقت
کو اپنے سر نہ لیں: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ " اس قرآن کو تو جمع کر
دینا اور اس کا پڑھوانا ہمارے ذمے ہے " ۔ اب جمع کرنے کے بارے میں جان لیجئے کہ
اسکی دو صورتیں ہیں ۔ ایک اس کا جمع کر دیا جانا حضورؐ کے سینہ مبارک میں (صلی اللہ
علیہ وسلم) ۔ کہ آپ کبھی نہیں بھولیں گے : سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ " آپ کو ہم
پڑھا دیں گے اور آپ ہرگز نہیں بھولیں گے ۔ آپ مطمئن رہیئے " پھر اسی جمعِ قرآن

کا دوسرا معاملہ ہے اس قرآن کو مصحف کی شکل میں جمع کرنا۔ یہاں معلوم ہوا کہ اس کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے۔ حضورؐ کے سینۂ مبارک میں جب قرآن جمع کیا گیا تو ظاہر بات ہے کہ ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا۔ بلا ترتیب جمع کرنا یہاں مراد نہیں ہے اب یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب نزولی اور ہے اور ترتیب مصحف اور ہے۔ اس میں تو کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ یہ نازل ہوا ایک خاص وقت میں اور خاص حالات کے پس منظر میں۔ اور اُس وقت اس کے نزول کی جو ترتیب ہوئی وہ اس وقت کے حالات سے نہایت مناسبت رکھنے والی ترتیب تھی کہ جیسے جیسے حالات تبدیل ہو رہے ہیں، قرآن مجید کی آیات نازل ہو رہی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بروقت رہنمائی حاصل ہو رہی ہے۔ بروقت تسلی مل رہی ہے، بروقت دلجوئی ہو رہی ہے۔ جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان کے بروقت جوابات مل رہے ہیں۔ تو ترتیب نزولی کی حکمت یہ تھی کہ حضورؐ کی دعوت جن جن مراحل سے گزر رہی ہے، آپؐ کی انقلابی جدوجہد کو جن جن موانع سے سابقہ پیش آ رہا ہے۔ ان کی مناسبت سے آیات اترتی چلی جائیں

لیکن اس کی جو اصل ترتیب ہے، جو مصحف میں بھی ہے اور یہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے۔ یہ ابدی ترتیب ہے۔ یہ وقتی حالات کے تابع نہیں ہے۔ لہٰذا دین میں جو اصل حجت ہے وہ یہ ترتیب ہے اور اسی ترتیب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جمع کیا حضورؐ کے سینۂ مبارک میں، اور حضورؐ نے اسی ترتیب کے ساتھ اُمت کی طرف منتقل فرمایا ہے۔ یہ بات میں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ بعض حضرات کو ان الفاظ سے مغالطہ ہو جاتا ہے کہ جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کہے جاتے ہیں کہ آنجنابؓ "جامع القرآن" ہیں۔ اس سے بعض حضرات اس مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاید یہ قرآن حضرت عثمانؓ نے مرتب کیا ہے۔ یہ جمع و ترتیب حضرت عثمان کی ہے۔ معاذ اللہ۔ حضورؐ نے قرآن موجودہ ترتیب کے مطابق مرتب فرما کر۔ اور یہ حضورؐ کا ذاتی عمل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے ذمے لے رہے ہیں:
اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۝ تو موجودہ ترتیب اور جمع کی شکل درحقیقت حضورؐ کی کی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق — اور جیسے کہ عرض کیا گیا یہی ازلی و ابدی ترتیب ہے جس نے لوحِ محفوظ سے بذریعۂ وحی حضورؐ پر تنزیل پائی ہے

سورت اختیار کی ہے۔ جو اُمّت کے پاس بحمد اللہ بعینہٖ اُسی ترتیب کے ساتھ محفوظ موجود ہے۔ باری تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہ

البتہ یہ ضرور ہے کہ "مَا بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ" یعنی جلد کے درمیان ایک کتاب ہوئی ہے۔ حضورؐ کے زمانے مبارک تک ایک کتاب کی شکل میں قرآن جمع نہیں تھا۔ سورتوں اور آیات کی ترتیب تھی اور اسی ترتیب سے حفاظ کو قرآن مجید یاد تھا۔ اسی ترتیب کے ساتھ رمضان المبارک میں حضور حضرت جبرئیل سے مذاکرہ فرماتے تھے اور حیات طیبہ کا جو آخری رمضان ہے اس میں دو مرتبہ پورا مذاکرہ ہوا۔ تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی ترتیب کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن اس کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ـــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جو بھی کاتبینِ وحی تھے انہیں جمع کر کے حضرت زید ابن ثابتؓ کو ذمہ دار اور ناظم بنا کر اس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیں۔ چنانچہ پورا قرآن کریم جو اسی ترتیب سے حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس جس کے پاس بھی مختلف سورتیں تحریری شکل میں موجود تھیں ان سب کے تعاون سے قرآن مجید کتابی شکل میں جمع ہوا۔

پھر بعد میں اس کے پڑھنے میں اہل عرب کے مختلف لہجے تھے، جیسے پنجابی زبان کے مختلف Dialects ہیں۔ اردو زبان کے مختلف لہجے ہیں۔ لکھنوی لہجہ اور ہے۔ دہلی کا لہجہ اور ہے۔ حیدرآبادی لہجہ اور ہے۔ تو مختلف لہجوں کا اثر اس کی کتابت و قرأت میں بھی آرہا تھا۔ اس کو حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک کتابت پر امت کو جمع کر دیا ہے ـــــــ قرآن مجید کو جمع کرنے والے حضرت عثمانؓ نہیں ہیں بلکہ اُمّت کو قرآن پر جمع کرنا یہ ہے آپ کا کارنامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جس کے لئے واقعہ یہ ہے کہ اُمّت تا قیامِ قیامت ان کے زیر بار احسان رہے گی۔

یہ بات سورہ قیامہ کی ان آیات سے ثابت ہوتی ہے کہ: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ہ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ہ "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا بھی اور اس کا پڑھوانا بھی، تو پھر جب ہم اسے پڑھوا

تو آپ اس ترتیب سے اسے پڑھیئے "۔ ترتیبِ نزولی تو ایک وقتی ضرورت کی بنا تھی جو ختم ہوئی لیکن مستقل ترتیب وہ ہوگی جس ترتیب سے ہم پڑھوائیں گے ۔

اس کے بعد فرمایا کہ : ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ؕ "پھر ہمارے ذمے ہے اس کی تبیین اور توضیح و تشریح بھی" — یہ بہت اہم بات ہے ۔ اس کے دو حصے ہیں اسے کو اچھی طرح جان لیجئے ۔ ایک حصہ تو یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں بعض احکام نازل ہوتے تھے ، یا بعض باتیں بیان ہوتی تھیں ، ان کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے تھے تو بعد میں توضیحی آیات نازل ہوتی تھیں ۔ ایسی آیات بعض اوقات تو اسی حکم کے ساتھ شامل کر دی گئی ہیں بعض اوقات آگے کسی مقامات پر اس کی توضیح کر دی گئی اور بعض اوقات اُسے اسی سورت کے آخر میں شامل کر دیا گیا جس سورت میں وہ بات آئی تھی ۔ اس کو نمایاں مثال سورۂ نساء میں ہے ۔ یہ تینوں مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں ۔ ایسی آیات کے ساتھ آپ اکثر دیکھیں گے کہ یہ الفاظ آتے ہیں : کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ؕ "اس طرح اللہ اپنی آیات کی وضاحت فرما دیتا ہے ۔ تبیین فرما دیتا ہے ۔

ایک تو تبیینِ قرآن یعنی قرآن مجید کی مزید تشریح و توضیح خود قرآن سے ہو گئی اور اس کا دوسرا انتظام یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرضِ منصبی قرار دیا گیا کہ اے نبیؐ ہم نے آپؐ پر جو یہ قرآن نازل فرمایا : وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ "تاکہ آپؐ اس ذکر یعنی قرآن کو واضح کریں ، آپ تبیین کریں ، توضیح کریں ، تشریح کریں ، لوگوں کے لئے اس چیز کی جو ان کے لئے نازل کی گئی ہے — اور یہ جو بعض حضرات کو مغالطہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن مجید پر سُنّتِ رسول اللہ علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام کا اضافہ کیا جائے تو گویا یہ قرآن کی توہین ہے ۔ یہ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مکمل نہیں ہے اور قرآن اپنی وضاحت کے لئے سنت کا محتاج ہے ۔ معاذ اللہ ۔ قرآن کے متعلق یہ تصور ہم ہرگز نہیں رکھ سکتے ۔ اور نہ ہی ہم قرآن کے لئے کسی طور پر بھی لفظ محتاج استعمال نہیں کر سکتے ۔ البتہ یہ ہم ضرور کہیں گے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کے محتاج ہیں ۔ یہ احتیاج ہماری ہے کہ فہمِ قرآن کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوالِ مبارکہ ۔ آپؐ کے افعال ۔ آپؐ نے قرآن مجید پر جس طرح عمل

کر کے دکھایا ہے ۔ تعلیماتِ قرآنی کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دائروں میں بطرزِ Demonstrate کیا ہے ۔ اس کے حوالے سے قرآن کو سمجھیں گے اور اس پر عمل کریں گے اور یہ سنت بھی درحقیقت قرآن مجید ہی کا حصہ ہو گی چونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاموں کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے ۔ تبیین حضورؐ نے فرمائی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے ذمّے لے رہے ہیں ۔ اس کی ایک مثال سورہ انفال سے پیش ہے ۔ وہاں ارشاد فرمایا کہ اے نبی آپؐ نے غزوہ بدر میں کنکریوں کی مٹھی بھر کر جو کفّار کی طرف پھینکی تھی تو اُسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب فرما رہے ہیں : وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ تو معلوم ہوا کہ بظاہر ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ ۔ تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ پر حضورؐ کے کام کو اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں ۔

اس سورہ مبارکہ میں یہ آیات : إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْاٰنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝ اگرچہ سورت کے مرکزی مضمون، اس کے عمود کے اعتبار سے تو ہم کہیں گے کہ ضمناً آئی ہیں ۔ لیکن ویسے یہ آیات نہایت اہمیت کی حامل ہیں ۔ نہایت اساسی امور ہیں جو ان تین چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان فرمائے گئے ہیں ۔ بڑی بنیادی باتیں ہیں جو ان آیات کے ذریعے واضح ہوتی ہیں ۔۔ اس پر سورہ قیامہ کا ہمارا مطالعہ اور اس پر قدرے غور و فکر ختم ہوتا ہے ۔۔ اس ضمن میں جو کچھ آج عرض کیا گیا ہے اس کے متعلق کوئی اشکال یا سوال ہو تو میں حاضر ہوں ۔

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب ! آپ نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات نیک کاموں میں جو عجلت ہوتی ہے وہ اچھی بات نہیں ہے جبکہ قرآن مجید میں آتا ہے : وَسَارِعُوْا إِلٰى مَغْفِرَةٍ اور ایک جگہ آیا ہے : وَسَارِعُوْا فِي الْخَيْرَاتِ ۔ تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب : بہت عمدہ سوال ہے ۔ اصل میں سَارِعُوْا فعل امر ہے ۔ مسابقت سے ۔ باب مُفاعلہ ہے ۔ اس میں اصل مفہوم ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش

اسے عجلت پسندی نہیں کہا جا سکتا ہے ـــ مسابقت کا جذبہ بھی فطرتِ انسانی میں
موجود ہے کہ انسان اپنے دوسرے ہم نوع لوگوں سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید
مسابقت کے اس جذبے کے رُخ کو خیر کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے ـ بجائے دُنیا میں
ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے کے تم بھلائیوں میں، نیکیوں میں، خیر
میں، اچھائیوں میں، عبادات کی بجا آوری میں، دین کے احکام اور اوامر و نواہی
کے اہتمام میں، دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت میں ایک دوسرے سے آگے
نکلنے کی کوشش کرو ـــ اصل میں وَ سَارِعُوْا، کا اصل رُخ ان باتوں کی طرف ہے
باقی ہر کام کے لئے جو اس کی مناسب تدریج ہے ـ اس کے لئے جو مناسب وقت
لگنا چاہیئے اس کا لحاظ ضروری ہے ـ اب اگر نماز ہے اور آپ بہت جلدی جلدی
پڑھ رہے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ نماز نہیں ہوئی
فَصَلِّ، فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ ـــ نماز کے ہر رکن کا حق آپ کو پورے سکون اور
ٹھہراؤ کے ساتھ ادا کرنا ہوگا ـــ اسی طرح نمازِ جمعہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ جب
نمازِ جمعہ کے لئے اذان ہو جائے تو اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ
فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ـ یہاں سعی سے دوڑنا مراد نہیں ہے اس لئے کہ نماز
کے لئے دوڑنے سے حضورؐ نے منع فرمایا ہے ـ یہ وقار اور سکینت کے منافی ہے
لہٰذا یہاں کہا جائے گا کہ اپنے تمام کاموں سے اپنا ذہنی تعلق توڑ کر جمعہ کی نماز کی طرف
لپکو ـ ہمہ تن اُسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ ـــ

حضرات! آج کی اس نشست میں سورہ قیامہ کا مطالعہ اور مختصر وقت میں
اس کے اتھاہ مطالب و مفاہیم پر جس درجے بھی ممکن ہو سکا غور و فکر اختتام پذیر
ہوا ـــ اب آئندہ سبق کے بارے میں نوٹ کر لیجئے کہ سورہ حٰم السجدہ چوبیسویں
پارے میں ہے اس کی آیت ۳۰ تا ۳۶ پر مشتمل ہوگا ـــ آپ حضرات اس کا مطالعہ
کر کے تشریف لائیں اور سامعین کرام اس کا متن سامنے رکھیں گے تو یقیناً اس
کے سمجھنے میں مفید ہوگا ـ

رَبَّنَا زِدْنَا اِيْمَانًا وَّهُدًى وَّعِلْمًا نَافِعًا وَّعَمَلًا صَالِحًا
وَّرِزْقًا حَلَالًا طَيِّبًا ط اٰمِيْنَ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ه

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۵)

غزوۂ بدر، مسلح تصادم کا آغاز

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ فی سورۃ الحج۔

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ

وقال اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فی سورۃ البقرہ۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ

وقال اللہ تعالیٰ فی ھٰذہ السورۃ

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

وقال اللہ تعالیٰ فی سورۃ الصف۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ

صدق اللہ العظیم

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی۔

حضرات! گزشتہ چار جمعوں سے اس اجتماعِ جمعہ میں جو گفتگو چل رہی ہے آپ کو یاد ہوگا کہ اس کا عنوان ہے "اسلامی انقلاب اور اس کے مراحل، مدارج و لوازم" آج اس سلسلہ کی پانچویں تقریر ہے۔ آپ حضرات کے لئے تو ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک مشہور کہاوت کے مطابق "جمعہ جمعہ آٹھ دن" ہوتے ہیں۔ لیکن میں چونکہ ہفتہ کے دوران سفر میں رہتا ہوں۔ لہٰذا مجھے یہ عرصہ بہت طویل محسوس ہوتا ہے اسی لئے میں یہ ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ سابقہ سلسلہ کلام کو ابتداً جوڑ دوں۔ میں

کسی طویل اعادہ کے بجائے صرف چند اہم نکات کا اعادہ کروں گا۔ ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ کسی بھی حقیقی اور واقعی انقلاب کے چھ یا سات مراحل ہیں، اور یہ مراحل درحقیقت میں نے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے اخذ کیے ہیں اس لئے کہ میرے نزدیک حضورؐ کا برپا کیا ہوا انقلاب ایک بھرپور اور کامل انقلاب تھا۔ اور ایک انسانی زندگی میں اُس کے جملہ مراحل طے پا گئے تھے۔ اس اعتبار سے اگر انقلابی عمل کو سمجھنا ہو تو اس کے لئے واحد ذریعہ (Source) سیرۃ النبیؐ ہے۔ اس انقلاب کے تین مراحل تمہیدی و ابتدائی نوعیت کے ہیں اور اندرونِ ملک کی حد تک تین مراحل تکمیلی ہیں۔ پھر ساتواں مرحلہ اس انقلاب کی بیرونِ ملک توسیع کا ہے۔ ورنہ کسی ملک کے اندر انقلاب کے چھ مراحل ہیں۔

پہلا مرحلہ یا پہلا قدم ہے کسی انقلابی نظریہ کی نشر و اشاعت۔ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں اس نظریہ کا ماخذ قرآن ہے۔ جیسے اشتراکی نظریہ کا ماخذ ہے "Das Capital" جو کارل مارکس نے لکھی تھی جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا۔ ع: "نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!"

بہرحال انقلابِ محمدیؐ کے ضمن میں انقلابی نظریے کا ماخذ ہے قرآن۔ تمام تر دعوت و تبلیغ اسی قرآن کے ذریعے سے ہوگی اور اس میں جو مرکزی چیز ہے وہ عقیدۂ توحید ہے۔ اسی کے جو معاشرتی، معاشی اور سیاسی متضمنات، مقتضیات، اور مضمرات، ہیں، ان سب کو جمع کیجئے تو یہ ہے درحقیقت "انقلابِ محمدیؐ کا نظریہ"

پہلا انقلابی قدم ہوگا نظریۂ توحید کی دعوت و تبلیغ بذریعہ قرآن مجید۔

دوسرا مرحلہ یا دوسرا قدم یہ ہوگا کہ جو لوگ اس نظریہ کو تسلیم، اور اس دعوت کو قبول کریں، انہیں منظم کیا جائے۔ اس تنظیم کی بنیاد کے ضمن میں اہم ترین بات یہ ہے کہ جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا وہ ہمہ تن، ہمہ وجود اور ہمہ جہت حضورؐ کا مطیع فرمان ہو گیا، اور جماعت میں شامل ہو گیا۔ یہ سب سے زیادہ فطری اور سب سے زیادہ مضبوط تنظیم ہے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ کسی انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ تنظیم نئی ہو۔ سابقہ نظام میں جو تنظیمی ہیئتیں ہوتی ہیں، ان کے ذریعے انقلاب نہیں آیا کرتا — وہ پھر Coup ہوتا

۔کوئی موجود منظم ادارہ کسی وقت موقع پاکر حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے ملے
ب نہیں کہتے۔ انقلاب کے لئے ایک نئی انقلابی پارٹی کا وجود میں آنا لازمی ہے
ی کہ نئی درجہ بندی ہو، یعنی نئے Cardres ہوں۔ اس میں سابقہ معیارات
بنیاد پر لوگوں کی درجہ بندی نہ ہو بلکہ درجہ بندی کا واحد معیار یہ ہو کہ کون
ں نظریہ سے کتنی گہری وابستگی رکھتا ہے اور اس انقلاب کے لئے کتنی قربانی
سکتا ہے، اور کتنا ایثار کر سکتا ہے۔ کسے باشد! ۔ جو ان اعتبارات سے مستعد
گا وہ آگے آجائے گا۔ چاہے سابقہ نظام میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔
ان معاملات میں پیچھے رہے گا نئے نظام میں اس کا شمار پیچھے رہنے والوں میں
ہوگا۔ خواہ سابقہ نظام میں وہ سرداروں اور چودھریوں میں سے کیوں نہ ہو۔
تیسرا مرحلہ اور قدم ہے تربیت۔ اس لئے کہ جن لوگوں نے اس نظریہ کو
صدقِ دل سے قبول کیا ہے۔ اگر انہیں تیار نہ کیا جائے ان کی تربیت نہ ہو، وہ پختہ
نہ ہوں تو انقلاب نہیں آسکتا۔ واضح رہے کہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحب الصلوٰۃ
والسلام کی تربیت میں روحانی اور اخلاقی اقدار مقدم ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ
حتی الوسع مادی تیاری کا اہتمام بھی کرنا ہوگا۔ چوتھا مرحلہ Passive Resistance
یعنی صبرِ محض کا مرحلہ ہے۔ میں تفصیل کے ساتھ یہ عرض کر چکا ہوں کہ اصل میں
تصادم کا آغاز داعی انقلاب اور اس کی جماعت کی جانب سے ہوتا ہے اس لئے
کہ جس معاشرے میں کوئی داعی انقلاب اپنی دعوت کا آغاز کرتا ہے تو اس معاشرے
کا اپنا ایک تسلسل ہوتا ہے، اس کی بہت سی روایات ہوتی ہیں، جنہیں ایک تقدیس
کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس معاشرے کے رسوم و رواجات کو بھی محترم سمجھا
جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اس معاشرہ میں جو مظلوم ہوتے ہیں وہ بھی اپنی قسمت پر
صابر و شاکر ہو کر قانع ہو چکے ہوتے ہیں وہ اس ماحول کو ذہناً قبول کر چکے
ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس معاشرہ میں جو شخص کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہے کہ یہ
نظام غلط ہے، ظالمانہ ہے، باطل ہے وہ گویا تصادم کا آغاز کر رہا ہے۔ اس
معذرت خواہانہ انداز کو ختم کر دینا چاہیے کہ تصادم مخالفین کی طرف سے ہوتا ہے۔ واضح
رہنا چاہیے کہ اس تصادم کا آغاز کیا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جیسے میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ ایک تالاب ہے جس کی سطح پر کوئی حرکت وارتعاش نہیں ہے ۔ اس میں آپ جب پتھر ماریں گے تو اس میں لہریں اٹھیں گی اور پورے تالاب میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گی ۔ یوں سمجھئے کہ اس معاشرے جس کی رگ و پے میں شرک، بت پرستی، اوہام رچے بسے تھے حضور اکرم صلی اللہ وسلم نے یہ نعرہ لگا کر پہلا پتھر مارا ۔

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔

تمہارے یہ سارے معبود باطل ہیں، تمہارا یہ تمام نظام فاسد اور استحصالی ہے ۔ مکہ کے لوگ خوب سمجھتے تھے کہ اس نعرہ کے معنی کیا ہیں وہ جانتے تھے کہ یہ نعرہ بغاوت ہے ۔ یہ ہمارے نظام کے لئے بڑا خطرناک چیلنج ہے ۔ اب ان کی طرف سے اپنے نظام کے تحفظ کے لئے تشدد شروع ہوا ۔ اس بات کو پیش نظر رکھیئے کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا ۔ انہیں اپنے نظام کا تحفظ کرنا تھا ۔ اپنے مفادات کا تحفظ کرنا تھا ۔

میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ اس تشدد کا آغاز زبانی ایذا سے ہوا ۔ اور اس ایذا رسانی کا اصل ہدف خود صرف حضورؐ کی ذات مبارک تھی ۔ نقل کفر کفر نباشد ۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہنا شروع کیا ۔ پاگل ہو گئے ہیں آسیب کا سایہ ہے ۔ دماغ خراب ہو گیا ہے ۔ شاعر ہیں، کاہن ہیں، ساحر ہیں کوئی عالم فاضل عجمی غلام ہے اُسے گھر میں بند کیا ہوا ہے اس سے (Dictation) املا لیتے ہیں اور ہم پر آ کر دھونس جماتے ہیں کہ مجھ پر آسمان سے یہ وحی نازل ہو رہی ہے ۔ مشرکین مکہ کی یہ تمام باتیں قرآن میں نقل ہوئی ہیں ۔ پھر انہوں نے دوسرے حربے بھی استعمال کیے ہیں : وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ[1] ان سارے ہتھکنڈوں کا مقصد کیا ہوتا ہے کہ داعی اوّل کے اعصاب کو متاثر کر دیا جائے ۔ اس کی ہمت توڑ دی جائے ۔ اس کی قوتِ ارادی میں تزلزل پیدا کر دیا جائے ۔ کردار کشی کی کوشش ایسے ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ

---

[1] اور بالکل قریب تھا کہ کافر آپ کو اپنی تیز نگاہوں سے پھسلا دیں جبکہ انہوں نے قرآن سنا اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے

(Nervous Breakdown) ں طریقے سے داعی اعصاب شکنی

کا شکار ہو جائے تو انقلاب کی ساری بات ختم! دعوت و تبلیغ، وعظ
ت سب کچھ اسی کے دم سے ہوتی ہے۔ لہٰذا پہلے تین سال جو تشدد ہوا
وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا ہے کسی اور پر نہیں ہوا۔ کسی اور سے
ہیں کہا گیا بلکہ اس تمام عرصہ میں حضورؐ ہی کو ہدف بنایا گیا ہے اور آپ کو
ں اذیتیں پہنچائی گئی ہیں۔ آپ کو نفسیاتی کوفت پہنچائی گئی ہے۔ ذہنی
ت اور کوفت پہنچانے کے اس دور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ کو مختلف
لیب سے تسلی دی جاتی رہی ہے: اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿﴾ "اے نبی!
استہزاء اور تمسخر کرنے والوں کے لئے آپؐ کی طرف سے ہم کافی ہیں"۔
ر: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿﴾ "اور اے نبی!
ہمیں خوب معلوم ہے۔ کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپؐ کا سینہ بھنچتا
تنگ ہوتا ہے"۔ یعنی آپ کو صدمہ پہنچتا ہے۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ آیا۔ جب مشرکین نے تجربہ کر لیا کہ اس استہزاء اور
تمسخر سے نہ تو حضورؐ کی ہمت پست ہوئی اور نہ آپؐ کی دعوت رکی بلکہ انہوں
نے دیکھا کہ آپؐ کی دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے تو جسمانی تشدد شروع
ہوا۔ ایمان لانے والوں کو مارو۔ ان کو ستاؤ۔ ان کو دہکتے انگاروں پر لٹاؤ۔
نوجوانوں کو گھروں سے نکال دو۔ یا ان کو خوب اذیت پہنچاؤ۔ جیسے حضرت عثمانؓ
کے ساتھ ہوا کہ انؓ کو ایک چٹائی میں لپیٹ کر انؓ کی ناک میں دھونی دے دی گئی۔
یہ تشدد (Persicution) نبوت کے چوتھے سال سے شروع ہوا اور ۵ نبوی میں
نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ چنانچہ حضورؐ نے چند صحابہؓ کو اجازت دے دی کہ تم حبشہ ہجرت
کر جاؤ۔ اس تشدد کا سلسلہ دس برس تک چلتا رہا ہے۔ اس عرصے کو میں صبر محض
(Passive Resistance) کا دور قرار دیتا ہوں یہ صبر محض کیا ہے! یہ کہ مسلمانوں کو
ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی: كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ۔ اپنے ہاتھ بندھے رکھو،
روکے رکھو۔ ماریں کھاؤ لیکن ڈٹے رہو، قدم پیچھے نہ ہٹے۔ اپنے موقف سے سرمو
انحراف نہ ہو۔ مگر جوابی کاروائی کی اجازت نہیں ہے۔ یہ مرحلہ پورے مکی دور میں

جاری رہا ہے۔

غزوۂ بدر کا پس منظر

اس کے بعد ہجرت کے ساتھ ہی مراحل انقلاب میں سے پانچواں مرحلہ یا پورا کہیے کہ تصادم کا دوسرا مرحلہ (Phase) شروع ہو گیا جس پر تفصیلی گفتگو میں پچھلی مرتبہ کر چکا ہوں: حکم آ گیا: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا "اجازت دے دی گئی ہے ان کو جن پر جنگ ٹھونسی گئی ہے۔ اس لیے کہ ان پر ظلم ہے"۔ یہاں سے جس کا آغاز ہوا اُس کا عنوان ہے 'اقدام'، یعنی (Passive Resistance) — اُس اقدام کی نوعیت کیا تھی! وہ میں گذشتہ مرتبہ تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ ربیع الاوّل ۱ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منوّرہ پہنچے۔ ابتدائی چھ ماہ تک تو آپؐ نے مکہ کے خلاف کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ آپؐ نے پہلے چھ مہینے داخلی استحکام پر صرف فرمائے ہیں۔ سب سے پہلا کام مسجد نبویؐ کی تعمیر یعنی مرکز کا قیام تھا۔ دوسرا کام آپؐ نے یہ کیا کہ انصار اور مہاجرین رضوان اللہ علیہم کے مابین مواخاۃ قائم کی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سگے بھائیوں سے زیادہ مضبوط وہ رشتے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کے درمیان قائم فرمائے۔ اور تیسرا کام تھا یہود کے ساتھ معاہدے اور ان میں ان کو جکڑ لینا۔

ان چھ ماہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمیں بھیجنی شروع کیں۔ پچھلی مرتبہ میں نے آٹھ مہموں کی تفصیلات آپ کے گوش گذار کر دی تھیں۔ ان میں سے چار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تشریف لے گئے لہٰذا انہیں غزوات کہا جائے گا اور چار وہ ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ آپؐ نے دستے بھیجے کسی صحابیؓ کو ان کا سربراہ بنا کر — ایسی مہمات کو سرایا کہا جاتا ہے۔ یہ آٹھ مہمیں ہیں جن میں چار غزوات ہیں اور چار سرایا۔ یہ ہیں اقدامات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ بدر سے پہلے پہلے۔ میں پچھلی مرتبہ یہ بات آپ کو وضاحت سے بتا چکا ہوں کہ جدید اصطلاحات کے حوالے سے ہم یوں کہیں گے کہ حضورؐ نے دو کام بیک وقت کیے۔ ایک تو وہی جس کی دھمکی رئیس خزرج حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ دے کر آئے تھے جس کا ذکر پچھلی مرتبہ تفصیل سے آ چکا ہے کہ وہ (یعنی حضرت سعد) اس دوران مکہ گئے تھے۔ امیہ ابن خلف کے یہاں مقیم ہوئے، جو ان کا حلیف

تھا۔ اس کے ساتھ طواف کے لئے گئے۔ جب ابوجہل نے ان کو دیکھا اور اُسے معلوم ہوا کہ یہ مدینہ کے رہنے والے ہیں تو اس نے طیش میں آکر اُن سے کہا کہ تم وہی ہو جنہوں نے ہمارے بھگوڑوں کو پناہ دی ہے۔ اگر تم امیہ ابن خلف کے حلیف نہ ہوتے تو خدا کی قسم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ اس پر حضرت سعدؓ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ اگر تم نے ہم پر طواف بند کیا تو ہم بھی تمہارے قافلوں کے شام کے راستہ کو تمہارے لئے مخدوش بنا دیں گے۔ اس کو جدید اصطلاح میں ہم کہیں گے Economic Blockade یعنی قریش کی معاشی ناکہ بندی۔ چونکہ ان کی معیشت کا سارا انحصار شام اور یمن کے راستوں سے تجارت پر تھا۔ لہٰذا حضورؐ نے پہلا اقدام یہ کیا کہ ان راستوں پر اپنی Presence یعنی اپنی موجودگی کا احساس دلا کر اُن کے تجارتی راستے کو مخدوش بنا دیا۔ ان اقدامات کا دوسرا مقصد تھا کہ جو قبیلے اس علاقے میں آباد ہیں اُن سے اوّل تو معاہدے کر لیے جائیں اور ان کو مسلمانوں کا حلیف بنا لیا جائے۔ لیکن اگر یہ نہ ہو تو ان کو غیر جانب دار ضرور بنا لیا جائے اور ان کے ساتھ یہ طے ہو جائے کہ وہ قریش کے مقابلے میں نہ مسلمانوں کی مدد کریں گے اور نہ ہی مسلمانوں کے مقابلہ میں قریش کی مدد کریں گے۔ اس علاقے میں جو متعدد قبائل آباد تھے حضورؐ نے ان سے یہ معاہدے کر لئے۔ اس کو جدید اصطلاح میں ہم کہیں گے Political Isolation of Quresh یعنی قریش کی سیاسی ناکہ بندی۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۶۷ء کی جو عرب اور اسرائیل جنگ شروع ہوئی تھی خلیج عقبہ کی ناکہ بندی (Blockade) سے شروع ہوئی تھی۔ صدر ناصر مرحوم نے اسرائیل کی ایلات کی بندرگاہ کو Block کر دیا تھا۔ جس کے ردعمل میں اسرائیل نے بھرپور جوابی کارروائی کی۔ اور اس چھ روزہ جنگ میں نہایت ذلت و اہانت آمیز عرب کی تین متحدہ حکومتوں کو شکست ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا قبلہ اوّل بیت المقدس بھی اسرائیلی قبضہ میں چلا گیا تھا اور تاحال اس کے قبضہ میں ہے۔ یہ اہم واقعہ ذہن میں رکھیے۔ تو جس طرح کے آجکل واقعات ہوتے ہیں، اُسی طرح کے اس زمانہ میں بھی ہوتے تھے۔ لیکن یہ کہ ہم اس زمانہ کی تاریخ کا سائنٹیفک طریقہ پر اور تجزیاتی انداز میں مطالعہ نہیں کرتے اور اس سے جو نتائج نکلتے ہیں ان پر غور و فکر نہیں کرتے۔ بس جاتے

ہنوں پر چونکہ ایک تقدس کا ہالہ ہوتا ہے تو ان واقعات کے بین السطور جو اسباب ہوتے ہیں۔ ان تک ہمارے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سیرت کے واقعات کو اُن کے صحیح پس منظر (Perspective) کو سمجھیں۔
مختصراً یہ کہ مدینہ تشریف لے جا کر حضورؐ نے چھ ماہ داخلی استحکام میں لگائے اور اس کے بعد رمضان سنہ ۱ھ میں مہمیں بھیجنے کا اقدام فرمایا۔ غزوہ بدر رمضان سنہ ۲ھ میں ہوا ہے تو ایک سال کے اندر آٹھ مہمیں حضورؐ نے بھیجی تھیں، جن کا ذکر میں گذشتہ تقریر میں کر چکا ہوں۔ ان میں سے دو کی یاد دہانی کرا دیتا ہوں۔ ایک تو وہ جو ذوالعشیرہ کے نام سے موسوم ہے، اس مہم میں حضورؐ کے قریباً دو ماہ لگے ہیں۔ اس کا مقصد اس قافلہ کا راستہ روکنا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام جا رہا تھا۔
اُس مہم میں ڈیڑھ سو مہاجرین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تیس اونٹ تھے تو اتنی بڑی قوت کے ساتھ حضورؐ نکلے تھے۔ گویا غزوہ بدر سے آدھی نفری اس مہم میں شریک تھی۔ میں نے اس کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ مجھے ان حضرات کی تردید کرنی ہے کہ جو مستشرقین کے الزامات سے مرعوب ہو کر یہ معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی اقدام نہیں ہوا۔ اور یہ کہ مدینہ والوں پر تو جنگ تھوپی گئی تھی، اس لئے اپنی مدافعت میں مسلمانوں کو تلوار اٹھانی پڑی ہے۔ معذرت خواہی کا یہ دور اب ختم ہو جانا چاہیئے۔ تاریخ، سیرت مطہرہ اور خود قرآن اس پر گواہ ہے کہ ہجرت کے بعد تمام اقدامات نبی اکرم صلی اللہ علیہ

سر سید مرحوم نے یہ معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا تھا۔ مولانا شبلی مرحوم کا بھی یہی انداز ہے۔ حالانکہ سیرت پر ان کی کتاب بڑی مستند کتاب ہے۔ لیکن وقت کے دباؤ میں وہ بھی آ گئے۔ یہ تو مولانا سلیمان ندویؒ نے جو مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد تھے اور انہوں نے اس کتاب کی بعد ازاں تکمیل کی ہے۔ اپنے استاذ مرحوم کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس مقام پر بڑا مدلل حاشیہ لکھا ہے کہ اور ثابت کیا ہے کہ غزوہ بدر کا اصل سبب وہ اقدامات تھے جو حضورؐ نے اس سے قبل قریش کے قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنانے کے لئے کیے تھے۔

وسلم کی طرف سے ہوتے ہیں۔ جن میں ایک تو یہ ذوالعشیرہ والا غزوہ بہت اہم
ہے۔ دوسرا وادیٔ نخلہ کا واقعہ جو فیصلہ کن ہو گیا اور یہ ہوا اُسی دوران میں
جبکہ ابوسفیان کا قافلہ بچ کر سوئے شام جا چکا تھا۔ یہ واقعہ جمادی الثانی کے آخری دن
ہوا تھا۔ جس میں قریش کے ایک قافلے سے مسلمانوں کی ٹکڑی کی مڈبھیڑ ہو گئی اور مکہ کا
ایک شخص عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ وادیٔ نخلہ وہ
وادی ہے کہ سنہ ۱۰ نبوی میں جب حضورؐ طائف کے سفر سے واپس تشریف لا رہے
تھے تو آپؐ جب یہاں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اس وقت جنوں کا ایک گروہ
اس وادی میں سے گزرا جس نے قرآن سنا اور حضور پر ایمان لے آیا۔ جس کا ذکر سورۂ
الجن میں ہے: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا
بِهٖ ط۔ وادیٔ نخلہ میں عمرو ابن عبداللہ الحضرمی کا قتل قریش کے لئے ناقابلِ برداشت
بن گیا۔ اس کا باپ امیہ بن حرب کا حلیف تھا جو ابوسفیان کا باپ تھا جو اس وقت
قریش کا سردار تھا۔ مکہ میں نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ خون کا بدلہ خون۔
یہ دونوں واقعات ذہن میں رکھئے چونکہ یہ اصل سبب بنے ہیں غزوہ بدر کے
اور غزوہ بدر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انقلابی جدوجہد کا اندرون عرب
آخری اور چھٹا مرحلہ مسلح تصادم (Armed Conflict) شروع ہوا ہے۔ اب اس
کو سمجھنے کے لئے آپ ذرا مکہ کی صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھئے۔ تاکہ صحیح پس منظر سامنے
رہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلی تقریر میں عرض کیا تھا کہ وہاں مزاج کے لحاظ سے دو
طرح کے سربرآوردہ لوگ تھے۔ اس مزاجی تفاوت کے لئے پچھلی مرتبہ میں نے آپ
کو دو جدید اصطلاحات سنائی تھیں Hawks and Doves۔ (اردو میں
کہہ سکتے ہیں کہ جنگ پسند اور امن پسند) یہ دو مزاج آپ کو ہر معاشرہ میں
ملیں گے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں بہت جوشیلے بہت جنگجو۔ بڑے جذباتی۔ وہ یہ چاہتے ہیں
کہ ہر قیمت پر دشمن کو کچل دیا جائے، نیست و نابود (Crush) کر دیا جائے۔ انہیں
Hawks کہا جاتا ہے اور کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ متحمل مزاج حلیم الطبع، مدبر، وہ م
کے روشن و تاریک پہلوؤں کو خوب دیکھتے بھالتے اور جانچتے ہیں۔ ان کو خون بہ
طبعاً بری لگتی ہے۔ مقصد ایک ہو تب بھی ایک طریقہ ہے کسی کو زہر دے کر مارنا

ب ذریعہ ہے کسی کو گڑ دے کر مارنا۔ تو Hawks . زہر دے کر مارنے کے درپے
تے ہیں۔ جبکہ Doves کا مقصد بھی دشمن کو ہلاک کرنا ہوتا ہے لیکن وہ زہر
ے بجائے گڑ دے کر مارنا چاہیں گے۔ تو مکہ میں ان دونوں قسموں کے لوگ تھے۔
ان تک Hawks کا تعلق ہے ان کا سب سے بڑا شخص ابوجہل تھا۔ ابوسفیان
بھی جب تک وہ ایمان نہیں لائے تھے، اسی فہرست میں شمار کیجئے۔ تیسرا شخص
بہ ابن ابی معیط Hawks کا بہت نمایاں شخص ہے۔ چوتھا شخص نضر ابن
ث یہ بھی ان کا نمایاں شخص ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نبی اکرم صلی صلی اللہ علیہ
لم کے بدترین دشمن اور خون کے پیاسے تھے۔ ہجرت کے بعد ہی سے ان کا اصرار تھا
مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن وہاں امن پسند یعنی Doves
ی تھے اور کافی بااثر تھے۔ ان میں نمایاں شخص حضرت خالد سیف اللہؓ کے باپ
لید ابن مغیرہ کا انداز مصالحانہ تھا۔ لیکن بدر سے پہلے وہ مر چکا تھا۔ ابوسفیان
من پسند کا باپ بھی Doves میں سے تھا یعنی شریف النفس انسان تھا۔
اطرح حکیم ابن حزام جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے، بہت ہی شریف
نفس انسان تھے ———— حضورؐ کو جب شعب بنی ہاشم میں
ے خاندان بنو ہاشم کے ساتھ محصور کیا ہوا تھا۔ یہ بھی ان اشخاص میں خاص طور
شامل تھے جن کا نام ان لوگوں میں آتا ہے کہ جو انسانی ہمدردی کے جذبے سے رات
اریکی میں چھپ چھپا کر پہاڑ کی چوٹی کو عبور کر کے محصورین کو کھانے پینے کی کچھ چیزیں
پا کرتے تھے۔ چونکہ وادی کے دونوں سروں پر پہرہ رہتا تھا۔ اس لئے پہاڑی
ور کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں ان کا نام اس لئے بتا رہا ہوں کہ غزوہ بدر میں ان
ب خاص رول ہے۔ جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ حکیم ابن حزام بعد میں ایمان لے
تھے لہذا صحابہ میں شامل ہیں، رضی اللہ تعالےٰ عنہ ۔
یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ حضورؐ کی ہجرت کے بعد ہی سے ان امن پسند لوگوں یعنی
Dove اور جنگ پسند لوگوں یعنی Howks میں رسہ کشی چلتی رہی ہے۔ ابوجہل
Hawks کا نمایاں ترین شخص تھا، وہ اور اس کے قبیل کے لوگ مصر تھے
مدینہ پر چڑھائی کی جائے تاکہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔

(صلی اللہ علیہ وسلم، و رضی اللہ عنہم) لیکن یہ Doves رو کہتے تھے کہ جب ہماری مصیبت ٹل گئی تو اب ہم کیوں فکر مند ہوں! جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں موجود تھے - ہمیں اندیشہ رہتا تھا کہ ہمارے نوجوانوں میں کوئی متاثر ہو کر آج ایمان لے آئے گا کوئی کل! اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا ۔ اب یہ بات ختم ہوئی ۔ عتبہ ابن ربیعہ کی نہایت مدبرانہ بات، جسے سیاسی اعتبار سے شاہکار کہا جا سکتا ہے، یہ تھی کہ اس نے مشورہ دیا تھا کہ تم اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عرب کے حوالے رہنے دو، یعنی اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عرب کے دوسرے قبائل کے مابین کشمکش ہو گی - ہم سے تو نہیں ہو گی - ہمارے سر سے تو بلا ٹلی - ظاہر بات ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نچلے ہو کر بیٹھنے والے نہیں ہیں، وہ تو اپنی دعوت و تبلیغ جاری رکھیں گے تو اب تصادم دوسرے قبیلوں سے ہو گا - تو اس نے مشورہ دیا کہ اب تم Watch کرو اور دیکھو کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے - اگر تو اہل عرب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ختم کر دیں - (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) - تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تم اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے سے بچ جاؤ گے، آخر اہل ایمان اور مشرکین مکہ بھائی بند ہی تو تھے - حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُدھر تھے تو عباس اِدھر تھے دونوں عبدالمطلب کے بیٹے تھے کہ نہیں - علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورؐ کے ساتھ ہیں تو عقیل ابن ابی طالب مشرکین کے ساتھ ہیں - باپ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُدھر ہیں تو ان کے بیٹے عبدالرحمٰن اِدھر ہیں - تو عتبہ نے بڑا صائب مشورہ دیا کہ ہمیں اپنے عزیزوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی ضرورت کیا ہے! اگر بقیہ عرب قبائل کو ختم کر دیں تو جو تم چاہتے ہو، وہ حاصل ہو جائے گا اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) غالب آ گئے تو بھی ہمارا کیا گھاٹا ہے - محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آخر قریشی ہی ہیں اس کا مطلب ہے کہ پورے عرب پر قریش کی سیادت و حکومت قائم ہو جائے گی اس مشورے سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عتبہ ابن ربیعہ کا اندازِ فکر کیا تھا! -

لیکن یہ دو واقعات[1] ایسے ہو گئے کہ جنگ پسندوں (Hawks) کو موقع ہاتھ آ گیا ایک طرف وہ شخص چیختا ہوا پہنچ گیا جو وادی نخلہ کی مڈبھیڑ میں مسلمانوں کے ہاتھ

---

[1] ان واقعات کی تفصیل ماہ نومبر کے میثاق میں وضاحت سے آ چکی ہے (ادارہ)

سے بچ نکلا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آدمیوں نے ہمارا قافلہ لوٹ لیا اور ہمارے ایک آدمی عمرو بن عبداللہ الحضرمی کو قتل کر دیا اور دو کو پکڑ کر لے گئے ۔ اس سے مکہ میں جو کہرام مچا اُس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں ۔ اور میں نے نوٹ کرایا تھا کہ ہجرت کے بعد پہلا جھنڈا بھی حضورؐ نے بلند فرمایا ۔ پہلا تیر بھی حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے چلایا اگرچہ اس سے کوئی زخمی نہیں ہوا تھا ۔ اور وادی نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں پہلا قتل بھی ہوا، دو کافر قید ہوئے اور قافلہ کا تمام ساز و سامان مسلمانوں کے ہاتھ آیا ۔ دوسری طرف ابو سفیان کی طرف سے S.O.S. call پہنچ گئی جو شام سے قافلہ لے کر واپس آ رہا تھا ۔ کہ سامان بہت زیادہ ہے محافظ صرف پچاس ہیں اور خطرہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قافلہ پر حملہ کریں ۔ چونکہ جب قافلہ جا رہا تھا تب بھی حضورؐ نے پیچھا کیا تھا لہٰذا اُسے یقین تھا کہ واپسی میں قافلہ پر تاخت ہو گی ۔ ممکن ہے کہ اُسے اطلاع ملی ہو کہ حضورؐ قافلہ پر حملہ کا قصد فرما رہے ہیں واللہ اعلم ۔ یہ دونوں چیزیں یک وقت جمع ہو گئیں ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ Hawks کی بن آئی اور ایک ہزار جنگجوؤں کا کیل کانٹے سے تیار ہو کر لشکر نکلا ۔ ابو سفیان کی عدم موجودگی میں قریش کی سرداری ربیعہ ابن عتبہ کے پاس تھی لہٰذا اُس لشکر کا سپہ سالار بھی وہی تھا ۔ ابو جہل، امیہ ابن خلف، نفران حارث، عتبہ ابن ابی معیط، شیبہ ابن عتبہ اور بہت سے وہ لوگ جو اہل ایمان کے خون کے پیاسے تھے، سب کے سب نکلے ۔ اس لشکر کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ سرداران قریش میں سے سوائے ابو لہب کے اور کوئی پیچھے نہیں رہا ۔ ابولہب بزدل انسان تھا ۔ اس نے اپنی جگہ ایک Mercenary یعنی کرائے کا فوجی بھیج دیا کہ میری طرف سے یہ لڑے گا ۔ اس شخص میں انسانیت کا کوئی جوہر نہیں تھا وہ بخیل اور بزدل شخص تھا، اُس کی اپنے معاشرہ کے اندر کوئی عزت نہیں تھی ۔ لوگ اُسے غزالِ زریں کا چور سمجھتے تھے ۔ چونکہ یہ کعبہ کے بیت المال کا متولی تھا اور وہاں سے چڑھاوے کے طور پر آیا ہوا سونے کا ہرن چوری ہو گیا تھا تو یہ اُس غزالِ زریں کا چور مشہور ہو گیا تھا ۔ پس ابولہب کے سوا قریش کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں بچا کہ جس کے تمام سربرآوردہ لوگ اس لشکر میں شامل نہ ہوتے ہوں ۔ البتہ ابو

سفیان رہ گئے تھے جو قافلہ کے ساتھ تھے - ان کو بھی پیغام بھیج دیا کہ تم بھی اپنی نفری اور سازو سامان کے ساتھ ہم سے آکر مل جاؤ - لیکن ابوسفیان کا اس معاملہ میں جو اپنا کیریکٹر ہے اس کا اگر مطالعہ کی جائے تو وہ خود ایک دلچسپ موضوع ہے میں اُسے اس وقت نہیں چھیڑوں گا - وہ بہت ہی حقیقت پسند انسان تھے محض جذباتی انسان نہیں تھے - انہوں نے دو احتیاطیں کیں - ایک طرف مکہ پیغام بھیج دیا کہ مدد بھیجو - دوسری طرف جب ان کو معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں کے ساتھ قافلہ کا رخ فرمائے ہیں تو انہوں نے اپنا راستہ بدلا - وہ بدر کی طرف آئے ہی نہیں - ساحل بحر احمر کے ساتھ ساتھ ہو کر نکل گئے - ابوجہل کا پیغام مل بھی گیا تھا کہ لشکر کے ساتھ آکر شامل ہو جاؤ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میں براہِ راست مکہ جا رہا ہوں -

غزوہ بدر سے قبل مشاورت

اب آئیے مدینہ کی طرف - یہ تو میں نے آپ کو مکہ کا منظر بتایا - مدینہ کے متعلق احادیث صحیحہ سے جو صحیح و معتبر ترین روایت ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کسی جنگ کا اعلان کیا نہ تیاری فرمائی - بلکہ پیش نظر صرف یہ تھا کہ جو قافلہ آ رہا ہے اُسے روکنا ہے - یہی وجہ ہے کہ بغیر کسی خاص اہتمام اور تیاری کے لوگ نکل کھڑے ہوئے - پھر یہ بات نوٹ کیجئے کہ غزوۂ ذوالعشیرہ میں ڈیڑھ سو افراد تمام مہاجرین تھے - جبکہ اس غزوہ میں صرف ساٹھ یا تیراسی۸۳ مہاجرین ساتھ ہیں - تعداد کے متعلق دونوں روایات موجود ہیں - اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر جنگ کا پروگرام ہوتا تو آپ خصوصی انتظام فرماتے اور تعداد زیادہ ہوتی - پھر یہ پہلی بار ہوا ہے کہ انصاری صحابہؓ بھی ساتھ نکلے ہیں بلکہ تعداد میں وہ زیادہ تھے - حضورؐ نے مدینہ میں بھی مشورہ کیا تھا اور پھر مدینہ کے باہر بھی ایک مجلس مشاورت منعقد فرمائی ہے لیکن مدینہ کی مشاورت میں جنگ کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا لہٰذا آپؐ نے کسی سے تاکیداً نہیں فرمایا کہ ساتھ چلو - مگر انصارؓ بھی خود اپنی مرضی سے ساتھ ہو گئے تھے - حضورؐ کی طرف سے کوئی خصوصی ترغیب نہیں تھی - اب آپؐ جب مدینہ سے کچھ دور پہنچے ہیں تو آپؐ کو معلوم ہوا کہ مکہ سے ایک ہزار کا کیل کانٹے سے لیس لشکر سوئے مدینہ نکل پڑا ہے اور منزل بمنزل

طے کرتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ اب یہ دو طرفہ معاملہ ہو گیا کہ شام کی طرف سے قافلہ آ رہا ہے اور جنوب سے لشکر چلا آ رہا ہے۔ اب یہاں مدینہ سے باہر مشاورت ہوئی ہے جو اہم ترین مشاورت ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ انفال میں جو بیان ہے وہ بہت مختصر ہے چونکہ قرآن مجید ایسے معاملات کو عموماً اختصار سے بیان کرتا ہے۔ ان آیات کے بین السطور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورۃً یہی یہ بات پیش کی ہوگی کہ "مسلمانو! ایک قافلہ شمال سے آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف تیس یا پچاس محافظ ہیں۔ مالِ تجارت بہت ہے۔ ایک لشکر جنوب سے آ رہا ہے اور وہ ہے کیل کانٹے سے لیس۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا وعدہ کر لیا ہے تو بتاؤ کدھر چلیں!" لیکن احادیث میں جو اس کی تفاصیل آئی ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری بات حضورؐ نے ابتداءً نہیں فرمائی۔ اس کی ابھی آگے وضاحت کروں گا۔ میرے نزدیک قرآن مجید میں پوری صورتِ حال کو Sum up کر دیا گیا ہے حضورؐ نے ابتداءً مشورہ طلب جو بات رکھی وہ یہی تھی کہ ایک ہے وہ قافلہ اور ایک ہے لشکر بتاؤ کدھر چلیں۔ اب ان حالات میں کچھ لوگوں کی مخلصانہ سوچ تھی انہوں نے تجویز کیا کہ حضورؐ قافلہ کی طرف چلئے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ قافلہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پچاس کی نفری ہے۔ آسانی سے قابو میں آجائیں گے۔ ساز و سامانِ تجارت بھی بہت ہاتھ لگے گا اور اسلحہ بھی جو آئندہ جنگ میں کام آئیں گے۔ لیکن حضورؐ جیسے کچھ منتظر سے تھے۔ تب لوگوں نے اندازہ کیا کہ منشائے مبارک کچھ اور ہے، حضورؐ کا اپنا رجحان طبع کچھ اور ہے۔ اُس مرحلے پر مہاجرین نے تقریریں شروع کیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں، جو آپ کا ارادہ ہو، بسم اللہ کیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے تقریر کی، حضورؐ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے تقریر کی۔ لیکن حضورؐ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ایسا نظر آ رہا ہے اور محسوس ہو رہا تھا جیسے حضورؐ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ حضرت مقداد ابن اسودؓ بھی مہاجرین میں سے تھے، انہوں نے کھڑے ہو کر وہ الفاظ کہے کہ "حضورؐ جو آپؐ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجئے۔ ہم موسیٰؑ کے ساتھی نہیں ہیں جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا

إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۔ ” موسیٰؑ تم اور تمہارا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ آپؐ بسم اللہ کیجیے۔ ہم آپؐ کے ساتھ لڑیں گے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعہ آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمائے“ لیکن حضورؐ پھر بھی کچھ انتظار کی کیفیت میں تھے۔ اب خیال آیا حضرت سعدؓ کو کہ حضورؐ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ کون سے سعدؓ ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ سعد ابن عبادہؓ تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کا قول یہی ہے، ایک روایت ہے کہ یہ حضرت سعدؓ ابن معاذ تھے۔ میرا رجحان غالب یہی ہے کہ یہ حضرت سعد ابن عبادہ تھے رضی اللہ عنہ۔ انصارؓ کے دو قبیلے تھے خزرج اور اوس۔ خزرج کا قبیلہ تعداد میں اوس سے تین گنا تھا اور اسکی طاقت بہت زیادہ تھی۔ خزرج ہی کی ایک شاخ کا سردار تھا عبداللہ ابن اُبی، منافقِ اعظم۔ اور پورے قبیلہ کے سردار تھے۔ حضرت سعد ابن عبادہؓ۔ چنانچہ سردار کی طرف سے کسی رائے کا اظہار گویا پورے قبیلہ کی طرف سے اظہارِ رائے کے مترادف تھا۔ اوس کے سردار تھے حضرتِ سعد ابن معاذؓ۔ بہرحال ان دو میں سے کسی نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ ”حضورؐ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے“ اس خیال کی وجہ کیا تھی! یہ کہ حضورؐ نے مدینہ (یثرب) تشریف لانے کی، بیعت عقبہ ثانیہ میں جو دعوت قبول کی تھی تو اس میں یہ طے ہوا تھا کہ ”اگر یہ قریش مدینہ پر حملہ کریں گے تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں“ گویا انصار اس معاہدہ کی رو سے اس کے پابند نہیں تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ قافلہ کا راستہ روکنا اور بات ہے اور باقاعدہ ایک لشکر جرار سے جا بھڑنا یہ بالکل دوسری بات ہے۔ لہٰذا اُس معاہدے کی رو سے انصارؓ اس کے پابند نہیں تھے۔ حضرتِ سعدؓ کو فوراً خیال آگیا کہ ہو نہ ہو حضورؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔ اس موقع پر حضرتِ سعدؓ نے جو بات کہی ہے وہ ایسی ہے کہ ہر مسلمان کو یاد رہنی چاہیے اور اس کے مطابق اپنا رویّہ اور عمل درست کرنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اس انقلابی عمل سے جو جماعت وجود میں آئی تھی اس کی دو بنیادیں ہیں۔ اصل بنیاد تو یہ تھی کہ حضو

اللہ کے رسول ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور جو بھی امتی ہے وہ حضورؐ کے ہر حکم کا ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ جہت پابند ہے۔ مطیع ہے، فرماں بردار ہے: وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ کوئی اضافی عہد ہو یا نہ ہو، کوئی معاہدہ ہو یا نہ ہو۔ کوئی اضافی بیعت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ مجرد یہ بات کہ وہ حضورؐ پر بحیثیت رسول اللہ ایمان رکھتا ہے وہ حضورؐ کا تابع فرمان ہے۔ یہ بات ہے جو حضرت سعد ابن عبادہؓ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اس موقع پر کہی کہ:

"حضورؐ! شاید آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے! اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنٰكَ ۔ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں، ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے۔ ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ اُس وقت کیا طے ہوا تھا! کیا نہیں ہوا تھا! وہ اس وقت وہ بات Irrelevant ہے، غیر متعلق ہے، آپؐ جو بھی حکم دیں گے۔ سِرْ بِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لے چلئے ہم کو جہاں بھی لے جانا ہو۔ خدا کی قسم اگر آپؐ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیجئے ہم برق الغمارہ تک جا پہنچیں گے (جو یمن کا آخری کونے کا شہر ہے) اور اس کے لئے ہم اپنی سواریوں کو دبلا کر دیں گے"

حضرت سعد ابن عبادہؓ کی یہ تقریر سن کر آپؐ کا چہرہ مبارک کھل اٹھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جماعت میں حضورؐ کی بیعت ثانوی چیز تھی۔ اس کی اصل بنیاد تو یہ تھی کہ جو آپؐ پر ایمان لائے اور حضورؐ کی تصدیق کرے وہ اس جماعت میں شامل ہے۔ جس نے بھی آپؐ کو اللہ کا رسول مانا ہے، جیسے فرمایا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝[1] ایمان کہاں رہ جائے گا اگر حضورؐ کا حکم نہ مانیں! لہٰذا بڑی پیاری، بڑی بنیادی اور اصولی بات کہی تھی اس وقت حضرت سعد ابن عبادہؓ یا حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہما نے کہ: اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنٰكَ ۔

---

[1] سو تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہونگے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں، پھر تیرے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں، اور خوشی سے قبول کریں۔

بات سے حضورؐ کا چہرہ انور کھل اٹھا۔ گویا آپؐ انصار کی رائے معلوم کرنے کے طر تھے۔ اس موقع پر بعض روایات میں مہاجرین کی تعداد ساٹھ اور بعض میں ـتی آئی ہے۔ تین سو تیرہ میں سے تیراسی وضع کیجئے تو انصار کی تعداد دو سو تیس ن ہے۔

اس مشاورت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی فرمائی اور پھر بدر پہنچ کر جب معلوم ہو گیا کہ وادی کے دوسرے سرے تک قریش کا لشکر پہنچ چکا ہے تو وہاں آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کے لئے فرمایا: وہاں کا بھی ایک واقعہ بڑا اہم ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض تجربہ کار حضرات نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر یہاں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ وحی کی بنا پر ہے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ اگر یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ جنگی مہارت اور حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس مقام کے بجائے اُس مقام پر کیمپ ہونا چاہیئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ جہاں تک خالص دنیوی امور کی تدابیر اور تجرباتی علوم کا تعلق ہے تو تأبیر النخل کے معاملہ میں آپؐ نے ہمیشہ ہمیش کے لئے امت کے لئے یہ ہدایت و تعلیم دے دی ہے کہ: اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج ہی ایسا تھا کہ آپؐ دنیوی تدابیر کے معاملہ میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کھودنے کا فیصلہ حضورؐ نے حضرت سلیمان فارسیؓ کے مشورہ پر فرمایا تھا۔

اب میں اس جنگ سے ایک رات پہلے کے دو منظر آپ کو اور دکھا دوں۔ ابھی جنگ نہیں ہوتی ہے کہ خبر پہنچ گئی کہ ابوسفیان کا قافلہ بچ کر نکل گیا۔ اب چہ میگوئی شروع ہوئی کہ جنگ کا کیا فائدہ ہے۔ ہم تو اپنے قافلہ کی حفاظت کیلئے آئے تھے۔ اس صورت حال سے Hawks کے مقابلہ میں Doves کے ہاتھ میں پھر ایک دلیل آ گئی کہ ہمارا مقصد قافلہ کی حفاظت تھا قافلہ بچ کر نکل گیا پھر جنگ کی ضرورت کیا ہے! چنانچہ قریش کے دو گھرانے بنو زہرہ اور بنو عدی لشکر کو چھوڑ کر چلے گئے کہ اب ہمیں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اب ہم شریک نہیں رہیں گے۔ اس کو بھی نوٹ کیجئے اکثر حضرات کو اس کا علم نہیں ہے

اس کے علاوہ اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ حکیم ابن حزام، عتبہ کے پاس گئے جو اس لشکر کا سپہ سالار تھا اور اس سے کہا کہ عتبہ! ایک نیکی کا کام تم اس وقت ایسا کر سکتے ہو کہ تاریخ میں تمہارا نام لکھا جائے کہ تم نے بہت بڑا کام کیا۔ عتبہ نے پوچھا کہ اچھا بتاؤ وہ کام کون سا ہے!۔۔ انہوں نے وہی تجویز رکھی کہ ہمارا قافلہ بچ کر نکل چکا ہے اب اس ہونے والی خون ریزی کو تم روک سکتے ہو۔ عمرو ابن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ حرب بن امیہ کا حلیف تھا۔ اگر تم اس کی دیت یا خون بہا ادا کر دو تو وہ مسئلہ بھی ختم۔ قافلہ بچ کر نکل ہی چکا ہے۔ پھر جنگ کی ضرورت نہیں ہوگی اس خواہ مخواہ کی خون ریزی کو تم روک سکتے ہو۔ عتبہ ابن ربیعہ نے کہا کہ بہت مناسب تجویز ہے۔ وہ خود اسی مزاج کا آدمی تھا۔ لیکن وہ جو Hawks کا سرغنہ۔۔ ابوجہل موجود تھا، فی الاصل تو اس کو سمجھانا مقصود تھا۔ چنانچہ دونوں اس کے پاس گئے اور اسے قائل معقول کرنے کی کوشش کی عتبہ نے کہا کہ دیکھو خونریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا قافلہ بچ کر چلا گیا۔ عمرو کا خون بہا میں ادا کر دیتا ہوں۔ اب ابوجہل کی چالاکی دیکھئے۔ ایک تو اس نے عتبہ کو طعنہ دیا۔ بزدلی کا طعنہ۔ اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عتبہ! تم اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر گھبرا گئے ہو، یاد رہے کہ عتبہ کے بڑے بیٹے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کے ساتھ تھے جو سابقون الاولون میں سے تھے۔ عتبہ کا دوسرا بیٹا اس کے ساتھ تھا۔ ابوجہل نے مزید نمک پاشی کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت پدری تمہیں بزدل بنا رہی ہے کہ بیٹا بد مقابل ہے اسی لئے تم جنگ ٹالنا چاہتے ہو۔ اس کا عتبہ نے وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر ایک باغیرت با حمیت انسان کو دینا چاہیئے۔ یہ چیزیں تو قریش میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ عتبہ نے کہا، کل کا دن بتا دیگا کہ بزدل کون ہے!۔ وہ اس طعنہ کو برداشت نہیں کر سکا۔ ابوجہل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عمرو ابن عبداللہ الحضرمی کے بھائی کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو ہم تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ کل لے سکتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو۔ اس شخص نے عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنے کپڑے پھاڑے، بالکل عریاں ہو گیا اور شور مچایا وَاعَمْرَاهُ - وَاعَمْرَاهُ۔ اسے قبائلی

زندگی میں Blood Cry (خونی چیخ) کہتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ مشتعل کرنے والا نعرہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے لشکر میں آگ لگ گئی۔ الغرض مشرکین کے کیمپ میں آخری رات تک یہ کشمکش جاری رہی ہے، کچھ لوگ چاہتے تھے کہ جنگ ٹل جائے۔ لیکن ابوجہل نے ان کوششوں کو اپنی چالاکی سے ناکام بنا دیا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور فیصلہ ہو گیا کہ بہر صورت کل جنگ ہوگی۔ چنانچہ دوسرے دن جنگ ہوئی۔

مشرکین کی دُعائیں

اب ایک چیز اور نوٹ کیجئے جو آپ کو شرک کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ مشرکین مکّہ میں سے دو اشخاص کی غزوہ بدر شروع ہونے سے متصلاً قبل رات کی دعائیں کتبِ تاریخ میں نقل ہوئی ہیں۔ حضورؐ نے بھی اسی شب کو دُعا کی ہے جس کا ذکر آگے کروں گا۔ میں اس وقت دو مشرکین کی دُعائیں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ تاریخ میں ایک ابوجہل کی اور دوسری نضر ابن حارث کی دعا منقول ہوئی ہے۔ میں ذکر یہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ دونوں مشرک تھے، اللہ کے منکر نہیں تھے۔ قرآن میں بار بار آتا ہے کہ جب تم پر کوئی مشکل وقت پڑتا ہے تو تم اپنی دیویوں اور من گھڑت معبودوں کو بھول جاتے ہو اور صرف اللہ کو پکارتے ہو۔ یہ دلیل آپ کو قرآن میں مل جائے گی چنانچہ ابوجہل کی دُعا منقول ہے: اَللّٰھُمَّ مَنْ اَقْطَعُنَا لِلرَّحِمِ فَاَحِنْہُ الْغَدَاۃَ "اے اللہ! جس نے ہمارے رحمی رشتے کاٹے ہیں کل تو اُسے ذلیل کر دے"

یہ اس شخص کی پکار ہے جس کی گھٹی میں قوم پرستی، نسل پرستی، قبائل پرستی پڑی ہوئی تھی، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کا سب سے بڑا الزام یہی تھا کہ انہوںؐ نے آ کر اپنی دعوت و تبلیغ کی بدولت ہمیں تقسیم کر دیا۔ ہمارے اولاد کو ہم سے جدا کر دیا۔ بھائیوں کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا۔ ہماری جو وحدت تھی، وہ تو اس طور پر پراگندہ ہو گئی۔ ہمارے رحمی رشتے محمد نے منقطع کر دیئے (صلی اللہ علیہ وسلم)، ابوجہل کا سب سے بڑا الزام یہی تھا۔ چونکہ صلہ رحمی کو تو ہمیشہ ایک بھلائی اور خیر تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور قطع رحمی ایک برائی سمجھی جاتی لہٰذا وہ اللہ کو اس کا واسطہ دے رہا ہے کہ مقابلہ میں محمد (صلی اللہ علیہ

جو لشکر لے کر آئے ہیں، انہوں نے قطع رحمی کی ہے ۔ اسی نے دعا کی کہ اے اللہ! کل تو اُسے رسوا کر دے جس نے ہمارے رحمی رشتے منقطع کئے ہیں: اَللّٰھُمَّ اَقْطَعُنَا لِلرَّحِمِ فَاَحِنْهُ الْغَدَاةَ — اور نضر ابن حارث کی جو دعا منقول ہوئی ہے اس کو پڑھ کر میں سخت حیران ہوا ہوں کہ ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کی شخصیتیں اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں، جن کی سوچ اس قدر غلط ہو چکی تھی کہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں سے ہم بہتر جماعت ہیں۔ اس کی دعا منقول ہوئی ہے کہ: اَللّٰھُمَّ اَنْصُرْ خَیْرَ الْحِزْبَیْنِ - یہ جو دو حزب بالمقابل آ گئے تھے ہمارے نزدیک تو ایک حزب اللہ اور ایک حزب الشیطان لیکن ان کی رو سے ان کے دین کے باغیوں کا حزب اُن کے سامنے تھا اور وہ تھے اپنے آبائی دین اور اپنی قوم کے وفادار - آمنے سامنے دو حزب ہیں اور وہ یہ سمجھ کر دعا کر رہا ہے کہ ہماری جماعت بہتر ہے حق پر ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! ان میں سے بہتر جماعت کی مدد فرمائیو - اللہ نے اس کی دعا تو ایک لحاظ سے قبول فرمائی جو بہتر گروہ تھا اسکی مدد فرمائی -

غزوہ بدر کے موقع پر حضورؐ کی دعا

دوسری طرف اسی رات کو حزب اللہ کے لشکر میں اس گھاس پھونس کی جھونپڑی میں جو آپؐ کے لئے بنائی گئی تھی - رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل ترین سجدہ کیا ہے، طویل ترین دعا کی ہے - اس دعا میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اے اللہ! کل اگر یہ لوگ یہاں قتل ہو گئے، شہید ہو گئے تو پھر قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا - اور تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا - اب اس کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے - حضورؐ نے ایسا کیوں فرمایا! اس لئے کہ آپؐ آخری نبی اور رسول تھے اور آپؐ کے بعد تا قیام قیامت کوئی نبی آنے والا نہیں تھا - حضورؐ نے بارگاہ رب العزت میں مزید عرض کیا - "بار الٰہا! میں نے اپنی پندرہ برس کی کمائی میدان میں لا کر ڈال دی ہے"۔ اس وقت تلوار لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہرے پر کھڑے تھے جس وقت حضورؐ سر بسجود تھے۔[1] جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ الفاظ

حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں

...ہیں تو انہوں نے عرض کیا: حَسْبُكَ، حَسْبُكَ يَارَسُوْلَ اللّٰہِ! بس کیجیے بس کیجیے

...ینًا اللہ آپؐ کی مدد فرمائے گا۔ اس پر حضورؐ نے سرِ مبارک اٹھایا اور زبانِ مبار...

...یہ الفاظ جاری ہوئے: سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۔ گویا اللہ کی طر...

...سے خوشخبری تھی کہ "اس جمعیت کو شکست ہو کر رہے گی اور یہ پیٹھ دکھا کر

...ھاگیں گے"۔

سیرتِ نبویؐ سے متعلق بعض اہم نکات

بہرحال اس غزوہ بدر سے چھٹا اور آخری مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی

مسلح تصادم Armed Conflict میں نے ہجرت کے بعد کے دو برس کی جو

تاریخ آج بھی دہرا دی ہے تو یہ ہے ۔ Active Resistance کا مرحلہ—

اقدام ہوا حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے۔ لیکن پہلی باقاعدہ جنگ ہوئی

ہے غزوہ بدر۔ اس معاملہ میں اس بحث میں پڑنا کہ جنگ کس نے شروع کی، کس

نے نہیں کی۔ آیا اسلام میں صرف دفاعی (Defence) جنگ کی اجازت

یا Offence جنگ یعنی خود حملہ میں پہل کرنا بھی درست ہے ۔

سوال یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باطل کا قلع قمع کرنے کیلئے

بھیجے گئے تھے یا باطل کو Acknowledge (تسلیم) کرنے کے لئے بھیجے

گئے تھے! حق باطل کو کبھی تسلیم اور برداشت کرسکتا ہے! ایک ہی شکل ہے

ہے کہ حق کے نام لیوا اگر بے حمیت اور بے غیرت ہو گئے ہوں، ان کو زندگی زیادہ

عزیز ہو گی تو وہ حق کو مغلوب دیکھ سکتے ہیں۔ ورنہ غیور، باحمیت حق کے ماننے

والے اور حق کے علمبردار، باطل کا وجود کبھی گوارا نہیں کرسکتے! حق کے پاس اگر طاقت

ہو تو وہ یقیناً جارح ہوگا۔ صرف ایک فرق ذہن میں رکھیئے۔ کسی فرد ر

حاشیہ صہ ۶۸

لہ اس موقع پر ایک بات یاد آگئی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے دورِ خلافت میں آنجنابؓ کے فرزندگان میں سے کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت میں سب... زیادہ شجاع، دلیر اور بہادر کون تھا؟ — سوالی کا خیال تھا کہ آنجناب اپنا نام لیں گے۔ لیکن حضرت علیؓ نے جواب دیا وہ شخص کہ جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر... پہلے والی شب کو اپنی جھونپڑی پر پہرے کے لئے معین فرمایا تھا، یعنی ابوبکر صدیق رضی...

(Individual) کو کبھی پہلے اپنا دین بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ نہ آئندہ کیا جائیگا۔
اس کے لئے قرآن حکیم کی نص موجود ہے: لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۔" دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے۔ بیشک ہدایت کی راہ گمراہی سے جُدا ہو کر روشن واضح ہو چکی ہے"۔ لیکن باطل کا غلبہ! یہ گوارہ نہیں کیا جائے گا۔ ملک میں تشریعی نظام (Law of the Land) بہرصورت اللہ کا قائم و نافذ ہوگا: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ۔ اگر اہل حق میں کوئی غیرت و حمیت ہے تو وہ حق کا بول بالا کرنے اُسے غالب کرنے اور باطل کو مٹانے، اُسے سرنگوں کرنے کی جدوجہد کے لئے تن، من، دھن سب کچھ لگا دیں گے۔ اس راہ میں جان دینے اور سر کٹانے سے زیادہ دنیا میں ان کو کوئی شئے محبوب نہیں ہو گی۔ اقبال نے بڑا پیارا شعر کہا ہے۔ ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

جسے Pieceful Co-existance کہا جاتا ہے یعنی دو متضاد فکری نظام پُرامن طریق پر پہلو بہ پہلو رہیں، تو باطل تو چاہے گا کہ یہ صورت برقرار رہے۔ اس لئے کہ اُسے تو اس طرح اپنے وجود اور بقاء کی ضمانت (Lease of Existance) ملتی ہے۔ لیکن یاد رکھیئے کہ حق و باطل کے مابین Pieceful Co-existance خود باطل ہے۔ حق اسے کیسے گوارا کر لے گا! ۔۔ اسی لئے میں پورے وثوق کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ مکہ میں بھی تصادم کا آغاز جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ جب یہ نعرہ لگایا۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

ان کے عقائد کی نفی، ان کے نظام کی نفی، ان کے رسم و رواج کی نفی، ان کے رزائلِ اخلاق کی نفی۔ ان کے معاشرتی نظام کی نفی، معاشرتی اونچ نیچ کی نفی۔ نسل پرستی کی نفی آباء پرستی کی نفی، ہوائے نفس کی نفی۔ بتایئے کہ اس کلمہ توحید کی زد سے باطل نظریات کا کون سا پہلو اور گوشہ بچ سکتا ہے۔ الغرض ہر چیز کی نفی۔ اس کلمہ میں موجود ہے۔

ہجرت کے بعد اقدامات بھی حضورؐ نے کئے صلی اللہ علیہ وسلم - کہاں وادی نلہ ! وہاں مہم بھیجی ہے - ابو سفیان کا قافلہ جب جا رہا تھا تب بھی اس میں ملل اندازی Intercept کرنے کے لئے حضورؐ بنفسِ نفیس ڈیڑھ سو مہاجرین ے ساتھ اس کے تعاقب میں نکلے ہیں - میں حیران ہوتا ہوں کہ مولانا شبلی مرحوم زوہ ذوالعشیرہ کا ذکر تک نہیں کرتے - ہمیں ان سے ہمدردی ہے - اس لئے کہ ہ انگریز کا دور تھا - مستشرقین کی طرف سے پے بہ پے حملے ہو رہے تھے کہ "ہ بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے - !" لہذا معذرت خواہانہ نداز تھا - انہوں نے لکھا ہے کہ ابو سفیان کا قافلہ جب واپس آ رہا تھا تو ایسے ہی خبر اڑ گئی کہ حضورؐ شاید اس پر حملہ کرنے والے ہیں - حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دو تین مہینے پہلے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قافلے کو Intercept کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے - وہ تو ایک دن رات کا فصل پڑ گیا کہ قافلہ بچ کر نکل گیا - مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں کہ ہمارے سیرت نگاروں نے خواہ مخواہ ایسی باتیں لکھ دی ہیں - اس دور میں عجیب عجیب جملے ملتے ہیں - کوئی صاحب قلم یہ لکھتے ہیں - "فلاں فلاں مسائل میں ہمارے فقہاء اصل حقیقت کو سمجھ نہیں پائے وغیرہ" گویا ہمارے فقہاء ان کے نزدیک کودن تھے - اور عقل و فہم سے عاری تھے آج کے دور کے لوگوں کو عقل آئی ہے - وہ اب پڑھائیں گے امام ابوحنیفہ کو، امام مالک کو، امام شافعی کو، امام احمد ابن حنبل کو اور ان کے جلیل القدر تلامذہ کو - رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کہ دیت کا معاملہ کیا ہے ! عورت کی دیت کتنی ہونی چاہئیے ! مرد کے برابر ہونی چاہئیے ! نہ کہ نصف - اور یہ کہ رجم تو خاص حالات میں بطور تعزیر ہے نہ کہ مستقل اسلامی حد ہے - ہمارے فقہاء نے گویا ان مسائل کو سمجھا ہی نہیں - اسی طرح یہ کہ "ہمارے سیرت نگاروں نے فلاں معاملہ میں یہ لکھ دیا وہ لکھ دیا !" تو سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس کون سا خصوصی ذریعہ علم ہے ! - یہ سارا کچھ ملا تو وہیں سے ہے - اگر آپ غزوہ بدر کا ایک واقعہ ماننے کو تیار ہیں تو وہ ہمیں کہاں سے معلوم ہوا ! انہی سیرت نگاروں نے بتایا تو ہمیں معلوم ہوا - قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے - لیکن جس طرح سیرت مطہ

میں اس کی کڑیاں جڑ کر آئی ہیں اُس طرح واقعات قرآن مجید میں نہیں ملیں گے - اجمالی تبصرہ ہے جو قرآن میں ملتا ہے - واقعات کی تفصیل کے لئے تو سیرت کی کتابیں ہیں البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ اگر واقعات کی کوئی کڑی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے تو دوسری کتابوں میں مل جاتی ہے - ان سب کا مجموعی مطالعہ کر کے اور ملا کر واقعات وحالات کی واضح اور مکمل تصویر بن جاتی ہے۔ وادیٔ نخلہ کا واقعہ سیرت کی تمام کتابوں میں چونکہ موجود ہے لہٰذا اس کو ماننے پر سب مجبور ہیں اور یہ تسلیم کیا گیا ہے - کہ اس واقعہ نے مکہ میں آگ لگائی ہے۔

ایک بات میں اور عرض کر دوں - حضورؐ مکہ سے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ جان بچا کر نہیں بھاگے تھے - جس کسی کا بھی یہ تصور ہو وہ اس کی اصلاح کر لے - ہمارے کچھ تجدد پسند دانشور، مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہو کر ایسا تصور رکھتے ہیں یہ حضرات ہجرت کے واقعہ کا ذکر Flight to Madinah یعنی مدینہ کی طرف فرار کے الفاظ سے کرتے ہیں - وہ اسے ہجرت نہیں کہتے - ہجرت اور فرار میں زمین و آسمان کا فرق ہے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس تصور کا ذرا سا شائبہ بھی کسی کے ذہن میں ہو تو وہ اسے کھرچ دے - ورنہ یہ بالکل ویسے ہے جیسے سورہ انفال میں آیا ہے کہ جنگ میں پیٹھ دکھا دینا بہت بڑا جرم، نا قابل معافی گناہ ہے سوائے اس کے کہ پینترا بدلنا مقصود ہو - یا یہ کہ پیچھے جو نفری ہے اس تک پہنچ کر پھر حملہ کرنا مقصود ہو - تو ہجرت کیا تھی! ہجرت درحقیقت باطل کے خلاف پینترا بدلنا تھا - ایک متبادل مرکز (Alternate Base) کی حیثیت سے حضورؐ نے پہلے طائف کا انتخاب کیا تھا - طائف والوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی - اللہ تعالیٰ نے یہ خوش قسمتی اور سعادت یثرب کے لئے رکھی تھی کہ اہل یثرب چل کر گئے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دے آئے، منظوری لے آئے - اب حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس گھڑی کی اجازت ملنے کا انتظار تھا جس گھڑی ہجرت کرنی تھی - جوں ہی اجازت آئی حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم عازم ہجرت ہوئے اور سوئے یثرب کوچ فرمایا - لیکن حضورؐ یہاں کھجوروں کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام

فرمانے نہیں آتے تھے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ - سے

دامن پکڑے چھاؤں گھنیری
تپتی راہیں مجھ کو پکاریں

چھاؤں سب کو پسند آتی ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو غزوہ بدر سے
پہلے بنفسِ نفیس چار مہموں میں تشریف لے گئے ہیں۔ حضورؐ نے تو ٹھنڈی چھاؤں
میں آرام نہیں کیا۔ ابتدائی چھ مہینے کا زیادہ سے زیادہ معاملہ ہے جس میں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نہ خود کسی غزوے کے لئے تشریف لے گئے نہ کوئی سریہ بھیجا۔ یہ
چھ ماہ حضورؐ نے جن کام میں لگائے ہیں اس کو میں بیان کر چکا ہوں۔ وہ داخلی
استحکام اور اقامتِ صلوٰۃ، اجتماعاتِ مسلمین کے لئے مسجد نبویؐ کی تعمیر نیز انصار و
مہاجرین میں مواخات سے متعلق تھا۔ ان کاموں کو سنبھالنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فوراً اقدامات کا آغاز فرما دیا۔ تو یہ ہے Active Resistance
(اقدام) جس کا آغاز ہوا نبی اکرمؐ کی طرف سے۔ جس کے نتیجہ میں آخری اور چھٹے
مرحلے یعنی مسلح تصادم کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے۔ غزوہ بدر اس کا آغاز ہے۔
تاریخ ہے ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ۔ ابوجہل سے ایک بات اور بھی منسوب
ہے کہ اس نے دعا کی تھی کہ "اے اللہ! اس جنگ کو یوم الفرقان بنا دے" اللہ تعالیٰ
نے اس دن کو حق و باطل میں امتیاز کرنے والا دن بنا دیا اور سورہ انفال میں اس
کو "یوم الفرقان" ہی قرار دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت اور غزوہ بدر ہی دین اللہ
کے بالفعل غلبہ کی تمہید بنے۔

غزوہ بدر کے بعد چھ سال تک یہ سلسلہ (Phase) اندرون ملک جاری
رہا۔ اس پر ان شاء اللہ تعالیٰ اب آئندہ جمعہ میں گفتگو ہوگی۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعَنِيْ
وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ○

(جاری ہے)

مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت واہمیت

پیشِ نظر مقالہ وہ خطبہ ہے جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس منعقدہ کلکتہ ۶، ۷، ۸ اپریل ۱۹۸۵ء میں بحیثیت صدر بورڈ کے ۶ اپریل کو بورڈ کے اجلاس میں زبانی ارشاد فرمایا تھا، اس اجلاس میں مسلمانانِ ہند کی تمام دینی وسیاسی جماعتوں، مسلم تنظیموں اور مختلف مکاتبِ خیال کے ذمہ داروں، مسلم دانشوروں، اور سربرآوردہ علماء اور قانون دانوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔

حضرات! سب سے پہلے میں اس بات پر معذرت کرتا ہوں کہ میں اس اہم موقع پر کوئی لکھا ہوا خطبہ پیش نہیں کر رہا ہوں، میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اندرونی اور بیرونی سفروں میں مشغول رہا، اور مسلسل انہماک اور مصروفیت رہی، لیکن اس غیر ارادی اور اضطراری کوتاہی میں خیر کا بھی ایک پہلو ہے، تیار کیے ہوئے بلند پایہ خطبہ ہائے صدارت کی افادیت اور اہمیت کو کم کیے بغیر جو اب ہماری علمی، ادبی و سیاسی تاریخ کا جزء بن گئے ہیں، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ بعض مرتبہ خطبۂ صدارت کُل کا کُل یا اس کا کوئی جزء بے محل یا بعد از وقت ثابت ہوتا ہے، اور حالات میں تغیر کی وجہ سے اپنی تازگی اور برجستگی کھو چکا ہوتا ہے اس لیے شاید اس میں بھی حکمتِ الٰہی کو دخل ہو کر اس فضاء میں تازہ حالات کے مطالعہ کے بعد آپ سے براہ راست خطاب کر رہا ہوں۔

حضرات! کسی بھی مسئلہ سے اختلاف یا کسی حقیقت سے گریز اور مخالفت کا باعث صرف مخالفت کا جذبہ، عناد یا سیاسی مصالح اور مفادات ہی نہیں ہوتے، اکثر غلط فہمی یا ناواقفیت یا ناقص واقفیت (جسے میں ناواقفیت سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں) اس کی ذمہ دار ہوتی ہے، افراد اور خاندانوں کی سطح پر بھی، ملتوں اور قوموں کی سطح پر بھی اور ملکوں اور سلطنتوں کی سطح پر بھی ایسی غلط فہمیاں، ناواقفیت اور ناقص واقفیت بڑے اہم اور سنگین نتائج کا سبب بنی ہے، اور قوموں، تہذیب وتمدن، سلطنتوں اور مذاہب کی تاریخ اس کی شہادتیں پیش کرتی ہے کہ بعض مرتبہ کسی غلط فہمی، ناواقفیت یا ناقص واقفیت کی بناء پر بے ضرورت جنگیں برپا ہوگئی ہیں، سلطنتیں سلطنتوں سے ٹکرائی ہیں، اور بعض اوقات وحشتیں وحشتوں سے نہیں وحدتیں وحدتوں سے ٹکرائی ہیں۔

مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں بھی نہ ہم کو اس کی ضرورت ہے نہ اس کا شوق ہے کہ ہم ان سب لوگوں کے بارے میں جو ملت اسلامیہ کے دائرے سے باہر ہیں، یا ان گروہوں، عناصر یا مکاتب خیال پر جو مسلم پرسنل لا کے مخالف ہیں اور جو ہندوستان پر یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے داعی اور اس کے حامی ہیں، یہ الزام لگائیں کہ ان میں مخالفت ہی کا جذبہ یا عناد کام کر رہا ہے، میرا خیال ہے کہ اس میں غلط فہمی اور زیادہ تر ناقص واقفیت کو دخل ہے۔

مسلمانوں کے عائلی قانون کی اہمیت اور صحیح حیثیت کیا ہے؟ اس کے متعلق میں دو حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، اور اُن سب حضرات کو جو مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے عادی ہیں، اور ان میں حُب الوطنی کا جذبہ ہے اور ان کا ذہن تخریبی Destructive نہیں بلکہ تعمیری (Constructive) اور حقیقت پسند (Realistic) واقع ہوا ہے، اور وہ صداقت کو قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں دو بنیادی حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، اور اس مؤقر مجلس کے توسط سے صحافت اور ابلاغ عامہ (Public Media) کے سنجیدہ اور ذمہ دار ذرائع سے میں اپنی آواز دور دور تک پہنچانا چاہتا ہوں

۱۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ (Comparative Study) کی روشنی میں جس کا میں ایک طالب علم ہوں۔ ان تمام آسمانی مذاہب کے بارہ میں کہہ سکتا ہوں جو صحیفے رکھتے ہیں، اور جن کے یہاں نبوت کی تاریخ ہے لیکن میرے لیے زیادہ محتاط صورت یہ ہے کہ میں اس دین کی طرف سے عرض کروں جس سے میرا اور آپ کا انتساب ہے کہ اس کی ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں کے ذریعہ، سماجی خدمتگاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Reformers) یا بانیانِ سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن کسی دین میں اور کسی تہذیب، نظامِ فکر، دبستان (School of thought) اور خالص مطالعہ غور و فکر، اور تجربہ کے نتائج میں ایک حدفاصل سرحدی لکیر (Line of Demarcation) ہے، جو ایک کو دوسرے سے جُدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، یہ حدفاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) اُن برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر کے اظہار کے لیے

مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں، جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب و
مدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نا دانستہ طریقے پر بعض بڑے
مہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حدِ فاصل اور امتیازی نشان
یا ہے؟ فلسفہ، سماجیات کا علم (Social Sciences) تہذیب و تمدن (Civilization)
سوسائٹی اور انسانی معاشرہ، یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے ان کا احترام کرتے ہیں،
اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب و تمدن اور فکر و دانش کا ایک مستقل
مدرسہ (School of thought) بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک
دین ہے، اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی
میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور یہ اُن کی زبان اور اُن کا طرزِ فکر نہیں، اس کا بنیادی
چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لیے اسی درجہ قابلِ احترام
اور قابلِ اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لیے اور سارے اُمتیوں کے لیے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝
اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (جو ان
کی طرف بھیجا جاتا ہے) مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ
نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (آپ نہیں جانتے تھے کہ کتنا پڑھنا کیا ہوتا
ہے، ہم نے اس کو ایک نور کی طرح آپ کے سینہ میں اُتارا، اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے
ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔)

اچھے اچھے سنجیدہ اہلِ علم اور اہلِ فکر اس مغالطہ میں ہیں، اس پر انہوں نے اپنی عمریں گذار دیں۔ ایک
کُتب خانہ تیار ہو گیا، اور اس نے غیر ضروری طور پر ایک مہم اور ایک معرکہ آرائی (Conflict) کی شکل اختیار
کرلی ہے، حالانکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں، سیدھی سی بات یہ ہے کہ آپ جس دین کے ماننے والوں کو مخاطب
کرتے ہیں، اُن سے توقع اور مطالبہ کرتے ہیں، ان کو مشورہ دیتے ہیں، پہلے اُن کا مزاج اور اُن کا امتیاز
سمجھ لیں، وہ پیغمبروں کی ایک ایسی جماعت اور اس جماعت ———— کے خاتم اور اس جماعت کے
فردِ اکمل کے تابع ہیں، جس کا رشتہ وحیِ الٰہی سے تھا، اور وہ خود وحی کا انتظار کرتا تھا، بیسیوں حدیثیں ہیں، جو میں
اس وقت آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا کہ لوگ پوچھنے آئے آپ نے کہا انتظار کرو، اور آپ خود انتظار
کرتے رہے، اور بعض مرتبہ تو ایسا ہوا کہ وسائل موجود ہے، اور آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور کسی صحابی
نے اپنے دوست سے کہا کہ دیکھو، تم دیکھنا چاہتے تھے کہ وحی کس طرح آتی ہے تو دیکھ لو، بعض دفعہ ایسا ہوا

کہ ساق مبارک کسی کی ساق پر تھی، اور وحی کا نزول شروع ہوا، وہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ میری ٹانگ ٹوٹ جائے، اتنا بوجھ تھا، اس لیے کہ وحی کے ساتھ ایک بوجھ ہوتا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس مادی دنیا سے آپ کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے، اور آپ کسی اور عالم میں ہیں، اور اس کے بعد آپ نے وحی کے الفاظ سنانے شروع کیے، ایک مرتبہ کفار نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا، آپ نے وحی کا انتظار کیا، یہاں تک کہ کئی روز (پندرہ دن) گزر گئے اور کفار کو اعتراض کا موقع مل گیا، جب سورۂ کہف نازل ہوئی تب اس کا جواب آیا، اور اللہ تعالیٰ نے وہ قصہ سنایا، آپ نے اس طرح سنایا جیسے کوئی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

وحی و نبوت کا فرق اساسی فرق ہے ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضلا سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی، نبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں، کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات ناآشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی کی ذہانت کا انکار ہے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں، عدالت میں پہلی بات یہ طے کی جاتی ہے کہ انہیں بحث کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ یہاں بڑے بڑے تجربہ کار قانون داں موجود ہیں، ان کو پہلے اپنی سند وکالت پیش کرنی ہوتی ہے اگر معلوم ہے فاضل جج کو کہ یہ باقاعدہ قانون کے فاضل ہیں اور سند رکھتے ہیں وکالت کی، اور مقدموں میں آتے رہتے ہیں تو ضرورت نہیں، لیکن پہلی مرتبہ کوئی وکیل یا بیرسٹر جائے گا تو یہ اطمینان کیا جائے گا کہ یہ قانون کا طالب علم رہا ہے، اور قانون کی سند اس کے پاس ہے یا نہیں، پھر یہ دیکھا جائے گا کہ موکل نے بھی اس کو اپنا ترجمان بنایا ہے یا نہیں، لیکن دین کا معاملہ عجیب و غریب ہے کہ اس کی حقیقت معلوم کیے بغیر اس کی تاریخ معلوم کیے بغیر، اس کی رُوح معلوم کیے بغیر ہر شخص اپنا حق سمجھتا ہے کہ اس کے بارے میں مشورہ دے، اور یہاں تک کہ ترمیم اور اصلاح کا مطالبہ کرے، اور اگر اس کو قبول نہیں کیا جاتا تو اس دین کے ماننے والوں پر جمود و جہالت کا الزام لگایا جاتا ہے اور ان کو کم عقل ثابت کیا جاتا ہے۔

میں اصلاً مذہب کا طالب علم ہوں، زیادہ سے زیادہ تاریخ و ادب کا طالب علم ہوں، میں کسی وقت یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ کسی ایسے فن یا مسئلہ میں دخل دوں جس کے مبادی (Fundamentals) سے بھی میں ناواقف ہوں، اگر کوئی شخص سائنس کے مبادی، فزکس کے مبادی یہاں تک کہ ریاضی (Mathematics) کے مبادی سے (جو روزمرہ کی ضرورت ہے) ناواقف ہے تو دنیا کا کوئی پڑھا لکھا انسان اس کو اجازت

نہیں دے سکتا کہ وہ یہ کہے کہ فلاں ماہر ریاضی نے یہ نتیجہ جو نکالا ہے غلط ہے، لیکن کیا مذہب ہی ایک ایسی چیز رہ گئی ہے کہ اس کے متعلق جس کا جی چاہے، جس وقت جی چاہے اور جس انداز میں جی چاہے مشورہ دیا جائے، اس کی ترجمانی کی جائے، اور اس میں خامیاں نکالی جائیں اور اس میں ترمیمات پیش کی جائیں، اس سے پورے نظام علم پر اثر پڑے گا، عصر حاضر کا سارا نظام اعتماد و اختصاص (Specialization) پر چل رہا ہے کیا مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کے ماہرین خصوصی کی کوئی قیمت نہیں؟ پھر مذہب کی ایک زبان ہوتی ہے، مذہب کے اصطلاحات ہوتے ہیں، اس کے الفاظ کے اعماق (گہرائیاں) و آفاق (وسعتیں) ہوتے ہیں، اس کی نفسیات ہوتی ہیں، یہ ساری چیزیں جانے بغیر کوئی شخص بھی (خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو اور کسی گروہ کا آدمی ہو) اگر کہتا ہے کہ صاحب، مسلمانوں کے عائلی قانون کا فلاں مسئلہ غلط ہے تو وہ اپنے حدود سے تجاوز کرتا ہے، وہ پورے سیاق و سباق سے ناواقف ہے اس توازن و تناسب سے ناواقف ہے جس کا لحاظ رکھا گیا ہے، آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر ایک مکمل ڈھانچہ اور جامع ماحول کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو اس کو مجموعی طور پر دیکھنا ہوتا ہے، حالت یہ ہے کہ جو راہ پر کھڑے ہو کر (اور یہ اخبارات بھی ایک طرح کے گھومتے پھرتے چوراہے ہیں) جس کا جی چاہتا ہے قلم اٹھا کر لکھ دیتا ہے، اس سے ایک انارکی پیدا ہوتی ہے، ذہنی انارکی سیاسی انارکی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ملکوں کی تاریخ میں پولٹیکل انارکی سے پہلے مثل انارکی اور اخلاقی انتشار پیدا ہوتا ہے، اسلام کے بارے میں ذمہ دارانہ طور پر عرض کرسکتا ہوں کہ اس کا ایک طالب علم ہوں، فاضل نہیں کہتا لیکن مانا ہوا طالب علم ہوں، اور یہ بال اسی طالب علمی میں سفید ہوئے ہیں کہ دین کے متعلق پہلے اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے، شریعت آسمانی ہے، اس کے لانے والے پیغمبر ہیں، یہودی تک اپنے دین و ملت کے بارے میں غیور واقع ہوئے ہیں آپ کسی یہودی سے یہ کہہ کر دیکھئے کہ تمہارا یہ مسئلہ غلط ہے، تمہارا یہ قانون غلط ہے، تو وہ کہے گا کہ ہمارے قانون کا تعلق شریعت موسوی سے ہے بائیبل سے ہے، ہم تو اس کے پابند ہیں، ساری دنیا بھی اگر کہے کہ یہ غلط ہے تو ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں، چنانچہ آج بھی اسرائیل کا پورا نظام معاشرت، اور ان کا عائلی قانون اسی پر چل رہا ہے۔

پھر اس مسئلہ پر ملک اور اہل ملک کی توانائی کیوں ضائع کی جارہی ہے ملک اور اہل ملک کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ غیر ضروری ذہنی انتشار، بدگمانی اور خوف کی فضا ختم کی جائے کوئی ملک اس طرح ترقی نہیں کرسکتا کہ اس کی آبادی کے مختلف عناصر میں مستقبل کے بارے میں شکوک و شبہات ہوں، اور اس سے بڑھ کر ملک کے لیے بدخواہی نہیں ہوسکتی کہ ا

توانائی جو ملک کی سالمیت، اس کی حفاظت اور تعمیر و ترقی میں صرف ہونی چاہیے تھی، وہ شکوک و شبہات کو رفع کرنے میں یا شکوک و شبہات کی فضا میں زندگی گزارنے میں خرچ ہو، میں ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم اس اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری آئندہ نسل ہماری طرح ان چیزوں کی معتقد اور ان پر یقین کرنے والی نہیں ہوگی جن پر ہم اعتقاد رکھتے رہیں، اور جو ہمارے لیے ضروری ہیں تو مسلمانوں کے اندر ایک تذبذب اور اندرونی انتشار کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جو صرف مسلمانوں کے لیے مضر نہیں ملک کے لیے بھی مضر ہے، یہ ہرگز دانشمندی کی بات نہیں ہے کہ جب ملک میں کوئی مصیبت نہیں آئی، کوئی سائیکلون نہیں ہے، کوئی ایمرجنسی کی کیفیت نہیں ہے، کوئی آسمان سے اولے یا گولے نہیں برس رہے ہیں کسی نے اس لیے حملہ کیا ہے کہ آپ مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کرائیے ورنہ ہم اس ملک پر قبضہ کرتے ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی جائے؟

۲۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے اس بارہ میں مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انہوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ ہے، اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے جامع بھی قرآن شریف میں ہے، يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ۔ (اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔)

یہاں تحفظ نہیں رزرویشن نہیں کہ اتنا آپ کا اتنا ہمارا، اتنا ملک کا، اتنا اسٹیٹ کا، اتنا خدا کا، اور اتنا خاندان اور قبیلہ کا، اتنا دین و ملت کا اور اتنا سیاسی مفادات کا نہیں، جو کچھ ہے سب خدا کا ہے، یہاں سب عبادت ہی عبادت ہے، مسلمان کی پوری زندگی عبادت ہے مسلمان کی پوری زندگی خدا کے سامنے عاجزانہ غلامانہ ہے، اسلام خدا کے سامنے مکمل سپردگی اور اپنے کو surrender بلا شرط حوالہ کرنے کا نام ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت وراثت میں ہمارے اقتصادی حالات کا تقاضہ کچھ اور ہے، یہاں کی مجبوریاں یہاں کے تمدنی تقاضے، معیار زندگی اور ہمارے خاندان کی پچھلی تاریخ، یہ سب اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم وراثت تقسیم نہ کریں، ہم اس زمین کو اسی طرح باقی رکھیں، کم سے کم لڑکیوں کو حصہ نہ ملے اس لیے کہ شادی کے بعد یہ حصہ ان کے گھروں کو چلا جاتا ہے، اس کا بالکل اختیار نہیں، اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دین کا دائرہ پوری زندگی پر حاوی ہے، اور اس میں کسی کو بھی ترمیم کرنے کا حق نہیں، بڑی سے بڑی عدالت
بڑی سے بڑی قوت حاکمہ، اور بڑی سے بڑی ہیئت منتظمہ اور بڑی سے بڑی دانش گاہ اور یہاں تک کہ
بڑے سے بڑے مجتہد اور امام وقت کو بھی ان چیزوں میں جو قرآن مجید میں منصوص و قطعی ہیں ایک لفظ، ایک
نقطہ کی ترمیم کرنے کی اجازت نہیں ہے، یہ سارے علماء بیٹھے ہوئے ہیں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں، اور
اگر یہ بات غلط ہے تو ان کا دینی تبحر اور احساس فرض انہیں مجبور کرے گا کہ یہ میری تردید کریں۔
ان دو حقیقتوں کو سمجھ لیا جائے کہ ایک تو یہ کہ یہ دین ہمیں وحی سے ملا ہے، پیغمبر کو بھی اس پر عمل کرنے کا
حکم ہے، قرآن مجید میں صاف صاف آتا ہے۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ
اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ (اے پیغمبر! ہم نے آپ کو دین کے خاص طریقہ (شریعت) پر کر دیا ہے
تو آپ اسی پر چلتے جائیے، اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔)
نبی معصوم اور نبی محبوب سے یہ کہا جا رہا ہے تو ہم سے کیسے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم شریعت
کو بدل دیں۔
یہ دو حقیقتیں ہیں جن کو سمجھنے کے بعد اس غلط فہمی کا پردہ ہی چاک ہو جاتا ہے اور ایک غیر ضروری صورت
حال کا مقابلہ کرنے اور اس پر اپنی ذہانت صرف کرنے سے ہمیں چھٹی مل جاتی ہے، اور ملک و حکومت کو دوسرے
ضروری کاموں کے لیے وقت بچ جاتا ہے۔
ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کے لیے، سالمیت کے لیے اور مشترک وطنی شعور کے
لیے ضروری ہے کہ ایک مشترک واحد عائلی قانون (Uniform Civil Code) نافذ ہو، تو میں ایک
سیدھی سی بات پوچھتا ہوں، اسکول کا بچہ بھی اس کا جواب دے سکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم جو ہوئی تھی،
اصلاً و ابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں بلکہ
پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون بالکل ایک ہے، یہ کوئی بھی شخص معلوم کر سکتا ہے کہ جہاں تک
قانون کا تعلق ہے ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ
کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہیئے تھا، پھر
جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ کرسچین اور پروٹسٹنٹ جن کی تہذیب بھی، عائلی قانون بھی بلکہ معاشرت بھی
ہے۔ وہ اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی
آیئے کہ جو مقدمے آتے ہیں، مسلمان مسلمان کے خلاف مدعی ہے، مسلمان مسلمان کا مدعی علیہ ہے، اور
مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا

قانون بھی ایک ہے بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت سے ہے، دولت پرستی کے جنون سے ہے، نفس پرستی اور مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے، جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعہ ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑیگا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیئے تاکہ آپس میں اتحاد و الفت پیدا ہو۔

حضرات! جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا اس گروہ اور خاندان سے تعلق ہے جس نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور بیش از بیش حصہ لیا، کلکتہ کی یہ سرزمین خاص طور سے اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ ایمانی قافلہ حجاز جاتے ہوئے یہیں سے گذرا تھا، اسی خلیج بنگال سے روانہ ہوا تھا، اور اپنے مستقر سے یہاں تک ایمان، توحید و سنت اور دینی حمیت کی روشنی پھیلاتا ہوا آیا تھا، اسی نے سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی روح پھونک دی، قرآن کہتا ہے کہ تمہیں عصبیت اور بغض اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے دو، اور تعصب و حق پوشی سے کام لو۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔)

انگریز اس بارہ میں زیادہ حقیقت پسند تھے، انہوں نے جب ہندوستان میں حاکمانہ طریقہ پر قدم رکھا تو انہوں نے اچھی طرح یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے عائلی قانون میں دخل نہیں دینا چاہیئے، ان کو اس میں آزاد رکھنا چاہیئے۔ اسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں محمڈن لا کا اتنا بڑا کام ہوا، اسی کلکتہ کی سرزمین پر اور خاص طور پر یادش بخیر رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی کے ہاتھوں اور سر عبد الرحیم وغیرہ کے ذریعہ ہوا، انگریزوں نے وہ کام بڑی عقلمندی کے کیے، انہوں نے اس بات کو پا لیا کہ بے ضرورت جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہیئے اور مشکلات نہیں پیدا کرنے چاہئیں، یہ ایک ایسی قوم کا طرز عمل ہوتا ہے جو حکمرانی کا تجربہ رکھتی ہے، انہوں نے دو باتیں طے کیں، ایک تو یہ کہ عائلی قانون اور مذہب میں مداخلت نہیں ہونی چاہیئے، دوسری بات یہ کہ نظام تعلیم سیکولر ہونا چاہیئے کہ بلی کتے کے قصے پڑھاؤ مگر کسی دوسرے مذہب کی تلقین نہ کرو ہم نے انگلش پرائمر اور ریڈریں پڑھی تھیں، ان میں شروع سے اخیر تک یہ دیکھا کہ جنوں اور بھوتوں پریوں تک کے قصے اور

کی بات کرتے ہیں

انے آئے، جانوروں کے قصے آئے لیکن کہیں یونانی رومن دیومالا (Mythology

نا روحی کی بات نہیں آئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اطمینان کی کیفیت رہی، وہ بنیادیں دوسری تھیں جن بنیادوں
ہندوستان کے مسلمانوں نے اور دوسرے عناصر نے مل کر یہاں غلامی کا جوا اپنے سر سے اتار کر پھینک دیا
در جنگِ آزادی لڑی، ان دونوں دانشمندانہ فیصلوں نے ان کی حکومت کی بقاء میں مدد کی اور اس کی مدت کو
دراز کیا، ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ جو واقعہ ۱۸۵۷ء میں
پیش آیا وہ ۱۸۰۰ء میں پیش آسکتا تھا، اور پیش آنا چاہیئے تھا، اور انیسویں صدی کے بالکل اوائل میں پیش
آجانا چاہیئے تھا، یہ سو برس سے زائد جو انہوں نے یہاں اطمینان سے حکومت کی، اس میں ان کی اس دانشمندی
کو دخل ہے کہ باشندگانِ ملک کی مذہبیات میں ان کے عائلی قانون میں دخل نہ دو، ان کے نظامِ تعلیم
میں دخل نہ دو، ان کو سیکولر طریقہ پر پڑھاؤ، اپنے اپنے مذہب کے مطابق یہ عقیدہ رکھیں، عمل کریں۔

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کر لیں گے
تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اور اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ
نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظامِ معاشرت و تہذیب
سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ
سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر موثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسجد میں آپ مسلمان ہیں (اور
مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہنا ہے اپنے سارے شوقِ عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات
میں مسلمان نہیں، اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت
نظامِ تمدن، اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے
جیسے دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہیئے، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا
دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے
کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہارِ خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے

آخر میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کا نیز آپ کی توجہ و التفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے
خیالات کے بے لوث و آزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا و آخر دعوانا ان

الحمد للہ رب العالمین ۝

بشکریہ:- تعمیرِ حیات لکھنؤ


ہردانہ منتخب
فریش ویل
بادام اور پستہ
نمکینیت کے تتے پہلو اور
بھرپور ذائقے کے ساتھ
Freshwell
ناشتے پر
چائے پر یا کسی بھی وقت
لذت میں ایک خوشگوار اضافہ
جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر
پیک کیے جاتے ہیں۔
سیل بند ڈبے کو کھولنے کا سہل ترین
طریقہ پاکستان میں پہلی بار
ہم نے متعارف کرایا۔
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
MASS

دِل افگندیم

قسط ۳

بسم اللہ مجرٖہا و مُرسٰہا

مولانا سعید الرحمٰن علوی

ان دو طبقات کے علاوہ بعض دوسرے طبقات!!

ان دو طبقات کے علاوہ ایک طبقہ ان رجالِ کار اور اعاظم اُمت کا ہے جنہوں نے ہر نئے فتنے کے سامنے بند باندھا۔ اُمّت کی تاریخ میں قدریت، جبریت، تجسیمیت، جہمیت، اعتزال، خلقِ قرآن، رفض، باطنیت، خارجیت اور دینِ الٰہی وغیرہ کے نام سے جو طوفان اٹھے، اللہ تعالیٰ نے ان کا مقابلہ کرنے اور ان کا رُخ موڑنے اور امّت کو ان کے مسموم اثرات سے بچانے کی غرض سے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل سے لے کر حضرت مجدّد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم وما بعد تک جن شخصیات سے کام لیا، انہیں کون سے پردے میں چھپایا جائے گا، اگر امام اہلِ سنّت اور فقہ کے ایک دبستان کے امام "احمد بن حنبلؒ" نہ ہوتے تو فتنۂ خلقِ قرآن کا عالمِ اسباب میں کیا بنتا! اور برِ عظیم میں فسادِ ذہنیت کا شکار علماء و مشائخ کے سبب جو گمراہی دینی حوالہ سے پھیلی اس کے سامنے روک بننے والے مجدّدِ سرہندی کا مقام کتنا عظیم ہے؟

ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی اَلَم نَشرَح ہے کہ قرآن و سنّت کے "تزکیہ و احسان" کی صفات کی غرض سے مصلحین کا ایک طبقہ ہر دَور میں موجود رہا جن کا ورثہ "علمِ تصوّف" کے نام سے معروف ہے، یہ حضرات تاریخِ اسلام کی زندہ اور متحرک شخصیات ہیں، جن کے سوزِ دروں نے امّت کے عام لوگوں کو روحانی اور مہلک امراض سے بچانے کی سعی و جد و جہد کی۔ تصوّف سے اس لئے الرجک ہونا کہ ایسی بات یونان و ہندوستان میں بھی تھی یا یہ کہ تصوّف کے نام پر بعض حضرات کا رویہ صحیح نہیں، عجیب سی بات ہے، سلوک و تصوّف ایک حقیقت ہے۔ کوئی شخص اپنے بُرے مقاصد کے لئے اس کا نام لیتا ہے تو وہ گردن زدنی ہے نہ کہ تصوّف و صوفیاء و مشائخ!

مولانا ابوالحسن علی میاں مدظلہٗ نے ان جملہ طبقات کی خدمات اور قربانیوں کی تفصیل

سے تذکرہ کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہی لوگ گلشنِ اسلام کے وہ سدا بہار پھول ہیں جن کی رنگینی و خوشبو سے اب بھی مشامِ جاں معطر ہے اور گوشہ چمن مہک رہا ہے۔

الف ثانی کی تجدید اور برِعظیم پاک و ہند

ان اوراق میں تفصیل بڑی مشکل ہے، ہم اپنا رُخ گیارھویں صدی کی طرف موڑتے ہیں، جب "الف ثانی" کی تجدید کا سہرا ایک ہندی نژاد کے سر بندھا، مشرقی پنجاب کے خطہ سرہند سے اٹھنے والی ایک عبقری شخصیت اس خطہ میں "بابِ تجدید" کے وا ہونے کا سبب بنی اور پھر قدرت کی نیرنگیاں ہیں یہ سلسلہ اب تک مرکزیت کے اعتبار سے اسی خطہ میں گھوم رہا ہے۔ سقوطِ بغداد کے بعد عالمگیر نوعیت کی دوسری شکل اسی صدی میں پیش آئی اور اسی سے وہ عظیم الشان انسان اٹھا جس نے صدی کا نہیں الف ثانی کا مجدد بن کر دنیا کو ظلمات سے بچایا۔ ہمایوں کے ساتھ تعاون کے نام پر جو فتنہ ایران سے نکل کر پورے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لینے کی فکر میں تھا اور جس کے اثرات آگے تک پھیلنے کا اندیشہ تھا اس سند باندھا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے۔ اور اسی پر بس نہیں بلکہ آئندہ چل کر نصرانیت کی شکل میں جو طوفان بڑھنے والا تھا، جس کا ایک مشاہدہ "اکبر" کے جشنِ نوروز میں فرنگیوں کی آمد سے ہو چکا تھا۔ اس کا ذکر اپنے مکتوبات میں "کافر رنگ" کے عنوان سے کرنا خداداد بصیرت کا شاہکار ہے۔

حضرت الامام مجدد الف ثانیؒ

یہ خطہ مصدقہ تاریخی روایات کے مطابق دورِ صحابہ میں ہی اسلام کی نورانیت سے کسی درجہ میں منور ہو چکا تھا اور حضرت الامام مجدد سے قبل بھی یہاں کے محدثین و فقہاء اور اربابِ دعوت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن نظریاتی فتنوں کے خلاف بند باندھنے کی جس طرح کی ہمت آپ کو ہوئی اور حکومت کا رُخ جسطرح آپ نے بدلنے کا انداز اختیار فرمایا وہ آپ کا ہی کا حصہ ہے۔ ادھر آپ ہی کے پیر بھائی حضرت الشیخ عبدالحق محدث دہلوی نے سرمایۂ حدیث کی اشاعت و تدریس کا اسی دور میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ کر اہتمام کیا۔

ان حضرات کی سعی و کاوش سے حالات رو بہ اصلاح ہوئے، ملک میں امن کی کیفیت پیدا ہوئی، زندگی کے تغیر پذیر تقاضوں کے سبب فقہ اسلامی کی تدوینِ نو کا کام ہوا اور بہت سی برکات ظہور پذیر ہوئیں ـــــ مغلیہ خاندان کے ایک اہم فرماں روا غازی اورنگزیب عالمگیر مرحوم کی وفات سے ۴ سال قبل حضرت شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے جو بقول مولانا عبیداللہ

سندھی علیہ الرحمہ حضرت مجدد الف ثانی کے کام کے آگے بڑھانے والے اور ان کے مشن کی تکمیل کرنے والے تھے۔

ذکر مولانا سندھیؒ کا

تاریخ کی بہت سی مظلوم شخصیات کے دائرہ میں مولانا سندھی کا نام بھی آتا ہے جنہوں نے سکھ مت چھوڑ کر اسلام قبول کیا، بھرچونڈی امروٹ (سندھ) اور دین پور (بہاولپور) کی خانقاہوں سے علم وعرفان کے موتی لوٹتے دیوبند پہنچے، گذشتہ صدی کے مجدد اکبر شیخ الہند مولانا محمود حسن کی حسنِ تربیت نے اس شخص کو قرآن کے علوم ومعارف کا ماہر بنا دیا ادھر بارہویں صدی کے مجدد کبیر امام ولی اللہ کی حکمت انقلاب دفکر کا سب سے بڑا داعی اور شارح۔ یہ شخص جس کی رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی تھی ملکوں ملکوں پھرا۔ اور بیسویں صدی کے انقلاب روس کے علمبرداروں کے دروازہ تک پہنچ کر انہیں اسلام کے پیغام حیات سے آگاہ کیا لیکن افسوس کہ اس کی درس گاہ کے بعض عزیزوں سے لے کر ندوہ اور جماعت اسلامی تک نے اسے معتوب قرار دیا اور مولانا مسعود عالم ندوی نے (جو ندوہ وجماعت کے بیک وقت خوشہ چیں تھے) تو ایسی ظالمانہ تنقید کی کر الاماں۔ موصوف تنقید میں اسلام کے اصولِ عدل و اعتدال تک کی رعایت نہ رکھ سکے۔ اس تنقید کا مؤثر علمی اور شافی جواب مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے دیا ــــــ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سندھی کو (دیکھیں "الفرقان" شاہ ولی اللہؒ نمبر) شاہ ولی اللہؒ کا سب سے بڑا شارح اور رازداں کہتے ہیں، اور مولانا سندھی کی رائے یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کا کام وہی ہے جو مجدد الف ثانی کا تھا، وہی مشن، وہی فکر وہی سوچ۔

امام ولی اللہ دھلوی کا مجددانہ رول

امام ولی اللہ نے سیاسی انقلاب کی کوششیں کیں جس کا ثبوت "خلیق احمد نظامی" کے مرتب کردہ "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" سے ملتا ہے۔ یہ ذخیرہ نظامی صاحب کو دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کے کتب خانہ سے فراہم ہوا۔ احمد شاہ ابدالی اور نواب نجیب الدولہ سے ربط وضبط سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب یہ محسوس کر گئے تھے کہ کوئی انقلاب اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کی پشت پر مخلص اور بے لوث رضا کاروں کی فوج نہ ہو۔ مروجہ اصطلاح میں کوئی باقاعدہ فوج کتنی ہی متمدن اور چاق وچوبند ہو، وہ کامیاب نہیں قرار پا سکتی۔ کامیاب وہی فوج ہوتی ہے

جو رضاکارانہ بنیاد پر منظم ہو اور جس کی اپنی فکری تطہیر ہو چکی ہو۔

ولی اللّٰہی فکر پر انقلابی جماعت کی تشکیل !!
یہی وجہ ہے کہ آئندہ چل کر شاہ صاحب کے فکر پر جو کام ہوا اس میں ایسی ہی فوج کا اہتمام کیا گیا۔ (امام ولی اللہ دہلوی کی تعلیمات ان کی تحریک اور ان کے افکار کو سمجھنے کیلئے "الفرقان" کے شاہ ولی اللہؒ نمبر کا مطالعہ مفید ہوگا، ادھر مولانا سندھی کی کتابیں تو اس سلسلہ میں کلیدی اہمیت کی حامل ہیں بالخصوص شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک اور محمودیہ) حضرت مجددؒ الف ثانی کے خدام و اہل تعلق نے وسطی ایشیا کی ریاستوں سے لے کر شام تک میں تجدیدی مساعی کا فرض سرانجام دیا تو امام ولی اللہ کے روابط حرمین شریفین تک نظر آتے ہیں، حرمین کے اساتذہ کا یہ کہنا کہ یہ شخص ہم سے الفاظ لیتا ہے لیکن ہمیں مفہوم و معانی سے آگاہ کرتا ہے " جہاں شاہ صاحب کی بصیرت علمی و روحانی کی دلیل ہے وہاں اس کے پس منظر اور تہہ منظر میں اور بہت کچھ نظر آتا ہے اور کیا عجب کہ اس خطہ میں آئندہ جو انقلاب آیا اس کی تہہ میں بالکلیہ نہیں تو کسی درجہ میں ولی اللّٰہی افکار کی بو تحقیق کے بعد کوئی محسوس کرلے ——— یہ بات کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب یا اس کے متعلقین میں سے کسی نے اس کا اشارہ نہیں کیا، بے وزن سی بات ہے، ضرورت ہے کہ تاریخ کے اس دلچسپ معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

شاہ ولی اللہؒ اور شیعہ
خود برِّعظیم کا معاملہ ایسا تھا کہ اس میں اندرونی انتشار جوبن پر تھا۔ ایرانی عمائدین جو پوری طرح چھا چکے تھے ان کی خفیہ ریشہ دوانیاں رنگ لا رہی تھیں اور وہ لوگ تاج و تخت ہی کے مالک بن کر نہ بیٹھ گئے تھے بلکہ انہوں نے نظریاتی بنیادوں کو ڈھانا شروع کر دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے "ازالۃ الخفاء" اگر لکھی اور پھر "قرۃ العینین" لکھی تو بلاوجہ نہیں اور ان کے فرزند گرامی شاہ عبدالعزیزؒ نے "تحفہ اثنا عشریہ" لکھی تو بھی اس غرض سے کہ ایک ایسا فتنہ جو اس خطہ کا نہیں ساری دنیا کا عظیم فتنہ ہے، اس کا سدباب ہو سکے۔ اے کاش کہ اس دور کے اہلسنت اور مابعد کے مقتدایانِ فکرِ ولی اللّٰہی اس ایرانی فتنہ کا تدارک کر سکتے تو آج یہ حال نہ ہوتا ———
" تفہیماتِ الٰہیہ " کا ایک مقام ملاحظہ فرمائیں جہاں امام ولی اللہؒ روحِ محمدی علیہ السلام سے استفادہ کرتے ہوئے بہت سی حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں حتیٰ کہ شاہ صاحب بول اٹھتے ہیں :

در حقیقت ختم نبوت را منکر اند گو بزبان آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم را
خاتم الانبیاء میگفتہ باشند صہ ۲۴۴

شاہ ولی اللہؒ کی فکر میں مسئلہ معاش کے حل کے لئے کاوشیں

ادھر شاہ صاحب کی بصیرت اور فراست مومنانہ انقلاب روس کے فکری بانیوں کی پیدائش سے بھی بہت قبل ان مسائل کی طرف حقیقت پسندانہ توجہ دلانے کی سعی کرتی نظر آتی ہے جن کا تعلق اسلام کے عدل اجتماعی کے حصہ معاشیات سے ہے۔ کوئی حجۃ اللہ البالغہ کے "ابتغاء رزق کے ابواب ملاحظہ کرے اور پھر سوچے کہ رزق کی مساوی تقسیم اور اس معاملہ میں اسلام کے عادلانہ فکر کی اس سے اچھی تعبیر ممکن ہے! مولانا مناظر احسن گیلانی سے لے کر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تک، اور اب زندہ حضرات میں سے مولانا محمد تقی امینی سے لے کر مولانا طاسین تک، یہ حضرات اسی فکر کے علمبردار ہیں جو تجارت وزراعت وغیرہ کے معاملات میں قوم کو سنجیدہ انداز اپنانے کی توجہ دلا رہے ہیں۔ اس پورے خطہ کا المیہ یہ ہے کہ یہاں کیمونزم کا ہوا تو ہر کوئی دکھاتا ہے لیکن اس "فتنہ عمیا" کو رد کا کیسے جائے، اس کی طرف توجہ کسی کی نہیں ہوتی۔ اگر حفظ الرحمٰن جیسا کوئی شخص قلم اٹھاتا ہے تو اس پر کیمونسٹ ہونے کی پھبتی کسی جاتی ہے اور عبید اللہ سندھی کے ایمان تک کو معرض خطر میں لاکر چھوڑ دیا جاتا ہے ۔۔۔ حالانکہ مسئلہ اسی طرح حل ہوگا جس طرح سیدنا ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا کہ روزینہ تو ہر شخص کو برابر ملے گا، اس میں کسی چھوٹے بڑے کی تمیز نہ ہوگی، رہ گیا معاملہ کسی کے سابق فی الاسلام ہونے کا یا اس کی خدمات اسلامی کا تو اس بنیاد پر وہ اللّے تللّوں کا مستحق نہیں، اس کا صلہ واجرہ رب العزت کی بارگاہ سے ملے گا۔

امام ولی اللہؒ نے اسی صدیقی فیصلہ کو بنیاد بنا کر یہ ابواب قلم بند کئے اور انہی بنیادوں پر شاہ صاحب کے فرزندان روحانی نے عمارت استوار کرنے کی فکر کی ۔۔۔ اے کاش وہ اہل سیاست جو اس خانوادہ کا نام لیتے ہیں، وہ ہی کم از کم اس کی فکر کرتے؟

مغرب سے اٹھنے والا فتنہ جبر اور شاہ ولی اللہؒ

شاہ صاحب نے "الفوز الکبیر" میں اصول تفسیر بیان کرتے ہوئے اہل کتاب کے ساتھ محاکمہ کی جو گفتگو کی، کیا وہ محض نظریاتی بحثیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ اس شخص نے شاہ ولی اللہؒ کو سمجھا ہی نہیں، وہ محض اندھیروں میں

بھٹک رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے اور ہم اس پر بوقت ضرورت تفصیل سے گفتگو کر سکتے ہیں کہ اگر مشرقی فتنہ کا سر کچلنے کے لئے (جو معاش کے حوالے سے آنے والا تھا) حجۃ اللہ البالغہ کی معاشی پالیسی کارگر ہو سکتی ہے تو مغرب کی طرف سے آنے والا فتنہ (بصورت غلبہ و استیلاء سیاسی) الفوز الکبیر کی ان ابحاث کی روشنی میں کچلا جا سکتا ہے۔ گویا مشرقی، مغربی اور اندرونی تینوں ہی فتنوں کی نشاندہی اور ان کے سدباب کا اس رجل رشید نے سامان فراہم کیا۔

شاہ عبدالعزیز کی نگرانی میں حضرت سید صاحب کی تیاری

اسی سروسامان کی روشنی میں شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرکزی قوت کا رول ادا کر کے "فک کل نظام" کی عملی شکل کی غرض سے تحریک جہاد و مجاہدین کی داغ بیل ڈالی اور اس کے لئے "طالوت" کا کردار ادا کرنے کی غرض سے رائے بریلی کے ایک باہمت، جفاکش اور مردِ حُر "سید احمد" کو چنا جسے امام کبیر، مجاہد اعظم اور امیر المؤمنین کا نام و لقب دیا جاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ "ہندوستان دارالحرب" کو فوز الکبیر کی روشنی میں سمجھا جائے اور پھر اگلی تحریک کو غور سے پڑھا جائے۔ مولانا غلام رسول مہر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر قیام الدین پٹنہ اور مولانا سید محمد میاں کی کتابیں سید صاحب کی اس پوری تحریک کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔ کس طرح رضاکارانہ بنیادوں پر قافلہ ترتیب پاتا ہے اپنی روحوں کی بالیدگی کی غرض سے کس بے سروسامانی کے عالم میں حرمین شریفین حاضری دی جاتی ہے اور خود ہندوستان کے مرکزی حصوں میں کس طرح دورے کئے جاتے ہیں ـــــــ

شاہ عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے اپنے خاندان کے ذمہ دار افراد کو جو علم و عمر میں سید صاحب سے کہیں بڑھ کر تھے سید صاحب کے دامن سے وابستہ کیا۔ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڈھانوی اور امام المجاہدین حضرت السید محمد اسمٰعیل شہید حنفی (محض علمی مطالعہ کے طور پر ملاحظہ کر لیں کشف الحجاب صہ۲۴ از قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پت "کان متبعاً حنفیاً" نیز الحطہ از سید نواب صدیق حسن والیٔ بھوپال کا صہ۱۷ "اقتضی اثر جدہ فی قولہ وفعلہ جمیعاً" (ہر قول و فعل میں اپنے دادا کی پیروی کی) نیز تنبیہ الضالین صہ۸۶-۸۹ مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے استاذِ محترم مولانا عبدالخالق کا ارشاد کہ تنویر العینین ان کی شہادت کے بعد ان سے منسوب کر دی گئی...... الخ ھکذا فی "حیاتِ طیبہ" صہ۲۶۶ از مرزا حیرت دہلوی)، اس کی سب سے بڑی شہادتیں ہیں ـــــ سید صاحب

نے بھرپور تیاری کے بعد راجستھان، سندھ اور کہاں کہاں کے مشکل سفر طے کر کے سرحدی علاقوں کو اپنا مرکز بنایا اور پشاور سے عملی جہاد کا آغاز کیا —— مرحوم سید سلیمان ندوی نے مولانا علی میاں کی کتاب سیرت سید احمد شہید کے مقدمہ میں جس دردِ دل سے ایک فقرہ لکھا ہے اس کی گرمی آج بھی محسوس ہوتی ہے، فرمایا:

"اگر خوانینِ پشاور وسمہ وفاداری کا مظاہرہ کرتے تو نقشہ ہی دوسرا ہوتا"

حضرت سید احمد شہید کی محنت کے اثرات —— !!

لیکن افسوس کہ بیگانوں سے بڑھ کر اپنوں کی بیوفائیاں سدِّ راہ بنیں —— اذا ھبّت ریح الایمان" مولانا علی میاں کی عربی کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ "جب ایمان کی بہار آئی" کے نام سے چھپ چکا ہے، اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برِّ عظیم کے مرکزی علاقوں بہار، بنگال، یوپی وغیرہ میں کس طرح ایک انقلاب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے اکابر مشائخ شاہ عبدالرحیم سہارنپوری اور حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی سے لے کر علماء صادق پور جیسے اساطین علم و امارت تک سید صاحب کے دامن سے وابستہ تن من دھن قربان کرنے پر آمادہ ہیں —— لیکن افسوس کہ جس علاقہ کو مرکز بنایا گیا اس کے اساطین حکومت و امارت جھوٹی اور وقتی خوشیوں کے لئے ان مردانِ حر کے سدِّ راہ بنے، پشاور میں ایک ہی رات میں سید صاحب کے سینکڑوں قیمتی رفقاء کے قتل سے لے کر سید صاحب کو زہر دینے تک اور پھر مشہد بالاکوٹ تک ایک ایک منزل ان ستم کیش لوگوں کی بیوفائیوں کا پتہ دے رہی ہے —— تاہم سید صاحب نے جو مشعل جلائی، علماء صادق پور اور دوسرے حضرات نے اسے برابر روشن رکھا۔ چمرقند کا مرکز انہی بلا نوشانِ محبت کی آماجگاہ تھا۔ ادھر بہار و حیدر آباد دکن اور پھر بنگال میں فرائضی تحریک اور مختلف حوالوں سے وہی روشنی کام آ رہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں سید صاحب کی تحریک سے بڑھ کر ایمان و یقین پیدا کرنے اور دینِ اسلام کے غلبہ کی کوئی تحریک نہیں ابھری اور اپنے معصوم بچپن کے دور میں وقت کے ایک عظیم روحانی قائد و پیشوا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ (جن کی خدماتِ عالیہ کی ایک طویل داستاں ہے) کی زبان سے اس سلسلہ میں جو لفظ سنے اور حضرت کے خدام حضرت السید نفیس شاہ صاحب اور حاجی متین احمد صاحب (حضرت کے میزبان) سے پھر اس کی تصدیق کی —— تو دل کو دھچکا لگا اور دنیا دور دور اندھیرے کا شکار نظر آئی —— امام وقت شاہ عبدالقادر نے فرمایا کہ سید صاحب

کی اس عظیم الشان جد وجہد کا جو حال ہوا، اسے دیکھ کر تو اب طبیعت سرد ہی ہو کر رہ گئی ہے کہاں کو ایسے دیوانے اٹھیں گے جو اس طرح "لَسْتُ أُبَالِي حِيْنَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا" کا رجز خواں" رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھ کر حالات کے دیو استبداد و جبر سے ٹکرا جائیں گے ___ تاہم مایوسی نہیں : لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

سید صاحب کے بعد کے اہم اقدامی مراحل!!!

مسلح انقلاب کی جو جد وجہد حضرت سید صاحب نے شروع کی اور اصلاح احوال کا جو مشن جس نہج سے انہوں نے اٹھایا، اس کی آئندہ ایک بھرپور کوشش ۱۸۵۷ء کا جہاد آزادی ہے جس میں قیادت کرنے والے اکثر و بیشتر حضرات وہی تھے جنہیں قافلۂ سید کے باقیات کہنا چاہیئے "۱۸۵۷ء کے ہیرو" نامی کتاب میں سید انیس فاطمہ نے اور بعض دوسرے حضرات نے اس موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں جس "جذبۂ حریت" کو سرد کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ سرد نہ ہوا۔ بلکہ خاکستر میں چنگاری کی شکل اختیار کر گیا اور مختلف مواقع پر بھڑکا جس کی ایک مؤثر شکل ۱۸۵۷ء میں سامنے آئی۔ اسی دور کا جہاد شاملی ہے جس کی قیادت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے کی جو ۴ سال کی عمر میں حضرت سید صاحب قدس سرہٗ کی گود میں دیئے گئے جب انہوں نے ان نواح کا دورہ کیا تھا۔ سید صاحب نے اس بچہ کو گود میں لے کر پیار اور دعا کی ___ لطیفہ یہ ہے کہ سید صاحب اور حاجی صاحب دونوں ہی کا معاملہ ظاہری علم کے طور پر بس واجبی تھا۔ لیکن ان کے دامن فیض سے وابستہ ہونے والے اعاظم رجال و اکابر علماء تھے، سید صاحب کے سلسلہ میں مولانا عبدالحی مولانا شاہ اسمٰعیل اور علماء صادق پور کے نام کافی ہیں تو حاجی صاحب کے وابستگان میں قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی، فقیہ عصر مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد منظہر نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور بعض واسطوں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا سید حسین احمد مدنی جیسے اساطین علم شامل ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور آپ کے خاندان کا جب علمی عروج تھا تو رائے بریلی میں شاہ علم اللہ کا خاندان تھا۔ اُدھر خود دہلی میں نقشبندی مجددی حضرات مصروفِ خدمتِ علم و معرفت تھے اور لطف یہ کہ سب حضرات کا باہمی گہرا رابطہ اور تعلق تھا۔

شاہ عبدالعزیز کو خاص طور پر جو علمی عروج نصیب ہوا اور ان کے فیض یافتگان اس وسیع خطہ میں پھیلے اس کی مثال تاریخ میں خال خال ملتی ہے ___ اس خاندان نے جو رجالِ علم تیار

کئے وہ تو کے ساتھ ہی ترجمۂ قرآن اور درسِ حدیث نیز فقہی مسائل میں توسع و وسعت کا ایک رویہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں قرآنی علوم کا چار سو ڈنکا پیٹا جس کا نہایت خوبصورت تذکرہ فاضلِ جلیل مولانا اخلاق حسین قاسمی کی کتاب "محاسن موضح قرآن" میں ہے ـــــ رہ گیا سلسلۂ تدریسِ حدیث تو اس وقت ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش کی کوئی علمی درسگاہ نہیں جس کی سند شاہ صاحب تک نہ پہنچتی ہو اور شاہ صاحب کے علوم کی اجتماعی وارث تحریک علمی دارالعلوم دیوبند کے حوالہ سے اس سند کا چرچا اقصائے عالم میں سنائی دیتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد رجالِ دین کی نئی منصوبہ بندی!

۱۸۵۷ء کا موڑ امّتِ مسلمہ بالخصوص اسلامیانِ برِعظیم کے لئے بڑا ہی اَلم ناک تھا ـــــ گویا سقوطِ بغداد کی دوسری شکل تھی اور بار دِگر وہی چھٹی صدی والا حادثہ رونما ہوا تھا۔ مغرب کے سیلاب جبر سے معلوم ہوتا تھا عالم اسلام کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر رہ گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کو ایک دوسرے رنگ میں کھڑا کر دیا اور میدانِ کارزار میں بوجوہ ناکامی کا شکار ہونے والے مجاہدین نئی قسم کی منصوبہ بندی سے سامنے آئے۔

اس حقیقت کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مرحلہ پر دو تعلیمی تحریکیں ابھریں، ایک دیوبند سے، دوسری علی گڑھ سے! گو کہ اس وقت بعض اور تعلیمی تحریکیں بھی تھیں جیسے خیرآباد، فرنگی محل وغیرہ لیکن جو جامعیت مدرسہ رحیمیہ دہلی (مدرسہ شاہ ولی اللہ) میں تھی وہ ان تحاریک میں نہ تھی، بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ابھرنے والی دو تحریکوں دیوبند ـــــ علیگڑھ میں سے بھی، مدرسہ رحیمیہ کا عکس جمیل نظر آتا ہے تو محض دیوبند کی تحریک میں۔

ہر چند کہ دیوبند اور علیگڑھ کی تحاریک کے بانی مولانا محمد قاسم اور سرسید احمد خاں دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے جو سلسلہ ولی اللّٰھیہ کے عظیم فرزند تھے لیکن سرسید احمد خاں مرحوم نے ایک اہلِ علم کے بقول "اعتزال" کا راستہ اختیار کیا اور جو عطارِ ملت کی بربادی کا باعث بنا تھا اسی کے لونڈے سے علاج کرانے میں عافیت سمجھی۔

تاریخی تسلسل کے حوالہ سے لامحالہ دیوبند کا نام لینا پڑتا ہے جس نے علمی تحریک کے حوالہ سے جہاں علمی وراثت و روحانی اقدار کی حفاظت کا کام کیا وہاں ملت کی خوشحالی و آزادی کے کام اور مشن سے بھی وہ برابر متعلق رہا۔

شیخ الہندؒ ۔۔۔ ہمہ گیر اور جامع شخصیت

دارالعلوم دیوبند، جو اس تحریک کا ابتدائی مدرسہ تھا، اس کے پہلے طالبعلم مولانا محمود حسن تھے جنہیں بعد میں "شیخ الہند" کے نام سے پورے برعظیم نے یاد کیا اور پھر میرے استادِ گرامی مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول یہ "الہامی لقب و خطاب" حضرت والا کے نام کا جزو لاینفک ہی نہیں، اصل پہ غالب آیا، یہ دراصل ان کی عظیم دینی و ملّی خدمات کا دنیا کی طرف سے اعتراف تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرفِ قبولیت کی سند۔

ایک مرحلہ پر مدرسہ میں "سیاسی سرگرمیوں" کے ضمن میں جب بعض حضرات سے دبی زبان میں کچھ باتیں کہیں تو شیخ الہند نے فرمایا کہ بھائی مدرسہ تو ہمارے سامنے بنا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت الاستاذ (مولانا نانوتوی) نے کیوں بنایا اور اس کے مقاصد کیا تھا؟

اور انہی شیخ الہندؒ نے ایک نازک موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جوان کی غرض سے مدرسہ نہ جاکر (جس کی تفصیل مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے حوالہ سے میثاق میں آچکی ہے) اسی حقیقت اور امر واقعہ ہی کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مدرسہ محض تعلیم و تعلّم کے لئے نہیں بنا، اس کے اصل مقاصد کچھ اور ہیں ۔۔۔ پھر اس نقطۂ نظر سے بھی ذرا غور فرمائیں کہ مختلف مواقع پر اس مدرسہ اور اس تحریکِ ملّی کے علمبرداروں نے جس غیرتِ ملّی کا مظاہرہ کیا اس کا ثبوت کہیں اور ملتا ہے؛ جنگ طرابلس ہو یا بلقان، دوسری جنگ عظیم کے دوران خلافت عثمانیہ کی بقا کا مسئلہ ہو یا ندوہ و جامعہ ملیہ کا قیام، حتیٰ کہ علیگڑھ کی بقا کا سوال جب آیا، تو ان حضرات نے آگے بڑھ کر اپنا ملّی فرض ادا کیا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کا عرصہ ۔۔۔!!

دنیا جانتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کا حادثہ امتِ مسلمہ کے لئے کتنا سنگین تھا، ایسے حادثات کے بعد قوموں کے سنبھلنے میں بڑا وقت خرچ ہو جاتا ہے۔ آخر بستی بسانا کھیل تو نہیں یہ تو بستے بستے بستی ہے، یہی وجہ ہے کہ برعظیم ہند و پاک میں ۱۹۰۰ء تک کوئی منظم تحریک یا اقدام کی شکل نظر نہیں آتی۔ ہاں اس دور میں نظر آتا ہے تو یہ کہ وہ قائدینِ ملت جو جنگ کی بازی ہار گئے تھے تعلیم کے حوالہ سے اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں۔ اسی دور میں سرسید احمد خاںؒ بھی اپنا کام شروع کیا۔ اسی زمانہ میں انگریز کے مخصوص اشارہ سے قادیانی نبوت کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے مقاصد بڑے واضح تھے۔ اسی زمانہ میں ایک مخصوص حوالہ سے "کانگریس" کی تشکیل ہوئی اور پھر بیسویں صدی

کے پہلے دہے میں "شملہ وفد" کے نتیجہ میں مسلم لیگ کا قیام معرض وجود میں آیا۔ تحریک دیوبند کے حضرات نے چونکہ اب کچھ قوت مجتمع کر لی تھی اس لئے انہوں نے علمی اجتماعات اور جلسوں کے ذریعہ رائے عامہ کی بیداری کا کام شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے پیچھے اصل ہاتھ مولانا محمود حسن کا ہی تھا جو جہاد شاملی کے قائدین مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہی کے علمی تربیت یافتہ ہی نہیں بلکہ روحانی تربیت یافتہ بھی تھے۔ اور ان کے جذبۂ جہاد و حریت کے وارث بھی! ان اجتماعات کے لئے ایک علمی انداز کی مجلس قائم کی گئی جس کے ناظم مولانا عبیداللہ سندھی تھے اس کے دو اہم اجتماع کانپور اور مرادآباد میں ہوئے جن میں اس دور میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی بھی شریک ہوئے۔ اور انہوں نے ناظم اجتماع مولانا عبیداللہ سندھی کی بے حد تعریف کی۔ ساتھ ہی خود دیوبند میں ۱۹۱۰ میں مولانا محمود حسن نے جلسہ دستاربندی کا اہتمام کرایا لیکن اس میں جہاں اپنے حلقہ و طبقہ کی اجتماعی قوت کا اندازہ لگانا اور انہیں کام کی لائن مہیا کرنا مقصود تھا، وہاں ساتھ ہی اس بُعد کو ختم کرنا بھی اس کا مقصود تھا جو دیوبند اور علیگڑھ میں پیدا ہو چکا تھا۔

دیوبند اور علیگڑھ کے لئے پُل ـــــ شیخ الہندؒ

شیخ الہندؒ کا یہ کارنامہ بڑا عظیم ہے کہ انہوں نے ان دو علمی دھاروں کو ملانے کی کوشش کی اور اس جلسہ میں علیگڑھ سے صاحبزادہ آفتاب احمد مرحوم وغیرہ کو بلا کر شامل کیا۔ نہ صرف یہ کیا بلکہ ایک تجویز پاس کرائی کہ ان دونوں درسگاہوں کے طلبہ کا آپس میں تبادلہ ہو۔ چنانچہ اس پر عمل بھی ہوا لیکن افسوس کہ علیگڑھ کے ایک طالب علم "انیس احمد" نے انگریزی اقتدار کے لئے مخبر کا فرض سرانجام دینا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں آئندہ چل کر بڑے نقصانات ہوئے۔ شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال متاثر ہوئی، وہ خود گرفتار ہوئے۔ خطرہ تھا کہ ان دونوں اداروں کے درمیان "ملاپ" کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ لیکن اسارتِ مالٹا کے بعد شیخ الہند نے کمال وسعتِ قلبی کے ساتھ پھر علیگڑھ کے آزادی خواہ طلبہ کو اتنی زبردست شاباش دی اور اس طرح ان کی خدمات کا اعتراف کیا کہ ایک دنیا ششدر رہ گئی۔

مولانا محمود حسن کا کمال یہ ہے کہ ایک تو انہوں نے اپنے اسلاف و اساتذہ کی روح کو زندہ اور قائم رکھا اور ان کی بتلائی ہوئی راہ پر مسلسل رواں دواں رہے۔ دوسرے انہوں نے ہندوستان کی قریب قریب جملہ ذمہ دار شخصیات اور اداروں سے روابط پیدا کئے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا میاں اصغر حسین اور

ڈاکٹر انصاری مرحوم جیسے حضرات نے بھی جنہوں نے آپ سے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا ہے، سب نے اس بات کی طرف توجہ دلائی۔ ان دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب وقار الملک، علی برادران، حسرت موہانی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، خان عبدالغفار، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالقیوم کانپوری، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا شاہد فاخر الہ آبادی، مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری، خلیفہ غلام محمد دین پوری، مولانا تاج محمود امروٹی الغرض سبھی لوگ آپ سے کسی نہ کسی ذریعہ سے متعلق تھے۔ ہندوستان کے اعتبار سے اس صدی کا یہ سب سے مبارک دور تھا کہ مولانا احمد رضا خان کے گھرانے کے علاوہ سارا ہندوستان ایک ساتھ کھڑا تھا اور گویا ہر کسی کا دل ایک ساتھ دھڑک رہا تھا۔

نظارۃ المعارف القرآنیہ، دہلی

جدید تعلیم یافتہ حضرات کو قرآن کی روشنی سے منور کرنے کی غرض سے آپ نے "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کی داغ بیل ڈالی، جس کے سربراہ مولانا عبیداللہ سندھی قرار پائے تو ان کے معاون مولانا احمد علی لاہوری ـــ اس ادارہ کے دہلی میں معاون مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل اور نواب وقار الملک جیسے لوگ تھے اور اس کی خدمات کا اعتراف مولانا شبلی نے کیا جیسا کہ اس موضوع پہ آج سے ۴ سال قبل انجمن خدام القرآن کے محاضرات میں مولانا عبیداللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقالہ میں واضح کیا تھا۔ پھر شیخ الہند نے مدینہ منورہ سے لے کر کابل تک اور ادھر ترکی کے حکمرانوں تک روابط قائم کئے جس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن انیس احمد صاحب کے بعد ملتان کے ایک خان بہادر نے جو روش اور رویّہ اختیار کیا اس کے نتیجہ میں بڑا نقصان ہوا۔ مولانا مکہ معظمہ میں گرفتار ہو کر انگریز حکومت کے اسیر ہو گئے۔ اس موقع پہ ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی ضروری ہے وہ یہ کہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان مرحوم کے ایک بڑے بھائی جان محمد خان بھی حضرت شیخ الہند کی مخبری پہ ایک زمانہ میں مامور رہے، انہوں نے دیوبند میں لکڑی کا ٹال شروع کیا اور شیخ سے رابطہ رکھا۔ ایبٹ آباد کے سابق خطیب مولانا محمد اسحٰق المرحوم نے سردار بہادر خان مرحوم کی موجودگی میں یہ قصّہ مولانا مفتی محمود مرحوم کو سنایا اور سردار بہادر خان نے اس کی تصدیق کی۔ جان محمد بعد میں انگریز کے عتاب کا ہی شکار نہ ہوئے بلکہ ہری پور میں اپنے بھائی اکرم خان مرحوم کی گولی کا نشانہ بھی بن گئے۔ فاعتبروا یا اُولی الابصار!

شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال

شیخ الہند نے جس تحریک ریشمی رومال کی داغ بیل ڈالی تھی وہ اگر کامیاب ہو جاتی تو تاریخ کا ایک بڑا معجوبہ ہوتا لیکن جس طرح حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریک خوانینِ سرحد کی بیوفائی کی بھینٹ چڑھ گئی اس طرح یہ تحریک ملتان کے ایک نواب زادہ اور فیصل آباد کے ایک نوجوان طالب علم کی مخبری کی بھینٹ چڑھ گئی ——— شیخ الہند اسارتِ مالٹا سے واپس تشریف لائے تو ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا تھا۔ وہ اب بالکل نحیف و نزار تھے لیکن ملی درد نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ برابر سرگرم عمل رہے علیگڑھ جا کر جامعہ ملیہ کی داغ بیل ڈالی اور اپنے کردار کی عظمت سے ثابت کر دیا کہ اگر علیگڑھ کے بعض عزیزوں نے دانستہ یا نادانستہ مخبری کے فرائض انجام دے کر مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور تحریک کو نقصان پہنچایا ہے تو کوئی بات نہیں، میں پھر بھی انہیں سینہ سے لگانے کو تیار ہوں اور اپنی شاخ کے حصول کے لئے پھر ان کے دروازہ پر چل کر آیا ہوں ——— ساتھ ہی آپ نے تفرقہ بازی کی لعنت سے قوم کو بچانے کی اپنے مخصوص خدام اور عام لوگوں تلقین کی۔ اسی دور میں وہ بات ہوئی جس کا مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ ذکر اکثر کے حوالہ سے ذکر آتا ہے کہ آپ نے قرآنی تعلیمات کے عام کرنے اور ان کو پھیلانے کی ضرورت پہ زور دیا۔ اس حوالہ یا گفتگو کا یہ مطلب اخذ کرنا کہ پہلے اس طرف ان کی توجہ نہ تھی، اب ہوئی، کسی طرح صحیح نہیں۔ اس سے قبل بھی وہ اسی کوجہ میں مصروف کار تھے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب زیادہ قوت و شدت کے ساتھ اس کام کے متمنی تھے۔

(جاری ہے)



Coca-
it!
THE COCA-COLA

نامہ نگار

حیدرآباد میں
تنظیم اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع

الحمدللہ کہ پروگرام کے مطابق تنظیم اسلامی کا اس سال کے دوران سہ روزہ چوتھا علاقائی اجتماع سندھ کے اہم شہر اور قلب حیدرآباد میں ۸ - ۹ اور ۱۰ نومبر کو بخیر وخوبی اختتام کو پہنچا۔ اگرچہ شروع میں کچھ دشواریاں اور مسائل کا سامنا تھا لیکن حیدرآباد کے رفقاء کے جذبہ اور لگن اور اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے تمام دشواریاں دور ہوگئیں۔ اس اجتماع کے انعقاد میں کراچی کے رفقاء نے بھی اپنی مقدور بھر کوشش کی۔ اجتماع سے پہلے انتظامات کے سلسلہ میں صلاح ومشورہ کے لئے محترم جمیل الرحمٰن صاحب اور خاکسار کو حیدرآباد جانے کا موقع ملا۔ کراچی تنظیم نے پوسٹرز اور ہینڈبلز کی طباعت اور مکتبہ کی ذمہ داریوں کو اپنے ذمہ لیا اور ایک ہزار پوسٹرز اور دس ہزار ہینڈبلز طباعت کرواکر حیدرآباد بھیجے۔ اس کے علاوہ کراچی کے دو رفقاء نے چھ نومبر کو حیدرآباد پہنچ کر حیدرآباد کے رفقاء کی اعانت کی۔ مرکز سے محترم جمیل الرحمٰن صاحب، قمر سعید قریشی صاحب، چوہدری غلام محمد صاحب اور عبدالرزاق صاحب جمعرات ۷ نومبر کی صبح ہی حیدرآباد پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح کراچی سے مکتبہ لے کر بھائی عبدالرشید صاحب، بھائی محمد صالح صاحب، بھائی ناصر انیس صاحب اور خاکسار جمعرات ہی کو ۸ بجے حیدرآباد پہنچ گئے۔

امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۸ نومبر کو نماز فجر سے قبل بذریعہ ٹرین حیدرآباد پہنچے اور پھر بعد میں مختلف مقامات سے رفقاء اجتماع گاہ پہنچنا شروع ہوگئے۔ کراچی کے رفقاء دو منی بسوں میں اجتماع گاہ پہنچے۔ ان بسوں پر "تنظیم اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع" کا بینر لگایا گیا تھا۔

اس علاقائی اجتماع میں امیر محترم کے تین عمومی خطابات تھے جو تین مختلف مقامات پر رکھے گئے تھے جبکہ رفقاء کے لئے تربیتی پروگرام کا انتظام محترم عبدالقادر صاحب امیر تنظیم اسلامی حیدرآباد کی فیکٹری (جواب بند پڑی ہے) میں تھا۔ رفقاء کے لئے اجتماعی رہائش ومسجد کا انتظام بھی وہیں کیا گیا تھا۔ فیکٹری کے مرکزی دروازہ پر "اھلاً وسھلاً" کا خوبصورت بینر آویزاں کیا گیا تھا۔ دروازہ میں داخل ہونے کے بعد دفاتر کے برآمدے میں استقبالیہ کاؤنٹر لگایا گیا تھا جہاں شرکاء اپنے نام اور تنظیم کا تعارفی بیج حاصل کرتے تھے۔ وہیں پر اجتماع سے متعلق بہت ہی مفید ہدایات درج تھیں اور تربیتی پروگرام کے نظام الاوقات بھی آویزاں تھے۔ اجتماع گاہ کے اندر قرآنی آیات کے بینر لگائے گئے تھے۔

اجتماع کا آغاز حیدر آباد کی ایک اہم جامع مسجد قبا پیسر آباد میں خطاب جمعہ سے ہوا۔ اس میں امیر محترم نے حکمت و احکام جمعہ کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ امیر محترم نے خطبۂ جمعہ کو حزب اللہ کا ہفتہ وار اجتماع قرار دیا جس کا اصل مقصد تذکیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ جمعہ میں خطبہ جمعہ کو ذکر قرار دیا گیا ہے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ قرآن حکیم دراصل مسلمانوں کی نظریاتی اور انقلابی جماعت کا بنیادی لٹریچر ہے۔ اور خطبۂ جمعہ کا مقصد یہ ہے کہ اس بنیادی لٹریچر یعنی قرآن حکیم کے ذریعے سے مسلمانوں کی جماعت کو ان کا اصل مقصد اور نظریہ کی یاد دہانی کرائی جائے۔ اس خطبہ کی اتنی اہمیت ہے کہ ظہر کی چار رکعت فرض نماز کی جگہ دو رکعت فرض رہ گئیں اور دو رکعت کی جگہ خطبہ قائم مقام ہو گیا اور خطبہ کی اذان سے نماز کے ختم ہونے تک کاروبارِ دنیوی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

۸ ر نومبر جمعۃ المبارک کی شام ہوم اسٹیڈ ہال کے سبزہ زار میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام وہ عظیم الشان جلسہ ہوا جس کی مثال حیدر آباد کے رفقاء کے مطابق ماضی میں نہیں ملتی۔ جلسہ گاہ اپنی بھرپور وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی۔ اگرچہ انتظام کرسیوں کا تھا لیکن وہ ناکافی ہو گئیں اور مزید دریوں کا اہتمام کرنا پڑا۔ اس کے باوجود بھی حاضرین کی ایک بڑی تعداد نے کھڑے ہو کر امیر محترم کا خطاب سنا۔ اس خطاب کا عنوان تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا؟ اور کیوں؟" امیر محترم کا خطاب رات نو بجے شروع ہوا اور ½ ۱۱ بجے تک جاری رہا۔ امیر محترم نے فرمایا کہ اگرچہ اسلامی انقلاب کی اصطلاح قرآنی اصطلاح نہیں لیکن جدید ذہن کے قریب ہونے اور ابلاغ کے لئے اس اصطلاح کا استعمال ضروری ہے جبکہ قرآن میں اس کے لئے چار اصطلاحات ہیں (۱) تکبیرِ رب (۲) اقامتِ دین (۳) اظہارِ دین (۴) وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ اور ان کا مقصد اور مفہوم ایک ہی ہے۔ اسلامی انقلاب کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلامی نظام کے تین شعبے ہیں نمبر ایک: سماجی نظام، اس میں کامل مساوات، فضیلت تقویٰ کی بنیاد پر، مخلوط معاشرہ کی نفی اور عصمت و عفت کی حفاظت۔ اس کے نمایاں اوصاف ہیں ـــــ نمبر ۲: معاشی نظام، امانت کا تصور، ملکیت کی نفی اور کفالت عامہ کا تصور اس کے اہم خدوخال ہیں ـــــ نمبر ۳: سیاسی نظام: یعنی حاکمیت صرف اللہ کی اور خلافتِ عامہ کا تصور کہ تمام مسلمان اجتماعی طور پر اللہ کے خلیفہ ہیں۔ اور ایسا نظام جس میں حریتِ مساوات اور اخوت ہوں۔ دوسرے سوال کے جواب میں کہ اسلامی انقلاب کیوں؟ امیر محترم نے فرمایا کہ یہ ہمارا دینی فریضہ ہے، ایمان کا تقاضا ہے! اور آخرت کے عذاب سے بچنے کے لئے لازم ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ خاص طور پر مسلمانانِ پاکستان کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ پاکستان کے قیام کا جواز اسلام کے سوا کوئی نہیں۔ اگر اس

ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوتا تو یہ اس کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ ہم نے اس کے لئے اللہ سے وعدے کئے ہیں کہ یہاں پر اسلام کو نافذ کریں گے تو اگر ہم اس وعدہ کو پورا نہیں کرتے تو اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

تیسرا خطاب عام امیر محترم کا جامع مسجد دار العلوم لطیف آباد نمبر ۱۰ میں بعد نماز عشاء ہوا۔ اس میں آپ نے گذشتہ خطاب کا خلاصہ بیان کیا اور "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیسے؟" کے عنوان پر خطاب کیا۔ جامع مسجد کا وسیع و عریض ہال بھرا ہوا تھا اور مسجد سے باہر بھی حاضرین موجود تھے اور امیر محترم کا خطاب بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ اس کے لئے ایک اسلامی انقلابی جماعت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے آپ نے تین مراحل کا ذکر فرمایا (۱) تبلیغ و دعوت (۲) تنظیم (۳) تربیت و تزکیہ ـــــ یہ ابتدائی مراحل ہیں اور اس کے بعد تین اگلے مراحل (۱) عدم تشدد یا صبر محض (۲) اقدام (۳) مسلح تصادم ـــــ امیر محترم نے فرمایا کہ اسلامی انقلاب کے یہ چھ مراحل میں نے سیرت النبیؐ سے اخذ کئے ہیں۔ آپ نے سیرت النبیؐ کا ایک خاکہ پیش فرمایا کہ آپؐ کی جدوجہد ان چھ مراحل سے گزری ہے۔ لیکن مسلمان معاشرہ میں اقدام کے مرحلے کو بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس میں منکرات کے خلاف حکومت کو چیلنج کرنا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم ایک منکر کے بعد دوسرے منکر کے خلاف مظاہرہ کریں گے اور یہ جب ہی ہو سکے گا جب معاشرہ میں اجتماعی ارادہ (Collective Will) پیدا ہو جائے گی۔

۱۰ نومبر کی شام عصر کے بعد امیر محترم نے سوال و جواب کی نشست میں حاضرین کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے۔ ایک خصوصی نشست ۹ نومبر بروز ہفتہ بعد نماز عصر امیر محترم کے ساتھ ہوئی جس میں سندھ یونیورسٹی کے پروفیسرز اور اعلیٰ علمی شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا۔ ایک پروفیسر نے اس ملاقات کے بعد اپنا تاثر ان الفاظ میں فرمایا کہ ماشاءاللہ ڈاکٹر صاحب چلتا پھرتا علمی سرمایہ ہیں ـــــ

دن کے تربیتی پروگرام میں جو نظام الاوقات مقرر کئے گئے تھے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) روزانہ بعد نماز فجر آدھ گھنٹہ۔ مختار حسین فاروقی صاحب کا خطاب

(۲) ۳۰-۶ بجے تا ۳۰-۸ بجے صبح۔ ناشتہ اور دیگر حوائج و ضروریات سے فراغت

(۳) ۳۰-۸ بجے تا ۳۰-۱۰ بجے تربیتی پروگرام

(۴) ۳۰-۱۰ بجے تا ۱۱ بجے وقفہ چائے

(۵) ۱۱ بجے تا ۱ بجے دوپہر تربیتی پروگرام

(۶) ۱ بجے تا ۱۵-۴ بجے نمازِ ظہر، کھانا، قیلولہ وغیرہ

(۷) نمازِ عصر تا نمازِ مغرب تعارف رفقاء

ہفتہ ۹ نومبر کو بعد نمازِ فجر رفیق تنظیم جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے صحابہ کی سیرت کا مطالعہ کرنے پر زور دیا کہ صحابہ کی جماعت میں مختلف طبائع کے اصحاب تھے تو جو کوئی بھی کسی صحابی سے اپنی طبیعت سے مناسبت پائے وہ ان کی اتباع اور پیروی کر کے ان سے قریب تر پہنچنے کی کوشش کرے۔ صحابہ کی مثال ستاروں کی مانند ہے اور جو کوئی بھی ان میں سے کسی کی پیروی کرے ہدایت کو پہنچ جائے گا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر رفقاء ۳۰-۸ بجے اجتماع گاہ میں جمع ہو گئے جو رہائش گاہ سے متصل ہی تھی۔ تعلیمی و تربیتی پروگرام کا آغاز ہوا تو کراچی کے رفیق ضمیر اختر صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کے پہلے تین دروس کی تلاوت کی۔ اسد الرحمٰن فاروقی صاحب نے پہلے درس کا خلاصہ اور دوسرا مکمل درس تقریباً ایک گھنٹے میں بیان کیا۔ آپ نے نہایت جامع انداز میں اقامتِ دین کی فرضیت کو واضح کیا۔ تیسرا درس چوہدری غلام محمد صاحب قیم تنظیم اسلامی نے دیا۔ آپ نے اپنے مخصوص لہجے میں ایک دشوار موضوع کو دل نشیں پیرائے میں بیان کیا اور قرآنی آیاتِ بیّنات کی روشنی میں بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں اسلامی انقلاب کے لئے آخری عنوان یعنی نہی عن المنکر اور محافظت حدود اللہ کے ضمن میں طاقت کا مظاہرہ اور چیلنج کو کھول کر بیان کیا۔

آدھ گھنٹے کے لئے چائے کا وقفہ ہوا۔ ۱۱ بجے پھر اجتماع کی کارروائی شروع ہوئی۔ محترم عبدالرزاق صاحب نے درس چہارم کے ذیل میں اقامتِ دین کا کام کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف پر شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا، درس پنجم پھر چوہدری غلام محمد صاحب نے دیا۔ آپ نے اپنے مخصوص طرزِ استدلال کے ذریعے حزب اللہ کی تشکیل میں فیصلہ کن عامل بمقابلہ حزب الشیطان پر روشنی ڈالی۔

آخر میں چھٹا درس ضمیر اختر صاحب نے دیا۔ آپ نے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی اور تنظیمی اساس پر متعلقہ منتخب آیات کی روشنی میں بیان کیا۔

پ نے بیعت کی اصل قرآن میں اور پھر دورِ نبوت اور دورِ خلافتِ راشدہ میں اس پر عمل د
ریخی حوالے سے واضح کیا۔ نیز مختلف ادوار میں اس کی نوعیت پر روشنی ڈالی۔

اتوار ۱۰ نومبر کو بعد نمازِ فجر حسبِ سابق محترم مختار حسن فاروقی صاحب نے گزشتہ مضمون کو مکمل کیا۔ ناشتے وغیرہ کی فراغت کے بعد ٹھیک ۸:۳۰ بجے رفقاء اجتماع گاہ میں جمع ہو گئے۔ درسِ ہفتم سے چوہدری غلام محمد صاحب نے آغاز کیا۔ آپ نے نظم جماعت کی پابندی اور اس سے رخصت و معذرت کے معاملے کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا۔

درسِ ہشتم رفیقِ محترم اسد الرحمان فاروقی صاحب نے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ آدھ گھنٹے میں مکمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھائی اسد الرحمان کو قوتِ بیان سے نوازا ہے۔ آپ نے مربوط انداز میں اطاعتِ امیر بمقابلہ تنازع فی الامر و نجویٰ کو متعلقہ آیات کی روشنی میں واضح کیا۔

درسِ نہم محترم عبد الرزاق صاحب نے دیا اور مختصر وقت میں امراء کا رفقاء کے ساتھ طرزِ عمل اور اسوۂ رسول ﷺ پر مدلل خطاب فرمایا۔ اس طرح تربیتی درس کا یہ سلسلہ مکمل ہوا۔ چائے کے وقفہ کے بعد امیر محترم نے دو روزہ دروسِ قرآن کے بارے میں سوالات کے جوابات دیئے۔ یہ سلسلہ نمازِ ظہر تک جاری رہا۔ نمازِ ظہر کے بعد چھ افراد نے امیرِ تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور جہاد پر مبنی بیعت کی۔ اللہ ان حضرات کو اپنے دین کا خادم بنائے۔ نمازِ ظہر کے بعد یہ سہ روزہ علاقائی اجتماع اپنے اختتام کو پہنچا۔

آخر میں حیدرآباد کے رفقاء کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ جنہوں نے اجتماع کے انعقاد کے سلسلے میں ان تھک محنتیں کیں اور میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ نوجوان رفقاء میں سے غیاث صاحب، اسلم صاحب، اعجاز صاحب، شاہد صاحب، عبد الحسیب غوری صاحب اور بزرگ رفقاء محمد حنیف صاحب، عبد الشکور صاحب اور امین الدین صاحب نے نہایت جانفشانی سے کام کیا۔ علاوہ ازیں ایسے تمام رفقاء جنہوں نے کسی بھی اعتبار سے حصہ لیا ہے۔ ان کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ ہے۔

قابلِ مبارک باد ہیں حیدرآباد تنظیم کے امیر جناب عبد القادر صاحب جنہوں نے اپنے مستعد رفقاء کے تعاون سے تمام مراحل کو حسن و خوبی انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کے لئے ایسے ہی جذبات سے نوازے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

مرتب: سید واحد علی رضوی
امیرِ وسطی تنظیم اسلامی کراچی

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین
اینڈ سنز

مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

THLY **"MEESAQ"** LAHORE

DECEMBER 1985 | No 12